بادہ کہن

الناظر کی شایع شدہ ۳۸ جلدوں کا ایک مکمل سٹ بھی بغرض فروخت موجود نہیں - صرف ۲۵ یا ۲۸ جلدوں کے چند سٹ ابھی مل سکتے ہیں - اور کچھ جلدیں زیادہ تعداد میں بچی ہیں - اس لیے اس ذخیرے کو ختم کرنے کے لیے ان کی قیمتوں میں

انتہائی تخفیف

کا اعلان کیا جاتا ہے - ہر جلد کا مختصر حال اور رعایتی قیمت درج ذیل ہے :-

(۱) جلد چہارم (جنوری لغایتہ جون ۱۹۱۱ء)

خاص مضامین نثر: عجائبات فلک (مفتی انوار الحق ایم اے) شاہان اودھ کی بے تعصبی (خواجہ عبد الروف عشرت) معرفت حق (مولوی سید علی اصغر بلگرامی) سکندر مقدونی (ا - ت) عالم خیال پر ایک نظر (شیخ مشیر حسین قدوائی بیرسٹرایٹ لا) اہمیت شکر (مولوی ابوالحسن الہ آبادی) جاپانی عورت (ت - ک) تقسیم محنت (خان بہادر مرزا سلطان احمد) حضرت فخر الدین عراقی (عبد اللہ یعنی مولوی معشوق حسین خاں بی اے) عالم خیال کے دوسرے رخ پر ایک نگاہ (مسٹر محمد سلیمان بیرسٹرایٹ لا) اسپین اور اسلام (مسٹر ابرار حسین) تسلیم و رضا (ابو العلا سید احمد ناطق) فطنت (خان بہادر مرزا سلطان احمد)

نظم:- عالم خیال (شوق قدوائی کی یہ نظم بہت مقبول ہوئی اور کتابی صورت میں بار بار چھپ چکی ہے) میں کیا ہوں (مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی) نیند (شوق قدوائی) ماں کی مامتا (منشی محمد حسین محوی) نوحہ خوانی (مرزا کاظم حسین محشر) مسدس نعتیہ (مولوی سید محی الدین تمنا پھلواروی) عبرت (حسرت) (علامہ سید علی حیدر نظم طباطبائی) حمد باری تعالی (داغ مسکی الدین) سینس اینڈ ریلیجن (شوق قدوائی) باغ خزاں رسیدہ (محوی)

حجم ۳۶۰ صفحے قیمت سابق عہر

رعایتی قیمت ۸ر

(۲) جلد پنجم (جولائی تا دسمبر ۱۹۱۱ء)

خاص مضامین نثر:- مسلمانوں کی علمی ترقیاں (مولوی محمد نعمت خاں) حق معرفت (مولوی سید علی اصغر بلگرامی) مجوزہ محمڈن یونیورسٹی پر ایک فلسفیانہ نظر (مسٹر ظفر حسن خاں) استاد الملک ملا جیون (قاضی خادم حسین علوی) بر جیس فلک (مفتی انوار الحق ایم اے) ہندوستان کے نوشتہ ہائے اسلامی (مولانا تسلیم شمس اللہ قادری) شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی (عبد اللہ) عورتوں کے حقوق (مولانا سید احمد دہلوی مولف فرہنگ آصفیہ) شیخ اوحد الدین کرمانی (عبد اللہ) مسلمانان ہند کی معاشرت اور اس کی اصلاح (ڈاکٹر کے فرضی نام سے کپتان لطافت حسین خاں آئی ایم ایس نے یہ مضامین لکھے) ذکاوت یا اخلاق (مولوی جواد علی خاں عالی) مشتری اور اس کا انجام (مفتی انوار الحق ایم اے) مولانا جلال الدین بلخی الرومی (عبد اللہ)

جلال الدین اکبر کے ایک سپہ سالار کی بہادری
(مسٹر قطب الدین حسین) کلیلہ و دمنہ (منشی دیانت حسین صاحب
کا تحقیقاتی مضمون) حیدر نائک (و۔ ک۔)
عقل انسانی (مولوی سعید احمد ناطق) جامعہ قرطبہ
(مولوی نعمت خاں) شیخ محی الدین اکبر (عبد اللہ۔ اس
مضمون کو دفتر رسالہ معونی نے کتابی صورت میں شائع کیا)
سیر کشمیر (مسٹر شبیر حسین قدوائی بیرسٹر ایٹ لا)
نظم:۔ ابر (منشی احمد علی شوق قدوائی) تتلی (منشی
محمد حسین محوی) ہوا (شوق قدوائی) جنگل اور باغ
(شوق قدوائی) فضا (شوق قدوائی) ہندسیا چل
کی چاندنی (شوق قدوائی) شخصی سلطنت میں
سازش کا اثر (سید میر محمد طباطبائی خلف علامہ سید
علی حیدر طباطبائی) قرض (مرزا محمد ہادی رسا دہلوی حیدرآبادی)

حجم ۳۶۰ صفحے۔ قیمت سابق ۲ر
رعایتی قیمت ۱۸ر

(۳) جلد بست و پنجم (جولائی تا دسمبر ۱۹۲۳ء)

(اس جلد کے بعض پرچوں میں حضرت جلیبی کے نوٹ
"نغمہ ہائے غیبیہ" کے عنوان سے شائع ہوتے رہے، اور ایڈیٹر کے
قلم سے سفر حجاز کی مختصر روداد کئی نمبر شائع ہوئے)
خاص مضامین نثر:۔ خواجہ بزرگ قدس سرہ
(عبد اللہ) حکومت کے وسائل آمدنی (مسٹر جے۔
آر۔ ہے) ایک غیب داں (خان بہادر مرزا سلطان احمد)
جنوبی ہند کی عظمت (مرزا مظفر حسین علی بیگ) چو کفر
از کعبہ بر خیزد کجا ماند مسلمانی (ایڈیٹر) خطاب
(گل) مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ (عبد اللہ) مثنوی
مولانا روم کی ایک جدید اردو شرح (مولوی
عبد الماجد بی اے) دنیا کے تمدنی مراکز (مولانا

حضرت موہانی) طاہرہ (ریویو: مولوی محمد ظفر ایم اے
ایل ایل بی) انگریزوں کا پہلا قدم بہار میں
(مولوی محمود شیر وکیل پٹنہ)
نظم:۔ سبد گل فروش (صاحبزادہ ولی احمد خاں
جے پوری) صبح حرم (حضرت شاہ ابو الشرف مجددی
مہاجر) لہو کی بوند (منشی محمود حسین محمود اسرائیلی) فتح مکہ
(جگر بسوانی) امید و بیم کی تصویر (قاضی غلام میر
اسیر بدایونی) انس بن مالک (جگر بسوانی) مجاز
سے حقیقت تک (مولوی وحید الدین سلیم پانی پتی)

حجم ۲۸۰ صفحے۔ قیمت سابق ۲ر
رعایتی قیمت ۱ر

(۴) جلد بست و ششم (جنوری تا جون ۱۹۲۴ء)

(اس جلد کے بیشتر پرچوں میں "نغمہ ہائے غیبیہ" جلیبی صاحب کے
قلم سے اور سفر حجاز کی روداد ایڈیٹر کی لکھی ہوئی درج ہے۔)
خاص مضامین نثر:۔ فلسفہ ازدواج (پروفیسر
رشید احمد صدیقی ایم اے) انسانی تہذیب کی
ترقی (مولوی کلیم الغنی قریشی) طاؤ۔ چینیوں کا خدا
(علامہ احسان اللہ عباسی مصنف تاریخ اسلام وغیرہ)
سقراط (مولوی حامد علی) روح نے بچا لیا
(مولوی محمد ظفر ایم اے) پیام امن (ریویو: مسٹر ظفر حسن
خاں) ذات بحت۔ روح۔ تقدیر (علامہ احسان اللہ
عباسی) حضرت مخدوم الملک (مولوی سید محمود شیر
وکیل) عربی شاعری کی خصوصیات (مسلم عظیم آبادی)
خواجہ قطب الدین بختیار کاکی (عبد اللہ)
کہرا۔ پالا۔ برف (میر طالب علی طالب الہ آبادی)
انبیائے بنی اسرائیل (منشی منشیر احمد عسلوی)
شیخ بو علی سینا (پروفیسر حافظ امجد حسین ایم اے)

سیرت ابن تیمیہ (مسٹر عبد السلام ندوی ایم اے)

نظم :- مذلے ذو الجلال (جگر بسوانی) رازِ حیات (مسلم عظیم آبادی) پاسِ محبت (صاحبزادہ ولی محمد خاں) جذبات قناعت (مولوی قاضی غلام امیر آسیر بدایونی) رہروی منزل حق (مسلم عظیم آبادی) انقلاب سیرت (سید غلام حسین گویا جہان آبادی) علم و ضبط (مولوی ضیاء احمد ضیاء ایم اے) فلسفۂ محبت (مولوی وحید الدین سلیم) اجل (آسط بسوانی)

حجم ۳۸۰ صفحے - قیمت سابق للعہ

رعایتی قیمت ۱۲ مر

(۵) جلد بست و ہفتم ۲۷ (جولائی تا دسمبر سنہ ۱۹۲۴ء)

ہمراہ "فیہ ما فیہ" اور سفر حجاز کی روداد کے کئی نمبر-

خاص مضامین نثر :- پیامِ امن (ریویو از مولانا عبد الرزاق ملیح آبادی) پارسی مذہب (ناظر دہلوی) آئینوں کی فضائی آسمانی تقسیم (سید طالب علی طالب الہ آبادی) بجلا وطنی (خواجہ منظور حسین علیگ) جدید دنیائے اسلام (ریویو از مولوی محمد ظفر ایم اے) تصوف (مولوی ضیاء احمد ایم اے) ابا بدلی (پروفیسر رشید احمد صدیقی ایم اے) ابن رشد (ریویو از منشی سید افتخار حسین بی اے رجسٹرار چیف کورٹ اودھ) افادات مہدی پر ایک نظر (مولوی سید حبیب احمد) یورپ میں فن تاریخ کی تاریخ (پروفیسر مقصود علی ایم اے) کلام میر (ا - ع) مختصر تاریخ جادہ و لمحقات (مولوی عبد السلام رفیق از جادہ) تاریخ مغرب ۱۰۲۱ء المداری (ریویو از منشی امیر احمد علوی بی اے) حضرت شیخ فرید گنج شکر (عبد اللہ) انتخاب از سیر المتقین

مولوی محمد یحیی تنہائی ایم اے) راماین کی تعلیم (علامہ احسان اللہ عباسی) دائرہ (مولوی نجم الغنی قریشی) ہرن کا کمرہ (مولوی نجم الغنی قریشی) اسپین کی پہلیاں (مولانا خلیل الرحمٰن) طنجہ و مراکش (ایضاً) غوث الاعظم (مرزا محمد عسکری بی اے) افغانیہ (مولوی حامد علی) فاتح مصر (الف - ع)

نظم :- زاری عفت (عبد اللہ خاں تپش خورجوی) غمزۂ کوئل (حضرت اقدس حیدر آبادی) دل (سید اظہر علی ایم اے) مسلم جوانمردے خطاب (جوش ملیح آبادی) دل (آسط بسوانی)

حجم ۴۰۰ صفحے - قیمت سابق للعہ

رعایتی قیمت ۱۲ مر

(۶) جلد بست و ہشتم ۲۸ (جنوری تا جون سنہ ۱۹۲۵ء)

(بعض پرچوں میں فیہ ما فیہ بعض میں سفر حجاز کی روداد ہے)

خاص مضامین نثر :- دیباچہ تصوف اسلام (مولوی عبد الماجد بی اے) تاریخ عرب (ریویو از پروفیسر فضل الرحمٰن ایم اے) مہرداد و پلکر (فانی خاں) اتحاد بین المسلمین والہنود (حضرت ملا مصنون العلیٰ البودھا موی) گوتم بدھ (منشی امیر احمد علوی بی اے) مولانا آزاد کی تحقیق و تدقیق (مولوی محمد یحیی تنہائی ایم اے) اردو (مولوی سید ضامن علی فاطمی) مغلیہ سلطنت کے زوال کے اسباب (حضرت ملا مصنون العلیٰ) عباسیہ بغداد (ریویو از منشی امیر احمد علوی بی اے) دیوانِ غالب کی شرحوں پر ایک سرسری نظر (مولوی محمد احمد تجو دموانی ایم اے) سیاسیات (ریویو از قاضی تلمذ حسین ایم اے) ہند عہد اور نگزیب میں (ریویو از مولانا عبد الماجد بی اے)

(بقیہ صفحہ ۸۶)

ایک طرف مسلم یونیٹی بورڈ ہوگا، دوسری طرف یونینسٹ پارٹی۔ اور دونوں کی غایت یہ ہوگی کہ چند زردار یا ہوشیاروں کو کونسل کی کرسی پر بٹھا دیا جائے۔ جہاں پہونچ کر یہ سب والے یا زیادہ چالاک اصحاب وزارت پر فائز ہوں اور بقیہ اپنے اغراض کی تکمیل کے لیے دوسری راہیں تلاش کریں۔

جدید اصلاحات کا اور نتیجہ کچھ ہو یا نہ ہو مگر عام طالب طبقہ کے لیے چند عہدے اور پیدا ہو جائیں گے۔ اسی سبب لوگوں میں قومی ہمدردی و غمخواری کا مرض روز بترقی ہے۔

افسوس ہے کہ مسلمانوں میں ایسے درد مند بہت کم ہیں جو محض قومی خدمت کے نقطۂ نظر سے کونسلوں میں جاتے ہوں، ورنہ مطلب پرست و خود غرض، پارٹی باز اور گروہ ساز طبقہ کے خلاف جدوجہد کرنے کے لیے ایک مضبوط جماعت کی تشکیل آسان ہوتی۔ روپیہ اور عیاریاں اسکے پاس ہیں مگر ووٹ غریب مسلمانوں کے ہاتھ میں ہیں جن کو مناسب طور پر صورت حال سے آگاہ کیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ ان قوم فروشوں اور اقتدار پسندوں کی مقصد برآری کا آلہ بننا پسند کریں کہ اس سے خود اُنکی مشکلات روز افزوں ہیں اور زندگی وبال جان ہو رہی ہے۔

حضرت بیخود موہانی کا ہماری شاعری کے خلاف اعلان جنگ اور اس سلسلہ میں لکھنؤ اور الہ آباد یونیورسٹیوں کے معلمین کرام کا سید مسعود حسن صاحب کے مقابلہ میں مشترکہ محاذ قائم کرنا نہایت درجہ قابل افسوس ہے۔ اگر ان اصحاب کا نقطۂ نظر خالص ادبی ہوتا تو الناظر بڑی خوشی سے اسکا استقبال کرتا، مگر تمام حالات سے باخبر ہونے کے بعد صاف نظر آتا ہے کہ جھگڑا صرف ذاتیات کا ہے۔ اور ہم مجبور ہیں کہ اس طریق کار کے خلاف صدائے احتجاج بلند کریں۔ بیخود صاحب میں تحقیق و تنقید کی جو صلاحیتیں ہیں وہ زیادہ کارآمد ثابت ہونگی اگر وہ اُن صدہا کتابوں کی اصلاح پر توجہ فرمائیں جو نصاب تعلیم کے طور پر مدارس میں محض ناشرین کی نفع رسانی کے لیے رائج ہیں اور اُردو زبان کو بگاڑنے اور مسخ کرنے میں کافی حصہ لے رہی ہیں۔ آپس کی زور آزمائی تماشائیوں کے لیے ضرور لطف و دلچسپی کا موجب ہوگی مگر ہمیں اندیشہ ہے کہ فریقین کو یکساں نقصان پہونچائیگی

جمعۃ الوداع سے عید کے دوسرے دن تک الناظر کی خدمت کا موقع نہ ملا، اور اس دفعہ حجم ۸۸ صفحے ہو گیا ہے اسلیے طباعت میں وقت زائد صرف ہوا۔ کوشش ہے کہ یہ پرچہ جنوری کی آخری تاریخوں میں ناظرین کرام تک پہونچ جائے۔ لیکن ایسا نہ ہو تو ناظرین معذور سمجھ کر تاخیر معاف فرمائیں۔ انشاءاللہ فروری نمبر وقت ہی پر پہونچے گا۔ سب اصحاب اسے یاد رکھیں کہ الناظر کی اشاعت انگریزی مہینے کی آخری تاریخوں میں ہوتی ہے۔ (۲۲ جنوری).

بنام خداوند جہاں آفریں

الناظر

نمبر ۱ جلد ۳۹ جنوری سنہ ۱۹۳۵ء

اودھ کو علحدہ صوبہ بنایا جائے

(جناب خان بہادر شیخ مقبول حسین صاحب قدوائی۔ سی۔ آئی۔ ای۔ تعلقدار گدیہ)

یہ مضمون اودھ کے تعلیم یافتہ اور بیدار طبقہ کو غور و فکر اور جد و جہد کی دعوت دینے کی غرض سے شایع کیا جا رہا ہے۔ اگر یہ تحریک چند سال قبل اٹھائی جاتی تو شاید سندھ اور اڑیسہ کی طرح اودھ کو علحدہ صوبہ بنانے کی تجویز بھی قرطاس ابیض اور پارلیمنٹری کمیٹی کی رپورٹ میں شامل ہوتی، مگر اس وقت راقم مضمون سرکاری ملازمت کی وجہ سے اس قسم کی تجویز پیش کرنے یا ایسی کسی تحریک کی رہنمائی کرنے کے مجاز نہ تھے۔ اب بھی ان کی تجویز کا بارآور ہونا ممکن ہے اگر صوبہ کے با اثر اور فعال طبقے اس بارے میں متحد الخیال ہوں اور پوری سرگرمی و یکجہتی کے ساتھ اس مقصد کے لیے جد و جہد کریں۔

برطانوی مدبرین کا قاعدہ ہے کہ اگر انکے منافع تو ذی تعلق نہ ہوں، تو وہ ہر معقول بات کو ماننے کے لیے آمادہ ہو جاتے ہیں بشرطیکہ مناسب طریقے سے انکے روبرو پیش کی جائے۔ صوبۂ اودھ کو علحدہ کرنے میں نہ برطانوی حکومت کا کچھ نقصان ہے نہ حکومت ہند کے لیے کوئی دشواری۔ اس لیے نسبتاً آسانی سے تصفیہ ہونے کی امید کی جا سکتی ہے۔ پھر اس صوبہ کے ہندو مسلمانوں کا عددی توازن بھی ایسا نہیں کہ علحدگی کی تحریک سے کوئی فرقہ وارانہ سوال پیدا ہو۔ اختلاف کچھ ہو سکتا ہے تو ان اصحاب کو جنھیں اندیشہ ہو کہ اس سے تعلقداروں کا اقتدار بڑھے گا اور چھوٹے زمینداروں یا کسانوں کی

اس کا اثر پڑے گا۔

بہر صورت اس مسئلہ پر سب کو غور کرنا چاہیے اور اگر اودھ کو علیحدہ کرانا ہے تو اس کے لیے ایک نمائندہ اجتماع کرکے مناسب عملی کارروائی کرنا چاہیے۔

صوبہ کے تمام اخبارات و رسائل سے امید ہے کہ اس مضمون کی اشاعت اور اس پر اپنے اوراق میں بحث کریں گے۔

ایڈیٹر

اودھ اس وقت بھی ہندوستان کا ایک مختص اور مکمل انتظامی حصہ ہے۔ صوبۂ آگرہ کے ساتھ الحاق سے اس کی امتیازی حیثیت ایک صوبے کی ختم نہیں ہوئی ہے۔ وہ صوبۂ آگرہ میں مدغم ہوکر اس کا ایک جزء نہیں ہوگیا ہے۔ اسکا واضح ترین ثبوت ہمارے مجتمع صوبوں کا نام ہی صوبہ جات متحدہ آگرہ و اودھ ہے جسکے کھلے ہوئے معنی یہ ہیں کہ دو مختلف صوبے یعنی صوبۂ آگرہ اور صوبۂ اودھ شامل کرکے ایک متحد حکومت بنائی گئی ہے

میرا خیال یہ ہے کہ ہندوستان کا کوئی حصہ جسکی حیثیت بلحاظ ایک جامع حصۂ حکومت کے دوسرے اقطاع ملک سے علیحدہ ہو، اودھ سے زیادہ قدیم نہیں ہے۔ اس کی یہ حیثیت اسی وقت سے قائم ہے جب ایودھیا راجہ رام چندر جی کے آباؤ اجداد کا دارالسلطنت تھا، وہ جب درحقیقت اودھ ہی مہذب ہندوستان تھا۔ تاریخ عتیق کے مختلف دوروں میں اودھ کے رقبے میں وقتاً فوقتاً کمی بیشی ہوتی رہی مگر اس کی انفرادی حیثیت ہمیشہ برقرار رہی۔ دوسرے اقطاع و اضلاع اس میں شامل ہوکر اس کا جزو بنے یا اس سے خارج ہوئے، مگر اس کا رقبہ کم ہونے پر بھی اس کے من حیث الصوبہ امتیاز و اقتدار میں کوئی خلل نہیں پڑا۔ اس کا نام بعض اور اقطاع ہند کی طرح صفحۂ تاریخ سے کسی وقت غائب نہیں ہوا، نہ وہ کسی دوسرے صوبے کا تابع حکومت ہوا۔

انگریزی حکومت کی ابتدا میں اودھ گو برائے نام صرف ایک صوبہ سلطنت مغلیہ کا تھا لیکن دراصل وہ ایک بااختیار اور طاقتور سلطنت تھی اور اس کی یہ حیثیت غدر کے پہلے انگلستان کے ارباب حل و عقد نے باقاعدہ طور پر تسلیم کرلی تھی۔ پھر یہ سلطنت غدر کے بعد ایک منفرد صوبے کی حیثیت سے انگریزی حکومت ہند کے زیر انتظام آئی اور تقریباً ربع صدی تک ایک مخصوص چیف کمشنر کے زیر حکومت رہی

۱۸۷۷ء میں گورنمنٹ ہند کو انتظامی ضروریات کی بنیاد پر یہ مناسب معلوم ہوا کہ یہ علیحدہ عہدہ چیف کمشنر کا تخفیف میں لایا جائے، اور اس کا الحاق صوبۂ ملحق "ممالک مغربی و شمالی" کے لفٹنٹ گورنر کے ساتھ کردیا جائے، اور دونوں صوبوں کا عاملانہ اسٹاف مشترک ہو جائے۔ باوجودیکہ اس تغیر انتظام سے اودھ کی تخصیصی حالت میں کوئی فرق نہیں پیدا ہوتا تھا۔ جو فرق ہوا تھا وہ صرف یہ تھا کہ اس کا

حاکم اعلیٰ جس کا لقب اب بھی چیف کمشنر رہا تھا، بجائے اسکے کہ صرف اُسی کی حکومت کا ذمہ دار ہو، اُس صوبے کی حکومت کا بھی ذمہ دار تھا۔ اُس کی عدالتیں اور اُس کے قوانین اب بھی دوسرے صوبے کی عدالتوں اور قوانین سے علیحدہ قائم رہے تھے۔ تاہم اس تغیر کے خلاف اودھ کے مقتدر اور سربرآوردہ باشندوں نے شدید صدائے احتجاج بلند کی اور ایک عرصے تک تعلقداران اودھ بسربراہی راجہ سر امیر حسن خاں صاحب مرحوم تعلقدار محمود آباد واویلا مچاتے رہے۔ اس موقع پر یہ امر قابل ذکر ہے کہ راجہ صاحب مرحوم کی قابلیت اور اخلاقی جسارت کی قابل رشک شہرت کا جو سکہ ملک پر بیٹھا اُس کا سب سے بڑا ذریعہ اُن کا اس اختلاف ہی کا کارنامہ تھا۔ اس مخالف گروہ کے اختلاف کا لب لباب یہ تھا کہ ممالک مغربی و شمالی کے لفٹنٹ گورنر کے زیر حکومت آنے سے اودھ کی تخصیصی حالت میں فرق آجائے گا اور اُن کی نئی گورنمنٹ، اُن کی ضروریات، اُنکے مدارج اور اُنکے مفاد کو اُسی حد تک ملحوظ نہ رکھ سکے گی جتنا کہ اُن کا مخصوص حکمراں رکھتا تھا۔ نیز دوسرے صوبے کے عامل افسر اسکے مختلف حالات کے آثر اور اودھ کی روایات سے ناواقفیت کی وجہ سے باشندگان اودھ کے حقوق و امتیازات کا کامل احترام نہ کریں گے۔ گورنمنٹ کی طرف سے ان وسوسوں کے متعلق پورا اطمینان دلایا گیا اور کہا گیا کہ ممالک مغربی و شمالی کے لفٹنٹ گورنر کا یہ فرض ہوگا کہ اودھ کے چیف کمشنر کی حیثیت سے وہ اودھ کے خاص حالات کو ہر وقت پیش نظر رکھے اور اودھ کی روایات، قوانین اور حقوق کا اب بھی ویسا ہی لحاظ قائم رکھے جیسا پیشتر تھا۔ چنانچہ درحقیقت بیشتر ایسا ہی ہوا۔ حکمران مشترک کی عام طور پر اودھ کی طرف خاص توجہ رہی۔ لکھنؤ الہ آباد سے زیادہ اسکا مستقر رہا۔ معاملات حکومت میں باشندگان اودھ کی خواہشوں اور رایوں کو خاص قدرت دی جاتی رہی۔ اُنکے تخصیصی انسٹیٹیوشنوں میں کوئی مداخلت نہیں کی گئی۔ اُنکے قانون اور عدالتیں بدستور علیحدہ رہیں۔

پچیس سال کے بعد پھر ایک تغیر ہوا۔ شمال و مغرب میں ایک نیا صوبہ قائم ہونے کی وجہ سے اس قطعۂ حکومت کے نام میں تغیر کی ضرورت لاحق ہوئی اور وہ بجائے "ممالک مغربی و شمالی اودھ" کے "صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ" کہا جانے لگا۔ اور اسی کے ساتھ چیف کمشنر کا لقب مسترد ہو کر دونوں صوبوں کے مشترک حکمراں کا لقب صرف لفٹنٹ گورنر ہی رہا۔ یہ صرف نام کا تغیر تھا۔ حالات انتظام میں اس سے کوئی فرق پیدا نہیں ہوا۔ دونوں صوبوں کا صدر حکومت اب بھی اُن کا مشترک گورنر رہا۔ اُسی کو لامحالہ دونوں صوبوں کے حقوق اور ضروریات کا یکساں خیال رہا۔ اور اُن میں تصادم کی حالت میں وہ دونوں کی بہبودی کو بغیر جانبداری مد نظر رکھتا رہا۔

لیکن اب کیا ہوگا۔ ہندوستان کے طرز حکومت کا کلیتاً بدل جانا طے شدہ امر ہے۔ اب تک حکومت کے درجہ بدرجہ تنخواہ دار افسر تھے، جنکا طبقہ عالی سلمہ قابلیت کا آزمودہ کارگروہ تھا جو گرد وپیش کے اثرات سے اس وجہ سے کلیتاً محفوظ تھا کہ یہ اثرات اُسکے افراد کے منصب میں کوئی خلل نہیں ڈال سکتے تھے۔ یہ افسر امور حکومت میں جو کچھ مناسب سمجھتے تھے کرتے تھے۔ باشندگان ملک کو اُن پر کوئی اختیار نہ تھا اور اس وجہ سے باشندگان ملک کو حکومت سے براہ راست کوئی تعلق نہ تھا۔ ملک ایک مدت سے اس طریق عمل کو ناپسند کرنے لگا تھا۔ وہ خود اختیاری حکومت کا مدعی تھا۔ یعنی یہ کہ اصل حکومت نمایندگانِ ملک کے ہاتھ میں آئے اور تنخواہ دار افسر اُنکے تابع فرمان ہوں۔ ایک عرصے کی جد و جہد کے بعد اب یہ طے پاگیا ہے کہ کم سے کم ہمارے صوبہ جات کو یہ حکومت خود اختیاری جلد سے جلد حاصل ہو جائیگی۔ مرکز حکومت ہر صوبے کی قانون ساز کاؤنسل ہوگی جس میں باشندگان صوبہ کے نمایندے داخل ہونگے اور ممبران گورنمنٹ کا انتخاب یہ نمایندے کریں گے۔ تمام اندرونی معاملات ان کاؤنسلوں کے سپرد ہونگے اور کثرت آرا سے طے پایا کرینگے۔ یہی طریق حکومت بیشتر ملکوں میں رائج ہے اور ہندوستان کا تعلیم یافتہ طبقہ اپنے ملک کی تمام اصلاحوں سے اس پولٹیکل اصلاح کو مقدم سمجھتا ہے۔

اب اہم سوال یہ ہے کہ کیا اودھ کو بھی اپنی موجودہ حالتِ اشتراک پر قائم رہکر یہ مقبول عام اور دلخواہ طرز حکومت حاصل ہو سکتا ہے۔ اس طرز کے مقبول عام اور دلخواہ ہونے کا ثبوت اس سے بہتر کیا نہیں ہے کہ نہ صرف کُل ہندوستان اُسکے حصول کے افکار میں شوریدہ اور بے چین ہے بلکہ اُسکے مختلف اقطاع نے مثلاً سندھ جو ایک مدت سے بمبئی پریسیڈنسی کا ایک جزو تھا، اڑیسہ جو تین صوبوں میں ایک مدت سے تقسیم تھا، اور نیا صوبۂ مغربی و شمالی جو پنجاب کو کاٹ کے بنایا گیا ہے اُس سے بجائے خود مستفید ہونے کی غرض سے اپنی علیحدہ حیثیت قائم ہونا گورنمنٹ سے طے کر چکا ہے۔ لیکن اودھ خاموش ہے۔ کیا اُسکو حکومت خود اختیاری کی ضرورت نہیں یا خواہش نہیں، یا وہ سمجھتا ہے کہ وہ اسکو اسکی موجودہ ہی صورت میں حاصل ہو جائے گی؟ اس کی موجودہ صورت کیا ہے؟ اُس کی اور اس کے شامل صوبے کی واضع قانون کاؤنسل مشترک ہے۔ اُس میں دونوں صوبوں کے ممبروں کی نسبت اُسکے خلاف تقریباً تہائی اور ایک کی ہے۔ کاؤنسلوں کے معاملات کثرت رائے پر طے پاتے ہیں۔ اس لیے کسی معاملے میں دونوں صوبوں کے اختلاف پر اُسکی کامیابی کیونکر خیال میں لائی جا سکتی ہے۔ مثلاً اگر یہ سوال کبھی نسبت اُٹھے کہ اُس کا چیف کورٹ فضول اسراف ہے، الٰہ آباد کا ہائیکورٹ اُس کی ضرورت پوری کر سکتا ہے۔ یا یہ کہ لکھنؤ بیجا طور پر دار الحکومت ہے، الٰہ آباد کا حق فائق ہے، تو کیا تمام اودھ ہم آواز ہونے پر بھی امید

مجلس قانون میں بازی جیت لے جانے کی عقلاً اُمید کرسکتا ہے؟ ایک چھوٹی سی مثال اسکی کہ نئے طریقے کی حکومت میں اودھ کو کیا توقع رکھنی چاہیے' اسوقت بھی ہمارے سامنے موجود ہے۔ حال کے کانسٹیٹیوشن کے تحت ممبران گورنمنٹ کا انتخاب اور تقرر صرف گورنر کے ہاتھ میں ہے اور گورنر ایک غیر جانبدار افسر ہے جس کا فرض اپنے ماتحت دونوں صوبوں کے حقوق کا یکساں خیال رکھنا ہے۔ تاہم گو ان صوبہ جات کی گورنمنٹ علاوہ گورنر کے چار ممبروں پر مشتمل ہے مگر ایک عرصے سے ان میں سے ایک بھی اودھ کا باشندہ نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ آیندہ نمایندگان اودھ کے ووٹوں کی ضرورت اس کی نظر اندازی کو بالکل اس حد تک پہونچنے دے لیکن کیا اس میں کسی شبہ کی گنجایش ہے کہ نئی حکومت میں یہ صوبہ عموماً بے بس ہوگا اور جبکہ صوبہ آگرہ کی قوت بمقابلہ اُسکے کم سے کم چوگنی زیادہ ہوگی اور آگرہ کی ضروریات گورنمنٹ کی توجہ اور اعانت کی طالب و مستحق اسی تناسب سے بیشتر ہونگی اور اودھ کے باشندوں کو ہر شعبۂ زندگی میں اسی تناسب سے دوسرے صوبے کے باشندوں سے مقابلہ کرنا ہوگا تو غریب خالص زراعت پیشہ اودھ کا کیا حشر ہوگا؟

لیکن بین الصوبہ اختلافی معاملات سے قطع نظر کرکے کیا حکومت خود اختیاری فی نفسہ ایسی چیز نہیں ہے کہ اُسکے حاصل کرنے کی کوشش کی جائے؟ کیا باشندگان سندھ اور باشندگان اُڑیسہ کو جنون ہے کہ وہ اُن صوبوں سے جن میں وہ پیوست ہوگئے تھے علحدہ ہوکر اپنی ذاتی حیثیت اور اپنا ذاتی اختیار و احترام قائم کرنے اور یہ انمول حق حاصل کرنے کے لیے جان لڑائے ہوئے ہیں؟ کیا اگر اُن کی موجودہ حیثیت قائم رہی تو اُنکے لیے اودھ سے زیادہ کوئی خطرہ متصور ہے؟ یہ قطعات اودھ کی طرح اسوقت بجاے خود ایک صوبہ نہیں ہیں۔ وہ رقبے میں اودھ سے کہیں کم ہیں۔ ان کا اور اودھ کا آمدنی میں کوئی مقابلہ نہیں ہے۔ لیکن وہ اپنے حق کے واسطے' اپنے مرتبے کے واسطے' اپنی حکومت پر اختیار کے واسطے اور دوسرے خود اختیار صوبوں سے پیچھے نہ رہنے کے واسطے زبردست لڑائی لڑ رہے ہیں۔ اودھ قانع اور بے حس بیٹھا ہے اور وقت ہاتھ سے نکلا جارہا ہے۔

اودھ کا رقبہ تقریباً آئرش فری اسٹیٹ کے برابر ہے۔ اُسکی آبادی سوا کرور سے اوپر اور آمدنی پانچ کرور سے زیادہ ہے۔ کیا ایسا ملک حکومت خود اختیاری کے شایاں نہیں سمجھا جاسکتا؟ اُسکو درحقیقت ایسی علحدہ حکومت کی ضرورت ہے۔ وہ ہر قسم کی ترقی میں نہ صرف صوبہ آگرہ سے بلکہ بیشتر دوسرے صوبوں سے بہت پیچھے ہے۔ اُسکے ہر طبقے کی ازدیاد فلاح و بہبود کے واسطے اُس کی گورنمنٹ کی خاص توجہ اور کوشش درکار ہوگی اور یہ توجہ اور کوشش اُس کو ایسی گورنمنٹ سے حاصل ہونا ممکن نہیں ہے جس پر اس کے ساتھ ایک دوسرے صوبے کے بھی فرایض انتظام ہوں جو ہر اعتبار سے اُس سے بہت زیادہ

پڑا ہے۔ اس صورت کا یہ نتیجہ ناگزیر ہے کہ اُس کی تمام مخصوص ضروریات پس پشت پڑتی رہیں اور اُس کی حالت بد سے بدتر ہوتی جائے۔

ہم نادانستہ اُن حالات سے فطرتاً اس قدر متاثر ہوتے ہیں جنکے ہم عادی رہے ہیں کہ باوصف تغیر زمانہ اُن کو اپنے خیال سے دور کرنا ہمارے لیے دشوار ہوتا ہے۔ ہم بڑے صوبوں کو مفید سمجھنے کے عادی ہو رہے ہیں۔ موجودہ طرز حکومت میں صوبوں کا بڑا ہونا یقیناً مفید حکومت تھا۔ اُن میں بڑی بڑی تنخواہوں کے افسروں کی زیادہ گنجائش ہوتی تھی اور اُنکی ترقیوں کے زیادہ دروازے کھل سکتے تھے۔ حکومت آگرہ کے ساتھ حکومت اودھ کے الحاق کی ایک بڑی ضرورت یہی تھی۔ لیکن وہ اصول جمہوری حکومت پر حاوی نہیں ہو سکتا۔ برعکس اسکے ایسی حکومت اُسی قدر زیادہ موثر اور مفید ہوگی جس قدر ایک مناسب حد تک زیادہ چھوٹے رقبے پر وہ قائم ہو۔ مثلاً آگرہ اور اودھ کو ایک صوبہ قرار دے کر اُس کی کانسٹی ٹیونسیاں ایسی چھوٹی بنانا ناقابل عمل ہے کہ ووٹروں اور ممبروں کے درمیان معقول واقفیت، حصول اعتماد یا تبادلۂ خیالات کا کافی موقع ملے۔ لیکن اودھ کی کاؤنسل اگر علیحدہ ہو تو یہ آسانی سے ممکن ہے۔ اُس کی ہر تحصیل ایک کانسٹی ٹیونسی ہو اور اُسکے ہر باشندے کو ووٹ کا حق دیا جائے جسکے معنی اصل جمہوریت ہوں۔ ہر ممبر اپنے ووٹروں کا سچا نمائندہ رہے، اُنکے حالات و ضروریات سے واقف اور اُنکے زیر اثر رہے، اور ملکی معاملات میں ووٹروں کی دلچسپی اور آگاہی مقابلتاً جلد ترقی کر جائے۔ ایک معلم دس طالبعلموں کو بمقابلہ سو طالبعلموں کے بہت جلد اور مکمل تعلیم دے سکتا ہے۔

ایک صاحب نے اس مسئلہ پر بحث میں یہ عجیب بات فرمائی کہ اودھ کی آگرہ سے علیحدگی ہندوستان کی نیشنلزم کے مقصد کے خلاف ہے۔ اس دلیل کے اس کے سوا اور کیا معنی ہو سکتے ہیں کہ سارے ملک کا انتظام اور اس کی تمام باشندوں کی فلاح کی دیکھ بھال صرف ایک دلی سے انجام پانا مفید و مناسب ہوگا۔ ان صاحب نے بظاہر اس پر غور نہیں کیا کہ امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا وغیرہ سب مقامی انتظام کی ضرورت سے مختلف حصوں میں تقسیم ہیں لیکن آج تک کسی نے اُنکے باشندوں کے ایک نیشن ہونے یا ان کے احساس نیشنلزم میں شبہہ نہیں کیا ہے۔ اور اگر ہندوستان کی شامت سے اس کی کوئی خاص حالت ایسی متعلق ہے تو ظاہر ہے کہ پہلے اُس کے تمام اور صوبوں کی حکومت کو مسترد کر دینا چاہیے تب اودھ کی علیحدگی کی خواہش یا ضرورت پر اعتراض کا موقع ہو سکتا ہے۔

بعض حضرات یہ پوچھتے ہیں کہ اودھ اپنی علیحدہ حکومت کا صرف بھی برداشت کر سکتا ہے؟ یہ بھی عجیب سوال ہے۔ ہمارا جواب تو اسکا یہ سوالات ہیں کہ کیا حکومت خود اختیاری کسی قیمت پر بھی گراں

قرار دی جا سکتی ہے؟ کیا ہماری آنکھوں کے سامنے دوسرے ملک والے ایسی حکومت کے واسطے صرف دولت ہی نہیں لٹا رہے ہیں؟ اس کی تصدیق نہیں کرتے ہیں؟ کیا خود ہمارا ملک ایسی حکومت کے حصول کے لیے روپیہ آنہ پائی کا حساب لگا رہا ہے؟ اور کیا ہمارا صوبہ سندھ اور اڑیسہ اور صوبۂ شمال و مغرب سے بھی زیادہ بے استطاعت یا پست ہمت ہے کہ وہ ایک نعمت پر صرف سے ڈر رہا ہے درآنحالیکہ یہ اقطاع اس سے نہیں ڈرتے؟ یا کیا اودھ کا درحقیقت دیوالہ نکلا رہتا تھا جب وہ نہ صرف عہد شاہی میں بلکہ انگریزی دور میں بھی اپنی علحدہ حکومت کے مصارف کا تمام و کمال خود کفیل تھا؟ دوسرا جواب یہ ہے کہ حکومت خود اختیاری کے معنی یہ ہیں کہ اختیارات حکومت اپنے ہاتھ میں آئیں۔ اس معاملہ کا پھر وہی حال ہے کہ ان خیالات سے گریز آسان نہیں ہے جنکے ہم عادی ہو رہے ہیں۔ ہمارے موجودہ انتظامی مصارف دوسروں کے پیدا کیے ہوئے ہیں اور دوسرے حالات میں پیدا ہوئے ہیں انکے بچائے کا ہمیشہ برقرار رہنا ہرگز ضروری نہیں ہے۔ حالات سابقہ میں کفایت کا لحاظ کبھی ایک شمہ برابر بھی جزو حکومت نہیں رہا۔ روپیہ بافراط مہیا تھا اور وہ بے دریغ صرف ہوتا تھا۔ بیرونی اہلکار کم تنخواہوں پر مل نہیں سکتے تھے اور انکی تعداد میں کمی بیشی ہمارے اختیار کی چیز نہ تھی۔ خود اختیار اودھ کو نہ اتنی تعداد میں بڑے اہلکاروں کی ضرورت ہو سکتی ہے اور نہ اتنے بڑے بڑے درماہوں کے اہلکاروں کی۔ بلاشبہ وہ علحدہ حکومت اپنے موجودہ صرف سے کم میں چلا سکتا ہے۔ آگرہ میں شامل رہ کر اس پر اس کی ضرورت سے زیادہ صرف کا بار پڑنا ممکن ہے۔ اس لیے کہ یہ صرف خود اسکے اختیار سے باہر ہوگا۔ وہ آگرہ کی کثرت آرا کا مجبوراً تابع ہوگا۔ برخلاف اسکے علحدہ ہوکر اس کو کامل اختیار حاصل ہوگا کہ وہ اپنے مخارج اپنے مداخل کے اندر رکھے یا ایک انگریزی مثل کے الفاظ میں یوں کہیے کہ اپنا کوٹ اپنے کپڑے کے مطابق قطع کرے۔

حقیقت یہ ہے کہ سب عذرات بے اصل عذرات ہیں۔ جو ایک مشکل اس معاملہ میں اودھ کی ہے وہ صرف یہ ہے کہ اودھ مردہ ہے یا مر رہا ہے۔ وہ قحط الرجال کے مہلک مرض میں مبتلا ہے۔ اسکے باشندوں کے جذبات سے اس کی خدمت کا شوق مفقود ہو گیا ہے۔ انکو اپنے ذاتی افکار اور ترددات سے فرصت نہیں ہے۔ ان میں ہمت نہیں، جوش نہیں، تخیل نہیں، دوراندیشی نہیں اور ملکی معاملات میں سربراہی کی قابلیت نہیں۔ اس سے بڑھ کر اودھ کی اور کیا بدقسمتی ہو سکتی ہے کہ درانحالیکہ دوسرے اقطاع ملک ملک کے ایسے عملی فدائیوں، خدمتگزاروں اور رہنماؤں سے مالا مال ہو رہے ہیں جن کی قابلیتوں اور خدمتوں کے ڈنکے چار دانگ عالم میں بج رہے ہیں ہمارا یہ قدیم مردم خیز خطہ کوئی ایک مثال بھی انکے برابر کی پیش کرنے سے قاصر ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ہر کس از دست غیر نالہ کند سعدی از دست خویشتن فریاد

فارسی کے دو لاینحل عُقدے

(جناب مولانا مصطفےٰ حسن علوی صاحب فرآبادی ایم اے، فاضل دیوبند۔ معلم لکھنؤ یونیورسٹی)

آج اگر یہ سوال اُٹھایا جائے کہ فتح اسلام کے بعد موجودہ فارسی زبان کی قدیم ترین یا سب سے پہلی کتاب کون تھی، اُسکے مصنف کا کیا نام تھا اور وہ کس فن میں لکھی گئی تو ممکن ہے کہ قیاس وتخمین کی آمیزش سے کچھ نہ کچھ اس کا جواب دیا جا سکے اس لیے کہ اہل عرب کے ایران پر طویل و مدید تسلط و اقتدار کے بعد نہ ہمارے ہاتھ میں وسائل رہے اور نہ ہم کو وسائط پر قابو حاصل ہے کہ حتمی و یقینی طور پر ہم کسی کتاب کے متعلق اس کے قدیم ترین ہونے کا ثبوت دے سکیں۔ لیکن اگر سوال کے ساتھ ایک قید احترازی بڑھا کر سوال کی شکل یوں بدل دی جائے کہ موجودہ فارسی کی قدیم ترین کتاب کون موجود ہے، تو جواب فی الجملہ آسان ہوگا کہ ایک کتاب تو طبری کی تاریخ کبیر کا ترجمہ ہے، جسکو بلعمی وزیر منصور بن نوح سامانی نے بحکم شاہ ۳۵۲ھ میں یا بالفاظ دیگر اصل کتاب تالیف ہونے کے پچاس سال بعد فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔ اور دوسری کتاب اسی طبری کی تفسیر کبیر کا ترجمہ ہے جو اسی مذکورۃ الصدر بادشاہ کے حکم سے ۳۵۰ھ اور ۳۶۶ھ کے درمیانی سنین میں کیا گیا۔ اسکا ایک نسخہ تو پیرس کی قومی لائبریری میں ہے اور دوسرا برٹش میوزیم کے کتبخانہ میں۔ لیکن افسوس ہے کہ دونوں ناقص ہیں۔ علامہ محمد قزوینی نے مرزبان نامہ کے مقدمہ میں اسکے دیباچہ سے کچھ اقتباس بھی نقل کیا ہے۔ تیسرا نام کتاب الابنیہ عن حقائق الادویہ، مولفہ ابو منصور موفق کا لیا جاتا ہے، جو اسی سابق الذکر عہد سلطنت میں تالیف کی گئی تھی۔ اس کا ایک نسخہ علی ابن احمد طوسی اسدی صاحب گرشاسپ نامہ و فرہنگ فارسی کے ہاتھ کا لکھا ہوا وائنا[۱] کی لائبریری میں محفوظ ہے لیکن اسکا رسم الخط یا تو کوفی ہے یا خط کوفی سے بالکل ملتا جلتا ہوا۔

ہر سہ کتب مذکورہ میں سے تاریخ طبری کے ترجمہ کے متعلق تو تعین تاریخ ممکن ہے کہ ۳۵۲ھ میں کیا گیا، لیکن بقیہ ہر دو کتب کے باب میں کسی تاریخ کی تخصیص یا کسی سن کی تحدید نہ ہونے سے ان ہر سہ کتب میں بھی کسی کے متعلق سابق یا مسبوق ہونے کا حکم قطعاً نہیں لگایا جا سکتا۔ قطع نظر اسکے یہ جواب فی الجملہ مسکت و مفہم بھی نہیں۔ اس لیے کہ اگر ہم کو کسی کتاب کی موجودگی کا علم نہ ہو یا اگر کسی نسخہ تک ہماری دست رس نہ ہوئی ہو تو یہ دلیل اسکے عدم وجود کی نہیں قرار دی جا سکتی۔ ممکن ہے کوئی اور کتاب

لہ تاریخ ادبیات ایران براؤن ص [illegible]

زاویۂ خمول میں پڑی رہنے کے باعث منصۂ شہود پر نہ آسکی ہو۔ حکومتوں کا ردوبدل، سلطنتوں کا انقلاب تیموری قتل و نہب اور نادری کشت و خون نے جب آسمان کے طبق الٹ دیے، زمین کے تختے پلٹ دیے، تو کیا استعجاب اور اچنبھے کی بات ہے کہ ایران کے صحیفے اور کتابیں تتر بتر ہو گئی ہوں اور مشرق کی چیزیں مغرب میں اور عجم کی چیزیں عرب میں پہنچ گئی ہوں۔ پھر اگر ذی علم و قدردانوں کے ہاتھ لگیں تو جان سے زائد قیمتی سمجھ کر انکا تحفظ کیا گیا اور اگر نااہل اور جُہال کے قبضہ میں آپڑیں تو ممکن ہے کہ ضائع ہو گئی ہوں یا کس مپرسی میں پڑی ہوں۔ دُور کیوں جائیے، بڑی بڑی بیش قیمت اور نادر کتابیں آج ہندوستان میں بھی بنیے بقالوں کے یہاں ردی کے ساتھ تُل کر بکتی ہیں اور عطاروں کے یہاں سے پڑیاں باندھ کر آتی ہیں۔ اور ابھی سیکڑوں نادرۂ روزگار جلدیں بے قدری اور حقیقت ناشناسی کی وجہ سے گھروں کے طاقچوں اور مچانوں پر رکھی ہونگی۔

یہی تینوں کتابیں، جنکا تذکرہ کیا گیا، ادبیاتِ ایران کے عام مورخین سے لیکر یورپ کے مستشرقین تک جنکی اطلاعات کثرت و سائل کے باعث زائد سمجھی جاتی ہیں سب ہی کے پیش نظر ہیں اور وہ انھیں کو تقدم زمانی کے شرف سے مشرف کرتے ہیں۔ لیکن اسی سلسلہ میں ایک چیز اور بھی سامنے آتی ہے جس پر بتصریح علامہ قزوینی "کتاب" کے لفظ کا اطلاق ہر چند کہ زیبا نہیں تاہم اسے نثر فارسی کا ایک قابل اعتنا نمونہ کہا جا سکتا ہے۔

"ہر چند "کتاب" نمی توان آنرا نامید ولے در ہر صورت کلیتہ متعلق بہ نثر فارسی است"[2]

وہ کیا چیز ہے؟ وہ شاہنامۂ فردوسی کا قدیم دیباچہ ہے جو سلطان بایسنغر نبیرہ امیر تیمور کے حکم سے لکھا گیا تھا اور بعض قدیم شاہناموں کے نسخوں کے ساتھ جو پیرس، لندن، کیمبرج اور برلن میں موجود ہیں وہ بھی ملحق ہے۔ یہ مقدمہ چونکہ بعینہ وہی ہے جو اُس شاہنامۂ نثری کے ساتھ منسلک تھا جسے ابو منصور محمد بن عبد الرزاق طوسی نے ۳۴۶ھ میں تالیف کیا تھا اور جسے کہا جاتا ہے کہ فردوسی نے آکر نظم کر دیا لہذا اگر اسکو سبقت زمانی کا فخر ہو تو بیجا نہیں ہے۔ بہرکیف یہ اس وقت تک کی تحقیقات ہیں اسے آخری اور قطعی فیصلہ نہیں کہا جا سکتا۔ یہ مسئلہ کتابوں کا ہے اور جس طرح یہ قطعی طور پر لاینحل ہے اسی طرح اسکی عقدہ کشائی بھی از بس دشوار ہے کہ اسلام کے بعد فارسی زبان میں سب سے پہلے کون شعر کہا گیا اور کس نے کہا۔ اس باب میں بھی مختلف محققین کی مختلف تحقیقاتیں ہیں۔ اور مختلف ہونے کی بنا پر مختلف یادداشتیں؛ بالاتفاق حتمی فیصلہ ہو ہی نہ سکا۔ علامہ شبلی نعمانی شعر العجم جلد ا صفحہ ۱۴ پر لکھتے ہیں کہ

---

[1] تاریخ ادبیات ایران [2] قزوینی۔

"مامون الرشید ایک مدت تک خراسان میں رہا اور غالباً فارسی سے حرف آشنا ہوگیا تھا۔ عباس مروزی نے ایک قصیدہ فارسی میں لکھا اور مامون الرشید نے اسکے صلہ میں ہزار دینار سالانہ مقرر کردیے۔ ارباب تذکرہ لکھتے ہیں کہ" اسلامی عہد میں فارسی شاعری کا یہ پہلا حرف تہجی تھا"
سب سے پہلے اس تحقیق کو پیش کرنے والا صاحب تذکرہ لباب الالباب[۱] عوفی ہے چنانچہ علامہ شبلی نے شعرالعجم جلد چہارم صفحہ ۹۲ و ۹۳ پر جہاں اس قصہ کو لکھا ہے وہاں تصریح کردی ہے۔ مسٹر براؤن نے بھی اس واقعہ کو Literary History of Persia کے ص۱۳ جلد ا میں عوفی یزدی ہی کے تذکرہ کے حوالہ کے ساتھ نقل کیا ہے۔

مجمع الفصحا نے اپنی کتاب کی جلد اول صفحہ ۶۳ میں اسکو سنہ ۱۷۰ھ کے واقعات میں سے لکھا ہے (جسے مسامحت پر محمول کیا جائے گا اس لیے کہ ہارون الرشید نے سنہ ۱۸۳ھ میں مملکت خراسان وغیرہ کو مامون کے حوالہ کیا اور خود مامون سنہ ۱۹۳ھ میں ہارون کی وفات کے بعد مرو پہنچا ہے) لیکن عوفی نے لباب الالباب میں سنہ ۱۹۳ھ ہجری کے ذیل میں بیان کیا ہے کہ ابوالعباس مروزی نے مامون کی مدح میں جب وہ مرو گیا تو ایک قصیدہ لکھ کر پیش کیا جسکے چند اشعار یہ ہیں[۲]

ای رسانیدہ بدولت فرق خود تا فرقدین ‌ ‌ گسترانیدہ بجود و فضل در عالم یدین
مر خلافت را تو شایستہ چو مردم دیدہ را ‌ ‌ دین یزداں را تو بایستہ چو رخ را ہر دو عین
کس بدیں منوال پیش از من چنیں شعری نگفت ‌ ‌ مر زبان پارسی را ہست با ایں نوع بین
لیک زاں گفتم من ایں مدحت ترا تا ایں لغت ‌ ‌ گیرد از مدح و ثنائے حضرت تو زیب و زین

لیکن عوفی کی اس تصریح پر روایتاً و درایتاً بہت کچھ رد و قدح کی جا سکتی ہے اور اسکے قدیم ترین شعر فارسی ہونے کے خلاف مختلف حیثیات سے استدلالات قائم کیے جا سکتے ہیں۔ روایتاً تو عوفی کے قول کی قدر و قیمت یوں گھٹتی ہے کہ تذکرہ لباب الالباب سنہ ۶۱۸ھ میں تالیف ہوا ہے یعنی بہ الفاظ دیگر یوں کہیں کہ عہد مامون الرشید کے تقریباً ۴۰۰ سال کے بعد۔ اب سوال یہ ہوتا ہے کہ عوفی سے قبل بھی رشید الدین وطواط نے حدائق السحر لکھی، چہار مقالہ نظامی سمرقندی نے تالیف کیا، کتاب معاییر اشعار العجم شمس قیس رازی نے ترتیب دی لیکن کسی نے بھی اس واقعہ کی طرف اشارہ نہیں کیا۔ عوفی کی باوجود بُعدِ زمانہ کے تصریح اور ان تمام تذکرہ نویسوں کا سکوت عوفی کی نقل پر اعتماد کو یقیناً گھٹا دیتا ہے۔ اس لیے کہ اگر یہ حکایت

---

[۱] مصنف ساتویں صدی ہجری میں تھا اسنے اپنے عہد تک کے حالات لکھے ہیں اور اب پروفیسر براؤن کے تحفہ تصحیح کے بعد طبع ہوگیا ہے۔ [۲] اسکے صرف چار اشعار موجود ہیں۔ شعرالعجم ص۱۱۱ جلد اول۔

صحیح ہوتی تو یہ نسبتاً قریبی عہد کے تذکرہ نویس اس کا ذکر ضرور ہی کرتے - علاوہ اسکے یہ ایک حقیقت ہے کہ قدیم شعرائے ایران نے جو کچھ لکھا اُس میں عروض عرب کی تقلید ہرگز نہیں کی - انکی اپنی بحریں تھیں اور انکا اپنا عروض ہوگا - خلیل ابن احمد فراہیدی نے جب عروض عرب کو مدون کیا اور اہل ایران اس سے واقف ہوے اُسوقت البتہ اُنھوں نے اشعار عربی عروض کی مناسبت میں لکھنا شروع کیے - ابتدا میں تو آنکھیں بند کرکے جو کچھ لکھا وہ اوزان عرب ہی کے تحت میں لکھا لیکن بعد چندے اُن سے نفور پیدا ہونا شروع ہوگیا - اور اب اُنھوں نے اس میں اپنے ذوق اور طبیعت کے مطابق تصرفات کرنا شروع کر دیے اور جو بحریں اُنکے انداز طبیعت کے خلاف تھیں اُنکو قطعاً ترک کر دیا - مثلاً عرب کی طویل و مدید بحروں میں آج فارسی کا کوئی شعر بھی نہیں ملتا - یہ ہے کیا؟ اس میں تصرفات اور زحافات بھی اُنکی طبیعتوں کے مناسب نہ تھے ۔ رہ گئیں باقی بحریں اس میں زحافات اور تغیرات پیدا کرکے اُنکو اپنے ذوق کے موافق بنا لیا - لہذا اگر یہ کہا جائے کہ اصل اصول تو ان بحروں کی عربی ہے لیکن زحافات کے بعد وہ ایران کی مخصوص بحریں قرار دے دی گئیں حتیٰ کہ ان پر عرب شعرائے شعر نہیں لکھے تو بیجا نہیں - مثلاً بحور رمل و ہزج اہل عرب کے یہاں تو مسدس مستعمل ہوتی ہیں لیکن ایرانیوں نے اپنے ذوق طبع کے خاطر اس کو مثمن کرلیا - اب اُس ابو العباس کے قصیدہ کو پڑھیے تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ بحر رمل[۵] مثمن مقصور میں کہا گیا ہے - اسکے معنی ظاہر میں یہ ہیں کہ پہلے تو بحر عرب یعنی مسدس کی ایران میں اشاعت ہوئی ہو جسکے لیے عادتاً عام طور پر ایک کافی مدت کی ضرورت پڑتی ہے اسکے بعد اہل ایران نے اس میں خاطر خواہ تصرف بھی کیا ہو اسکے لیے بھی کچھ کم زمانہ درکار نہیں ہوتا - اب اسکے ایک اور پہلو پر نظر ڈالیے کہ یہ واقعہ ہے کہ خلیل ابن احمد واضع عروض عرب نے ۱۷۵ھ میں[۶] وفات پائی اور اس قصیدہ کے لکھنے اور پیش کرنے کا واقعہ ۱۹۳ھ کا ہے لہذا یہ بات بظاہر مستبعد ہے کہ صرف ۱۸ سال کی مدت میں اتنے مرحلے طے ہوگئے ہوں کہ ایران میں عروض عرب کی اشاعت کافی ہوئی ہو اور اہل ایران نے پہلے اسکی تقلید کی اسکے بعد اس میں اپنے مطبوع خاطر تغیرات کیے اور انکی مدد سے اپنی مخصوص بحریں ایجاد کرلی ہوں - بظاہر تو وجدان سلیم اسکو باور کرنے سے قاصر ہے کہ مرو میں بیٹھ کر جو مرکز علوم عربیہ سے دور دراز واقع ہے ایک ایرانی شاعر ایسے زور شور کا قصیدہ لکھ لے - علاوہ اسکے عربی کلمات اور الفاظ کی بہتات جو اس قصیدہ میں پائی جاتی ہے وہ بھی واقعہ کی اصلیت کو ضعف پہونچاتی ہے - چنانچہ علامۂ قزوینی لکھتے ہیں :-

۵ فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلات -

۶ دائرۃ المعارف الاسلامیہ ص ۸۸۶ جلد ۲

"با وجود آنکہ دراں زمانہا یعنی دو بست سال قبل از فردوسی ہنوز زبان عربی ایں قدر تاراج بر زبان فارسی نکردہ بود و عناصر عربی در عبارات فارسی لابد بغایت اندک بودہ است خود قرینہ دیگرے است کہ ایں قصیدہ منسوبہ مجعول است و مدتے طویل بعد از عصر مامون ساختہ شدہ است۔"

پروفیسر براؤن نے بھی اپنی کتاب Literary History of Persia کی جلد اول صفحہ ۱۳ و ۳۴۰ و ۴۵۲ میں اس واقعہ اور انتساب کی تردید کی ہے لیکن علامہ شبلی مرحوم نے شعر العجم جلد اول صفحہ ۱۱۵ پر اس قصیدہ میں عربی الفاظ کی کثرت کو ایک امر کی تائید میں مستدل قرار دیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں[تہ]

"ایران میں ابتدا ہی سے عربی نہایت شدت سے مخلوط ہو گئی تھی عباس مروزی نے مامون الرشید کی مدح میں جو قصیدہ لکھا اُس کے چار شعر آج بھی موجود ہیں جن میں نصف سے زیادہ عربی الفاظ ہیں۔"

یہ تو بعض کی رائے تھی لیکن کچھ لوگ اس طرف بھی گئے ہیں کہ ابو حفص حکیم سغدی نے سب سے پہلے شعر کہا جس کے متعلق علامہ شبلی لکھتے ہیں کہ پہلی صدی ہجری کا شاعر تھا۔ شعر یہ ہے

آہوے کوہے در دشت چگونہ دودا — یار ندارد بے یار چگونہ رودا

لیکن صاحب معاییر اشعار العجم کی تصریح[ثہ] کے مطابق ابو حفص تیسری صدی کا شاعر تھا۔ اگر اسی پر اعتماد کر لیا جائے تو اس قول کا بھی وہن اور ضعف ظاہر ہے اس لیے کہ یہی زمانہ رودکی[جہ] کا بھی تھا اور یہ امر واقعہ ہے کہ رودکی سے قبل بہت سے شعرا گزرے ہیں[حہ]۔ منجملہ اُن کے ایک حنظلہ بادغیسی تھا۔ جس کے دیوان کو پڑھ کر حسب تصریح عروضی سمرقندی[خہ] احمد بن عبد اللہ ایک معمولی حالت سے ترقی کر کے حاکم خراسان بن بیٹھا تھا۔ یہ قصہ چونکہ دلچسپ ہے اس لیے پورا لکھنا اچھا معلوم ہوتا ہے۔

احمد بن عبد اللہ خجستانی سے لوگوں نے دریافت کیا کہ تو تو گدھوں کا الاغ تھا خراسان کی حکومت تجھ کو کس طرح مل گئی؟ اُس نے جواب دیا کہ خجستان کے علاقہ بادغیس میں بیٹھا ہوا میں حنظلہ بادغیسی کا دیوان پڑھ رہا تھا۔ جب ان دو شعروں پر پہونچا

مہتری گر بکام شیر درست — شو خطر کن ز کام شیر بجوے
یا بزرگی و عز و نعمت و جاہ — یا چو مردانت مرگ رویاروے

But though this assertion has been accepted as a [ط] historical fact by some scholars of repute the scepticism of others appears to the writer well-justified

تہ شعر العجم ص۱۱۲ جلد اول ثہ معجم فی معاییر اشعار العجم ص۱۸۱ جہ وفات ۳۲۹ھ شعر العجم ص۳۶ جلد اول حہ ص۲۱ شعر العجم جلد اول
خہ چہار مقالہ عروضی سمرقندی ص۳۱ طبع لاہور۔

تو میرے دل میں اپنی موجودہ حالت پر عدم اطمینان کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ گدھوں کو بیچ کر میں نے گھوڑا خریدا اور اپنے وطن سے نکل کر علی بن لیث کی خدمت میں گیا جو یعقوب بن لیث اور عمرو بن لیث کا بڑا بھائی تھا۔ دونوں چھوٹے بھائی اُسکی تعظیم و تکریم میں کمی نہ کرتے تھے۔ پھر جب پہاڑی رستوں کو طے کرتا ہوا یعقوب چھوٹا بھائی خراسان سے غزنین پہونچا تو اُس نے رباط سنگین مقام سے مجکو اپنی خراسان کی جاگیروں کا ایجنٹ مقرر کر دیا حتٰی کہ اس ایجنسی کی بدولت میرے ساتھ سو سوار رہنے لگے۔ علی بن لیث کی جاگیروں میں سے ایک کا نام کروخ ہری اور دوسری کا خوانت نیشاپور تھا۔ میں نے کروخ پہونچکر فرمان پیش کیا اور اس پر جو کچھ مجھے ملا وہ میں نے فوج پر تقسیم کر دیا۔ رفتہ رفتہ میری فوج تین ہزار ہو گئی۔ پھر خوانت پہونچکر میں نے ایسا ہی کیا لیکن وہاں کے اکابر نے میری کوئی تعظیم و توقیر نہ کی۔ کہنے لگے کہ ہمیں صرف دس آدمیوں والا حاکم درکار ہے۔ اب میں نے صفاریوں کی اطاعت کو تو بالائے طاق رکھ دیا اور خوانت کو لوٹ لیا وہاں سے ایک دہقان کو ساتھ لیکر بیہق پہونچا۔ بیہق میں میرے گرد دو ہزار سوار جمع ہو گئے۔ اب میں نے نیشاپور کا خیال کیا اور رفتہ رفتہ میری قسمت نے ایسی یاوری کی کہ سارا خراسان میرے قبضۂ اقتدار میں آگیا۔ یہ سب کیوں؟ ان ہی دو شعروں کی بدولت۔ یہ سنہ ۲۶۸ھ سے قبل کا واقعہ ہے اس لیے کہ اسی سال احمد بن عبداللہ خراسان میں قتل کیا گیا تھا واقعہ مذکورہ میں احمد بن عبداللہ اپنا خاندان صفاریہ سے تعلق ظاہر کرتا ہے اور یہ واقعہ تاریخی ہے کہ صفاریہ خاندان میں ابو حفص سغدی سے پہلے بھی شعرا گزرے ہیں۔ پھر اُنکے اشعار کو تقدم زمانی کیوں نہ حاصل ہو۔ حنظلہ[1] بادغیسی، محمود وراق، فیروز مشرقی یہ سب اس سے پہلے کے شاعر ہیں۔ عروضی سمرقندی[2] کی تصریح کے مطابق حنظلہ بادغیسی صاحب دیوان بھی تھا چند اشعار یہ ہیں۔

یارم سپند گرچہ بر آتش ہمی فگند   از بہر چشم تا نرسد مر ورا گزند
او را سپند و مجمرہ ناید ہمی بکار   با روے ہمچو آتش و با خال چوں سپند

اگرچہ اس عقدہ کشائی میں اور تذکرہ نویسوں نے بھی موشگافیاں کی ہیں لیکن وہ اس قدر بے بنیاد اور سطحی ہیں کہ ان پر توجہ بھی نہیں کی جا سکتی اور مسئلہ لاینحل ہی رہتا ہے۔ ہاں اگر اس شرط سے اغماض کر لیا جائے کہ شاعر خواہ ایرانی ہو یا عربی تو شاید مسئلہ فی الجملہ آسان ہو جائے اور مندرجہ ذیل فقرات کو جو میں ایک طول طویل قصہ کے ضمن میں علامہ قزوینی کی وسعت نظری کی بدولت کتاب الاغانی سے نقل کرتا ہوں اس مسئلہ کا فی الجملہ حاصل سمجھا جا سکتا ہے۔

---

[1] متوفی سنہ ۲۱۹ھ شعر العجم ص ۲۷ [2] چہار مقالہ ص ۲۷

آبست نبیذ است

عصارات زبیب است

سمیہ روسپی است

واقعہ اگرچہ طویل ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ دلچسپ بھی، اس لیے پورا نقل کیا جاتا ہے۔ کہتے ہیں[۱] کہ سعید بن عثمان جب خراسان کا حاکم مقرر ہوا تو اُس نے چاہا کہ ابن مفرغ شاعر کو بھی اپنے ساتھ لیجائے۔ جتنا اُس کو ساتھ لیجانے پر اصرار تھا اُتنا ہی ابن مفرغ کو انکار۔ اس لیے کہ اس نے سعید کے بجاے عباد کی مصاحبت کو زائد پسند کیا جو سیستان کا گورنر بن کر عنقریب جانے والا تھا۔ جب باوجود اصرار بلیغ شاعر راضی نہ ہوا تو سعید نے اُسکو بلا کر کہا کہ دیکھو میری یہ بات یاد رکھنا کہ عباد ایک کمینہ آدمی ہے زائد اُس سے میل جول نہ رکھنا اس لیے کہ وہ ذرا سی بات میں ملول ہو جاتا ہے۔ اسکی توجہ اور عنایتوں پر نازاں نہ ہونا اور جن باتوں کی تُجھکو برداشت ہے وہ اُن کو برداشت بھی نہیں کر سکتا۔ یہ کہکے سعید نے کچھ روپیہ پیسہ منگایا اور ابن مفرغ کو دیدیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہدیا کہ اسکو اپنی ضروریات سفر میں صرف کرنا، اگر عباد کی صحبت تیری طبیعت کے موافق ہو تو فبہا، ورنہ بسر و چشم میرا مکان تیرے لیے حاضر ہے۔ یہ کہکے سعید تو خراسان چلا گیا لیکن ابن مفرغ نے عباد کی معیت اختیار کر لی۔ جب عبید اللہ کو جو عباد کا چھوٹا بھائی تھا معلوم ہوا تو اُس نے اس معیت کو اچھی نظروں سے نہ دیکھا۔ جب عباد چلنے لگا تو عبید مع اور لوگوں کے مشایعت کے لیے گیا اور رخصت ہوتے وقت عبید نے اُسکو اپنے پاس بلا کر کہا کہ اگرچہ عباد نے تیری معیت کی درخواست کو منظور کر لیا ہے لیکن مجھے کچھ پسند نہیں ہے۔ اسنے دریافت کیا کہ آخر اس ناپسندیدگی کا کیا سبب ہے۔ عبید نے سبب بیان کیا کہ چونکہ تو شاعر آدمی ہے اور شعراء عام طور پر نازک خیال ہوتے ہی ہیں اور ذرا سی فروگذاشت اور بے توجہی انکے نزدیک بڑی چیز خیال کی جاتی ہے اگر انکو کسی معاملہ میں ذرا سا وہم پیدا ہو جائے تو رفتہ رفتہ وہ وہم یقین کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

پھر اہم بات یہ ہے کہ اگر کسی تقصیر پر ہزارہا معذرتیں اس کے سامنے پیش کی جائیں تو ایک کو بھی خاطر میں نہیں لاتا۔ میرا بھائی ایک ایسے مقام پر جا رہا ہے جو فتنوں اور فسادوں سے پُر ہے۔ ظاہر ہے ایسے موقعہ پر وہ ان فتنوں فسادوں کے دبانے اور ظلم کرنے میں اپنی توجہ منعطف کرے گا یا تیری طرف متوجہ ہوگا۔ تو بھلا اُسے معذور کیوں سمجھنے لگا۔ پھر نتیجہ یہ ہوگا کہ تو ہمارے بدنام کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھے گا۔ ابن مفرغ نے جواب دیا نہیں حضور ایسا ہرگز نہ ہوگا۔ مجھ پر عباد کے بڑے بڑے احسانات ہیں۔ عبید نے

---

[۱] کتاب الاغانی جلد ۱۷ صفحہ ۵۱ تا ۵۵ و طبقات الشعراء صفحہ ۲۱۰ لابن قتیبہ۔

اس کی باتوں کو اوپری اوپری سمجھ کر کوئی اہمیت نہ دی اور اسکی گفتگو حلق سے نیچے نہ اُتری۔ لیکن جب شاعر کا اصرار حد سے گزر گیا تو اُس نے کہا بہتر ہے جا۔ لیکن اس شرط پر کہ اگر میرے بھائی کی طرف سے کسی معاملہ میں کوئی کوتاہی یا تاخیر ہوئی تو اس کا اثر نہ لیگا اور مجھے لکھ کر مطلع کر دیگا۔ اُس نے اقرار کیا۔ عبید نے کہا۔ اچھا جا اللہ مبارک کرے۔ عباد منزلیں طے کرتا ہوا خراسان پہونچا اور اپنی مہم میں ہمہ تن مصروف ہو گیا بھلا کیا موقعہ تھا کہ اس رفیق سے پوچھ گچھ کرتا۔ نتیجہ وہی ہوا جس کی پیش بینی عبید نے کی تھی جس کہ اُسنے عبید کو شرط کے مطابق اطلاع بھی نہ دی۔ موقعہ موقعہ توہین آمیز فقرے کستا اور ہجو میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھتا تھا ایک روز کا واقعہ ہے کہ عباد کہیں جا رہا تھا یہ بھی ساتھ ہو لیا۔ عباد کی داڑھی کچھ غیر معمولی طور پر بڑی اور لمبی ہونے کی وجہ سے جب ہوا اُس میں بھرتی یا جھونکے لگتے تو تھیلے کی طرح ہلنے لگتی تھی۔ اس موقع پر ہوا تیز چل رہی تھی داڑھی جھونکے کھانے لگی۔ شاعر کچھ کر صبر نہ کرسکا ہنس ہی دیا۔ ایک اور شخص تحجمی اسکے ساتھ تھا اُس سے کہنے لگا

الا لیت اللحی کانت حشیشا	اگر داڑھیاں گھاس چارہ ہوتیں تو ہم مسلمانوں
فنعلفہا خیول المسلمینا	کے گھوڑوں کو کھلا دیتے۔

تحجمی نے بات عباد تک پہونچا دی۔ سنتے ہی نعل در آتش ہو گیا۔ مگر حیران تھا۔ سزا دے تو حق صحبت کی وجہ سے مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ یوں ہی چھوڑ دے تو دل نہیں مانتا۔ اتفاقاً اُسکو بھی پتہ چل گیا کہ سازشی نے ایک مذاق کی بات امیر تک پہونچا دی ہے۔ دل میں کہنے لگا کہ اب تو عباد کے ہاتھوں زندگی کا خاتمہ ہونا مقدر معلوم ہوتا ہے۔ عباد کے پاس پہونچا اور عرض کیا کہ حضور آپ کو معلوم ہے کہ سعید میری کتنی عزت کرتا تھا اور میرے ساتھ کیسی آؤ بھگت سے پیش آیا کیا۔ لیکن با وجود ان تمام باتوں کے پھر بھی میں نے اُس کو چھوڑ کر آپ کی خدمت میں رہنا پسند کیا۔ لیکن مجھے اس حضوری سے چنداں فائدہ میسر نہ ہوا۔ حضور اجازت مرحمت فرمائیں کہ میں اپنے وطن واپس جاؤں۔ امیر نے جواب دیا کہ تو نے یہ بات بھی خوب کہی۔ تو ہی نے تو مجھ سے میرے ساتھ رہنے کی خواہش ظاہر کی تھی اور تو ہی نے میری رفاقت کی درخواست کی۔ میں نے بھی کچھ مضائقہ نہ سمجھا۔ مجھے اس کا وقت ہی کب ملا کہ میں تیرے ساتھ کچھ کر سکتا۔ اب تو مجھ سے واپسی کی اجازت مانگتا ہے۔ میں تیری نیت سے خوب واقف ہوں۔ تو اپنے قبیلہ میں مجھے رسوا اور بدنام کریگا۔ اچھا ذرا ٹھہر کہ میں تیرے حقوق تو ادا کر دوں۔

عباد کو خفیہ طور پر یہ بھی پتہ لگ گیا تھا کہ ابن مفرغ اُسکو بُرا بھلا کہتا پھرتا اور راہ در پدر کی گالیاں بھی دیا کرتا ہے۔ ایک روز کا واقعہ ہے کہ عباد گھوڑے پر سوار ہو کر چلا۔ جب وہ سر پٹ دوڑنے لگا اور

لقیہ سواروں سے آگے بڑھ گیا تو اُس نے ایک اور فقرہ چُست کیا

سبق عباد و صلت لحیۃ — عباد آگے نکل گیا اور اُس کی داڑھی (ہار کے) پیچھے رہ گئی۔

عباد کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ پہلے تو اُس نے یہ کیا کہ ابن مفرغ کے قرضخواہوں کو بھڑکا دیا، اور جب اُنکی طرف سے یورش ہوئی اور یہ ادائے قرض سے عاجز رہا تو قیدخانہ میں بند کر دیا اور اس کی داڑھی منڈوا دی۔ یہ ہی نہیں بلکہ اُس کی ایک پروردہ باندی اَراکہ اور غلام بُرد نامی کو اس پاداش میں بیچ ڈالنے کی اُسکو اطلاع دیکی اُس نے یہ سُن کر کہلا بھیجا کہ مجھے یہ دونوں جان سے زیادہ عزیز ہیں اور اولاد سے بڑھ کر محبوب، بھلا کوئی اپنی جان اور اولاد کو بیچا کرتا ہے۔ لیکن عباد نے ایک نہ سُنی اور اُنکو بیچ ہی ڈالا۔ خراسان کے ایک شخص نے خریداری کی۔ جب دونوں کو لیکر گھر پہونچا تو بُرد غلام نے جو بڑا چالاک اور زیرک تھا کہا تم کو کچھ خبر ہے کہ تم نے کیا خریدا ہے؟ خریدار نے جواب دیا ہاں یہی معلوم ہے کہ میں نے تجھے خریدا ہے اور اس باندی کو۔ غلام نے جواب دیا بخدا ایسی بات نہیں ہے، تو نے آبروریزی، رسوائی اور فضیحت کا ایسا پلندہ خریدا ہے جو تیری زندگی کے ختم تک تجھ سے الگ نہیں ہو سکتا۔ یہ سُن کر خریدار گھبرا اُٹھا اور کہنے لگا یہ کیوں؟ غلام نے جواب دیا کہ ہم ابن مفرغ کی ملکیت میں تھے۔ اُس کی زبان اور فتنہ انگیزیوں کی بھگتان ہمیں بھگتنی پڑی ہے، اُس نے عباد امیر خراسان اور عبید عالم عراق اور اُس کے چچا کی ہجو کی تھی۔ تم نے مجھکو اور اس باندی کو نہیں خریدا، بلکہ اس مضغۂ گوشت کو خریدا جو اُسکے پہلو میں رکھا تھا، بخدا اُس سے بڑھ کر بدبخت کوئی گھر نہ ہوگا جس میں یہ سودا خرید کر لایا جائے۔ خریدار نے کہا اچھا جاؤ تم اُسی کی ملکیت ہو اگر جانا چاہو تو اُسی کے پاس چلے جاؤ، اگرچہ اس خیال سے میرے جسم میں کپکپی پیدا ہوتی ہے کہ عباد کو اس کی خبر ہو جائے تو میں تباہ ہو جاؤں گا، اور اگر تم چاہو تو چندے میرے پاس ہی رہو۔ غلام نے جواب دیا کہ اچھا آپ ایک خط اس مضمون کا ہمارے مالک کو لکھ دیجئے۔ خریدار نے خط لکھ دیا۔ جب ابن مفرغ کو خط ملا تو اُس نے شکریہ کے ساتھ رسید بھیجدی اور لکھ دیا کہ تم اپنے پاس ہی ان دونوں کو رہنے دو تا آنکہ میرے پھلے دن آئیں۔ ایک روز عباد نے اپنے دربان سے کہا کہ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابن مفرغ قیدخانہ میں چنداں بےچین نہیں ہے۔ حکم دیا کہ اس کا گھوڑا، ساز و سامان اور اثاث البیت نیلام پر چڑھا دیے جائیں اور جو قیمت آئے اُس کو قرضخواہوں پر تقسیم کر دیا جائے۔ لیکن اس پر بھی عباد نے اُس کو قیدخانہ سے رہائی نہ دی۔ ابن مفرغ نے اپنے غلام اور باندی کی یاد میں ایک غم آلود نظم لکھی جس کا پہلا شعر یہ ہے

شریت برداً ولو ملکت صفقتہ — تو نے برد غلام کو خرید تو لیا لیکن اگر اسے اپنی ملکیت میں
لما تطلبت فی بیع لہ رشدا — رکھتا تو تجھے فلاح نصیب نہ ہوتی۔

قصہ بیان کرنے والے کہتے ہیں کہ جب ابن مفرغ کو قید خانہ میں ڈال دیا گیا تو اس طرح عباد کی ہجو کرتا رہا اور
مذمت کرنا نہ چھوڑا تو عبداللہ معلوم اور کیا تھا یہ آیتیں نازل ہوئی ہیں لہذا اس نے اپنا رویہ اب یوں بدل دیا کہ اگر
کوئی اُس سے پوچھتا کہ تو قید خانہ میں کیوں ہے، تو یہ جواب میں کہتا کہ امیر نے میری اصلاح احوال کے لیے مجھے
قید خانہ میں رکھ دیا ہے۔ شدہ شدہ یہ خبر عباد کو پہونچی کہ اس نے اب یہ رویہ اختیار کر رکھا ہے تو اس کا غصہ
بھی دھیما پڑ گیا اور سمجھا کہ اب وہ اپنی سزا کو پہونچ چکا لہذا اس کی رہائی کا فرمان جاری کر دیا۔ یہ چھوٹ کر بصرہ آیا
پھر شام پہونچا۔ غرضکہ یہاں جہاں جاتا عباد اور اسکے باپ کی ہجو نہ چھوڑتا۔ حتیٰ کہ بصرہ میں تو یہ نوبت پہونچ گئی
تھی کہ عباد کی ہجو لوگوں کے زبان زد تھی لوگ ہجو یہ اشعار گا گا کے پڑھتے تھے۔ عباد کے بھائی عبید کو خبر پہونچی
تو اس کی گرفتاری کی فکر میں لگ گیا، اگر چھپ کر شام نہ چل دیتا تو وہیں پکڑ جانے میں کوئی کسر نہ تھی۔
شام کے دیہاتوں اور جنگلوں میں چھپا چھپا پھرتا۔ لیکن جہاں کہیں موقع ملتا آل زیاد کی اہانت سے باز نہ رہتا، انکے
نسب پر چوٹیں کرتا اور زیاد کی ماں سمیّہ کو فحش سناتا تھا۔ آخرکار حکومت کو سراغ لگ گیا کہ وہ شام کے اطراف
میں ہے۔ کہیں گرفتار نہ ہو جائے اس لیے بھاگ کر پھر بصرہ آیا اور احنف بن قیس سے پناہ کا طالب ہوا۔ احنف
نے صاف انکار کر دیا کہ حکومت کے مقابلہ میں میں کسی کو پناہ نہیں دے سکتا۔ تو حکومت کا مجرم ہے۔ اگر تو پسند کرے
تو تجھے بنی سعد کے حوالہ کر دوں وہاں تو بے کھٹکے رہے گا۔ ابن مفرغ نے جواب دیا اسے منظور اگر بنی سعد پناہ دیں۔
کہ ہم کیوں ایسے شخص کو پناہ دیں تو کیا ہوگا۔ پھر خالد بن عبداللہ کے پاس پہونچا وہاں سے بھی صاف جواب ملا
پھر عمر بن عبید اللہ اور طلحہ کے پاس آیا، دونوں نے وعدہ تو کر لیا لیکن وعدہ پورا نہ کر سکے۔ فرمایا ایک شخص منذر
نے اس کو پناہ دیدی۔ اتفاق دیکھیے کہ بحریہ بنت منذر عبید اللہ کے نکاح میں تھی اور اس کے باپ کی عبید کے
یہاں بڑی عزت و توقیر کی جاتی تھی۔ عبید کو خبر لگ گئی کہ ابن مفرغ بصرہ میں فلاں جگہ پناہ گزیں ہے۔ منذر کی عبید
کے یہاں سے طلبی آئی تو وہ اُدھر گیا۔ اِدھر عبید کے سپاہی منذر کے گھر پہونچ گئے اور ابن مفرغ کو گرفتار کر لیا
اسکو لیکر عبید کے پاس پہونچے۔ منذر نے دیکھا تو ششدر رہ گیا۔ دست بستہ عبید سے عرض کرنے لگا کہ حضور
میں نے اس کو پناہ دی ہے آپ اس کو ہاتھ نہ لگائیں۔ عبید نے کہا درست ہے، آپ کی اور آپ کے
باپ دادا کی شان میں تو اس نے قصیدے کہے، لیکن ہمارے اجداد کو اس نے کیا کچھ برا بھلا کہا ہے۔ میں
بخدا اس سے درگزر نہ کرونگا۔ اگر آپ کو یہ خیال ہے کہ آپ کی دختر میرے نکاح میں ہے تو میں اس کے مقابلہ
میں اُسکو طلاق دینے کے لیے تیار ہوں۔ منذر چپ ہو رہا۔ مجبور تھا۔ عبید ابن مفرغ کی طرف متوجہ ہو کر
کہنے لگا کمبخت تو نے عباد کی خوب رفاقت کی۔ ابن مفرغ نے جواب دیا کہ حضور نے یہ بھی خیال کیا کہ اُس کے
برتاؤ میرے ساتھ کیسے رہے۔ میں سعید کو چھوڑ کر اُسکے ساتھ ہوا اور جو کچھ میری کمائی تھی وہ سب میں نے اُس پر

قربان کر دی، میرے ساتھ عباد نے کیا کچھ نہیں کیا۔ قید میں رکھا، گالیاں سنائیں، مارا پیٹا۔ میں محض اس لیے اُس کے پاس سے چلا آیا کہ کہیں اُس کا طرزِ عمل اُس کی رسوائی کا سبب نہ بن جائے۔ اب میں آپ کے قبضۂ اقتدار میں ہوں، آپ حاکم ہیں، جو چاہیں کریں۔ عبید نے اِدھر تو اُس کو قید کرنے کا حکم دیا اُدھر یزید بن معاویہؓ حاکمِ اعلیٰ کو اس کے قتل کر دینے کی اجازت کے لیے لکھا۔ یزید نے جواب میں لکھا کہ اس کا ارادہ بھی نہ کرنا، ہاں جتنی بھی سزا چاہو دیدو۔ یہ کیوں؟ یہ اسلیے کہ اسکے خاندان کے لوگ میری فوج کے سپاہی اور میرے معتمد علیہ ہیں۔ ہرگز ہرگز اسکو قتل نہ کرنا، ہر طرح سے اسکی تذلیل کرلو۔ جب عبید نے حاکمِ اعلیٰ کا عندیہ نہ پایا تو قتل سے باز رہا لیکن اور سزائیں دینے میں کچھ کسر نہ رکھی۔ پہلے تو پا کر اسکو نبیذ، جس میں ایک گانٹھوں دار گھاس سرخ رنگ کی ملا دی گئی، پلائی۔ نتیجہ اسکا یہ ہوا کہ ابن مفرغ کو دستوں کا سلسلہ جاری ہوگیا، پھر حکم دیا کہ اسی حالت میں اس کو شہر میں گشت کرایا جائے۔ اسکے ساتھ یہ بھی کیا کہ ایک بلی اور سور کو بھی ساتھ ساتھ کر دیا۔ ابن مفرغ چیختا چلاتا اور دستوں کی وجہ سے بیتاب تھا۔ لڑکے پیچھے سے شور و غل مچاتے اور اُس سے پوچھتے تھے این چیست؟ ابن مفرغ جواب دیتا

آبست نبیذ است

عصارات زبیب است

سمیہ[1] روسپید است

غرضیکہ بصرہ کی گلی گلی اور کوچہ کوچہ میں پھرایا گیا، تھک کے چور ہوگیا، دستوں کا سلسلہ جاری تھا ہی، ایک جگہ گر پڑا، اور ایسا گرا کہ اٹھنے نہ پایا۔ عبید کو اطلاع دی گئی، اُس نے کہا کہ وہ کمبخت کیا مرے گا۔ بہر حال اب نہلا دھلا کر بستر تک پہونچ گیا۔ جب نہا دھو کر فارغ ہوا تو فی البدیہہ کہنے لگا

یغسل الماء ما فعلت وقولی — جو کچھ تو نے کیا اُسے تو پانی نے دھو دیا لیکن بات

راسخ منک فی العظام البوالی — پرانی ہڈیوں میں پیوست ہو کر رہ گئی ہے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ پھر قید میں ڈال دیا گیا۔ اور رہائی اُس کو اُس وقت ہوئی جب یمن کے سرداران لشکر میں اسکے خلاف جوش و خروش پیدا ہوا اور انھوں نے یزید سے اسکی رہائی کے متعلق تہدید آمیز درخواست کی۔

یہ قصہ عہدِ خلافت یزید بن معاویہؓ کا ہے، اگر اس کو صحیح مان لیا جائے تو ان ابیات پر قدیم ترین ہونے کا دعوےٰ کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے کہ یزید کی خلافت ۶۰ھ سے لیکر ۶۴ھ تک ہوئی ہے لیکن پھر بھی اشکال یہ ہے کہ ابن مفرغ جسکی زبان سے یہ فقرات ادا ہوئے ہیں وہ عربی النسل تھا، اگرچہ اُسنے خراسان وغیرہ میں رہ کر معلوم ہوتا ہے کہ فارسی سیکھ لی تھی۔

[1] نام جدۂ عباد و عبید۔

اس سلسلہ میں چند فقرات اور بھی ہیں جو اسکے مقابلہ میں اگرچہ متاخر ہیں نیز اُن پر صحیح طور پر معاملت فارسی شعر کی تعریف بھی صادق نہیں آتی لیکن انکو اشعار رعامیانہ یا بالفاظِ دیگر "تصنیف" میں محسوب کر سکتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ۱۰۸ھ میں جب ابو منذر اسد بن عبد اللہ قسری نے ختلان میں لشکر کشی کر کے خاقان ترک سے جنگ کی اور شکست کھائی تو پریشان ہو کر بلخ بھاگ گیا۔ اہل خراسان نے اسکی ناکامی اور ہزیمت دیکھ کر یہ شعر کہا:

از ختلان آمذی بر و تباہ آمذی
بیدل فراز آمذی

یہ فقرے زبان زدِ خلائق ہو گئے تھے حتی کہ لڑکے گلی کوچوں میں پڑھتے پھرتے تھے۔ طبری نے تاریخ کبیر میں اس قصہ کو یوں لکھا ہے۔

ثم دخلت سنۃ ثمان و مائۃ ... و فیہا غزا اسد بن عبد اللہ الختل فذکر عن علی بن محمد ان خاقان اتی اسدا ولم یکن بینہم قتال فی تلک الغزاۃ و ذکر عن ابی عبیدۃ انہ قال بل ہزموا اسدا و فضحوہ فتغنی علیہ الصبیان۔

جب ۱۰۸ھ ہوا تو اسد نے ختل میں لشکر کشی کی، علی بن محمد سے بیان کیا گیا ہے کہ خاقان اسد کے پاس آیا لیکن ان میں لڑائی نہیں ہوئی اور ابو عبیدہ نے بیان کیا کہ لشکر خاقان نے اسد کو شکست دی اور رسوا کر کے بھگا دیا تو لڑکوں نے گا گا کے پڑھنا شروع کیا۔

دوسرے موقع پر اسی طبری نے یوں بھی لکھا ہے

وسار اسد بالناس حتی نزل مع الثقل و صبحوا اسلامن الغد و ذلک یوم الفطر فکادوا یمنعونہم من الصلوۃ ثم انصرفوا و مضی اسد الی بلخ ... ففی ہذہ الغزاۃ قیل لہ بالفارسیۃ

اسد لشکر لیکر ثقل میں آیا دوسرے روز خاقان کا لشکر پہونچ گیا اس روز عید تھی نماز بھی نہ پڑھ سکے، جب لشکر لٹ گیا تو اسد بلخ چلا گیا اس لڑائی میں جب شکست ہوئی تو فارسی میں اسکے متعلق یہ کہا گیا

از ختلان آمدیہ برو تباہ آمدیہ
آبار باز آمدیہ خشک نزار آمدیہ

بہرحال یہ بھی ایک فارسی شعر کے نمونے بن سکتے ہیں، اگرچہ وزن اور بحر کی موجودگی اس میں محض اتفاقیہ ہے اسلیے کہ واضع عروض عرب یعنی خلیل ۱۷۰ھ میں پیدا ہوا۔ ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ عروض عرب ایران میں پہونچ ہی کیسے سکتے، وضع بھی نہ ہوئے تھے۔

کتاب الاغانی نیز دیگر کتب تواریخ میں اور بھی کچھ ضمنی طور پر فقرات ملتے ہیں لیکن چند اں قابل اعتنا نہیں ہیں، اس لیے ترک کرتا ہوں۔

This class of verse ephemeral as our own topical and comic songs

لٹریری ہسٹری آف پرشیا۔ جلد ۳ صفحہ ۲۲۱

اوستیا

تاریخ روما کا ایک گم شدہ ورق

(از مولانا رئیس احمد جعفری ندوی ایڈیٹر روزنامۂ خلافت بمبئی)

چند مہینے گزرے، حکومت اطالیہ (اٹلی) کی سرپرستی میں روما اور سرحدِ "استیا" کے درمیان موٹروں، لاریوں، اور بار برداری گاڑیوں کے لیے، توسیعِ شاہراہ کے سلسلہ میں جدید سڑکوں کی تعمیر کا کام شروع ہوا۔ یہ تاریخی سرحد جو اپنے خصائص، اور پچھلی تاریخ کے اعتبار سے ایک خاص اہمیت رکھتی ہے، تیا صرے کے پایۂ تخت سے ۲۸ کیلومیٹر دور ہے۔ اور راستوں کی تعمیر و توسیع کا یہ وہ پروگرام ہے جو ایک عرصہ سے حکومت اطالیہ کے زیرِ غور ہے۔ اس پروگرام کا مقصد، ایک طرف تو تمدنی اور اقتصادی ضروریات کو پورا کرنا اور دوسری جانب، بیکاروں کے لیے کام مہیا کرکے اُن کے بڑھتے ہوئے خطرہ سے نجات حاصل کرنا تھا۔ کئی برس تک بعض موانع ایسے پیش آتے رہے، کہ اس سلسلہ میں کوئی اقدام نہ کیا جا سکا، لیکن کچھ عرصہ ہوا، کام شروع کردیا گیا، اور وہ اتنا نتیجہ خیز نکلا کہ اس نے گویا آثارِ قدیمہ کی دنیا میں، ایک ایسی نئی چیز پیش کردی، جو علماءِ فن کی غور و فکر، بحث و گفتگو اور تحقیق و تفتیش کا ایک مستقل موضوع ہے۔

خیر، تو کام شروع ہوا، اور کوئی ایسی چیز رونما نہیں ہوئی، جو لوگوں کے لیے جاذبِ توجہ ثابت ہوتی۔ ایک روز اتفاقاً بعض انجینیروں نے کام کے دوران میں اس تاریخی سرحد کے پاس، کھدائی کے وقت کچھ قدیم وضع کی دیواریں دیکھیں، سنگِ مرمر کے، خاص وضع و تراش کے متعدد ٹکڑے بکھرے ہوئے پائے، اور کچھ ایسے آثار پائے، جنھوں نے انکے سمندِ جستجو پر تازیانہ کا کام کیا، اُنھوں نے اس کی طرف خاص خاص لوگوں کی توجہ مبذول کرائی، علماء آثار کو دعوت دی، اور اس طرح دنیائے "اثریات" میں ایک قسم کی جنبش پیدا ہوگئی۔

پروفیسر جو یڈو، فن حفائر (کھدائی کا کام) اور تاریخ قدیم میں غیر معمولی فضیلت و بصیرت رکھتے ہیں، انکے معلومات کی وسعت، تجربات کی فراوانی، اور دقتِ نظر کا ہر شخص کو اعتراف ہے۔ موصوف کو زحمت دی گئی کہ وہ اس نئے مسئلہ کو اپنے ہاتھ میں لے لیں اور ان دیواروں اور پتھروں کی زبانِ خاموش سے نتائج نکال کر، دنیا کے ناواقفوں کو حقائق سے بہرہ ور کریں۔ موصوف نے یہ درخواست

قبول فرمائی اور پوری تندہی و جانفشانی سے اس کام میں مصروف ہو گئے۔ اور تھوڑے ہی عرصہ میں کھود نے تاریخ قدیم کا ایک گم شدہ صفحہ دنیا کے سامنے پیش کر دیا، جو اپنی قدامت اور ندرت میں مستقل حیثیت رکھتا ہے۔ مسٹر جوبڈو نے اپنے نظریات و خیالات، اور مشاہدات و تاثرات، اطالیہ کے ایک مشہور اخبار میں شائع کرا دیے ہیں۔ ہم پورا مضمون تاریخ قدیم کے حقائق و واقعات سے پُر ہے اور اپنی جاذبیت و دلچسپی کے اعتبار سے اس کا مستحق ہے کہ نذرِ ناظرین کیا جائے، لیکن ہم آج کی مجلس میں اس کے خاص خاص حصے پیش کرتے ہیں۔ یہ خلاصہ، گویا مضمون کا نچوڑ ہے، کوئی قابلِ ذکر بات نظر انداز نہیں ہونے پائی۔ مسٹر جوبڈو کی تحقیق نے عالمِ اثریات کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کر دیا ہے۔ اور حق یہ ہے کہ وہ علمائے اثریات کے غور و فکر کا مستحق ہے۔ اس نئے باب نے روما کی گزشتہ تاریخ کے چند ایسے اوراق ہمارے پیش نظر کر دیے ہیں جو مرورِ ایام سے او جھل ہو چکے تھے۔ اور جن کا انکشاف یقیناً ایک قابلِ قدر کارنامہ ہے۔

کھدائی کے بعد، مسٹر جوبڈو نے، جو آثار دریافت کیے ہیں، ان میں وہ تین دستاویزات خاص اہمیت رکھتی ہیں جنھوں نے روما کی تاریخ قدیم کے بعض گوشے بے نقاب کر دیے ہیں۔ شہر ادوستیا، قیاصرہ کے زمانہ میں ہمیشہ مرکزِ تمدن اور مرکزِ تجارت کی حیثیت سے معروف رہا، اس کی اہمیت و عظمت سے اس زمانہ کے لوگ بہت متاثر تھے۔ مسٹر جوبڈو نے جو دستاویزیں یافت کی ہیں وہ تین الواح کا مجموعہ ہیں۔ اور ان الواح میں، ہر ہر لوح بجائے خود، مختلف قطعات سے عبارت ہے۔ پتھر کے یہ ٹکڑے دستبردِ زمانہ سے اپنے ان نقوش کو مسخ کر چکے ہیں، جو تاریخ کے لیے زبانِ گویا کی حیثیت رکھتے ہیں، لیکن انسان کی طبع، جستجو پسند، کسی چیز کو جب پا لے، تو کچھ نہ کچھ نتیجہ نکال ہی لیتی ہے، یہی حال ان ٹکڑوں کا بھی ہوا۔ بظاہر یہ پتھر کے ٹکڑے اس درجہ اپنے آب و رنگ سے محروم ہو چکے تھے کہ انھیں پڑھنا۔ انکی عبارت ملانا، اور اس سے کوئی نتیجہ نکالنا گویا ناممکن سا تھا، لیکن مسٹر جوبڈو نے اس کارِ دشوار کو بھی بحسن و خوبی انجام دیا۔ ان ٹکڑوں کو جمع کیا، انھیں ایک خاص ترتیب سے رکھا، اور اس طرح انکے مٹے ہوے نقوش بھی، ایک حد تک روشن ہو گئے۔

چنانچہ مسٹر جوبڈو کی کاوش و محنت کے سبب یہ رموز، اپنے اصلی رنگ میں ظاہر ہو گئے، اور ان سے روما کی عظمتِ ماضی کے بعض گوشے نمایاں ہو گئے، اور بعض ایسے واقعات معلوم ہوے جو تاریخ روما کے حلقۂ گم گشتہ کی حیثیت رکھتے ہیں، اور انکی اہمیت علمائے آثار و حفریات کے نزدیک مستقل تاریخ سے کم نہیں۔ ان الواح پر جو عبارت کندہ ہے، تاریخی حیثیت سے وہ بجائے خود ایک خاص اضافہ ہے۔ علاوہ ازیں اس سے

اُس زمانے کے تمدن پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

ان اثری دستاویزات سے اوستیا کی قدامت کی تصدیق ہوتی ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسٹر جوبیڈ نے اس انکشافات کے بعد، جو لوح سنگی پائی تھی اور جس میں قیصر ترایانو کے عہد کے بعض واقعات منقوش تھے وہ صحیح ہیں، اس لیے کہ ان الواح ثلثہ سے بھی انکی تائید ہوتی ہے۔ اس لوح سے جو واقعات معلوم ہوئے ہیں وہ سنہ ۱۰۹ء اور سنہ ۱۱۳ء پر مشتمل ہیں۔ ترایانو کا عہد حکومت روما کے تمام قیاصرہ کی تاریخ میں ہر اعتبار سے برتر اور بہتر ہے۔ معلوم ہوتا ہے ترایانو ایک خاص دل و دماغ کا قیصر تھا، جسنے اپنے زمانہ میں ایسے کارنامے انجام دیے جو ابتک محفوظ ہیں اور نام نیک کے ساتھ محفوظ ہیں۔

اب ہم پھر اپنے اصل موضوع پر آتے ہیں، مسٹر جوبیڈ کو جو تین الواح دستیاب ہوئی ہیں اُن میں سے ہر لوح، ۲۲ سطروں پر مشتمل ہے۔ لاتینی زبان استعمال کی گئی ہے پہلی لوح میں سنہ ۱۱۶ء کے حوادث مندرج ہیں، دوسری لوح پر سنہ ۱۲۵ء و سنہ ۱۲۶ء کے واقعات منقوش ہیں۔ اور تیسری لوح پر سنہ ۱۵۱ و سنہ ۱۵۲ و سنہ ۱۵۳ء کے حالات ثبت ہیں۔ ان سے اکثر قیاصرہ کے حالات ملتے ہیں۔ لیکن درمیانی گیارہ کڑیاں ناپید ہیں، جو ان الواح کے بعد بھی، گوشۂ تاریکی میں ہیں، اور جنکے متعلق کوئی صحیح رائے اب بھی نہیں قائم کی جا سکتی۔ بہرحال جو حالات معلوم ہو سکے ہیں، اپنی اہمیت کے اعتبار سے وہ بھی ایک خاص منزلت رکھتے ہیں۔

تیسری لوح اپنی وضع و شکل کے اعتبار سے، ان الواح سے مشابہ ہے جو لیدیہ۔ و ما میں اس وقت موجود ہیں۔ ان الواح سے پُرانے زمانہ میں یہ کام لیا جاتا تھا کہ کسی امر اہم سے متعلق قیصر کو جب کوئی فرمان شایع کرنا ہوتا، یا کسی حکم کی تبلیغ و تشہیر کی ضرورت محسوس ہوتی تو، سنگی تختیوں پر، فرمان کے الفاظ کندہ کرائے جاتے، اور اُس لوح کو معابد کی دیواروں پر، یا عام گزرگاہوں پر، یا اُن بڑے بڑے میدانوں میں، جہاں کسی میلہ یا تفریح کے سلسلے میں عام آمد و رفت رہتی ہو، لٹکا دیا جاتا تھا۔ تاکہ ساری قوم اسکے مفہوم و مقصد سے پوری طور پر واقف ہو جائے، اور اُسکے الفاظ کے نفاذ و اجراے پیشتر، قوم کے تمام طبقات تک اس کا مفہوم پہونچ جائے یہ دستور عام طور پر، روما میں اور اوستیا میں شایع و ذائع تھا۔ اسی طرح، خاص خاص واقعات بھی اپنی اہمیت و عظمت کے باعث، سنگی تختیوں پر کندہ کرا کے برسرعام لٹکا دیے جاتے تھے، تاکہ لوگوں کے دلوں میں انکی یاد تازہ رہے، اور وہ ہمیشہ قوم کے دلوں میں محفوظ رہیں۔ اس سے مقصد یہ تھا، کہ ایسے کارنامے پڑھ کر قوم کے افراد میں، حمایت و شجاعت کے جذبات تازہ ہوں اور اُن میں عزم و تہور کی روح بیدار ہو، نیز شجاعت و بسالت، عظمت و جبروت، قیاصرہ کا دبدبہ، اور افواج کا طنطنہ آنکھوں کے سامنے رہے۔ اور اس طرح ہر فرد قوم ایک خاص جذبہ سے سرشار نظر آئے۔

ان الواح پر جو ابھی حال میں دستیاب ہوئی ہیں، ایسے حوادث مرقوم ہیں، جو قیصر کی قوت وطاقت، اُسکے فرامین واحکام، اور اُسکے اوامر ونواہی سے، اور ایسے واقعات سے جو حیات قومی میں ایک روح تازہ پیدا کردیں، لبریز ہیں۔ بعض ایسے واقعات بھی ہیں جو شہنشاہان روما کی فتحمندیوں اور جنگ آزمائیوں کے آئینہ دار ہیں۔ بالکل اس طرح، جیسے آج کل ہمارے زمانہ میں، حکومتیں اپنے اس قسم کے واقعات گزٹ کے ذریعے اور کمیونکے کی صورت میں شایع کیا کرتی ہیں۔

ان تصریحات سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ اکتشاف جدید کس درجہ قیمتی ہے، اور یہ معلومات جنہوں نے روما کی تاریخ قدیم میں، کئی اہم ابواب کا اضافہ کردیا، کس قدر کارآمد اور نافع ہیں؟ اب ہم ان الواح کے متعلق الگ الگ مواد پیش کرنا چاہتے ہیں تاکہ خلط مبحث نہ ہو۔

(۱) شہنشاہ ترایانو کی فتحیابیاں

پہلی لوح میں صرف ۱۳ سطریں ایسی ہیں، جو پڑھی جاسکیں، باقی، قدامت وکہنگی کے سبب اور عرصے تک زیر زمیں مدفون رہنے کے باعث، اس قدر زیادہ مٹ گئیں کہ پڑھی نہ جاسکیں۔ بعض ٹکڑوں سے لوح شکستہ بھی ہے، اس لیے الفاظ کے پڑھنے اور نتیجہ نکالنے میں اور دقت ہوئی۔ اور افسوس یہ کہ گم شدہ ٹکڑے دستیاب بھی نہیں ہوسکے، حالانکہ پروفیسر جوبیڈونے بڑی کوشش کی۔ اس لوح پر چھ قناصل کے اسماء کندہ ہیں، جن میں سے چار تو اچھی طرح پڑھے جاتے ہیں، اور یہ وہ قناصل ہیں جنھیں سنہ ۱۱۶ء میں جب شہنشاہ ترایانو عراق کی سرزمین کو اپنے قشون قاہرہ سے پامال کررہا تھا، اُس نے عیسائیوں کے سینیٹ کے پاس ایک وفد کی صورت میں روانہ کیا تھا "تاکہ انھیں شہنشاہ کی فتحمندیوں، ورظفر یابیوں کے واقعات بتائے اور سند خوشنودی حاصل کرے۔ ذیل میں ہم اس لاتینی عبارت کا متن درج کرتے ہیں، جو اس لوح پر کندہ ہے، اور جس میں، حوادث کی تفصیل بیان کی گئی ہے :—

"Decimo Kal. Mart. Laureate misse ad senatum ad Imperatore Traino Augusto ob (quam causam Parthicus appelatus est et pro Salute eius Senatus facto et supplicationes (inominia delubra) et ludi facti acto etc.....

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ شہنشاہ ترایانو نے، عیسائیوں کی مجلس الشیوخ (سینیٹ) کے پاس ایک وفد روانہ کیا، جو اسکے قناصل پرمشتمل تھا، سنہ ۱۱۶ء کے ماہ مارچ میں، ۲۳ تاریخ کو یہ وفد روانہ ہوا۔ وفد کے جانے کا مقصد یہ تھا کہ شیوخ کے سامنے سرکاری طور پر اُن فتحمندیوں کی تفصیل پیش کرے، جو شہنشاہ ترایانو

نے، دریاے دجلہ کے کنارے اور حکومتِ ثانیہ پر یلغار رحملہ کے بعد حاصل کی تھیں۔ شہنشاہ نے مجلس شیوخ اور کاہنوں کی جماعت کو حکم دیا تھا کہ وہ اس نمایاں اور غیر معمولی کامیابی کی خوشی میں صلوٰۃ شکر ادا کریں اور عید مہرجان منائیں، اور اس فتح کی مسرت بے پایاں کا مظاہرہ قلبی اس طرح کریں کہ مسلسل آٹھ روز تک جشن انبساط برپا رہے، اس لیے کہ شہنشاہ کے نزدیک یہ نمایاں اور یادگار فتح ایسے ہی جوش مسرت کی طالب ہے اور اس کا اظہار شیوخ اور کاہنوں کی طرف سے ضرور ہونا چاہیے۔

لوح کی آخری سطروں کے الفاظ اتنے مٹے ہوئے ہیں کہ انکا پڑھنا ناممکن ہے، لیکن مسٹر جوٹیدوے اپنی مہارتِ فن کی بدولت انھیں بھی پڑھنے کی کوشش کی، اور ایک حد تک کامیاب بھی ہوے۔ مسٹر جوٹیدو کی تحقیق کے مطابق، ان آخری سطروں میں، اظہار مسرت کے طور پر عید مہرجان منانے کا حکم دیا ہے، اور اس عید کے لیے شرط رکھی ہے کہ رات کو منائی جائے، تاکہ سب لوگ اس سے محظوظ ہوسکیں، اور شہنشاہ تراپانوس کی عظمت و ہیبت کے قائل ہوں، اور اسکے لیے یہ مظاہرہ لباس ضروری ہے!

(۲) حاکم اسپین کا قضیہ

اُس زمانہ میں، اسپین، مملکت روما کا ایک محکوم حصہ تھا، اسکے والی کا نام کونیلیو برنتیانو تھا۔ اس نے مرکز سے سرکشی کی، اور ایسے افعال کا ارتکاب کیا، جو اس کی باغیانہ سرشت کو ظاہر کرتے تھے، چنانچہ اس کا معاملہ، مجلس الشیوخ کے سامنے پیش کیا گیا، اس قضیہ کی تفصیل دوسری لوح پر ثبت ہے۔ اس دوسری لوح میں سولہ سطریں پڑھی جاتی ہیں، اس میں بہت سے فناصل کے اسماء درج ہیں جو اس زمانہ سے تعلق رکھتے تھے، نیز اس عہد کے دوسرے حوادث تاریخی بھی کندہ ہیں۔ ان حوادث و واقعات کی فہرست میں ایک واقعہ خاص طور سے قابل ذکر ہے، اور وہ یہ کہ ۱۴۲ء کے دوران میں ملکہ انیا فوستیا (Annia Faustia) کی مارکو اوریلیو (Marco Aurelio) ولیعہد مملکت سے شادی کا اعلان ہوا اور تقریب کے سلسلے میں ان ہدایا اور تحائف کی تقسیم کا حال مندرج ہے، جو انطینوبیو، کاہنوں کی جمعیۃ کے رئیس نے تقسیم کیے تھے، نیز ان جشنوں کا تذکرہ ہے جو اس تقریب سعید کے موقع پر منائے گئے تھے اور جن میں سب نے بقدر توفیق و مقدرت حصہ لیکر اپنی مسرت و شادمانی کا اظہار کیا تھا۔

اس لوح کے بعض شکستہ ٹکڑوں پر جو عبارت منقوش ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی سنہ کے ماہ جون میں، مہرجانات "السرک" منائی گئیں، یہ مہرجانات کھیل اور تفریح کے پبلک میدانوں میں منائی گئیں، جو اپنی وسعت و کشادگی کے اعتبار سے خاص اہمیت رکھتے تھے۔ ان مہرجانات میں، رومی جمہور نے جس جوش و خروش سے حصہ لیا، اُسی طرح، اسپینی عوام نے بھی دل کھول کر شرکت کی، اور کسی قسم کی

تفریق کا مظاہرہ نہیں کیا۔

ان واقعات کے علاوہ ایک اور حادثہ مرقوم ہے کہ اکتوبر میں مجلس شیوخ نے ایک جلسۂ عام منعقد کیا، تاکہ ان اتہامات پر غور کرکے فیصلہ کیا جائے، جو کورنیلیو پرشیانو Cornelio Prisciano پر لگائے گئے تھے۔ یہ شخص، مملکت روما کی طرف سے اسپین کا گورنر تھا۔ اس لوح سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ مجلس الشیوخ نے ان الزامات کی تحقیق کی اور ایسی شہادتیں فراہم کیں جن سے نفس واقعہ کی صداقت یا عدم صداقت آشکارا ہو۔ لوح کے الفاظ اس معاملہ کے متعلق یہ ہیں:

De cornelio phisciano in Senatum quad Prevenciam Hispaniamhoatilitur

لیکن اسکے بعد کیا ہوا؟ مجلس الشیوخ نے کیا فیصلہ کیا؟ وہ کس طرح نافذ ہوا؟ ان واقعات کی تفصیل اس لوح سے نہیں معلوم ہوتی۔ کیونکہ اس کا بھی آخری حصہ شکستہ ہے، اور بعض ٹکڑے ناپید ہیں، لہذا کوئی صحیح علم اس باب کے متعلق نہیں ہو سکا، اور نہ اس وقت تک شاید معلوم ہو سکے، جب تک یہ گم شدہ کڑیاں نہ مل جائیں۔

(۳) شیستیو کی حفاظت کا مسئلہ

تیسری لوح پر، سنہ ۱۵ء کے حوادث و واقعات مرقوم ہیں۔ اس کے بعض حروف کافی نمایاں اور روشن ہیں۔ اس سے تین باتیں خاص طور پر معلوم ہوتی ہیں، اول تو، مارکو اورلیو ولیعہد کے بیٹے کی وفات، دوسرے اسکے دوسرے بیٹے کی وفات حسرت آیات، اور تیسرے، شیستیو کی حفاظت کا مسئلہ۔ اس لوح میں بھی بعض سطریں ایسی خراب حالت میں ہیں کہ انکا پڑھنا کسی طرح بھی ممکن نہیں۔ اور اسکی وجہ سے اس لوح کے بعض واقعات بھی پردۂ خفا میں مستور رہ گئے۔ مسٹر جوڈو نے اس حصہ کے پڑھنے کی بڑی کوشش کی، لیکن وہ ناکام رہے۔ مبہم اور ناقابل فہم حروف سے بھی ایک حد تک کام چل سکتا ہے، لیکن جب لوح کے بعض حصے ہی غائب ہوں، تو محض قیاس کی بنا پر، تصنیف و تالیف کیونکر ممکن ہے؟

رومی اسے کوری کے نام سے یاد کرتے تھے، جس طرح آج بھی اطالوی، اس نام کو استعمال کرتے ہیں۔ اس کی تعمیر و تشکیل سنہ ۵ اور سنہ ۶ ق م میں عمل میں آئی۔ بعد کو شہنشاہ فالینتی فالینتا نے اس کے پہلو میں ایک شہر لوشیو شیستیو کی تعمیر کی، کچھ ہی عرصہ کے بعد جسکی حیثیت ایک اچھے خاصے آباد شہر کی سی ہو گئی۔ شہنشاہ فالینتی کا زمانہ ۳۶۵ — ۳۷۰ء ہے۔

یہ ہے خلاصہ مسٹر جو یڈو کے پُرمغز مقالۂ تحقیقی کا، جسکی اہم الاہم حصص ہم نے عربی میں (اور میں نے اُردو میں بھی) منتقل کیے ہیں۔ کوئی اہم اور قابل ذکر بات اس مقالہ میں ترک نہیں کی گئی ہے۔ اس میں سب سے زیادہ اہم حصہ، شہنشاہ ترایانو کی اُن فتوحات کا تھا جو اُسنے مشرق کو علب میں حاصل کی تھیں۔ اُنھیں بغیر کسی کمی بیشی کے پیش کر دیا۔

اس شہنشاہ کے عہد میں، بلانی، بیتینیا کا حاکم تھا۔ یہ شخص بڑے دبدبہ وطنطنہ سے حکومت کرتا تھا۔ اسکا معمول تھا کہ ہر روز، ایک مجلسِ عدالت منعقد کرتا تھا، تاکہ ان لوگوں کے متعلق آخری فیصلہ صادر کرے جن پر دینِ مسیحی کے قبول کرنے کا الزام لگایا جاتا تھا۔ اسکے محاکمہ کا طریقہ یہ تھا کہ ملزموں کے بیانات لیتا تھا، پھر اُن پر جرح کرکے اُنھیں ایسا ایسا گھیرتا تھا کہ اُن میں تاب مقاومت باقی نہیں رہتی تھی، اُس وقت مجبوراً بعض لوگ الزام کی صحت کا اعتراف کر لیتے تھے۔ بس فوراً پھانسی کا حکم دے کر اُن کا خاتمہ کرا دیتا تھا۔ اُس زمانہ میں، اُن لوگوں کی تعداد میں، روز بروز اضافہ ہو رہا تھا جو دینِ مسیحی کو قبول کر رہے تھے۔ انھیں اپنے مذہب پر اتنا پختہ اعتقاد تھا کہ وہ بعض اوقات بغیر کسی تامل کے اعتراف کر لیتے تھے، لیکن اس اعتراف و الزام نے جب ہزاروں آدمیوں کو عروس مرگ سے ہمکنار کر دیا تو اسے ذرا ہوش آیا اور خطرہ پیدا ہوا کہ کہیں شہنشاہ کو میری اس ظلم آرائی کا حال نہ معلوم ہو جائے، تو پیش بندی کے طور پر اُس نے خود، شہنشاہ کو حالات سے باخبر کر دیا، اور اس باب میں شاہی ہدایت کا طالب ہوا، تاکہ آئندہ اس سلسلے میں جو کچھ کرے، اس کی سند جواز پاس رہے، اور وقت ضرورت اس سے استناد کرکے وہ خود بری الذمہ ہو سکے۔

لیکن شہنشاہ نے جو جواب دیا، وہ ذرا خلافِ توقع تھا، شہنشاہ نے اپنے اس جفاکار گورنر کو حکم دیا تھا کہ وہ مرحمت و شفقت سے کام لے اور اجراء حدود میں سختی سے کام نہ لے، بلکہ مسیحیوں سے کوئی تعرض ہی نہ کرے، جو لوگ اس دین کو قبول کرنا چاہتے ہیں اُنھیں قبول کرنے دے اور اُن سے کسی قسم کی بازپرس نہ کرے، اور نہ الزامات لگا لگا کر لوگوں کو حسب منشا سزا دے، ہاں وہ صرف اُن لوگوں کا فیصلہ کر سکتا ہے، جو خود فریادی ہو کر اُسکے پاس آئیں اور انصاف کے طالب ہوں۔

شہنشاہ کے اس حکم کا نتیجہ یہ ہوا کہ دینِ مسیحی کے حلقہ بگوشوں کی تعداد ساعت بساعت بڑھنے لگی، چنانچہ شہنشاہ کو اطلاع دی گئی کہ مسیحیت اس کی حکومت میں اس سرعت سے پھیل رہی ہے، جس طرح آن کی آن میں، سوکھی لکڑیوں کو آگ پکڑ لیتی ہے، اور دفعۃً سارے نواح میں چھا جاتی ہے۔ لیکن ان اطلاعات اور "سنسنی خیز" اطلاعات کے بعد بھی، شہنشاہ کے طرز عمل میں، کوئی فرق نہیں آیا، اُس نے

رواداری کا جو اصول قائم کردیا تھا اُس پر خود بھی قائم رہا، اور دوسروں کو بھی اُس سے تجاوز کرنے کی اجازت نہیں دی۔ اس روش کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسیحیت بغیر کسی مانع کے خوب پھلی پھولی۔ اور سرعت سے مدارج ارتقا طے کرتی رہی۔

شہنشاہ کی اس روش سے بعض جماعتیں بہت ناخوش تھیں، چنانچہ اُنھوں نے نظام حکومت بدلنے اور شہنشاہ کو معزول کرنے کا تہیہ کرلیا۔ یہ جماعت رات کی تاریکی میں بغاوت کے جراثیم پھیلاتی تھی۔ اس نے تقریباً پورے طور سے یہ طے کرلیا تھا کہ حکومت کا نظام ضرور بدلا جائے، تاکہ عیسائیوں کی یہ آزادانہ روش باقی نہ رہے، اور وہ پھر اُسی طرح سلاسل جفا میں گرفتار ہوجائیں، جیسے پہلے تھے۔ لیکن قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔ ادھر یہ ترکیبیں ہو رہی تھیں، نظام حکومت بدلنے کی تدبیریں کی جارہی تھیں، اُدھر یہ ہوا کہ ایک ایسا حادثۂ عظیم پیش آیا جسنے بہت سے لوگوں کو ختم کردیا۔ اس قدرتی حادثہ میں اتفاقاً اسی جماعت کا نقصان جان زیادہ ہوا۔ اس سے یہ لوگ سمجھے کہ یہ شہنشاہ کے باطنی تصرف اور اُس کے قہر و غضب کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ یہ لوگ اپنے گناہوں سے تائب ہوئے، اور اتنا متاثر ہوئے کہ مسیحیوں کے کسی قسم کا تعرض کرتے ہوئے گھبرانے لگے۔ انکے اس اضطراب کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسیحی اب حقیقی طور سے آزاد ہوگئے اُن پر سے اخلاقی اور جماعتی پابندیاں اُٹھ گئیں اور وہ قوانین کے اُس شکنجے سے بھی آزاد ہوگئے جو اناتیوس اسقف انطاکیہ نے انکے لیے تیار کر رکھا تھا۔ چنانچہ اس ردِ عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ شہنشاہ ترایانوس کے حکم کے مطابق، فوج کے ایک دستے نے ان حضرت کو اسیر کیا، اور شیر کی جھاڑی میں ڈال دیا، جسنے تھوڑی ہی دیر میں چیر پھاڑ کر اِن بیچارے کا خاتمہ کردیا، کہ اصلی داعیِ بغاوت اور بانیِ فساد یہی شخص تھا۔ شہنشاہ ترایانوس کی اس "دین پناہی" نے اُسے مسیحیوں میں بہت ہردلعزیز کردیا، اور قوم میں بھی اسکی منزلت بڑھ گئی۔ روما کی تاریخ شہنشاہیت میں آج بھی اُسکا نام روشن حروف میں نظر آرہا ہے۔

اسی شہنشاہ ترایانوس کے عہد کا وہ واقعہ بھی ہے، جس کی جزئی تفصیل اوپر کہیں گزرچکی ہے۔ بات یہ ہوئی کہ یہودی اپنی فطرت بد کی وجہ سے خارج البلد کر دیے گئے، اور عام طور پر شاہی حکم سے انکی جلاوطنی عمل میں آئی۔ فن سازش و بغاوت کے ماہرین خصوصی میں ہمیشہ اس قوم کا شمار ہوا ہے، چنانچہ اُس زمانہ میں بھی یہ لوگ خارج البلد ہوکر مشرق میں پھیل گئے، اور جہاں پہونچے وہاں سازش اور بغاوت کی آبیاری شروع کردی۔ اسکندریہ، انطاکیہ، پارتیا، آرمینیا، عرب نائیہ، غرض کوئی حصہ، کوئی قطر، کوئی گوشہ ایسا نہیں تھا، جہاں یہ پہونچے ہوں اور اُنھوں نے روما کا تختِ حکومت اُلٹنے کی کوششیں شروع نہ کردی ہوں۔
یہ روما کی شہنشاہیت کو اپنا دشمن سمجھتے تھے، اس لیے پوری قوت کے ساتھ اسکا استیصال کرکے دم لینا

چاہتے تھے۔ شہنشاہ ترایانو کو جب اُن کے اس عزم ناسعود کی اطلاع ہوئی تو وہ مردانہ وار اس خفیہ بغاوت کا قلع قمع کرنے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا، خود ہی فوج کی قیادت کی، اور نہر دجلہ تک بڑھتا ہوا یلغار کرتا ہوا پہونچ گیا۔ یہی وہ فتح تھی جسکی خوشی میں شہنشاہ ترایانو نے مجلس الشیوخ کے پاس اپنے حیچ قاصل کا ایک وفد روانہ کیا تھا، جس نے شہنشاہ کا یہ حکم سُنایا تھا کہ وہ اس تاریخی فتح کی مسرت میں عید نہرجان منائیں اور صلوٰۃ شکر بجا لائیں۔

افسوس کہ شہنشاہ ترایانو کی یہ فیروزمندیاں ابھی جاری تھیں کہ موت کا پنجۂ آہنی اُسکی گردن میں پیوست ہوگیا، اور وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہوگیا۔ اسکے بعد شہنشاہ ہیدریان کا قصہ ہوا، اسے اپنے پیشروے کوئی مناسبت نہیں تھی۔ اس نے مسیحیت کو تہ و بالا کردینے کی کوشش کی۔ اپنی شہنشاہی کا اعتراف کرانے کے لیے خود مختلف مقامات کا دورہ کیا۔ اس سلسلہ میں شمالی برطانیہ بھی گیا، وہاں سے فارغ ہوکر یونان پہونچا، اثینا میں قیام کیا، پھر روما آیا، یہاں سے اُٹھا تو انطاکیہ پہونچا وہاں سے بڑھا تو اسکندریہ پہونچ گیا تاکہ پھر روما واپس جائے، وہاں سے ایک فوج لے کر یہودیوں کے استیصال کے لیے فلسطین اس ساز و سامان کے ساتھ پہونچا کہ سارے شہر کو زیر و زبر کرکے رکھدیا اور خود، بیت المقدس میں قیام کیا۔

اوپر مارکوس اوریلیوس، ولیعہد، کی شادی کا ذکر ہوچکا ہے، اسکی مزید تشریح یہ ہے کہ شاہزادہ نے شاہزادی آنیا فوستنیا سے شادی کرلی، لیکن شاہزادی نہایت بد اطوار اور ناشایستہ تھی، ولیعہد کا اس سے شادی کرنا عام طور سے معیوب سمجھا گیا، اُسکی بد اطواری کا یہ عالم تھا کہ خود ولیعہد کو بھی خوش نہ رکھ سکی، اور اُس سے بھی ایسا ناشایستہ برتاؤ رکھا، جس نے اُسے بیدل کردیا۔ لیکن ولیعہد چونکہ شریفانہ اطوار و خصائل رکھتا تھا، اس بُرے طرز عمل کو بھی وہ انگیز کرتا رہا، اور اپنی روش میں اُس نے کسی قسم کا کوئی فرق نہیں آنے دیا، لیکن آدمی خوش قسمت تھا، کچھ ہی عرصہ کے بعد شہزادی کسی مرض میں مبتلا ہوئی، اور دفعتہً اُس کا انتقال ہوگیا۔ اس گلوخلاصی سے شہزادہ بہت خوش ہوا اور خدا کا شکر بجا لایا۔ ۱۸۰ء میں اس خوش اطوار شاہزادہ نے رحلت کی، صرف ۱۲ برس تک بحیثیت شاہنشاہ روما کے یہ زندہ رہا اور اسکے بعد اُسکا انتقال ہوگیا، جسکا عام سوگ منایا گیا۔

تاریخ قدیم کے یہ مباحث، جو دلچسپ بھی تھے اور سبق آموز بھی، گزر گئے۔ آئیے اس مجلس کو تھوڑی

یراور قائم رکھیں۔ تکمیل بحث کی خاطر یہ معلوم کرنے کی بھی کوشش کریں کہ ادستیا کی حقیقت کیا ہے؟
۶۷۲ء ق م میں، جو روما کے تیسرے شاہنشاہ، تولوس ہوستیلیوس کا زمانہ تھا، روما اور بالونجا کے باشندوں میں سخت جنگ ہوئی۔ اس بادشاہ کی دوراندیشی نے اسے یہ مشورہ دیا کہ وہ خود جنگ سے کنارہ کش رہے، اس کی یہ صورت سوچی کہ فریقین میں سے تین تین پہلوان میدان میں اتریں اور وہ فریق غالب مانا جائے، جو تینوں پر غالب آ جائے۔ روما کی طرف سے تین پہلوان جو آل ہوراشیو سے تعلق رکھتے تھے، میدان میں اترے، اور بالونجا کی طرف سے تین پہلوان جو آل کوریاتو سے متعلق تھے، آگے بڑھے۔ معرکہ آرائی شروع ہوگئی۔ روما کے گروہ سے دو آدمی گر گئے، تیسرے آدمی کو بھی آل کوریاتو نے زخمی کر دیا۔ اس طرح گویا ہوریاتو نے تیسرے آدمی کو بھی پچھاڑ دیا، لیکن ہوریاتو کے خاندان کی ایک لڑکی، اس تیسرے آدمی سے محبت کرتی تھی۔ جب اس نے اس شکست کا یہ منظر دیکھا تو واویلا شروع کر دی۔ لوگ اسے شہنشاہ کے پاس لے گئے کہ وہ اس نزاد دفغاں کا فیصلہ کرے، لیکن بادشاہ نے فیصلہ کرنے سے انکار کر دیا، پھر یہ مسئلہ اس محکمۂ قضا کے سامنے پیش کیا گیا جو صرف عورتوں کے عدالتی فیصلہ کے لیے قائم تھا۔ ہوراشیو نے اب خطرہ محسوس کیا اور معافی طلب کی، چنانچہ اسے معافی دیدی گئی۔

بالونجا کا شہنشاہ مولوس فوفیتوس، اس حرکت کو بنظر تعمق دیکھ رہا تھا، اسے یہ بھی احساس تھا کہ شکست سے آخر میں وہی دوچار ہوگا، چنانچہ اس نے ایک دوسری صورت اختیار کی، اور وہ یہ کہ شہنشاہ روما کو اطلاع دی کہ بعض اندرونی بغاوتیں، اس کی حکومت کو متزلزل کیے ہوئے ہیں، لہذا شہنشاہ روما اس نازک موقع پر اگر اسکی مدد کرے اور اسے ان آفات سے محفوظ کر دے تو وہ عمر بھر اس کا شکر گزار رہے گا۔ شہنشاہ روما نے غایت درجہ انسانیت و شرافت سے اس کی یہ فریاد سنی اور امداد پر آمادہ ہوگیا، لیکن فوراً ہی اسے اطلاع مل گئی کہ اسکے ساتھ دغا کی گئی ہے، چنانچہ اس نے دعا کی کہ اگر مجھے کامیابی اور ظفرمندی نصیب ہوئی، تو ایک بہت بڑے شہر کی تعمیر کروں گا، جو اپنی عظمت و رفعت کے لحاظ سے ساری دنیا کے لیے نمونہ ہوگا، اور اسکا نام ادستیا رکھونگا —————— ادستیا رومیوں کی ایک دیوی کا نام ہے، جسکا وہ بہت ادب و احترام کرتے ہیں۔ حسن اتفاق کہ کامیابی رومیوں کے حصے میں آئی، اور شہنشاہ روما نے اپنے دشمنوں کا اچھی طرح خاتمہ کر کے رکھ دیا، ایسا کہ پھر کسی کو سر اٹھانے کی جرأت نہ ہو۔

بادشاہ روما نے، بالونجا کے خائن اور غدار بادشاہ کو گرفتار کیا اور اسے نہایت حیرت انگیز طریقہ پر سزائے موت دی، تاکہ لوگوں کو عبرت ہو اور وہ اسکے اس فعل سے سبق حاصل کریں۔

اس فتح کے بعد، شاہنشاہ نے اپنی نذر پوری کرنی چاہی۔ چنانچہ وہ جنگ کے دیوتا کے مندر پر گیا اور وہاں قربانی کی رسم ادا کی۔ ان مراسم سے فارغ ہونے کے بعد اُس نے اپنی نذر پوری کی اور ایک عالیشان شہر اوستیا نامی کی بنا ڈالی، جو حقیقۃً اسلوب و وضع کے لحاظ سے ایسا اعلیٰ درجے کا تھا کہ واقعی دنیا کے لیے نمونہ ثابت ہوا۔

یہ ہے شہر اوستیا کی کہانی، اور اُس دیوی (اوستیا) کی کہانی، جسکے نام پر اس کی تعمیر ہوئی۔ یہی وہ شہر ہے، جو اب ایک کھنڈر کی صورت میں، مسٹر جو یڈو کی محنت و کوشش کے بعد دریافت ہوا ہے۔ اس کے آثار اب بھی اس کی عظمت ماضی کے آئینہ دار ہیں، اور ان سے بہت سے سبق حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

(ترجمہ از عربی)

فغانِ آرزو

(جناب منشی انور حسین صاحب آرزو لکھنوی)

کل قہقہہ مینا کا تھا اب چشمِ تر ساغر ہوں میں
بدلی ہے طرزِ زندگی افسانۂ دیگر ہوں میں

تم شکوے سن سکتے نہیں اور لٹ کے کیونکر چپ رہیں
فیصل ہے یہ جھگڑا ابھی کہہ کہ غارتگر ہوں میں

جاں اک امانت جسکی تھی پھر آج اُسی کو سونپ دی
قاتل سے اپنے سرخرو خونِ لبِ خنجر ہوں میں

اک چپ کے معنی سیکڑوں اک غم پہ لاکھوں تہمتیں
اُتنا ہی رسوا ہے جہاں جتنا حیا پرور ہوں میں

مشقِ ستم سے پوچھ لے ترکِ ستم سے پوچھ لے
پتھر سے بڑھکر سخت ہوں شیشے سے نازکتر ہوں میں

جب سوزِ غم افزوں ہوا شعلہ سا لہرانے لگا
چپ رہ کے بھی سب کہہ گیا کتنا زباں آور ہوں میں

ہے بیقراری زندگی اور موت دم بھر کا سکوں
اس دشتِ پُر آشوب میں اک موجۂ صرصر ہوں میں

سیلابِ بحرِ شوق کی ہر موج ہے موجِ آفریں
مٹنا مرا دشوار ہے یکطرح صد پیکر ہوں میں

کم کر گئے گرمی شوق کی پایا نہ منزل کی طرف
پگھلا ہوا اولا ہے دل پانی نہیں پتھر ہوں میں

جب آرزو کچھ پڑھ دیا محفل کو وجد آنے لگا
اس دورِ بے کیفی میں بھی اک گردشِ ساغر ہوں میں

اصطلاحات فلسفہ پر تنقید

(سلسلہ کے لیے ملاحظہ ہو الناظر بابت اکتوبر ۳۴ء)

منطق

تنقید بر اصطلاحات منطق ترجمۂ جناب مولانا عبدالماجد صاحب بی اے

ٹ - جن الفاظ پر * یہ نشان ہے وہ اب تک عربی منطق میں رائج ہیں - نئے ترجمہ کی ضرورت نہیں ہے -

اصطلاح انگریزی	اصل ترجمہ	ترجمۂ جدید	تبصرہ و تشریح
Agreement	موافقت	اتصال *	
Dis-agreement	مخالفت	انفصال *	
Analogy	تمثیل	تشبیہ	
Invariable	دائمہ	ثابت - قدیم *	ثابت یا قدیم وہ شے ہے جس میں تغیر و تبدل نہ ہو سکے - دائمہ غلط ترجمہ ہے - اس لیے کہ دائمہ وہ قضیہ موجبہ ہے جس میں موضوع کا ثبوت یا سلب محمول کے لیے ہمیشہ رہے -
Argument	بُرہان	دلیل *	بُرہان دلیل قطعی کو کہتے ہیں -
Attributes	اعراض	صفات	عرض Accident کا ترجمہ ہے
Axioms	براہین اولیہ - علوم متعارفہ - اوّلیات	اوّلیات	
Beliefs	یقینیات	عقائد	یقین Certainty کی انگریزی ہے
Fundamental beliefs	اولیات - یقینیات اوّلیہ	عقائد اساسی	
Universal beliefs	اولیات عامہ یقینیات عامہ	عالمگیر عقائد	عامہ General کا ترجمہ ہے

Cause, direct	علت مستقیم	علت بینہ *	
Cause, final	علت غائی	علت تامہ *	علتِ غائی وہ مقصد ہے جس کے لیے کوئی فعل کیا جائے۔ مثلاً تخت بنانے کی غرض اُس پر بیٹھنا ہے۔
Characteristic	خاصّہ	خصوصیت	فاضل مترجم نے Property کا بھی ترجمہ خاصّہ کیا ہے۔
Circumstances	عوارض۔ حالات	حالات	
Cognition	تعقل	ادراک *	
Classification	اصطفات	تقسیم۔ ترتیب	
Data	معطیات	مفروضات *	
Definition Redundant	تعریف زائد	رسم *	
" Provisional	تعریف عارضی	تعریف فرضی	
Difference	تفریق	فرق	
Division Incomplete	تقسیم غیر کامل	تقسیم ناقص	
" Over Complete	تقسیم اکمل	تقسیم زائد یا تقسیم مفصّل	
Extensive	وسعت	وسیع	
Fallacy of Accident	مغالطۂ اتفاق	مغالطۂ اتفاقیہ	اتفاق اور اتفاقیہ میں فرق ظاہر ہے۔
" " appeal to passion	مغالطہ مرافعہ لتشافق	مغالطہ استرحام مغالطہ	
Fallacy Popular	مغالطہ دلیل مرافعہ الی تشافق العوام	مغالطۂ عوام	شیخ کی ایک کتاب بھی اسی نام سے موسوم ہے جسے "مغالیط عامّہ" کہتے ہیں۔
Fallacy Verecundian	مغالطہ استناد الی تعظیم المستندین العظام۔	مغالطہ استناد	
Inference	انتاج۔ استنتاج	نتیجہ	انتاج نتیجہ دینے کو کہتے ہیں۔

Inference immediate	استنتاج بدیہی	نتیجۂ فوری	
" mediate	" نظری	" بالواسطہ	
Logic of Certainty	منطق یقینی	منطق یقین	
" Probability	" احتمالی	منطق امکان	
Percepts	مدرکات	تصورات	
Proposition hypothetical	قضیہ فرضیہ	قضیہ مفروضہ	
Proposition indefinite	قضیہ مہملہ	قضیۂ غیر معین	
" Symbolic	قضیہ اموزجی	قضیۂ علامتی	
Mind	نفس	نفس، من	
Science	حکمت	سائنس۔ علم	حکمت کا ترجمہ ہے Philosophy
Dilemma	قیاس محتمل منذرین	توریہ *	
Synthetic Method	اسلوبِ تحلیل	طریقۂ ترکیبی	تحلیل کا ترجمہ ہے Analytical
Term Abstract	حد مجردہ	حد معناتی	
" Concrete	حد مقرون	حد ذاتی	
Verification	امتحان	تصدیق *	

نفسیات

تنقید بر اصطلاحات اصول نفسیات ترجمۂ جناب پروفیسر مقصود ولی الرحمٰن صاحب ایم اے۔ (عثمانیہ یونیورسٹی)

اصطلاح انگریزی	اصل ترجمہ	ترجمۂ جدید	تبصرہ و تشریح
Accomodation	توفیق	تطبیق	توفیق کے معنی ہیں کامیابی۔ مالدار ہونا
Acranial	بے سر دو دھارا	بے سر کی دو دھاری	
Amphioxus		مچھلی	

Altruistic Emotions	اخوانی جذبات	جذبات ایثار	
Amphibian	خشک آبی	دو جنسے	ایسے جانور جو دو قسم کی زندگی بسر کرتے ہیں Amphi ، دو bios ، زندگی
Analysis Intellectual	تحلیل عقلی	تحلیل ذہنی	
Anatomy	علم تشریح الاجسام	تشریح	
" Comparative	تطبیقی " "	تشریح تقابلی	
Aphasia	فقدان تکلم	نقصان تکلم زوال گویائی	دماغ کے کسی حصہ کی خرابی کی وجہ سے اظہار خیالات پر قادر نہ ہونا۔
Appetite	اشتہا	خواہش	
Association	تلازم	تصاحب	
" by Contiguity	تلازم بالمقارنت	تصاحب بالاتصال	
" Successiv	تلازم متعاقب	تصاحب ترتیبی	
Attention	توجہ خود رو	توجہ اختیاری	
Spontaneous		توجہ فطری	
" Non-voluntary	توجہ عدیم الارادہ	توجہ غیر ارادی	
" Involuntary	توجہ غیر ارادی	توجہ خلاف ارادی	وہ توجہ جو ارادہ کے خلاف کسی چیز کی طرف ہو۔
Cell	خلیہ	خانہ	(خانہ دار Cellular)
Blood Vessels	اوعیۂ دموی	رگہائے خون	
Bulb	بصل	گرہ	
Buccal	بوقی	رخساری۔ حنکی	بوق ایک جزو ہے اور بوقی اسی سے منسوب معلوم ہوتا ہے۔
Capsule	درج	کیسہ خول محفظہ	
Chiasma	صلیبیہ	تقاطع	دو خطوں کا ایک دوسرے کو قطع کرنا مثلاً ×
Cochlea	قوقلیہ	گھونگا پرتو۔ حلزون الاذن	

Dura Mater	ام جافیہ	سخت دماغی جھلی	اس کے لغوی معنی ام جافیہ (سخت ماں) ہیں۔
Pia mater		نرم دماغی جھلی	(لغوی۔ نیک ماں)
Concord	ہمواری	ہم آہنگی، سُر ملانا (ساز یا باجا ملانا)	ہمواری زمین وغیرہ کے برابر ہونے کو کہتے ہیں۔
Comparative Psychology	نفسیات تطبیقی	نفسیات تقابلی	Comparision کا ترجمہ خود فاضل مترجم نے مقابلہ کیا ہے۔
Complex Tone	مرکب صوتی	لہجہ مضاعف	
Conation	طلب	قوت ارادی	
Conductivity	موصلیت	— رسانی	
Constrictor	عاصرہ	سمٹنے والا پٹھا	عربی میں "عضلہ عاصرہ" کہتے ہیں
Co-ordination	تطابق	تسویہ - برابری	
Cornea	قرنیہ	پتلی	قرنیہ بھی صحیح ہے
Consciousness	شعور	آگہی - ہوش	آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچھائے (غالب) ساقی بجلوہ دشمن ایمان و آگہی (غالب)
Corpora quadrigemina	اجسام رباعیہ	چو جڑواں جسم یا چار جسمے	اس کی عربی اجسام توأمیہ اربعہ ہے۔
Corpuscle	جسیمہ	جسیم - ذرہ	جسیمہ غلط ہے۔
Delusions	غوایات	دھوکا - فریب	
Discord	ناہمواری	اختلاف نغمہ - بے سُرا پن	
Dissonance	"	" "	
Drum	طبلہ	پردۂ گوش، صماخ	عربی ہے طبلۃ الاذن۔ صرف طبلہ غلط ہے
Ego	الیغو	خود - انا	
Egotistic Emotion	جذبۂ الیغوئی	جذبۂ خودی یا انانیت	
Emulation	مبارزت	مقابلہ	
Eustachean tube	اوستاکی نالی	کان کی حلقی نالی	اُستاکیوس ایک اطالوی طبیب تھا جسکے

			۔ یہ نالی ہے جو اندرونی کان اور منہ کے پچھلے حصہ کو ملاتی ہے۔
Extensity	امتدادیت	وسعت	
Familiarity	مانوسیت	اُنس۔ بےتکلفی	
Feeling	حسیت	احساس۔ حاسہ	
Freedom of the will	آزادیٔ ارادہ	اختیار	
Fusion	امتزاج	آمیزش۔ ملاوٹ	
Ganglion	عقدہ	گرہ	
General Idea	عام مثال	عام تخیل	
Generic "	جنسی مثال	جنسی تخیل	
Hippo Campal	ہیپوکمپی	متعلق ماہی اسپ کا یا متعلق بہ اسپ ماہی	
Hydroid	آبماں	کرم آبی۔ جل کیڑا	
Hypnosis	حالت تنویم	خواب مصنوعی۔ نقلی نیند	
Idea	مثال	خیال	
Ideation	تمثل	تخیل	
Ideational	تمثلی	تخیلی	
Illusion	التباس	فریب نظر۔ دھوکا	
Imagination	تخیل	تمثل۔ تصور	
Imitation	تقلید	نقل	
Instinct	جبلت	میلان فطری۔ طبیعت یا رجحان	
Intellectual	عقلی	ذہنی	
Interjection	ندائیہ	کلمۂ استعجاب	
Introspection	مطالعہ باطنی	باطن بینی۔ مراقبہ نفس	

Joint	مفصل	جوڑ - بند	
Lapsed intelligence	عقلِ مسقوط	کند ذہنی	
Lens	عدسہ	لنز	عدسہ بھی صحیح ہے مگر اُردو میں لنز ہی اچھا ہے
Lobe	فص	لَو	
Mind	ذہن	نفس - من	خیال - ارادہ + احساس + حافظہ + عقل کا نام نفس ہے۔
Octave	سرگم	آٹھواں پردہ آٹھواں سُر	سرگم پورے ساتوں سُروں کا مخفف ہے۔
Onomatopoetic	صوتی	صوت نما، نقل صوت	
Optimistic	رجائی	خوش خیال - زندہ دل	
Perception	ادراک	تصور	
Pitch	استواء آواز	رفعت صوت بلندی آواز	
Productive Imagination	تکوینی تخیل	تصور تکوینی	
Relaxation	رخاوت	ڈھیل تخفیف	
Reproduction	محاکات	استحضار	دوبارہ یاد کرنا۔
Retention	خازنیت	رکاوٹ - روک	خزن کے معنی ہیں جمع کرنا یا چھپانا
Retina	شبکیہ	جالدار جھلی	
Sameness	ہویت	یکسانیت	
Satisfaction	تشفی	اطمینان	اُردو میں تشفی کے معنی ہیں تسلی کے (یعنی دلاسا)
Secretiveness	اخفائیت	رازداری - [illegible] [illegible]	
Sentiment	وجدان	تاثر - کیفیت	
" Concrete	وجدانِ [illegible]	تاثر [illegible]	

Strain	جہد	کوشش بلیغ، تناؤ	
		آرائی - نغمہ	
Sub-Consciousness	تحت شعور	زیر آگہی - کم آگہی	
Suggestion	تاثر - تاثر آفرینی	اشارہ - ایما	
Sympathetic System	نظام اشتراکی	نظام مواسات نظام ہمدردی	اشتراک سیاسی اصطلاح ہے جو ملکیت کے مشترک ہونے کے متعلق ہے
Temporal	زمانی	دنیوی - فانی	روحانی اور دائمی کی ضد
Timbre	کیفیت (آواز)	اختلاف صدا، وغیرہ	دو باجوں کے ایک ہی سُر کا اختلاف صوتی
Tone	سُرتی	لحن - سُر	
" Combination	سُرتی مرکبیت	آمیزش سر	
Tympanum	طبلہ	پردۂ گوش - دف گوش	عربی ہے طبلہ الاذن
Telepathy	دور اثری	دور احساسی	Pathos کے معنی ہیں احساس
Unconsciousness	غیر شعوری	بیہوشی - عدم آگہی	
Ventricle	تجویف	جوف بدنی	تجویف مصدر ہے
Vibration	ارتعاش	لرزش - تھرتھراہٹ	
Vocal Cord	حبل صوتی	رشتۂ آواز	

مابعد الطبیعیات

تنقید بر اصطلاحات مابعد الطبیعیات مترجمۂ جناب مولوی عبد الحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو

اصطلاحات انگریزی	اصلی ترجمہ	ترجمۂ جدید	تبصرہ
Academy	اکادمیہ	اکاڈمی	
Aposteriori	غیر اولی	تجربی	
Apriori	اولی	پیدائشی، خلقی	بالکل لفظی ترجمہ مفہوم پر حاوی نہیں ہے
Contemplation	غوص	مراقبہ - تفکر	غوص کے معنی ہیں غوطہ لگانا۔

Dynamism	قوتیت	حرکیت	
Eternity	سرمدیت	ازل - ابد	
Full	ملا	بھرا ہوا - پر	(عربی ملآن ہے)
Geocentric	ارضی مرکزی	ارض مرکزی - زمین مرکزی	
Hylozoism	ہیولی	مادی حیاتیت	
Indifferent	تغافلی	بے پروا	
Mechanism	میکانیت	میکانکیت، اشینیت	میکانیت مکان سے مشتق ہے اس لیے غلط ترجمہ ہے۔
Monad	خود	واحدہ - ذرہ	ایسا ذرہ جو قوی ہو - (لیبنز)
Monadology	خودیات	واحدیات - ذریات	
Mythology	خرافاتی ضمنیات	متھیا	یہ سنسکرت کا لفظ بالکل انگریزی کا ہم معنی ہے۔
Neo platonism	اشراق	نو فلاطونیت، افلاطونیۃ الحدیثہ، نو اشراقیت	اشراق صبح کے وقت روشن ہونے کو کہتے ہیں - افلاطون و بقراط اسی نسبت سے اشراقی کہلاتے تھے لیکن اشراقیت اور نو اشراقیت کے عقائد میں فرق ہے۔
Nihilism	نافیت - نفیت	عدمیت	
Optimism	رجائیت	زندہ دلی خوش فالی	
Paganism	پیگانیت	کفر - الحاد	
Pagan	پیگان	کافر - ملحد	
Pan theism	وجودیت	مذہب ہمہ اوست	وجودیت سے مفہوم ادا نہیں ہوتا
Positivism	واقعیت - اثباتیت	مذہب وضعی، وضعیت	یعنی فلسفہ کا مت جو واقعات پر مبنی ہے۔ اور علتوں کے امکان سے قطعی انکار کرتا ہے۔

Sensualism Sensism Sensationalism	شہوانیت	حسیت - مذہب الحسی	شہوانیت برے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔
Stoicism	رواقیت	رواقیت - یوگ	
Personification	تشخص	التباس - بہروپ	
Pessimism	قنوطیت	مردہ دلی - بدفالی	عربی تشاؤم ہے
Place	أین	مکان	
Time	متی	زمان	
Zeus	زینون	زیوس	یونانیوں کا ایک دیوتا - اسم علم ہے اصطلاح نہیں ہے۔

شہابِ ثاقب

(جناب مرزا ثاقب صاحب قزلباش لکھنوی)

شکر ہے بوے وفا شامل ہے بوے دوست میں
اُڑ رہی ہے خاک دل مدت سے کوے دوست میں

واے قسمت کب دیا گوشِ سماعت نے جواب
کچھ مزا ملنے لگا جب گفتگوے دوست میں

نازشِ دیر و کلیسا بدحواسی میں بڑھی
کوے دشمن تک گیا میں جستجوے دوست میں

گوہرِ یکدانۂ دل کھلتے کھلتے رہ گیا
غرق تھا مدت سے فکرِ آبروے دوست میں

زندگی سے دشمنی ہے کیا کروں مجبور ہوں
موت رہتی مجھ کو نظر آتی ہے روے دوست میں

دل کو رکھا ذکر میں مشغول جب تک دم رہا
زندگی ثاقب بسر کی گفتگوے دوست میں۔

لکھنوی اور دہلوی مدارس شاعری پر ایک تحقیقی اور تنقیدی نظر

(جناب منشی [illegible] احمد [illegible] صاحب [illegible] بی اے ایل ایل بی وکیل)

(۱)

ادب کا مفہوم [illegible] لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ ادب اور ادب کو ادب بنانے والوں کی ہستیاں کچھ اس طرح ایک دوسرے کے ساتھ توام ہیں کہ ایک کے بغیر دوسرے کا تذکرہ "جسدِ بے جان" سے زیادہ حقیقت و وقعت نہیں رکھتا۔ بالفاظ دیگر ہر ادبی شاہکار ہمارے ذہنی احساسات کو اُس شخصیت کی جانب منتقل کر دیتا ہے جس کے علم و فضل، قابلیت و کمال کا وہ ثمرہ ہے جس کے خیالات و جذبات کا وہ آئینہ ہے۔ لامحالہ ہر ادب [illegible] ہے جنہوں نے اُس کے سنوارنے میں اہتمام بالشان [illegible] اس ادب کو ادب کا مرتبۂ اعلیٰ حاصل ہوا ہے" اور گو یہ عذر [illegible] حق بجانب ہے کہ [illegible] زندگی پر تفصیلی بحث کرنے سے "تضیعِ اوقات" اور "دور از موضوع" ہو جانے کا اندیشہ ہے لیکن اس امر سے بھی کسی طرح انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ادب کے "بحرِ ناپیدا کنار" کے ہر ہر گوہر آبدار کی "چمک دمک" "وضع و بناوٹ" "حسن و قبح" سب پر خصوصیت کے ساتھ عمیق اور مفصل تبصرہ کیے بغیر "ذوقِ ادب" کے "تشنہ کام" رہ جانے کا کھٹکا ہے۔

ادب کسی قوم اور کسی زبان کا ہو اُس کا ارتقا کے مختلف ادوار سے گزرنا لازمی ہے۔ وہ صدی سے صدی اور قرن سے قرن میں بدلتا اور تغیر پاتا رہتا ہے۔ ہر نیا ستارہ جو ادب کے درخشاں اُفق پر طلوع ہوتا ہے اور ہر پرانا ستارہ جو اس ادبی اُفق پر کبھی [illegible] چمک کر غروب ہوتا ہے، ستارۂ ماقبل و مابعد سے اسی طرح متعلق ہوتا ہے جس طرح شب و روز سے صبح صادق یا آسمان و زمین سے اُفق۔ ستارے طلوع اور غروب ہوتے رہتے ہیں [illegible] اُفق کی حیثیت اور نکہت دونوں کو متاثر کرتے رہتے ہیں لیکن ایک زمانہ آتا ہے جب ایک خورشید [illegible] نمودار ہوتا ہے [illegible] فضاؤں اور تجلیوں [illegible] دوسرے تمام ستاروں کی روشنی کو ماند کر دیتا ہے۔ یہ غیر معمولی شخصیت کا مالک باکمال اپنے عہد کی [illegible] اپنے اثرات چھوڑ جاتا ہے اور اگر اُس کے بعد کے آنے والے [illegible] "جادۂ ادب" کے افکار کا بغور مطالعہ کیا جائے تو پتہ

چلے گا کہ ان میں سے تقریباً سب "دانستہ یا نادانستہ" اُسکے افکار سے متاثر اور اُسکے کمال کے مرہونِ منت ہیں، اور اُنکے کلام اور طرزِ کلام میں اُسی کے اثرات کی جھلک نمایاں ہے۔ یعنی جب کوئی باکمال شہرت اور ہر دلعزیزی حاصل کرکے بقائے دوام کا مرتبہ حاصل کر لیتا ہے تو اُس کے پیرو اور اُس کی نقل کرنے والے عرصہ تک وجود میں آتے رہتے ہیں۔ اس طریقے سے مختلف اسکولوں کی بناء پڑتی ہے اور متعدد تحریکیں رُونما ہوتی ہیں۔ یہ تحریکیں ایک مدت تک باقی رہتی ہیں لیکن جوں جوں "نظریۂ ذوق" متغیر ہوتا ہے یہ بھی محو ہوتی جاتی ہیں اور انکے ساتھ ساتھ اُنپر قائم شدہ اسکول بھی مٹتے رہتے ہیں۔ انکے اختتام کے بعد ان کی جگہ دوسرے اسکول اور دوسری تحریکیں لے لیتی ہیں —— ہم تاریخ کے اسکول کا ذکر کرتے ہیں تو ہمارا مقصد اُن تمام شعراء سے ہوتا ہے جنھوں نے اُس کا تتبع کیا۔ جنھوں نے اُسی "طرزِ ادا" اور اُسی "طرزِ تخیل" کی پیروی کی جسے تاریخ نے معراجِ کمال تک پہونچا دیا تھا —— آج سے پچھتر برس پہلے نثر نویسی کا جو طریقہ رائج تھا اُسکی بناء کرنے والے لکھنؤ کے مرزا رجب علی بیگ سرور تھے۔ انکی روشِ تحریر نے عرصہ تک لوگ کے تمام طبقے کو متاثر رکھا۔ اور اس لحاظ سے ہم اُس عہد کے طرزِ تحریر کو "سرور اسکول" کی نثر کے نام سے موسوم کر سکتے ہیں۔

اس نوعیت کی تحریکیں اور اس قسم کے اسکول ادب کے ارتقائی نشو و نما میں بہت اہم حصہ لیتے ہیں۔ ہر اسکول کا سرگروہ ایک نہ ایک باکمال ہوتا ہے۔ کمال کے معنی مختلف اصحاب کے ذہن میں جدا جدا ہیں۔ کسی کا خیال ہے کہ کمال نام ہے "شخصیت کے اقتدار" کا۔ کوئی کہتا ہے کہ کمال عبارت ہے "جدت طرازی کی صلاحیت" سے۔ بہرطور کمال کا مفہوم خواہ کچھ ہی ہو، یہ امر مسلم ہے کہ ہر حقیقی باکمال دُنیا میں ایک کلیۃً جدید اور نرالی شے کے وجود میں لانے کا باعث ہوتا ہے —— خود اپنی ذات —— اور چونکہ وہ اپنے کمال کے تمام حقائق و معارف کو اپنی ہر تصنیف میں حل کر دیتا ہے اس لیے اُس کا ہر "کار" دُنیا کے تمام "تصانیف" سے متمائز کیا جا سکتا ہے اور بہرطور باکمال کی ان امتیازی خصوصیات کو ملحوظ رکھنا تمام "نقادانِ ادب" کا پہلا فریضہ ہے۔ اس موقع پر ہم کو یہ امر نہ فراموش کر دینا چاہیے کہ مصنفین جن کے متعلق عام طور پر یہ تخیل ہے کہ وہ کلیۃً جدت طراز تھے اور یہ کہ اُنکے اولی کوائف کسی دوسری ہستی کے کارناموں یا خیالات کے منت کش نہیں ہیں، اُن میں سے بھی اکثر ایک حد تک دوسروں کے "جامِ تخیل" کے بادہ خوار اور آوروں کے "گلشنِ فکر" کے خوشہ چیں ہوتے ہیں —— نواب مرزا خاں صاحب داغ دہلوی مرحوم کے متعلق عام طور پر یہ گمان کیا جاتا ہے کہ اُن کا "رنگِ فکر" اُنھیں کے لیے مخصوص تھا، کہ اُنھوں نے ہی اسکی بنیاد ڈالی اور اُنھیں پر یہ ختم ہو گیا لیکن نفس الامر میں حقیقت یہ ہے کہ جس مخصوص طرزِ تخیل کو اُنھوں نے اپنی ذہانت اور حسنِ ادا سے چرخِ ہفتم پر پہونچا دیا تھا وہ اُن سے برسوں قبل جراُت کے ہاتھوں آغاز کی عزت حاصل کر چکا تھا اور جس

پودے کو اُنھوں نے "خونِ فکر رنگین" سے پروان چڑھایا اُس کی نشوونما اور آبیاری مدتوں جرأت کے ہاتھوں سے ہوتی رہی تھی۔

جرأت:

(۱) چمپئی رنگ اُس کا اور جوبن وہ گدرایا ہوا — ہے نشہ اب تک آنکھوں میں ہے چھایا ہوا

(۲) ہمارے سر پہ چھائی ہیں بلائیں شام ہجراں کی — وہ اپنے شانے پہ ہیں بال ادھر کھولے اُدھر باندھے

(۳) ادا جان لیتی ہے بانکی تمھاری — ستم ڈھا رہی ہے جوانی تمھاری

رنگین:

(۱) اک ادا مستانہ سر سے پاؤں تک چھائی ہوئی — اُف تری کافر جوانی جوش پر آئی ہوئی

(۲) قیامت ہیں بانکی ادائیں تمھاری — ادھر آؤ لے لوں بلائیں تمھاری

(۳) یہ سیر ہے کہ دوپٹہ اُڑا رہی ہے ہوا — چھپاتے ہیں جو وہ سینہ کمر نہیں چھپتی

میر انیس مرحوم جس صنف شاعری کے خداوند ہیں اُس کی تعلیم اُنھوں نے مرثیہ گو حضرات کے کلام سے حاصل کی تھی، میر کے متعلق عام طور پر یہ تصور ہے کہ وہ اپنے مخصوص رنگ میں سب سے علیحدہ تھے کہ اپنے امتیازی طرز میں وہ صرف آپ اپنا جواب تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ گو میر کا سا انداز بیان نہ کسی کو اُن سے پہلے نصیب ہوا تھا نہ اُن کے بعد کسی کے حصہ میں آیا مگر اُنھوں نے قدم محض اسی راستے پر اُٹھایا جس کی بنا میں اُن سے پیشتر کئی شعرا نے قائم کر دی تھیں، اسمٰعیل میرٹھی، آزاد اور حالی، جو ہندوستان میں قدرتی اور نیچرل شاعری کے علمبردار متصور ہوتے ہیں، بڑی حد تک مغربی زبانوں کے اساتذہ کے مرہونِ منت ہیں۔

جیسا کہ میں نے اس سے پہلے لکھا ہے ادب تغیر پذیر ہے اور صدی سے صدی، قرن سے قرن بدلتا رہتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح ہر زمانے میں ذہنیتِ عامہ کا ایک خاص رجحان ہوتا ہے، عوام الناس کی دلچسپیاں اور جذبات ایک مخصوص اور امتیازی رنگ کے ہوتے ہیں، اسی طرح ہر دور کا ذخیرۂ ادب بھی چند خاص اور ساعتی نظریہ جات سے متاثر ہوتا ہے۔ یہ نظریے ایک محدود دورانِ وقت تک باقی رہتے ہیں پھر فنا ہو جاتے ہیں اور ان کی جگہ دوسرے نظریے لے لیتے ہیں۔ ایک دور کے نظریوں سے دوسرے دور کے نظریوں میں ضرور کچھ نہ کچھ اختلاف ہوتا ہے۔ موجودہ دور سرسید، حالی، آزاد، شبلی اور نذیر احمد کے دور سے کچھ زیادہ دور نہیں۔ مگر باوجود اس کے موجودہ دور اور اُس دور کے مذاقِ عام اور ادبی نظریوں میں کس قدر تفاوت ہے، بہت سی چیزیں اُس میں ایسی ہیں جو ہم کو بہت دلکش اور عجیب معلوم ہوتی ہیں اور بہت سے تخیلات ایسے ہیں جو اُس دور میں کلیۃً معدوم تھے۔ مگر آج کے ادبی کارناموں میں بخوبی نمایاں ہیں ——— میر حسن کے زمانے میں سحر البیان کی ستائش کا

کیا ٹھکانا ہوگا، جانِ عالم پیا کے اختر نگر میں ناسخ اور وزیر کے اشعار پڑھتے ہیں اُڑ جاتی ہوں گی جھلملاتی ہوئی شمع کے سے لکھنؤ میں گلزارِ نسیم کی بیتوں پر سامعین بسمل ہو جاتے ہونگے، لیکن آج کیا حال ہے، سحر البیان اور گلزارِ نسیم کو ادبی کارنامے سمجھ کر ان کی قدر و منزلت کر لی جاتی ہے، گر اُن میں ظاہر شدہ خیالات پر سامعین کی بھویں تن جاتی ہیں۔ ناسخ اور وزیر کے افکار کو اساتذہ کے زورِ تخیل کا حاصل سمجھ کر اُن سے بے ادبی نہیں کیجاتی مگر کراہت کے اظہار سے سننے والے باز نہیں رہتے —— اس سب کا مقصد یہ ہے کہ ہم کو ادب کے مطالعے میں مصنفین کے انفرادی تاثرات کو فراموش نہ کرنا چاہیے کیونکہ کامل ترین باکمال بھی اپنے دور کے میلانات و جذبات، تہذیب و تمدن، احساسات و ادراکات سے محفوظ نہیں رہتا بلکہ اُس سے متاثر ہوتا اور اس ماحول کے تاثرات کو قبول کرتا ہے۔ سلطنتِ عباسیہ کی تاتاریوں کے ہاتھوں بربادی نہ ہوتی تو سعدی کا دل ہلا دینے والا مرثیہ وجود میں نہ آتا، فرانس کی تمدنی، معاشرتی زندگی اٹھارویں صدی میں ناگفتہ بہ نہ ہوتی تو والٹیر کے کارنامے آج موجود نہ ہوتے، لکھنؤ واجد علی شاہی عیش پرستی و بدمستی کا گہوارہ نہ ہوتا تو ناسخ، امانت وغیرہ کے افکار صفحۂ ہستی پر نہ آتے۔ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اپنے دور کی ذہنیت کو بھی اپنے وجود سے متاثر کرتا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ یہی وہ شے ہے جس میں مسلم الثبوت اور ہر دلعزیز اہلِ کمال کی کامیابی کا راز مضمر ہے یعنی یہ کہ پبلک نے اُنکے کلام کی داد کس طرح دی اُنکے افکار کا استقبال کس طرح کیا — اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمارا فرض ہے کہ ہر باکمال کو خواہ وہ شاعر ہو یا ناظم، ناثر ہو یا مؤلف اُس کے دورِ حیات کا افسردہ تصور کرنا چاہیے اور اُس پر تنقید و تبصرہ کرنے کی ساعتوں میں اس صداقت کو نظر انداز نہ کر دینا چاہیے، یعنی اُس کے حسن و قبح کو تولتے وقت ہمیں اُن اثرات کا جن سے اُسکی تخیل متاثر ہوئی، اُن جذبات کا جن سے اُس کا مذاق بنا، اُن احساسات کا جن سے اُسکے کلام کو امتیازی حیثیت حاصل ہوئی، لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

اس قسم کے اثرات کبھی محض ادبی ہوتے ہیں یعنی اُن کا انحصار کتابوں پر اور اُن کی انتہا ان کتابوں کے لکھنے والوں تک ہوتی ہے۔ اس نوع کے اثرات کے عمیق مطالعہ سے ہمیں اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح نئے مذاق پیدا ہوتے اور پرانے مردہ ہوتے ہیں، لیکن بیشتر یہ اثرات ادبی حیثیت سے بڑھ کر سیاسی، سماجی اور تمدنی ہو جاتے ہیں۔ بھلا یہ کیونکر ممکن ہے کہ کسی ملک کی کشمکشِ حیات کے ایک خاص دور میں ملک کے باشندوں کے خیالات و جذبات، تمدن و تہذیب، اخلاق و معاشرت میں تغیر ہوتا رہے اور ملک کا ادب ان سب سے الگ تھلگ ان شورشوں سے علیحدہ رہے اور اثر نہ لے۔ ہم کسی ادبی کارنامے کے متعلق یہ تصور نہیں کر سکتے کہ وہ اپنے ماحول سے جدا ہو کر وجود میں آیا، ہم اس پر مجبور ہیں کہ اس کی بابت تصورات ذہن میں

لاتے وقت یہ ملحوظ رکھیں کہ اس کا مصنف فلاں عہد میں پیدا ہو کر فلاں زمانے میں برسرِ عروج تھا۔ اس کی شخصیت اس قسم کی تھی۔ اس کے ماحول میں یہ اجزا شامل تھے، اس کے زمانے میں یہ شورشیں اور یہ تحریکیں برپا تھیں۔ قدیم یونان کے ڈراما نگاروں کے حالاتِ زندگی اس نظریہ کی تائید کرتے ہیں۔ موجودہ دَور کے اسلامی شعراء اس صداقت کے زندہ ثبوت ہیں۔ غرض ہم اس پر مجبور ہیں کہ کسی ادب کے کسی دَور کے مطالعہ کے وقت نہ صرف اُس دَور کے باکمال اشخاص کے زمانۂ حیات کا بغور مطالعہ کریں، بلکہ اُس دَور کے عام اقتصادی، سیاسی، تمدنی، معاشرتی حالات پر بھی نظر رکھیں، کہ ان کے بغیر ادب کے مطالعہ کے نامکمل اور تشنہ رہ جانے کا امکان ہے۔

(۲)

الفاظ دہلوی اور لکھنوی استعمال کیے جاتے ہیں اُردو شاعری کے دو اہم ادوار کو متمائز کرنے کے لیے، دو مختلف مدارس تخیل میں امتیاز کرنے کے لیے —— ۔ ان دونوں کے مابین تفاوت جو آج کا نہیں کم سے کم ایک صدی پیشتر کا ہے حقیقت میں بڑی حد تک سہولت پر مبنی ہے تاکہ مطالعہ کی خاطر ایک وسیع اور بڑی چیز کو دو تنگ تر اور نسبتاً چھوٹے حصص میں جدا کیا جا سکے۔ اور گو اس میں شک نہیں کہ اس امتیاز کی گنجائش بھی ہے اور ضرورت بھی۔ نیز اگر اس کی صحیح تعبیر کی جائے اور اسے محدود معنیٰ کے اندر رہنے دیا جائے تو یہ حق بجانب بھی ہے مگر یہ فرق نہ تو اس قدر نمایاں ہے کہ دونوں مدارس شاعری کے مابین ایک واضح خطِ تقسیم قائم رکھا جا سکے اور نہ اس قدر درست کہ اسے بنیاد سمجھ کر اس پر تنقید و تبصرہ کی کوئی عمارت قائم کی جائے۔ کیونکہ اس کی تعیین میں نہ تو اُن ادبی رجحانات کو ملحوظ رکھا ہے جن کے ذریعہ ادب ہر دور میں تبدل اور تغیر ہوتا ہے نہ اُن نازک اور لطیف حقیقتوں کا لحاظ کیا گیا ہے جن کے زیرِ اثر عام تخیلات اور جذبات ارتقا کے منازل طے کرتے ہیں۔ اُردو شاعری کی تاریخ میں شاید کوئی ایک ذات بھی ایسی نہ ملے گی جسے ہم بے دھڑک اس تفریق و تفاوت کا کلیتہً ذمہ دار ٹھہرا دیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ آج تک کوئی ایک ہستی ایسی نہیں گزری جس نے صاف و صریح لفظوں میں یہ کہا ہو کہ اُردو شاعری کے ہمیشہ سے دو اسکول ہیں ——

دہلی اور لکھنؤ ــــــــ گر باوجود اس کے ایک طویل مدت سے ہر نقاد اور ہر مبصّر کا قلم "ذوقِ شعری" کے سلسلے میں اس امتیاز کی طرف اشارہ کرتا رہا ہے، اور ان میں سے تقریباً ہر ایک نے اس امر کو فرض کر لیا ہے کہ اس امتیاز کی حدیں نمایاں اور اس فرق کی بنیادیں واضح اور مستحکم ہیں، اسی کے ساتھ ساتھ اُن میں سے اکثر نے یہ غلطی بھی کی کہ نقد و نظر کی دھن میں اور تبصرہ نگاری کے جوش میں یہ تصور کر لیا کہ لکھنؤ کے زمانۂ عروج شاہی میں ماحول وہی تھا جو آج پایا جاتا ہے، کہ جذبات و خیالات کا رجحان اُس دور میں بھی بجنسہ و بعینہ ویسا ہی تھا جیسا کہ دورِ حاضر میں ہے، کہ اُس عہد کا شعر گو علوم مغربی سے اُسی قدر بہرہ ور اور تہذیب جدید سے اُسی طرح باخبر تھا، جس قدر اور جس طرح عہد موجودہ کا سخن سنج ہے، کہ اُس کی نظر میں بھی وہی اسمان اور اُس کے دماغ میں بھی وہی تاثر تھا جو ہماری نظروں اور ہمارے دماغوں میں ہے۔ انسان بہر حال و بہر رنگ انسان ہے، بنا بر آں فطرتِ انسانی غیر متغیر ہے، لیکن ماحول کا اثر فطرت کے فروعات میں بہت سی تبدیلیاں کرتا رہتا ہے، اگر آج یہ ممکن ہوتا کہ ہم میر و مومن کو دوبارہ عالمِ اجسام میں لا کر اُن کے سامنے دورِ حاضرہ کی شاعری کے نمونے پیش کر سکتے تو مجھے یقین ہے کہ وہ بھی اس پر اُسی قدر تحیر و تعجب کا اظہار کرتے جس قدر ناسخ و آتش در انحالیکہ میر و مومن کے رنگ کو ناسخ و آتش کے رنگ سے دور یا پاس کی بھی نسبت نہیں۔

قبل اس کے کہ اس امتیاز کی خصوصیات پر تبصرہ اور اس کی حیثیت سے بحث کی جائے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تاریخی اہمیت کی مختصر اسبابِ وجوہ وضاحت کر دی جائے۔

جہاں تک صنفِ اشعار اور صنفِ جذبات کا تعلق ہے اگر غالب کو نظر انداز کر دیا جائے تو دلی کی شاعری میر کے وقت سے داغ کے وقت تک قریب قریب ایک ہی ڈھچر پر چلی، ماحول سے جذبات پر اثر پڑتا ہے اس لیے جوں جوں دلی کا رنگ بدلتا گیا جذبات و خیالات کے لہجے میں تبدیلی ہوتی گئی مگر نظام شاعری غیر متغیر رہا، حتی کہ جس نہج پر برسوں پیشتر میر نے شعر کہے تھے، برسوں بعد داغ نے اُسی نہج کی پیروی کی اور گو دونوں کے انداز بیان اور حسن تخیل میں تعیین کا تفاوت ہے لیکن اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ نظام شاعری وہی رہا، اور اس لحاظ سے دونوں میں کوئی ایسا فرق نہیں کہ دلی کی شاعری کو مختلف ادوار میں تقسیم کرنے کی ضرورت پیش آئے۔ غالب البتہ بجائے خود ایک علیحدہ مدرسہ شاعری ہے اور اس کی

شاعری ایک مستقل باب، اور گو اپنے اثراتِ ابعد کے لحاظ سے وہ دلّی کے بقیہ تمام شاعروں سے مجموعۃً زیادہ اہم ہے مگر دلّی کے رنگِ شاعری پر بحث و تمحیص کرنے کی غرض سے اُسے فی الحال نظرانداز کر دینے میں کوئی حرج نہیں۔

دلّی کی شاعری کا پہلا مستقل باب گو حاتم، آرزو، ناجی، مضمون اور آبرو وغیرہ سے شروع ہوتا ہے مگر نفس الامر میں میر و سودا کو سرآمدِ شاعرانِ دہلی تسلیم کرنا چاہیے۔ اس میں شک نہیں کہ حاتم، آرزو وغیرہ کا دور تاریخی حیثیت سے اردو کی تدریجی ترقیوں کی منزل کا ایک نمایاں نشان ہے لیکن اُردو شاعری کے دہلوی مدرسہ کی سب سے بڑی ترقی کے زمانہ کی ابتدا، میر و سودا اور اُن کے معاصرین ہی کے عہد سے ہوتی ہے جس میں "محبوبۂ شاعری مع اپنی تمام کرشمہ سازیوں کے الفاظ و خیالات سے آراستہ و پیراستہ ہو کر دنیا کے سامنے نمودار ہوئی۔" اس دور میں گو زبان صاف ہوئی، بہت سے خوبصورت اور مناسب الفاظ اور محاورے، فارسی سے کچھ اُردو میں داخل کر لیے گئے، حسن و عشق کے معاملات حُسن و اثر کے ساتھ نظم ہونے لگے، نقائص و معائب سے کلام پاک ہونے لگا، غزلیں کانوں کو بھلی معلوم ہونے والی بحروں میں کہی جانے لگیں، نئے نئے اصنافِ شعر رائج ہوئے، زبان میں وسعت اور لوچ، حسن و جوہ پیدا ہو گئے، بایں ہمہ یہ دور وہ دور تھا جس میں زبان نہ پوری طرح سلجھی ہوئی تھی نہ شستہ، متروک اور غیر مستعمل الفاظ بے دھڑک استعمال کیے جاتے تھے، کسو، کبھو، ٹک، سوں، آئیاں، بلا تکلف اشعار میں نظم ہوتے تھے، پست خیالات کے ساتھ بلند خیالات ملے جلے ہوتے تھے، غزلوں میں شتر گربہ اور ناہمواری، دونوں عیوب بدرجۂ اتم نظر آتے تھے [گو سودا کا کلام ایک حد تک اس قسم سے بری ہے] مبتذل اور فحش الفاظ کا استعمال بے غل و غش جاری تھا، تذکیر و تانیث میں اختلاف اور ہٹ دھرمی نمایاں تھی، چونکہ اندوہ و حرماں، یاس و غم، کے جذبات دلوں پر مسلط تھے اس لیے اشعار میں دلگدازی اور سوز زیادہ واضح ہوتے تھے، فلسفہ، حکمت، سائنس، مابعد الطبیعات، کسی سے گویا کوئی تعلق نہ تھا گو نفسیات کے نمونے جابجا، اور صحیح فطرتِ انسانی کے جیتے جاگتے مرقعے جگہ جگہ نظر پڑتے ہیں، فارسی ترکیبیں نسبتاً کم استعمال ہوتی تھیں اور اغلاق و غلو معیوب سمجھے جاتے تھے" یہ اثرات غالب اور مومن کے زمانہ تک باقی رہے" اور یہی بڑا سبب تھا کہ ان دونوں باکمالوں کی خاطر خواہ منزلت نہیں ہوئی۔ اجمالاً ہم ذیل کے چند اشعار کو اس دور کی شاعری کا صنفی نمونہ تصور کر سکتے ہیں

میر (۱) خون ہر اک حرفِ شوق سے ٹپکے تھا لیے — وہ نہ سمجھا کہ مرے نامے کا مضموں کیا ہے

" (۲) سرہانے میر کے آہستہ بولو — ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

میر(۳) پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے — جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے
" (۴) کہتا تھا کسی سے کچھ تکتا تھا کسی کا منہ — کل میر کھڑا تھا یاں سچ ہے کہ دِوانا تھا
" (۵) افسوس ہم کہ منتظر اک عمر تک رہے — پھر مر گئے ترے تئیں اک بار دیکھ کر
درد (۶) شیخ کعبے ہو کے پہنچا ہم کنشتِ دل میں ہو — درد منزل ایک تھی ٹک راہ ہی کا پھیر تھا
یقین (۷) جب دیکھتا ہوں تجھ کو تنہا سجن چمن میں — کس کس طرح کی باتیں آتی ہیں میرے من میں
سودا (۸) کہے تھا ریختہ کہنے کو عیب نادان بھی — سو یوں کہا کہ میں دانا لگا ہنر کہنے
" (۹) بہنا ہماری چشم کا دستور ہو گیا — دی تھی خدا نے آنکھ سو ناسور ہو گیا
" (۱۰) کل حضرت سودا کو سنا بولتے یاں رو — اللہ رے اللہ رے کیا زورِ بیاں ہے

میر و سودا اور اُنکے معاصرین کا زمانہ ختم ہو کر دلی کی شاعری کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے، جس میں مصحفی، جرأت، انشا، اثر، میر حسن، راسخ، بقا، حسرت، رنگین وغیرہ شامل ہیں۔ اس عہد میں بھی عہدِ قبل کے عیوب و محاسن برابر پائے جاتے ہیں۔ البتہ ایک ترقی یہ ہوئی کہ بہت سے الفاظ جو متروک ہو چکے تھے نکال کر اُنکے بجائے جدید الفاظ اور نئی اور اچھوتی ترکیبیں زبان میں داخل کر لی گئیں، ہندی اور فارسی محاورے آپس میں ملا دیئے گئے، طرزِ عبارت اور مضامین میں کوئی خاص جدت نہیں پیدا ہوئی مگر زبان نے البتہ ترقی کر لیا۔ اس دور کی شاعری اُس زمانہ کی دہلوی سوسائٹی کا صحیح نمونہ ہے، معشوق کے حسنِ ظاہری کی تعریف، بند بند الفاظ میں نہیں کھلم کھلا، رنڈی، گوئی وغیرہ وغیرہ کا وجود اسی عہد سے پڑتا ہے، اور اگر ہم بغور دیکھیں تو ہم کو اسی عہد سے آئندہ کے ایک عہد کی خبر ملتی ہے جو داغ دہلوی کے دور میں جا کر معراجِ کمال کو پہونچا، اُس عہد کے جراثیم انہی مصحفی اور جرأت کے دور میں وجود میں آ چکے تھے، اور یہی جراثیم تھے جنہوں نے کامل نشوونما پا کر دلی کے آخری دور میں داغ سے ایسے شعر کہلوائے

حوروں کا انتظار کرے کون حشر تک — مٹی کی بھی ملے تو روا ہے شباب میں (داغ)

مصحفی وغیرہ کا دور دیکھ کر کسی شخص کے وہم و گمان میں بھی نہیں گزر سکتا تھا کہ اس دور کے بعد ایک ایسا دورِ عالم وجود میں آنے والا ہے جس میں اس دور کا غالباً کبھی خیر نظر آئے گا۔ یہ دور دلی کی شاعری کا تیسرا دور تھا جس کی ابتدا غالب، مومن، ذوق، شیفتہ، تسکین، مجروح، حقیر، عیش اور ظفر سے ہوتی ہے، جیسا کہ میں اس سے قبل لکھ چکا ہوں۔ باستثنائے غالب کے اس عہد میں بھی نظامِ شاعری میں کوئی فرق نہیں ہوا، اور گو فارسیت کو اور بھی ترقی ہوئی اور ہندی کے رہے سہے الفاظ بھی نکل گئے مگر اس دور کے شعرا کے نظریوں میں بھی کوئی بین

تفاوت صنفِ جذبات کی حد تک نہیں ہو ـــــ ۔ اس دور کی سب سے بڑی امتیازی خصوصیت اسکے تین عظیم ترین اساتذہ ـــــ غالب، مومن، ذوق ـــــ کی "سہ رنگی" ہے۔ تینوں نے اپنے اپنے لیے شعرگوئی کی نئی راہیں تلاش کرلیں، جس نے اُنھیں قدما اور متاخرین دونوں سے ممیز کردیا، لیکن غالب کے سوا کسی اور کا "نظریۂ شاعری" نہیں تبدیل ہوا ـــــ مومن نے جدا رنگ اختیار کیا، ذوق نے الگ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنائی، نصیر نے علیحدہ طرز نکالا۔ مگر مومن، ذوق اور نصیر تینوں کی شاعری شعر کے ارتقا کا باعث نہیں ہوئی اور اس کا سبب یہی تھا کہ تینوں کے کلام میں باوصف اوروں سے ظاہری فرق کے اصول اور نظام شاعری وہی رہے جو دوسرے اساتذہ کے تھے

مومن (۱) بے نالہ منہ سے جھڑتے ہیں بے گریہ آنکھ سے　　اجزائے دل کا حال نہ پوچھ اضطراب میں
" (۲) کل تم جو بزمِ غیر میں آنکھیں چرا گئے　　کھوئے گئے ہم ایسے کہ اغیار پا گئے
ذوق (۳) یوں لائے داں سے ہم دلِ صد پارہ ڈھونڈھ کر　　دیکھا جہاں پڑا کوئی ٹکڑا اُٹھا لیا
" (۴) کیا جانیے کیا لاگ ہے اُسے میری طرف سے　　جو خواب میں بھی رات کو تنہا نہیں آتا
نصیر (۵) ہنسنے ہے کوٹھے پہ میرا یوسف میں زیرِ دیوار رو رہا ہوں　　عجب تماشا ہے دیکھو لوگو فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں

اسوقت لکھنؤ کا ناسخی رنگِ شعرگوئی اپنی داغ بیل ڈال چکا تھا۔ اس رنگ کے اثرات عالمگیر اور متعدی تھے۔ یہی سبب تھا کہ ذوق، نصیر، مومن، حتیٰ کہ غالب بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکے اور ان سب کے کلام میں بھی کہیں کہیں اُس رنگ کی جھلک دکھائی دے جاتی ہے

مومن (۱) غیر کے لکھنے کو تم نے کیا تراشی ہے قلم　　ورنہ میرے استخواں کیوں ہو گئے قطِ قلم سے
" (۲) زہر نوشِ غمِ شیریں نے کہا خسرو سے　　تلخیِ مرگ میں شکر کا مزا ہوتا ہے
" (۳) اس ستمگر سے گر آنکھ لڑی ہے کہ حباب　　کیسے کچے گھڑے پانی پہ جو بھرتے ہیں
غالب (۴) مرنے کے بعد بھی نہ گئی بانکپن کی شان　　تختے پہ بہر غسل لٹایا اکڑ گئے
ذوق (۵) کھینچے دلِ انساں کو نہ وہ زلفِ سیہ فام　　اژدر اگر انساں کو نگل جائے تو اچھا
" (۶) بتوں کی سرد مہری نے کھلائی زعفراں لیکن　　کرے کیا گر مجھ شی ہو گیا کشمیر دل میرا
داغ (۷) آنسو بہا رہا ہوں خطِ شوق پڑھ کے میں　　یوں ڈالتا ہوں دانہ کبوتر کے روبرو
" (۸) تلخیِ موت کو فرہاد کی وہ کیا جانے　　منہ سے شیریں کے ابھی دودھ کی بو آتی ہے

ذوق زبان پر قدرت اور محاورات اور امثال کی بندش و استعمال کی حد تک کیا دلی اور کیا لکھنؤ سب جگہ آپ اپنی نظیر ہیں اور اُن کی شاعری کا اخلاقی پہلو یقیناً اس لائق ہے کہ اُس کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے۔

اس دَور کی اہم ترین خصوصیت داخلیت کا مکمل غلبہ ہے، اس کا ثبوت یہ ہے اس عہد کے اساتذہ کی مکمل زبان دانی تھی۔ مومن اور غالب فارسی کے جید عالم اور شاعر تھے نازک خیالی، بلند پروازی، صحیح جذبات کی صحیح لیکن غیر معمولی ترکیبوں سے نگارش، جدتِ تخیل، جدتِ تشبیہات و استعارات، یہ چیزیں اس دور میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔ معمولی سے معمولی واقعات کو پامال سے پامال خیالات کو ایسے اسلوب سے بیان کرنا کہ وہ بہت غیر معمولی اور مرقع ہو جائے اس عہد کے سخنوروں کا شعار تھا، خصوصاً غالب اپنی طبیعت کا ایک جزو مشکل پسندی، معنی آفرینی، اور عام طرز نگارش سے علحدگی تھی، وہ دلی جذبات کے ادا کرنے میں بھی یدطولیٰ رکھتے تھے، اور فلسفہ اور حقیقت طرازی ان کی گھٹی میں پڑے ہوئے تھے۔ غالب سے کم لیکن پھر بھی غیر معمولی حد تک، یہ اوصاف مومن، ذوق وغیرہ میں بھی موجود تھے۔ القصہ دلی کی شاعری کا یہ دَور تمام ادوار ما قبل و ما بعد سے بالکل جدا اور نرالا تھا اور یقیناً سب سے زیادہ زریں اور درخشاں۔

دلی کی شاعری کا آخری دور داغ، مجروح، ظہیر اور انور وغیرہ کا ہے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں شاعری کا رنگ بالکل پلٹ ہو گیا لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہوا۔ اس غلط فہمی کے دو وجوہ تھے۔ پہلی وجہ داغ کا امتیازی طرز شعر گوئی جس نے عام طور سے لوگوں کو اس دھوکے میں مبتلا کردیا کہ اس دَور میں اردو شاعری کا دلی اسکول ایک اور ڈھنگ پر گامزن ہے۔ دوسری وجہ اُس زمانے میں لکھنؤ کی انتہائی پستی اور سوقیت تھی، جس کے مقابلہ میں عوام کا یہ باور کرلینا کہ دلی کے رنگ میں ایک غیر معمولی تغیر ہوا ہے، کچھ زیادہ بعید از گمان نہیں معلوم ہوتا۔ اس دَور کی سب سے اہم امتیازی خصوصیت طرزِ ادا کی چستی، تخیل میں راز و نیاز، معاملہ بندی، بانکپن اور انداز بیان میں بے ساختہ پن کی فراوانی ہے۔ اس قبیل کے نمونے داغ اور انور کے یہاں بہت ملیں گے، اور واقعہ یہ ہے کہ صرف انھیں دو اشخاص کو اس عہد کی شاعری کا علمبردار سمجھنا چاہیے۔ ظہیر، مجروح وغیرہ نہ اس قدر سربرآوردہ ہیں نہ اس درجہ قابلِ تحسین اور اس میں بھی شک نہیں کہ ان دونوں میں نہ داغ کا سا حسنِ بیان ہے نہ انور کا سا علوئے تخیل

داغ
(۱) مے پی تو سہی توبہ بھی ہو جائیگی زاہد — کمبخت قیامت ابھی آئی نہیں جاتی
(۲) خاطر سے یا لحاظ سے میں مان تو گیا — جھوٹی قسم سے آپ کا ایمان تو گیا
(۳) دُور کئے نامِ شفا سُنکے نہ تھے خواہش مرگ — منہ ذرا سا نکل آیا ترے بیماروں کا

انور
(۴) نہ ہم سمجھے نہ آپ آئے کہیں سے — پسینہ پونچھیے اپنی جبیں سے

(۵) یہ راز خود زندگی صرف اس لیے ہے   کہ تم مجھ سے کبھی پوچھو کہاں ہو

اس دور میں دلی کی شاعری سے یہی حقیقی شعریت اور اظہار آتش گویا کہ مفقود ہو چکی تھیں اور شعر گوئی محض ایک مشغلہ ۔ وہبی جذبات کے اظہار کا ذریعہ رہ گئی تھی ۔ عریاں جذبات کی نگارش ، غرضیکہ نمائش انداز بیان ، اس عہد کی عظیم ترین خامیاں ہیں لیکن ہم یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کہ اس دور کی شاعری نے ملک کے عام جذبات کی بیداری میں جو حصہ لیا وہ دلی کے کسی اور دور شاعری سے نہیں منسوب کیا جا سکتا ۔

یہ مسئلہ تو آج تک طے نہیں ہو سکا کہ اردو کی خدمت کرنے کا سب سے زیادہ فخر کس خطہ ہندوستان کو حاصل ہے ۔ دلی والوں کو اصرار ہے کہ اردو کی داغ بیل یہیں پڑی ، یہیں اس کی پرورش و پرداخت شروع ہوئی ، اس لیے دلی کو اردو کے سب سے بڑے خدمت گزار کہلانے کا حق حاصل ہے ۔ دکن کا یہ اصرار ہے کہ اردو ادب کی ابتدائی نشو و نما کا غیر فانی فخر اسکو حاصل ہے اس لیے وہ اردو کے سب سے اہم خدمت گزار کہلانے کا مدعی ہے ۔ اور وہ مدعی ہے کہ چونکہ اس نے اس زبان کو سنوارا اتنا سنوارا کسی اور حصہ کی قسمت میں نہیں آیا ، اس وجہ سے اس کا حق حاصل ہے کہ اپنے آپ کو اردو کا عظیم ترین خدمت گزار کہلائے ۔ پنجاب اپنی جگہ پر اسی قسم کے دعاوی پیش کر کے اپنا حق جتاتا ہے ۔ بہر حال جھگڑا یہاں دلی اور لکھنؤ میں ہے اس بنا پر پنجاب اور دکن کو دائرہ بحث سے خارج کیا جا سکتا ہے ۔ اب رہ گئے لکھنؤ اور دلی ۔ ظاہر ہے کہ دلی کو اردو کا پودا لگانے اور اس کی ابتدائی آبیاری کرنے کا فخر ملتا ہے ۔ اس جگہ یہ امر فراموش نہ کرنا چاہیے کہ جس دلی کے سر اردو کی واقعی خدمت کرنے کا سہرا ہے وہ دلی اکبر اور اورنگ زیب اور محمد شاہ رنگیلے کی دلی نہیں تھی بلکہ وہ دلی تھی جہاں نام نہاد بادشاہ بے تخت و تاج فرماں روا ، سرپرست حکومت تھے ، دولت و ثروت مٹ چکی تھی ، حکومت و سلطنت خواب ہو چکی تھی ، عروج کے افسانے اور کمال کی داستانیں محض خیال رہ گئی تھیں ۔ ظاہر ہے کہ عوام الناس کے دل درد و غم سے لبریز تھے ، پبلک کے دماغ حزن و ملال کے ہنگاموں سے پر تھے ، آنکھیں اقتدار و جلال کے نظارے دیکھنے کی ہوس میں نم تھیں ۔ اس حالت میں دلی نے طفل اردو کو گود میں لیا اور اس کی تربیت اور پرورش شروع کی ۔ حاتم و آرزو ، میر و سودا ، درد و سوز ... اور یقین ، ان سب نے جب اس بچے کی فکر و پرداخت پر کمر باندھی تو دلی کی تباہی اور بربادی عبرت کی آنکھوں کے سامنے تھی ۔ ماحول کا اثر مسلم ہے ، گرد و پیش کے تاثرات یقینی ہیں ، جو جذبات دل میں آتے وہ درد و غم کے مرقعے ، جو خیالات دماغ میں پیدا ہوئے وہ حزن و الم کے مجسمے ، جو احساسات قلب میں رونما ہوئے وہ سوز و ساز کی جیتی جاگتی تصویریں نہ کھانے کا ٹھکانا تھا نہ پینے کا سہارا ، ایک وقت کے بعد دوسرے وقت کی روٹی کی امید مشکل سے بندھتی تھی ۔

مصحفی و حسرت، جرأت و انشا، راسخ و رنگیں، انھوں نے جب اس بار کے اٹھانے کی حامی بھری تو حالت اور بھی بد سے بدتر تھی، غالب، مومن، ذوق و نصیر کا عہد آیا تو غدر نے رہی سہی آبرو بھی کھو دی، سامان خورد و نوش تک کی وقت ہونے لگی۔ اس سب پر طرہ "دلّی کی گلیاں" اس قدر عزیز تھیں کہ "دکن کی قدر سخن" انکے سامنے گوارا نہیں ہوئی۔ عیش و عشرت سے دُور، رنگ رلیوں سے جدا، حزن و ملال کی تصویر، درد و الم کے نام لیوا، فکر و تردد کے بندے، خوشی و مسرت کے گمان سے معرّا خود غرض دنیا نے مجبور کرکے کہا "میرا اسطااللہ مغور کرو" ایسی صورت میں بھلا عیش و عشرت کے نغمے کیا کانوں میں آتے، رنگینیوں اور سرمستیوں کے ترانے کیا گوشزد ہوتے۔ لامحالہ سوز و گداز کا دور دورہ ہوا، خیالات ستھرے، سچے، پاکیزہ، اور صلیت و واقعیت سے لبریز ہونے لگے، صدمات و آلام جس قدر جلد انسان کو مجاز سے نکال کر حقیقت تک پہونچا دیتے ہیں مسرت و آرام نہیں کر سکتے، دلّی والوں کے شعر خنجر و نشتر بن کر چلے اور تیر و تفنگ بن کر دلوں میں اتر گئے، کہنے والے اور سننے والے، دونوں ایوان حقیقت کی خبریں لانے لگے، معرفت کا ذوق و شوق عام و خاص سب کے رگ و پے میں سرایت کر گیا، اور اہل دہلی کے ترانوں کو قبول عام و بقائے دوام کا خلعت عطا ہو گیا۔

اس حالت میں لکھنؤ کی عروس خوابیدہ نے انگڑائی لے کر آنکھ کھولی طفل اردو دہلی میں فقدان سامان پرورش سے ناتواں اور مریض تھا، ہمک کر نازنین لکھنؤ کی جانب ہاتھ پھیلا دیے، زیور عیش سے آراستہ، سامان تعیش سے پیراستہ، امارت سے سجی، دولت و ثروت سے سنوری ہوئی دلھن مسکرائی اور طفل اردو کو گود میں لے کر سینے سے لگا لیا۔ —— لکھنؤ کے عروج کا زمانہ، سامان تعیش کی ارزانی گلی گلی کوچہ کوچہ رشک ایوان سلیمانی، راحت و آرام کا دور دورہ، دولت و مسرت کا ہر سمت شہرہ، روح فکر دو عالم سے آزاد، دل قیود دنیوی سے چھوٹ کر شاد، کنگھی چوٹی کے تذکرے، زلف و خال کا ذکر، چوک کی طوائفوں سے صحبت، دربار کے خواجہ سراؤں سے رسم و راہ، خیالات سیاہ کاری کا مجسمہ، جذبات عیاشی کی تصویر، احساسات تصنع اور تعلقات بیہودگی کی نمائش، کھانے کی اشیائی افراط، پینے پلانے کی چیزوں کی بہتات، تن کی آرائش و زیبائش کے سامان وافر، استغنا، بے فکری، بیکاری، کی بدمستیاں دن عید رات شب برات

چاندنی ہے سایۂ دیوار قیصر باغ میں

دلوں میں درد و گداز کا نام نہیں، دماغوں میں سوز و ساز کا شائبہ نہیں، اس لکھنؤ میں میر و سودا، مصحفی و انشا، جرأت و رنگین، پریشاں حال، خستہ نوال، دہلی سے آئے، طبیعتیں بدستور، شخصیتیں برقرار، لامحالہ جذبات و احساسات کا بھی اگلا ہی سا رنگ رہا، کلام اور اشعار میں کوئی نمایاں تغیر و تبدل نہیں رونما ہوا۔

لیکن آثار جبھی سے بدل گئے۔ رُخ اُسی وقت سے پھر گیا۔ یہ تبدیلی غیر متوقع نہیں تھی، دلی کے سرمایۂ ادب میں اسکے آثار ملنے لگے تھے اور یہ واضح تھا کہ وہ کون سا رخ ہے جدھر یہ کشتی بہ رہی ہے۔ حتیٰ کہ میر و سودا اور ان کے معاصرین کے آخری عمر کے کلام میں اس کے نمونے ملتے ہیں

میر (۱) نازکی اُن لبوں کی کیا کہیے — پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے
، میرؔ ان نیم باز آنکھوں میں — ساری مستی شراب کی سی ہے
سودا (۲) غنچے سے مسکرا کے اُسے زار کر چلے — نرگس کو آنکھ مار کے بیمار کر چلے
" (۳) کیفیتِ چشم اُس کی مجھے یاد ہے سودا — ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں
قائم (۴) صاف تھا جب تک تو مجھ کو بھی جواب صاف تھا — اب جو خط آنے لگا شاید کہ خط آئیگا

لکھنؤ میں آکر جب ان شاعروں نے آزادی سے اس شاعری میں قدم رکھا تو اُس وقت رنگِ محفل یہ پایا کہ کوئی دل اور کوئی داغ سوز و گداز سے آشنا نہیں، خود تو دل حسرت و یاس کے مرقعے دیکھتے دیکھتے، اندوہ و حرماں کے ترانے سنتے سنتے تنگ آ ہی چکا تھا جادو ٹوٹا اور بڑھتے دریا کا سیلاب سب کچھ بہاتا ہوا لیگیا۔ اور وہی دلی کے مصحفی و انشا لکھنؤ میں آکر ایسے عیش و عشرت کے بندے ہوے کہ اُنکے ڈھونگ کے افسانے آج تک زبانوں پر باقی ہیں۔ بذلہ سنجی، لطیفہ گوئی، مذاق، دلچسپی، غرض کون سی ایسی چیز تھی جو اِن لوگوں میں نہیں پیدا ہوئی، گو یا رنجیدہ جیسی ذوق کلمۃً مفقود نہیں ہوا تھا، اور جب مصائب نے پھر اپنی آماجگاہ بنایا تو انھیں اصحاب کے قلم سے یہ شعر بھی نکلے

انشا (۱) نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی — تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں
" (۲) کہاں گردشِ فلک کی چین دیتی ہے ہمیں انشا — غنیمت ہے کہ ہمصورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں
مصحفی (۳) حسرت پہ اُس مسافرِ بیکس کی رو یئے — جو تھک گیا ہو بیٹھ کے منزل کے سامنے
" (۴) شاہد رہیو اے شبِ ہجر — جھپکی نہیں آنکھ مصحفی کی

اُردو کے تقریباً تمام نقادوں اور تبصرہ نگاروں سے یہی چوک ہوئی کہ اُنھوں نے اس "ہجرتِ شاعری" کی تحقیق کو "تنقید" کی دُھن اور "تبصرہ نگاری" کے انہماک میں نظر انداز کر دیا۔ جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ دلی اور لکھنؤ کے ارتباط سے جو جراثیم پیدا ہو چلے تھے وہ اُنکی نظروں سے مستور رہے۔

یہ دَور لکھنؤ کی شاعری کا پہلا دَور تھا جس میں لکھنؤ کی شاعری بھی دلی سے کچھ ایسی علیحدہ نہیں تھی۔

اس لکھنؤ میں ناسخ نے آکر کھولی اس ماحول میں آتش نے ہوش سنبھالا اور ان ہی اثرات کے تحت انکے دوسرے ہم عصر شعراء کی پرورش ہوئی اور لکھنؤ کے مذاقِ سلیم کی تشکیل عمل میں آئی۔ یہ لکھنوی شاعری کا دوسرا دور تھا۔ جو دلی کے دور [illegible] سے [illegible] زیادہ اہم ہے کہ یہاں سے لکھنؤ کا نظامِ شاعری دلی کے ایک مختلف اسکول کی بنا پر [illegible] اور حقیقت یہ ہے کہ یہیں سے دلی اور لکھنؤ کے علیحدہ علیحدہ مدارسِ شاعری کی بنیاد پڑتی اور یہیں سے دونوں میں امتیاز کا آغاز ہوتا ہے۔ ناسخ پہلے شخص تھے جنہوں نے اس کا ادراک کیا کہ اساتذۂ دہلی نے جوہرِ تخیل اور خلوصِ جذبات کی خاطر زبان کی نزاکتوں اور قواعد کی لطافتوں کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں کی ہے [illegible] اس احساس ہوا کہ اب شعرا کا اولین فرض زبان کی صفائی، محاورات کی تصحیح، الفاظ کی تزئین اور ترکیبات کی [illegible] ہونا چاہیے۔ ہر قوم اور ہر ملک کے سرمایۂ ادب میں کم سے کم ایک جزو ضرور ایسا ہونا چاہیے جو [illegible] ثابت ہو جس پر صرف و نحو کی تدوین کی جا سکے۔ جس سے ادبی اصولوں کی [illegible] مرتب [illegible] استدلال کیا جا سکے اور ناسخ کو یہ شرف حاصل ہوا کہ [illegible] ان کے مبارک ہاتھوں سے پورے ہوئے۔ انہوں نے شعر گوئی کے مسلّم اصولوں سے [illegible] زبان و الفاظ کے لیے تخیل کی قربانی گوارا کی، فضول مبالغے، بیجا استعارے کی، تکلف و تصنع [illegible] جس کام کا بیڑا اٹھایا تھا اس سے قدم نہ ہٹایا، اور اسی جگہ ان کی بے خوفی اور عظمت [illegible] ناسخ کی بے جگری اور ذمہ داری کا پہلا نشان [illegible] ہے۔ ناسخ نے زبان کی [illegible] غلط قرار دے کر بغیر کسی ڈر اور جھجک کے [illegible] لکھنؤ [illegible] ناسخ کے ذریعہ [illegible] تاریخ میں پہلی بار جگہ حاصل ہوئی تھی زبان کی درستگی کی سعی میں ان کا ہم نوا ہو گیا۔ لکھنؤ اس طرح [illegible] اس نہج ([illegible]) [illegible] احساس [illegible] ادب کی خدمت اور پہلوؤں پر [illegible] کے خدمت [illegible] لکھنؤ میں اور ایک نئی اور جدید [illegible] ذوق شوق سے گامزن ہونے لگے۔ اس دور کے بھی ابتدائی اشعار [illegible] رنگ کی [illegible] سوقیت یا پستی نہیں پیدا ہوئی تھی جس نے آگے چل کر [illegible] لکھنؤ کو [illegible] اس عہد کے مذاق کے بہترین نمونے [illegible] اس زمانے کا خاص رنگ [illegible] ذیل کے اشعار ہو سکتے ہیں

امیر (۱) [illegible] ہزاروں [illegible] ذوق [illegible] محفل کی
ہر (۲) دل کو نالوں کی [illegible] منزل آخر ہوئی فریادِ جرس باقی ہے

ناسخ (۳) ابرِ رحمت سے تو محروم رہی کشت مری — کوئی بجلی ہی فلک تو نے گرائی ہوتی
آتش (۴) یار کو میں نے مجھے یار نے سونے نہ دیا — رات بھر طالعِ بیدار نے سونے نہ دیا
" (۵) یہ کیفیت اُسے ملتی ہے جو جسکے مقدر میں — مے الفت نہ خُم میں ہے نہ شیشے میں نہ ساغر میں

بہت ممکن ہے کہ اس "اعتدال" کا بڑا سبب آتش کا وجود ہو۔ آتش کی شخصیت بے شبہ لکھنؤ کی صفتِ شعر میں سب سے زیادہ باعظمت اور معتبر سمجھی جانی چاہیئے، حقیقت میں آتش "اجتماع الضدین" کا ایک بہت عمدہ نمونہ تھے، بدرت تو ان کے جذبات کا رُخ دلّی کے رنگِ شاعری کی جانب زیادہ مائل تھا، اور اس میں ذرا سا بھی شک نہیں کہ وہ قدرت کی جانب سے غیر معمولی شاعرانہ دماغ لائے تھے، خدا نے انکو گداز دل اور بلند خیال دماغ ودیعت کیے تھے اور انکے کلام کے متعلق امیر مینائی مرحوم کی یہ تنقید کہ "انکے اشعار میں پسی ہوئی بجلیاں ملی ہوتی ہیں" بالکل صحیح ہے۔ مگر کچھ تو انکی طبیعت میں تھا کہ زبان کی صفائی اور چستی کی طرف بھی توجہ کریں، اور کچھ اپنے ماحول کے اثر سے بھی وہ لکھنؤ کے رنگ سے مرعوب ہوئے - اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ انکی شخصیت اور انکی ذات میں شعر کا ایک ایسا امتزاج ہو نظر آتا ہے جس کی نظیر لکھنؤ میں کہیں اور نہیں ملتی، کبھی ان کا دماغ اور تخیل ان نازک حقیقتوں کی جانب رہنمائی کرتا ہے جو دلی کے بہترین سخنوروں کے ثمرۂ تخیل سے بھی ارفع و اعلیٰ ہیں اور کہیں خالص ناسخیت غالب دکھائی دیتی ہے۔ میرے خیال میں اس تنوع کا بڑا سبب یہ ہے کہ آتش کو مصحفی سے تلمذ حاصل تھا

آتش (۱) آئے بھی لوگ بیٹھے بھی اٹھ بھی کھڑے ہوئے — میں جا ہی ڈھونڈتا تری محفل میں رہ گیا
" (۲) کوچۂ یار میں سائے کی طرح رہتا ہوں — در کے نزدیک کبھی ہوں کبھی دیوار کے پاس
" (۳) نقشِ پائے رفتگاں سے یہ صدا ہے آرہی — دو قدم میں راہ طے ہے شوقِ منزل چاہیئے
آتش بہ رنگِ ناسخ (۴) صحرا کو بھی نہ پایا اقلیمِ وسعت فزا میں — سالکو چلا ہے کعبہ کا بیا ہو تو چھالے بن گئے
(۵) بخدا میں نے جلایا نہیں پروانے کو — شمع نے آگ رکھی سر پہ قسم کھانے کو

لیکن آتش کا سب سے زیادہ امتیازی اور قابلِ لحاظ کلام وہ ہے جس میں علوِ تخیل اور رفعتِ جذبات کے ساتھ ساتھ زبان کی چستی، بندش کی صفائی، طرزِ ادا کا اچھوتا پن اور انداز بیان کی پذیرائی بھی بدرجۂ اتم نمایاں ہے

آتش (۱) چال ہے مجھ ناتواں کی مرغِ بسمل کی تڑپ — ہر قدم پر ہے یقیں یاں رہ گیا واں رہ گیا

" (۲) بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا — جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا
" (۳) پیامبر نہ میسر ہوا تو خوب ہوا — زبانِ غیر سے کیا شرحِ آرزو کرتے

لکھنؤ کی شاعری کا دورِ سوئم جو آتش و ناسخ کی زندگی ہی میں شروع ہو گیا تھا، اُنکے شاگردوں اور شاگردوں کے شاگردوں کا زمانہ ہے۔ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ کسی مخصوص طرزِ ادا یا کسی خاص راہِ سخن کے موجد کے پیرو اور متابعین اُس موجد کے رنگ کو کمال تک پہونچانے کی دُھن میں اُس رنگ کی اصلی روح کو نظر انداز کرکے اُسے انتہا (Extreme) تک پہونچا دیتے ہیں اور اس سعی و کاوش میں اُس مخصوص رنگ میں تصنع اور تکلف پیدا ہو جانا کچھ بعید از قیاس امر نہیں۔ وزیر، رند، صبا، برق، رشک، قلق، تکلیم، تسلیم، امانت، ان سب نے یہی غلطی کی کہ بغیر سوچے سمجھے نہ صرف ناسخ کی تقلید کی کوشش کی بلکہ ناسخ اور آتش کے رنگوں کی آمیزش کرنا چاہی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس دور کی شاعری نہ محض دلی سے بالکل علٰحدہ ہو گئی بلکہ ناسخ اور آتش کی شاعری سے بھی مختلف رہی، حتیٰ کہ خود ناسخ بھی ایک حد تک اُس سے متاثر ہوئے اور اُنکے آخری زمانے کے کلام کو اُنکے متقدمین کے کلام سے ممتاز نہیں کیا جا سکتا، اس وقت شاعری محض الفاظ کا گھروندا، صرف صنایع و بدایع کا طلسم ہو کر رہ گئی، اور اُس میں سے روحِ جذبات، چاشنیِ تخیل، اسی طرح مفقود ہو گئے جس طرح امیر خسرو یا دلی کے کلام سے زبان کی صحت و سلاست، یہ دورِ لکھنؤ کی شاعری کا سب سے پست اور سب سے ردی دور تھا اور اس عہد کے اشعار خشک، بے مزہ، اور لفظوں کا گھروندا ہیں

امانت (۱) آنسو رواں ہیں زلفِ سیہ کے خیال میں — موتی پرو رہا ہوں ترے بال بال میں
" (۲) فی سبیل اللہ پانی اپنا دو اے آبلو — کانٹے اب دیکھے نہیں جاتے زبانِ خار کے
وزیر (۳) نہانے میں جو لہراتی ہے زلفِ یار دریا میں — تڑپنے لگتی ہیں پانی پہ موجیں مچھلیاں ہو کر
بحر (۴) کیا کیا نہ مجھ سے سنگدلی دلبروں نے کی — پتھر پڑیں سمجھ پہ نہ سمجھا کسی طرح
ناسخ (۵) بے خطر یوں ہاتھ دوڑاتا ہوں زلفِ یار پر — دوڑتا تھا جس طرح ثعبانِ موسیٰ مار پر

رند، وزیر، امانت وغیرہ کے عروج کا زمانہ پھیکا پڑا اور ان کی جگہ اُنکے شاگردوں نے لے لی، وہ بھی اسی ماحول کے تربیت یافتہ، اور اسی ذہنیت کے ساختہ پرداختہ تھے۔ ناسخ کے عروج اور ہر دلعزیزی کے افسانے کانوں میں گونجتے ہوئے، اس پر طرہ انیس و دبیر کی معرکہ آرائیوں کی صحبتیں آنکھوں سے دیکھی ہوئی،

زبان کی سلاست اور صفائی کا جنون اب تک دماغوں پر مسلط تھا، اور یقین کیجیے کہ لکھنؤ کی شاعری اُسی مقام پر رہتی اگر زمانہ پلٹا نہ کھاتا، مگر دفعتاً انقلاب عظیم ہوا اور لکھنؤ کی سلطنت ختم ہو گئی۔ اس دھچکے سے ابھی اختر نگر نہیں سنبھلا تھا کہ غدر نے اور چرکا دیا، جس چیز نے دلّی کے دل کو "گداختہ" بنا دیا تھا وہی لکھنؤ میں پیش آئی، رامپور بسا اور پھر ایک بار دلّی اور لکھنؤ کے سخنور یکجا ہوئے، اُن سے خلا ملا ہوئی، کچھ تو دل دُکھے ہوئے تھے ہی، سونے پر سہاگا دلّی والوں کا دلکش اور دلپذیر کلام دیکھا، غیر ارادی طور پر مذاق اور طبیعت میں تغیر پیدا ہوا، یہ دورِ امیر، جلال، بحر، تسلیم، وغیرہ کا ہے ——— لیکن دل ابھی تک دلّی والوں کے سے نہیں ہوئے تھے، پھر ناسخ اور اُنکے معتقدین کو بھی کچھ ایسا عرصہ نہیں گزرا تھا، غلبہ پُرانے رنگ ہی کو رہا۔ اس دور میں جو لکھنؤ کی شاعری کا چوتھا دور تھا، امیر مینائی مرحوم کی ہستی سب سے زیادہ ممتاز تھی، اور شاید اُنکے دادا اُستاد مصحفی کا فیض تھا کہ اُنکا کلام اُس وقت بھی اور شعرا کی بہ نسبت دلّی والوں سے زیادہ ملتا تھا۔ امیر مرحوم، علم و فضل، جوہرِ کمال، قادر الکلامی اور پختہ گوئی کے ساتھ ساتھ ازل سے دلِ دردآشنا لائے تھے صحبتیں صحیح نہ ملنے کے باوجود اُن کا کلام ابتدا ہی سے اپنے میں سوز و گداز کے نشتر پوشیدہ رکھتا تھا اور اس کا علم بہت لوگوں کو ہے کہ اُن کا غدر سے پہلے کا کلام جو تلف ہو گیا، اہلِ دہلی کے کلام سے اس درجہ مشابہ ہے کہ بادی النظر میں تمیز کرنا دقت طلب ہوگا

(۱) جتنا جی چاہے ستالے ستم ایجاد مجھے — مرغ نصویر ہوں آتی نہیں فریاد مجھے
(۲) مدت سے امیرؔ اسکے ملنے کی تمنا تھی — آج اُس نے گلا اپنے ملنے کو تقضا آئی

رامپور بھی بگڑ گیا اور گلستانِ سخن کے عنادل کو از سرِ نو فکرِ نشیمن ہوئی، کچھ بلبلوں نے "باغِ دکن" میں "دامنِ دولتِ نظام" میں پناہ پائی اور دائرہ مکمل ہو گیا

تھی ابتدا جہاں سے وہیں انتہا ہوئی

داغؔ یہاں آئے اور خوب چمکے، امیر مینائی بھی یہاں پہونچے اور پیوندِ خاک ہو گئے

دل کی دل ہی میں رہی حسرتِ پرواز چمن — ابھی کلیاں کئی تھیں تھوڑی سی کہ صیاد آ گیا

انگریزوں کا ہند پر تسلط مکمل ہو گیا، مغربی خیالات دلوں میں گھر کرنے لگے، لکھنؤ میں عامۃ الناس کے جذبات کا حال بالکل وہی تھا جو میر، سودا وغیرہ کے دور میں، دلّی والوں کا تھا۔ لیکن اب تک آتش کے شاگردوں کے چڑھائے ہوئے ملمع کا پردہ نہیں ہٹا تھا، فطرت کوشش کرتی تھی کہ ان زنجیروں سے آزاد ہو مگر ماحول کا اثر کہاں جاتا، دلّی والوں کا سا سوز و گداز کلام میں چمکنے لگا مگر بطرز دگر"

مصحفی (۱) پیری میں [illegible] شبِ غم [illegible] سحر ہوتی ہے — [illegible] ادھر کی دنیا ادھر ہوتی ہے

آرزو (۲) دھواں سا اٹھا لحد سے میری نکلی جب [illegible] — [illegible] شوق [illegible] باقی کہ مر گیا ہوں ترس کر

عزیز (۳) اے ناشناس اہلِ وفا [illegible] — اپنا [illegible] خون جگری [illegible] دیکھ کر

مگر استدادِ زمانہ کے ساتھ [illegible] نے غلبہ پالیا اور آج تک شاگردوں کے مخرب اثرات محو ہوگئے گو ناسخ کا پڑھایا ہوا سبق، زبان کی [illegible] اور الحمدللہ کہ موجودہ لکھنؤ بڑی حد تک صحیح مذاق شاعری کا حامل ہے [illegible] لکھنؤ کی شاعری کا پانچواں اور آخری دور ہے اور اس سے امید ہوتی ہے کہ مستقبل شاندار اور درخشاں ہوگا [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] — [illegible] طرف پروانہ
[illegible] رنگ [illegible] — [illegible] اور ابھی ہے بیگانہ
کسی کی چشم فسوں [illegible] — [illegible] ساتھ لیے پھرتا ہوں پری خانہ
یہ سوزِ عشق کی تکمیل کا [illegible] — [illegible] ہو کے ہم آوارہ خاکِ پروانہ
جنوں کے جوش میں [illegible] — [illegible] بہشت زدہ ہے ویرانہ
[illegible] — [illegible] نظر میں جیسے افسانہ
[illegible] — [illegible] نظام ویرانہ
گلوں سے [illegible] — [illegible] رنگینیوں کا افسانہ
تمام عشق [illegible] — [illegible] پگڑی کہ پروانہ
[illegible] — [illegible] ہے جس کا افسانہ
وہ سوز و سازِ محبت [illegible] — [illegible] پروانہ

تمام عمر [illegible] دیکھی تھی
[illegible] آج [illegible] عشق [illegible]

ریاض مرحوم

[illegible]

ریاض احمد مرحوم و مغفور کی شاعری کی [illegible] کچھ ضرورت نہیں وہ اپنے کمال فن کی داد زندگی ہی میں اطراف ملک سے [illegible] شہرت کسی [illegible] سے بڑے شاعر سے کم نہیں۔ یہ کہنا بالکل سچ ہے [illegible] کے معترف ہیں [illegible] تغزل بہت بے تکلف تھا۔ ایک غزل سرائی میں [illegible] ریاض کی شاعری [illegible] کی دلآویز شان موجود ہے۔ اشعار میں [illegible] مناسبت [illegible] ہے۔ اسیر کے شاگردوں میں بعد امیر مینائی کے [illegible]

ریاض کو فطرتاً ویسا ہی دماغ [illegible] شاعر بغیر جبلی مناسبت شعری کے عام شہرت تام [illegible] اپنے شاعرانہ [illegible] کے جو فاضلانہ شان رکھتے ہوں۔ میرا خیال [illegible] ریاض کی زندگی ہی میں مشہور ادبی ماہوار رسالوں میں ان کے کلام [illegible] ہو چکا ہے۔ میرا خیال ہے کہ شاید ہی ان کے کلام کی تنقیص و حرف گیری کسی نے کی ہو۔ اس کہنے سے میری یہ غرض نہیں ہے کہ ریاض کا کلام صنعت [illegible] سے خالی ہے اور ان کی غزلوں پر بدقت [illegible] نکتہ چینی نہیں کر سکتا۔ بڑے بڑے استادان فن کے کلام پر حرف گیری ہو چکی ہے۔

کوئی شاعر ہو جب اس کے کلام میں سادگی اور [illegible] ہے تو بعض سست اشعار پر چنداں خیال نہیں کیا جاتا۔ ریاض کی ساری عمر ادبی کاموں [illegible] وہ محض غزل گو نہ تھے بلکہ نثر میں بھی انشا پردازانہ دستگاہ رکھتے تھے۔ [illegible] اخبار نویسی میں بھی انکو اچھا ملکہ تھا۔ ریاض الاخبار جب تک گورکھپور سے نکلتا رہا [illegible] فرائض منصبی کو پورا کرتے رہے۔ سیاسی معاملات میں مختصر نوٹ وہ لکھا کرتے تھے، وہ [illegible] خیز اور دلچسپ ہوا کرتے تھے۔ [illegible] صاحب الرائے [illegible] ٹپکتی تھی۔ اودھ پنچ اور مشیر قیصر [illegible] ریاض الاخبار اور اودھ پنچ کو دیکھا ہے انکو یہ حالات معلوم ہیں۔ [illegible] ریاض کی طباعی اور شوخ نگاری کے نمونے مل سکتے ہیں۔

اخبار نویسی کے انہماک تامہ کے بعد بھی ریاض نے اپنی غزل گوئی کی شان کو قائم رکھا۔ نظم و نثر دونوں میں انکو مہارت تام تھی۔

شاعر کے لیے آزادانہ مزاجی ضروری ہے۔ ریاض کے بعض احباب بھی اسی قسم کے تھے جو باوجود قابلیت فنی کے آزاد مزاج تھے۔ مولانا شرر مرحوم ریاض کے خاص دوستوں میں تھے۔ نثار حسین مرحوم (مدیر پیام یار) بھی انکے بے تکلف دوست اور ہمنشین تھے۔ اور بعض مقامات میں ہم سفر بھی رہ چکے ہیں۔

سفر و حضر میں ریاض کی شوخ طبعی کی بعض حکایات عجیب و غریب سنی ہیں جنکو بخیال طوالت نظر انداز کیا جاتا ہے۔ بعض لوگوں سے سنا ہے کہ ریاض نوجوانی میں اپنی ٹوپی میں ریاض کا نام لکھوا کر نکلتے تھے۔ وہ ایک بار دوستوں کی خوشی سے بھیس بدل کر سائلانہ حیثیت سے کچھ وصول کر کے تنقل و تفکہ میں صرف کیا۔ مگر یہ بیانات اور اسی قسم کے دوسرے حالات روایتی ہیں۔

ریاض کو اگر ملازمت کی طرف توجہ ہوتی تو وہ اپنے والد سید طفیل احمد کے ذریعہ سے پولیس میں ملازم ہو سکتے تھے۔ کیونکہ وہ کوتوال تھے۔ مگر ریاض کو پولیس کی ملازمت کیوں پسند آتی۔ وہ گاہ گاہ پولیس کے سوء نظم پر نکتہ چینی کیا کرتے تھے اس باعث پولیس ان سے ناراض تھی۔ پولیس کی ملازمت کے سوا اگر وہ کسی رئیس سخن دوست سے تعلق پیدا کرنا چاہتے تو آسانی سے ممکن تھا بلکہ بخوشی انکو ملازم رکھ لیا جاتا۔

جالب مرحوم ریاض کو بادشاہ سخن کہا کرتے تھے اور انکے رنگ شاعری کے مداح و معترف تھے۔ رامپور اور حیدرآباد میں ان کے بعض دوست احباب موجود تھے اور خود رئیس انکی شاعری کو پسند کرنے والے تھے۔

ریاض الاخبار بند ہونے کے بعد گویا ریاض کے جوش و وجدانیت میں کمی پیدا ہوئی اور جوانی کی تاب و تواں میں انحطاط آ گیا۔ کچھ دنوں لکھنؤ میں بھی طباعت کا ناکام سلسلہ رہا آخر کار ترک کرنا پڑا۔ کچھ عرصہ مہاراجہ صاحب بہادر محمود آباد (مرحوم) کے دامن لطف سے وابستگی ہوئی اور مہاراجہ صاحب مغفور ہی کے مقرر کردہ وظیفہ پر بسر اوقات رہی۔ مہاراجہ صاحب کی خدمت میں ریاض نے کئی قطعات پیش کیے۔ غالباً مہاراجہ صاحب سے اسکا صلہ بھی ملا ہو۔ مہاراجہ صاحب ریاض پر شاہانہ اور مربیانہ توجہ فرماتے تھے اور شاید مشورہ سخن بھی کرتے تھے۔ غالباً پسماندگان ریاض سے وہ رعایت ملحوظ رہے کیونکہ وہ غیر مطمئن ہیں۔

ریاض کی مالی حالت کبھی قابل اطمینان نہیں رہی۔ اور یہ گویا میراث اہل فن و کمال کی ہے۔ انکے دیوان کا زندگی میں طبع نہ ہونا [illegible] ہے [illegible] اس سرمایہ نظم [illegible] ہی میں رہے کہ

کوس رحلت بکوفت دست اجل

مرحوم اس آرزو کو اپنے ساتھ لے گئے۔ ریاض کی کئی لڑکیاں اور لڑکے ہیں مگر کوئی "میراث پدر خواہی علم پدر آموز"

کا مصداق نہیں - امید ہے کہ ریاض کے بعض ذی اثر اور معتقد احباب ریاض کی اس مردہ آرزو کو زندہ
کرکے انکی روح کو خوش اور سخن دوست اصحاب کے لیے ایک دلکش تحفہ پیش کریں گے - ادبی دنیا میں ریاض
کا دیوان قابل قدر چیز ہوگا - چونکہ اُن کا دیوان ہنوز غیر مطبوعہ ہے اس لیے ان کے کلام پر نقد و تبصرہ کافی نہیں
ہوسکتا، مگر اُن کے متفرق مطبوعہ کلام سے کچھ انتخاب کرکے مرحوم کی یاد تازہ کی جاتی ہے -
حسب معمول شعراء ریاض نے بھی علاوہ رنگ تغزل کے استخفافِ مذہب کو جائز رکھا ہے - شراب کے
مضامین باوجود مینوش نہ ہونے کے ایسے لکھے ہیں کہ میخوار بھی نہ لکھے گا - ریاض نے شراب کو ہاتھ سے بھی
نہ چھوا ہوگا، وہ پابندِ صوم و صلوٰۃ بھی تھے - مگر شاید ہی کوئی غزل انکی ایسی ہو جس میں شراب کی میخوارانہ تصویر
نہ کھینچی ہو - میں نے ایک روز کہا کہ اس بڑھاپے میں تو آپ رندانہ اشعار سے کنارہ کشی کیجیے - جواب دیا
کہ یہ تو شرابِ محبت ہے -

ایک غزل میں لکھتے ہیں

یہ دشتِ ابر پہ جاتے ہیں خم کے خم کہاں ساقی　　بتا دے آج شورِ قلقلِ مینا کہاں ہوگا

برسات میں بادلوں کا اِدھر سے اُدھر جانا اور کبھی تصادم سے گرجنا گویا صدائے قلقل مینا ہے - پھر ساقی
سے پوچھتے ہیں کہ یہ شورِ قلقلِ مینا کہاں ہوگا؟ قلقل مینا سے بادلوں کی گرج کو تشبیہ دینا غالباً نئی مثال ہے -
اسی زمین میں شورِ خندۂ گل کو شورِ اذاں کس رنگ سے ثابت کیا ہے، یہ شعر نازک خیالی کی بہترین
مثال ہے - شورِ خندۂ گل کو اذان سمجھ کر یادِ خدا کے لیے اُٹھنا میکشوں کے لیے عجیب بات ہے -

نہیں صبحِ چمن میں کیفِ خوابِ صبح سمجھا نہ　　کہ شورِ خندۂ گل کان میں شورِ اذاں ہوگا

معشوقانہ اندازِ تبسم :-

تبسم اور شوخی اُسپہ اندازِ تبسم کی　　ترے لب پر جو یوں آیا کوئی رازِ نہاں ہوگا

ذیل کے شعر میں قاتل کی ہمدردی ملاحظہ ہو

لہو روئیں گے میرے زخم دامن رکھ کے آنکھوں پر　　تمہارا داغِ دامن حشر میں جیبِ گلستاں ہوگا

اس مختصر انتخاب میں کلام کا انتخاب ردیف وار نہیں ہے - جو شعر یاد آئے یا بعض پرچوں سے ملے
درج کر دیے گئے - ذیل کی غزل میں مطلع کے سوا باقی اشعار میں رنگ تصوف کی جھلک نظر آتی ہے مگر رنگ
تغزل کو قائم رکھا ہے - وہو ہذا

او کوسنے والے اب دعا دے　　کہہ دے کہ تجھے خدا شفا دے
درماں کی طرح تڑپ مزا دے　　یارب مجھے دردِ لادوا دے

وہ ایک شعر میں ایسی شراب کے خواہاں ہیں جو دنیا کے میکدہ میں نہیں مل سکتی یعنی بادۂ توحید و معرفت کی تمنا کرتے ہیں

یہ میکدے سب ہیں اس سے خالی   دل کو مرے بیخودی عطا دے

اسی مضمون کو دوسرے طرز سے لکھتے ہیں جس کا روئے سخن مرشد یا حُسنِ ازل سے ہے۔ دنیا کے ساتھ حُسنِ عاقبت کی آرزو کرتے ہیں بہت ہی پاکیزہ متصوفانہ خیال ہے

جنت میں بھی حشر میں بھی کام آئے   تو ہاتھ سے جام اک پلا دے

دو شعر اور ملاحظہ ہوں

میری شبِ غم کی صبح ہو جائے   وہ رُخ سے ذرا نقاب اٹھا دے

وہ تارِ نفس کہاں سے لاؤں   ٹوٹے ہوئے دل کی جو صدا دے

ذیل کے اشعار میں شوخ طبعی اور رندانہ مذاق کی تصویر آ رہی ہے۔ اس زمین میں مغفور امیر مینائی کا یہ مطلع بہت مشہور اور پسندیدہ ہے

ستارے مرے دیکھے بھالے ہوئے ہیں   یہ سب گنبد میرے اُچھالے ہوئے ہیں

اور نکالے کا قافیہ بھی شوخی میں خوب کہا ہے

شکایت جو کی میں نے جوبن پہ بولا   ارے یار ہم بھی نکالے ہوئے ہیں

اب ریاض کے نکالے اور اُچھالے کے قافیوں کو ملاحظہ کیجیے اور دادِ طباعی دیجیے

یہ سیدھے جو اب زلفوں والے ہوئے ہیں   ہمارے ہی سب بل نکالے ہوئے ہیں

چھپا کر بہت پی ہے مسجد میں واعظ   یہ ظرف و سبو سب کھنگالے ہوئے ہیں

الگ ہے خدائی سے سب ساخت ان کی   یہ بت اور سانچے میں ڈھالے ہوئے ہیں

جنوں فصل[1] لایا ہے کچھ فصلِ گُل میں   یہ لالہ نہیں زخم آلے ہوئے ہیں

یہ اے شیخ گنبد نہیں مسجدوں کے   خُم مے ہمارے اُچھالے ہوئے ہیں

سُنا ہے ریاض اپنی داڑھی بڑھا کر
بُڑھاپے میں اللہ والے ہوئے ہیں

ریاض نے شراب کے مضامین میں بعض شعر ایسے بھی نکالے ہیں جو حافظ اور عمر خیام کے رنگ سے ملتے ہوئے ہیں اور ایک اُردو گو شاعر کے لیے یہ کمالِ مشق کی انتہا ہے یعنی یہ اشعار بظاہر رندانہ ہیں مگر ان پہ رنگِ تصوف مضمر ہے۔ مثلاً

---

[1] غالباً رنگ کی جگہ فصل چھپ گیا ہے۔

پی پی کے اُسنے سجدے کیے ہیں تمام رات　　اللہ رے شغل زاہد شب زندہ دار کا

ظاہر ہے کہ زاہد شب زندہ دار کی شراب مے عشق ہے ورنہ رات بھر خدا کی عبادت کون کر سکتا ہے۔ دنیا کی شراب تو بدحواس اور مدہوش کرنے والی ہے۔ رند کو اپنے سر و پا کی خبر نہیں رہتی تو یادِ خدا کیسی۔ اسی مذاق سے ملتا ہوا یہ شعر بھی ہے

حرم و دیر میں ہوتی ہے پرستش اُس کی　　میکشو یہ بھی کوئی نام ہیں میخانوں کے

ایضاً

کبھی کی پی ہوئی کام آئی آج حشر کے دن　　خدا کے سامنے میخوار سرخرو آئے

انتہائی شوخی

وہ آرہا ہے عصا ٹیکتا ہوا واعظ　　ہوا دے اتنی کہ ساقی کہیں نہ تھام لے

مست مے عشق کے رفتار و حرکت کو کس پیرایہ میں ظاہر کیا ہے۔ میرے خیال میں یہ شعر بالکل نیا ہے جہانگیر کے کسی درباری شاعر کا شعر ہوتا تو وہ سیم و زر میں تولا جاتا

فرشتے عرصہ گاہِ حشر میں ہم کو سنبھالے ہیں　　ہمیں بھی آج لطفِ لغزشِ مستانہ آتا ہے

اسی قافیہ کو آتش مرحوم نے بھی خوب کہا ہے مگر دونوں میں جو فرق مابہ الامتیاز ہے وہ محتاجِ بیان نہیں خیال جداگانہ ہے

اُلٹتی ہیں صفیں گردش میں جب پیمانہ آتا ہے　　مگر اُسکو فریبِ نرگسِ مستانہ آتا ہے

اس شعر میں دریا کو بیابان کس خوبی سے ثابت کیا ہے نازک خیالی کی بہترین مثال ہے۔ یعنے

مجھ کو آنکھوں نے دکھایا ہے پلک جھپکاتے　　خشک ہو کر کسی دریا کا بیابان ہونا

کسی شاعر کا یہ شعر مشہور ہے

قیس جنگل میں اکیلا ہے مجھے جانے دو　　خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو

اسی مضمون کو ریاض نے دوسرے ردیف و قافیہ میں عجب اثر انداز الفاظ میں نظم کیا ہے جس کی داد اہل سخن دے سکتے ہیں

روز راتوں کو سحر کرتا ہوں یہ آواز قیس　　پھاڑے کھاتا ہے مجھے خالی بیابان آجکل

شمع کو گریاں اکثر شعرا نے کہا ہے مگر ریاض کی جدت آفریں طبیعت نے اُسکو خنداں بنا دیا۔ اور وجہ خندہ س پیرایہ میں بیان کی ہے۔ یہ شعر بھی ریاض کا حصہ ہے وہو ہٰذا

تھا حسن اتفاق کہ پیہم شرر اُٹھے　　وہ خوش ہوئے کہ شمع کو ہم نے ہنسا دیا

افسردگی اور بے دلی کا اظہار

دل سے نکالا اڑا لے سب ارمان ممال کے — اب پھینک آئیں سینے سے کیا دل نکال کے

رندانہ آزاد مزاجی

سال پلٹے ایک خم بھیری کو نکلے ہیں ریاضؔ — میکدے کچھ وقف ہیں ان شیخ جی کے واسطے

ایک دوسری زمین میں رندانہ شوخی کی حد کر دی ہے ملاحظہ ہو

راہی ملتی ایک شے تھی آبِ زمزم سے بہت — ہم چرا کر لے گئے اہل حرم کے واسطے

اسی زمین میں یہ شعر بھی خوب کہا ہے دنیاوی تعلقات کے کم کرنے کو کس پیرایہ میں ادا کیا ہے

یہ ہوائے تاجداری یہ ہوائے خودسری — اے حباب اتنے کھیڑے ایک دم کے واسطے

ولہ

ریاضؔ اک چلبلا سا دل ہو ہم ہوں — حسینوں کی بھری محفل ہو ہم ہوں

یہ شعر جذبات حسن و عشق کی دلکش تصویر ہے۔ غالباً یہ مطلع ریاضؔ نے نوجوانی میں کہا ہوگا۔ بندش کس قدر صاف ہے۔ دونوں مصرعے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہیں۔

چلے آتے ہیں خوش خوش اپنے گھر سے — وہ ہنستے کھیلتے بازِ سحر سے

اس شعر میں معشوق کی شوخ مزاجی میں بھولے پن کی ادا دکھائی ہے۔ بازِ سحر جو ایک غیر مرئی شے ہے، اُس سے کھیلنا خلافِ قیاس ہے، مگر لطفِ بیان نے شعر میں دلآویزی پیدا کر دی۔ مجھ سے ایک صاحب نے بیان کیا تھا کہ سابق نواب صاحب رامپور نے اس شعر پر اظہارِ پسندگی فرمایا تھا۔

غالبؔ نے ایک شعر میں غریب واعظ پر میخواری کا الزام بطور تجاہلِ عارفانہ لگایا ہے۔ شعر اپنے رنگ میں لاجواب ہے یعنی

کہاں میخانہ کا دروازہ غالبؔ اور کہاں واعظ — پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

ریاضؔ نے اپنے ایک شعر میں قریباً یہی شوخی پیدا کی ہے۔ وہ علانیہ اقرار میکشی کرتے ہیں، مگر کس ٹھاٹھ سے گویا اچھے خاصے واعظ او مولوی ہیں مگر درپردہ رند

ہم نے دیکھا طرفِ میکدہ جاتے تھے ریاضؔ — اک عبا پہنے، عصا تھامے عمامہ باندھے

ولہ

نہ دن کو دھوپ رکتی ہے نہ شب کو اوس رکتی ہے — مرے گھر کا وہ عالم بیکسوں کی جیسے تربت ہو

اس شعر میں غربت اور بیکسی کی جو حالت دکھائی ہے وہ ایک واقعی امر ہے۔ اس لیے یہ واقعہ ہے نہ مبالغہ۔

شعر کو پڑھ کر دل متاثر ہوتا ہے۔

ہاتھ سے گلچیں کے جھٹکے کون کھائے   شاخِ گل پر آشیانہ کچھ نہیں

ان دونوں مصرعوں میں خودداری کو ظاہر کیا ہے جو خصائلِ انسانی میں بہترین خصلت ہے۔ شاخِ گل کو اس واسطے چھوڑا جاتا ہے کہ گلچیں کی تعدی اور کج خلقی سے نجات ملے۔

ہے ریاض اک جوانِ مست خرام   [illegible] جھومتا جائے

یہ شعر بھی عنفوانِ شباب کی حالت کا نقشہ اتار رہا ہے۔ جوشِ شباب کی مستی کیفِ شراب سے جداگانہ ہے بعض نوجوانوں کی رفتار مستانہ بھی ہوتی ہے۔

ولہٗ

هم وہاں ہیں کہ جہاں دونوں برابر ہیں ہمیں   یہ شبِ وصل ہے کیا یہ شبِ فرقت کیا ہے
آ کے دو آنسو گرائے کوئی امید نہیں   اب مری قبر سے لپٹی ہوئی حسرت کیا ہے
اے ریاض آج بھی جاتے ہو کہاں زنداں سے   نہ کھلے گل، نہ بہار آئی، یہ وحشت کیا ہے

پہلے شعر میں عاشقانہ محویت کی حالت بیان کی ہے۔ جب انتہائی استغراق و محویت خیالِ یار میں ہوتی ہے تو وصل و فراق میں امتیاز نہیں رہتا۔ عاشق نے رخِ خیالی تصویرِ دوست میں مستغرق ہو کر لذتِ وصل سے محظوظ ہوتا ہے۔ دوسرے شعر میں فقدانِ غمگسار سے مخزون ہو کر حسرت کا اظہار کیا ہے کہ میری قبر سے لپٹنا چھوڑ دے۔ حسرت ویاس کی اچھی مصوری کی ہے۔ تیسرے شعر میں زنداں سے رہا ہو کر پھر زنداں ہی میں لوٹ جانے کی وجہ خوب بیان کی ہے۔ جب موسمِ گل ہی نہیں تو وحشیانِ عشق کے لیے زنداں ہی کیا برا ہے۔

کیا کیا مزے نہ لیے ہیں لحد کے فشار نے   اپنا بنا لیا مجھے ظالم کے پیار نے

لحد کے فشار کا مزا کیا؟ یہی نا، کہ گوشت و پوست اور استخوان کو پیس ڈالا۔ دوسرے مصرعہ نے مصرعہ اولیٰ میں جان ڈال دی ہے۔ یعنی مجھے اس ظالم (لحد) کے پیار نے اپنا بنا لیا۔ خاک میں خاک مل گئی۔ مفہومِ شعر کتنا اچھا رہا۔

سینے تک آئے سونے میں کب میرے دستِ شوق   دھوکا دیا تجھے ترے پھولوں کے ہار نے

رنگِ تغزل میں یہ شعر ڈوبا ہوا ہے۔ اپنے دستِ شوق کا الزام پھولوں کے ہار کو دے کر معشوق سے اپنی بے قصوری ثابت کی ہے۔

یہ سن کے، دور جاتی ہے آواز رات کی   بیٹھا ہے قیس نجد میں مجھ کو پکار نے

نجد میں جب قیس تنہائی سے گھبرایا تو اس نے رات کو آواز دی کہ ریاض میرے پاس آئیں تو میرا دل بہلے۔

خوب شعر کہا ہے۔

مٹی کے ساغروں میں یہاں ہے تازگی گُل — ہر شے میں جان ڈال دی فصلِ بہار نے

یوں تو فصلِ بہار سب ہی کے لیے خوش آیند ہے۔ مگر رندوں کے لیے مٹی کے ساغروں میں بوئے گُل پیدا ہو جانا بہت ہی سُرور افزا اور طرب انگیز ہے۔

اتنا تو ہم بھی جانتے ہیں ایک آہ کی — بے آس ہو کے اس دلِ امیدوار نے

عاشقانہ مایوسی کو نئے انداز سے نظم کیا ہے۔ بے آس اور مایوس ایک ہی بات ہے

ولہ

دن میں چرچے خُلد کے شب میں مئے کوثر کے خواب — ہم حرم میں آرہے میخانہ ویراں دیکھ کر

اس شعر میں ریاض نے ترکِ رندی کو جدید طرز سے بیان کیا ہے۔ میخانوں کو جب ویران اور خراب دیکھا تو حرم میں آ گئے اس لیے کہ دن کو خلد کا چرچا رہتا ہے اور رات کو مئے کوثر کے خواب دیکھتے ہیں۔ میخانوں میں جب شراب ہی نہیں تو رند اپنے دل کو کیونکر تسکین دے۔ مگر مفہومِ شعر سے کنایتاً یہ ثابت ہے کہ حرم کا رہنا مجبوراً ہے۔ دراصل یہ شعر بھی رندانہ ہے گو بادی النظر میں پارسایانہ جھلک دکھاتا ہے۔

صبح پیری آنکھ جب اپنی کھلی تو یوں کھلی — جیسے کوئی چونک اُٹھے خواب پریشاں دیکھ کر

چشمِ عبرت دیدۂ حسرت تھے ذرّے خاک کے — رو دیے ہم عالمِ گورِ غریباں دیکھ کر

شوخی اور آزادی کے ساتھ نیچرل رنگ ذیل کے شعر میں ملاحظہ ہو

چھپی اودی گھٹاؤں میں وہ پریاں رقص جن میں ساقی — اتر کر رقص کرنے دامنِ کہسار میں دیکھا

کون سورج کی نکلی جام سے — یہ کیسی دھوپ نکلی چاندنی میں

ولہ

دل بیتاب بھی کیا اشک کے طوفاں میں گیا — پُرشکن موج سے ہے دامنِ دریا کیسا

اشک کے طوفان میں دل کے بہ جانے سے دریا کا پُرشکن یعنی رنجیدہ ہونا اس لیے کہا کہ دل کی بیقراری سے دریا کے سکون میں فرق آ گیا، جوش و بیقراری پیدا ہو گئی۔ کثرتِ گریہ سے طوفانِ اشک کا دریا میں دل جانا دلاور مبالغہ ہے۔ یہ شعر فارسی اشعار کی معنی خیزی ظاہر کرتا ہے۔

دیکھنا چٹکی میں اُنکی کوئی ناوک تو نہیں — مُنہ کو دوڑ کے یہ آتا ہے کلیجا کیسا

بیٹھے ہو دل ہے اُس نے تیر کی جھلک یار کی چٹکی میں دیکھ لی ہے اس لیے فرطِ شوق میں سینے سے

خون نکلا آتا ہے کہ ناوکِ یار مجھ کو ہدف بنائے۔ خوب شعر ہے۔ شوق قدوائی نے بھی ایک شعر اسی مذاق سے ملتا ہوا کہا ہے اور خوب کہا ہے

چھوٹنے تک یہ دل بیتاب کے مضطر رہا   تیر چٹکی میں لہو کے گھونٹ پی پی کر رہا

دیگر

کس کا غبار ہے یہ ہمارا غبار ہے   جس کا ہر ایک ذرہ دلِ بے قرار ہے

لے لو دم اور گھنی چھاؤں سے اُٹھنے والو   ہم بھی چلتے ہیں ذرا خشک پسینا ہو جائے

یہ شعر بالکل واقعہ ہے۔ مسافرانِ دشتِ محبت سے کہتے ہیں ذرا درختوں کے سایہ میں اور دم لے لو میں بھی تمہاری طرح تھکا ہوا ہوں، ذرا پسینہ خشک ہو لے تو ہم تم ساتھ ہی صحرائے عشق کو طے کریں گے کیونکہ ہمراہی میں دل بہلتا رہے گا۔

کسے بتائے کوئی رنگِ آرزو کیا ہے   اُنھیں یہ ضد ہے کہ دیکھیں گے ہم کہ کیا ہے[1]

ریاض کا یہ شعر رنگِ تغزل کی نادر مثال ہے۔ معشوق کا خونِ آرزو دیکھنے کے لیے ضد کرنا اور عاشق کا خونِ آرزو دکھانے سے پس و پیش اس خیال سے کرنا کہ وہ اسکی کیا قدر کرے گا بہت ہی والہانہ مذاق ہے۔ غالب نے بھی اپنے ایک شعر میں معشوق کی ضد کو اسی رنگ میں لکھا ہے۔ صرف ایک مصرعہ یاد ہے

اس پہ روٹھے ہیں کہ ہم دردِ جگر دیکھیں گے

اس مختصر انتخاب سے یہ ثابت ہو جائے گا کہ ریاض نے ہر رنگ میں پسندیدہ اشعار کہے ہیں۔ غالباً بعض ناظرین کو خیال ہو گا کہ صرف منتخب اشعار درج کیے گئے اور سست اشعار پر نکتہ چینی نہیں کی گئی۔ اسکی نسبت اتنا کہدینا کافی ہے کہ خود ریاض کی زندگی میں کسی غیر نے نہیں تو ان کے خاص احباب نے بعض اشعار پر نکتہ چینی کی اور بعض اشعار بدلنا چاہے مگر ریاض چونکہ منکسر اور متحمل تھے خاموش رہے۔ لہذا میں نے بھی خذ ما صفا و دع ما کدر پر عمل کیا۔

بہرحال ریاض مرحوم کاملِ فن اور استادِ سخن تھے اور دورِ آخر کے شعراء میں انکی ذات بہت غنیمت تھی وہ داغ اور امیر کے معاصرین میں تھے۔ خدا انکو غریقِ رحمت فرمائے۔

---

[1] اس مصرعہ میں شاید کوئی لفظ میری یاد سے بدل گیا ہو۔

جوہرِ آئینہ پر ایک سرسری نظر

(مسٹر سید وصی رضا بی۔ اے آنرز)

۱۔ قدرت کے قوانین اٹل ہیں۔ مشاہدہ اور تجربہ اسکے دو شاہد عادل ہیں۔ ہر عمل کے ساتھ رد عمل (Reaction) وابستہ ہے۔ فرقۂ نصیری کی ضد پر فرقۂ ناصبی کا ظہور ہوا۔ ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری مرحوم (غالب پرست) کے مقابلہ کو ڈاکٹر عبد اللطیف (غالب بیزار) نکلے۔

"جب یہ کتاب (ہماری شاعری) پہلے پہل شایع ہوئی ...... تو اخباروں میں تقریظوں کا غلغلہ رہا۔ رسالوں میں تعریفوں کا ہنگامہ رہا"

نامی ادب اردو مسٹر منوہر لال زتشی نے اپنے انگریزی مجموعۂ مضامین (Gleanings) میں ایک مضمون اس کی تعریف میں لکھا۔ ڈاکٹر بیلی نے تاریخ ادب اردو (بزبان انگریزی) کے آخر میں اردو کی ہزارہا کتابوں میں سے گنتی کی چند کتابوں کے نام لکھے ہیں اُن میں سے ایک ہماری شاعری بھی ہے۔ جوہر آئینہ مصنفۂ جناب تجوّد موہانی بطور رد عمل ایک تنقیصی مقالہ کی پہلی قسط شایع ہوئی ہے۔

۲۔ بعضوں نے شہرت کا یہ ذریعہ اختیار کیا ہے کہ کسی مشہور شاعر یا معروف ادیب پر اعتراضات کرکے ہمیشہ کے لیے بدنام ہو جاتے ہیں۔ ناسخ نے اپنے نزدیک کلام انیس پر خطِ نسخ کھینچ دیا تھا۔ اُس کا مقصد تو پورا نہ ہوا البتہ ناسخ "بدنام کنندۂ نکو نامے چند" کی حیثیت سے آج تک زندہ رہ گیا۔ عبداللہ آدج اگر غالب کے "ڈیڑھ جزو" پر تعریض نہ کر جاتے تو باوجود صاحب ہشت دیوان ہونے کے آج انھیں کون جانتا۔ غالب غالب ہی رہا مگر عبداللہ آدج کا نام غالب کی شہرت کی بدولت زندہ ہے۔ شاید اسی طرح جناب ادیب کی شہرت کے ساتھ جناب تجوّد کا نام بھی باقی رہ جائے۔

۳۔ اس تنقیص کا انجام وہی ہوگا جو گلزار نسیم پر مولانا شرر مرحوم کی تنقید کا ہوا۔ کچھ لوگ جناب تجوّد کی موافقت کریں گے کچھ مخالفت۔ دنیائے ادب میں معاملۂ گلزار نسیم کے قسم کی ایک ہلچل مچ جائیگی۔ ہماری شاعری کا جو مرتبہ ہے وہی رہیگا۔ البتہ اس ہنگامے کے ذریعہ سے چند ادبی نکات حل ہو جائیں گے۔

۴۔ ہماری شاعری کے لکھنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ نام نہاد تعلیم یافتہ طبقہ کو راہ راست پر لایا جائے۔ اس کا بہترین طریقہ یہی تھا کہ اردو شاعری پر جو اعتراضات عموماً وارد کیے جاتے ہیں اُنکا جواب لکھ دیا جائے۔

مولانا حالی مرحوم کے مشہور مقدمہ سے جو غلط فہمی پیدا ہو گئی تھی اور اُن کے خلوص نیت کا جو غلط نتیجہ گمراہ طبقے نے نکالا تھا اُس کو دُور کرنا ہماری شاعری کا مقصد اولیں ہے۔ جناب بیخود نے جس عنوان سے تنقیص کی ابتدا کی ہے اُس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہماری شاعری کے مقصد کو سمجھنے میں اُن سے سہو واقع ہوا۔ الانسان مرکب من الخطاء والنسیان۔ انگلستان کا مشہور نقاد ریلے (Raleigh) ایسے ہی موقع کے لیے لکھتا ہے:

"اگر تم کو اظہار رائے کرنا ہی ہے تو کرو۔ مگر اس سے پہلے سمجھنے کی کوشش کرو"[1]

اگرچہ ابھی صرف جلد اول کی قسط اول ہی شائع ہوئی ہے مگر

منّے انم حدیث نامہ چہ ان است ہمی دانم کہ عنوانش بجون است

جناب بیخود فرماتے ہیں:

"مجھے ہماری شاعری سے مفصل بحث کرنا ہے اور دکھانا ہے کہ مولف علام نے کہاں کہاں خوشہ چینی کی ہے اور کہاں کہاں نکتہ آفرینی۔ علمائے بلاغت کے اقوال کہاں کہاں سنور گئے ہیں، کہاں کہاں مسخ ہو گئے ہیں۔ مثالیں تحقیق کی آئینہ دار ہیں یا آئینہ تحقیق کا زنگار ...... مولف بے بدل کی شگفتہ متانت، سنجیدہ ظرافت۔ سادہ رنگینی۔ پُرکار سادگی (خط کشیدہ فقرے جناب ادیب کے ہیں) سبھی کی داد دینا ہے"

ان عبارتوں کو پڑھنے کے بعد جوہر آئینہ کا مقصد صاف ظاہر ہو جاتا ہے ع قیاس کن زگلستان من بہار مرا۔

تمہید میں جناب بیخود فرماتے ہیں

"ابھی یہ کہنا قبل از وقت ہے کہ میری کتاب (آئینہ) ہماری شاعری کے لیے تہنیت کا ترانہ ہے، مسرّت کا شادیانہ ہے یا اُردو زبان کا مرثیہ۔ اُردو شاعری کا نوحہ ہے"

خط کشیدہ فقروں سے واضح ہوتا ہے کہ جناب بیخود کو اُردو زبان اور اُردو شاعری سے قلبی محبت ہے لیکن ان کی کتاب سے اس دعوے کی تصدیق نہیں ہوتی۔ جو کتاب اُردو شاعری کی حمایت میں لکھی گئی ہو اُس کی اس شدومد سے مخالفت کی جائیگی تو نتیجہ ظاہر ہے کہ گمراہ طبقہ گمراہ تر ہو جائیگا۔

ہمہ فکر تعمیر دارند و بس ۔ تو در بند تخریب بنیاد خویش۔

اردو زبان کے ساتھ ہمدردی کا دعویٰ کرنے کے بعد ہماری شاعری کی مخالفت کرنا یعنی اُردو شاعری کی جڑ

---

[1] Judge if you must, but before you judge try to understand. (A note on Criticism)

کھو کھلی کرنا، اپنے دعوے کو باطل کرنا ہے۔ جناب تجوّد بجا بالی خود صرف واقعی غلطیاں ہی دکھائیں گے لیکن اگر وہ اپنے اس خیال پر قائم بھی رہ سکیں تو نتیجہ یہ ہوگا کہ سطح بیں لوگوں کو اس کتاب سے ایک بدگمانی سی پیدا ہو جائے گی اور اس سے ہماری شاعری کی تصنیف کا جو مقصد ہے وہ فوت ہو جائیگا۔ انسان کا یہ فطری خاصہ قابل لحاظ ہے۔

۵ - جناب تجوّد نے جو پیرایۂ بیان اختیار کیا ہے وہ تنقید کے لیے زیبا نہیں ہے۔ بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شمشیر برہنہ لیے ہوئے میدان کارزار میں حریف کو للکار رہا ہے۔ مثالیں ملاحظہ ہوں:

"بعض احباب نے ادھر کچھ یوں ہی سی توجہ بھی فرمائی .... مگر دور ہی سے پینترے بدل کر رہ گئے۔" (آئینہ صفحہ ۱)

"ہم دو مختصر سے قطعے نقل کرتے ہیں اور ہے کوئی جوان میں سے ایک شعر بھی حذف کر دینے کی قدرت رکھتا ہو۔" (آئینہ۔ صفحہ ۲۵)

کسی ادبی موضوع پر بالعموم اور تنقیدی مقالہ پر بالخصوص قلم اُٹھاتے وقت جہاں تک ہو سکے ذاتی تعلقات کو بھلا دینا چاہیے۔ کیونکہ تنقید کا مقصد اظہار دوستی یا دشمنی نہیں ہوتا، بلکہ غیر جانبدارانہ اور منصفانہ فیصلہ ہوتا ہے۔ اگر جذبات کا دخل نہ ہوگا تو بھی شان تحریر کے شایاں ہوگا اور تہذیب کا دامن بھی ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے گا۔ آئینہ کے ہر ہر فقرہ سے ذاتی پرخاش کا اظہار ہوتا ہے، جو تنقید کی عالمانہ عبارت کے لیے نازیبا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کوئی گرہ بہ ابرو۔ چیں بہ جبیں۔ کف در دہاں۔ چلا چلا کر دل کے بخارات نکال رہا ہو۔ مثالیں ملاحظہ ہوں:

"مولف علام نے اس قطعے کے متعلق دو صفحے سیاہ کیے مگر نتیجہ کچھ بھی نہیں"

"جناب مولف کی دی ہوئی مثالیں زیادہ تر ایسی ہی ہیں یعنی غلط ہیں۔ سقیم ہیں۔ بے محل ہیں......"

(آئینہ۔ صفحہ ۳۵)

اس عبارت کے بعد نقطے دیے ہوئے ہیں جن کا مطلب ہے ع۔ کہ اب تہذیب کا دامن بھی چھوٹا جا رہا ہے مجھ سے

"اس وقت مصنف علام کی وہ حالت نظر آتی ہے جو مرض کے بحران اور نزع کے ہیجان میں ہوتی ہے" (آئینہ صفحہ)

اس تشبیہ کی شائستگی قابل ملاحظہ ہے۔

۶ - اس تمہید کے بعد میں جناب تجوّد کو یہ مشورہ دوں گا کہ اگر اُنکے نزدیک ہماری شاعری میں خامیاں ہیں تو وہ مہذب طریقہ سے اُن کو دور کرنے کی کوشش کریں۔ مثلاً جن مثالوں کو وہ غلط سمجھتے ہوں اُن کے بجائے صحیح مثالیں پیش کر دیں۔ فیصلہ ارباب نظر کے ہاتھ ہے۔

اگر وہ ہماری شاعری کو از سرتا پا غلط یا مہمل سمجھتے ہوں تو اس موضوع پر اس سے بہتر ایک کتاب لکھ ڈالیں۔ کیونکہ آجکل ایسی کتابوں کی اشد ضرورت ہے۔

اگر تنقیدی مقالات لکھنے کا شوق ہو تو میں یہ ضرور التماس کروں گا کہ وہ اس فن پر انگریزی میں چند کتابیں (کم ازکم سچا نش) پڑھ لیں۔ کیونکہ اُس زبان میں یہ فن معراج کمال پر پہونچا ہوا ہے۔ اس مطالعہ سے کم ازکم اتنا فائدہ تو ضرور ہوگا کہ تنقیص اور تنقید کا فرق بخوبی معلوم ہو جائیگا۔ اس موقع پر میں بصد ادب پنڈت بشن نرائن در کا ایک شعر نقل کرتا ہوں

ہمیشہ چاک پیراہن پہ پڑتی ہے نظر اُس کی
نہیں جز عیب بینی عیب کوئی چشم سوزن میں

نالۂ قیس

(جناب مولوی محمد عاصم صاحب قیس کاکوروی)

سینے میں داغِ دل کو درخشاں کیے ہوے
نکلا ہوں آفتاب کو حیراں کیے ہوے

ایمان۔ کفرِ عشق کو ایماں کیے ہوے
ہے سارے کافروں کو مسلماں کیے ہوے

جیتا ہوں جاں حضور پہ قرباں کیے ہوے
ہے اتنی بات جاں کو مری جاں کیے ہوے

کیا کہیے جیرہ دستیِ شوقِ وصال کو
جو ہر نہیں کو آپ کی ہے 'ہاں' کیے ہوے

عہدِ وفا سے آپ کے ہے میری زندگی
گویا کہ ہے جو یاس کو ارماں کیے ہوے

عاشق ہے جسم و روح سے بھی اپنی بے نیاز
سب روح و جسم زندۂ جاناں کیے ہوے

لطفِ شہود یہ ہے کہ قصے ہوں مختصر
اک حیرتِ محض کو فراواں کیے ہوے

سالک ہے راہِ عشق کا ہر دم حضور میں
ہر پیچ رہ کو گیسوِ پیچاں کیے ہوے

کنجِ شبِ فراق ہے بزمِ شبِ وصال
دامانِ شب کو زلفِ پریشاں کیے ہوے

پھر ہے مزاجِ طائرِ وحشی تر نگ پر
کنجِ قفس کو اک چمنستاں کیے ہوے

صحرا کو پھر چلا اُڑ کے جاتے کہاں ہو قیس
تارِ نفس کو تارِ گریباں کیے ہوے

ترکیب بند

(غیر مطبوعہ کلام حضرت امیر مینائی)

باغِ ہستی میں گزرتے ہیں عجب لیل و نہار
کبھی ایامِ خزاں ہیں کبھی ایامِ بہار

موئے گیسو میں سیاہی سے سپیدی آئی
کیا تلوّن ہے کہ کافور ہوا مشکِ تتار

نہ صراحی سی ہے گردن نہ وہ رُخ سرخ و سپید
نہ وہ انگیزِ بدن ہے نہ وہ سینے کا اُبھار

حُسن و خوبی کے مرقع پہ پھرا یہ پانی
رنگ باقی نہ رہا مٹ گئے سب نقش نگار

صرصرِ مرگ چلی ایسی کہ پژمردہ ہوئے
سیکڑوں رشکِ چمن، غنچہ دہن، لالہ عذار

جنکے پھولوں سے زیادہ تھے نزاکت میں بدن
پاؤں پھیلائے وہ سوتے ہیں تہِ سنگِ مزار

خاک کو اُنکی اُڑائے لیے پھرتی ہے ہوا
گھر سے رہتے تھے جو بادکے گھوڑے پہ سوار

مٹ گئے، خاک ہوئے جامۂ ہستی اُنکے
جھاڑتے چلتے تھے دامن سے جو رستے میں غبار

جامۂ تنگ میں جو تنگ رہا کرتے تھے
کیا شکنجے میں لحد کے ہیں گرفتارِ فشار

یا تو مجمع زرِ و دولت پہ تھا یا اب کوئی
فاتحے کو بھی لحد پر نہیں آتا زنہار

اُن کے مرنے کا ہوا حُسن جو انکو یہ غم
بن کے بیٹھا ہے لحد پر صفتِ ماتمدار

چشمِ عبرت سے سوئے باغ جو جا کر دیکھا
کہہ رہی تھی یہی اک شاخ پہ اک بلبلِ زار

حیف در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد
روئے گُل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

تیغِ ابرو کو جو دیکھو تو ذرا آب نہیں
تیرِ مژگاں میں وہ تپہ نہیں پرتاب نہیں

سر جھکا عالمِ پیری میں ہوا خشک بدن
قد صنوبر نہیں چہرہ گُل شاداب نہیں

کفن و غسل کا نزدیک زمانہ آیا
خواہشِ آبِ رواں و شبِ مہتاب نہیں

شاہدِ پیر غضب ہے جو کرے اب گرمی
طائرِ روح کم از طائرِ سیماب نہیں

آئینہ سامنے آتا ہے تو شرم آتی ہے
حوصلے مٹ گئے نخوت کے وہ اسباب نہیں

شوق کہتا ہے جھکاؤں تہِ ابرو کیا سر
قابلِ سجدہ یہ ٹوٹے ہوئے محراب نہیں

موجۂ موئے کمر یا کسی بچھو کا ہے نیش
دہنِ مار ہے اب ناف کا گرداب نہیں

نہ رہا نام کو بھی حسنِ لب و دنداں کا　　لعل میں رنگ نہیں موتیوں میں آب نہیں
شبنم و ذرہ و خرما کا نہیں نام و نشاں　　اب تو وہ جلوۂ خورشیدِ جہاں تاب نہیں
نہ وہ پوشاک ہی رنگیں نہ وہ چہرہ سیمیں　　داغ ہی داغ ہے لالہ نہیں مہتاب نہیں
کارواں ہے نہ خریدار نہ بازار نہ مصر　　وصلِ یوسف کے خیالات بجز خواب نہیں
جو مکاں خانۂ عشرت تھے ہوئے ہو کے مکاں　　کثرتِ خلق نہیں مجمعِ احباب نہیں

کلکِ تقدیر کہ شرحِ خطِ رخسار نوشت
معنیش فاعتبروا یا اولی الابصار نوشت

نغمۂ صفی

(جناب مولانا سید علی نقی صاحب صفی لکھنوی ملقب بہ لسان القوم)

پھرتی ہے جس کو گردشِ دوراں لیے ہوئے　　دل میں ہے وہ غریب کچھ ارماں لیے ہوئے
خنجر نگاہِ عربدہ ساماں لیے ہوئے　　گردن پہ خونِ گبر و مسلماں لیے ہوئے
چھیڑا تھا یوں ہی نشترِ مژگاں نے اک بار　　اب تک خلش ہے دل میں رگِ جاں لیے ہوئے
اہلِ جہاں سے اے دل امیدِ کرم نہ رکھ　　ہر آستیں ہے دشنۂ پنہاں لیے ہوئے
آتا ہے کس حسیں کے نظارے کو صبح دم　　آئینہ اک مہرِ درخشاں لیے ہوئے
جھک جھک کے دیکھتا ہے مرے جوشِ آہ کو　　گردوں چراغِ مہ تہِ داماں لیے ہوئے
ہر عندلیب کو ہے چمن در نگاہِ عشق　　ہر گل بغل میں اک گلستاں لیے ہوئے
آندھی ہیں راہِ شوق میں شوریدگانِ عشق　　دامن میں خاکِ کوچۂ جاناں لیے ہوئے
بیٹھا ہوں عرصگاہِ قیامت میں شرمسار　　دامانِ تر میں گوہرِ غلطاں لیے ہوئے
ٹھہری ہوئی رگوں سے ملاتا ہوں بار بار　　ہاتھوں پہ چند تارِ گریباں لیے ہوئے
مرجھا گئی ہو جو وہ کلی پھر کھلے گی کیا　　سینے میں دل ہے پہلوِ حرماں لیے ہوئے
جوشش بہار کی وہ گل افشانیاں کہاں　　رنگِ خزاں ہے اب چمنستاں لیے ہوئے
آتی نہیں نظر مجھے پہنچی ہے اتنی دور　　لطفِ شباب عمرِ گریزاں لیے ہوئے
بے طرح آج ہے رخِ طوفانِ ابر و باد　　سمتِ سوادِ شامِ غریباں لیے ہوئے

نہ رنگ اور نہ بوئے اسلام کہیں صفی
ہو تم بغل میں، ہاتھ میں، قرآں لیے ہوئے

تاریخ رحلت حضرت ریاض مرحوم

(جناب نواب فصاحت جنگ حافظ جلیل حسن صاحب جلیل مانکپوری)

ہند میں ایک ریاض باقی تھے | بادۂ صاف کے جو ساقی تھے
وہ ریاضِ سخنورِ کامل | شاعرِ فرد جوہرِ قابل
عندلیبِ ریاضِ گویائی | مستِ صہبائے جامِ مینائی
یوسفِ کاروانِ شعر و سخن | کوکبِ آسمانِ شعر و سخن
آہ دُنیا سے ہو گئے راہی | غرقِ حسرت ہے مہ سے تا ماہی
اُن سے قصرِ جناں ہوا روشن | بجھ گیا یاں چراغِ بزمِ سخن
لطفِ حق سے اُدھر وہ ہم آغوش | مجمعِ دوستاں اِدھر بیہوش
اُن کی تربت میں پھول جنت کے | یاں چھپے دل میں خار حسرت کے
وہ اُدھر عیشِ جاوداں کے لیے | ہم اِدھر نالہ و فغاں کے لیے
جامِ کوثر وہاں ہیں بھرتے ریاض | آنکھیں یاں خوں فشاں ہیں بہرِ ریاض
محوِ حور و قصور وہ ہیں اُدھر | یاں ہیں ناخنوں سے چہرہ و تابِ جگر
سحر و افسوں تھا ہر کلام اُن کا | شہرۂ روزگار نام اُن کا
شعر مستانہ اُن کا حصہ تھا | مے و مینا نہ اُن کا حصہ تھا
ہر غزل ایک میکدہ پُر جوش | جس کا ایک ایک تھا بادہ نوش
اثر اس نشہ کا خراب نہیں | مے اطہر ہے یہ شراب نہیں
شوخیٔ طبع اُن کی فطرت میں | مستیٔ عشق اُن کی طینت میں
اُن کے احباب اُن کے پروانے | اپنے بیگانے جیسے دیوانے
نثر بھی مثلِ نظم دلکش تھی | نغز شستہ انوکھی نوکھی غش تھی
ایک انشائے رنگیں انشا سے | یادۂ نثر کے تھے یکتا سے
چھپ کے نکلا نہیں ابھی دیواں | گنجِ مخفی کی شکل ہے پنہاں
سرد بزمِ سخن ہے جلیلؔ | جامِ صہبا ہے اُن کا ذکرِ جمیل
کہہ گیا یہ چھلک کے جامِ ریاض | چمنِ خلد ہے مقامِ ریاض

۱۹۳۴ء

فریبِ خواب

(جناب "ابو عمر" صاحب لکھنوی)

دیکھا شبِ فراق میں اک مضطرب نے خواب
فردوسِ انبساط کا اک کھل گیا ہے باب

مائل ہوا ہے حسن بصد ناز عشق پر
میں ہوں حریمِ ناز میں قسمت سے باریاب

تاباں فروغِ حسن سے دیوار و در تمام
تابش فزا ستارۂ قسمت کی آب و تاب

اک نازنیں ہے خلوتِ راز و نیاز میں
ہے وقفِ انتظار، پریشانِ اضطراب

شوخی چھپی ہوئی ہے حیا و حجاب میں
بچپن کی سادگی میں ہے لیکن ابھی حجاب

دل کو نصیب نسبتِ حسنِ نظر ہے آج
حاصل ہے چشمِ شوق کو بھی فخرِ انتساب

بیتابیوں سے عشق کی ناآشنا ہے حسن
بیگانہ وش ابھی ہے وہ بیگانۂ شباب

سرمستِ جوشِ عیش، وہ ہے اس سے بے خبر
میں رندِ بے حجاب، وہ ہے پیکرِ حجاب

ڈوبا ہے اضطراب میں یاں جوشِ آرزو
معصومیت میں غرق وہاں جوشِ اضطراب

چشمِ امید دست نگر ربط و ضبط کی
آمادہ چشمِ ناز کہ ہو جائے محوِ خواب

میری نگاہِ شوق ہے مصروفِ التجا
اُس کی نگاہِ شرم ہے سرگرمِ صد عتاب

گستاخیوں پہ دستِ ہوس ہے تُلا ہُوا
نازک مزاج یار میں برپا ہے پیچ و تاب

اُکتا کے میری عرضِ تمنا سے شوق سے
چشمِ غضب نے اُٹھ کے دیا خشمگیں جواب

فرمانِ تیغِ ابروئے خونخوار "دُور باش"
چینِ جبیں کا حُکم کہ "زیں حکم سر متاب"

چشمِ عتابِ حُسن نے بیدار کر دیا
آنکھیں کھُلیں تو دیکھ لیا دَورِ انقلاب

وہ جوشِ عیش ہے، نہ وہ ہے جوشِ آرزو
وہ دَور دَور ہے نہ وہ ہے رشکِ آفتاب

اب دل ہے لخت لخت، جگر داغ داغ ہے
میں ہوں فریب خوردۂ نقش و نگارِ خواب

اے انتظار تو نے!

(جناب مولوی محمد اسحاق صاحب مائل رضا ری خیرآبادی)

آنکھوں کی نیند اڑائی کس شوخ حیلہ جو نے   دھوکے میں مجھ کو ڈالا ہے کس کی گفتگو نے
بیتاب کر دیا ہے دل کو کس آرزو نے   کیسا کیا پریشاں اے انتظار تو نے
اے انتظار تو نے!

وہ بار بار میرا راہِ امید تکنا   ایفائے عہد پر وہ دل کا مرے دھڑکنا
مایوس ہو کے کیا کیا کچھ بیٹھے بیٹھے بکنا   کس درجہ بوکھلایا اے انتظار تو نے
اے انتظار تو نے!

وہ بدگمان ہونا وہ پیچ و تاب کھانا   دنیائے آرزو میں ہیجان سا اٹھانا
سو سو طرح سے دل کو باتوں میں پھر لگانا   کھایا نہ رحم مجھ پر اے انتظار تو نے
اے انتظار تو نے!

وہ دل کا مسکرانا، وہ عالمِ تخیل   ہوش و حواس کا وہ ہو جانا محو بالکل
پھولے نہیں سمانا میرا وہ صورتِ گل   ہنس ہنس کے خوں رلایا اے انتظار تو نے
اے انتظار تو نے!

وہ راہ چلنے والوں پر اشتباہ ہونا   کچھ دیر تک انھیں پر قائم نگاہ ہونا
پھر نا امید ہو کر دل کا تباہ ہونا   تڑپایا خوب مجکو اے انتظار تو نے
اے انتظار تو نے!

آہٹ ذرا جو پائی میں سمجھا کوئی آیا   سر جو جھکا ہوا تھا فوراً اسے اٹھایا
افسوس اے نگاہو! پھر بھی نہ کچھ دکھایا   بھٹکایا مجھ کو کیا کیا اے انتظار تو نے
اے انتظار تو نے!

آتے ہی ہوں گے "مائل" یہ دل ہی دل میں کہنا   اس آرزو میں سرا محوِ انتظار رہنا
تنہا سے ہجر اپنے تاب و جگر پہ سہنا   یہ ظلم کس سے سیکھے اے انتظار تو نے
اے انتظار تو نے

ہندو مسلمانوں میں اتحاد کیونکر ہو سکتا ہے؟

کانپور کی تحقیقاتی کمیٹی کی سفارشیں

(سلسلۂ ماہ گزشتہ)

(از ظفر الملک)

(ب) سیاسی و اقتصادی سفارشات

اب ہم سیاسی و اقتصادی سفارشات بیان کریں گے :-

(۱) ہمارا کام فنڈامنٹل رائٹس کمیٹی (بنیادی حقوق کی کمیٹی متعینہ کراچی کانگریس) کی سرگرمیوں کے بدولت بہت کم ہو گیا۔ ساتھ ہی اُسکے ہمارا خیال ہے کہ کانگریس کو اہل ہند کے روبرو سواراج کی مکمل تر تجویز کا خاکہ رکھنا چاہیے جس میں افراد کے حقوق و فرائض کا ذکر ہو، کانگریس کی اقتصادی پالیسی درج ہو، اور وہ طریقے بیان کیے جائیں جن کے ذریعہ سے ایک آزاد، دیانت دار اور آزمودہ کار مجلس وضع قوانین حاصل ہو سکے۔ سواراج کی یہ تجویز ایسی ہو جو ہندو اور مسلمانوں کو یکساں طور پر اس بات کا یقین دلا سکے کہ کانگریس سب کے اخلاقی و مادی مفاد کے لیے غیر جانبدارانہ طور پر کوشاں ہے اور کسی ایک فرقہ کے مقابلہ میں دوسرے فرقہ کی ہوا خواہ نہیں ہے - خواہ ہندو ہوں یا مسلمان، زمیندار ہوں یا کسان، سرمایہ دار ہوں یا مزدور - کانگریس کو چاہیے کہ جو جماعتیں اقلیت میں ہوں اُن کے خطرات دُور کرے اور تمام طبقوں کے غربا کو اطمینان دلائے کہ سواراجی حکومت اُنکی فلاح و بہبود کے خیال کو سب سے مقدم رکھے گی۔

جب ایسی تجویز مرتب ہو جائے تو اس کی موافقت میں زور شور سے پرچار کیا جائے۔

(۲) کانگریس کے دستور العمل میں اس مقصد سے تبدیلیاں کی جائیں کہ عہدہ داروں اور مجلس انتظامی کے ارکین کے انتخاب کے لیے خاص صفات لازمی قرار پائیں - ہماری رائے میں اُن میں حسب ذیل صفات ہونا چاہیے :-

(الف) صوبہ وار اور ماتحت مجالس کے ارکین کی عمر کم سے کم ۲۵ سال اور کل ہندوستان کی مجلس کے ارکین کی عمر ۳۰ سال ہونا چاہیے۔

(ب) وہ کم سے کم ۵ سال تک کانگریس کے معمولی رکن رہ چکے ہوں۔

(ج) وہ کسی ایسی فرقہ وار انجمن کے رکن نہ ہوں جو ہندوؤں، مسلمانوں یا سکھوں کی جماعت کے سیاسی حقوق کے تحفظ کے لیے کام کرتی ہو۔

(د) وہ یہ یقین رکھتے ہوں کہ ملک کے موجودہ حالات میں عدم تشدد ہی کا واحد طریقہ ہے جس پر سوراج حاصل کرنے کے لیے عمل پیرا ہونا چاہیے اور تشدد کی جس قدر کارروائیاں ہماری سیاسی جنگ کے سلسلے میں کی جائیں گی وہ ہمارے مقصد کے لیے نقصان رساں ہوں گی۔

(۳) فرقہ وار رہنماؤں کی پالیسی اور طریق کار کی خاص کر اسی فرقہ کے لوگوں کو مذمت کرنا چاہیے۔ یہ بات پوری سرگرمی سے واضح کر دینا چاہیے کہ فرقہ وار جماعتوں سے سب فرقوں کے مفاد کو نقصان پہنچتا ہے جبکہ کانگریس ملک کے ہر باشندے کے فائدہ کے لیے کام کرتی ہے اور اس امر کے لیے کوشاں ہے کہ دنیاوی آسایش کی ضروریات ایسے طور پر تقسیم ہوں کہ افلاس دور ہو جائے۔ اور ہر شخص کو بسر اوقات کے لائق آمدنی ہو۔ اور اس طرح مختلف اقوام و طبقہ جات اور "دار" و "نادار" کے درمیان باہمی تصادم کا خطرہ نہ رہے۔

(۴) ہماری سختی کے ساتھ یہ رائے ہے کہ مذہب کی بنیاد پر جداگانہ انتخاب کے طریقے کو موقوف کر دینا چاہیے اور کانگریس کو کسی نہج سے اسکے برقرار رہنے پر راضی نہ ہونا چاہیے۔ منجملہ ۲۶ مسلمان شاہدوں کے جن سے ہم نے اس بارے میں سوالات کیے، ۱۹ نے جداگانہ انتخاب کے طریقے کو مردود قرار دیا، اور موجودہ فرقہ وار بدمزگیوں کو بہت کچھ اسی کا نتیجہ ظاہر کیا۔ صرف سات نے اسکی تائید کی۔

بطور اصول کے ہم مذہب کی بنیاد پر مخصوص نشستوں کے خیال سے بھی اختلاف رکھتے ہیں لیکن بنظر اسکے کہ بعض اقلیت والی جماعتوں کے کثیر افراد میں شکوک اور اندیشے جاگزیں ہیں، ہمارا خیال ہے کہ ایک معینہ مدت کے لیے اقلیت والی جماعتوں کو مخصوص نشستیں دی جائیں۔ ہمیں یقین ہے کہ نئے اعتماد اور امیدوں کی بدولت جو پہلے سے زیادہ قومی تخیل پیدا ہوگا وہ جلد اس تخصیص کو غیر ضروری بنا دے گا۔

(۵) کانگریس کو فرقہ وار مجالس سے فرقہ وار حقوق کے تصفیہ کی کوشش ترک کر دینا چاہیے۔ اسے جب کبھی ضرورت پیش آئے، ساری قوم کے نمائندہ کی حیثیت میں حکومت سے گفت و شنید کرنا چاہیے۔

(۶) ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے حملوں سے بچانے کے لیے جدا جدا منظم کرنے کی تمام کوششیں جیسی کہ سنگھٹن اور تنظیم کی غرض ہے موقوف کر دینا چاہیے۔

(۷) تمام فرقہ وار رضاکاروں کی جماعتیں مثل مہابیر دل اور علی غول کے توڑ دی جائیں اور ہندوؤں

اور مسلمانوں دونوں کے مشترکہ رضاکاروں کی جمعیتیں ترتیب دی جائیں۔

(۸) کانگریس کے ہر رضاکار سے اس بات کی قسم لی جائے کہ جب کبھی اُسکے حلقہ میں ہندو مسلمانوں میں فساد ہوگا تو وہ اس امر کی انتہائی جد و جہد کریگا کہ دونوں فرقوں میں صلح ہو جائے اور طرفداری کے ساتھ ہندوؤں اور مسلمانوں کی مدد کریگا، اور اگر خود اُس پر حملہ کیا جائے تو جوابی حملہ نہ کریگا۔ بلکہ اتحاد کے مقصد کے خاطر تکلیف برداشت کریگا۔

(۹) ایک فرقہ کی کسی جماعت کی جانب سے دوسرے فرقہ کے لوگوں کے اقتصادی مقاطعہ کی جو کوششیں ہوتی ہیں وہ بدمزگی اور تصادم کا مستقل ذریعہ بن جاتی ہیں اور دونوں طبقوں کے بہترین مفاد کو نقصان پہونچاتی ہیں۔ اسکا پرزور طریقہ پر استیصال کرنا چاہیے۔

(۱۰) دونوں جماعتوں کے افراد کے درمیان اقتصادی اشتراک عمل کو بڑھانا چاہیے۔ بنک، بیمہ، تجارت، اور صنعت و حرفت کے کام متحدہ کوششوں سے جاری کرنا چاہیے۔

(۱۱) خاص کوششیں اس امر کی ہونا چاہیے کہ کانگریس کا پرچار غریبوں، کسانوں، مزدوروں اور بیکاروں میں ہو ——— کانگریس کا اقتصادی نظام عمل خاص طور پر اُن کو سمجھایا جائے تاکہ یہ امر اُن پر بخوبی واضح ہو جائے کہ ہندوؤں مسلمانوں، اونچی اور نیچی ذات والوں سب کو بدیسی حکومت اور سوسائٹی کی موجودہ تنظیم کے ماتحت باقی رہنے سے یکساں نقصان پہونچا ہے اور اُن کی اقتصادی حالت اُسی وقت بہتر ہو سکتی ہے کہ وہ سب مل کر مشترکہ اغراض کے لیے جد و جہد کریں۔

(۱۲) فرقہ وارانہ اتحاد کو مستحکم کرنے، مقامی ضروریات کے نگراں رہنے اور مقامی بورڈوں اور حکام کی کارروائیوں پر نظر رکھنے کے لیے جہاں تک ممکن ہو مشترکہ ہندو مسلم پنچایتوں اور اُنکے تحت میں مشترکہ رضاکار جمعیتوں کو وسعت دی جائے۔

(۱۳) کانگریس کے تمام جلسوں، جلوسوں میں فرقہ وارانہ انقلاب پسندوں کے لیے "ہائے ہائے" "جے" یا "زندہ باد" کے نعرے لگانا موقوف کیے جائیں۔

(۱۴) پکٹنگ (دھرنا) کی طرح ہڑتالیں بھی کلیۃً پرامن ہوں۔ کسی طرح کی زبردستی ہرگز نہ کی جائے۔

(ج) تمدنی و معاشرتی سفارشات

اب ہم اپنی تجاویز کے تیسرے حصہ یعنی تمدنی و معاشرتی سفارشات پر آتے ہیں:-

(۱) ہر ہندو اور ہر مسلمان کو دوسری جماعت میں سے کم سے کم ایک شخص کو اپنا دوست بنانا چاہیے۔ جس سے اس امر میں مدد ملیگی کہ ہر جماعت کے نقطۂ نظر کو دوسری جماعت کے لوگ بہتر طریقے پر سمجھ سکیں۔

(۲) ہندوؤں اور مسلمانوں کے تہواروں میں ایک دوسرے کی شرکت روز افزوں ہونا چاہیے - موجودہ تہواروں میں سے بعض کو جیسے کہ ہولی، دیوالی، عید الفطر اور شب برات میں دونوں جماعتوں کے مشترک تہوار کی حیثیت دی جائے - اور نئے مشترک قومی تہوار رائج کیے جائیں -

(۳) تفریح اور دلچسپی کے لیے مشترکہ کلب اور دارالمطالعے اور مجلسیں قائم کی جائیں -

(۴) ملک کے تمام باشندوں کو چاہیے کہ اپنے تئیں ہندی یا ہندوستانی کہیں اور لباس و وضع کے ایسے اختلافات کو مٹائیں یا کم سے کم اُن میں تخفیف کریں جن سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے امتیاز میں بدنمائی پیدا ہوتی ہو - خیالات میں یکسانیت اور باہمی مودت پیدا کرنے کا یہ خاص ذریعہ ہوگا -

(۵) پردہ موقوف کرنے کے لیے خاص کوششیں کرنا چاہیے، مگر ایسی احتیاطوں کے ساتھ جن کی ہندوستانی سوسائٹی کی بہترین روایات متقاضی ہوں ——— ہندو اور مسلمان خواتین باہم گرز اندمیل جول پیدا کریں اور عورتوں کو مفاد عامہ کے کاموں میں زیادہ حصہ لینے کی ترغیب دی جائے -

ہمارا خیال ہے کہ پردہ کے اُٹھ جانے پر ہندو مسلم اتحاد کی راہ سے ایک بڑی رکاوٹ دفع ہو جائیگی -

(۶) اچھوت پن، سوائے اُس صورت کے کہ ناصحانی اور خاص امراض کے تعلق میں ہو، موقوف ہونا چاہیے - کوئی انسان یا کسی انسان کا کھانا یا پانی ایسا متبرک متصور نہ ہو کہ کسی خاص ذات یا عقیدہ کے دوسرے انسان کے صرف چھو جانے سے ناپاک ہو جائے -

(۷) اکثر شکایت کی جاتی ہے کہ میونسپلٹی یا دوسرے مقامی (نیم سرکاری) اداروں میں جہاں کوئی ایک جماعت برسر اقتدار ہوتی ہے تو انتخابی عہدوں، ملازمتوں، مالی امدادوں اور ٹھیکوں کی تقسیم میں نیز کسی خاص جماعت کے معاشرتی و مذہبی امور، تجارت اور پیشوں، گوشت کی دوکانیں کھولنے اور ہندوستانی زبانوں کی تعلیم اور مدارس کے متعلق ضمنی قواعد بنانے میں فرقہ وارانہ طرفداری کی جاتی ہے -

اس قسم کے حالات جہاں کہیں اور جس حد تک بھی پائے جاتے ہوں نہایت درجہ قابل ملامت اور قومیت کے مخالف ہیں - ہر جگہ انکو روکنا اور موقوف کرنا چاہیے - مقامی مشترک پنچایتیں اس معاملہ میں بہت کچھ معین ہو سکتی ہیں -

(۸) چوپایوں کا ذبیحہ جس میں مذہبی قربانیاں بھی شامل ہیں عام ملکی قوانین کے ماتحت ہونا چاہیے - جو حفظان صحت اور اخلاق عامہ پر نظر رکھ کر بنائے جائیں - گائے کی قربانی میں اس سے زیادہ کسی کو دخل نہ دینا چاہیے جتنا کہ بکرے، بھیڑ یا بھینس کی قربانی میں دخل دیا جاتا ہے - جہاں کہیں کسی کی جانب سے اس بارے میں مداخلت کی جائے کانگریس والوں کا فرض ہونا چاہیے کہ مداخلت کے خلاف ستیاگرہ کریں -

البتہ باہمی رضامندی سے جو رواج قائم ہوا ہو یا جو تصفیہ کیا گیا ہو اُس میں اس طرح پر دخل دینے کی ضرورت نہیں۔

(۹) مساجد کے قرب میں باجہ بجانے پر کسی کو اس سے زائد مداخلت نہ کرنا چاہیے جتنی کہ معبدوں اور مندروں کے قرب میں کسی دوسری قسم کی آوازوں پر کی جاتی ہے۔
جہاں کسی کی جانب سے اس بارے میں مداخلت کی جائے کانگریس والوں کا فرض ہونا چاہیے کہ مداخلت کے خلاف ستیا گرہ کریں۔
البتہ باہمی رضامندی سے جو رواج قائم ہوا ہو یا جو تصفیہ کیا گیا ہو اُس میں اس طرح پر دخل دینے کی ضرورت نہیں۔

(۱۰) ہندوؤں کو چاہیے کہ موجودہ موروثی ذاتوں کے طریقوں کو مع بیشمار گوتوں کے موقوف کر دیں اور چار خاص ذاتوں (ورنوں) کی بنیاد کو جامد وراثت کے اصول سے ہٹا کر پیشہ کی نوعیت اور درجہ پر قائم کریں (یعنی (۱) اہل علم کے لیے علمی پیشے (۲) ارباب عمل کے لیے انتظامی پیشے (۳) اصحاب طلب کے لیے پیدائش زر کرنے والے پیشے اور (۴) اُن لوگوں کے لیے جو ذہنی اعتبار سے ان تینوں کی طرح ترقی یافتہ اور تعلیم پذیر نہیں اور جو انکو صرف حقیر کاموں میں مدد دے سکتے ہیں محنت کے پیشے۔ سوراجی حکومت کا یہ فریضہ ہوگا کہ زندگی کے خاص انعامات یا عطایا یعنی (۱) عزت (۲) اقتدار (۳) دولت اور (۴) تفریح اور بسر اوقات کے خاص ذرایع یعنی (۱) عام اور شخصی وظائف (۲) کرایہ یا عام تنخواہیں (۳) تجارت اور (۴) کافی اجرتیں سب کو ان چاروں طبقات میں ایسے مناسب طریقے پر تقسیم کرے کہ غربت اور ثروت کی انتہائی حالتیں باقی نہ رہیں، ضروریاتِ زندگی سب کو یقینی طور پر حاصل ہوں، رشک و حسد کے مواقع کم ہو جائیں اور کارِ خیر کی تحریک زیادہ سے زیادہ بڑھ جائے۔

ذات پات کا موجودہ طریقہ جو داخلی طور پر انتشار رکھتا ہے اور آپس میں ایک کو دوسرے سے جدا کیے ہوئے ہے، اس طرح سے اگر ایک ایسی معاشرتی تنظیم میں تبدیل ہو جائے جس میں باہم کر معاونت کرنے والی مختلف پیشہ والوں کی ایسی جماعتیں ہوں جن میں سے ہر ایک کا وجود دوسرے پر منحصر ہو تو مسلمان عیسائی اور دیگر تمام مذاہب کے پیرو بھی اپنے عقائد میں کوئی تبدیلی کیے بغیر ان جماعتوں میں شریک ہو سکیں گے۔

ہم نے وہ تجاویز پیش کر دی ہیں جو ہمارے خیال میں اُس معاشرتی سیاسی و مذہبی مخالفت کا انسداد کرنے میں معین ہوں گی جو فی زمانہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو جدا کیے ہوئے ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ بیماری ہمارے

معاشرتی نظام کی تہ تک پہونچ چکی ہے اور طریقۂ علاج لازمی طور پر دھیما اور تدریجی ہوگا اس لیے ہماری بہت سی تجاویز بظاہر ایسی ہیں جو تمامہ فوراً عمل میں نہیں لائی جا سکتیں۔ اُن پر عملدرآمد کے لیے مسلسل توجہ، نگرانی اور استقلال کی ضرورت ہوگی۔ اس بنا پر ہماری آخری تجویز یہ ہے کہ کانگریس کو ایک مستقل مجلس بنانا چاہیے جسکے ارکین ایسے اصحاب ہوں جو ہندو مسلمانوں میں اتحاد پیدا کرنے کے مسئلے سے گہری دلچسپی رکھتے اور اس مقصد کے واسطے کام کرنے کے لیے تیار ہوں۔ یہ مجلس دوسرے تمام کاموں کو چھوڑ کر ہمہ تن اُس خاص مدعا کے حصول ہی کے لیے کام کرے۔ سیاسی مشاغل سے نسبتاً آزاد ہونے کی بنا پر اُسکو ایسے طبقات آبادی میں کام کرنے کا بہتر موقع حاصل ہوگا جو سیاسی جد و جہد کے دائرہ سے باہر ہیں اور جن پر اس بیماری (نفاق باہمی) نے سب سے زیادہ قبضہ حاصل کر رکھا ہے۔

بے شبہہ کانگریس نے وقتاً فوقتاً اس مسئلہ پر اپنی توجہ مبذول کی ہے مگر اُسکی پالیسی کا رُخ اب تک مسئلہ کے سیاسی پہلو پر اور اُن مخصوص حالات پر رہا ہے جو وقتی طور پر رونما ہوتے رہے۔ لیکن اب ہماری رائے میں وقت اس کا ہے کہ کانگریس تعمیری رنگ میں اہل ملک کی معاشرتی زندگی پر اُسی طرح پُرزور اور مؤثر طریقے پر اثر انداز ہو جس طرح کہ وہ اُنکی سیاسی زندگی پر اثر ڈال رہی ہے۔

اس میں شبہہ نہیں کہ ہم ایک نئے تجربہ کا مشورہ دے رہے ہیں مگر ہماری مخلصانہ رائے یہ ہے کہ یہ تجربہ اس لائق ہے کہ اس کی ضرور آزمائش کی جائے۔ اگر یہ کامیاب ہوا تو ہندو مسلم مسائل کا مستقل حل ہاتھ آ جائے گا اور اگر اس مقصد کو تمامہ حاصل کرنے میں کامیابی نہ ہو تب بھی بہت سی مشکلات میں اس کے ذریعہ سے کمی ضرور ہو جائے گی۔

جو سفارشیں ہم نے تجویز کی ہیں، اُن پر عملدرآمد کرنے کی خدمت اسی مجلس کے سپرد ہونا چاہیے۔ (جسکے بنانے کا اوپر مشورہ دیا گیا ہے)

تحقیقاتی کمیٹی کی سفارشیں تمام ہوگئیں۔ آئندہ اختلافی یادداشتوں کے ضروری اجزا اور دیگر امور متعلقہ پیش کیے جائیں گے۔ اس خیال سے کہ لوگوں کو غلط فہمی نہ ہو، یہ امر ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ یہ سفارشیں کمیٹی کی اکثریت کی منظور کردہ ہیں یا مختلف الخیال ارکین کے درمیان مفاہمت کا نتیجہ۔ البتہ راقم الحروف کے عقائد و خیالات چونکہ اکثریت کے خیالات سے تمام امور میں متفق نہ ہو سکے اس بنا پر اپنی یادداشت میں اُن اختلافات کی وضاحت کر دی۔

نظرے خوش گزرے

یہ پرچہ اچھا خاصہ "اودھ نمبر" بنگیا ہے، اس لیے کہ ایک طرف اسی پرچہ میں اودھ کو علیحدہ صوبہ بنانے کی تجویز پیش کی جارہی ہے اور دوسری طرف محض اتفاقی طور پر بغیر کسی خاص اہتمام کے صرف ایک مضمون اور ایک غزل کو شامل نہ کرلے سے یہ رسالہ تمامتر اودھ کے اہل قلم کی جولاں گاہ بنگیا ہے، اور اس میں کوئی مضمون نظم و نثر دوسرے صوبجات کے دوستوں حتیٰ کہ صوبۂ آگرہ کے احباب کا بھی نہیں ہے۔ اسکے یہ معنی نہیں کہ انتظامی تقسیم کے ساتھ ساتھ ہم لسانی و ادبی تفریق کے بھی حامی ہیں۔ اردو کو ہندوستان کی مشترکہ قومی زبان بنانے کی جد و جہد کرنے والے سے اس قسم کا اندیشہ نہ رکھنا چاہیے اور امید ہے کہ الناظر کے قلمی معاونین کو، جو سارے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں، اس سے کوئی بدگمانی نہ پیدا ہوگی۔

برادر مکرم منشی امیر احمد علوی صاحب رمضان میں علیل ہو گئے، اس سبب سے "اسرائیلیات" کا دلچسپ سلسلہ فی الحال رُک گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ جلد شفا بخشیں۔ صاحب ممدوح نے آخری تاجدار دہلی بہادر شاہ ظفر کے متعلق عرصہ ہوا رسالۂ شمع (آگرہ) میں متعدد نہایت دلچسپ مضامین لکھے تھے۔ اب اُنھیں کو بڑھا کر ظفر کی سوانحعمری مرتب ہوگئی ہے جو انشاء اللہ تھوڑے ہی دنوں میں زیور طبع سے آراستہ ہوکر ارباب ذوق تک پہونچیگی۔ کتاب کا حجم اندازاً دو سو صفحہ کے قریب ہوگا اور قیمت روپیہ سوا روپیہ۔ جو شایقین اپنی فرمایشات درج کرانا چاہیں "الناظر بک ایجنسی" کو اطلاع دیں۔ تاکہ کتاب تیار ہوتے ہی ارسال خدمت کی جائے۔

حضرت ریاض مرحوم کے متعلق کئی مضامین اور تاریخیں آئی ہوئی رکھی ہیں اور غالباً ابھی اور اصحاب بھیجتے رہیں گے۔ جنکی اشاعت بھی انشاء اللہ تدریجاً ہوتی رہیگی۔ اس طرح امید ہے کہ سال بھر تک برابر مرحوم کا ذکر خیر جاری رہے گا۔

الناظر کے ابتدائی پرچوں کی تقسیم کچھ اس طرح ہوئی کہ تھوڑی سی ششماہی جلدیں مرتب ہونے کے بعد اُسکا کوئی پرچہ نہیں بچا، نہ قسم عام کا اور نہ اعزازی قسم کا۔ البتہ جولائی کے کچھ پرچے بچے ہیں، اور باقی مہینوں کے کافی تعداد میں ہیں۔ جو صاحب چاہیں قیمت بذریعہ ٹکٹ ارسال فرماکر منگالیں قیمت کی شرح حسب ذیل ہے:-

قسم عام فی پرچہ ۵ر } مع محصول ڈاک
اورزاں قسم فی پرچہ ۴ر

جن اصحاب کے پاس اگست کے پرچے زیادہ از ضرورت ہوں وہ دفتر الناظر کو مرحمت فرمائیں تاکہ جن شایقین کی جلدیں نامکمل ہیں اُن تک پہونچائے جائیں۔ دفتر سے اُن پرچوں کی قیمت مل جائیگی۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس گزشتہ سال میرٹھ میں ہوا تھا اور اب کی آگرہ میں منعقد ہوگا۔ اسی کانفرنس کی صوبہ وار شاخ کا سالانہ جلسہ ابھی دو ماہ ہوئے مظفر نگر میں ہوا تھا۔ اس قدر جلد جلد ایک ہی صوبہ میں ان کانفرنسوں کا انعقاد سوائے اسکے کوئی معنی نہیں رکھتا کہ ان مجالس کو خود اپنے وجود کا قوم کو یقین دلانا ہے۔ صوبہ کی انجمن جب سرگرم کار ہے تو مرکزی انجمن کو دوسرے علاقوں پر توجہ کرنا چاہیے جہاں ان صوبجات سے زیادہ اشاعت تعلیم کی ضرورت ہے۔ علی الخصوص اُن صوبوں میں جہاں مسلمانوں کی آبادی اور جہالت دونوں زائد ہیں۔ یہاں تو ایک چھوڑ پانچ پانچ یونیورسٹیاں موجود ہیں اور تعلیم یافتہ بے روزگاروں کی تعداد روزافزوں۔

ایجوکیشنل کانفرنس نے گزشتہ دو میں کافی کام کیا ہے مگر جب سے نواب صدر یار جنگ مولوی حبیب الرحمن خاں شروانی اسکے معتمد ہوئے ہیں، کانفرنس کی سرگرمی اور جوش عمل میں فرق آگیا ہے۔ نواب صاحب کے مخلص، دیندار، علم دوست اور صحیح الخیال بزرگ ہونے کی بنا پر اس قسم کے عہدوں پر انکا انتخاب کردیا جاتا ہے مگر اول تو .... مئیوں سے اسکی توقع ہی فضول ہے کہ وہ اُن لوگوں کی سی سرگرمی ومستعدی سے کام کرسکیں گے جو عام طور پر محنت وجفاکشی کی زندگی بسر کرتے ہوں۔ اسکے علاوہ نواب صاحب طبعاً بہت سکوت پسند ہیں۔ اُنکے لیے معتمدی کے بجائے صدارت کی کرسی زیادہ موزوں ہے۔ انجمن ترقی اردو کے بھی ایک زمانہ میں وہ معتمد بنادیے گئے تھے اور باوجودیکہ ادب وشاعری سے صاحب ممدوح کو خاص شغف ہے مگر معتمد کی حیثیت سے اُنکا عہد کامیاب نہیں ہوا۔

ایجوکیشنل کانفرنس کی طرف سے "مسلمانوں کے افلاس کا علاج" کے نام سے ایک رسالہ شایع کیا گیا ہے جو دراصل کانفرنس کی ایک منتخب کمیٹی کی رپورٹ ہے۔ اس میں مسلمانوں کے مالی انحطاط کے وجوہ وعلل سے بحث کی گئی اور اُسکے انسداد وتدارک کے لیے بعض تجاویز پیش کی گئی ہیں۔ رپورٹ کے مرتب ڈاکٹر ضیاءالدین صاحب، مولوی سید طفیل احمد صاحب جائنٹ سکرٹری ایجوکیشنل کانفرنس، اور حافظ محمد ابراہیم صاحب وکیل نگینہ ہیں۔

رپورٹ کی تجاویز کو بنیاد قرار دیکر ایجوکیشنل کانفرنس نے غور و بحث کے بعد جو سفارشات منظور کی ہیں وہ رپورٹ کے ساتھ دو ورق پر الگ چھپی ہوئی دفتر کانفرنس (سلطان جہاں منزل۔ علیگڈھ) سے ملیں گی۔

ہم نے اس رسالہ کو بہت دلچسپی سے پڑھا۔ اور اُن سفارشات کا جو افلاس کے دفعیہ کے لیے پیش کی گئی ہیں کافی غور سے مطالعہ کیا۔ چونکہ یہ کمیٹی بزم تعلیمی کی بنائی ہوئی تھی اس لیے قدرتاً اسکا نقطۂ نظر بہت کچھ تعلیمی رہا۔ اگر ایسے لوگ اس کمیٹی میں شریک ہوتے جو اقتصادیات، مالیات، صنعت و حرفت اور تجارت سے اُسی قدر باخبر ہوتے جس قدر ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب وغیرہ تعلیمی امور سے واقف ہیں تو ہمیں یقین ہے کہ سفارشات زیادہ جامع اور مفید ہوتیں۔

کانفرنس کی منظور کردہ سفارشات میں سے ۵، تو وہ ہیں جن کا تعلق براہ راست تعلیم، درسگاہوں، امتحانات اور بالآخر ملازمت سے ہے حالانکہ ملازمت کے ذریعہ کچھ ہی لوگوں کی شکم پُری یا آسودگی ممکن ہے کیونکہ ملازمتوں کی تعداد محدود ہے اور رہیگی، اور اسکی آمدنیاں بھی ہمیشہ محدود رہیں اور رہیں گی۔ اب جاگیروں کا زمانہ نہیں رہا اور جو تعلقے یا زمینداریاں باقی ہیں وہ بھی چند روز کی مہمان نظر آتی ہیں۔

باقی ۵ تجاویز صنعت و حرفت کے بارے میں ہیں۔ ان میں سے دو جو بنک سے متعلق ہیں سود کی لعنت کا طوق گردن میں ڈالے ہوئے خود اپنے غیر اسلامی ہونے کا ڈھنڈورا پیٹ رہی ہیں۔ البتہ باقی تجاویز کارآمد ہوسکتی ہیں، مگر ایک خاص فروگذاشت کی بنا پر اندیشہ ہے کہ کمیٹی کی رپورٹ اور کانفرنس کی سفارشات سے زیادہ فائدہ نہ پہونچے گا۔

کانفرنس پر یہ الزام بہت پُرانا ہے کہ وہ بکثرت تجاویز ہر سال منظور کردیا کرتی ہے اور پھر سال بھر تک اس کی خبر نہیں لیتی کہ اُن پر عمل کس حد تک ہوا۔ گورنمنٹ سے جو سفارشات کی جاتی ہیں یا حکام سے جن تجاویز کا تعلق ہوتا ہے، اُنکے متعلق تو وفد جانے یا کانفرنس کے دفتر سے مراسلت کی اطلاع کبھی کبھی ملتی بھی ہے لیکن جن تجاویز کا تعلق قوم سے ہوتا ہے وہ عموماً شرمندۂ عمل نہیں ہوتیں۔

مریض افلاس کے لیے صرف حکماے حاذق کی تشخیص اور نسخہ نویسی اگر کافی ہوتی تو کیا کہنا تھا۔ مگر حالت یہ ہے کہ اول تو مریض کو اپنے مرض کی شدت کا احساس نہیں، اس لیے وہ علاج کی ضرورت ہی نہیں جانتا۔ دوسرے دوا قیمتی ہے، جسکی فراہمی آسان نہیں۔ تیسرے ترکیب استعمال سے نہ خود اُسکو پوری واقفیت ہے نہ کوئی فہمیدہ تیماردار میسر ہے۔ اور چوتھے وہ صدرجہ کا بدپرہیز واقع ہوا ہے۔

اس صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لیے ضرورت اسکی تھی کہ کانفرنس کی جانب سے دردمند مسلمانوں کی ایک ذیلی مجلس اس غرض کے لیے بنائی جاتی کہ وہ مسلمانوں کو انکے مرض افلاس سے پوری طرح آگاہ کرے، [illegible]

ذاتی مطبوعات الناظر پریس

جو الناظر کے خریداروں قلمی معاونین اور تاجران کتب کو چوتھائی قیمت کی رعایت سے مل سکیں گی

تصانیف مولانا شبلی

اسلامی حکومت - اور اسکا اثر ہندوستان پر مولانا شبلی کا ایک تاریخی مضمون قیمت ۱/
عالمگیر اور تو زک جہانگیری " ۲/
زیب النساء " ۱/
سفرنامہ مصر و روم و شام - مولانا شبلی کا سفرنامہ ممالک اسلامیہ کے متعلق تاریخی و تمدنی حالات کے متعلق بہترین معلومات کا ذخیرہ ہے قیمت ۸/
مجموعہ کلام شبلی - مولانا شبلی کا ہر صنف کا اردو کلام کسی دوسرے مجموعہ حتی کہ کلیات شبلی مطبوعہ دارالمصنفین میں بھی یہ چیزیں نہ ملیںگی - ۱۰/

تصانیف مولانا حالی

بیوہ کی مناجات - مولانا حالی کی مشہور نظم - قیمت ۲/
برکھارت اور ایکے کا مناظرہ " ۱/
مجموعہ اشعار حالی - مولانا حالی کی چار نظموں کا مجموعہ مسدس اسلامیہ کلمہ حق تعصب و انصاف مرکب ...
حب وطن - مولانا حالی کی مشہور نظم ۱/
دیوان حالی - مولانا حالی کا دیوان مختلف مطابع میں چھپا ہے مگر ہمارے یہاں ہمیشہ اسی نسخہ کی تقلید کی ہے جو خود مولانا نے چھپوایا تھا مقدمہ بھی درج رکھا گیا ہے - البتہ مقدمہ علٰحدہ کر دیا ہے - قیمت ۱۲/
مرثیہ غالب - مرثیہ غالب جس میں مشہور نظم ۱/

شکوہ ہند مشہور نظم قیمت ۲/

مقدمہ شعر و شاعری - یہ مقدمہ دیوان حالی کے ساتھ شائع ہوا تھا اور اس میں شاعری کی اہمیت و حقیقت سے بحث کر کے اردو شاعری پر قابل قدر تنقید لکھی گئی ہے دیوان حالی ابتداءً ۱۸۹۵ء میں چھپا اور کچھ عرصہ میں فروخت ہو کر نایاب ہو گیا - پچیس سال کے بعد جب ہم نے دوبارہ دیوان چھاپا تو مقدمہ کو الگ کر دیا - کہ فی الحقیقت یہ ایک جداگانہ کتاب ہے - اب ہمارے ہی نسخہ کی نقلیں بعض دوسرے مطابع نے بھی چھاپی ہیں مگر ہم ہر دفعہ مولانا کے نسخہ سے مقابلہ کر کے صحت کر لیتے ہیں اور یہ بات کبھی نہیں لکھا ہوا ہے

تصانیف منشی احمد علی شوق قدوائی

قاسم و زہرہ - یہ لاجواب مثنوی (ڈرامہ) حضرت شوق کی زبان دانی کا نمونہ ہے - ساری کتاب میں کہیں اضافت نہیں آنے پائی ہے سفید ولایتی کاغذ ۸/ کھدرا دیسی کاغذ ۶/
میکفرن اور لوسی - ایک مختصر اور قابل دید ڈرامہ - قیمت ۲/

تصانیف مرزا محمد ہادی رسوا بی اے

مثنوی امید و بیم - نظم اردو میں فلسفیانہ مضامین پیش کرنا اور شاعرانہ لطافتوں کو بدستور قائم رکھنا کمال ہے - قیمت ۴/
نو بہار - مرزا رسوا کی لاجواب نظم ... مخصوص

رنگ میں ہے - قیمت ۲/

تصانیف ڈاکٹر اقبال

بلال - بلال حبشی کے متعلق ڈاکٹر اقبال کے ولولہ انگیز اشعار - قیمت ۱/
فریاد امت - بہ بارگاہ ختمی مآب صلعم اقبال کی یہ نظم نہایت ہی پر اثر ہے ۳/
تصویر درد - اقبال کی یہ نظم بھی بہت مشہور ہے اور انکے مخصوص رنگ کی چیز ہے ۳/
شکوہ - اقبال کی مشہور نظم جس میں اللہ تعالیٰ کے روبرو مسلمانوں کے موجودہ تنزل کا شکوہ کیا ہے - قیمت ۲/
جواب شکوہ - اللہ تعالیٰ کی طرف سے اقبال نے خود اپنے شکوہ کا یہ لاجواب جواب لکھا ہے - قیمت ۳/

تصانیف منشی احمد علی بی اے

شباب لکھنؤ - نصیرالدین حیدر بادشاہ اودھ کے عہد میں دربار لکھنؤ کی حالت - جو ایک یوروپین صاحب نے چھاپی تھی اور جسے اس روانی سے اردو کیا ہے کہ دیکھ کر آپ کو خیال بھی نہ ہوگا کہ یہ ترجمہ ہے - دیباچہ میں سلطنت اودھ کی مختصر تاریخ اضافہ کر دی گئی ہے کہ کتاب کے مطالب سمجھنے میں مدد ملے - قیمت ۱۲/
مرقع اودھ - شباب لکھنؤ کا دیباچہ ...

ملنے کا پتہ :- الناظر بک ایجنسی - لکھنؤ

ذاتی مطبوعات الناظر پریس

جملہ الناظر کے خریداروں، قلمی معاونین اور تاجران کتب کو چوتھائی قیمت کی رعایت دیے مل سکیں گی

تصانیف مولانا شبلی

...ی حکومت - اور اسکا فخر ہندستان ...
...شبلی کا ایک تاریخی مضمون قیمت ا/
...گیر اور تزک جہانگیری " ۲/
...ب النساء
...ر نامہ مصر و روم و شام - مولانا شبلی کا سفر نامہ ...
...ن ممالک اسلامیہ کے متعلق تاریخی و تمدنی حالات
...کے متعلق بہترین معلومات کا ذخیرہ ہے قیمت ۱۲/
مجموعہ کلام شبلی - مولانا شبلی کا ہر صنف کا
اردو کلام کسی دوسرے مجموعہ حتی کہ کلیات شبلی
طبع دار المصنفین میں بھی یہ بہترین نہ ملیگی - ۱/

تصانیف مولانا حالی

...بیوہ کی مناجات - مولانا حالی کی مشہور
نظم قیمت ۲/
...ت اور ایکے کا مناظرہ " ا/
...کلام حالی - مولانا حالی کی چار نظموں کا
... تعصب و انصاف ... مرکب ...
...مد علی - مولانا حالی کی مشہور نظم ا/
دیوان حالی - مولانا حالی کا دیوان مختلف
... میں چھاپے گر ہمارے یہاں ہمیشہ اسی
... ہے جو خود مولانا نے چھپوایا تھا
... میں نہیں لگایا ہے - البتہ مقدمہ علیحدہ
... قیمت ۱۲/
...شکوہ ہند - ... مسدس ... ا/ مشہور نظم

شکوہ ہند۔ مشہور نظم قیمت ۲/

مقدمہ شعر و شاعری - یہ مقدمہ دیوان حالی کے
ساتھ شایع ہوا تھا اور اس میں شاعری کی
ماہیت و حقیقت سے بحث کرکے اردو شاعری
پر قابل قدر تنقید لکھی گئی ہے دیوان حالی ابتداءً
۱۸۹۵ء میں چھپا اور کچھ عرصہ میں فروخت
ہو کر نا پید ہو گیا۔ پچیس سال کے بعد جب ہم نے
دوبارہ دیوان چھاپا تو مقدمہ کو الگ کر دیا۔
کرنی الحقیقت یہ ایک جداگانہ کتاب ہے۔ اب
ہمارے ہی نسخہ کی نقلیں بعض دوسرے مطابع نے
بھی چھاپی ہیں مگر ہم ہر دفعہ مولانا کے نسخے سے مقابلہ
کرکے صحت کر لیتے ہیں اور دیباچہ بھی وہی لکھا ہے جو خود ...

تصانیف منشی احمد علی شوق قدوائی

قاسم و زہرہ - یہ لاجواب مثنوی (ڈراما)
حضرت شوق کی زباندانی کا نمونہ ہے۔ ساری
کتاب میں کہیں اضافت نہیں آنے پائی ہے
سفید دیسی کاغذ ۸/ کھرا دیسی کاغذ ۱۲/
سیکفرن اور لوسی - ایک مختصر اور قابل دید
ڈراما۔ قیمت ۲/

تصانیف مرزا محمد ہادی رسوا بی اے

مثنوی امید و بیم - نظم اردو میں فلسفیانہ
مضامین پیش کرنا اور شاعرانہ لطافتوں کو
بدستور قائم رکھنا کمال ہے۔ قیمت ۴/
نو بہار - مرزا رسوا کی یہ لاجواب نظم انکے مخصوص

رنگ میں ہے۔ قیمت ۴/

تصانیف ڈاکٹر اقبال

بلال - بلال حبشی کے متعلق ڈاکٹر اقبال
کے ولولہ انگیز اشعار۔ قیمت ا/
فریاد امت - یہ بارگاہ ختمی مآب صلعم
اقبال کی یہ نظم نہایت ہی پر اثر ہے ۳/
تصویر درد - اقبال کی یہ نظم بھی بہت
مشہور ہے اور انکے مخصوص رنگ کی چیز ہے ۳/
شکوہ - اقبال کی مشہور نظم جس میں اللہ تعالیٰ
کے روبرو مسلمانوں کے موجودہ تنزل کا دکھڑا
رویا ہے - قیمت ۲/
جواب شکوہ - اللہ تعالیٰ کی طرف سے
اقبال نے خود اپنے شکوہ کا یہ لاجواب
جواب لکھا ہے - قیمت ۳/

تصانیف منشی احمد علی بی اے

شباب لکھنؤ - نصیر الدین حیدر بادشاہ اودھ
کے عہد میں دربار لکھنؤ کی حالت - جو ایک
یورپین صاحب نے چھاپی تھی اور جسے
اردو لباس میں دیکھ کر آپ کو خیال بھی
نہ ہوگا کہ یہ ترجمہ ہے - دیباچہ میں سلطنت
اودھ کی مختصر تاریخ اضافہ کر دی گئی ہے کہ
کتاب کے مطالب سمجھنے میں مدد ملے
قیمت ۱۲/
مرقع اودھ - شباب لکھنؤ کا دیباچہ ...

ملنے کا پتہ :- الناظر بک ایجنسی - لکھنؤ

سلطنت اودھ کی مختصر تاریخ عہد نصیر الدین حیدر تک - قیمت ۸ر

تصانیف منشی امیر احمد علوی بی اے

سفر سعادت - ۱۹۲۹ء میں سفر حرمین کو حج و زیارت کا شرف نصیب ہوا - وطن سے روانگی کے وقت سے واپسی تک آپ اپنا روزنامچہ قلمبند فرماتے رہے - یہی قابل قدر روزنامچہ کتاب کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے حجم ۹ جزء - قیمت عہ

گوتم بدھ - ہندوستان کے نامور ہادی مہاتما بدھ کے سوانح اور انکی مذہبی تعلیمات ۶ر

تصانیف مسٹر سلطان حیدر جوش

اتفاقات زمانہ - ایک نہایت ہی اچھوتا اور مختصر و عجیب افسانہ - قیمت ۱ر

فسانہ جوش - مسٹر جوش کے قابل دید مختصر افسانوں اور دلاویز ادبی مضامین کا مجموعہ سلسلہ منتخبات الناظر کی دوسری جلد ہے - قیمت عمر

مساوات - ایک نہایت ہی اچھوتا اور عجیب مختصر افسانہ - قیمت ۱ر

تصانیف حضرت ملا بودھا موسوی

انتخاب نقیب - بدایوں کے مشہور رسالہ نقیب میں جو قیمتی مضامین وقتاً فوقتاً حضرت ملا صاحب نے لکھے تھے یہ انہیں کا مجموعہ ہے (ملا ... فرضی نام ہے ایک ایسے ادیب کا جو ... اور جو گمنامی میں اپنے ... سمجھتے ہیں) قیمت ۶ر

خطاب - انگریزی خطابوں کی تاریخ اور مرزا کی اہمیت و حقیقت سمجھ لینے کے بعد کوئی سچا مسلمان ان خطابوں کی ہوس نہ کرے گا - قیمت ۱ر

تصانیف مولانا شاہ ابو الاشرف مجددی مہاجر

صبح حرم - ایک چھوٹی سی نظم ہے جس میں خاندان حضرت مجدد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کے چشم و چراغ جناب شاہ ابو الاشرف صاحب مہاجر نے بیت اللہ شریف کا وہ سماں دکھایا ہے جو ایک عابد شب زندہ دار کو چھٹتے وقت سحر کے گھر میں نظر آتا ہے - مطالب ایسی پاکیزگی اور شیرینی کے ساتھ ادا ہوئے ہیں کہ پڑھنے والا مسرور و شادمان ہو جاتا ہے ۲ر

دیوانہ حجاز - اس ولولہ انگیز نظم میں حجاز کے تمام مقامات کا ذکر کر کے روضۂ اطہر حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اور حرم کعبہ کے ساتھ دلی شیفتگی کے جذبات نمایاں کیے گئے ہیں۔ قیمت ۲ر

اصول نسخ - منشی حامد علی مرصع رقم نے جو لکھنؤ کے اس عہد میں فن نسخ کے مسلمہ استاد تھے عربی تحریر کے قواعد کو اپنی عمر کے آخری حصے میں اس غرض سے مدون کر دیا کہ اس فن کے مبتدیوں اور شائقین کو تحصیل فن میں مدد ملے - قواعد کے علاوہ تمام ضروری مشقوں کی تختیاں بھی مرتب کر دی ہیں - ۶ر

الاحسان (مولفہ مولوی احسان الدین علوی کاکوروی) اس کتاب میں لفظ صوفی کی تحقیق، تصوف کی ابتدا اور اسکی رفتہ رفتہ ترقی کا ذکر کیا گیا ہے اور آخر میں تصوف کے تمام شعبوں کی اسلام سے تطبیق اور اس کی حقانیت اور اصول پر بحث ہے

اسلام - نواب محسن الملک کا قابل دید مضمون جس میں دکھایا گیا ہے کہ اصلی اسلام کیا ہے قیمت ۲ر

اسلامی کتبخانے - عہد عباسیہ کے کتبخانوں کے متعلق اطالوی خاتون ڈاکٹر اولگا پنٹو کا قابل قدر مضمون - جسے لائق مترجم قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی نے باضافہ حواشی اردو میں منتقل کیا ہے - قیمت ۲ر

ایک نادان خدا پرست اور دانا دنیا دار کی کہانی - سر سید احمد خاں مرحوم کے زور قلم کا نتیجہ ۱ر

بہترین انشا پرداز - الناظر کے انعامی مقالے کے ان مضامین کا مجموعہ جن میں متعدد اہل قلم نے اس موضوع پر طبع آزمائی کی ہے کہ آزاد - حالی - نذیر احمد اور شبلی میں سب سے بہتر انشا پرداز کون تھا، اور کس نے اردو علم ادب کی سب سے زیادہ خدمت انجام دی ان مضامین میں چاروں اساتذہ اردو کی تصنیفات پر تبصرہ کیا گیا، ان کی خصوصیات تحریر نمایاں کی گئیں اور ان کا باہمی موازنہ و مقابلہ کر کے ایک کو بمقابلہ دوسروں کے بہترین انشا پرداز ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے - حجم ۳۰۰ صفحے عہ

بہترین غزل گو - قاضی غلام امیر امیر بدایونی نے اس رسالہ میں دکھایا ہے کہ شعرائے اردو میں میر تقی میر کے بعد بہترین غزل گو شیخ ابراہیم ذوق تھے - قیمت ۴ر

تاریخ امریکہ - پرانی دنیا کی تو اردو میں متعدد تاریخیں موجود ہیں مگر نئی دنیا کی کوئی چھوٹی یا بڑی تاریخ اسوقت نہیں ہے - اس لیے جناب مولوی محمد یحییٰ صاحب تنہا بی اے ایل ایل بی مصنف سیر المصنفین نے یہ اجمالی تاریخ انگریزی تاریخوں کی مدد سے تیار کی - حجم ۱۸ جزء مع نقشہ امریکہ

تاریخ عرب - موسیو سیدیو فرانسیسی کی لاجواب تاریخ کا ترجمہ۔ جس میں عرب اور اہل عرب کے متعلق اتنی کثیر معلومات فراہم ہے کہ کسی دوسری تاریخ میں یہ مواد نہ ملیگا - عربوں نے دنیا میں جہاں جہاں حکومت کی انکی تاریخ عمومی کے ساتھ ساتھ تمدنی و معاشرتی حالات جنگی و علمی کارنامے - اکتشافات و ایجادات غرضکہ جو کچھ عربوں نے کارہائے نمایاں کیے ان سب کا تذکرہ اس کتاب میں کیا گیا ہے۔ تمدن عرب کے مصنف نے اپنی مشہور کتاب کی تدوین بعد میں کی اور اس لحاظ سے وہ بھی اس لاجواب تاریخ کا رہین منت ہے قیمت قسم اول للعہ قسم دوم سعہ؍

تحقیق انیق - یعنی عالم کے حدوث و قدم پر ایک نظر دقیق - علامۂ اجل مولانا نذیر احمد لکھنوی نے مزبذبین و متشککین کی ہدایت کے لیے تحریر فرمایا - ا؍

ترقی زبان بذریعہ تراجم - پروفیسر گھوشال ایم اے کا وہ قیمتی لکچر جو انھوں نے لکھنؤ کی اردو کانفرنس میں پڑھا تھا - جس میں تراجم کے متعلق نہایت مفید معلومات فراہم کی گئی ہے اور صدر کانفرنس نے بہت پسند کرکے چھاپنے کی ہدایت کی تھی - ۴؍

تذکرہ حزیں - مشہور شاعر شیخ علی حزیں جو ہجرت کرکے ایران سے ہندوستان چلے آئے یہ انکی سوانحعمری ہے - قیمت ۴؍

تسخیر فرانس - ملک الشعرائے انگلستان شکسپیر کے لاجواب ڈرامے "ہنری دی ففتھ" کا ترجمہ - مولوی تفضل حسین ناظر نے اسخوبی سے کیا ہے کہ اردو عبارت میں بھی شکسپیر کے زور بیان کا لطف آتا ہے - قیمت عہ

جزاء الاعمال - از مولانا اشرف علی صاحب تھانوی - جس میں قرآن و حدیث کی رو سے بتایا گیا ہے کہ اچھے کاموں کا انعام اور برے کاموں کی سزا اس دنیا میں کیونکر ملتی ہے - قیمت ۳؍

جمیل و بثینہ - اہل عرب کے حسن و عشق کا ایک دلچسپ افسانہ - جس میں قدیم عربی تہذیب و تمدن کی جھلک بھی دکھائی ہے از مولوی جواد علی خاں عالی - ۳؍

حکایت لیلے مجنوں - مشہور ادیب سید سجاد حیدر (یلدرم) بی اے علیگ کا قابل دید فسانہ - قیمت ۱۲؍

خورشید بدر - منشی نور الحسن نیر خلف حضرت محسن کاکوروی نے واقعات جنگ بدر کو نظم کیا ہے - قیمت ۲؍

رسالہ استبداد - انقلاب فرانس سے کچھ پہلے ایک اطالوی اہل قلم نے یہ رسالہ لکھا تھا سلطان عبدالحمید خاں کے عہد میں شیخ عبدالرحمن کواکبی نے اسے عربی میں منتقل کیا - اور اب مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی ندوی نے اسے اردو لباس سے آراستہ کیا ہے - رسالہ کی غایت یہ ہے کہ سیاسی استبداد کی حقیقت سے آگاہ ہو کر لوگ اس سے بیزار ہو جائیں اور ان میں غلامی و استبداد کی گرفت سے آزادی حاصل کرنے کا جوش پیدا ہو - قیمت ۱۲؍

زود پشیماں - ناظر کے فرضی نام سے مولوی عبدالماجد صاحب بی اے نے یہ اصلاحی ڈراما لکھا تھا - جو الناظر میں چھپنے کے بعد کتابی صورت میں شائع ہوا ہے - اردو کے اوریجنل ڈراموں میں اس کی خاص اہمیت ہے - اسکے اکثر اشعار بھی مصنف کے طبع زاد ہیں - اور زبان وبیان کی خوبیوں کا تو کچھ کہنا ہی نہیں قیمت ۸؍

سفیر اودھ - نواب واجد علی شاہ جب حکومت اودھ سے معزول کیے گئے تو انھوں نے اپنی والدہ ماجدہ، اپنے بھائی اور ولیعہد کو انگلستان میں دادرسی کی غرض سے بھیجا اور مولوی مسیح الدین خاں بہادر سابق سر منشی گورنر جنرل کو اپنا سفیر بنا کر ساتھ کیا - یہ انھیں کی خود نوشت سوانحعمری ہے جو یورپ کے ہفت سالہ قیام کے بعد واپس آکر قلمبند ہوئی اور انکے قلمی نسخے سے چھاپی گئی - قیمت عہ

شوکیہ اور دو مظلوم بہنیں - جناب نیئر بھوپالی کے دو دلچسپ اور مختصر افسانے - قیمت ۲؍

طالبعلم کی زندگی کا کیا مقصد ہونا چاہیے اس عنوان سے خواجہ غلام الثقلین مرحوم نے ایک نہایت سبق آموز اور مفید لکچر دیا تھا جس میں طالبعلموں کو نہایت کارآمد باتیں بتائی گئی ہیں مع حالات مصنف از خواجہ غلام السیدین صاحب خلف مصنف۔

فلسفہ تصوف - حکیم عبدالقوی صاحب لکھنوی کا قابل دید مضمون جو دقیق ہونے کے باوجود نہایت شگفتہ اور دلچسپ انداز میں لکھا گیا ہے ۴؍

قصائد مومن - مولوی ضیاء احمد ضیاء بدایونی ایم اے نے حکیم مومن خاں دہلوی کے قصائد بعد تصحیح و تحشیہ مرتب کیے ہیں اور شروع میں مومن کے مختصر حالات اور ان کے خصوصیات کلام لکھے ہیں - قیمت ۱۲؍

قواعد المنتخب - جلال لکھنوی کا لاجواب رسالہ جو زبان کے متعلق بہترین تحقیق سے لبریز ہے - ۴؍

گائے کا گوشت (قدیم اہل ہنود میں) ڈاکٹر راجندر لال متر نے قدیم مستند مذہبی کتابوں کے حوالہ سے بتایا ہے کہ گائے کا ذبح کرنا اور اسکا گوشت برہمنوں کو تقسیم کرنا ہندوؤں کی مذہبی

عموم کے لیے بعض ضروری تھا۔ قیمت صرف

محبت اور جاہ و ثروت کی کشمکش
مولوی محمد مسلم عظیم آبادی (ایم اے) کا قابل دید افسانہ۔ موجودہ تعلیم یافتہ طبقہ میں بہت پسند کیا گیا ہے۔ قیمت ۱۲ر

مسالک النظر - ایک یہودی نومسلم نے اپنی مذہبی کتابوں سے حضور انور صلعم کی نبوت کا اثبات کیا ہے جسے پروفیسر نعیم الرحمٰن ایم اے نے نایاب عربی نسخے سے ترجمہ کیا ہے قیمت ۱۲ر

مسلمانان اندلس - نامور مورخ مسٹر اسٹینلی لین پول کی مختصر تاریخ اسپین کا یہ ترجمہ مولوی سید عبدالغنی واصل (علیگ) مرحوم نے کیا تھا۔ اسکے مطالعے یورپ میں مسلمانوں کی ہزار سالہ حکومت کے ضروری حالات معلوم ہو سکتے ہیں۔ قیمت عہ

مسئلہ ٹرکی اور رسول ملٹری گزٹ
مولوی ابوالحسنات ندوی کا قابل دید مضمون ۲ر

مصنوعی شوہر - انقلاب ایران کی ایک ظریفانہ داستان پڑھتے پڑھتے لوٹ جائیے گا۔ ۲ر

مولانا شبلی - مولوی سید انصاری بی اے (جامعہ) نے آزاد، حالی، نذیر احمد اور شبلی کی تصانیف پر تبصرہ کرکے موازنہ کے بعد ثابت کیا ہے کہ اردو کے بہترین انشاپرداز مولانا شبلی تھے اور اردو کی سب سے بڑی خدمت بھی ان ہی سے ہوئی۔ قیمت ۱۰ر

تمدن مغرب یا مغربی محل خانے (از سید طالب علی طالب الہ آبادی) مغربی ممالک میں سائنس کے تجربات۔ مخلوق مرد و زن کے ساتھ خرابیاں گھر میں کیا سلوک ہوتا ہے ان امور کو دلکش انداز میں بیان کیا ہے۔ ۲ر

مسئلہ دائمی - مشہور محدث ابن جوزی کا نایاب مسئلہ دشریعت۔ مترجمہ جناب قاری شاہ محمد جان صاحب ادیب مدرس اول مدرسہ فرقانیہ لکھنؤ۔ متن و ترجمہ بالمقابل چھاپے گئے ہیں۔ اس سے پہلے یہ مسئلہ دشریعت چھپا نہیں تھا۔ قیمت ۴ر

نامہ نجد - وہابی فرقہ کے عقائد کی تشریح خود ابن عبدالوہاب کے بیٹے امام عبداللہ کے قلم سے ۲ر

وکرم اروسی - (مترجمہ مولوی عزیز مرزا مرحوم) ہندی مہاکوی کالیداس کے ایک مشہور ناٹک کا اردو ترجمہ مع ایک بسیط مقدمہ کے جس میں ہندو ڈرامہ کی تاریخ و نوعیت پر مفصل بحث کی گئی ہے اور کالیداس کا موازنہ شیکسپیر اور وانس وغیرہ کے ساتھ کیا گیا ہے۔ قیمت عہ

کتب ذیل پر پندرہ ۱۵ فیصدی چھوٹ ملیگی

امداد باہمی - انجمنہائے امداد باہمی کی ابتدائی تاریخ، ان کے بنیادی اصول، اعمال ممالک متعددہ میں ان کا تدریجی نشو و نما اور عالمگیر وسعت امداد باہمی کے مختلف طریقوں کی تشریح، اقتصادی فلاح کے لیے اسکی ضرورت و اہمیت اور ہندوستان میں تحریک و مجالس امداد باہمی کے اساسی مسائل، طریق کار کی نوعیت اور انکا باہمی تقابل وغیرہ مصنفہ منشی اظہر علی بی اے وکیل لکھنؤ۔ حجم ۲۹ جزو مع عکسی تصاویر قیمت عمہ

باغ فردوس - لکھنؤ کے باکمال شاعر میر ولایت علی فردوس تخلص کو میر انیس کی شاگردی کا فخر حاصل تھا۔ یہ لاجواب مثنوی گلزار نسیم کی بحر میں لکھی ہے اور مرزا رجب علی سرور کے فسانہ عجائب کو اس میں نظم کیا ہے۔ قیمت عہ

عورتوں کی انشاء - (مصنفہ بیگم صغرا علی) جو عورتوں کی مخصوص فطرت اور طبعی رجحان کو مد نظر رکھکر انہیں کی زبان میں لکھی گئی ہے۔ جسکے مطالعہ سے خواتین کو خطوط نویسی میں مردانگی اور ان کی واقفیت بڑھے گی۔ قیمت عمہ

واقعات کربلا - میر انیس کے ایک ہی بحر کے بہترین مراثی کا انتخاب اس اسلوب سے کیا گیا ہے کہ مسلسل داستان کربلا تیار ہو گئی اور بطور رزمیہ نظم کے پیش کیا جا سکتی ہے۔ قیمت عہ

الناظر کی پرانی جلدیں

جلد (۴) جنوری لغایۃ جون ۱۹۱۱ء غیر مجلد	۸ر
جلد (۵) جولائی لغایۃ دسمبر ۱۹۱۱ء "	۸ر
جلد (۱۲) جنوری لغایۃ جون ۱۹۱۵ء "	عہ
جلد (۱۸) جنوری لغایۃ جون ۱۹۱۸ء "	عہ
جلد (۱۹) جولائی لغایۃ دسمبر ۱۹۱۸ء "	عہ
جلد (۲۰) جنوری لغایۃ جون ۱۹۱۹ء "	عہ
جلد (۲۱) جولائی لغایۃ دسمبر ۱۹۱۹ء "	عہ
جلد (۲۲) جنوری لغایۃ جون ۱۹۲۰ء "	عہ
جلد (۲۳) جولائی لغایۃ دسمبر ۱۹۲۱ء "	عہ
جلد (۲۴) جنوری لغایۃ جون ۱۹۲۳ء "	عا
جلد (۲۵) جولائی تا دسمبر ۱۹۲۳ء "	عہ
جلد (۲۶) جنوری تا جون ۱۹۲۴ء "	عا
جلد (۲۷) جولائی تا دسمبر ۱۹۲۵ء "	عا
جلد (۲۸) جنوری تا جون ۱۹۲۵ء "	عا
جلد (۳۰) جنوری تا مارچ ۱۹۲۶ء "	عہ
جلد (۳۲) جنوری تا مارچ ۱۹۲۷ء "	عہ
جلد (۳۳) جولائی تا دسمبر ۱۹۲۷ء "	عا
جلد (۳۴) جنوری تا جون ۱۹۲۸ء "	عا
جلد (۳۵) جنوری تا جون ۱۹۲۹ء "	عا
جلد (۳۶) جولائی تا دسمبر ۱۹۲۹ء "	عا
جلد (۳۷) جنوری تا جون ۱۹۳۰ء "	عا

نئی کتابیں

مقالاتِ حالی (جلد اول) مولانا حالی کے مضامین کا یہ مجموعہ برسوں کی تمناؤں کے بعد ادب اردو کے شائقوں کے لیے شایع ہوا ہے۔ شروع میں مولوی عبدالحق صاحب کا مختصر مقدمہ ہے اور چار سو صفحوں کے مضامین ہیں۔ کتاب مجلد ہے۔ قیمت للعہ ر

منشورات ۔ یعنی پنڈت برجموہن دتاتریہ صاحب کیفی دہلوی کے علمی اور ادبی لکچروں اور مضامین کا یہ مجموعہ ادب اردو میں قابل قدر اضافہ ہے۔ حجم تین سو صفحے سے زائد۔ جلد معمولی۔ قیمت عہ ر

جامع اللغات

(از خواجہ عبدالمجید ۔ بی اے)

یہ لغت چار بڑی جلدوں میں تیار ہوئی ہے، جس کا مجموعی حجم تین ہزار صفحے کے قریب ہے۔ اور الناظر کے پیمانہ کا حساب لگایا جائے تو پانچ ہزار صفحوں سے زائد ہوگا۔ مرتب کا دعویٰ ہے کہ اردو کی تمام شایع شدہ لغات سے زیادہ جامع اور زمانہ حال تک کی معلومات کا حامل یہ لغت ہے۔ غرضکہ لغت اور انسائیکلوپیڈیا کا اسے مجموعہ کہنا چاہیے۔ قیمت کامل للعہ ر

مقالاتِ شبلی ۔ (جلد چہارم) مولانا شبلی کے متفرق مضامین جو الندوہ اور دیگر جرائد میں چھپے تھے، نئی ترتیب سے شایع کیے جا رہے ہیں۔ جلد اول میں مذہبی مضامین (قیمت عہ ر) جلد دوم میں ادبی مضامین (قیمت عہ ر) جلد سوم میں تعلیمی مضامین (قیمت عہ ر) اور اس چوتھی جلد میں تنقیدی مضامین ہیں۔ قیمت عہ ر

معجزۂ قرآن مجید

یعنی قرآن مجید کے لفظاً اور معناً کلام الٰہی اور معجزہ ہونے کا ناقابل تردید واقعات اور دلائل سے کامل ثبوت نوشتۂ خان بہادر مولوی ادریس احمد صاحب بی اے ہیڈ ماسٹر اسلامیہ اسکول بریلی جو ہر مسلمان نوجوان کو مطالعہ کرانا چاہیے۔ حجم ۲۴۰ صفحے قیمت صرف للعہ ر

عرب کی موجودہ حکومتیں ۔ یعنی عرب کی قابل ذکر حکومتوں، نجد و حجاز، عسیر، یمن، لحج، نواحی مسقط، بحرین، کویت، عراق اور حوادث فلسطین و شام کے مختصر و جامع حالات ۔ مرتبہ شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی۔ مع جغرافیۂ عرب مرتبہ "طالب علم" مقیم مکہ۔ قیمت عہ ر

چنگیز خاں ۔ نامور تاتاری فاتح کی سوانحعمری۔ جس نے اپنے عہد کی دنیا کو تہ و بالا کر دیا تھا ایک انگریزی کتاب سے مولوی عنایت اللہ خاں شمس العلما ذکاء اللہ مرحوم نے ترجمہ کرکے بحسن و خوبی تمام چھپوائی۔ حجم ۵۰ ۳ صفحے قیمت عہ ر

رس ۔ یعنی فلسفۂ انبساط ۔ سنسکرت ادب کے گہرے مطالعہ کے بعد مولوی حبیب الرحمٰن صاحب شاستری نے جو مسلم یونیورسٹی میں سنسکرت کے معلم ہیں، یہ قابل قدر کتاب لکھی ہے۔ جس میں شاعری اور ڈراما کے متعلق مسرت و جدائی کے پرتو ربانی اور تجلی ذاتی ہونے کی توضیح کی گئی ہے۔ قیمت عہ ر

الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

بقر عید آرہی ہے!

لکھنؤ عطر کی بہت بڑی منڈی ہے اور ہم تمام مشہور اور اچھے کارخانوں کا مال روانہ کر سکتے ہیں جس قسم کا عطر درکار ہو ہم سے طلب فرمائیے۔

قیمت فی تولہ کے حساب سے

عطر بیلا عہ ، ے ، ے ، تک
عطر چنبیلی عہ " عـہ ، "
عطر موتیا عہ " عـہ ، "
عطر چمپا عہ " عمہ ، "
عطر جوہی عہ " عـہ ، "
عطر نرگس عہ " ے ، "
عطر مولسری عہ " عمہ ، "
عطر موگرا عہ " ے ، "
عطر سورنگی عہ " ے ، "
عطر گل حنا عہ " عمہ ، "
عطر یاسمین عہ " عـہ "
عطر رات کی رانی عہ " شے "
عطر صد برگ عہ " ے ، "
عطر ہارسنگھار عہ " ے ، "
عطر کیوڑہ عہ " شے ، "
عطر گلاب ے " عـہ ، "
عطر مشک ۱۲؎ " عمہ ، "
عطر زعفران ۱۲؎ " شے ، "
عطر عنبر عہ " عـہ "
عطر عود عہ " شے ، "
عطر پانڑی عہ " عمہ ، "
عطر خس عہ " شے "
عطر حنا عہ " عـہ "
عطر ناگیسر ے " عـہ "
روح گلاب عـہ " ما ، "
عطر اگر ترکی عـہ " عـہ "
عطر مخلوط عنبری عمہ " شے "

عطر نکہت عہ عہ ے ے تک
عطر فتنہ عہ " شے ، "
عطر عروس عہ " عمہ "
عطر سہاگ عہ " شے ، "
عطر مدن ماں عہ " عـہ "
عطر مدن مست ۱۲؎ " للعہ ، "
عطر اورنگ زیب شاہی عہ " عمہ ، "
عطر شہناز عہ " عمہ ، "
عطر کسم عہ " ے ، "
عطر شگوفہ عہ " ے ، "
عطر نارنگی عہ " عا ، "
عطر شمامۃ العنبر عمہ " ے ، "
عطر شاہ پسند وعـہ "
عطر محبوب پسند عـہ "
عطر اگر گل ے ، ے عـہ ، "
عطر اگر گل کہنہ عـہ " عـہ "
عطر دونا عہ " ے ، "
عطر کاسنی عا " للعہ "
عطر مالتی عا " عمہ "
عطر گل صنوبر عہ " ے ، "
عطر کیتکی عہ " عا ، "
عطر انبہ عہ " عا ، "
عطر کھیرا ۱۲؎ " ے "
عطر پان عہ " عا "
عطر نازبو عا " عمہ ، "
عطر مصالحہ عہ " للعہ ، "
عطر برگ حنا ۱۲؎ " ے ، "

راحتِ رُوح

یہ لاجواب عطر شاہی زمانہ کی ایجاد ہے جو اب صرف یہاں کے ایک قدیم کارخانۂ عطر میں تیار ہوتا ہے اور خوش مذاق رئیسوں اور بڑی بڑی سرکاروں میں بہت پسند کیا جاتا ہے۔ قیمت فی تولہ عمہ ،

مخلوط آصفی

نواب آصف الدولہ کے عہد میں یہ بے نظیر عطر تیار ہوا تھا اور اُنھیں کے نام سے موسوم ہے۔ جرمنی اور جاپان کے آئے ہوئے عطر خوشبو کی تیزی اور پائداری میں اسکا مقابلہ نہیں کرسکتے۔ فی تولہ عمہ ،

عطر عزیز ناز

یہ عطر یہاں کے ایک مشہور کارخانہ کی سالہا سال کی محنت و کوشش کا ثمرہ ہے اور بھینی بھینی خوشبو والے کئی قسم کے پھولوں کی خوشبو سے تیار ہوا ہے۔ قیمت فی تولہ ے ،

خوشبودار تمباکو

(زردہ)

(پتی) فی سیر ۱۲؎ ، ۱۲؎ ، عا ، للعہ ، شے ،
(مشکی) " ے ، للعہ ، شے ، عـہ ،
مشکی دانہ دار " للعہ ، شے ، عـہ ، عـہ
مشکی نقرئی " عـہ ، عـہ ، عـہ ، عـہ

گولیاں

طلائی فی تولہ ۱۲؎
نقرئی " ۶ ، ۸ ، ۱۰ ،
سادہ بلا ورق " ۴ ،

قوام

قوام مشکی فی تولہ ۲ ، ۴ ، ۵ ، ۶ ، ۸ ، عہ ، عا ،
قوام زعفرانی " ۲ ، ۴ ،
برقی قوام " عہ ، ۱۲؎ ، ۱۲؎
افشانی قوام " عہ

کشیدنی تمباکو

فی سیر ۲ ، ۳ ، ۶ ،
۸ ، عہ ، عا ،

پان کا مصالحہ ۔ مشک و زعفران کی آمیزش سے ترکیب پاتا اور پان کو لذیذ و خوش ذائقہ بناتا ہے۔ فی ڈبیہ ۲ ، فی شیشی ۵ ،

المشتہر۔ ظفر الملک اینڈ سنس۔ لکھنؤ

بنام خداوند جان آفریں

الناظر

نمبر ۲ جلد ۳۹ — فروری سنہ ۱۹۳۵ء

"بنت الحکمت، یا عذرا کا فسانۂ محبت"

(جناب مولوی محمد خلیل الرحمن صاحب مترجم عذرا و اخبار الاندلس وغیرہ)

آج سے ۳۴، یا ۳۵ برس کی بات ہے کہ میں جواں تھا۔ اُس زمانے میں میں نے ایک رومان کا ترجمہ اپنے رنگ میں کرکے اُس کا نام "عذرا" رکھا تھا۔ اُس وقت مجھے یہ خیال تھا کہ اور افسانوں کی طرح اُس کی عمر طبعی پانچ برس سے زیادہ نہ ہوگی۔ مگر اللہ جس کو جتنی چاہے زندگی دے؛ مجھے حیرت ہو رہی ہے کہ وہ اُسی آن بان کے ساتھ زندہ ہے، اور اُس میں وہی شان دل رُبائی باقی ہے جو اُس وقت تھی۔ اب تک اُس کے پانچ ہزار نسخے نکل چکے ہیں، اور چھٹا ایڈیشن زیر طبع ہے۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ کم از کم بیس ہزار آدمیوں نے اُس کو پڑھا ہے اور اپنی اپنی جگہ محوِ حیرت ہو کر رہ گئے ہیں۔ ۳۴، ۳۵ برس کے بعد بھی اُس کے متعلق بہت سے استفسارات میرے پاس آرہے ہیں، اور میں جواب دیتے دیتے تھک گیا ہوں۔ اس کی مقبولیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ میری "عذرا" سے پہلے جہاں تک مجھے علم و تحقیق ہے، کسی خاتون کا نام عذرا نہ تھا؛ مگر آج، اللہ جھوٹ نہ بلائے تو، سیکڑوں لڑکیاں عذرا نامی ہندوستان میں موجود ہیں۔ میں اپنے ناظرین کا جتنا بھی شکریہ ادا کروں بجا ہے ؛

اب میری رسوائی کی داستان بھی سُن لیجیے

چشم لطف گر بینی گرفتاران رسوا را ؛ ما ہم گوشۂ چشمے کہ رسوا کردۂ ما را

"عذرا" کے شائع ہونے کے تیئیس برس کے بعد، میری بدقسمتی سے، اُس نے ایک مقدس (غالباً کاٹھیاواڑی)

مولوی صاحب کو مسحور کرنا چاہا۔ بھلا ایک زاہد خشک کو اس کی تاب کہاں! اُنھوں نے بسم اللہ کہکر نہیں، بلکہ لاحول پڑھ کر "سچ" میں دھر گسیٹا کہ یہ کتاب مسئلۂ "تناسخ کی اشاعت کرتی ہے اور اُس کا ثبوت بہم پہنچاتی ہے" لہذا وہ اور اُس کا مترجم، وغیرہ وغیرہ ہے۔

پس از صد سال ایں معنی محقق شد بہ خاقانی کہ بورانی است با دنجاں و با دنجاسنت بورانی

خاقانی کو اتنی ذرا سی بات معلوم کرنے میں ایک صدی لگی، ہمارے مولانا اُس سے بہت زیادہ ذہین ہیں کہ ایک تہائی صدی میں اتنی بڑی اور ڈھکی چھپی بات کو معلوم کر لیا۔ قطع نظر اس کے کہ وہ سارے کا سارا ردمان "سخن گسترانہ بات" ہے، میں نے اُس میں ایک مقام پر لکھ بھی دیا ہے کہ "میں تناسخ کا قائل نہیں"؛ مگر جناب مولانا کے ضعف بصارت کا میرے پاس کوئی علاج نہ تھا۔ اب میں ہزار پوچھتا پھرتا ہوں، کوئی نہیں تبلاتا کہ "شعر مرا بہ مدرسہ کہ بُرد"۔ بہرحال اس بوڑھاپے میں بہ ذریعہ "الناظر" اس "قدردانی عالم بالا" کا شکریہ ادا کرتا ہوں ٭

ہاں تو، میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ میرے قدر افزاؤں کا شکریہ مجھ پر اس لیے اور بھی واجب ہے کہ باوجودے کہ "عذرا" تشنہ ہے پھر بھی اُس کی قدر افزائی کی گئی۔ اُس سے مختصراً اتنا تو معلوم ہو جاتا ہے کہ عذرا مُلک عرب کی ایک لڑکی تھی؛ حُسن کی دیوی تھی؛ آئی سِس اُس کی معبود رہی تھی؛ عشق میں ڈوبی ہوئی، ایک مقام، کور، میں ایک منتظر کا انتظار کر رہی تھی۔ لیکن وہ کون تھی؛ کہاں کی تھی؛ کور میں کس طرح پہنچی، آئی سِس سے اُس کا رشتہ کیسے جُڑا؛ خود آئی سِس کیا تھی، اور اسی قبیل کے اور سوالوں کا جواب نہیں ملتا۔ اتفاق سے ابھی دو ایک برس ہوئے اُس کی خود نوشتہ سوانحمری اور اُس کا افسانۂ محبت مجھے ملا، اور میں نے اُس کا ترجمہ کر دیا ہے، جو کتابستان، الہ آباد شایع کرے گا۔ اس میں تمام سوالوں کا جواب مل جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ از روئے انشا وہ ویسی نہ ہو، جیسی میری جوانی کی اولاد "عذرا" تھی (جوانی گو زندگانی بہ رفت) مگر اتنا ضرور ہے کہ میری نظر میں وہ "عذرا" سے زیادہ دلکش ہے (یوں اپنی اولاد کس کو بُری لگتی ہے) اور مجھے اللہ کی ذات سے امید ہے کہ یہ کتاب (بنت الحکمت) "عذرا" سے زیادہ پڑھی جاوے گی؛ و ما تشاؤن الا ان یشاء اللہ۔ چوں کہ "بنت الحکمت" کا بڑا دار و مدار آئی سِس پر ہے، اور وہ ہندوستان کی کافر ماجرائی میں بالکل گُم ہے، اس لیے اُس کی تقریب کے واسطے میں نے چند صفحے اپنے نامۂ اعمال کی طرح کالے کیے ہیں، وہ آپ کے ملاحظے کے لیے پیش کرتا ہوں۔ ممکن ہے کہ ان میں آپ کوئی نئی بات پائیں۔ خدا نہ کرے کہ "بنت الحکمت" کے شایع ہونے کے بعد میں کسی اور فتوے کا مورد بنوں؛ گو زمانۂ حال کے فیشن کے موافق بدنامی میں زیادہ نام ہوتا ہے؛ مگر میں اس بوڑھاپے میں اللہ ہی سے پناہ مانگتا ہوں ٭

تقریب

این ایزیس[1] تحتها النیل یجری حکمت شاطیئہ طولاً و عرضا۔

یا لہا ! اصبحت بغیر مجیر، تشتکی من نوائب الدہر عَضّا!

ممکن ہے کہ یہ کہا جاوے کہ ناول، یا رومان کے لیے نہ تقریب کی ضرورت ہے، نہ تمہید کی، نہ حواشی کی۔ لیکن ناظرین جب اس کتاب کو ملاحظہ فرماویں گے تو خود ہی تسلیم فرمالیں گے ان سب کی ضرورت ہے؛ نیز یہ کہ "بنت الحکمت" نہ ناول ہے نہ رومان؛ بلکہ ایک نہایت باعظمت اور بہت بڑی فاضلہ خاتون کی نہایت دلچسپ سوانح حیات ہے، اور اس کے لیے تقریب و تمہید و حواشی کی ضرورت ہے۔ "عذرا" (جس کو فی الحقیقت "بنت الحکمت" کا دوسرا حصہ ہونا چاہیے تھا) کو ملاحظہ فرمانے والے حضرات اس کو تسلیم فرماویں گے کہ اس کے مناظر پر لاعین رات، ولا اُذن سمعت بالکل صادق آتا ہے۔ بعینہٖ "بنت الحکمت" کی بھی وہی کیفیت نظر آوے گی؛ اور وہ سب تاریخی ہوں گے۔ مگر میرا یہ عرض کرنا "عطار بگوید" کے مصداق ہے، اس کو جانے دیجیے۔

بالغ نظر حضرات کے اعتراض رفع کرنے کے لیے یہ گزارش کرتا ہوں کہ یہ تقریب نہیں ہے، بلکہ دو اہم امور کے متعلق توجہات عالیات کو مبذول کرانے کے لیے ایک بہانہ ہے۔ مجھے اس کا اعتراف ہے کہ ناظرین کو اپنی آراء قائم کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دینا چاہیے؛ لیکن اس کا کیا علاج ہے کہ ان دو اہم امور میں سے کم از کم ایک ایسا ہے کہ کتاب شروع کرنے سے پہلے اُس کا جان لینا اشد ضروری ہے۔

حضرات ناظرین ملاحظہ فرماویں گے کہ "بنت الحکمت" (اسی میں "عذرا" کو شامل سمجھیے) کی تمام دل رُبا عمارت دو دل کش ستونوں پر قائم ہے: ایک حسن و عشق، اور دوسرا دین آئی سس۔ ان دونوں ستونوں پر بوجھ اس طرح تقسیم کیا گیا ہے کہ اگر ایک بھی ستون کم زور ہو تو دوسرا ستون اتنی بڑی عمارت کا بوجھ نہیں سنبھال سکتا؛ مگر غور سے دیکھیے تو اصل مرکز ثقل دین آئی سس ہی ہے۔

باوجود اس کے کہ "بنت الحکمت" کا خمیر حسن و عشق سے ہے، مگر اُس کا امتزاج کچھ ایسی خوبی سے کیا گیا ہے کہ رخسار محبوب پر اُس کا رنگ اس طرح نہیں جھلکتا کہ جذبات چُغلی کھاتے دکھائی دیں؛ بلکہ وہ ایک ایسا عطر ہے جس کی خوش بو سے پیہم مشام جاں معطر رہتا ہے؛ مگر یہ نہیں نظر آتا کہ عطر کا رنگ کیا ہے۔ بلکہ بعض وقت یہاں تک شبہہ ہونے لگتا ہے کہ خوش بو کدھر سے آرہی ہے۔ اس خصوص میں مجھے افسوس ہوتا ہے اپنے ملک پر،

---

[1] آئی سس کے مختلف ہجاء اور تلفظ کیے جاتے ہیں؛ چنانچہ موجودہ مصر میں وہ "ایزیس" ہے۔ میں نے کمال وفاداری اور انتہائی نمک حلالی سے انگریزی تلفظ "آئی سس" اختیار کیا ہے۔ (محمد خلیل الرحمٰن)

جہاں، اِلّا ماشاءاللہ، ناول یا رومان کا تمنا، امتیاز و اشگافی و برہنگی سمجھا جاتا ہے، اور جو ناولسٹ اس معاملے میں جتنا زیادہ رسوائے زمانہ ہوتا ہے، اُتنا ہی وہ اپنے فن میں کامیاب سمجھا جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ "بنت الحکمت" کی یہ خصوصیت اچھی نظر سے دیکھی جاوے۔

مگر، میں اور ناظرین پھر اس کو بھولے جا رہے ہیں کہ "بنت الحکمت" نہ افسانہ ہے، نہ ناول، نہ رومان، بلکہ حقیقتہً عذرا کی سوانح عمری ہے، جن کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ اس خاموشی سے جل بجھیں، کہ دل کی جلن نے قلم سے آہ کا دھواں تک نہیں نکلنے دیا۔ اُن کی جتنی بھی جان سوزی نظر آتی ہے، وہ لاش پروانہ نہیں، بلکہ اُن کے دُکھے اور پھر جلے دل کی راکھ ہے۔ جو شخص کہ ہزاروں برس کے انتظار سے (اور انتظار تو گھڑی بھر کا بھی بُرا) جان بہ لب ہو، کیا اُس کا جو نشان بھی رہ گیا ہو وہ قابل احترام نہ سمجھا جاوے گا؟ انسان پھر انسان ہے، اور "درد چوں در سینہ باشد، نالۂ زار آورد" کا اور اُس کا قیامت تک کا ساتھ ہے؛ مگر عذرا کا یہ قابل دید و داد کارنامہ ہے کہ اپنے اشک ہائے پیہم کے سیلاب میں اپنی معبود، آئی سس، کو اُنھوں نے نہیں بہا دیا۔ "چو میرد مبتلا میرد، چو خیزد مبتلا خیزد" کا خلعت صرف اُن ہی کے قد زیبا کے لیے بنایا گیا تھا، اور اُن ہی پر پھبا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ آئی سس کی عبادت کو اپنی زندگی کا سہارا سمجھتیں اور اُسی کی خانقاہ کو اپنا تکیہ گاہ نہ بناتیں۔ اس سہارے، اس تکیے، کو ذرا ہٹا لیا جاوے تو عذرا باوصف اپنے حسن کمال اور کمال حسن کے ایک بدنما ڈھیر رہ جاتی ہیں۔

عذرا کو، جو اپنے آزاد وطن عزیز، ملک عرب کی آزاد لڑکیوں کا پورا نمونہ ہیں، خوش بختی سے ابتداء عمر ہی میں ایک دست گیر کامل ملتا ہے، جو سالک "راہ و رسم منزلہا" تھا، اور آئی سس کا عابد۔ اُنھوں نے عذرا کا ہاتھ پکڑا، اور اُس وقت تک نہیں چھوڑا کہ جب تک اُن میں بادیۂ عرب کی خصوصیت، آزادی، بلکہ صحیح معنوں میں، انحراف، کے خاتمے کے آثار نہیں دیکھ لیے۔ اور وہ وقت اس پیر کامل کا آخری تھا۔ مگر ایک بات جو میری طرح، شاید، ناظرین کو بھی پریشانی میں ڈالے، یہ ہے کہ باوجودے کہ اُس پیر کامل نے عذرا کو شروع ہی سے اپنی طرح آئی سس کا ایسا عابد بنایا تھا کہ وہ نہایت خلوص و اعتقاد کے ساتھ آخر وقت تک (بہ شرطے کہ عذرا کے اعتقاد کے موافق کوئی آخر وقت ہو!) اُس کو اپنا معبود بناوے رہیں۔ مگر حیرت تو اُس وقت ہوتی ہے کہ جب آئی سس کی عبادت کرتے کرتے عذرا کی عمر کا بڑا حصہ گزر جاتا ہے، اور اُن سے سوال کیا جاتا ہے کہ "آئی سس کیا ہے؟" تو وہ ایک عجیب لہجے سے، کانوں پر ہاتھ دھر کر صاف کہہ دیتی ہیں کہ "میں نہیں جانتی"۔ سوال یہ ہے کہ جب "نہیں جانتی" تو اُس کو معبود کیوں سمجھا؛ اور اُس کی عبادت کیوں کی۔ لطف یہ ہے کہ جس وقت وہ یہ جواب دیتی ہیں، اُس وقت بھی وہ آئی سس کی قوت و قدرت

سے سخت مرعوب ہیں۔ میرے نزدیک (اور میری ہستی ہی کیا) یہ امر کچھ محل تردد نہیں۔ ہر شخص یہ سمجھتا ہو کہ میرے معبود میں ایسی صفات ہیں، جن کا میں احاطہ نہیں کر سکتا۔ اس واسطے اگر وہ اعتراف جہل نہ کرے تو جاہل کہلاوے گا۔ مزید حیرت یہ ہے کہ چند ہی روز کے بعد وہ دلیرانہ کہہ اٹھتی ہیں کہ "میں آئی سس کی بیٹی ہوں؛ میں آئی سس کے برابر ہوں؛ میں خود آئی سس ہوں" حال آں کہ اب بھی وہ آئی سس سے اتنی مرعوب چلی آتی ہیں کہ اس کے دوسرے مجسمے، یعنی صداقت کی دیوی کے بت کو گور میں دیکھ کر، اُس کا بھی ویسا ہی احترام کرتی ہیں، جیسا کہ خود آئی سس کا!

یہ معمّہ ضرور ہی، مگر شاید، لانیحل نہیں۔ گو میں اپنی عقل پر پورا بھروسا نہیں کر سکتا، مگر جو صورت مجھے معلوم ہوتی ہی، وہ یہ ہی کہ ہر شخص کی، جو راہِ سلوک میں گام زن ہوتا ہی، یہ کیفیت ہوتی ہے کہ شروع شروع میں کسی ہستی کو معبود مانتا ہی، اُس کی عبادت کرتا ہی، اُس سے مرعوب ہوتا ہی؛ مگر اُس کو نہیں دیکھتا، اُس کا پتہ نہیں پاتا۔ اُس کی تلاش کرتا ہی؛ اور جب اُس میں اُس کے پاؤں زخمی ہو جاتے ہیں تو گھبراتا ہی، نکل بھاگنا چاہتا ہے؛ لطف یہ ہی کہ بھاگ بھی نہیں سکتا، تو ناچار کبھی "ہمہ از وست" کہتا ہی، اور کبھی "ہمہ اوست" مگر "تحیر" پھر بھی اُس کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ ہوتے ہوتے وہ اپنے معبود کو خود اپنے وجود میں جلوہ گر دیکھتا ہے، اور اب گھبرا کر پکار اٹھتا ہے کہ "انا الحق"۔ یہی وہ سرِ عزیز ہی کہ جس کو چھپائے رکھنا ہر سالک کا فرض اولین ہی (یاد فرمائیے قدس سرہ العزیز)۔ اسی سر کو ظاہر کر دینے کا نتیجہ سُولی پانا، سر اُڑایا جانا، عمر طویل کی مصیبت میں پھنسا دیا جانا ہوتا ہی؛ یعنی جو بدقسمت تھے، اُن کی جان لے کر اُن کی آیندہ ترقی (بطور سزا) روک دی گئی، اور جو خوش قسمت تھے (جیسے عذرا) اُس نے طول عمر کی سزا پائی۔ ممکن ہے کہ وہ ترقی کر گئی ہوں، اور آخر انجام یہ ہوا ہو کہ وہ مقام عبودیت میں قائم کر دی گئی ہوں؛ جو راہ سلوک کی شاید بڑی اور اہم منزل ہی۔ ممکن ہی کہ یہ پوچھا جاوے کہ جو شخص اتنے بلند مرتبہ پر پہنچ کر بھی بوالہوسی نہ چھوڑے اُس کو کیا خطاب دیا جاوے گا؟ میں کہوں گا کہ ممکن ہی عذرا کے لیے یہ بھی مقام عبودیت کا ایک جلوہ ہو!

لیکن اس سے بھی کٹھن سوال ہم ہندوستانیوں کے لیے یہ ہی کہ آخر آئی سس کون تھی اور اُس کا دین کیا تھا؟ میرا یہ کہنا تو غلط ہوگا کہ یورپ کا بچہ بچہ آئی سس کو جانتا ہی؛ مگر اس میں شبہہ نہیں کہ وہاں ہزاروں آدمی ایسے ہوں گے جو اس کا جواب دے سکیں گے۔ میرے ہندوستان میں اس سے بہت ہی کم واقف ہیں۔ میں اپنے وطن کی تنقیص نہیں کرتا، یہاں کی اُفتاد کو روتا ہوں۔ ایں سوختن ست ساختن نیست۔

اگر آئی سس کو اپنی پوری عظمت و جلالت کے ساتھ ہندوستان میں جلوہ آرا دیکھنا ہو تو اُس کو ٹھاکر دوارہ

میں، شوالوں میں، مندروں میں تلاش نہیں کرنا چاہیے؛ وہ اگر ملے گی تو بہ ظاہر عیسائیوں اور بہ حقیقت پولوسیوں[۱] کے گرجاؤں میں، کلیساؤں میں، قربان گاہوں میں، اُن کے مراسم مذہبی میں، اُن کے جلوسوں میں۔ تعجب ہوگا کہ باوجود پولوسیوں کی سخت کشش و کوشش کے اب تک دُنیا کے ہر حصے میں جہاں تک پولوسیوں کے قدم پہنچے ہیں، آؤسس ہی حیّ و قائم و متصرف چلی آتی ہے، جیسی وہ حضرت مسیح علیٰ نبینا و علیہ السلام سے ہزاروں برس پیشتر سے تھی ؛

لیکن تا وقتے کہ میں تفصیل سے آؤسس کا حال نہ عرض کروں، نہ اُس کی اصل حقیقت معلوم ہوگی، نہ اُس کی جلالت قدر، نہ آپ "بنت الحکمت" سے پوری طرح لطف اندوز ہو سکیں گے؛ نہ اُس وقت تک میرا قول بالا صحیح معلوم ہوگا کہ جب تک آپ رومن کیتھولک مذہب کی عبادت گاہیں اور اُن کے مختلف قسم کے جلوس نہ ملاحظہ فرمائیں۔ مجھ سے جہاں تک ہو سکے گا، میں بہت ہی اختصار کی کوشش کروں گا ؛

آؤسس کا نمود مصر میں "نئی سلطنت" کے زمانے میں ہوا، جو ۱۶۰۰ قبل مسیح سے ۱۱۰۰ ق م تک رہی۔ پھر، نسبتہً، بہت جلد ایشیا کے اکثر حصص اور یونان و روم کے بیشتر حصوں پر قابض ہو کر اُس نے ایسا عروج پایا کہ مسیحیت کے مدمقابل بن گئی ؛

قریباً سات صدی قبل از مسیح میں آؤسس کے دین نے بڑی سرعت کے ساتھ ترقی کرنا شروع کی۔ ممفس اور فلے جیسے بڑے بڑے شہروں کی عظمت تو صرف اُسی کی وجہ سے قائم تھی ہی، قریباً اسی زمانے میں اُس کی پوجا فینیقیہ میں جا پہنچی؛ اور ۳۳۳ ق م کے بعد یونان میں بھی اُس کی پرستش شروع ہوگئی؛ اور یہ کیفیت ہوئی کہ باوجود اس کے کہ یونان غیر ملکی ادیان اور مذاہب کو اپنے ملک میں فروغ دینے کا سخت مخالف تھا، مگر بہ مجبوری آؤسس کا مندر اپنے یہاں قائم ہونے دیا؛ حتّٰی کہ دارالسلطنت میں نہ صرف اُس کا اثر و نفوذ بڑھا، بلکہ مضافات میں بھی اُس کے مندر بن گئے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ آؤسس کے مشتقات سے تبرکاً و تیمناً لوگوں کے نام رکھے جانے لگے؛ مثلاً آؤسی ڈوٹس، آؤسی ڈورس وغیرہ ؛

یونان میں آؤسس، بہ راہ راست، مصر سے آئی تھی، مگر فینیقیہ نے اس کے دین کی بڑی خدمت کی اور اُس کو اور ممالک میں پھیلایا؛ چناں چہ روم میں یہ دین فینیقیہ ہی سے گیا۔ جنرل سُلا (۱۳۸ تا ۷۸ ق م)

[۱] یہ وجہ میرا یہ اعتقاد ہے کہ جس دین کو لے کر حضرت مسیح علیٰ نبینا و علیہ السلام، مبعوث ہوئے تھے، وہ دین جناب پولوس نے اس طرح گم کیا ہے کہ اب اُس کا پتہ "در کتاب" بھی نہیں۔ رومن کیتھولک مذہب ہو، یا بہ طریق تنزل، "پراٹسٹنٹ" اس میں فی صدی اسّی حصہ آؤسس کے دین کا ہے۔

کے زمانے میں تو اس کو روم میں دن دُونی اور رات چوگنی ترقی ہونی شروع ہوئی۔ گو رومن علی العموم قدامت پسند تھے، مگر یہ بھی اُس کی ترقی میں حارج و مانع نہ ہوسکے۔ خود روم میں آئی سس کے ۵۳ مندر تھے، جو دین آئی سس کی کامیابی کے کافی گواہ ہیں۔ جب قدامت پسندوں کا یہاں بہت زور ہوا تو ۵۸ ق م میں یہ مندر ڈھا دیے گئے۔ لیکن ۴۳ ق م میں ہی اس کا پھر مندر بن گیا۔ چند روز کے بعد کچھ ایسی صورت پیدا ہوگئی کہ ممکن تھا کہ اس دین کو استئصال نصیب ہو جائے؛ کیونکہ گورنمنٹ روم نے سخت مجبور ہو کر اس کو تسلیم کرا لیا۔ لیکن ۲۸ ق م میں اینٹنی اور ملکہ کلیوپٹرا کے قصے کے باعث مصر کی ہر چیز سے وہ تعصب بڑھا کہ روم میں مصری آئی سس کی پوجا حکماً بند کر دی گئی؛ یہاں تک کہ اُس کے مندر کھود پھینکے گئے۔ مگر یہ درخت ایسا نہ تھا کہ جڑیں اکھاڑ ڈالنے پر فنا ہو جاتا۔ زمانۂ مابعد میں اس دین کا پھر اتنا زور ہوا کہ گورنمنٹ کو پھر اسے تسلیم کرنا پڑا۔ اب کے اُس کے مندروں کی تعداد بھی یہاں زیادہ ہوگئی۔ ان کے آثار اب تک نکلتے چلے آ رہے ہیں۔ شدہ شدہ ملک روم کے علوم و فنون اور لٹریچر میں اس نے جگہ لے لی۔

دوسری صدی عیسوی تک دین آئی سس، روم میں دین غالب رہا، اور نوزائیدہ دین مسیحؑ (یا پولوس؟) کا سختی سے مقابلہ کرتا رہا۔ روم کے بڑے بڑے نام و نمود کے خاندان آئی سس کے بھگت تھے، ان لوگوں نے اپنے دین کی طرف سے مسیحیت (یا پولوسیت؟) کا سخت مقابلہ کیا۔ غالباً بلکہ شاید یقیناً، دین آئی سس کو اپنے بقا میں کامیابی ہو جاتی، لیکن جناب پولس کو عین وقت پر بڑی اچھی تدبیر یہ سوجھ گئی کہ اُنھوں نے اس دین کے اکثر بیشتر اصول کو اپنے مذہب (یہ یاد رہے کہ میں "مذہب" کہہ رہا ہوں "دین" نہیں کہتا) میں داخل کر لیا؛ یہاں تک کہ مصر کی تثلیث کو بھی، جو آئی سس، اوسی رس اور ہورس پر مشتمل تھی۔ جناب پولوس نے اس کو بدل کر باپ، بیٹا، روح القدس گھڑ لیا۔ اس کے لیے بہت وقت اور تفصیل کی ضرورت ہے، اور اس کا یہ موقع نہیں، کہ پولوسیت کے اہم مسائل کا تجزیہ کر کے دین آئی سس کے اصول سے مقابلہ کیا جائے اور یہ دکھلایا جائے کہ پولوسیت میں موخر الاسم کے کتنے اصول ضم فرما لیے گئے ہیں (مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز + ورنہ در محفل رنداں خبرے نیست کہ نیست)

بہرحال پانچویں صدی عیسوی تک آئی سس کی پرستش روم میں ہوتی رہی؛ آخر جناب پولوس اُس شخص (علیہ السلام) کے نام لیوا تھے، جو مُردوں کو زندہ کیا کرتا تھا، کیا اُن میں اتنی کرامات بھی نہ ہوتی کہ اُن کے لگائے ہوئے زخم آئی سس کے جسم میں خون کی بوند بھی چھوڑ دیتے!

سارڈینیا نے آئی سس کی پرستش فینیقیہ سے لی؛ وہاں سے مالٹا، سسلی اور جنوبی اٹلی نے اس کو قبول کیا؛ یہاں تک کہ پمپے نیا (واقع اٹلی) اس دین کا مرکز بن گیا۔ پامپے یائی میں اس کا مندر سنہ ۸۰ ق م

تک قائم رہا؛ مگر ۷۹ء ق م کے مشہور حادثے کے بعد، جہاں سب کچھ تباہ ہوا، یہ بھی تباہ ہو کر پھر نہ بنا۔ یوں آدی سس، کم از کم، سات سو برس تک یورپ میں پُجتی رہی ؛

باقی مقامات، سارڈین یا وغیرہ، میں اس دین کو مذہب پولوسیت پر بھینٹ چڑھا کر اس کا خاتمہ کر دیا گیا؛ اپنے وطن، یعنی مصر میں ۵۶۰ء تک تو اس کی پرستش باقی تھی، اس کے بعد پولوسیت کے ناوک نے اس کو اپنا صید بنا کر، اپنے نزدیک، اس کو پردۂ دنیا سے محو کر دیا۔ مگر بہ قول مسٹر لوئیس سپنس کے، ناشکرے پولوسیوں کے علی الرغم، آدی سس اس وقت تک نہایت اعتقاد کے ساتھ، پیرس، دارالسلطنت فرانس میں، یعنی حضرت پولوس کے جانشین، جناب پاپائے روم کے زیر طناب، پوجی جا رہی ہے!

امید ہے کہ اس مختصر سے آدی سس کے دین کی حالات قدر معلوم ہو گئی ہوگی۔

معلوم ہوتا ہے کہ دین آدی سس "نئی سلطنت" کے قائم ہونے سے کئی ہزار سال پیشتر سے موجود تھا؛ مگر اس کو فروغ اُسی زمانے (۱۶۰۰ ق م سے ۱۱۰۰ ق م تک) میں ہوا۔ اسی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مصری جیسی مہذب متمدن و فلسفی و سائنس داں قوم نے اس کو بغیر کامل غور و خوض کے؛ اور بلا اس کے کہ وہ اس کی تعلیمات اور اس کے اصول میں حقانیت نہ دیکھ لیتی، اُس کو ہرگز اختیار نہ کیا ہوگا۔ آدی سس کے پوشیدہ رموز جیسے جیسے اس کے پڑھنے والوں پر کھلتے گئے، وہ اُس کو اپنی ملکہ، اپنی دیوی، اپنی ماتا، وغیرہ، قرار دیتے گئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُس کے دین میں ایسی چیزیں تھیں کہ جن کے اتباع سے اُس کے پجاریوں کو بقاء دوام حاصل ہو جاتا تھا؛ اُس میں کچھ ایسی مسحور کرنے والی قوت تھی کہ اُس کا بھگت یہ انعام پا کر رہتا تھا۔ یہی عقیدہ "بنت الحکمت" کی جان ہے اور اسی پر یہ تمام شان دار عمارت کھڑی ہے۔ یہ دین خود ایک رمز ہے، اور اس کا ایک سرِ عظیم وعزیز ایسا ہے کہ جس کو ظاہر کرنے والی نے عذاب الیم (بلکہ صحیح طور پر عذاب عقیم) پایا؛

اس موقعے پر مناسب ہوگا کہ ضمیمے میں زیر عنوان اوسی رس، جو کچھ تحریر ہے اُس کو ملاحظہ فرمایا جاوے۔ اُس سے معلوم ہوگا کہ افسانہا و اصنام میں اُس کی پیدائش وغیرہ کس طرح بتلائی گئی ہے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اوسی رس، آدی سس، ہورس، وغیرہ کے قصے میں آفتاب و ماہتاب کے طلوع و غروب ہونے کی تلمیح ہے۔ اسی نے دینی صورت اختیار کر لی۔ ممکن ہے کہ یہ خیال صحیح ہو؛ لیکن اگر بہ نظرِ غور دیکھا جاوے تو یہ قصہ نیکی اور بدی کی استمراری جنگ کو ظاہر کرتا ہے۔ پھر غور کیجیے! یہ قصہ صاف طور پر اس کو ظاہر کرتا ہے کہ آدمی مرنے کے بعد اپنی اولاد کی صورت میں پھر پیدا ہوتا ہے۔ مگر خیر! یہ تو زمانۂ حال کے محض قیاسات ہیں۔ قدیم مصری اس کے یہ معنی لیتے تھے کہ روح قدیم ہے؛ حشر و نشر حق ہے؛ آدی سس عاقبت میں بھی انسان کے کام آوے گی کیونکہ

وہ دنیا و مافیہا کی شفیق ماں ہی۔ آئی سس کی کوششوں سے اوسی رس کے جی اُٹھنے کے یہ معنی تھے کہ آئی سس کی برکت و تصرف سے روح نے نشاۂ ثانیہ پائی اور وہ (روح) از سرِ نو پیدا ہو گئی ؛

آئی سس نے جو اپنے شوہر اوسی رس پر ماتم کیا، اور اُس کی لاش کے پتہ لگانے میں تکلیفیں اُٹھائیں، اُس کے معنی کما حقہٗ قیاس میں نہیں آتے ؛ مگر اس سے دُنیا کو شوہر پرستی کا سبق حاصل ہوتا ہی۔ اس کی مثال ہمارے ہندوستان کی سیتا جی میں ملتی ہی۔ مگر جو تعلیمات اور جو دل سوزی و دل دوزی آئی سس کے قصے میں ہی، وہ سیتا جی میں کہاں!

جس زمانے میں آئی سس اپنے شوہر کی لاش کی تلاش میں تھی، اُس کو پتہ لگا کہ لاش ایک صندوق میں رکھ کر نیل میں بہا دی گئی ہی۔ موجوں نے اُس کو ایک جھاؤ کے درخت تک پہنچا دیا ہی، اور قدرتِ ایزدی سے جھاؤ نے اُس کو اپنے تنے میں چھپا لیا ہی، اور وہ تنہ اتنا بڑا ہو گیا ہی کہ ایک بادشاہ کو اُسے دیکھ کر تعجب ہوا، اور وہ (بادشاہ) یہ تنہ اُکھاڑ کر لے گیا، اور اُس کو اپنے محل کا ستون بنا لیا۔ آئی سس اُس بادشاہ کے دارالسلطنت میں پہنچی اور ایک حوض پر جا بیٹھی۔ لوگوں نے اُس کا حال پوچھنا چاہا تو اُس نے کسی کو کچھ نہ بتایا۔ اتفاق سے بادشاہ کی کچھ ملازم چھوکریاں وہاں آ گئیں۔ اُن کو دیکھ کر آئی سس کو رحم آیا؛ اُس نے چھوکریوں کے پھٹے میلے کپڑے بدلے، کنگھی چوٹی کی، عطر لگایا۔ جب یہ چھوکریاں اپنی ملکہ کے پاس گئیں، تو اُسے تعجب ہوا، اور اُس کے پوچھنے پر چھوکریوں نے آئی سس کا پتہ دیا۔ ملکہ نے اُسے بُلا بھیجا اور اپنے دودھ پیتے بچے کی اُسے کھلائی مقرر کر دیا۔ آئی سس اُس کے مُنہ میں اپنی اُنگلی دے دیتی تھی، نہ معلوم اُس سے کیا نکلتا تھا کہ بچہ سیر ہو جاتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اُس نے ایسی تدابیر شروع کیں کہ بچے کو حیاتِ دوام حاصل ہو جائے۔

اس قصہ کا مطلب صاف ہی کہ وہ مظلوموں کی مددگار ہی، بچوں کی محافظ ہی، بنی نوعِ انسان کا پیٹ بھرتی ہی، اور جو کوئی اُس کی سپردگی میں آ جاتا ہی وہ بقاءِ دوام حاصل کر لیتا ہی۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہی کہ وہ بچوں کے لیے بمنزلۂ ماں کے ہی۔ اور اتنی شفیق ماں ہی کہ اُن کے ساتھ وہ ایسے سلوک کرتی ہی کہ جہاں تک مادّی ماؤں کا خیال بھی نہیں جا سکتا ؛

عوام الناس کے لیے آئی سس کی جو صفت اظہر من الشمس ہی، اور جس کو ہر موقعے پر ظاہر کر دیا جاتا ہی، وہ یہ ہی کہ وہ نیچر کی دیوی اور مصر والوں کی اَن داتا ہی۔ زمین میں قوتِ نمو وہی پیدا کرتی ہی۔ اُس کا بڑا نشان وہ ستارہ ہی جو نیل میں طغیانی اور موسمِ بہار اپنے ساتھ لاتا ہی۔ نیچر میں ہوا بھی داخل ہی۔ آئی سس ہوا کی بھی دیوی ہی؛ نسیم وہی چلاتی ہی، اور اُس کے ساتھ آفتاب کو ظلمتِ شب سے وُہی نکالتی ہی؛ موسمِ بہار کی ہوا اُسی کے

دم کا طفیل ہے؛ غلوں کو پکا دینے اور خشک کرنے والی ہوا بھی وہی بھیجتی ہے؛

ایک یہ قصہ بھی آئی سس سے منسوب ہے کہ جب وہ اُس مکان سے نکلی ہے جہاں اُس کو سیت نے قید کر دیا تھا (یہ وہ مکان ہے جہاں گرمی کے موسم میں آئی سس کے حکم سے ہوا بند کر دی جاتی ہے) تو سات زہریلے بچھو اُس کو راستہ دکھانے کے لیے اُس کے ساتھ ہو لیے اور اُس کو دلدلوں کے اُس پار نکال کر لے گئے۔ راستے میں جس عورت نے اُن کو دیکھا اُس نے بچھوؤں کے خوف سے دروازے بند کر لیے۔ اس پر بھی ایک بچھو نے ایک بیمار بچے کے کاٹ لیا۔ آئی سس نے فوراً اُسے اچھا کر دیا۔ شاید اس قصے کا یہ مطلب ہو کہ یہ بچہ سردی کا گلابی موسم ہے، جس نے گرمی سے کملائے ہوئے پودوں کو جھنجھوڑ کر جگا دیا، اور اُن میں حیات تازہ بخش دی۔ آئی سس کے بیٹے ہورس کو بھی بچھو کاٹتا ہے؛ آئی سس اُس کو اچھا کر دیتی ہے؛ یعنی آفتاب کی تمازت کو سردی کے موسم کی شروع کی ہوائیں کم کر دیتی ہیں، اور شدہ شدہ جاں بخش بہار آ جاتی ہے؛

آئی سس مزروعہ زمین، فصل اور ماکولات کی دیوی بھی ہے۔ شروع سے آخر تک موسم بہار، زمین کی نمو کی طاقت، زمین کی ماں سوا آئی سس کے کوئی نہیں؛

آئی سس میں طبیب اور ساحر کی صفت بھی ہے۔ یہ دونوں صفات اُس کے دین کے پھیلنے میں بہت مددگار ہوئیں۔ لکھا ہے کہ سنہ ۱۵۵۳ ق م میں ایک طبیب نے اس لیے آئی سس کی تپسیا کی کہ اُس کے علاج معالجے میں وہی خاصیت پیدا ہو جاوے، جو اُس نے اپنے بیٹے ہورس اور اپنے دشمن سیت کے زخموں کے اچھا کرنے میں برتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ "وہ سحر و ساحری کی قوتِ متحرکہ" تھی۔ جو الفاظ اُس کی زبان سے نکلتے تھے وہ بڑی بڑی تاثیریں رکھتے تھے، اور جو کچھ وہ کہتی تھی وہ ہو کر رہتا تھا۔ اس قصے میں یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ وہ اپنے دشمن کے ساتھ بھی دوستی کرتی ہے۔ دشمن بھی اُس کے فیض سے محروم نہیں رہتا؛

میں عرض کر چکا ہوں کہ آئی سس نیچر کی دیوی ہے؛ اس کے ساتھ ہی وہ ایسی کریم ذات ہے کہ کائنات کے تمام مادی و جسمانی و روحانی فوائد اُسی کے ہاتھ میں ہیں۔ جس کو جو کچھ ملتا ہے اُسی کے دستِ فیض سے ملتا ہے۔ وہ "عدیم المثال ہے" "عظیم الشان" ہے" "بڑی فیاض ماں" ہے" "سارے دیوتاؤں کی ماں" ہے" "جتنے چھوٹے چھوٹے مقامی دیوتا تھے وہ سب اُسی کی خصوصیات کے مظہر تھے، اور اُن سب کی وہ کلی مظہر ہے۔ فرق اگر کچھ ہے تو صرف ناموں کا، جو بہت حقیر چیز ہے؛

اگر غور کیا جاوے تو مصر کا سب سے بڑا دیوتا اوسی رس تھا، لیکن اُس کے تمام خصوصیات آئی سس میں آ گئے تھے اور اُن کے ساتھ آئی سس کے خصوصیات مل گئے؛ اس لیے اوسی رس کا ستارہ آئی سس کے آفتاب کے سامنے بالکل ماند ہو کر رہ گیا؛ یہاں تک کہ اوسی رس کے مندر بھی اُتنے نہ بنے جتنے آئی سس

کے۔ اوسی رس کی پوجا مصر تک محدود رہی، اور آئسس کی پرستش آدھی عمرانی دنیا میں پہنچ گئی۔ جو مندر اُس سے منسوب تھے اُن کے ناموں ہی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُن مندروں کے بانی آئسس کا درجہ بہت بلند سمجھتے ہیں۔ وہ ملکہ تو سمجھی ہی جاتی ہے؛ "ماتا" کہے بغیر اُس کو یاد نہیں کیا جاتا۔

سب سے آخری فرعون نختانی بس نے بھی قریباً سنہ ۳۶۰ ق م میں اُس کا ایک مندر بنوا کر اُس کا نام "ملکہ آئسس کا مندر" رکھا تھا۔ سنہ ۵۶۰ء تک اُس میں "ماتا" کی پوجا ہوتی رہی اور ہوتی رہتی، مگر جسٹینین نے جوشِ مسیحیت میں آکر بہ جبر اُس کو بند کرادیا۔

میں بخوفِ طوالت آئسس کی اور بہت سی صفات کو بیان نہیں کرتا۔ میں نے اوپر جو دو ایک باتوں کی ترجمانی کی ہے، وہ کچھ تو اپنی عقلِ ناقص کے موافق ہے، اور کچھ یورپین علماء کی رائے کے موافق۔ میری ترجمانی بالکل ایسی ہے جیسے میں وید کی تشریح و تفسیر کروں؛ اور علماء یورپ کا تو کہنا ہی کیا ہے۔ اس دین کے رموز و اسرار و غوامض تو کوئی "ماتا" کا معتقد ہو وہی بیان کرسکتا ہے۔ باقی رہا اس دین کا فلسفہ؛ وہ باوجود غور و فکر میری سمجھ سے بالاتر ہے؛ اور یہیں میں اپنے قصورِ فہم کا اُن لوگوں کے ساتھ معترف ہوں، جنھوں نے سیکڑوں برس "ماتا" کی عبادت اور اُس کا فلسفہ سمجھنے میں گزار دیے اور پھر کہیں یہ کہتے ہوئے اُٹھے کہ: "اے ماتا! تو ہماری سمجھ سے بالاتر ہے"۔

دینِ آئسس کا اتنے زمانے (بیسویں صدی عیسوی) تک باقی رہنا، اُس میں طاقت و ہمت کا موجود رہنا، اُس کا دنیا کے اکثر حصص میں اتنا شیوع، واقعی حیرت انگیز ہے۔ توجیہ یہ ہوسکتی ہے کہ "ماتا" میں وہ خصوصیات تھیں کہ دنیا بھر کے لیے وہ کافی و وافی تھی۔ اُس میں تمام دیوتاؤں کی خصوصیات اس طرح موجود تھیں کہ اُس کے بھگت کو کہیں اور دریوزہ گری، یا کسی اور آستانے پر جبہہ سائی نہیں کرنی پڑتی تھی۔ اُس کے مراسمِ دینی میں دل کشی تھی؛ اُس کے رموز میں دل فریبی تھی؛ اور سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ وہ اپنی عبادت کے بدلے میں اپنے بھگتوں کو نقد انعامات عطا کردیتی تھی، نسیہ کا وہاں بہت کم ذکر تھا۔ اُس میں پاکیزگی، پارسائی، تزکیۂ نفس، عفو، خدا اور ارواحِ مطہرہ سے شرفِ ہمکلامی، روح کی نشأۃ ثانیہ، بقاء دوام، غرض کیا کیا گنایا جاوے، سب کچھ موجود تھا۔ مذہب پالوس بھی ان ہی چیزوں کا انسان کو امیدوار بناتا تھا، اور اس سے زیادہ دینے کا وعدہ کرتا تھا، اور یہ سب نسیہ پر تھا، نقد کا وہاں ذکر نہ تھا۔ لوگ ایسے کہاں کے بے وقوف تھے کہ اپنے قدیم دین کو چھوڑ کر ایک جدید مذہب کو اختیار کرنے پر آسانی سے مائل ہوجاتے۔ نسیہ کو نقد پر کون ترجیح دیتا ہے، خواہ وہ بہ زورِ شمشیر ہی ہو؟ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں میں خلاف و نزاع پیدا ہوا، پھر علی الترتیب جدل، جبر، جور، جنگ، قتل و غارت تک نوبت پہنچی۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ ایک طرف تو یہ کرتوتیں ہیں، اور دوسری طرف ایک حلیم پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ) کا نمونہ دکھلا کر دھوکا دیا جاتا ہے۔ دونوں میں کوئی مناسبت ظاہری و باطنی نظر نہ آتی تھی۔ وہ بھڑکے اور مقابلے کے لیے تیار ہوگئے۔

نوعمر اور پیر فرتوت کا مقابلہ ہی کیا۔ بہ ظاہر دین آدیسس مٹا دیا گیا؛ لیکن اس کی روح، اس کے مراسم، بلکہ وہ مجسّم، پولوسیت میں اس طرح مخلوط ہوا کہ ٹمٹماتی روشنی کا جو دیا حضرت مسیح (علیٰ نبینا وعلیہ السلام) نے روشن کیا تھا وہ آدیسس کی مشعل کی روشنی میں گم ہو کر رہ گیا۔ یہ کیفیت بھی اس وقت تک حاصل نہیں ہوئی جب تک "ماتا" کی اکثر صفات "مادر الٰہ" یعنی مریم عذرا میں اور ہورس کی حضرت مسیح میں نہیں بتلائی گئیں۔ ایک انگریزی مصنف (سر فلنڈرس پیٹری) تو نہایت انصاف مندی کے ساتھ صاف صاف فرماتے ہیں کہ: "مصریوں کے (عقائد مذہبی) میں مسیحیت کو پیوند دیا گیا"۔ غائر نظر حضرات مسیحی اولیائے نصوص کو ذرا تحلیل کر کے ملاحظہ فرمائیں گے تو ان میں صاف طور پر "ماتا" کی پوجا اور عبادت، اور "ماتا" کے پروہتوں کی تمام باتیں دکھلائی دیں گی۔ سوال یہ ہے کہ اگر جناب پولوس، آدیسس کے مصدق ہو جاتے تو کیا ایک بہت بڑا مسئلہ حل ہو جاتا، اور لاکھوں انسانوں کی جانیں نہ بچ جاتیں؟

افسوس ہے کہ بہت سے جملۂ معترضہ آ جاتے ہیں۔ اس کو سیرت کم سوادی پر محمول فرمائیے:

ماتا آدیسس کا بت، یا تصویر یہ ہے کہ وہ عورت تو ہے ہی، ایسے ڈھیلے ڈھالے لمبے کپڑے پہنے ہوئے ہے کہ ٹخنوں تک پہنچتے ہیں۔ کندھے پر ایک دوپٹہ ہے، سینے پر آ کر اس میں گرہ دی ہوئی ہے۔ بعض وقت یہ چادر دوپٹے کے برقع، یا نقاب ہوتا ہے، جو راز، یا پردے کی علامت ہے۔ اس کے داہنے ہاتھ میں طقطقہ (جھنجھنا) ہے اور بائیں ہاتھ میں چھوٹا سا لوٹا یا اسی قسم کا کوئی اور برتن۔ اس کے بال گھنے اور لمبے ہیں۔ ماتھے پر کنول کا پھول ہے، جو حشر کی علامت ہے۔ ہلال اور ستارے بھی ہیں، کیوں کہ وہ علم ہیئت کی بھی دیوی ہے۔ شعریٰ (سیوزنٹیل کے قریب کا ایک ستارہ) اس کا خاص ستارہ ہے کہ اس کے نکل آنے سے موذی حشرات الارض چھپ جاتے ہیں۔ کبھی اس کو ایک گتے پر بٹھا دیا جاتا ہے۔ چوں کہ وہ زراعت کی دیوی ہے، اس کے سامنے مشعلوں کی روشنی ہوتی ہے، گیہوں کی بالیوں اور خشخاش کے ڈوڈوں کا ڈھیر اس کے آگے ہوتا ہے۔ وہ عالم سفلی کی ملکہ ہے، اس لیے وہ سنگ موسا کے چبوترے پر بیٹھی ہوتی ہے۔ بہ حیثیت سمندر کی دیوی کے وہ ایک کشتی میں سوار ہے، بادبان کھلے ہوئے ہیں، اور وہ سمندر میں چلی جا رہی ہے۔ محبت و شفقت مادری کی دیوی ہے، اس لیے وہ اپنے دودھ پیتے بچے، ہورس، کو سینے سے لگائے ہوئے دودھ پلاتی ہے۔ کبھی آدیسس کو بھی ان دونوں کے ساتھ بٹھلا کر یہ مقدس کنبہ پورا کر دیا جاتا ہے۔

اب ذرا اس تصویر کو حضرت مریم عذرا کی تصویر سے (بورومیت حذف کر کے) مقابلہ کیجیے؛ خاص کر اس حصے سے، جس میں جناب ممدوحہ حضرت مسیح (علیہ السلام) کو خاص انداز اور خاص ساز و سامان سے گود میں لیے ہوئے ہیں۔ پھر دیکھیے کہ دونوں میں کتنی مماثلت ہے؛ ابن اللہ کی ماں، مریم عذرا میں کتنی کمی ہے، اور ماتا

آئی سس پر کیا بیتی؛

ہر ملک کی رسم و رواج اور آب و ہوا کو آئی سس کے تہواروں اور پوجا میں بڑا دخل تھا۔ روم میں سب سے بڑا تہوار ۲۸ر اکتوبر سے شروع ہو کر نومبر کی ۳ر تاریخ تک جاری رہتا تھا۔ ۳۱ر اکتوبر کو ماتا آئی سس ایک دو اور دیویوں کو لے کر اوسی رس کی تلاش میں نکلتی تھی۔ پروہت اور عابدین و زاہدین دینِ آئی سس کے واسطے یہ دن بڑے درد و غم کا ہوتا تھا۔ یکم نومبر سے ۳ر نومبر تک اوسی رس کی لاش ملنے، یا جی اُٹھنے کی خوشی منائی جاتی تھی۔ ۲ر نومبر کو نو نو پروہتوں کا گروہ، تین دفعہ کرکے، ایک جلوس بنا کر خوشی منانے کے لیے نکلتا تھا۔ نومبر کی ۳ر کا جلوس ماتا کی خوشی میں شریک ہونے کا تھا۔ ۵ر مارچ جہازرانی کا موسم شروع ہو جانے کی خوشی کا تھا۔ ایک جہاز خوب سجایا جاتا تھا۔ اس میں خوش بودار مسالے سلگا کر "ماتا" کے نام پر سمندر میں چھوڑ دیا جاتا تھا۔ دو اور تہوار ہوتے تھے۔ مگر ان کی چنداں اہمیت نہیں تھی۔ ۳۰ر مارچ کو ایک تہوار دریائے نیل کی طغیانی کے نام سے منایا جاتا تھا۔ حالاں آں کہ یہ ظاہر ہے کہ روم کو نیل سے کوئی تعلق نہیں ہے؛

"ماتا" کی پوجا کرنا کرانا پروہتوں کا کام تھا۔ ان لوگوں کا ایک جم غفیر ہر وقت تیار رہتا تھا۔ یہ تمام گروہ، صحیح معنوں میں، مقدسین کا ہوتا تھا۔ مندر اور پوجا کے متعلق مختلف صیغے ہوتے تھے اور ہر صیغے کے الگ الگ کارکن، ان ہی پروہتوں میں سے مقرر کر لیے جاتے تھے۔ پروہتوں کے لیے لازمی تھا کہ وہ چار ابرو کا صفایا رکھیں، کتان کے کپڑے پہنیں، نہایت پاک صاف رہیں (نہ کہ عیسائیوں کے راہبوں کی طرح نجس، ناپاک) اور بعض دیگر چند باتوں سے پرہیز کریں؛

پروہتوں کی تین قسمیں ہوتی تھیں: ایک صرف "ماتا" کے خادم، دوسرے "ماتا" اور اوسی رس دونوں کے خادم، تیسرے صرف پروہتی کرنے والے۔ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ سالکین و عارفین کے لیے ایک درجے سے دوسرے تک ترقی کرنے کی کیا کیا شرائط تھیں، کیونکہ یہ باتیں بہت ہی مخفی رکھی جاتی تھیں۔ مگر ایک شخص، اپولی اس نامی نے، خدا جانے سچ یا (یقیناً زیادہ تر) جھوٹ، بعض بھیتے کی باتیں، ایک افسانے کے پیرایے میں لکھی ہیں۔ میں ذیل میں اس کا خلاصہ لکھتا ہوں، جس سے اکثر مراسم مذہبی معلوم ہو جائیں گے۔ قصہ یہ ہے کہ:—

ایک شخص، لوسی اس، یہ تہیہ کرتا ہے کہ وہ "ماتا" آئی سس کو اپنا معبود بنا لے — بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ خود "ماتا" نے اس کو خواب میں اپنا بھگت بننے کی ہدایت کی تھی؛ کیوں کہ بغیر اس کی توفیق کے کوئی ایسے مجاہدات شاقہ نہیں برداشت کر سکتا۔ دوسرے روز نیل کی طغیانی کا جلوس نکلنے والا تھا۔ اس میں

سب سے آگے کچھ لوگ سپاہیوں، شکاریوں، اور مچھیتوں کا سوانگ بھرے ہوتے تھے۔ ان کے بعد اصل جلوس شروع ہوتا تھا۔ پہلے سفید لباس پہنے ہوئے عورتیں، بالوں میں پھول لگائے اور ہاتھوں میں پھول لیے ہوتی تھیں۔ ان کے بعد کچھ عورتیں ہوتی تھیں، جن کے ہاتھوں میں آئینے ہوتے تھے، اور ان آئینوں کے رُخ "ماتا" کی طرف ہوتے تھے کہ وہ اپنی صورت دیکھے اور دکھائے۔ ان کے پیچھے کچھ لوگ کنگھے لیے ہوتے تھے، اور اپنی حرکات سے یہ ظاہر کرتے تھے کہ گویا وہ "ماتا" کے بالوں میں کنگھی کرتے آ رہے ہیں۔ ان کے پیچھے کچھ لوگ روغن طلباں اور خوش بودار چیزیں لیے ہوتے تھے اور ان کو راستے میں چھڑکتے جاتے تھے۔ انکے پیچھے بہت سے مرد اور عورتیں موم بتیاں، مشعلیں وغیرہ، روشنی کا سامان، لیے ہوتی تھیں۔ پھر باجہ بجانے والے اپنی بانسریاں اور نفیریں وغیرہ لیے ہوتے تھے؛ ان کے ساتھ ہی کچھ نوجوان سفید لباس پہنے ہوئے بھجن گاتے تھے؛ اُن کے پیچھے کچھ اور باجے والے، پھر چوب دار، ان کے بعد ہر عمر و حیثیت کے مرد اور عورت عارفین کا گروہ ہوتا تھا؛ ان سب کا لباس بالکل سفید ہوتا تھا۔ عورتوں کے سر پر نہایت خوش بودار تیل لگا ہوتا تھا اور اُن کے چہرے پر ایسا باریک نقاب، کہ اُن کے چہرے کو چھپا نہ سکتا تھا۔ مرد حسب دستور چادر اور کا صفایا کیے، سفید صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوتے تھے؛ ہر ایک کے ہاتھ میں سونے، چاندی اور کانسی کے جھنجھنے ہوتے تھے، اور وہ اُن کو تال سُر کے ساتھ ایک خوش آیند آواز میں بجاتے جاتے تھے۔ ان کے پیچھے پجاری یا پروہت، بگلے کے پر کے سے سفید لباس پہنے ہوتے تھے، اور "سب سے بڑی ماتا دیوی" کے نشانات ہاتھ میں اُٹھائے ہوتے تھے۔ پہلے پروہت کے ہاتھ میں سونے کا ایک بہت بڑا چراغ دان رہتا تھا؛ دوسرے کے ہاتھ میں قربان گاہ کی قسم کی ایک چیز؛ تیسرے کے ہاتھ میں زیتون اور تاڑ کے مصنوعی درخت، جن کے پتے اور ٹہنیاں سونے کی ہوتی تھیں؛ چوتھا آدمی ایسا ہوتا تھا، جو اپنے بائیں ہاتھ سے کام لے سکتا تھا، جو مصریوں میں انصاف کی علامت تھی۔ یہی شخص عورت کی چھاتی کی شکل کی سونے کی بنی ہوئی ایک چیز ہاتھ میں لیے ہوتا تھا، جس میں دودھ بھرا ہوتا تھا؛ وہ اس دودھ کی دھار دیوی پر چڑھاتا جاتا تھا۔ پانچواں آدمی ایک پنکھا لیے تھا، جس کی ڈنڈی وغیرہ سونے کی تھی۔ اس کے دوش بدوش ایک آدمی ایک بڑا مرتبان پانی سے بھرا لیے تھا۔ ان سب کے بعد بہت سے مرد ہوتے تھے، جو مختلف دیوتاؤں کا بھیس بھرے ہوئے تھے۔ انوبس (پیغام رسانی کا دیوتا) اپنے ہاتھ میں کچھ ٹہنیاں لیے ہوئے تھا، اور اپنے داہنے ہاتھ سے تاڑ کے پتے ہلاتا جاتا تھا۔ ایک گائے اپنے پچھلے دونوں پیروں پر کھڑی ہوتی تھی۔ جو دنیا بھر کی گویا پرورش کرنے والی کی قائم مقام تھی۔ ان سب کے پیچھے ایک شخص ایک صندوق لیے ہوتا تھا، جس میں مخفی اسباب و تبرکات رکھے ہوتے تھے۔ پھر ایک اور شخص ہوتا تھا جو "ماتا" کا بُت اُٹھائے ہوئے ہوتا تھا۔ "ماتا" کا یہ بُت عجیب قسم کا ہوتا تھا کہ اس کو نہ چوپائے

کا کہا جا سکتا تھا، نہ پرندکا، نہ انسان کا۔ سب سے آخر میں ایک پروہت ہوتا تھا جس کے ہاتھ میں طشتہ تھا اور سر پر گلاب کے پھولوں کا تاج۔ اس تزک و احتشام کے ساتھ جہاز سمندر تک لے جایا گیا، اور اُس میں چھوڑ دیا گیا۔ تو عارفین واپس ہوے، اور تمام نشانات وغیرہ رکھ کر اُنھوں نے "اِتا" کے چاندی کے بُت کی پابوسی کی۔ اور زیتون کی شاخیں، پھول پتے لے کر خوش خوش اپنے قیام گاہ پر آگئے۔

"اِتا" کے جلوس کی یہ تفصیل اپولی اس نے لکھی ہے۔ جن حضرات کو کہ مذہب رومن کیتھولک کے مذہبی جلوس کو دیکھنے کا اتفاق ہوا ہو، وہ آئی سس کے جلوس سے اُس کا مقابلہ فرما کر دیکھیں کہ ان دونوں میں کہاں تک مماثلت ہے، اور جہاں نہیں ہے، کیوں نہیں ہے۔

غرض اب قصہ یوں شروع ہوتا ہے کہ اس جلوس کے بعد لوسی اس نے مندر کے اندرونی حصہ میں قیام کیا۔ اور پروہتوں کی تمام نمازوں وغیرہ میں شامل ہوتا رہا۔ اُس نے خوب خوب مجاہدے اور ریاضتیں کیں، جن کی تفصیل بہت طویل مگر دلچسپ ہے۔ اُس نے آئی سس کے متعلق بہت سی کتابوں کا بھی مطالعہ کیا۔ آخر "اِتا" نے اُس سے کہا کہ اب وہ وقت قریب آگیا ہے کہ اُس کو مبتدیوں کے گروہ میں شامل کرلیا جاوے۔ اُس کو پہلے غسل دیا گیا، پھر اصطباغ دے کر "اِتا" کے قدموں میں مخفی امور اور مخفی کتابوں کے مطالعے کی ہدایات پانے کے واسطے پہنچا دیا گیا۔ جانے سے پہلے، اُس کو بھرے مجمع میں فہمایش کی گئی کہ وہ دس روز تک نہ گوشت کھاوے، نہ کسی نشیلی چیز کو ہاتھ لگاوے، نہ زیادہ کھانا کھاوے۔ ان دس دنوں کے گزر جانے کے بعد شام کے وقت اُس کی تقدیس کی باقاعدہ رسم ادا کی گئی۔ سورج ڈوبنے کے بعد اُس کو تمام حاضرین نے بہت سے تحایف دیے۔ جب رات ہوی، تو پروہت اُس کو مندر کے اندرونی حصے میں چھوڑ آئے۔ یہاں اُس کو فوراً الہامات شروع ہوگئے اور اُس نے وہ عجیب وغریب باتیں دیکھیں جن کے ظاہر کرنے کی اجازت نہیں۔ اگر وہ کچھ کہہ سکتا تھا تو صرف اتنا کہ میں موت کی سرحد تک پہنچا، اور وہاں سے تمام عناصر کے کندھوں پر سوار ہوکر واپس آیا۔ میں نے آدھی رات کے وقت آفتاب کو پورا درخشاں دیکھا۔ زمین کے دیوتاؤں اور آسمان کے دیوتاؤں سے رُودررُو ملا۔

دوسرے روز صبح اُس کو اس حیثیت کے ساتھ باہر نکلنے کی اجازت دی گئی کہ وہ بارہ قسم کے کپڑے پہنے ہوے تھا، اُن پر ایک بہت ہی خوبصورت رنگین کتاں کا جبّہ تھا، اور ایک بہت بڑی قیمتی چادر کمر سے ٹخنے تک پڑی ہوی تھی۔ ان تمام کپڑوں پر مختلف رنگوں سے جانوروں کی تصویریں بنی ہوی تھیں۔ ایک روشن شمع اُس کے ہاتھ میں تھی، اور تازہ اور زیتون کے پتّوں کا سہرا اُس کے ماتھے پر۔ تھوڑی دیر اُس کو پردے کے پاس کھڑا رہنا پڑا، پھر جتنے لوگ جمع تھے اُن کے سامنے پردہ ہٹا کر اُس کی زیارت کرائی گئی۔

پھر "ماما" کی ہدایت کے موافق لوسی اس کو ایک سال روم میں گزارنا پڑا، اور اس کے آخر میں اُس کو اوسی رس کے رازوں کے بے نقاب کرنے کی مشقت میں لگا دیا۔ اس کے چند روز بعد اُس کو، خواب میں، پھر ہدایت ہوئی کہ وہ تیسری مرتبہ ریاضت کرے۔ جب وہ یہ بھی کر چکا تو اُسے پانچ برس ایک کالج میں مطالعہ کرنا پڑا .... (انتہیٰ ملخصاً)

آئی سس کے مندر میں دو وقت نمازیں ہوتی تھیں: پہلی آفتاب طلوع ہونے کے وقت؛ اُس وقت پروہت مندر کا دروازہ کھولتے تھے اور دیوی کو جگاتے تھے، یعنی آرتی ہوتی تھی۔ مختصر سی دعاؤں کے بعد قربان گاہوں کے گرد گھومتے تھے اور کچھ رسمیں ادا کرتے تھے، جس میں دودھ کا چڑھانا بھی شامل تھا۔ یہ ہو چکتا تھا تو پروہت، بہ آواز بلند، یہ اعلان کر دیتے تھے کہ دن نکل آیا ہے۔ دوسری نماز سہ پہر کو ہوتی تھی۔ اُس وقت پروہت پوجا کرنے والوں کے سامنے متبرک پانی کا ایک برتن بھر کر کھڑے ہو جاتے تھے، اور تمام حاضرین اُس کو سجدے کرتے تھے ؛

تعجب یہ ہے کہ کہیں (کم از کم مجھے) یہ ذکر نہیں ملا کہ آئی سس کی طرف کوئی صحیفۂ آسمانی منسوب تھا بھی یا نہیں۔ اگر ہوتا تو یقیناً ذکر آتا۔ اُن کے دین کی رموز کی باتوں کا ذکر ضرور آتا ہے۔ مگر وہ دست بُردِ زمانہ ہو گئیں؛ یا اگر ہوں گی تو "ماما" کے معتقدین کے پاس پیرس میں ؛

یہ نہ سمجھ بیٹھنا چاہیے کہ پرانے مصر کے لوگ محض دیوتاؤں ہی کو پوجتے تھے اور خدا کو نہ جانتے تھے۔ وہ ایک ایسی ذات، ایسی ہستی کے قائل تھے جو تمام دیوتاؤں سے بالاتر تھی۔ اس ہستی کی کوئی شکل و صورت نہ تھی؛ وہ پاک و منزّہ تھی؛ اُس میں جذبات نہ تھے؛ وہ آنکھ سے نہیں دکھائی دیتی تھی۔ سب پر حکومت کرتی تھی؛ تمام دیوتا اور تمام انسانی ارواح بالآخر اُسی میں جا ملتے تھے۔ تمام دیوتا (غالباً مع آئی سس کے) اُسی کے تابع فرمان تھے ؛

یہ لوگ حشر و نشر کے قائل تھے۔ اُن کے نزدیک اعمال تولے جاتے تھے اور اُن کے موافق جزا و سزا ملتی تھی؛ ہیروڈوٹس نے لکھا ہے کہ دنیا بھر میں مصری ہی سب سے پہلی قوم ہے جو تناسخ و بقاء ارواح کی قائل تھی۔ اُن کے نزدیک جب آدمی مر جاتا تھا تو اُس کی روح اجسام سفلی و فضائی و جانوران بحری و بری میں حلول کر جاتی تھی اور یوں ہی منتقل ہوتے ہوتے پھر انسانی جسم میں آتی تھی۔ اس آواگون میں کم از کم تین ہزار برس لگ جاتے تھے ؛

مجھے اعتراف ہے کہ گو مفصلۂ بالا بیان شاید دلچسپ ہو، مگر باوجود اتنے طول ہو جانے کے بہت کچھ تشنہ ہے۔ مگر بیت الحکمت کے سمجھنے کے لیے اس سے زیادہ ضرورت نہیں؛ اور وہ اس سے زیادہ کی متحمل

بھی نہیں ہو سکتی۔

میری آخری تمنا یہ ہے کہ کوئی باہمت عزیز ہندو ہو یا مسلمان، آدی سس پر ریسرچ کر کے ہندوستان کو اُس سے کم از کم روشناس تو کر دیں۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ یہ نہایت دلچسپ کام ہوگا۔ گو اس وقت بظاہر اس میں بڑی روشنی دکھائی نہیں دیتی، مگر بالیقین یہ نور سے سراسر معمور رہی!

درونش مشرقِ بیضا، برونش یک شبِ یلدا
درون چوں طلعتِ عذرا، برون چوں طرۂ لیلیٰ

بیانِ شرف

(جناب مولانا شاہ ابو الشرف صاحب مجددی مہاجر مکی)

ہر جفا اُن کی ہوئی ہم کو وفا سے بڑھکر
اب نکالیں وہ کوئی ظلم، جفا سے بڑھکر

لوگ ملتے ہیں بُتِ ہوش رُبا سے بڑھکر
اپنی نظروں میں نہیں کوئی خدا سے بڑھکر

سرِ تسلیم ہے خم تیری رضا کے آگے
دے وہ رُتبہ جو ہے تسلیم و رضا سے بڑھکر

سایۂ تیغ میں جنت ہے مجاہد کے لیے
آبِ خنجر کا ہے لطف آبِ بقا سے بڑھکر

وہ ملا دستِ لبِ کوثر مجھے ساقی سے ملی
میرے ہونٹوں کو لگے چاٹنے کاسے، بڑھکر

جاں نثاروں کی صفوں میں ہے قضا کا کیا کام
اک ذرا لو تو خبر تیغِ ادا سے، بڑھکر

ناپ کر دیکھ لیا ہم نے شبِ ہجر کو بھی
وہ بھی نکلی نہ تری زلفِ رسا سے بڑھکر

تو سمجھا لے گا اگر پاس نہ ان کی سفاک
آپ خنجر پہ گریں گے ترے پیاسے، بڑھکر

کمسنی جنکی ہمیں یاد ہے، اور کل کی ہے بات
آج اُنھیں دیکھیے کیا ہو گئے کیا سے، بڑھکر

یہ شرف ہو گیا مخصوص بذاتِ حسنینؑ
سارے دنیا کے ہیں پوتوں سے نواسے بڑھکر

تجربہ کر لیا اور دیکھ لیا سب کو شرف
کوئی ہمدرد نہیں یادِ خدا سے بڑھکر

مرزا غالب اور خطوط کی تاریخیں

(جناب منشی مہیش پرشاد صاحب مولوی فاضل مسلم ہندو یونیورسٹی)

اُردو علم ادب میں مرزا غالب کے خطوط کو جو درجہ حاصل ہے اُسکا بیان میرے ہاتھوں توضیح کا محتاج نہیں۔ چنانچہ مرزا کی تحریروں سے جو علمی و ادبی نکات متصور ہیں اُنکے سوا مرزا کے واقعات زندگی اور دیگر تاریخی واقعات کی بابت بھی بہت سی معلومات میسر آتی ہیں اور جن رقعات میں تاریخ کتابت درج ہے اُن سے تو صحیح واقعہ کا وقت بھی معلوم ہو جاتا ہے۔

(۱) مرزا ایک مکتوب[1] مورخہ ۲۰ ر نومبر ۱۸۵۵ء میں اپنے متعلق یوں لکھتے ہیں:—

"صبح کو میں ہر روز قلعہ کو جاتا ہوں۔ ظاہرا مولوی صاحب اول روز آئے ہونگے۔ جب سوار ہو جاتا ہوں تب بھی دو چار آدمی مکان پر ہوتے ہیں۔ مولوی صاحب بیٹھتے حقہ پیتے۔ اگر قلعہ جاتا ہوں تو پہر دن چڑھے آتا ہوں"

(۲) دہلی میں اجرائے چنگی کی بابت مرزا ایک مکتوب[2] محررہ ۹ ر نومبر ۱۸۵۹ء میں یوں گویا ہیں:—

"چونگی کے باب میں کونسل ہوئی، پرسوں، ۷ ر نومبر سے جاری ہو گئی۔ سالگ رام خزانچی، چھنامل، مہیش داس ان تین شخصوں کو یہ کام بطریق امانی سپرد ہوا ہے۔ غلہ اور اوپلے کے سوا کوئی جنس ایسی نہیں جس پر محصول نہ ہو"

(۳) ۱۸۵۷ء کے غدر میں ۱۱ رمئی کو دلی انگریزوں کے ہاتھ سے نکل گئی مگر ۱۴ ر ستمبر ۱۸۵۷ء کو پھر دلی پر انگریزوں کا عمل و دخل ہو گیا۔ بعد فتح مارشل لا (فوجی آئین) جاری ہوا تاہم دسمبر ۱۸۵۷ء میں عوام الناس کے خطوط کی آمد و رفت سرکاری ڈاک میں ضرور جاری ہو گئی تھی۔ چنانچہ مرزا کے ایک مکتوب[3] محررہ ۵ ر دسمبر ۱۸۵۷ء میں اس ضمن کی عبارتیں یہ ہیں:—

"ایک خط میں نے منشی نبی بخش صاحب کو بھیجا اُس کا جواب مجھ کو آیا اور ایک خط تمھارا کہ تم بھی موسوم بہ منشی ہرگوپال متخلص بہ تفتہ ہو . . . ."

---

[1] قبلہ آپ کو خط کے بھیجنے میں تردد کیوں ہوتا ہے الخ بنام قاضی عبد الجمیل صاحب بریلوی (اُردوے معلی و عود ہندی)

[2] جناب عالی آپ کا لکھا ہوا خط سہ شنبہ یکم نومبر الخ بنام ذوالفقار الدین حیدر خاں عرف حسین مرزا صاحب (اُردوے معلی)

[3] صاحب تم جانتے ہو کہ یہ معاملہ کیا ہے الخ بنام منشی ہرگوپال تفتہ (اُردوے معلی)

بہر حال منشی صاحب کو میرا سلام کہنا اور یہ خط دکھا دینا۔ اسوقت تمہارا خط پہنچا اور اسی وقت میں نے یہ خط لکھ کر ڈاک کے ہرکارے کو دیا۔

(۴) دہلی کی جامع مسجد کی بابت مرزا ایک[1] خط محررۂ ۱۶ دسمبر ۱۸۶۲ء کے شروع ہی میں لکھتے ہیں: —

"جو یائے حال دہلی نہ الور سلام لو۔ مسجد جامع واگزاشت ہوگئی۔"

مرزا کے بیشتر خطوط اُردوئے معلّی میں اور اس سے کم عود ہندی میں شایع ہو چکے ہیں لیکن اول الذکر مجموعے کے بہت سے خطوط میں تاریخ کتابت درج ہے۔ مگر مؤخر الذکر مجموعے میں بمشکل تمام کچھ خطوط ایسے ملتے ہیں جنکی تاریخ کتابت صحیح طور سے معلوم ہو جاتی ہے۔ مزید براں جب ہم مرزا کے خطوط کی تاریخوں پر نظر ڈالتے ہیں تو حسب ذیل نتائج نکلتے ہیں: —

(۱) کسی کسی خط میں ہجری و عیسوی دونوں تاریخیں بقید وقت، یوم، ماہ و سنہ درج ہیں

(الف) دوشنبہ دوم جمادی الاول ۱۲۷۶ھ مطابق ۲۸ نومبر ۱۸۵۹ء وقت صبح[2]

(ب) صبح جمعہ ۲۵ ذی الحجہ ۱۲۸۲ھ ۱۲ مئی ۱۸۶۶ء[3]

(۲) کہیں کہیں تاریخیں بقید وقت یوم و ماہ ہجری و عیسوی درج ہیں سنہ کا اظہار نہیں کیا گیا ہے۔

(الف) صبح چہارشنبہ ہفتم رمضان ششم مارچ[4]

(ب) مرقومہ صبح سہ شنبہ ۲۹ نومبر ۳ جمادی الاول بحساب جنتری[5]

(۳) بعض خطوط میں محض عیسوی تاریخیں مع وقت یوم ماہ و سنہ ہیں۔

(الف) صبح یکشنبہ ۱۰ ستمبر ۱۸۶۳ء[6]

(ب) چہارشنبہ ۲۵ ستمبر ۱۸۶۱ء ہنگام نیمروز[7]

(۴) کہیں کہیں ہجری تاریخیں بقید یوم ماہ و سنہ ہجری ہیں۔

---

[1] بنام میر مہدی حسین صاحب مجروح (اُردوئے معلّی)

[2] یوسف مرزا میرا حال سوائے میرے خدا اور خداوند کے الخ مکتوب بنام جناب یوسف مرزا صاحب (اُردوئے معلّی)

[3] میرے شفیق میرے شفیق مجھ سے پیچ دیپچ کے ماننے والے الخ مکتوب بنام منشی حبیب اللہ خاں صاحب ذکا۔ (اُردوئے معلّی)

[4] صاحب دو خط تمہارے پے بہ پے ڈاک آئے کل دوپہر ڈھلے الخ مکتوب بنام میر مہدی حسین صاحب مجروح (اُردوئے معلّی)

[5] میاں کل صبح کو تمہارے نام کا خط روانہ کیا شام کو تمہارا الخ مکتوب بنام جناب یوسف مرزا صاحب (اُردوئے معلّی)

[6] جانا عالیشانا۔ پہلے خط بغیر توسط برخوردار علی حسین خاں الخ بنام علاء الدین احمد خاں بہادر (اُردوئے معلّی)

[7] علائی مولائی اسوقت تمہارا خط پہنچا دوپہر پڑھا الخ بنام نواب علاء الدین احمد خاں بہادر (اُردوئے معلّی)

(الف) سہ شنبہ ۱۸ رمضان ۱۲۸۰ھ[1]

(ب) یوم الخمیس ۱۷ محرم ۱۲۸۳ھ[2]

(۵) کہیں کہیں تاریخیں بقید یوم و ماہ ہجری ہیں :-

(ا) پنجشنبہ ۲۶ رمضان[3]

(ب) آج بدھ کے دن ۲۷ رمضان کو[4]

(۶) کسی کسی خط میں کسی قسم کی تاریخ کا اظہار ہی نہیں[5]

علاوہ بریں یہ بھی واضح رہے کہ کہیں کہیں تاریخیں ابتدا میں ہیں کہیں اخیر میں ہیں اور کہیں درمیانی عبارتوں میں ہیں۔ جیسا کہ اردوے معلّی و عود ہندی کے رقعات کو بغور دیکھنے سے بخوبی معلوم ہو سکتا ہے۔ قصہ کوتاہ خطوط کی تاریخیں کسی اصول پر مبنی نہیں ہیں جنکے باعث خطوط کی سلسلہ وار تدوین و ترتیب بالکل ناممکن یا یوں کہیے کہ سخت مشکل ہے۔ تاہم خطوط کی اصل عبارتیں یا بعض خارجی واقعات ایسے ہیں جن سے بعض خطوط کی تاریخ کا پورا یا ادھورا پتہ یا دو سنہ کم و بیش وقت کے بعد چل ہی جاتا ہے۔

(ا)

مرزا غالب نے ایک خط بنام نواب علاء الدین خاں بہادر کی تاریخ بقید یوم و وقت صبح دوشنبہ شانزدہم ازمہ صیام لکھی ہے۔ جنتری سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا نے جن ایام میں اردو خطوط لکھے ہیں اُن میں سے بعض مائہ ذیل سنہ ایسے ہیں جن میں ۱۶ رمضان دوشنبہ کو پڑتا ہے۔

۱۲۶۸ھ	۵ جولائی ۱۸۵۲ء
۱۲۷۳ھ	۱۱ مئی ۱۸۵۷ء
۱۲۷۶ھ	۹ اپریل ۱۸۶۰ء
۱۲۸۱ھ	۱۳ فروری ۱۸۶۵ء

مگر اس ۱۶ رمضان والے خط میں ہی مرزا نے یہ لکھا ہے :—

---

[1] قرۃ العین میر مہدی و میر سرفراز حسین الخ مکتوب بنام میر مہدی حسین مجروح۔ (اردوے معلّی)

[2] اخ مکرم کے خدام کرام کی خدمت الخ مکتوب بنام نواب امین الدین احمد خاں صاحب (اردوے معلّی)

[3] صاحب کل تمہارا خط پہنچا آج اسکا جواب لکھ کر الخ مکتوب بنام نواب علاء الدین احمد خاں بہادر (اردوے معلّی)

[4] آج بدھ کے دن ۲۷ رمضان کو پہر دن چڑھے جس وقت کہ میں کھانا الخ مکتوب بنام نواب علاء الدین احمد خاں بہادر (،،)

[5] مثلاً عود ہندی میں جناب چودھری عبد الغفور صاحب سرور کے نام کا پہلا اور دوسرا خط۔

"صبح دوشنبہ شانزدہم ازمہ صیام
میری جان نئے مہمان کا قدم تم پر مبارک ہو اللہ تعالیٰ تمھاری اور اُس کی اور اُسکے بھائیوں
کی عمر و دولت میں برکت دے۔ تمھاری طرز تحریر سے صاف نہیں معلوم ہوتا کہ سعید ہے یا سعیدہ ہے۔
ثاقب[۵۱] اس کو عزیز اور غالب عزیزہ جانتا ہے۔ واضح لکھو تا احتمال رفع ہو"

اور پھر ایک مکتوب بنام نواب علاء الدین میں مرزا یوں رقم فرما ہیں :—
"سعیدہ کا مقدم تم پر مبارک ہو۔ ثاقب مجھ سے لڑتا تھا کہ بھتیجا ہے میں کہتا تھا کہ پوتی ہے۔ بارے
میں جیتا اور ثاقب ہارا"

اس عبارت سے واضح ہے کہ یہ مضمون پچھلے مضمون سے کیونکر مطابقت رکھتا ہے۔ چنانچہ جس خط کی یہ عبارت ہے وہ یقیناً ۱۶ر رمضان کے بعد لکھا گیا ہے مگر اس کی تاریخ بقید یوم صرف "پنجشنبہ ۲۶ر رمضان" درج ہے۔ ہاں اسی خط میں چونکہ ہولی اور پارسیوں کی عید کو سہ شنبہ کا ایک ساتھ ہونا مندرج ہے پس ہمارے نزدیک ۱۶ر رمضان سے ۱۳ر فروری ۱۸۶۵ء (۱۲۸۱ھ) ہی مراد لینا مناسب ہے۔

(۲)

مرزا ایک خط[۵۲] میں جناب حاتم علی مہر صاحب کو لکھتے ہیں :—
"بھائی جان۔ کل جو جمعہ روز مبارک و سعید تھا گویا میرے حق میں روز عید تھا۔ چار گھڑی دن رہے
نامہ فرجام اور چار گھڑی کے بعد وقت شام۔

چار جلدوں کا پارسل پہنچا
واہ کیا خوب برمحل پہنچا"

یہاں لفظ جمعہ کے سوا کوئی تاریخ ماہ یا سنہ تمام خط میں درج نہیں ہے مگر ایک مکتوب[۵۳] بنام منشی شیو نرائن صاحب کے الفاظ یہ ہیں :—
"برخوردار اقبال نشاں کو دعا پہنچے۔ کل جمعہ کے دن ۱۹ر نومبر ۱۸۵۸ء کو سات کتابوں کے دو پارسل پہنچے۔ واقعی کتابیں جیسا کہ میرا جی چاہتا تھا اسی روپ کی ہیں۔ حق تعالیٰ مرزا تفتہ کو سلامت رکھے"
پس اس خط سے نتیجہ نکلا کہ مرزا حاتم علی صاحب کے نام والے خط میں جمعہ سے مراد ۱۹ر نومبر ۱۸۵۸ء ہے۔

---

۵۱ نواب شہاب الدین احمد خاں بہادر جو نواب علاء الدین احمد خاں بہادر کے چچیرے بھائی تھے اور مرزا کی بی بی کے بھتیجے پوتے تھے۔

۵۲ عود ہندی و اُردوئے معلیٰ۔ ۵۳ اُردوئے معلیٰ

(۳)

مرزا ایک خط حکیم غلام نجف خاں صاحب کو لکھتے ہیں :-

"میاں تم سے رخصت ہو کر اُس دن مرادنگر میں رہا دوسرے دن یعنی جمعہ کو میرٹھ پہونچا۔ نواب مصطفیٰ خاں نے ایک دن رکھ لیا۔ آج شنبہ ۲۱ جنوری یہاں مقام ہے نو بج گئے ہیں بیٹھا ہوا یہ خط لکھ رہا ہوں۔ مفت کا کھانا ہے خوب پیٹ بھر کر کھاؤں گا۔ کل شاہجہاں پور پرسوں گڈھ مکتیشر رہوں گا الخ"

اس خط کے آخر میں "محض" چاشتگاہ شنبہ ۲۱ جنوری" درج ہے یہاں ۱۸۶۰ء ہونا چاہیے کیونکہ مرزا اسی سنہ کی جنوری میں رامپور تشریف لیگئے تھے۔ چنانچہ اسی مضمون کا ایک خط بنام منشی ہرگوپال تفتہ یہ ہے :-

"بھائی میں نے دلّی کو چھوڑا اور رامپور کو چلا۔ پنجشنبہ ۱۹ کو مرادنگر اور جمعہ ۲۰ کو میرٹھ پہونچا آج شنبہ ۲۱ کو بھائی مصطفیٰ خاں کے کہنے سے مقام کیا۔ یہاں سے یہ خط تم کو لکھ کر بھیجا۔ کل شاہجہاں پور پرسوں گڈھ مکتیشر رہونگا۔ الخ"

اس خط کے آخر میں "چاشتگاہ شنبہ ۲۱ جنوری ۱۸۶۰ء" درج ہے۔ اور اس خط کے مضمون سے بھی اس امر کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ پچھلا خط ۱۸۶۰ء کا ہے۔

مرزا کے اصلی خطوط یا اُنکے عکس یا بلاک جو میری نظر سے گزرے ہیں اُن سے میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ مرزا بعض اوقات خط میں تاریخ درج نہ کرتے تھے۔ تعمہ کو تاہ تھوڑے سے خط ہیں کہ تاریخ، ماہ یا سنہ مندرج نہیں اور اُنکی تکمیل کسی نہ کسی حد تک ہو جاتی ہے لیکن بہت سے خطوط ایسے ہیں جن کی تاریخ کا صحیح تعین بقید ماہ و سنہ اگر محال نہیں تو دشوار گزار امر ضرور ہے شلاً

مکتوب	مکتوب الیہ	
چودھری صاحب شفیق کرم کی خدمت میں بعد ارسال سلام الخ	چودھری عبد الغفور صاحب سرور	(عود ہندی)
پرسوں تمارا خط آیا حال جو معلوم تھا وہ پھر معلوم ہوا الخ	منشی ہرگوپال صاحب تفتہ	(اُردوئے معلّٰی)
سعادت و اقبال نشاں مرزا علاء الدین خاں بہادر کو فقیر اسد اللہ الخ	نواب علاء الدین احمد خاں بہادر	(اُردوئے معلّٰی)
فقیر اسد اللہ جناب مخدومی مولوی کرامت علی صاحب کی خدمت میں الخ	مولوی کرامت علی	(اُردوئے معلّٰی)

مرزا کے خطوط جو عود ہندی اور اُردوئے معلّٰی میں شایع ہو چکے ہیں اُن میں سے صرف تھوڑے سے

خطوط کے اصل موجود ملتے ہیں۔ چنانچہ ان اصل خطوط میں سے اکثر ایسے ہیں کہ اُن میں تاریخ مندرج ہے اور ان اصل رقعات کی بدولت مجھے اُن خطوط کی تاریخ معلوم ہو سکی ہے جو کہ عودِ ہندی اور اردوئے معلیٰ میں مطبوعہ ہیں لیکن انکے ساتھ تاریخ کا اندراج نہیں۔ پس اگر مرزا کے اصل رقعات اور میسر آئیں تو بہت سے خطوط کی تاریخ کا ٹھیک ٹھیک پتہ لگ سکتا ہے اور ممکن ہے کہ بعض امور پر مناسب روشنی پڑے مگر حق تو یہ ہے کہ مرزا کے اصل خطوط کا میسر آنا ہی بہت مشکل اور ایک حد تک ناممکن بات ہے۔ کیونکہ مرزا کے بہت سے اصل رقعے یقیناً ضائع و برباد ہو چکے ہیں۔

فغانِ آرزو

(جناب منشی انور حسین صاحب آرزو لکھنوی)

یہ دل کا سوز جو آنسو بنے شرار نہ ہو
وہ راز ہے کہ کھلے بھی تو آشکار نہ ہو

فریبِ وعدہ کا آ سکے کوئی شکار نہ ہو
غضب ہے عمر کٹے ختم انتظار نہ ہو

مشاہداتِ تصور ہیں کیا طلسمِ فریب
نظر یقین کرے دل کو اعتبار نہ ہو

سکھا کے شیوۂ تسلیم دل کیا ہے عطا
کہ اختیار رہے بھی کوئی اختیار نہ ہو

بسورنے کی ادا ہے شگفتہ کلیوں میں
کہیں خزاں کی یہ لوٹی ہوئی بہار نہ ہو

فدا ہو جان یہ ساقی گری ارے توبہ
گلے سے زہر بھی اُترے تو ناگوار نہ ہو

خوشی نہیں تو محبت کے غم ہی میں ہو مزا
وہ کھیل کھیلنے بیٹھا ہوں جس میں ہار نہ ہو

یہ بے نیازیِ چشمِ کرم معاذ اللہ
اُمیدوار بنا دے اُمیدوار نہ ہو

بغیر امید کے دُنیا میں زندگی ہے محال
کوئی گھڑی نہیں جس میں کچھ انتظار نہ ہو

جو محوِ دید ہے اُسکو یہ احتیاط کہاں
کہ رازِ شوق نگاہوں سے آشکار نہ ہو

عدم کے خواب سے کم غفلتِ شباب نہیں
قضا بھی آ کے جگائے تو ہوشیار نہ ہو

جگر کا آبلہ چھالا بنا ہے پتھر کا
اُٹھائے چوٹ پہ چوٹ اور اشکبار نہ ہو

یہ فتحِ حسن میں کیوں شانِ اعترافِ شکست
سیاہ پوش ہو عالم وہ سوگوار نہ ہو

ہنسی ہنسی میں وہ رو دیتے ہیں آرزو مرے بعد
نہ ہو گا پھر بھی گوارا کہ اشکبار نہ ہو

سیاسی مطلع پر جنگ کے بادل

از جناب مولانا محمد ظفر صاحب ایم اے ایل ایل بی ایڈیٹر

اِسوقت یورپ کی وہی حالت ہے جو ۱۹۱۴ء میں تھی۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ اُسوقت جنگ کے اُسی وقت شروع ہو جانے کا کسی کو خیال نہ تھا اور ممالک طیار نہ تھے لیکن آج یورپ کیا، دنیا کے بیشتر ممالک جنگ کے لیے بہت کچھ طیار ہیں اور جنگ کا ہر وقت انھیں کھٹکا لگا رہتا ہے۔

انگلستان جو یورپ کا اسوقت ایک قسم کا سرپنچ ہے خود ایسے ہی اندیشوں میں مبتلا ہے نومبر کے آخر میں دارالعوام میں مسٹر چرچل نے جو تقریر کی اُس سے عیاں ہے کہ اسوقت جنگ آیندہ کا کابوس کس بُری طرح بڑے بڑے مدبروں تک کے دماغوں پر سوار ہے۔ مسٹر چرچل کی نظر صرف جرمنی پر رہی کہ وہ ہوائی لحاظ سے زبردست طیاریاں کر رہا ہے اور انگلستان کو اتنی ہوائی مضبوطی حاصل نہیں جس سے اُسکے باشندے آرام سے سو سکیں۔ مسٹر بالڈون نے جواب میں اطمینان دلایا کہ جنگ کا خدشہ بے حقیقت ہے لیکن اِس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جرمنی جب سے تخفیف اسلحہ کی مجلس سے اُٹھ کے گیا ہے اور جب سے اُس نے بین الاقوامی جمعیت کی ممبری سے استعفا دیا ہے وہ برابر زبردست طیاریوں میں مصروف ہے۔ وہ برابر ہوائی جہازوں کو بڑھائے چلا جا رہا ہے۔ لیکن وہ انگلستان جیسے ملک سے جو جنگ عظیم کے بعد سے برابر اپنی ہوائی حیثیت کو مضبوط بنا رہا ہے اور جسے فن پرواز کی مکمل فنی معلومات حاصل ہیں اور لائق مبصر اسکی خدمت پر کمربستہ رہے ہیں، ہرگز عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس کی تو اب آنکھیں کھلی ہیں یا یوں کہیے اُسے تو اب موقع ملا ہے کہ ہاتھ پاؤں ہلا سکے۔ طیاری وہ ضرور کر رہا ہے لیکن انگلستان کی دیرینہ کوششوں کے سامنے اُس کی ابتدا ہے۔ البتہ اسکی طیاریاں سراسر پوشیدہ ہیں مگر معتبر ذرائع سے جو کچھ معلوم ہوا ہے وہ اندیشہ ناک نہیں۔

سیاست کا سرسری مطالعہ کرنے والا بھی جانتا ہے کہ مدبروں کا یہی حال ہے۔ ان میں کا ایک گروہ وحشت زدہ تقریریں کرتا ہے۔ دوسرا تسلی و تشفی دیتا ہے اور دشمن کو حقیر سمجھتا ہے۔ لیکن غور کرنے والوں کو ان دونوں کے درمیان راستہ تلاش کرنا چاہیے۔ دونوں گروہوں کے خیالات معلوم کر کے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ جنگ کی گھٹا اُمڈ رہی ہے اور اُسکی بھیانک صورت دُور سے لوگوں کو متوحش کر رہی ہے۔ کیا عجب ہے کہ وہ جلد یا بدیر آگے بڑھ کے فضا میں چھا جائے اور طوفان رعد و باراں سے لوگوں کے دل و دماغ پر لرزہ طاری کر دے!

دُنیا کے مختلف ممالک کی بساطِ سیاست پر سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک طرف تو اندیشہ ہے کہ جاپان سے امریکہ یا روس کی جنگ ہو جائے۔ دوسری طرف خوف ہے کہ جرمنی پھر ۱۹۱۴ء کا سا نقشہ کھینچ کے نہ رکھدے۔ فی الواقع روس اور جرمنی کی طیاریاں ہی دیگر ممالک کے مدبروں کی توجہات اپنی طرف مبذول کرا رہی ہیں۔

مسٹر لائڈ جارج زمانۂ جنگ کے وزیر انگلستان نے مختلف موقعوں پر جو خیالات ظاہر کیے ہیں اُن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اُنکی دُوربین نظریں جنگ کے بادل اُٹھتے ہوئے دیکھ رہی ہیں۔ مارچ ۱۹۳۴ء میں اُنھوں نے ایک مضمون میں آسٹریا، جرمنی وغیرہ کے متعلق بحث کرتے ہوئے لکھا کہ حالات ایسے خطرناک نہیں کہ یقین سے کہا جا سکے کہ لڑائی زمانۂ قریب میں ہونیوالی ہے، لیکن ڈر ضرور ہے۔ اُنکے سامنے یہ باتیں تھیں جن سے اُنھیں جنگ کا اندیشہ فی الحال نہیں معلوم ہوتا تھا کہ ہٹلر نے برسرِ اقتدار ہونے کے بعد پولینڈ سے معاہدہ کرلیا ہے۔ جرمنی سے دو اندیشے رہتے ہیں۔ ایک پولینڈ کی طرف کیونکہ جنگ عظیم کے بعد اُسکے ملک کا کچھ حصہ اس میں شامل کر دیا گیا ہے، جرمنی اُسے اپنی ڈیوڑھی سمجھتا ہے اور وہ اُسے اپنے ملک کے لیے اپنے قبضے میں رکھنا نہایت ضروری سمجھتا ہے۔ دوسری طرف سار کے صوبہ کا معاملہ ہے۔ یہ جرمنوں کا علاقہ ہے جو پندرہ برس سے فرانس کے تسلط میں چلا آرہا ہے۔ جرمنی کا پولینڈ سے معاہدہ ہو جانے سے اس ڈیوڑھی کا قصہ فی الحال ختم ہو گیا ہے۔ فرانس کی طرف سے کسی قسم کا خطرہ اس لیے نہیں کہ فرانس نے اس تمام سرحد پر ایسے زبردست قلعے بنائے ہیں کہ انجینیری بجا طور پر اُن پر ناز کر سکتی ہے۔ لیکن بلجیم اب بھی اُسی طرح حائل ہے جس طرح ۱۹۱۴ء کی جنگ میں سدِ راہ تھا۔ البرٹ شاہ بلجیم اسقدر عقلمند اور مدبر مانا جاتا تھا کہ جبتک وہ جیتا رہا اُسکے وزیر اور دستوری ادارے اُسکی رائے کو نہایت صائب مانتے ہوئے اپنی رائے کو اُسکے سامنے ہیچ سمجھتے اور اُسکی ہی رائے اور فیصلہ پر کاربند ہوا کرتے تھے۔ اُس کا دماغ ہنگامی تلاطم سے محفوظ تھا۔ اُس نے بارہا کہا کہ میں نے جرمنی کا مقابلہ فرانس کی وجہ سے نہیں کیا، بلکہ محض اس لیے کہ اس میں بلجیم کی خودمختاری کا سوال درپیش تھا۔ میں اپنے ملک کی خودمختاری کے لیے لڑ رہا تھا۔ اسی دلیری اور ہمت سے اُس نے فرانس کی ہر اُس کوشش کی مخالفت کی جو اُس نے جنگ عظیم کے بعد فاتحانہ جوش میں بلجیم کے ذریعہ جرمنی کے خلاف کرنی چاہی۔ ایسے حالات میں اگر فرانس نے جرمنی کو اُس کی جنگی طیاریوں کی مصروفیت میں ہی جا لینے اور گلوگیر ہونے کی فکر کی اور بلجیم کے ذریعہ اپنا مقصد حل کرنا چاہا تو بلجیم ۱۹۱۴ء کی طرح اُسے بھی آنکھیں دکھائے گا۔ اس لیے فرانس کو جرمنی کے خلاف کسی قسم کی جارحانہ یا جنگجویانہ حرکت کرنے کا موقع نہیں۔ اور جرمنی فرانس کے استحکامات کی وجہ سے اُس طرف توجہ نہیں کر سکتا۔ اور سب سے بڑی بات

یہ ہے کہ سارا اور السیس اور لورین کے صوبے ہی اسکے اس ارادہ میں سب سے اول سدِ راہ ہیں۔
چند ماہ بعد مسٹر لائڈ جارج نے ایک نمائش کے افتتاح کے موقع پر اسکے برعکس تقریر کی۔ نومبر کے وسط میں اخبار ڈیلی اکسپریس نے جنگی تصویروں کی ایک نمائش لندن میں منعقد کی جسکا افتتاح مسٹر مذکور کے ہاتھوں عمل میں آیا اور انھوں نے فرمایا کہ لڑائی کا اندیشہ ایک حقیقت ہے جس سے آپ کو عہدہ برآ ہونا ہے۔ اس لیے ضرورت ہے کہ اس نسل کے مرد و عورت کو معلوم کرایا جائے کہ جنگ کیا چیز تھی۔ اور جب وہ ہمارے سروں پر نازل ہوگی تو وہ کیا چیز ہوگی۔ اس دفعہ ہمارے بچے میدانِ جنگ میں ہونگے۔ جن آتشیں اسلحہ جات نے ہمارا بھرکس نکالا تھا وہی ہمارے بچوں کا قلع قمع کرینگے۔ اس لیے انھیں ضروریاتِ جنگ سے آگاہ کرنا چاہیے۔ جنگ دبے پاؤں راستہ پر چلی آرہی ہے اور اس سے ہمیں لازمی طور پر دوچار ہونا ہے۔ میں اس نمائش کا ہرگز افتتاح نہ کرتا اگر میرا خیال یہ نہ ہوتا کہ اب وقت آگیا ہے کہ اس نسل کو جنگ کی ماہیت سے آگاہ کیا جائے۔ وہ لوگ جنھیں گزشتہ مہیب جنگ سے سابقہ پڑا تھا جلد جلد اس دنیا سے اُٹھتے چلے جا رہے ہیں اور اسکا ثبوت فوجی پنشنوں سے مل سکتا ہے کہ سال بسال ان میں کس قدر کمی آتی جا رہی ہے۔ موجودہ نسل کو جنگ کی حقیقت کی خبر نہیں۔ یہ نمائش اس ضرورت کو پورا کردیگی۔ جنگ کے ایام میں تم لوگوں کو سچے سچے حالات نہیں بتا سکتے۔ تم قوم کی ہمت اور حوصلہ قائم رکھنا چاہتے ہو۔ اس لیے بہت کچھ چھپانا پڑتا ہے۔ خراب حالات کی ہوا تک نہیں دی جاتی۔ تمھیں اطلاع ملتی ہے کہ خندقیں چھین لی گئیں، اہم مقامات پر قبضہ کرلیا گیا، گاؤں ہاتھ سے جاتے رہے، توپیں اور قیدی گرفتار ہوگئے۔ لیکن یہ ہیں کیا اور انکے لیے کیسے کیسے مصائب میدانِ جنگ میں جھیلنے پڑتے ہیں، کس طرح ہفتوں خون میں گارا بنی ہوئی زمین میں سپاہیوں کو کھڑا رہنا پڑتا ہے، لوگوں کو انکی کیا خبر۔ دہشت انگیزی کچھ جرمنوں ہی کا خاصہ نہیں۔ یہ جنگ کا ایک لوازمہ ہے۔ نمائش کی یہ تصویریں جنگ کے اتفاقیہ حادثے نہیں ہیں بلکہ لوازمات جنگ میں سے ہیں۔ دشمن کا اخلاق اور حوصلہ توڑنا جنگ کا ایک لازمی کرشمہ ہے۔ یہ اسی دہشت و بربریت کے طفیل ہے کہ فتح حاصل ہوجاتی ہے۔ جنگ قتل کرنے، پرخچے اُڑانے، تکا بوٹی کرنے اور فاقے مار ڈالنے کا نام ہے۔ قومیں بھوکی مرگئیں گو ہم کو یہ روزِ بد نہیں نصیب ہوا۔ محض ہمارے اُن بہادروں کی بدولت جو آج بھلا دیے گئے ہیں۔ میں اُن لوگوں میں سے نہیں جو کہتے ہیں کہ جنگ اب ہوئی۔ میں یہ کہتا ہوں کہ ممکن ہے اس میں کچھ توقف ہو لیکن وہ ہے یہیں کہیں دبے پاؤں آتی، اور وہ نہ معلوم کس وقت ہمیں آکے دبوچ لے۔"

انگلستان کے علاوہ دیگر ممالک کے وزرا بھی اسی قسم کی تقریریں کرتے رہتے ہیں۔ اُن سب سے یہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ جنگِ آیندہ کو کسی طرح دور نہ سمجھنا چاہیے۔ انکے دل کو لگی ہوئی ہے کہ جنگ اچانک آئیگی

اور جلد آئے گی۔

ہمیں سب سے پہلے اپنے ایشیا کے حالات پر نظر ڈالنی چاہیے۔ ہم امریکہ اور جاپان کی جنگ کے اندیشے کو لیتے ہیں۔ جاپان چین میں جو کچھ پیشقدمی کر رہا ہے اسکی وجہ سے اسکا امریکہ سے دست و گریباں ہو جانا ممکنات سے ہے۔ چین امریکہ کے مال کی منڈی ہے جیسے جاپان کی بھی ہے۔ جاپان کا روز بروز اس ملک میں پھیلتے جانا امریکہ کو کسی طرح گوارا نہیں۔ لیکن دونوں ملکوں کو اپنے حالات کا بخوبی اندازہ ہے۔ جاپان اس وقت معاہدۂ واشنگٹن کی ترمیم چاہتا ہے کیونکہ اسکی رو سے بحری بیڑہ کی طاقت کے متعلق اس پر ایسی پابندیاں عائد کی گئی تھیں جن کی وجہ سے وہ امریکہ سے دبا رہے اور مسابقت نہ کر سکے۔ امریکہ اس کی اس خواہش کے بالکل خلاف ہے۔ جاپان دول یورپ سے اپنا حق تسلیم کرانا چاہتا ہے۔ بصورت ناکامیابی وہ اس کی بھی پرواہ نہیں کرتا کہ بطور خود اپنی خواہش کو معرض عمل میں لے آئے۔ اس کا جواب امریکہ یہ دیتا ہے کہ تمہارے ہر ایک جہاز کے مقابلہ میں میں تین جہاز بناؤں گا اور یہ سلسلہ برابر جاری رہیگا۔ یہ مان بھی لیا جائے کہ امریکہ کا بیڑا ہر طرح اور ہر وقت جاپان کے بیڑے سے فوقیت رکھے گا لیکن جنگ کی صورت میں جاپان کو یہ فائدہ رہیگا کہ وہ اپنے مستقر سے بہت قریب رہ کے اسکے بیڑے سے مقابلہ کریگا، اور امریکہ کا بیڑا گھر سے چار ہزار میل کا فاصلہ طے کر کے بحر الکاہل میں آ کے دشمن سے نبرد آزما ہو گا۔ اتنے دور دراز سفر میں جنگ سے پہلے ہی بیڑے کے ایک معتد بہ حصہ کو حوادث سمندری سے دو چار ہونے کی وجہ سے بہت کچھ نقصان پہونچ چکا ہو گا۔ جنگ ہونے پر اسے زیادہ ہی زیادہ نقصان کا خدشہ ہے۔ جاپان کا سب سے پہلے یہ کام ہو گا کہ وہ چین کے ساحل کی ناکہ بندی کر دے۔ امریکہ کا بازار بند ہو جائیگا اور وہ بازار سارا کا سارا جاپان کے لیے کھل جائے گا۔ جاپان یہی چاہتا ہے۔ اسکے لیے چین ہی بہت کافی ہے۔

امریکہ کا بہت کچھ سرمایہ جاپان میں لگا ہوا ہے۔ امریکہ کے محکمۂ تجارت کے جمع کردہ اعداد و شمار کے مطابق ......۴۴۶ ڈالر امریکہ کے جاپان میں لگے ہوئے ہیں۔ جنگ ہونے کی صورت میں یہ سب کچھ ہاتھ سے جاتا رہے گا۔ جو مال و اسباب جاپان میں امریکہ کا ہے سب ضبط کر لیا جائیگا۔ اور جو روپیہ اُدھار ہے وہ سب مارا جائیگا۔ تقریباً سو جاپانی کارخانوں میں ......۶۲ ڈالر لگے ہوئے ہیں۔ جاپان کو خراب سال میں ......۱۳۴ ڈالر سے زیادہ کا تجارتی مال امریکہ سے جاتا ہے۔ سال اچھا ہو تو وہاں ......۲ ڈالر سے زیادہ کا مال کھپ جاتا ہے۔ چین کی ناکہ بندی ہو جانے سے پانچ اور دس کروڑ ڈالر کی درمیانی مالیت کی تجارت جاتی رہیگی۔ جاپان کا بھی اسی قسم کا نقصان ہو گا۔ سنہ ۱۹۳۱ء میں جاپان کی کُل برآمد کا ۳۷ فیصدی حصہ ریاستہائے متحدہ میں گیا جس کی مالیت ......۲۰۹ ڈالر تھی۔ وہ تجارت جاپان کے ہاتھ سے جاتی رہیگی۔

جاپان کا فائدہ اسی میں ہے کہ چین ترقی نہ کرے یا ترقی کرے تو اس حدتک کہ وہ اُسکے لیے خطرناک نہ ہو۔ چین مغربی ممالک سے ہوائی جہاز منگا رہا ہے۔ لیکن جاپان اسے چین بجبیں ہو کر دیکھ رہا ہے اور اندیشہ ہے کہ وہ ان منگائے ہوئے جہازوں کو چین میں نہ آنے دے۔ حالانکہ چین و جاپان ایک مذہب اور ایک نسل سے تعلق رکھتے ہیں لیکن چینی کچھ اور خمیر کے بنے ہوئے ہیں۔ اس ملک کی وسعت اور قدرتی ذرائع کی فراوانی کے باوجود وہ تنزل و بیکسی کے غار میں گرے ہوئے ہیں۔ اُن میں ملک کے لیے قربانی کا مادہ نہیں۔ علاوہ ازیں ملک میں اتنی قومیں اور فرقے آباد ہیں کہ ہندوستان کی طرح ملک کی تنظیم دشوار ترین امر ہے۔

جاپان کی نظر چین پر ہے اور چین ہی اُسکے لیے مشکلات کا منبع ہے۔ وہ چین کی حالت صرف اس حدتک سنوارنے کا حامی ہے جس سے وہ دول مغرب کا شکار نہ ہو لیکن خود اُسکے لیے کبھی خطرہ نہ بن سکے۔

چین کے بازاروں پر زیادہ تر جاپان کا قبضہ ہے اور مغربی مال و اسباب بھی کافی کھپ جاتا ہے لیکن اس نفع کے مقابلہ میں جنگ کا خرچ کہیں زیادہ ہے۔ ان سب باتوں کو دیکھتے ہوئے امریکہ و جاپان میں جنگ کا اندیشہ نہیں۔ امریکہ جنگجو ملک نہیں۔ اسکی تیاریاں بہت کچھ سہی لیکن جب جنگی روح اُس میں نہیں تو سارا سازوسامان بیکار رہے۔ یورپ کی جنگ عظیم میں بمصداق ع۔ زنداں کو چلے چل چل کر۔ امریکہ نے سالوں کے تذبذب کے بعد شرکت کی لیکن دھوم دھام کے مقابلہ میں عملی جنگی شرکت کچھ بھی نہ تھی۔ امریکہ نے اپنی تیاریوں کے باوجود روس سے معاہدہ بھی کرلیا ہے۔ لیکن امریکہ نے اس میں پہلو بچالیا ہے اور اسے محض قیام امن کا معاہدہ قرار دیا ہے۔ یعنی دونوں امن قائم رکھنے کے لیے ایک دوسرے کی مدد کرینگے لیکن اگر جنگ ہو جائے تو جنگ میں شرکت ضروری نہ ہوگی۔ ایک امریکی اہل الرائے لکھتا ہے:—

"ہمارے جدید تعلقات کا یہ مقصد نہیں ہے کہ اگر جاپان روس پر حملہ کرے تو ہم فوراً اُس کی مدد کو دوڑ پڑینگے۔ بلکہ اس کا مقصد صرف زیادہ خوش فہمی اور بہتر اشتراک عمل ہے۔"

اور اس کی تصریح یوں کی جاتی ہے:—

"اس اشتراک عمل کی دو شکلیں ہیں۔ آپس میں ہمارے تعلقات اس قدر عمیق ہوں کہ واقعات کا بغور مطالعہ کرتے رہیں۔ اگر منچوریا میں حالات نازک صورت اختیار کرلیں تو ہم سوویٹ سرداروں سے مشورہ کریں اور اُنکی جنگ روکنے کی کوششوں میں اُن کے مددگار ہوں۔ کیونکہ جاپان روس سے کبھی نہ کبھی خود چھیڑخانی کرے گا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ جنگ شروع ہونے پر روس میں اور ہم میں کوئی بدگمانی پیدا نہ ہونے پائے گی۔ ہم مشورہ میں شریک ہوتے رہنے کی وجہ سے جنگ کے اسباب سے واقف ہوں گے اور ہماری اخلاقی مدد روس کے حق میں ہوگی۔ ایسی مدد گو جنگ میں بیکار ہوتی ہے لیکن

جاپان پر اس کا معقول اثر پڑیگا، کیونکہ وہ ڈرتا رہے گا کہ کہیں امریکہ پیچھے سے اُس پر حملہ نہ کردے - ہماری مدد یہ ضرور ہوگی کہ روس ہمارے ملک سے رسد کے ذخیرے خریدیگا جو ہمارے موجودہ تعلقات پیدا ہونے سے پہلے ممکن نہ ہوتا -

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ امریکہ کی ذہنیت کس قدر ساہوکارانہ ہے - ایسے لوگ لڑا نہیں کرتے - زبانی چیخ پکار سے زیادہ ان سے کچھ بن نہیں پڑتا - معاہدہ کرکے بھی ان سے جب ان کے حلیف کو امداد کی توقع نہ ہو تو وہ بطور خود کیا خاک دائرۂ جنگ میں کودنا پسند کریں گے -

روس کا معاملہ جداگانہ نوعیت رکھتا ہے - جاپان جو کچھ طیاریاں کررہا ہے وہ صریحاً روس کے خلاف ہیں - وہ امریکہ کو خوب پہچانتا ہے - جاپان امریکہ سے لوہے کا ریزہ اور چورا برابر خرید رہا ہے - اور ہر سال اس کی مقدار بڑھتی جا رہی ہے - یہ چورا بم اور توپ کے گولے بنانے میں کام آتا ہے - ۳۲ء میں اس نے ۱۶۴۰۰۰ ٹن اور ۳۳ء میں ۵۴۷،۵۳۹ ٹن منگایا - ۳۴ء کے ابتدائی دو ماہ میں ۲۸۴۰۰۰ ٹن منگایا اور امید ہے کہ سال ختم ہونے تک ۱½ لاکھ ٹن منگا چکا ہوگا - ایسے اچھے گاہک سے امریکہ کیا بگاڑنے والا ہے - اور جاپان کو اگر امریکہ سے دو دو ہاتھ کرنے ہوتے تو وہ امریکہ سے یہ خرید و فروخت نہ کرتا - کیونکہ اس سے اُسکے کان کھڑے ہوتے - یہ تو سب کچھ روس کے لیے ہو رہا ہے -

جاپان تو یہ سمجھتا ہے کہ روس کے دل میں ۱۹۰۵ء کی جنگی شکست کی پھانس برابر کھٹک رہی ہے اور وہ اپنے بیڑۂ بالٹک کی تباہی کا انتقام لینے کا آرزومند ہے - اُس سے جنگ ضرور ہونی ہے - سوال صرف وقت کا ہے -

بیڑۂ بالٹک کی تباہی کے بعد روس کو آج تک بحری بیڑہ طیار کرنا میسر نہیں ہوا - اس لیے اُس نے ہوائی طیاریاں زبردست کرلی ہیں - وہ جاپان پر ہوا کی طرف سے ایسی ضرب لگانا چاہتا ہے جس سے وہ ڈگمگا جائے اور پاؤں زمین آپڑے - روس کا ہوائی مستقر ولاڈی واسٹاک میں ہے - اس میں اور جاپان میں ۳۵۰ سے ۷۰۰ میل تک لمبے پانی کا قطعہ حائل ہے - روسی ہوائی جہاز اس فاصلہ کو آسانی سے طے کرکے جاپان پر پھیل سکتے ہیں اور اپنے گولوں سے اسے تہ و بالا کرسکتے ہیں -

جاپان کی بحری اور بری طاقت بہت زیادہ ہے لیکن ہوائی طاقت کمزور ہے - روس کو جرمن ماہروں کی تربیت ملی ہے اس لیے اُس کی ہوائی جہازرانی میں کسی قسم کا نقص نہیں - جاپانی اچھے ہوائی جہازراں نہیں بنتے - اس کی وجہ ایک تو چاول ہے جو وہ بہت کھاتے ہیں - دوسرے اُن کی مائیں شیرخوارگی میں انکو کمر پر پنگوڑے میں باندھے پھرتی ہیں - اس کی وجہ سے اُن کے سر بہت جلد چکرا جاتے ہیں اور ہوائی جہاز

کے ایک خاص بلندی پر پہنچنے کے بعد اُن کے دماغ سرگرانی کی وجہ سے بیکار ہو جاتے ہیں۔ اس دماغی کمزوری کا اُنھیں بخوبی احساس ہے جسنے اس خیال کے ساتھ ملکے جو اُنکے دلوں میں روسی ہوائی برتری کا جما ہوا ہے انھیں بہت کچھ اُس سے مرعوب کر رکھا ہے۔ ان کا ہوائی بیڑہ کتنا ہی زبردست ہو یہ رعب اُنکے لیے خطرناک نتائج پیدا کرنے والا ہوگا۔ اسکے علاوہ جاپانی شہر ہوائی جہازوں کے حملوں کی بہت زیادہ زد میں ہیں۔ مکانات لکڑی اور کوٹے ہوے کاغذ کے ہیں جو چند بموں کے آپڑنے سے آن واحد میں آگ کی بھٹی کا نمونہ بن جائیں گے۔

روسی ہوائی سپہ سالار کلیم وروشیلو کہتا ہے کہ مجھے ہوائی طاقت پر بھروسہ ہے اور میں جاپان سے صرف ہوا میں ہی لڑونگا۔ جاپان نے اگر ہم پر حملہ کیا تو اس کے لشکروں کا مقابلہ کرنے کی ہمیں مطلق ضرورت نہیں، بلکہ ہم خود اُسکے شہروں پر ٹوٹ پڑیں گے۔

اگر جاپان پر ہوا کی طرف سے زبردست حملہ ہوسکے اور وہاں کی آبادی کی اخلاقی حالت برباد کی جاسکے تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اُسکی بحری اور بری طاقت سب دھری رہ جاتی ہے اور جنگ کا خاتمہ آن واحد میں ہو جاتا ہے اور جاپان فاتح کے قدموں پر ناک رگڑتا نظر آئیگا۔ نظر بریں جاپان نے ہوائی جہازوں کے بنانے کا کام مستعدی سے جاری کر رکھا ہے۔ بظاہر ان چوکوئی ریاست کو اسلحہ طیار کرکے دینے کے لیے ۴۰ ہزار جاپانی نوجوان گزشتہ چند ماہ میں کارخانوں میں لگادیے گئے ہیں۔ جلی سے شورے کے لدے ہوے جہاز پر جہاز منگائے جارہے ہیں۔ نوجوانوں کو ہوائی حملہ کرنے کے طریقے سکھائے جا رہے ہیں۔

روس جاپان سے زیادہ تیزی اور مستعدی سے اپنا ہوائی بیڑہ مضبوط کرتا چلا آرہا ہے۔ وہ اپنے بیڑے میں بڑے بڑے تین تین چار چار، پانچ پانچ انجن والے دور کی مار کرنے والے بمبار جہاز تعمیر کرنے میں منہمک ہے۔ جاپان محض لڑائی کے جہاز چھوٹے چھوٹے بمبار جہاز اور ہوائی جہازوں پر زمین سے نشانہ لگانے والی توپیں طیار کرنے میں مصروف ہے روس کو اپنے ولاڈی واسٹک کے ہوائی مستقر میں ہوائی جہاز تین سے پانچ ہزار میل کا فاصلہ طے کرکے لانے پڑینگے اور جاپان کو اسکے مقابلہ میں یہ فائدہ ہوگا کہ ایک چھوٹے سے حلقہ میں اس کا سب کچھ سامان حرب جمع ہوگا۔

جاپان ولاڈی واسٹک پر ہوائی اور بحری حملے کرکے قبضہ میں لانے اور منچوریہ سے اپنی بری فوجوں سے گھیر اڈالنے کی کوشش کرے گا۔ اگر وہ سائبریا ریلوے کے شمالی حصہ کو اُن کمزور مقامات پر جو بیکال اور ولاڈی واسٹک کے درمیان متعدد واقع ہیں قطع کردے تو روس کی ساری رسد بند ہو جائیگی۔ اس کا روسیوں کو بخوبی احساس ہے۔ اسی لیے وہ اپنی ہوائی طاقت کو بہت ہی مضبوط کرنا چاہتے ہیں، تاکہ دشمن پر جارحانہ کارروائی کے علاوہ اس سے مدافعت بھی کی جاسکے۔

اس نے آٹھ ہزار جہاز اور ۱۲ ہزار انجنوں والے جہاز اسی سال مکمل کر لینے کا عزم کر لیا ہے۔ یہ دنیا میں سب سے بڑا ہوائی بیڑہ ہوگا۔ سابقہ جنگ عظیم میں اس سے کہیں زیادہ جہاز متخاصمین کے پاس تھے۔ جرمنی نے جنگ کے چار سالوں میں ۴۴ ہزار ہوائی جہاز اور ۴۸ ہزار موٹر والے جہاز تیار کیے اور ۱۹۱۸ء کے اکتوبر میں یعنی جنگ کے آخری مہینے میں ۲۲ سو جہاز اور ۹ سو موٹر والے جہاز بنائے تھے۔ یہ سولہ سال پہلے کا ذکر ہے۔ اب تو ہر چیز ترقی پر ہے۔ اب طیاری پہلے سے زیادہ زبردست ہو سکتی ہے۔

امریکہ کے پاس اس وقت ہر قسم کے آٹھ ہزار ہوائی جہاز ہیں۔ روس کا ارادہ ہے کہ آٹھ ہزار جہاز پورے کرلے جن میں سے دو ہزار کئی کئی انجنوں کے رکھے جائیں۔ اُس نے دو لاکھ ہوا بازوں کی تربیت کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ جہاز ماسکو۔ لینن گراڈ۔ ٹیگن روگ۔ چارکو۔ نجنی نوگراڈ۔ پرم وغیرہ میں رکھے جائیں گے۔

منچوریا کی سرحد کے پاس پاس سائبریائی ریلوے کی پٹری پڑی ہوئی ہے۔ روس کے ایشیائی مقبوضات کا اس پر انحصار ہے۔ منچوکو کے اندر سرحد کے برابر چینی مشرقی ریلوے بنی ہوئی ہے۔ اس میں روس کے ۵ کروڑ پونڈ لگے ہوئے ہیں۔ روس نے اسے جاپان کے ہاتھوں بیچ ڈالنا چاہا تھا۔ اور سال بھر ہوا جاپان اور روس میں اس بارے میں بہت کچھ جھگڑا ہوا مگر روس نے مطلق اپنی طبیعت میں جوش نہیں آنے دیا۔ وہ نہایت سکون سے جاپان کی چھیڑ خانیوں کو برداشت کر رہا ہے۔ کوئی اور ملک ہوتا تو جاپان کی ان آتش افروزیوں پر نعل در آتش ہو جاتا۔ لیکن روس اپنی نام نہاد وحشت و خونخواری کے باوجود حلم آمیز اغماض سے کام لے رہا ہے۔ اس ریل کے روسی منیجر نے اپنے ریلوے محافظوں پر مفروضہ مانچوکا والوں کے ۲۰۰ مسلح حملے شمار کر کے بتائے۔ جس کا جواب جاپان نے یہ دیا کہ اس ریل کے چھ ملازموں کو جھٹ پٹ جیل خانہ میں بند کر دیا۔ اسکے علاوہ اس ریل سے جاپانی فوجیں آتی جاتی رہتی ہیں۔ باربرداری وغیرہ کے متعلق لاکھوں بل جاپان کے ذمہ ہیں۔ اُس نے ایک حبہ ادا نہیں کیا اور نہ کبھی ادا کرے گا۔ اس ریل کے معاملات کی کشیدگی کے علاوہ سائبریا میں مچھلیاں پکڑنے کے سلسلہ میں تعلقات نازک رہتے ہیں۔ ماہی گیری جاپان کا آج کل بھی بڑا ذریعہ معاش ہے۔ سائبریا کی مچھلیوں کے علاقوں کے کرایہ کی ادائگی کے متعلق جاپانی ماہی گیر ہر سال روسیوں سے جھگڑا کرتے رہتے ہیں۔ جن علاقوں کو کرایہ پر نہیں لیا جاتا جاپانی باقاعدہ اُن میں چوری چھپے مچھلیاں پکڑ پکڑ کے لیجاتے ہیں۔ اور اُن پر روسی ساحل سے گولیاں برسائی جاتی ہیں۔ اگر جاپان کو اپنی طاقت پر بھروسہ ہوتا تو وہ اسی بات پر فوراً روس کی گردن ناپنے کو کود پڑتا۔

قدرتی طور پر سوال پیدا ہوتا ہے آخر جاپان و روس میں بنائے مخاصمت کیا ہے۔ اُس کو یقین ہے کہ جس طرح جاپان نے مانچوکو پر قبضہ کر لیا ہے اسی طرح وہ سائبریا کا نصف مشرقی حصہ بشرطیکہ اُس کا بس چل جائے

ضرور ہتھیا لینا چاہتا ہے۔ روس نے جاپان کے مانچوکو پر قابض ہونے پر دم نہیں مارا لیکن وہ بیرونی منگولیا میں اس کی دست برد کو مطلق برداشت نہ کرے گا۔ یہ علاقہ خود مختار جمہوریت ہے اور بیرونی اثرات سے یکسر پاک ہے۔ خانہ بدوش قبیلوں پر موروثی شہزادے حکمراں ہیں لیکن اس علاقہ پر سویٹ نگرانی قائم ہے کیونکہ اس سے سائبریا کی سرحد کی حفاظت لازم آتی ہے۔ نقشہ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سائبریا کو جانے والی ریل سرحد کے برابر برابر چلی جاتی ہے۔ جاپانی فوجیں بیرونی منگولیا کی مشرقی حد تک جا پہنچی ہیں، اور اسکے جاسوس سونا تلاش کرنیوالوں تیل کے تاجروں اور سیاحوں کے بھیس میں سرحد پار جا چکے ہیں۔ اور وہ یہاں کے شہزادوں کو رشوتیں دے دے کے توڑنے کی کوشش میں رہتے ہیں۔ روس کو یقین ہے کہ جب موقع ملیگا جاپانی فوجیں ضرور بڑھیں گی۔ اگر وہ اچانک شمال کی طرف پلٹ جائیں تو جھیل بیکال کے پاس ریل کا سلسلہ منقطع کرکے روس پر کاری ضرب لگا سکتی ہیں۔ ریل کا سلسلہ ایک دفعہ جہاں ٹوٹا مشرقی سائبریا کا حصہ جاپان کی مٹھی میں آجائیگا اور روس کو پیچھے ہٹ جانا پڑے گا۔ جاپان کو سائبریا کے مشرقی حصہ کی اس لیے ضرورت ہے کہ جھیل بیکال سے ساحل سمندر تک زرخیز اور گھاس سے لبریز میدان پھیلا ہوا ہے جس کو کاشت میں لانے سے جاپان کی روز افزوں آبادی کے لیے کافی سے زیادہ خوراک پیدا کی جا سکتی ہے۔ جاپان کی آبادی روس سے نصف ہے لیکن اس کے پاس زمین کا روس کے مقابلہ میں صرف تیرھواں حصہ ہے۔

اس پیش آنے والے تصادم کے لیے روس جان توڑ تیاریاں کررہا ہے۔ چونکہ یہ سائبریا والی ریل کسی بڑی جنگ میں ضروریات رسد رسانی و بار برداری کے لیے کافی نہیں ہو سکتی اس لیے روس جلد سے جلد اس کی دوہری پٹری ڈال رہا ہے۔ اس اثنا میں دو لاکھ سرخ فوج جھیل بیکال سے ولاڈی واسٹک تک سرحد کے لگی لگی پھیلتی چلی گئی ہے۔ اسکے علاوہ وہ آرخینگل سے بحیرۂ اوخوٹسک تک ایک اور اندرونی ریل بنانے کی فکر میں ہے تاکہ سائبریا والی ریل کے ہاتھ سے نکل جانے کی صورت میں وہ اس سے کام لے سکے۔

وہ سامان حرب کے لیے کسی دوسری سلطنت کا محتاج نہیں ہونا چاہتا۔ ہر چیز ہوائی جہازوں سے لے کے گولیوں تک وہ اپنے ملک میں بنوا رہا ہے۔ کلم نے ایک تقریر کی جس پر خوب نعرہائے تحسین بلند ہوئے۔ اسکا مطلب یہ تھا کہ جاپان سے جنگ ضرور ہوگی اور وہ زبردست ہوگی۔ ہم مشرق بعید کا ایک ایک انچ ہر قربانی پر اپنے قبضہ میں رکھیں گے اور یہ حقیقت ہے کہ ہم ضرور اسے قبضہ میں رکھیں گے۔

جس وقت جاپان نے اپنا ہوائی بیڑا اس حد تک طیار کرلیا جو وہ روس کی لڑائی کے لیے ضروری سمجھتا ہے یا روس نے جب سائبریا والی ریل کی دوہری پٹری بنالی جنگ شروع ہو جانے کا پورا امکان ہے۔

اب ہمیں دوسری تماشاگاہ جنگ پر نظر ڈالنی چاہیے۔ جنگ عظیم کا خاتمہ ہونے پر معاہدۂ ورسیلز سے جرمنی کی قطع و برید

کی گئی ۔ اسے فوج رکھنے کی ممانعت کی گئی ۔ اسکے بعض علاقے فرانس و پولینڈ کو دیدیے گئے۔ اُسکے سر پر تاوانِ جنگ کا بھاری بوجھ رکھ دیا گیا۔ اتحادی کہتے رہے ہیں کہ اس جنگ میں جرمنی کو شکست فاش دی گئی۔ لیکن جرمنی کا مقولہ یہ ہے کہ ہم جنگ کے آغاز کے ذمہ دار نہیں اور نہ ہمیں شکست دی گئی ہم فاتحانہ دوسرے ملکوں پر قابض تھے کہ حریفانہ سازباز سے ہماری پشت میں خنجر اتار دیا گیا ہمیں ہمارے ملکی غداروں نے جنگ کے خاتمہ پر مجبور کیا ۔ ان باتوں نے جرمنی میں ۱۹۱۸ء سے اب تک برابر ایک خاص قسم کی بےچینی جاری رکھی ہے ۔ جب سے ہٹلر برسراقتدار آیا ہے اس بےچینی میں شدت پیدا ہو گئی ہے ۔ اور اس نے ہر ممکن طریقے سے اسکی مخالف ورزی کی ہے ۔ ہٹلر ہنڈنبرگ سے بڑا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ اس بڈھے جرنیل کی مشہور شاہ پسندی کے باوجود قیصر واپس نہیں آسکا ۔ اس خاندان کی تصویریں اس کی میز پر البتہ آخر دم تک رہیں، لیکن یہ کوئی قابل تعریف کام نہ تھا ۔ بیشک اس نے مرتے مرتے قیصر کو اپنی وفاداری کا یقین آخری پیام کے ذریعہ دلایا۔ لیکن اس کے زمانہ میں جرمنی میں آہنی خلیج اسپرٹ پیدا نہ ہوسکی جو ہٹلر کے صرف چند روزہ اقتدار میں پیدا ہو گئی ہے ۔ اب قیصر کے زمانہ کی سی چہل پہل اور جنگجوئیت چاروں طرف نظر آرہی ہے اور یورپ گھبرا گھبرا کے اسے دیکھ رہا ہے ۔

مسٹر بالڈون نے دارالعوام میں مسٹر چرچل کے جواب والی تقریر سے پہلے ایک تقریر کی تھی جس میں جرمنی سے اپیل کی تھی کہ وہ اسلحہ بندی کے متعلق اپنے دعاوی کھلے طور پر پیش کرے کیا یہ اپیل معاہدۂ ورسیلز کی نامعقولیت کا اقبال نہیں ؟ دوسرے الفاظ میں جرمنی کے اسلحہ بند ہونے پر احتجاج تو کیا نہیں جاتا، اس سے التماس کی جاتی ہے کہ اسے اپنے دعاوی کے متعلق جو کچھ کہنا ہو صاف صاف کہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ جرمنی خفیہ خفیہ مسلح ہو رہا ہے ۔ کیونکہ برطانیہ اطالیہ اور دیگر دول جرمنی کے مساوات کے دعوے کی دبی زبان سے تائید کرتے رہے ہیں لیکن فرانس کو جرمنی کے یہ دعوے ایک آنکھ نہیں بھاتے ۔ جرمنی نے برطانیہ وغیرہ کی خاموش رضامندی سے حوصلہ پا کے اپنے آپ کو زیادہ سرگرمی سے مسلح کرنا شروع کر دیا۔ ۶ کرور افراد کی ایک زبردست اور مغرور قوم سے ہمیشہ کے لیے اپنے پڑوسی کا غلبہ برداشت کرنے کی توقع کرنا عقلمندی سے بعید ہے۔

فرانس کا جرمنی سے ڈرنا بجا ہے لیکن امن کی خواہش میں اس پر جنگی غلبہ قائم رکھنا تدبر کے منافی ہے۔ وہاں بیکلی ہونی ضروری تھی جو شروع ہو گئی ۔ اگر تدبر و دانشمندی سے قیام امن کی کوشش کی جائے تو نتائج اچھے اور معقول رونما ہو سکتے ہیں ۔ جمعیۃ الاقوام نے تخفیف اسلحہ کے سلسلہ میں جو کچھ کیا اس سے اسکی غیر معقولیت کا ثبوت ملتا ہے ۔ اس نے بھی بار بار معاہدۂ ورسیلز کی لفظاً و معناً تعمیل پر زور دیا ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جاپان کی طرح جرمنی نے بھی اسے ٹھکرا دیا ۔ جمعیۃ کو فرانس نے اپنی آرزوؤں کا آلۂ کار بنایا ، اس لیے وہ اپنے مقصد میں

ناکام ثابت ہوئی۔ فرانس کے علاوہ دوسرے دول جرمنی کے مسلح ہونے پر معترض نہیں۔ اُن کے کان صرف اس کی عجلت اور اخفا سے کھڑے ہوئے ہیں کیونکہ جرمنی نے زرتاوان ادا کرنے سے اس وجہ سے انکار کیا کہ اُس کا ادا کرنا اُس کی طاقت سے باہر ہے لیکن اسلحہ جات کی طیاری میں بڑی بڑی رقمیں خرچ کرنے کی اس میں طاقت کہاں سے آگئی۔ اس متضاد طرز عمل کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہے، جسکے لیے جرمنی طاقتور جنگی کل طیار کر رہا ہے۔

اب سار کے صوبہ میں رائے شماری ہونے والی ہے[ل] کہ وہ جرمنی کو واپس جانا چاہتا ہے یا اپنی موجودہ حالت پر خوش ہے۔ دنیا کو یقین دلایا گیا کہ یہ صوبہ فرانسیسیوں سے آباد ہے لیکن اب واقعات جرمنی کے دعوے کی تائید کر رہے ہیں کہ اس میں جرمنوں کی آبادی زیادہ ہے۔ انکی تعداد آٹھ لاکھ سے زیادہ ہے۔ فرانس کی جانب سے باقاعدہ دنیا کو یقین دلانے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ اس علاقہ پر فرانس کا تاریخی حق ہے۔ لیکن امریکہ والے بھی اب اس طریقہ سے واقف ہوگئے ہیں ڈاکٹر آوڈوائی لمینگ نے ایک طویل مضمون میں لکھا ہے کہ ہمیں السیس لورین صوبوں کے متعلق بے وقوف بنایا گیا کہ وہ فرانس کے صوبے ہیں جنھیں جرمنوں نے زبردستی اپنے ملک میں ملا لیا۔ دراصل وہ جرمنی کے ہی صوبے ہیں۔ وہاں جرمنوں کی آبادی ہے۔ ہمیشہ امریکہ جرمنی کا ہم خیال رہا لیکن پریزیڈنٹ ولسن پر ریشہ دوانی کا اثر ہوا اور رفتہ رفتہ امریکی رائے جنگ عظیم کے آخر میں جرمنی کے خلاف ہوگئی جس کا نتیجہ صدر مذکور کے ۱۴ نکات کی شکل میں ظاہر ہوا۔ اور وہ جرمنی کو لے بیٹھے۔ اب ہماری آنکھیں کھل گئی ہیں اور آیندہ ہم پہلے کی طرح بے وقوف نہ بنائے جا سکیں گے۔ سار جرمنی کا ہے اور اندیشہ ہے کہ غیر دانشمندانہ طریقہ سے اس معاملہ کا سرانجام دوسری جنگ کا پیش خیمہ نہ ہو جائے۔

حکومت برطانیہ نے معاملہ کی نزاکت کا خیال رکھتے ہوئے فرانس اور جرمنی کی رضامندی سے اپنی فوج وہاں تعینات کرنے کا فیصلہ کیا ہے تاکہ رائے شماری کے زمانہ میں کسی قسم کا تصادم نہ ہونے پائے۔ اس فوج کے علاوہ کوئی سپاہی جرمنی کا ہو یا فرانس کا وہاں اس انتظام کے کام پر مامور نہ ہوگا۔ ہر سلطنت ڈر رہی ہے کہ کوئی ایسا واقعہ رونما نہ ہونے پائے جس سے جنگ کے شعلے بھڑک کے سب کو اپنے آغوش میں لے لیں۔ جنگ کوئی نہیں چاہتا، لیکن ہر ایک اپنے سایہ سے ڈر رہا ہے اور اسکی وجہ سے طیار ہو رہا ہے۔ اس کا ثبوت مجلس تخفیف اسلحہ کی کارروائیوں سے ملتا ہے کہ اسکے جلسوں میں جو تقریریں تخفیف کے حق میں کرتے تھے اپنے گھر جا کے وہی مسلح ہونے میں زیادہ سرگرم نظر آتے تھے۔ سال گزشتہ یورپ نے تین ارب ڈالر جنگی طیاریوں پر صرف کیے ہیں اور یہ وہ زمانہ ہے جبکہ اقتصادی بحران کا رونا ہر جگہ رویا جا رہا ہے۔

[ل] رائے شماری ہوگئی اور سار کے باشندوں نے جرمنی سے الحاق کا فیصلہ کیا جسے مجلس اقوام نے بھی تسلیم کر لیا۔ ایڈیٹر

پچھلے دنوں آسٹریا کے چانسلر ڈولفس کے قتل کر دیے جانے پر ایسی حالت پیدا ہو گئی تھی کہ جنگ کا ڈر تھا۔ مسولینی نے اپنی فوجیں آسٹریا کی سرحد پر بھیجدی تھیں تاکہ وہ جرمنی کے خلاف اسکی حمایت میں نقل و حرکت کریں۔ اس کے بعد فرانس میں یگوسلاویہ کا بادشاہ مارا گیا۔ یہ واقعہ بالکل ویسا ہی تھا جس پر سنہ ۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم شروع ہوئی تھی۔ یہ جنگ عظیم کی بارود کے لیے ایک شرارہ کا کام دینے والا حادثہ تھا لیکن ابتدائی جوش یورپ کی خوش قسمتی سے ہنگری اور یگوسلاویہ کی باہمی سب و شتم میں منتقل ہو گیا۔ اب یہ معاملہ جینوا میں پیش ہے۔ یگوسلاویہ ہنگری پر اپنے بادشاہ کے قتل کا الزام لگا رہا ہے اور ہنگری انکار کر رہا ہے۔ نوبت یہاں تک پہنچ رہی ہے کہ جمعیتہ کے ایک جلسہ میں یگوسلاویہ کے سفیر نے بیان کیا کہ ہنگری سرحد سے گزشتہ چھ سال میں بیس دہشت انگیز حرکات یگوسلاویہ کے حدود میں سرزد ہوئی ہیں۔ تحقیقات سے پایا گیا کہ انکے بانی ہنگری سے خفیہ طور پر آئے۔ یہاں انھوں نے خاص تربیت حاصل کی تھی۔ ہنگری کے سفیر نے نہایت درشت لہجہ میں اس الزام کی تردید کی کہ یہ بے بنیاد کذب و دروغ کا طومار اور اتہامات کا تار و پود ہے۔ ان حالات میں جنگ کا چھڑ جانا بعید از قیاس نہیں۔

ترکی کو دیکھیے۔ وہ درہ دانیال کو جلد جلد مستحکم کر رہا ہے اور بلغاریہ اور ہنگری بھی اپنی طاقت بڑھا رہے ہیں۔ اٹلی میں ٹیکس بڑھ گئے ہیں۔ مسولینی نے بحری بیڑہ کے لیے ..... فوج اور ہوائی بیڑہ کے لیے اتنی ہی رقم مانگی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہوائی جہاز اتنی کثرت سے ہمارے پاس ہونے چاہییں کہ آسمان میں چھا کے سورج کی دھوپ ہم تک نہ آنے دیں۔ اور اطالوی اس قدر طیار رہوں کہ جس وقت انھیں آواز دی جائے وہ فوراً لبیک کہتے ہوے میدان میں آ جائیں۔

برطانیہ نے ۱۴ مزید ہوائی دستے طیار کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ مسٹر بالڈون نے مسٹر چرچل کے جواب میں جو تقریر کی اس میں بتایا کہ جنگ چھڑنے پر کوئی ہم کو غیر طیار نہ پائے گا۔ مادر وطن کی حفاظت کے لیے ۲۲ دستے اور بحری بیڑہ کے لیے ۳ دستے ۳۶-۱۹۳۵ء تک بن جائیں گے اور تین سو ہوائی جہاز کا مزید اضافہ ہو جائیگا۔

فرانس نے ظاہر کیا ہے کہ جرمنی تین لاکھ سپاہی طیار کر رہا ہے اور اسکے پاس ہوائی جہاز ایک ہزار کے قریب ہیں۔ جرمنی کے مشہور مدبر ہیپن نے ایک تقریر میں کہا کہ مرد کے لیے جنگ میں لڑنا مرنا ایسا ہی ہے جیسے عورت کے لیے بچوں کا پالنا پوسنا۔

اس وقت یورپ کی شامت اعمال قوم پرستی کا جذبہ ہے۔ ایک نسل دوسری نسل سے نفرت کرتی ہے۔ یہ جذبہ جنگ عظیم میں پیدا ہوا اور اس کے بعد سے برابر بڑھ رہا ہے۔ یہ اسی جذبہ کا نتیجہ تھا کہ جرمنی نے اپنے ملک سے یہودیوں کو نکال دیا۔ ہٹلر اپنی غیر مخلوط آریا نسل کی حمایت پر جان لڑانے کے لیے سر سے کفن باندھے کھڑا نظر آتا ہے۔ یہ نسلی امتیاز کا نفرت انگیز جذبہ دنیا کی تباہی کا باعث ہوگا۔ اسلام نے ہی اس امتیاز کی نفی کی ہے

اور اُس کے احکام کی خلاف ورزی کا ایک ادنیٰ نمونہ اب یورپ و امریکہ کی حالت ہے اور اس کا پرتو ایشیا پر بھی پڑ رہا ہے۔

جرمنی کی طیاریاں اس وقت اس قدر مکمل معلوم ہوتی ہیں کہ صاف ظاہر ہے کہ اس نے ۱۹۱۴ء والی جنگ کے تجربات اپنے پیش نظر رکھے ہیں۔ اُس وقت اسے مطلق گمان نہ تھا کہ جنگ اتنا طول کھینچے گی۔ بلجیم اگر سدِ راہ نہ ہو جاتا تو جرمن محکمۂ جنگ کا یہ اندازہ بالکل درست تھا کہ پیرس پر بہت جلد قبضہ ہو جائیگا۔ اور فرانس زمین پر آ پڑیگا۔ اسکے بعد انگلستان کو دبا لینا کچھ مشکل نہ ہوگا۔ لیکن حالات برعکس ہوئے اور جرمنی کو آخر بلجیم کی تاخیر سے شکست نصیب ہوئی۔ لیکن وہ اس شکست پر بھی فخر کرتا ہے کہ دنیا بھر کی چیدہ سلطنتوں کے مقابلہ میں کوئی سلطنت چار سال تک اس پامردی سے جنگ نہ کرسکتی تھی۔ آیندہ جنگ کے لیے اس کی طیاریوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے وقت کا اندازہ بھی رکھا ہے۔ وہ فرانس کو اپنا دشمنِ جانی سمجھتا ہے۔ اُسکو پچھاڑنے کے بعد وہ انگلستان کے جنوبی حصہ کو پامال کر دینا کچھ مشکل کام نہیں سمجھتا۔ وہ سمجھتا ہے کہ پھر پورے جزیرہ کا قصہ بھی پاک کرنا آسان ہوگا۔ وہ آیندہ جنگ میں ایسے وسائل اختیار کرنے کی کوشش کریگا جن سے جنگ بہت جلد ختم ہو جائے۔ مثلاً ہوائی بیڑہ کسی ملک پر چڑھ جائے اور متعدی امراض کے جراثیم والے بم زمین پر پھینک کے آن واحد میں مخلوق کو جاں بلب کر دے۔

جنگ کے جوش میں اس وقت جرمنی وہی غلطی کر رہا ہے جو بسمارک کے بعد اس سے سرزد ہوئی۔ فرانس سے جنگ ہونے کے بعد جرمنی نے دیکھا کہ فرانس میں توانائی جلد جلد عود کر رہی ہے اور ایک نئی جنگ ضرور ہوگی۔ بسمارک نے آسٹریا اور روس سے معاہدے کر لیے۔ فرانس اکیلا رہ گیا۔ اس نے ترکیبوں سے فرانس کو اُبھارا کہ وہ نوآبادیات کے لیے جارحانہ کارروائی کرے۔ اس سے اس کا مقصد یہ تھا کہ اسکا تصادم انگلستان سے ہو جائے۔

معاہدہ تو روس و آسٹریا سے ہو گیا لیکن ان دونوں سلطنتوں کے مفاد بلقان میں ٹکراتے تھے اور یہ دوستی پائدار نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن جب تک بسمارک زندہ رہا اُس نے اپنی لیاقت اور ہوشمندی سے معاہدہ برقرار رکھا۔ مگر اسکے مرنے کے بعد اسکے جانشین اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اُنہوں نے آسٹریا سے زیادہ پینگ بڑھائے۔ جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ آسٹریا کی وجہ سے جرمنی کو بلقان کے معاملات میں جن سے اُسے کسی قسم کی دلچسپی نہ تھی ملوث ہونا پڑا۔ اور اسکے جواب میں روس نے برافروختہ ہو کے فرانس سے رشتۂ محبت جوڑ لیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب فرانس اور انگلستان کے تعلقات اس قدر کشیدہ تھے کہ کسی کو وہم و گمان بھی نہ ہو سکتا تھا کہ یہ دونوں سلطنتیں کبھی ایک دوسرے کے گلے لگ جائیں گی۔ فرانس کو نومبر ۱۸۷۰ء کی شکست کے بعد جرمنی

کا اس قدر رعب چھا گیا تھا کہ وہ بالکل ہمت ہار گیا تھا اور اپنی نجات اسی میں سمجھنے لگا تھا کہ جرمنی کی فوقیت تسلیم کی جائے اور اس سے ٹکر نہ لی جائے۔ لیکن ۹۸ء میں ڈلکاسی کے فرانس کے وزیر خارجہ بننے پر اس کی حکمت عملی میں تبدیلی آگئی۔ وہ اور اسکے ہم خیال نو آبادیات کے حامی ضرور تھے لیکن انھوں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ یہ توسیع انگلستان کی رقابت میں ہی پڑ سکتی ہے۔ مخالفت سے بربادی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کی بحری قوت پھیلی ہوئی ہونے کی وجہ سے فرانسیسی نو آبادیاں انگریزوں کے رحم پر موقوف ہونگی چنانچہ اسکے زمانہ میں انگلستان سے معاہدہ ہوا۔ لیکن دو تلواریں ایک نیام میں نہ رہ سکتی تھیں۔ کیونکہ انگلستان روس سے بدظن تھا اور اُسے یقین تھا کہ اس کا دانت اس کے ایشیائی مقبوضات پر ہے۔ انگلستان کا معاہدہ جاپان سے تھا۔ جنگ روس و جاپان چھڑ گئی اور فرانس کا معاہدہ معرض خطر میں پڑ گیا۔ روس کا بیڑہ بالٹک بحر الکاہل کو روانہ ہوا اور راستے کو کوئلہ وغیرہ رسد فرانسیسی بندرگاہوں سے حاصل ہوئی جو انگلستان جاپانی معاہدہ کی وجہ سے برداشت نہ کر سکتا تھا۔ جاپان نے صرف لفظی اعتراض کیا اور زیادہ زور نہ دیا اس وجہ سے کہ اسے یقین تھا کہ بیڑہ کو آنے دو اس کا تیا پانچہ کر دیا جائیگا۔ چنانچہ سوشیما کی فتح نے اس خیال کی تائید کر دی۔ فرانسیسی مدد روس نے انگریزوں کو برہم نہ ہونے دیا۔ اتفاق سے انھیں ایام میں ڈوگر بنک پر روسی جہازوں نے انگریزی ماہی گیر کشتیوں کو گولیوں کا نشانہ بنایا اور پھر لطف یہ کہ وہ جہاز زخمیوں اور ڈوبتوں کو یوں ہی چھوڑ کے اپنے مستقر پر واپس چلے گئے۔ روس و انگلستان میں جنگ چھڑتے چھڑتے رہ گئی۔ کیونکہ ڈلکاسی اور اسکے سفیر متعینہ لندن کیمبن کی کوششوں سے معاملہ ایک پنچایت کے سپرد کیا گیا۔

اسکے بعد مراکو میں الجھنیں پیدا ہوئیں۔ اُس وقت فرانس و انگلستان کے تعلقات استوار ہوئے ایک معاہدہ کی رو سے انگلستان نے فرانس کو مراکش میں اور فرانس نے انگلستان کو مصر میں من مانی کارروائی کرنے کی آزادی دیدی۔ اسکے بعد قیصر نے بندر اغادر کے معاملہ میں لڑنے کی دھمکی دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ الجیرین کانفرنس کے نام سے ایک مجلس میں باہم معاملات طے ہوئے جن کے نتیجے روس انگلستان اور فرانس کے وہ معاہدے تھے جو ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم میں کام آئے۔

وہی اب ہو رہا ہے۔ ہٹلر کا جوش و خروش اطالیہ کو اس سے بیگانگی کا سبق دے رہا ہے۔ اور روس بھی فرانس کی گود میں آ پڑا ہے۔ یہ تازہ خبر ہے کہ ضرورت کے وقت روس نے اپنی فوج فرانس کے حوالہ کر دینے پر آمادگی ظاہر کی ہے۔

یورپ کا مطلع اس وقت نہایت غبار آلود ہے۔ ذیل کے نقشے سے مختلف ملکوں کی جنگی مستعدی کا

اندازہ کیا جا سکتا ہے ان اعداد و شمار میں کمربستہ اور محفوظ فوجیں شامل ہیں :-

سنہ ۱۹۱۳ء

	مرتبہ فوج	خرچ
روس	۵۴۰۰۰۰۰	۷۹۶۳۸۷۶۱
فرانس	۵۳۰۰۰۰۰	۴۰۴۲۹۲۲۴
برطانیہ	۸۰۳۱۲۸	۲۸۶۶۶۲۳۰
اطالیہ	۳۳۸۰۰۰۰	۱۶۰۰۵۰۴۲
امریکہ	۲۱۳۴۴۵	۱۸۸۴۵۸۰۹
جاپان	۱۴۰۰۰۰۰	۹۴۰۷۵۶۲
رومانیہ	۵۸۰۰۰۰	
بلجیم	۳۴۰۰۰	
یونان	۱۵۰۰۰۰	
پرتگال	۱۵۰۰۰۰	
جرمنی	۵۴۰۰۰۰۰	۵۸۶۵۷۸۳۱
اسٹریا ہنگری	۳۶۰۰۰۰۰	۴۷۰۳۷۸۰۹
ترکی	۱۹۲۸۷۱۵	
بلغاریہ	۴۵۰۰۰۰	
میزان	۲۹۰۹۵۲۸۸	۲۶۰۰۵۷۰۶۷ پونڈ

سنہ ۳۴ء

	مرتبہ فوج	ہوائی جہاز		اخراجات
روس	۱۶۲۱۰۰۰۰	۷۵۰	سنہ ۳۱ء	۲۲۳۷۶۳۴۰۰ پونڈ
فرانس	۶۹۵۲۲۱۳	۳۰۰۰	سنہ ۳۳ء	۱۱۰۷۰۲۳۲۸
برطانیہ	۱۱۴۱۹۸۷	۱۴۳۴	سنہ ۳۴ء	۵۵۶۱۸۲۸۸
اطالیہ	۶۴۹۵۵۳۵	۱۵۰۷	سنہ ۳۴	۵۵۴۱۴۲۸۹

امریکہ	۴۴۴۹۶۱	۲۳۵۱	سنہ ۳۳ء	۵۵۴۱۰۰۷۶
جاپان	۲۱۷۷۰۰۰	۱۹۳۹	سنہ ۳۲ء	۶۱۰۳۸۰۸۰
رومانیہ	۱۶۰۰۸۲۷	۷۹۹	سنہ ۳۳ء	۱۱۲۷۵۱۶۹
بلجیم	۵۸۴۲۲۴	۱۹۵	″	۸۰۰۸۶۶۵
یونان	۵۸۳۴۵۰	۱۲۰	سنہ ۳۲ء	۵۲۱۳۱۲۰
پرتگال	۴۱۹۸۰۰	۱۳۰	سنہ ۳۳ء	۴۷۱۷۳۱۸
جرمنی	۱۱۰۰۵۰۰	(نامعلوم)	″	۳۸۸۰۰۰۰۰
آسٹریا	۳۰ ہزار		″	۳۸۰۸۰۰۰
ہنگری	۳۵ ہزار		″	۵۲۶۱۳۴۰
ترکی	۶۶۵۸۰۰	۵۰		
بلغاریہ	۳۳ ہزار			
میزان	۳۸۴۷۲۳۹۹۷	۱۲۲۷۵		۶۲۳۹۰۳۰۰۷۴ پونڈ

مفت رسالے

انجمن رفیق الاسلام گوڑگانوہ نے **رفیق حج** اور **رفیق نکاح** دو نئے رسالے شایع کیے ہیں، پہلا چھوٹی تقطیع کے ۱۱۲ اور دوسرا ۱۲۰ صفحوں پر چھپا ہے۔ پہلے میں حاجیوں کے گھر سے چلنے سے لے کے واپس آنے تک کے جملہ معلومات مہیا کیے گئے ہیں۔ یہ رسالہ بہت بڑا رہبر ثابت ہوگا۔ دوسرے میں نکاح کے جملہ پہلوؤں پر بحث ہے بالخصوص شادی شدہ نومسلمہ سے شادی اور تعددِ ازواج پر دو باب معلومات سے لبریز ہیں۔ دونوں رسالے آسان اردو اور قصہ کے طرز میں لکھے گئے ہیں۔ پتہ ذیل پر پانچ پیسے کے ٹکٹ محصول ڈاک کے لیے بھیجنے پر مفت مل سکتے ہیں۔ بیرنگ مطلق نہیں بھیجے جاتے۔ اسی محصول میں رسالہ تحفۂ زکوٰۃ بھی منگایا جا سکتا ہے۔ وہ بھی ۱۱۲ صفحے کا رسالہ ہے۔

محمد ظفر - وکیل گوڑگانوہ (پنجاب)

تلافیِ مافات

(جناب مولوی اسمٰعیل احمد مینائی صاحب تسنیم بی اے ایل ایل بی وکیل)

"شیریں، اگر تم سچ سچ جواب دینے کا وعدہ کرو تو میں ایک سوال کروں ـــــ آخر تم نے مجھ میں کونسی ایسی بات دیکھی جو میری محبت کو نہ صرف برداشت ہی کیا، بلکہ اُس کی قدر و وقعت بھی کی۔ دنیا میں صرف تین چیزیں ہوتی ہیں جن کی طرف کسی کا رجحان ہو سکتا ہے۔ پہلے حسنِ صورت، وہ مجھے قدرت نے عطا نہیں کیا، دوسرے دولت، تو خود تمھارے پاس دولت کی کیا کمی ہے، تیسرے قابلیت، سو اس خصوص میں بھی مجھے کوئی غیر معمولی اور نمایاں امتیاز حاصل نہیں ہے، علاوہ بریں لیاقت علمی میں تم خود کس سے کم ہو جو میری معمولی قابلیت تم کو متاثر کر سکے، پھر کون سی خوبی تم نے مجھ میں ایسی پائی، کیا صفت مجھ میں ایسی محسوس کی کہ اگر میں تم پر جان نثار کرتا ہوں تو تم بھی میری دلدادہ ہو۔ میں تم سے خلوصِ قلب سے محبت کرتا ہوں تو تم بھی مجھ سے صاف دلی، اور اخلاص سے عشق رکھتی ہو۔ آج دنیا میں مجھ سے زیادہ خوش قسمت آدمی نہیں ہے دولت، عزت، شہرت، سب خدا کے فضل سے پہلے ہی سے تھیں، اب ایک محبت کرنے والی حسین، باعصمت اور لائق بیوی ملنے والی ہے"۔

"محبت" شیریں نے سنجیدگی سے جواب دیا "صرف محبت کی غرض سے کی جاتی ہے، اُس میں کسی اور جذبے، کسی اور لالچ کو دخل نہیں ہوتا، حسنِ صورت قابلیت، دولت، یہ سب چیزیں عارضی ہیں۔ محبت اگر کسی عارضی شے کی غرض سے کی جائے تو وہ محبت نہیں کیونکہ محبت جاودانی ہے ابدی ہے اور فنائے جسمِ انسانی کے بعد بھی اس کا وجود رہتا ہے۔ اگر محبت کی بنا کوئی عارضی شے مثل حسنِ صورت یا دولت کے ہوتی تو موت محبت کا خاتمہ کر دیا کرتی کیونکہ موت سے یہ چیزیں بھی ختم ہو جاتی ہیں۔ تعجب ہے کہ تمھاری سی ذہانت، تمھارے سے دماغ کا آدمی اتنا مادہ پرست ہو، پرویز، تمھاری ایسی باتوں سے مجھے کبھی کبھی گمان ہوتا ہے کہ تم کو مجھ سے سچی محبت نہیں ہے۔ تم صرف میری صورت اور میرے جسم سے محبت رکھتے ہو، میری روح سے اور مجھ سے نہیں، سچ بتاؤ، اگر میں اتنی خوبصورت نہ ہوتی تو بھی کیا تم کو اسی قدر عزیز ہوتی جتنی اب ہوں"۔

"شیریں" پرویز نے آنسو بھری آنکھوں سے جواب دیا "کیا تم مجھے واقعی اتنا سطحی سمجھتی ہو کیا تم درحقیقت مجھے اس درجہ مادہ پرست تصور کرتی ہو، تم یقین کرو کہ تم جس زمین پر قدم رکھتی ہو وہ زمین مجھے عزیز ہے، تم جس چیز کو چھو لیتی ہو وہ چیز مجھے پیاری ہے۔ بھلا یہ کیونکر ممکن ہے کہ تمھارا حُسن، تمھاری خوبصورتی زائل ہو جانے کے بعد میں تم کو بھول جاؤں، تمھاری محبت کو فراموش

کردوں، شیریں تم مجھے صرف اس لیے عزیز نہیں ہو کہ تم حسین اور خوبصورت ہو، بلکہ اس لیے کہ تم شیریں ہو۔"

پرویز اور شیریں سائنس کی اعلیٰ جماعتوں میں ہم جماعت رہ چکے تھے، اور دونوں کا شمار ذہین طالبعلموں میں ہوتا تھا۔ لیکن شیریں کی ذکاوت کی برتری تھی کہ ایم۔ ایس۔ سی میں وہ اوّل آئی، یکجہتی اور قابلیت کے سبب سے دونوں میں ابتدا ہی سے جو انس تھا جو رفتہ رفتہ عشق میں تبدیل ہو گیا۔ پرویز کے والدین میں سے کوئی بقید حیات نہیں تھا۔ گھر پر وہ تنہا رہتا تھا، اس کا چھوٹا بھائی جہانگیر انگلستان میں بیرسٹری کی تعلیم پا رہا تھا، بہت سی جائداد تھی جو دونوں بھائیوں کی ضروریات کے لیے بالکل کافی تھی، پرویز کالج میں کیمیا کا پروفیسر بھی تھا، اس نے اپنے گھر پر بھی ایک مختصر سی تجربہ گاہ بنالی تھی جہاں اپنے خالی وقت میں وہ تحقیق و تدقیق میں مصروف رہتا تھا۔ شیریں کے باپ اس کے بچپن ہی میں مر گئے تھے، ماں البتہ زندہ تھی، باپ نے بیوہ اور بیٹی کے لیے بہت کثیر روپیہ اور جائداد چھوڑی تھی، شیریں کو کیمیا سے بہت شغف تھا اور چونکہ پرویز اس کا منگیتر تھا اس لیے جب سے اس نے کالج چھوڑا تھا اپنا یہ معمول کر لیا تھا کہ روزانہ سہ پہر کو کچھ وقت پرویز کے ہمراہ اس کی لائبریری یا تجربہ گاہ میں گزارتی تھی ———

پرویز شیریں سے باتیں کرتا جاتا تھا اور ایک شیشے کے برتن کو گرم بھی کرتا جاتا تھا، برتن میں ایک رقیق سیال شے تھی، یکایک اس میں جوش آنے لگا، پرویز تو اس طرف متوجہ نہیں تھا لیکن شیریں کی نظریں اسی پر جمی تھیں۔ سیال کی یہ حالت دیکھ کر اس نے چیخ ماری اور لپک کر پرویز کو ڈھکیل کر اس جگہ سے ہٹا دیا، پرویز ابھی واقعہ کو پوری طرح سمجھ کر اپنے خیالات مجتمع بھی کرنے نہ پایا تھا کہ بڑی زور کا دھماکا ہوا، برتن پھٹ گیا، اور شیریں بیہوش ہو کر گر پڑی، چند لمحوں تک پرویز خاموش کھڑا رہا، رفتار واقعات کی سرعت نے اس کی قوت خیال سلب کر لی تھی، اسکے بعد اُسے حادثہ کی اہمیت کا اندازہ ہوا، دوڑتا ہوا باہر گیا، موٹر نکالی، اور فوراً سول سرجن کو لیکر آیا، راستے میں اس نے مجمل حالات ڈاکٹر سے بیان کر دیے تھے، خود بھی اس کے ہمراہ کمرے میں گھسنے لگا تو ڈاکٹر نے روک دیا، اضطراب و پریشانی سے پرویز کا برا حال تھا، شیریں کا مکان قریب تھا، دوڑتا ہوا گیا اور اس کی ماں کو ساتھ لیکر واپس آیا تو معلوم ہوا کہ سول سرجن مریضہ کو لیکر اسپتال چلا گیا۔ جو وہم اب تک محض وہم و خوف تھا اب یقین کی حد تک پہونچ گیا، اُسے شیریں کی زندگی سے یاس ہو گئی، ہاتھ پیر کانپنے لگے، ٹانگوں نے جواب دے دیا، دماغ نے کام کرنا بند کر دیا اور پرویز بیہوش ہو کر گر پڑا۔ شیریں کی ماں نے یہ دیکھا تو فوراً دوسرے ڈاکٹر کو بلوا کر پرویز کو اس کے سپرد کیا اور خود شیریں کے پاس اسپتال چلی گئی۔

پرویز کے عالم بیہوشی ہی میں سول سرجن نے ٹیلیفون سے اطلاع دی کہ شیریں کے علاج کا مناسب انتظام اسپتال میں کر دیا گیا ہے، اس کی ماں اسکے پاس ہے، اور امید کی جاتی ہے کہ اس کی جان بچ

جائے گی۔

دوسرے روز پرویز اس قابل ہوا کہ خود اسپتال جا سکے، کمرے یا وارڈ کا نمبر تو اُسے معلوم نہ تھا ایک ملازم سے کہا کہ "کل جو عورت تیزاب سے جلنے کے سبب اسپتال لائی گئی ہے اُسکے کمرے میں مجھے پہونچا دو"۔ قدرت کی ستم ظریفی دیکھیے جس روز شیریں کو یہ حادثہ پیش آیا تھا اُسی روز ایک اور نوجوان لڑکی اسپتال میں داخل کی گئی تھی، اس لڑکی کا شوہر بہت ظالم اور غصہ ور تھا، کسی بات پر غضبناک ہو کر اُس نے گندھک کے تیزاب کی ایک بوتل بیوی کے مُنہ پر اُلٹ دی تھی، ملازم نے غلطی سے پرویز کو اس لڑکی کے کمرے میں پہونچا دیا، وہاں صرف ایک نرس موجود تھی، جسے یہ اطلاع دی جا چکی تھی کہ اس لڑکی کا بھائی اسے دیکھنے آنے والا ہے، قدرتاً نرس نے پرویز کو لڑکی کا بھائی سمجھا، اور خاموش رہی، پرویز مریضہ کے پلنگ کے پاس گیا، نرس نے چادر ہٹا کر مریضہ کا چہرہ کھول دیا، پرویز نے کراہت سے مُنہ پھیر لیا، اور آنکھوں پر ہاتھ رکھے باہر آیا، وہاں سے گھر پہونچا، اسباب درست کیا، روپیہ لیا، اور اُسی ہفتے میں ہندوستان چھوڑ دیا ———

شیریں کے زخم کچھ ایسے خطرناک نہ تھے، برتن پھٹتے وقت قدرتاً اُسنے اپنا بازو منہ پر رکھ لیا تھا، جسکے سبب سے اُس کا چہرہ بالکل محفوظ رہا، صرف چند خراشیں آئیں جو جلد ہی اچھی ہو گئیں، شانہ اور ہاتھ البتہ بُری طرح جلے تھے اُن کی صحت میں دیر لگی، ——

شیریں تندرست ہو کر اسپتال سے نکلی تو اُسے پرویز کے غائب ہو جانے کا علم ہوا، اُس نے بہت تلاش کی مگر پتہ نہ چلا، رفتہ رفتہ اُسے یہ معلوم ہوا کہ پرویز اُسے دیکھنے کے لیے ایک روز بھی شفا خانے نہیں آیا، اس نے تحقیق کی تو اسے پرویز کی غلط فہمی کا علم ہوا، اب اُسے اسکا احساس ہوا کہ پرویز نے اس دھوکے میں کہ شیریں جلنے سے بدصورت ہو گئی ہے، اس سے کنارہ کشی کی ہے۔ اس احساس سے اسے بہت صدمہ ہوا، سوچتی تھی کہ میں نے تو اپنی زندگی، اپنی خوبصورتی، سب کچھ پرویز کی خاطر خطرے میں ڈالی اور پرویز سے اتنا بھی نہ ہوا کہ میرے صحت پانے تک ٹھہرتا، اسی دوران میں اُسے آخری روز کی گفتگو یاد آئی کہ پرویز کے نزدیک محبت کی بنا، صرف عارضی چیزیں ہو سکتی تھیں، ان تمام خیالات کے ہجوم نے اسکے دل و دماغ کو بہت متاثر کیا، اس پر طرہ یہ ہوا کہ بیٹی کی یہ مصیبت ماں سے نہ دیکھی گئی اور شیریں کی تندرستی کے چند ماہ بعد وہ مر گئی، شیریں بیچاری یوں ہی کیا کم غمزدہ تھی، ماں کی موت کے صدمے نے اُسے پاگل بنا دیا، منہ پر نقاب ڈالی، خدا کا نام لیا اور نکل کھڑی ہوئی۔

پرویز نے ہندوستان چھوڑا تو سیدھا انگلستان بھائی کے پاس پہونچا، کچھ دنوں وہاں رہا، پھر یورپ کی سیاحی کرتا ہوا امریکہ گیا، کیمیا سے اُسے بہت ذوق تھا، امریکہ کی ایک یونیورسٹی میں کچھ دنوں ترقی کی، آدمی لائق تھا، دو ایک برس میں ڈاکٹریٹ مل گئی، اُسکے پروفیسر کی لڑکی حسین تھی اور مالدار، پرویز کو شیریں

کی تو اب یاد بھی نہیں آتی تھی، اس لڑکی کو دیکھا تو لٹو ہوگیا، آدمی خود بھی وجیہ تھا [illegible] درخواست [illegible] منظور ہوئی اور شادی ہوگئی، ایک سال کے بعد ایک لڑکا ہوا جسکی پیدائش میں ماں کا انتقال ہوگیا [illegible] بیوی کی موت کا بہت دھکا لگا [illegible] پھر ڈاکٹری کا مطالعہ شروع کردیا [illegible] ذکاوت کی وجہ سے چھ سات سال میں [illegible] کے درجے تک پہونچ گیا، اور [illegible] ہزاروں میں ایک [illegible] دس برس سے زیادہ ہو چکے تھے، وطن کی یاد نے [illegible] شروع کیا، اپنے لڑکے [illegible] لڑکے کو انگریزی اسکول میں داخل کرادیا اور خود مطب کرنے لگا ؛

(۲)

شیریں کے جلنے کے حادثے کو پچیس برس گزر گئے جہانگیر جو اب اسی شہر میں پریکٹس کرتا تھا اس سے بالکل لاعلم تھا اور وہ بیمار، جو اسکے بیاہ کے واسطے تھے اُن میں سے بھی بعض مر مرا گئے بعضوں کے دماغ سے بالکل محو ہوگیا، شیریں کا مکان پچیس برس سے یوں ہی بند پڑا تھا، مکان سے ملحق باغ تھا جو نگرانی نہ ہونے کے سبب سے [illegible] ہو چکا تھا، بہار آتی تھی لیکن خودرو بیلوں اور خاردار جھاڑیوں کے سبب سے بمشکل چند پھول سطح تک پہونچتے تھے، ابتدا سے خزاں میں رنگ برنگ کے کانٹے دار خودرو پودے نکل آئے تھے، جو رفتہ رفتہ تمام باغ کی زمین پر پھیل گئے تھے، اُنھوں نے پھولوں کے درختوں کو [illegible] پوشیدہ کرلیا تھا

ٹوٹے ہوئے پھاٹک کے قریب ایک شاندار عمارت کا [illegible] تھا [illegible] میں ایک گلاب کا [illegible] سال بہار کے موسم میں ایک خوش رنگ گلاب کا پھول کھلاتا تھا، اسی پھاٹک سے [illegible] ہوتی تھی [illegible] ہوا [illegible] درواز [illegible] ایک کمرے [illegible] میز پر چند کتب پڑی ہوئی تھیں، [illegible] ایک الماری [illegible] تھا ——————

[illegible] رات کا وقت تھا، ہوا زور سے چل رہی تھی کہ نقاب پہنے ہوئے ایک عورت پھاٹک سے باغ میں [illegible] کچھ دیر تک ٹھٹک کر رہ گئی، یہ معلوم ہوتا تھا گویا غور کر رہی ہے کہ مکان میں داخل ہو یا واپس چلی جائے، کچھ دیر سوچنے کے بعد وہ مکان کی طرف بڑھی، اس کی رفتار سے واضح ہوتا تھا کہ وہ خود پر بہت جبر کر رہی ہے [illegible] تیر و نشتر کا کام کرتا تھا مگر وہ اُن لوگوں میں سے نہ تھی جو تکلیف کے وقت چلا اٹھتے ہیں، خاموشی سے وہ [illegible] داخل ہوئی [illegible] نقاب اُلٹ دی، —— شیریں، لیکن کون شیریں [illegible] برس کی خوش مزاج [illegible] شیریں نہیں، چھیالیس برس کی [illegible] اور دُکھیاری شیریں جسکے بالوں میں سفیدی آچلی تھی، جسکے چہرے پر جھریاں پڑ گئی تھیں، شباب کے صدمات بہت شکست اور [illegible] ہوتے ہی [illegible]

برس میں دنیا کی خود غرضیوں کے اتنے تلخ تجربے نے اُسکے بالوں کی رنگت بدل دی تھی، وقت، وقت کی حیثیت سے اُس کے لیے کوئی حقیقت نہیں رکھتا تھا۔ صدمات کی اُس پر اتنی بارش ہوئی تھی کہ اب صدمات کا اُسے احساس و ادراک نہیں رہا تھا — بچپن میں اُسے تعلیم دی گئی تھی کہ خدا اپنے بندوں پر ہمیشہ مہربانی کرتا ہے اور یہ کہ اپنی زندگی کو اپنے ہاتھ سے ختم کرنا گناہ عظیم ہے۔ خدا کی اس مہودہ مہربانی کی چاشنی اُسے اس وقت تک چکھنے کو نہیں ملی تھی لامحالہ اُس کے ذہن میں خدا کے وجود کے متعلق بھی شکوک پیدا ہو گئے تھے اور اسی کے ساتھ ساتھ یہ خیال بھی جڑ پکڑتا گیا کہ جب زندگی کی تکلیفیں ناقابلِ برداشت ہو جائیں تو خودکشی کر لینا حرام نہیں، لیکن ابھی تک کسی نہ کسی طرح وہ اس فعل کے ارتکاب سے باز رہی تھی —

اُس نے کمرے میں روشنی کی اور ایک بکس کو کھولا، کہ بچھانے کے لیے کچھ نکالے، صندوق میں کچھ کپڑے تھے اور کپڑوں کے اوپر ایک چھوٹا سا بھورے رنگ کا چمڑے کا ڈبہ رکھا ہوا تھا، جو باوجود زیادہ دنوں کا ہونے کے اب بھی گویا کہ نیا تھا، رنگ میں البتہ کچھ پھیکا پن آچلا تھا، شیریں نے اُسے کھولا، ایک موتیوں کا ہار اُسکے اندر رکھا ہوا تھا، وقت زیادہ گزرنے کے سبب سے موتیوں کی آب و تاب ماند ہو گئی تھی، دو ایک بالکل سیاہ پڑ گئے تھے، ڈبہ کھولتے ہی کاغذ کا ایک پُرزہ اُڑ کر نیچے گرا، شیریں نے اُسے اُٹھا کر پڑھا، کاغذ زرد ہو چکا تھا، روشنائی کہیں کہیں مٹ گئی تھی لیکن الفاظ اب بھی پڑھے جاتے تھے، پرویز کے صاف اور روشن خط میں لکھا ہوا تھا —— "پہلے قلب سمندر سے، پھر میرے محبت بھرے قلب سے پیاری شیریں کے لیے" —— شیریں نے موتیوں کو ہاتھ میں لیا اور غور سے دیکھا، آنکھوں میں آنسو بھر آئے، عمر میں پہلی بار اُسے خود پر رحم آیا — لیکن ضبط کر کے آنسو پونچھے، موتیوں کو ایک کپڑے میں لپیٹ کر اسی بکس میں رکھ دیا۔ ہاتھ میں جو چھوٹا سا بیگ تھا اُسے کھولکر کچھ کھانے کو نکالا، کھانے سے فارغ ہو کر ہاتھ پونچھے، بیگ بند کر کے الگ رکھ دیا، روشنی گُل کی اور ایک کرسی پر بیٹھ کر دونوں ہاتھوں سے مُنہ چھپا لیا اور اسی طرح سو گئی:

(۳)

پرویز کے مکان کے دو قطعے تھے، ایک میں جہانگیر رہتا تھا اور دوسرے میں پرویز۔ جہانگیر چالیس کے لگ بھگ تھا مگر اب تک غیر شادی شدہ —— طبیعت کے لحاظ سے وہ فلسفی تھا، دونوں بھائیوں میں مؤانست اور اتحاد و محبت تھا، اور پرویز کو اپنی ذات کے علاوہ کسی سے اگر تعلق تھا تو وہ بیٹے سے یا بھائی سے، روز صبح کو جہانگیر پرویز کے ہمراہ اُسکی لائبریری میں ناشتہ کرتا تھا، ناشتے کے دوران میں اور اُسکے کچھ بعد تک دونوں بھائی اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے تھے، پھر جہانگیر اپنے دفتر چلا جاتا تھا اور پرویز اپنے کام میں مشغول ہو جاتا تھا، پندرہ برس میں پرویز کی قابلیت کی دور دور دھوم ہو گئی تھی، یہ مشہور تھا اور بالکل بجا طور پر کہ وہ بہت سنگدل اور خود غرض ہے، اور واقعہ یہ ہے کہ اُس کی سنگدلی اور خود غرضی میں کوئی کلام نہیں تھا، بغیر کسی قسم کی

قیل و قال کے وہ ایک شخص سے یہ کہدیتا تھا کہ اس کی بیوی گھنٹہ بھر میں مرجائیگی، بلا پلک جھپکائے وہ والدین کو سکنڈوں کی صحت کے ساتھ اولاد کی موت کا وقت بتا دیتا تھا۔ لوگ اُس کی عزت کرتے تھے، اُس سے ڈرتے تھے، اُس کی قابلیت کے، اُس کی جراحی کے، معترف تھے لیکن بجز اُسکے لڑکے اور اُسکے بھائی کے دنیا میں کوئی تیسرا آدمی نہیں تھا جو اُس سے محبت کرتا ہو۔

صبح کا وقت تھا، پرویز اپنی لائبریری میں تنہا بیٹھا ہوا تھا، سامنے میز پر ہمایوں کے وہ تمام خطوط پڑے ہوے تھے جو اُس نے وقتاً فوقتاً کالج سے باپ کو لکھے تھے۔ پرویز اُن کا مطالعہ نہیں کر رہا تھا، دراصل وہ سب خطوط اُسے ازبر تھے لیکن باوجود اسکے وہ روز صبح کو اُنھیں ضرور ایک بار پڑھتا تھا مگر کچھ عجیب بات تھی کہ آج وہ اپنے خیالات کو اُن پر مجتمع نہیں کرسکا، جب وہ اُنھیں پڑھنے کی کوشش کرتا اُس کی آنکھوں کے سامنے ایک بیس سالہ ہنس مکھ، حسین دوشیزہ کا چہرہ آجاتا تھا، متعدد بار اُس نے کوشش کی کہ وہ چہرہ اُسکے سامنے سے ہٹ جائے، آنکھیں بند کرلیں مگر وہ تصویر غائب نہیں ہوئی بیوی کا فوٹو سامنے رکھا ہوا تھا، خیال ہٹانے کی غرض سے اُسے اُٹھا کر دیکھنے لگا، —— "کتنی خوبصورت عورت تھی اور کیسی لاجواب بیوی" —— "مجھے اُس سے بڑی محبت تھی" لیکن معاً اُسکے دل میں یہ خیال آیا کہ جس عورت سے اُسے حقیقت میں الفت تھی وہ اُس صورت کی مالکہ تھی جو صبح سے بار بار اُس کے پیش نظر ہوجاتی تھی، زندگی میں پہلی بار اسکے دماغ میں اس اصلیت نے جگہ پائی کہ ہر ذی روح کے لیے قدرت ایک مخصوص ہمدم ودیعت کرتی ہے، شیریں کا خیال آتے ہی اُسے خیال آیا "معلوم نہیں شیریں اب کہاں ہے، زندہ بھی ہے یا مرگئی" اُس نے اِس کا احساس کیا کہ وہ اور شیریں ایک دوسرے کے لیے بنے تھے۔ قسام ازل نے اُنھیں ازل کے روز ہی متحد کردیا تھا، شیریں خوبصورت ہو یا بدصورت، لنگڑی ہو یا لولی، ہر حال میں پرویز شیریں کے لیے بنا تھا اور شیریں پرویز کے لیے، اس وقت اُسے اس کا اندازہ ہوا کہ ہمایوں کی ماں کبھی اُس کے دائرہ محبت میں داخل ہی نہیں ہوئی تھی، اُس کی جانب جو کچھ رجحان اُسے تھا وہ محض عارضی اور سطحی، لیکن اس امر کا اندازہ ہوسکے پر بھی اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ہمایوں کی ماں کو بھی اس کا ادراک ہوگیا تھا اور یہ ادراک ہی بڑی حد تک اُس کی جوانمرگی کا باعث ہوا —— پرویز اسکا ممنون تھا کہ اُس کی وجہ سے ہمایوں عالم وجود میں آیا، لیکن بس اسی حد تک، اِس سے زیادہ منت پذیر ہونا اُسکے خیال میں غلطی تھی۔ اس کا فلسفہ تھا کہ بیوی مثل ایک تیتری کے ہوتی ہے جو باغ میں آتی ہے، اس پھول پر بیٹھتی ہے اُس شاخ پر منڈلاتی ہے، اس کلی سے دل بہلاتی ہے اور پھر چلی جاتی ہے، —— مگر شیریں ایک کلیتہً علحدہ شے تھی پرویز باوجود کوشش کے اُسے بھول جانے میں کامیاب

نہیں ہوا تھا ——— [illegible] قسم کے [illegible]
دماغ میں چکر لگا رہے [illegible]
پر غور کرتا [illegible] چہرہ [illegible]
جو عرصہ دراز سے [illegible]
ایک تصویر نکالی [illegible] دیکھنے لگا [illegible]
دلآویز آنکھوں [illegible]
شیریں کی تصویر شیریں [illegible]
کا چہرہ محبت [illegible]
کامل اور مکمل نمونہ حسن و نسوانیت کا [illegible]
شوخ اور شیریں لب [illegible]
والی آنکھیں [illegible]
بال ——— اُس کے چہرے [illegible]
نزاکت بھی، حسن بھی تھا اور استقلال بھی ——
"مرد کے لیے بہترین [illegible]
آواز لیند کی [illegible]
کی [illegible]
جنکے حصول کے لیے [illegible]
کی پرواہ [illegible]
عروج [illegible]
مشاق ہوتی ہیں ——— [illegible]
ہمالیہ [illegible]
اتنا ہی تفاوت [illegible]
مکمل نغمہ میں [illegible]
ہوا۔ اُس [illegible]
سے جو کر [illegible]

[illegible] لیکن اس خیال کے ہمراہ ہی اُسکے دماغ نے
[illegible] شیریں نے اُسکے ساتھ تو بڑا ظلم کیا،
[illegible] شیریں [illegible] وہ اپنے دل پر ایک گناہ
[illegible] ۔ فوراً [illegible] نے شیریں کو
[illegible] شروع کیا، ابھی وہ
[illegible] تھا کہ دروازے پر کسی کی آہٹ
[illegible] تصویر میز کے خانے میں
[illegible] دیکھنے لگا۔ جہانگیر داخل
[illegible] ایک دوسرے باتوں میں
[illegible] کا سامان کیا اور دونوں
[illegible] فوٹو رکھا ہوا تھا،
[illegible] لگی ہوئی تھیں، باتیں
[illegible] تو تصویر پر پڑی کہنے
[illegible] شاید بھی آ گئی
[illegible] محبت کر
[illegible] کسی کو ملے،
[illegible] آپ سے بہت جلد
[illegible] کے چہرے کا رنگ متغیر
[illegible] پھر شیریں کی حسین اور
[illegible] بات ٹالنے کی غرض سے
[illegible] قدرت کے کھیل کسی کی سمجھ میں
[illegible] کی ماں کا انتقال
[illegible] لطف باقی نہیں رہا، لیکن
[illegible] اُسنے توجہ چاہا
[illegible] شعاری سے دوسرے کا

کیا حال ہوا"

"بھائی صاحب" جہانگیر نے کہا "یہ خیال آپکا بالکل نادرست ہے، قدرت کے ہر فعل میں اُس کی ایک مصلحت مضمر ہے، ہر کام میں ایک راز پوشیدہ ہے آپ اور ہم اُسے سمجھتے نہیں، اس لیے بیتاب اور بیچین ہوتے ہیں، آپ کا اضطراب بالکل بجا ہے بر انسانیت ہے لیکن اس اضطراب میں بھی سکون کی ایک جھلک موجود ہے کہ آپ کی ایک محبت کرنیوالی کہیں نہ کہیں آپ کا انتظار کر رہی ہے آپ کے لیے چشم براہ ہے — بہر حال اس گفتگو سے آپ کو اذیت ہوتی ہوگی اسلیے اسے ترک کر دینا چاہیے — ہاں آج ایک عجیب واقعہ پیش آیا، میں سویرے چہل قدمی کے لیے نکلا تھا، ٹہلتا ٹہلتا اُس مکان تک چلا گیا جو بیس برس سے خالی پڑا ہوا ہے، اور مجھے اُسکے باغ میں ایک نقاب پوش عورت کو ٹہلتے دیکھ کر بڑا تعجب ہوا، میں ٹھہر کر اُسے دیکھتا رہا، مجھے کھڑا دیکھ کر وہ سڑک تک آئی، اور میری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہی جب اُس نے ہمارے مکان کے متعلق سوال کیا کہ وہ خالی ہے یا اُس میں کوئی رہتا ہے، میں نے جواب دیا کہ وہ میرا ہی مکان ہے اور اُس میں میرے بڑے بھائی ڈاکٹر پرویز رہتے ہیں، آپ کا نام سنتے ہی ایسا معلوم ہوا کہ اُس پر بجلی گر پڑی، "پرویز، ڈاکٹر پرویز" کیا یہ ہی پرویز ہیں جو پہلے کالج میں کیمیا کے پروفیسر تھے" میں نے جواب دیا ہاں — پھر اُس نے دریافت کیا کہ ڈاکٹر صاحب تو مفقود الخبر ہو گئے تھے — میں نے اُسے بتایا کہ یہاں آپ امریکہ میں رہے، یہاں شادی کی جس سے ایک لڑکا موجود ہے جو ڈاکٹری پڑھ رہا ہے اور دو چار روز میں واپس آنے والا ہے —— اسکے بعد میں چلا آیا مگر میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کون عورت ہے، گفتگو سے تو وہ بہت شایستہ اور تعلیم یافتہ معلوم ہوتی ہے اور آپ کا تذکرہ اُس نے اس طرح کیا گویا آپ سے خوب واقف ہے کیا آپنے اُسے پہچانا؟"

پرویز نے بیچینی سے کرسی میں پہلو بدلا، اُس کا چہرہ زرد تھا، روح مضطر تھی کہ دل کی بھڑاس نکال دے، شیریں کی صورت پھر اُسکے سامنے آگئی، اُس نے کہا "ہاں میرا خیال ہے کہ وہ بیرسٹر صاحب مرحوم کی لڑکی شیریں ہے، میں اُس سے اور اُسکے حالات سے خوب واقف ہوں، کالج میں وہ میری ہم جماعت تھی، اور بہت ذہین متعلمہ، پہلے وہ نقاب پوش نہیں رہتی تھی، لیکن کالج میں میرا ایک اور دوست تھا فریدوں، اُسکو شیریں سے محبت ہو گئی اور شیریں کو اُس سے، دونوں نے آپس میں شادی کرنے کا معاہدہ کر لیا، فریدوں کو کیمیا سے بہت دلچسپی تھی، اُسنے گھر پر بھی تجربہ گاہ بنا رکھی تھی، اور شیریں اکثر اُس کے ہمراہ تجربوں میں شریک رہتی تھی، شادی سے ایک دن پہلے فریدوں ایک خطرناک تجربہ میں مشغول تھا، شیریں بھی موجود تھی، اتفاق سے چند کیمیائی اجزاء میں آگ لگ گئی اور آلہ جات پھٹ گئے، مگر قبل اسکے کہ حادثہ رونما ہو شیریں نے دوڑ کر فریدوں کو اُسکی جگہ سے ہٹا دیا، اور خود حادثہ کے تمام صدمات برداشت کیے، اُسکا حسن ملیامیٹ

ہوگیا اور گو جان بچ گئی مگر وہ بدصورت اور بد قوارہ ہوگئی
فریدوں نے جب اُس کی صورت دیکھی تو اُسے نفرت
ہوگئی اور قبل اسکے کہ اُسے صحت ہو وہ ہندوستان
چھوڑکر بھاگ گیا، مجھے علم نہیں کہ آجکل وہ کہاں ہے
لیکن چند سال ہوئے اُس کا ایک خط میرے نام
آسٹریلیا سے آیا تھا، شیریں اُس زمانے سے نقاب
پوش رہتی ہے" ـــــ پرویز نے گفتگو ختم کی تو
جہانگیر کی آنکھیں پُرنم تھیں، اُسنے کہا "بھائی صاحب
آپ نے دیکھا کہ فریدوں نے شیریں کو اُسکے ایثار کا
کیا بدلہ دیا، وہ اُسے اُس وقت بے یار و مددگار
چھوڑکر چلا گیا جب اُسے مدد اور ہمدردی کی سخت
ضرورت تھی"

"واقعی اگر یہ میری آنکھوں کا دیکھا واقعہ نہ ہوتا،
تو شاید سُن کر یقین نہ آتا کہ دنیا میں ایسا بھی ممکن ہے"
پرویز کے منہ سے بے اختیار نکل گیا،

"ایک کُتے کی بابت تو یقین آسکتا ہے لیکن
ایک انسان کے متعلق نہیں" جہانگیر نے جواب دیا،
پرویز کا رنگ فق ہوگیا، کسی دوسرے کی زبان
سے یہ الفاظ اتنے تکلیف دہ نہ ہوتے مگر بھائی
کی زبان سے یہ سُن کر اُس پر بہت اثر ہوا۔ "اس
واقعہ کو بہت دن ہوئے کوئی پچیس برس" اُس نے
کہا، اُس کی ہمت نہیں پڑی کہ جہانگیر سے یہ بھی کہدے
کہ فریدوں نے شادی بھی کرلی تھی جس سے ایک لڑکا
موجود تھا" اُس نے جب مجھے خط لکھا تھا تو اُس میں
اس کا ذکر بھی کیا تھا کہ اب وہ بہت پشیمان ہے اور

اُس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا تلافی کرے اور کس طرح،
تمہاری رائے میں اُسے کیا کرنا چاہیے"

"اُس کا اقرار آج تک باقی ہے جو اُسے اس
امر پر مجبور کرتا ہے کہ اُس اقرار کو یا تو پورا کرے یا اُس
سے نجات حاصل کرے ـــ اُس نے شیریں سے
شادی کی درخواست کی تھی، شیریں نے منظور کیا تھا،
آج تک اُس نے نہ اُس اقرار کو پورا کیا نہ اُس کی
زنجیر سے آزادی حاصل کی حتیٰ کہ شیریں سے معافی
کی بھی درخواست نہیں کی، اُس پر طرہ یہ کہ اُس نے
شیریں سے ایسا برتاؤ کیا جو کُتے سے بھی بدتر ہے اور
اس طرح اپنے جرم کو اور سنگین کردیا، اسکے لیے اب بجز
اس کے کوئی راستہ نہیں کھلا ہے کہ یا تو شیریں سے عقد
کرے یا اُس سے معافی مانگ کر اُس سے نجات
حاصل کرے، اسکے سوا اور کوئی تیسری صورت نہیں ہے۔
کم سے کم میرے دل میں تو ایسے انسان کے لیے ذرہ بھر
بھی عزت نہیں ہوسکتی، اور نہ وہ کسی عزت کا مستحق ہے،
یہ آپ کی عالی ظرفی ہے کہ آپ اُسے دوست کے نام
سے یاد بھی کرلیتے ہیں۔ کیا بھائی صاحب ایسا ممکن نہیں
کہ آپ فریدوں کو بلوالیں اور ہم آپ سبھی کہکے اُسے
اور شیریں کو ایک دوسرے سے پھر ملادیں" ـــ

"بھائی صاحب یقین کیجیے کہ دنیا میں اس قسم کے
افعال بدترین گناہ ہیں، میں ایک دردمند کو معاف
کرنے کے لیے تیار ہوں، ایک چور کی خطا بخش سکتا ہوں،
ایک قاتل سے ہمدردی کرسکتا ہوں لیکن ایک
دل توڑنے والے کا قصور معاف نہیں کرسکتا"

جہانگیر کی آنکھوں سے یہ کہتے کہتے آنسو نکل پڑے۔

"مجھے علم نہیں آجکل فریدہ کہاں ہے جو میں اُسے خط لکھوں" پرویز نے بمشکل جواب دیا۔

"کس قدر افسوس کی بات ہے کہ ایک انسان اتنے عظیم گناہ کا بوجھ اپنے سر پر لیے ہوئے خدا کے سامنے حاضر ہوگا"

جہانگیر کے اس جواب کے بعد کچھ دیر خاموشی رہی، پرویز کے دماغ پر اس فوری خاموشی کا بہت اثر ہوا، وہ کوشش کرتا تھا کہ بولے لیکن الفاظ نہیں نکلتے تھے، اس کشمکش میں وہ قریب قریب پاگل ہوگیا

جب اُلجھن ناقابل برداشت ہوگئی تو وہ دفعتاً کھڑا ہوگیا، اُس کے ہونٹ خشک تھے، زبان تالوے لگی ہوئی تھی —— "جہانگیر جہانگیر کیا تم اب بھی ......" "ٹھہریے" جہانگیر نے ہاتھ اُٹھا کر جواب دیا "میرا خیال ہے کہ کوئی آیا ہے دروازے پر موٹر آکر رکی ہے" —— اتنے میں کمرے کا دروازہ کھلا، اور ایک نوجوان خوبصورت لڑکا داخل ہوا۔ پرویز دیوانہ وار آگے بڑھا، "پاپا پاپا" لڑکے نے کہا۔ "میں آگیا"

(باقی آئندہ)

نالۂ ثاقب

(جناب مرزا ثاقب صاحب قزلباش لکھنوی)

دل میں بھی جلوہ گر وہی صورت ہے نور کی
بیکار تو لگی ہے مجھے کوہ طور کی

آنکھوں کو تم نہ لاؤ کہ ہیں مجرم نگاہ
کیوں بستیاں جلاؤ دل ناصبور کی

اچھی ہے ہر طرح رخ محبوب پر نقاب
اک وجہ ہے [illegible] شب غم کے ظہور کی

کچھ کھو کے سیکھ مشورہ تحصیل [illegible]
بیہوش ہو کے دیکھ ادا برق طور کی

نالوں کے واسطے شب غم [illegible]
ان کے قریب آ گئی آواز دور کی

شب ڈھل رہی ہے [illegible]
کیا ہولناک صبح ہے یوم النشور کی

صبح قفس خدا نہ دکھائے اسیر کو
[illegible] ہیں دل کے پاس صدائیں طیور کی

[illegible]
نالے [illegible] کسی سے ضرور کی

[illegible] ثاقب [illegible]
[illegible]

انشا و مصحفی کے متعلق بعض غلط فہمیاں

(جناب مولوی محمد اظہار حسن صاحب بی اے ایل ایل بی وکیل)

نومبر ۱۹۳۴ء کے رسالہ "زمانہ" میں مولوی نظام الدین حسین خاں صاحب اڈیٹر ذوالقرنین بدایوں کا ایک مقالہ "ریختی کے دو شاعر" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ مولوی صاحب موصوف اردو ادب کے محسن قدیم اور پرانے لکھنے والے ہیں۔ معمولاً ان کے ارشادات مستند ہونے چاہییں۔ لیکن زیر نظر مقالہ میں ایک بات تحقیق طلب نظر آئی اس لیے یہ چند سطور لکھنے کی جرأت کی گئی۔

سید انشا کے متعلق مولوی صاحب نے تحریر فرمایا ہے

"آپ نے جب لکھنؤ کی سرزمین پر قدم رکھا تو مرزا سلیمان شکوہ کا زمانہ تھا۔ شاعروں میں مصحفی کا طوطی بول رہا تھا۔ انشا کے انوکھے خیالات اور نرالی بندشوں نے سلیمان شکوہ کو اپنا دلدادہ و شیدا بنا لیا۔ مصحفی کی پیری نہ چلی وہ انھیں سے اصلاح لینے لگے۔"

یہ صحیح نہیں ہے۔ اس غلطی کی ابتدا شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد سے ہوئی ہے اور غالباً انھیں کی وجہ سے اکثر دوسرے تذکرہ نگار بھی مغالطہ میں پڑ گئے۔ مولوی نظام الدین حسین خاں صاحب کا مضمون بھی آزاد ہی سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے اگرچہ انھوں نے انشا کی آخر عمر کی پریشانیوں کے متعلق آزاد کے بیان کو تسلیم نہیں کیا ہے۔ آزاد کا قول ہے کہ

"پہلے مرزا سلیمان شکوہ مصحفی سے اصلاح لیا کرتے تھے جب سید انشا پہنچے تو مصحفی کا مصحف طاق پر رکھا گیا۔ بزرگوں سے سنا اور طرز کلام سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ شاہزادہ موصوف کے سر دیوان کی غزل اور اکثر غزلیں بھی سید ممدوح کی اصلاح کی ہوئی بلکہ کہی ہوئی ہیں۔ چنانچہ پہلا ہی مطلع اس مطلب کو روشن کرتا ہے

دل اب تو عشق کے دریا میں ڈالا   توکلت علی اللہ تعالیٰ

سید انشا ایسی تضمینوں کے بادشاہ تھے۔" (آب حیات ص ۲۶۲ طبع نہم)

لالہ سری رام نے انشا کے متعلق لکھا ہے

"دہلی سے لکھنؤ پہنچے اور میرزا سلیمان شکوہ کی سرکار میں اپنی خوش سخنی و شاعری کی بدولت باریاب ہو گئے مرزا سلیمان شکوہ مصحفی سے اصلاح لیتے تھے جب یہ پہنچے تو ان کا چراغ گل ہو گیا۔ ان سے اصلاح لینی شروع کر دی۔" (خمخانۂ جاوید جلد اول ص ...)

مولوی عبد الحق گل رعنا میں فرماتے ہیں

"اس بات کا سخت افسوس ہے کہ مصحفی جیسے باکمال شاعر کی جیسی قدر ہونی چاہیے تھی لکھنؤ میں نہیں ہوئی مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار سے اُن کو صرف پچیس روپیہ ماہوار ملتے تھے جب میر انشاء اللہ خاں کو باریابی ہوئی اور وہ شاہزادہ کی غزلیں بنانے لگے تو اس پچیس روپیہ میں بھی تخفیف ہوگئی۔ (ص ۲۳)

آزاد نے تو خیر سنی سنائی بات لکھی تھی یا مرزا سلیمان شکوہ کے طرز کلام سے اندازہ کیا تھا۔ لالہ سری رام کو غالباً آزاد کی عبارت سے دھوکا ہوا۔ لیکن مولوی عبد الحق کی غلطی واقعی حیرت انگیز ہے کیونکہ انھوں نے یہ قول خود مصحفی کا تذکرہ دیکھا تھا اور خود مصحفی کی شہادت اسکے خلاف ہے۔ اور مصحفی کے قول کی موجودگی میں اور کسی کی بات سند نہیں ہوسکتی۔ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد نے مصحفی کے تینوں تذکرے شائع کردیے ہیں۔ تذکرۂ ہندی میں مرزا سلیمان شکوہ کے ذکر میں مصحفی لکھتے ہیں

"در ایامیکہ علم ترتیب مجلس مشاعرہ شدہ بود اکثرے از کاردانان این فن در حضور آمدہ حاضر می شدند و این فقیر حقیر ہم چوں نسبت دیرینہ باو داشت گوشہ نشینی را بکار نزدہ رجوع آورد گفتۂ میر انشاء اللہ خان حسب الطلب حضور با جمعیت کمالی و شکستہ حالی شریک مجلس [illegible] تاریخ بہ تعلقہ [illegible] حضور رسانید و بعد چندے از کار [illegible] و مجاز [illegible] قصیدہ کہ مشتمل بر تہنیت عیدین بود بانعام [illegible] را از حضیض خاک باوج افلاک رسانید [illegible] جرأت [illegible] فقیر بعد سہ چہار ماہ دولت ملازمت حضور حاصل نمودہ بنوازش خسروانہ [illegible] و نیز ذکر شدہ [illegible] کثرت درویشی و قناعت عالی خود را داشت در این مشاعرہ بنام [illegible] مرزا [illegible] خود [illegible] گرفتہ میر انشاء اللہ خاں کہ بہ نائب مختار حضور یعنی خان صاحب قبلہ و قبلہ خان زاد خاص جہاں [illegible] ایشان در شعر فہمی و نثر نویسی نظیر خود ندارند صیغۂ اخوت خواندہ اند ہمیشہ [illegible] اسناف سخن می باشند و چند بار بالفعل لافقہ قیاد گوشوارہ سر بابات پر افراختہ اند حق تعالیٰ این قدر شناس شعرا [illegible] زمانہ کہ دوں قدر سخن با خاک یکساں شدہ بر تخت سلطنت و جہانبانی و دولت سلطانی [illegible] ہر دو را شب و روز دست دعا بر دارند زود بر آورد۔ آں زماں بیان داد و دو بشی [illegible] عالی کردہ خواہد شد" ص ۱۲۱

اس بیان سے یہ امر بالکل روشن ہوجاتا ہے کہ جس وقت مصحفی سرکار مرزا سلیمان شکوہ میں باریاب ہوئے ہیں سید انشا کا طوطی بول رہا تھا اور وہ نائب سرکار کی حیثیت سے شہزادہ کی ناک کا بال بنے ہوئے تھے۔ بلکہ خود مصحفی انہیں کی وساطت سے دربار میں پہنچے تھے [illegible]۔

اغلب ہے کہ اس وقت شہزادہ کی غزلیں بنانے کی خدمت بھی انشا ہی کے سپرد ہو کیونکہ مصحفی اور جرأت تو

بعد میں پہونچے ہیں، میر سوز نے وہاں قیام نہیں کیا اور کوئی ایسا تھا نہیں جس کا رنگ انشا کے آگے جمتا۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ مصحفی سالک ملازمت میں فوراً ہی داخل ہو گئے تھے لیکن تذکرہ کی تحریر تک صرف دو مرتبہ انعام پانے کی نوبت آئی تھی اور سید انشا "ہمیشہ مورد گوناگوں الطاف خسروی" رہتے تھے۔ ایسی صورت میں یہ کہنا کہاں تک درست ہو سکتا ہے کہ

"آپ نے جب لکھنؤ کی سرزمین پر قدم رکھا تو مرزا سلیمان شکوہ کا زمانہ تھا۔ شاعروں میں مصحفی کا طوطی بول رہا تھا۔ انشا کے انوکھے خیالات اور نرالی بندشوں نے سلیمان شکوہ کو اپنا والہ و شیدا بنا لیا۔ مصحفی کی پیری نہ چلی وہ انھیں سے اصلاح لینے لگے۔"

اس سلسلہ میں یہ امر بھی قابلِ لحاظ ہے کہ مصحفی نے کہیں یہ نہیں لکھا کہ مرزا سلیمان شکوہ انکے شاگرد تھے حالانکہ بعض دیگر رؤسا کے متعلق انھوں نے اس کی تصریح کر دی ہے۔ مثلاً ریاض الفصحا میں نواب مرزا محمد تقی خاں ہوس کے ذکر میں لکھا ہے کہ "فقیر را بہ شرف استادی خود امتیاز بخشیدہ" ہاں انکے اس شعر سے جس میں یہ ہے کہ [illegible] استاد کیا کرتے ہیں امیراب کے [illegible] ہوتا ہے جو دربار میں کے لایق

واقعہ یہ ہے کہ سید انشا کی ہیجان طبیعت کبھی انھیں نچلا نہ بیٹھنے دیتی تھی اور کسی نہ کسی شاعر سے آویزش ضرور ہو جاتی تھی۔ چنانچہ انھوں نے مصحفی پر بھی اعتراضات کیے۔ ادھر سے [illegible] جواب دیئے گئے۔ پھر تو وہ کیچڑ اچھلی کہ الامان والحفیظ۔ مرزا سلیمان شکوہ شروع سے سید انشا کے [illegible] تھے اس لیے اب بھی انھیں کا ساتھ دیا۔ اور مصحفی کی تنخواہ میں تخفیف کر دی۔ یہ طرز عمل قابلِ اعتراض سہی لیکن [illegible] مطابق فطرت۔ اگر مصحفی کی حیثیت شہزادہ کے استاد کی ہوتی تو البتہ اسکے برعکس ہوتا۔

حکیم عبد الحی نے آزاد کی تحریروں کو جرح اور تنقید کا آماجگاہ بنایا ہے۔ تذکرۂ مصحفی کا ایک نسخہ ندوہ کے کتبخانے میں موجود ہے وہ بھی انھوں نے دیکھا تھا لیکن پھر بھی بعض عجیب غلطیاں ان سے سرزد ہو گئیں۔ آزاد نے رنگین کے حوالہ سے سید انشا کی آخری حالت کا جو نقشہ کھینچا ہے اس پر تنقید کرتے ہوئے حکیم صاحب نے لکھا ہے

"آزاد نے انشا کی وہ مشہور غزل [illegible] جگہ نقل کی ہے جو [illegible] نہایت موزوں ہے اور اس کا ایک شعر ہے

نہ چھیڑ اے نکہت بادِ بہاری راہ لگ اپنی ۔۔۔ تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

مگر واضح رہے کہ یہ غزل انشا کی اس زمانے کی تصنیف نہیں ہے جو [illegible] اور جس کا زمانہ بیان کیا جاتا ہے میں نے اس غزل کے چند اشعار تذکرۂ مصحفی میں پڑھے ہیں [illegible] لکھا گیا ہے جس وقت انشا لکھنؤ پہونچے بھی نہ تھے۔ مصحفی نے تذکرہ میں [illegible] اور مرزا عظیم وغیرہ

شعرائے دہلی سے معرکے درپیش تھے "۔ گل رعنا ۔ فٹ نوٹ ۔ ص ۲۵۷-۹

مصحفی نے انشا کے متعلق جو کچھ اپنے تذکرہ میں لکھا ہے وہ بجنسہ حسب ذیل ہے

"انشا تخلص سید انشاء اللہ خاں نام دارد خلف میر ماشاء اللہ وطن بزرگانش نجف اشرف ۔ خودش در مرشد آباد تولد یافتہ تحصیل کتب عربیہ و فارسیہ بقدر حال ہمہ دارد از ابتدائے عمر بحکم موزونی طبع شعر بہر سہ زبان بگوید و نمود طبیعت می نماید اما میلان طبعش بطرف ریختہ بیشتر است مثنوی شیر و برنج در جواب نان و حلوہ مولانا بہاء الدین آملی بسیار بصفا گفتہ داد فصاحت زبان فارسی درو دادہ دیوانش از نظر فقیر گزشت اگرچہ ہمہ کلامش از عالم ظرافت خالی از کیفیتے نیست اما آنچہ از اشعارش انتخاب افتادہ این است۔"

اس تمام مضمون سے یہ کہاں ظاہر ہے کہ مصحفی نے تذکرہ میں وہاں تک کا حال لکھا ہے کہ وہ مرشد آباد سے دلی آچکے ہیں اور مرزا عظیم وغیرہ شعرائے دلی سے معرکے درپیش تھے "۔ یا یہ کہ مصحفی کا تذکرہ "اُس زمانہ میں لکھا گیا ہے جس وقت انشا لکھنؤ میں پہونچے بھی نہ تھے" انشا کے منتخب اشعار میں مصحفی نے یہ شعر بھی لکھا ہے

مانگا جو اُس سے بوسہ میں نے چمن کے اندر
بولے یہاں نہیں چل مچھی بھون کے اندر

مچھی بھون کے ذکر سے معلوم ہوتا ہے کہ انشا لکھنؤ آچکے تھے اور سلیمان شکوہ کا حال تو اس مسئلہ کو بالکل صاف کردیتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ بقول آزاد "قتیل کے رقعوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۲۵ہجری میں وہ (سید انشا) موقوف ہوکر خانہ نشیں ہوئے تھے" (آب حیات۔ طبع نہم۔ فٹ نوٹ ص ۲۶۹) اور مصحفی کا تذکرہ ۱۲۰۹ہجری میں تکمیل کو پہونچ چکا تھا۔ اس طور پر خود آزاد ہی کے بیان سے اس کی تردید ہو جاتی ہے کہ عالم بیچارگی میں کسی مشاعرہ میں سید انشا نے

نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹھکیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

والی غزل پڑھی تھی، کیونکہ اس غزل کے منتخب اشعار مصحفی کے "تذکرۂ ہندی" میں موجود ہیں۔

قطعۂ انتقال حضرت ریاض خیرآبادی

(جناب مولوی محمد محفوظ الکریم صاحب کلیم جلیپوری)

ریاض سخن ور بحکم جلیل
ہوئے جانب باغ جنت رحیل

دعا کر یہ تاریخ میں اے کلیم
ریاض ارم پائے وہ یا نبیل

۱۳۵۳ھ

چوری اور سینہ زوری

(از پروفیسر جلیل قدوائی ایم اے)

رسالہ الناظر کے نومبر نمبر میں مولوی [illegible] صاحب [illegible] کا مضمون "شاعری میں چوری" پڑھ کر بے ساختہ یہ کہاوت یاد آگئی جو اس مضمون کا عنوان ہے۔ میں [illegible] صاحب سے بادب عرض کروں گا کہ اگر اس عنوان سے انکی طبیعت بے کیف ہو تو پیشگی معافی چاہتا ہوں کیونکہ میرا انکی نیت پر حملہ کرنا ہرگز مقصود نہیں ہے۔ جیسا میں نے ابھی عرض کیا یہ عنوان محض اضطراری طور پر ذہن میں آگیا۔ اب یہ ٹوپی اُن کے سر پر ٹھیک اُترے یا کہاوت کسی پر صادق آئے تو یہ خود [illegible] ہے میرا قصور نہیں

مجھے حامد صاحب سے اختلاف کرنے کی ضرورت نہیں ہونی چاہیے تھی کیونکہ مضمون میں خود یہ تحریر فرما کر کہ "تاہم میرے نزدیک اس قسم کا اخذ یا سرقہ معاصرین کے کلام سے خصوصاً [illegible] تھوڑے [illegible] سے نہ کرنا چاہیے ورنہ اسکے اظہار و اعتراف کا اہتمام لازم کر لینا چاہیے۔ یہاں دونوں شعر لفظوں میں [illegible] ایک سے ہیں اور یہ مضمون ایسا نہیں ہے کہ توارد کے قبیل سے تصور کر لیا جائے اس لیے اس کا اعتراف بہتر تھا" میرے لیے کچھ کہنے سننے کی گنجائش نہیں چھوڑی تھی، مگر اس "اقرار صالح" کے بعد بھی جب وہ مسلسل [illegible] اور اصرار کے ساتھ شعرائے متقدمین اور اساتذۂ حال کے کلام سے مثالیں دے دے کر فرماتے ہیں کہ "ایسی حالت میں جلیل صاحب کس کس کو پڑھنے والوں کے سوا نکھے ہونے کا یقین دلائیں گے اور اعتراف قصور پر مجبور کریں گے" تو افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ وہ سب نہیں جو دو آنکھیں خدا کے فضل سے ملی ہیں اُن میں [illegible] ناک ڈالتے ہیں اور مجھے اُن سے شدت سے اختلاف کرنا پڑتا ہے، اور چونکہ میرے نزدیک اُنکے مضمون سے نوخیز شعراء اور ادبی تنقید کے طلباء کے دل و دماغ میں غلط فہمی کے راہ پانے کا اندیشہ ہے اس لیے [illegible] شعر و ادب کے ایک ادنیٰ لیکن سچے طالب علم و خدمت گزار ہونے کی حیثیت سے میں یہ اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ جواباً چند سطریں سپرد قلم کردوں۔

سب سے پہلے دونوں زیر بحث اشعار پیش کردوں تاکہ ناظرین کے سامنے رہیں اور انھیں مضمون کے سمجھنے اور اشعار پر غور کرنے میں آسانی رہے۔ وہ دونوں اشعار یہ ہیں:-

اصغر: صدہا تو لطف مے سے بھی محروم رہ گئے — یہ امتیاز ساغر و مینا لیے ہوئے

رضی: صدہا مذاق حسن سے بیگانہ رہ گئے — یہ امتیاز معنی و صورت لیے ہوئے

صاحبِ "حدائق البلاغت" سرقاتِ شعریہ کی دو قسمیں بیان کرتے ہیں: سرقۂ ظاہر اور سرقۂ غیر ظاہر۔ سرقۂ ظاہر کی پھر چار قسمیں بیان کی گئی ہیں جن میں سے ایک اغارہ اور مسخ ہے جس کی پہچان یہ ہے کہ "مضمونِ شعر تمام یا بعض الفاظ کے ساتھ لے لیں اور ترتیبِ نظم بدل دیں" اس میں کوئی شک نہیں کہ سرقۂ زیرِ بحث اسی قسم کے تحت میں آتا ہے کیونکہ رتنی صاحب کے شعر میں نہ صرف اصغر صاحب کے شعر کا مضمون قریب قریب تمام الفاظ کے ساتھ پایا جاتا ہے بلکہ نظم کی ترتیب بھی وہی ہے۔ اس سرقہ کی نسبت فاضل مصنف کا قول فیصل یہ ہے "اگر شعرِ ثانی زیادہ معنی خیز ہے تو ممدوح و مقبول ہے، برابر ہے تو پہلے کو ترجیح ہے اور پست ہے تو مذموم و معیوب ہے" حامد صاحب کی رائے میں "اگر شعرِ ثانی پہلے کے برابر بھی ہے تو جائز رکھنا چاہیئے" میری ناچیز رائے ہے کہ یہاں حامد صاحب نے پہلے شاعر کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ حامد صاحب نے ایک اور بات یہ بتائی ہے کہ "آخذ کو بھی دیکھنا چاہیے کہ وہ کس حیثیت کا ہے" اور یہاں اس بات سے ناخوش ہو کر کہ میں نے اپنے غصے میں "اُن کی (رتنی صاحب کی) خوشگوئی کا پورا اعتراف نہیں کیا" انھوں نے میرے ساتھ بھی انصاف نہیں کیا۔

اس موقع پر اس مسئلہ سے متعلق بھی اپنا نقطۂ خیال عرض کر دینا چاہتا ہوں۔ بیشک میں نے رتنی صاحب سے ضرورت سے زیادہ حسنِ ظن ظاہر نہیں کیا تھا لیکن میں نے اصغر صاحب کی نسبت بھی اپنے خط میں ایک لفظ تعریفی یا تحسینی نہیں استعمال کیا۔ واضح رہے کہ وہ صرف ایک مختصر سا خط تھا جس میں اصغر صاحب کی تعریف کرنے کی ضرورت و گنجائش نہ تھی۔ یہیں سے تو ایک "سخن گسترانہ بات" کہ دی تھی جسے غلط رنگ دیا گیا۔ لیکن رتنی صاحب کا جتنا اعتراف کر سکتا تھا میں نے کیا۔ میں اس کے لیے مجبور تھا۔ میں اسکے لیے اب بھی مجبور ہوں۔ رتنی صاحب کا کلام میری کیا شاید کسی شخص کی نظر سے کتابی صورت میں ابھی تک نہیں گزرا۔ جو کلام کبھی کبھی نظر سے گزرتا رہا اُسی کی بنا پر رائے قائم کی گئی۔ دُنیا یہی کرتی ہے۔ آج کوئی آنکھ بند کر کے ایمان نہیں لے آتا۔ یہ تو شعروشاعری ہے، اس بیسویں صدی میں تو "بے با خبر" لوگ بھی موجود ہیں جو نعوذ باللہ منہ اُن کے احکامِ اور "الہاماتِ غیب" کے اقوال تک کی دھجیاں اُڑائے رکھے دیتے ہیں ......
یہ واقعات و حالات کی دُنیا ہے۔ زندگی کے ہر شعبہ کی طرح شعروشاعری میں بھی مقابلہ و کشمکش کی کارفرمائی ہے۔ شاد عظیم آبادی نے کیا خوب کہا ہے

یہ مینا نہ ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی ‎ ‎ ‎ لپک کر جو اٹھا لے ہاتھ میں مینا اُسی کا ہے!

ممکن ہی نہیں یقین ہے کہ ملک کے مختلف گوشوں میں رتنی صاحب اور اصغر صاحب سے بہتر شعراء پڑے ہونگے، لیکن ہم اُن کی شعروشاعری سے بے خبر ہیں۔ ہم اُنکے کمال کا کیونکر اعتراف کریں، جب ہم اُنھیں نہیں جانتے۔

یہ بے نیاز شعرا بشیک صلاحیت رکھتے ہیں کہ ہماری شاعری میں انقلاب پیدا کردیں بلکہ یہ بھی اندیشہ ہے کہ ناظرین اور اہلِ ذوق اُن کا خیال کرکے بیتاب ہوکر یہ حرکت کر بیٹھیں کہ بے اختیار چیخ اُٹھیں ؎

خامہ انگشت بدنداں کہ اُسے (انھیں) کیا لکھیے ناطقہ سر بگریباں کہ اسے (انھیں) کیا کہیے

یا جیسا شکسپیر نے ایک موقع پر کہا ہے Kneel down, Kneel down and wonder وغیرہ ، مگر اس تیرہ اُدھار پہ ہم نو نقد "کو کیسے ترجیح نہ دیں اور کیسے آیندہ کے "خوانِ یغما" کی امید میں آج کے "ماحضر" پر اکتفا نہ کریں علاوہ اس کے شہرت و نام آوری خصوصاً شعر و سخن میں کسی کی میراث نہیں

تجہ ل خاطر رحسنِ سخن خداداد آست!

خیر اس قدر تو "آخذ" کی حیثیت " و غیرہ کے سلسلہ میں ..... باقی اب دیکھنا چاہیے کہ آخر شعر ثانی کیسا ہو؟ اُردو کا ایک خوش مذاق انگریزی نقاد کہتا ہے "صحیح معنوں میں شاعر وہی ہے جو فلسفۂ حیات اور حقائق عالم کو اس طرح نظم کردے کہ ہر حقیقت لطیف تر ہوکر روحِ انسانی میں محو ہو جائے . ساز حقیقت کی ایک موج ترنم ہے اسے شاعری کہیے یا موسیقی مفہوم ایک ہی ہے . جو شاعر فلسفۂ لطیف سے محروم ہے وہ شاعر ہی نہیں. شاعر کسی لطیف خیال کو نظم کرے یا بادہ کہنہ کو ساغر نو میں پیش کرے اگر ان دونوں میں سے ایک خصوصیت بھی نہ ہو تو شعر کہنا ایک ناقابلِ عفو جرم ہے جس کی سزا مذاقِ صحیح کا پیشہ اختیار کیے ہوؤں کے ذریعے سے ہونی چاہیے" میری ناقص رائے میں یہ الفاظ شعر و شاعری پر تنزلی لفظ ہیں اور شعر کی اچھائی برائی کی جانچ پڑتال کے لیے ایک سچا معیار ، کیونکہ دراصل اگر ہم یہ معیار قبول نہیں کرتے تو کوئی بتائے کہ آخر زندگی میں شاعری کی ضرورت کیا ہے؟ آخر شاعری اس دنیا میں کس طرح اپنے وجود کو حق بجانب ثابت کرسکتی ہے ؟

شعر و سخن سے سلسلہ ۔ چونکہ ایک ذوقی و وجدانی چیز ہے اس لیے سامع کے دل و دماغ میں شعر کی کیفیت کسی خارجی ذریعہ سے نہیں پیدا کرائی جاسکتی نہ شاعر کے کمال کا خدانخواستہ "بزورِ شمشیر" اعتراف کرایا جاسکتا ہے . ہوسکتا ہے کہ فن کے اعتبار سے ایک شعر بالکل بے عیب بلکہ تمام لوازمات شاعری سے آراستہ ہو لیکن اگر اس میں وسعت اور گہرائی اثر قوم اور لوچ ، ہمہ گیری اور اثر پذیری نہیں تو وہ شعر کامیاب شعر نہیں اسی نکتہ کو پیش نظر رکھ کر بعض نقادانِ ادب کہتے ہیں کہ صحیح آرٹسٹ اپنے جذبات و بیانات پر قابو رکھتا ہے . آرٹ میں ایک چیز ہے جسے ضبط کہتے ہیں ۔ سچا آرٹسٹ حقیقت کا اظہار کرنا اس قدر نہیں جانتا جتنا کہ اُسکا چھپانا ، وہ سننے والوں کو ایک طرح سے مغالطہ دیتا ہے اور وہ کچھ ایسا محسوس کرتے ہیں کہ جو آسکا

دل خون ہوا جاتا ہے اب پہ ہے تبسم ہم جان فدا کرتے ہیں کس بے جگری سے!

دراصل وہ جو کہنا چاہتا ہے اس کی طرف سے صاف بے پروائی اور استغنا تک برتتا ہے تاکہ آرٹ کا خون نہ ہو اور سامع یا ناظر کو حقیقت بالکل "برہنہ" سنائی یا دکھائی نہ دے۔ ورنہ اس دنیا میں لاتعداد متضاد حقیقتیں ہیں انھیں صاف صاف نظم کر کے رکھ دے اور کوئی ان کی طرف متوجہ بھی نہ ہو۔ ہم دنیا کے کھیڑے، غل غپاڑے اور جنجال سے گھبرا کر، اس کی تلخ حقیقتوں سے منہ موڑ کر آرٹ کی آڑ میں اسی لیے پناہ لیتے ہیں تاکہ انکے "کھرے پن" سے نجات پائیں، ان حقیقتوں سے جن سے مفر نہیں، جن سے دوچار ہونا ناگزیر ہے دست و پا سے نہیں، آنکھ کان یا دماغ سے نہیں، بلکہ اپنے دل سے، اپنے جذبات سے، اپنے ذوق و وجدان کے واسطے سے دوچار ہوں۔ اب اگر آرٹ کی دنیا میں بھی وہی کاروبار کی دنیا کے اصول کام کریں تو آرٹ کی غرض و غایت فنا ہو جاتی ہے۔ حقائق کے نظم کرنے کی ایک صورت تو یہ ہے کہ تمام منطق و فلسفہ و الٰہیات کی کتابیں منظوم ہو جائیں اور بعض بے راہ رو من چلے یہ کام کرتے بھی ہیں لیکن اس مشغلہ کو شاعری سے اکثر نقادوں کے قول کے مطابق "وہی نسبت ہے جو فرشتوں کی حمد و تسبیح کو ایک گنہگار انسان کی ہرزہ سرائیوں سے"

غالب نے کہا ہے

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو — بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر
مطلب ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام — چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

یہی حال فارسی میں حافظ اور خیام کا ہے جنھوں نے شراب و ساغر کے پردے میں اسرار حیات کی نقاب کشائی کی ہے۔ اور ہر بڑا شاعر یہی کرتا ہے۔ شاد عظیم آبادی کا جو شعر میں نے اوپر پیش کیا ہے اس میں بھی "مے و مینا" کے پردے میں زندگی کی ایک بسیط و تہہ گیر حقیقت نظم کی گئی ہے۔ ایک مالی سے کسی نے پوچھا "یہ کون پودا ہے؟" اس نے کہا "حسنینہ" ایک ماہر نباتیات نے درخت کے شجرۂ خاندانی اور اس کی ذات پات پر روشنی ڈال دی، لیکن جب اسپنسر نے پھول کو "رات کی رانی" یا بن جانسن نے اسے "شب دلھن" کہا، تو یہ گویا شاعری کی سرحد کی ابتدا ہوئی، بھلا کہاں باوجود اپنی شعریت کے "حسینہ" کا اصطلاحی لفظ اور کہاں "رات کی رانی" یا "شب دلھن" کا کیف خیال!

مجھے اپنے بیان کے زیادہ طول دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ دونوں اشعار ناظرین کے سامنے ہیں۔ مضمون کا سوال برطرف رضی صاحب کے شعر کی زبان میں بھی لکنت ہے۔ میری ترمیم کہ "بیگانے" کے بجائے "بیگانہ" زیادہ فصیح و برجستہ ہوتا، حامد صاحب بھی قبول کر چکے ہیں۔ اسکے مقابلہ میں اصغر صاحب کے شعر میں لفظ "محروم" ہے جو یقیناً "بیگانہ" سے زیادہ برمحل ہے۔ علاوہ اسکے شعر و شاعری کی مناسبت سے اس لفظ میں جو کیفیت و اثر ہے اسے اہل ذوق خود محسوس کر سکتے ہیں۔ رضی صاحب کے شعر میں "معنی و صورت" کا تقابل اپنی طرف

متوجہ کرتا ہے مگر فوراً محسوس ہوتا ہے کہ یہ صرف اہتمام ہی اہتمام ہے باقی خیر صلاح ہے۔ شعر میں ایک خشک ایک روکھے پھیکے انداز میں نظم کردی گئی ہے۔ بس، جو شاعری کی زبان نہیں ہے اس لیے شعر کیف فضا پیدا کرنے سے قاصر ہے۔ صرف انتخاب الفاظ یا اہتمام سے فن اور قواعد کی تا نیری تو بیشک ہو ناظرین کے دلوں میں ظن ہے شاعری "استادی" کا سکہ بھی بیٹھ گیا ہو مگر کیف و اثر غائب ہو گیا۔ آپ کہا کہ

شعر میں کہتا ہوں سمجھے تم کرو!

تو اس غریب نے اسی بدذاقی کا شکوہ کیا۔ ... اصغر صاحب نے "معنی و صورت" بھی ایک موقع پر استعمال کیا اُن کا شاعرانہ انداز بیان کہیں ہاتھ سے نہیں جاتا، اسی لیے وہ اپنے معاصرین کی سطح سے بہت بلند نظر اور اُن کی شاعری کی حقیقی عظمت ہے۔ وہ شعر یہ ہے

قربان ترے میکش ہاں اے نگہ ساقی   تو صورت مستی ہے تو معنی میخانہ

مگر اس "صورت و معنی" سے لطف اندوز ہونے کے لیے فن و زبان دانی سے اصطلاح کے ذوق کے علاوہ "نیز جنوں می باید"۔ ... پھر جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ رضی صاحب کے شعر کا مضمون ستم رسیدہ ہے اُن کی حقیقی قدر و قیمت واقعتاً بہت کم رہ جاتی ہے اور یقیناً صاحب "حدائق البلاغت" کے فیصلہ کے مطابق وہ نہیں قرار پاتا تو کم از کم "پہلے کو ترجیح" ضرور ہونا چاہیے، لیکن حامد صاحب رضی صاحب کے شعر کو ترجیح دیتے ہیں اس لیے کہ "تضاد و تقابل" اُن کے ہاں "مکمل" ہے۔ کیا عجیب بات ہے کہ جب کہ یہ چیزیں ایسی نہ ہوں حامد صاحب اُن میں "ہتیا" نہیں کرسکتے .... میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ شعری کیفیت کسی سے سامع یا ناظر کے دل میں نہیں پیدا کرائی جا سکتی اور حامد صاحب نے تو ماشاء اللہ اس روشن حقیقت مضمون میں یہ فی البدیہہ و برجستہ شعر بھی تصنیف فرما دیا ہے

"صدیاں تو حقِ شعر سے محروم رہ گئے   یہ آتی نہ اصغر و اکبر لیے ہوئے"

اصغر صاحب نے اپنے زیر بحث شعر میں ایک کھلی ہوئی حقیقت ایک سچے شاعر کی حیثیت ایک رنگین انداز میں ادا کی ہے جو خالص شاعری کی زبان ہے۔ یہ انداز ایسا پاکیزہ ہے اور "ساغر و پردہ" اس قدر باریک کہ نور حقیقت کا ایک طوفان بلکہ سیلاب چھن چھن کر دیکھنے والوں کی نظروں کو دیتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں رضی صاحب کے شعر میں "معنی و صورت" صرف اصطلاحی الفاظ معلوم جنھوں نے حقیقت کو پیش ہی نہیں دیا محدود بھی کر دیا ..... اس پر اصغر صاحب کی افضلیت کا یہ مضمون پہلے نظم کیا اُن کے شعر کو یقیناً کم از کم "ترجیح" کا مستحق قرار دیتی ہے مگر حامد صاحب کو اس

اختلاف ہے .... اب اس کے بعد یہ طولانی بحث کہ تمام شعراء متقدمین ایسا کرتے آئے ہیں یا اساتذہ حال بھی مضمون چُراتے ہیں بیکار ہے، ہر زمانے میں سارق شعراء کی یا اُن شعراء کی جو اس معیار پر پورے نہیں اُترے گرفت کی گئی اور اُن سے بازپُرس ہوئی اور آج بھی ایسا ہوتا ہے اور یہ ڈھٹائی تو شاید کسی زمانے میں نہیں ہوئی کہ معاصرین کے کلام سے چوری کی گئی ہو اور اُسے ایسے بیباک طریقہ پر مشتہر کیا گیا ہو۔

خیر، رضی صاحب نے جو کیا وہ کیا، حامد حسن صاحب نے اُن کی موافقت میں مضمون لکھ کر اُن کے جرم کو ہلکا بنانے کی کوشش کی ہے یہ میرا خیال ہے کہ اُنھوں نے ایک خطرناک روش کی داغ بیل ڈالی ہے اور ایک ایسا فتویٰ جواز دیا ہے جس پر عمل درآمد کرنے سے خوف ہے کہیں خام کار اور نوجوان شعراء بے راہ روی پر نہ آمادہ ہو جائیں اور اُن کے ذہن سے اس آزادی کے زمانے میں اصل و مجاز، حقیقت و اضافت، جوہر و عرض، نیک و بد اور کھرے کھوٹے کی قوتِ امتیاز نہ فنا ہو جائے۔

میں دیکھتا ہوں کہ میرے ارادہ کے خلاف یہ مضمون طویل ہو گیا۔ مجھے اس کا افسوس ہے۔ میں نے ہمیشہ اس بات کی کوشش کی ہے کہ ہنگامی مناقشات سے جہاں تک ممکن ہو الگ رہ کر اپنی محدود بساط کے مطابق اُردو ادب شعری خدمت کروں مگر بخت و اتفاق نے مجھے اس مناقشہ میں لا ڈالا۔ میں امید کرتا ہوں مجھے افسوس کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ مضمون پڑھ کر ناظرین مجھ سے اتفاق کریں گے کہ اس مسئلہ پر غور و فکر سے بحث کرنے کی ضرورت تھی۔

اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ "ایک مضمون سے دوسرا مضمون"، "ایک بات سے دوسری بات" "ایک اسلوب سے دوسرا اسلوب" ہمیشہ سے نکلتا آیا ہے ع جلتا ہے چراغ سے اسی طرح چراغ، مگر اس کے معنی نہیں ہونا چاہیے کہ "چراغ گُل، پگڑی غائب!" اور میں دیکھتا ہوں کہ "چراغ" کا کیا سوال یہاں تو رضی صاحب اور اُن کے یارانِ طریقت دیدہ و دانستہ اور دن دہاڑے "پگڑی" نہیں شاعر کا سارا اندوختہ اور خونِ جگر کی کمائی ہضم کیے بیٹھے ہیں اور ڈکار نہیں لیتے ع این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند۔ مگر دیکھنے والے ضرور کہہ اُٹھیں گے ؎

غیر پھرتا ہے لیے یوں ترے خط کو کہ اگر
کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے!!

قطعات تاریخ وفات حسرت آیات استاذ الشعرا حضرت ریاض خیرآبادی مرحوم

(از شیخ محمد اسحاق صاحب ضیا لکھنوی تلمیذ خواجہ محمد عبدالرؤف صاحب عشرت لکھنوی)

موت کی چکھنا ہے سب کو چاشنی افسوس ہے — ہے قضا ہر شخص کے سر پر کھڑی - افسوس ہے
ہاتھ خالی جو چلے جاتے ہیں اس دنیا سے آہ — حال پر روتی ہے اُنکے بیکسی - افسوس ہے
چار دن کی زندگی سامان سو سو سال کے — کسقدر ہوتے ہیں غافل آدمی - افسوس ہے
کچھ نہیں کرتے ہیں زادِ آخرت کا انتظام — کھو رہے ہیں مفت اپنی زندگی - افسوس ہے
آہ کچھ عبرت نہیں ہوتی کسی کی موت سے — ہے یہی صدمہ یہی حسرت یہی - افسوس ہے
میر و سودا اب کہاں ہیں داغ و مومن اب کہاں — جب اجل غالب پہ غالب آگئی - افسوس ہے
درد و انشا شاہ محسن اٹھ گئے دنیا سے آہ — آتش و ناسخ امیر لکھنوی - افسوس ہے
یہ تو باتیں کل کی ہیں اب حال سنیئے آج کا — ایک تازہ حادثے سے واقعی افسوس ہے
شاعر شیریں بیاں تھے جو ریاض نامور — ہو گئی دنیا سے رحلت آپ کی - افسوس ہے

مصرعۂ تاریخ ہجری یہ لکھو تم اے ضیا
شمع بزم شاعری گل ہو گئی - افسوس ہے
۵۳ ۱۳ھ

ایضاً

مل گیا خاک میں ریاض سخن — اے ضیا بن گئی ہے قبر ریاض
کیوں نہ حاصل ہو دیکھ کر عبرت — منظرِ بیکسی ہے قبر ریاض
جس جگہ پر ہے حسرتوں کا ہجوم — بس سمجھ لو وہی ہے قبر ریاض
فاتحہ کو گئے تھے کچھ احباب — جس جگہ پر بنی ہے قبر ریاض
خاک کا ڈھیر اک نظر آیا — رو کے بولے یہی ہے قبر ریاض
غم کی آنکھوں میں کھنچ گئی تصویر — سب نے جب دیکھ لی ہے قبر ریاض

فکر تاریخ جب ضیا کو ہوئی
بولا ہاتف - یہی ہے قبر ریاض
۵۳ ۱۳ھ

جوہر تاباں

(از جناب منشی ایاقت علی صاحب تاباں بدایونی)

چھیڑ اے سازِ جنوں نغمۂ حرماں کوئی
آج ثابت نہ رہے تارِ گریباں کوئی

کیفِ خود رفتگیِ ذوقِ تماشا مت پوچھ
بن گیا ہے ہمہ تن دیدۂ حیراں کوئی

دیکھنے والوں کی آنکھوں پہ پڑے ہیں پردے
دیکھنے والے سے ہوتا نہیں پنہاں کوئی

ذرہ ذرہ میں نظر آتا ہے حسنِ خود بیں
نہیں چھپتا نہیں چھپتا کسی عنواں کوئی

حسن کا ناز کہیں عشق کا انداز کہیں
ہے نئی شان سے ہر لحظہ نمایاں کوئی

حیرتِ جلوہ گہِ ناز کا عالم مت پوچھ
دم بخود ہے کوئی انگشت بدنداں کوئی

حرم و دیر میں مینا نہ [illegible] خانے میں
ہے نئی شان سے ہر لحظہ نمایاں کوئی

عشق احساسِ کم و کیف سے بیگانہ ہے
[illegible] ہو تو حیراں کوئی

کر دیا قیدِ تعین سے جنوں نے آزاد
بیڑیاں اب نظر آتی ہیں نہ زنداں کوئی

اُف ری دلبستگیِ لذتِ بیدادِ جنوں
نہ گریباں ہے نہ اب جیب نہ داماں کوئی

قید پابندیِ آداب جنوں ختم ہوئی
اب گریباں سے نہ ہے تارِ گریباں کوئی

اب نہ وہ دل ہے کہ جس میں خلشِ [illegible] کی ہو
اب ہے وہ درد کہ جس کا نہیں درماں کوئی

دل ہے اور کیفِ فراوانیِ سامانِ جنوں
اب نہ حسرت کوئی باقی ہے نہ ارماں کوئی

کہیں مسکن کا ٹھکانا ہے نہ مدفن کو زمیں
مجھ سا دنیا میں نہیں بے سر و ساماں کوئی

المدد نالۂ دل آج ہلا دے دنیا
[illegible] ہے زنداں کوئی

دیکھ لے چشمِ ترحم سے دمِ ذبح مجھے
ہو نہ جائے کہیں نا کردہ پشیماں کوئی

چشمِ تر تاب کو حسرتِ چمن آرائی کر
شاید آ جائے پئے سیرِ گلستاں کوئی

آئیے آئیے دل آپ کا گھر اپنا ہے
نہ تکلف ہے یہاں اور نہ ساماں کوئی

سو حیاتیں ابدی موت پہ اس کی قرباں
جس کی میت پہ کرے بال پریشاں کوئی

طے ہوئی منزلِ عرفانِ جنوں اے تاباں
اب کوئی دشت ہے باقی نہ بیاباں کوئی

انتخاب مشاعرۂ انجمن بہارِ ادب لکھنؤ

منعقدۂ ماہ جنوری سنہ ۱۹۳۵ء

آمین
(جناب منشی محمد امین صاحب آمین سلونوی)

با ایں ہمہ نزاکت دنیا پہ چھا رہے ہیں   وہ آج ہر فضا کو رنگیں بنا رہے ہیں
مجھ کو زمانے سے جب مطلب نہیں ہے کوئی   پھر کیوں زمانے والے مجھکو ستا رہے ہیں
افسانہ زندگی کا اس کے سوا نہیں ہے   یاد آئے تھے کسی دن یاد آج جا رہے ہیں
کچھ حاصلِ محبت دنیا میں اب نہیں ہے   اک بار ہے کہ ناحق دل پر اٹھا رہے ہیں
محشر میں ہے سراسر اعمالِ زندگانی   سرگشتۂ ازل کو پھر آزما رہے ہیں
تاریک تھا زمانہ بے رنگ تھیں فضائیں   ان کو خیال سے ہم رنگیں بنا رہے ہیں

اصغر
(جناب محمد ... صاحب اصغر)

جلوہ دکھا دکھا کے پردے گرا رہے ہیں   بھڑکا کے آتشِ غم دامن بچا رہے ہیں
کچھ مصلحت ہے اس میں یا آزما رہے ہیں   آؤ انھیں سے پوچھیں جو دل لبھا رہے ہیں
بیمار ہچکیوں سے بہلا سکے اپنے دل کو   اور آپ ہیں کہ بیٹھے زلفیں بنا رہے ہیں
کچھ سوچیے تو دل میں یہ نیند ہے اجل کی   شانہ ہلا ہلا کر کس کو جگا رہے ہیں
ہم بیخودی کے ہاتھوں گھر سے نکل تو آئے   لیکن خبر نہیں ہے کس سمت جا رہے ہیں

آشفتہ
(جناب حکیم سید علی صاحب آشفتہ لکھنوی)

ارمانِ بیخودی کی منزل پہ لائے ہوئے ہیں   دل کے لیے جنوں کی دنیا بنا رہے ہیں
جیسے مری نظر میں جلوے سما رہے ہیں   اے جذبِ دل بتا دے کیا خود وہ آ رہے ہیں
ناکامیٔ محبت بربادیٔ تمنا   کیا کیا نئے فسانے ترتیب پا رہے ہیں
فریاد اے محبت اے بیکسی دہائی   وہ اور مری لحد سے بچ بچ کے جا رہے ہیں
بھر دیں نظر نے دل میں رنگینیاں بلا کی   پھولوں کے رنگ کٹ کر آنکھوں میں آ رہے ہیں

دل
(جناب منظر حسن صاحب دل شاہجہانپوری)

پامال دل کے ذرّے عالم پہ چھا رہے ہیں   سب سے الگ یہ اپنی دنیا بسا رہے ہیں

سجدوں سے دعا ہے کب آستاں پرستی
ناصح مقدر اپنا ہم آزما رہے ہیں

وارفتگیِ دل نے پہونچا دیا وہاں تک
منزل ہے اپنے پیچھے ہم آگے جا رہے ہیں

ہاں اک نظر ادھر بھی اے محوِ لطفِ ہستی
غنچے بہارِ گل پر کیوں مسکرا رہے ہیں

گزرا ہے عشق اپنا ادراک کی حدوں سے
اب بھی جناب ناصح سمجھا بجھا رہے ہیں

دل فرطِ جستجو میں اب اس مقام پر ہے
چھالے ابھر ابھر کر ہمت بڑھا رہے ہیں

وقار

(جناب کاظم علی خاں صاحب وقار لکھنوی)

میں خوابِ مرگ میں ہوں اور وہ جگا رہے ہیں
یا ناز کر رہے تھے یا دکھ اٹھا رہے ہیں

ٹکڑے دل و جگر کے اشکوں میں آ رہے ہیں
اپنا فسانۂ غم رنگیں بنا رہے ہیں

بیداد کرنے والے بیداد کر کے تھکیں گے
ہم با وفا رہیں گے اور با وفا رہے ہیں

روداد ہجر میری اتنا تو رنگ لائی
میں درد کہہ رہا ہوں وہ مسکرا رہے ہیں

اٹھو وقار دیکھو مردہ پسند دنیا
ہنستے تھے جو وہی اب آنسو بہا رہے ہیں

وصی

(جناب چھٹن صاحب وصی خلف جناب مولانا صفی صاحب لکھنوی)

چاروں طرف سے ایسے طوفان آ رہے ہیں
یہ بھی خبر نہیں ہم کس سمت جا رہے ہیں

تاثیرِ دردِ دل کا قائل نہیں وہ ظالم
ہم دکھ بھری کہانی ناحق سنا رہے ہیں

ایمان و زہد و تقوے ہیں غرقِ ساغرِ مے
ایسے سیاہ بادل مغرب سے آ رہے ہیں

گم گشتہ دل کا میرے وہ کیوں سراغ دیں گے
نظریں بچا بچا کر جو مسکرا رہے ہیں

بن کر عرق جبیں سے ٹپکے گا خونِ ناحق
کیوں قتلِ بیگنہ کو ظالم چھپا رہے ہیں

اے مرگِ ناگہانی اب کیا جواب دوں میں
یہ کس کے پوچھنے کو احباب آ رہے ہیں

گوہر

(جناب سید ولایت حسین صاحب گوہر لکھنوی)

نیچی نظر کیے وہ میت پر آ رہے ہیں
دنیا یہ جانتی ہے آنسو بہا رہے ہیں

شاید وہ بے مروت پہنچا لے با مروت
اس آرزو پہ اپنی ہستی مٹا رہے ہیں

کل تک ہمارے دل پر بیحد تھی مہربانی
بگڑے تو آج کیا کیا طوفاں اٹھا رہے ہیں

اک تیری جستجو میں پہونچے کہاں کہاں ہم
ہر جادۂ طلب میں عنواں جدا رہے ہیں

مظہر

(جناب مظہر صاحب مظہر لکھنوی)

انجام پر نظر ہے آنسو بہا رہے ہیں
دل کی لگی کو مظہر اب یوں بجھا رہے ہیں

گریاں کسی کے دامن آنکھوں پہ لا رہے ہیں — جو رازِ دل عیاں ہیں اُن کو چھپا رہے ہیں
ہیں خوب راہ و رسمِ دَیر و حرم سے واقف — جانے دے ہم کو زاہد جس سمت جا رہے ہیں
کھاتے نہیں ترس کچھ، دل ہو گیا ہے چھلنی — ناوک لگانے والے ناوک لگا رہے ہیں
دیوانگی کے صدقے یا رب یونہیں رہوں میں — دیوانہ وہ سمجھ کر مجھکو ستا رہے ہیں

مجروح

(جناب نواب فریدوں مرزا صاحب مجروح لکھنوی)

طوفانِ غم اُٹھے گا پیغام لا رہے ہیں — آنکھوں میں بے ارادہ آنسو جو آ رہے ہیں
خط پڑھ کے نامہ بر کو ملزم بنا رہے ہیں — لفظوں میں اپنے دل کے معنی چھپا رہے ہیں
بیمار کو خدا پر چھوڑا ہے چارہ گر نے — بالیں پہ ہے اُداسی لوگ اُٹھتے جا رہے ہیں
یوں شکوے کر رہے ہیں دیوانگی میں اُن سے — جیسے وہ سامنے ہیں اور مسکرا رہے ہیں
تھا ارتباط ایسا ہستی و نیستی میں — روتے ہوئے ہم آئے روتے ہی جا رہے ہیں
کیوں دل لہو نہ رو دے مجروح شامِ غربت — اپنے پرائے ہم کو سب یاد آ رہے ہیں

عاشق

(جناب منشی امبکا پرشاد صاحب عاشق لکھنوی)

بیٹھے ہوئے سرہانے وہ مسکرا رہے ہیں — ہم دل کے ڈوبنے پر آنسو بہا رہے ہیں
ہم تو فسانۂ غم اپنا سنا رہے ہیں — وہ چپکے سن رہے ہیں اور مسکرا رہے ہیں
ہیں نقش اتنے گہرے زریں وفا کے دل پر — ہم چاہتے ہیں بھولیں وہ یاد آ رہے ہیں
جی چاہتا ہے دیکھیں لطف اُنکے روٹھنے کا — خود چھیڑ چھیڑ کر ہم اُن کو ستا رہے ہیں
ناصح عبث تو وجہِ گریہ کو پوچھتا ہے — اک آگ سی لگی ہے اُس کو بجھا رہے ہیں

خلیل

(جناب خلیل احمد خاں صاحب خلیل)

وہ جو ہماری شمعِ تربت جلا رہے ہیں — بعدِ فنا ہوا کے طوفان آ رہے ہیں
گزرے ہوئے فسانے مجھکو سنا رہے ہیں — یہ کیوں مستور دل پر نشتر لگا رہے ہیں
اے اہلِ دید سنبھلو یہ بجلیاں نہیں ہیں — شاید وہ رفتہ رفتہ پردہ اُٹھا رہے ہیں
عالم اِدھر وفا کا دنیا اُدھر جفا کی — رنگ اپنا اپنا دونوں دل پر جما رہے ہیں

ہندو مسلمانوں میں اتحاد کیونکر ہو سکتا ہے؟

کانپور کی تحقیقاتی کمیٹی کی سفارشیں

(سلسلۂ ماہ گزشتہ)

(از ظفر الملک)

کمیٹی کی جملہ سفارشات گزشتہ دو پرچوں میں ملاحظہ سے گزریں۔ رپورٹ پر منشی منظر علی صاحب سوختہ، عبد اللطیف خاں صاحب بجنوری اور پنڈت سندر لال صاحب نے دستخط کرتے وقت چونکہ نہ تو کوئی خاص یادداشت مرتب کی اور نہ کسی مقام پر جداگانہ رائے زنی فرمائی۔ اس لیے سمجھنا چاہیے کہ ان اصحاب کو ساری رپورٹ سے کلیۃً اتفاق ہے۔ باقی تین ارکین نے چونکہ جداگانہ یادداشتیں لکھی ہیں، اس لیے اُن کا ذکر علیحدہ علیحدہ کرنا مناسب ہوگا۔

سب سے پہلے کمیٹی کے صدر ڈاکٹر بھگوان داس صاحب کی یادداشت ہے۔ جو ڈاکٹر صاحب کے مخصوص فلسفیانہ طرز نگارش کا قابل دید نمونہ کہی جا سکتی ہے، اور اس لایق ہے کہ تمام و کمال ترجمہ کرکے شایع کی جائے، موقع ملا تو انشاء اللہ اُس کا ترجمہ بھی پیش کیا جائے گا۔ صاحب ممدوح نے اپنی یادداشت میں جہاں بعض سفارشات کی تشریح کی ہے وہیں حسب ذیل دو سفارشیں اضافہ کرنے کا مشورہ دیا ہے:۔

(ا) سیاسی و اقتصادی سفارشات کی دفعہ ۱۰ (ص ۴۹ الناظر ماہ جنوری) میں یہ عبارت بڑھائی جائے

"(۱۰- الف) چونکہ مسلمان جماعت میں یہ خیال پھیلا ہوا ہے کہ وہ جماعت بمقابلہ ہندو جماعت کے عام طور پر زائد غریب اور کم تعلیم یافتہ ہے اور یہ کہ آخر الذکر جماعت کی چالوں کے باعث ایسا ہوا ہے مناسب ہوگا کہ کانگریس ایک کمیٹی کانگریسی مسلمانوں کی اس غرض سے بنائے کہ وہ اس سارے مسئلہ کی تحقیقات کرے اور اس بات کو جانچے کہ

(الف) آیا یہ واقعہ ہے یا نہیں کہ ایک ہی طبقہ یا پیشہ کے مسلمان بمقابلہ اُسی طبقہ یا پیشہ کے ہندوؤں کے زیادہ غریب اور کم تعلیم یافتہ ہیں۔

(ب) اگر مسلمان زیادہ غریب اور کم تعلیم یافتہ ہیں تو اس صورت حال کے اسباب داخلی ہیں جیسے کہ وراثت کے خاص قوانین، ماندوبود کے طریقے، ہندوؤں کے نسلی اختلاط کی طرح ضعف جسمانی

کی زیادتی، مدت دراز تک نئی تعلیم سے کنارہ کش رہنا، اس امید پر کہ اجنبی حکومت مربیانہ سلوک کرے گی عہد و جہد کی کمی، وغیرہ یا خارجی ہیں جیسے کہ ہندوؤں کی جانب سے نامناسب کارروائی یا اجنبی حکومت کا تجارت اور صنعت و حرفت وغیرہ میں غیرملکی مقابلہ کرنیوالوں کی اعانت کرنا وغیرہ یا دونوں

(ج) اگر ایسا ہے تو اس کا کیا تدارک کیا جائے۔

(۴) مذہبی و تعلیمی سفارشات کی دفعہ ۱ (ص ۵۹ الناظر ماہ دسمبر) میں یہ عبارت بڑھائی جائے:-

"(۱-الف) تمام تعلیمی اداروں میں، دوسرا کام شروع کرنے سے پیشتر جملہ فرقوں کے تمام طلبہ چند منٹ کے لیے کیجا بٹھائے جائیں اور وہ خاموشی کے ساتھ کوئی آواز نکالے یا کسی عضو کو حرکت دیے بغیر اپنے دل میں یہ دعا کریں کہ ہر جگہ نفرت کا جذبہ فنا ہو جائے اور ساری دنیا پر صلح، شانتی، امن اور سلامتی کی حکومت ہو اور تمام بنی نوع انسان خوش و خرم رہیں۔ کانگریسی مجالس کے تمام جلسے یا ایسے جلسے جو کانگریس کی سرپرستی میں منعقد ہوں اسی طرح مختصر، خاموش اور پرسکون دعا سے شروع کیے جائیں۔"

سفارشات بالا کے علاوہ تمدنی و معاشرتی سفارشوں کی دفعہ ۸ (ص ۸۰ الناظر ماہ جنوری) کے متعلق حسب ذیل تصریحات قابل ملاحظہ ہیں -

"میں اپنی حیثیت صاف طور پر بیان کر دینا چاہتا ہوں - میں اس سفارش سے اتفاق کلی رکھتا ہوں کیونکہ اپنے باطن کی خوب جانچ کرنے کے بعد میرا ضمیر مطمئن ہو کر اسکے الفاظ عین انصاف کے مطابق ہیں اور یہ کہ جب تک خود ہندو کسی قسم کے جانوروں کی قربانی کرتے اور قصابوں کے ہاتھ مویشی فروخت کرتے رہیں گے جیسا کہ اس وقت وہ کرتے ہیں وہ مذہب کا نام لیکر دوسروں کے خلاف گائے کی قربانی یا مویشی کشی کے بارے میں حکم امتناعی حاصل نہیں کر سکتے۔ لیکن ذاتی طور پر میری نگاہ میں گائے کا گوشت اور سؤر کا گوشت اور تمام حیوانی غذا خواہ وہ کسی نوع کی ہو ایک سطح پر ہے اور سب قابل احتراز ہے - میں حضرت علی کے اس مشہور قول کو مانتا ہوں جس میں انھوں نے یہ عام مشورہ دیا تھا کہ "لوگوں کو عام طور سے اپنے شکموں کو مردہ جانوروں کی قبر نہیں بنانا چاہیے" اسی طرح میں ذاتی طور پر اس بات کو نہیں مانتا کہ خون کی کوئی قربانی اس خدا کی بارگاہ میں مقبول ہوتی ہے جو تمام مخلوقات کا خدا ہے بلا لحاظ اسکے کہ قربانی کرنے والا ہندو ہے یا مسلمان یا یہودی - اس نیازمند کا عقیدہ تو یہ ہے کہ اس کی بارگاہ میں صرف ایک ہی قربانی قبول ہوتی ہے اور وہ ذاتی قربانی ہے

اس باب میں قرآن کے وہ الفاظ بہت زیادہ قابل اتباع جانتا ہوں جن میں اعلان کیا گیا ہے کہ

''ان قربانی کے جانوروں کا نہ تو گوشت اللہ تک پہونچتا ہے اور نہ خون۔ اُسکی بارگاہ تک جو پہونچتا ہے وہ یہ کہ تم اپنے تئیں برائیوں سے بچاؤ اور اپنے آپ کو پاک رکھو''

(سورۂ حج ۲۲/۳۷)

میں یقین کرتا ہوں کہ جب جذبات اور عقل میں باہم مطابقت ہو جائیگی تو حیوانات کے ذبیحہ اور تحفظ کا سارا مسئلہ مذہب کے دائرہ سے باہر نکال لیا جائے گا اور نفسیات، طب اور اقتصادیات کی روشنی میں اس کا فیصلہ ہوا کرے گا''

دوسری یادداشت بابو پرشوتم داس ٹنڈن صاحب کی ہے۔ اس میں کوئی نئی سفارش پیش نہیں کی گئی ہے بلکہ ساری رپورٹ پر ایک قسم کا تبصرہ ہے۔ البتہ صاحب ممدوح نے رپورٹ کے اُس حصہ سے اپنی بے تعلقی ظاہر فرمائی ہے جس میں ہندو مسلمانوں کے باہمی تعلقات کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔

ٹنڈن صاحب کو شروع ہی سے اس حصہ سے اختلاف تھا۔ اُنکی رائے میں تحقیقاتی کمیٹی کے دائرۂ عمل میں یہ بات داخل ہی نہ تھی کہ اس قسم کا تاریخی تبصرہ رپورٹ کا جزو بنایا جائے۔ چنانچہ اُنھوں نے جب یہ دیکھا کہ بقیہ پانچ اراکین اس جزو کو رپورٹ میں شامل رکھنے کے موافق ہیں تو بجائے اس کے کہ اپنی یادداشت میں اپنے اختلاف کے اظہار پر قناعت فرماتے یہ نرالا اور عجیب وغریب طریقہ اختیار کیا کہ قبل اسکے کہ رپورٹ مکمل ہو اور باقاعدہ کانگریس کے صدر کی خدمت میں بھیجی جائے، صدر کانگریس کو اس مضمون کی ایک تحریری درخواست بھیجی کہ کمیٹی کے نام حکم امتناعی جاری کیا جائے کہ اس قسم کا تاریخی تبصرہ مرتب کرنا کمیٹی کے حدودِ اختیار سے باہر ہے۔

ستم بالائے ستم یہ ہوا کہ کانگریس کی مجلس عاملہ نے خدا معلوم کسی مغالطہ کی بنا پر یا جیسا اُس وقت سمجھا گیا اندرونی ریشہ دوانیوں سے متاثر ہوکر ٹنڈن صاحب کی درخواست قبول کرلی اور ایک امتناعی تجویز منظور کرکے کمیٹی کو بھیجدی۔ مگر غنیمت یہ ہوا کہ جب کمیٹی کی جانب سے دو اراکین نے اصالتاً مجلس عاملہ کے سامنے مرافعہ پیش کیا تو بالآخر وہ امتناعی تجویز کالعدم قرار پائی اور رپورٹ کا یہ اہم جزو قائم رہ گیا۔

ٹنڈن صاحب کے خیالات سے اتفاق ہو یا نہ ہو، مگر اُن کو جو منزلت اپنی قوم میں حاصل ہے اور کانگریس کے حلقہ میں جو اقتدار اُن کا ہے اُسکی بنا پر ضروری ہے کہ اُنکی تنقید اور رایوں کا غور سے مطالعہ کیا جائے۔ اس لیے انشاء اللہ اس جزو کا تمام وکمال ترجمہ بھی آئندہ پیش کیا جائے گا۔

یہاں صرف اُنکے وہ خیالات پیش کیے جاتے ہیں جو سفارشات کے حصہ سے تعلق رکھتے ہیں۔
اس سلسلہ میں اُنکی یادداشت کا آخری جزو درج ذیل ہے :-

" رپورٹ کے تیسرے حصہ میں تمدنی و معاشرتی سفارشات کی دفعہ ۸ (ص ۸۰ الناظر ماہ جنوری) ذبیحہ گاؤ کے مسئلہ سے متعلق ہے۔ جس طریقہ پر یہ مسئلہ طے کیا گیا ہے میں اُس سے متفق نہیں ہوں۔ ہم جانتے ہیں کہ عہد گزشتہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات کو ڈھالنے میں اس مسئلہ نے اہم حصہ لیا ہے۔ میں نے اوپر اسلامی عہد حکومت کی رواداری کا ذکر کیا ہے۔ معاشرتی زندگی کے جس ایک شعبہ میں یہ رواداری صاف طور پر نمایاں تھی وہ مسلمان فرمانرواؤں کا وہ پاس و لحاظ تھا جو وہ گائے کے بارے میں ہندو جذبہ کے متعلق برابر ظاہر کرتے رہے۔ گائے کا مسئلہ اپنی موجودہ صورت میں برطانوی حکومت کا تحفہ ہے۔ عہد اسلامی میں ذبیحۂ گاؤ کا کسی منظم درجہ پر ہونا پڑھنے میں نہیں آتا۔ اصل تو یہ ہے کہ اس بات کی تحریری سند موجود ہے کہ مسلمان بادشاہوں نے مخصوص احکام جاری کیے تھے کہ کسی ضرورت سے بھی گائے ذبح نہ کی جائے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ ۱۸۵۷ء کی لڑائی میں ملک سے گاؤکشی موقوف کرنے کا مسئلہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اتفاق پیدا کرنے کا ایک ذریعہ تھا جس کی بدولت ایسا مستحکم اتحاد قائم ہو سکا ہم نے رپورٹ میں باوجود عارضی اختلافات سے ہندو مسلم تہذیب کے لازمی طور سے ایک ہونے پر زور دیا ہے اور دکھایا ہے کہ باہمگر ایک قسم کے ذہنی اتحاد کے ارتقا میں برطانیہ کے موقع پر نمودار ہونے سے خلل واقع ہوا اور ہم نے مشورہ دیا ہے کہ ہماری تمام سفارشات کا نصب العین یہ ہونا چاہیے کہ دونوں کے تمدن کا ملاً ایک دوسرے میں مدغم ہو جائیں۔ اس خیال کو پیش نظر رکھ کر مجھے محسوس ہوتا ہے کہ مسئلہ گاؤ کے ساتھ وہ سلوک نہیں کیا گیا جو اس نصب العین کو قریب تر کرنے میں معاون ہو۔ ہم اس بات پر جتنا بھی زور دیں کم ہوگا کہ کسی ہندو کو کبھی گائے کا ذبیحہ روکنے کے لیے کسی قسم کا تشدد نہ کرنا چاہیے، لیکن ساتھ ہی اُسکے ہمیں ایسی مخصوص راہ بھی تجویز کرنا چاہئے جو ایسے حالات پیدا کرنے کا سبب ہو کہ اس مسئلہ پر کشیدگی نہ ہونے پائے۔ میرے خیال میں اس طریقہ پر ممکن ہے کہ یہ امر لازم قرار پا جائے کہ تمام گائیں صرف اُن مذابح میں ذبح ہوں گی جو اسی مقصد کے لیے بنائے گئے ہوں اور مواضعات میں جہاں مذابح نہیں ہیں، آبادی سے دُور ذبح کی جائیں گی کہ ہندوؤں کے جذبات مجروح نہ ہوں۔

اس مسئلہ کو حل کرنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک یہ ہے کہ ہندوؤں سے یہ درخواست کی جائے کہ گائے کی نسبت کے جذبات اپنے دلوں سے نکال دیں اور اس رائے کو مان لیں کہ گائے بھی اُسی طرح ذبح کی جا سکتی ہے جس طرح کہ دوسرے جانور۔ دوسرا طریقہ یہ ہے جو اس ملک کی روایات میں داخل ہے کہ اس

سرزمین کے جملہ باشندے بشمول مسلمانان گاے کشی سے اجتناب کریں۔ متعدد رہنماؤں نے وقتاً فوقتاً مسلمانوں کو یہ مشورہ دیا ہے کہ ہر دو جماعت کے برادرانہ تعلقات کی خاطر سے ہندوستان میں گاے کشی موقوف کریں اور اپنی رائے کی تائید میں مذہبی اور تاریخی براہین پیش کیے ہیں۔ میں اس قابل تو نہیں کہ مسلمان جماعت کو یہ مشورہ دے سکوں مگر ساتھ ہی اسکے میں کامل ہندو مسلم ادغام کا خواب دیکھا کرتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ ہندو اور مسلمان ایک ہی محلہ کے اندر پاس پاس گھروں میں رہیں اور باہم نہایت اچھے معاشرتی تعلقات رکھیں اور میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ ہندو اور مسلمان عورتیں باہم اسی قدر معاشرتی تعلقات رکھیں جیسے کہ مرد۔ یہ خواب پورا نہیں ہوسکتا اگر مسلمانوں کے ان ذاتی گھروں میں جو ہندوؤں کے مکانات سے متصل واقع ہیں گاے ذبح ہونے کا امکان ہے۔ ہندوؤں کو اس امر کی ترغیب دینا ممکن ہے کہ جب ایسی قربانیاں ہوں تو وہ خاموش رہیں مگر جہاں ایسی قربانی ہوتی ہو اسکے پڑوس میں سکونت پذیر ہونا ان کے لیے خوشی اور مسرت کا موجب نہیں ہوسکتا۔

آج بھی مسلمانوں کے لیے جو گائیں ذبح ہوتی ہیں ان کی تعداد بہت کم ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ اس سے کسی طرح کی سختی ہوگی اگر ذبیحۂ گاؤ کو ان ذابح میں محدود کر دیا جائے جو آبادی سے کچھ فاصلہ پر باقاعدہ بنائے گئے ہوں اور ذاتی گھروں کے اندر کبھی اس کی اجازت نہ دی جائے۔

ہندوؤں کو یہ صورت قبول کر لینا چاہیے جسکے بعد گاے کا مسئلہ دونوں جماعتوں کو جدا نہ ہونے دیگا۔

بقیہ تمام سفارشات سے میں کلیۃً متفق ہوں۔ ہم نے ان تمام امکانی ذرائع کا احاطہ نہیں کیا ہے جنکے ذریعہ ہندو مسلمان باہم متحد کیے جاسکتے ہیں بلکہ صرف ان طریقوں کو ظاہر کیا ہے جن پر اگر عمل کیا گیا تو بہت جلد ساری فضا میں ایسی تبدیلی ہو جائے گی جو دوسرے تعلقات اور رشتے قائم کرنے میں معین ہوگی تا آنکہ بالآخر ان کا جداگانہ وجود ہندوستانی قوم کی ایک بڑی انفرادیت میں مدغم ہو جائے گا۔"

آئندہ قسط میں انشاءاللہ تیسری یادداشت کے ضروری اجزا پیش کیے جائیں گے

بقیہ ص ۱۵۶

افسوس کہ آں نظر کی دلی قدر دان اور علمی معاون بیگم صغرا علی، جنکی "عورتوں کی انشا" ادب اردو کا قابل قدر نمونہ اور اپنے مبحث پر بہترین تصنیف ہے، جمعہ ۸ر فروری کی شب کو اس دار فانی سے رحلت کر گئیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ عورتوں کے نام سے نظم و نثر کا جو ذخیرہ اردو میں جمع ہوا ہے اسکے علی الرغم کہا جاسکتا ہے کہ مرحومہ پاکیزہ ادبی ذوق اور شستہ و فصیح انشا کے لحاظ سے اپنی نظیر آپ ہی تھیں۔ اللہ تعالیٰ جنت نعیم عطا فرمائیں۔ آمین

نظرے خوش گزرے

فروری کا مہینہ ۲۸ دن کا۔ اور سال کے اس سب سے چھوٹے مہینے میں یہ اُفتاد پیش آئی کہ عرصہ دراز سے وکٹوریہ اسٹریٹ کے جس مکان میں کتابوں کا ذخیرہ، مطبع اور الناظر کا دفتر تھا اور جہاں بارہ سال سے زائد اہل و عیال سکونت بھی رہی تھی، اُسکا تخلیہ کر کے جوہری محلہ کے ایک مکان میں سب سامان پہونچانا پڑا۔ اور اسکی بدولت تقریباً دس دن تک الناظر کا کام بالکل بند رہا۔ کوشش کی جائیگی کہ تاخیر سے کام شروع ہونے کے باوجود یہ پرچہ ۲۸ فروری تک شایع ہو جائے۔ مگر شاید اس میں کامیابی نہ ہو۔ اس لیے ناظرین سے التماس ہے کہ تھوڑی تاخیر سے چیں بہ جبیں نہ ہوں۔

بعض قدردانان الناظر کبھی کبھی یہ خواہش ظاہر فرمایا کرتے تھے کہ ہر جلد کے صفحات مسلسل رکھے جائیں اور تکمیل جلد کے بعد ایک فہرست مضامین مرتب کر دی جایا کرے تاکہ جو لوگ پرچوں کو احتیاط سے جمع کرتے ہیں اُنکو آیندہ اُن سے کام لینے میں آسانی ہو۔ زمانہ اور معارف وغیرہ میں برابر اسکا التزام کیا جاتا ہے مگر میری حالت یہ تھی کہ احباب کی توجہ دہانی پر ارادہ کرتا بھی تو جلد کے شروع کرتے وقت اسکا خیال نہ رہتا۔ اب کی جناب مولوی مقبول احمد صاحب صمدنی نے پھر توجہ دلائی۔ چنانچہ اس نمبر سے یہ طریقہ شروع کیا جاتا ہے۔ اور انشاءاللہ کوشش کی جائیگی کہ یہ سلسلہ برابر جاری رہے۔

"لکھنوی اور دہلوی مدارس شاعری" پر جنوری نمبر میں برادرم اسمٰعیل احمد صاحب تسنیم کا جو مضمون شایع کیا گیا، وہ محض قسط اول تھی۔ مگر خاتمہ پر "باقی آیندہ" درج ہونے سے رہ گیا جسکی بنا پر بہت سے احباب نے یہ سمجھا ہوگا کہ مضمون ختم ہو گیا، اور اس سے ممکن ہے کہ صاحب مضمون کے متعلق سوءظن بھی پیدا ہوا ہو۔ عزیز موصوف نے وعدہ کیا تھا کہ دوسری قسط بھی جلد پہونچ جائیگی، مگر اس اثنا میں اُنھیں حیدرآباد سے وطن آنا پڑا اور یہاں کی مصروفیتوں نے اُسکی تکمیل کا موقع نہ دیا۔ اُمید ہے کہ مارچ کے پہلے ہفتہ میں وہ حیدرآباد واپس پہونچ جائینگے اور وہاں سے جلد بقیہ مضمون ارسال کر سکیں گے۔ سردست اپنی اس مجبورانہ کوتاہی کی تلافی کے لیے وہ ناظرین الناظر کی خدمت میں "تلافی مافات" پیش کرتے ہیں۔ یہ افسانہ انشاءاللہ دو تین نمبروں میں ختم ہو جائے گا۔

(بقیہ بر ۱۵۵)

بابتمام خدا و خدمت جہان تقریب

النّاظر

نمبر ۳ جلد ۲۹ ———— مارچ سنہ ۱۹۳۵ء

صوفیاء اور بادشاہوں کے تعلقات

کتب تاریخ اور ملفوظات کے مطالعہ سے خواجہ عبید اللہ احرارؒ کے حالات

(جناب مولوی محمد تقی احمد صاحب - ایم اے ایل ٹی)

(۱) ملفوظات کی تاریخی حیثیت

علم تاریخ کا دائرہ اس قدر وسیع ہے کہ محض بادشاہوں اور امراء کے حالات کو مکمل تاریخ کہنا اس علم کی جائز وسعت کو بیجا طریقہ سے محدود کر دینا ہے۔ ایسی تحقیقات جو دورِ ماضیہ کے حکمرانوں کے حالات اور ان کے عہد کے چند حیرت انگیز واقعات تک محدود ہوں مورخ کے لیے ناکافی ہوتی ہیں، اور اس لیے ضرورت ہوتی ہے کہ وہ دوسرے ذرائع سے تفتیش کر کے دنیا کے سامنے کسی دور کی تاریخ کا مکمل خاکہ پیش کرے۔

صوفیا کے ملفوظات اور تذکروں کا مطالعہ اس موقع کے لیے نہایت مفید ثابت ہوتا ہے۔ اس وجہ سے کہ ان سے اکثر ایسے واقعات کا بھی انکشاف ہو جاتا ہے جن پر معاصر مورخین نے توجہ کرنا مناسب نہ سمجھا۔ علاوہ ان کے [illegible] سے [illegible] زندگی کا طریقہ، [illegible] کی معاشرتی اور تمدنی ترقی کا بھی پتہ [illegible] ایک [illegible] ملفوظات اور تذکرے [illegible] ہو کے آگے

حاجتیں لیکر آتے تھے اور ضرورتاً یا سبیل تذکرہ بہت سے واقعات بھی بیان کر جاتے تھے، جو ملفوظ نگاروں اور تذکرہ نویسوں نے محفوظ کر لیے ہیں۔ یہ واقعات عام طور پر صحیح ہوتے تھے اس واسطے کہ غلط بیانی تو شے دیگر ہے اپنے معتقد الیہ سے قلبی کیفیات کا خفا بھی اعتقادی حیثیت سے گناہ سمجھا جاتا تھا۔

اس موقع پر سلاطین خلجیہ کے دور کا ایک واقعہ یاد آتا ہے جس کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا۔ سلطان جلال الدین خلجی کا زمانہ تھا۔ امیر خسرو دربار شاہی اور خانقاہ نظام الدین اولیاؒ دونوں مقامات کے حاضر باش تھے۔ بادشاہ نے چاہا کہ اُن کے ذریعہ سے بلا اطلاع حضرت نظام الدینؒ کی خدمت میں حاضر ہو۔ حضرت عادتاً بادشاہوں کی ملاقات سے گریز فرماتے تھے۔ بادشاہ نے امیر خسرو کے ذریعہ سے معلوم کر لیا کہ حضرت کس وقت ملتے ہیں۔ ساتھ ہی تاکید بھی کر دی کہ اس امر کی اطلاع حضرت کو نہ ہونے پائے۔ امیر خسرو نے بادشاہ سے وعدہ تو کر لیا مگر گھر پہونچ کر عقیدت نے سخت گیری کی اور نہ رہا گیا۔ حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بادشاہ کے ارادہ سے مطلع کیا۔ چنانچہ حضرت اُس وقت دہلی سے باہر چلے گئے اور بادشاہ کو خانقاہ سے ملاقات ہوئے بغیر واپس جانا پڑا۔ جب امیر خسرو دربار میں حاضر ہوئے تو بادشاہ نے اُن سے پوچھا کہ یہ کیا کیا۔ اُنھوں نے صاف کہدیا کہ گھر پہونچکر دل نے نہ مانا۔ میں نے سوچا کہ پیر سے چھپانا اُنکی نارضامندی کا باعث ہوگا جس سے دین اور دُنیا دونوں کا نقصان ہے، بخلاف اسکے ظاہر کر دینے میں بادشاہ کی خفگی کا اندیشہ ہے جس سے صرف دُنیا کی تکلیف جھیلنا پڑیگی، اس لیے میں نے بادشاہ کی خفگی کو آسان سمجھا اور حضرت کو اطلاع دے دی۔

اس واقعہ سے پتہ چلتا ہے کہ عقیدتمند امرا اور درباریوں کی زبان سے جن واقعات کا تذکرہ اپنے معتقد الیہ صوفیا کے سامنے ہوتا تھا اُن کی صحت میں کوئی شبہہ نہیں کیا جا سکتا۔ اسی لیے ملفوظات اور تذکرے جس حد تک تاریخی واقعات کا پتہ دیتے ہیں اُنکی شہادت ضرور قابل لحاظ ہے۔

اکابر صوفیا کے ملفوظات کی خاصی تعداد دستیاب ہوتی ہے۔ اس موقع پر ہم اُن میں سے دو پر مختصراً تنقید کرنا چاہتے ہیں تاکہ سلسلۂ نقشبندیہ کے ایک مشہور بزرگ حضرت عبید اللہ احرارؒ سمرقندی کے کچھ حالات ناظرین کے سامنے پیش کریں۔

حضرت کے مفصل حالات یا مکمل سوانح حیات کی گنجایش اس مختصر مضمون میں نہیں ہے۔ ہم صرف آپ کے ملکی خدمات اور سیاسی اثرات پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔ مگر بہتر ہوگا کہ پہلے ان دونوں ملفوظات کی تاریخی حیثیت ناظرین کے سامنے پیش کر دی جائے تاکہ واقعات کی صحت میں شک کی گنجایش نہ رہے۔

اس موقع پر بغرض تعارف یہ یاد دلانا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ حضرت عبید اللہ احرار وہی بزرگ ہیں جنکے

مولانا جامیؒ نے یوسف زلیخا میں حمد و نعت کے بعد ہی ایک عنوان قائم کیا ہے اور ۵۳ اشعار نظم کیے ہیں، جن میں سے "چو فقر اندر قبائے شاہی آمد - بہ تدبیر عبید اللّٰہی آمد" بہت زباں زد ہو گیا ہے۔

تاریخ کی کتابوں میں بھی کئی جگہ آپ کا تذکرہ ہے۔ بابر نے اپنے چچا سلطان احمد مرزا شاہ سمرقند کے حالات میں لکھا ہے" وہ حضرت خواجہ عبید اللہ احرارؒ کا مرید تھا۔ حضرت کے سامنے نہایت درجہ آداب کا لحاظ رکھتا تھا۔ آپ کی محفل میں اُس نے کبھی ایک زانو دوسرے زانو پر نہیں رکھا۔ مگر اپنی عادت کے خلاف ایک مرتبہ سلطان حضرت کی محفل میں پیر جوڑ کر بیٹھا۔ رخصت ہونے کے بعد حضرت کے اشارے سے نشست کی جگہ دیکھی گئی تو وہاں ایک ہڈی سی ملی۔ جس کی وجہ سے مجبوراً سلطان کو ترک ادب کرنا پڑا۔

سلطان احمد کے باپ سلطان ابوسعید مرزا کو بھی حضرت خواجہ سے نہایت عقیدت تھی۔ صاحب تاریخ رشیدی لکھتے ہیں کہ

سلطان ابوسعید کہ در تمشیت امور ملک و ملت پیوستہ با حضرت خواجہ مشورت می کرد و از غایت نیازمندی گاہے پیادہ برابر اسپش رفتہ لوازم کمال ارادت بجا می آورد۔

ملکی اور مذہبی معاملات میں حضرت خواجہ سے مشورہ کرتا تھا اور نہایت نیازمندی سے آپ کے گھوڑے کے ساتھ پا پیادہ چل کر اپنی کمال عقیدتمندی کا اظہار کرتا تھا۔

اگرچہ بابر کے بچپن ہی میں حضرت خواجہ کی وفات ہو چکی تھی پھر بھی اپنے بزرگوں کے قدم بقدم اُسکو آپ سے نہایت درجہ عقیدت تھی۔ چنانچہ بابر نامہ میں جمعہ ۶ر نومبر ۱۵۲۸ء کے واقعات میں درج ہے کہ میرے جسم میں اس قدر حرارت بڑھ گئی تھی کہ میں جمعہ کی نماز بمشکل پڑھ سکا مغرب کے دن ۲۷ر صفر کو میں نے سوچا کہ حضرت خواجہ عبید اللہ احرارؒ کے رسالہ والدیہ کو نظم کروں۔ میں نے دل میں خیال کیا کہ حضرت کی توجہ سے اگر مجھکو صحت ہو گئی تو میں یہ سمجھوں گا کہ یہ نظم مقبول ہوئی جیسے کہ صاحب قصیدہ بُردہ کو قصیدہ کی مقبولیت کے انعام میں لقوہ سے نجات ہو گئی تھی۔ چنانچہ میں نے مولانا جامیؒ کی سبحۃ الابرار کے وزن پر نظم کرنا شروع کر دیا۔ گزشتہ سال ایک مہینہ یا چالیس روز گزرتا رہا تھا مگر اس سال خدا کی عنایت اور حضرت کی توجہ سے مجھکو ۲۹ر صفر چہارشنبہ کے روز چھٹکارا مل گیا، صرف کسل باقی رہا۔

(۲) رشحات اور سلسلۃ العارفین

کتب تاریخ سے حضرت خواجہ کے متعلق ہم کو صرف ایسے ہی جستہ جستہ حالات ملتے ہیں۔ آپ کے مفصل سوانح حیات اور ملکی و سیاسی خدمات سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے اس کی ضرورت ہے کہ ہم ملفوظات کی طرف توجہ کریں۔ مترجم بابر نامہ مسز بویرج نے بھی غالباً اسی وجہ سے آپ کے ایک

مطبوعہ ملفوظ یعنی رشحات کا مطالعہ کیا اور اپنے ترجمۂ بابرنامہ میں اُس سے جا بجا نوٹ بھی لیے۔

رشحات مطبوعہ صورت میں ۳۶۰ صفحے سے زائد کی کتاب ہے۔ اس میں سلسلۂ نقشبندیہ کے بزرگوں کے حالات ہیں۔ مُلا فخرالدین علی بن حسین الواعظ الکاشفی (یعنی خلف الصدق مصنف انوار سہیلی) اس ملفوظ کے جامع ہیں۔ سبب تالیف یہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت خواجہ کے آستانہ پر آخر ماہ ذیقعدہ ۸۸۹ھ اور اوائل ماہ ربیع الثانی ۸۹۳ھ میں دو مرتبہ حاضر ہوئے۔ روزانہ جو کچھ آپ کی زبان سے سنتے اُس کو اپنے دماغ میں محفوظ کر لیتے اور گھر آکر لکھ لیتے تھے۔ حضرت خواجہ کی وفات کے بعد اُس روزنامچہ کی ترتیب شروع کی تاکہ مفارقت کی تکلیف اس طرح یاد کرنے سے کم ہو جائے اور دوسروں کو بھی استفادہ کا موقع ملے۔ مگر یہ ملفوظ اپنی موجودہ حالت میں سولہ برس بعد مرتب ہو پایا۔ چونکہ اصل غرض حضرت خواجہ کے حالات کے بیان سے تھی اس لیے کرامات، ارشادات، اور کچھ خاندانی حالات بھی اضافہ کیے گئے۔ تتمہ کتاب میں ایک فارسی تاریخ بھی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ رشحات تاریخی نام ہے۔

(پابند محاسبان سنجیدہ صفات + تاریخ تمامش زحروف رشحات)

رشحات میں ایک اور ملفوظ کا حوالہ ہے جس سے مدد بھی لی گئی ہے حضرت خواجہ کے مخصوص اصحاب کے حالات میں مولانا محمد قاضی کا تذکرہ کرتے ہوئے مصنف رشحات لکھتے ہیں کہ مولانا نے حضرت خواجہ کے مناقب میں ایک کتاب تالیف کی ہے جس کا نام سلسلۃ العارفین و تذکرۃ الصدیقین ہے۔ یہ کتاب مطبوعہ نہ ہونے کی وجہ سے نادرالوجود ہے۔ مگر خوش قسمتی سے ایک وسیع النظر بزرگ نے حضرت خواجہ کے ذکر میں بیان فرمایا کہ یہ کتاب اُن کے کتب خانہ میں موجود ہے اور بکمال شفقت مجھے پڑھنے کے لیے عنایت بھی فرمائی۔ چونکہ کتاب پر مصنف کا نام ہے اور کتاب کا نام درج نہیں اس لیے خیال ہوا کہ رشحات سے اس کا مقابلہ کیا جائے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ در اصل یہ وہی ملفوظ ہے جس کا تذکرہ اوپر آچکا ہے یا کوئی اور کتاب ہے۔

رشحات میں مولانا محمد قاضی کے حالات میں لکھا ہے:-

"مولانا محمد قاضی از اجل اصحاب حضرت ایشاں اند و در مناقب و شمائل و خصائص و فضائل آں حضرت کتابے تالیف کردہ اند مسمی بہ سلسلۃ العارفین و تذکرۃ الصدیقین۔ در آنجا آوردہ اند..... کہ ابتدائے ملازمت من حضرت ایشاں را آں بود کہ با طالب علم کرمانی مولانا نعمت اللہ نام از سمرقند بہ عزیمت ہرات بیروں آمدہ بودیم چوں بہ دہ شادماں رسیدیم و بواسطۂ گرمی ہوا توقف کردیم نماز دیگر بود کہ حضرت ایشاں رسیدہ۔ بملازمت رفتم۔ پرسیدند از کجائی گفتم از سمرقند بعد ازاں بہ حکایت مشغول شدند و آنچہ در خاطر بود ہمہ را اظہار فرمودند از انجملہ سخنے بود کہ فقیر را سرگشتہ ساختہ از یں

ولایت می بود آنرا بروجہے اظہار کردند کہ خاطر فقیر بجانب ایشاں قوی منجذب شد"

تھوڑی ہی تلاش کے بعد قلمی ملفوظ میں بعینہٖ یہ واقعہ ان الفاظ میں مل گیا :-

"در ابتدا ے آنکہ ایں فقیر جامع ایں جمع و تالیف (بخط) مت شریف حضرت ایشاں مشرف شدم آں بود کہ مولانا نعمت اللہ (طا) ب علے کرانی از سمرقند بعزیمت ہرات متوجہ شدہ بیروں آمدہ بود کہ بقریۂ شادماں رسیدیم مولانا نعمت اللہ گفتم کہ ہوا بنہایت گرم است ———— لحظہ در باغ حضرت خواجہ توقف کنیم تا ہوا باعتدال شود چناں کردیم نماز دیگرے بود کہ شخصے آمد کہ حضرت خواجہ می آیند توقف کردیم لحظہ بود کہ حضرت ایشاں آمدند بہماں جائے کہ ما بودیم متوجہ ایں کمینہ شدند و فرمودند کہ از کجائی و بحکایت مشغول شدند و آنچہ بخاطر بود ہمہ را اظہار کردند از آنجملہ (سخنے بود) کہ فقیر را سرگشتہ ساختہ ازیں ولایت می برد آنرا بروجہے اظہار کردند کہ خاطر فقیر بجانب ایشاں قوی نگراں شد"

سوائے چند الفاظ کے تغیر و تبدل کے بعینہٖ وہی عبارت ہے جس سے یقین ہوگیا کہ یہ کتاب وہی ملفوظ ہے۔ اسکے بعد مولانا محمد قاضی جامع ملفوظ کے مزید حالات کی تلاش ہوئی، جسکے سلسلہ میں چند واقعات بابرنامہ و حبیب السیر کے مطالعہ سے دستیاب ہوئے - یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ ان دونوں تاریخوں میں جن بزرگ کا ذکر ہے وہ یقیناً یہی خواجہ مولانا محمد قاضی ہیں مگر گمان غالب یہ ہے کہ کوئی اور شخص اس نام کے خواجہ عبید اللہ احرار کے مخصوص اصحاب میں نہیں تھے -

بابرنامہ میں ایک جگہ تو سمرقند کو پہلی مرتبہ چھوڑنے کے بیان میں بابر نے لکھا ہے کہ میرے استاد اور پیر خواجہ مولانا قاضی کے خطوط آئے جن میں سمرقند سے واپس آنے کی فرمایش تھی اور دوسری مرتبہ اپنے لشکر کے خجند پہونچنے اور دشمنوں کے اندجان پر قابض ہونے کے واقعات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ دشمنوں نے خواجہ مولانا قاضی کو شہید کر ڈالا - اور بڑی بے حرمتی سے اُن کی لاش قلعہ کے دروازہ پر لٹکائی - ان کا اصل نام عبد اللہ تھا اور یہ حضرت خواجہ عبید اللہ احرار کے مُرید تھے اور انھیں کے تربیت یافتہ - کوئی شک نہیں کہ وہ ولی تھے کیونکہ ان کے قتل میں سعی کرنے والے تھوڑے ہی دنوں میں ناس ہوگئے -

حبیب السیر میں بھی یہ واقعہ اسی نوعیت سے درج ہے جسکے چند الفاظ نقل کیے جاتے ہیں :-

"خواجہ مولانا قاضی را کہ موسوم بعبید اللہ بود و بدستور معہود در دولت خواہی حضرت پادشاہی سعی می نمود بر دار کشیدہ شہید ساختند ...... حالانکہ از جملہ تربیت یافتگان حضرت ولایت پناہ خواجہ ناصر الدین عبید اللہ بود"

تاریخ کی کتابوں سے صرف اسی قدر پتہ چلتا ہے کہ مولانا محمد قاضی حضرت خواجہ کے اجل اصحاب میں سے

تھے۔ ان کا جامع ملفوظ ہونا ہم کو صرف ملفوظات سے معلوم ہوتا ہے۔ مگر دقت یہ ہے کہ تاریخ میں ان کا نام عبد اللہ دیا ہے جس کا ذکر ملفوظات میں نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ غیر معروف ہونے کی وجہ سے صاحب رشحات نے ان کے حالات میں اس کے لکھنے کی ضرورت نہ سمجھی ہو۔ لہذا پورے وثوق کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مولانا محمد قاضی جامع ملفوظ سلسلۃ العارفین وہی شخص ہیں جن کا کتب تاریخ میں ذکر ہے یا کوئی اور بزرگ۔ مگر اول تو حضرت عبید اللہ احرار کے اجل اصحاب کی فہرست میں اس نام کے ایک ہی شخص کا ہونا اور دوسرے سلسلۃ العارفین کے ایک حصہ کے خاتمہ پر اس عبارت کا موجود ہونا

"وجمع من ہو مقبول ومنظور لحضرت العالی.... المشہور بین الخلائق ..... مولانا محمد قاضی"

اس خیال کی تائید کرتا ہے کہ یہ وہی بزرگ ہیں۔ اُنکی شہادت کے واقعہ کا تذکرہ رشحات میں نہ ہونا بالکل قرین قیاس ہے۔ اس لیے کہ ملفوظ کے مرتب کرنے کے وقت تک وہ ضرور زندہ تھے جیسا کہ اُنکے حالات کی عبارت سے پتہ چلتا ہے۔

(۳) حضرت خواجہ عبید اللہ احرار کے ملکی خدمات

اب ان ملفوظات سے ہم چند ایسے واقعات نقل کرتے ہیں جو حضرت خواجہ عبید اللہ احرار کے ملکی خدمات اور ایسے غیر معمولی اقتدار کا پتہ دیتے ہیں جس سے شاہانِ وقت بھی مرعوب تھے۔ رشحات میں "صلح دادن حضرت ایشاں سہ بادشاہ مخالف را در یک معرکہ" کی سرخی سے ایک نہایت دلچسپ اور تعجب خیز واقعہ درج ہے۔ یہ سلسلۃ العارفین سے نقل کیا گیا ہے جس کے جامع (خواجہ مولانا قاضی) خود اس موقع پر حاضر تھے۔ لہذا بجائے رشحات کے اس قلمی ملفوظ کا لفظ بلفظ ترجمہ کیا جاتا ہے:-

"مرزا سلطان احمد مرزا عمر شیخ اور سلطان محمود خاں کی ملاقات کا واقعہ:- معلوم ہوا کہ مرزا عمر شیخ نے سلطان محمود خاں کو اپنی مدد کے لیے بلایا ہے اور دونوں شاہرخیہ کے مقام پر معہ لشکر موجود ہیں۔ سلطان احمد مرزا بہت بڑے لشکر کے ساتھ اُنکے مقابلہ کے لیے چلے اور حضرت (خواجہ عبید اللہ احرار) کو بھی ساتھ لے لیا اور یہ ظاہر کیا کہ حضرت کو صلح کے لیے لیے جاتا ہوں۔ چالیس روز شاہرخیہ میں قیام رہا۔ اکتالیسویں دن آق قورغان میں جو شاہرخیہ کا ایک موضع ہے سلطان احمد کا لشکر فروکش ہوا۔ حضرت نے مرزا سلطان احمد سے فرمایا مجھکو کیوں لائے میں لڑائی کے کام کا نہیں، اگر لڑنا ہی تھا تو میرا ساتھ لانا بیکار ہوا، اگر صلح کا ارادہ ہے تو تاخیر کیوں ہے، مجھکو تمھارے لشکر کے قیام نے پریشان کر دیا ہے، اب زیادہ رُکنا ممکن نہیں۔ مرزا نے جواب دیا میرا کیا اختیار ہے جو حضور چاہیں کر سکتے ہیں، مجھ کو ذرا بھی دریغ نہ ہوگا۔ چنانچہ حضرت سوار ہو کر مرزا عمر شیخ اور سلطان محمود سے ملنے کے لیے شاہرخیہ کی طرف چلے۔ میں (مولانا محمد قاضی)

بھی حضور کے ہمرکاب تھا۔ اُن لوگوں کو حضرت کے تشریف لانے کا علم ہوگیا، استقبال کے لیے حاضر ہوئے اور حضرت کے ساتھ شاہرخیہ کی طرف چلے۔ راستہ میں حضرت نے سلطان محمود خاں سے تپاک التفات فرمایا اور صلح کی معاملت کو طے کر دیا۔ قرار پایا کہ تینوں لشکر ایک دوسرے کے مقابل صف باندھکر کھڑے ہوں اور درمیان میں ایک شامیانہ لگا یا جائے جس میں تینوں بادشاہ اور حضرت خواجہ تشریف فرما ہوں۔ حضرت آپس میں اُسی جگہ صلح کرادیں۔ اور شرائط کا تعین ہو جائے۔ اسکے بعد سہ پہر تک لشکر کوچ کرے۔ حضرت کی توجہ کا مرزا سلطان محمود خاں پر خاص اثر طاری ہوتا تھا۔ صبح تڑکے مرزا سلطان احمد کا لشکر ساز وسامان سے تیار ہو گیا۔ یہ طے ہو چکا تھا کہ سپاہی صرف جلیتہ نہ پہنیں باقی تمام ہتھیار لگالیں۔ بعض نے چھپا کر جلیتہ بھی پہن لیا۔ دوسری طرف سے سلطان محمود خاں اور مرزا عمر شیخ کا لشکر ہتھیار بند روانہ ہوا اور موضع تھقیہ میں پہونچکر اُسنے اپنی صفیں درست کرلیں حضرت پھر شاہرخیہ تشریف لے گئے تاکہ سلطان محمود خاں اور مرزا عمر شیخ کو اپنے ساتھ لے آئیں۔ بہت دیر کے بعد آپ کے ساتھ یہ دونوں آئے اُسوقت لشکروں نے اپنی صفوں کو درست کیا۔ شامیانے کے نصب کرنے میں اختلاف ہوگیا۔ یہانتک کہ بات بڑھ گئی۔ حضرت دونوں لشکروں کے درمیان تشریف رکھتے تھے۔ آپنے ظہر کا وضو یہیں کیا اسکے بعد میری طرف مخاطب ہوکر فرمایا کہ مرزا سلطان احمد سے جاکر میری طرف سے کہو کہ میں اکیلا اس بڑھاپے میں تمھارے تمام لشکر اور ہتھیاروں کا بوجھ اُٹھائے ہوئے ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ لشکر تباہ نہیں ہو جاتا۔ اتنا ہی کیا کم ہے اب اس سے زیادہ طاقت نہیں رکھتا۔ اگر تم کو میرے ساتھ خلوص ہے تو دوسری طرف کے لوگوں کو جہاں وہ چاہیں شامیانہ لگا لینے دو۔ یہ پیغام پہنچتے ہی اُس خوش اعتقاد بادشاہ نے حکم دے دیا کہ وہ لوگ جہاں کہیں وہیں شامیانہ نصب کر دو، مجھ کو حضرت پر بھروسا ہے۔ اسکے بعد مرزا سلطان احمد اپنے ارکین سلطنت اور امراء کے ساتھ آکر شامیانے میں بیٹھ گیا۔ کچھ عرصے کے بعد سلطان محمود خاں اور مرزا عمر شیخ کو ہمراہ لیکر حضرت بھی تشریف لائے۔ جب یہ دونوں شامیانے کے نزدیک پہنچے مرزا سلطان احمد انکے استقبال کے لیے اپنے امرا کو ہمراہ لیکر شامیانے کے باہر آیا۔ حضرت نے سلطان محمود خاں کو پہلے آگے بڑھایا اور مرزا سلطان احمد سے معانقہ کرایا۔ اسکے بعد مرزا عمر شیخ کو۔ دونوں بھائیوں میں معانقہ ہوا۔ مرزا عمر شیخ نے بھائی کے ہاتھ کو بوسہ دینا اور رونا شروع کیا، اور وہ بھی عمر شیخ کی گردن سے لپٹا تھا اور روتا تھا۔ یہ دیکھ کر تمام لوگ رونے لگے اور بڑا شور مچا۔ اس کے بعد شامیانے کے نیچے نشست ہوئی۔ مجلس بڑی پرہیبت تھی۔ میں نے ہیبت کے مارے اپنے مُنہ پر کپڑا ڈال لیا۔ دونوں لشکر مستعد کھڑے تھے کہ ذراسی بات پر تلوار چلنے لگے۔ میں نے ما حضر پیش کیا جب کھانا ہو چکا تو صلحنامہ لکھا گیا۔ حضرت نے تاشقند سلطان احمد کے قبضے سے نکال کر سلطان محمود خاں کو دیا۔ ہر شخص کی زبان پر یہی تھا کہ حضرت نے جو کچھ کیا وہ تصرف اور قوتِ ولایت کا کمال ہے۔ آپ کی تشریف آوری سے ایک لمحہ میں سب کے دل سے دشمنی ایسی دور ہوگئی

گویا کبھی تھی ہی نہیں۔ اس واقعہ سے لوگوں کا اعتقاد اور زیادہ ہوگیا۔ بعض لوگ تو کہتے تھے کہ معلوم نہیں پُرانے مشائخ میں سے بھی کسی میں یہ طاقت تھی یا نہیں۔ جب مجلس ختم ہوگئی تو دونوں لشکر کے لوگ اس طرح ایک دوسرے سے ملے جیسے بھیڑ کا بچہ بھیڑ سے۔ حضرت نے سلطان محمود خاں سے فرمایا تم تاشقند چلو میں دوسرے راستے سے آتا ہوں۔ حضرت لشکر سے باہر نکل کر مولکت کی جانب تشریف لیجلے۔ راستے میں میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا میری کوششوں کی بابت تمہاری کیا رائے ہے۔ اس واقعہ کو یاد رکھو اور لکھ لینا"

تاریخ حبیب السیر سے بھی اس واقعہ کا ثبوت ملتا ہے۔ مورخ نے حضرت خواجہ کے حالات میں لکھا ہے۔

"حکایت مشہور است و برالسنۂ افواہ ثقات مذکور کہ نوبت عمر شیخ مرزا و سلطان محمود مرزا باکدیگر اتفاق نمودہ لشکر بسمرقند کشیدند و سلطان احمد مرزا از شہر بیرون رفتہ بمقابلہ و مقاتلہ ایشان مبادرت نمود و همت ساخت و روزے کہ ہر دو سپاہ در برابر یکدیگر صف قتال بیاراستند ناگاہ خبر رسید کہ خواجہ ناصرالدین عبید اللہ دراں معرکہ تشریف آوردند ...... خواجہ عبید اللہ بہ آنجا رسیدہ بہ زلال موعظت و نصیحت قتال و جدال را انطفا داد و ہر سہ پادشاہ را بصلح و صفا راضی ساختہ فرمود تا درمیان میدان شامیانہ بر افراشتند ...."

اس طرح کے کثرت سے واقعات رشحات اور سلسلۃ العارفین میں موجود ہیں جن کی گنجایش ایک مبسوط کتاب ہی میں ہوسکتی ہے۔ بخیال طوالت صرف چند نقل کیے جاتے ہیں۔ آپ کے ارشادات کے سلسلے میں مولانا محمد قاضی نے سلطان ابو سعید مرزا کا ایک اور واقعہ لکھا ہے جسکا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔

"حضرت فرماتے ہیں کہ میں نے سلطان ابو سعید سے کہا کہ فلاں شخص کا تمغہ (ٹیکس) معاف کردو۔ اُنھوں نے مان لیا اور حکم دیدیا کہ اس شخص سے نہ لیا جائے۔ کچھ دنوں بعد میں نے اُن سے ایک بار کہا کہ آپ کی خدمت میں مجھکو بہت دنوں سے نیاز ہے مگر نہایت نادم ہوں کہ اتنا عرض کرنے کی ہمت نہیں ہوتی کہ جب تمغہ شرعاً ناجائز ہے تو ایسے ہی شخص کا کیوں معاف کیا جائے عام رعایا اس کی معافی سے کیوں نہ مستفیض ہو۔ مرزا نے اُس وقت سکوت کیا اور میں بھی یہ کہکر چُپ ہوگیا۔ جب مرزا کے دربار سے گھر واپس آیا تو میں نے نور سعید سے یہ واقعہ بیان کیا۔ اُنھوں نے بوقت ملاقات مرزا سے کہا کہ بڑے تعجب کی بات ہے کہ آپ حضرت کے اتنا کہنے کے بعد بھی تمغہ کی عام معافی پر آمادہ نہ ہوئے۔ مرزا نے جواب دیا میری جرأت نہیں پڑی کہ حضرت کے سامنے ایسی بات کا دعوے کروں جس پر میری ہمت پورے طور پر مستعد نہیں تھی لہذا میں نے سکوت کیا۔ اب انشاءاللہ حضرت

کی خواہش کے موافق عام معافی کا حکم جاری کر دوں گا۔ چنانچہ تھوڑے ہی دنوں کے بعد تمام رعایا کا تمغہ معاف ہوگیا۔"

بابرنامہ سے پتہ چلتا ہے کہ سلطان محمود مرزا خلف سلطان ابوسعید نے حضرت خواجہ کی وفات کے بعد ابواب جاری کرنے میں بڑی شدت کی۔ چنانچہ بابر نے سلطان محمود کے حالات میں لکھا ہے کہ حضرت خواجہ کی اولاد کی بدولت بہت سے مفلس اور غریب لوگ ٹیکس (ابواب) دینے سے معاف تھے، مگر اب اُن سے بڑے ظلم و تعدی کے ساتھ تحصیل ابواب کی جاتی ہے۔ خود حضرت خواجہ کی اولاد سے بھی تشدد کے ساتھ ابواب طلب کیے گئے۔

ان واقعات سے صاف پتہ چلتا ہے کہ حضرت خواجہ کی شخصیت کا شاہانِ وقت پر کس قدر اثر تھا۔ بادشاہوں میں آپ سے سوءِ اعتقاد رکھنے والے بھی تھے۔ جن میں سے ایک تو یہی سلطان محمود تھا جس کے زمانہ کا مختصر حال بابرنامہ میں ملتا ہے۔ بابر نے اس کے محاسن اور معائب دونوں بیان کر دیے ہیں۔ لکھا ہے کہ وہ خوش خلق اور منتظم تھا مگر شراب اور امرد پرستی کا اس حد تک دلدادہ تھا کہ اس کے امراء کے کمسن بچے بھی نہ بچتے تھے۔ بابر لکھتا ہے کہ یہ رواج اسکے زمانہ میں اس درجہ عام ہوگیا تھا کہ ہر شخص اس کو فیشن سمجھ کر کرتا تھا۔ اسکے دربار میں کبھی کبھی علانیہ فواحش کا اجراء بھی ہوتا تھا۔ حضرت خواجہ سے اسکو سوءِ ظن تھا۔ رشحات میں سلطان محمود کے نام حضرت خواجہ کا ایک خط موجود ہے جسکا طرز تحریر عجیب شان کا ہے۔ اُسکا بھائی احمد مرزا سمرقند کا بادشاہ تھا۔ جسکے ملک پر چڑھائی کرنے کے ارادہ سے اُس نے فوجکشی کی۔ حضرت خواجہ اُسکو ان الفاظ میں منع فرماتے ہیں:—

"بعد از رفع نیاز عرضداشت ایں فقیر کلال زمان حضرت مخدوم زادۂ خود آنکہ ..... قصد سمرقند از خدمت شما مناسب نمی نماید ...... تیغ بر روے برادر خود کشیدن چہ مناسب ...... بسخن مردم قصد ایں ولایت کردن و سخن فقیر قبول نکردن عجب می نماید .... در سمرقند عزیز بسیار اند فقرا بسیار اند صلحا بسیار اند ایشاں را پیش ازیں بہ تنگ آوردن مناسب نیست مبادا کہ دلے درد کند تاولِ درد مند چہ کند ...... ملتمس ایں فقیر کہ خدمت بے غرض است خالصۃً لوجہ سبحانہ قبول کنید"۔

ان چند واقعات سے ناظرین نے حضرت خواجہ کے ملکی خدمات کا اندازہ کر لیا ہوگا۔ حضرت نے رعایا کو بادشاہو کے ظلم سے بچانے کی اہم ترین خدمت اپنے سر لے لی تھی اور بارہا فرماتے تھے کہ میرے سپرد یہ کام کیا گیا ہے کہ شاہانِ وقت کو اُن بیجا حرکات سے باز رکھوں جن کی وجہ سے خلق اللہ کو تکلیف پہونچتی ہے۔ سلسلۃ العارفین میں آپ کا مقولہ بایں الفاظ درج ہے:—

"مارا کارے دیگر فرمودہ اند کہ مسلمانان را از شر ظلمہ نگاہداریم بواسطۂ ایں معنی با پادشاہان بایست اختلاط کردن و نفوس ایشاں را مسخر گردانیدن و توسط ایں عمل مقصود مسلمین را بر آوردن"

(۴) حضرت خواجہ کے شکل و شمائل

اگرچہ ملفوظات میں اس قسم کے بہت سے واقعات کا تذکرہ ہے مگر ہم نے صرف وہ چند امور نقل کیے ہیں جنکا تاریخی ثبوت بھی فراہم ہوتا ہے۔ دوسرے واقعات ہر چند کہ تاریخی حیثیت سے استناد کے درجہ تک نہیں پہونچتے مگر ہم کو اُن کے مطالعہ نے اس طرف متوجہ کیا کہ حضرت خواجہ کے ظاہری اکتسابات شکل و شمائل اور روزمرہ کی زندگی کا بھی ملفوظات سے مطالعہ کریں۔ تاکہ اندازہ ہوسکے کہ درحقیقت آپ میں وہ صفات ظاہری بھی موجود تھے جنکا جامع ہونا ایسی اہم خدمت کے سرانجام دینے کے لیے ضروری ہے۔

صورت | رشحات میں حضرت خواجہ کے اصحاب میں سے ایک شخص کا قول نقل ہے کہ ایک روز حضرت نظام الدین سمرقندی کے پاس بیٹھا تھا، اتنے میں ایک جوان آیا جسکا چہرہ بہت نورانی اور بارعب تھا۔ اور تھوڑی دیر بیٹھ کر واپس گیا۔ اُسکے چلے جانے کے بعد حضرت نظام الدین سے پوچھا کہ یہ کون شخص تھے تو اُنھوں نے بتایا کہ یہ خواجہ عبید اللہ ہیں۔

حفظِ ادب | ایک شخص کا بیان ہے کہ میں نے آپ کی بیس سال خدمت کی اور خلوت اور جلوت دونوں میں آپ کے ساتھ رہا، اس طویل مدت میں آپ کو کبھی کوئی ایسی بات کرتے نہیں دیکھا جس سے دوسرے کی طبیعت کبیدہ ہو۔ کبھی آپ نے سیب یا انگور کھانے کے بعد چھلکا منہ سے نکال کر نہیں پھینکا، اور نہ بلغم یا تھوک کو اس طرح سے خارج کیا کہ دوسرے کو بُرا معلوم ہو۔

ایثار | آپ کا خود بیان ہے کہ شروع زمانہ میں جب میں ہرات میں تھا تو افلاس کا یہ عالم تھا کہ میرے پاس صرف ایک پگڑی تھی اور وہ بھی اس قدر چھوٹی اور بوسیدہ کہ اگر ایک پیچ ٹھیک کرتا تھا تو دوسری جگہ سے کھل جاتی تھی۔ اتفاقیہ بازار سے گزر رہا تھا کہ ایک فقیر نے سوال کیا۔ میرے پاس سوا اُس پگڑی کے اور کچھ نہ تھا۔ میں نے پگڑی اُتار کر نانبائی کو دی اور کہا کہ یہ پاک ہے اس کو لے لو دیگ پونچھنے کا کام دیگی اور اس فقیر کو کچھ کھانا دو۔

خدمتِ خلق | بیان فرمایا کہ جس زمانے میں میں سمرقند میں مولانا قطب الدین کے مدرسہ میں تھا تو کئی آدمیوں کی جو ایک ہی مرض میں مبتلا تھے، خدمت کرتا تھا۔ اُنکو پاخانے پیشاب کا ہوش نہ تھا اور دن رات میں کئی مرتبہ ہر شخص کے کپڑے اور بچھونے خراب ہوتے تھے، جن کی میں برابر طہارت کرتا تھا۔ آخر مجھکو بھی وہی مرض ہوگیا جو اُن لوگوں کو تھا۔ ایک رات کو جب مجھے تپ محرقہ تھی کئی گھڑے پانی بھر کر میں نے اُن بیماروں کے کپڑے

اور بستر دھوئے ، جس زمانہ میں آپ ہرات میں تھا پیر ہرات کے حمام میں جاکر لوگوں کی خدمت کیا کرتا تھا۔ بعض دفعہ پندرہ سولہ آدمیوں کی ایک ساتھ خدمت کی۔ خدمت کرتے میں کبھی نیک و بد آزاد یا غلام کا فرق نہیں کیا۔ اور قبل اس کے کہ کوئی بدلا دے سکے وہاں سے چل دیا۔

جواں مردی اور ہمت | بیان فرمایا کہ میں بچپن میں بہت ڈرتا تھا، گھر سے تنہا باہر نہ جاتا تھا۔ ایک رات کو دل میں سمائی کہ مزارات کی زیارت کرنا چاہیے۔ چنانچہ شیخ ابوبکر قفال شاشی اور وہاں سے شیخ خاوند طہور اور پھر خواجہ ابراہیم کیمیا گر اور اسکے بعد شیخ زین الدین دعاے عارفاں کے مزار پر گیا۔ اسوقت سے خوف بالکل دل سے دور ہو گیا۔ حتیٰ کہ تاشقند کے بزرگوں کے مزارات پر جو ایک دوسرے سے بہت دور تھے ایک رات میں گشت کر لیتا تھا۔ بعض ان میں سے ایسی جگہ واقع تھے کہ لوگ وہاں دن میں تنہا جاتے ڈرتے تھے۔ ایک رات کو شیخ زین الدین دعاے عارفاں کے مزار پر بیٹھا ہوا تھا کہ ایک مجنون آ پہونچا۔ یہ شخص بڑا لمبا چوڑا اور قوی تھا۔ ان دیار سے لوگ اس سے ڈرتے تھے اور انھیں دنوں ایک آدمی کو قتل کر چکا تھا۔ یہاں پہونچکر اس نے شور مچانا شروع کیا اور مجھ سے ضد کی کہ یہاں سے چلے جاؤ۔ میں نے اُس کی طرف توجہ نہ کی۔ یہ دیکھ کر وہ ایک مرتبہ دوڑا اور درختوں کی شاخیں توڑ کر جمع کرنے لگا۔ اسکے بعد مسجد سے چراغ اُٹھا لایا اور اس ارادہ میں تھا کہ اُس سے لکڑیاں جلا کر میرے اوپر پھینکے۔ مگر اسی اثنا میں ہوا تیز چلی اور چراغ ٹھنڈا ہو گیا۔ اب اس کا غصہ اور تیز ہوا۔ میرے گرد صبح تک چکر لگاتا کیا اور برابر چیختا رہا۔ میں نے اُس کی طرف مطلق توجہ نہ کی صبح ہونے کے بعد وہ تاشقند کے بازار کی طرف بھاگا وہاں پہونچکر اس نے پھر ایک آدمی کو قتل کر ڈالا۔ یہ دیکھکر لوگوں نے اُسے گھیر کر مار ڈالا۔

علوم ظاہر | آپ کا ابتدائی زمانہ سفر و سیاحت میں صرف ہوا جسکا مقصد بزرگان دین اور کاملین کی صحبت تھی۔ سمرقند، بخارا، مرو، خراسان، ہرات، اور بلخ میں رہ کر اکابر وقت کی صحبت سے فیضیاب ہوئے۔ علاوہ مولانا یعقوب چرخی کے جن سے آپ کو بیعت تھی شیخ بہاء الدین عمر اور مولانا نظام الدین خاموش کی صحبت میں بھی بیٹھے اور بعض دیگر بزرگوں سے بھی ملاقات کی۔ اس سفر کے اثناء میں آپ علوم ظاہری کی پوری تکمیل نہ کرسکے مگر استعداد خداداد تھی چنانچہ بڑے بڑے علماء آپ کے بیان تفسیر و حدیث سے دنگ رہ جاتے تھے۔ آپ کے مخصوص اصحاب کی فہرست میں بعض اکابر علماء کے نام بھی ہیں جو آپ کے علم و فضل کے معترف تھے۔ رشحات میں لکھا ہے کہ آپ ارشاد فرماتے تھے "مجموعہ تحصیل ما از مصباح یک دو ورق بیش نیست" اس ارشاد کے سلسلہ میں ایک اور واقعہ درج ہے جس سے حضرت خواجہ کی خداداد قابلیت کا ثبوت ملتا ہے۔ خواجہ فضل اللہ ابو اللیثی[1] جو اکابر علماے سمرقند میں سے تھے کہا کرتے تھے کہ میں حضرت خواجہ کا باطنی کمال تو

---

[1] تاریخ حبیب السیر میں خواجہ فضل اللہ ابو اللیثی کے حالات مرزا الغ بیگ گورگان کے زمانہ کے اکابر علماء کے حالات میں لکھے ہیں جسکے چند الفاظ یہ ہیں "کمال حال خواجہ فضل اللہ ابو اللیثی بصفت فضل و کمال ارایش داشتہ ہموارہ اوقات شریف را بدرس و افادہ صرف میکرد"

دیکھ نہیں سکتا مگر اتنا ضرور جانتا ہوں کہ آپ نے علوم ظاہری بہت کم پڑھے لیکن برابر تفسیر قاضی کے مطالب پر سوالات فرمایا کرتے ہیں جسکا جواب کسی عالم سے بن نہیں پڑتا۔

غنا اور تمول | رشحات میں لکھا ہے کہ انتیس سال کی عمر میں حضرت خواجہ سیر و سیاحت کے بعد تاشقند واپس گئے۔ اور وہاں زراعت شروع کی۔ جس میں اس قدر نفع ہوا کہ آپ کے مال و دولت، مویشیوں اور املاک کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔ جب مصنف رشحات حضرت خواجہ کے آستانہ پر دوسری مرتبہ حاضر ہوئے (سنہ ۸۹۳ھ) اُسوقت تیرہ سو [۱۳۰۰] مزرعہ حضرت خواجہ کی ملک میں تھے۔ آپ کا خود بیان ہے کہ صرف سمرقند کے مزرعات کا عُشر اسی ہزار من غلہ مرزا سلطان احمد کے زمانہ میں حکومت کو دیا جاتا تھا۔ مولانا جامی نے حضرت خواجہ کی مدح میں ایک شعر اسی مضمون کے متعلق نظم کیا ہے۔

ہزار شش مزرعہ در زیر کشت است　　که زاد رفتنِ راہِ بہشت است

اس جائداد کی کثیر آمدنی محض رفاہ عام میں صرف ہوتی تھی۔ ملفوظات میں جگہ جگہ واقعات ملتے ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ سلسلۃ العارفین سے چند اقتباسات کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔

۱۔ ایک روز مجھ کو بلا بھیجا اور فرمایا کہ .... اپنی زندگی کے آخری حصہ میں میری یہ خواہش ہے کہ اپنے آبا و اجداد کے مزاروں پر فقیروں کا پیٹ بھردوں اور اسی زمانہ میں ترکستان سے قحط کی مدافعت کے بعد خوش خوش تشریف لائے تھے ..... میں نے اس خدمت کو اپنے سر لے لیا۔ ایک دن میں اتنی بکریاں حلال کی جاتی تھیں کہ جنکا حساب مشکل تھا۔ میں خود اپنے ہاتھ سے فقیروں کو بانٹتا تھا۔ گرد و نواح میں جسقدر خربوزہ بویا گیا تھا سب انھیں فقیروں کو بانٹ دیا گیا۔ یہ رمضان کا مہینہ تھا مگر میری عدیم الفرصتی کا یہ عالم تھا کہ افطار کرنا بھی دشوار ہو جاتا تھا۔

۲۔ ایک مرتبہ خبر آئی کہ سلاطین و خوانین قزاق نے باہم اتفاق کر لیا اور اس ملک پر حملہ کرنے اور لوٹنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ حضرت نے ملک و رعیت کی حفاظت اور مسلمانوں[۱] کے عیال و اطفال کی خیراندیشی کی غرض سے پچاس یا ساٹھ ہزار اشرفی بطور تحفہ حملہ آوروں کو بھیجیں اور اُن سے کہلا بھیجا کہ اپنے ارادہ سے باز آئیں۔ چنانچہ آپ کے کہنے سے اُنھوں نے منظور کر لیا۔

۳۔ مرض الموت میں آپ نے وصیت فرمائی کہ میں نے سوچا تھا کہ ایک اور عمارت اُس زمین پر بنواؤں جو مسجد نگاریں کے مقابل خرید کی تھی اور اُس میں تفسیر، حدیث، فقہ اور مصنفات امام غزالی کے

[۱] چونکہ عام رعایا سمرقند کی مسلمان تھی لہذا لفظ مسلمان کا یہاں پر اطلاق صرف کلمہ گویوں تک محدود نہیں ہے، بلکہ اس کا صحیح مرادف خلق اللہ یا سمرقند کی عام رعایا ہے۔

درس کے لیے ایک مدرسہ کھولوں اور پچاس ہزار دینار کی جائداد خرید کر بازار سوزن فروشاں کی مسجد کے لیے وقف کر دوں تاکہ مدرس، امام اور موذن کو کچھ اور زیادہ دیا جا سکے اور مرمت بھی اُسی آمدنی سے کی جائے۔ اُس جائداد کی آمدنی جو میری زندگی میں اس مدرسہ پر خرچ ہو رہی ہے، میرے بعد بھی اسی پر خرچ ہو۔

(۵) ارشادات

مضمون کے ختم پر آپ کے چند ارشادات جو بحث مضمون سے متعلق ہیں نقل کیے جاتے ہیں۔ بادشاہوں کے فرائض اور سیاسیات کے متعلق بھی آپ ایک وقیع رائے رکھتے تھے۔ جسکا کچھ اندازہ ان ارشادات سے ہو سکتا ہے۔ اگرچہ علم باطن اور تصوف کے متعلق آپ کے ہزارہا بیش قیمت ارشادات موجود ہیں مگر بحث مضمون سے انکی بے تعلقی مجبور کرتی ہے کہ انکو اس موقع پر نظر انداز کیا جائے۔

۱۔ مرتبۂ نبوت کے بعد بادشاہت کا مرتبہ ہے۔ اس سے بڑھ کر سوائے نبوت کے کوئی اعلیٰ مرتبہ نہیں۔ دین کی امداد اور شریعت کی حفاظت جس قدر بادشاہوں کے ہاتھ سے ہو سکتی ہے کسی دوسرے سے ممکن نہیں۔ ظالموں اور باغیوں کا دفعیہ بھی بادشاہ ہی خوب کر سکتے ہیں۔ جس قدر خیرات بادشاہ ایک گھڑی میں کر سکتا ہے دوسرا برسوں میں نہیں کر سکتا۔ قباحت صرف اُس وقت ہوتی ہے جب بادشاہت اور حکومت سعادتِ آخرت کا ذریعہ نہ ہو۔

۲۔ سلطنت اور امارت دراصل یہی ہے کہ خدا اور رسول کے احکام کی پوری پابندی کی جائے۔ حضرت عمرؓ نے اپنے صاحبزادے پر حدِ شرع جاری کی اور جسم سے روح کی مفارقت کے بعد بھی بقیہ کوڑے لگانے کا حکم دیا۔

۳۔ کوئی عمل اس سے بہتر نہیں کہ امراء اور بادشاہوں کی ڈیوڑھی پر حاضر رہے اور وہاں فقیروں اور مظلوموں کی مدد کرے۔ ایک مرتبہ ایک بزرگ کو راہِ حق میں ایک ایسی دشواری پیش آئی کہ کسی طرح سے وہ مشکل حل نہیں ہوتی تھی۔ اُنکو تین مرتبہ ہدایت ہوئی کہ فلاں شاہی چوبدار کے پاس جاؤ تاکہ تمھاری مشکل حل ہو۔ انھیں کسی طرح پر یقین نہیں آتا تھا کہ اُس چوبدار سے امور باطن میں مدد مل سکے گی۔ متواتر حکم ملنے کے بعد مجبوراً یہ خیال کرکے چوبدار کے پاس گئے کہ شاید خداوند تعالیٰ کی اس پر خاص عنایت ہے۔ جب مشکل حل ہو گئی تو چوبدار سے پوچھا کہ تمھارا کونسا عمل خداوند تعالیٰ کو اس قدر پسند آیا کہ یہ دولتِ باطنی عنایت ہوئی؟ اُس نے جواب دیا کہ میں روز صبح اُٹھ کر بادشاہ کی ڈیوڑھی پر حاضر ہوتا ہوں اور دن بھر اسی کوشش میں رہتا ہوں کہ مظالم اور خلاف شرع امور نہ ہونے پائیں۔ جس روز کامیاب ہو جاتا ہوں خدا کا شکر کرتا ہوں، ناکامی کی حالت میں صبر اختیار کرتا ہوں، جسکے انعام میں مجھ کو ایسا مرتبہ اور ایسی دولت نصیب ہوئی کہ تم جیسے لاکھوں میرے پاس آتے ہیں۔

۴۔ بادشاہ خداوند تعالیٰ کے حکم اور اقتدار کے مظہر ہیں، اُن کو چاہیے کہ اقتدار اور حکومت میں مستقل رہیں، تاکہ صحیح معنوں میں مظہرِ حق ہو سکیں۔ سلطنت میں شرکت عیب ہے۔

"سلطنت میں شرکت عیب ہے" یہ مقولہ آسٹن کے سیاسی نظریہ یعنی شاہی اختیارات میں شرکت کے عدم جواز (Indivisibility of Sovereignty) کے مرادف ہے۔

ناظرین کو حضرت خواجہ کی زندگی کے ان مختصر حالات سے اندازہ ہوا ہوگا کہ بعض صوفیہ نے کس قدر اہم خدمات انجام دیے ہیں۔ یہ خیال کہ صوفی ہونا اپنے قوائے عمل کو بیکار رکھ کر دوسروں کی خدمت کا طالب ہونا ہے، محض ایک غلطی ہے۔ تصوف اور حق شناسی دراصل خدمتِ خلق ہے اور یہی صوفیا اور فقرا نے ہمیشہ کیا ہے۔ آزادی کی حمایت، جبر کی وجہ سے کارل مارکس کے سے علمبردارانِ حریت کے نام آج تک دنیا کی زبانوں پر ہیں، صوفیا کا بھی مشغلہ رہا ہے، جسکا ثبوت اس مختصر مضمون سے فراہم ہوتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ تارک الدنیا فقیر کو اسکی فرصت نہیں تھی کہ وہ عالمِ سیاسیات کے مانند اشتمالیت (Communism) اور اشتراکیت (Socialism) کے مباحث پر کوئی جدید تصنیف پیش کر سکے یا روسو کی طرح فرسودہ سیاسی نظریوں پر اپنی جدتِ طبع سے نئی روشنی ڈال سکے۔ مگر خدمتِ خلق کے لیے جب میدانِ عمل میں آنے کی ضرورت ہوتی تھی تو وہ سب سے پہلے کمرِ ہمت چست کرنے کو تیار رہتا تھا۔

ایک بے عطف و بے اضافت غزل

(جناب مولوی محمد یوسف صاحب ناظم انصاری)

جو قول پائے ہیں شیخ سے ہم تو برہمن کو زبان دی ہے
حرم میں ناقوس کی شرط پھونکیں کہ بتکدوں میں اذان دی ہے

نہیں جھکا میں کسی کے سامنے تیرے سر کو زمانے فلک ہم
ہمیں ... نے بخشی ہے جس نے تجھکو یہ شان دی ہے

سنا سنا ہے یاد اتنا ... ہمیں بھی
نہ کچھ مرے یقین کا تو گرا اگر تو آہوں سے جان دی ہے

بلائی نہ پہلے ہی روز کہتے تو سر تجھکا کے ...
ہماری مجبوریاں یہی ہیں کہ ہم نے تجھ کو زبان دی ہے

ظہور کے واقعات ایسے تو پیش آئے ہیں پیشتر بھی
یہ کیا ہمیں لا کے تم نے ہوش سی ہوئی داستان دی ہے

نہ کیسے آفاق ہیں جو شہرہ ترے شہیدوں کی جرأتوں کا
اُنھیں بھلا موت کا خطر کیا جنھیں اجل نے امان دی ہے

سمجھ لے اس بات کو جو انساں نہ حق سے ناظم وہ ہو گریزاں
اُسی نے ایمان بھی تو بخشا ہے جس نے ہم کو یہ جان دی ہے

آئینۂ سکندری

(جناب پروفیسر عبد القوی صاحب فانی ایم اے مسلم لکھنؤ یونیورسٹی)

مشرق کی علمی دنیا میں کون ایسا شخص ہے جس نے **جام جہاں نما یا جام جم** یا آئینۂ سکندری کا نام نہ پڑھا ہوگا - لیکن غالباً ایسے عمیق الفکر اور دقیق النظر حضرات بہت کم ہوں گے جنھوں نے ان ایجنٹ طلسمی چیزوں کی ماہیت اور نوعیت پر غور بھی کیا ہو - آئیے تھوڑی دیر کے لیے اسی موضوع پر غور و فکر کریں اور دیکھیں کہ علم و دانش کی روشنی میں ان طلسمی اشیا کی حقیقت و ماہیت کیا ثابت ہوتی ہے -

مہابھارت کا واقعہ | جن حضرات نے ہندوستان قدیم کی رزمیہ کتاب مہابھارت کا مطالعہ کیا ہے اُنھوں نے یہ واقعہ ضرور پڑھا ہوگا کہ جب جنگ عظیم میں کوروؤں کو شکست ہوکر پانڈووں کو فتح کامل حاصل ہو چکی اور کروروں آدمی تیغ کے گھاٹ اتر کر ملک عدم کو پہونچ چکے تو پانڈووں کو اس ہولناک آفت جان پر سخت رنج ہوا - حسن اتفاق سے ایک روز **بیاس جی** تشریف لائے - جب اُنھوں نے پانڈووں کو اس قدر مغموم و ملول دیکھا تو فرمایا کہ وہ ان تمام آدمیوں کو جو جنگ مہابھارت میں کام آچکے ہیں ایک مرتبہ پھر دکھا دیں گے - چنانچہ وہ پانڈووں کو ساتھ لیکر دریائے گنگا کے کنارے پہونچے - اشنان و پوجا کرنے کے بعد اُنھوں نے حکم دیا کہ سب لوگ دریا کی ساکن سطح پر یکسوئی کے ساتھ نظر جمائیں اور تماشہ دیکھیں - حسب حسب ہدایت لوگوں نے تھوڑی دیر دریا کے ساکن اور شفاف پانی پر نظر جمائی تو کیا دیکھتے ہیں کہ دریا کے پانی میں جوش پیدا ہوا - اور اُس میں سے لاکھوں کروروں آدمی دریائے آہن میں غرق اور شمشیر بکف پیدا ہوئے - گھمسان کا رن پڑا اور وہی مسلح جوان جو دریا سے نمودار ہوئے تھے آپس میں کٹ مرے اور پھر دریا میں غائب ہوگئے - آخر یہ طلسمی منظر کیا تھا؟ اس کا راز صرف یہ تھا کہ یہ لوگ جنگ مہابھارت خود دیکھ چکے تھے - دریائے گنگا کے ساکن اور شفاف پانی پر جو اُنھوں نے نظر جمائی تو دریا کی سطح "**مرآۃ الخیال**" یا "**آتم درپن**" (Autoscope) بن گئی - اور دیکھنے والوں کے نفس غیر شاعر (Sub-conscious mind or Subliminal Self) نے سطح آب پر منعکس ہوکر جنگ کا تمام منظر پیش کر دیا - یہی راز **جام جمشید** میں تھا - مصر قدیم کے کاہن بھی اسی طرح کسی ظرف میں پانی بھر کر اُس کی صاف و شفاف سطح پر نظر جما کر پیشین گوئی کیا کرتے تھے -

تلو رمینی | قدیم یونانیوں کی تاریخی کتابوں اور علم الاصنام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مقام ڈلفائی

کے بڑے مندر میں جب کوئی شخص غیب کا حال معلوم کرنے جاتا تھا تو مندر کی بڑی پجارن چقماق پتھر کی صاف اور شفاف سطح پر نظر جما کر اپنے اوپر ایک قسم کی محویت طاری کر لیتی تھی اور پتھر کی چمکدار سطح پر اُسے اُس واقعہ کا منظر دکھائی دینے لگتا تھا جو آئندہ ظاہر ہونے والا ہوتا تھا۔ یہی منظر دیکھ کر وہ آئندہ کے لیے حکم لگا دیتی تھی۔

اسی طرح بائبل کے مطالعہ سے ہم کو یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ ہیکل سلیمانی میں جو ربی اعظم رہتا تھا اُس کے قبضے میں دو چمکدار پتھر تھے۔ جو اُسکی عبا پر سینے کے محاذ میں نصب ہوتے تھے۔ جو بڑا تھا اسکا نام تمیم Thummim تھا اور دوسرے کا نام یوریم (Urim E) ضرورت کے وقت انھیں چمکدار پتھروں کی صاف سطح پر نظر جما کر بزور کہانت پیشین گوئی کی جاتی تھی۔ اور آئندہ کے واقعات پر حکم لگا دیا جاتا تھا۔ محققین کا قول ہے کہ یہودیوں کا یہ فن یہودیوں نے مصریوں سے اُس زمانے میں سیکھا تھا جب وہ ملک مصر میں جلا وطنی کی زندگی بسر کر رہے تھے اور یہ فن اُنکے مقتدایان دین میں نسلاً بعد نسلٍ بطور اسرار سینہ بسینہ چلا آتا تھا۔

یہ بلور یا سنگ پارہ درحقیقت چقماق پتھر کا ایک صاف اور چمکدار ٹکڑا ہوتا تھا۔ اس کی وضع بعض اوقات بیضوی مگر عموماً گول ہوتی تھی۔

جرمن سائنسداں **ریشنباخ** اور دیگر محققین کا قول ہے کہ اس پتھر میں اعلیٰ درجے کی مقناطیسیت ہوتی ہے۔ اور اس میں اتنی قوت ہوتی ہے کہ معمولی درجہ کی "محویت بیدارانہ" پیدا کر دے، جسے عاملین تنویم (Hypnotists) کی اصطلاح میں (Waking Trance) کہتے ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ تمام احیاء و اجسام میں ایک قدرتی خاصہ ہوتا ہے جسے سائنس کی اصطلاح میں "عود" (Od or Odyle) کہتے ہیں۔ اور اسکی خاصیت بجنسہ ویسی ہوتی ہے جیسی ہوا کے عنصر "آرغون" (Argon) کی۔ یعنی جن اجسام و احیاء سے وہ جوہر تعلق رکھتا ہے وہ اُنکی حرکت اہتزازی (Vibrations) کو جذب کر لیتا ہے۔ اسے دراصل "اثیر سکونیاتی" (Static Ether) سمجھنا چاہیے۔ اس جوہر میں اگرچہ کوئی ذاتی قوتِ عمل نہیں ہوتی مگر اپنے سکون اور گیرائیوں کے باعث جملہ قوائے مقناطیسی مستور رکھتا ہے۔ یہ جوہر، سنگ چقماق میں خصوصیت کے ساتھ قوی ہوتا ہے۔ اور اس میں یہ خاصہ ہوتا ہے کہ جس طرح ایک فوٹو فلم اُن چیزوں کی تصاویر جو اُس پر منعکس ہوتی ہیں محفوظ کر لیتا ہے اُسی طرح چقماق کا یہ جوہر بھی تصاویر تصوری اور اشکالِ ذہنی (Mental Images) کو محفوظ کر لیتا ہے۔

ذہن یا نفس انسانی کے دو پہلو ہوتے ہیں (۱) "شعور بیدار" (Waking Consciousness) جس کا تعلق دُنیا کی خارجی چیزوں سے ہوتا ہے۔ اسے اصطلاح میں نفس شاعر (Conscious mind) کہتے ہیں۔ (۲) دوسرا نفس مستتر ہوتا ہے جس کا تعلق باطنی دنیا کی چیزوں سے ہے اس کا نام اصطلاح میں

نفسِ غیر شاعر (Sub-conscious mind) ہے۔ نفس کے یہ دونوں پہلو اپنا اپنا حلقۂ عمل رکھتے ہیں اور دونوں کا عمل اختیاری اور اضطراری ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے روحِ انسانی کو اس تمام مرکبِ نفسیاتی کا خزانہ سمجھنا چاہیے جس میں افکار، جذبات، خواہشات، تاثرات، حسیات اور خیالات وغیرہ شامل ہیں۔ جس طرح ایک عاملِ تنویم (Hypnotiser) اور اس کے "معمول یا وسیط" (Subject) کے درمیان وحدتِ خیالی ہوتی ہے اسی طرح مختلف اشیا میں مقناطیسیت کی طاقت سے وحدتِ حسّی بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ بہت سی چیزیں واقعات کے اثر کو اسی طرح محفوظ رکھتی ہیں جس طرح ریکارڈ گانوں کو بصورتِ صوت محفوظ رکھتا ہے یا حافظہ پر زور ڈال کر واقعات بیان کیے جا سکتے ہیں۔ اسی طرح واقعات کا جو اثر اشیاء پر پڑتا ہے اُسے بھی بصورتِ اشکالِ خیالی یعنی ذہنی تصاویر (Thought Images) از سرِ نو ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ حالانکہ کسی غیر ذی روح چیز اور عامل کے نظامِ عصبی میں بلاواسطہ کوئی وحدتِ حسّی نہیں ہوتی۔ پھر کیا تعجب کی بات ہے کہ تبو یا چقماق یا پارہ کسی عامل کے نظامِ عصبی پر ایک واضح اور قابلِ ادراک اثر ڈال سکتا ہے۔ لیکن اس اثر کا جذب و ادراک عامل کی قابلیت پر منحصر ہے۔ یہی راز "آئینہ سکندری" یا ملہم آئینہ کا ہے جس کا حال ہم آگے چل کر بیان کریں گے۔ لیکن اس سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عامل کی خصوصیات پر بھی کچھ روشنی ڈالی جائے۔

عامل

بعض اشخاص میں قوتِ نفسی یا روحانیاتی دوسروں کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہوتی ہے اور بہت جلد اپنا عمل دکھاتی ہے۔ عموماً اس کے عمل کا یہ ملکہ باپ سے بیٹے کو یا مرشد سے مرید یعنی گرو سے چیلے کو پہونچتا ہے۔ بعض اشخاص پر کچھ اثر اجرامِ سماوی کا بھی ہوتا ہے۔ مثلاً جس شخص کے زائچہ میں **نیپچون (Neptune)** سیارہ کا اثر غالب ہو اس کی روحانیاتی قوتیں بہت زیادہ تیز ہوتی ہیں۔

نسلی اور روحانیاتی اثرات کے علاوہ اس سلسلہ میں روایاتِ نفسی کو بھی بہت بڑا دخل حاصل ہے۔ انھیں اصطلاح میں روایاتِ طبیعی (Psychic Traditions) کہتے ہیں۔ اوّل الذکر کا اثر اس نظام کی ترکیب و نوعیت پر بہت زیادہ پڑتا ہے جس کی وساطت سے روح یا نفسِ انسانی کام کرتا ہے۔ لیکن روایاتِ نفسی وہ چیزیں ہیں جن کے ذریعہ سے اس قوت اور قابلیتِ عمل کا اندازہ ہوتا ہے جو نظامِ جسمانی سے ظاہر ہوتی ہے۔ یہی چیز انسان کی قوتِ عمل کو بہت جلد ابھارتی اور چمکا دیتی ہے۔

چونکہ انسان کی روحانی ضرورتیں بہت کچھ اہمیت رکھتی ہیں اس لیے دنیا میں ہمیشہ ایسے آدمی پائے جاتے ہیں جن میں تشریح یا تعبیرِ رؤیا کا ملکہ بہت بڑھا ہوا ہوتا ہے۔ یہ لوگ گویا اعلیٰ اور ادنیٰ دنیاؤں یا بالفاظِ دیگر عالمِ ارواح اور اس دنیائے ارضی کے درمیان تعلقات کا ایک قدرتی واسطہ ہوتے ہیں۔

نفسیاتی لحاظ سے عامل کی دو قسمیں ہیں۔ (۱) **مثبت** جنھیں انگریزی زبان میں (Positive Seers) کہتے ہیں۔ (۲) **منفی یا مجہول** جو اصطلاح میں **(Passive Seers)** کہلاتے ہیں۔

"مثبت عامل" ایک نفسیاتی عمل کے ذریعہ سے اشکال ذہنی پیدا کرتا ہے اس نفسیاتی عمل کی تشریح حد امکان سے باہر ہے۔ لیکن یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اس نفسیاتی ذریعہ سے روح انسانی کے حسیات بصورت علامات یا نشانات، اشکال سیاوی میں صورت پذیر ہو جاتے ہیں تصاویر ذہنی کا ظاہر کرنا غیر اختیاری یا غیر شعوری ہوتا ہے۔ لیکن ان تصاویر ذہنی کا دیکھنا ایک عمل شعوری ہے۔

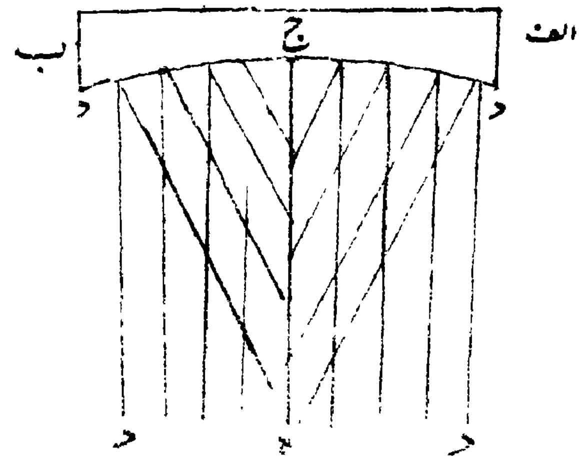
"منفی عامل" اپنی ذاتی سعی سے کوئی شکل پیدا نہیں کرتا بلکہ وہ تصاویر و اشکال خود بخود اسکے پردۂ نفسی پر منعکس ہوتی ہیں۔ یہ تصاویر "استعاری" **(Allegorical)** یا "علاماتی" **(Symbolical)** نہیں ہوتیں۔ بلکہ گذشتہ یا آئندہ واقعات کی صحیح تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔

علامات اور حروف جو طور پر طلسمی آئینہ میں ایک مثبت عامل کو نظر آتی ہیں انکی تشریح و تعبیر ہم آگے چل کر کرینگے۔ فی الحال "آئینۂ سکندری" یا طلسمی آئینہ کا کچھ حال بیان کرتے ہیں۔

طلسمی آئینہ یہ آئینہ عموماً مدور یعنی گول ہوتا ہے۔ اور چھ انچ قطر کے آئینہ میں تقریباً ½ انچ گہرائی ہوتی ہے۔ شکل مندرجہ ذیل ملاحظہ ہو



اس گہرائی کے باعث آئینہ پر سے منعکس ہونیوالی شعاعوں کا نقطۂ مرکزی **(Focus)** کسی قدر فاصلہ پر قائم ہو جاتا ہے۔ اور اس صورت میں شخص عامل اسے کسی دیوار پر دو گز کے فاصلہ سے آویزاں کر کے کام لے سکتا ہے۔ اگر آئینہ کے قطر کے تناسب سے آئینہ کی گہرائی اور زیادہ کر دی جائے تو اس کا نقطۂ شعاعی اسقدر فاصلہ پر قائم ہو سکتا ہے کہ اسے گود میں رکھ کر یا ہاتھ میں سنبھال کر بھی کام لیا جا سکتا ہے۔ اس صورت میں نتائج بھی عمدہ برآمد ہوتے ہیں۔ اور آئینہ میں منظر تصویری دکھائی دیتا ہے۔ آئینہ کے پیچھے ٹین، لکڑی، یا کوئی اور چیز لگا دی جا سکتی ہے۔ عموماً آئینہ کے پیچھے تارکول کے مرکب کی ایک سیاہ تہہ لگا دی جاتی ہے۔



شکل میں ا ب آئینہ ہے اور ج اسکا نقطۂ شعاعی مرکزی (Focus) عامل کی جگہ ہ ہے۔ اس حالت میں آئینہ پر جو شعاعیں پڑینگی اُن کا رُخ خطوط د د سے ظاہر کیا گیا ہے۔ یہ شعاعیں ایک دوہری مقناطیسی سطح پر پڑتی ہیں۔ اور پڑتے ہی اندر کی طرف منحرف ہوکر پھر عامل کی طرف بمقام ہ ایک قلم شعاعی کی صورت میں واپس آتی ہیں۔ اور اسی کے باعث عامل پر عمل تنویم خود بخود طاری ہو جاتا ہے۔

واضح ہو کہ رویا یعنی اشکال و مناظر بلور یا سنگپارہ یا آئینہ کے اندر نہیں ہوتے بلکہ عامل کے ذہن یا روح میں ہوتے ہیں۔ اور ان کے مرئی ہونے کی صورت یہ ہے کہ عامل کے جسم سے روحانی و عصبی امواج کا جب اہتزاز ہوتا ہے تو اُنکا اثر وسیلۂ رویاء (بلور، سنگپارہ، ظرف آب یا آئینہ) سے "عود سکونیاتی" (Static Odyle) پر پڑتا ہے اور پھر وہاں سے منعکس ہوکر وہ عامل کے اعصاب بصری کے ذریعہ سے اُسکے مراکز دماغی (Brain Centres) پر اثر انداز ہوتا ہے۔

خاص ہدایات بلور یا سنگپارہ کو محفوظ رکھنے کے لیے سیاہ مخمل کی تھیلی بنائی جائے۔ اسی طرح آئینہ کو بھی کسی محفوظ کیس یا غلاف میں رکھا جائے۔ یہ بھی احتیاط رکھی جائے کہ بلور یا آئینہ کی سطح پر خراشیں نہ پڑ جائیں اور وہ رگڑ کھا کر دھندلی ہو جائے۔ استعمال کرنے کے وقت جب بلور یا آئینہ کو صاف کیا جائے تو ایک خشک ریشمی رومال کے ذریعہ سے کیا جائے۔ بلور یا آئینہ کو دھوپ میں ہرگز نہ رکھا جائے کیونکہ اس سے مقناطیسی قوت میں خرابی آجاتی ہے۔ اسی طرح بلور یا آئینہ پانی کی نمی سے بھی محفوظ رکھا جائے۔ عامل جب بیٹھے تو روشنی اور آلۂ رویاء کے بیچ میں بیٹھے اور عمل کے

وقت کمرہ میں کامل سکوت و سکون ہونا چاہیے۔

اقسامِ رؤیا | اقسام رؤیا دو ہیں (۱) رویائے راست (۲) رویائے علاماتی جنہیں انگریزی میں (Direct & Symbolic Visions) کہتے ہیں۔

قسم اول یعنی رویائے راست میں کوئی گزشتہ یا آیندہ ہونے والا واقعہ بصورتِ منظر براہِ راست دکھائی دیتا ہے۔

رویائے قسم دوم یعنی رویائے علاماتی میں کوئی منظر تو دکھائی نہیں دیتا مگر نشانات یا علامات (Symbols) کے ذریعہ سے صورِ خیالی (Ideograph) پیدا ہوتی ہیں۔

صورتِ اول میں وہ اثرات جو عامل کے نفس غیر شاعر کے انفرادی حلقۂ عمل میں مستور ہوتے ہیں صورت پذیر ہو جاتے ہیں۔ اور صورتِ دوم میں ذہن کا تعلق روح یا دائرۂ ارضی سے پیدا ہو جاتا ہے جسے "World-soul or Earth Sphere" کہتے ہیں۔ اس صورت میں تمام سیاسی، مجلسی اور کونی (Cosmic) واقعات نہایت خوش اسلوبی سے پردۂ شعور و ادراک پر نمایاں ہو جاتے ہیں۔

ثبت قسم کے عاملوں میں رویائے علاماتی (Symbolic Vision) بہت جلد نشوونما پا جاتا ہے۔ اس میں فائدہ تو یہ ہے کہ اس قسم کا رؤیا دائم اور مستقل ہوتا ہے۔ لیکن نقص یہ ہے کہ علامات کی تشریح یا تعبیر میں اکثر مغالطہ ہو جاتا ہے۔ ان علامات کی تشریح ہم آگے چل کر کریں گے۔

مثبت عامل کے نفس غیر شاعر کے حلقۂ عمل میں جوں ہی نقوشِ ذہنی پیدا ہوتے ہیں وہ انھیں اسی وقت پردۂ رویت پر منعکس کرنے لگتا ہے۔ اور وہ فوراً ان اشکال کا مطالعہ تعبیری نگاہ سے کرتا ہے لیکن عامل مجہول کو اول احساس بعد ازاں رویت ہوتی ہے۔ ایک عامل گویا رویت کے بعد غور کرتا ہے اور دوسرا احساس کے بعد رویت کرتا ہے۔

طریقۂ عمل | جس وقت عامل بلور یا آئینہ پر نظر جماتا ہے تو ابتدا میں اسے آلۂ عمل کی سطح پر ایک دھندلی سی چیز یا غبار سی پھیلی نظر آتی ہے تھوڑی دیر بعد یہی غبار کسی قدر منجمد ہو کر سفید ابر کی شکل اختیار کر لیتا ہے جس میں روشنی کے شیارے چھوٹے چھوٹے ذرّے ادھر ادھر تیرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس وقت عامل کا مرکزِ بصری بھی غیر مستقل حالت میں ہوتا ہے۔ آنکھ کی پتلی کبھی پھیلتی اور کبھی سکڑتی ہے۔ اور آلۂ رویا بھی کبھی اس ابر میں غائب ہو جاتا ہے اور کبھی پھر دکھائی دینے لگتا ہے۔ اس کے بعد عامل کی نفسی قوتیں کے لحاظ سے جلدی یا دیر میں ایسا وقت آ جاتا ہے جبکہ وہ سفید ابر اور نور کے وہ ذرات رقصاں یکلخت غائب ہو کر آنکھوں کے سامنے ایسی وسیع اور کشادہ فضا پیدا ہو جاتی ہے جیسا کہ فصلِ بہار کا صاف آسمان۔

اس وقت عامل کے دماغ میں وقتاً فوقتاً اختلال پیدا ہونے لگے گا اور اُسے ایسا محسوس ہوگا گویا دماغ کے پردے کبھی کھلتے اور کبھی بند ہوتے ہیں۔ کاسۂ سر کی جڑ میں ایک قسم کا دباؤ سا محسوس ہونے لگے گا اور ایسا معلوم ہوگا گویا دماغ کا حصہ زیریں سکڑ رہا ہے۔ جب یہ حالت طاری ہوگی تو عامل کبھی کبھی لمبی سانس اور حبس دم کرنے لگے گا۔ اور یہی وہ وقت ہے کہ اسکے سامنے صاف اور شفاف پردۂ نفسانی پر منظر اور دلیں دکھائی دیگا۔

ہر رویت یا سلسلۂ رؤیا سے پیشتر ایک عمل تجرید (Abstraction) طاری ہوتا ہے جس میں عامل کا شعور غیر محسوس طور پر رفتہ رفتہ گرد و پیش کی اشیاءِ مادی کے احساس و ادراک سے معطل ہو جاتا ہے۔ اسے یہ بھی خبر نہیں رہتی کہ وہ کس مقام پر اور کس کمرے میں بیٹھا ہوا ہے اور اسکی صحبت میں کون کون لوگ موجود ہیں۔ وہ یہ بھی بھول جائیگا کہ وہ کسی بلور سنگ یا آئینہ پر نظر جمائے ہوئے ہے۔ الغرض بجز ان باتوں کے جو اُسے اس کے روحانی حواس کے ذریعہ سے محسوس ہوتی ہیں نہ وہ کچھ دیکھتا ہے نہ سنتا ہے نہ جانتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ اپنی شخصیت کے وجود کا بھی ادراک نہیں رکھتا اور رویا سے پیش نظر میں بالکل محو ہو جاتا ہے۔

تشریح علامات و تعبیر رویاء

بنی نوع انسان کی ابتدائی زبان علامات یا اشارات تھے۔ اور لوگ علامتوں ہی کے ذریعہ سے بولتے اور لکھتے تھے۔ جنوبی امریکہ کے قدیم باشندوں، قدیم اہل پیرو، قدیم مغول (Mongolians) قدیم قبطیوں اور قدیم عبرانیوں کے حروف صوری یا ہیروغلیفی تحریرات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قدیم زمانہ میں تحریر و تقریر کا ذریعہ تصاویر خیالی (Ideographs) تھیں۔

اگر ہم مختلف اقوام و ملل کے حروف تہجی پر غور کریں تو اس سے بھی صاف طور پر واضح ہو جائیگا کہ جس عہد میں وہ لوگ رہتے تھے اس وقت دنیا کی مادی اور مجلسی حالت کیا تھی۔ مثلاً اگر قدیم عبرانیوں کے حروف تہجی پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان "خیموں میں رہنے والے" لوگوں کی زندگی کس قدر سادہ اور خانہ بدوشانہ واقع ہوئی تھی۔ عبرانی حروف کے "اشکال" اجرام سماوی کی شکلوں پر قائم کیے گئے تھے جن میں دوازدہ بروج کی شکلیں بھی داخل ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لوگ گرم ممالک میں کشادہ اور وسیع "سقف نیلی رواق" کے نیچے زندگی بسر کرتے تھے انھیں اجرام سماوی سے کس قدر واقفیت تھی۔ اس زمانہ کے عقلاء تاروں بھری راتوں میں شامیانۂ فلک کے زیر سایہ بیٹھ کر رات کی ٹھنڈی ہواؤں کا لطف اُٹھاتے اور آسمانوں کی زبان حال کا مطالعہ کرتے تھے اُن کے نزدیک یہ "اکاس بانی" بنی نوع انسان

کے لیے پیغام ربانی تھا - اور اسی خیال سے وہ اس آواز کو سمجھتے اور پھر اس آواز کی نقل کرنے کی کوشش کرتے تھے - اس طرح انھوں نے اجرام سماوی کی شکلوں پر اپنی زبان کے حروف تہجی کی شکلیں وضع کی تھیں -

لیکن جب ہم ان اشکال یا حروف کے معانی پر غور کرتے ہیں تو ہمیں صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ ان لوگوں کا طرزِ معاشرت کیا تھا - مثلاً الف کے معنی "بیل" - بے = بیت بمعنی خیمہ - دال - دالت بمعنی درِ خیمہ - لام = لامد بمعنی وہ آلہ جس سے بیل ہانکے جاتے ہیں - میم بمعنی پانی - ضاد بمعنی مچھلی پکڑنے کا کانٹا - قاف بمعنی رسی کا لچھا - جیم = جمل بمعنی اونٹ - یا = ید بمعنی ہاتھ - عین بمعنی آنکھ - واؤ بمعنی کانٹا یا زنجیر کی کڑی - حے = حیت بمعنی ڈلیا یا ٹوکرا - قاف بمعنی سر - نون بمعنی مچھلی - فے بمعنی منہ - سین بمعنی دانت - رے = رأش بمعنی سر - وغیرہ وغیرہ - مختصر یہ کہ تمام حروف کے معنی سے ان لوگوں کی سادہ زندگی کا اظہار ہوتا ہے -

اسکے بعد ان حرفوں کے مرکبات بنائے گئے - مثلاً الف اور لام = ال = خدا - یا لام والف فنا - نیستی - اسی طرح جوں جوں زمانہ گزرتا گیا خانہ بدوشانہ عادات میں بھی ایک باقاعدہ زبان بنگئی اور پھر اسکے ادبیات ظہور میں آگئے - اس طرح ان لوگوں کو علم اور اس خمسہ کے استعمال سے حکم حاصل ہوگیا - مثلاً لفظ "ید ع" یا ید ع کو لیجیے جسکے معنی ہیں علم - یہ لفظ تین حروف سے مرکب ہے - یعنی یا ید بمعنی ہاتھ - دالت بمعنی دروازہ اور عین بمعنی آنکھ - اب ان تین حروف پر فرداً فرداً غور فرمائیے - مثلاً ہاتھ علامت ہے کسی طاقت اور قابلیت کی - دروازہ علامت ہے داخلہ اور دخول ابتدائی کی - اور آنکھ علامت ہے بصارت اور ... روشنی کی - اب ان تینوں علامتوں کے مرکب سے ایک صورت خیالی یعنی (ideographic) ... پیدا ہوئی جسکے معنی ہوئے - جاننے کے لیے ہاتھ سے دروازہ کھولنا یعنی تحقیق و تدقیق - اور یہی ... ہے -

چینی زبان کے حروف ... شکلیں ... تھا ... تصویری ہیں - اگرچہ ان میں عرصہ دراز سے ... کی سی باقاعدگی پیدا ہو گئی ہے ... جو شکلیں ... ابتدا میں ... تھیں وہ اب ... اور باقاعدہ ہوگئی ہیں - لیکن ان اشکال کے جو نام ... موجود ہیں ان سے قدیم مغول کی زندگی کا حال ... معلوم ہو جاتا ہے - اور ظاہر ہوتا ہے کہ ... زندگی ... اہل چین کا طرزِ معاشرت اور تمدن ... ترقی یافتہ اور وسیع تھا - کیونکہ ان اشکال کے علاوہ جو عبرانی زبان کے حروف میں پائی جاتی ہیں چینی زبان میں دیگر حروف ایسے بھی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ چینی لوگ صنعت و حرفت میں

بہت زیادہ ترقی کر گئے تھے۔ چینی زبان کے مندرجہ ذیل حروف اور اُن کے معنی ہمارے قول کا بہت کافی ثبوت ہیں۔

حرف چینی	تلفظ بخط انگریزی	معنی
ہسی	Hsi	صندوق
چائتھ	Chich	مُہر یا ٹھپہ
مین	Mien	چھت
چن	Chin	رومال
کُنگ	Kung	کمان
امی	mi	ریشم
لیائی	lei	ہل

اسی طرح اور بہت سے الفاظ ہیں مثلاً دھاتوں کے نام۔ شراب۔ گاڑیاں۔ دباغت شدہ چمڑا وغیرہ۔ اسی کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قدیم چینیوں کی ذہنیت پر خرافیات (Mythology) کا بھی زیادہ غلبہ تھا۔ کیونکہ بہت سے حروف کی شکلوں میں اژدہا اور ارواح اور شیاطین کی علامتیں بھی شامل ہیں۔

اگر علامات کی اصلیت اور ابتدا پر غور کیا جائے تو ظاہر ہوتا ہے کہ وہ در اصل صور خیالی (Thought Forms) ہیں۔ جو مختلف خیالات کے ارتباط سے اُس ذہن میں جہاں ان کی تخلیق ہوئی مستقل اور واضح معانی پیدا کرتے ہیں۔ ان کا انحصار بلحاظ معنی قوانین متعلقہ خیال اور اس توسّل و مراسلات پر ہے جو روحانی اور مادی دُنیاؤں کے درمیان موجود ہے۔ لہذا جس چیز کے متعلق کوئی علامت قائم کی گئی ہے اس چیز کی نوعیت، خصوصیت، خواص اور استعمالات کے لحاظ سے اس علامت کی تعبیر و تشریح کی جا سکتی ہے۔

طریقۂ تعبیر کے متعلق ہم چند علامتیں بطور مثال پیش کرتے ہیں جو واقعی آئینہ میں نظر آئی تھیں۔ ان پر غور کرنے سے سمجھ میں آ جائیگا کہ رویائے علاماتی کی تعبیر کیونکر کی جاتی ہے:۔

پاؤں اگر نظر آئے تو اسکے معنی سفر اور عقل و فہم کے ہیں۔

منہ کے معنی تقریر، انکشافات، الہام اور پیغام کے ہیں۔

کان کے معنی خبر اور اطلاع کے ہیں۔ اگر کان بے ڈھنگا اور ٹوٹا ہوا نظر آئے تو اسکے معنی رسوائی اور دشنام کے ہیں۔

آفتاب اگر صاف اور درخشاں نظر آئے تو اسکے معنی فلاح و بہبود، فارغ البالی، عزت و حرمت،

صحت و تندرستی، مہربانی اور عطایا کے ہیں۔ اگر گہن میں نظر آئے تو مرد کی موت سے مراد ہے۔

چاند اگر ہلال ہے تو اس کی تعبیر کامیابی، قبولیتِ عامہ، اضافہ و ترقی ہے۔ اگر چاند مائل بہ زوال ہو تو اسکے معنی بیماری، تنزل، زوال، نقصان اور مصیبت و تکلیف کے ہیں۔

آفتاب اگر کسی مرد کو غیر درخشاں، بے شعاع یا دھند غبار سے پوشیدہ نظر آئے تو اسکے معنی بیماری، مصیبت، ناگہانی، بے عزتی کا خطرہ وغیرہ ہیں۔ اگر کسی عورت کو **چاند** اسی حالت میں نظر آئے تو اس کی بھی یہی تعبیر ہے۔ یہ تمام فطری تعبیریں ہیں جو ہر شخص کی سمجھ میں آسکتی ہیں۔

لیکن یہ بھی خیال رہے کہ ہر علامت کی متعدد یعنی تین تین چار چار تعبیریں ہو سکتی ہیں لہذا جس مقصد سے آئینہ یا بلور دیکھا گیا ہے اُسی مقصد کے لحاظ سے رویاے علاماتی کی تعبیر کی جائیگی۔ مثلاً اگر رویت کا مقصد روحانی دنیا سے متعلق ہے تو جو علامت رویا میں نظر آئیگی اُسکی تعبیر اُنھیں معنی میں کی جائیگی جنکا تعلق عالم ارواح سے ہے۔ اگر مقصد دنیوی ہے یعنی مادی دنیا سے تعلق رکھتا ہے تو رویا کی تعبیر دنیوی لحاظ سے ہوگی۔

مثلاً اگر مقصد رویت روحانی دنیا سے تعلق رکھتا ہے اور رویا میں ترازو نظر آئے تو اسکی تعبیر ہوگی عدل مطلق۔ اگر مقصد رویت دنیوی ہے تو ترازو کے معنی ہونگے نصیفہ، تناسب، تقابل، استدلال، عقل و فہم۔ اگر مقصد رویت سوشل یعنی سماجی ہے تو اسکی تعبیر ہوگی قرضہ، احسان، ذمہ داری، محصول یا ٹیکس اور مقصد رویت اگر مادی ہے تو ترازو کے معنی ہونگے توازن قوٰے، عمل و رد عمل۔ اگر ترازو کے دونوں پلے برابر ہیں تو شگون نیک اور موافق مطلب ہے۔ اگر دونوں پلے غیر متوازن ہیں تو اسکے معنی ہونگے تباہی، بربادی، موت۔ اگر ترازو کے ساتھ تلوار بھی دکھائی دے تو سزا جلد ملیگی۔

جہاز علامت ہے تجارت کی۔ اگر جہاز کے تمام بادبان کھلے ہوے ہیں تو اسکے معنی یہ ہیں کہ دوسری دنیا سے تعلقات جلد قائم ہو جائیں گے یا ممالک دور دراز سے بہت جلد کوئی خبر آنیوالی ہے، تجارت کو ترقی ہوگی یا بحری سفر درپیش ہے۔ اگر بادبانوں پر کسی قسم کی تحریر نظر آئے تو خبر کی مزید وضاحت ہوتی ہے۔ اگر جہاز پر بحری قزاقوں کا جھنڈا لہراتا نظر آئے تو اسکے معنی ہیں دوسری دنیا میں جلد منتقل ہونا یعنی موت۔ دور دراز کا سمندر یہی معنی رکھتا ہے کہ دوسری دنیا میں بہت جلد جانا ہے۔ اور اس صورت میں موت قدرتی ہوگی۔ لیکن اگر ملک دور دراز ملکیت غیر کی ہے تو اسکے معنی ہیں کہ وجہ وفات مرگ ناگہانی ہوگی۔ اگر جہاز کے بادبان ڈھیلے اور سست ہیں تو اسکی تعبیر یہ ہوگی کہ تجارت میں نقصان ہوگا۔ یا مصیبت آئیگی یا دیر ہوگی یا کوئی خبر بر وقت نہیں آئیگی یا اگر کسی خبر کے آنے کی پہلے سے توقع ہے تو وہ نہیں آئیگی۔

(۲۴۔۹۔۲۷)

برجیس قدر بہادر

(جناب خواجہ عبدالرؤف صاحب عشرت لکھنوی)

جب معزول بادشاہ حضرت محمد واجد علی شاہ آخری شاہِ اودھ لکھنؤ سے کلکتے تشریف لیجانے لگے تو اپنی کُل املاک، خزانہ، روپیہ، مال، متاع جنرل اوٹرم کے حوالے کردیا۔ جنرل موصوف پانچ مہینے تک بادشاہی املاک میں رہے، جسکے بعد جنرل بکلسین بہادر تشریف لائے، وہ مالکِ املاکِ شاہی ہوئے۔ پھر جنرل لارنس آئے، یہ بہت عقیدتمند تھے۔ ناگہاں میرٹھ سے خبر آئی کہ وہاں کی فوج باغی ہوگئی اور چھاؤنیاں پھونک دی گئیں۔ جنرل لارنس چیف کمشنر لکھنؤ نے یہ خبر سنتے ہی گوروں کے افسر کو لکھا کہ ہندوستانی فوج میرٹھ میں برگشتہ ہوگئی۔ تم فوراً چوپڑ کے اصطبل کو چھوڑ کر ہندوستانی چھاؤنی میں معہ فوج کے چلے آؤ۔ افسر فوج نے حکم کی تعمیل کی۔ دوسرے دن گجردم فوج کو میدان میں بُلاکر اُنکے افسروں سے کہا کہ تم کو سرکار نے عزت دی، عہدے دیے، اُنتیسویں دن تنخواہ بٹ جاتی ہے، بہادری کے تمغے ملتے ہیں، مریضوں کے لیے ڈاکٹر نوکر رکھے، اور تم لوگ ناسپاسی پر آمادہ ہو، اپنے حق میں کیوں کانٹے بوتے ہو۔ فوج کے افسروں نے کہا آپ کا فرمانا صحیح ہے، بیشک آپ نے ہماری بہادری اور جانبازی کی قدردانی کی۔ ہم کمپنی کے نمکخوار ہیں، مگر یہ جھوٹے کارتوس مچھلی کے آئے ہیں، اور حکم ہے کہ انکو دانت سے کاٹو، یہ ہم سے نہ ہوگا، ہمارے مذہب میں ایسی چیز دانت سے کاٹنا حرام ہے، آپ ہم کو بے دین کرنا چاہتے ہیں، آپ کی نیت میں فساد معلوم ہوتا ہے، ہندو مسلمان کوئی اسے قبول نہیں کرے گا۔ یہ جواب سُن کر فوج کے دل کا حال معلوم کرلیا۔ دوسرے دن صبح کو سب انگریز مچھی بھون میں گئے اور دوربین لگا کر چاروں طرف نشیب زمین کو ملاحظہ کیا۔ قلعہ کے بیچ میں مرزا یحییٰ علی خاں خلف محمد علی شاہ رہتے تھے۔ اُن سے کہا تم فوراً اس مکان کو خالی کردو۔ اور ایک دوسرا مکان اُنکے رہنے کو دیا۔ اُس میں انگریزی فوج نے قیام کیا اور جس قدر عمارت قلعہ کے قُرب و جوار میں تھی، سب کو ایک دم سے کھود ڈالنے کا حُکم دیا۔ ہزاروں گھر تہ خاک ہوگئے، جنکا اسباب صاحب خانہ نکال نہ سکے۔ حُسن باغ کو بالکل کھود کے بے نشان کردیا۔ مصطفےٰ علی خاں کو قید کرلیا۔ رکن الدولہ نواب محمد حسن خاں، مرزا حمید رشکوہ و مرزا نورالدین خلف شہزادہ مرزا سلیمان شکوہ دہلوی کو قید کرلیا۔ منڈیاؤں کی چھاؤنی میں جتنی ہندوستانی فوجیں تھیں اُنھوں نے میگزین اونٹ وغیرہ لے لیے۔ گوروں سے اور اُن سے لڑائی ہونے لگی۔ چھاؤنی پھونک دی۔ گوروں

نے تھوڑی فوج تلنگوں کے مقابل رکھی باقی فوج کو لیکر دوسری طرف سے گھس آئے۔ اس میں بہت سے تلنگے مارے گئے اور ساٹھ ستر قید ہوے۔ بعض مردم شہر نے بلوہ کیا، ان میں سے سولہ آدمیوں کو دوسرے دن سرراہ پھانسی پر چڑھا دیا۔ اسی طرح دو چار مجرموں کو روز پھانسیاں دیتے تھے۔ بیلی گارد میں انگریزی زبردست فوج موجود تھی۔ چاروں طرف توپیں چڑھادی تھیں۔ کئی سال کا سامان خوراک موجود تھا، غلہ بھرا ہوا تھا۔ اتنے میں پرشدے پور میں بلوہ ہوگیا۔ انگریز گھبرا گئے۔ لیکن راجہ منونت سنگھ نے انگریزوں کی مدد کی اور انکو اپنے ساتھ لیکر الہ آباد پہونچا دیا۔ لارنس صاحب چیف کمشنر کو معلوم ہوا کہ باغی فوج یہاں سے دس کوس کے فاصلے پر ہے۔ اسی وقت بادشاہ کی بارگاہ میں بہت سے فوجی گورے بھجوا دیے۔ انکو دیکھ کر نواب حسام الدولہ گھبرا گئے۔ انگریزی افسر نے کہا کہ جسقدر بادشاہی محل میں اسباب ہے سب ہمارے حوالے کردو۔ پانچ صندوق جواہر اور بیشمار اشرفیاں، جواہرات کے بادشاہی کئی تاج، کئی تخت جواہر کے، خراسانی اصفہانی تلواریں، بیش قیمت بندوقیں یہ سب اسباب تیس چھکڑوں میں لادکر انگریز لیگئے۔ ایک مورچہ پکے پل پر بنایا، دوسرا لوہے کے پل پر۔ دو ہزار برق انداز تھے اور بیشمار تلنگے۔ فوج کے بہت سے لوگ نوکری چھوڑکر چلے گئے۔ محمود خاں کوتوال جاں نثاری دکھاتا رہا۔ کچہری کبھی کبھی ہوتی تھی تو بھی شہر میں تشویش پھیلی تھی۔ سب کو مال کا ڈر، جان کا خوف تھا۔ دوکانداروں نے دوکانیں بند کر رکھی تھی۔ لوگ گھر سے نہیں نکلتے تھے۔ مہاجن اپنا روپیہ پیسہ دوکانوں سے اٹھا کر لیگئے۔ سب نے اپنا اپنا مال وزر زمین میں گاڑا۔ بہت سے لوگوں نے گٹھریاں باندھ کر کنوئیں میں ڈالدیں، برسوں کی روزیاں کنوئیں کی نذر کردیں۔ گورنمنٹ نے اشتہار دیا کہ سب لوگ اپنے اپنے گھروں سے ہوشیار رہیں، فوج خلاف ہوگئی ہے۔ خبر آئی ہے کہ چنہٹ میں باغی فوج پڑی ہے اور وہ لکھنؤ پر حملہ کرنے والی ہے۔

تلنگوں کے افسروں نے برہمنوں سے نیک ساعت دریافت کی تو انھوں نے کہا سہ شنبہ کا دن حملے کے واسطے ہر طرح اچھا ہے۔ لارنس صاحب چیف کمشنر بھی کیل کانٹے سے درست تھے۔ دوشنبہ کا دن گزر کے سہ شنبہ کی رات کو علی الصباح فوج لکھنؤ کی طرف بڑھی۔ چیف کمشنر فوج لیکر فوراً مقابل ہوے۔ بہت داد شجاعت دی، لیکن لڑائی بگڑ گئی۔ چیف کمشنر صاحب تو آہنی پل طے کرکے بیلی گارد میں داخل ہوگئے۔ اس خبر کے سنتے ہی کہ انگریزوں کو شکست ہوئی تمام قیدی سپاہی جو مچھی بھون میں قید تھے، انکی تعداد دو ہزار تھی۔ قلعہ کی کھڑکیاں توڑ کر باہر نکل آئے، سپاہی بھی نکل گئے۔ کچے پل پر انگریزوں کی طرف سے مورچہ کھدا ہوا تھا، راستہ بند تھا، پرندہ پر نہیں مار سکتا تھا۔ مگر ایک فقیر احمد اللہ شاہ صاحب تھوڑی فوج لے آئے اور صفوں کو چیرتے ہوے لوہے کے پل سے پار اتر گئے۔ انگریزی فوج گولیوں پر گولیاں لگا رہی تھی مگر شاہ صاحب پر گولیوں کا اثر بھی

نہ ہوتا تھا - اس کرامت کو دیکھ کر بہت لوگ انکی معیت میں ہوے - رات بھر توپیں بندوقیں چلا کیں - پیر سُنجارا کے شہدے بھی ایک چھوٹی سی توپ لیکر بیلی گارد کے سامنے آ کھڑے ہوے - ابھی پانچواں دن لڑائی کو ہوا تھا کہ افسران فوج نے جمع ہو کر مشورہ کیا کہ بغیر کسی بادشاہ کے ہم لوگ بے سر ہیں، سپاہ کو بادشاہ کی ضرورت ہے - اس لیے کہ بغیر خورشید کے ذرّے نہیں چمک سکتے - بادشاہ کی اولاد میں سے کسی کو تخت پر بٹھانا چاہیے - یہ تجویز کر کے مرزا ولیعہد کی ڈیوڑھی پر گئے، دربان فوج کو دیکھ کر گھبرا گئے - محل ارضعیفہ بوہل ہو گئی - کہاریاں محل میں خبر دینے کو گئیں - محل میں اک شور مچ گیا کہ فوج ہمیں لوٹنے آئی ہے - افسران فوج نے سب کی تشفی کی اور کہا گھبراؤ نہیں، ہم تو ایک خوشخبری لیکر آئے ہیں - پانچ روز سے بیلی گارد میں جنگ ہو رہی ہے - مگر یہ سب فوج محفلِ بے چراغ ہے، اس لیے کہ ہمارا کوئی بادشاہ نہیں ہے یوں تو بہت سے شہزادے ہیں مگر ہم کو تو مرزا واجد علی شاہ بادشاہ کی اولاد سے کام ہے - خواجہ سرا محل میں گیا اور کہا کہ گھبرانے کا مقام نہیں خوشی کا وقت ہے - فوج شہزادے کو بادشاہ بنانا چاہتی ہے - تامل نہ کیجیے گا - شہزادے کو گراں بہا لباس پہنا کر تخت پر بٹھائیے بادشاہ کی ساس نے کہا کہ میرا نواسا تو مجنون ہے، اُسے اپنے تن بدن کا ہوش نہیں - اگر وہ ہوش میں ہوتا تو سب سے پہلے بادشاہ اسے ولیعہد بناتے - بادشاہ کے ولیعہد تو لندن کو گئے ہیں اُنکا ایک فرزند موجود ہے، وہ ابھی سال بھر کا شیرخوار ہے - افسرانِ فوج نے بہت افسوس کیا اور کہا اگر اس وقت بادشاہ ہوتے تو اُنکو تخت پر بٹھاتے - انھیں میں سے ایک نے کہا تو پھر پریشانی کس بات کی ہے - اسی محل کے قریب نواب حضرت محل کی بارہ دری ہے - یہ بھی بادشاہ کی بیوی ہیں، انکا ایک شہزادہ ہے، برجیس قدر نام ہے - آخر سب اسی ڈیوڑھی پر آئے - داروغہ سے سب حال بیان کیا کہ اب تک ہم انگریزی ملازم تھے، لیکن اب اُن سے کارتوس کے بارے میں لڑائی ہو گئی - قلعہ مچھی بھون تو ہم نے خالی کرا لیا، بیلی گارد پر ایک زبردست جنگ اور ہو گی - لیکن ابھی تک فوج کا بادشاہ کوئی نہیں ہے، ہم اس واسطے یہاں آئے ہیں کہ بادشاہ کا فرزند اسی محل میں ہے، آپ داروغہ ہیں محل میں ہماری سفارش کیجیے - داروغہ ممو خاں نے پردہ کے پاس جا کر محلدار سے کہا کہ حضور عالیہ سے کہدو تکلیف نہ ہو تو ذرا پس پردہ تشریف لائیے خاص بات عرض کرنا ہے - ممو خاں داروغہ حکیم حسن رضا خاں بلگرامی اُستاد مرزا برجیس قدر میر مہدی آتالیق منتظر تھے کہ بیگم صاحبہ تشریف لائیں - داروغہ نے زمیں بوس ہو کر عرض کی کہ شکر کا مقام ہے، خداوند عالم مہربان ہوا - افسران فوج آئے ہیں اور درخواست کرتے ہیں کہ مرزا برجیس قدر بہادر سجا بادشاہ کے تخت سلطنت پر جلوہ افروز ہوں - ہم اپنی جاں بازی دکھائیں گے - مگر تنخواہ میں اضافہ کیا جائے - پیادوں کا بارہ روپے مہینہ اور سواروں کا تیس روپیہ ماہوار کیا جائے - حضرت عالیہ نے فرمایا ابھی جلدی کیا ہے، ابھی تو لکھنؤ بھی فتح نہیں ہوا - یہ خبر

سکے ہے کہ کس کی فتح اور کس کی شکست ہوگی۔ ابھی ہم اتنی ہمت نہیں کر سکتے کیونکہ انگریز تو گھر میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ برجیس قدر تخت پر قدم رکھیں گے تو ماخوذ ہو جائیں گے۔ اگر وہ فوج پر ظفر حاصل کریں گے تو ہم سے بری طرح پیش آئیں گے۔ ہماری یہ ہمت یہ جرأت نہیں ہو سکتی۔ اپنی جان بھاری نہیں ہے۔ سلطنت اسی دن لٹ گئی جب ہمارے بادشاہ یہاں آئیں گے۔ اور اب ہمارا وہ اگلا زمانہ نہیں ہے، نہ جواہر ہے نہ خزانہ، تمام مال و اسباب، زر و جواہر سب فرنگی لے گئے۔ جو کچھ تاج و تخت باقی تھا وہ بھی لے گئے، تم کو تنخواہ کہاں سے دیں گے جس کو تمہارا جی چاہے تخت پر بٹھاؤ ہمیں معذور رکھو۔ جب اہلکاروں نے یہ جواب سنا تو باہر آکر فوج سے کہا سردست تو یہ انتظام ممکن نہیں۔ بڑا سوال تو تنخواہ کا ہے۔ سرکار کے پاس زر ہے نہ جواہر۔ اگرچہ شہزادہ صاحب اقبال ہے مگر گیارہواں سال شروع ہے، جنگ کے زمانہ میں ایسے بادشاہ کی ضرورت ہے جو جہاندیدہ زمانہ کے نشیب و فراز سے واقف ہو۔ یہ سن کے افسران فوج نے کہا ہم نے اب تک پاس ادب کیا۔ مناسب یہی ہے کہ شہزادے کو لے آئیے، نہیں تو بات بگڑ جائے گی۔ اگر وہ کمسن ہے تو کیا غم ہے دنیا کے بادشاہ خود نہیں لڑتے، مگر بادشاہ کے نام سے سپاہ کو قوت ہو جاتی ہے۔ بے زری کا عذر بھی بیجا ہے، جب ملک زادہ بادشاہ بن جائے گا تو اسکے خیال سے زمین سونا اگلے گی۔ ابھی تک ہم نے عنان ادب کو نہیں چھوڑا، سرکشی میں خیال ادب نہیں رہتا۔ ڈر یہ ہے کہ کہیں گستاخی نہ ہو جائے۔ اگر زیادہ عذر ہوگا تو ہم محل میں گھس آئیں گے اور شہزادے کو جہاں پائیں گے اپنے کندھوں پر اٹھا کر تخت پر بٹھائیں گے۔ جب اہلکاروں نے حضرت محل کے پاس آکر پھر کہا کہ ہم نے سب طرح سمجھایا مگر افسر لوگ نہیں مانتے۔ مکان میں آنے کو آمادہ ہیں۔ ہم لوگ ان سے لڑ نہیں سکتے۔ جو کچھ ہو جائے وہ تعجب نہیں ہے۔ انکے آنے میں اب دیر نہ سمجھیے۔ آگے حضور مالک و مختار ہیں۔ پھر سوچ کر بیگم صاحبہ نے جواب دیا۔ خیر ہر حال میں وہ مددگار ہے۔ خدا دیتا ہے تو اس میں انکار فضول ہے مگر دل گھبراتا ہے، انجام پر نظر کر کے خوف معلوم ہوتا ہے۔ تخت و تاج ملتا ہوا چھوڑ دینا خدا کی مصلحت سے منہ موڑنا ہے لیکن اس وقت انکار بہتر نہیں ہے۔ اگر خدا مہربان ہے تو ڈر کا ہے کا۔ جا کے کہہ دو ہم کو منظور ہے۔ کوئی نیک تاریخ تخت نشینی کی مقرر کی جائے مگر ان سے قول و قسم لے لو کہ کسی وقت ہماری اطاعت سے باہر نہ ہوں۔ زندگی بھر دامن نہ چھوڑیں لڑائی سے منہ نہ موڑیں۔ ہمیں اکیلا چھوڑ کر بھاگ نہ جائیں، کسی کی لگائی بجھائی پر نہ آئیں، جو ٹکڑا میسر ہو بانٹ کھائیں۔ سب اہلکاروں نے کہا حضور مبارک ہو۔ تمام اہلکار افسران کے پاس آئے اور کہا تمہارا کہنا بیگم صاحبہ نے قبول کیا، مگر تم سب لوگ اپنے اپنے دین کی قسم کھا کر اس بات کا وعدہ کرو کہ بیگم صاحبہ کا ساتھ دو گے۔ سب نے قسم کھائی کہ جب تک دم میں

دم سے آپ کا ساتھ دیں گے۔ مگر بیگم صاحبہ بھی یہ اقرارنامہ لکھ دیں کہ جب بادشاہ آئیں گے تو تخت و تاج اُن کو دیدیا جائے گا۔ بیگم صاحبہ نے خوشی سے اپنی مُہر کرکے اقرارنامہ لکھ دیا۔

دوسرے دن ظہر کے وقت قصرِ خاقان میں شاہزادہ برجیس قدر مع بیگم صاحبہ سواری پر تشریف لائے۔ قصرِ خاقان کو رات بھر صاف کرکے سجایا تھا۔ تاج و تخت مرصع تیار کیا گیا تھا۔ اُسی تخت پر شہزادہ برجیس قدر کو بٹھایا۔ چاروں طرف سے مبارک سلامت ہونے لگی۔ نئے اہلکار ملازم ہوئے ایک لاکھ فوج رکھی گئی۔ گولہ اندازوں کا غول کا غول نوکر ہوا، تُمندار بھرتی ہوئے بخشی ملازم ہوئے۔ ممو خاں داروغہ کو محمد علی خاں کا خطاب ہوا۔ لوہار توپیں ڈھالنے لگے۔ کئی لاکھ کا خزانہ اِسی مصارف میں خالی ہو گیا۔ نواب شرف الدولہ بہادر نائب مقرر ہوئے۔ حکیم رضا خاں کے سپرد دیوانی ہوئی۔ آخر افسروں نے مشورہ کرکے ایک دن دھاوے کا مقرر کیا۔ انگریزوں نے شیل کے گولے گرانا شروع کیے، جس کی دھمک سے زمین پھٹ جاتی تھی۔ اور سیکڑوں قدم تک آدمی گر گر کر مر جاتے تھے۔ ہندوستانی فوج کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ یہ صرف اپنی بہادری سے لڑتے تھے۔ اگر سَو ہندوستانی مرتے تھے تو سات آٹھ انگریز گرتے تھے۔ جب ہندوستانیوں نے میدانِ جنگ فتح کیا تو اُنھوں نے سُرنگ اُڑا کر اُن کا خاتمہ کر دیا۔ بہت سے اہلِ شہر دہل کر مر گئے۔ اس قدر مجروح تھے کہ علاج کے لیے جراح بھی نہ ملتے تھے۔ باوجودیکہ پے در پے شکست ملے، والدۂ برجیس قدر حضرت محل صاحبہ نہایت جواں ہمت تھیں، بڑی جواں مردی سے ہر مشکل کو حل کرتی تھیں۔ رات دن انجام کی فکر تھی۔ سویرے کرسی پر رونق افروز ہوتی تھیں، افسرانِ فوج جنگ کا حال بیان کرتے تھے۔ جنرل حسام الدولہ کو علم تھا کہ جنگ میں تاخیر موجب ضرر ہے۔ ورنہ ہو جلدیہ آتش فرو ہونا چاہیے۔ نائب کو حکم تھا کہ مُلک کا محصول جلد حاصل کرکے فوج کی تنخواہ بانٹ دو۔ روزانہ فوج کو قسم قسم کی نعمتیں بھیجی جاتی تھیں۔ مُلک کا انتظام ٹھیک نہ تھا مگر محصول برابر آتا تھا، فوج کو تنخواہ تقسیم ہوتی تھی کمیدان اور تمندار افسران فوج تو جنگ میں جاتے نہ تھے فقط تلنگے کام کرتے تھے۔ اسی طرح جنگ طول پکڑتی جاتی تھی، اور تلنگوں کا زور گھٹتا جاتا تھا۔ لڑائی کو جب چار ماہ گزر گئے، فرنگیوں کی امدادی فوج کانپور سے تازہ دم آ رہی تھی۔ اُس نے اُناؤ میں ایک دن آرام کیا۔ جب یہ خبر برجیس قدر کی فوج میں آئی تو تلنگوں میں کھلبلی پڑ گئی — افسروں نے انتظام شروع کیا۔ کہیں نادری فوج بھیجی گئی کہیں اختری روانہ ہوئی۔ بشیر گنج میں جنگ ہوئی اُس میں بھی تلنگوں کو ہٹنا پڑا۔ اب فرنگی فوج عالم باغ میں آگئی۔ اور وہاں اپنا دھس بنانے میں مشغول ہوئی۔ کانپور سے آمد و رفت جاری تھی۔ ناکوں پر توپیں لگادی گئیں، مگر کمیدان کپتان فوج ہندوستانی سب جنگ کے اصول سے ناواقف تھے۔ آخر عالم باغ سے

انگریزوں نے حملہ شروع کیا اور سکندر باغ تک آ گئے۔ سکندر باغ میں بھی اچھی جنگ ہوئی۔ وہاں بھی ہندوستانیوں کو شکست ہوئی۔ بھگدڑ پڑ گئی۔ کچھ تو دریا میں ڈوب کر مر گئے کچھ پیر کر پار اتر گئے۔ انگریزوں نے چھتر منزل پر قبضہ کر لیا اور وہاں سے کچھ بیلی گارد میں داخل ہوئے کچھ چھتر منزل میں رہے۔ قریب قریب مورچے بندھے۔ عشق منزل کا راستہ بند ہو گیا۔

اب لڑائی کو پانچ مہینے گزر گئے۔ نواب رکن الدولہ محمد حسن صاحب جو بیلی گارد میں نظر بند تھے وہیں مر گئے، وہیں دفن ہوئے۔ دوسرے روز سویرے انگریز اپنی قوم کے لوگوں کو بیلی گارد سے نکال کر عالم باغ کی طرف روانہ ہوئے۔ چھتر منزل کی فوج بھی انکے ہمراہ تھی۔ راستے میں جتنے شاہی مکان تھے سب کو مسمار کر دیا۔ تمام فوج نجف کی طرف چلی۔ شام تک لڑتے بھڑتے دلکشا تک پہونچے۔ دوسرے دن سب عالم باغ کو روانہ ہو گئے۔ اور بچوں کو بیبیوں کو کانپور بھجوا دیا۔ اب انگریزوں نے کچھ فوج لندن سے بلوائی اور بہت سی فوج نیپال سے مل گئی، کچھ فوج پنجاب سے آئی۔ کانپور سے عالم باغ تک فوج ہی فوج تھی۔ اس فوج نے پہلے تو تمام بستیوں کو تباہ و برباد کر دیا۔ بے گناہوں کو مار ڈالا۔ مسلمانوں کو ۔۔۔ کو برباد کیا، گھر لوٹے گئے، زراعت پامال ہوئی، مرزا برجیس قدر کی فوج بھی تھی مگر افسران فوج سرکار انگریزی سے ساز باز رکھتے تھے اور بھی علاوہ اس کے ملے ہوئے تھے۔ آخری روز تک فوج بہت بڑی مگر کام نہ پہونچنے انگریزی فوج عالم باغ تک پہونچ گئی۔ اب لاٹ صاحب اور جنرل اوٹرم نے تجویز کیا۔ تمام شہر کو گھیر لو اور رعایا کو ایک طرف راستہ دے دو کہ وہ بھاگ سکے۔ فوجیں چاروں طرف پہنچ گئیں۔ جنرل اوٹرم صاحب نے شاہی قلعے میں آئے۔ قلعہ کا نام حصن حصین تھا۔ ۔۔۔ کو دیکھ کر حیران ہو گئے۔ ان کو کہیں مدد نہ ملی۔ بھاگنے لگے۔ ہر طرف قتل ہونے لگے۔ دریا سے خون جاری ہو گیا۔ تمام شہر میں لاش پر لاش پڑی ہوئی تھی۔ بہت سی رعیت بے خطا قتل ہوئی۔ سب گھر فوج نے لوٹ لیے۔ بھاگنے کا راستہ نہ ملتا تھا۔ بہت سے اہل شہر گھر گئے۔ چار روز تک اسی طرح قتل عام ہوا۔ ۔۔۔ تو اور بھی قیامت برپا تھی۔ گوروں کی فوج قلعے کے اندر چلی گئی۔ اب تو ظلم برپا ہو گیا۔ آسمان سے ۔۔۔ عام لوگ موت کے گھاٹ اتارے گئے۔ قیصر باغ میں قتل کا ۔۔۔ جب قتل ۔۔۔ سے سپاہی نکلے تو فوجی لوگ مال و زر لوٹنے لگے۔ شاہی محل کی عورتیں بے دم ۔۔۔ بھاگنے کا راستہ نہ ملتا تھا۔ ان میں سے ایک تو لڑ کر وہیں مر گئی۔ مرزا برجیس قدر اپنی والدہ کے قلعہ سے نکل گئے۔ تمام شہر میں ماتم بپا تھا چھوٹے چھوٹے بچے، پردہ نشین عورتیں، بڈھے ضعیف، بیمار، کمزور، جوان سب منہ اٹھائے بھاگ رہے تھے۔ جن کی شکل آفتاب نے بھی نہ دیکھی تھی وہ عصمت مآب شہزادیاں بے نقاب ننگے پاؤں گرتی پڑتی بھاگ رہی تھیں بہت سی

بیبیوں سے اُنکے شوہر اُنکے عزیز چھوٹ گئے۔ زن و مرد سب غم میں مبتلا تھے، گدا و غنی سب ایک حال میں تھے، شہزادیاں راستے میں تھک تھک کے گر پڑیں، وہ دن روزِ محشر سے کم نہ تھا۔ آبرو کا غم جان کا غم، دولت کا غم اولاد کا غم، رات بھر میں سب لوگ شہر سے باہر ہو گئے۔ سکھ، فرنگی، نیپالی، گھڑ گھر کا اسباب کھود کھود کر نکال رہے تھے اور جو صاحب خانہ ملتا تھا اُسے باغی سمجھ کر قتل کر ڈالتے تھے۔ شہر میں ہر جگہ لوٹ تھی۔ مگر خاندانِ درگاہ شاہ میاں نے بہت بہادری سے لڑ کر جان دی۔ فوج تو برجیس قدر اور اُن کی والدہ کو لیکر لڑتی بھڑتی نکل کھڑی ہوئی۔ احمد اللہ شاہ نے درگاہ حضرت عباس میں فوج سے تین دن تک مقابلہ کیا، آخر جب انگریزی فوج بہت زیادہ آگئی اور وہ تنہا رہ گئے تو کسی طرف کو چلے گئے۔ جب فوج برجیس قدر کو لیکر کا ٹکرا یا دیعنی گومتی پر پہونچی تو وہاں آدمیوں کی بھیڑ تھی۔ ہزاروں فوجی سپاہی، اور ایک ناؤ تھی، پہلے برجیس قدر اور اُن کی ماں کو ناؤ پر سوار کرکے پار اتارا۔ اُسکے بعد فوجی سپاہی اور سب لوگ کچھ پیر کر نکل گئے کچھ ناؤ میں سوار ہو کر اُترے۔ بیگم نے تو نیپال کا قصد کیا۔ فوج ساتھ ساتھ تھی، گر داروغہ واجد علی اور غلام رضا، شرف الدولہ وغیرہ نہیں گئے، گھر میں بیٹھ رہے۔ مرزا برجیس قدر بوندی میں داخل ہوئے وہاں کی گڑھی بنی ہوئی تھی اُس میں آرام سے رہے۔ وہاں کے راجہ حاضر ہوئے اور بقدر ہمت اُنکی مدد کی۔ وہ جنگل بھی آباد ہو گیا۔ کیونکہ اُنکے ساتھ دو لاکھ آدمی تھا۔ بیگم صاحبہ نے کچھ دنوں وہاں قیام کرکے نیا بندوبست شروع کیا۔ داروغہ مموں خاں جسے محمد علیخاں کا خطاب دیا تھا، قدیم الخدمت اور نمک حلال تھا۔ جس وقت کہ بڑے بڑے نامی اہلکار انگریزوں سے مل گئے، یہ ثابت قدم رہا۔ اس لیے اُسے وزیر بنایا لیکن پورا اختیار ملکی و مالی درحقیقت امراؤ مرزا خلعت معل جان بنارسی کے ہاتھ میں تھا۔ اُس نے شاہی فرامین یہاں سے جاری کیے۔ کئی ناظم مقرر کرکے علاقے کی سند لکھ دی۔ لکھنؤ تک عمل کرنا چاہا مگر ملک میں تو ہر طرف خلل تھا۔ دو چار قدم بھی شہر سے باہر جو کوئی قدم نکالتا تھا لُٹ جاتا تھا۔ یہاں تک کہ گھاگھرا کے اُس طرف انگریزی فوج بھی آگئی۔ اُنکے ساتھ بھی راجہ بینی مادھو سنگھ بڑی بہادری اور جانبازی سے لڑتا رہا، فوج شاہی بھی برسر جنگ رہی۔ جناب بیگم نے تلنگوں کی شکست دیکھ کر نیپالی سپہ سالار کو نامہ لکھا کہ اگر ہماری اعانت کرو تو ہم پہاڑ پر چلے آئیں۔ خط لیکر قاصد روانہ ہوا، مگر نیپال کے راجہ تک اس لیے نہ پہونچ سکا کہ اہلکاران نے باوجود امکان کے اُسے کمک نہ دی، فقط راستے کے گھاٹ سے راہ و رسم کرکے واپس آیا۔ ایک پہاڑی اہلکار وزیر خاں ساتھ آیا اُسنے بھی سب حال شہزادے سے بیان کیا کہ اگرچہ نیپالی زبان سے وعدہ کرتے ہیں مگر یقین نہیں آتا کہ آپکا ساتھ دیں۔ ان کے قول کا اعتبار نہیں۔ شہزادہ نے خلعت دے کر اُسے رخصت کیا۔ انگریزوں نے

گھاگھرا پر پُل باندھنا چاہا اور پنجاب سے بہت سی فوج بُلوائی۔ آٹھ دس دن یہاں بھی جنگ رہی۔ آخر کو کشتی کا پل انگریزوں نے باندھ لیا اور فوج پار اُترنے لگی۔ گھاٹ پر معرکہ کی جنگ ہوئی اور ہندی فوج کو شکست ہوئی۔ امراؤ مرزا اُس جنگ میں گھر گیا۔ سامنے دریائے گھاگھرا، پیچھے گورنمنٹ کی فوج، اس نے اپنے حواس کو قائم رکھا۔ اور تمام سواروں کو ہمراہ لیکر گھوڑوں کے زیر بند کاٹ کر دریا میں کود پڑا۔ خدا کی قدرت سے دریا کمر کمر تک ہو گیا۔ سب سوار صحیح و سلامت دریا کے پار اُتر آئے۔ اُسی وقت جنرل خدا بخش خاں، شہزادے کو لیکر چل نکلا۔ تلسی پور کے پاس ایک گانؤں بھگوان پور ہے، وہاں قیام کیا۔ ہر قسم کے سوداگر، دوکاندار تاجر ساتھ ساتھ آئے۔ اس سے پہلے نان پارے میں قیام کیا تھا اب بھگوان پور میں آرہے۔ رات کو کھانا میسر آیا۔ دس بجے دن کو بیگم صاحبہ نے دربار فرمایا۔ اور بیان کیا کہ جنرل خدا بخش خاں تلسی پور میں گھر گیا ہے۔ سوار بھی اُس کے ہمراہ ہیں۔ نہ گھوڑوں کو گھانس میسر آئی نہ فوج کو راشن ملا۔ لکھتا ہے کہ انگریزوں سے مقابلہ ہے اگر حضور یہاں تشریف لے آئیں تو کام بن جائے۔ سب نے کہا کہ ہم تو آپ کے غلام ہیں۔ جہاں حکم ہو چلیں۔ بیگم صاحبہ نے شب کو وہیں قیام کیا اور سویرے روانگی کا اہتمام کیا۔ شام تک سب تلسی پور پہونچ گئے۔ یکایک مخبر نے خبر دی کہ جنرل کو شکست ہوئی۔ یہ سُن کر بیگم صاحبہ نے حکم دیا کہ اب یہاں سے کوچ کرکے گلریا میں قیام کرو۔ مورچے باندھ کر انگریزوں سے جنگ ہوگی۔ لیکن یہاں بھی بیگم صاحبہ کو شکست نصیب ہوئی۔ گلریا کے قریب ایک قلعہ تھا وہاں قیام کیا۔ انگریزی فوج نے قلعہ کو گھیر لیا۔ بہت بھاری جنگ ہوئی اور یہاں بھی شکست نصیب ہوئی۔ اب بیگم صاحبہ معہ شہزادہ سکھپال میں سوار ہوکر سرحد نیپال میں داخل ہوئیں۔ وہاں نگہبانِ سرحد نے روکنا چاہا مگر وہ اتنے بڑے لشکر کو کیا روک سکتا تھا۔ بٹول پہاڑ کے نیچے سب نے قیام کیا۔ تمام افسرانِ فوج راناہینی مادھو سنگھ، راجہ جوت سنگھ، راجہ دیبی بخش، راجہ ہردت سنگھ، سید محمد حسن خاں، تجمل حسین خاں نانہاراؤ، بالاراؤ، کو شہزادہ برجیس قدر نے طلب کیا۔ سب کے مشورہ سے یہ بات طے ہوئی کہ یہاں مورچہ باندھ کر دشمن کی راہ بند کر دی جائے۔ نگہبانِ سرحد کو بہت کچھ زر و مال دیا اور بہت جواہر عطا کیا۔ اور اُس سے کہا کہ تم ہماری راہ میں مدد کرنا۔ جنرل احسان علی خاں اُس مورچہ پر رہا اور شہزادہ دیوگڑھ کی طرف روانہ ہوے اور پہاڑی راستہ طے کرکے بٹول پہونچے۔ وہاں تیرہ دن قیام رہا۔ ایک مخبر نے چودھویں دن خبر دی کہ نیپال کے راجہ کا بھانجا ہرمنجن راجہ کا ایک خط لایا ہے۔ خدا بخش خاں اُس کی پیشوائی کو روانہ ہوے اور شہزادے کے پاس اُس کو لائے۔ وہ شہزادے کی فوج کی کثرت دیکھ کر رعب میں آگیا۔ جس طرف نظر اُٹھا کر دیکھتا ہے فوج ہی فوج نظر آتی ہے۔ جب شہزادے پر نظر کی زمین چوم کر قدم بڑھایا، نگاہ نیچی کر لی۔ کیا دیکھتا ہے کہ ایک حسین تیول صورت لڑکا جسکی پیشانی سے دولتمندی ظاہر ہوتی ہے۔ تخت شاہی پر جلوہ افروز ہے۔ نذر پیش

کرکے لفافہ پیش کیا - اُس میں لکھا تھا زہے نصیب کہ آپ کے قدم اس ملک میں آئے - اُمید وار ہوں کہ غریب خانے تک تشریف لائیے - شہزادہ نے یہ خط پڑھ کر نیپال کا ارادہ کیا - راستے بہت خراب تھے - بیس دن میں بمشکل وہ مسافت طے ہوئی - وہاں کے راجہ کا دیوان پہاڑ کا سپہ سالار تھا - اُس نے جو فوج کو دیکھا فوراً شہزادہ کو چٹھی لکھی کہ آپ ہرگز اس طرف آنے کا قصد نہ کیجیے بٹول واپس جائیے - اب سب میں تجویز ہونے لگی کہ کیا کرنا چاہیے، اگر پہاڑ پر قیام کرتے ہیں تو راجہ سے جنگ ہوتی ہے اور پس پشت انگریزی فوج آتی ہے - ممو خاں وزیر نے بھی یہی رائے دی کہ واپس چلنا چاہیے - آخر یہ مصیبت کے مارے پہاڑوں سے ٹکراتے ہوئے ایک مہینے میں بٹول واپس چلے آئے - یہاں احسان علی خاں جنرل نے خبر بھیجی کہ یہاں کے پہاڑی لوگ انگریزوں سے ملے ہوئے ہیں، ان کی وجہ سے ہم کو شکست نصیب ہوئی - ظاہر میں تو پہاڑی ہمارے ساتھ ہیں مگر در پردہ انگریزوں کو مدد دیتے ہیں - یہ سُن کر بہت ملال ہوا - بیگم صاحبہ نے اسی وقت بدری سنگھ میر لشکر والی نیپال کو خط بھیجا کہ باوجود یکہ تمہارے ساتھ احسان کیے گئے اور تم نے ہمارے لشکر کی اعانت کا وعدہ کیا تھا تو بھی تم نے ہماری مدد نہ کی - اُس نے جواب دیا - میں ابھی دیوان جنگ بہادر کو خط لکھتا ہوں، اگر وہاں سے اجازت ملی تو آپ کی کمک کو حاضر ہوتا ہوں - اتنے میں جنرل احسان علی خاں نے شکایت کی کہ پہاڑیوں نے انگریزی فوج کو راستہ دے دیا اور اب وہ قریب آ گئے ہیں - شہزادے نے بدری سنگھ میر لشکر کو دوسرا خط لکھا کہ بڑا ظلم ہے کہ باوجود وعدہ تمہارے گھر میں بے وطن مسافروں کو امان نہیں ہے - اُس نے جواب میں لکھا کہ ہم انگریزوں کو روک نہیں سکتے ہیں - لیکن اگر آپ تنہا آئیں تو مع چند ارکان قریب کے آ سکتے ہیں - یہ خط سُن کر سب کو رنج ہوا - کہ یا تو راجہ نے ہم کو اس محبت سے طلب کیا تھا، یا اتنی بے رخی کی - یہ تو ممکن نہیں کہ راستے میں لشکر کو بے پناہ چھوڑ دیں - آخر مشورہ ٹھہرا کہ بیگم صاحبہ اور چند عورتوں کو بالا سے کوہ روانہ کیا جائے اور شہزادہ مع ارکین سلطنت دامن کوہ بٹول میں مورچہ باندھ کر قیام کرے - بٹول پر سخت لڑائی ہوئی - لیکن شہزادہ کی فوج توپ بندوق کا مقابلہ نہ کر سکی اور سخت شکست کھائی - گورنمنٹ کی فوج نے تعاقب کر کے سنگینوں پر رکھ لیا - بہت سے قتل ہوئے - ساری فوج بھاگ کر شاہزادے کے پاس پہونچی - دوسرے دن وہاں سے ماہ پور کی طرف کوچ کیا - یہاں تین دن بے آب و دانہ رہے - پہاڑ پر جانے کا راستہ بھی بند تھا - نیپالی سپاہ کی طرف سے جا بجا توپیں لگی ہوئی تھیں اور فوج بندوقیں لیے کھڑی تھی - اِدھر گورنمنٹ کی فوج اُدھر نیپالی فوج - یہ غریب فاقہ کش زندگی سے تنگ تھے، دونوں طرف سے راستہ بند تھا، رسد کا سامان کہیں سے نہیں آتا تھا - آخر زندگی سے مایوس ہو کر پہاڑ پر چڑھے اور نیپالی فوج کو چاروں طرف سے گھیر لیا -

سالار فوج نیپال نے جب دیکھا کہ ہم اتنی فوج سے مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اسوقت رسد بھی آخر لڑائی کی رک گئی اور
تمام فوج میں رسد تقسیم ہوئی۔ اسکے بعد بیگم صاحبہ کو ایک خط لکھا کہ وہاں آپ کو تکلیف ہوگی بہتر ہے کہ پانچ سو آدمیوں
کو ہمراہ لے کر آپ نئے کوٹ میں تشریف لے آئیں اور باقی لشکر دیوگڑھ میں قیام کرے۔ اس خط کے ملتے ہی بیگم معہ
اور سب عورتیں اور شہزادہ برجیس قدر وغیرہ مع خدمتگاروں نئے کوٹ کی طرف روانہ ہوئے۔ امیران لشکر برجیس قدر
کو صحیح خبر ملی کہ امراؤ مرزا افسر لشکر انگریزی افسروں سے ملا ہوا ہے اور ہم سب کو دغا سے قتل کرانا چاہتا ہے۔
امراؤ مرزا کو بھی کسی طرح خبر لگ گئی، فوراً سب سے پہلے نئے کوٹ کی طرف بھاگ گیا۔ اور پوشیدہ دیوان جنگ بہادر
کے پاس پہونچ گیا، اور کہا برجیس قدر کی فوج مجھ کو قتل کرنا چاہتی ہے مگر میں سرکار انگریزی کا خیر خواہ ہوں۔ اور
انگریزوں کی سندیں پیش کیں۔ جب دیوان کو معلوم ہوا کہ حقیقت میں انگریزوں کا خیر خواہ اور مخبر ہے۔ تو اُسے اپنے
امن میں لے لیا۔ بیگم صاحبہ مع برجیس قدر کے نئے کوٹ میں پہونچیں تو دیوان نے نذر پیش کی۔ برجیس قدر
نے اُسکو جواہرات خلعت مرحمت فرمایا اور ایک گھوڑا خاصی کا جسکا نام نگینہ تھا مرحمت فرمایا۔ اُسکے جتنے
فوجی افسر تھے سب کو شہزادہ کی طرف سے خلعت بیش بہا عنایت ہوئے مگر دیوگڑھ کی آب و ہوا ایسی ناموافق
ہوئی کہ تمام لشکر بیمار ہو گیا اور تمام فوج موت کی نذر ہو گئی۔ جب یہ حال افسرانِ فوج نے دیکھا تو انھوں نے
انگریزوں سے تحریک کی اور ان سے ملنے پر انگریزی لشکر میں چلے گئے۔ برجیس قدر قلعہ میں فروکش تھے اتنے
میں دیوان حاکم کی ایک عرضی آئی کہ فدوی کو کچھ عرض کرنا ہے، کسی دیرینہ سال کو یہاں تک بھیج دیجیے۔
برجیس قدر خود سوار ہو کر چلے۔ حاکم نے کوس بھر آکر پیشوائی کی اور زمین بوس سلام کرکے شہزادہ کو اپنے
گھر لے گیا اور کرسی زرنگار پر بٹھایا۔ شہزادے نے فرمایا کہ انقلاب زمانہ سے اکثر ایسا ہوا کہ بڑے بڑے
بادشاہوں پر وقت پڑا تو دوسرے بادشاہوں نے مدد کی ہے ہمارے بزرگوں سے تم واقف ہو گے کہ
جب ادھر سیر و شکار کی غرض سے آئے تو والیِ ملک نیپال نے حاضر ہو کر انکو نذر دی اور ایک ملک شکار کے
واسطے نذر کیا، بادشاہ کی طرف سے انکو خلعت اور مرتبہ دیا گیا۔ تمھارے لیے یہ فخر کی بات ہے کہ ہم اُسی
نسل کے ہیں۔ اور تمھارے مہمان ہیں۔ اب چاہے تم نیکنامی لو یا بدنامی دونوں ہو سکتے موجود ہیں۔ برجیسقدر
تو اتنا فرما کر رخصت ہوئے مگر ایک دانا آدمی ان کا، دیوان نے رکھ لیا۔ اور اُس سے کہا کہ بات یہ ہے
کہ ہم انگریزوں کے مددگار ہیں اور ان سے ہم کو بہت کچھ دولت ملتی ہے، اب شہزادے کے ساتھ کوئی رعایت
کوئی مہمان نوازی نہیں کر سکتے ہیں، آپ بیگم صاحبہ سے دستخطی پروانہ ایک وزیر کے نام لکھوا دیجیے کہ ممو خاں
وزیر فوج کو وہیں چھوڑ کر تنہا نئے کوٹ کو چلا آئے۔ اس آدمی نے دیوان حاکم کی تمام تقریر بیگم صاحبہ سے
کہی۔ یہ سُن کر بیگم صاحبہ کو بہت رنج ہوا۔ مشورہ کے بعد دل پر جبر کرکے پروانہ مُہری لکھ دیا۔ اور دوسرے دن

اپنا دوسرا پروانہ وزیر کے نام لکھا کہ تم ہرگز یہاں نہ آنا، اس میں دغا ہے۔ پہلا خط جبری ست لکھ دیا تھا۔ وزیر پہلا خط پاتے ہی چل کھڑا ہوا۔ دوسرا خط راستے میں نہیں ملا۔ چند افسر وزیر کے ہمراہ تھے۔ کمین گاہ میں عالم کوہ کی فوج لگی ہوئی تھی، ان سب کو گرفتار کرکے ہتھیار رکھوا لیے۔ دیوان کو جب یہ خبر ملی تو وہ چند انگریزی افسروں کو لیکر لشکر میں آیا۔ اور فوج سے کہا کہ تمہارے تمام افسر تو گرفتار ہو گئے اب اگر تم ہتھیار رکھ دو تو تم کو انگریز امان دیدیں گے۔ فوج نے کہا کہ آپ کے وعدے اور مہماں نوازی تو ہم کو خوب معلوم ہے، ہم کو تو دغا پر دغا دی آپ کی کسی بات کا اعتبار نہیں آتا۔ انگریزوں سے امان تو کیا ملیگی۔ اور نہ ہم ہتھیار رکھیں گے اور نہ اس ملک میں رہینگے تین ہزار سوار تھے۔ سب نے کمر باندھی اور کشمیر کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس جنگ و جدل میں رانا راؤ بہادر کی عورت گرفتار ہو گئی، لیکن انگریزوں نے اسے بیگم صاحبہ کے پاس بھیجوا دیا۔ رانا یعنی رانا معو سنگھ جی ٹنکر ویتی دیوگڑھ میں اپنا خیمہ ڈالے مختصر سی فوج لیے پڑے تھے۔ دیوان عالم انکے پاس گیا اور کہا تم جاکر اپنے گھر رہا ہو۔ ہم تم کو انگریزوں سے امان دلوا دیں گے۔ اس بہادر نے جواب دیا۔ تمہارے قول و قرار کی خوب تصدیق ہو چکی ہے اور جو کچھ تم نے کیا اچھا کیا، اب تم ہمارے واسطے فوج لیکر آئے ہو، ہم اب گھر کہاں جا سکتے ہیں۔ یہاں قضا لائی تھی، لیکن دو گھڑی کی امان دے دو تو تمہارا احسان ہے۔ کوہی فوج سے امان ملی تو اس نے اسی وقت اپنا روپیہ جمع کیا۔ عورت کا زیور اتروا کر، جتنی عورتیں تھیں سب کا زیور اتروا کر عورتوں کو تو دامن کوہ میں بٹھا دیا۔ اور کہا تم سے تو اب صبر کرو مگر بات یاد رکھنا، بیگم سیدا سبکی رفاقت میں رہنا، اور انھیں کے پاس جاکر مرنا۔ گھوڑے پر سوار ہو کر اپنے جوانوں کی صف میں آیا اور کہا۔ دیکھو ہمارے پاس اس قدر دولت ہے، اس میں جواہر بھی ہے، موتی بھی ہے، زیور بھی ہے۔ جسکا جو جی چاہے اس ڈھیر میں سے لیکر چلا جائے، ہم خوشی سے رخصت کرتے ہیں، اور جس کو مردانہ موت قبول ہو وہ ہمارے ساتھ جان دے۔ دو آدمیوں نے ان میں سے دولت لیکر اپنا راستہ لیا۔ دوسو اڑتالیس جوان لڑنے مرنے پر تیار ہو گئے۔ دیوان کے ساتھ دو ہزار پہاڑی فوج تھی، اسکے علاوہ انگریزی فوج بھی بہت تھی۔ اسی وقت توپیں لگا دی گئیں۔ رانا کے پاس توپ تھی ہی نہیں۔ جیسے پہلا گولا چھوٹا بہت سے لوگ توپوں سے ڈر گئے مگر باقیماندہ سپاہی توپوں پر جا پڑے اور تلوار کھینچکر بہت سے قتل کیے۔ وہ تھوڑے سے جوانمرد اس بہادری سے لڑے کہ کوہی فوج بھاگ کھڑی ہوئی۔ تھوڑی دیر تک ہندیوں نے کوہی فوج کا تعاقب کیا۔ آخر ایک افسر نے کچھ فوج ایک باغ کی آڑ میں چھپا رکھی، اور جب یہ لوگ پہاڑی فوج کو بھگاتے جا رہے تھے تو عقب سے پہلوان سنگھ نے توپچیوں کو حکم دیا۔ سب نے توپوں کی باڑھ ماری۔ رانا صاحب بے خبری میں مارے گئے، ان کے سب ساتھی وہیں لڑکر مر گئے۔ اس میدان کو فتح کرکے دیوان عالم ٹہول میں آیا، جہاں ممو خاں وزیر اور نواب خان بہادر

رئیس بانس بریلی قید تھے۔ ممو خاں وزیر نے ہر چند دیوان حاکم کی خوشامد کی کہ یا تو مجھے اپنے پاس قید رہنے دو یا جس طرف کا حکم دو چلا جاؤں۔ لیکن دیوان نے اس غریب کو اور خاں صاحب کو انگریزوں کے حوالہ کر دیا جب برجیس قدر کی تمام فوج کشمیر کی طرف چلی گئی، وزیر گرفتار ہو گیا، نواب خاں رئیس قید ہو کر انگریزوں کے حوالے کیا گیا، امراؤ مرزا انگریزوں سے مل گیا، راجا بینی مادھو پہاڑیوں سے مقابلہ کرکے توپوں سے مارا گیا، اور کچھ سپاہی نقصانِ آب و ہوا سے تلف ہوئے، اور انگریزوں کو اطمینان ہو گیا کہ برجیس قدر کی تمام فوج کا خاتمہ ہو گیا۔ تو انگریزوں نے بیگم صاحبہ کو خط بھیجا کہ اس جنگ میں آپ کی کوئی خطا نہیں تھی۔ باغیوں نے زبردستی آپ کے صاحبزادہ کو بادشاہ بنا کر خود بھی تباہ ہوئے اور آپ کو بھی پریشان کیا اور اپنے اعمال کی سزا خوب پائی۔ مگر اب قسم کھا کر وعدہ کرتے ہیں کہ ہم آپ کو کوئی صدمہ نہ پہونچائیں گے۔ آپ مع شاہزادہ تشریف لائیں، چاہے لکھنؤ میں رہیں یا کلکتے میں، دس پانچ گاؤں آپ کو دیدیں گے اور تیرہ ہزار روپیہ ماہوار برابر دیتے رہیں گے اور شہزادے کی وہی عزت برقرار رہیگی جو بادشاہ کی ہونا چاہیے۔ تعلیم بھی ہماری طرف سے اُن کی اچھی ہوگی۔ لیکن آپ اور شاہزادہ جہاں رہیں گے وہاں ہمارا پہرہ ضرور رہیگا۔ اور کبھی شاہزادہ کو لکھنؤ سے باہر جانے کا حکم نہیں دیا جائیگا۔ یہ سب باتیں آپ کو منظور ہوں تو اس اقرارنامہ پر مُہر کر دیجیے۔ بیگم صاحبہ نے جواب میں لکھا کہ ہم کو تنخواہ لینا منظور نہیں ہے۔ اب ہم زندگی بھر پہاڑ پر رہیں گے۔ تم نے پُرانے عہدنامہ کو فسخ کر دیا تو اب نئے عہدنامہ کے ایفا کی کہاں تک اُمید ہو سکتی ہے۔ جب انگریزوں کو جواب ملا تو اُنھوں نے اپنے ملازمین کو حکم دیا کہ بیگم صاحبہ کو بآرام تمام و بحفاظت خاص نیپال میں پہونچا دو۔ بیگم صاحبہ سکھپال میں سوار ہوئیں اور سارا عملہ ہمراہ ہوا۔ چودہ گھوڑے اور سات ہاتھی، چار خواجہ سرا، بہت سے نوکر، چند خواص، پُرانی اور نئی ملازم عورتیں، یہ سب کے سب ہمراہ تھے۔ کئی روز میں یہ سفر طے ہوا اور نیپال کے پہاڑ پر خیمہ لگا۔ پہاڑ کی چوٹی پر جو حاکم تھا وہ پیشوائی کو آیا اور بہت عزت سے لے گیا۔ کوٹھی میں اُتارا اور ضیافت کے نام سے پانچ توڑے دیئے، دو چار گھوڑے دو چار ہاتھی نذر کیے۔ شہزادہ کی طرف سے گراں بہا خلعت عنایت ہوا۔ اور باقی جس قدر لشکر اور رفقا ساتھ تھے اُن کو بیگم صاحبہ کے ساتھ جانے کی اجازت نہ تھی، سب نئے کوٹ میں پڑے ہوئے تھے۔ انگریز چاہتے تھے کہ یہ سب لوگ لکھنؤ میں واپس آئیں اس لیے اُن سے کہلا بھیجا کہ آپ سب لوگ اپنے وطن کو جا سکتے ہیں بشرطیکہ اپنے اپنے ہتھیار رکھدیں۔ آخر مجبور ہو کر باقیماندہ نے ہتھیار رکھدیئے اور وطن کو واپس آئے۔ ہر سپاہی کا نام اور گھر کا پتہ لکھ لیا گیا۔

خدا کی شان کے کرشمے دیکھیے کہ آخری شاہِ اودھ کا لختِ جگر جس نے ہمیشہ مہدِ عافیت میں پرورش پائی، گیارہ برس کی عمر میں زبردستی بادشاہ بنایا گیا اور بے سروسامانی کی حالت میں گھر سے نکالا گیا۔ تلوار کے

سایہ میں نیپال کی سرحد میں مارا مارا پھرا کہیں پناہ نہ ملی، کسی نے دھیان نہ کیا۔ آخر نظربندوں کی طرح ٹھگ نیپال میں رہنے کی جگہ ملی۔ آخر وقت میں قضا نے کلکتہ کا سفر درپیش کیا۔ یہ مصائب ہیں جو نازک مزاج ناز پروردہ شہزادہ کو پیش آئے

وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِیْلاً

(از جناب سید معقول حسین صاحب احمد پوری بی اے)

جب سے دنیا میں ہے مکین انساں جب سے قائم ہوے زمین و زماں
جب سے مذہب کا دور دورہ ہے جب سے قانون کار فرما ہے
جب سے اخلاق کا بجا ڈنکا جب سے تہذیب کا ظہور ہوا
جب سے صدق و صفا کا ہے اک شور جب سے قومی ملاپ کا ہے زور
دیکھتے ہیں یہ تب سے ہم پیارے
ہے وہی چاند اور وہی تارے!
اور ہوا بھی بدل کے چلتی ہے نئی تہذیب بھی برستی ہے
روز فیشن نئے بدلتے ہیں نئے قانون بھی نکلتے ہیں
اگلے اور مجلسیں بھی کم نہ رہیں امن کی صورتیں بھی کم نہ رہیں
پھر بھی دنیا کا رنگ روپ وہی
وہی سایہ ہے اور دھوپ وہی!

افسانہ اور اُس کی فنی ترتیب

(جناب سید وقار عظیم صاحب ایم اے)

اُردو میں اُس مفہوم کو ادا کرنے کے لیے کوئی لفظ نہیں جو Selling کے لفظ سے ادا ہوتا ہے۔ اور حقیقت میں اس مفہوم کو ایک لفظ میں ادا کرنا اگر ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ اس لیے کہ افسانہ کی Selling میں ہمیں پلاٹ کی ترتیب۔ کرداروں کی فطرت، ماحول کے حقیقی عناصر اور کسی خاص منظر کے فطری اثرات کو نظر میں رکھنا پڑتا ہے۔ Setting کا مقصد یہ ہے کہ افسانہ کے واقعات کی ترتیب، اُن کی رَو، اُن کے ارتقا، وقت اور جگہ کے تناسب اور کرداروں کو حقیقی بنانے میں دوسرے اجزا سے فطرت سے زیادہ سے زیادہ قریب کرے۔ یا دوسرے لفظوں میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ Setting ہی کا فن ایسا ہے جس کی مدد سے افسانہ نگار افسانہ کے مختلف اجزا میں تناسب پیدا کر کے اس میں فنی بارکیاں پیدا کر سکتا ہے۔ افسانہ پڑھنے والے کے ذہن کو متاثر کرنے کی صورت سے کوئی ترکیب نہیں کہ Setting افسانہ کی حقیقت کو اس کے سامنے اس طرح پیش کرے کہ پڑھنے والا اپنے آپ کو اُس کے اندر گم کر دے۔ اور افسانہ کا مقصد اور اُس کے واقعات اُس کے ذہن میں بالا تبالے نقش ہوتے چلے جائیں۔

یہی وجہ ہے کہ اکثر افسانہ نگار اپنے افسانے کو بیانی تفصیلات سے شروع کرتے ہیں۔ اور چند جملوں میں پڑھنے والے کے ذہن میں واقعات یا Situation کو بٹھا دیتے ہیں اور اس کے بعد پڑھنے والا اس ابتدا میں پیدا کیے ہوئے منظر کی مدد سے افسانہ کے دوسرے واقعات میں ایک حقیقی رازدار کی طرح شریک ہوتا ہے اور اُن میں دلچسپی محسوس کرتا ہے۔ اُس کے سامنے جو چیز آتی ہے اجنبی نہیں معلوم ہوتی اس لیے کہ ابتدا میں جو Setting یا Situation اس کے سامنے پیش کر دی گئی ہے اُس کے بعد اسی قسم کی چیزوں کے وجود کی امید کی جا سکتی تھی۔

یہ کہنے کے بعد شاید افسانہ نگار اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جائیں کہ افسانہ شروع کرنے سے پہلے اُس کی Setting پیش کر دینی ضروری ہے اور وہ صرف بیانی تفصیلات کے ذریعہ سے پیش کی جا سکتی ہے۔ یہ سمجھنا قطعی غلطی ہے۔ اس لیے کہ Setting بیانی تفصیلات کے علاوہ اور بہت سے طریقوں سے بھی پڑھنے والے کے ذہن میں جاگزیں ہو سکتی ہے۔ بعض نکانانی افسانوں میں اُس کا پہلا جملہ پڑھنے والے

کے ذہن کو افسانہ کی Situation سے واقف کر دیتا ہے اور جب افسانہ پڑھنے والا اُس جملے کو پڑھنے کے بعد اجنبیت کی دنیا سے نکل کر افسانہ کے واقعات کی رَو میں داخل ہو جاتا ہے تو فن کار افسانہ نگار Setting کو رفتہ رفتہ اور نمایاں کرتا چلا جاتا ہے اور افسانہ کے آخر تک وہ ایک مستقل حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ یہی طریقہ بیانی تفصیلات یا Description میں بھی ملحوظ رہے۔ Setting کو ابتدائی بیانات کے ذریعہ سے پیش کرنے کے لیے ضروری نہیں کہ ہم طویل تفصیلوں سے کام لیں۔ اس لیے کہ عموماً افسانہ پڑھنے والے طویل تفصیلات میں دلچسپی نہیں لیتے اور اُنھیں پڑھے بغیر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ اچھے افسانہ نگار اس بات سے واقف ہیں اس لیے اُن کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اگر افسانہ کو بیان یا Description سے شروع بھی کریں گے تو نہایت اختصار سے کام لیں گے اور افسانہ پڑھنے والے کو اپنے واقعات کی رَو میں شامل کر لینے کے بعد رفتہ رفتہ Description کو اپنے مقصد اور ضرورت کے مطابق طویل بناتے جائیں گے۔

ان تفصیلات کے غیر ضروری حصّوں سے بچنے کے لیے افسانہ نگار کو دو باتوں کی سخت ضرورت ہے۔ اوّل تو یہ کہ وہ اپنے گرد و پیش کا مطالعہ اتنی غور سے کرے کہ چھوٹی اور بڑی ہر چیز اُس کی نظروں کے سامنے ہو افسانہ میں جس ماحول یا Situation کو وہ پیش کرنا چاہتا ہے اُسے اُس کی رگ رگ سے واقف ہونا چاہیے۔ ورنہ ایک کامیاب آرٹسٹ کی حیثیت سے کبھی نمایاں درجہ حاصل نہیں کر سکتا۔

لیکن مشاہدہ سے زیادہ ضروری چیز ایک اور ہے۔ انسان زیادہ سے زیادہ مشاہدہ کرے اور اپنے افسانہ کے ماحول سے اُسکے گرد و پیش کی ذرا ذرا سی چیز سے اچھی طرح واقف ہو۔ اسکے باوجود بھی وہ افسانہ میں اثر نہیں پیدا کر سکتا۔ یا اپنے تحریری بیانات کو زیادہ مفید اور فنی نہیں بنا سکتا۔ اس لیے کہ ضروری مشاہدات پر عبور کرنے کے بعد اُس کے لیے یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ جو چیزیں اُس کی نظر سے گزری ہیں اُن میں سے ہر ایک کی اہمیت کیا ہے۔ کس چیز کا بیان فطرتِ انسانی پر زیادہ گہرا اثر ڈال سکتا ہے۔ کس چیز کا ذکر افسانہ پڑھنے والے کو آسانی سے اُس کا اور افسانہ کے واقعات کا رازدار بنا سکتا ہے۔ کس چیز کے پڑھنے کے بعد پڑھنے والا خود کو افسانہ کے ماحول میں شامل سمجھ لینے پر مجبور رہے۔ اس لیے افسانہ نگاروں کا دوسرا لیکن سب سے زیادہ اہم فرض یہی ہے کہ ہمیشہ اس بات کا اندازہ کر سکیں کہ انھیں ایک موقعہ پر کس چیز کی تفصیلات پیش کرنے کی ضرورت ہے اور کس سے بچنا لازمی ہے۔

اکثر افسانے پلاٹ کی دلچسپی۔ کردار کی بلندی۔ تخیّل کی جدت اور اس قسم کی دوسری چیزوں کے لحاظ سے کافی بلند ہوتے ہیں لیکن اُنھیں پڑھنے کے بعد ہم کوئی خاص اثر نہیں محسوس کرتے۔ ہم تھوڑی دیر

کے لیے اپنے آپ کو گزرے ہوئے واقعات میں گم ہوتے ہوئے نہیں دیکھتے ۔ ہم پلاٹ کی دلچسپی ۔کرداروں کی فطری بلندی، اور تخیئل کی سحر کاریوں سے اس درجہ بھی اثر قبول نہیں کرتے کہ افسانہ ختم کرنے کے بعد اُس سے لطف لینے کی کوشش کریں ۔ اس کی ظاہرا کوئی وجہ نہیں سمجھ میں آتی ۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسا ہونے کی صرف ایک وجہ ہے ۔ اور وہ صرف Setting کی فنی کمی ۔ افسانہ میں ہر چیز اپنی اپنی جگہ دلچسپ اور ایک بلند معیار کی ہے لیکن افسانہ نگار فن کی نزاکتوں سے ناواقف ہے اُسے تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد پڑھنے والوں کے دلوں کے لیے کوئی نیا جادو پھونکنا چاہیے ۔ اُسے چاہیے کہ افسانے کے واقعات کے درمیان میں ایک غیر محسوس طریقہ پر اُس روحانی نغمہ کے زور ایک بول بولتا چلے جو فطرت انسانی کے دلوں کو اپنے قبضہ میں رکھنے کے لیے سحر کا کام کرتا ہے ۔جسے ہر لطیف دُنیا میں فن کی نزاکت کہا جاتا ہے اور جس نے افسانہ نگاری میں Setting کا نام اختیار کیا ہے ۔ اس لیے ہم مختصر طور پر Setting کے متعلق یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایک ایسی چیز ہے جو افسانہ میں دلکشی اور دلفریبی پیدا کرنے کے لیے ایک روح کی حیثیت رکھتی ہے ۔ اُس کے بغیر ہر بلندی پستی اور ہر کیف ایک بے اصولی ہے ۔ بڑے افسانہ نگار Setting کی ادبی اور فنی نزاکت کا کام تصور زائی Suggestibility سے لیتے ہیں اور ہر موقعہ پر کچھ خود لکھتے ہیں اور کچھ پڑھنے والے کا تصور خود محسوس کرنے پر مجبور ہے ۔اُن کا کام اُس کے تصور کو راہ راست پر لگانا ہے ۔اور اسی کا نام فن ہے ۔یہی Setting کی خوبی ہے ۔

Setting کا بہترین مواد اکثر افسانہ نگاروں کے نزدیک مقامی رنگ ہے ۔اور اس لیے ہر زبان کے اچھے اچھے افسانہ نگار اپنے لیے کسی نہ کسی خاص مقامی خصوصیت کو مخصوص کر لیتے ہیں اور اپنے افسانوں کی بنیاد اُسی پر رکھتے ہیں ۔ اُردو میں "پریم چند" اور اُنکا اثر قبول کرنے والے دوسرے افسانہ نگاروں کے افسانے اس رنگ کی بہتر سے بہتر مثالیں پیش کر سکتے ہیں ۔ لیکن اس قسم کے افسانوں پر عموماً جو اعتراض ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ جن افسانوں کی بنیاد مقامی خصوصیات پر ہوتی ہے وہ صرف ایک محدود جماعت کے لیے دلچسپی کا سامان بن سکتے ہیں ۔ یہ اعتراض کسی حد تک صحیح ہے لیکن اس کا اطلاق صرف ایسے افسانوں پر ہوتا ہے جن میں لکھنے والوں نے اپنے مطمح نظر کو بھی محدود کر دیا ہے ۔ اچھے افسانہ لکھنے والے مقامی رنگ کو بھی بلند سے بلند مقاصد کا ارضیہ (Background) بناتے ہیں ۔اُن میں جہاں ایک طرف مقامی دلچسپیاں اور اُس کی مخصوص کششیں ہیں وہاں عالمگیریت کے دلدادوں کے لیے بڑے سے بڑا تفریح کا سامان بھی موجود ہے ۔ اس لیے کہ ایسے افسانہ نگار مقامی رنگ کو افسانہ کی بنیاد نہیں بناتے بلکہ اُس سے صرف ایک ایسی Setting کا کام لیتے ہیں جسکے بغیر اُنکے موضوعہ پلاٹ کا وجود اور اُن کے پیدا کیے ہوئے فطری

کردار دن کا عمل غیر ممکن تھا۔ وہ فطرتِ انسانی کی شیرینی اور تلخ حقیقتوں پر عبور رکھتے ہیں۔ انھیں نفسیات
نے عام انسانی فطرت کی نازک لطافتوں سے آگاہ کر رکھا ہے۔ انھیں معلوم ہے کہ انسانی فطرت کی کون سی
رگ کس وقت چھیڑنی چاہیے اور کس رگ کا کس وقت چھیڑنا خطرناک اور خلافِ فطرت ہے۔ اس کی
عمدہ مثالیں "پریم چند" کے افسانوں میں ملتی ہیں جن میں سے اکثر میں انھوں نے دیہاتی زندگی کو اپنا موضوع
بنایا ہے اور اپنے افسانوں کی بنیاد بھی اسی Setting پر رکھی ہے لیکن اس کے باوجود اُنکے پلاٹ اور
کردار جن رنگوں میں پیش کیے جاتے ہیں وہ ایک محدود جماعت کی دلچسپی کا موجب نہیں ہوتے بلکہ عام
فطرتِ انسانی اُن سے وہی اثر قبول کرتی ہے جو ایک محدود جماعت کے افراد۔ اور اسکی وجہ صرف
یہ ہے کہ اُن کی Setting میں نفسیاتی گہرے مطالعہ اور مشاہدہ کے باریک فرق سے کام لیا گیا ہے۔
"پریم چند" کے افسانوں کا ذکر آگیا اس لیے اس موقع پر اس بات کا اظہار بھی ضروری ہے کہ مقامی
رنگ کو افسانہ میں صرف اس لیے شامل نہیں کرنا چاہیے کہ وہ اس کی دلچسپی میں اضافہ کر سکتا ہے۔
بلکہ ضروری یہ ہے کہ ہر شخص یہ سمجھے کہ جو پلاٹ یا جو کردار افسانہ میں جس رنگ میں پیش کیے گئے ہیں ان کے
لیے صرف اس قسم کی Setting کافی ہو سکتی تھی۔ اگر یہ Setting نہ ہوتی تو پلاٹ کی فطری
رفتار اور کرداروں کے ارتقا میں فرق آ جاتا۔ اس لیے نئے افسانہ نگاروں کو اس بات کا خیال رکھنا چاہیے
کہ افسانہ میں مقامی رنگ شامل کرتے وقت یہ بھی محسوس کر لیں کہ اسکے متعلقہ پلاٹ اور کرداروں کے فطری
تقاضوں کو وہ Setting سے کس حد تک لگاؤ ہے۔ اگر دونوں میں سے کوئی ایک دوسرے سے الگ
معلوم ہو تو یہ بہت بڑی کمی سمجھی جائے گی۔

مقامی رنگ کہنے کے بعد ہمارا ذہن خدا جانے کس کس طرف جاتا ہے۔ اس لیے کہ مقامی رنگ میں
ہر وہ چیز شامل ہے جس کا تعلق کسی خاص مقام سے ہو اور جو اُس مقام کے سوا اور کہیں مل بھی نہ سکے۔ اس لیے
اس میں کسی خاص جگہ کے لوگوں کی فطرت، اُنکے رہنے سہنے کے طریقے، اُنکے لباس، اُنکے مشاغل، اُن کے
کردار اور اُنکی گفتار کے علاوہ مناظرِ فطرت اور امتیازی خصوصیات اور اس قسم کی ساری چیزوں کو شامل
کر سکتے ہیں۔ لیکن مقامی خصوصیات میں سے مناظرِ فطرت ایسی چیز ہیں جنکو افسانہ کی Setting سے
زیادہ گہرا تعلق ہے۔ اور مقامی مناظرِ فطرت کو قریب قریب ہر قسم کے افسانوں کی Setting کے لیے
کام میں لا سکتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہوگا کہ ہم اُن چیزوں کا بیان کرتے وقت اپنا طرز بدلنے پر مجبور ہو جائیں گے۔
اس لیے کہ ہر مختلف قسم کے افسانہ کے لیے ایک جداگانہ قسم کی Setting کی ضرورت ہے۔ مثال
کے لیے اگر ہم رومانی افسانوں کو لیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ان کا انداز دوسرے افسانوں سے مختلف ہے۔

اس میں ہیرو اور ہیروئن کے جذبات میں ایک قسم کا ہیجان ہوتا ہے جو کلاسی اور مثالی عشق کے افسانوں میں نہیں ہوتا۔ رومانی افسانوں کا عاشق کسی قدر بے تاب، بے چین اور سیماب صفت ہوتا ہے۔ مثالی اور کلاسی عشق میں ایسی مثالیں نہیں ملیں گی۔ اس لیے ضروری ہوا کہ ہم افسانہ کی Setting کو اُسی عاشق کے مزاج کے مطابق رکھیں۔ مناظر فطرت کی ایسی چیزوں کو پیش کریں جن کا وجود بجائے خود رومانی صفات کا حامل ہے۔ چاندنی عشق پرور روشنی کے علاوہ۔ پپیہے کی پی کہاں مور کی تانیں اور اس کا رقص۔ سرسوں کا پھولنا یہ سب چیزیں رومانی جذبات کی پرورش کرتی ہیں۔ اور اس لیے رومانی افسانوں کی بہترین Setting ہو سکتی ہیں۔ کلاسی عشق کے افسانوں میں عاشق و معشوق کی حالت بالکل دوسری طرح کی ہوتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے میں سرشار، دُنیا و مافیہا سے بے خبر، خود ہی مبتدا اور خود ہی خبر۔ اور اسی قسم کی دوسری پاکیزہ اور بلند زندگی کی باتیں۔ ایسے افسانوں میں مناظر فطرت کو اُنکے رنگ میں رنگ کر پیش کرنا چاہیے۔

عشقیہ افسانوں کے مواد اور فطرت کی ہم آہنگی کا ذکر آنے کے ساتھ یہ کہہ دینا بھی ضروری ہے کہ عموماً دوسری قسم کے افسانوں میں بھی اس طریقہ کو محمود سمجھا جاتا ہے کہ افسانہ کے واقعات اور مناظر فطرت کے ذریعہ سے پیش کی ہوئی Setting میں ایک خاص قسم کی ہم آہنگی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر افسانہ نگار اس Setting کو اس سے زیادہ بلند مقصد کے لیے کام میں لاتے ہیں۔ وہ مناظر کی Setting پیش کرکے پڑھنے والے کو افسانہ کی Spirit یا اُس کے Mood کا صحیح پتہ بتا دیتے ہیں اور پڑھنے والا بالکل شروع ہی سے اُس رنگ میں ڈوب جاتا ہے۔ لیکن ایسے موقعوں پر اس بات کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے کہ مناظر فطرت کو بالکل شروع ہی میں تفصیل کے ساتھ نہ بیان کر دیا جائے بلکہ افسانہ کے ارتقا اور اس کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ فطرت اور اُس کے مناظر کے مختلف ہم آہنگ پہلو پیش کیے جائیں۔ تاکہ یہ مناظر برابر افسانہ کی Spirit اور Mood کے مطابق رہیں۔

افسانہ نگاری کے فن اور Setting کی سحر آفرینیوں میں سب سے دشوار بات یہی ہے کہ افسانہ نگار اپنے افسانہ کے بالکل ابتدائی جملوں سے قصہ یا افسانہ کے Mood کا اظہار کر دے۔ چنانچہ اچھے اچھے افسانہ نگاروں کے دو ایک افسانوں کی ابتدا مثال کے طور پر پیش کرکے اس بات کو زیادہ واضح کیا جا سکتا ہے۔

نیاز کا افسانہ کیوپڈ و سائکی اس طرح شروع ہوتا ہے :۔

سیم لہ ق۔ یونان کے معبد کا ذرہ ذرہ بجائے خود اک حسن آباد تھا۔ لیکن سائکی کے شباب نے جس رعنائی جمال کا مظاہرہ کیا وہ حقیقتاً عورت کی "دُنیا" میں ایک سحر تھا۔ اک اعجاز تھا"

کسی رومانی افسانہ کی ابتدا اس شکل سے اور بھی زیادہ دلکش اور تصور زا Suggestive ہو سکتی ہے کہ دو جملوں کو پڑھنے کے بعد انسان حُسن کے اُس سحر کا اثر محسوس کرنے لگتا ہو جو آگے چل کر افسانہ میں فتنۂ قیامت بن کر ظاہر ہوا ہے۔

مجنوں کے افسانہ "بیگانہ" کی ابتدا یوں ہوتی ہے :۔

"صورت اور حرکات و سکنات سے ہر شخص اُس کو پاگل کہہ دیتا اور ہم لوگوں نے تو اُسکو پاگل ہی سمجھ لیا تھا ہم لوگوں کو یقین تھا کہ وہ بغیر ٹکٹ سفر کر رہا ہے ورنہ ایسے رقہ پوشوں کا سکنڈ کلاس میں کہاں گذر؟ بال پریشان داڑھی بڑھی ہوئی ناخن گندے شاید مہینوں سے نہیں کٹے تھے آنکھوں میں حلقے پڑے تھے، ہونٹ سوکھے ہوئے تھے گال پچکے ہوئے تھے۔ برسوں کا بیمار معلوم ہوتا تھا۔ سوا کُرتے اور پائجامہ کے اُس کے بدن پر کچھ اور نہ تھا۔ کُرتے کی یہ حالت کہ کہیں سے آستین نکلی ہوئی۔ کہیں سے دامن سِلا ہوا۔ پائجامہ بھی کچھ اس سے بہتر حالت میں نہ تھا ......"

اس ابتدا کے بعد ہر شخص جس قسم کے واقعات سننے کا مشتاق بن جاتا ہے اُن کی حیثیت یقیناً ایک ٹریجڈی کی ہو سکتی ہے ابتدائی Selting سے اگر افسانہ نگار اس قسم کا اثر پیدا کر سکتا ہے تو وہ اپنے فن میں کامیاب ہے۔ افسانہ کی Selting کے متعلق مختصر طور پر جو کچھ کہا گیا اُس سے اُس کی اہمیت کا اندازہ ہو سکتا ہے اس لیے کہ ہم نے دیکھا کہ کوئی افسانہ خواہ وہ دوسری حیثیتوں سے کتنا ہی بلند اور لطیف کیوں نہ ہو اُس وقت تک فن کی نازک بلندیوں تک نہیں پہنچ سکتا جب تک اُس میں Selting کا خاص طور پر خیال نہ رکھا گیا ہو۔ Selting کے حُسن سے افسانہ کے حُسن لطافت۔ اثر اور بلندی میں اضافہ ہوتا ہے پلاٹ کی دلکشیاں جذبات پر اُس وقت قبضہ کر سکتی ہیں جب اُن میں Selting کا سحر شامل ہو۔ کردار افسانہ نگار کے ہاتھ میں کٹ پتلی معلوم ہوتا ہے جب تک Selting کی مدد سے اُسے ماحول اور واقعات کے مطابق نہ بنایا جائے۔ لیکن ان سب محاسن کے باوجود بھی ایک مبتدی افسانہ نگار کے لیے Selting ایک بیحد نازک چیز ہے۔ اور اسکے کام میں لانے سے پہلے فنی احتیاط برتنے کی ضرورت ہے۔ اور خواہ ہم اُسکے ذریعہ سے اپنے واقعات کو پیش کریں۔ چاہے ہم اُس کی مدد سے اپنے کرداروں کو روشناس کرائیں۔ چاہے ہم اُس کی مدد سے پڑھنے والے کے جذبات کو اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کریں۔ خواہ مناظر فطرت اور مقامی رنگ سے اُس میں فنی سحر کاریاں بھریں۔ یا اُس کی مدد سے افسانہ کے Mood اور Spirit اور اپنے پیغام کو دوسروں تک پہونچائیں۔ اُس سے کوئی بلند یا پست اہم یا غیر ضروری کام لیں لیکن ہر صورت میں صرف ایک بات کا یاد رکھنا ضروری ہے اور وہ یہ کہ Selling کو ہمیشہ افسانہ کے مقصد کا تابع رہنا

چاہیے — اس لیے کہ اصل چیز جسے ہم پیش کر رہے ہیں وہ ہمارا مقصد ہے۔ Setting صرف اُسے قابلِ قبول بنانے کے لیے کام میں لائی جاتی ہے۔

خالدہ خانم

(جناب مسٹر مشیر الدین بی اے ایل ایل بی ایڈوکیٹ لکھنؤ)

آج کیا شور ہے اس ملک کے ایوانوں میں
نازنیں کون ہے یہ [illegible] میں

زلفِ محبوبۂ ملت کے پریشانوں میں
وہ جو پہونچی تھی کبھی ناز کے میدانوں میں

جس کی آنکھوں میں ہے آزادیِ قومی کا سرور
ہندوؤں میں ہے نہ [illegible] مسلمانوں میں

برہمن! توڑ کے اب سارے بتانِ ہندی
اس کی تصویر [illegible] صنم خانوں میں

وہ مئے ناب کہ ہو نشۂ دوشیزہ جس میں
ہے کہیں سکتہ [illegible] میخانوں میں

دخترِ ہند! نہ وہ شعلۂ [illegible]
[illegible] سوزش ترے پروانوں میں

مرغِ آزاد ہے وہ نغمہ زنِ دشت و جبل
تیری آواز ہے محدود گلستانوں میں

اس کی فطرت میں ہے آزادیِ تابِ نسیم
تیری گردش ہے مقید [illegible]ستانوں میں

ملکۂ بزم ہے وہ خالدۂ رزم ہے وہ
منتشر تو ہے غلاموں میں وہ سلطانوں میں

کچھ بھی ہے سر میں ترے ذوقِ نمائش کے لئے
اور کچھ [illegible] تماشا ترے دیوانوں میں

پھول کو حق ہے کہ وہ چاک گریباں ہو جائے
تو [illegible] نہیں چاک گریبانوں میں

تلافی مافات

(سلسلہ ماہ گذشتہ)

(از جناب منشی خلیل احمد صاحب تسنیم بی اے ایل ایل بی وکیل)

(۴)

جہانگیر سے یہ سن کر کہ پرویز نہ صرف پندرہ برس سے گھر پر موجود ہے بلکہ اس نے امریکہ میں شادی بھی کرلی تھی شیریں کو کوئی صدمہ ہوا نہ رنج —— تعجب اسے ضرور ہوا لیکن وہ پرویز کی بزدلی اور خود غرضی پر ... جب تک اسے اس کا علم نہ تھا کہ پرویز سے یہ گناہ کرانے میں ... اعتراف کی دیوانگی کی حالت میں ہوا تھا یہ علم اسے نہیں ہوا تھا یہ حرکت اس نے قصداً کی تھی اور سالہا سال کی کشمکش میں اس کی پرویز کے دل سے ... جو نکل چکی تھی تب اس نے دوسرا عقد کیا تھا، صرف یہی نہیں بلکہ وہ اپنے گھر واپس آ گیا تھا جہاں کہ ... شیریں ... اپنی گزشتہ محبت کی ... ادا کی ہوئی، اس وقت تک اسکا احساس ہوا کہ پرویز کی فطرت کو اس نے سمجھا ہی نہیں تھا، کہ پرویز ... کے کہاں سے ... زیادہ ... قابل نفرت تھا۔ ... گزشتہ محبت کے تمام اثرات اس کے دل میں موجود ہوتے تو یہ خبر اس کے لئے بہت تکلیف دہ ہوتی۔ مگر اس اطلاع کے سنتے ہی وہ شعلہ جو اب تک اس کے سینے میں ٹمٹما رہا تھا، بجھ گیا۔ یہی سبب تھا کہ اسے تعجب تو ہوا تکلیف نہیں ہوئی۔ دن بھر وہ انہیں واقعات پر غور کرتی رہی۔ اسے اعتبار نہیں آتا تھا کہ پرویز وہی پرویز ہوگا جو پچیس برس پیشتر اس سے اتنی عظیم ... محبت کا اظہار کرتا تھا۔ شام کو اس کے دل میں دفعتاً پرویز کو دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی —— نصف شب گزر چکی تو اس نے کمرے سے قدم نکالا، باغ کے ... اس کی نظر اس ایک اکیلے گلاب کے پھول پر پڑی جو سالہا سال سے اس کی محبت کا ... تھا۔ رات چاندنی تھی، اور شبنم کے قطرے پھول پر موتی سے چمکتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ انہیں دیکھ کر اسے پرویز کے دیئے ہوئے موتی یاد آئے۔ ایک نامعلوم جذبے کے ماتحت وہ پلٹی اور اس ڈبہ کو بھی ساتھ لے لیا —— پرویز اور ہمایوں لائبریری میں تھے، جس کی کھڑکیاں ٹینس کھیلنے کے لان کی طرف کھلتی تھیں۔ ہر سائے کا ... اٹھاتی ہوئی، چھپتی، رکتی آخر شیریں ایک کھڑکی کے نیچے پہنچ گئی۔ کھڑکی پر چمکا لگا تھا جس کے سائے میں وہ اندر سے نظر نہیں آتی تھی۔ اس نے غور سے پرویز کو دیکھنا شروع کیا، سامنے میز پر ہمایوں کی ماں کا فوٹو رکھا ہوا تھا۔ دونوں

باپ بیٹے اُسی کے متعلق گفتگو کر رہے تھے، شیریں نے خوب نظر جما کر دیکھا، پرویز میں گویا کہ کوئی تغیر نہیں ہوا تھا، عمر میں وہ اور شیریں قریب قریب برابر تھے، پرویز شاید دو ایک برس بڑا ہو گا، کنپٹیوں کے قریب اُسکے بال سفید ہو چلے تھے، ورنہ بائیس برس کے نوجوان پرویز اور سینتالیس سال کے ادھیڑ پرویز میں کوئی فرق نہیں تھا ——— ہمایوں شباب، مردانہ حسن اور شوخی کا مجسمہ تھا، شیریں کا دل بے اختیار اُس کی طرف کھنچنے لگا، اُسنے بغور دیکھا تو اُسے تعجب ہوا کہ ہمایوں کی صورت میں خود اُس کی بہت شباہت تھی، ——— تھوڑی دیر کے بعد ہمایوں سونے کے لیے چلا گیا، جس وقت وہ جا رہا تھا پرویز نے اُسے محبت سے لبریز آنکھوں سے دیکھا، شیریں نے بھی پرویز کی محبت بھری نظر دیکھی اور اُسے تعجب ہوا کہ پرویز سا خود غرض انسان بھی اتنی عظیم محبت کا حامل ہو سکتا ہے، تھوڑی دیر تک پرویز کھڑا ہوا اُس دروازے کو دیکھتا رہا جس سے ہمایوں باہر گیا تھا، اُس کی پشت کھڑکیوں کی طرف تھی، اس وقت ایک نامعلوم جذبے کے تحت شیریں نے موتیوں کا ڈبہ پرویز کے اوپر پھینک دیا، ڈبہ پرویز کی پیٹھ پر لگا اور گر پڑا۔ پرویز یکایک چونک پڑا، مڑا تو اُسے وہ ڈبہ نظر آیا، پرویز نے اُسے اُٹھا کر کھولا، کھولتے ہی وہ پرچہ جس پر اُسکے ہاتھ کا [پہلے قلب سمندر سے، پھر میرے محبت بھرے قلب سے پیاری شیریں کے لیے] لکھا ہوا تھا گرنے لگا، پرویز نے اُسے پڑھا اور پڑھتے ہی چونک پڑا، پھر موتیوں کو غور سے دیکھنے لگا، چند لمحوں کے لیے واقعہ کی عجوبیت اور بیاختگی کے سبب سے اُسکے دماغ نے کام کرنا بند کر دیا، یہ موقعہ شیریں کے لیے کافی تھا، خاموشی گر تیزی سے وہ مکان کے باہر چلی گئی، پرویز کے حواس بجا ہوئے تو فوراً کھڑکی کے پاس آیا، وہاں تلاش کیا، پھر باہر نکل کر ان پر تلاش کیا مگر کچھ پتہ نہ چلا، دل میں اُسے یقین تھا کہ دنیا میں صرف ایک ہی ہستی ایسی تھی جو اس ڈبے کو اُس پر پھینک سکتی تھی، اس کا خیال آتے ہی شیریں کا مجسمہ اُسکے سامنے آ گیا، بمشکل وہ کمرے تک پہنچا، کمرے میں پہنچتے پہنچتے اُس کا سر چکرایا، پاؤں لڑکھڑانے لگے، ہمت کر کے میز کا خانہ کھولا، اُس میں موتیوں کا ڈبہ رکھا، لیکن اب طاقت نے جواب دیدیا اور پرویز بیہوش ہو کر گر پڑا ——— دھماکے کی آواز سن کر ہمایوں نیچے آیا تو باپ کو بیہوش پایا، نوکر سب سو چکے تھے، بمشکل پرویز کو اُٹھا کر کوچ پر لٹایا اور تدابیر ہوش میں لانے کی کیں، تھوڑی دیر میں پرویز کو ہوش آیا، بیٹے کے کندھے کا سہارا لیکر سونے کے کمرے تک گیا، ہمایوں نے نیند لانے کی دوا دی اور پرویز سو گیا ؏

(۵)

دوسرے دن صبح کو ناشتے کے بعد جہانگیر اور ہمایوں چہل قدمی کو نکلے، راہ شیریں کے مکان کے سامنے سے تھی۔ وہ نقاب پہنے ہوئے برآمدے میں ٹہل رہی تھی، ہمایوں نے جہانگیر سے پوچھا

"چچا جان، یہ کون ہے"

جہانگیر نے جو کچھ پرویز کی زبان سے سنا تھا بیان
کر دیا۔ قصے کے اختتام تک ہمایوں کی آنکھیں نم
تھیں، دفعتاً اس کی نظر باغ کی زبوں حالت پر
پڑی، اس نے جہانگیر سے کہا
"چچا جان، اگر ہم اپنے مالی کو بھیج کر اس باغ
کو درست کرا دیں تو کوئی حرج ہے"
جہانگیر نے کچھ دیر غور کیا پھر جواب دیا
"جہاں تک مجھے اس کے واقعات زندگی کے علم
سے اندازہ ہے وہ نہ اسے پسند کرے گی نہ برداشت۔ ہاں
یہ ممکن ہے کہ میں اور تم دونوں خود مل کر باغ کی درستی
کر دیں، آج تعطیل کا دن ہے مجھے فرصت بھی ہے"
ہمایوں تو تیار ہی تھا، مکان قریب ہی تھا،
جا کر مالی کے ساتھ دو پھاوڑے اور کھرپے لے آیا۔
دونوں نے مل کر کام شروع کر دیا، شیریں ان لوگوں کو
آتے دیکھ کر اندر چلی گئی تھی، جھلملیوں میں سے وہ ان
دونوں کو کام کرتے دیکھتی رہی، ہمایوں اور جہانگیر نے
خاردار درخت اور خود رو بیلیں کاٹ کر نکال ڈالیں۔
درختوں کے تھالے بنا دیے، خوشرنگ بیلوں کو ترتیب
دے دی، ایک بجا تو دونوں چچا بھتیجے پھاوڑے وہیں
چھوڑ کر کھانا کھانے چلے گئے، کھانے کے بعد ہمایوں تو
پرویز کی طبیعت کی خرابی کے سبب نہ آ سکا، جہانگیر
پھر واپس آیا، باغ میں گھسا تو دیکھا کہ شیریں اس کے
کام کو دیکھ رہی ہے، باغ نصف کے قریب درست
ہو چکا تھا نصف باقی تھا، شیریں سوچ رہی تھی کہ باغ
کی موجودہ حالت خود اس کی زندگی کی داستان کی کس قدر
ایسی تصویر تھی ــــ ایک جانب نصف حصہ اچھا،
صاف ستھرا، آئینہ دار پھلنے پھولنے والا، درمیان میں
ایک خط منقسم جو اس زمانے سے مشابہ تھا جس میں
اس پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹا، دوسری جانب پھیلی پڑی
کا کوڑا کرکٹ ــــ جہانگیر نے اس کے قریب ہو کر کہا،
"کیا آپ سمجھتی تھیں کہ میں واپس نہیں آؤں گا"
شیریں چونک پڑی، وہ اپنے خیالات میں اس قدر
محو تھی کہ اسے جہانگیر کے آنے کی خبر ہی نہیں ہوئی پلٹ
کر اس نے جہانگیر کو دیکھا، جہانگیر نے کہا
"میرا منشا یہ نہیں کہ کسی کام کو ہاتھ لگاؤں اور
ادھورا چھوڑ دوں، میں اپنے ہمراہ کچھ بیج لیتا آیا ہوں
انہیں آپ کے باغ میں بو دوں گا، تھوڑے دنوں
میں درخت نکل آئیں گے اور باغ کی خزاں کا اختتام
ہو جائے گا"
"خزاں کا کبھی اختتام نہیں ہوتا" شیریں نے
تلخی سے جواب دیا۔
"میرا خیال تو یہ نہیں ہے، خزاں ایک خاص مدت
سے زیادہ رہ ہی نہیں سکتی، ہمارے گرد و پیش اس کا
ثبوت موجود ہے"
"ثبوت کہاں ہے، میں نے تو کبھی دیکھا نہیں"
شیریں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا
"آپ نے نہیں دیکھا تو اس کا سبب یہ ہے کہ
آپ نے دیکھنے کی کوشش نہیں کی، کیا آپ نے کبھی
کوئی ایسا درخت دیکھا ہے جو ہر بہار میں نہ پھلتا پھولتا
ہو بجز ان اشجار کے جو اپنی زندگی کے دن پورے

کر چکے ہیں ——— ایک پھول کھلتا ہے، بہار بھر شگفتہ رہتا ہے پھر مرجھا کر سوکھ جاتا ہے گویا خواب میں سب بسر کیا سال بھر کے بعد پھر اُسی کونپل میں ویسا ہی پھول نہیں نکلتا ——— کلی سے کلی تک، پھول سے پھول تک، پھل سے پھل تک، بہار سے بہار تک، سال بھر سے زیادہ کا وقفہ نہیں ہوتا، حتیٰ کہ خزاں کی ہوا کو بھی برس دن سے زیادہ کا حصہ نہیں لگتا، اس سے زیادہ وقفہ ہو نہیں سکتا، اس لیے کہ خدا خوب سمجھتا اور جانتا ہے کہ ایک سلسلے میں ایک سال کا طویل غم بہت کافی ہے اس سے زیادہ انسان کی برداشت سے باہر ہے"

"میں تو پچیس برس سے اپنے غم کا بار اپنے سینے پر لیے پھر رہی ہوں، اور آج تک خدا نے اُسے ہلکا نہیں کیا"

"آپ اُسے ہلکا کر سکتی ہیں بشرطیکہ آپ اُسے ہلکا کرنے کی کوشش کریں ——— دنیا کا سب حسن، تمام مسرتیں، ساری خوشیاں کسی کی کوشش کرنے سے حاصل ہوتی ہیں، اور کوشش نام ہے کام کرنے کا، کام اپنے لیے اور دوسروں کے لیے، کوئی شخص اُس وقت تک سکون اور مسرت نہیں حاصل کر سکتا جب تک اُسکے حصول کے لیے اُس نے سعی نہ کی ہو بہار کے موسم میں تتلی کتنی خوش خوش پھولوں کا منہ چومتی پھرتی ہے اُس کی ہستی مجسم مسرت اور اُس کا وجود سراپا خوشی ہوتا ہے، لیکن اُس کی تمام مسرت اور اُسکا سارا عیش ثمرہ ہے اُس کی کوششوں اور کاوشوں کا، وہ پیدا ہونے کے وقت سے بھونرے سے نکلنے کی کوشش میں مصروف ہو جاتی ہے حتیٰ کہ بہار آنے تک وہ اُس سے باہر نکل آتی ہے اور سانس تک پھولوں پر بیٹھ کر لطف بہار اُٹھانے کے قابل ہو جاتی ہے"

"لیکن بفرض محال وہ اگر کوشش کے باوجود باہر نہ نکل سکے"

"یہ ممکن ہی نہیں، ہم ہر کام انجام دے سکتے ہیں، ہر منصوبے میں کامیاب ہو سکتے ہیں، البتہ کوشش شرط ہے، پتھر کے اندر ایک بیج پہونچ جاتا ہے اُسکے پر نہیں ہوتے کہ اڑ جائے لیکن باایں ہمہ وہ اسی پتھر میں پھوٹتا اور پھیلتا ہے یہاں تک کہ اُسے توڑ کر باہر نکل آتا ہے اور اسی پتھر سے اپنی غذا حاصل کرتا ہے"

"لیکن انسان اور پرندوں اور جمادات میں بہت فرق ہے، ہم سب ایک ہی جیسے قوانین کے تحت زندگی نہیں بسر کرتے"

"کیوں نہیں، ایک ہی خدا نے سب کو بنایا ہے، ——— ہم سب سکون ابدی اور راحت سرمدی حاصل کر سکتے ہیں، ہم میں سے ہر ایک آشتی کے جام سے سیراب ہو سکتا ہے بشرطیکہ ہم خلق خدا کی خدمت کریں، خدا ہم پر مصیبت ڈالتا ہے تاکہ دوسروں کی مصیبت کا احساس کر سکیں، ہم کو غم سے دوچار کرتا ہے تاکہ دوسروں کے غم کا اندازہ کر سکیں اور اُنکی مصیبت اور غم میں اُنکے شریک ہو کر اُنکی ہمدردی کر سکیں"

شیریں کچھ دیر ساکت و خاموش رہی، پھر اُسنے کہا

"آپ نے زنجیریں دیکھی ہیں، میں بھی پابزنجیر ہوں"

"ہاں" جہانگیر نے کہا "میں نے زنجیریں دیکھی ہیں،"

لیکن میرا عقیدہ ہے کہ زنجیریں ہم خود بناتے ہیں ایام گزشتہ میں جب ایک شخص دوسرے کو قتل کر دیتا تھا تو قاتل کو مقتول کے ساتھ پا بزنجیر کر دیتے تھے اس طرح قاتل ہمیشہ اپنے گناہ کو اپنے ہمراہ لیے پھرتا تھا یعنی جس وقت اس سے قتل کا ارتکاب ہوا اس نے اپنے پیر میں زنجیر ڈال لی"

"لیکن میں نے کوئی جرم نہیں کیا"

"اسی سبب سے تو میرا خیال ہے کہ زنجیر کی کڑی کہیں نہ کہیں ڈھیلی ہے اور آپ تلاش کریں تو اس ڈھیلی کڑی کے ذریعہ سے آزادی حاصل کر سکتی ہیں"

"میں تو بیس برس سے اس کڑی کی تلاش میں ہوں مگر مجھے اس کا پتہ نہیں ملا" شیریں نے کہا

"مجھے آپ کے حال پر تاسف ہے، لیکن باوجود تلاش کے کڑی نہ ملنے کا سبب روشنی کا فقدان ہے آپ ظلمت اور تاریکی میں مقیم ہیں — ابھی تک آپ کو سچی مسرت کا راز نہیں معلوم۔ جب آپ کی قسمت کی شب تاریک ختم ہو کر طالع مسعود کا دن نکلے گا اس وقت آپ اس ڈھیلی کڑی کو پا لیں گی اور عیش دوام کا زینہ آپ کو مل جائے گا"

شیریں مکان کے اندر چلی گئی، جہانگیر کی گفتگو کا اس کی طبیعت پر بہت اثر پڑا، اور دن بھر اسی پر غور کرتی رہی — جہانگیر شام تک کام کرتا رہا، باغ صاف کر دیا، بیج بو دیے اور کام ختم کر کے واپس چلا گیا، شیریں برابر اُسے چلمنوں میں سے دیکھتی رہی، اس کے قلب کو جہانگیر کے دلائل کی صداقت کا احساس تھا مگر وہ یہ جانتی تھی کہ وہ ایسی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے جنہیں یا پرویز توڑ سکتا ہے یا موت ؛

(۶)

صبح کا وقت تھا، جہانگیر کو چند مسلیں دیکھنا تھیں، وہ ناشتہ کرتے ہی رخصت ہو گیا، پرویز اور ہمایوں لائبریری میں بیٹھے رہتے، پرویز اخبار دیکھ رہا تھا اور ہمایوں ایک کتاب لیے ہوئے بیٹھا تھا۔ دفعتاً ہمایوں نے سوال کیا

"پاپا، شیریں سے آپ واقف ہیں؟"

پرویز کرسی پر سے اچھل پڑا، چہرے پر زبردستی سکون پیدا کیا، پھر سنبھل کر بیٹھا اور کہا "کون سی شیریں؟"

"یہ جو کھنڈر والے مکان میں رہتی ہے اور جس کے چہرے پر ہمیشہ نقاب پڑی رہتی ہے"

"بیرسٹر صاحب مرحوم کی لڑکی سے معلوم ہوتا ہے تمہارا مطلب ہے"

"اس کا پورا قصہ تو چچا جان مجھ سے بیان کر چکے ہیں مگر میں اس کے علاوہ بھی اور کچھ واقعات معلوم کرنا چاہتا ہوں"

"جہانگیر نے جو کچھ تم سے بیان کیا اس سے زیادہ مجھے علم نہیں"

ہمایوں خاموش ہو گیا، لیکن پرویز کے دماغ میں ایک طوفان اضطراب برپا ہو گیا، وہ سوچنے لگا کہ ہمایوں نے یہ سوال اس سے کیوں کیا۔ کیا کسی نے اسے اصلی واقعہ سے مطلع کر دیا یا شیریں نے اس سے تمام حالات بیان کیے — شیریں کا خیال

آتے ہی اُس کا تصور بندھ گیا، گزشتہ چند دنوں میں اُسے اس کا خوب اندازہ ہوگیا تھا کہ شیریں اب بھی اُسکے دل و دماغ پر قبضہ کیے ہوے ہے، پچیس برس تک وہ برابر خود کو یقین دلاتا رہا کہ وہ اب اُسے یاد نہیں، ابراہیم شیریں نہیں تو شیریں سے نامنصفانہ برتاؤ کی یاد ہمیشہ اُسے ستاتی رہی، بظاہر وہ یہ کہکر اپنا دل خوش کرلیتا تھا کہ نہیں اب وہ اُسے بھلا دینے میں کامیاب ہوگیا ہے اور اپنی اس کامیابی پر نازاں ہوتا تھا لیکن دل میں وہ خوب جانتا تھا کہ میری یہ کامیابی محض عارضی ہے اور موہوم ——— انسان ہمیشہ اسی قسم کی دل خوش کُن کامیابیوں پر مغرور ہوتا ہے اور اُس وقت تک اپنی اس خام خیالی میں مست و سرشار رہتا ہے جب تک مصیبت بالکل سر پر نہ آجائے، جب مصیبت آنکھوں کے سامنے ہوتی ہے اُس وقت اس عارضی اور موہوم کامیابی کا پردہ بالکل رفتہ رفتہ آنکھوں سے اُٹھتا ہے لیکن اس کا بھی یہ اثر نہیں ہوتا کہ وہ اس مصیبت سے نجات پا جائے، وہ مصیبت تو آتی ہے اور آکر رہتی ہے لیکن انسان محض تھوڑی دیر کے واسطے ہر چیز کو اصلی رنگ و ہیئت میں دیکھتا ہے، اگر یہ حالت باقی رہے تو اُس سے پھر اسی قسم کی غلطی کا امکان نہیں مگر یہ تاثر بھی ہر چیز کی طرح عارضی اور موہوم ہوتا ہے جب کچھ روز گزر جاتے ہیں تو پھر انسان کے لیے وہی احیاءِ آرزو اور وہی اُس کی بے پروائی کارگاہ ہیں ——— ——— آدمی دریا اور کو روکنے یا اُسکے بہاؤ کے رُخ کو بدلنے کی غرض سے اُنپر بند تعمیر کرتا ہے اور اس طرح دریا کو مجبور کر دیتا ہے کہ اُس کی مرضی کے مطابق چلے، بظاہر دریا اُس کے احکام کی تعمیل کرتا ہے اور اتنی سہولت اور خاموشی سے کہ اُس سے انسان کو مشکوک ہو جانا چاہیے، لیکن انسان زعم کمال میں اس درجہ مستغرق ہوتا ہے کہ اُسے یہ آسان اور سہل اقراری شبہہ میں نہیں ڈالتے - دن رات دریا کا پانی انسان کے بنائے ہوے بند پر بوجھ ڈالتا رہتا ہے، کہیں کہیں چھوٹے گڑھے تیز رو دھارے سے بچ کر نیچے پوشیدہ گوشے بند کی بنیاد کو کھوکھلا کرتے رہتے ہیں، حتیٰ کہ ایک چھوٹا سا بالکل معمولی سوراخ ہو جاتا ہے، دریا کے مخزن سے دو تیز رو دھارے آکر ان چھوٹے تباہ کرنے والے دھاروں کی معاونت کرتے ہیں، فطرت بھی مسکراتی رہتی ہے، کیونکہ اُسے تو انسان کا زعم باطل کرنے میں لطف آتا ہے، ——— نقشِ بند ٹوٹ جاتا ہے اور دریا ہر اُس شے کو جو اُس کے راستے میں ہو بہا لے جاتا ہے اور بیشتر سے زیادہ تیز رفتار سے بہتا ہوا پھر اپنی پرانی آزادی حاصل کرلیتا ہے - بعینہ یہی حال انسان کا ہے، کوئی سا ہو، کسی قسم کا جذبہ ہو، اگر وہ سچا اور حقیقی ہے تو خواہ کتنا ہی دبایا جائے اور خواہ کتنے ہی صبر و ضبط کے کبھی نہ کبھی تو ان دبیز پردوں کو توڑ کر سطح پر آجاتا ہے، ایک عرصے تک رُکے رہنے کے سبب سے اُس کی قوتِ مقابلہ اور بڑھ جاتی ہے، اور سطح پر اُس کا جوش اور اضطراب زیادہ شورش انگیز اور دیرپا ہوتا ہے، یہی حال ابراہیم کا تھا، ایک عرصے تک اُسنے بظاہر شیریں

کے خیال کو دبا دے گا لیکن اب اسے احساس ہوا تھا کہ خواہ وہ کوشش کرے یا نہ کرے یہ جذبہ زیادہ دنوں تک پوشیدہ رہنے والا نہیں، مگر فرق اتنا تھا کہ پہلے اسے انکشافات کی پرواہ نہ تھی اب اسے یہ فکر تھی کہ یہ راز طشت از بام ہوا تو ہمایوں کو بھی اپنے باپ کی بزدلی اور کمظرفی کی اطلاع ہو جائیگی اور وہ بیٹا جو اپنے باپ کو ہمیشہ شریف ترین اور سب سے زیادہ باعزت اور ایماندار سمجھتا رہا ہے اپنے باپ کے اصلی صفات سے باخبر ہو جائیگا۔ اس امر کا خیال آتے ہی اُسکے جسم میں تھرتھری پیدا ہوگئی دفعتاً اُسکے کانوں میں جہانگیر کے یہ الفاظ گونجنے لگے "اُسکا اقرار آج تک باقی ہے جو اُسے اس پر مجبور کرتا ہے کہ اُس اقرار کو یا تو پورا کرے یا اُس سے نجات حاصل کرے" ـــــ ان لفظوں سے اُس کے دل و دماغ میں آگ سی لگ گئی اُسے ایسا معلوم ہوا کہ جہانگیر کھڑا ہوا اُسکے سامنے کہہ رہا ہے اور وہ سُن رہا ہے "کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ ایک انسان اتنے عظیم گناہ کا بوجھ اپنے سر پر لیے ہوئے خدا کے سامنے حاضر ہوگا" ـــــ قلبی اور ذہنی تلاطم سے گھبرا کر وہ اُٹھ کھڑا ہوا، چہرے کا رنگ متغیر تھا، اُٹھتے ہی شیریں ـ ـ بیس سالہ حسین اور خوبصورت شیریں ـ ـ کا چہرہ آنکھوں کے آگے آگیا، شدت کرب میں اُس نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا لیکن اُس چہرے کے نقوش آنکھوں کے سامنے سے زائل نہ ہوئے کمرہ کی دیواریں اسے گھومتی ہوئی معلوم ہوئیں کرسیاں اور میزیں رقص کرتی ہوئی دکھائی دیں اور پرویز بیہوش ہو کر گر پڑا ـــــ باپ کو اُٹھتے دیکھ کر ہمایوں بھی کھڑا ہوگیا تھا پرویز کے چہرے کو دیکھا تو اور بھی پریشان ہوا آگے بڑھا کہ باپ کو سہارا دے لیکن اتنی دیر میں پرویز گر پڑا، ہمایوں نے گھبرا کر نوکروں کو آواز دی، باپ کو اُٹھا کر کوچ پر لٹا دیا، ہوش میں لانے کی تدابیر کیں، تھوڑی دیر میں پرویز کو ہوش آیا، ہمایوں نے پوچھا

"پاپا، طبیعت کیسی ہے"

"اچھا ہوں" پرویز نے جواب دیا، لیکن جواب دیتے ہی اُسے پھر جہانگیر کے الفاظ یاد آگئے "اُس کا اقرار آج تک باقی ہے جو اُسے اس پر مجبور کرتا ہے کہ یا تو اُس اقرار کو پورا کرے یا اُس سے نجات حاصل کرے" ـــ یکایک اُس کی روح کو مقید رکھنے والی زنجیریں ٹوٹ گئیں، احساسات کا طوفان ضبط کے بندوں کو توڑ کر ہر قسم کی رکاوٹوں کو بہا لیگیا، خود غرضی اور بزدلی کے الزامات جن سے اتنے دنوں تک وہ منکر رہا تھا اُسکے دماغ پر بالکل ثبت ہوگئے، ـــ اُسے اپنے جُرم کا مکمل احساس ہوا، آنکھوں میں آنسو بھر آئے، ٹٹولتا ہوا اُٹھا اور کمرے کے باہر چلا گیا، جسم کمزور تھا، اور روح احساس جرم سے زخمی، لیکن آخر کار انسانیت، صداقت اور حق نے فتح پالی تھی ۔

(۷)

پرویز گھر سے نکلا تو سیدھا شیریں کے پاس پہونچا،

دروازہ کھلا ہوا تھا اور شیریں اندر تھی، اُسکے رنج وغم میں اب سکون کی جھلک تھی، کیونکہ اُسے اطمینان تھا کہ جو کچھ ہونے والا تھا ہو چکا، اب محض اُس کی یاد اور یاد کی برداشت باقی ہے ——— پرویز لڑکھڑاتا ہوا داخل ہوا تو شیریں کرسی سے اُٹھ کر کھڑی ہو گئی ——

"شیریں" پرویز نے کہا "شیریں، میں یہ اقرار کرنے آیا ہوں کہ میں نہایت بزدل اور خود غرض ہوں"

شیریں ہنسی، ایک تلخ اور زہر خند قہقہہ، جس سے پرویز پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو گئی

"میں یہ پہلے ہی سے جانتی تھی، آپ کو صرف یہ کہنے کی خاطر مجھ تک آنے کی زحمت نہ گوارا کرنی چاہیے تھی"

"شیریں" پرویز نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "شیریں، ۲۵ برس گزرے جب میں نے تم سے شادی کی درخواست کی تھی، تم نے منظور کر لی تھی، آج تک میں اپنے اقرار کی زنجیروں میں مقید ہوں، کبھی میں نے اُن سے آزاد ہونے کی خواہش کا اظہار نہیں کیا بلکہ ایک کُتے کی طرح مُنہ چھپا کر تم کو چھوڑ کر چلا گیا ——— میں آج اس لیے آیا ہوں کہ تم سے کہوں کہ میں اپنا اقرار پورا کرنے پر تیار ہوں"

"پچیس برس گزرے" شیریں نے کہا "جب تم نے مجھ سے شادی کی درخواست کی تھی، تم آج تک اُس اقرار کی زنجیروں سے وابستہ ہو، جاؤ آج میں تمھیں آزاد کرتی ہوں"

"نہیں نہیں" پرویز نے کرب سے کہا "نہیں میں آج اُسے پورا کرنے آیا ہوں اُس سے آزاد ہونے نہیں"

"کیوں" شیریں کا ایک لفظ پرویز کے دل میں تیر کی طرح اُتر گیا

"تاکہ اپنے گزشتہ برتاؤ کی تلافی کر دوں"

"کیا اسی کو تم تلافی کہتے ہو، پچیس برس گزرے جب میں نے تمھیں موت نہیں، موت سے بدتر شے سے بچایا، مجھے تم سے محبت تھی، اُسی محبت کی خاطر میں نے اپنی خوبصورتی، اپنی جان تمھارے لیے خطرے میں ڈالی اور تم نے مجھے اس کا بدلہ کیا دیا کہ میرے صحت پانے تک بھی نہ ٹھہرے، میرا شکریہ ادا کرنے کا بھی تم کو خیال نہیں آیا، تم مجھے اُس وقت چھوڑ کر چلے گئے جب ہمدردی اور اعانت کی مجھکو سخت ضرورت تھی، اور اس صدمے نے میری ماں کا دل توڑ دیا، جس سے وہ مر گئی، میرے بال سفید کر دیے جس سے میں مُردوں سے بدتر ہو گئی، تم یہ سمجھ کر کہ میں جلنے سے بدصورت ہو گئی ہوں مجھسے چھپ کر روپوش ہو گئے"

"میں نے سمجھا نہیں خود جا کر دیکھا"

"لیکن اُس صورت میں بھی تمھارا طرزِ عمل قابلِ نفرت تھا، تم نے اتنی وحشیانہ اور تہذیب سوز حرکت کی کہ اُس کا انتقام بجز خدا کے کوئی اور تم سے نہیں لے سکتا ——— یہی نہیں بلکہ تمھارا جُرم اُس سے زیادہ سنگین ہے جتنا تم سمجھتے ہو ——— لو دیکھو اُس عورت کی صورت کو جو تم کو موت سے بچانے کے لیے بھی اب تم سے شادی نہ کریگی" یہ کہکر شیریں نے نقاب اُلٹ دی۔

پرویز کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا آگیا، اٹکھڑا کر وہ پیچھے ہٹا، پھر حیرانی اور تعجب سے قدم پکڑلیے، کچھ دیر ساکت کھڑا رہا، پھر آہستہ آہستہ آگے بڑھا، شیریں کا ہاتھ اٹھا کر اس کی انگلیوں کو اپنے لبوں سے لگایا ——— شیریں پھر ہنسی، یہی تلخ اور زہرخند ہلکا سا قہقہہ اور کہا "ہاں اس ہاتھ کو بوسہ دو کیونکہ یہ ان حصوں میں نہیں ہے جو جل گئے تھے"

(باقی آئندہ)

فغانِ آرزو

(جناب منشی انور حسین صاحب آرزو لکھنوی)

فرقت بھی وصل ہے جو نہ دل بدگماں رہے ۔ جس حال میں بھی ہم تو رہے شادماں رہے
گہ آرزو بنے کبھی دردِ نہاں رہے ۔ القصہ دل میں گھس کے رہے تم جہاں رہے
بن کشتۂ ہوائے محبت مثالِ شمع ۔ ہر بات راز ہے تو نہ منہ میں زباں رہے
خلوت کدہ میں دل کے ہو جلوت تو خوب ہے ۔ نہ پردۂ نگاہ بھی کیوں درمیاں رہے
انجامِ التفات سے امید توڑ دی ۔ ہاں کچھ دنوں تو ہم بھی بہت شادماں رہے
ان بن ہے باغباں سے اور باغ سے لگاؤ ۔ گل سے قریں نگاہ سے دور آشیاں رہے
منزل کے جذبِ تام سے جھوٹی لگا کے آس ۔ ہم ناتوان گردِ پسِ کارواں رہے
حسرت بھری نگاہ ہی بجلی کوئی گرائے ۔ جب ہم نہ رہنے پائے تو کیوں آشیاں رہے
میں دربدر رہوں اور وہ خوش اس خیال پر ۔ ہے نام کا ہمارے ہی چاہے جہاں رہے
غم چشمۂ حیات کی باقی ہوئی ہے سوت ۔ جب تک بھی آنکھ آنکھ ہے آنسو رواں رہے
الفت میں نالش ہی بنا ہے ملال کی ۔ کیونکر دوئی مٹے جو خودی درمیاں رہے
وسعت کو دل کی تنگ نہ کر اے ہجومِ یاس ۔ آخر غریب دردِ محبت کہاں رہے

پھر آرزو کو در سے اٹھا چلے یہ بتا
آخر غریب جانے کہاں اور کہاں رہے

"بہار"[۱]

(مولوی محمد اظہار الحسن صاحب بی اے ایل ایل بی وکیل)

اگلے وقتوں میں بیاض رکھنے کا دستور تھا۔ قریب قریب ہر اہلِ ذوق کے پاس ایک بیاض ضرور ہوتی تھی جس میں اُس کی پسند کے مطابق اشعار درج ہوتے تھے۔ ہر طرف شعر و سخن کے چرچے تھے۔ شایستہ صحبتوں میں ضرب الامثال کے طور پر آرایشِ سخن یا زیبِ داستان کے لیے شعر پڑھے جاتے تھے۔ مذاقِ سخن لازمۂ تہذیب و شایستگی قرار پا گیا تھا اس لیے بیاض بھی ضروری سی ہو گئی تھی۔ عام طور پر تو یہ ایک پرائیوٹ چیز سمجھی جاتی تھی ہاں کبھی کبھی بعض مشہور اور مستند سخن سنج بزرگوں کی بیاضوں کے بعض صفحات شایع بھی ہو جاتے تھے۔ اس قسم کی بیاضوں کی کوئی خاص ترتیب نہ ہوتی تھی بلکہ مختلف شعرا کے متفرق دلپسند اشعار یکجا جمع کر دیے جایا کرتے تھے۔ ان میں فارسی کے شعر بھی ہوتے تھے اور اُردو کے بھی قدیم اساتذہ کے نتائجِ افکار بھی ہوتے تھے اور بعض عصرِ خود شامل کی تراوشِ قلم کے نمونے بھی۔ امتدادِ زمانہ کے ساتھ بیاض رکھنے کا رواج بھی عمومیت سے محروم ہو گیا۔ یہ دورِ نثر کا ہے۔ شعر و سخن کا عام چرچا کم ہوا تو یہ شوق بھی گھٹ گیا۔ یہاں تک کہ عصرِ جدید کے اکثر سخنوروں کے نزدیک تو بیاض کا مفہوم ذاتی دیوان کے قلمی نسخہ تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔

'بہار' کو بھی الیاس صاحب کی بیاض سمجھنا چاہیے جس کو سائنٹفک انداز پر ترتیب دینے کی کوشش کی گئی ہے اگرچہ لایق مرتب کو اس میں پوری کامیابی نہیں ہوئی اور وہ "عرضِ حال" میں یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہوے کہ "ترتیب مجھے خود بھی پسند نہیں۔ اکثر سرخیاں قائم نہ ہو سکیں اکثر تشنہ رہ گئیں"۔ بہرحال ترتیب کا بنیادی اصول مرتب صاحب کے الفاظ میں یہ ہے کہ "عاشق کس طرح تمام مراحلِ زندگی و محبت طے کرتا ہوا پیوندِ خاک ہو جاتا ہے کیا کیا مصائب اس پر پڑتے ہیں اور وہ ان کو کیسے جھیلتا ہے اُس کی تربت پر کیسی بیکسی برستی ہے میدانِ حشر میں وہ کس طرح داورِ محشر کو (؟) خطاب کرتا ہے اور اس کا خطاب ایک دوسری ہستی کو کس طرح قدرے بےچین اور پریشان کر دیتا ہے"۔ ظاہر ہے کہ انتخاب کا یہ اصول شاعری کی صرف ایک خاص قسم یعنی عاشقانہ شاعری اور اس کے بھی ایک محدود حصہ کے لیے مناسب ہو سکتا ہے اور اس اصول کے ماتحت جو کتاب مرتب کی جائے اُس کا نام "بہار" کبھی موزوں نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اس مجموعہ میں لایق مولف

---

[۱] آراستہ مسٹر الیاس احمد صاحب ایل ایل بی جے پی ایس منصف سہارنپور (میرٹھ؟)۔ تقطیع چھوٹی، حجم ۲۳۶ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت نفیس، معارف پریس اعظم گڑھ سے ۱۲ میں مع محصول ڈاک کے مل سکتی ہے۔

اس ترتیب کو نبھا نہیں سکے۔ حمد و نعت کے بعد حسن و عشق کے بیان سے کتاب کی ابتدا ہوتی ہے، درمیان میں ہیکل اور غلغال کے متعلق اشعار ہیں اور بہشت و دوزخ کے ذکر پر اس کا اختتام۔

زندہ زبانوں میں ادبیات اور خصوصاً نظموں کے اکثر قابل قدر انتخابات شایع ہوتے رہتے ہیں کشمکش زندگی سے ہر شخص کو اتنی فرصت کہاں کہ بطور خود مختلف شعرا کے کلام کا مطالعہ کرے اور ڈھیر دیوانوں سے قطع نظر کرکے چوٹی کے اشعار کے مطالعہ سے کیف اندوز ہوسکے۔ اردو غریب اس بارے میں تہی دست ہے۔ کچھ عرصہ سے بعض مشہور اساتذہ کے دواوین کے انتخابات تو شایع ہونے لگے ہیں لیکن مختلف [illegible] مختلف شعرا کے بہترین کلام کے کیجائی انتخابات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ غالباً سب سے پہلے [illegible] لائق مرتب کے ایک ہمنام پروفیسر الیاس برنی صاحب کو حاصل ہوا کہ انھوں نے [illegible] کے سلسلے شایع کیے چونکہ ضرورت کی چیز تھی شایقین سخن نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ان کے قبول عام کو دیکھ کر [illegible] لیا جاتا ہے [illegible] ذوق سلیم کے ساتھ انتخابات مرتب کیے جائیں تو قدر دانوں کی کمی نہیں۔

مغربی تعلیم کی اشاعت کے بعد سے یورپ پرستی کی ایک لہر سی چل پڑی [illegible] روایات کو خس و خاشاک کی طرح بہا لے گئی۔ اور یہ ظاہر ہوا کہ جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کو [illegible] ہر چیز پرانی نظر آنے لگی [illegible] اردو زبان سے اکتا گئے۔ [illegible] ہوگئی تھی۔ اردو کی بہترین کتابوں کا مطالعہ بھی اُنکے نزدیک تضیع اوقات کا مترادف تھا۔ اور انگریزی کی معمولی سی معمولی تصنیف کو بھی وہ حسرت و فخر کی نگاہوں سے پڑھتے تھے۔ [illegible] شکر ہے کہ یہ حالت زیادہ دیر [illegible] اور اب اردو کے اکثر [illegible] نگاہوں کے فاتح [illegible] ہیں۔ الیاس احمد صاحب لایق ستایش ہیں کہ [illegible] اردو شاعری کے مطالعہ کا وقت نکال کر اپنے ذوق [illegible] ہے بلکہ انھوں نے دوسروں کو بھی اس دعوت کیف میں شریک کرلیا۔

الیاس صاحب کی "بہار" اس عام خیال کے خلاف ایک مستقل احتجاج ہے کہ عاشقانہ شاعری یا غزل کا دور ختم ہوچکا۔ فرماتے ہیں "میں [illegible] شعر [illegible] سے دلچسپی رہی۔ بالخصوص اس صنف شعر سے جس کو غزل کہتے ہیں دلچسپی کیوں نہ ہوتی"۔ اس احتجاج کو اور موثر بنانے کے لیے آپ نے اپنی تالیف کو معنون کیا ہے "شمیم عشق و محبت کے نام سے" کیونکہ آپ کا عقیدہ ہے کہ ہر کار خیر اپنے وجود کے لیے اس شمیم روح پرور کا مرہون منت ہے"۔

کتاب کے شروع میں صاحب "شعر الہند" مولوی عبدالسلام صاحب ندوی کا ایک ڈیڑھ صفحہ کا تعارف ہے۔ پھر انتساب کے بعد "عرض حال" کے عنوان سے فاضل مرتب نے "سبب تالیف" بیان کیا ہے۔

اسکے بعد مختلف عنوانات کے نیچے اُردو اور فارسی کے اشعار جمع کر دیے گئے ہیں۔ کہیں کہیں صرف مصرعوں پر اکتفا کیا گیا ہے۔ بعض عنوانات کے متعلق نثر میں مختصر تبصرہ بھی ہے۔ اکثر اشعار کے ساتھ شاعر کا تخلص بھی لکھ دیا گیا ہے لیکن نصف سے زائد اشعار ایسے ہیں جن پر شاعر کا تخلص درج نہیں۔ بعض اشعار مختلف عنوانات کے ماتحت مکرر درج ہو گئے ہیں اور یہ اس وجہ سے مناسب نہیں کہ صاحب کتاب کو ہر عنوان کے متعلق بہترین اشعار کے مکمل انتخاب کا دعوٰی نہیں ہو سکتا۔ اور تکرار کی دوسری وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔

افسوس ہے کہ بعض غیر ضروری اسقام انتخاب میں راہ پا گئے۔ اُمید کہ دوسرے ایڈیشن میں اس طرف توجہ کی جائے گی۔ بعض اشعار غلط طور پر منسوب ہو گئے ہیں۔ مثلاً

اک ہوک سی دل میں اُٹھتی ہے اک درد جگر میں ہوتا ہے
ہم راتوں کو اُٹھ اُٹھ روتے ہیں جب سارا عالم سوتا ہے

ضیا کا شعر ہے اور میر سے منسوب کر دیا گیا ہے۔ مصرعہ اولٰی میں اک درد جگر میں ہوتا ہے کی جگہ اک درد سا پیدا ہوتا ہے لکھا ہے جس سے شعر کے لطف میں کمی واقع ہوتی ہے۔

ہے اعتماد مرے بخت خفتہ پر کیا کیا
وگرنہ خواب کہاں چشم پاسباں کے لیے

غالب سے لیکر مومن کو بخش دیا گیا ہے

یا غنیاں کلیاں ہو گئیں ہلکے رنگ کی
بھیجی ہیں ایک کسن کے لیے

امیر کا شعر تھا داغ کو عنایت ہو گیا۔ حضرت شمس تبریزؒ کا مشہور مطلع ہے

یا رسول اللہ حبیبِ خالقِ یکتا توئی
برگزیدہ ذوالجلال پاک و بے ہمتا توئی

"بہار" میں اس کو مولانا روم سے منسوب کیا گیا ہے۔

اسی طرح بعض اشعار میں خفیف سی ترمیمات بھی ہیں۔ ایک اچھے شعر کا ہر لفظ نگینہ کی خاصیت رکھتا ہے اور معمولی سے تغیر الفاظ سے بعض اوقات لطفِ شعر خاک میں مل جاتا ہے۔ اصلاح کی بات دوسری ہے ورنہ الفاظ میں کمی بیشی یا تغیر و تبدل مناسب نہیں۔

گُل تو کھل کھل کر بہار اپنی صبا دکھلا گئے
حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

مصرعہ اولٰی یوں ہونا چاہیے ع پھول تو دو دن بہارِ جاں فزا دکھلا گئے۔

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے

ساغرِ جم کی بجائے جامِ جم ہونا چاہیے اور مرا سے قبل "یہ"۔

اے خوشا وقت کہ آئی و بصد ناز آئی
بے حجابانہ سوئے بتکدۂ ما باز آئی

بتکدہ کی جگہ محفل ہے۔ بتکدۂ ما میں تو اضافت بھی نہیں۔

دینا وہ اُن کا ساغرِ مے یاد ہے نظامؔ — منہ کو اُدھر چھپا کے اِدھر کو بڑھا کے ہاتھ

مصرعۂ ثانی میں "منہ پھیر کر اُدھر کو" ہونا چاہیے۔ ایک لفظ کے تغیر سے لطفِ شعر میں کتنا فرق ہو گیا۔

تا منفعل ز رنجشِ بیجا نہ سازمت — می آرم اعتراف گناہ نبودہ را

"سازمت" کی جگہ "بینمت" ہونا چاہیے۔ ان دونوں لفظوں میں جو نازک فرق ہے وہ اربابِ ذوق سے پوشیدہ نہیں۔ سازمت میں معشوق پر عاشق کا تفوق ظاہر ہوتا ہے اور بینمت میں شوق بھی ہے دلداری بھی۔

خندۂ اہلِ جہاں کی مجھے پروا نہ تھی — تم بھی ہنستے ہو مرے حال پہ رونا ہے یہی

"پروا نہ تھی" یقیناً غلط ہے۔ "پروا کیا تھی" ہونا چاہیے۔

انتخاب شخصی ذوق کی چیز ہے اور ہر شخص کا مذاقِ سخن علیحدہ ہوتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ایک شعر جو مجھے پسند ہے آپ کو بھی اچھا معلوم ہو۔ یہ قطعی ممکن ہے کہ جس شعر کو سن کر ایک شخص کی زبان سے بیساختہ آہ یا واہ نکل جائے اُسی شعر کو سن کر دوسرے کی تیوریوں پر بل پڑ جائیں۔ اس لیے اصولاً تو کسی مجموعۂ انتخاب میں بعض اشعار کے شریک کرنے یا نہ کرنے پر اعتراض صحیح نہیں ہو سکتا لیکن پھر بھی یہ احتیاط لازم ہے کہ ایسے اشعار شامل نہ کیے جائیں جن میں کوئی لفظی یا معنوی نقص ہو یا جو مذاقِ سلیم سے گرے ہوئے ہوں۔

مومنؔ کے شعر

تو کہاں جائے گی کچھ اپنا ٹھکانا کر لے — ہم تو کل خوابِ عدم میں شبِ ہجراں ہوں گے

کے ساتھ مقطع کے اس شعر کو منتخب کرنا

یار کے وعدۂ فردا کی قسم سچ کہنا — کل کہاں ٹھاٹ ترے اے شبِ ہجراں ہوں گے

ستم ظریفی نہیں تو اور کیا ہے؟

حسبِ ذیل اشعار اگر انیسویں صدی کے کسی انتخاب میں پائے جائیں تو مضائقہ نہیں لیکن سنہ ۱۹۳۴ء میں جو انتخاب شائع ہو اُس میں ایسے شعروں کا ملنا حیرت انگیز ہے۔

اچھوتی ابھی ہے مئے احمری — کنواری ہے مینا کی نیلم پری

چلے ہیں غیر کیا کیا جب مری محفل سے وہ نکلے — پریشاں بال منہ کر جوڑا ڈھے دوپٹہ اوڑھ کر اُلٹا

پہلے میں خاک ہوا خاک سے پیدا نہ ہوا — جب میسر مجھے اک بوسۂ جاناں نہ ہوا

لپٹ جاتے ہیں وہ بجلی کے ڈر سے — الٰہی یہ گھٹا دو دن تو برسے

بعض شعروں میں غلطیاں بھی ہیں

نقشِ قدم یہ ہیں اُسی جانِ بہار کے — کچھ پنکھڑیاں پڑی ہیں لحد پہ گلاب کی

"کچھ" کے ساتھ اسم جمع ہونا چاہیے۔ "ہیں" کا بھی یہی تقاضا ہے

تری صورت سراسر پیکرِ مہتاب ہے سلمیٰ — ترا جسم ایک تودہ ریشم و کمخواب ہے سلمیٰ

ریشم و کمخواب کا ہجوم ممکن ہے اردو کے جدید رجحانات ہو۔ اردو کے مزاج اس کی متحمل نہیں ہو سکتی۔

صبح طالع ہوئی سو کے اُٹھے سونے والے — آفریں او مرے بیدار نہ ہونے والے

اب تک صبح طلوع ہوئی نہ کہتے تھے

بعض اشعار کے عنوانات بھی محلِ نظر ہیں

جان دی دی ہوئی اُسی کی تھی — حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا (انقلابِ بغداد)

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں — خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں (لحد)

لیکن ناانصافی ہو گی اگر یہ نہ کہا جائے کہ عمدہ اشعار بھی کافی تعداد میں منتخب کیے گئے ہیں۔ فارسی اشعار عام طور پر خوب ہیں اور بعض اشعار کے عنوان غور کرنے کے لیے کافی ہیں۔ بہرحال بہار ایک عمدہ رفیقِ سفر ثابت ہو سکتی ہے۔

مرقوماتِ رقم

کیا ہے شمع رُخوں کا عدو اپنے دیوانہ — نہاں ہے میرے عناصر میں خاکِ پروانہ
تمہی سے دل کی ہے رونق خیالِ جانانہ — ترے بغیر یہ دنیا ہے ایک ویرانہ
میں رندِ مست ہوں دنیا و دیں سے بیگانہ — کلام و نغمہ میسر نہ تاجِ شاہانہ
خبر نہیں مجھے اے چشمِ مستِ جانانہ — شراب ہوتی ہے کیسی کدھر ہے میخانہ
ہے محو بزمِ جہاں تیری ہی پرستش میں — تمام شمع کرے یا طواف پروانہ
یہ دل کی دیکھیے جرأت اے حسن قتل کی ہمت — نہ آسکے جو تصور میں بے حجابانہ
کہانیاں تھیں مرے سارے واقعاتِ شباب — مری حیات ہے بھولا ہوا اک افسانہ

ستم پرست رقم جا رہا ہے کعبے کو
چھپائے سینے میں چھوٹا سا ایک بتخانہ

صلائے عام

(جناب منشی سراج احمد صاحب آفاقی بی۔ اے)

R. L. Stevenson نے "An apology for idlers" لکھ کر کاہلوں کے لیے جو سرمایہ تفریح مہیا کیا ہے وہ آج تک [illegible] Stevenson کے اس مضمون کو دیکھ کر یہ خیال ہوتا ہے کہ [illegible] ہاتھ سے کام کرنے والوں کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا جائے۔ چنانچہ تحریر ذیل اسی خیال سے لکھی گئی ہے۔ اگرچہ Stevenson کے ایسا پایہ مضمون کے سامنے ان ٹوٹی پھوٹی چند سطور کی کوئی حقیقت نہیں اور اس قسم کی کوشش کرنا کہ اسے سٹیونسن کے مضمون سے کوئی نسبت دی جائے [illegible] تاہم امید ہے کہ ناظرین کی ضیافت طبع کے لیے کچھ نہ کچھ سامان مہیا ہو جائے گا۔

میں یہ پوچھتا ہوں کہ آخر وہ اپنے باقاعدہ کیا خدمت [illegible] دنیا بھر کے جتنے کام ہیں سب انہی سے لیے جاتے ہیں اور بایاں ہاتھ بجز معدودے چند کام کرنے کے ہمہ وقت بیکار رہتا ہے۔ داہنے ہاتھ کو شکایت ہے کہ کام کرتے کرتے اس کے پنجے ڈھیلے ہوئے جاتے ہیں اور بائیں ہاتھ کو شکوہ ہے کہ اسے کوئی پوچھتا ہی نہیں۔

آخر اس تفریق کی وجہ؟ ایک کے ساتھ اس درجہ عنایت اور دوسرے کے ساتھ اتنی مغائرت برتنے کا سبب؟ اس پر طرہ یہ کہ اگر کوئی بچارا شخص اس غیر منصفانہ طریقہ کار سے انحراف کرتا ہے اور اپنے ہاتھوں کے ساتھ مساوات برتنا چاہتا ہے تو بجائے اس کے کہ اس کی تعریف کی جائے وہ نکو بن جاتا ہے۔ دنیا اسکا مذاق اڑاتی ہے۔ سوسائٹی اسکو ملعون کرتی ہے۔ [illegible] کھبڑا اور نہ جانے کن کن خطابوں سے وہ مخاطب کیا جاتا ہے۔ کیوں؟ حیرت اس بات پر ہے کہ آدم کے وقت سے ہاتھوں کے لیے جو تقسیم کار مقرر ہے اس میں تبدیلی [illegible] سبحان اللہ کتنا بڑا [illegible] دنیا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ جس عضو بدن سے بہت زیادہ کام لیا جاتا ہے وہ کمزور ہو جاتا ہے اور جو عضو معطل رہتا ہے وہ بھی بیکار محض ہو جاتا ہے مگر وہ جو شخص کہہ گئی ہے کہ مرنے کی ایک [illegible] سب کچھ جانتے ہوئے بھی اسلاف کے بنائے ہوئے طریقے سے ہٹنا کوئی نہیں چاہتا۔ میری تو سمجھ میں اب تک نہیں آیا کہ اس [illegible] تقسیم کار میں کیا مصلحت پوشیدہ ہے — خدا جانے ازل میں ان دونوں ہاتھوں سے کیا گستاخی سرزد ہوئی تھی کہ دونوں شیطان کی طرح

مردود ہوئے اور دائمی سزا کے مستوجب قرار پائے۔

ایک کو یہ سزا دی گئی کہ جا دنیا میں جتنا کام ہے سب تجھی کو کرنا پڑے گا۔ کھانا تو کھلائے گا۔ پانی تو پلائے گا۔ داڑھی تو مونڈے گا۔ کپڑا تجھے سینا پڑے گا۔ قلم دوات میں تجھے گھسنا پڑیں گے۔ ہاں۔ ٹینس۔ کیرم۔ کرکٹ۔ والی بال۔ بیڈمنٹن تجھے کھیلنا پڑیں گے۔ قینچی تو چلائے گا۔ جا نوکر تجھ کو کام کرنا پڑے گا۔ روٹی تو پکائے گا۔ غرضیکہ چھوٹے سے چھوٹا اور بڑے سے بڑا کام تجھے کرنا پڑے گا۔ اب بیچارہ داہنا ہاتھ ہے کہ کثرت کار سے پسا جاتا ہے۔

دوسرے ہاتھ کو یہ حکم دیا گیا کہ جا تیری سزا یہ ہے کہ تو وضو کے وقت ناک صاف کیسے اور استنجا کرنے میں مدد کرے اور اگر کبھی داہنا ہاتھ رخصت لے تو اس کے بہت سے کام کر لے۔ اگرچہ ذلیل ترین کام دیے گئے تھے مگر داہنے ہاتھ کی کثرت کار کے آگے یہ کام بہت ہی کم تھے۔ بائیں ہاتھ نے سوچا کہ ٹھیک ہے کہ نجاست سے آلودگی ہو جائے۔ فوراً دھل جائے گی پھر صاف کے صاف۔ مشکل سے دن میں تین چار بار کام کرنا پڑے گا۔ جلاب و مسہل کے مواقع پر البتہ دقت ہوگی مگر کون روز مسہل لیتا ہے۔ یہ سب سوچ کر اس نے یہ کام قبول کر لیے اور چین کی بانسری بجنے لگی۔

خیر ہمیں اس سے سروکار نہیں کہ ازل سے یہ سزائیں مقرر کی گئی ہیں یا یہ کہ ہمارے اسلاف نے یہ طریقہ کار کس طرح جائز کیا۔ اور کہاں تک وہ اس امر کے انتخاب میں حق بجانب تھے۔ دیکھنا یہ ہے کہ موجودہ زمانے میں جبکہ ہم اپنے اسلاف کے مقابلہ میں ہر طرح لائق و فائق ہیں اور تمدنی۔ سیاسی۔ معاشرتی۔ تعلیمی۔ مذہبی اور روحانی ترقیوں کے میدان میں لاف گزاف مارتے ہوئے میلوں آگے بڑھ گئے ہیں اور جبکہ ہر طرف مساوات، مساوات، حقوق طلبی و حقوق دہی کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں یہ کہاں تک زیبا اور درست ہے کہ ہم ایک جانب تو دنیا بھر کو حقوق دلانے میں مصروف رہیں اور حقیقت سدھارنے کی تگ و دو کر کے مساوات پیدا کرنے میں منہمک رہیں اور دوسری جانب چراغ تلے اندھیرا کے مصداق اپنے گھر میں بلکہ یہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا کہ اپنے جسم کے اعضا کے ساتھ تقسیم کار میں مساوات سے کام نہ لیں۔

اس لیے ہماری ذاتی رائے یہ ہے کہ اول خویش بعدہ درویش پر عامل ہو کر ہر شخص اپنے ہاتھوں کی تقسیم کار کو پہلے اصول مساوات کے مطابق ترتیب دے اور جب آہستہ آہستہ اس عظیم مقصد میں کامیاب ہو جائے تو خارجی دنیا کی طرف قدم اٹھائے۔

مگر یہاں فوراً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یوں یکایک بائیں ہاتھ کو کام سکھانا آسان نہیں۔ یہ عادت تو بچپن سے پڑی ہے۔ بیشک یہ عذر معقول ہے۔ مگر علاج مشکل ہے محال نہیں۔ یہاں میں چند آسان طریقے بتاتا ہوں

جو انشاء اللہ کارآمد اور مفید ثابت ہوں گے۔

(۱) ہر کام کرتے وقت حتی المقدور بایاں ہاتھ پیش پیش رکھا جائے۔ خواہ کام کرنے میں تاخیر ہو یا کام بگڑ جائے۔ ہمت نہ ہاری جائے۔

(۲) اگر داہنا ہاتھ بہت زیادہ دخل در معقولات کرے تو اسکی سزا بھی آسان ہے کہ اُسے ایک ایسا زخم پہنچا دیا جائے جو کم سے کم دو تین ہفتے میں مندمل ہو۔ اور جتنے کام بائیں ہاتھ کے لیے مخصوص کرنے والے وہ بائیں ہاتھ سے لیے جائیں۔ اگر اپنے ہاتھ سے زخم پہنچانے میں طبیعت جھجکے تو کسی دوست یا ہمدرد کو اس خدمت کے لیے متعین کیا جائے۔ بہت لوگ اپنی خدمات پیش کرنے کے لیے بخوشی تیار ہو جائیں گے۔ وقتاً فوقتاً اگر داہنے ہاتھ کی عادت بدستور قائم رہنے کا اندیشہ ہو تو کبھی چاقو سے انگلی کاٹ دی کبھی آگ سے اس کی مرمت کی۔ کبھی کانٹا چبھو دیا۔ غرضکہ ہر ممکن طریقہ سے اُسکے کام میں روڑے اٹکائے جائیں۔ اگر اس پر بھی وہ اپنی عادت نہ چھوڑے تو کام کے وقت اسے پشت پر کس کر باندھ دیا جائے۔

میرے خیال میں سردست یہ چند تدابیر کام شروع کرنے والوں کے لیے کافی ہیں۔ باقی رہا آئندہ آنے والی نسل چھوٹی امت کے لیے یہ امر بہت آسان ہے کہ شروع ہی سے اُسے بتایا جائے کہ یہ کام داہنے ہاتھ سے کرو اور فلاں بائیں ہاتھ سے۔ انشاءاللہ خاطر خواہ کامیابی ہوگی۔

ناظرین مضمون نیز اُن حضرات کے لیے جو اس صلائے عام پر لبیک کہنے کے لیے تیار ہوں اگر میں اپنے ہاتھوں کی تقسیم کار کی مجمل فہرست بھی شامل کر دوں تو خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

اس امر کا اظہار بھی ناگزیر ہے کہ فطرت کی اس تقسیم کار کے جراثیم طبیعت میں موجود تھے لہٰذا مجھے ساعت دینے میں کچھ زائد وقت نہیں اٹھانا پڑی۔ بچپن سے ہاتھوں نے بیشتر کام آپس میں بانٹ لیے تھے۔ صرف تھوڑی ترمیم اور ردوبدل مجھے کرنا پڑی۔

داہنے ہاتھ کے کام:۔ کھانا کھانا۔ لکھنا۔ دانت مانجنا۔ منہ دھونا۔ کُلی کرنا۔ کھیلوں میں ہاکی کرکٹ۔ کیرم کھیلنا۔

بائیں ہاتھ کے کام علاوہ اُنکے جو ازل سے اُس کی قسمت میں لکھے گئے ہیں یہ ہیں:۔ پنسل سیاہ، پنسل قلم بنانا۔ داڑھی مونڈنا۔ پانی پینا۔ بندوق چلانا۔

بائیں ہاتھ کے کھیل:۔ والی بال، بیڈمنٹن، ٹینس، پتنگ اڑانا۔ ڈھیلا پھینکنا۔

آخر میں اُن حضرات کو جو ابھی "زبانِ خلق" سے ڈرتے ہیں اور جنکے ارادے متزلزل ہیں انکی تسلی کے لیے یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ اب دنیا بھی رفتہ رفتہ ان رموز سے واقف ہو رہی ہے اور لیفٹ

اشخاص کو خاص وقعت کی نگاہ سے دیکھتی ہے جو بائیں ہاتھ سے کام لیتے ہیں۔ بائیں ہاتھ سے ٹینس یا کرکٹ کھیلنے والا بہت خطرناک کھلاڑی سمجھا جاتا ہے ——— موجودہ زمانہ میں لڑائی میں وہ سپاہی میدان جنگ میں زیادہ بہتر سمجھا جاتا ہے جو بائیں ہاتھ سے بندوق چلاتا ہے اس لیے کہ ہوائی جہاز پر فیر کرنا آسان کام نہیں ہے۔ اور بائیں ہاتھ والے کا فیر بہت کم خطا کرتا ہے۔

اب بھی بائیں ہاتھ کو تفویض کار کی اہمیت سمجھ میں نہ آئے تو مجبوری ہے۔

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم
چشمۂ آفتاب را چہ گناہ؟

افکارِ رضی

(جناب مولوی رضی احمد صاحب رضی بدایونی)

فریبِ پرسشِ پنہاں کا تسکیں آفریں ہونا
یقیں بے گانۂ راز، گماں بے یقیں ہونا

کمالِ ذوقِ سجدہ ہے زسرتا پا جبیں ہونا
کمالِ بندگی ہے بے نیازِ کفر و دیں ہونا

زبانِ حال سے شرحِ حدیثِ آرزو کر دی
اسے کہتے ہیں خاموشی کا معنی آفریں ہونا

جنونِ نامکمل ہے جنوں، محسوس ہو جب تک
گریباں کا گریباں، آستیں کا آستیں ہونا

مٹے بن کر بہت خاک۔ کہ نصب العین اعلیٰ تھا
زمیں تصویر کا تھا مرکزِ صورت آفریں ہونا

اٹھا اے وسعتِ ذوقِ نظر۔ قید یہ تعین کی
سکھا دے سب نیاز اقبالِ کفر و دیں ہونا

نہ سوچا تھا پہلے انجامِ محبت۔ یہ خبر کیا تھی
نگاہ ناز میں کو ... ہونا

نہ بیم موج و طوفاں ہے۔ نہ اب گرداب کا کھٹکا
مبارک کشتیٔ عمرِ رواں کو تہ نشیں ہونا

تماشا گم۔ تماشائی بھی گم۔ ذوقِ تماشا بھی
تماشا ہے ترے جلوے کا حیرت آفریں ہونا

اٹھا کر رخ سے پردہ۔ دعوتِ ذوقِ تجسس دے
سکھا دے بزمِ گیتی کے ذرہ ذرہ کو جبیں ہونا

حمایت نابِ حسن سے تماشا کیا نظر ہوئی
فریبِ شوق تھا میرا کھٹکا بے یقیں ہونا

فضا ساکت۔ ستارے چپ۔ وہ پچھلی شب۔ وہ تنہائی
وہ سازِ بزمِ فطرت کا ترنم آفریں ہونا

رضی تصدیق ہے عرفان کے تکمیل مدارج کی
مری مشکل کا مشکل تر ہے اب مشکل نہیں ہونا

کچھ نبت الحکمت اور عذرا کے متعلق

جناب محترم اڈیٹر صاحب الناظر۔ تسلیم۔

الناظر فروری ۱۹۳۵ء میں جناب مولوی محمد خلیل الرحمٰن صاحب نے اپنے ترجمہ کردہ ناول "عذرا" کی بے حد اعزازی وغیرہ کے متعلق جو کچھ ارشاد فرمایا ہے صحیح ہے۔ "عذرا" نے عام ناولوں اور افسانوں اور اولانہ سوانحمریوں سے بہت زیادہ مقبولیت اور شہرت حاصل کی۔ مولوی صاحب فرماتے ہیں کہ بہت سے استفسارات اس کے متعلق میرے پاس آرہے ہیں۔ ایک استفسار میرے ذہن میں بھی عرصہ سے ہے جسے بتوسط الناظر پیش کرنے کی معافی مولوی صاحب ممدوح سے چاہی جاتی ہے۔ کیونکہ اس سے مولوی صاحب کی قیمتی عمر و فرصت میں خلل آئیگا۔ "عذرا" کے دیباچہ میں جو حالات لاہور وغیرہ کے بیان کیے گئے ہیں وہ اسقدر ہیں کہ اس سے پیشتر کتابی شکل میں اس مضمون کا وجود نہ تھا جس کا ترجمہ مولوی صاحب نے اپنے رنگ میں کرکے نام عذرا رکھا تھا۔ انگریزی ناول مسمی She "شی" میں بھی کچھ ایسے ہی واقعات اس مضمون کے باب تک پہنچنے کی تمہید کے طور پر بیان کیے گئے ہیں۔ بعض مقامات کے نام عذرا کے سے ہی ہیں۔ اشخاص کے ناموں میں البتہ فرق ہے۔ مولانا مولوی صاحب مہربانی فرما کر اس امر کو صاف کردیں تو کسی گونہ معلومات میں اضافہ سا تو اطمینان ہو جائے کہ "شی" کے مصنف یا مؤلف نے اپنا مضمون ناول [illegible] یا کہیں اور سے کوئی [illegible] صاحب کے نسخہ یک اصل رومان پہنچنے سے پہلے حاصل کرلیا تھا یا اسکے بعد۔ یا جس وقت صاحب موصوف نے ترجمہ فرمایا تو اُن کے علم میں اس "شی" کا وجود تھا یا نہیں۔ غالباً نہ تھا۔ ورنہ اس طرف بھی دیباچہ و تمہید میں کچھ اشارہ ہوتا۔ میرا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ میرے دل میں یہ شبہ ہو کہ لاہور میں حنیف صاحب وغیرہ کے ملنے کے جو واقعات بیان کیے گئے ہیں وہ کتاب کی تمہید بطور ایک واقعہ [illegible] کے طور پر ہیں اور در اصل پیش نہیں آئے لیکن کیا یہ مطلب اخذ کیا جا سکتا ہے کہ [illegible] صاحب کا فرضی نام حنیف بیان کیا گیا ہے (کیونکہ دیباچہ میں لکھ دیا گیا ہے کہ یہ اصل نام نہیں ہے) کیا اُن صاحب کو حالات بیان کردہ سے بذات خود تعلق و واقفیت نہ تھا اور وہ خود ایک مترجم سے زیادہ حیثیت نہ رکھتے تھے۔ یا یہ کہ حنیف سے براہ راست پہلے اور مسودات حاصل کیے جانے سے قبل۔ حاصل کرنے والے۔ یا خود حنیف ہی۔ مولف "She" سے مل چکے تھے۔ بہرحال۔ یہ معلوم ہو جانا بہتر ہے کہ "عذرا" کا اصل اور ابتدائی نسخہ یا مسودات عربی میں لکھا یا فارسی میں یا انگریزی میں یا کسی اور زبان میں۔ اور اس کا اصل اور ابتدائی مصنف یا مولف کون شخص تھا۔

اگر عذرا کے دیباچہ والے ضعیف ہی اصل ہیں تو جو کچھ بھی اُن کا اصل نام ہو۔ قابل مدح و ستائش ہیں کیونکہ عذرا کا تخیل عام معیار سے نہایت بلند ہے اور تخیل بلند کیوں نہ ہو جبکہ نفس مضمون بھی ایسے عجیب و غریب واقعات سے تعلق رکھنے والا ہو جس کی نہ تو تاریخ کا احاطہ کرنے والا ہو جیسا کہ مولوی صاحب نے مضمون "بنت الحکمت" میں بھی تشریح فرمائی ہے۔ "رومان" کا عام مفہوم تو یہی ہے کہ واقعیت کی بجائے فسانویت غالب ہو اور مولوی صاحب نے خود بھی رومان ہی لکھا ہے لیکن ایسا رومان جو واقعیت کا جگہ جگہ شبہہ پیدا کرے اور صوفیانہ طریقہ پر روحانیات کی تشریح کرتا چلا جائے بہت ہی بلند مرتبہ ہے۔ اس لیے مولوی صاحب کی جابجا تصنیف "بنت الحکمت" جب کبھی شائع ہوئی یقین ہے کہ اسے شائقین ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔ ناول "شی" تو اُسی جگہ پر ختم ہو گیا ہے جس جگہ سے عذرا کا پہلا حصہ تھا۔ لیکن اس سلسلہ میں دوسرا حصہ از نام "عذرا کی واپسی" بھی شائع ہو چکا ہے۔ مولوی صاحب کے اس مضمون میں اُس کے متعلق کوئی حوالہ نہیں ہے۔ کیا وہ اُن کی نگرانی و مرضی سے شائع نہیں ہوا اور کیا انگریزی مولف کو "واپسی" کے متعلق کوئی روئداد نہ ملی یا تخیل نے رسائی نہ کی۔ بہرحال اگر مولوی صاحب ان امور پر مزید صراحت کی تکلیف گوارا فرمائیں گے تو میری طرح جن صاحبوں کو اس صراحت کی ضرورت محسوس ہوتی ہوگی مطمئن ہو جائیں گے۔ اور مفید غالباً اس فخر کا موقعہ مل سکے گا کہ ایشیائی ادبیات کی خوشہ چینی یورپین ناول نویسوں نے بھی کی ہے ممکن ہے مولف "شی" نے اپنے ماخذ کا کہیں اعتراف کیا ہو کیونکہ میرے پاس اصل ناول معہ دیباچہ (اگر کوئی ہو) نہیں ہے بہت زمانہ ہوا جب سرسری طور پر دیکھا گیا تھا۔ اور جب ہی سے یہ خلش پیدا ہوئی تھی کہ اس مضمون کے سب سے پہلے کس شخص کے دماغ سے پیدا ہونے کا واقعہ معلوم ہو جائے۔ اگر میں اپنی ناقابلیت یا کم علمی سے اپنا مطلب بخوبی نہ سمجھا سکا ہوں تو امید ہے کہ مولوی خلیل الرحمن صاحب یا کوئی پڑھنے والے پرائیویٹ خط بھیجنے کی تکلیف اور بھی گوارا فرمائیں گے۔ والسلام

مشتری - محمد نصیر حق بی اے ایل ایل بی سب جج - بریلی ریاست بھوپال

قطعہ تاریخ وفات حسرت آیات استاد الشعرا حضرت ریاض خیرآبادی مرحوم

(جناب شیخ محمد اسحٰق صاحب ضیا لکھنوی)

چوں حضرت ریاض بباغ نعیم رفت — دور خزاں بگلشن شعر و سخن نمود

اے وا مصیبت آہ کہ ایں صدمۂ عظیم — صبر و شکیب اور عقل و ثبات و خرد ربود

تاریخ ارتحال چو پرسیدم اے ضیا

گفتا سروش غیب - فضائے ریاض بود

۶ ۱۹   ۳۴

شغلِ بکا

۱۳۵۳

(جناب پروفیسر حامد حسن صاحب قادری)

قطعات تاریخ وفات ناگہانی مولوی عبدالعزیز فرزند یگانہ مولانا حافظ محمد ابو اشرف صاحب مجددی مہاجر مکی خلف الرشید و سجادہ نشین حضرت شاہ محمد معصوم صاحب رحمۃ اللہ علیہ مولوی ثم رامپوری ثم مہاجر مدنی و مدفون مکی

مرحوم عبدالعزیز مولانا ابو اشرف صاحب عرف تحسین صاحب کا اکلوتا جوان بیٹا تھا جو پیدا ہوئے مکہ مکرمہ سے ہندوستان آیا تھا ریاست رامپور میں اپنے چچا مولوی ابوطاہر صاحب عرف ... صاحب کے پاس رہتا تھا۔ ان کی لڑکی سے اس کی شادی ہونے والی تھی سب تیاریاں ہو چکی تھیں کہ یکایک ۲ محرم ۱۳۵۳ھ کو رامپور میں انتقال کیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون!

(۱)

چھائی ہے یہ مُردنی سی کیسی — کیا سانحہ آج ہو گیا ہے
آیا ہے شرف کے پاس جو آج — آنکھوں سے لہو وہ رو گیا ہے
آیا ہے جو مضطرب ہوا ہے — بیتاب گیا ہے جو گیا ہے
کیا کہیے کہ کون بحرِ غم میں — کشتیِ شرف ڈبو گیا ہے
فرزندِ عزیز خُلد پہونچا — وہ سمجھے تھے ہند کو گیا ہے
دولھا بننے کو تھا جو تیار — آغوشِ اجل میں سو گیا ہے
کیا دل پہ چھُری چلا گیا ہے — کیا نشترِ غم چبھو گیا ہے
دریا دریا رُلا گیا ہے — دامن دامن بھگو گیا ہے
سب چین دلوں کا لے گیا ہے — سب دفترِ عیش دھو گیا ہے
گرم اشک ہیں اب تو سرد آہیں — دل میں وہ انھیں سمو گیا ہے
تھمتی نہیں آنسوؤں کی لڑیاں — موتی یہ وہی پرو گیا ہے

اب دل میں کہاں پتہ ملے گا ساتھ اُس کے ہی صبر تو گیا ہے
روشن تھی جو شمع بجھ گئی ہے نادر تھا جو لعل، کھو گیا ہے
آتا ہے وہ بار بار دل میں آنے کو نہیں وہ گو گیا ہے
پائے وہ بہشت میں پھل اُسکا نیکی کا جو بیج بو گیا ہے
مغفور ہو وہ کہ ساتھ اُس کے اُس کا عملِ نکو گیا ہے
تھا ذکر کہ اب نہ آئے گا ہاتھ جو ہاتھ سے دوستو گیا ہے
کیا شاہد خوبرو اُٹھا ہے کیا عاقلِ نکتہ گو گیا ہے
اُٹھ کر کہی ایک[1] نے یہ تاریخ
"کیا چاند غروب ہو گیا ہے"
۱۳ ۵۴

(۲)

شرف جہاں سے گزر جائے جب جواں بیٹا سیاہ کیوں نہ ہو آنکھوں میں پھر جہاں کی فضا
یہ سالِ مرگ سُناتا ہے حادثہ غمگیں کہ اور کچھ نہیں چارہ بجز رضا بقضا
ہوئے عزیز کے جانے سے آہ بے سرو پا شباب و حسن و وفا، فقر و دین و رشد و رضا
۱ ۳ ۵ ۴

(۳)

پہلو سے شرف عزیز محبوب گیا وہ طالبِ حق تھا، سوئے مطلوب گیا
ٹوٹا دلِ زار تو یہ نکلی تاریخ وہ ماہ ہوا غروب، دل ڈوب گیا
۱ ۳ ۵ ۴

(۴)

وہی مادۂ تاریخ بغیر تخرجہ

یہ حوصلہ تھا شرف کا کہ سُن کے مرگِ پسر کہا یہی تھی رضائے خدا تو خوب ہوا
مگر مجھے ہے وہ صدمہ کہ میں نے سالِ وفات کہا کہ، "ڈوب گیا دل وہ مہ غروب ہوا"
۱ ۳ ۵ ۴

(۵)

فرزندِ جواں نورِ نظر بود شرف را رفت از بر و از جان و دلش تاب و تواں برد
تاریخِ وفاتش شدہ، بر خاست چو محشر "ایں ماتم سخت است کہ گویند جواں مُرد"

۲ ۴ ۸ ۲
۵ ۶ ۹
۱۹۳۴

[1] ایک عدد کا تخرجہ کیا گیا ہے جس کی طرف اس مصرع میں اشارہ ہے۔

انتخاب مشاعرہ سالانہ بزم جگر بسواں

مصرع طرح: - جان لیکر اُس نے بیماروں کو اچھا کردیا

ماسٹر باسط بسوانی سکریٹری بزم جگر

بیخودی میں رازِ الفت اُن پہ افشا کردیا — آپ میں آئے تو سوچے ہم نے یہ کیا کردیا
خیر ہم تو ہوگئے بدنام اپنے عشق سے — تجھ کو لیکن حُسن والے کس نے رسوا کردیا
جان لینا ہی مریضِ حق کے غم میں خوب تھا — تم نے یہ اچھا کیا دراصل اچھا کردیا
میں ترے رازِ محبت کو چھپاتا ہی رہا — دیکھ افشا ہوگیا یا میں نے افشا کردیا
اشکِ حسرت رات دن رو رو کے پونچھا کیے — آستیں میں جذب ہم نے ایک دریا کردیا
کیا بتائیں عشق نے ہم سے کیے کیا کیا سلوک — جو نتیجہ چاہیے تھا وہ نتیجا کردیا

خون کے آنسو جو تم روتے ہو باسط رات دن
کیا کسی بے درد نے خونِ تمنا کردیا

آیجاد بسوانی — شمع کے اشکوں میں شامل تھا مگر آبِ حیات — اپنے پروانے کو پھر محفل میں زندہ کردیا

احمد خیرآبادی - اپنی آنکھیں کھول غافل اور فیضِ علم دیکھ — علم والوں کو خدا نے ملک والا کردیا

بشیر بسوانی - جو کہ اچھے تھے ہوئے بیمار اسکو دیکھ کر — اور بیماروں کو اُسنے آکے زندہ کردیا

بیکس بلگرامی - کامیابِ آرزو ہنستے ہیں میرے حال پر — تم نے ایسا مجھکو ناکامِ تمنا کردیا
سب اُنھیں کیا دیکھتے ہیں اہلِ محشر حشر میں — سب اُنھیں کو کہتے ہیں اک حشر برپا کردیا

خبیر بسوانی - تربتوں میں بھی رہیں گے بارِ احساں سے دبے — جان لے کر اُسنے بیماروں کو اچھا کردیا

حکیم جگر صدیقی مہتمم مشاعرہ بزم جگر

کام جو کرنا تھا تجھ کو وہ مسیحا کردیا — مار ڈالا ہم کو دُنیا بھر میں زندہ کردیا
ٹوٹے بازو اور بھی توڑے مرے صیاد نے — ہنس کے دروازہ قفس کا اُسنے پھر وا کردیا
مر گئے سب وہ سمجھتے ہیں تسلی ہوگئی — ہنس کے کہتے ہیں مریضوں کا مداوا کردیا
کسقدر افسردہ افسردہ تھا باغِ کائنات — حُسن کی نیرنگیوں نے رنگ پیدا کردیا
یہ طرفداری نہ تھی تو کیا تھا قسامِ ازل — ہم کو بیدل کردیا اُنکو دل آرا کردیا
فاتحہ پڑھتے رہے ہنستے رہے روتے رہے — قبر پر آکر اُنھوں نے قول پورا کردیا
دیر سے بگڑے ہوئے بیٹھے ہیں وہ اس بات پر — کیوں مرے بیمار کو عیسیٰ نے اچھا کردیا

کیا سمجھ کر شمع روئے یار پر تم نے جگرؔ
صورتِ پروانہ دل قربان اپنا کر دیا

شاعرہ پردہ نشیں
ختم یوں دستِ جنوں نے سب کا جھگڑا کر دیا — ہتکڑی ٹوٹی کہ بیڑی کا ارادہ کر دیا

حجاب صاحبہ
اب رازِ غم کا دل سے نہ چھپنا اثر — کر دیا حسرت بھری صورت نے رسوا کر دیا

شاہجہانپوری
پردۂ غفلت رہا حسن و عشق آگے کیا کہوں — کس کے قابل کون تھا قسمت نے کیسا کر دیا
تابعِ حکم جنوں میں ہم کو کیا پاسِ مقام — بار ہا صحرا کو گھر اور گھر کو صحرا کر دیا
ہمکلام اُس سے ہوئے کیوں ایسا تھا جذبِ شوق کو — ہم نے خود ہی حرف کو حرفِ تمنا کر دیا

گو کلامِ عاشقانہ سے ہے اب نفرت حجابؔ
پھر بھی خاطر سے جگر صاحب کا کہنا کر دیا

تپشؔ بسوانی
کچھ بھی تو ہستی نہ تھی آدم کی اے ربِ کریم — خاک کا پتلا تھا رتبہ تو نے اعلیٰ کر دیا

سروؔ جالندھری
دستِ رنگیں دیکھتے ہیں آج وہ پھر بار بار — آج پھر قتلِ دو عالم کا ارادہ کر دیا

شورؔ بسوانی
کیوں مقدر سے نہ پہنچے عرش پر اُسکا دماغ — تیری زلفِ عنبریں نے جس پہ سایا کر دیا

خلیلؔ بسوانی
مست آنکھوں سے جو ساقی نے اشارہ کر دیا — پھر سے دل میں ہمارے جوش پیدا کر دیا
اس طرح فاران کی چوٹی پہ چمکا نورِ حق — کفر کی تاریک دنیا میں اُجالا کر دیا
جلوۂ دلدار و موسیٰ سامنے تھے طور پر — عشق نے آ کر بیچ میں دونوں کے پردا کر دیا
وہ سنا کر مجھ پریشاں حال کو کہتے رہے — ایک سودائی نے ہم کو خوب رسوا کر دیا

آئے تھے کعبے سے بتخانہ میں اُٹھکر ہم خلیلؔ
آج بتخانہ سے کعبہ کا ارادہ کر دیا

تمناؔ بسوانی
دل کو حیراں آنکھ کو ناخوش خود کو رسوا کر دیا — کیا کیا میں نے کہ نذرِ تمنا کر دیا
بعد مرنے کے بہائے اشک اُسکی خاک پر — شمع نے پروانہ کا ٹھنڈا کلیجا کر دیا
اُس نے پوچھا حال ہم نے ایک فقرہ میں بیاں کی — اس طرح افسانۂ غم کا خلاصہ کر دیا
حسن گر ہوتا نہ دنیا میں تو یہ بے کیف تھی — ہاں اسی اک چیز نے دنیا کو دنیا کر دیا

سوزؔ بسوانی
جان دیتا ہوں اُسی پر جس نے رسوا کر دیا — اُس پہ میں قربان جس نے درد پیدا کر دیا
حرکتِ دل ہو چکی بند اور زندگی بیکار ہو گئی — جب تجلی آئی تو دریا نے کنارا کر دیا
کیا بدقسمت ہوں [illegible] رازِ عشق — گر چھپایا دل نے تو آنکھوں نے افشا کر دیا

دہر میں تنہا رہا عقبیٰ میں بھی تنہا رہوں — گوشۂ تربت میں بھی یاروں نے تنہا کر دیا
سوزِ پروانے جلے لیکن نہ رسوائی ہوئی — شمع نے خود جل کے رازِ الفت کا افشا کر دیا

رام بسوانی — رام ہی کے نام سے یہ جان و دل ہیں شاد باد — رام اُنکے نام میں احسان کیا کیا کر دیا
ستار بسوانی — جو ہماری قبر کو پامال کر کے چلتے ہیں — ساری دنیا میں اُنھیں نے حشر برپا کر دیا
رتن … بادی — ایک ہی ترچھی نظر نے ہائے یہ کیا کر دیا — تھم چکا تھا درد جو پھر دل میں دونا کر دیا
آپ میں آنا ہمیں دشوار پھر دن ہو گیا — جب کسی نے ذکر کچھ ہم سے تمہارا کر دیا
صدیق بسوانی — لن ترانی کی صدا آئی تو موسیٰ غش میں تھے — یہ نہ پوچھو یار نے کیا کہہ دیا کیا کر دیا
اکمل خیرآبادی — اُس نے شاید غنچہ کے دھوکے میں پوچھا ہے کہیں — کیا سمجھ کر تم نے اظہارِ تمنا کر دیا
چار جانب کی فضائیں منقلب ہونے لگیں — پھیر کر آنکھیں انھوں نے کیا اشارا کر دیا
کیا ہوئیں وہ شوخیاں بیباکیاں خود بینیاں — حشر میں کیوں آج کہتے ہو کہ رسوا کر دیا
ماہر شاہ آبادی — خونِ حسرت کر دیا خونِ تمنا کر دیا — اے تغافل کیش تو نے کام دل کا کر دیا
موردِ الزامِ الفت ہم ہی ناحق مگر — عشق پروانے کے دل میں کس نے پیدا کر دیا
کوہکن نے سر کو پھوڑا خاک چھانی قیس نے — تو نے چاہا جس کو جیسا اُسکو ویسا کر دیا
بات تو جب ہے کہ خود وہ پوچھیں دل کی آرزو — لطف ہی کیا ہے جو اظہارِ تمنا کر دیا
ناصر تمبوری — وہ کیا ہم نے جو کچھ تم نے اشارا کر دیا — پیرِ مغ پیرِ طریقت تجھ کو اپنا کر دیا
ناخدا جس کو بنایا تھا وہی دشمن ہوا — غرق اُس نے بحرِ شورش دل کا سفینہ کر دیا
شائق آبادی — کیا کیا اے عشق آخر تو نے یہ کیا کر دیا — رنگِ حسنِ بے وفا کا ہم کو شیدا کر دیا
سرزنش اپنے حسن کی شہرت تھی منظورِ نظر — دار پر منصور کو کھنچوا کے رسوا کر دیا
قیس … پوری — پھر مرے ظالم نے اک تھوڑا سا وعدہ کر دیا — پھر مرے مر مر کے جینے کا سہارا کر دیا
اک نظر دیکھا تھا جسنے تماشا بن گیا — اک نظر دیکھا جسے تم نے تماشا کر دیا
یا محمد آپ نامِ نبوت کے سوا — ہر تجلی نے تری کتنوں کو موسیٰ کر دیا
قرار بسوانی — دیکھیے اُس شوخ کی جادو نگاہی کا اثر — درد میرے دل جگر دونوں میں پیدا کر دیا
قدیر … پوری — موت کی سُن کر خبر احسان اتنا کر دیا — مر چلے تھے ہم انھوں نے آ کے زندہ کر دیا
سر جھکائے دیر سے چھپتا رہے ہیں حشر میں — ہم نے ناحق خون کا قاتل پہ دعوا کر دیا

دامن بسوانی	قتل کر کے اپنے احسان اسے مسیحا کر دیا	جان لے کر تو نے بیماروں کو زندا کر دیا
	یہ ہوا انجام بیمار الم کی موت میں	عمر بھر کا ختم اک ہچکی میں قصہ کر دیا
ہمسر باڑوی	گل کھلائے آپ کے چشم خونفشاں نے اس قدر	خلد ہم نے کوچۂ قاتل میں پیدا کر دیا
یوسف محمود آبادی	حسن اپنا ہر طرح سے آشکارا کر دیا	واہ کیا پردہ کیا خود کو ہویدا کر دیا
	عاشق جانباز لاکھوں تھے یہ ہے ان کا کرم	سر ہمارے ناز برداری کا سہرا کر دیا
طرب بسوانی	ہو گئے ہیں اس قدر فرقت میں ہم غم آشنا	درد اپنے دل میں ہم نے آپ پیدا کر دیا

تعارف

سرود زندگی - حضرت اصغر گونڈوی کے کلام کا تازہ مجموعہ - مع مقدمہ از ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو و تقریظ از مولانا ابو الکلام آزاد و تصویر شاعر - حجم ۸ جزو تقطیع خورد - طباعت، جلد دیدہ زیب - قیمت عہ

ملنے کا پتہ :- منشی اصغر حسین صاحب اصغر ایڈیٹر ہندستانی - ہندستانی اکیڈمی - الہ آباد -

شہید وفا - خواجہ غلام السیدین صاحب پرنسپل ٹریننگ کالج علی گڈھ (خلف خواجہ غلام الثقلین مرحوم) کا افسانہ مع مقدمہ از سید الطاف علی بی اے بریلوی مصنف حیات رحمت خاں - حجم ۶ جزو کتابت و طباعت صاف قیمت ۱۲؍

ملنے کا پتہ :- روہیلا بک ڈپو - نینی تال روڈ - بریلی

سبل السلام - مولوی حاجی مصطفےٰ حسن صاحب علوی فاضل دیوبند ایم اے نے رفع الحجاب مؤلفہ مولوی ایوب احمد صاحب بی اے ایل ایل بی اور احسن الانتخاب فی ذکر معیشت سیدنا ابی تراب مؤلفہ مولوی علی حیدر صاحب ابن حافظ شاہ علی انور قلندر مرحوم کے بیانات کی تردید و تنقید میں یہ کتاب لکھی ہے - حجم ۱۸ جزو (پیمانہ کتب درسی) کاغذ و طباعت صاف - قیمت ۸ ر - ملنے کا پتہ :- انوار المطابع لکھنؤ -

مجموعہ رسائل حج - مؤلفہ مولوی حاجی عبد الوہاب صاحب دہلوی تاجر مکہ معظمہ - اس میں اسرار حج، حج نبوی، اور ادعیۂ حج تین رسائل ہیں - حجم ۱۰۸ صفحے مع نقشہ و زیارات مکہ معظمہ و مدینہ منورہ - کتابت و طباعت روشن - ذیل کے پتہ پر ڈیڑھ آنہ کے ٹکٹ بھیجکر مفت حاصل کی جا سکتی ہے :-

کوٹھی علی جان مرحوم - نئی سڑک - دہلی -

نظرے خوش گزرے

آیندہ ایسٹر کی تعطیلوں میں مسلم لیگ کا اجلاس لاہور میں ہونے والا ہے اور صوبجات متحدہ کے سرکاری مرکز الہ آباد میں اسی ماہ ایک کانفرنس اس غرض سے طلب کی گئی ہے کہ ڈاکٹر شفاعت احمد خاں صاحب کو مسلمانوں کے فوز و فلاح کا جو نسخہ کسی حاذق کامل سے ملا ہے اُسے قوم کے نمایندوں کی سپردگی میں دے کر ڈاکٹر صاحب بار امانت سے سبکدوش ہونا چاہتے ہیں۔

مسلم لیگ کی عمر اب تقریباً تیس سال کی ہے۔ عام طور پر انسان اس عمر میں جوان ہوتے اور دنیا سے عمل میں انتہائی جد و جہد کے نمونے پیش کرتے ہیں اور جو کیفیت انسانوں کی ہے وہی انسانی اداروں کی بھی ہونا چاہیے۔ مگر لیگ پر گذشتہ پندرہ سال سے کہولت اور بوڑھاپا طاری ہے اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس خزاں رسیدہ باغ میں کبھی بہار نہ آئے گی۔

دسمبر ۱۹۱۷ء میں جب مسلم لیگ اور کانگریس کے اجلاس بمقام کلکتہ منعقد ہوئے اور پہلی بار سید وزیر حسن صاحب سکریٹری مسلم لیگ نے اپنی سالانہ کارگزاری کی رپورٹ مرتب کرکے اراکین لیگ کی خدمت میں منظوری کے لیے باقاعدہ پیش کی تو صدر کی اجازت سے ہمیں اُس پر تبصرہ کرنے کا موقع ملا۔ اور ہم نے عام اراکین اور ذمہ دار عہدہ داروں کو اس طرف توجہ دلائی کہ لیگ اور کانگریس دونوں کے درمیان جو اتحاد عمل قائم ہوا ہے اُسکو کامیاب بنانے کے لیے ضروری ہے کہ کانگریس جیسی منظم اور با اثر انجمن ہے مسلم لیگ بھی ویسی ہی مستحکم اور بارسوخ بنائی جائے۔

کانگریس کی تنظیم کا اسوقت یہ حال تھا کہ علاوہ صوبوں کی مجالس کے تقریباً تمام بڑے بڑے مقامات پر اُس کی ضلع وار شاخیں قائم تھیں جہاں سے باقاعدہ انتخاب کے ذریعہ سے ڈیلیگیٹ یا نمایندے منتخب ہوکر کانگریس کے جلسوں کی رونق بڑھاتے تھے اور جو تجاویز کانگریس میں منظور ہوتی تھیں اُنکو سارے ملک میں مشتہر کرنے اور مقبول بنانے کے لیے اور جو اُن میں سے عملی تجاویز ہوتی تھیں اُن پر عمل کرانے کی غرض سے صوبوں اور اضلاع کی مجالس مسلسل جد و جہد کرتی رہتی تھیں۔

مسلم لیگ کی حالت یہ تھی کہ صدر مجلس کا ایک مرکزی دفتر تھا۔ صوبوں کی مجالس بھی قائم تھیں مگر چند کے سوا عموماً مجالس کا وجود محض کاغذی تھا۔ اور اضلاع میں تو شاذ و نادر ہی کوئی باقاعدہ جماعت بندی ہو۔

صدر مجلس کا بھی یہ حال تھا کہ رجسٹر پر اگرچہ پانچ چھ سو اراکین کی تعداد درج تھی لیکن اُن میں سے باقاعدہ چندہ ادا کرنے والے اور لیگ کے جلسوں میں شرکت کرنے والے یا اُسکے اغراض و مقاصد سے دلچسپی رکھنے والے بہت کم

تھے ۔ جہاں کہیں سالانہ اجلاس منعقد ہوتا تھا مقامی اصحاب کی کافی تعداد ارکان میں داخل ہو جاتی تھی اور وقتی طور پر رونق افزائی کا موجب بنجاتی تھی اسکے بعد پھر کسی کو لیگ یا اُسکے معاملات سے کوئی دلچسپی باقی نہ رہتی تھی ۔

گیارہ سال کے بعد کلکتہ ہی میں جب دوبارہ لیگ اور کانگریس کا اجتماع ہوا تو دونوں مجالس کی حالت کا موازنہ کرکے عجیب حیرت ہوتی تھی ۔ کانگریس نے اس اثنا میں مہاتما گاندھی کے زیر قیادت و رہنمائی یہ منزلت حاصل کرلی تھی کہ کانگریس نگر کی شان و شوکت دیکھکر انسان دنگ رہ جاتا تھا ۔ اور مسلم لیگ غریب کی یہ حالت تھی کہ البرٹ ہال میں جب ڈاکٹر کچلو صاحب نے اپنی رپورٹ سنائی تو مختصر سی جگہ ہونے کے باوجود بکثرت کرسیاں خالی پڑی تھیں ہمنے ان حالات سے متاثر ہوکر ایک بار پھر مسلم لیگ پر نوحہ خوانی کی اور ذمہ دار عہدہ داروں اور کارکنوں کو توجہ دلائی کہ اس زبوں حالی سے لیگ کو نکالیں مگر

کون سنتا ہے فغانِ درویش قہرِ درویش بجانِ درویش

اب کی دفعہ لیگ کا اجلاس لاہور میں ہورہا ہے جو زندہ دلانِ پنجاب کا مرکز ہے ۔ پنجاب کے بعض مسلمان اخبار نویسوں کا خیال ہے کہ مسلمانانِ ہند کی رہنمائی کی اہلیت سب سے زیادہ بزرگانِ پنجاب میں ہے ۔ خدا کرے کہ اب کی سالانہ اجلاس کے موقع پر پنجاب کے غیور اور عمل دوست بزرگوں کو مسلم لیگ کے حال زار پر رحم آجائے اور وہ اُسکو ایک منتظم اور مقتدر ادارہ بنانے کا تہیہ کرکے مسلمانانِ ہند کی اہم ترین سیاسی ضرورت کا سامان کرنے کے لیے آمادہ کار ہو جائیں ۔

ڈاکٹر شفاعت احمد خاں کے طلب کردہ اجلاس کے متعلق کچھ کہنا فضول ہے ۔ جلسہ کا اعلان ہوتے ہی ظہور احمد صاحب بیرسٹر الہ آباد و رکن کونسل صوبہ متحدہ نے اخبارات میں شایع کرایا کہ یہ ڈاکٹر صاحب کا خود ساختہ ایک جلسہ ہے ۔ مسلمانانِ الہ آباد یا کسی ادارہ پر اس کی ذمہ داری نہیں ہے ۔ صوبہ متحدہ کی تعلیمی کانفرنس دونے الگ متنبہ کیا کہ جن اغراض کے لیے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور اس کی صوبجاتی شاخ قائم ہے اُنھیں اغراض کے حصول کے لیے ایک نیا ادارہ قائم کرنے کی کیا ضرورت ہے ۔ مگر ڈاکٹر صاحب جانتے ہیں کہ دنیا بیوقوفوں سے بھری ہوئی ہے مسلمات اصول و آئین کی قیود سے آزاد ہیں اس لیے یہ توقع بیجا نہیں کہ اُنکو اپنے نسخہ کیمیا کی نمائش کا موقع دینے کے لیے کچھ نہ کچھ حضرات ضرور ہی الہ آباد پہونچ جائیں گے ۔ اسمبلی کے انتخاب میں ناکامیاب رہنے اور مسلم کانفرنس و مسلم لیگ سے بیزار ہو جانے کے بعد آخر ڈاکٹر صاحب کے لیے سوا اسکے چارہ ہی کیا تھا کہ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنا کر مسلمانوں کی رہنمائی کرتے رہیں ۔

بنام خداوند جان آفرین

الناظر

نمبر ۴ جلد ۳۹ اپریل سنہ ۱۹۳۵ء

ابراہیم عادل شاہ اوّل

سنہ ۱۵۳۵ - سنہ ۱۵۵۷ء

(جناب ڈاکٹر م، ح سید صاحب ایم اے پی-ایچ ڈی۔ ڈی لٹ)

پندرہویں صدی کے آخر میں سلطنتِ بہمنیہ کا چراغ گل ہوگیا مگر دکن میں مسلمانوں کا اقتدار پچاس سال بعد تک رہا۔ سیاسی حیثیت سے یہ اقتدار کئی حصوں میں تقسیم ہوگیا اور ہر حصہ کی تشکیل ایک آزاد حکومت سے ہوئی۔ بیجاپور میں کامل شاہانہ اقتدار قائم کرنے کا شرف یوسف عادل شاہ کو حاصل ہوا جو فتوحاتِ عادل شاہی "تذکرۃ الملوک" اور گلشن ابراہیمی کے مصنفوں کے بیانات کے مطابق بیرون نژاد تھا۔ بیس سال کی پُر از واقعات حکومت کے بعد سنہ ۹۱۶ھ میں یوسف نے انتقال کیا اور اُس کا شیر خوار لڑکا اسمٰعیل جو پونجی خاتون نامے ایک جمیلہ مرہٹہ لڑکی کا اکلوتا بیٹا تھا، اُسکی جگہ تخت نشین ہوا۔ اپنے دیگر معاصرین کی طرح اسمٰعیل کو بحیثیت ایک جنگ آزما شہریار کے نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔ اُس نے بیدر پر قبضہ کرلیا اور بہمنیوں کے مشہور و معروف فیروزہ کے تخت پر متمکن ہوا۔ یہ اُس کی زندگی میں قابل یادگار دن تھا اس لیے اُس نے نہایت فیاضی سے عطایا و ہدایا تقسیم کیے۔ اسکے چاروں لڑکے، ملو، اقو، ابراہیم اور عبداللہ بھی انعام و اکرام سے سرفراز ہوئے۔ اسمٰعیل نے بستر مرگ پر اپنے بڑے بیٹے ملو کو اپنا جانشین نامزد کیا، باوجودیکہ تمام امرائے دربار

اُسکے مقابلہ میں ابراہیم کو پسند کرتے تھے۔ ابراہیم نے جب اپنے دوستوں کی درخواست تخت نشینی کو رد کر دیا تو بادلِ "ناخواستہ" شاہ مرحوم کی ہدایات پر عمل کیا گیا۔ لیکن ملو کی بدمزاجی اور بداعمالی کی بدولت کہ اُسنے نامی امراء کے خاندانوں کی آبرو کا بھی پاس و لحاظ نہیں کیا، عامہ خلائق اُس سے بیزار ہو گئی اسلیے امرائے دربار نے ابراہیم کو بادشاہ منتخب کرکے ملو کو تخت سے علیحدہ کر دیا۔ اس طرح ابراہیم بیجاپور کا حکمراں قرار پایا۔

اواخر فروری ۱۵۳۵ء میں ابراہیم عادل شاہ اپنے معزول بھائی کے بجائے تخت نشین ہوا۔ تخت نشین ہوتے ہی اُس نے ایک نیا فرمان جاری کیا جس کی رو سے مذہب شیعہ کو سخت صدمہ پہونچا۔ اور سُنی مذہب ترقی کرنے لگا۔ اُس نے شیعوں کے تمام مظاہرے ممنوع قرار دیے۔ اور امراء کے نام فرمان بھجوائے کہ وہ اپنی تمام متعلقہ جاگیروں میں سُنی مذہب کے رواج دینے کی کوشش کریں۔ اُس نے اپنے جوش کی وجہ سے تقریباً تمام غیر ملکی لوگوں کو ملازمتوں سے برخاست کر دیا۔ کچھ تو وجے نگر (بیجانگر) چلے گئے اور بعض نے احمدنگر کی راہ لی۔ اپنے خاص محافظ دستے میں صرف چار سو غیر ملکی اشخاص باقی رکھے اُن کو چھوڑ کر بقیہ تمام غیر ملکی افسر برطرف کر دیئے گئے اور اُن کی بجائے دکنی اور حبشی لوگ مقرر ہوئے۔ درباری زبان اُس نے ہندی مقرر کی، اسی زبان میں حساب کتاب بھی رکھا اور یہ کام ہندو برہمنوں کے سپرد کیا گیا[1]۔

تخت نشینی کے تھوڑے ہی عرصے بعد ابراہیم نے اپنی تمام تر توجہ وجے نگر کے معاملات پر صرف کر دی جس میں اُسے اپنے مفاد اور کامیابی کا اچھا موقعہ ملا۔ اُس زمانے میں وجے نگر کے معاملات نہایت پیچیدہ تھے۔ دارالسلطنت میں بھوج ترل کی شخصیت غالب تھی۔ بھوج ترل اپنی حکمت عملیوں سے اپنے نابالغ بھتیجے (حکمراں) کا نگراں بن گیا تھا۔ اس کا مقابل رام راجہ تھا جس نے شاہی خاندان میں شادی کر لی تھی۔ اور سلطنت کے اعلیٰ مرتبہ کا ایک شخص تھا۔ بھوج ترل سے مقابلہ میں وہ خود بھی اپنا اقتدار حاصل کرنا چاہتا تھا۔ جب بھوج ترل کے دل میں بادشاہ بن جانے کا خیال موجزن ہوا تو اُس نے اپنے نابالغ بھتیجے کا نہایت بیدردی سے گلا گھونٹ دیا۔ بھوج ترل جیسے ظالم بیدرد کا یہ غیر معمولی فعل ہرگز ہرگز اس قابل نہ تھا کہ اُسے ہردلعزیزی حاصل ہوتی اور بنظر استحسان دیکھا جاتا، بلکہ یہ فعل اُس کی کامیابی کے لیے سدِ راہ ہو گیا۔ دربار کے تمام امراء اُسے حقارت کی نظر سے دیکھنے لگے اور اُن کی طبیعتیں اُس سے متنفر ہو گئیں۔ امراء نے رام راجہ سے درخواست کی کہ بھوج کے ان بیدردانہ مظالم کا [illegible]

۱ تاریخ فرشتہ حصہ سوم صفحہ ۸ - ۱۰۰ - بساتین السلاطین صفحہ ۴۹ ؛ واقعات تاریخ دکن؛ کیمبرج ہسٹری جلد سوم صفحہ ۴۲۹

خاتمہ کر دیا جائے۔ بھوج ترمل نے جب یہ دیکھا کہ امراء اور رعایا کی نفرت کا یہ عالم ہے کہ وہ بغاوت پر تیار ہیں اور اُس کے مقابلہ میں راجہ رام کو برسرِ اقتدار کرنا چاہتے ہیں تو اُس نے اپنے سفیروں کو پچاس لاکھ ہُن اور دوسرے بیش بہا قیمتی تحائف ابراہیم کے حضور پیش کرنے کے لیے بھیجا اور ابراہیم سے درخواست کی کہ وہ کسی نہ کسی طرح سے مدد اُس کی مدد اور اس آڑے وقت میں اس کی دستگیری فرمائے۔ بھوج نے اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ خود کو ابراہیم کا باج گزار بھی تسلیم کر لیا اور سلطانی فوج کے روزانہ سفر خرچ کے لیے تین لاکھ ہُن دینے پر رضامند ہو گیا۔ ابراہیم نے اسد خاں کے مطلق مشورہ سے بھوج کی اس درخواست کو منظور کر لیا۔ اپنی فوج کو ترتیب دے کر وجے نگر کا رخ کیا۔ جہاں نہایت عزت کے ساتھ ایک اعلیٰ فرماں روا اور حاکم کی حیثیت سے اس کا شاندار استقبال کیا گیا۔ اس طرح سے بھوج کو جب مسلمانوں سے تقویت ہو گئی تو رام راجہ اور اس کے ساتھی امراء کو کسی قسم کی ہمت نہ پڑی اور اُنھوں نے کوئی عملی کارروائی بھوج کے خلاف نہ کی بلکہ ہر دو بھوج کی اطاعت کا دم بھرنے لگے اور ایک ہندو سلطنت میں مسلمانوں کو اس طرح سے مداخلت کرنے کی خرابیوں پر باہم گفتگو کرنے لگے۔ جب بھوج ان لوگوں سے بالکل بے خوف ہو گیا، اُس نے خیال کیا کہ مجھے اب مزید امداد کی ضرورت نہیں ہے۔ اس نے مسلمانوں سے واپسی کی درخواست کی [illegible] لاکھ ہُن نقد اور [illegible] تحفے تحائف جن میں [illegible] ہاتھی اور کئی خوبصورت گھوڑے بھی شامل تھے ابراہیم کے حضور میں پیش کیے۔ ابراہیم خوش و خرم [illegible] اپنی فوج کے ساتھ بیجاپور واپس آیا۔[1]

ابراہیم کا واپس ہونا ہی تھا کہ رام راجہ اور اُس کے ساتھی دارالسلطنت کی طرف نہایت تیزی سے بڑھے اور فوج کو [illegible] کر کے بھوج کے خلاف برانگیختہ کیا۔ تمام فوج خاص راجہ اور بھوج سے منحرف ہو گئی۔ بھوج نے جب اپنے بچاؤ کی [illegible] سبھی کا یہ عالم دیکھا تو اُس نے اپنے تمام ہاتھیوں اور گھوڑوں کو بیکار کر کے خودکشی کر لی۔[2]

اس بغاوت کی خبر ابراہیم کو ملی۔ اُس نے اس سے فائدہ اٹھانے کا اچھا موقع دیکھ کر ادونی کا قلعہ فتح کرنا چاہا۔ یہ مہم اسد خاں کے سپرد کی گئی۔ اسد خاں نے اپنی فوج لیکر قلعہ کے سامنے پڑاؤ ڈال دیا چونکہ قلعہ کی محافظت کی کوئی کوشش نہیں کی گئی تھی اور نہ کسی بیرونی امداد کی کوئی امید تھی اس لیے عنقریب وہ [illegible] تسخیر ہو جاتا [illegible] رام راجہ اپنی انتہائی کوششوں سے دارالسلطنت میں امن و امان قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا [illegible] اپنے بھائی وینکٹادری کو فوج کا سپہ سالار بنا کر بھیجا۔ وینکٹادری

---

[1] بساتین السلاطین صفحہ ۵۰-۵۱۔ فرشتہ حصہ سوم صفحہ ۸۱-۸۲

[2] فرشتہ حصہ سوم صفحہ ۸۴-۸۵۔

نے مسلمانوں کو شکست دی اور قلعہ کو اپنے قبضہ میں کر لیا۔ فتح کی مسرت میں یہ لوگ اس قدر مدہوش ہوئے کہ ان کی مدہوشی سے اسد خاں نے فائدہ اُٹھایا اور اُس نے اچانک بجلی کی طرح سے ہندوؤں کے پڑاؤ پر حملہ کر دیا۔ سپہ سالار وِتّھل داس کو اچھی طرح سے بھاگنے کا موقع نہ ملا۔ اس لیے مجبوراً اُسے اپنے خزانے، اہل و عیال اور ہاتھیوں کو وہیں چھوڑنا پڑا۔ سپہ سالار کو اپنے اہل و عیال کی رہائی کی فکر دامنگیر ہوئی۔ اُس نے اپنے بھائی راجہ رام سے صلح کا مشورہ کیا جس نے اُسے صلح کرنے کی رائے دیدی۔ دونوں بھائیوں نے اسد خاں کو رشوت دے[1] کر استدعا کی کہ ابراہیم سے صلح کرا دی جائے۔ اسد خاں واپس چلا گیا۔ تاریخ فرشتہ میں صلحنامہ کے شرائط مذکور نہیں ہیں۔

اسد خاں نہایت مدبر، سیاست داں اور صاحب اثر تھا۔ اسی وجہ سے وہ دربار کے سب سے بڑے عہدہ پر ممتاز تھا۔ دوسرے امراء اُس سے حسد رکھتے تھے۔ اُنھوں نے اُس کے خلاف بادشاہ کو بھڑکانے کی کوشش کی اور عرض کیا کہ اسد خاں نے اس مہم میں ہندوؤں سے رشوت لی ہے۔ لیکن ابراہیم نے اِن حاسد امیروں کی ایک نہ سُنی اور قلعۂ آدونی کی واپسی پر اُسے سلطنت کا وزیر اعظم اور فوج کا سپہ سالار مقرر کر دیا۔

اسد خاں کی اس عزت افزائی سے اُسکے حاسدوں کو سخت تکلیف ہوئی، اور وہ اُس کی مخالفت پر اور زیادہ آمادہ ہوگئے۔ دربار میں خفیہ طور پر خبریں مشہور ہوگئیں کہ اسد خاں، برہان نظام شاہ کا ہم مذہب ہونے کی وجہ سے اپنی جاگیر[2] بلگام اُسے دینا چاہتا ہے۔ اس خبر سے بادشاہ کو اسد خاں کی دغابازی اور مکاری سے قلعہ کی واپسی کا پورا پورا یقین ہو گیا۔ اُس نے اپنے معتمدین کو جمع کیا اور اُن سے مشورہ کیا کہ اسد خاں کو اپنے قبضہ میں رکھنے کی کونسی یقینی تدبیر ہو سکتی ہے۔ معتمدین نے یہ صلاح دی کہ شہزادہ علی کے ختنہ کی تقریب میں اسد خاں کو مدعو کر کے دارالسلطنت میں نظربند کر لیا جائے۔ لیکن اسد خاں معمولی دماغ کا آدمی نہ تھا وہ نہایت سیاست داں اور چالاک تھا۔ اُس کے مخالفوں کا اُسے اپنے جال میں پھنسا لینا کوئی معمولی کام نہ تھا۔[3]

۱۵۴۰-۴۱ء میں برہان نظام شاہ کو یہ خبر ملی کہ سنی ابراہیم عادل شاہ اور اُس کے مربی اور شیعہ سپہ سالار اسد خاں میں باہم بدگمانیاں پیدا ہوگئی ہیں۔ اس سے وہ دلیر ہوا اور اُس کی ہمت بڑھی، وہ امیر برید سے

---

[1] فرشتہ صفحہ ۸۲ - ۸۶ بساتین السلاطین صفحہ ۵۳ - ۵۶

[2] ملاحظہ ہو تاریخ فرشتہ صفحہ ۸۶

[3] کیمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد سوم صفحہ ۴۴۰

[4] بساتین السلاطین صفحہ ۵۶ - فرشتہ جلد سوم صفحہ ۸۶ - ۸۸

مل گیا اور اسد خاں کے خلاف اُس نے جھوٹی خبریں مشہور کر دیں۔ امیر علی برید اور برہان نظام شاہ دونوں نے مل کر ابراہیم کے مقبوضات پر حملہ کر دیا اور شولاپور کے پانچ اضلاع چھین کر خواجہ جہاں دکنی کے ملازموں کو دیدیے پھر بلگام کا رخ کیا۔ اسد خاں اپنے آقا کا ایک وفادار خادم تھا۔ وہ حملہ آوروں کا ایسی حالت میں مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ اپنی حکمت عملی سے بظاہر برہان کے مطالبہ کو پورا کرنے کے لیے چھ ہزار سواروں کے ساتھ اُس سے مل جانے پر مجبور ہو گیا۔ اس کے سوا اُسے کوئی چارہ نہ تھا۔ ابراہیم کو جب یہ معلوم ہوا کہ اس طرح سے برہان کی طاقت بڑھ گئی تو وہ بیجاپور سے گلبرگہ بھاگ گیا۔ برہان اور امیر علی برید نے مل کر بیجاپور کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔[۵۵]

اسد خاں بظاہر ابراہیم کے دشمنوں سے دوستی کا دم بھرتا رہا لیکن حقیقت میں وہ اپنے مالک کا ہمیشہ وفادار بنا رہا۔ اُس کو اپنے آقا کی یہ بُری حالت اور ذلت دیکھ کر دل ہی دل میں سخت صدمہ ہوا اور اُسے اپنی حکمت عملی سے خفیہ طور پر اپنے معتمد خاص علی محمد کرشی کو دریا عماد شاہ کے پاس بھیجا اور اُسے ابراہیم کی مدد کے لیے بلایا۔ اُس سے یہ وعدہ کر لیا کہ جیسے ہی وہ سرحد پر پہونچے گا وہ اُس سے مل جائے گا۔ اور اُس کا ساتھ دے گا۔ عماد شاہ نے اسد خاں کی یہ التجا قبول کر لی اور وہ فوراً گلبرگہ کی طرف بڑھا۔ اب برہان اور امیر علی برید نے دار السلطنت عادل شاہی کا محاصرہ اُٹھا لیا اور قرب و جوار کے مضافات کو لوٹتے ہوے دونوں برار کی فوج کی طرف بڑھے کہ ایسا نہ ہو وہ ابراہیم سے مل جائے۔ اسد خاں اپنے معاہدہ کے مطابق دشمنوں کا ساتھ چھوڑ کر اپنے ساتھیوں کے ساتھ عماد شاہ سے جا ملا۔ اور اُس سے درخواست کی کہ وہ اسکے آقا ابراہیم سے مصالحت کرا دے۔ عماد شاہ نے اسد خاں کی سچائی اور راستبازی کا یقین کر کے دل سے اُس کا ساتھ دیا اور ابراہیم کو اس کی غلطی سے متنبہ کر کے خادم و مخدوم کی اس بدگمانی کو دُور کر دیا جو حاسدوں نے پیدا کر دی تھی اس تجدید اتفاق نے خادم و مخدوم کے اُلجھے ہوے معاملات کو بالکل سُلجھا دیا۔ غنیم نے بہت بُری طرح سے شکست کھائی۔ اسی اثنا میں امیر برید کی اچانک وفات ہو گئی (۱۵۴۲ء) اور برہان کو مجبوراً ابراہیم سے صلح کرنی پڑی۔ اُس نے شیخ طاہر کو ابراہیم کی خدمت میں صلح کے لیے بھیجا جس میں یہ طے پایا کہ شولاپور اور اُس کے پانچوں ضلعے ابراہیم کو واپس دیے جائیں اور اُن اضلاع پر برہان کا کوئی استحقاق نہ ہو۔[۵۶]

برہان نظام شاہ کو اس شکست کا بیحد افسوس ہوا جس میں اُس نے اپنی پوری حکمت عملی سے کام لیا تھا۔

---

[۵۵] فرشتہ۔ صفحہ ۸۹-۹۰ بساتین السلاطین صفحہ ۵۶-۵۷ - بشارکل لینڈ مارکس آف دی ڈکن صفحہ ۳۸-۳۹-۹۲

[۵۶] بساتین السلاطین صفحہ ۵۷-۵۸ - فرشتہ جلد ۲ صفحہ ۹۰-۹۲

[illegible] کی عمر کی [illegible] میں [illegible] نے بیجاپور [illegible] کا [illegible] اور اس کے اضلاع
[illegible] ظاہر [illegible] قطب شاہ کے دربار میں سفیر
[illegible] قطب شاہ اور رام راج کو شاہ بیجاپور کی مخالفت پر متفق کر لے۔ [illegible] میں [illegible] ایک سیاسی
[illegible] دکن سے گولکنڈہ
[illegible] شاہی [illegible] تھے کہ یہاں
عادل شاہی [illegible] میں [illegible] کرتے ہوئے کئی مرتبہ
عادل شاہی فوجوں [illegible] پر قبضہ کر لیا اور
ایک [illegible] کے قریب
[illegible] کا محاصرہ کر لیا۔ [illegible] کے خلاف کھینچا۔

ابراہیم عادل شاہ [illegible] تھا کہ [illegible] کیا کرنا چاہیے
[illegible] تھا [illegible]
[illegible] مقابلہ
کیا جائے۔ چنانچہ ابراہیم [illegible] کے
لیے [illegible]
[illegible] شاہ [illegible] سے بھی
[illegible] جمشید قطب شاہ گولکنڈہ [illegible]
[illegible] میں [illegible] جمشید کا [illegible] ظاہر ہے کہ اس فتح
کے بعد [illegible] آسان تھا۔ [illegible] بیجاپور کے خلاف سیاسی
[illegible]

ابراہیم [illegible] صحیح [illegible] دولت [illegible] قائم نہیں
[illegible] تھا۔ [illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible] ۵۵ [illegible]
[illegible] صفحہ ۱۲۵

معلوم ہوتی رہیں۔ ابراہیم نے عاجز آکر دریا پار کرکے دشمن کو زبردستی لڑنے پر مجبور کیا۔ برہان کو شکست[1]
فاش ہوئی جس میں اس کا تمام ساز و سامان اور بہت سی قیمتی چیزیں ابراہیم کے ہاتھ لگیں۔ برہان شاہ کو صلح کی
درخواست کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ در حقیقت [illegible]
تک [illegible] علیحدگی اختیار کر لی تھی اور کرنا چاہتا تھا اور جس نے [illegible] خلاف برہان کو مدد دینے کی
اطلاع بھی کر دیا تھا۔ برہان سے [illegible] ابراہیم کو کوئی اعتراض
نہ ہوگا اور اس بات کا وعدہ بھی کیا کہ اگر ابراہیم وسطے نگر میں سے مقامات حاصل کرے تو [illegible]
روک نہ کرے گا۔ ابراہیم کو پورا اختیار ہوگا کہ جس قدر [illegible] چاہے کو ڈوں سے چھین لے۔ کوئی [illegible] ہوگا۔[2]
پھر بھی اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ [illegible]
[illegible] اور گنڈ مرکے قلعے چھین لیے۔[3]

اس کے بعد ابراہیم کی حالت [illegible] واقع ہوا۔ اس کی طبیعت یکایک ظالمانہ ہو گئی [illegible]
جا سکتے کہ اس فوری تبدیلی کی کیا وجہ تھی۔ ظاہر ہے کہ اس کا یہ سبب ہو کہ جو خوف اس نے امیروں کی
[illegible] کے لیے [illegible] تھی اس نے اچھے [illegible] نام [illegible] ابراہیم کو اس کی دغابازی کا شک
ضرور تھا۔ ممکن ہے کہ اسے یہ خیال بھی ہوا ہو کہ [illegible] پے در پے حملوں کے پردے میں امیروں کی بھی
کچھ سازش ضرور ہے۔ بہر حال اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ابراہیم نے اپنے افسروں کو نہایت
بیدردی سے قتل کرنا شروع کر دیا۔ [illegible] چالیس ممتاز ہندو اور ستر مسلمانوں
کو قتل کرا دیا۔[4] اور جب [illegible] ہوئے تو انہوں نے اس بات کی سازش کی کہ اسے تخت سے
اتار دیا جائے اور اس کی جگہ اس کے بھائی عبداللہ کو تخت پر بٹھایا جائے۔ مگر قبل اس کے کہ ان کا یہ
منصوبہ پورا ہو بادشاہ کو اس کی خبر لگ گئی [illegible] اس کا جنون اور بھی مشتعل ہوا۔ اس نے اب ہر درباری
کو جس پر ذرا بھی سازش میں شرکت کا شبہ ہوتا تھا قتل کرانا شروع کر دیا۔ شہزادہ عبداللہ گوا بھاگ گیا۔
بہت سے امراء دارالسلطنت چھوڑ کر چلے گئے کیونکہ اب کسی کو یہ بھی معلوم تھا کہ بادشاہ کے ظلم کا شکار اب کون
بنے گا۔ بیچارہ اسد خاں بھی بیلگام چلا گیا۔ کیونکہ بادشاہ کو کچھ اس کی طرف سے شک پیدا ہو گیا تھا۔[5]

---

[1] بساتین السلاطین صفحہ ۲۰ - ۲۱ - فرشتہ جلد ۳ صفحہ ۹۴ - ۹۵

[2] برہان مآثر - صفحہ ۵۰

[3] کیمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد [illegible] ۴۳۱

[4] فرشتہ - جلد ۳ - صفحہ ۹۵ - ۹۶

[5] بساتین السلاطین صفحہ ۵۱ - ۵۲ - [illegible] صفحہ ۲۲ - ۲۳ - فرشتہ جلد ۳ صفحہ ۹۶ - ۹۸

شہزادہ عبداللہ اپنے بھائی کے ظالمانہ برتاؤ سے عاجز آکر گوا کو چلا گیا تھا۔ بیجاپور کے بہت سے امراء نے مدد حاصل کرنے کی امید میں عبداللہ کو ترغیب دی کہ برہان نظام شاہ اور جمشید قطب شاہ سے خط و کتابت کی جائے۔ ان بادشاہوں نے بیجاپور کی پریشان اور تباہ حالت دیکھ کر اور اسد خاں کے تنفر کو معلوم کر کے وعدہ کیا کہ وہ عبداللہ کو تخت پر بٹھانے میں ضرور مدد دیں گے۔ انھوں نے گوا کے پرتگالیوں کو اس مضمون کا خط لکھا کہ ابراہیم عادل شاہ کے مظالم کی وجہ سے نجومی پیشین گوئی کرتے ہیں کہ اُسکی سلطنت میں ایسی بدامنی پھیلے گی جسے وہ رفع نہ کر سکے گا۔ اس لیے اُنکی دلی خواہش ہے کہ شاہزادہ عبداللہ کو بھیجدیا جائے۔ تاکہ اُسے بھائی کی جگہ پر تخت نشین کر دیا جائے۔ پرتگالی ان کا ساتھ دینے پر رضامند ہوگئے۔ اور انھوں نے کہا کہ اس بات کا یقین کی امید اسی وقت ہو سکتی ہے جبکہ اسد خاں پورے طور پر اُن کا ساتھ دے۔ مگر اسد خاں کی یہ حالت تھی کہ خواہ اُسے کتنی ہی تکلیف اٹھانی پڑتی اور اشتعال دیا جاتا لیکن وہ اپنے مالک کا ساتھ چھوڑنے کے لیے ہرگز تیار نہ تھا۔ برہان اور جمشید خود بیجاپور کی طرف بڑھے۔ اسد خاں نے اُن کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ اسد خاں گھبراتا تھا کہ ایسا نہ ہو کہیں سلطنت کو یہ خود آپس میں تقسیم کر لیں جب یہ اپنی سلطنتوں کو واپس گئے تو پرتگالیوں نے بھی مدعی شہزادہ کی کوئی مدد نہ کی۔ شہزادہ کے مددگاروں کی جماعت بیجاپور اور گوا دونوں جگہ منتشر ہوگئی۔ کالکن نے پرتگالیوں سے بیزار ہو کر ابراہیم کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ ابراہیم نے فوج کثیر سے مغربی گھاٹ طے کر کے بغاوت کو فرو کیا۔ اسد خاں کی اپنے آقا سے مصالحت ہوگئی۔ وہ آخری وقت اپنے وفادار نوکر کو عالم نزع میں بستر مرگ پر دیکھنے کے لیے روانہ ہوا۔ لیکن ابراہیم کے بیلگام پہونچنے سے پہلے جنوری ۱۵۴۶ء میں اسد خاں کا انتقال ہو گیا۔[1]

بیجاپور اور گوا میں جو مخالفت عبداللہ کی وجہ سے ۲۲ اگست ۱۵۴۸ء کو پیدا ہوگئی تھی وہ ابراہیم عادل شاہ اور پرتگالی گورنر گارسیا ڈی سا کے درمیان ایک صلحنامہ کے ذریعہ سے دور کی گئی۔[2]

برہان نظام شاہ نے بیجاپور کے خلاف ۱۵۴۸ء کے اواخر یا ۱۵۴۹ء کے اوائل میں پھر ایک مرتبہ نبرد آزمائی کی۔ وہ شہزادہ عبداللہ کو جمشید قطب شاہ اور پرتگالیوں کی مدد سے ابراہیم کے تخت پر بٹھانے میں ناکام رہا۔ برہان نظام شاہ کی کوششوں کی ناکامی کی اصلی وجہ اسد خاں کی راسخ وفاداری تھی۔ چونکہ اسد خاں کی وفات کی وجہ سے اُس کے آقا ابراہیم کی بہبودی کی کوئی فکر کرنے والا نہ تھا اس لیے برہان نے اپنی پرانی کوشش کے ارادہ کے لیے موقع غنیمت جانا۔ اُس نے اپنے ارادہ کو مد نظر رکھتے ہوئے رام راجہ کے پاس سفیر بھیج کر

[1] فرشتہ - جلد سوم - صفحہ ۹۸-۹۹ کیمبرج ہسٹری آف انڈیا - جلد سوم صفحہ ۴۴۲ - بساتین السلاطین صفحہ ۸۲-۸۳

[2] فاریا - جلد دوم حصہ ۳ ۲۴۰-۲۴۱

آپس میں اتحاد و دوستی کا اعتراف کیا۔ ابراہیم کو جب اس نامہ و پیام اور اتحاد و دوستی کی خبر معلوم ہوئی تو اُس نے بیجاپور میں رام راج کے سفیر [illegible] سے اپنی ناراضی کا اظہار کیا۔ سفیر اپنی جان کے خوف سے فوراً وجے نگر واپس گیا۔ اور ابراہیم کے اس طرز عمل سے [illegible] رام راج بہت غصہ ہوا اور اُس نے ابراہیم و احمد نگر کے خلاف [illegible] ایک خط لکھ کر حسب معاہدہ عادل شاہی سلطنت پر فوج کشی [illegible] کلیانی کے خلاف [illegible] ابراہیم اپنی ایک [illegible] مملکت کو بچانے والوں کے مقابلے [illegible] ہوئی اور کلیانی برہان کے قبضہ میں آگیا۔

ابراہیم نے کلیانی فتح کرنے کی پھر جلد تیاری کی۔ برہان کو جب یہ خبر ہوئی تو اُس نے رام راجہ کے پاس ایلچی بھیجے۔ رام راجہ نے [illegible] کے قریب [illegible] ملاقات کرنی چاہی تاکہ [illegible] آئندہ کے لیے ایک نقشہ عمل مرتب کر لیا جائے۔ [illegible] نے ابراہیم کی توجہ [illegible] سرحدی جانب منعطف کر دی۔ رائے چور اور مدگل دشمنوں کی متفقہ قوت کا مقابلہ نہ کر سکے اس لیے ان کے قبضہ میں آگئے۔ پھر بھی برہان کو تسکین نہ ہوئی وہ ابراہیم سے سخت متنفر تھا۔ ان دونوں [illegible] اپنے [illegible] سلطنت بیجاپور کے محاصرہ کے لیے تیار کر لیا [illegible] احمد نگر اور وجے نگر کی فوج لے [illegible] احمد نگر [illegible] قبضہ کر لیا۔ ابراہیم نے بھی قلعہ کی حفاظت [illegible] سے کام نہیں لیا [illegible] دلیری کا ثبوت دیا۔ اسی طرح سے محاصرہ جاری رہا۔ ابراہیم کی خوش قسمتی تھی کہ [illegible] بیمار پڑ گیا [illegible] احمد نگر واپس ہونے پر مجبور ہوا۔ اور وہیں ۳۰ دسمبر ۱۵۵۳ء کو اسکی وفات ہوئی۔[6]

برہان کی وفات کے بعد ابراہیم کو اُمید تھی کہ اب اُسے احمد نگر سے فرصت مل جائیگی۔ چنانچہ برہان کے جانشین حسین نظام سے ایک مرتبہ اُس کی دوستانہ ملاقات بھی ہوئی مگر یہ سمجھوتا زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکا کیونکہ حسین نظام شاہ کے کئی بھائی اپنے باپ برہان کے انتقال کے بعد بھاگ گئے تھے اور اُنھوں نے ابراہیم عادل شاہ کے یہاں پناہ لی تھی۔ یہ لوگ [illegible] سلطنت میں احمد نگر کے خلاف سازشیں کر رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ۱۵۵۵ء میں خواجہ جہاں [illegible] (جس پر نظام شاہ نے حملہ کیا تھا کیونکہ وہ [illegible] شاہزادہ کے حقوق کی تائید کرتا تھا) بیجاپور بھاگ آیا۔ اسی زمانے میں سیف عین الملک نے برار چھوڑ دیا [illegible] ابراہیم عادل شاہ کے یہاں پناہ لی تھی ابراہیم نے اُسے سابق

---

[5] فرشتہ - جلد سوم - ۱۲۰ - ۱۴۲ اور ۲۳۴

[6] برہان مآثر صفحہ ۲۵۸ فرشتہ جلد سوم ۱۰۲ - ۱۰۵ و ۲۳۸ - کیمبرج ہسٹری جلد سوم ۴۴۲

اسد خاں لاری کی جاگیر تھا۔ جس کی وجہ سے وہ بیجاپور کا بڑا دولتمند اور طاقتور امیر بن گیا۔ دونوں پناہ گزینوں نے ابراہیم کو اپنے بھتیجے علی کی تائید پر آمادہ کر لیا۔ یہ حسین کا سوتیلا بھائی بھی تھا۔ اور ابراہیم کے دربار میں پناہ گزین تھا۔ شہزادہ کو اپنے سوتیلے بھائی کی سلطنت پر لشکر کشی کے لیے ایک چھوٹی سی فوج دی گئی۔ اُدھر ابراہیم نے شولاپور کا محاصرہ کر لیا۔ مگر علی کو خلاف توقع بہت مایوسی ہوئی اور حسین دریا عماد شاہ کے ہمراہ شولاپور پہونچا۔ ابراہیم نے سیف عین الملک کو مقدمۃ الجیش کے ہمراہ بھیجا تاکہ وہ حسین اور دریا عماد شاہ کو آگے بڑھنے سے [illegible] حسین کی تمام فوج پر حملہ کر دیا۔ اُس کی تھوڑی سی فوج [illegible] ابراہیم کو یہ خبر دی کہ اُس نے سیف عین الملک کو [illegible] حسین [illegible] شاہ [illegible]

ابراہیم اس خبر کی تصدیق کیے بغیر بیجاپور کی طرف [illegible] کے ہاتھ جانے کی وجہ یہ بھی تھی کہ اُسے خبر ملی تھی کہ سیف عین الملک جو [illegible] دشمنی کی نیت سے اُس کا پیچھا کر رہا ہے۔ حسین جس کی فوج نے کافی [illegible] اٹھائی تھی [illegible] ابراہیم کے لیے یہ جنگ بالکل بیکار ثابت ہوئی۔[1]

ابراہیم کی ذلت کا پیمانہ [illegible] سیف عین الملک نے بغاوت شروع کر دی۔ ہم ابھی دیکھ چکے ہیں [illegible] ابراہیم سے [illegible] کچھ عرصہ بعد عین الملک بھی دارالسلطنت پہنچا اور بادشاہ سے ملاقات کرنی چاہی [illegible] ابراہیم یہ سمجھتے ہوئے کہ سیف اس کا تعاقب کر رہا ہے قلعہ بند ہو گیا اور اس سے ملنے سے انکار کر دیا۔ اُسکے قاصد کے ساتھ برا برتاؤ کیا گیا اور سیف کو بتا دیا گیا کہ اگر وہ باغی نہیں ہے تو کچھ [illegible] جس سے کوئی فائدہ کی امید نہیں کی جا سکتی۔ عین الملک نے اس برتاؤ کی وجہ سے متنفر ہو کر سلطنت بیجاپور میں ایک باغی کی حیثیت اختیار کر لی کیونکہ وہ اب بھی اپنے [illegible] چاہتا تھا۔ اُس نے [illegible] ان کی طرف رُخ کیا۔ [illegible] اپنی فوج کی تنخواہ دینے لگا۔ اُس نے شاہی فوج پر کئی مرتبہ فتوحات حاصل کیں [illegible] جو اس وقت گوا میں موجود تھا۔ اعانت بھی کر دی۔ [illegible] سواروں کی فوج کو جو اُس کے خلاف بھیجی گئی تھی شکست دی۔ [illegible] کو جو دلاور خاں کی

[1] برہان مآثر صفحہ [illegible] فرشتہ جلد سوم [illegible] جلد سوم صفحہ ۴۲۳

سرکردگی میں تھی شکست دی۔ حبشی سردار اور خود ابراہیم بیجاپور بھاگنے پر مجبور ہوئے۔ عین الملک نے اُن کا تعاقب کیا۔ ابراہیم جب بہت تنگ اور پریشان ہو گیا تو اُس نے امراے برار سے امداد مانگی۔ رام راجہ نے اپنے بھائی وینکٹا دادری کو پندرہ ہزار سواروں کے ہمراہ اس کی مدد کے لیے بھیجا۔ بعد میں عین الملک نے ہندو فوج پر شب خون مارا مگر شکست کھائی کیونکہ ہندو ہوشیار تھے۔ عین الملک کی فوجیں قریب قریب بالکل برباد ہو گئیں اور وہ اپنے بھتیجے صلابت خاں کے ساتھ احمدنگر کی سرحد پر بھاگ گیا۔ اور التجا کی کہ اسے شاہی ملازمت میں دوبارہ داخل کر لیا جائے۔ حسین نظام شاہ نے دھوکا دینے کی غرض سے اُس کا جواب اثبات میں دیا۔ لیکن جب عین الملک حاضر ہو کر آداب شاہی بجا لایا تو اُس نے اُسے قتل کرا دیا[1]۔

عین الملک کی بغاوت کے زمانہ میں شہزادہ عبد اللہ نے جو اس وقت گوا میں پرتگالیوں کی حمایت پر اعتماد کرتے ہوئے ایک مرتبہ پھر اپنے بھائی کے تخت کا دعوے کیا۔ اُسے پرتگالیوں نے بھی مدد دی۔ عین الملک کی بغاوت کے ساتھ ساتھ عبد اللہ نے اپنے کو شاہ بیجاپور مشہور کر دیا۔ دو ہزار سواروں اور تین ہزار پرتگالی پیدلوں کے ہمراہ عبد اللہ شاہی چوکی (پونڈا کا قلعہ) پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا۔ اُسے ایک پرتگالی افسر نے تخت کر کے خود بیجاپور کا رخ کیا۔ بالآخر ابراہیم نے اُسے شکست دی اور وہ قید کر کے قتل کر دیا گیا[2]۔

ان تمام حالات کے سدھرنے کے بعد ابراہیم عادل شاہ شراب نوشی اور عیاشی کی زیادتی کی وجہ سے ایک پیچیدہ اور مہلک مرض میں مبتلا ہو گیا۔ اُس نے اپنے دوران علالت میں بہت سے طبیبوں کو جو اُس کے علاج میں ناکامیاب ہوئے قتل کرا دیا اور بعض کو ہاتھیوں سے کچلوا کر مروا ڈالا۔ جو طبیب باقی رہ گئے تھے وہ بیچارے اپنی جان لے کر حدود سلطنت سے باہر نکل بھاگے۔ آخر کار طبیبوں کے چھوڑ دینے پر ۱۵۵۷ء میں اس کی وفات ہوئی۔ اور اپنے آبا و اجداد کے مزارات کے قریب دفن کیا گیا[3]۔

---

[1] بساتین سلاطین صفحہ ۵۵ - ۵۶ فرشتہ جلد ۳ - ۱۰۷ - ۱۱۰ ہسٹاریکل لینڈ مارکس آف دی ڈکن صفحہ ۹۲
کیمبرج ہسٹری آف انڈیا صفحہ ۴۴۳ - ۴۴۴

[2] فاریا حصہ دوم باب ۲ کیمبرج ہسٹری جلد سوم صفحہ ۴۴۳

[3] فرشتہ جلد ۳ - صفحہ ۱۱۱ - ۱۱۲

قائم

(جناب مولوی محمد یحییٰ صاحب بی اے رنگ ساز پور (دہلی))

آپ کا نام قیام الدین اور قائم تخلص تھا۔ اگرچہ مولد چاند پور ضلع بجنور تھا مگر بسلسلۂ ملازمت زندگی کا بیشتر حصہ دلی میں بسر ہوا۔ فارسی استعداد اچھی معلوم ہوتی ہے کیونکہ کلام میں فارسی تراکیب دلپسند انداز کے ساتھ پائی جاتی ہیں۔ اس وقت دلی میں شعر و سخن کا کمال کا چرچا تھا۔ اس سے قائم کو بھی شعر کہنے کا شوق پیدا ہوا۔ پہلے خواجہ میر درد سے اصلاح لی۔ بعد میں مرزا سودا سے تلمذ ہوا۔ اور فن شاعری میں نام پیدا کیا۔

دلی کی تباہی کے بعد اپنے وطن واپس آئے۔ دو کچھ روز نواب محمد یار خاں کے ساتھ ٹانڈہ میں رہے۔ اسکے بعد رامپور چلے گئے۔ تھوڑے دن وہاں بسر کیے۔ بعد ازاں لکھنؤ گئے۔ وہاں ... سے ناخوش اپنے وطن کے عامل کے پاس چلے گئے۔ ہو سکے اور ملکیتیں جو ضبط ہو گئی تھیں ان کو پھر بحال کرایا۔ لیکن وہاں سے بھی طبیعت اچاٹ ہوئی اور رامپور چلے گئے اور وہیں ۱۲۰۸ھ میں انتقال فرمایا۔ علاوہ دیوان کلیات کے اردو شعراء کا تذکرہ بھی فارسی میں تحریر فرمایا ہے جس کا نام مخزن نکات ہے۔ مجموعہ نغز میں لکھا ہے کہ قائم امروہہ کے قاضی مقرر کیے گئے تھے اور اسی عہدۂ قضا پر قصناتی۔

کلام پر تبصرہ آزاد نے آب حیات میں اس باکمال شاعر کو مرزا سودا کے تحت حاشیے پر جگہ دی ہے ذرا چند سطریں ملاحظہ ہوں :-

"یہ صاحب کمال چاندپور کے رہنے والے تھے مگر فن شعر میں کامل تھے۔ ان کا دیوان ہرگز میرزا کے دیوان سے نیچے نہیں رکھ سکتے۔ مگر اپنے اقبال کا دو کیا کہئے شہرت نہ پائی"

معلوم ہوا کہ حضرت آزاد شہرت کے پیچھے پیچھے ہیں۔ چونکہ قائم نے شہرت نہ پائی آپ نے بھی اس کو زمرۂ شعراء سے خارج کر دیا۔ کیا سخن فہمی اسی کا نام ہے؟ سبحان اللہ

نیز یہ بھی خیال غلط ہے کہ کلام قائم کو شہرت نصیب نہ ہوئی۔ آپ کے یہ شعر تو اب تک زبانزد خاص و عام ہیں:

قسمت کو دیکھ ٹوٹی ہے جا کر کہاں کمند   کچھ دور اپنے ہاتھ سے جب بام رہ گیا

درد دل کچھ کہا نہیں جاتا   آہ چپ بھی رہا نہیں جاتا

جب شیفتہ کے زمانہ تک بعض لوگ قائم کو سودا کا ہم پلہ سمجھتے تھے تو یہ کہنا کہ کلام قائم کو شہرت نہ نصیب ہوئی

بیجا ہے۔ چنانچہ شیفتہ نے اس عام خیال کی یہ کہکر تردید کی ہے کہ

"آنچہ بعض ناشناسان سخن بہ کلامِ خود اشتہار دادن حرف دردوانگی شان از جنون است

بڑے بڑے اُستادوں کا بھی یہی حال ہے کہ ان کا ایک آدھ شعر ضرب المثل ہو جاتا ہے۔ نہ کسی کا ہر کلام ضرب المثل بنتا ہے اور نہ شہرت پذیر ہوتا ہے۔ عوام سخن فہم نہیں ہوتے۔ خواص کو چاہیے کہ جو کلام انھیں پسند آئے اُس کی تعریف کریں اور جو ناپسند ہو اُس کی بُرائی کریں۔ ورنہ بُرے بھلے میں تمیز کرنا دشوار ہو جائیگا۔ اگر محض شہرت کو اچھے کلام کا معیار رکھا جائے تو بہت سے بے کمال اُستاد بن جائیں گے اور بڑے بڑے اُستاد شعراء کی فہرست سے خارج ہو جائیں گے۔ آزاد سے کوئی پوچھے کہ میر ضاحک کا آپ کو صرف ایک شعر ملا اور آپ نے اُن کا حال درج کتاب کیا۔ برخلاف اس کے نظیر کا کلام کافی مشہور ہے اور انکا کلیات بھی دستیاب ہو تاہے لیکن آپ نے انکا ذکر حاشیہ پر بھی نہ کیا۔ یہ کیوں؟ انصاف، انصاف!!

در اصل قائم کا تخلص پہلے ... تھا بعد میں اُس نے ہدایت اللہ خاں ہدایت سے اصلاح لی۔ بعد ازاں خواجہ میر درد کا شاگرد ہوا۔ اسکے بعد مرزا سودا سے مشورہ سخن کرنے لگا۔ اور ہر ایک استاد اِن فن سے اُس کا بگاڑ ہوا یہاں تک کہ ہدایت کی ہجو میں ایک قطعہ کہا اور سودا نے قائم کی ہجو کہی تو مرزا سودا سے جاکر معافی مانگی اور قائم کی بجائے مرزا نے قوقی تخلص ایک فرضی شاعر کا نام لکھدیا۔ (تذکرہ حکیم قدرت اللہ خاں قاسم)

شیفتہ گلشن بیخار میں تحریر فرماتے ہیں :-

"قائم تخلص شیخ محمد قیام الدین از ساکنان چاند پور و رشید تلامذہ مرزا رفیع سوداست۔ شاعر ست خوش گفتار بلند پایہ موزونیت طبیعتش ... ہمہ حال قائم در سخن شگفتہ دل پسند اند گو بپایہ سودا مباش اما طبع اصناف او را میسر است۔ لاسیما در قطعات و رباعیات معانیے کہ بدولت بر شوخی نمائش کند از طبعش تراویدہ ..."

صاحب طبقات الشعرا لکھتے ہیں :-

"بسیار آدم با مزہ واہل درد، متواضع حلیق مہذب صورت، پاکیزہ سیرت، خوش مقال و در سخنوری ہمتا از خوش خیالان زمان و بلند نظران جہان فکر رسا دارد و در نازک خیالی معنی یابی داد سخنوری میدہد"

مصحفی اپنے تذکرہ میں فرماتے ہیں :-

"در پختگی کلام وحسنِ مصرع غزل درد بود قصیدہ و مثنوی وغیرہ موافق زمانہ روش بروش استاد راہ میرفت بلکہ در بعضے مقام رجحان نیز جست"

ہمارے پیش نظر قائم کا وہ مختصر مجموعہ کلام ہے جو حسرت موہانی نے شائع کیا ہے۔ اُس میں تقریباً ایک ...

اشعار غزل کے ہونگے [illegible] ایک قصیدہ کے بھی چند اشعار درج ہیں۔ دیگر اصناف سخن کے متعلق تو ہم کوئی رائے ظاہر نہیں کر سکتے اور الا [illegible] دیگر تذکرہ نویسوں کی رائے کو تسلیم [illegible] سبب [illegible] کے متعلق ہم اپنی رائے دے سکتے ہیں جو درج ذیل [illegible]۔

تینوں [illegible] غزلوں کے پڑھنے کے بعد طبیعت نے جو [illegible] یا [illegible] کہ قائم کو شمار استادوں میں ہونا چاہیے۔ چنانچہ اسی معیار سے بقیہ غزلیات دیکھی گئیں اور [illegible] ہے کہ آپ کے طرز ادا اور مضامین کی جلوہ گری اور فارسی تراکیب کی دلکشی آپ کو کسی استاد کے پیچھے بیٹھنے نہیں دیتیں۔ اگرچہ تشبیہات معمولی ہیں لیکن سلیقہ کے ساتھ بندھی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ قائم اپنا مرتبہ شاعری خود بھی بلند سمجھتے تھے۔ چنانچہ حسب ذیل اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے عہد [illegible] سودا کو جو استاد تھے اپنے سے زیادہ نہیں سمجھتے تھے اور میر کے تو مقابل ہونا تو [illegible] سکتے ہیں البتہ سودا کا ادب کرتے ہیں:-

اے گردش [illegible] تری [illegible] | [illegible] سودا [illegible]
سودا تو [illegible] | [illegible] ایک [illegible]
قائم [illegible] | [illegible] سودا

قائم جو کہیں ہیں فارسی یار | اس سے تو یہ ریختہ ہے بہتر
جیسے [illegible] قائم کے ہو کیونکر سخن [illegible] دل کا سبز | [illegible] کے خوش [illegible] فرہاد داغ
قائم تو بھی [illegible] کے [illegible] ریختہ | [illegible] حضرت [illegible] کی طرف
میرا [illegible] کہاں [illegible] چمن میں | [illegible] طرز سخن میں
قائم یہ فیض صحبت سودا [illegible] | طرز [illegible] کہیں
آج قائم [illegible] شعر [illegible] | [illegible] ہے
قائم میں [illegible] کیا ریختہ ورنہ | اک بات [illegible] زبان دکنی تھی
قائم میں [illegible] تھا چھیت | [illegible] مجھے

بہرحال قائم کے کلام سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ آپ یقیناً علم استادی بلند کیے ہوئے ہیں۔ قائم کے اشعار میں ایسی [illegible] ہے کہ خود بخود دل ادھر کھنچا چلا جاتا ہے۔ روانی اور سلاست کے علاوہ ترکیب شعر کی چستی اور مضمون کی [illegible] دونوں آپ [illegible] کہنے پر مجبور کرتی ہیں۔

[illegible] قائم کی [illegible] ترکیب جو [illegible] تشبیہ [illegible] درج کی جاتی ہیں۔
[illegible]
[illegible] نسیم فروش، پریشاں نظری (یہ ترکیب میر تقی میر کے یہاں بندھ چکی ہے)

اسناظر

جلوہ جا بجا ہے اس بت کے زبان کا
نہ پہانہاں نظروں مجرم ہے مینا ئی کا

پوپ بکرم خوردہ، ستم ظریف، یک سرہزار سودا، مقتضائے سن شباب، خانہ برانداز خندا بیستا دہ خون ریز قتل نیت۔ زلف شوخ سر طولانی اس کا شیخ طالب شعر

کاوش طلب ہیں تیغ سے زخم کہن ہنوز

[illegible] آتش شعر

[illegible]
شعر

[illegible]

سینہ خراشی [illegible] شعر

اب بھی کوچوں میں کہیں شور و فغاں سنتے ہو

شعر

[illegible]

رات کو چین ہے نہ دن کو تاب
دل ہے [illegible] اضطراب

جاسے [illegible] نہیں [illegible]
[illegible] جاب

دل پاک کے اسکی زلف میں آرام رہ گیا
در بیش جس جگہ کہ ہوئی شام رہ گیا

مانند غنچہ ہو جب آشفتگی ہوا
ہو سکا کسی کے دل کو جو گرہ وں سے انبساط

[illegible] تھی
جو ڈال ہاتھ پر تھا سو بجلی کی ال تھی

قائم کے یہاں بعض ہندی الفاظ خوب بندھے ہیں ملاحظہ ہوں:

کس بھروسے پہ دلا ہم کو سمجھا تھا تو نے
اس منہ سے تجھے دعوی تھا شکیبائی کا

ہنس ہنس کے ڈالتا ہے یہ کس کے گلے میں باہم
کیا مجھ کو دو معاملہ شب کا بسر گیا

صحبت کا دل میں جو نہ آزار کی ہوس
[illegible] ہے کچھ [illegible] کی ہوس

موافقت کی بہت شہریوں سے میں لیکن — وہی غزال ابھی رم رہا ہے آنکھوں میں
کیا ہتیا ہیں تجھے دینی ہے لے عزیز — اتنا پڑا ہے ملک خدا جا کے مر کہیں
دل نازک وکا رشک ورشی — اتنا ہے نپٹ مرا ان کھپا
رونگی کب تک اے فرد اشکبا رہی — اب کیا تجھے ڈوبینگی چل تھل تو بھر گئے
سنگ کو آپ کریں ہیں میں ہاری باتیں — لیکن [illegible] سے کہاں سنتے ہو

[illegible] کیا دیکھے ہو [illegible] قائم — [illegible] عطر [illegible] آپ [illegible]
[illegible] کوئی جاتا ہے [illegible] قائم — بھلا آئیگی کیں [illegible] تو جیو تو جس بھر لیجا

[illegible] ہم عصر شعرا کی طرح قائم کے یہاں بھی مترو فت [illegible]

نت بجائے ہمیشہ - تنک بجائے ذرا

جو ٹوٹ جائے تنک یہ طلسم ہستی کا — ہزار گنج ہوں [illegible] دفینہ میں

سجن بمعنی محبوب اب یہاں بالکل متروک ہے [illegible] کو بجائے انکو لیک بمعنی [illegible] [illegible]
ہوا میں نہ دیکھا بجائے میں نے نہ دیکھا [illegible] بجائے چاہتے ہے [illegible] گزری بجائے اکی
کیوہم گزری [illegible] قائم سے بجائے میرے [illegible] [illegible] بجائے
سے [illegible] تنک بجائے [illegible] بجائے [illegible]
پھیر بھیجا بجائے پھر بھیجا، ہم کھینچا بجائے ہم نے کھینچا [illegible] بجائے [illegible] بجائے بھی ذرا
بجائے ذرا، جانیے بجائے خدا جانے [illegible] بجائے [illegible] بجائے میں [illegible] بجائے [illegible] بجائے
آنے کسو بجائے کسی [illegible] نے بجائے [illegible] اندھیارا بجائے اندھیرا ؎

شیخ مجھ کو ڈرا گور کی اندھیاری سے — ہجر کی کاٹی ہیں میں نے تو شب تار بہت

آپی بجائے آپ ہی [illegible] میں بجائے نہیں ؎

جا [illegible] زخم تیں مرے تن پر — کون سی ہے یہ امتحاں کی طرح

[illegible] بجائے [illegible] باندھا ہے ؎

[illegible] میں تجھ کو جان تلک — اب اور پیار کروں کہاں تلک

[illegible] ہمارے اور [illegible] بجائے تمہارے - [illegible] کیفیت کو کیفیت یعنی [illegible] کی جگہ [illegible]
مفتوح باندھے گئے ہیں ؎

کیفیت شب جاگنے سے تجھ پہ جو آتی ہے صبح — حسن نور شمع کب اس طرح دکھلاتی ہے صبح

[illegible]

۹ [illegible] | [illegible]

۱۰ [illegible] | [illegible]

۱۱ [illegible] | [illegible]

۱۲ [illegible] | [illegible]

۱۳ [illegible] | [illegible] نقش [illegible]

۱۴ نکلی ہے جو اسکی [illegible] ہم تو کیا | [illegible] ہوا

۱۵ چھپ سی کچھ [illegible] | ہم کو بھی [illegible] عشق میں اک [illegible] تھا

۱۶ [illegible] | [illegible]

۱۷ عیش و طرب [illegible] | صدمے ہیں اس گزشت کے سب کچھ گزر گیا

۱۸ آئے بھی فصلِ گُل تو ہیں آیا کہ ہم نشیں
جس دل میں کچھ ہوا تھی سو اب دل ہی مر گیا

۱۹ ہرگز نہیں مقدور تری حمد و ثنا کا
برہان ہے دعوے کی مرے عجز بیاں کا

۲۰ اے عشق مرے دوش پہ تو بوجھ رکھ اپنا
ہر سر متحمل نہیں اس بار گراں کا

۲۱ پوشیدہ ہے جوں بو وہ ہر اک رنگ میں قائم
دیکھے تو اگر غور سے گلزار جہاں کا

۲۲ گو خضر تھا منزل کو نہ مقصود کی پہونچا
جو پا نہ ہوا پامال جو ترے نقش قدم کا

۲۳ کیا دور جو بخشش پہ کریں ناز جرائم
جس روز کہ شافع ہو تو اعمالِ اُمم کا

۲۴ با ختمِ رسل گرچہ گنہگار ہے قائم
پر اُس کو بھروسا ہے ترے فضل و کرم کا

۲۵ نا پختگی کا اپنی سبب اُس ثمر سے پوچھ
جلدی سے باغبان کی جو خام رہ گیا

۲۶ آہ اے مرغِ چمن کچھ تو بھی واقف ہے کہ صبح
گُل نے کیا پوچھا تھا ہنس کر باغباں نے کیا کہا

۲۷ ٹکڑے کب غم نے یہ جگر نہ کیا
ایک نالہ ہم نے پر نہ کیا

۲۸ خم کے خم پی گئے مئے منصور
لیک اُس کا سا شور و شر نہ کیا

۲۹ دنیا فلک نے ہمیں عز و جاہ دیا نہ دیا
غرض یہ ذکر سا سب ہے کیا؟ دیا نہ دیا

۳۰ تو مہربان کبھو ہم پہ ایک دم نہ ہوا
ہوئے جو تجھ پہ ہم عاشق تو کچھ ستم نہ ہوا

۳۱ ترے فراق میں مر کر کھلا ہے یہ عقدہ
کہ تھی وہ موت سمجھتے تھے جس کو ہم جینا

۳۲ صبا کیا ز گلشن تک ہمارے مشت پر لیجا
قفس میں ہم پہ جو گزرے سو یاروں کو خبر لیجا

۳۳ تا بفلک نالہ تو پہونچا تھا رات
میں ہی کچھ اللہ کا ڈر کر گیا

۳۴ کوچہ گردی دلِ مجنوں نے مرے کی ایجاد
مبتذل بان کے مذہب بادیہ پیمائی کا

۳۵ ناصح تو کہے ہے یوں کہ گویا
ہے دل پہ کچھ اختیار میرا

۳۶ نے وعدہ اُس کے ساتھ نہ پیغام کیا کہوں
پوچھے کوئی سبب جو مرے انتظار کا

۳۷ ہنسنے کا یار یہ بھی کوئی طور ہے کہ آج
قائم نے تیرے ہات سے گھبرا کے رو دیا

۳۸ نہ جرم اُس کا ہے ثابت نہ کچھ مری تقصیر
خدا ہی جانے کہ رنجش کا کیا ہوا باعث

۳۹ رہا میں اُس سے گرفتہ اک عمر تک لیکن
کیا جو خوب تامل تو کچھ نہ تھا باعث

۴۰ نا صبا پوچھ نہ احوال خموشی مجھ سے
ہے یہ وہ بات کہ آتی نہیں تقریر کے بیچ

۴۱ کچھ آج دل پہ یہ وحشت کا رنگ ہے صیاد
ترے قفس سے چمن مجھ پہ تنگ ہے صیاد

۴۲ گئی بہار خزاں آئی گُل ہوئے پامال
مری رہائی میں اب کیا درنگ ہے صیاد

قریبِ باغباں پہ ہو کے غافل
نہ اے بلبل اکٹھے خار و خس کر

کہ عندلیب گل نے جو پھاڑا ہے پیرہن
رکھتا ہے کس کے گوشۂ دستار کی ہوس

کس سے کہوں حال ہر گز رو آپ
کچھ مجھ سے بھی جانتا ہے بہتر

جو سوزِ عشق کا چرچا وہاں نہیں قائمؔ
تو آیا میں جاؤں گا دینے بہشت میں آتش

نالوں سے عندلیب کے آیا ہے جی تنگ
کس نے مرے مزار پہ لا کر چڑھائے گل

توڑنا دیر و حرم تک بھی نہ چنداں ہے گناہ
اپنے مذہب میں ہے کچھ کفر تو آزردنِ دل

اب کے جو یہاں سے جائیں گے ہم
پھر تجھکو نہ منہ دکھائیں گے ہم

جو کوئی در پہ ترے بیٹھے ہیں
دونوں عالم سے پرے بیٹھے ہیں

قائمؔ اور تجھ سے طلب بوسہ کی کیونکر کہیے
یوں وہ ناداں ہے پر اتنا تو بد آموز نہیں

عبث ہیں ناصحا ہم سے زخود رفتوں کی تدبیریں
رکے ہے بحر کب گو موج سی ہوں لاکھ زنجیریں

جانے دو جو نصیب میں ہونا تھا سو ہوا
یارو خدا کے واسطے تکرار مت کرو

یہ جانتا میں نہیں ہوں کہ دل ہے کیا قائمؔ
پر اک خلش سی رہے ہے مدام سینے میں

کوئی مختار لکھو یا کوئی مجبور ہمیں
ہم سمجھتے ہیں جہاں تک کہ ہے مقدور ہمیں

اپنا قصور سعی ہے ملتا جو تو نہیں
کیونکر ملے وہ جس کی ہمیں جستجو نہیں

خوش رہ اے دل اگر تو شاد نہیں
یاں کی شادی پہ اعتماد نہیں

کہتا ہے آئینہ کہ بت تجھ سا ہی اک ہے اور
باور نہیں تو لاؤں ترے روبرو کروں

مجھ سا جہان میں کوئی آشفتہ سر نہیں
ہے یوں تو زلفِ یار بھی پر اس قدر نہیں

قائمؔ تو اس طرح جو پھرے ہے خراب و خوار
اے خانماں خراب مگر تیرے گھر نہیں

حیرت نے کیا ہے اب جہاں کا
جوں آئینہ روشناس مجھکو

قائمؔ کے حال سے ہے اگر میں عبرت کہ چرخ
ایسا گرا نہیں کہ وہ تجھ سے سنبھل سکے

۶۱ نہ دیکھو سرسبزی اور اوراقِ گل کو یاس قائمؔ
ہے شرحِ تنگیٔ غنچہ فراغِ جیبِ گل سے

۶۸ شب کو تو شغلِ گریہ ہے اور دن کو مشقِ غم
وہ تا ہے اس طرح کوئی کمبخت بسر کرے

۶۷ پہلے ہی سوجھتی تھی ہمیں اے شبِ فراق
یہ رات بے طرح ہے خدا ہی سحر کرے

۶۹ صورت میں تری گر نظر آوے ملک الموت
جی دینا کسی طرح سے دشوار نہ ہووے

۶۷ دو چیز ہیں یادگارِ دوراں
تیرا ستم اپنی جاں نثاری

۶۸ [illegible] آپ سے — اور ہی کچھ پیشہ کیا چاہیے
۶۹ [illegible] تاثر — مجھے [illegible] نہیں [illegible] کیسے
۷۰ [illegible] جہاں [illegible] — [illegible] کرے
۷۱ [illegible] سے — [illegible] ساری
۷۲ [illegible] — [illegible] پاس مجھے

قطعات تاریخ وفات استاد الاساتذہ خیام العصر حضرت ریاض

(از [illegible] صاحب شفق عماد پوری [illegible])

[illegible] — [illegible] ہندوستان میں
[illegible] — [illegible] زبان میں
[illegible] — [illegible] پیر مغان میں
[illegible] — [illegible] ایسا کوئی اب جہاں میں
شفق [illegible] سال رحلت
[illegible] جنان میں

۱۳۵۳ھ

(۲)

ہندوستان [illegible] — [illegible] اردو زبان ریاض
[illegible] — [illegible] پیر مغان ریاض
[illegible] — [illegible] سا ریاض
[illegible] شفق
ہے سے [illegible] جادو بیان ریاض

[illegible]

اصطلاحات فلسفہ پر تنقید

(سلسلہ ماہ جنوری ۱۹۳۵ء)

[illegible]

[illegible] ترقی [illegible]

[illegible] اصطلاحات [illegible]

[illegible] تحقیقات

کی گنجائش ہے

احسن

ضمیمہ نمبر (۱) اصطلاحات اخلاقیات

اصطلاح انگریزی	ترجمہ	اصطلاح انگریزی	ترجمہ
Ability	[illegible]	Compare / Contrast	مقابلہ
Abstinence	پرہیزگاری		
Benevolence	کرم، سخاوت	Continence	عفت
Blasphemy	الحاد و کفر	Criterion	معیار
Bonum	نیکی، بھلائی	Cynics	کلبی
Categorical Imperative	حکم صریح	Duty	فرض
Ceremonial	رسم [illegible]	Charity	خیرات
Certainty	جزم، یقین	Chastity	عصمت، پاکدامنی
Chance	اتفاق، موقعہ	Deontology	اخلاقیات
Choice	پسند	Design	نقشہ
Chrematistics	علم [illegible]	Destiny	مقدر، قسمت
Civility / Courteousness	شائستگی، تمیزداری	Economics	معاشیات
		Eudemonism	لذتیت، لذت پرستی

Faith	ایمان	Quietism	سکوت - مراقبہ
Feudalism	زمینداری - جاگیرداری	Reform	اصلاح
Freedom	آزادی - اختیار - حریت	Resolve	تہیہ
		Rectitude	دیانتداری
Grandeur	عظمت - شکوہ	Self Control	ضبط نفس
Humanity	مروت - انسانیت	Self development	ارتقائے نفس
Interest	دلچسپی - [illegible]		
Intolerance	عدم تحمل	Self Surrender	تسلیم نفس
Irony	طنز	Selfishness	خود غرضی - مطلب پرستی - غرض آشنائی
Magnanimity	دریادلی - بلند نظری		
Merit	رتبہ	Serfdom	غلامی
Peripatetic	مشائیین	Slavery	غلامی
Parsimony	جزرسی - کنجوسی	Socialism	اشتراکیت
Politics	سیاسیات	Society	جماعت - سماج
Political	سیاسی	Social	سماجک
Pragmatism	دخل بمعقولات	State	سلطنت - راج
Progress	ترقی	Theology	دینیات
Prudence	دوراندیشی - پیش بینی - احتیاط	Theological	دینی
		Vanity	خود پسندی - گھمنڈ - انانیت - خودی
Physiognomy	قیافہ		

[illegible] اصطلاحات منطق

اصطلاح انگریزی	ترجمہ	اصطلاح انگریزی	ترجمہ
Abduction		Absurd	نامعقول - خلاف عقل
Syllogism	قیاس [illegible]	Aetiology	علم العلل - فلسفۂ اسباب
Abcissio Infiniti	[illegible]	A Fortiori	بدرجۂ اولیٰ

Allegory	تمثیل
Antimony	ضد قانونی
Aphorism / Apophthegm	مختصر مثل-سوتر
Assent	ایجاب
Assertion	بیان-اقرار
Assertory	ایجابی
Attributive terms	حدود توصیفی
Causality / Causation	سببیت
Colligation of facts	اجتماع واقعات
Commensurate terms	حدود عدادی
Contingent	مشروط
Crucial Instance	آخری مثال
Demonstration	تصریح
Denomination	تسمیہ-نام
Designation	معنی-مراد
Development	ارتقا-تدریج
Dialectical	استخراجی
Empirical	تجربی
Enthymeme	قیاس مختصر
Enumerative judgement	قضیہ تعدادی
Episyllogism	قیاس ثانوی
Equipollency	مساوات قضایا

Equivocation	ذومعنین-توریہ
Exceptive proposition	قضیہ استثنائی
Exclusiva	طریقۂ طرح
Exclusive proposition	قضیہ مخصوصہ
Explicative judgment	حکم توضیحی
Exponsible proposition	قضیہ مطلقہ
Exposition	تشریح توضیح
Extension of terms	وسعت حدود
Fallacy of figure of speech	مغالطۂ خطابی
Fundamentum Divisionis	اصول تقسیم / بنائے تقسیم
Identity	یگانگت
Infinite terms	حدود لامتناہی
Instance	مثال
Intension of terms	وسعت حدود
Interaction	معاکست-عمل و ردعمل
Intermixture of effects	اختلاط اثرات
Measurement	ناپ-پیمائش
Methodology	علم تقسیم-انقسام

Mixed modes	مرکب مخلوط
Nominalism	اسم پرستی
Principle of Nota* Notae	اصول صفت صفت
Paronymous Words	الفاظ مشترک مشتق ۔ تجنیس صوتی
Per se	خود بخود ۔ فی نفسہ
Per Accidens	اتفاقاً
Plurality of Causes	کثرت علل ۔ تعدد اسباب
Prerogative Instance	مثال اعلیٰ
Relative terms	حدود اضافی
Second intentions	بعد کا ارادہ

Fallacy of Secundum quid	مغالطۂ اصولی
Self evident	بدیہی
Subaltern genus	جنس التحت
Subsumption	شمول مقولۂ عامہ
Symbol	علامت ۔ نشان
Synthetic Judgement	حکم ترکیبی
Topic	مقولہ
Truth	صداقت
Uniformity of nature	یکسانیت ۔ قدرت
Verbal propositions	قضایائے لفظی

* اصول صفت صفت شے کی صفت ہے ۔

Nota Notae est nota rei ipsius

یعنی جو کسی صفت کی تعریف کرتا ہے وہ اس شے کی تعریف کرتا ہے جس صفت کی وہ ہے ۔

غزل شیخ محمد عبدالعزیز صاحب عزیز فاضل پوری

تصور میں موافق گر مری تقدیر ہو جاتی   جو صورت سامنے آتی وہی تصویر ہو جاتی
جو ہے تقدیر دشمن کی مری تقدیر ہو جاتی   [illegible] کوئی تدبیر ہو جاتی
نقاب رخ سرک جاتا تو لاکھوں خون ہو جاتے   نگاہیں تیری بانکی [illegible] شمشیر ہو جاتی
اگر فرہاد میرا نام جذب عشق میں لیتا   [illegible] جوئے شیر ہو جاتی

عزیز خستہ تن نے کل جو نقش [illegible] کیا تھا
الٰہی آج پوری خواب کی تعبیر ہو جاتی

تلافی مافات

سلسلۂ ماہ گزشتہ

(جناب منشی اسمٰعیل احمد مینائی صاحب تسنیم بی اے، ایل ایل بی - ایڈ کیٹ)

(۸)

دل شکستہ اور اپنی بزدلی کا داغ بدستور اپنے دل پر لیے ہوئے پرویز گھر واپس آیا، ہمایوں کسی مریض کو دیکھنے گیا ہوا تھا، پرویز لائبریری میں پہونچا اور میز کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ سر ہاتھوں سے تھام لیا اور اپنی گزشتہ زندگی پر تنقید کرنے لگا، شیریں کا چہرہ بار بار اُسکے سامنے تھا، کوشش کی کہ سامنے سے ہٹ جائے مگر کامیاب نہ ہوا۔ انتہائی اضطراب میں آنکھیں بند کرلیں، سوچنے لگا کہ اگر میں اس چہرے تک پہونچ جاؤں تو اس کا گلا گھونٹ ڈالوں۔ لیکن اس خیال کے ساتھ ہی قوت ارادی نے تمام دوسرے خیالات پر غلبہ حاصل کرلیا، بہ آواز بلند کہنے لگا ”میں اپنے اور دوسرے گناہ موت تک کا گناہ نہیں شامل کرنا چاہتا“ — قتل کا خیال گزرتے ہی پرویز کے تخیل کا رخ بدل گیا۔ اب سوچنے لگا ”میں مر جاؤں گا تو کیا شیریں کا چہرہ اُس وقت بھی میرا پیچھا نہ چھوڑے گا۔ کیا جب میرا استکبار اور روح تنہا ہوگا، اُس وقت بھی یہ شکل مجھے چین نہ لینے دیگی، اُس وقت بھی یہ سحر آگیں آنکھیں مجھے دیکھتی رہیں گی۔ زندگی میں تو وہ اور میں جدا نہ ہوسکے لیکن موت کے بعد بھی میں اس سے جدا نہ ہونگا“ پرویز کی محویت کا یہ عالم ہوا کہ دوپہر گزری سہ پہر ہوئی اور اُسے خبر نہیں ہوئی۔ دن ختم ہوکر شام ہوئی، رات کے آثار نمایاں ہو چلے، کمرے میں تاریکی ہوگئی، مگر وہ یوں ہی بیٹھا رہا، حتیٰ کہ ہمایوں واپس آیا، اُسی نے روشنی کی، کھڑکیاں کھولیں، پھر باپ کے پاس آکر بیٹھ گیا اور اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیکر کہنے لگا

”پاپا، میں جانتا ہوں کہ آپ سے زیادہ شریف خیال، حق پرست، اور ایماندار انسان مشکل سے دنیا میں ہوگا آپ ہمیشہ وہی کرتے ہیں جو حق ہوتا ہے وہی سنتے ہیں جو صداقت ہوتی ہے۔ میں آپ کی صبح کی بیہوشی کا سبب خوب جانتا ہوں۔ میں نے آپ سے شیریں کے متعلق سوال کیے، اُن سوالات سے آپ کا ذہن اُس کی عبرتناک انسانِ حیات کی طرف منتقل ہوگیا، اور آپ کو اپنے اور اُسکے زمانۂ طالب علمی کی یاد آگئی۔ کام آپ ویسے ہی زیادہ کرتے ہیں، دماغ اس کشاکش کو برداشت نہیں کرسکا — اب میں آیندہ سے کبھی اُسکا ذکر آپکے سامنے نہیں کرونگا۔ البتہ اتنا اور کہنا چاہتا ہوں کہ آج میں نے اُسکی صورت دیکھی“

(باقی)

پرویز کرسی پر سے اُچھل پڑا، شیریں کا چہرہ جو اب مستقلاً اُسکے سامنے رہتا تھا، اُسکے اور قریب آگیا۔

"کیا اُس نے اپنی صورت خود تمھیں دکھائی" پرویز نے کانپتی ہوئی آواز سے پوچھا

"جی نہیں، میں نے غلطی سے اُس کی صورت دیکھ لی، میں آج اُس کے پاس گیا، دروازہ کھلا ہوا تھا، میں بے تحاشا اندر چلا گیا، وہ سو رہی تھی نقاب اُلٹی ہوئی تھی ——— بابا وہ بہت حسین ہے اتنی حسین کہ اُس سے بڑھ کر خوبصورت عورت میں نے کبھی نہیں دیکھی، اُس کا بشرہ مکمل ہے گویا سنگ مرمر سے تراشا گیا ہے۔ اُس کی آنکھیں اتنی خوشنما ہیں کہ وہم و گمان میں بھی اتنی خوشنمائی نہیں آسکتی بابا بال اُس کے بالکل سفید ہیں لیکن انکی سفیدی میں بھی سیاہی سے زیادہ خوبصورتی ہے مگر بابا وہ وہ اسلئے وہ نقاب پہنتی ہے"

"پھر تم نے اُس سے اسکا سبب نہیں دریافت کیا" پرویز نے کہا

"ہاں میں نے دریافت کیا اور اُسنے تفصیل سے سب باتیں مجھے بتلائیں ——— میں نے اُس کی خوشامد کی اُس سے التجا کی کہ وہ مجھے اُس شخص کا پتہ بتا دے جو اسکی تباہ حالی کا ذمہ دار ہے، لیکن اُس نے نہیں بتایا"

پرویز کے دل کی حرکت تیز ہوگئی، خون دماغ کی طرف منتقل ہونے لگا، ہمایوں کی گفتگو کے دوران میں اُس کی حالت اُس شخص کے مانند تھی جس کے سر پر ایک رہیشہ دوراں کی تلوار لٹک رہی ہو جس کا گرنا بھی یقینی اور لازمی ہو، وہ خواہ کسی رخ سے گرے زخمی ضرور کریگی ——— "اُس نے مجھے اپنے چہرے کے جلنے کی وجہ بھی سمجھائی کہ جس وقت دھماکا ہوا اُس نے فطرتاً اپنا بازو چہرے پر رکھ لیا جس سے چہرہ جلنے سے بچ گیا مگر شعلے اور ہاتھ پر بہت زخم آئے ——— صحت پانے پر جب اُسے اس کا علم ہوا کہ اُس کا منگیتر ایک غلط فہمی میں مبتلا ہوکر مفقود الخبر ہوگیا ہے تو اُسے بہت صدمہ ہوا، اُس پر طرہ والدہ کی موت اور بیکسی اس ہجوم غم نے اُس کے بال سفید کر دیے ——— میں نے دوبارہ اُس سے التجا کی کہ وہ مجھے اپنے منگیتر کا نام و نشان بتا دے مگر اُس نے صرف اتنا کہا کہ وہ اب بھی بقید حیات ہے اور خوش و خرم، اور اُس کو اپنی حیوانیت اور بزدلی کی کوئی سزا نہیں ملی ہے ——— بابا، انسان کا فرض ہے اور انسانیت اس کی متقاضی ہے کہ اس شخص کو سزا دی جائے، مجھے اگر وہ شخص کسی طرح مل جائے تو میں اپنے ہاتھ سے اُس کی دھجیاں اڑا دوں"

پرویز کیا ہر قسم کی روح کے لیے برداشت کی ایک حد ہوتی ہے مشہور ہے جیسا کہتے ہیں کہ وہ شخص اپنے جرم کی سنگینی سے واقف ہو کوئی بھی بیٹے کی زبان سے ایسے الفاظ نہیں سن سکتا ——— لڑکھڑاتا ہوا وہ کرسی سے اٹھا، دفعتاً شیریں کا چہرہ اُسکے سامنے سے غائب ہوگیا، ہاتھوں سے ٹٹولتا ہوا وہ ہمایوں

کے پاس پہونچا اور آواز بلند کہا

"ہمایوں اُٹھو۔ وہ کمبخت تمہارے سامنے موجود ہے، اُٹھو اور اُس کی دھجیاں اُڑادو"

پرویز کو بولتے دیکھ کر ہمایوں کھڑا ہو گیا۔ ایک لمحے تک وہ بالکل خاموش رہا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ جو کچھ پرویز کہہ رہا ہے وہ صحیح ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ اُسے خیال ہوا کہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے وہ یقیناً درست ہے اُسے تعجب ہوا کہ وہ اب تک اس راز تک کیوں نہیں پہونچا تھا۔

"پاپا، پاپا" اُس نے روتے ہوئے کہا "نہیں نہیں ایسا نہیں ہو سکتا"

پرویز نے ہمایوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں شیریں کا چہرہ اب اُسکے سامنے نہیں تھا لیکن اب اُس سے زیادہ [illegible] اُس نے ہمایوں کے چہرے کو دیکھا — جہاں حیرت تھی، اور غضب نے رفتہ رفتہ یقین کے جذبے کو جگہ دی۔ اُسکے بعد نفرت کا اظہار ہوا — وہ نفرت بھی اتنی مکمل اور شدید جسکا کوئی مداوا نہیں — اپنی تمام روح کی گہرائیوں کے ساتھ ہمایوں پرویز سے نفرت کرنے لگا اور پرویز کو اس کا علم ہو گیا

"پاپا، پاپا" ہمایوں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "مجھ سے کہہ دیجیے کہ یہ سچ نہیں ہے۔ صرف ایک لفظ کہہ دیجیے۔ اور میں یقین کر لوں گا"

پرویز کا سر نیچا ہو گیا۔ اُس کی آنکھیں جھپک نہیں، چہرے پر سرد پسینہ آگیا۔ اُس نے دونوں ہاتھ اُٹھائے کہ ہمایوں کو چھوئے، ہمایوں پیچھے ہٹ گیا اس طرح گویا کسی زہریلے ناگ کی دسترس سے باہر ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔ پرویز نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور لڑکھڑاتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا — ہمایوں کی ٹانگیں جواب دینے لگیں، کرسی کا سہارا لیکر بیٹھ گیا، غم اور غصے سے اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں

"پاپا، پاپا" اُس نے چپکے سے کہا "پاپا، پاپا"

کمرے کے باہر پرویز شرابیوں کی طرح جھومتا ہوا زینے پر چڑھ رہا تھا، آگے آگے اُسکے شیریں کی تصویر بھی سیڑھیوں پر چڑھ رہی تھی، اُسے خیال آیا کہ اُسنے ایک بار ایک مریض سے کہا تھا کہ "انسانی تکالیف کی ایک حد ہوتی ہے جسکے آگے نہ وہ جاسکتی ہیں اور نہ لے جائی جاسکتی ہیں" اس وقت اُس نے محسوس کیا کہ اُس کا یہ خیال غلط تھا، ہمایوں سے اُسے سچی محبت تھی، اُس کی نفرت نے اس کا دل توڑ دیا، وہ ہمایوں کی ہر قسم کی اذیت برداشت کرنے کو تیار تھا، مگر ہمایوں کی جانب سے نفرت کا اظہار، اُسکی روح کے لیے تکلیف دہ تھا — شیریں کی تصویر اب بھی آگے آگے چل رہی تھی، اُسے خود حیرت تھی مگر وہ محسوس کر رہا تھا کہ اُسکے لیے شیریں پھر وہی شیریں ہو گئی تھی جو پہلے کبھی رہ چکی تھی — اب تک پرویز نے کبھی موت کی خواہش نہیں کی تھی، اُسکے نزدیک موت ایک محض فضول چیز تھی، جس طرح بغیر کسی سبب کے کسی چلتی ہوئی گھڑی کو روک دیا جائے۔ لیکن وہ اسوقت

خود موت کی آرزو کر رہا تھا [illegible] موت ایک
دلچسپ چیز تھی تمام تکلیفوں کا خاتمہ، تمام مصیبتوں کا علاج
اُسے خیال آیا کہ اگر وہ مر جائے تو پھر [illegible] اُسے
کراہت اور نفرت کی نظر سے نہیں دیکھے گا نہ شیریں کا
چہرہ اُس کے سامنے ہوگا [illegible]
یکایک اُس کی ذہنیت میں ایک [illegible] اُس
نے سوچا کہ وہ عورت جس سے مجھے [illegible]
سامنے موجود ہے [illegible]
زیادہ عزیز [illegible]
و آسائش اُسے ملیں [illegible] انسان
مانگ سکتا ہے" یہ سوچ کر [illegible]
شیریں کا چہرہ [illegible]
پھونچکر ایک زہر قاتل کی شیشی [illegible]
زہر ایک گھونٹ [illegible]
"شیریں [illegible]
کہ میں اپنے اعمال پر [illegible]
ہوں اور [illegible]
سے بڑے اور چھوٹے سے چھوٹے [illegible]
نہایت منصف [illegible]
ہے اور [illegible]
پرویز کو ایسا معلوم ہوا [illegible]
آنسو [illegible]
رہی ہے [illegible]
نہیں تھی۔ وہ لیٹ گیا
"شیریں" اُس نے پکارا "شیریں [illegible]

ہاتھ میں اپنا ہاتھ [illegible]"
"شیریں [illegible] آگے بڑھی اور اُسکی پٹی کے
پاس دو زانو بیٹھ گئی [illegible] اُس کا ہاتھ لینے ہاتھ
میں لینا چاہا لیکن نہ [illegible] اُس نے [illegible] کیا کہ
[illegible] کی طرف جو ہر مرد
[illegible] ——— عورت کا
——— [illegible] مر گیا۔

(۹)

[illegible] غم و اندوہ کرب
[illegible] ایک
[illegible] اور بار بیٹے
[illegible] تھے [illegible] بیچارہ کوئی نہیں
[illegible] تھا اور اُس کی
[illegible] صبح ہوتے ہی
[illegible] اسکا ارادہ تھا کہ
[illegible] باپ بیٹوں کے
[illegible] قسم کا فرق ہے مگر اپنی
[illegible] نفرت کرنے لگا تھا۔ اُسے
یقین تھا کہ [illegible] تو یہ نفرت یقیناً باقی
[illegible] کا تہیہ کر رہا
[illegible] ہونے دیگا حتیٰ کہ
[illegible] کہ رات ہی کو پرویز کو
[illegible] بیٹا جو اسکا گوشت
[illegible] اُس سے نفرت
[illegible] آیا کہ شیریں نے

اُسے اپنے منگیتر کا نام اور پتہ بتانے سے کیوں انکار کیا تھا، اور اس علم سے اُس کی قدر و منزلت اُس کے دل میں زیادہ ہو گئی، صبح کو مقررہ وقت پر وہ لائبریری میں آیا اور یہ دیکھ کر کہ پرویز ابھی نہیں پہنچے تو اُس نے اخبار اُٹھا لیا اور اُسے دیکھنے لگا، بظاہر نظریں اخبار پر تھیں لیکن دل و دماغ کہیں اور تھے، نوکر نے ناشتہ لا کر رکھ دیا اور چلا گیا، ہمایوں کو انتظار کرتے کرتے نو بج گئے اور پرویز نہیں آیا، نوکر نے ڈرتے ڈرتے ہمایوں سے کہا

"میاں آج ڈاکٹر صاحب ابھی تک نہیں اُترے"

"ہاں شاید وہ شب میں دیر کو سوئے، اب آتے ہی ہوں گے"

"مگر میاں اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا، آپ جا کر دیکھ آئے، ممکن ہے اُن کی طبیعت کچھ خراب ہو"

طوعاً کرہاً ہمایوں اوپر گیا، جب دروازے دھب دھبانے سے کوئی جواب نہیں ملا تو وہ اندر داخل ہوا، پرویز بستر پر لیٹا ہوا تھا، پورے لباس میں، چہرے پر سکون و راحت کا تبسم تھا، ہمایوں قریب گیا، اسے کا شانہ ہلایا، پھر نبض دیکھی، دل دیکھا، کہیں کوئی حرکت نہیں تھی، کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اُس نے پرویز کی بند آنکھوں کے پپوٹے دیکھے اور انہیں دیکھ کر وہ سب کچھ سمجھ گیا، ادھر اُدھر نظر دوڑائی تو گلاس [illegible] اُٹھا کر سونگھا، حمام میں جا کر اسے خوب دھویا اور الگ رکھ دیا، خود نیچے اُتر کر نوکروں کو اطلاع دی [illegible]

میز پر سر رکھ کر بیٹھ گیا —— اس کا ابتدائی جذبہ اطمینان اور سکون کا تھا، اُس نے محسوس کیا کہ پرویز نے مناسب ترین طریقہ اختیار کیا، خود نجات پانے کا اور ہمایوں کو نجات دینے کا —— دل ہی دل میں اُس نے پرویز کی قدر کی اور اُس کا شکریہ ادا کیا کہ اُس نے اُسے قعر مذلت سے بچا لیا —— لیکن رفتہ رفتہ اُسے خیال پیدا ہوا کہ موت سے باپ مر گیا مگر اس کی رسوائی نہیں مٹی، اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ تکلیف جو اُسے باپ کو زندہ دیکھ کر ہوتی وہ اب نہ ہوگی لیکن کیا ہر روز [illegible] کیا وہ کبھی وہ بھلا سکے گا، اس جذبے کے بعد اسے اُس محبت کا احساس ہوا جو پرویز کو اُس سے تھی اور [illegible] خیال کے ساتھ ہی آنسوؤں کا دروازہ جو اب تک بند تھا کھل گیا اور وہ رونے لگا، جب کچھ دل ہلکا ہوا تو اُسے اس کا اندازہ ہوا کہ وہ [illegible] جہانگیر کسی قانونی جرم سے [illegible] اور کوئی ایسا تھا نہیں جو اُس کی [illegible] کی باتیں کرے گا اُسے خیال [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible] باپ کا [illegible] موت کا [illegible]

[illegible] شیر [illegible]

"مجھے سخت رنج ہے اور تمھارے ساتھ ہمدردی ہے"

"آپ کو رنج ہونے اور ہمدردی کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ یہ فرض تو میرے باپ کا تھا اور اب پرویز [illegible]" شیریں پھر چونک پڑی، اُس نے سمجھا کہ معلوم ہوتا ہے پرویز نے موت سے پیشتر سب حال ہمایوں کو بتا دیا۔

"میں اس لیے آیا ہوں" ہمایوں نے [illegible] خاموشی اور ہچکچاہٹ کے بعد کہا "کہ آپ سے درخواست کروں کہ میرے [illegible] باپ [illegible] کر دیجیے۔"

"لیکن [illegible] معافی کی خواہش نہیں کی" شیریں نے [illegible] سے جواب دیا۔

"میں جانتا ہوں، لیکن میں آپ سے اس کی خواہش کر رہا ہوں، پرویز نہیں تو پرویز کا لڑکا آپ سے [illegible] التجا کرتا ہے [illegible] کے صدقے میں پرویز کو معاف کر دیجیے اور اسے رب خالق کے حضور میں گنہگار نہ جانے دیجیے۔"

"لیکن اُنھوں نے اپنی زندگی میں کبھی اس کی خواہش نہیں کی" شیریں نے پھر [illegible] سے جواب دیا۔

"اسی لیے تو انھیں معاف کرنے کی اور زیادہ ضرورت ہے، علاوہ بریں اسی پر میری زندگی کا دار و مدار ہے [illegible] انھیں معاف نہیں کریں گی میں کسی ایک ذی روح سے بھی آنکھ ملا کر بات نہیں کر سکوں گا —

آپ نے آپ سے میرے [illegible] میں جانتا ہوں کہ جو کچھ میں آپ سے چاہتا ہوں اُس کا کرنا آپ پر بہت گراں ہے، لیکن میری خاطر انھیں معاف کر دیجیے، آپ سوچیے اگر اُن سے یہ گناہ سرزد نہ ہوا ہوتا تو آج آپ میری [illegible] تو بھی انھیں ابھی تک معاف نہیں کیا ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ مجھے بھی معاف کرنا ہوگا اور آپ کو بھی" —

یہ کہہ کر ہمایوں نے شیریں کا ہاتھ پکڑا اور اپنے گھر لے آیا [illegible] اس کی خواب گاہ [illegible] تھی، ہمایوں شیریں کو [illegible] ہو چکی تھی، ہمایوں نے [illegible] اندر سے بند کر دیا۔

[illegible] خود تو وہ چلے گئے مگر میرے [illegible] اپنے عیش کی ٹھوکر چھوڑ گئے [illegible] انھیں [illegible] کر دیجیے [illegible] کے واسطے انھیں معاف کیجیے۔

شیریں نے آہ سرد بھری، وہ پرویز کے بالکل قریب کھڑی تھی، اتنی قریب کہ اسکا دامن پرویز کے جسم سے مس ہو رہا تھا، لیکن اب اُس کے دل میں پرویز کی [illegible] نہ کوئی عناد، پرویز اب وہی [illegible] اُسے عشق تھا، جسکے آغوش میں [illegible] ہونٹوں اور چاندنی راتوں کی [illegible] باہیں ڈال کر وہ [illegible] کیا کرتی تھی، اُس وقت اُسے محسوس

ہوا کہ موت سب مرضوں کی دوا ہے — ہر معموں کا حل ہے —— ہمایوں آہستہ سے باہر آ گیا اور شیریں اور پرویز پھر ایک بار ایک دوسرے کے ساتھ تنہا رہ گئے، شیریں نے نقاب الٹ دی، روشنی پرویز کے چہرے پر پڑ رہی تھی، ایک ایک سطر خوب روشن اور عیاں تھی [illegible] پرویز کے لیے بہت مہربان ثابت [illegible] تصویر [illegible] دونوں جانب [illegible] لکیریں [illegible] تھیں محو ہو گئی تھیں [illegible] چہرے کی [illegible] اور [illegible] میں بدل گئی تھی، لبوں پر وہی دلکش مسکراہٹ تھی جو شیریں نے پچیس برس پہلے اپنے ایام محبت میں دیکھی تھی، اب پرویز پھر ایک بار وہی پرویز تھا جو شیریں کے ساتھ اُسی جماعت میں تعلیم پاتا تھا، جس کے ساتھ وہی دارالتجربہ میں کام کیا کرتی تھی —— شیریں نے پھر بغور پرویز کے چہرے کو دیکھا [illegible] اُسکے ذہن میں خیال آیا کہ "جن سے ہم محبت کرتے ہیں اُنھیں پر ہم ظلم زیادہ کرتے ہیں" —— "خدا، اے یزداں!" اُس نے با آواز بلند کہا "میری مدد کر، مجھے استقلال دے مجھ کو ظرف عطا کر کہ میں اُسے برداشت کر سکوں"

دفعتاً اُسے جہانگیر کے الفاظ یاد آ گئے —— "خدا ہم پر مصیبت ڈالتا ہے کہ ہم دوسروں کی مصیبت کا احساس کر سکیں، اور دوسروں کی مصیبت و غم میں شریک ہو کر اُن کی ہمدردی کر سکیں"

پھر اُس نے پرویز کے چہرے کی طرف دیکھا اور اب اُسے علم ہوا کہ پرویز کے چہرے میں بہ نسبت گزشتہ دن کے جب وہ اُس سے بٹ گیا تھا بہت تغیر ہو گیا ہے اُسے خیال آیا کہ یقیناً ان چوبیس گھنٹوں میں اُسے اپنے افعال گذشتہ پر بہت شدید پشیمانی ہوئی

"اے میرے مالک" اُس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر پرویز کی پٹی کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھ کر کہا "وہ تیری رحمت سے ملاقات کرنے میں" —— یکایک اُس کے دل میں رحم کی لہریں موجزن ہوئیں، جھک کر اُس نے پرویز کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور پرویز کے مردہ چہرے پر آنسوؤں کی بارش ہونے لگی ۔

(۱۰)

شیریں باہر نکلی تو رات زیادہ ہو چکی تھی اُس نے جہانگیر کو ہمایوں کے پاس بیٹھے پایا، وہ بھی وہیں جا کر بیٹھ گئی، اُس کے قلب کو ایک عجیب سکون حاصل تھا، اُس کے سینے میں ایک انوکھی راحت تھی جیسے اُس کی تمام تکالیف اُسکے تمام مصائب کا خاتمہ ہو گیا، جہانگیر ہمایوں کو سمجھا رہا تھا۔

"ہمایوں، زندگی کے لیے موت ضروری ہے اور لازمی، ہم کو اس کا علم نہیں کہ موت کے بعد کیا ہوتا ہے، لیکن یہ ایک پردہ ہے جو ہمیشہ انسانی آنکھوں کے سامنے پڑا رہتا ہے اور صرف چند لمحوں کے لیے موت کے وقت اُٹھتا ہے —— زندگی ایک قوس قزح ہے جو دو عظیم خاموشیوں، دو بڑے سکوتوں کو ملاتی ہے، آفرینش سے پہلے کی خاموشی اور موت کے بعد کا سکوت —— یہ ایک سیڑھی ہے دونوں کے درمیان،

اور اس لیے انسان کا انتقام، اسکے آغاز سے زیادہ تعجب انگیز نہیں' — وہ خدا جس نے زندگی میں ہمارا خیال رکھا کیا وہی خدا مرنے کے بعد ہماری خبر نہیں لے سکتا — تمھارے باپ میرے حقیقی بھائی تھے' اور ایک ایسے بھائی جن کی مثال مشکل سے ملیگی، اُن کا ورقِ حیات پاک وصاف ہے اور بے داغ، ایک دھبہ بھی بزدلی یا بےغیرتی کا اُس پر نہیں" — اس موقعہ پر ہمایوں نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا مگر شیریں اُسی طرح بیٹھی رہی — "وہ بہادر تھے" جہانگیر نے سلسلہ جاری رکھتے ہوے کہا "زندگی کے میدان جنگ کے ایک نڈر اور دلیر سپاہی' جو دشمن سامنے آیا، جس غنیم نے حملہ کیا، اُنھوں نے مردانہ وار اُس کا مقابلہ کیا — بزدلی کے نام سے وہ آشنا نہ تھے، ہر فرض کو اُنھوں نے مردانگی سے مرد کی طرح انجام دیا، اُن کے پہلو میں عالی ظرف دل تھا — یہ دنیا جنت ہوجائے اگر اُن کے سے دو چار آدمی اور دنیا میں ہوں' اُنکی مثال سے ہمکو سبق لینا چاہیے — ہمایوں تم خود اندازہ کرسکتے ہو کہ مجکو انکی موت کا کتنا صدمہ ہے' لیکن جب تک ہم کو خود رنجوں سے سابقہ نہیں پڑتا ہم دوسروں کے رنجوں کو محسوس نہیں کرسکتے' اپنی کمزوریاں دیکھکر ہم کو اندازہ ہوتا ہے کہ دوسروں کے عیوب کو کس طرح پوشیدہ کرنا چاہیے — آج وہ ایک سکوت عظیم میں سونے جارہے ہیں' اور وہاں اُسوقت تک سوتے رہیں گے جب تک قیامت نہ آئے اور خدا خود اپنے طلسم نہاں کو نہ توڑے"

— — — — — —

جہانگیر کی آواز بھرا گئی، سلسلہ ٹوٹ گیا، اور انتہائے غم میں وہ اُٹھکر باہر چلا گیا — —

ہمایوں نے شیریں سے پوچھا "آپنے انھیں معاف کردیا" شیریں نے مُنہ سے جواب نہیں دیا، اثبات میں سر ہلا دیا، اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"اماں" ہمایوں نے کہا — ایک معصوم مگر مصیبت زدہ بچے کی طرح وہ اُٹھا، اور شیریں کے کندھے پر سر رکھکر رونے لگا ؛

غزل میاں عبدالعزیز صاحب فطرت (راولپنڈی)

نشیمن ہوگیا برباد میرا — سمجھ اللہ دل ہے شاد میرا
جلایا آشیاں برقِ نظر نے — کرے گا اور کیا صیاد میرا
جلی ہیں داغہائے دل کی شمعیں — ہوا ظلمت کدہ آباد میرا
یہ غم خانہ۔ یہ دل۔ یہ حسرت آباد — یہ ہے کاشانۂ برباد میرا
کہاں سے آرہی ہے غم کی آواز — کہیں ہوگا دلِ ناشاد میرا

سلطان صلاح الدین اور عقلمند نیتھن

ایک ایکٹ کا ڈراما

از مشہور جرمن ڈراما نویس لسنگ

(از جناب سید [illegible] حسنی صاحب ایم اے)

[گاٹ ہولڈ ایفرائم لسنگ جرمنی کا مشہور ڈراما نویس سیاکسنیا میں ۲۲ جنوری ۱۷۲۹ء کو پیدا ہوا اور برنزوک کے مقام پر ۱۵ فروری ۱۷۸۱ء کو اس نے انتقال کیا۔ اس نے ابتدا میں مذہبی تعلیم پائی تھی لیکن وہ فطری طور پر صحافت اور نقد کی طرف مائل تھا۔ ۱۷۴۸ء کے بعد لسنگ نے ڈراما نویسی شروع کی اور اس قدر مقبولیت اور شہرت حاصل کی کہ وہ ۱۷۶۷ء میں ہیمبرگ تھیٹر کا ڈائرکٹر مقرر کر دیا گیا۔ کچھ ہی دنوں بعد وہ وولفن بٹل کے کتب خانہ کا ڈائرکٹر بھی ہو گیا۔ اور ان دونوں فرائض کو اپنی آخر زندگی تک بہت ہی کامیابی سے ادا کرتا رہا۔

اس کی تصانیف سے "مس سارا سمپسن" (۱۷۵۵ء)، "منا فان بارنہلم"، "ایمیلیا گیلوٹی" اور "ناتھن" زیادہ مشہور ہیں۔ ذیل کا ٹکڑا اُسکے ڈراما "عقلمند نیتھن" سے لیا گیا ہے۔ لسنگ نے اس حصے میں بہت ہی عمدہ پیرائے میں اُن اختلافات کو ظاہر کیا ہے جو مختلف مذہبوں کے پیرووں میں پیدا ہو گئے ہیں۔ اس نے اس امر پر زور دیا ہے کہ عیسائی ہوں یا مسلمان، یہودی ہوں یا ہندو، سب کے سب مذہب کی اصلی غرض و غایت یعنی خدمت، اخوت و محبت کو یکلخت بھول بیٹھے ہیں۔ وہ جنت کو اپنا مخصوص حق سمجھتے ہیں لیکن اُس کے حصول کے لیے جو فرائض ضروری ہیں اُن سے بیگانہ ہیں۔ حالانکہ جنت کا حقدار وہی ہو سکتا ہے جو اپنے ماننے والے خلق اللہ کے سب سے بڑے خادم ہوں اور جو اپنے معتقدین [illegible] سے زیادہ نیکی اور محبت کے کام انجام دیں۔

لسنگ نے مذہبی اختلافات و افتراق کے مٹانے کے لیے جو خیال ظاہر کیا ہے کہ موجودہ رواج کے لحاظ سے بالکل غیر اسلامی ہے۔ اس مختصر سے سین میں اس مذہبی بحث کے علاوہ جس خوبی سے مختلف دیگر حقائق پر چند جملوں میں روشنی ڈالی گئی ہے وہ آپ اپنی نظیر ہے۔

ذیل کا ترجمہ سرسری مطالعہ کی غرض سے نہیں پیش کیا جا رہا ہے بلکہ غور سے پڑھنے اور غور کرنے کے لیے!]

سین :-

سلطان صلاح الدین کا محل، دربار کا ہال کمرہ

افراد :-

صلاح الدین —— سلطان

سیتا —— صلاح الدین کی بہن

نیتھن —— یہودی

صلاح الدین (احکام دیتے ہوئے) جیسے ہی وہ یہودی آئے اُسے یہاں لے آنا.... بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُسے ابدولت کے حکم کی تعمیل میں عجلت کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی!

سیتا :- نہیں بھائی صاحب۔ شاید وہ گھر پر موجود نہ رہا ہوگا۔

صلاح الدین - ممکن ہے!

سیتا - آپ کے بشرے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے آپ کوئی جنگ کرنے والے ہیں؟

صلاح الدین - ہاں!.... اور ایسے اسلحوں سے جنکے استعمال سے میں بالکل بیخبر ہوں۔ کیوں جی سیتا، کیا مجھے جھوٹی بات بنانا، اور دھوکا دینا ہی پڑے گا؟ مجھ سے اور ان باتوں سے کیا مطلب!! اور یہ کس لیے؟ روپیہ حاصل کرنے کی غرض سے روپیہ! اور وہ بھی ایک یہودی سے! صلاح الدین اور اس طرح کا جھوٹ اس قماش کی ذلیل حرکتیں! دُنیا کی سب سے زیادہ ذلیل چیز کے لیے!

سیتا - ہاں، لیکن دُنیا کی یہی حقیر چیزیں بہت زیادہ نفرت سے ٹھکرائے جانے پر، بدلا لینے کے لیے بہانے ڈھونڈھنے لگتی ہیں۔

صلاح الدین - یہ سچ ہے.... لیکن اگر یہ یہودی ایسا ہی دانشمند اور نیک ہو جیسا کہ وہ درویش کہتا تھا، سچا اور ایماندار ثابت ہوا تو؟

سیتا - تو پھر آپ کی مشکلات کا خاتمہ ہے! اس لیے کہ جال ایک لالچی اور جھوٹے یہودی کے لیے بچھایا جاتا ہے نہ کہ ایک راستباز شخص کے لیے! وہ تو بغیر کسی جال کے ہمارا ہے۔ مجھے تو ایسے آدمی کی گفتگو سن کر بڑی خوشی ہوگی۔ ذرا دیکھوں تو وہ کتنی صفائی اور آسانی سے ہمارے جال کو پھاڑ ڈالتا ہے اور کن تدبیروں سے ان گتھیوں کو ایک ایک کرکے سلجھا دیتا ہے۔

صلاح الدین - سیتا، تم سچ کہتی ہو۔ مجھے بھی اس تماشے میں بڑا لطف آئے گا۔

سیتا - تو پھر آپ کیوں پریشان ہیں۔ اگر وہ اپنے تمام ہم قوموں کی طرح ایک مکار اور عیار یہودی ہے تو آپ کو اس کی مطلق پروا نہ کرنی چاہیے کہ وہ آپ کو بھی اسی نظر سے دیکھے گا جس سے وہ سارے عالم کو دیکھتا ہے۔ بلکہ اگر ایسی صورت میں آپ کے چہرے سے غیر معمولی

جذبات ظاہر ہونگے تو آپ کو وہ صرف بے وقوف ہی نہ سمجھے گا بلکہ بے وقوف بنائے گا بھی !

صلاح الدین - تو میں محض اس لیے ایک بُرا فعل کروں کہ بُرے آدمی مجھے بے وقوف نہ سمجھیں ؟

سیتا - ہاں بھائی جان، اگر آپ کسی شے سے اُس کا صحیح مصرف لینا بُرا فعل سمجھتے ہیں تو ایسا ہی ہے !

صلاح الدین - سچ ہے، عورت کے ذہن میں جو تدبیر آئیگی وہ اسکے لیے ہزار بہانے اور ہزار نام تجویز کریگی!

سیتا - بہانے ؟

صلاح الدین - بہن مجھے ڈر ہے کہ یہ تمھاری نازک حرکتیں میرے سخت ہاتھوں میں پاش پاش ہو جائیں گی - ایسی تدبیروں کا کامیاب بنانا اُنھیں لوگوں کا کام ہے جو انھیں سوچ سکتے ہیں - عمل سوجھ کی سکید ستی کا محتاج ہے ! .... خیر ان باتوں کو جانے دو - جیسا بھی مجھ سے بُرا بھلا ہوگا میں اس کام کو انجام دونگا - لیکن دل یہی چاہتا ہے کہ انجام بخیر ہو!

سیتا - بھائی جان ذرا ہمت سے کام لیجیے اگر آپ سچی طور پر ارادہ کرلیں گے تو میں وعدہ کرتی ہوں کہ کام ہو کے رہیگا - یہ عجیب بات ہے کہ آپ جیسے مرد ہمیشہ یہی سمجھتے ہیں کہ اُنکی ساری ترقیاں اُن کی تلواروں ہی کی مرہون منت ہیں - حالانکہ جب شیر لومڑی کے ساتھ شکار کھیلتا ہے تو وہ اُسکی رفاقت کو ذلیل وحقیر سمجھنے کے بجائے اُسکی چالوں کی قدر کرتا ہے -

صلاح الدین - اچھا یونہی سہی! لیکن یہ بھی عجیب بات ہے کہ عورتیں ہمیشہ مردوں کو اپنی ہی سطح پر کھینچ لاتی ہیں ! اچھا بہن سیتا اب تم یہاں سے چلی جاؤ مجھے اپنا سبق اچھی طرح یاد ہوگیا ہے !

سیتا - کیا میں یہاں سے چلی جاؤں ؟

صلاح الدین - تو کیا تمھارا ارادہ یہاں موجود رہنے کا تھا ؟

سیتا - نہیں آپ کے پاس نہیں، بلکہ اس بغل والے کمرے میں ،

صلاح الدین - کیا ! ہماری باتیں سننے کے لیے؟ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا ! اگر مجھے کامیاب دیکھنا ہے تو یہاں سے جلد ہی چلی جاؤ ! دیکھو وہ پردہ ہلتا ہے - یہودی آگیا، خبردار یہاں نہ ٹھہرنا ! جاؤ، میں دیکھتا رہوں گا !

(سیتا ایک دروازے سے جاتی ہے نیتقن دوسرے دروازے سے داخل ہوتا ہے - صلاح الدین تخت پر بیٹھ جاتا ہے)

صلاح الدین - یہودی، قریب آ، اور قریب ! .... بالکل میرے قریب - ڈر دل سے نکال ڈال !

نیتقن - ڈر، ظل اللہ ! ڈر تو جہاں پناہ کے دشمنوں کے دل میں ہو سکتا ہے -

صلاح الدین - تمھارا نام نیتقن ہے ؟

نیتقن - ظل اللہ !

صلاح الدین - عقلمند نیتقن ؟

نیتقن - نہیں جہاں پناہ !

صلاح الدین - لیکن لوگ تو تمھیں یہی کہتے ہیں،

نیتقن - ہاں، لیکن عوام !

صلاح الدین - میں تو عوام کی آواز کو حقیر نہیں سمجھتا۔ میں بہت دنوں سے اس شخص کی ملاقات کا مشتاق ہوں جسے لوگوں نے عقلمند کا خطاب دے رکھا ہے۔

نیتھن - لیکن جہاں پناہ اگر لوگوں نے یہ خطاب طنزاً دیا ہو؟ اگر عقلمند کے معنی دور بیں کے ہوں اور اس سے مراد یہ ہو کہ میں اپنا مطلب نکالنا خوب جانتا ہوں، تو؟

صلاح الدین - مطلب سے تمہارا منشا مقصد و غایت حقیقی سے ہے؟

نیتھن - تو جہاں پناہ، خود غرض سب سے زیادہ دور بیں ثابت ہوگا اور عقلمند اور دور بیں کے ایک ہی معنی ہونگے۔

صلاح الدین - تمہاری یہی گفتگو جو کچھ تم اپنے کو ثابت کرنا چاہتے ہو اُسکے بالکل ضد تمہیں ثابت کر رہی ہے۔ تم انسان کا صحیح مقصد جانتے ہو، عوام نہ تو اسے جانتے ہیں اور نہ اُنھوں نے اسکے جاننے کی کوشش کی۔ صرف یہی امر آدمی کو عقلمند بناتا ہے!

نیتھن - لیکن ظل اللہ، ہر شخص اپنے کو عقلمند سمجھتا ہے!

صلاح الدین - بس انکسار ختم کرو! جب ہم حقیقت کی تلاش میں ہوں تو اس طرح کا انکسار ناقابل برداشت ہو جاتا ہے۔ اس لیے اب کام کی بات کرو اور صاف صاف بے تکلف گفتگو!

نیتھن - جہاں پناہ، میں ہر خدمت کے لیے حاضر ہوں، اور یہ ثابت کر دوں گا کہ میں ظل اللہ کی عنایات کا مستحق ہوں۔

صلاح الدین - تم میری کیونکر خدمت کرو گے؟

نیتھن - میرے پاس جو کچھ مال ہے اُسکا بہترین حصہ سستے سے سستے داموں پر حاضر ہے۔

صلاح الدین - کیا کہا مال؟ تمہارا مال؟ یہ سودا تو میری بہن کر سکتی ہے (دل میں۔ سُن کے خوش تو ہو گئی ہونگی!) - خود مجھے خرید و فروخت میں کوئی دخل نہیں۔ میں اصول تجارت سے بالکل ناواقف ہوں۔

نیتھن - تو کیا جہاں پناہ مجھ سے یہ دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ میں نے اپنے سفر کے دوران میں دشمن کی فوجی حرکت کا مطالعہ کیا ہے اور اب وہ کدھر بڑھنے والا ہے۔ اگر ایسا ہے تو ....

صلاح الدین - یہ بھی میری غرض نہیں۔ مجھے دشمن کی نقل و حرکت کے بارے میں کافی اطلاع ہے.... تم میری بات سنو!

نیتھن - ظل اللہ میں ہمہ تن گوش ہوں!

صلاح الدین - جس چیز کے متعلق میں تم سے دریافت کرنا چاہتا ہوں وہ ان باتوں سے بالکل ہی مختلف ہے۔ چونکہ لوگ تمہیں عقلمند کہتے ہیں اس لیے مجھے یہ بتاؤ کہ تم کون سے مذہب و ملت کو بہتر سمجھتے ہو؟

نیتھن - جہاں پناہ، میں یہودی ہوں۔

صلاح الدین - اور میں مسلمان ہوں! عیسائی ہم دونوں کے درمیان ہیں۔ اس طرح تین مذہب ہوئے۔ اور ان میں سے ایک ہی سچا ہو سکتا ہے۔ تمہارا جیسا آدمی کسی مذہب پر اس لیے قائم نہیں رہ سکتا کہ اتفاقاً

آپکی پیدائش اسی ملت میں ہوئی - [illegible] اگر کسی مذہب
کو اختیار کرتا ہے تو اس لیے کہ [illegible] اُنکی رائے
اور اسکے دلائل اس ترجیح کا ساتھ دیتے ہیں - اسلیئے مجھے
آج تنہائی اور خلوت میں [illegible] کے وجوہ و اسباب بتاؤ
مجھے آجتک اتنی مہلت نہ ملی کہ میں اس مسئلہ پر بطور خود غور
کرسکتا - یہ ممکن ہے کہ میں پہلا بادشاہ ہوں جس نے
اس طرح کی عجیب فرمایش کی ہو - لیکن میرے خیال میں
مجھے اس سوال پر [illegible] مسئلے کی کوئی وجہ نہیں ہے!
کیا میں پہلا بادشاہ ہوں؟ ہاں ہاں [illegible]
اچھا اگر تمھیں اپنے پریشان خیالات اکٹھا کرنے کے
لیے کچھ وقت چاہیے تو میں وہ بھی بخوشی منظور کرتا ہوں
(دل میں) [illegible]
کہ میں نے ٹھیک [illegible]
[illegible] میں ابھی [illegible]
نیتھن - (تنہا) عجیب [illegible] ہے!
آخر سلطان چاہتا کیا ہے؟ میں زر نقد کے لیے
تیار ہو کر آیا - وہ صداقت کا طالب ہے - صداقت!
گویا صداقت روپیوں کی برابری کر سکتی ہے! وہ تو
ایک غیر مستعمل سکہ ہے! کیا وہ وزن کی جائیگی؟ اگر
ایسا ہو تو کیا کہنا! پھر تو نیا ہی سکہ بنے؟
ویسا سکہ نہیں جو داؤں پر لگایا جا سکتا ہے جو بساط پر
پھینکا جا سکتا ہے! .... کیا صداقت بھی عقلمند کے
سر میں اسی طرح جمع کی جا سکتی ہے جس طرح سونا تھیلیوں
میں کہ جب ضرورت ہوئی پیش کر دیا گیا نکال لیا گیا؟
...... اس معاملہ خاص میں ہم دونوں میں سے یہودی

کون برت رہا ہے؟ وہ صداقت طلب کرتا ہے،
کیا اسے واقعی صداقت کی ضرورت ہے؟ .....
آخر اس کا منشاء کیا ہے؟ اس کی غرض کیا ہے؟
.... یا .... یا یہ محض ایک چال ہے؟ .... لیکن
یہ اس کی سی بزرگ شخصیت کے لیے بڑی ذلیل حرکت
ہوگی! مگر بڑوں کے لیے کوئی فعل چھوٹا بھی رہ جاتا ہے؟
دیکھو وہ مکان میں دراتا چلا گیا - حالانکہ اسے ٹھہر کر
دق الباب کرنا چاہیے تھا! مجھے ہوشیاری سے کام
لینا چاہیے - اس وقت اسے کوئی سخت جواب دینا
اور متعصب یہودی بن کر باتیں کرنا مناسب نہیں ہے.
اسی کے ساتھ یہ بھی قرین عقل نہیں کہ بالکل ہی یہودیت
نہ برتی جائے اس لیے کہ اگر یہودیت نہ ہو تو اقتضائے
مسلمانیت یہی ہے کہ اسلام ہو! بس یہی بات ٹھیک
ہے! بچوں کی طرح بڑے بوڑھے بھی کہانیوں سے خوش
کیے جا سکتے ہیں، بشرطیکہ وہ اچھی طرح کہی جائیں! ....
دیکھو وہ آ رہا ہے! (صلاح الدین اندر داخل
ہوتا ہے)

صلاح الدین (دل میں) - بس اب راستہ صاف
ہے! نیتھن، میں جلد تو نہیں آگیا؟ کیا تم نے اس
مسئلے پر غور کر لیا؟ بیان کرو کوئی سنتا نہیں ہے!
نیتھن - کاش سارا عالم سنتا ہوتا!
صلاح الدین - تمھیں اپنے مذہب پر بڑا بھروسا
ہے! بیشک یہ تمھاری عقلمندی ہے کہ تم صداقت
نہیں چھپانا چاہتے اور اعلان حق میں اپنی جان و
مال کا بھی خیال نہیں کرتے -

نیتھن ۔ ہاں مگر اُسی وقت جبکہ ضرورت مجبور کرتی ہے اور فائدہ دکھائی دیتا ہے .....

صلاح الدین ۔ تو مجھے امید ہے کہ آج کے بعد سے میں مصلح الدین کے خطاب کا مستحق ہو جاؤں گا !

نیتھن ۔ واقعی بہت ہی محترم خطاب ہے !... مگر .... مگر جہاں پناہ ۔ قبل اس کے کہ میں اپنے مطلب کا اظہار کروں مجھے ایک کہانی کہنے کی اجازت دیجائے

صلاح الدین ۔ ہاں ہاں ، مجھے اچھی کہانیاں ہمیشہ سے مرغوب ہیں ۔

نیتھن ۔ اچھی ؟ ۔ جہاں پناہ یہ تو ٹیڑھی کھیر ہے !

صلاح الدین ۔ پھر وہی منکسرانہ انکسار ہے بس کہانی شروع کرو !

نیتھن ۔ زمانۂ قدیم میں مشرق میں ایک شخص رہتا تھا جسے اُسکے دوست نے ایک نایاب و بیش قیمت انگوٹھی دی ۔ اس انگوٹھی میں اس طرح کا اوپل جڑا تھا کہ اُس کا رنگ ہر وقت بدلا کرتا تھا ۔ اور اُس کا خاص اثر یہ تھا کہ جو شخص اس انگوٹھی پر اعتقاد رکھیگا وہ خدا کا محبوب ہوگا اور ساری دنیا اُس سے محبت کریگی ۔ اس مشرقی کو وہ انگوٹھی اس قدر پسند تھی کہ وہ کبھی اُسے اپنے ہاتھ سے نہ اُتارتا تھا ۔ اور اُس نے طے کر لیا تھا کہ وہ انگوٹھی اُسکے خاندان سے باہر نہ جائیگی ۔ اس لیے اسنے وصیت کی کہ اسکا وارث اسکے بیٹوں میں سے محبوب ترین فرزند ہوگا اور وہ اپنی اولاد میں سے محبوب ترین فرد کو یہ انگوٹھی عطا کریگا ۔ اور یوں ہی پشت در پشت یہ انگوٹھی خاندان کے محبوب ترین فرد کے پاس رہیگی اور وہی ساری جائداد کا مالک ہوگا ۔ جہاں پناہ سن رہے ہیں ؟

صلاح الدین ۔ میں خوب سمجھ رہا ہوں ، چلو ، آگے بڑھو ۔

نیتھن ۔ ایک سے دوسرے کے پاس ہوتی ہوئی بالآخر یہ انگوٹھی ایک ایسے شخص کے پاس پہونچی جسکے تین لڑکے تھے ۔ تینوں فرمانبردار باپ کے مطیع ، اور وہ بھی تینوں سے یکساں محبت کرتا تھا ۔ اس کی محبت بھری نظروں میں ان میں سے ہر ایک یکساں طور پر اس انگوٹھی کا اور اس کی جائداد کا مستحق معلوم ہوتا تھا ۔ اس نے اپنی اسی کمزوری سے مجبور ہوکر ان میں سے ہر ایک سے خفیہ طور پر اس انگوٹھی اور جائداد کی وراثت کا وعدہ کر لیا ۔ اس طرح ایک زمانہ گزر گیا یہاں تک کہ اُس کے مرنے کا دن قریب آگیا ، باپ اب پریشان ہوا ۔ وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ اپنے اُن لڑکوں میں سے جو اُس پر یکساں طور پر اعتماد کرتے تھے ، ایک کو خوش اور دو کو مایوس کرے ۔ اب وہ کیا کرتا ؟ .... اُس نے خفیہ طور پر ایک جوہری کو بلایا کہ اُس سے ویسی کہ وہ بالکل اسی طرح کی دو اور انگوٹھیاں بنا دے ، خواہ کتنا ہی خرچ ہو اور کتنا ہی صرف کیوں نہ ہو لیکن انگوٹھیاں ایسی بنیں کہ اصل سے سرمو فرق نہ ہو ! جوہری نے حرف حرف تعمیل کر دی ! ۔ جب انگوٹھیاں بن کر آئیں تو خود بڈھے میاں نہیں پہچان سکے کہ ان میں سے اصلی کون سی ہے اور نقلی کون سی ہیں ! اب باپ نے

خوش ہوکر بیٹوں کو بلایا، ہر ایک سے وہ علیحدہ علیحدہ رخصت ہوا اور اس نے ہر ایک کو ایک انگوٹھی اپنی دعاؤں کے ساتھ دی ..... اور وہ مرگیا! جہاں پناہ سن رہے ہیں؟

صلاح الدین (جس نے کہ پریشان ہوکر یہودی کی طرف سے پشت پھیر لی تھی) ہاں ہاں میں سن رہا ہوں، تم قصے کا انجام بیان کرو!

نیتھن - جہاں پناہ، کہانی ختم ہوگئی! اسکے بعد جو واقعات پیش آئے وہ دماغ پر تھوڑا سا زور دینے سے ہر ایک شخص سمجھ سکتا ہے۔ ابھی باپ کا کفن بھی میلا نہ ہونے پایا تھا کہ ہر ایک لڑکا اپنی اپنی انگوٹھی پیش کرکے جائداد کا دعویدار ہوا، سوالات و جوابات شروع ہوگئے، بحثوں کے دفتر کھل گئے اور جھگڑے کا افتتاح ہوگیا! مگر سب بے سود! اصلی انگوٹھی کا اسی طرح اسوقت پتہ نہ چلا جس طرح (تھوڑی دیر سلطان کے جواب کا انتظار کرکے) آج اصلی مذہب کا!

صلاح الدین - تو کیا میرے سوال کا تمہاری طرف سے یہی جواب ہے؟

نیتھن - نہیں جہاں پناہ! لیکن یہ کہانی میری طرف سے بحیثیت معذرت کے پیش کی جاسکتی ہے۔ ان انگوٹھیوں میں جو باپ نے مخصوص طور پر اس لیے بنوائی تھیں کہ کوئی ان میں فرق نہ نکال سکے میں فرق نکالوں، یہ میری مجال کہاں!

صلاح الدین - ہٹاؤ بھی یہ بیکار کی باتیں نہ بناؤ! تم مذہب کی مثال انگوٹھی سے دیتے ہو، میں نے جن مذاہب کا نام لیا ہے، انکے صاف صاف مخصوص علامات ہیں اور وہ ایک دوسرے سے لباس و غذا تک میں مختلف ہیں!

نیتھن - جہاں پناہ یہ صحیح ہے ـــ لیکن وہ اپنے اساس میں مختلف نہیں ہیں! کیا ان میں سے ہر ایک تاریخ پر مبنی نہیں ہے؟ خواہ وہ تاریخ سماعی ہو یا تحریری؟ کیا تاریخ کی بنا اعتماد پر نہیں ہے؟ ..... تو پھر ہم سب سے زیادہ کس پر بھروسا کرسکتے ہیں؟ اپنے ہی خاندان والوں پر، وہی جن سے ہمارا گوشت پوست بنا ہے، جو ہم سے بچپنے سے محبت و شفقت کرتے رہے ہیں، جنھوں نے سوا اُن موقعوں کے جہاں پر ایسا ہی کرنا ہمارے لیے بہتر تھا، ہمیں کبھی دھوکا نہیں دیا! آخر میں اپنے آبا و اجداد پر اُسی طرح کا اعتماد کیوں نہ کروں جیسا کہ ظل اللہ اپنے اسلاف پر کرتے ہیں؟ یا کیا میں ظل اللہ سے یہ استدعا کرسکتا ہوں کہ جہاں پناہ اپنے آبا و اجداد کو محض اس لیے جھوٹا سمجھیں کہ میرے آبا و اجداد سچے ثابت ہوں؟ یہی بات عیسائیوں کے لیے بھی کہی جاسکتی ہے!

صلاح الدین - رسول مقبول کی قسم تو سچ کہتا ہے میں لاجواب ہوگیا!

نیتھن - اب ذرا انگوٹھی کے معاملے کی طرف ظل اللہ توجہ فرمائیں - یہ عرض کیا جاچکا تھا کہ لڑکوں نے آپس میں جھگڑا کیا، ہر ایک قاضی کے پاس گیا اور سچ سچ اس بات کی قسم کھائی کہ اُس نے اپنے باپ کے ہاتھ سے وہ انگوٹھی پائی تھی اور اُسے یہ امید بھی

ولائی گئی تھی کہ انگوٹھی پر عمل جاری رکھیں اسی کو
ترکہ میں ملیگی۔ اس میں وہ مطلقاً جھوٹ نہیں بولے۔
ہر ایک کا یہ دعویٰ تھا کہ یہ امر ناممکن ہے کہ اُس کے
باپ نے اُس سے غلط بیانی کی ہو۔ ان میں سے
ہر ایک اس بات پر مُصر تھا کہ اُسکا باپ اس قسم
کی رکیک حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ اس [illegible]
خواہش کے خلاف اس نتیجہ پر پہنچنے پر مجبور تھے کہ
کہ انکے باپ کے مرنے کے بعد کوئی نہ کوئی جعلسازی
کی گئی!

صلاح الدین۔ [illegible] تو قاضی صاحب نے
کیا کہا؟ میں بھی اُن کا فیصلہ سننے کے لیے تیار
ہوں۔ ذرا میں دیکھوں تو کہ تم اُن کے منہ سے کیا
کہلاتے ہو [illegible]؟

نیتھن۔ قاضی نے کہا [illegible]
کے روبرو حاضر نہیں کیا جائیگا تو میں فیصلہ کرنے
سے عاجز ہوں۔ میرا کام معمے حل کرنا نہیں ہے! کیا
یہاں اصلی انگوٹھی کے [illegible]! .....
لیکن ہاں ذرا ٹھہرو، تم نے یہ بیان کیا ہے کہ اصلی
انگوٹھی کا یہ اثر ہے کہ جو اسے پہنتا ہے اس سے خدا
اور ساری دنیا محبت کرتی [illegible]
تو اب [illegible] اس محبت [illegible]
کا اثر [illegible]
نہیں ہوتا؟ کیا تم میں سے ہر ایک اپنی ہی ذات
سے محبت نہیں کرتا؟ تم سب کے سب فریب خوردہ
فریبی ہو! [illegible] تمہاری انگوٹھیاں نقلی ہیں، غالباً وہ اصلی
انگوٹھی غائب ہو گئی اور تمہارے باپ نے اُس ایک
کی جگہ تین تین بنوا دیں!

صلاح الدین۔ واہ واہ، سبحان اللہ!

نیتھن۔ جہاں پناہ، قاضی نے یہ بھی کہا کہ اگر تم
میرے فیصلے پر راضی نہیں ہو اور میری صلاح پر عمل
نہیں کرنا چاہتے تو تمہاری خوشی! لیکن میں تم سے
اس معاملے پر غور کرنے کی [illegible] خواہش کروں گا۔
[illegible] ہر ایک کو [illegible] باپ نے
[illegible] تم میں سے ہر ایک یہ سمجھتا ہے
کہ اصلی انگوٹھی اسی کے پاس ہے۔ تمہارے باپ
[illegible] انگوٹھی کے اثر سے آزاد
[illegible] یکساں محبت کرتا تھا
[illegible] باپ کے ساتھ محبت
[illegible] دوسروں کے حقوق غصب کرلے۔
اس لیے تم [illegible] ہر ایک کو چاہیے کہ تم اسی کی
طرح محبت کرو [illegible] خود غرضی سے علیحدہ ہو کر اس امر
[illegible] کہ محبت اور نیکی کے کام
[illegible] اور خدا پر بھروسا کرکے اپنی انگوٹھی کے
اثرات [illegible] — اگر کسی زمانے میں تمہارے
بچوں کے بچوں [illegible] اس انگوٹھی کے اثرات
[illegible] سامنے
[illegible] زیادہ دانا
[illegible] اس جھگڑے کا
فیصلہ [illegible] یہ تھی [illegible]
قاضی کی تقریر!

صلاح الدین ۔ سبحان اللہ! سبحان اللہ!

نیتھن ۔ اب اگر جہاں پناہ کا یہ خیال ہو کہ جہاں پناہ ہی وہ قاضی .....

صلاح الدین (سلطان نے نیتھن کے قریب آ کے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور اس سین کے خاتمے تک یوں ہی پکڑے رہا) میں اور قاضی! خاک کا حقیر و ذلیل پُتلا! واللہ نہیں!

نیتھن ۔ کیوں جہاں پناہ؟ کیوں نہیں؟

صلاح الدین ۔ پیارے نیتھن، اُس قاضی کا زمانہ ابھی نہیں آیا، اُس کی کرسی عدالت میرے لیے نہیں ہے! ...... اچھا تم جاؤ .... لیکن دیکھو ہمیشہ میرے دوست رہنا ۔

نیتھن ۔ کیا جہاں پناہ کو کچھ اور بھی ارشاد فرمانا ہے؟

صلاح الدین ۔ نہیں ۔

نیتھن ۔ کچھ بھی نہیں؟

صلاح الدین ۔ مطلقاً نہیں، لیکن یہ آخر تم اس قدر اصرار سے کیوں بار بار پوچھ رہے ہو؟

نیتھن ۔ جہاں پناہ اس لیے کہ میری خواہش تھی کہ مجھے ایک استدعا کا موقع دیا جاتا ۔

صلاح الدین ۔ تو موقع و محل کی جستجو کی ضرورت نہیں ۔ ابھی کہہ ڈالو!

نیتھن ۔ ظل اللہ، میں ایک دور دراز سفر سے واپس آ رہا ہوں اور بہت سی وہ رقمیں وصول کر کے لایا ہوں جو لوگوں پر باقی تھیں، آج کل کے پُرخطر زمانے میں نقد روپیہ اپنے پاس رکھنا مخدوش ہے، اور مجھے کوئی محفوظ مقام دکھائی نہیں دیتا .... اور ...... اور جہاں پناہ اس ہونے والی جنگ میں روپیے کی سلطنت کو ضرورت ہوگی، کیا ظل اللہ میری خاطر سے میری رقموں کا مصرف نہیں نکال سکتے؟

صلاح الدین (نیتھن کو بغور دیکھ کر) کیا تم سے وزیر سے ملاقات ہوئی تھی یا تم نے خود ہی بھانپ لیا ہے کہ تم اس طرح کی مجھ سے استدعا کر رہے ہو؟

نیتھن ۔ کیا بھانپ لیا جہاں پناہ؟

صلاح الدین ۔ بھئی معاف کرنا، اب بات بنانے سے کیا فائدہ، میں خود تم سے یہی .....

نیتھن ۔ جہاں پناہ یہی طلب فرمانے والے تھے ۔

صلاح الدین ۔ ہاں ۔

نیتھن ۔ تب تو

چہ خوش بود کہ برآید بیک کرشمہ دو کار!

مسیحی مصنفین کا یہ عام شیوہ ہے کہ اپنے افسانوں اور ڈراموں کے ذریعہ مسلمان تاجداروں کے خلاف زہر پھیلاتے رہتے ہیں اور سلطان صلاح الدین نے جنگ ہائے صلیبی میں عیسائیوں کی متحدہ فوجوں کو جیسے پے بہ پے شکستیں دیں اُنکی بنا پر اس نامور فاتح سے ان کو خاص دلی بغض ہے جس کی بدولت کثیر التعداد تصانیف میں سلطان کی سیرت پر مختلف پہلوؤں سے حملے گئے ہیں ۔ اس ڈرامہ میں بھی مصور کا یہ نقص موجود ہے، اگرچہ پردہ قلم بہت باریک ہے اور بڑی عیاری سے استعمال کیا گیا ہے ۔ **ایڈیٹر**

اُردو ادب پر ایک خطبہ

(جناب مولوی مشیر احمد علوی صاحب نادری ناظر کاکوروی بی اے)

یہ مقالہ مرحوم صلاح الدین خدا بخش پروفیسر تاریخ اسلامی کلکتہ یونیورسٹی کا وہ خطبۂ صدارت ہے جو انھوں نے آل انڈیا اورنٹیل کانفرنس کے سالانہ اجلاس منعقدۂ پٹنہ ۲۱ دسمبر ۱۹۳۰ء میں شعبۂ اُردو کی صدارت کرتے ہوے ارشاد فرمایا تھا - یہ ترجمہ تو کہلانے کا کسی طریقے مستحق نہیں ، لیکن ہاں اُس خطبہ کو سامنے رکھ کر مرتب کیا گیا ہے -

مترجم

اُردو کے آغاز کی داستان ہوشربا بحیثیت ادبی زبان کے باوجود تحقیقات کے بھی اب تک پردۂ راز ہی میں ہے - اس کی ابتدا ۱۳۹۸ء سے بھی کرتے ہیں جب تیمور نے ہندوستان پر حملہ کیا، لیکن بعض اس سے بھی بہت قبل سے اسکی ابتدا کا سنہ مقرر کرتے ہیں - اور اس گروہ کا یہ دعویٰ ہے کہ مسعود بن سعد نے گیارہویں صدی عیسوی کے پہلے عشرہ میں ریختہ میں کچھ شعر کہے - اور تیرہویں صدی عیسوی میں تو سلطان العشاق حضرت امیر خسرو نے اس جدید زبان میں بہت کچھ لکھا ہے جو تذکرۂ عرفات کے باکمال مصنف (مولف ؟) اوحدی کے خیال میں خسرو کے "موجودہ فارسی تصانیف سے دوگنا تھا"- اس سے بھی زیادہ لطف کی یہ بات ہے کہ مشہور مستشرق مسٹر گراہم بیلی نے ایک جدید تحقیقات پیش کی ہے - اسکی رو سے تو اُردو کا دَور محمود کے حملہ سے ہندوستان میں شروع ہوتا ہے ——— بہرحال جو کچھ بھی ہو' ان تمام قیاسات و خیال آرائیوں کو علحدہ کردینے کے بعد بھی اس امر میں تو کوئی شبہہ ہی نہیں رہتا کہ اسلامی عہد حکومت (کی ابتدائی صدیوں میں بھی) میں مسلمانوں نے اس جدید زبان کو ضرور استعمال کیا اور اس جدید زبان میں شعر بھی کہے - ہاں یہ ضرور تھا کہ اُس دَور کی اُردو، فارسی سے علحدہ چیز نہ تھی، بلکہ فارسی ہی کا دوسرا نام اُردو تھا - کیونکہ تعداد الفاظ فارسی کی غالب ہوتی تھی اور امرا و سلاطین کی ٹکسالی زبان فارسی ہی سمجھی جاتی تھی - اس فارسی یا عجمی امتزاج کا یہ اثر تھا کہ کبیر و چند کا کلام بھی فارسی کے اثرات قبول کرنے سے انکار نہ کرسکا - اور یہ "اپنانے" کا عمل بڑی دیر عرصہ تک جاری رہا - حتیٰ کہ فارسی محاورات بھی زبان زد ہوتے گئے؛ اور اس طرح جدید زبان کے نشر و اشاعت میں بھی فارسی ممد و معاون ہوتی گئی - اکبر کی آزاد خیالی نے اس جدید زبان کے نشر و اشاعت میں بہت کافی حصہ لیا - اور جملہ مذاہب کے مقدس حروف بھی اُسی کے طفیل جدید زبان میں سموئے گئے - فارسی میں سنسکرت ادبیات کے ترجموں نے جدید زبان کی تحقیقات کے لیے راہیں کھول دیں - اور اسی طرح

مسلمانوں اور ہندوؤں کے تعلقات کی کشادگی میں جدید زبان نے بھی حصہ رسدی ہاتھ بٹایا اور مجبوراً ہندوؤں اور مسلمانوں کو دونوں زبانیں پڑھنا پڑیں۔ یہ اثر دارالخلافت کی زبان پر بہت گہرا پڑا۔ دہلی میں اور ہمالیہ کے شمالی جانب جو ہندی بولی جاتی تھی اُس پر بھی عجمی رنگ چڑھا اور خوب چڑھا۔ دولت مغلیہ کی حدود میں وسعت ہوتی گئی۔ جنوبی حدود میں بھی اضافہ ہوا۔ اور اس طرح دارالسلطنت کے محاورات اور ٹکسالی زبان دکن تک پہونچی اور دکن میں بھی مسلمان شاہنشاہوں کی درباری زبان بننے کا اسکو شرف حاصل ہوا۔ چنانچہ یہ اسی کا تصرف کہا جا سکتا ہے کہ بحمدہ آج سلطنت عثمانیہ میں ایک جامعہ محض اس جدید زبان (اُردو) کا قائم ہے، اور اس دارالعلوم کے منتہی کسی دوسری درسگاہ کے فارغ التحصیل سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔

لیکن یہ کہنا غالباً بیجا نہ ہوگا کہ ادبی تالیفات کا اہم کام سب سے پہلے گولکنڈہ اور بیجاپور کے اسلامی درباروں سے شروع ہوا اور مرکزی مقام دہلی اس سلسلہ میں یقیناً بہت پیچھے رہ گیا۔ نوطلوع ادب یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ نہ تو عوام کے ادبی ذوق کا نتیجہ تھا اور نہ اُنکے خیالات کا آئینہ دار۔ کیونکہ گولکنڈہ والے ٹیلگو بولتے تھے اور بیجاپور والے کنڑی۔ یہ دونوں ڈراوڈین زبانیں تھیں۔ ان زبانوں کو شمالی آریائی زبان سے مطلقاً کچھ تعلق نہ تھا۔ اور اسی خیال سے اس جدید ادب کے لیے اپنا ماڈل عجمی بنانا پڑا۔ یقیناً اُس دور کا ادب تمام تر عجمی اثرات سے پُر تھا بلکہ یہ کیوں نہ کہا جائے کہ وہ کلیتہً عجمی خیالات کا نقش ثانی تھا۔ چنانچہ قصائد، غزلیں، مرثیے، مثنویات، رباعیات اور ہجویات سب ہی کچھ عجمی تاثرات کا نتیجہ کہا جا سکتا ہے۔

گولکنڈہ میں ادبی مرکز قائم ہوا۔ قلی قطب شاہ اور اُس کا جانشین عبداللہ قطب شاہ دونوں مشہور شاعر تھے۔ قطب شاہ کے دور میں ابن نشاطی نے دکنی زبان میں دو تصانیف پیش کیں۔ طوطی نامہ اور پھول بن۔ بیجاپور کا دربار بھی بہت شاندار ادبی مرکز تھا ابراہیم عادل شاہ (۱۵۹۹-۱۶۲۶ء) نے نورس مرتب کیا۔ علی عادل شاہ کا درباری شاعر برہمن جو نصرتی کے نام سے آج بھی مشہور ہے۔ اسکی مشہور مثنوی گلشن عشق اب بھی ادبی اعتبار سے بہت کافی مشہور ہے۔ یقیناً یہ لوگ ادبی ہراول یا پیامبر تھے۔ اور یہ اعزاز تسام ازل نے ولی اورنگ آبادی اور سراج اورنگ آبادی کے لیے مخصوص رکھ چھوڑا تھا کہ صدیوں تک اُن کی زبان مستند تصور کی جائے۔ بہت سے مورخین اور اُدباء کی اب یہ رائے ہو گئی ہے کہ اُردو شاعری میں (تیرہویں صدی میں) شمالی ہندوستان میں جو انقلاب ہوا وہ یقیناً ولی کے اثر اور خیال کا بڑی حد تک رہین منت تھا۔

اُس دَور کے بہت سے دوسرے مشاہیر کی طرح ولی کے سوانح حیات ہم کو زیادہ معلوم نہیں ہیں۔ اب ہم اورنگ آباد سے دوبارہ دہلی واپس آتے ہیں اور یہاں ہم کو ظہور الدین حاتم کی بلند شخصیت نظر آتی ہے جن کے آفتاب کمال نے اُس مشہور لیکن بدنصیب شہر کی شہرت میں یقیناً اضافہ کیا۔ ——— لیکن یہ ضیا بھی ولی اورنگ آبادی سے اکتساب کی گئی تھی ——— محمد شاہ کے دوسرے سن جلوس میں دارالخلافت دہلی میں دیوان ولی کی اشاعت ہوئی۔ رقابت اور رشک و حسد کی آگ بھڑکی۔ اور دہلی کی ادبی سبھا میں اس رقیبانہ جنگ سے آگ لگ گئی۔ حاتم نے جو اس دَور کے ہراول تھے اس جوش سے فائدہ اُٹھایا، اور ولی کے نقش قدم پر چلنا شروع کیا۔ لیکن اس اہتمام بالشان مناقشہ کے باوجود حاتم کی زبان دکنی نہ تھی بلکہ شمالی (یا ہندوستانی؟) حاتم کی ساعی جلیلہ کی تقلید اُس کے احباب نے کی اور تاجی، مضمون، اور آبرو نے دہلی کے ادبی وقار کو بڑھانے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ ایک جدید شاہراہ کھل گئی اور ایک جدید ستارہ مطلع ادب پر طلوع ہوا۔ حاتم اُس اسکول کا پرنسپل (اگر یہ کہنا جائز ہے؟) تھا جس کا سب سے بیش قیمت رکن رفیع السودا تھا۔ لیکن حاتم کے معاصر خان آرزو کی شہرت نے حاتم کو پس پشت ڈال دیا۔ گو خان آرزو کی شہرت زیادہ تر فارسی تحقیقات کی بنا پر ہے لیکن پھر بھی وہ اُردو کا ایک باکمال شاعر اور بے نظیر ادیب تھا۔ آرزو کا ایک تذکرہ بھی سر صلاح الدین خدا بخش مرحوم کے کتبخانہ میں تھا جو اگر کبھی شایع ہو گیا تو اُس سے زیادہ قدیم اور مستند تذکرہ دوسرا نہیں ہو سکتا۔ میر جو سودا کے معاصر تھے وہ انھیں خان آرزو کے شاگرد تھے نادر شاہی حملہ کے بعد آرزو لکھنؤ چلے آئے اور یہیں اُن کا انتقال بھی ہو گیا۔ لیکن کس قدر افسوسناک واقعہ ہے کہ آج لکھنؤ میں کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ خان آرزو کس جگہ محو خواب ہے! یقین کا بھی تذکرہ کیا جا سکتا ہے جو بہت ہی نو عمری میں احمد شاہی دَور میں داعی اجل کو لبیک کہہ گیا۔ اور اس سلسلہ میں خواجہ میر درد کی غیر فانی شہرت کا تذکرہ ناگزیر ہے جو بیک وقت شاعر بھی تھے اور صوفی بھی، موسیقی کے ماہر تھے خود گاتے تھے اور قوالوں سے بھی بہترین کلام سنتے تھے۔ ان میں یاس و امید دونوں کا انتہائی جذبہ موجود تھا اور اُسی کے ساتھ نہایت آزاد خیال۔ لیکن سخت مذہبی انسان تھے۔ ہم انکے متعلق آیندہ چل کر پھر کچھ لکھیں گے جب عظیم آباد کی شاعری کا تذکرہ کریں گے۔

خان آرزو کی سنت پر عمل پیرا ہو کر میر اور سودا بھی لکھنؤ چلے آئے اور آصف الدولہ کی عنایات سے مستفید ہوتے رہے ——— میر۔ اس نام ہی سے مختلف اضداد و اشیا کا پتہ چلتا ہے۔ خیالات کی صفائی، تخیل کی بلند پروازی، شیرینی و حلاوت، یاس و حرماں، شام مصیبت کے نظارے، مصائب کے ازدل، حرمان نصیب

سکیاں، دبائی ہوئی آہیں اور چشمِ پُرنم - غرضکہ دنیا کی ہر مشکل اس نام میں فطرت نے ودیعت کر دی تھی — ایسے پاک اور نزہت پرور مناظر کو دیکھتے ہوئے سودا کا میدانِ عمل شاعری میں میر سے بالکل جداگانہ ہوتا ہے بلکہ یہ کیوں نہ کہا جائے کہ ایک بہت بڑی حد تک دونوں میں بعد المشرقین تھا - خیالات میں اختلاف، الفاظ میں اختلاف، محاورات میں اختلاف - اس جنگ کا انجام کیا ہوا؟ شیرینی، حلاوت اور روشنی کا تلخی، سختی، اور ظلمت سے مقابلہ تھا - لیکن جدید زبان کو اس جنگ سے بھی کچھ نہ کچھ نفع مل ہی گیا — اس موقعہ پر کون ہے جو غالب کے صداقت نامہ سے انکار کر سکتا ہے

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقولِ ناسخ　　آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

سر سید اعظم کا فیصلہ بھی سننے کے قابل ہے :-

"میر کی زبان اس قدر صاف ہے اور اظہارِ خیال کے طریقے جو وہ استعمال کرتے ہیں اس قدر مناسب اور فطری ہیں کہ آجتک اُن کی توصیف و تعریف میں سب لوگ متفق ہیں - گو سودا کی زبان بھی بے نظیر ہے اور وہ تلمیحات میں میر سے یقیناً افضل ہیں لیکن طرزِ ادا اور اسالیب میں یقیناً میر سے کمتر ہیں"۔

سیاسی طوفان دار الخلافت دہلی میں آیا اس کی شان و شوکت میں فرق آ گیا لیکن شاعرانہ عظمت برقرار رہی - مابعد کے مغل شہزادے خود شاعر تھے - شاہ عالم کا تخلص آفتاب تھا - اُنکی مثنوی اور دیوان منظوم اقدس کے نام سے مشہور ہے - سلیمان شاہ کا بھی ایک دیوان ہے - غالب کی "شمع" بہادر شاہ جو دولِ مغلیہ کی طویل زنجیر

اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

کی آخری کڑی تھا، وہ ظفر تخلص کرتا تھا - لیکن یہ تخلص راس نہ آیا - کیونکہ تیموریہ جاہ و جلال کا مرثیہ پڑھنے کے لیے فطرت نے ظفر کو منتخب کیا تھا - اور قسمت کی نیرنگیوں اور مقدرات کی کہانیوں کا سب سے غمناک منتہیٰ اور حرماں نصیب افسانہ گو رنگون میں ظفر ہی تھا — بہرحال ظفر کا نام اپنے اُستاد ذوق کے نام کے ساتھ لیا جاتا ہے - قصیدہ نگار کی حیثیت سے ذوق کا پایہ بہت ارفع ہے — دہلی، اپنی جائے پیدایش سے علیحدہ ہونے کے بعد بھی کوئی شے اُن تخیلات سے ظفر کو علیحدہ نہیں کر سکتی تھی جنکی افسوسناک یاد اور خواب کی سی دلچسپیاں رنگون میں ستایا کرتی تھیں - اور اُس دور کا جو سرمایہ ظفر کا اسوقت موجود ہے وہ یقیناً دہلی کے شاہی سرمایہ سے زیادہ قابلِ وقعت ہے - کیونکہ اس میں واقعیت اور اصلیت کی جھلک پائی جاتی ہے اور دہلی میں تصنع اور آورد کا پایہ بلند تھا — اس حرمانی دور کی شاعری یقیناً اس قابل ہے کہ اُسکو ہاتھی دانت کی نفیس اشیا کی طرح عزت و حرمت کی جگہ ادبِ اُردو میں دی جائے —

اُستاد ذوق کے علاوہ جب دہلی میں انحطاط کی تاریکی تھی تو ایک شہاب ثاقب کی روشنی مصحفی کی شکل میں رونما ہوئی اور لافانی عظمت غالب کے حصہ میں آئی۔ نہ اس وجہ سے کہ وہ میر کے مقابلہ میں زیادہ بہتر کہتے تھے، اُنکا اسلوب بیان نادر تھا یا تخیل ارفع تھا، یا سودا کی طرح وہ ہاجی تھے، یا درد کا تصوف اُن میں تھا یا مومن کی طرح اُن کے کلام میں نزاکت، رعنائی یا تنوع یا مزاح موجود تھا —— بلکہ غالب ان تمام باتوں سے بالکل علحدہ خود ایک مستقل تاسیس ہے اور اُردو شاعری کا سب سے بلند شاعر تصور کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر بجنوری نے تو انتہائی فرط عقیدت سے اس اعلان میں بھی تامل نہ کیا کہ ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں وید مقدس اور کلام غالب۔ غالب اصل میں نام ہے اُس عہد کے اسلامی سماج کے عطر کا جو کھنچکر اسد اللہ خاں کی ذات میں مجتمع ہو گیا تھا۔ اور یہ انھیں اوصاف و محامد کا نتیجہ تھا کہ جب فلک ادب پر غالب کا آفتاب کمال طلوع ہوا تو اس وقت کے تمام ادبی ستاروں کی روشنی ختم ہو گئی۔ اور فرط عقیدت سے جملہ شعرا نے زینا اپنا سر نیاز اپنے دور کے سب سے بڑے صاحبقراں کے حضور میں خم کر دیا۔ ابوالعلیٰ یا عمر خیام کی طرح غالب اپنے عہد کا ایک نمایندہ ہے جو اپنی شاعری میں اپنے دور کی روح پھونک دیتا ہے۔ غالب یقینی اپنے عہد کا ایک باکمال مجتہد اور مجدد تھا اور اگر تشبیہ کفر نہیں ہے تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ شریعتِ شاعری کا پیغمبر ہے —— اس کی شاعری ایک مستقل پیام ہے اقوام عالم کے لیے —— اُسکے صحیفے کے نمایاں ابواب یہ ہیں: —— تساہلی و بیکاری کے خلاف علم بغاوت بلند کرتا ہے —— استبداد کے خلاف نفرت کا اظہار کرتا ہے۔ مذاہب کی غلط تعبیر پر مضحکہ اُڑاتا ہے۔ مجتہدین و علما کے تقدس کا استہزا کرتا ہے۔ محبت کے فقدان پر نوحہ کرتا ہے۔ عدم مساوات پر اشکوہ و نفرت کا اظہار کرتا ہے۔ عام خیرات وعفو کی وکالت کرتا ہے —— اور اسی کے ساتھ ساتھ وہ گل و بلبل کو کبھی بھول نہیں جاتا۔ عاشق کے مصائب سے بھی باخبر ہے اور وصال کے لطائف کا بھی اُس کو علم ہے —— یہی وہ زندگی کا اعلےٰ رُخ ہے جو غالب نے اپنے صحیفہ میں پیش کیا ہے اور یہی وہ اعلیٰ شاعری کا نمونہ ہے جو اُس رنگا رنگ زندگی کا نقش ثانی کہلانے کا مستحق ہے —— دوسرے شعرا فردوسی بادلوں پر سفر کرتے ہیں یا آسمانوں کے گرد و نواح میں خلا میں گھوما کرتے ہیں یا اپنے شہپر خیال کو لاشئی کی تلاش میں اُڑایا کرتے ہیں یا اپنی خود اختراع کردہ کائنات کے کسی حصہ میں سکون حاصل کرتے ہیں۔ لیکن غالب ارضی مخلوق سے دنیاوی باتیں کرتا ہے —— اور انسانوں کے کھوئے ہوئے، گرتے ہوئے اور مکرر نقوش پا کی رہنمائی کرتا ہے۔ اور ظلمت میں شمع عرفانی سے لوگوں کے قلوب منور کرتا ہے۔

دہلی کے بعد اردو کا مرکز لکھنؤ ہوا۔ یہاں نخلِ اردو پھولا پھلا۔ آرزو، سودا و میر کے وطنِ ثانی کی شہرت میں اضافہ ہونا شروع ہوا۔ دہلی کی قدیم عظمت پر بھی لکھنؤ کی بڑھتی ہوئی شہرت کا اثر پڑا۔ ممتاز مہاجرین کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا۔ چنانچہ میر حسن، میر سوز، اور قلندر بخش جرأت لکھنؤ میں آ گئے۔ یہ اسکول واجد علی شاہ کے عزلِ سلطنت تک قائم رہا۔ ایک شاعر نے اس اسکول کے متعلق خوب کہا تھا

"خوش درخشید ولے دولت مستعجل بود"

یہاں اس عہد کے شعرا میں آتش و ناسخ کا بہت زور رہا۔

لکھنؤ کے سیاسی اقتدار کے خاتمہ کے ساتھ ہی اُس کی ادبی مرکزیت بھی رامپور منتقل ہو گئی۔ خانوادہ رامپور فیاضانہ ہنر بخشیوں میں مصروف تھا۔ اس خانوادہ نے قابل لائق افراد کو تمام اقطاعِ ملک سے اپنے دربار میں جمع کر لیا۔ نواب کلب علی خاں بہادر خلد آشیاں کے دربار میں ادبی نورتن کی سبھا قائم ہوئی۔ یہ وہ ادبی سبھا تھی جو سلطنت دہلی کے مٹنے کے بعد آخری بار رامپور میں منعقد ہوئی تھی۔ یہاں دہلی اور لکھنؤ اسکول کے اساتذہ ایک جدید اسکول قائم کرنے کے لیے شورت پر جمع ہوئے۔ یہاں لکھنؤ معیار اور دہلی معیار سمویا گیا اور ایک جدید شاعرانہ معیار وضع کیا گیا۔ ناسخ کی لفاظی اور تصنع ٹکسال باہر کیا گیا۔ اسی طرح دہلی اسکول کی چند باتیں ٹکسال باہر کی گئیں۔ سادگی، واقعیت، اصلیت یہاں کا معیار قرار پایا۔ امیر و داغ اس دربار میں ممتاز نظر آتے تھے لیکن داغ کی قدر زیادہ ہوئی۔ اور وسیع میدان اور بہت شہرت اُنکے نصیب میں آئی کیونکہ وہ حیدرآباد چلے گئے اور نظام دکن کے استاد کی حیثیت سے دنیاوی جاہ و جلال سے بھی سرفراز کیے گئے۔ امیر عالم تھے، فاضل تھے، صوفی تھے، سب ہی کچھ تھے اور اُسکے ساتھ شاعر بھی تھے لیکن داغ کے اقبال کے سامنے اُنکو وہ شہرت نصیب نہ ہو سکی جسکے فی الحقیقت امیر مستحق تھے ——

اب تک ہم نے دکن، رامپور، دہلی اور لکھنؤ کا تذکرہ کیا ہے لیکن اب ہم کو عظیم آباد کا بھی ذکرِ خیر کرنا چاہیے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ علم و ادب کی مساعیِ جلیلہ میں ہمارے وطن پٹنہ کا کیا حصہ ہے۔ مشرقی شہروں میں چند ہی شہر ایسے ہونگے جنکا ماضی اس قدر شاندار ہوگا جس قدر کہ عظیم آباد کا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے عہد میں اس شہر نے باوجود بد نصیبی شاملِ حال رہنے کے ایک ممتاز حیثیت رکھی ہے اور عظمت و بزرگی اُس پر نثار ہوتی رہی ہے وقت آئے گا جب اُس کی مستور عظمت و جلال کا عوام کو اندازہ ہو سکے گا۔ اور انکشافات سے اُسکے مدفون خزائن، شاہانہ اقتدار اور سالہا سال کی اہمیت اور ہر دلعزیزی کا پتہ چلے گا۔ اُس وقت

لوگ پٹنہ کی عزت کریں گے - عہد عالمگیری میں اسی شہر نے دہلوی شہزادوں کیلیے مرزا بیدل کا سا عدیم المثال اتالیق مہیا کیا - جن کا ادب و شاعری ہماری تحسین و توصیف سے مستغنی ہے ـــــ اور پٹنہ اُس گہر گراں مایہ کو عرصے تک فراموش نہ کرسکا -

---

مرزا بیدل کے بعد ایک دوسرا سیارہ سپہر ادب پر ضَو فشاں ہوا - ہمارا مطلب مرزا معتبر خاں سے ہے جو شاعر تھے اور فطرت تخلص کرتے تھے - فطرت نے ہمارے شہر کی عزت و وقار کو بڑھایا - باہر سے تشریف لائے اور پٹنہ کو اپنا مسکن بنالیا - جس وقت بیدل و فطرت فلک ادب پر زہرہ و مشتری کی طرح جگمگا رہے تھے اور شہر پٹنہ کی عظمت و اقتدار میں اپنی لافانی شاعری سے اضافہ کر رہے تھے اُس زمانے میں سیف خاں کی مسجد گنگا کے صاف و شفاف ساحل کے قریب اپنی تاریخی یادگاروں کے دامن عاطفت میں تمدن و تہذیب کے نشر و اشاعت میں مشغول تھی - شاد مرحوم نے خوب کہا ہے ؎

بیا مسجد سیف خاں را نظر کن مصفا تر از سینۂ پاکبازے

پٹنہ جو زینتِ عصری کے دوش بدوش تھا، دوران تیموریہ کے شاہزادوں، شاعروں، اور علما کا مسکن ہوگیا تھا - دہلی سے سیر و سیاحت کے لیے چلے، پٹنہ میں فروکش ہوے - یہاں کی فضا اور ماحول خالص ادبی ہوگیا تھا - ان مہاجرین کرام کی فہرست میں ہم کو شہزادہ عظیم الشان کا نام نامی بھی نظر آتا ہے - جنھوں نے پٹنہ کو اس قدر بلند کیا کہ اس کا نام ہی بدل دیا، اور اپنے نام پر عظیم آباد کردیا - جو آج تک شرفا کی زبان پر ہے -

فرخ سیر بھی پٹنہ کی غیر معمولی آب و ہوا سے مسحور ہو چلے تھے - نواب حسین علی خاں صوبہ دار کا محل اُس عہد میں شرفاء کا مسکن تھا - وہ خود شاعر تھے اور شعر و شاعری کی بڑھتی ہوئی آگ کو اُن کے دم سے بہت تقویت ہوئی - یہ خیال کہ شعر و شاعری کی فضا دلی اور لکھنؤ کی تاراجی کے بعد یہاں پیدا ہوئی، غلط ہے - بلکہ ہمیشہ سے عظیم آباد میں ادب پرستی چلی آتی تھی - ہاں یہ صحیح ہے کہ اُس وقت عظیم آباد نے اس تاراج شدہ قافلہ کی مہمانی سے دریغ نہ کیا تھا -

---

اُس عہد کے ایک باکمال شاعر میر غلام علی راسخ بہت ذی مرتبت تھے - وہ میر کے معاصر تھے اور اُنکی شاعرانہ اکلیل جہاں بانی کے متعلق راسخ کا جھگڑا تاریخ ادب میں یادرہیگا - راسخ کی شاعری منتہاے کمال تک پہونچ چکی تھی - وہ صوفی ہونے کے باوجود نہایت درجہ مغموم و سنجیدہ تھے - اُنکی شاعری بشریت کی انجیل ہے - اور ایسی بشریت جسکی دیواریں کسی مذہب و ملت کے فرقہ وارانہ تضاد سے علیحدہ نہیں کیجاسکتی

ہیں اور یہ ایسی غیر فانی پائدار شاعری ہے جو معاصر شعرا کے کلام میں مفقود ہے۔ ملاحظہ کیجیے

کدھر کعبہ کہاں کا عرش اعظم　　　　دل شکستہ ہے کاشانہ تیرا

امیری کیسی کیا یہ مرتبہ شاہی وزیری کا　　　　تو اے غافل شناسا ہے مدارج ہو فقیری کا

غافل تو ابھی تو انتہی ہے　　　　کب تک تم تغافل سا کرے گا

مجھے سونپ داغ فراق نے ہوئے یوں جدا کہ پھر نہ ملے　　　　مرے دل میں تا دم واپسیں وہ امانت انکی دھری رہی

یہ رنج غریبی سبب خستہ تنی ہے　　　　جوں نقش قدم اپنا وطن بے وطنی ہے

نہیں ہوش والوں پہ کچھ حسد مجھے رشک ہے تو انھوں پہ ہے

جنھیں تیرے جلوے کے سامنے مری طرح بے خبری رہی

خدا جانے نہاں اس آشکارا میں ہے کیا کیا کچھ　　　　خوشا وہ اہل دل جن پر نہاں بھی آشکارا ہے

اگر شاہی سرپرستیوں نے دہلی کے ادیبوں اور شاعروں کی پشت پناہی کی اور اودھ میں شجاع الدولہ و آصف الدولہ کے دور نوابی میں علم و ادب کی غیر معمولی قدر افزائی کی گئی تو پٹنہ بھی کسی سے کم نہ رہا۔ راجہ رام نرائن اور راجہ شتاب رائے کی صوبہ داری کے زمانہ میں ہمارے ادبیات کی وہ عزت افزائی ہوئی کہ تاریخ ہند اس کے برابر کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔ راجہ رام نرائن شیخ علی حزیں کے شاگرد تھے اور اس دور کے اساتذہ میں انکا شمار ہوتا تھا اور اردو کے عاشق تھے۔ موزوں تخلص کرتے تھے۔ راجہ شتاب رائے بھی علم و ادب کے شیفتہ تھے۔ دہلی اور دوسرے مقامات سے شعرا و ادبا آتے اور گوہر مراد لیکر مالامال واپس جاتے۔ اور اس طرح اکناف ہند میں پٹنہ کا نام روز روشن کی طرح مشہور ہو گیا۔ اس دور میں بہت سے باکمال افراد دہلی سے آئے جن میں نواب اشرف علی فغاں جو احمد شاہ کے سوتیلے بھائی تھے انکی بہت ممتاز حیثیت تھی۔ وہ بڑی روایات کے حامل تھے اور انکا اسلوب بیان بہت ستھرا تھا۔ انھوں نے پٹنہ میں اردو کے لیے جدید شاہراہ پیش کی۔ انکی ہدایات سے متاثر ہو کر اردو بہت منزہ، موثر اور نقائص سے پاک ہو گئی۔ انکا دیوان اب تک (مضافات بہار) میں محفوظ ہے۔ راجہ شتاب رائے کے صاحبزادے راجہ بہادر راجہ کو علم و ادب کے شوق و ذوق کا جذبہ اور داد و دہش کا احساس ورثہ میں ملا تھا۔ انکے دور امارت میں پٹنہ کی بڑی شہرت ہوئی اور شاعروں کی کثرت نے اردو کا مرکز اب عظیم آباد کو بنا دیا تھا۔ دور دور سے تشنگان ادب اس خمخانہ میں اپنی پیاس بجھانے کے لیے جمع ہو گئے تھے۔ چنانچہ میر شیر علی افسوس اور میر امن اسی دور کے باکمال افراد تھے جو ہجرت کر کے راجہ کے دسترخوان کرم پر بیٹھے ہوئے ہدیہ تبریک

پیش کر رہے تھے۔ یہ لوگ اُردو نثر کے بانیوں [illegible] تھا [illegible] جب انکی خدمات ادب دُہرائی جائیں گی تو یقیناً
کوئی شخص پٹنہ کو فراموش نہ کر سکے گا۔ جب ہم پٹنہ کے اوراق ہستی پر طائرانہ نظر ڈالتے ہیں تو اُن خاموش ہوں
کو بھی چھوڑ نہیں سکتے جنکی خدمات علم و ادب [illegible] آپ ہی خیال کیجئے کیا سید ہدایت علی
اسد جنگ کا نام خاموشی سے چھوڑا جا سکتا ہے [illegible] کا ادبی ذوق [illegible] ہے۔ اس ادب پرست
ہستی کی وساطت سے [illegible] کی عظمت و جلال کی صدائیں ہمارے کانوں میں سنائی دیتی ہیں۔ اُنکی
ٹھمریاں، ساون [illegible] آج ہمارے بچے بچے کی زبان پر ہیں۔ [illegible] زیادہ ہر دلعزیزی و
مقبولیت کا معیار کیا ہو سکتا ہے۔ [illegible] بحیثیت اُستادِ فن انکی شہرت پٹنہ
اور بیرونِ پٹنہ میں [illegible] تذکرہ میں اُنکا [illegible] نقل کیا ہے [1]

ہر گز یہ مرے عشق کا [illegible] اگر آ کے مری [illegible] رنگ

اُنکے [illegible] غلام حسین غالب صاحب سیر المتاخرین کی شہرت بحیثیت
[illegible] بزرگ نواب علی ابراہیم خاں خلیل صاحب
گلزارِ ابراہیم کی شہرت [illegible] کی محتاج نہیں ہے۔ اسی طرح بے نظیر فرشتہ خصلت بزرگ
[illegible] العرائس [illegible] ہر آئندہ شاعروں کے
لیے مشہور ہیں [illegible] کو بھی کسی طرح بھلایا نہیں جا سکتا۔
فریاد باکمال شاعر تھے۔ اُنکے چچا خواجہ [illegible] کے شاگرد تھے۔ [illegible] سلسلہ سے تصوف کا حصہ باکمال
اُستاد سے ملا تھا۔ اسی لیے اُنکی شاعری پر [illegible] اثر [illegible] گہرا ہے۔

---

[1] میری ایک [illegible] جانب منعطف کرائی ہے جو بہت
امید افزا ہے۔ [illegible]

[2] علی ابراہیم [illegible] مرتب کیا تھا اور جسکو
عرصہ ہوا علامہ شبلی نعمانی [illegible] مشہور ادیب ڈاکٹر محی الدین
قادری [illegible] زبان فارسی ہے [illegible] مرزا علی لطف کے
تذکرہ کی اُردو [illegible]

فریاد کی شاعری میں یہی رنگ بہت ممتاز نظر آتا ہے [illegible] یاد اسکو خانقاہِ دردکے عاقہ گوش ہوگئے کیونکہ فریاد اپنے شاعرانہ تخیل کے لئے کسی گلاب بلبل [illegible] عجب [illegible] آنکھوں یا خیر [illegible] فوق الفطرت نازک کمر کے [illegible] کاسہ گدائی پیش نہ کرتے تھے بلکہ وہ قلب انسانی سے تخیل حاصل کرتے تھے [illegible] ذاتی صابر وسنجیدہ اُنھوں نے [illegible] مقدس خیالات کو اُجاگر کیا ہے - فریاد کی شاعری نوعیت [illegible] کی ہے [illegible] اعلیٰ پیرایہ کا ثنا کے اعلیٰ طبقات سے ہی کرسکتے ہیں [illegible] ہر دور کی [illegible] منطقی [illegible] کے اعلیٰ جذبات [illegible] بھی مستور کائنات سے حاصل کرتے ہیں - انکا رنگ [illegible] کم میں [illegible] ہے [illegible] اپنے طرز میں نقائص سے مبرا اور اس خود تراشیدہ راہ پر بے خوف چلتے ہوئے نظر آتے ہیں - انکا کلام [illegible] قوت بیانیہ کا نظر آتا ہے اور استعارات و تشبیہات سے بھی مالا مال ہے [illegible] کی شاعری [illegible] کی شاعری سے خاص قسم کی ہر دلعزیزی انکو حاصل ہے کیونکہ بالعموم وہ ایسے خیالات پیش کرتے ہیں [illegible] عام طور سے [illegible] متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے -

---

شاد، جن کی موت کو ابھی کچھ زیادہ [illegible] گزرا ہے [illegible] عظمت و جلال اور تمدن و تہذیب کی آخری کڑی تھے - وہ گزشتہ نسل [illegible] افسوس ہے کہ وہ اب نہیں رہے جبکہ انکی سب سے زیادہ احتیاج تھی - آج سے [illegible] سال پہلے میری انکی پہلی ملاقات ہوئی تھی - وہ سماں اب تک میری آنکھوں میں محفوظ ہے - [illegible] وقت وہ فلک ادب پر مشہور ہو رہے تھے - یقیناً وہ اُن متقدمین کے حلقہ میں سے تھے جنکو ہم ساری سے ایام پارینہ کے ادبی مرکز سے تعبیر کرسکتے ہیں - شاد کی قابل لحاظ ادبی صحبتوں میں انکی شاعری کا عنصر نمایاں ہوتا تھا اور اس [illegible] بہت کا سی [illegible] بھی شاد کی سننے میں آئی ہیں اور وہ لطیف نظمیں اب بھی میرے حافظہ میں محفوظ ہیں - شاد کا تخیل مجھکو بہت دور لے جاتا ہے - وہ [illegible] تیز متجسس آنکھیں، انکی بدیہہ گوئی، انکی حاضر جوابی، انکی غیر معمولی بہادری، صداقت، اور اعلیٰ خودداری، انکی ظرافت، سنجیدگی کی خصوصیات اب بھی مجھکو یاد ہیں - اور اسی دور میں میں نے فرنگی محل کے مشہور عالم باعمل مولانا عبدالحی کی بھی زیارت کی تھی - اور شمس العلما علامہ شبلی نعمانی کی بھی زیارت میں نے اسی احوال میں کی تھی - کیونکہ [illegible] پٹنہ [illegible] تو نہ تھا، لیکن ادبی حیثیت سے [illegible] کا درجہ معاصر شہروں میں بہت [illegible] تھا --

(باقی)

---

۵ فریاد کی شاعری کے متعلق [illegible] - انکی شاعری کسی حد تک [illegible] کے اتباع میں ہے لیکن جو تعریف [illegible] کرنے کی [illegible] سی جا سکتی ہے - ممکن ہے صوبجاتی شاعر کی حیثیت سے فریاد نازیبا ہوں لیکن [illegible] حیثیت سے [illegible] کے شعرا میں شمار کئے جاتے ہیں - [illegible]

سودیشی چاے کا ایک گھونٹ

(مسٹر غلام احمد علوی فرقت ۔ اسسٹنٹ ایڈیٹر روزنامہ حقیقت لکھنؤ)

نمائش ۴ بجے سے شروع ہوتی تھی لیکن ہم پہنچے جب ۵ بجے ۔ اس حساب سے ہم کو پورے ۱ گھنٹے کی تاخیر ہو گئی اور ٹھیک پانچ بجے ہم نمائش گاہ میں داخل ہوئے ۔ اس سے قبل کبھی سودیشی نمائش دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا ۔ پہلی بار ہر نئی چیز دیکھنے کا اشتیاق ایک فطری بات ہے گویا ہماری فطرت سے زیادہ نمائش دیکھنے کا اشتیاق تھا۔

ٹکٹ خریدنے کے بعد جوں ہی ہم نے نمائش گاہ کے پھاٹک میں قدم رکھا دو گاڑھے کے لیڈروں نے بہ زبان سودیشی کہا "ہمرو داش کرکے" شہر کی طرف سے آئیے ۔ ہم نے ان بولی بولنے والوں پر جو نظر ڈالی تو ایسا معلوم ہوا کہ دو لیڈر […] تانا شاہی […] کے ماتحت باہر نکل رہی ہے جو خالص کھدر لئے ہیں ۔ بعد میں جب ان لیڈروں کی […] معلوم ہوا کہ یہ کانگریسی والنٹیر ہیں جو کھدر کے سردی پروف کوٹ زیب تن کیے ہیں ۔ ان کوٹ کی […] اس طرح پر ہوئی تھی کہ ان میں صرف سانس لینے اور بولنے کے دو راستے بنا دیئے گئے تھے ۔ شاید ایک راستہ اوپر کی جانب اور تھا جس سے بوقت ضرورت دیکھ بھی لیا جاتا تھا ۔ بہرحال "ہمرو داش" کرکے ہم دوسرے راستے سے جو چند بلیوں کی مدد سے پھاٹک کے اندر ہی بنا لیا گیا تھا ۔ نمائش گاہ میں داخل ہوئے ۔ یہاں پہنچکر ہمارے منہ سے نکلا سبحان تیری قدرت ۔ اور ایسا معلوم ہوا جیسے سودیشی طریقہ پر بازار مصر میں ہم فروخت کرنے کی غرض سے لائے گئے ہیں ۔ یا ہم اور ایک ہمارے کرم فرما جو غالباً اپنی […] کرنے کے لیے پھاٹک میں داخل ہوتے وقت ہمارے رفیق سفر ہو گئے تھے ایک ایسے ملک میں پہنچ گئے ہیں جہاں صرف عورتوں کی حکومت ہے ۔ اور مردوں سے سوائے الو بنانے کے اور کوئی کام نہیں لیا جاتا ۔ غرض یہ دیکھ کر ہماری اور ہمارے کرم فرما کی باچھیں ایک ساتھ کھل کر دونوں کانوں سے جا ملیں ۔ آگے بڑھے تو ایک صابن کی دکان سے آواز آئی "شودیشی شابن یہاں ملتا ہے" پچھلے تجربہ کے بعد جب ہم نے یہ سنا تو ہم کو خیال گزرا کہ اردو زبان میں سودیشی طریقے پر کچھ قطع برید منظور ہوئی ہے اور گاندھی جی نے بڑے شین کی بزرگی کو برقرار رکھتے ہوئے 'س' اور 'ص' کو 'الف بے' کی فہرست سے خارج کرکے 'پ' کو 'د' سے بدل کر سودیشی زبان تیار کر دی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہر طرف سے شین شین کی پکار ہو رہی ہے ۔ چنانچہ […] جیسے جیسے ہم آگے بڑھتے گئے ہمارا

قیاس یقین کی حد تک پہونچ گیا۔ صابن "قبلی" اور کرنٹ والے صابن کا دو چار جگہ معائنہ کرنے کے بعد ہم نے دیکھا کہ ہر طرف زرق برق قسم کی عورتوں کی اس قدر کثرت ہے کہ خود جانا دشوار ہے۔ نظر کو بہت سی رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ پہلے اخلاقاً کچھ توقف کیا۔ لیکن جب یہ معلوم ہو گیا کہ یہاں اخلاق والے کچھ نہیں کر پاتے تو مجبوراً بد اخلاقی کے زریں اصولوں پر کار بند ہونا پڑا۔ اور اس قیاس آرائی میں واقعی ہم بالکل ٹھیک اترے۔ سب سے عجیب چیز جو نمائش گاہ میں ہم کو نظر آئی وہ بقول ایک دوکاندار کے "سودیشی سوئی میں دھاگا ڈالنے والا شین تھا" (سودیشی سوئی میں تاگا ڈالنے والی مشین) یہ مشین ہم کو بہت پسند آئی ہم نے کمال باہر والی کھونٹی الگنی جیسے میلانے کی ہم کو عرصے سے فکر تھی، بیچنے والے کی گولک میں ڈال کر "سودیشی سوئی میں دھاگا ڈالنے والا شین" خرید لیا اور آگے بڑھے۔ نمائش میں اشتہارات بلا وجہ بہت تقسیم ہو رہے تھے اس لیے ہمارے دونوں ہاتھ ادھر ادھر کاغذوں سے گھرے تھے۔ دو چار دوکانوں کا معائنہ کرنے کے بعد اور مختلف دوکانوں سے سودیشی الائچی کے نمونے چکھنے کے بعد ہم نے دیکھا کہ ایک جگہ بقول شخصے "سودیشی قسم کا سفوف" بک رہا ہے۔ اس سفوف سے میلے سے میلا کپڑا چشم زدن میں صاف ہو جاتا تھا۔ صاحب معاملہ کو اس بات کا دعویٰ تھا کہ وہ میلے سے میلا کپڑا لیجانے پر سب کے سامنے محض تجربے کے طور پر صاف کرکے حوالے کر دیتے تھے۔ ہم نے موقعہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے کرم فرما کا کوٹ دکھایا جو اتنا ہی کثیف تھا جتنا سڑک کوٹنے والے انجن ڈرائیور کا کوٹ ہو سکتا ہے۔ اور کہا "کیوں جناب آپ اس کوٹ کو بھی صاف کر سکتے ہیں" اس پر صاحب معاملہ غصہ میں آکر بولے "ارے صاحب اس سے زیادہ گندے کوٹ ہم صاف کر چکے ہیں" اس سے ہمارے ساتھی کو کچھ خفت تو ضرور ہوئی تاہم ہم نے ایک ادنیٰ سی جنبش سے وہ کوٹ اتارا جو ہمارے کرم فرما کے جسم مبارک پر محض ایک ٹوٹے بٹن کے سہارے لٹکا ہوا تھا، اور صاحب معاملہ کے طشت میں ڈال دیا، جس میں سفوف اور گرم پانی ڈالا جا چکا تھا۔ اور کہا "اچھا اسکو صاف کیجیے"۔

ہماری خفت اور شرمندگی کی اس وقت کوئی حد و انتہا نہ رہی جب ہم نے دیکھا کہ کوٹ اترنے کے بعد ہمارے کرم فرما عنفت مادر زاد ہو کر رہ گئے۔ اور دونوں بغلوں میں ہاتھ ڈال کر سردی سے کٹکٹاتے ہوئے دانتوں سے ہم سے کہہ رہے تھے "یہ ... کا ... کا ... یا ... کیا"؟ ہم نے اُنکے سوال کا کوئی جواب دیتے ہوئے کہا "گھبراؤ نہیں، کوٹ صاف ہو رہا ہے" یہ کہکر ہم اس طرح دوسری طرف چل دیے جیسے کوئی ہم کو بلا رہا ہے۔ اور ایک بھیڑ میں مل کر دور سے تماشا دیکھنے لگے کہ اب کیا ہوتا ہے۔

انکا بنیا سودا کیسے، ہمارے ملاقاتی غریب کو دسمبر کی شدید سردی میں مسلسل دس منٹ تک اس

دوکان پر عہ اپنی کا مٹکا رکھا ہوا تھا کو شکس پاؤڈر میں ڈال لینے کے بعد صاف ہو کر ہمارے کرم فرما کے
حوالے کیا گیا تو وہ سوں سوں کرتے دونوں بغلوں میں ہاتھ ڈالے ہماری جستجو میں آتے نظر آئے۔ یہ دیکھ کر ہم سخت
پریشان ہوئے کہ اب اس بلائے بے درماں کو نمائش میں لیے لیے ہم کہاں کہاں پھریں گے، اور ہم دوسری طرف
چلدیے [illegible] کرم فرما کی طرف سے اطمینان کرلینے کے بعد اب ہم کو یہ فکر ہوئی کہ کوئی ساتھی ہوتا ۔۔۔ ہم اسی
فکر میں تھے کہ ہمارے چار دوست نظر آئے اور ساتھ ہو گئے۔ اتنے میں تو ہم نے ایک طرف چلنے کا قصد کیا ہی تھا
کہ دیکھا دور پر ایک صاحب چائے بنا رہے ہیں۔ قریب پہنچے تو کرسیوں پر بیٹھ جانے کا اشارہ کیا گیا۔
چار پیالیاں چائے کی اچھی خاصی بنا کر پیش کی گئیں۔ سامنے بیٹھنے کے بعد ہم کو یقین ہو گیا کہ اس میں
شکر کے بجائے بھوسوں کا پرانا شیرہ ملا کر دودھ کی جگہ چونا گھول دیا گیا ہے۔ ہم نے ایک گھونٹ پینے کے بعد بہا
زور سے "آق تھو" کی کہ تمام چھینٹیں پانی کے سامنے کے منہ پر پڑیں۔ اس پر حریف ثانی نے رومال سے اپنا منہ
پونچھتے ہوئے ہم سے دریافت کیا کہ طبیعت کیسی ہے؟ ہم نے دو چار متواتر چھینکیں لیکر کہا "بحمد اللہ زندہ ہوں"
اور اپنے چاروں ساتھیوں پر نظر کی کہ ان میں سے کوئی سودیشی چائے کی نذر تو نہیں ہو گیا۔ اس سے
اطمینان کرنے کے بعد ہم نے ایک زور کی سانس لی اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ البتہ اس سودیشی چائے کے
ایک گھونٹ میں ہمارا قریب نصف گھنٹے کے صرف ہوا اور جب ہم وہاں سے اٹھے ہیں تو طبیعت کی بحالی
اس گھونٹ کی نذر ہو چکی تھی۔ آگے بڑھ کر کیا دیکھا کہ ایک سودیشی مارواڑی ایک دوکان پر بیٹھا سودیشی
برتن فروخت کر رہا ہے۔ علیک سلیک کے بعد قیمت دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ ایک معمولی سودیشی ٹین
کی طشتری کی قیمت مبلغ چار روپیہ ہے۔ ہم نے متانت سے پوچھا "لالہ جی یہ ہر دوالے سودیشی سکے نہ؟" جواب
ملا کہ آپ "ہنسی" کرتے ہیں۔ واہ صاحب "واہ"۔ ادھر سے ہم نے دوسری طرف رخ کیا تو ایک سودیشی
کھمبا نظر آیا جس پر شروع سے آخر تک سوائے زبان سودیشی کے سوا انگریزی لکھی ہوئی تھی کہ فلاں فلاں موقع پر
فلاں فلاں دفعات کے ماتحت کھمبا فلاں جگہ سے فلاں جگہ اکھاڑ کر لگایا گیا اور پھر فلاں دفعہ کے ماتحت
فلاں فلاں جگہ پھرایا گیا۔ اس کے بعد دوسری چند دوکانیں جو دیکھنے کو رہ گئی تھیں ان پر سرسری نظر ڈالنے کے
بعد ہم ٹھیک دس بجے گھر واپس آ گئے۔ سودیشی چائے کا گھونٹ ہم کو اب تک یاد ہے۔

جھٹپٹے کے تاثرات

(جناب منشی شبیر حسن خاں صاحب جوش ملیح آبادی)

ہوائے شام جب بھرتی ہے ٹھنڈی سانس صحرا میں
مجھے ہر ایک پتی نوحہ خواں معلوم ہوتی ہے

فضائے تیرہ پر جس وقت چھا جاتا ہے سناٹا
مجھے جنبش میں ذروں کی زباں معلوم ہوتی ہے

شفق کے ہر نفس اڑتے ہوئے اوراقِ سوزاں میں
مجھے بیتابیِ عمرِ رواں معلوم ہوتی ہے

زمین و آسماں جب ظلمتوں میں ڈوب جاتے ہیں
حیاتِ نوعِ انساں رائیگاں معلوم ہوتی ہے

بلند و پست و آب و رنگ جب کچھ بھی نہیں رہتے
یہ دنیا صرف اک وہم و گماں معلوم ہوتی ہے

کھنکتی ہے مزے سے جب گلے جنگل کے سناٹے
ہوائے سرد میری ہم زباں معلوم ہوتی ہے

ٹپک پڑتا ہے آنسو کی طرح جب مہرِ گردوں سے
لبِ جاں پر صدائے الاماں معلوم ہوتی ہے

دلِ وادی سے اٹھتا ہے دھواں جس وقت ہلکا سا
پہاڑوں کی بلندی سرگراں معلوم ہوتی ہے

چھپا لیتی ہے خشک و تر کو جب شام اپنے آنچل میں
بشر سے روحِ عالم سرگراں معلوم ہوتی ہے

دیا، کچھ فاصلے پر ٹمٹماتا ہے جب بن میں
سیاہی رہروؤں کی رازداں معلوم ہوتی ہے

جھلک اٹھتا ہے جب پہلا ستارہ بامِ گردوں پر
کلیجے پر مجھے نوکِ سناں معلوم ہوتی ہے

فلک کے ہاتھ سے جب پرچمِ زر چھوٹ جاتا ہے
زمیں اک کشتیِ بے بادباں معلوم ہوتی ہے

فرازِ چرخ پر رہ رہ کے جب کوندا لپکتا ہے
اداسی کارواں در کارواں معلوم ہوتی ہے

کلی کے مسکراتے ہی، حیات و موت میں مل کر
[illegible] معلوم ہوتی ہے

مہک پھولوں کی میداں پر چھا جاتی ہے [illegible]
کسی کی یاد روحوں پر فشاں معلوم ہوتی ہے

گھنیرے باغ میں جس وقت دو دل [illegible]
[illegible] معلوم ہوتی ہے

شفق کو دیکھتے ہی وہ محبت [illegible]
[illegible] معلوم ہوتی ہے

رنگیلی ڈھال پر انگڑائی لیتا ہے اک افسانہ
تری [illegible] موڑ پر اک داستاں معلوم ہوتی ہے

یہ [illegible]
مجھے تو جوش اک خوابِ گراں معلوم ہوتی ہے

اسلام ماضی و حال

(جناب آبر احسنی گنوری)

اسلام اولیں اے سرچشمۂ ہدایت — تو تھا خدا کی رحمت تجھ پہ خدا کی رحمت
دنیا کو تھا سہارا صرف ایک تیرے دم کا — تاریک وادیوں میں تو نور بن کے چمکا
جب کفر کا جہاں میں دریا اُبل رہا تھا — حق آ کے صرف تیرے دامن میں پل رہا تھا
مجبوریوں سے پلٹی جہان کی کایا — باطل کے خرمنوں پر تو برق بن کے چمکا
رنگینیوں نے تیری رنگت دونی مٹا کر — بندوں سے تو نے بندے اللہ سے ملا کر
سادہ چٹائیوں پہ سوتے تھے تیرے سلطاں — آرائشیں ہزاروں اس سادگی پہ قرباں
رنگیں نوائیوں پہ رجھ رجھ گیا زمانہ — تو سرمدی ترنم تو قدرتی ترانہ
ظاہر ہوا تجھی سے انسان پہ زورِ انساں — دنیا تھی جن کی آنوں پر تیری ہی لب بدنداں
گلشن سے بڑھ کے چھایا پُرخار جھاڑیوں پہ — تیری جو وادیوں سے چمکا پہاڑیوں پر
تھی جنگ میں کبھی طاعت وہ تیرے غازیوں کی — تکبیر گونجتی تھی صف سے نمازیوں کی
تاریکیوں سے سارا عالم ہوا تھا سونا — سینا ہر ایک ذرہ تھا طور کا نمونا
ادیان اسبق تجھے بھولا ہوا فسانہ — نقشِ قدم پہ تیرے چلتا تھا سب زمانہ
جوہر کئی حق گویا نموسیت کی کٹ کر — تجھ میں ہی آ گئی تھیں سب خوبیاں سمٹ کر
دعوے برابری کے رکھتا تھا ہر مسلماں — اک اونٹ پہ رواں تھے باہم غلام و سلطاں
برپا کیا تغیر دنیا کی حالتوں میں — اک آگ سی لگا دی تو نے جہالتوں میں
تو نے ہی دور کی تھی حیوانیت کی صورت — سیکھی ہر آدمی نے تجھ سے ہی آدمیت
حق بات پہ وہ تیرے شیدائیوں کا اڑنا — جانوں پہ کھیل جانا شعلوں میں کود پڑنا
باطل نوازیوں پہ ڈٹ جانا غیر ممکن — راہوں سے تیری کوئی ہٹ جائے غیر ممکن
تیری پناہ میں سب رومی ہوں یا کہ شامی — تو بیکسوں کا والی تو غمزدوں کا حامی
قائم کیے وہ تو نے معصومیت کے رشتے — انسان رہ گئے تھے بن بن کے سب فرشتے
تو کام کر رہا تھا جس وقت فرشیوں میں — اُن کی ریاضتوں کے چرچے تھے عرشیوں میں

انصاف آکے تیرے قدموں کو چومتا تھا — وہ لاش پر بھی دڑے، وہ لاڈلا عمرؓ کا
نظروں میں گھومتی ہے تیری وہ پیاری صورت — تھا جا بجا سراپا یک تو پیکرِ محبت
اللہ اب یہ عالمِ مسلم کی خودسری کا — جیسے کبھی جہاں میں اسلام ہی نہیں تھا
ذلت کی وادیوں میں غفلت سے سو گیا ہے — مرکز سے اپنے ہٹ کر ظلمت میں کھو گیا ہے
تا اہلِ مسلموں کے دل سے حجاب اُٹھا جا — اسلامِ اولیں آ مسلم انھیں بنا جا
نغموں کو تیرے سن کر سب جھوم جائے خلقت
پھر بج اُسی ادا سے پھر سازِ فطرت

سلام

(مسٹر علی رضا خاں رضاؔ اٹاوی - غازی آباد)

بھری رن میں پڑی ہے لاش سرور دھوپ میں — ہائے یوں مرجھائے زہراؓ کا گلِ تر دھوپ میں
بے کفن دیکھا جو لاشہ سرورِ کونین کا — سایہ افگن ہو گئے جبریل کے پر دھوپ میں
خیمۂ آلِ محمدؐ میں قیامت آ گئی — نیزۂ خونی پہ چمکا شہ کا جب سر دھوپ میں
عصر کا ہنگام تھا مصروفِ سجدہ تھے حسینؑ — عین سجدے میں نمازی کا کٹا سر دھوپ میں
اے علی اکبرؑ اُٹھو زینبؓ کو پردے میں کرو — بنتِ حیدرؓ آ گئی خیمے سے باہر دھوپ میں
ڈھانپتی ہے خاک اُڑ اُڑ کر شہیدوں کے بدن — بیکسوں پر کون ڈالے آکے چادر دھوپ میں
چھپ گیا مہرِ فلک تھرا گیا عرشِ بریں — سر سے جب کھینچی گئی زینب کے چادر دھوپ میں
پیاس سے یوں خشک تھی معصوم اصغرؑ کی زباں — سوکھ جائے جس طرح برگِ گلِ تر دھوپ میں
اے قیامت چھپ کے بیٹھی تھی کہاں عاشور کو — شمر نے چھینی تھی جب زینبؓ کی چادر دھوپ میں
پیاس کا سرورؐ کی کتنا پاس تھا عباسؑ کو — آج تک لیٹے ہیں دریا کے برابر دھوپ میں
جذبۂ غیرت ترا کیا ہو گیا آبِ فرات — تین دن پیاسی رہی آلِ پیمبرؐ دھوپ میں
اے رضاؔ بے چین ہو جاتی تھیں بنتِ مصطفےٰ
جب نکلتے تھے کبھی شبیرؑ و شبرؑ دھوپ میں

حضرت عباسؓ

ساقی نامہ کا آخری ٹکڑا اصل جنگ ـــــ پر

(از جناب حکیم سید علی صاحب آشفتہ لکھنوی)

یہ چند بند ایک نوتصنیف مرثیہ کے ہیں جس میں ڈیڑھ سو سے زائد بند ہیں۔ مرثیہ کے متعدد اجزا لکھنؤ اور بیرون جات کی مختلف مجلسوں میں پڑھے جا چکے ہیں اور بقیہ کے لیے دور دراز مقامات سے حکیم صاحب مدعو ہیں۔ ہمارا یہ حصہ کسی مجلس میں پڑھنے کے بعد انشاءاللہ آئندہ نذر ناظرین ہوگا۔ ایڈیٹر

ساقی سمجھ لیا کہ یہ ہے کون گلعذار زخمی لب فرات کھڑا ہے جو جاں نثار
کیا میں تجھے بتاؤں یہ کس کی ہے یادگار تیرا ہی لخت دل تو ہے عباسؑ نامدار
پہچان لے کہ دھوپ سے تو تمتما گیا ہے آج
وہ پیاس ہے کہ پیاس سے سنولا گیا ہے آج

ذرہ جو دشت کا ہے وہ شعلہ ہے آگ کا جو ڈھیر خاک کا ہے وہ تودا ہے آگ کا
سیلاب دوڑتا نظر آتا ہے آگ کا صحرا تمام آگ کا دریا ہے آگ کا
پھنکتی ہے برق آگ لگی ہے سحاب میں
شعلوں کی جا رہی ہے لپک آفتاب میں

تیورا رہا ہے اپنے ہی شعلوں سے آفتاب دیتا ہے اپنی آپ دوہائی خود التہاب
اک آتشیں کرہ ہے کہ پانی پہ ہے حباب ہے انقلاب طبع سے عالم میں انقلاب
شعلے بھڑک کے دامن صحرا جلاتے ہیں
چاروں طرف سے آگ کے طوفان آتے ہیں

لو دے رہے ہیں زخم دھواں بن گیا ہے خون جوش وغا میں غیظ سے کیا کیا جلا ہے خون
حدت وہ ہے کہ برق سے بھی کچھ سوا ہے خون چہرہ سفید ہو گیا اتنا بہا ہے خون
دامن سے پاک اس رخ زیبا کی گرد کر
یہ آگ سلسبیل کے چھینٹوں سے سرد کر

اس کے سوا ہے کون سہارا حسینؓ کا　　بس اب یہی ہے چاہنے والا حسین کا
کنبہ ہے تین دن سے جو پیاسا حسینؓ کا　　آیا ہے بن کے نہر پہ سقا حسین کا
میرے لیے بھرے ہوں جو ساغر انڈیل دے
لِلّٰہ اس کی مشک میں کوثر انڈیل دے

اب خون دوں پیوں گا کہاں کی شرابِ ناب　　اب تو یہی خوشی ہے کہ ہو جائے دل کباب
ے ہو گی نماک باعثِ تسکینِ اضطراب　　طبقے پلٹ رہے ہیں وہ آیا ہے انقلاب
انصاف کے گلے پہ چھری پھرنے والی ہے
بجلی ستم کی ٹوٹ کے پھر گرنے والی ہے

پھر آگئی سمٹ کے سپاہِ ستم شعار　　فوجوں سے پھر چھلک گیا میدانِ کارزار
پھر ہیں کہیں فرات پہ سو اور کہیں ہزار　　میکش نثار اے مرے عباسؓ ہوشیار
زخمی سمجھ کے برچھیوں والے نہ گھیر لیں
ڈرتا ہوں دشمنوں کے رسالے نہ گھیر لیں

پیکاں چلے ہیں جو رگِ دنیا سے ہوشیار　　ہاتھوں سے سرے سینۂ زیبا سے ہوشیار
عباسؓ اپنے دل کی تمنا سے ہوشیار　　مشتاقِ سکینہؓ ساتھ ہے اعدا سے ہوشیار
تیغیں ہیں برچھیاں ہیں سنانیں ہیں ہر طرف
ہاتھوں میں دشمنوں کے کمانیں ہیں ہر طرف

دی خوب دادِ جنگ طبیعت سنبھل گئی　　دشمن سے نہر چھین لی حسرت نکل گئی
افسوس مشک بھرتے ہی قسمت بدل گئی　　پھر دشمنوں سے نہر پہ تلوار چل گئی
زخمی جو شیر ہے تو زمیں تھرتھراتی ہے
اڑتا ہے خوں ہوا میں جو تلوار جاتی ہے

خوں سے زمیں ہے سرخ ہوا سرخ آب سرخ　　اک ایک موج سرخ ہے چترِ حباب سرخ
سب کائنات سرخ مہ و آفتاب سرخ　　یہ سب تو خیر خود نظر احتساب سرخ
وہ بحرِ خوں رواں ہے کنارا نہیں کہیں
رن بولتا ہے آج سہارا نہیں کہیں

زخمی اسد کو چھیڑ دیا قہر ہو گیا　　رگ رگ میں تاؤ کھا کے لہو زہر ہو گیا

دریا رواں لہو کا لبِ نہر ہوگیا　　وہ رن پڑا کہ نقشِ فنا دہر ہوگیا
دوشِ ہوا پہ سر بھی ہیں لاشے بھی خون بھی
ذرے فضا کو ہے حرکت بھی سکون بھی

تلوار ہے کہ صاعقۂ برقِ طور ہے　　جس سے ملی وہ جامۂ ہستی سے دور ہے
اللہ رے اقتدار یہ شانِ غرور ہے　　اک اک سے کہہ رہی ہے کہ مرنا ضرور ہے
میں ہوں عدو ہے رن ہے ترائی ہے شیر ہے
ملتی ہے آسماں سے زمیں تھوڑی دیر ہے

تو شرط ہے کہ عرش کے تارے نہ توڑ دوں　　اس چرخِ نیلگوں کے کنارے نہ توڑ دوں
فوجوں کے دل یہ سارے کے سارے نہ توڑ دوں　　تم پر تمہارے ظلم کے آرے نہ توڑ دوں
دشمن پہ آ چلی ہے تباہی ترے نثار
زخموں سے چور باندھے سپاہی ترے نثار

جتنا ادھر سوا نظر آتا ہے اہتمام　　بڑھتا ہے اور دل میں ادھر جوشِ انتقام
دشمن نے خاندانِ رسالت کیا تمام　　بس ایک میں ہوں اک علی اکبرؑ ہے اک امام
یہ بھیڑ کچھ تو چھانٹ دوں اکبرؑ کے واسطے
فوجیں کچھ اور کاٹ دوں اکبرؑ کے واسطے

ان کو بڑا غرور ہے کثرت پہ ناز ہے　　آپس میں مشورے ہیں ہم ساز باز ہے
یہ ان کو کیا خبر کہ خدا کارساز ہے　　اولادِ مرتضیٰؑ کو بڑا امتیاز ہے
تو شرط ہے کہ جور کی دنیا الٹ نہ دوں
کوفہ پہ شام، شام پہ کوفہ الٹ نہ دوں

غزل شیخ بنے میاں صاحب جوہر چاندوڑی

کہاں تیری جفا نے مار ڈالا　　مجھے میری وفا نے مار ڈالا
عدو پر رات دن تیرا کرم ہے　　تری طرزِ وفا نے مار ڈالا
زمانہ مٹ گیا تیری ادا پر　　بہانا ہے قضا نے مار ڈالا
جدھر اٹھی کیا اک حشر برپا　　نگاہِ فتنہ زا نے مار ڈالا
کسی پہلو نہیں آرام دل کو　　زمانے کی ہوا نے مار ڈالا

انتخاب مشاعرۂ غازی آباد

مصرعہ طرح - تو مشق ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر

منشی کالی چرن صاحب اخترؔ دہلوی

قفس میں پھیر دیتا ہے چھری صیاد گردن پر
پھڑکتے ہیں کبھی اُڑنے کو جب سوئے نشیمن پر

نہ مرنا جینے ہی ہرگز نہ کرنا خونِ خودداری
نہ رکھنا بھول کر بھی بارِ احساں اپنی گردن پر

نگاہِ سیر میں پہونچی نہیں اس راز تک ورنہ
بہارِ بوستاں بن کر خزاں چھائی ہے گلشن پر

جناب ارمان میرٹھی

ذرا سی بات ہے محشر میں جھگڑا ہو گیا برپا
ہیں دو چار دھبے خون کے ہیں اُنکے دامن پر

مٹاتے ہیں بگولے روز اُٹھ اُٹھ کر مری تربت
مری مٹی بھی شاید بار ہے صحرا کے دامن پر

جناب اظہر

نہ جانے کس بلا کی ہے کشش ان چار تنکوں میں
نظر صیاد کی ہر وقت رہتی ہے نشیمن پر

یہ کیا کم ہے کرم صیاد کا اتنی اجازت ہے
نگاہیں میں قفس سے ڈال لیتا ہوں نشیمن پر

قفس میں اور کچھ مجھکو مری قسمت نہ سنوائے
یہ کیسی روشنی یارب ہوئی شاخ نشیمن پر

عبد الرحمٰن صاحب برقؔ غازی آباد

جسے دامِ رگِ گل سے کیا تعبیر انساں نے
خطِ طغرا میں ہے حرفِ خدا ہر گُل کے دامن پر

برنام داس صاحب جوہرؔ دہلوی

بہاریں چار دن کی چاندنی ہیں آتی جاتی ہیں
رہیں گی تا بکے اٹکھیلیاں بلبل کی گلشن پر

عبد الحمید صاحب حمیدؔ میرٹھی

یہی دو چار تنکے خانہ بربادی کا باعث ہیں
نہ یہ ہوتے نہ آتیں آفتیں میرے نشیمن پر

مشتاق احمد صاحب شائقؔ صہبائی میرٹھی

نوید زندگی دے کوئی اجزائے پریشاں کو
وہ پھر فاتحہ آج آرہے ہیں میرے مدفن پر

منشی چندی پرشاد صاحب شیداؔ دہلوی

نظر موسیٰ کی کیا پڑتی جمالِ برقِ ایمن پر
تجلی ریزیوں کی تھی نقاب اُس روئے روشن پر

پشیمانی سے اشکِ خوں نہیں نکلے سرِ محشر — سمٹ کر آ گیا گلزارِ جنت میرے دامن پر
سمجھ تو لے ذرا پہلے حقیقت کیشیاں انکی — جہالت سے ہوا کیوں شیخ خندہ زن برہمن پر

جناب صافی میرٹھی

الٰہی خیر گلشن میں کہیں صیاد آ پہونچا — نظر پڑتی ہے کس کی برق بن بن کر نشیمن پر
فنا کے بعد چمکی ہے دلِ پُرداغ کی قسمت — چڑھانے آئے وہ پھولوں کی چادر میرے مدفن پر

علی رضا صاحب رضا اٹاوی

نہ پوچھو حالِ دل اُس سے جو ہنگامِ اسیری بھی — نگاہیں چپکے چپکے ڈال لیتا ہو نشیمن پر
جفاؤں پر وہ اپنی ڈالتے ہیں اس طرح پردہ — چڑھانے آئے ہیں پھولوں کی چادر میرے مدفن پر

بابو لال صاحب غافل سکندر آبادی

اُنھیں مشقِ ستم کا جب زمانہ یاد آتا ہے — گھڑی بھر کے لیے آ بیٹھتے ہیں میرے مدفن پر

جناب کامل

شفق تم جسکو کہتے ہو مرا خونِ تمنا ہے — رہیگا حشر تک یہ مدعی گردوں کی گردن پر

حکیم عبد الغنی صاحب مسیح غازی آباد

ہزاروں چاندنی راتوں کو رونے کا نتیجہ ہے — وہ آنسو جو ستارا بنکے چمکا اُنکے دامن پر
کہیں اشکِ ندامت زندہ کرسکتا ہی عاشق کو — کھڑے رویا کریں وہ عمر بھر اب میرے مدفن پر
زمیں ٹھکرا رہی ہے جذبِ سے گورِ غریباں کی — وہ جب سے نام اپنا لکھ گئے ہیں میرے مدفن پر

ڈاکٹر سرداری لال صاحب نشتر میرٹھی

یہ منظر کیا قیامت ڈھائیگا یارانِ گلشن پر — نشیمن میں ہوں میں بجلی چمکتی ہے نشیمن پر
کیا بعد فنا یہ اور اک اندھیر دنیا نے — مجھے مدفن میں رکھکر شمع رکھدی میرے مدفن پر
فلک بھی پھول برساتا ہے مجھپر اے تری قدرت — ستارے ٹوٹ کر گرتے ہیں اکثر میرے مدفن پر
جلائی شمع بھی تم نے تو مجھکو فائدہ کیا ہے — اُجالا شمع کا ہوتا ہے مدفن میں کہ مدفن پر

ہربلغ چند ظاہری غازی آباد

بڑھایا دل کو قاتل کے تری کہ کرکے یہ ہمنے — "تو مشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر"

لا اعلم

چمن والو ذرا تم یہ فریبِ برق تو دیکھو — کہ کوندے آسماں پر اور گرے میرے نشیمن پر

ہندو مسلمانوں میں اتحاد کیونکر ہو سکتا ہے؟

کانپور کی تحقیقاتی کمیٹی کی سفارشیں

(سلسلۂ ماہ فروری)

از ظفر الملک

تیسری اختلافی یادداشت راقم الحروف کی تھی۔

رپورٹ کے حصۂ اول یعنی تاریخی بیان کے بعض اجزا کے متعلق اختلاف کا اظہار حواشی میں کر دیا گیا تھا جو اصل رپورٹ کے ساتھ ہی پیش کیے جا سکتے ہیں۔ انشاء اللہ مناسب موقع پر اس تاریخی بیان کے وہ ضروری حصے بھی شائع کیے جا سکیں گے جو حکومت کی زد میں نہیں آتے۔

رپورٹ کے حصہ دوم یعنی حادثۂ کانپور کے حالات سے کسی قسم کا اختلاف کرنے کی ضرورت نہ تھی اگر ایک نہایت ہی ناگوار واقعہ نہ پیش آجاتا۔ رپورٹ کی ترتیب بنارس میں ہوئی۔ اور اس سلسلہ میں چند بار وہاں جانا اور کئی کئی دن قیام کرنا پڑا۔ تقسیم کار کے اصول پر رپورٹ کے مختلف اجزا کی تسوید جدا جدا اراکین سے متعلق تھی۔ جب کامل مسودہ تیار ہو گیا تو کمیٹی کے جملہ اراکین نے بشمول صدر یکمشت سارے مسودہ پر غور و بحث کر کے مناسب ترمیمات و تغیرات کے بعد اُسے منظور کیا۔ جو اراکین کسی جزو سے اسکے بعد بھی اتفاق نہ کر سکے اُن کو اپنی یادداشتوں کے ذریعہ اختلاف کے اظہار کا موقع تھا۔

حادثۂ کانپور کے حالات کے باب میں عام طور سے کوئی اختلاف نہ تھا۔ البتہ ایک جزء ایسا تھا جس کے متعلق ایک رکن کا خیال تھا کہ رپورٹ میں اس کو شامل کرنے کی ضرورت نہیں۔ بات یہ تھی کہ جن اصحاب نے کمیٹی کے استفسارات کے تحریری جوابات ارسال کیے اور کمیٹی کے روبرو شہادتیں دیں عام طور پر اُن سب کی شہادتیں برسرعام لی گئی تھیں۔ صرف کانپور کی کانگرس کمیٹی کے اراکین کے بیانات علحدہ بصیغۂ راز لیے گئے۔ اور پنڈت گنیش شنکر ودیارتھی کے واقعۂ قتل سے متعلق بھی بعض بیانات صیغۂ راز میں لینا پڑے تھے، اس لیے کہ شہادت دینے والے اجلاس عام میں بیان دینے کے لیے آمادہ نہ ہوے اور کمیٹی یہ چاہتی تھی کہ ملک کے اس مخلص اور بہادر خادم کی عبرتناک ہلاکت کے واقعات کی پوری طرح چھان بین کرے۔

کانپور کے کانگرسی اصحاب کے بیانات کے اقتباسات بغیر اُنکے نام ظاہر کیے ہوے رپورٹ میں

درج کیے گئے تھے۔ جنکے مطالعہ سے واضح ہوتا تھا کہ ہندو مسلمانوں کے تعلقات کے باب میں کانپور کے کانگریسی کارکنوں کے رجحانات کس قسم کے تھے۔ مگر جب ایک رُکن نے اس جزو کے رپورٹ میں شامل کرنے سے اختلاف ظاہر کیا تو خیال ہوا کہ یہ حصہ خارج ہو جائے گا۔ لیکن جن صاحب نے یہ حصہ قلمبند کیا تھا اُنھوں نے باصرار کہا کہ ایسا ہرگز نہ ہوگا۔ چنانچہ جس وقت رپورٹ کا یہ حصہ زیر بحث آیا اُسوقت اختلاف کرنے والے رُکن کی رائے کا احترام کرتے ہوے اُس میں مناسب ترمیمات کر دی گئیں لیکن اصل حصہ خارج نہیں ہونے پایا۔ کمیٹی کا کام ختم ہو گیا تو میں لکھنؤ چلا آیا۔ اور جن ارکین کے سپرد یہ خدمت کی گئی تھی کہ رپورٹ پر نظر ثانی کر کے اُس کی عبارت کو اور چُست بنا دیں وہ الہ آباد تشریف لے گئے۔ الہ آباد میں جب رپورٹ مکمل طور پر تیار ہوئی تو اُس کی متعدد نقلیں کرا کے ایک نقل مجھے ارسال کی گئی اور ایک نقل جو صدر کانگریس کی خدمت میں بھیجنے کے لیے رکھی گئی تھی اس غرض کے لیے وصول ہوئی کہ اُس پر اپنے دستخط ثبت کروں۔ دستخط کرنے سے قبل اُسکی ورق گردانی کی گئی تو یہ دیکھ کر حیرت کی انتہا نہ رہی کہ رپورٹ سے یہ حصہ حذف کر دیا گیا ہے۔ احتجاج کرنے پر اصل مسودہ لکھنؤ آیا اور اُس میں سے یہ جزو نقل کرنے کے بعد اپنی اختلافی یادداشت میں اضافہ کرنا پڑا۔ اگر رپورٹ ضبط نہ ہو جاتی اور عام طور پر شایع ہوتی تو غالباً کانگریسی حلقوں میں میری یہ حرکت عدد رجہ قابلِ سرزنش قرار پاتی۔ مگر جس کی ساری زندگی اس قسم کی غیر آئینی اور بے اصول کارروائیوں کے خلاف جنگ کرنے میں گزری ہو اُسکے لیے سوا اسکے چارہ نہ تھا کہ وہ لومۃ لائم سے بے پروا ہو کر اس ذمہ داری کو اپنے سر لے۔

رپورٹ کے حصہ سوم یعنی سفارشات سے زیادہ اختلاف کرنا پڑا۔ اختلاف کا بڑا سبب تو یہ تھا کہ حصۂ سفارشات کی تسوید اس مطمح نظر سے کی گئی تھی کہ ہندو مسلمان تمدنی حیثیت سے ایک دوسرے میں مُدغم ہو جائیں اور ظاہر میں کوئی امتیاز باقی نہ رہے۔ کہا جاتا ہے کہ ممالک متحدہ یورپ و امریکہ میں عیسائیوں کے مختلف فرقے یا مسیحی اور یہودی باہم اس طرح زندگی بسر کرتے ہیں کہ مذہبی عقائد میں اختلاف کے باوجود لباس، وضع قطع، طریقہ ماندوبود میں بظاہر کوئی فرق نہیں معلوم ہوتا اور اسی کی تقلید کرنے کا خیال ہندوستان میں بھی انگریزی خواں طبقہ کے ایک گروہ میں پایا جاتا ہے۔ مگر یورپ و امریکہ میں مذہبی اختلاط جس درجہ پر پہونچ گیا اور نسل و رنگ کے امتیازات جس حد تک قائم ہو گئے ہیں اُن سے چشم پوشی کرنا قرین انصاف نہیں۔

جو لوگ اسلام کو دنیا کا آخری اور کامل ترین مذہب مانتے اور قرآن و سنت کے اتباع کو نجات اُخروی کا ذریعہ جانتے ہوں وہ کیسے اس کو قبول کر سکتے ہیں کہ اسلامی تعلیم کو پس پشت ڈال دیں اور ہندو مسلمانوں کے کامل تمدنی ادغام کو منظور کر لیں۔

اس بنیادی اختلاف کا ذکر یادداشت کے شروع میں کرنے کے بعد، سفارشات ذیل سے کُلاً یا جزواً

حلات کیا گیا :-

(۱) تمدنی و اقتصادی سفارشات کی دفعہ ۲ (صفحہ الناظر ماہ جنوری) میں مشورہ دیا گیا ہے کہ "ہولی، دیوالی، عید الفطر اور شب برات" کو "دونوں جماعتوں کے مشترک تہوار کی حیثیت دی جائے، اور نئے مشترک قومی تہوار رائج کیے جائیں"

چونکہ مذہبی امور میں "بدعت" شرعاً ممنوع ہے اس لیے اس سفارش کا جزو ابتدائی تو قطعاً ناقابل قبول ہے۔ البتہ آخری جزو قابل قبول ہو سکتا ہے اگر نیا تہوار جو رائج کیا جائے اُس کے منانے کا طریقہ ایسا رکھا جائے کہ وہ ایک خالص معاشرتی تقریب رہے اور کوئی ایسی بات اُس میں داخل نہ کی جائے جو مذہبی نقطۂ نظر سے مسلمانوں کے لیے قابل قبول نہ ہو۔ کیونکہ جس طور سے عموماً ہندو تہوار منائے جاتے ہیں مسلمان ان کی پیروی سے معذور ہیں۔

بے شبہ موجودہ طرز زندگی، یہاں ہندوستان میں نیز دوسرے ممالک اسلامیہ میں، عام طور پر اسلامی تعلیم کے مطابق نہیں ہے۔ ٹھیک یہی حالت دوسرے اور پرانے مذاہب کے متبعین کی ہے کہ وہ اپنے مذاہب کی تعلیمات کے مطابق زندگی نہیں بسر کرتے، جس کے وجوہ ظاہر ہیں اور یہاں اُن پر بحث کی حاجت نہیں لیکن یہ واقعہ کہ ہمارے برادران ملت کا طریق کار درست نہیں ہے، غلط مشورہ دینے کی وجہ نہیں قرار پا سکتا۔

(۲) دوسرے مذاہب کی تعلیمات کے متعلق میں وثوق کے ساتھ نہیں کہہ سکتا لیکن اسلام کی تعلیم میرے عقیدہ میں ایسی جامع ہے کہ روزانہ زندگی کی ادنیٰ سے ادنیٰ تفصیلات پر ہمارے مذہبی احکام حاوی ہیں۔ لباس اور وضع جس کا ذکر دفعہ ۴ (صفحہ الناظر ماہ جنوری) میں ہے عام طور پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مذہب سے کوئی تعلق نہیں رکھتے —— کم سے کم آزاد خیال اصحاب تو یہی سمجھتے ہیں —— لیکن کوئی مسلمان ایسا لباس نہیں پہن سکتا اور نہ اُسے پہننا چاہیے جو اُس کے مذہبی اعمال مثلاً نماز کی ادائی میں ہارج یا مانع ہو۔ اور ہر مسلمان کی وضع بھی اسلام کے پسندیدہ طریقہ کے مطابق ہونا چاہیے۔ اس بنا پر یہ امتیاز، خواہ بد نما ہو یا نہ ہو، ترک نہیں کیا جا سکتا بلکہ قائم رکھنا لازمی ہے۔

(۳) دفعہ ۵ (صفحہ الناظر ماہ جنوری) پردہ موقوف کرنے کی سفارش کرتی ہے۔ پردہ کا جو طریقہ یہاں رائج ہے، میں جانتا ہوں کہ اُس میں بعض تبدیلیوں کی ضرورت ہے اور میں خوشی کے ساتھ ایسی ترمیمات قبول کروں گا جو مذہبی اجازت کے حدود سے باہر نہ ہوں مگر پردہ کی موقوفی مذہب میں مداخلت کے مرادف ہوگی جسے مسلمان منظور نہیں کر سکتے اور نہ اُنھیں منظور کرنا چاہیے۔ دراصل یہ ایک خالص خانگی مسئلہ ہے جسے مسلمانوں پر چھوڑ دینا چاہیے تاکہ وہ اسے اپنے مذہبی و معاشرتی خیالات کے مطابق حل کر سکیں۔

(۴) میں دفعہ ۹ (صفحہ ۸ ماہ جنوری) سے عام طور پر متفق ہوں لیکن اس بات کی وضاحت کر دینا چاہتا ہوں کہ اپنے گھر کے اندر چوپایوں کے ذبح کرنے کے حق میں، قانون سازی یا انتظامی احکام کے ذریعہ مداخلت کی جائے گی تو مسلمانوں اور دوسرے گروہوں کو ہمیشہ بجا طور پر اس سے شکایت پیدا ہوگی اور مجھے امید ہے کہ اس دفعہ کے الفاظ خصوصاً یہ جملہ کہ "عام ملکی قوانین کے ماتحت ہونی چاہیے" اس امر کے لیے نہ بہانہ بنائے جائیں گے کہ ایسے قوانین بنائے یا نافذ کیے جائیں جو کسی شخص کے آزادانہ طور پر مذہبی احکام کی تعمیل کرنے یا شہری آزادی کے حق میں مزاحم ہوں۔

ہر مسلمان پر لازم ہے کہ جہاں وہ اپنے مذہبی فرائض کو آزادی سے اور بغیر کسی روک یا مزاحمت کے انجام دے وہیں اس باب میں پورا اہتمام اسے کرنا چاہیے کہ ہمسایہ کو کسی قسم کی شکایت کا موقع نہ ملے۔

(۵) تعلیمی سفارشات پر عموماً اتفاق ہے مگر مندرجہ ذیل کے متعلق چند باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔

(الف) دفعہ ۳ (صفحہ [illegible] الناظر ماہ دسمبر) کی تمہید میں بیان کیا گیا ہے کہ غیر فرقہ وارانہ درسگاہوں کے ہندو مسلمان طلبہ زیادہ وسیع النظر ہوتے ہیں۔ جو میرے خیال میں صحت پر مبنی نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں لوگوں کے نام لینا مناسب نہ ہوگا لیکن میں بے خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ ممتاز مسلمان وطن پرستوں میں سے اکثر اصحاب مسلم یونیورسٹی (سابق ایم اے او کالج علیگڑھ) کے تعلیم یافتہ ہیں یا اس سے وابستہ رہے ہیں ——— حالانکہ ہندو سنگھٹن کے ممتاز رہنماؤں کی بہت بڑی تعداد غیر فرقہ وارانہ کالجوں کے طلبائے سابق میں سے ہے۔

یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ اس دفعہ کے تحت میں جو سفارشیں کی گئی ہیں وہ ان درسگاہوں پر حاوی نہیں جو خاص طور پر مذہبی تعلیم دینے کے لیے ہیں۔

(ب) دفعہ ۶ (صفحہ ۲۲ الناظر ماہ دسمبر) میں ۱۸ سال سے کم عمر نابالغوں کے تبدیل مذہب کو ناجائز قرار دینے کی جو سفارش کی گئی ہے وہ اسلامی قانون کے خلاف ہے اور مسلمان اسے قبول نہیں کر سکتے۔ فقہ اسلامی کی رو سے مسلمان فقہاء کی رائے میں تو نابالغ کو بھی مذہب تبدیل کرنے کا حق حاصل ہے جو بالغ العقل ہو۔ اور سن بلوغ کی حد ۱۵ سال سے اوپر نہیں، [illegible] بہت سے اشخاص علی الخصوص عورتیں تو اس سے بھی کم عمر میں بالغ ہو جاتی ہیں۔

میں اس رائے سے بھی [illegible] تبدیل مذہب کا کوئی سچا واقعہ پیش نہیں آیا۔ یا یہ کہ مذہبی تبلیغ کرنے والی جملہ مجالس [illegible] کو توڑ دیا جائے۔ کمیٹی صرف یہ چاہتی ہے کہ تبدیل مذہب کے بارے میں [illegible] ذرائع اختیار نہ کیے جائیں اور جو مجالس اس اصول کی پابندی نہ کریں انکو توڑ دیا جائے۔

(۶) سیاسی و اقتصادی سفارشات کی دفعہ ۴ (صٹ الناظر ماہ جنوری) کے اس مشورہ سے میں اتفاق
ں کرسکتا کہ مذہب کی بنیاد پر جداگانہ انتخاب کا طریقہ موقوف کر دیا جائے۔ میرے مسلم نیشنلسٹ پارٹی کے احباب
ال جو کچھ بھی ہو مگر تمام حالات پر نظر کرتے ہوئے مجھے یقین ہے کہ انتخابات جداگانہ کی موقوفی اقلیتوں کے حق
مضرت رساں ہوگی اور تاوقتیکہ اعلیٰ ذات کے ہندو جو اس وقت ملکیت کے لائق تمام اشیاء کے واحد
رہ دار ہیں اُن کا عام رویہ حقیقی طور پر تبدیل نہ ہو اور وہ اس پر رضامند نہ ہوں کہ اُن کروروں بدنصیبوں کے ساتھ
اچھوت کہے جاتے ہیں کامل انصاف برتیں گے اور زندگی کے تمام شعبوں میں اُنکو پورا حصہ دیں گے مخلوط
اب کے لیے اقلیتوں کو مجبور نہ کرنا چاہیے۔

کیا خود مہاتما گاندھی کا ارشاد نہیں کہ "اچھوتوں کی حالت سوراج کے ماتحت اب سے بھی زیادہ خراب
جائیگی اور یہ محض اس سبب سے کہ حاصل شدہ اقتدار ہماری کمزوریوں اور نااہلیتوں کی پشت پناہی کا ذریعہ بنجائیگا۔"

اس لیے میرا ذاتی مشورہ یہ ہے کہ صوبجات میں اکثریت کو چاہیے کہ اپنے نمایندوں کو مخلوط انتخاب کے ذریعے
ب کرائے تاکہ اقلیتوں کے حقوق سے بالکل تغافل نہ برتا جاسکے اور جو جماعت اقلیت میں ہو اُسکو اختیار دیا جائے کہ اپنے نمایندے
گانہ انتخاب کے ذریعہ یا وہ پسند کرے تو مخلوط انتخاب کے ذریعہ منتخب کرے۔

ممکن ہے کہ دستور سازی میں یہ بات بے ڈھنگی سی معلوم ہو مگر مجھے اعتماد ہے کہ یہ صورت مفید ثابت ہوگی
ر اقلیتوں کا کافی تحفظ کریگی۔ اس ملک کے حالات یورپ سے اس قدر مختلف ہیں کہ ہمیں اپنے اہل ملک
ضروریات پوری کرنے کے لیے اپنے نظام کار نیز نظم و نسق کے دستور میں تبدیلیاں کرنا ہونگی۔ ہمیں تمام جزئیات میں
رپ کی تقلید کرنے کی حاجت نہیں۔

میں کبھی اس رائے کو پسند نہیں کرسکتا کہ انتخاب جداگانہ ہندو مسلمانوں کے درمیان افتراق کا سبب ہو
ہے۔ ممکن ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے، یہ خیال حکام کا پیدا کردہ ہو مگر بہت سی دوسری چیزیں بھی تو ہیں
جو اُن ہی نے رائج کی ہیں اور اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اُن سے کچھ نہ کچھ فائدہ ہمیں ہو چکا ہے۔ پھر
اکیلا انتخاب جداگانہ ہی کیوں اس طرح مردود بنانے کے لیے تجویز ہوا ہے۔ انگریزی کی پرانی مثل ہے کہ "پہلے کتے
کو بدنام کردو اور پھر اُسے ٹھوکریں مار کر نکال دو" اور میرے خیال میں اس بارے میں یہ مثل پوری طرح صادق آتی ہے۔

اگر کسی اتفاق سے مسلمانوں کی حیثیت منقلب ہو جاتی اور اُنکی قوی اکثریت اُسی حالت تحفظ میں ہوتی
جو اس وقت اکثریت کی جماعت کو حاصل ہے تو یہ امر مشتبہ ہے کہ اُس وقت کی اقلیت مخلوط انتخاب
کی اس شد و مد سے وکالت کرتی۔

(۷) دفعہ ۱۰ (ص۶۹ الناظر ماہ جنوری) میں مشورہ دیا گیا ہے کہ بنک اور بیمہ وغیرہ کے کاروبار دونوں جماعتوں

کی متعدد کوششوں سے قائم ہوں۔ روپیہ کا سود کسی نوع یا صورت میں ہو اسلامی تعلیم کی رو سے حرام ہے۔ اس لیے میں اپنے ہم مذہبوں سے بنک اور بیمہ کے کاروبار میں شرکت کی درخواست نہیں کر سکتا۔ برخلاف اس کے میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ اُن کو اس قسم کے تمام مخرب اخلاق کاروباروں سے الگ رہنے کی صلاح دوں۔ بلکہ ایک قدم آگے بڑھا کر میں اپنے ہندو بھائیوں سے بھی یہ التجا کروں گا کہ وہ اس قسم کے کاروبار سے احتراز کریں جس سے نہ صرف اُن کی اخلاقی و روحانی ترقیوں میں رُکاوٹ ہوتی ہے بلکہ سرمایہ داری کی پرورش میں مدد ملتی ہے جو نوع انسانی کے لیے بے شمار مصائب کا منبع ہے۔ میرا یہ بھی عقیدہ ہے کہ جو لوگ یہ مخرب اخلاق کاروبار کرتے ہیں وہ اپنی آیندہ نسلوں کی فلاح و بہبود کی تمام امیدوں کا خون کرتے ہیں، اور اُنکے خاندان بہت ہی قلیل مدت میں سطح ارض سے نابید ہو جاتے ہیں اور اس طرح ہماری (سوسائٹی) سماج کا وجود ہی بربادی کے خطرہ میں پڑ جاتا ہے۔ صرف نکوکار اور متقی ہی فلاح پاتے اور اپنے بعد فلاح پانے والی اولاد چھوڑ جاتے ہیں۔

سفارشات کی بعض دفعات سے اختلاف کے بعد چند مزید تجاویز پیش کی گئی تھیں جو مع تمہیدی بیان کے درج ذیل ہیں:-

"بے شبہہ وضع کی یکسانیت، باہمی خورد و نوش یا تعلیمی درس گاہوں میں ساتھ رہنے اور تہواروں میں شرکت کرنے یا کلبوں اور انجمنوں میں مجتمع ہونے سے ایک حد تک معاشرتی تعلقات بڑھتے ہیں۔ مگر ہندو مسلم اتحاد کے مسئلہ پر اگر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے تو امید ہے کہ تمام غور کرنے والے اصحاب تسلیم کریں گے کہ حقیقی اتحاد اُسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب دل بدل جائیں کہ اُس سے خوش خیالی و خیر طلبی، ہمدردی و اعتماد کی فضا پیدا ہونا یقینی ہے اور چونکہ اتحاد خبث باطن کا بھی دافع ہے اس لیے ایسی فضا محض بیرونی اور سطحی تدابیر سے پیدا نہیں ہو سکتی۔ بلکہ اس کے لیے مدت تک اور آہستہ آہستہ باطنی اصلاح کرنے کی ضرورت ہوگی۔ جذبات خصومت اور دوسروں پر اقتدار حاصل کرنے کی خواہشات کو قابو میں رکھنا پڑےگا اور اخوت انسانی اور محبت کے خیالات عام طور پر قلوب میں نصب کرنا ہوں گے۔

مسلمانوں کے عہد حکومت ہند کا صدہا سال کا تجربہ صاف طور پر ظاہر کرتا ہے کہ قدرتی اسباب کی بنا پر دونوں قوموں میں ایک طرح کا اختلاط ہوتا رہا اور اسکے لیے نہ تو کسی قسم کا ڈھونگ کیا گیا اور نہ مصنوعی طریقوں سے اختلاط کی رفتار تیز کی گئی۔

میرے خیال میں ہماری تمام بیماریوں کا واحد علاج محبت ہے اور اگر ہم کسی طریقہ سے دونوں جماعتوں کے رہنماؤں اور متبعین میں اُسے داخل کر سکیں تو ہمارا مقصد حاصل ہو جائیگا۔ یہ کیسے کیا جائے، سخت مشکل سوال ہے۔

یورپ کی بڑی بڑی قومیں جو ۱۸-۱۹۱۴ء کی دردناک عالمگیر جنگ میں نبرد آزما رہیں عام طور سے اُنکی وضع، لباس، اطوار و رسوم قریب قریب مشترک تھے مگر سب کو معلوم ہے کہ کس درندگی سے ایک قوم نے دوسری کے گلے کاٹے اور اپنے تباہ و برباد کرنیوالے خلافِ انسانیت مساعی میں کیسے باہمدگر مسابقت کرتی رہیں۔

جو کچھ یورپ میں واقع ہو چکا ہے اغلب ہے کہ ہندوستان میں اُس کا اعادہ ہو گا۔ اگر دلوں میں تبدیلی پیدا کیے بغیر ہم کمیٹی کی اُن تمام سفارشات پر عمل کرنے کے لیے رضامند بھی ہو جائیں جو تدریجی ادغام کے خیال پر مبنی ہیں۔

بہرحال اصلی اور مستقل اتحاد پیدا کرنے اور ہندو مسلمانوں کے درمیان برادرانہ تعلقات قائم رکھنے کے لیے میری ناچیز رائے میں ہمیں اپنے طریقوں میں حقیقی تبدیلی کرنا ہو گی اور اُنکا ذکر بیان کیا جاتا ہے :-

(۱) ہندوؤں کو جو اکثریت میں ہیں اور دولت، جدید تعلیم، تنظیم، اور بیوپار میں مسلمانوں سے بہت آگے ہیں چاہیے کہ مسلمان اقلیت کے قلوب پر تصرف حاصل کرنے کے لیے تذبذب و تامل کے بغیر اُس کو وہ ضمانتیں اور آسانیاں مہیا کریں جو وہ ملک کے دستور میں اپنی مناسب حیثیت قائم رکھنے کے لیے طلب کرتی ہے۔

(۲) ہم میں سے بہت سے لوگ تہذیب جدید کی مذمت کرتے ہیں مگر باوجود اسکے یورپ کی نقالی کی بہترین کوششوں میں مصروف رہتے ہیں۔ ہندو اور مسلمان دونوں صرف زبان سے اپنے اپنے مذاہب کی محبت کا دم بھرتے اور اپنی قدیم تہذیبوں کی عظمت اور خوبیوں پر اظہار تفاخر کیا کرتے ہیں اور کوئی اس بات کو محسوس نہیں کرتا کہ ہماری روزانہ زندگی کے طریقے روز بروز ایسے بدلتے جاتے ہیں کہ ہم اُس عہد سے بہت دُور ہوتے جاتے ہیں جسکو ہم اسلاف کا عہد زریں کہتے ہیں۔

اس تماشے کو ختم کرنا چاہیے اور اگر واقعۃً ہمیں سچا اور دیانتدار بننا منظور ہے اور ہم امن و اتحاد سے رہنا چاہتے ہیں تو ہمیں مغربی تخیلات و عادات کا سارا شوق ترک کر دینا اور وید و قرآن کے ازمنۂ قدیم کی طرف واپس جانا چاہیے۔

(۳) خدائے واحد کا خیال نہ صرف مسلمانوں کے بلکہ جیسا کہ باب سفارشات کے صفحہ ۲ میں درج ہے ہندوؤں کے بھی بعض فرقوں کے عقیدہ کا مرکزی نقطہ ہے۔ اگر ہندوؤں کے تمام فرقوں میں اس عقیدہ کو پھیلانے کی مسلسل اور سرگرم کوششیں کی جائیں تو مذہبی تخیل میں ایک حد تک اتحاد ہو جائیگا جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ موحدین اور مشرکین کے دلوں سے حقارت و نفرت کے جذبات دور ہو جائیں گے۔

(۴) اگرچہ یہ امر محال ہے کہ اقتدار و دولت کی ہوس انسانوں کے قلوب سے محو ہو جائے جو تمام مشکلات اور مخاصمتوں کا اصل سبب ہے لیکن یہ ناممکن نہیں کہ اُسے ایک بڑی حد تک قابو میں رکھا جائے یا محدود کر دیا جائے۔

مگر یہ بات صرف روحانیت کے ذریعہ حاصل ہو سکتی ہے جو خدا پرستی اور پرہیزگاری کا دوسرا نام ہے۔ حقیقی اور مخلصانہ کوششیں اس امر کی ہونا چاہیے کہ ہماری نوجوان نسلوں اور مفکرین کے خیالات اس نہایت اہم ضرورت کی طرف رجوع ہوں۔

جب ضعیف کو قوی سے کسی قسم کا اندیشہ نہ رہیگا، ہوس پر عام طور سے قابو ہو جائیگا اور لوگ خدا ترسی اور پاکیزگی کی زندگی بسر کرنا سیکھ جائیں گے تو ہندو اور مسلمان آسانی سے دوست بن جائیں گے، اور ایک ہی ماں باپ کی اولاد کے مانند باہم محبت کرنے لگیں گے۔

آپ کبیر کی، صوفیا کی، اولیا کی، انبیا کی مدح سرائی کرتے ہیں مگر جب عمل کا وقت آتا ہے اور آپ سے اُن کے نقش قدم پر چلنے کو کہا جاتا ہے تو آپ فوراً مُنہ پھیر لیتے ہیں۔ اقوام کے درمیان اتحاد پیدا کرنے کا یہ طریقہ نہیں ہے۔ بلکہ اسکے برخلاف اُن کا انتشار بڑھے گا اور اُنکے اختلافات اس حد تک بڑھ جائیں گے کہ آپ اُسکا اسوقت اندازہ بھی نہیں کرسکتے۔ لیکن یہ یقینی ہے کہ اس طرز عمل کے بدولت وہ اُسی طرح بربادی سے ہمکنار ہونگی جس طرح یورپین قومیں خود اپنی ساختہ و پرداختہ مغربی تہذیب کے بوجھ کے تلے پسی جا رہی ہیں۔

مولانا محمد علی (مرحوم) نے اس باب میں کیا خوب لکھا ہے اور قوم سازی کے نئے تجربات کے خلاف کیسا متنبہ کیا ہے:

"ہر زمانہ کے مصلحین مذہب نے اس معاملہ میں مہلک کمزوری دکھائی ہے کہ اُنھوں نے مختلف سرچشموں سے کچھ اجزا نکال کر ایک مذہب کا معجون مرکب تیار کرنا چاہا۔ اُنھیں یہ اُمید تھی کہ شمولیت کے اس طریقہ سے وہ ایسے مذہب کی تحدید کر سکیں گے جس میں تمام مذاہب کے بہترین اصول ہونگے اور ہر ملت کے افراد اس مذہب کو آسانی سے قبول کریں گے۔ لیکن تاریخ نے ثابت کر دیا کہ خلط ملط المذاہب سے امن و اتحاد میں کوئی ترقی نہ ہو سکی۔ البتہ ان مصلحین نے اکثر اوقات اُنکے مختلف مذاہب و ملل میں ایک اور اضافہ کر دیا جو پہلے سے موجود تھے اور اختلافات کو بڑھاتے جا رہے تھے۔ ایسی کوششوں کی ناکامیوں نے جن کا مقصد نیک تھا لوگوں کو مجبور کیا کہ وہ رواداری کے طریقہ اختیار کریں۔"

(اُردو ترجمۂ خطبۂ صدارت کوکناڈا کانگریس ص ۸۲)

ہندو تیوہاروں کی اصلیت

منشی رام پرشاد صاحب بی اے ہیڈ ماسٹر نے اس کتاب میں ہندوؤں کے اخلاقی و تمدنی نظام کا بیان لکھکر دکھایا ہے کہ ہندوؤں کے مختلف تیوہار کس طرح منائے جاتے ہیں اور اُنکی ضرورت کیا ہے۔ حجم ۱۲۸ صفحے ۹/
منیجر الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

نظرے خوش گزرے

یہ پرچہ امید ہے کہ سابقہ پرچوں سے کچھ پہلے شایع ہو سکے گا۔ اور اگر کوئی نئی افتاد پیش نہ آئی تو اس ششماہی کے ختم تک انشاء اللہ وسط ماہ میں رسالہ کی اشاعت کا انتظام ہو جائے گا۔

الناظر کا حجم ۳ جزو سے شروع ہو کر ۴½ جزو تک پہونچ گیا ہے اور قلمی معاونین کی عنایت سے اب آسانی ۵ جزو کیا جا سکتا ہے۔ مگر چونکہ ۵ جزو کا پرچہ ایک پیسہ کے ٹکٹ میں نہ جا سکے گا اس لیے ۸ صفحوں کے اضافہ سے خرچ بہت بڑھ جائے گا۔ اگر آئندہ دو ماہ کے اندر قسم اول کے خریداروں میں کافی اضافہ ہو جائے تو جولائی سے حجم ۸۰ صفحے کیا جا سکتا ہے۔

ناظرین کرام کو معلوم رہنا چاہیے کہ دوسرے جرائد کی طرح الناظر کو یہ آسانی حاصل نہیں کہ عمال سرکاری یا ریاستوں کی سرپرستی سے فائدہ اٹھائے۔ اسکے لیے جس اہلیت کی ضرورت ہے وہ اگر کبھی تھی بھی تو اب باقی نہیں۔ اس لیے الناظر اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے لیے یا بالفاظ دیگر اپنے مداخل و مصارف میں توازن قائم رکھنے کے واسطے تمام تر عام ناظرین ہی کی امداد کا طالب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وقتاً فوقتاً الناظر کے قدردانوں کو توجہ دلائی جاتی ہے اور اس وقت بھی یہ درخواست کی جاتی ہے کہ احباب خاص کے علاوہ جو ہمیشہ الناظر کی توسیع اشاعت میں ساعی رہتے ہیں، عام خریدار بھی توجہ فرمائیں، تاکہ الناظر زیادہ مفید خدمات انجام دینے کے لایق ہو جائے۔

الناظر کے موجودہ خریدار اگر یہ کر لیں کہ جون کے اختتام سے پہلے پہلے قسم اول کا ایک ایک خریدار ضرور بنائیں گے، تو اضافۂ حجم میں کچھ کوئی امر مانع نہ رہے۔

کانپور کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ کا حصۂ سفارشات مع اختلافی یادداشتوں کے اس نمبر میں ختم ہے۔ تاریخی تبصرہ اور بعض دیگر ضروری اجزا بعد کو حسبتہ حسبتہ پیش کیے جا سکیں گے۔

"اصطلاحاتِ فلسفہ پر تنقید" کے اوراق گزشتہ مہینوں میں قلت گنجایش کے سبب شامل نہ ہو سکے۔ اس پرچے سے پھر سلسلہ شروع ہوتا ہے اور امید ہے کہ آیندہ نمبر میں تمام ہو جائیگا۔ جن احباب کو اس بحث سے دلچسپی ہے یا جنھوں نے اپنی رائے ظاہر فرمانے کے وعدے کیے ہیں انشاء اللہ مضمون کی تکمیل کے بعد اُن اصحاب کے مضامین حاصل کر کے شایع کیے جائیں گے۔ یہ بحث عام پسند نہیں مگر جو لوگ انگریزی زبان سے علمی مضامین

کتب کا ترجمہ کرنا چاہتے یا اردو میں علمی کتابیں لکھنے کا شوق رکھتے ہوں اُن کے لیے اصطلاحات کا تصفیہ بہت ضروری ہے۔

مارچ نمبر میں افسانہ کی فنی ترتیب پروفیسر وقار عظیم صاحب کا جو مضمون شایع کیا گیا اُس کے مطالعہ سے غیر انگریزی داں طبقہ کو عجب نہیں جو کچھ خاصی اُلجھن ہوئی ہو کیونکہ Setting - Spirit اور Mood وغیرہ کے ترجمے درج نہ تھے - مسٹر اجمل خاں یا دوسرے اصحاب جو اصطلاح سازی کے کام سے دلچسپی رکھتے ہیں، اگر توجہ فرمائیں اور اُن اصطلاحات کے ترجمے تجویز فرمادیں تو نوجوان اہل قلم کو اُن کی عنایت سے بہت فائدہ پہونچیگا۔

Setting کے معنی، افسانہ نویسی کی اصطلاح سے قطع نظر کرکے، نگینہ جڑنے کے ہیں۔ اصطلاح قرار پا جانے کے بعد معناً اگرچہ بہت وسعت پیدا ہوگئی ہے لیکن غور کیا جائے تو حاصل کلام یہ نکلتا ہے کہ افسانہ کے تمام ضروری اجزا کو باہم مربوط کرکے اُس کو فنی حیثیت سے مکمل بنا دینے کا نام Setting ہے جسے ہمارے نگینہ ساز سجاوٹ یا سجائی سے تعبیر کرتے ہیں - اس لیے اگر کوئی دوسرا بہتر اور موزوں لفظ نہ ملے تو یہی الفاظ Setting کے مرادف قرار دیے جا سکتے ہیں اور کچھ دنوں کے استعمال کے بعد رفتہ رفتہ اُن تمام معانی پر حاوی ہو جائیں گے جو اس وقت Setting سے وابستہ ہیں۔

Spirit کا ترجمہ عام طور پر "روح" کیا جاتا ہے اور افسانہ کے تعلق میں یہی لفظ استعمال کیا جا سکتا ہے۔ Mood کے معنی حالت، کیفیت، انداز کے ہیں - افسانہ کے سلسلہ میں غالباً آخری لفظ زیادہ موزوں ہوگا۔

گزشتہ مہینے میں تصدق احمد خاں شروانی جیسے بہت مخلص، سرگرم اور قابل کارکُن کے انتقال سے جو جگہ قومی خدمتگزاروں کی صف میں خالی ہوئی ہے اُس کا پُر ہونا محال اگر نہیں تو دشوار ضرور ہے - صوبہ متحدہ کے، انگریزی تعلیم یافتہ دوستوں میں مولانا محمد علی مرحوم کے جو چند مخصوص رفقاء کار تھے اُن میں شروانی صاحب اپنی آزاد خیالی و ایثار پیشگی کی بنا پر بہت نمایاں تھے - اور کانگرسی مسلمانوں میں تو اُن کے بعد میدان بالکل خالی نظر آتا ہے -

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

حجم کی قلت اور مشاغل کی کثرت کے باعث ریویو کے لیے جو کتابیں وصول ہوئی ہیں ابھی تک اُن پر توجہ نہیں کی جا سکی - خدا نے چاہا تو آیندہ مہینے سے اس کا التزام کیا جائے گا کہ صفحۂ تعارف سے کوئی پرچہ خالی نہ رہے -

بنام خداوند جان آفرین

الناظر

نمبر ۵ جلد ۳۹ مئی سنہ ۱۹۳۵ء

امیر خسرو اودھ میں

(جناب مولوی سید حسن صاحب برنی بی اے ایل ایل بی (علیگ) ایڈوکیٹ بلند شہر)

مولانا حالی کی حیات سعدی اور یادگار غالب دیکھ کر مختلف اہل قلم کو نامور شعرا و مصنفین کی سوانحعمریاں مرتب کرنے کا خیال پیدا ہوا - اور اس سلسلہ میں متعدد کتابیں لکھی گئیں - حیات خسرو کی تدوین منشی سید احمد صاحب مارہروی کے حصہ میں آئی - مگر جب نواب اسحٰق خاں مرحوم نے تصانیف خسرو کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا اور حضرت امیر خسرو کی متعدد مثنویاں جدید طرز پر ترتیب پاکر شائع ہوئیں تو ضرورت اسکی محسوس کی گئی کہ ایک مفصل و مبسوط سوانحعمری از سر نو ترتیب دی جائے - انجمن ترقی اردو کی جانب سے مرحوم سید افتخار عالم مارہروی مصنف حیات النذیر اس کام پر متعین کیے گئے - مگر انکی وفات کے باعث تاج خسرو کی اشاعت نہ ہو سکی - ممکن ہے کہ اسکا مسودہ انکے ورثاء کے پاس یا انجمن ترقی اردو کے دفتر میں محفوظ ہو - برنی صاحب بھی کچھ عرصہ سے سوانح خسروی کی تدوین میں مصروف ہیں اور اسکے بعض اجزا وقتاً فوقتاً شائع کراتے رہتے ہیں - مضمون ذیل بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے - امید ہے کہ انکی پہلی کتاب البیرونی کی طرح انکی سوانحعمری خسرو بھی قدر کی نگاہوں سے دیکھی جائے گی - ایڈیٹر

اسلامی سلطنت کے پچھلے دور میں دربار اودھ کی علمی و ادبی قدردانیاں عام طور پر زبان زد ہیں لیکن بہت

کم لوگ جانتے ہونگے کہ اسلامی سلطنت کے ابتدائی دور میں بھی اس سرزمین کے بعض صوبہ دار بڑے علم دوست ہوئے ہیں۔ اُن میں سے ایک کو یہ فخر بھی حاصل ہے کہ وہ ہندوستان کے اسلامی عہد کے سب سے بڑے شاعر امیر خسرو کے سرپرستوں میں شمار ہوتا ہے۔

اُس کا نام ملک امیر علی تھا۔ وہ سلطان بلبن کے غلام کا لڑکا تھا۔ اور بلبن کے زمانہ میں سرجاندار کے عہدہ پر فائز تھا۔

اسلامی غلامی دنیا کی دوسری قوموں کی رسم غلامی سے کچھ الگ چیز تھی۔ مسلمانوں میں بھی غلام خدمت کا ذمہ دار ہوتا تھا لیکن اس میں اچھا غلام محترم بھی بن سکتا تھا۔ جہاں تک کہ بعض اوقات مسلمان غلام اپنی قابلیتوں سے بادشاہت تک پہونچے۔

امیر علی بڑا فیاض دل پایا تھا۔ فیاضی کی رسم مشرق کی پرانی خصوصیت ہے۔ اس میں ہندو مسلمان دونوں کی پچھلی روایتیں یکساں ہیں۔ اُس زمانہ کے سلطان امیروں کو بڑے حوصلے دیے تھے۔ اس دور کے مستند مورخ ضیاء برنی نے اپنے نانا سپہ سالار حسام الدین کی سند سے لکھا ہے کہ وہ اُمراء آپس میں عداوت کرنا نہ جانتے تھے۔ لیکن سخاوت اور فیاضی میں ایک دوسرے سے بازی لیجانے کی کوششیں کرتے رہتے تھے۔ اگر کوئی امیر سُن لیتا کہ فلاں امیر کے دسترخوان پر پانسو آدمی کھانا کھاتے ہیں، یا فلاں امیر سواری کے وقت دو سو ٹنکہ لُٹا دیتا ہے" تو وہ چاہتا کہ اُسکے یہاں ہزار آدمی کھانا کھائیں، اور سواری میں چار سو ٹنکہ صدقہ ہوں۔ اگر کوئی امیر مجلس نشاط میں پچاس گھوڑے انعام دیتا، اور دو سو آدمیوں کو کپڑے تو دوسرا اُس کی کوشش کرتا کہ سو گھوڑے بخشدے اور پانسو آدمیوں کو کپڑے دے۔

اُس عہد کے امیر اپنی فیاضیوں اور خیراتوں کی وجہ سے ہمیشہ مقروض رہتے تھے۔ اُن کے گھروں میں سونا چاندی جمع نہ ہوتا تھا۔ سلطنت دہلی کے امراء سے لین دین کرنے والے ملتانی اور ساہوکار مالا مال ہوگئے تھے۔ اُنھیں روقرضہ کے علاوہ انعام بھی ملتے رہتے تھے۔ ادھر کسی امیر کی مجلس یا دعوت مقرر ہوتی اُدھر اس کے نوکر چاکر اُن ملتانیوں اور ساہوکاروں کے پاس دوڑے جاتے اور سودی تمسک لکھ کر روپیہ لے آتے۔ (فیروز شاہی صفحہ ۲۰۰)

ہندوستان کی دولت میں کچھ کمی نہ آتی تھی۔ ان فیاضیوں سے نہ امیر ہی کنگال ہوتے تھے، نہ ملک کا کچھ بگڑتا تھا۔ روپیہ ہیر پھیر کے ملک والوں ہی میں لوٹتا پلٹتا رہتا تھا۔ یہ زمانہ نہ تھا کہ سب طبقے معاشی تنگدستی میں گھرے دکھائی دیتے ہیں اور ہمارے ملک میں فیاضی کا نام ہی نام رہ گیا ہے۔

وہی مورخ لکھتا ہے:۔

نئی کتابیں

مرقع چغتائی

غالب کا اردو دیوان بارہا چھپا مگر مرقع چغتائی کی شان سب سے جدا ہے بلکہ بے مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو کی کوئی کتاب اس اہتمام سے طبع نہیں ہوئی۔ اس کا پہلا ایڈیشن ایک سو روپیہ فی جلد کے حساب سے فروخت ہوا۔ دوسرا ایڈیشن ستر روپیہ کو بکتا رہا۔ اور اب قیمت بارہ روپیہ ﷲ ہے۔

غالب کا دیوان مع خوشنما بیل کے بلاک میں چھپا ہے اور پچاس کے قریب رنگین اور سادی چغتائی کی بنائی ہوئی تصاویر ہیں جن سے اشعار غالب کے مطالب ذہن نشیں کرنے کی کوشش کی گئی ہے خوشنما جلد اس پر دیدہ زیب غلاف۔

بال جبریل

اقبال کے اردو کلام کا تازہ مجموعہ پایہ مثل بانگ درا کے۔ لکھائی چھپائی دیدہ زیب۔ خوشنما جلد۔ قیمت ۲ر

نوٹ:۔ اس کتاب پر کسی حال میں چھوٹ نہ دی جائیگی

مسدس حالی

کے سیکڑوں ایڈیشن اب تک شائع ہو چکے ہیں مگر اب کی بار پوری کتاب بلاک میں چھپی ہے اور ایسی خوشنما ہے کہ بس دیکھتے رہیے۔ ہر صفحہ پر خوش وضع بیل ہے اور نہایت دیدہ زیب جلد

قسم اول (ہفت رنگی) ے ر

قسم دوم (سہ رنگی) عار

دیوان نغانی

ایران کے مشہور شاعر بابا فغانی کا قابل قدر دیوان پہلی بار زیور طبع سے آراستہ ہوا ہے۔ پروفیسر منوہن لال ماتھر دہلوی ایم اے نے مختلف نسخوں سے تصحیح و تطبیق کر کے مقدمہ تحریر کیا ہے۔ دیوان کا حجم تین سو صفحے کے قریب اور پیانہ کتابی ہے۔ قیمت عار

تنقیدات عبد الحق

مولوی عبد الحق صاحب سکرٹری انجمن ترقی اردو و اڈیٹر رسالۂ اردو کی چوبیس تنقیدوں کو رسالۂ اردو کے بارہ سال کے پرچوں سے انتخاب کر کے مولوی محمد تراب علی خاں صاحب باز حیدرآبادی نے مرتب کیا ہے۔ حجم ۱۲ جزو تقطیع خورد۔ قیمت عہر

گلبدن بیگم

شہنشاہ بابر کی بیٹی گلبدن بیگم کی یہ سوانحعمری انگریزی اور فارسی ماخذوں سے پروفیسر سید ابن حسن صاحب شارق بی اے بی ٹی نے مرتب کی ہے جس میں بابر، ہمایوں اور اکبر تینوں مغل بادشاہوں کے حالات بھی درج ہیں حجم ۱۰۰ صفحے پانچ عکسی تصاویر اور سادہ جلد۔ قیمت ۱۲ر

ملنے کا پتہ:۔ الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

مرآۃ المثنوی

مثنوی مولانا روم کا بہترین ایڈیشن - جس میں مثنوی کے منتشر مضامین کو ایک سلسلہ کے ساتھ مرتب کیا ہے کہ پڑھنے والا مولانا کے مدعا اور ان کی تعلیم کو بڑی آسانی سے سمجھتا چلا جاتا ہے - کئی انڈکس اور فہرستیں ہیں جن کی مدد سے سب نشان شعر نکل آئیگا اور بسیط شرح بھی شامل ہے - شروع میں جناب قاضی تلمذ حسین صاحب ایم اے مرتب کتاب کا مفید و دلچسپ مقدمہ - حجم ۱۱۰۰ صفحے - کاغذ و طباعت اعلیٰ - دیدہ زیب جلد - قیمت عہ ر

مغز نغز

مثنوی مولانا روم کا قابل قدر انتخاب از مولانا ابوبکر صاحب معلم دینیات مسلم یونیورسٹی - کم فرصت لوگوں کے لیے یہ انتخاب نہایت مفید ہے - حجم ... صفحے پیمانہ خرد عہ ر

کلیات خواجہ عزیز لکھنوی

خواجہ عزیز الدین عزیز لکھنوی آخری دور کے فارسی شعرا میں امتیاز خاص رکھتے تھے - یہ انھیں کا کلیات ہے - صہ

دیوان گرامی

حضرت گرامی دربار آصفیہ کے نامور فارسی شاعر تھے - انکا قابل دید دیوان فارسی شاعری سے ذوق رکھنے والوں کے لیے بہترین ہدیہ ہے - قیمت لعہ ر

رباعیات گرامی

حضرت گرامی کی قابل دید رباعیوں کا مجموعہ قیمت لعہ ر

وکلائے مرافعہ - فارسی جدید کا قابل دید ڈراما مع مقدمہ پروفیسر محمد مسلم صاحب عظیم آبادی جدید ول خصوصیاً فارسی جدید ۱۲ ر

رفیق تنہائی

از پروفیسر سید علی عباس حسینی ایم اے - جس پر مصنف کو ہندوستانی اکیڈمی سے پانچ سو روپیہ انعام ملا - مبصرین کی رائے میں یہ افسانے پریم چند کے افسانوں کے ہم پایہ بلکہ فنی حیثیت سے اُن سے بہتر ہیں - قیمت عہ ر

رعایت :- خریداران الناظر کے لیے صرف ۱۲ ر

اصنام خیالی

مسٹر جلیل احمد جلیل قدوائی ایم اے کے مختصر افسانوں کا دوسرا مجموعہ - مقدمہ از پروفیسر محمد مجیب صاحب - اس مجموعہ میں روسی زبان کے مشہور افسانہ نویسوں کے سات افسانوں کے ترجمے ہیں - اور چھ افسانے اسی رنگ میں جلیل صاحب کے طبعزاد ہیں - حجم ۲۵۰ صفحے مع تصویر مولف - قیمت لعہ ر

(اسیر گل کے نام سے پہلا مجموعہ شایع ہوکر قبولیت حاصل کر چکا ہے - اُس کی قیمت ۸ ر ہے)

ہنسانے فسانے

سید ابوتمیم صاحب فرید آبادی کے مزاحیہ افسانوں کا دلچسپ مجموعہ - مع تقریب ملا رموزی - قیمت عہ ر

مجبور وفا

اس افسانہ میں پنڈت کشن پرشاد کول نے جو ایک مشہور لبرل ہیں اور کانگریس کے طریق کار سے بالاعلان اختلافات رکھتے ہیں ۱۹۲۱-۲۲ء کی جنگ آزادی کا نقشہ دکھایا اور کانگریسی لوگوں کے اچھے اور برے کاموں کو نمایاں کیا ہے - حجم ۴۶۰ صفحے قیمت عہ ر

ملنے کا پتہ :- الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

مفارقت کا حال :-

هر شب منم و دلی و دردی / غم را بدو چشم آب خوردی
شب در روز کنم آه جان سوز / زین گونه بود شب در روز
یکشب من و دل چراغ و پیش / جانی به هزار داغ در پیش
بودیم همه به گفت و گویت / محرم نه کسی بجز آرزویت
گفتم که ازین اسیر بیداد / یاد آیدت یا نیاید یاد

اُس زمانہ میں برسات کا موسم تھا۔ اودھ کی برسات کا منظر خسرو کے قلم نے اس طرح کھینچا ہے :-

عین بشکال وقت باران / خیمه زده ابر در اسواران
می گفت ترانه ابر سرمست / بود آب به رقص و برق می جست
باران به هوا بقطره سازی / قطره به زمین به حلقه بازی
گریه ز من و ز ابر هم باد / بیرون و درون ما نه غم باد
تا وقت سحر قلم در انگشت / در تاریکی همی زد انگشت

امیر خسرو کا درد و سوز مشہور ہے۔ اُنکے شیخ اُنکے دردِ سینہ کو وسیلۂ مغفرت بتاتے ہیں۔ اس خط میں بھی اُس درد کا جا بجا نشان ملتا ہے۔

ایک دوسرا خط نثر میں رجب ۶۸۰ھ میں اودھ سے بھیجا ہے۔ اُس میں کیقباد اور بغرا خاں کے باہمی میل اور اپنے مدتوں کے بچھڑے دوستوں سے ملاقات کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے شمس الدین دبیر اور اثیر الدین بھی ہیں[۱]۔ جب سلطان بلبن نے اپنے بیٹے بغرا خاں کو بنگال کا صوبہ دار بنا کر بھیجا تھا تو یہ دونوں اُسکے ساتھ تھے۔ اب بعد مدت اُن سے ملنا ہوا تو خوب لطف سے وقت کٹا۔ جدائی کا شکوہ ہوتا رہا۔

"نخست شکایت از دوران روزگار درمیان آورد که شیوهٔ آبای علوی و امهات سفلی است که ابنای جنس و اخوان انس را چون بنات النعش از هم گر متفرق می دارد ..... هر یکے از احباب را یاد کردے علی العموم می کرد علی الخصوص آن نجم ما را"

دریا پار جہاں بنگال کا لشکر ٹھہرا تھا، اثیر الدین سے ملاقات ہوئی۔ رات کو عشا کے قریب پہونچے تو وہ ان سے مل کر بڑا متعجب ہوا۔

---

[۱] یہ دونوں اُس دور کے مشہور اہل قلم اور منشی تھے۔

ایں توئی یا بخواب می بینم کہ بشب آفتاب می بینم!

شبا روزے بدیدار آں عزیز شب را بروز و روز را بشب آوردہ شد"

تیسرے دن اپنے دوست شمس الدین کے ساتھ کشتی میں سوار ہو کر کنارے پہونچے اور وداع کہہ کر رخصت ہوئے۔ راستہ میں حاتم خاں کو اودھ کا صوبہ ملا۔

یہ مختصر مجلس ختم ہوئی اور عین برسات میں سرجو ندی کے کناروں سے جہاں دونوں لشکروں کے پڑاؤ تھے وہ شہر اودھ کو روانہ ہوئے۔

"ہم در اثنائے راہ مخدوم بندہ بمنزلت اقطاع اودھ شرف دست بوسی یافت بندہ کہ چوں عطارد در شعاع آں آفتاب است نتوانست کہ بخانۂ خویش راجع شود ضرورت باستقامت آں طرف رضا داد۔ ملک بے مثال بہ طلب مثال ولایت بزور رفتت رکاب فرو برسا اعلیٰ منطقۂ جوزا بمیان بست .... ہم باراں بود .... در عین باراں و باران عین چوں آب سرد بجانب اودھ روان کردہ شد۔

ابر می بارد و من می شدم از یار جدا چوں کنم دل بچنیں وقت ز دلدار جدا

ابر و باران و من و یار ستادہ بوداع من جدا گریہ کناں ابر جدا یار جدا

.... مردم چشم از شرح فراق دوستاں رشح می تراوید و ابر چوں ہوا خواہاں می گریست و پائے مرکبم در آب چشمہا می لغزید و برق چوں سخرگاں می خندید۔

مگو کہ برق بخندد کہ ژالہ سنگ انداز حباب شیشہ گری را کشادہ کردہ دکاں

"تا بدیں طریق ایں خراب از معمورۂ اودھ آمد .... (اعجاز خسروی رسالۂ پنجم)

اودھ پہونچنے کے واقعات قران السعدین میں یوں بیان کیے ہیں:—

با علم فتح دراں راہ دور سایہ فشاں شد بجد کنت پور

خاں جہاں حاتم مفلس نواز گشت باقطاع اودھ سرفراز

من کہ بدم چاکر او پیش ازاں کرد کرم آنچہ کند بیش ازاں

تا ز چناں بخشش چاکر فریب بندہ شدم لازمۂ آں رکیب

در اودھم برد بلطفے چناں کیست کہ از لطف بتابد عناں

خوش شدم از حالتش چنانم گزشت کم وطن اصل فراموش گشت

زاں اودھ از بخشش او تا دو سال ہیچ غم دنیا نبود از ملال (ص ۲۱)

اگرچہ وہ اودھ میں بہت آرام سے تھے، لیکن ماں دہلی میں انکی جدائی میں تڑپ رہی اور بلانے کے لیے

"کیا کریم، نفیس، غریب و عجیب غلام زادہ تھا کہ جسے شاہ عہد اور حاتم خاں کہتے تھے، اور اس بادشاہ کی کیسی عظمت و بزرگی تھی کہ جس کا غلام زادہ اس زمانہ او رعہد ابتدا میں "شاہ" کہلاتا تھا اور "حاتم خاں" مشہور تھا۔ سو ٹنکے سے کم بخشش میں بہت کم دیتا تھا، اور جسے انعام میں گھوڑا اور کپڑا دیتا تو بغیر تھیلی روپیہ کے نہ دیتا۔ معمولی گوچہ گرد فقیروں کو اشرفی اور روپیہ سے کم نہ دیتا تھا۔ اور جیتل (پیسہ) کا تو اس کے یہاں ذکر ہی زبان پر نہ آتا تھا"۔ (ص ۱۹۰)

بلبن اس کی فیاضیوں سے بہت خوش ہوتا اور خدا کا شکر ادا کرتا تھا کہ غلام زادہ ایسا فیاض ہے۔ ایک دن سلطان نے کہا "مجلس شراب اور عالم مستی میں ایسی بخششیں کر بیٹھتے ہو، تمہاری فیاضی کو جب مانوں کہ ہوشیاری میں ایسا کرو"۔ اس نے اسی دن سے شراب سے توبہ کر لی اور ہوشیاری میں اس سے زیادہ فیاضیاں دکھائیں۔

بلبن بھی اس کی روز بروز ترقی کرتا رہا۔ اخیر عہد بلبن اور کیقباد کے زمانہ میں یہی حاتم ثانی سرزمین اودھ کا اقطاع دار تھا۔ (ص ۱۱۸-۱۱۹)

امیر خسرو کی شاعری کا شہرہ عہد بلبن کے عہد میں پھیل چکا تھا۔ وہ بلبن کے دونوں بیٹوں محمد سلطان خاں شہید اور بغرا خاں کے ندیم رہ چکے تھے۔ ۶۸۳ھ میں جب ہونہار ولیعہد (محمد سلطان) تاتاریوں کی لڑائی میں مارا گیا تو ایک مدت تک اپنے وطن پٹیالی میں گوشہ نشین رہے، دوبارہ حاتم خاں کے یہاں تعلق ہو گیا۔ وہ دو برس تک اس تعلق سے اودھ میں رہے۔ ضیاء برنی لکھتا ہے :۔

"امیر خسرو کے دیوان میں حاتم خاں کی بہت سی مدائح موجود ہیں۔ امیر خسرو بھی اسکے یہاں ملازم تھے اور ایک اسپ نامہ اس کے نام پر لکھا ہے، جس میں لکھتے ہیں :۔

شاہ عہد اختیار دولت و دیں　　　آفتابِ شرف سپہر نہ زمیں

ہم علی نام ہم بہ شیر دلی　　　شیر دُلدل سوار ہم چو علی

اس کی فیاضی کی تعریف میں لکھتے ہیں :۔

بہ بحر گفتم مانی بدست خان زکرم　　　روان بلرزہ درآمد کہ ایں محل نہ مراست

گہ سخا دُر و یاقوت مایۂ کف اوست　　　گہ عطا خس و خاشاک مایۂ کفِ ماست! (ص ۱۱۸)

امیر خسرو کے دوسرے تیسرے دیوانوں وسط الحیوٰۃ اور غرۃ الکمال، مثنوی قران السعدین اور ان کے مجموعۂ رسائل اعجاز خسروی میں قیام اودھ کے بعض جزئیات پر روشنی پڑتی ہے۔ اس میں کچھ شبہ نہیں ہے کہ ان دونوں دیوانوں وسط الحیوٰۃ اور غرۃ الکمال میں ان کا بہت سا کلام بھی ایسا ہے جو اودھ میں بیٹھ کر

لکھا گیا تھا، اگرچہ اُس سب کا چھانٹنا ناممکن ہے۔

یہ زمانہ امیر خسرو کی شاعری کا نصف النہار سمجھنا چاہیئے۔ بالخصوص اُن کی غزل سرائی کا۔ بلبن کے انتقال کے بعد غالبًا وہ اپنے مربی حاتم خاں کے ساتھ دہلی چلے آئے تھے۔ پھر کیقباد کے ساتھ ہی دو مہینے کے سفر کے بعد اودھ پہونچے، جہاں بغرا خاں اور کیقباد کی ملاقات ہوئی جس کا مفصل تذکرہ مثنوی قران السعدین میں ملتا ہے۔ اسکے بعد وہیں رہنے لگے۔ یہاں تک کہ ۶۸۷ھ کے اخیر میں وہ دہلی واپس ہو کر سلطان کیقباد کے ملازم ہوگئے۔

قیام اودھ کی یادگاروں میں ایک دلچسپ منظوم خط سہ شنبہ ۶ ارجب ۶۸۶ھ کا لکھا ہوا غرۃ الکمال میں ملتا ہے۔ اُن کی ماں اور دیگر اعزہ دہلی میں موجود تھے، اور میر کی طرح خسرو بھی دہلی کے عاشق تھے۔

تا بعد دو ماہ ازرہ دور   آمد بہ اودھ سپاہ منصور
سلطان نظرے بطلعت بکشاد   واقطاع اودھ بخان ما داد
شد شہر اودھ حوالۂ خان   شد دہر ابد نوالۂ خان
با آنکہ نداشتم صبوری   افتاد سکونتم ضروری

لیکن فراق کی درد بھری داستان سننے کے قابل ہے

شبہا من و دل بہ غم نوازی   با یاد تو در خیال بازی
دردے و ہزار آہ جاں سوز   آہے و ہزار تیر دل دوز
دل رفتہ و من بخاک ماندہ   جاں بر شرف ہلاک ماندہ

اس دوران میں کچھ نئے دوست بھی اُس ملک میں پیدا ہوگئے تھے۔

با آنکہ ازیں ولایت خوش   یارے دو سہ اند نغز و دلکش
از حالت من در آرزویت   عاشق شدہ ہمچو من برویت
با من بو انست شب و روز   دل سوختہ را قناعت آموز

مگر دہلی کی صحبتیں رہ رہ کر یاد آتی تھیں:-

کو آں بہ وفا بہم نشستن   دل در طرب و نشاط بستن
گاہے بہ بدیہۂ دل آویز   سفتن گہر بنجامۂ تیز
گہ جام نشاط نوش کردن   گہ زمزمہ ترنگوش کردن
گہ کردن گشت سوے بستان   گاہے بہ طواف حوض سلطان[عــــه]

عــــه دہلی کا حوض شمسی جو التمش نے بنوایا تھا۔

پر خط بھیج رہی تھی - آخر اُن کی محبت نے اُنھیں اودھ میں نہ بیٹھنے دیا - اور وہ حاتم خاں سے اجازت لیکر دہلی چلے آئے:-

من ز پئے شرم صد ز خویش — رفتہ ز جائے خود و پیوند خویش
مادر من پیر زن سبحہ سنج — ماندہ بہ دہلی ز فراقم برنج
روز و شب از دوری من بیقرار — سوختۂ داغِ من تمام کار
در غم و زاری ز جدا ماندنم — نامہ نویساں ز پے خواندنم
چوں کشش سینہ زغایت گزشت — باعثۂ دل ز نہایت گزشت
حالِ خود و نامۂ امیدوار — باز نمودم بخداوندگار
داد اجازت بہ عنائے تمام — تا ہمہ اندر رہِ مقصود گام
خرج رہم زاں کفِ دریا اثر — گرم رواں کرد بہ کشتی زر
تا ز چناں بخشش مفلس پناہ — شکر کناں پائے نہادم براہ (ص ۱۲۱-۱۲۲)

اسکے بعد وہ دربارِ شاہی میں پہونچے اور اخیر عمر تک دربارِ دہلی کے ملک الشعراء رہے - پھر امیر خسرو کا اودھ میں رہنا نہیں ہوا -

کلامِ محمود

(جناب محمود اسرائیلی)

شبِ فرقت مجھے کتنی بڑی معلوم ہوتی ہے! — قیامت کی گھڑی اک اک گھڑی معلوم ہوتی ہے!!
مجھے تدبیر میں قسمت جڑی معلوم ہوتی ہے — اسی حلقے کی یہ بھی اِک کڑی معلوم ہوتی ہے
لبِ گلگوں میں اُنکی تابشِ دنداں کو کیا کہیے — کلی کے مُنہ میں موتی کی لڑی معلوم ہوتی ہے
لبِ دریا حبابوں کی چمک کیا لطف دیتی ہے — زمیں نیلم کی ہیروں سے جڑی معلوم ہوتی ہے
وہ جلادہ رندِ مشرب اور آئیں خانقاہوں میں! — ان حضرت کی کوئی مشکل اڑی معلوم ہوتی ہے!!
گنہ کرلو، جب تصور بھی گنہ کا دل میں آتا ہے — اجل مجھکو مرے سر پہ کھڑی معلوم ہوتی ہے
ہر انساں زندگی میں موت کو آساں سمجھتا ہے — یہ منزل سب کو مرنے پر کڑی معلوم ہوتی ہے

بہشت آباد ہے محمود کے جس گوشۂ دل میں
اُسی کے پیچھے یہ دُنیا پڑی معلوم ہوتی ہے

ہنگامۂ عالم

(جناب مسٹر مظفر علی قدوائی)

سبحان اللہ - ذرا خیال فرمائیے - ایک کاہل آدمی اور یہ موضوع - لیکن آپ جانتے ہیں کہ تماشے کا سب سے زیادہ لطف اُنھیں کو آتا ہے جو دُور سے دیکھا کرتے ہیں - اب مجھے دیکھیے - میں ہوں، اور میرا کمرہ - ایک بڑے بازار میں جہاں ہر وقت آمد و رفت کا ہنگامہ رہتا ہے' ایک آباد سڑک کے کنارے اپنے ٹوٹے برآمدے میں بیٹھا ہوں - "قناعت اور کاہلی کا حقہ" میرے منہ سے لگا ہے - شہد کا مرتبان اور "چنیا بیگم" سے معروفِ اختلاط ہوں - اس قدر اہم اور خود فراموش مصروفیتوں میں بجز اسکے اور کیا ممکن ہے کہ "ہنگامہ عالم" کی دلچسپیوں کا بس دُور ہی سے مشاہدہ کر لوں -

جن ہستیوں کو اس ہنگامہ سے تھوڑا سا بھی تعلق ہے وہ ہمیشہ عدیم الفرصت ہی نظر آتی ہیں - اسکی قید نہیں کہ وہ ہستی خود بھی اس ہنگامہ میں شریک ہو - میرے سامنے آنے جانے والوں کا ایک بے سر و پا اژدہام ہے جس کی نہ تو ابتدا ہی معلوم ہوتی ہے اور نہ انتہا - رات دن کانوں میں بے شمار قدموں کی تیز آوازیں آیا کرتی ہیں - بعض دوڑتے ہیں تو بعض قدم اُٹھائے گردن جھکائے تیزی سے گزر جاتے ہیں - بعض تھک کر رُک گئے ہیں تو سستی نا ہموار قدم ڈال رہے ہیں - غرضکہ ہر شخص مصروف تگ و دو ہے - ہر انسان اس بے ترتیب و منتشر دوڑ دھوپ میں شریک ہے اور اپنی تمام سعی سے اُس افق کامیابی تک پہونچ جانا چاہتا ہے جو ہر ہر قدم پر اُس سے دُور ہوتا جاتا ہے -

اس ہجوم کو ——— جس میں مرد اور عورت' جوان اور بوڑھے' خوش خو، سادہ لوح' نیک نہاد اور بد طینت' امیر اور غریب' پُر مذاق اور مغموم' ہر قسم کے انسان شریک ہیں - طاقت ور کمزوروں کو ایک طرف ڈھکیلے دیتے ہیں' چالاک' احمقوں کے پاس سے ہنستے ہوئے گزر جاتے ہیں - جو پیچھے رہ گئے ہیں آگے جانے والوں کو ڈھکیل رہے ہیں اور جو آگے نکل گئے ہیں پیچھے والوں کو لاتیں مار رہے ہیں ——— غور سے دیکھیے اور اِس انسانی سمندر کے جزر و مد سے لطف اُٹھائیے -

یہاں ایک ضعیف آدمی تھک کر ہانپ رہا ہے تو وہاں ایک کمزور فطرت معصوم دوشیزہ ایک سخت گیر خاتون کی وحشت سے سہمی جا رہی ہے - کہیں ایک شوقین طالب علم دنیا میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے کتاب پر نظر جمائے' دھکے کھاتا ہوا گزر رہا ہے' تو کہیں ایک تھکا ہوا انسان ایک عمدہ لباس والی خاتون کو

"گلستاں بکنار" لیے جا رہا ہے - یہاں ایک دو فرلانگ کا بنگلہ ہے جس سے اُس دلفریب بستی کو دیکھ رہا ہے جو اسکا وطن ہے اور جسے شاید اب زندگی میں وہ دوبارہ نہ دیکھ سکے گا، تو وہاں ایک قوی اور کشیدہ قامت انسان لمبے لمبے قدم رکھتا ہوا چلا جا رہا ہے - کہیں ایک کمزور دُبلا پتلا آدمی بھیڑ سے بچتا ہوا ناتوانی کے باعث لڑکھڑا کر رک جاتا ہے اور سوچتا ہے کہ وہ آگے بڑھ رہا ہے تو کہیں ایک مکار بدمعاش زمین کی طرف سر جھکائے اور مجمع پر ترچھی نظریں ڈالتا ہوا سڑک کے اس رخ سے اس رخ تک چلا جاتا ہے - وہاں ایک شریف عورت نوجوان کبھی اپنے گرد آلود پیروں کو دیکھتا ہے اور کبھی اُس "دور از نگاہ" مقام کو جو اس کی منزل مقصود ہے، تو وہاں ایک فلسفی، ایک شاعر، اپنے خیالات میں محو، شعر کی رنگینیوں میں غرق "سر در گریباں" اور "انگشت در حرکت بے معنی" اپنے سے باتیں کرتے ہوئے سرگرم جادہ پیمائی ہے —— بے وقوفوں کا ایک بے سر و پا مجمع، ناداںوں کا ایک جم غفیر —— شہزادہ و فقیر، گناہگار و پارسا، قصائی اور نانبائی، درزی اور موچی، کمہار اور ملاح - غرض کہ تمام ہستیاں ایک ہی موج میں ادھر سے اُدھر تھپیڑے کھا رہی ہیں ——

کہیں ایک منصف "کلاہ عدالت" سر پر رکھے، داڑھی ہلاتا ہوا معروض جا رہا ہے تو کہیں ایک پارچہ فروش "سراسیمگی" اپنے شفیئے کپڑوں میں مست ہے —— کہیں ایک سپاہی سرخ وردی پہنے اور سینہ تانے اکڑا ہوا ہے تو کہیں بیچارہ خاموش اور پراگندہ خیال درزی لمبے ڈورے والی سوئی کو ٹوپی میں لگائے، گردن جھکائے، کپڑے کے گز کو کھولتا اور لپیٹتا چلا جا رہا ہے —— کہیں ایک طالب علم اپنی کتاب کی ورق گردانی کر رہا ہے تو کہیں ایک "عطر بیز" دلدار اپنے چمکدار کپڑوں کی جگمگاہٹ دکھلا رہی ہے —— کہیں ایک مدبر سیاست دان اپنی قانون سازی کے غلغلہ کو عرش بریں تک پہونچا دینے کی کوشش کر رہا ہے تو کہیں ایک اشتہاری حکیم "نادر الوجود مرکبات" کی تبلیغ میں سرگرم ہے —— کہیں مکار سرمایہ دار اپنا جال بچھا رہا ہے تو کہیں غربت سے کھا فرزند در" اپنی سعی لاحاصل پہ گریہ و زاری کر رہا ہے —— کہیں ہر کمیا ہے تو کہیں "پوشاک پالش" —— کہیں شاعر ہے تو کہیں "خواہ مخواہ مرد آدمی" —— کہیں ایک رکن مجلس عاملہ ہے تو کہیں ایک "مصنوعی فخر" رقاصہ —— کہیں "لیڈر" تمام دنیا کو اپنے نظریہ کا نشان بنانا چاہتا ہے تو کہیں ایک حکومت پرست ہے جو چاندی کے روپیہ لیکر سفید کو سیاہ کر دکھاتا ہے اور ذاتی مفاد کے لیے "محبت قومی" کو فروخت کیے دیتا ہے —— کہیں ایک "تقدس مآب" تو کہیں ایک جواری —— کہیں محتسب ہے تو کہیں رند لاابالی —— غرضکہ ہمہ کائنات بہ یک ست ہنگامۂ عالم میں شریک ہے —— ، تیوریوں، گالیوں، دعاؤں، کوسنوں، گانوں،

قہقہوں اور گریۂ غم کا ایک ہنگامہ ہے اور پھر بھی سب "میدانِ ہستی" میں ایک دوسرے کے "ہمرکاب" ہیں ان کی رفتار کبھی کم نہیں ہوتی۔ اس دوڑ کا اختتام کہیں ہے ہی نہیں۔ نہ تو اس راہ میں سرائیں ہیں کہ آرام کرلیں اور نہ ایسے پُرلطف مناظرِ حسن سے روح میں تازگی پیدا ہوسکے۔ نہ تو سکون ہے اور نہ سایہ دار درخت کہ تھک کر اُن کے "تلے" بیٹھ جائیں ——— موسم کیسا ہی کیوں نہ ہو ان لوگوں کے نصیب میں شرکتِ ہنگامہ ہی ہے۔ مبادا کہ پیچھے آنے والے ان کو روندتے ہوئے نکل جائیں۔

ان کے دماغوں میں ارتعاش ہے، اور اعضا میں کپکپی۔ لیکن اُس وقت تک یہ "اس ہنگامہ" سے علیحدہ نہیں ہوسکتے جب تک دل دھڑکنا نہ چھوڑ دے۔ "آنکھیں" حسن کے پاؤڈر" کی طرح سفید اور بے رونق نہ ہو جائیں، اور ایک یہ "انبساط" آنے والی آواز اس کا اعلان نہ کردے کہ پیچھا کرنے والوں کو ایک قدم آگے بڑھنے کا موقع مل گیا ہے ——— اس "مردم کش" رفتار اور "ہنگامۂ آرزو" میں شامل ہو کر بھی ایک "کاہل آدمی" کے سوا کون یہ کرسکے گا کہ اس سے لطف اندوز ہوسکے۔ بجز "کاہل" کے کون ایک دیر میں ہوشیار ہونے والے مسافر کی طرح منہ کھولے آنکھیں پھاڑے، کارواں کو گزرتا دیکھا کرے گا اور دوڑ کر ان میں سے کسی میں شریک نہ ہوجائے گا ——— کم سے کم مجھے تو اس کا اعتراف ہے کہ "سرِراہ ٹوٹا سا ایک بر آمدہ" ——— "قناعت اور کاہلی کا حقہ" ——— "شہد کا مرتبان" ——— اور "چنیا بیگم کا خرامِ ناز" ——— ایسے استعارے ہیں جو میری فطرت کو صحیح معنوں میں پیش کررہے ہیں۔ ——— میں جانتا ہوں کہ بہت سے پڑھنے والے اس میں فلسفہ کا رنگ دیں گے ——— کوئی اسے "اپنے رنگ میں مستی سے" تعبیر دے گا اور کوئی اسے "قناعت" سمجھے گا ——— لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ اس دُور سے دیکھنے پر بھی میں "ہنگامہ عالم" سے لطف اندوزی کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ اور پھر ایسی حالت میں جبکہ چاروں طرف پُرکیف مظاہرات ہوں ——— سچ کہوں! — میں فطرۃً تو ایسا "افغانی" ہوں جو کسی جگہ مجمع دیکھ کر اپنے بچے کو اس لیے بھیج دیتا ہے کہ "وہ کیفیت سے آگاہ کرے" اور خود اس کا منتظر رہتا ہے کہ کہیں جھگڑا فساد ہو رہا ہو تو پہلے موقع پر "سعادتِ شرکت" حاصل کرلے۔ اب اسے کیا کروں کہ موقع ہی نہیں ملتا اور اگر ملے گا تو اُس وقت ملے گا جبکہ ہستی کی آگ دنیا تو ختم ہوجائے گی یا "چرچے یہی رہیں گے افسوس ہم نہ ہونگے" ——— اس میں میرا کیا قصور ہے یہ تو قسمت کا پھیر ہے۔

میں "سعیِ خطرناک" کا "پُرزور حامی" ہوں اور اُس میں شرکت کا متمنی، لیکن دُور سے۔ جب میں یہ سنتا ہوں کہ تمام دُنیا اس میں شریک ہے اور ایمان داری و جواں مردی سے اپنے لیے راہ نکال رہی ہے تو میں بہت خوش ہوتا ہوں۔ کیونکہ ایسے مشاہدات انسان کے خون کے "بہادر عناصر" کو مشتعل کر دیتے ہیں۔

زندگی کی جد و جہد میں شریک ہونا ، نامساعدات زمانہ سے طاقت آزمائی کرنا اصلی لطفِ حیات ہے ۔ ہزاروں
میں دیو اور اژدر پیدا ہوتے رہتے ہیں ۔ اور اُس سونے کے صندوق کو حاصل کرلینا جس کے یہ نگراں ہیں
عملاً اتنا آسان نہیں جتنا کہ کاغذ پر لکھ دینا ۔ کتابوں میں اکثر یہ لکھا ہوتا ہے کہ ایک شہزادہ اپنی "جوانمردی کی
نمائش کرنے" اپنے والدین کے دربار سے کسی اہم کام کو انجام دینے کے لیے عنقریب سفر محمل باندھ لیتا
ہے" ـــــ اور دو تین سال محنت کرنے کے بعد (اب اس کی اصلیت کو خدا ہی جانتا ہے!) دولتِ دنیا
کے چھکڑے لاد کر لے آتا ہے اور ایک بیش بہا پوشش شہزادی مزید برآں! ـــــ لیکن کسی نے یہ بھی غور کیا ہے
کہ ان افسانوں کے مصنف کوئی ایسے ذرائع نہیں بتلاتے جن سے یہ ہر کس و ناکس کے لیے ممکن الحصول
ہو جائے ـــــ اور اسی پر مجھے بڑا غصہ آتا ہے ۔ کیونکہ اگر کوئی ایسے طریقے واقعی ہیں تو ان پر عملی جد و جہد
واقعی بڑی پُر لطف ہوگی ۔

ہزاروں میں ایک ناول نویس بھی ایسا نہیں ہوتا جو اپنے "ہیرو" کا سچا قصہ لکھ دیتا ہو ۔ دس بارہ
مضمونوں میں چائے کی دعوت کا ذکر ہوتا ہے پچاس ساٹھ صفحوں میں ناچوں کا تذکرہ ہوتا ہے اور باقی کتاب
میں ایسا ہی "الم غلم" چلیے ناول "قریب الختم" ہو گیا ۔ آخر میں نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اب وہ ہمارے ملک کا ایک
بڑا بھاری تاجر ہے اور عظیم الشان میر ـــ یا ایک بڑا ماہر فن ہے ۔ غرضکہ دنیا بھر میں یکتا ہے اور تمام دنیا
اس طرح اُس کے آگے سرنگوں ہے جس طرح ایک کمزور درخت تیز ہوا کے سامنے یا ایک ضعیف انسان
گردشِ روزگار کے روبرو ۔ مختصر یہ کہ جیسی خدا نے اُس کی پھیری ویسی ہی سب کی پھیرے ـــ سچ پوچھیے
تو یہ چھوٹے چھوٹے "دل بہلاؤ" اور "وقت گزار" افسانے اُن بڑے بڑے ناولوں سے کہیں زیادہ مبنی
بہ حقیقت ہوتے ہیں کیونکہ ان میں بتایا جاتا ہے کہ کس طرح ایک "دفتری بچہ" ایک بڑی [illegible]
کا افسرِ اعلیٰ بن گیا ۔ یہ قصے ہمارے ذہن نشین کر دیتے ہیں کہ کیونکر ایک "دوانی بیرسٹر" عدالتِ عالیہ کا جج
بن گیا ۔ دراصل وجود کی دلچسپیاں چھوٹی چھوٹی تفصیلات میں ہوتی ہیں "محیر العقول نتائج" میں نہیں ـــــ

فی زمانہ ہم کو ایسے ناولوں کی ضرورت ہے جو ذی حوصلہ انسانوں کی دماغی الجھنوں کا نقشہ کھینچتے ہوں ۔ اُن کی
سعی و پریشانی ، امید و ناامیدی کامیابی اور ناکامی ، اچھی طرح واضح کر دیتے ہوں ۔ مجھے یقین ہے کہ "دوشیزۂ
بخت" سے اظہارِ عشق کا افسانہ اتنا ہی پُر کیف ہوگا جتنا کہ ایک حور بہشتی کی گرویدگی کا ذکر ـــــ اگرچہ دونوں
کا نفسِ مطلب ایک ہی ہوگا ۔ کیونکہ گزشتہ علماء کے بہ قول قسمت بھی "عورتوں" ہی سے ملتی جلتی ہے ، لیکن وہ
"عورت" کی طرح "بے وجہ غیر مستقل مزاج" نہیں ہوتی ـــ اس لیے اگر غور سے دیکھا جائے تو ایک کی جستجو دوسری
کی تلاش ہے ۔ "بن جانسن" "Jonson" کہتا ہے کہ

ایک عورت کو چاہو، وہ تم سے نفرت کرنے لگیگی۔ اُس کی تلاش کرو وہ
تم سے بھاگیگی لیکن اُسکی طرف سے بے توجہ ہو کر اُسے تنہا چھوڑ دو تو وہ تم کو
چاہنے لگیگی اور تمہاری تلاش شروع کریگی۔

اور یہ مقولہ قسمت اور عورت دونوں کے باب میں صادق آتا ہے۔ ایک عورت اُس وقت تک اپنے عاشق کی قدر نہیں کرتی جب تک کہ وہ "یوسف بے کارواں" نہ ہو جائے۔ اسی طرح جب تک تم "لاتوں سے قسمت کی نوازش نہ کرو" اور اس کی حرمت سے منہ نہ موڑو وہ ہرگز تم پر لطائف حیات کی بارش نہیں کرتی۔ لیکن ہمیشہ اُس کی مسکراہٹ بالکل یہ شعر ہوتی ہے

کی مرے قتل کے بعد اسنے جفا سے توبہ ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

اور اس تبسم بے محابا کی داد اس کے سوا اور کیا ہو جو ہے کہ اس عالم میں کوئی عطیہ کبھی بروقت نہیں ملتا واپس۔

خیر! --- اچھے آدمی آج تک کبھی "صحیح قسم کے" ہوتے ہی نہیں۔ ورنہ میرے اور اُنکے خیالات کا مطابقت نہ کرنا کیا معنی؟ --- میں اتنا ضرور مانتا ہوں کہ اگر دنیا سے حوصلہ مند انسان غائب ہو جائیں تو دنیا "شہر خموشاں" ہو جائیگی — دراصل حوصلہ مندی "آب حیات" ہے۔ ایسا نہیں ہے جو مٹی کو مزہ دار بنا دیتا ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر دنیا ترقی کر ہی نہیں سکتی۔

"فلسفی" کہتا ہے کہ حوصلہ مندی "سکون" کے نعمت کو تباہ کر دیتی ہے۔ لیکن یہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ آخر وہ لوگ کیسے "گم کردہ راہ" ہو سکتے ہیں جو صبح سے شام تک اپنی کوششوں کو ختم کیے ایسی راہیں بنایا کرتے ہیں جن پر بنی نوع انسان کو آگے بڑھنے کا موقع مل سکتا ہے ——— وہ کیونکر غلطی پر ہو سکتے ہیں جو اپنی ذہنیت کو ہر وقت یہی صرف کرتے ہیں کہ کائنات کھیل کود میں مصروف ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ اپنی محنتوں کا صلہ "ریاستوں کی تنخواہ" نہیں ہونے دیتے، جو کبھی پوری طرح ملتی ہی نہیں۔ لیکن اپنے مقاصد کے لیے کام کرکے وہ ہم کو بھی نفع پہونچاتے ہی ہیں۔ انسان کو وہ جذبۂ ایثار ودیعت نہیں ہوا ہے جو "دیوتاؤں" کو ہوا کرتا تھا۔ بنی نوع انسان ایک دوسرے سے اس طرح وابستہ ہیں کہ کوئی فرد صرف اپنے کو فائدہ نہیں پہونچا سکتا۔ اپنی بہتری میں جو قدم آگے بڑھایا جاتا ہے اُس سے خود بخود تمام عالم کی بہتری ہو جاتی ہے۔ ایک چشمہ بہنے کی سعی میں پن چکی کو چلاتا ہے۔ گھونگھے کے کیڑے اپنا گھر بنانے کی جد و جہد میں ایک ملک کو دوسرے سے ملا دیتے ہیں۔ ہر حوصلہ مند انسان اپنی طرح

بلند کرنے کی کوشش میں ایک معیارِ رفعت چھوڑ جاتا ہے۔ اسکندر (Alexander) اور قیصر (Caesar) اپنے حوصلوں کو پورا کرنے کے لیے جنگ آزما ہوئے لیکن انھوں نے نصف عالم کو مہذب بھی بنا دیا۔ اسٹیفنسن (Stephenson) نے اپنی شہرت اور دولت کمانے کے لیے ریل کا انجن ایجاد کیا، لیکن آج لاکھوں بلکہ کروڑوں آدمی اُس سے فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔ آغا حشر اور شکسپیر (Shakespeare) نے اس لیے ڈرامے لکھے کہ ان کی آمدنی سے انکے بیوی بچے آرام اُٹھا سکیں۔ لیکن ہزاروں آدمی ان سے لطف اُٹھاتے ہیں اور سبق بھی حاصل کرتے ہیں۔

ایک حد تک تو "کم حوصلہ" اور "قانع انسان" بھی بیجا ہوتے ہیں۔ وہ اعلیٰ مصوری کے لیے ایک اعلیٰ معیار قائم کر جاتے ہیں۔ اور دراصل حوصلہ مندوں کی جدوجہد کے قدر شناس آخر ایسے ہی لوگ ہوا کرتے ہیں۔ جب تک قانع لوگ اپنے خیالات کی تبلیغ نہ کریں۔ میں انکے خلاف ایک لفظ بھی کہنے کا مجاز نہیں لیکن خدا کے لیے اُن کو یہ موقع نہ دیجیے کہ وہ تمام دنیا میں مارے مارے پھریں اور اس کی تبلیغ کریں کہ وہ خدا کی صناعی کی اعلیٰ ترین مثال ہیں۔ کیونکہ بحقیقت وہ مکھیوں کے چھتے میں ناکارہ "بڑے مکھے" ہیں۔ وہ ایسے لوگ ہیں جو سڑکوں پر ٹخنوں سے اونچے پاجامے پہنے، منہ کھولے، بال بکھرائے، اور بے شمار پان کھائے صرف اس لیے سرگشت کیا کرتے ہیں کہ دنیا کی مشغولیت کا اپنے نقطۂ نظر سے مشاہدہ کریں۔ اس لیے اُن کو یہ سوچنے کا موقع بھی نہ دیجیے کہ وہ بڑے عاقل دانشمند و فلسفی ہیں اور قناعت ایک نعمت ہے۔ کیونکہ اُن کو ایسا سوچنے کا بڑا شوق ہوتا ہے۔ ممکن ہے یہ سچ ہو کہ ایک قانع آدمی ہر کہیں خوش رہ سکتا ہے۔ لیکن بالکل یہی حال "خرِ خراسانی" کا بھی ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے جہاں دُنیا چاہتی ہے اُن کو ڈھکیل دیتی ہے اور جس طرح چاہتی ہے اُن سے سلوک کرتی ہے۔ اکثر اُن کی بابت یہی کہا جاتا ہے کہ "اُف، وہ اپنی حالت پر قانع اور خوش ہیں۔ اُن کو کیوں گڑبڑاؤ"۔ آخر کار یہ ہوتا ہے کہ قانع انسان جہاں ہوتا ہے وہیں رہ جاتا ہے اور دوسرے بڑھ جاتے ہیں ——

اگر تم اپنی حماقت سے قانع واقع ہوئے ہو تو میرا کہا مانو اور ہرگز قناعت کو ظاہر نہ ہونے دو۔ بلکہ دوسروں کے ساتھ ہنگامے میں شریک ہو جاؤ۔ اگر تم کو تھوڑی چیز درکار ہو تو بہت مانگو۔ کیونکہ اگر تم ایسا نہ کروگے تو تم کو کچھ نہ ملے گا۔ اس دنیا میں مدعی کا طریقِ طلب اختیار کرنا زیادہ سودمند ہے۔ اور مناسب بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ایک کی ضرورت پڑے تو دس مانگو۔ سو کی ضرورت ہو تو ہمیشہ ہزار مانگو کیونکہ اگر تم سو مانگوگے تو صرف دس ملیں گے۔ اس مشہور کلیہ پر عمل نہ کرنے ہی سے "عمر خیام" کا اتنی

دشواریاں اُٹھانا پڑیں۔ اُس نے اپنی دُنیاوی بہشت کے لیے "ایک جھونپڑا، ایک حسین کم عمر نازنیں اور شراب" ان ہی کو کافی تصور کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جھونپڑا اور شراب تو خیر جوں توں مل گئے لیکن دنیا کو جنت کر دینے والی نازنین اس کے مقدر سے یک قلم نابود ہو گئی ——

اس کے برخلاف اگر وہ یونان شاہی، پرستان، اور شراب سے بھرے ہوئے سمندر مانگتا تو اس کے حوصلہ کی بلندی دیکھ کر اسے یہ تینوں چیزیں ایک حد تک ضرور عطا کر دی جاتیں —— قانع انسان کے لیے زندگی بھی کس قدر غیر دلچسپ مسئلہ ہو جاتی ہے —— آخر ان کا وقت کیسے گزرتا ہے۔ اور کون سی تمنا ان کے خیالات کو مشغول رکھتی ہے —— ہستی کا مفہوم صرف شکرگزاری اور عبادت ہی تو نہیں — اخبار بینی اور "حقہ بازی" تو شغلہ عام ہے اس میں اب وہ لطف کہاں سچ یہ ہے کہ قانع اشخاص تو توقعات کی دلچسپیوں سے آگاہ ہوتے ہیں اور نہ کوششوں کی مسرتوں سے آشنا —— ایک عالی ہمت انسان کے لیے زندگی ایک پُرلطف بازی گاہ ہے جہاں ہوشیاری اور ہنرمندی کا امتحان ہوتا ہے — اور اس بازی کو جیتنے کے لیے ایک کھلاڑی اور چابکدست انسان اور نہ چوکنے والی نظر کی ضرورت ہے —— ایسے لوگ اس میدان میں سراسیمگی کو بھی نشاط بے حد خیال کرتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے کہ ایک غواص غوطے لگانے کو اور ایک کھلاڑی اپنی تیز رفتاری کو —— اس میں شک نہیں کہ بسا اوقات غوطہ لگانے والے غوطے کھانے لگتے ہیں۔ لیکن "سعی فتح" کے ناکام ہونے پر صرف "تاب مقابلہ" ہی مسرور کر دیتی ہے اور اس خیال سے تشفی ہو جاتی ہے کہ کم سے کم وہ بیکار تو نہ تھے۔

محنت کی ناکامی میں بھی وہ کیف ہے جو چارپائی پر لیٹ کر وقت گزارنے میں ہرگز نہیں ہوتا — اس بازی گاہ کے ہر کھلاڑی کے لیے انعامات ہیں اور اس میں شرکت کرنے کے لیے "ملکی و غیر ملکی" کی کوئی شرط نہیں۔ عمر رسیدہ تجربہ کار آدمی کے لیے یہاں دولت ہے اور نوجوانوں کے لیے شہرت —— عورت کے لیے آبرو اور حسن ہے، احمقوں کے لیے دلچسپیاں اور کاہلوں کے لیے قہقہے ——

پس اے معزز ناظرین (بلا امتیاز جنس) اُٹھیے اور اس ہنگامہ میں سعادت شرکت حاصل کیجیے۔ کیونکہ جو کوئی اس سے واپس آیا ہے کبھی خالی ہاتھ نہیں آیا —— جو کامیاب ہوتا ہے اُسے انعام ملتا ہے اور جو ہار جاتا ہے وہ یہ کہکر خوش ہو لیتا ہے کہ :—

"مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا"

(ترجمہ)

بابا افضل الدین کاشانی مرقی

شعر کے حسن و عیب کی تمیز بڑی حد تک ذوق سے متعلق سہی لیکن بعض اوقات شاعر کی زندگی اور اسکا ماحول محاسن کلام میں اس قدر اضافہ کر دیتے ہیں کہ انکے جانے بغیر ذوق انسانی شعر کی حقیقی خوبی تک نہیں پہونچ سکتا کبھی شعر میں تلمیح ہوتی ہے اور وہ تلمیح بھی شاعر کی شخصیت سے تعلق رکھتی ہے لہذا جب تک شاعر کی حیثیت اور اُس کی ذات کے متعلق ہم کو واقفیت نہ ہو شعر کی داد تحسین ناشناس سے زائد مرتبہ نہیں رکھتی۔ شعرا کے حالات بیشتر تو انکی سوانحمریوں اور تذکروں سے معلوم کیے جاتے ہیں لیکن فی الجملہ شاعر کا کلام بھی اُس کی ذات اور شخصیت کا ترجمان بن جاتا ہے اور اُس کی تربیت دماغی کے مدارج، اُسکے جذبات و حسیات کا عکس اُسکی تحریروں سے نظر آتا ہے تاہم اگر تفصیلی طور پر معلوم کرنا ہو کہ فلاں شاعر کو شاعر بنانے میں کون احول معین و مددگار تھا اُسکے دور میں کیا فضا تھی اور اُسکے ارد گرد کن کن دماغوں کا ہجوم تھا جس نے اُسکے ارتقاء روحانی اور ذہنی نشو و نما میں اعانت کی تو پھر اس کے سوانح حیات پڑھنا ضروری ہیں جن سے پتہ چل جائے گا کہ شاعری میں جو روحانیت اور تصوف کا رنگ ہے یا تغزل اور مدح سرائی کا لہجہ ہے یا فلسفہ اور اخلاقیات کا پرتو ہے تو انکے اسباب کیا تھے۔ دیکھیے جب تاتار کا طوفان شیرازۂ عالم کو درہم برہم کر رہا تھا، خانماں برباد اور خانوادے اُجڑ گئے تھے، سر بفلک عمارتیں سطح زمیں بن گئی تھیں، مساجد اور معابد کی اینٹ سے اینٹ بجی، عبادت خانے ویران اور خانقاہیں مسمار کر دی گئیں، بڑی بڑی مقتدر اور ذی رتبہ ہستیاں کاسۂ گدائی لیے نان شبینہ کو محتاج نظر آنے لگیں۔ غرض انقلاب دوراں نے دنیا کی ناپائداری اور جاہ و جلال کی غیر استواری کا منظر آنکھوں کے سامنے کر دیا تو شیخ سعدی، ابن یمین، خواجہ حافظ جیسوں نے بے ثباتی کے نقوش کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔۔۔۔ اپنے اپنے تاثرات کو کلام میں ظاہر کرنے لگے اور دیکھنے اور پڑھنے والے اسے سوز دل تڑپ کی تصویر سمجھے اور اب بھی سمجھتے ہیں۔ فارسی شعرا سے قطع نظر ہر زبان کے حقیقی شاعر کا کلام اُسکے حالات اور ماحول کا ایک حد تک ترجمان ہوتا ہے۔ اس کے زمانہ کی فضا اور بیرونی حالات جس طرح کے ہوتے ہیں اُسکی شاعری میں اس کا پرتو نظر آتا ہے۔ میر تقی کے کلام کا غالب عنصر یاس و حرماں سے پُر ہے۔ یہ اس لئے کہ اسکے واقعات زندگی ہی یاس انگیز اور حرماں نصیب تھے۔ انشا کی ابتدائی شاعری میں رعنائیوں اور شوخیوں کی بھرمار ہے لیکن آخری کلام میں درد و بیچینی کی بہتات۔ اسی طرح ذوق کے دیوان کو مطالعہ کرنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ

شاعری بادشاہوں اور درباروں میں رسائی تھی، قدر و منزلت بڑھی ہوئی، اور اُس نے مرفہ الحال اور مستغنی ہوکر زندگی بسر کی۔

جب کسی شاعر کا کلام مختلف حیثیات کی وجہ سے جاذبِ توجہ اور دلکش ہو تو فطرۃً ضرورت ہوتی ہے کہ اسکی ذات و حالات کے متعلق جستجو کی جائے۔ اسکے احوال سے کلیۃً ہمیں واقفیت ہو اور وہ اسباب تفصیل کے ساتھ معلوم ہوں جنھوں نے اُسکے کلام میں دلچسپی کے سامان بہم پہونچا دیے اور بڑی مایوسی اور دلشکنی اُسوقت ہوتی ہے کہ جب ان امور تک ہماری دسترس نہ ہو۔ اللہ بھلا کرے پچھلوں کا کہ جہاں تک اُن سے بن پڑا اُنھوں نے بڑی حد تک اِس ضرورت کو پورا کر دیا۔ اور جہاں انکی طاقت نے جواب دیا تو تفصیل نہ سہی اشارہ ہی کر گئے۔ منجملہ ان اہلِ سخن کے جن کے کلام میں فی الجملہ جذب و کشش ہے اور جنکے مکمل حالات ہم تک نہیں پہونچے، ایک بابا افضل الدین کاشانی مرقی بھی ہیں جنکے متعلق عام طور پر تذکرہ نگاروں اور تاریخوں سے مختصر حالات کا ہم کو علم ہوتا ہے اور بالخصوص اردو تذکرہ نویس تو صفحاتِ کتب کو اُنکے ذکر سے گویا خالی ہی چھوڑ گئے۔ حالانکہ یہ وہ حکیم ہیں کہ اُنکے عہد کے بڑے بڑے دانشمند اور حکما اُنکی اُستادی اور عظمت[1] کے قائل رہے۔ اور اُنکے کلام کو قدر کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اور کیوں نہ ہوتا، اُنکے کلام میں حسنِ بیان، دقتِ معانی، دردانگیزی، طراوت اور روانی سب ہی باتیں پائی جاتی ہیں۔ بالخصوص اُن کی رباعیاں جن کی تعداد کافی ہے، ہر عہد کے لوگوں کی زبانوں پر ہیں، اور ہر دور کے لوگوں نے اُن سے خاص دلچسپی حاصل کی۔

خواجہ حکیم افضل الدین کاشانی کا تذکرہ کتابوں میں تو "افضل الدین کاشانی" کے نام سے کیا گیا ہے، لیکن عام طور پر فارسی میں "بابا افضل" کے عرف سے مشہور ہیں۔ 'بابا' کا لقب زمانہ سابق میں اُن لوگوں کے لیے استعمال کیا جاتا جو اپنے عہد میں پیشوائی کا مرتبہ حاصل کر چکے ہوں۔ چنانچہ بابا طاہر عریاں، بابا کوہی، بابا رکن الدین وغیرہم کے ساتھ بھی بابا کا لقب شامل ہے کیونکہ اپنے اپنے عہد میں یہ لوگ مرشد ابنائے زمانہ تھے۔ تذکرۂ عرفات العاشقین اور ہفت قلزم نے "افضل الدین محمد کاشانی" کے نام سے انکا ذکر کیا ہے۔ نصیر الدین طوسی جو بابا افضل کے معاصر تھے اُنھوں نے اپنی کتاب مبادی موجودات میں "شیخ افضل الدین محمد بن حسن المرقی المعروف بافضلی" کے ساتھ یاد کیا ہے۔ اسکے علاوہ انکے رسالہ منہاج المبین کے ترجمہ میں بھی جو علم منطق میں ہے یوں لکھتے ہیں

"تمت ترجمۃ منہاج المبین لاصابۃ الیقین فی المنطق للمولی وقطب العالم قدوۃ الحکما، افضل الدین محمد بن الحسن بن محمد بن خوزہ"

نصیر الدین طوسی نے اُنکے نام کے بعد مرقی لکھا ہے۔ انکی وفات مرق میں ہوئی اور انکا مزار بھی مرق میں ہے لہذا ممکن ہے کہ اُن کا مولد بھی مرق ہو جو کاشان کے مضافات میں ایک چھوٹے سے قصبہ کا نام

[1] دیباچۂ رباعیات بابا۔

ہے اور جس کا انتظام و انصرام ساوہ سے متعلق تھا - چنانچہ حمداللہ مستوفی نزہۃ القلوب میں لکھتے ہیں

"آن ایالت چہار ناحیت است ناحیہ چہارم" بسین چیل و دو پارہ دیہ است و رود ان وازتاوہ و دشیرم ومراق ... معظم قراے آن"

بابا افضل کا مزار اسی مرق میں ہے اور وہاں اطراف و اکناف کے لوگ اس کی زیارت کے لیے آتے ہیں "تفاحہ" اور "پیرایۂ شاہاں" جو بابا افضل کے تصانیف میں سے ہیں اور جن کا تذکرہ آگے چل کر ہم کریں گے - ان کے مقدمہ میں میرزا حسین خان مصبر السلطنۃ ایرن کاشانی نے لکھا ہے

"مدفنش در کوہستان سردسیر سمت جنوب غربی مدینۂ کاشان در بالاے قریہ معروف بمرق در دامنۂ کوہ مدفون است نزہت گاہ غریب است ... و زیارت گاہ خاص و عام است بقعۂ عالی دارد و از تمام اطراف کاشان و ولایات دیگر بزیارت تربتش می آیند و حکایات و خوارق عادات غریبہ ازو نقل می کنند مرقدے دیگر از سلاطین تاگیار است کہ در ایام سیر و جہان گردی جناب بابا مجذوب بابا شدہ .. و از سلطنت کنارہ نمود .. بعد از وفات بابا معتکف مزار او بودہ"

بابا افضل نے ایک چھوٹا سا رسالہ چند سوالات کے جواب میں لکھا اُس میں یوں لکھا ہے

"ایں جوابہا آخر سخن خواجہ بود چوں بہ جوار حق پیوست از مرق الخ"

بہر حال سطور بالا سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ بابا افضل کا مولد ہی اُن کا مدفن بنا۔

بابا افضل کے سوانح نگار کو جس سب سے بڑی دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ یہ ہے کہ انکی تاریخ ولادت وملت کی تعیین نہیں ہوسکتی - سب سے پہلے جس نے ان بزرگ کا تذکرہ کیا - وہ نصیرالدین طوسی ہیں جو ساتویں صدی کے اربابِ دانش میں شمار ہوتے تھے اُنھوں نے سیر و سلوک[1] میں جو غالباً ۶۵۳ھ یا ۶۵۴ھ میں لکھا گیا اپنے حالات کے ضمن میں لکھا ہے

"اما پدر بندہ کہ مردے جہاندیدہ بود .... بندہ کمترین را بہ تحصیل فنون علم و استماع سخن ارباب مذاہب .. ترغیب کردے تا اتفاق را شخصے از شاگردان افضل الدین کاشی رحمہ اللہ کہ او را کمال الدین محمد حاسب گفتندے .. خصوصاً در فن ریاضی تقدمے حاصل کردہ بود با پدر بندہ .. سابقۂ دوستی .. داشت بداں دیار افتاد .... و بندہ در پیش او بتعلیم ریاضی مشغول شد"

سطور بالا میں اس امر کی کوئی تصریح نہیں کہ یہ کس زمانہ یا سال کا واقعہ ہے لیکن اس کے آگے کی سطروں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ۶۱۲ھ یا اسکے قریب کا واقعہ ہوگا - چنانچہ لکھا ہے

"بہر وقت در اثناے سخن اہل ظاہر اکسری کردے ... و بندہ را دلپذیر آمدے چوں خواستے بفور سخن

---

[1] سیر و سلوک - ص۹-۱۱

"برسر اازاں اتباع نو دسے دگفتے انچہ لب و خلاصہ سخن ست ہنوز با تو گفتنی نیست کہ تو کودکی و روزگار ندیدہ"

ان سطور سے معلوم ہوتا ہے کہ بچپن اور کودکی کا زمانہ تھا جب نصیر الدین طوسی نے کمال الدین حاسب کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیے تھے۔ اور چونکہ اس زمانہ میں لوگ عام طور پر ۱۴-۱۵ سال کی عمر میں علم ریاضی کی تحصیل کیا کرتے تھے لہذا اس قرینہ سے پتہ چلتا ہے کہ طوسی نے کمال الدین حاسب کی شاگردی ۶۱۲ھ کے قریب اختیار کی تھی اور جب مؤخر الذکر بابا افضل کے شاگرد تھے تو انکا سن بھی غالباً ۳۰ سے تو متجاوز ہی ہوگا یا اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ بابا افضل اور کمال الدین استاد و شاگرد دونوں ہمعمر ہی تھے تب بھی یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ بابا افضل کی ولادت ۵۸۲ھ میں ہوئی ہوگی۔ شرح اشارات کے قیاس خلف کے بیان میں طوسی لکھتا ہے

"ان الشیخ افضل الدین محمد بن حسن المرقی المعروف بالقاشی ذہب الی ان ہذا القیاس ہو قیاس استثنائی"[1]

بابا افضل کا اس قیاس کے قیاس استثنائی ہونے کا قائل ہونا منہاج المبین سے طوسی نے نقل کیا ہے اور شرح اشارات کی تکمیل ۶۴۴ھ میں ہوئی ہے لہذا قرینہ سابق کو پیش نظر رکھتے ہوئے بابا کی عمر اسوقت ۵۲ سال ہوگی۔

بابا کی تحریریں یا مکاتیب جو دست برد زمانہ سے محفوظ رہے ان میں بھی بابا نے اپنے معاصرین کا کہیں صراحۃً ذکر نہیں کیا ہے جس سے تعیین عہد میں سہولت حاصل ہو جاتی ہاں اشارے کیے ہیں جن سے فی الجملہ انکے عصر کا پتہ چل سکتا ہے۔ چنانچہ ایک مکتوب میں لکھتے ہیں

"صباح و مسا مجلس عالی صاحب کبیر ... صدر الصدور مجد الدین ظہیر الاسلام .. سعادت ابدی را .. آرام جاں باد"

یہ مجد الدین غالباً مجد الدین تبریزی وزیر ہوں گے جن کو ۶۶۲ھ میں اباقا نے قتل کر ڈالا تھا[2] اور ان کے بعد وزارت خواجہ شمس الدین صاحب دیوان کی طرف منتقل ہو گئی تھی بنا بریں اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ ۶۶۲ھ میں یہ خط لکھا گیا تو اس نتیجہ پر پہونچنا آسان ہے کہ اس وقت بابا کی عمر کوئی ۶۰ سال کے قریب ہوگی۔ چنانچہ اس مکتوب کے آخر میں خود ہی لکھتے ہیں

"دانائے نہاں و آشکارا آگاہ و دانا ست کہ ایں بندہ ناتواں شصت سال ہست تا در ظلمات حیات الخ"

ایک اور مکتوب میں لکھتے ہیں

"کلماتے کہ از اقلام مبارک آں خلاصہ اخیار عصر و نوبادہ بستان خرد ... شمس الدین ایدہ اللہ ... برسید دیدہ از دیدن آں رقوم ... مایۂ تمام از سرور ... برداشت و دل از خدائے تعالی سپاس فراواں پذیرفت"

اسکے علاوہ ایک خط میں شمس الدین کا نام آیا ہے۔

"آنم رآفرینی کہ از جانب مجلس اعلائے شمس الدین مجد الاسلامی براہی مخلص رسید"

---

[1] شرح اشارات ص۹۶ [2] حبیب السیر جلد ۲ ص۵۹

اگر اس بات کے قرائن موجود نہ ہوتے کہ شمس الدین جسکا ذکر بار بار آتا ہے وہ صاحب دیوان جوینی ہی ہیں تب البتہ اشکال تھا اس لیے کہ شمس الدین کے لقب سے تاریخ ایران کے ہر عصر میں کوئی نہ کوئی ضرور ہی ملقب ہوا ہے لیکن یہاں قرینہ قویہ شمس الدین سے صاحب دیوان جوینی ہی مراد لینے کا یہ ہے کہ اول تو یہی ۶۶۱ھ سے لیکر ۶۸۳ھ تک شاہان مغلیہ (ہلاکو خانی) کی وزارت کے عہدہ پر فائز رہے اور یہی صرف یہی فضلا اور حکما کی پرورش اور ان پر الطاف کریمانہ کے ساتھ ممتاز و مشہور ہوئے اور یہی تھے وہ کہ شعرا کا ایک گروہ ان کے خوان کرم کا زلہ ربا تھا۔ لہذا ممکن ہے کہ بابا افضل بھی انھیں میں کے ایک فرد ہوں جو اس وزیر کے الطاف و انعام سے محظوظ اور بہرہ مند رہے۔ اسکے علاوہ ایک قرینہ شمس الدین سے مراد صاحب دیوان جوینی لینے کا یہ بھی ہے کہ ۶۸۳ھ میں جب شمس الدین کے قتل کا وقت قریب آیا تو اُس نے قرآن شریف سے جو اس کے پاس موجود تھا، فال نکالنے کے بعد ایک تحریر بطور وصیت نامہ کے اپنے بیٹوں کو لکھی اور ایک خط اپنے زمانہ کے علما و حکما کے نام لکھا۔ صاحب وصاف اس خط سے قبل لکھتے ہیں "ایں رقعہ با فاضل تبریز نوشت" اس کے بعد سطور ذیل نقل کی ہیں :-

"چون[1] بقرآن تفاول کردم برآمد ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا تتنزل علیہم الملائکۃ الا تخافوا ولا تحزنوا وابشروا بالجنۃ التی کنتم توعدون' باری تعالیٰ چون بندۂ خویش را دریں جہان فانی نیکو داشت و ہیچ مرادے از و دریغ نخواست کہ دریں جہان بشارت جہان باقی بہ و رسانند چون چنیں بود مولانا محی الدین و مولانا افضل الدین و مولانا شمس الدین ... ومشائخ کبار را کہ ذکر ہر یک تطویل می انجامد ... بشارت رسانیدن واجب نمود تا دانند کہ قطع علائق کردہ روانہ گشتیم ایشان نیز بدعائے خیر مدد دہند"

اسکے علاوہ بابا افضل کے بھی چند مکاتیب ہیں جن میں صراحت تو نہیں لیکن احتمال قوی ضرور ہے کہ انھوں نے صاحب دیوان ہی کے نام لکھے تھے۔ مثلاً ایک خط لکھا اور مکتوب الیہ کو مخدومی سے مخاطب بنا کر اسکے ایک عزیز دلبند کی وفات پر دلداری کی ہے اور جستہ جستہ نصائح بھی ہیں۔ قرینہ یہ ہے کہ غالباً یہ خط صاحب دیوان ہی کو ۶۷۵ھ[2] میں اسکے بیٹے بہاء الدین محمد کے واقعہ قتل کے بعد لکھا تھا۔

جیسا کہ اوراق ماضیہ میں میں نے لکھا ہے کہ بابا افضل کا مستقل اور مفصل کوئی تذکرہ اسوقت تک موجود نہیں ہے اور اگر ہے تو اس طرح کہ امین احمد رازی نے تذکرۂ ہفت اقلیم میں شعرائے کاشان کے ضمن میں انکا بھی ذکر کر دیا ہے۔ وہ لکھتا ہے

"افضل الدین محمد افضل زمان واکمل دوران بودہ چنانچہ اعلم العلما خواجہ نصیر الدین ایں قطعہ در حق وے گفتہ

[1] لٹریری ہسٹری آف پرشیا براؤن جلد ۳ صفحہ ۲۷ [2] تاریخ ادبیات ایران براؤن جلد ۳ صفحہ ۲۷ [3] ایضاً صفحہ ۲۰ جلد ۲

گر عرش کنید بر ملائک — فضل فضلا بفضل افضل
از ہر ملکے بجائے تسبیح — آواز آید کہ افضل افضل

عوفی لباب الالباب میں لکھتا ہے کہ جب یمین الدولہ محمود غزنوی کا پرچم ولایات ایران و عراق پر لہرانے لگا تو شاہ نے خواجہ افضل الدین جیسے صدر اجل اور یکتائے روزگار کی معیت میں غزنین کا ارادہ کیا لیکن فلک شعبدہ باز نے اس معیت کو قائم نہ رکھا۔ حاسدوں نے تمامی کی اور بدخواہوں نے برائی چاہی تا آنکہ محمود کا دل انکی طرف سے مکدر ہوگیا۔ جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ انکو قید خانے میں ڈال دیا گیا۔ ایاز بابا افضل کا شاگرد تھا، لہذا آپ نے ایک قصیدہ بادشاہ کی شان میں لکھا اور ایاز کے توسط سے پیش کردیا۔ شاگرد نے شاگردی کا حق ادا کرتے ہوئے بادشاہ سے آپ کی براءت چاہی اور اس لعل بے بہا کو معدن سے نکال لانے میں کامیاب ہوگیا۔ جب بابا کو آزادی ملی اور جلاد فلک کے ہاتھوں سے رہائی تو آپ نے ایاز سے وطن واپس جانے کیلیے استصواب رائے کرکے عادت اختیار کی اور تا حیات کمال معنوی اور سعادات اخروی کے حصول میں مصروف رہے۔[1]

اس قدر تو ان تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے لیکن ان کے بعد کے مورخین اور سوانح نگاروں نے کوئی صحیح معلومات بہم نہیں پہونچائے۔ تقی الدین کاشانی کی خلاصۃ الافکار، علی قلی خاں کی ریاض الشعرا، مخزن الغرائب، عرفات العاشقین ان کے متعلق صحیح اور معتدبہ حالات سے گویا خالی ہی ہیں۔ صاحب خلاصۃ الافکار نے اپنی عادت کے مطابق اتنا ضرور کیا کہ انکے عشق و محبت کا ایک قصہ لکھدیا ہے اور تعجب یہ ہے کہ لطف علی بیگ نے تذکرہ آتشکدہ میں اور رضا قلی خاں نے ریاض العارفین میں بھی اسی کا تتبع کیا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ بابا افضل کو ایک درزی کے لڑکے سے محبت تھی۔ مسلسل تین برس تک بیشتر اوقات درزی کی دوکان کے مقابل مسجد میں بیٹھ کر گزارتے رہے اس لیے کہ وہی ایک جگہ بے روک ٹوک اپنے منظور نظر کی طرف ٹکٹکی باندھ کر بیٹھنے کے لیے مصئون و محفوظ ہوسکتی تھی۔ باوجود اس سہ سالہ ریاضت و مشقت کے کبھی بات کرنے کا موقع ہاتھ نہ آیا۔ اتفاقاً ایک روز معشوق دوکان پر نہیں آیا۔ بیتاب ہوگئے۔ جویندہ یابندہ پتہ چلا کہ چند سرخوش نوجوانوں کے جھرمٹ کے ساتھ کسی باغ کی گلگشت کو نکل گیا ہے۔ باغ کا پتہ لگا کر آپ بھی پہونچے۔ دیکھا کہ ایک درخت کے سایہ میں بیٹھے ہیں۔ پہلے تو ادھر ادھر منڈلاتے رہے پھر کچھ بہانہ پاکر پاس پہونچے تو کیا سنتے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک اپنا اپنے عاشقوں کا تذکرہ کررہا ہے۔ جب درزی کے لڑکے کی باری آئی تو اس نے کہا کہ تین سال ہوگئے کہ برابر ایک شخص کو اپنی دوکان کے سامنے والی مسجد میں بیٹھے

---

[1] حکایت انکے بارے میں یقیناً غلط معلوم ہوتی ہے اسلیے کہ لباب الالباب تقریباً ۶۱۸ھ میں تالیف ہوئی - مقالات زرین ص ۸

دیکھتا ہوں حالانکہ اُس کی نظر میری طرف سے کبھی پھرتی نہیں لیکن آج تک میں نے اُس کو منہ نہیں لگایا۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ جب میں دوکان پر کپڑا اٹھاتا ہوں تو جیسے الفراق الفراق کی آواز جھاڑنے میں سنائی دیتی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ وصال کا انجام فراق ہے اور فراق جیسا کچھ جاں کاہ اور دلدوز ہوتا ہے ظاہر ہے۔ میرا جی نہیں چاہتا کہ اس درد کو دوام اٹھانے اور اسکی کلفتیں جھیلے۔ لہذا اس ظاہری اور چند روزہ صحبت کے دروازے بند ہی رہیں تو اچھا ہے۔ معشوق کے منہ سے یہ سننا تھا کہ بابا نے ایک چیخ ماری اور مدہوش ہوگئے۔ یہ منظر دیکھتے ہی سب نے آکر گھیر لیا۔ دیکھا تو بابا افضل تھے۔ اللہ ری باطنی محبت کہ معشوق سے رہا نہ گیا پاؤں پر گر پڑا اور مرید ہوگیا۔ جب بابا کو ہوش آیا تو یہ منظر سامنے تھا۔ دُنیا اور ما فیہا کو لات ماری اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے گوشۂ تنہائی اختیار کرلیا۔

صاحب آتشکدہ نے یہ بھی لکھا ہے[1] کہ بابا افضل کے معاصرین میں سے اکثر لوگ ان کے پاس آتے جاتے رہتے تھے۔ ان آنے جانے والوں میں چھوٹے بھی تھے اور بڑے بھی۔ مثلاً سعدی اور نصیر الدین طوسی جو اس عصر کے سرآمد فضلا میں گنے جاتے تھے وہ بھی اکثر آتے گئے ہیں۔ طوسی نے ایک بار بابا کے پاس یہ ایک رباعی بھی لکھکر بھیجی تھی۔

اجزاے پیالہ اے کہ در ہم پیوست | بشکستن آں روا نمی دارد مست
چندیں سر و پاے نازنین و سر دست | از بہر چہ ساخت و از براے چہ شکست

بابا نے اس کا جواب بھی دیا،

تا گوہر جاں در صدف تن پیوست | از آب حیٰوۃ صورت مردم بست
گوہر چو تمام شد صدف را بشکست | بر طرف کلہ گوشۂ سلطاں بنشست

ان دونوں رباعیوں کو مولفِ ریاض العارفین نیز محمد حسین شوستری نے مختار الجوامع[2] میں بھی نقل کیا ہے۔

صاحب مجمع الفصحا[3] لکھتا ہے کہ بابا افضل محقق طوسی کے ماموں تھے۔ اس پر دوسرے تذکروں میں یہاں تک منقول ہے کہ جب طوسی ہلاکو خاں کا وزیر ہوا اور مہمات درپیش ہوئیں تو اسی قرابت و یگانگی کی وجہ سے کاشان نہب و غارت اور قتل عام سے محفوظ رہا۔ لیکن صاحب عرفات العاشقین وغیرہ کے بیان کے مطابق دونوں میں اُستادی اور شاگردی کے تعلقات تھے۔

بابا کے سنہ وفات کے متعلق بہت کچھ اختلافات ہیں۔ اُس چھوٹے سے رسالہ میں جسمیں اُنکے مختصر حالات لکھے ہیں اور جس کی ایک کاپی ایشیاٹک سوسائٹی بنگال میں موجود بھی ہے۔ انکی رحلت کا

[1] مطبوعہ طہران ص۱۶۲ [2] ص۱۹۴ مطبوعہ بمبئی [3] جلد ا ص۲۰۲

سال ۶۶۶ درج ہے ۔ محمد حسن خاں اعتماد السلطنۃ نے مختصر ناصری میں ۶۶۸ھ درج کیا ہے اور تقی الدین نے تذکرۂ خلاصۃ الافکار میں ان کا سالِ رحلت ۷۰۷ھ لکھا ہے ۔ یہی نہیں بلکہ ایک شعر جس سے مادۂ تاریخ نکلتا ہے اُس کو بھی نقل کیا ہے

تاریخ وفاتِ خواجہ افضل — از عقل بجوے وعقل اول

اگر صاحب دیوان کے مکتوب کو پیش نظر رکھا جائے کہ جس میں افضل الدین کا نام بھی آتا ہے اور جس کو ہم مختصراً اوپر نقل کر چکے ہیں تو صاحب خلاصۃ الافکار کا سالِ رحلت ۷۰۷ھ قرار دینا یقینی غلط اور بدیہی البطلان ہے اس لیے کہ صاحب دیوان جیسا کہ گزر چکا ۶۸۳ھ میں قتل کیا گیا تھا ۔ لہذا اس مادۂ تاریخ کی تاویل یوں ممکن ہو سکتی ہے کہ اس سے دوسرے افضل الدین مراد ہوں جو تیس یا چالیس سال بابا افضل کی وفات کے بعد تک زندہ رہے ۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس دور کے بعد والے مورخین نے غلط تاریخی اشاعت پر بھروسہ کرکے اس کا مورد افضل کو قرار دے لیا ہو ۔ اور یہ کوئی نئی بات بھی نہیں ، اکثر ہوا ہے کہ ایک غلط تاریخ نے شہرت پائی ہے اُسی پر مورخین اور مابعد کے شعرائے اعتماد کرکے کچھ نہ کچھ لکھ دیا ۔ اور جب حدسیات اور ظنیات ہی پر مدار بحث ٹھہرا تو یہ بھی کہنا کچھ بیجا نہیں ہے کہ افضل الدین جنکا اشارہ صاحب دیوان کے مکتوب میں پایا جاتا ہے اس سے مراد یہ بابا افضل ہی نہ ہوں بلکہ وہ افضل الدین ہوں جو اس لقب لیکن محمد کے نام سے ایران میں موجود تھے اور جو علمائے منطق میں شمار کیے جاتے تھے اور جن کی کتب اور منطق میں بہت سی تالیفات موجود تھیں یعنی افضل الدین سے مراد ابو محمد بن نامور بن عبد الملک خونجی شافعی ہوں جن کا سنہ وفات کشف الظنون میں حاجی خلیفہ نے ایک[1] مقام پر ۶۴۲ لکھا ہے اور دوسری جگہ[2] ۶۴۶ درج کیا ہے ۔ بعض جگہوں پر ۶۴۹ اور ۶۴۶ بھی لکھا ہے یہ صاحب تالیفات ہوئے ہیں کشف[3] الاسرار عن غوامض الافکار، موجز اور جمل القواعد یا کتاب الجمل علم منطق میں ان کی مشہور و معروف کتابیں بھی ہیں

(ولہا بقیہ)

---

[1] جلد ۲ ص ۲۰۱ [2] ص ۱۶۹ [3] کشف الظنون

غزل جناب قمر سہسرامی الٰہ آباد

بکھرے پرے ہر ذرہ جو ترا حسن نمایاں ہو جائے — ذرہ سورج بنے قطرہ دُرِ غلطاں ہو جائے

پھول نرگس کے نہیں بناکر لحد سے میری — مرکے بھی حسرتِ دیدار نمایاں ہو جائے

قدر دانا ہے کہ جو دست نگر ہو تیرا — خود وہ شرمندۂ کوتاہی داماں ہو جائے

درد دل اُس کو نہیں کہتے محبت والے — چارہ سازوں کا جو منتکش درماں ہو جائے

دل سے میرے وہ محبت کے ترانے نکلیں — تارِ مضراب قمر تارِ رگِ جاں ہو جائے

پریم مدھ کے متوالے

(جناب پروفیسر محمد مسلم صاحب عظیم آبادی ایم اے)

سید کبیرالدین احمد کو لوگ کبیر داس کہتے تھے۔ اس نے ہندوستان کی اجتماعی اور سیاسی کشمکش کے دور میں پرورش پائی تھی جبکہ مدرسہ کا بچہ بچہ سیاسیات سے کچھ نہ کچھ دلچسپی رکھنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا تھا۔ گھر کی اسلامی تعلیم، اسکول میں ہندو ذہنیت کے مطالعہ اور برہمو ہیڈ ماسٹر کے اثر صحبت نے اس کے دل و دماغ میں کمسنی ہی سے ایک ہیجان پیدا کر رکھا تھا۔ اس کے شعور کے ساتھ ساتھ اس کا ذوق مطالعہ و فکر بڑھتا گیا۔ ایک طرف اس کے قابل باپ نے قرآن مجید کو رسمی ترجمہ و تفسیر کے بغیر آزادانہ لغوی، تاریخی و نفسیاتی روشنی میں ذہن نشین کیا، جس سے اس نے اسلام کی ہمہ گیری اور وسعت مشرب کو سمجھا، اور ایسا سمجھا کہ ایک مولوی نہیں سمجھتا۔ دوسری طرف اس کی غیر معمولی دماغی ترقی اور شائستگی نے ہیڈ ماسٹر صاحب کی توجہ اپنی طرف کھینچی اور ایسی کھینچی کہ اسکے اسکول کے تمام اسباق خانگی طور پر اپنے ذمہ لے لیے۔ ان کی توجہ صرف یہی نہیں کہ وہ اپنی جماعت میں اوّل رہنے لگا بلکہ مذاہب عالم سے روشناس کر کے ہر مذہب کے خالص اور بہترین اجزاء کھول کر دکھا دیے۔ اس سلسلہ میں زرتشت، کنفیوشس، سری کرشن، گوتم بدھ، مسیح علیہم السلام اور سلطان مہابیر شنکر آچارج، گرونانک، دیانند، ویویکانند، رامانند، چیتنیہ، بابا تلسی داس، بابا کبیر، راجہ رام موہن رائے، اور کیشب چندر سین کے سوانح زندگی اور تعلیمات سے آشنا کر دیا۔ اور وید، ویدانت، بھاگوت گیتا کے مقامات سمجھائے۔ یہ رنگ دیکھ کر باپ نے بھی متکلمینِ اسلام معتزلہ، ابن حزم، غزالی، رومی، ابن تیمیہ، ابن قیم، شاہ ولی اللہ، اسمٰعیل شہید، سید احمد خاں، مرزا غلام احمد نیز بابی و بہائی متنبیوں کے سوانح حیات، افکار اور تصوف عرب و عجم سے آگاہ کر کے عقائد متقابلہ کے معلومات کی تکمیل کی۔

کبیر کے دماغ پر اس متنوع معلومات کا مجموعی اثر یہ ہوا کہ وہ توحید خالص، وحدت خلق (وحدت وجود نہیں) وحدت ادیان اور مساوات بنی نوع انسان کا معتقد ہو گیا۔ نمازیں بلا قید جماعت سہی؛ اس نے جاری رکھیں، رمضان کے روزے بھی ناغہ نہیں کیے، مگر فروعی مسائل میں اس نے کبھی سنت و اجماع و قیاس کی طرف زیادہ اعتنا نہ کی۔ اس لیے نہ سنی نے اسے سنی جانا، نہ شیعہ نے شیعہ مانا، نہ اہل حدیث نے اسے موحد فی النبوت گردانا۔ قرآن شریف پر اپنے عقائد کا انحصار رکھنے اور بات بات پر آیات قرآنی و تواریخ سے استدلال و استشہاد کرنے کے سبب سے کوئی اسے کھلم کھلا کافر کہنے کی جرأت تو نہ کر سکا مگر پیٹھ پیچھے مختلف مذاہب بلکہ دہریت و کفر سے بھی

منسوب کیا جانے لگا۔

کبیر جب پریسیڈنسی کالج کے پہلے سال میں تھا، سیاسیاتِ ہند نے ہندو مسلم اتحاد کے جوش و خروش کی صورت اختیار کی اور عام جلسے ہونے لگے تو کبیر کے دوستوں نے اسے پکڑ کر مسطبۂ عام (پبلک اسٹیج) پر کھڑا کر دیا۔ ایک سیلاب خیالات اس کے دل و دماغ میں جوش مارتا رہتا تھا اور کالج یونین کی محدود وسعت اس کے پھیلنے کو کافی نہ تھی۔ اسٹیج پر پہنچتے یک بیک ندی کا بند ٹوٹ جانے کی طرح اس نے ہندو مسلم اتحاد پر فصاحت کا طوفان برپا کر دیا۔ ایک دم میں وہ وید، انجیل، ہندو دھرم، مغربی سائنس، قرآن، تاریخ کے حوالوں سے جو سچے محب وطن ہیں مجمع پر طلسم خاموشی چھایا ہوا تھا، تالیاں بھی فراموش تھیں۔ سامعین کے اصرار پر صدر نے اسے بہت زیادہ وقت دے دیا۔ آخر رات کے ساڑھے دس بجے جب تقریر ختم ہوئی، ہر طرف سے زندہ باد، زندہ باد، کبیر داس کی جے، کے نعروں، مصافحوں، معانقوں اور دعاؤں کے شور میں مشکل سے فراغت پائی۔ دوسرے اتوار کے دن اس کی مخصوص و مبسوط تقریر کا ہر روز اخبار و رسائل میں چرچا ہوا اور مجمع نے کہیں پیچھا چھوڑا۔

ہیڈ ماسٹر صاحب بابو تیش چندر بنرجی اپنی ملازمت سے مستعفی ہو کر اپنے گاؤں کے مکان واقع بھوانی پور میں اقامت گزیں تھے۔ بقول خود کبیر ان کا شاگرد تھا اور کبیر بھی ان سے کبھی کبھی ملا کرتا تھا۔ دوسرے اتوار کی سہ پہر کو جب وہ ان کے مکان پر پہنچا تو وہ اسے گلے لگا کر آبدیدہ ہو گئے۔ کہنے لگے عزیزم تم نے میرا ایک دیرینہ ارمان ایک حد تک پورا کر دیا۔ اور اس سے زیادہ کی توقعات پیدا کر دیں۔ کاش میں اپنی زندگی میں انھیں بھی پورا ہوتے دیکھ لوں۔

تارا دوڑی آئی اور کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولی "دادا (بھائی) تم تو بڑے مقرر ہو گئے ہو۔ میں سبھا میں تمھاری تقریر سن کر حیرت زدہ ہو گئی۔ کاش ہم بنگلہ بھی اسی روانی سے بول سکتے۔ تب اپنی بہت سی عزیزوں اور سہیلیوں کو سناتی۔ ان میں مسلمانوں سے اچھے بہت ہیں۔ ان کے بارے میں تو کہتی ہیں "میری بیتھون کالج کی سہیلیاں تمھاری بہت تعریف کرتی ہیں۔ اب مانتی ہیں کہ میں اسلام کی سچائی پر جس سے کہا کرتی تھی تو حق پر تھی۔"

کبیر "کاش انھیں یہ معلوم ہو جائے کہ میرے نوجوان مسلمان دوست کہتے ہیں اور وہ مجھے پکا مسلمان نہیں سمجھتے۔"

تارا "تو پکا ہندو کون ہے اور پکا عیسائی کون ہے؟ ہم جیسی اور لڑکیاں جو ہمت کرنے والے کو اس کے دھرم کے لوگ ادھرمی (کافر) کہتے ہیں۔ یہ حقیقت تو اب نئے تعلیم یافتہ لڑکوں اور لڑکیوں پر روشن ہو چکی ہے۔ اور پھر یہ سراہتی تو اسلام کو ہوں نہ کہ موجودہ مسلمانوں کو۔"

کبیر "تارا یہ سچ ہے۔ وہ نہ میں کیا۔ سب تیش بابا کی کرپا ہے۔ تیری میں اپنی تعریف تو کسی اور وقت سنوں گا۔"

لاؤ قرآن شریف۔"

کبیر نے ایک رکوع پڑھا۔ ترجمہ کیا۔ باپ بیٹی نے سر جھکائے۔ ادب سے سنا۔ سوالات کیے جن کو کبیر نے حل کیا۔ ستیش بابو نے ایک بھجن پڑھی۔ کبیر اور تارا نے آنکھیں بند کیے سنی۔ پھر کبیر نے دعا پڑھی اور باپ بیٹی نے آمین کہی۔ اس انوکھی عبادت کے بعد پھلوں کے ساتھ چائے پی جاتی۔ تارا جو ستیش بابو کے گھر میں بیٹی اس کی اکیلی خانہ داری میزبانی کی خدمت انجام دیتی۔ بغیر تیاکو کے سب سے یہ گروہ عزیز تھا یہ مختصر پارٹی برخاست ہو جاتی۔ یہ تھا ہر اتوار کی سہ پہر کا معمول۔

کبیر کی دوسری مخصوص تقریر کے دن کیا کیفیت گزری اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ سارے اخبارات اس کے اقتباسات اور کبیر کی تعریف سے معمور تھے۔ ہر جماعت میں اسی کا چرچا تھا۔ پولیس کی رپورٹ پر حکام انتظامی کے اشارے سے یا محض اخباروں میں پڑھ کر پرنسپل صاحب نے کبیر کو اپنی کوٹھی پر بلا بھیجا اور سیاسیات میں مداخلت پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ کبیر نے جواب دیا کہ اگر حب وطن کا وعظ جو ہمیں کالج میں سکھایا جاتا ہے اور مساوات نوع انسان کی نصیحت جو بائبل اور قرآن دونوں پیش کرتے ہیں سیاست ممنوعہ ہے تو اس شجر ممنوع سے کوئی تعلیم یافتہ یا نادار شہری پرہیز نہیں کر سکتا۔ نہ عیسائی من حیث عیسائی نہ مسلم من حیث مسلم نہ ہندو من حیث ہندو۔ میں نے بغاوت یا نقض امن کی کوئی تحریک تو نہیں کی۔

پرنسپل: "یہ سچ ہے کہ تم قانونی گرفت سے باہر ہو۔ میں ذاتی طور پر تمہارا ہم خیال ہوں۔ مگر جانتے ہو کہ بعض چیز ایک کے لیے تریاق ہوتی ہے، دوسرے کے لیے زہر۔ عوام پر اس اشتراک و مساوات عامہ کی تعلیم کا یہ اثر ہوگا کہ سوشلزم یا اشتراکیت نشو و نما پائیگی جو حکومتوں کے امن و انتظام میں مخل ہوتی ہے۔"

کبیر: "میری تقریر انگریزی میں ہوتی ہے، مخاطب صرف تعلیم یافتہ ہوتے ہیں۔ پھر عوام پر برا اثر کیوں پڑے گا۔ رہا سوشلزم، کمیونزم یا بالشویزم تو معاف فرمائیے گا آپ خود ایک لکچر میں ان کے فرق ہم پر واضح کر چکے ہیں اور سوشلزم کو وسیع مفہوم میں ناقابل اعتراض بلکہ مفید خلق فرما چکے ہیں۔ پھر یہ غلط بحث کیوں فرما رہے ہیں۔ اسلام خود ایک پیغمبر جیسے سوشلزم کا حامی بلکہ پیدا ہر مبلغ ہے جس سے کوئی باخبر مسلمان انکار نہیں کر سکتا۔ پھر ایک مسلمان کو اس سے کیونکر روک سکتے ہیں؟"

پرنسپل صاحب زور سے ہنسے فرمانے لگے "میرا منشا بحث کرنا یا تمہیں کوئی نیا حکم دینا نہیں۔ میں نے تمہیں یہاں پرنسپل کی حیثیت سے نہیں بلایا بلکہ ایک ہمدرد دوست کی حیثیت سے اور یہ کہتا ہوں کہ حکام انتظامی ذرا ذرا سی بات سے خائف ہو جاتے ہیں۔ وہ ہندو مسلم اتحاد کو منع نہیں کرتے مگر اسکے جوش کے نتائج سے ڈرتے ہیں۔ حق و ناحق سے بحث نہیں۔ احتیاط سمجھو یا وہم کہو دوسری بات یہ ہے کہ تمہارے یہ تقریری ہنگامے

سیاسیات کے دائرہ سے باہر بھی مگر اس قدر قریب ہیں کہ ہر لحظہ اس میں گر جانے کا قوی اندیشہ ہے جو طالب علم کی حیثیت سے ابھی تمہارے لیے مہلک ہے۔ کم سے کم بی اے کے امتحان تک اس کو ملتوی رکھو اور اگر سرکاری ملازمت کرنا ہو تو بالکل روک دو۔ حق یا ناحق حکام کو یہ پسند نہیں۔ وہ مشتبہ ہو ہی جاتے ہیں"۔

کبیر "بس بس میں آپ کا مطلب سمجھ گیا۔ شکریہ۔ تکمیل تعلیم تک میں ارشاد کی تعمیل کروں گا"۔

پرنسپل (مسکرا کر) "مجھے امید تھی کہ تمہارے لیے اشارہ کافی ہوگا"۔

ایک تو پرنسپل کی فہمائش، پھر امتحان کی تیاری، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہندو مسلم اتحاد و محبت کی لہر جو... دوڑ رہی تھی، بقرعید میں ایک گائے کے جھگڑے نے فنا کر دی۔ یہ بھائی بھائی کئی روز تک چھریاں لیے ایک دوسرے کے جگر میں بھونکنے کو تیار رہتے۔ ہفتہ بھر بھلے آدمیوں کا راہ چلنا بند ہو گیا۔ راہ گیر پکڑ پکڑ کر پیٹے اور کبھی مار تک ڈالے جاتے۔ چار دن پیشتر کی محبت نفرت و کدورت ہی نہیں بلکہ وحشت و بہیمیت سے بدل گئی تھی۔ کبیر مایوس ہو کر ہندو مسلم اتحاد کے خواب کو دل سے بھلانے کی کوشش کرنے لگا۔ اور پڑھنے یا ستیش بابو کے ہاں جا کر غم غلط کرنے کے سوا کوئی شغلہ نہ رہا۔

اسی زمانہ کی ایک سرد شام کا ذکر ہے۔ کبیر، ستیش بابو اور تارا آتشدان کے پاس بیٹھے آگ تاپ رہے تھے۔ آج کے ہندو مسلم کشت و خون کی خبر زیادہ حسرتناک تھی۔ بظاہر سب خاموش تھے مگر اندر اندر سب کے دل وقف شیون تھے۔ لاکھ تقریریں دلوں میں گونجتی تھیں، تدبیریں چلاتی تھیں اور مایوسی کی ایک ٹھنڈی سانس میں اُڑ جاتی تھیں۔ چہرے سراپا فکر و تخیل تھے۔ ستیش بابو زیر لب بڑبڑائے جیسے دل کی آواز سنائی دے جائے۔

"جب تک ہندو مسلمان مذہب، زبان، چھوت چھات اور ذات پات کے بہانوں سے علیحدہ رہیں گے جب تک ان کی ذہنیتوں میں اختلاط نہ ہوگا متحدہ ہندی قومیت کا خواب خواب ہی رہیگا۔ ان میں صدیوں اتحاد نہ ہوگا"۔

کبیر "آپ گویا میرے دل سے بول رہے ہیں۔ میں بھی یہی سوچ رہا ہوں کہ متحدہ قومیت جو اتحاد چاہتی ہے وہ سطحی لیپ پوت، اور پیوند و رفو سے ممکن نہیں۔ دین کے پاک نام سے خلق خدا کا جتنا خون بہایا گیا ہے کسی دوسرے دنیاوی مقصد یا طمع سے نہیں بہا۔ کیا اب بھی مذہب کو خدا کی رحمت کہا جا سکتا ہے؟"

تارا "قطع کلام ہوتا ہے۔ تازہ جنگ یورپ میں جتنا خون بہا ہے، جتنے بچے یتیم، سہاگنیں بیوہ اور بوڑھے والدین نپوتر (لاولد) معصوم بچے قتل، عصمت کی دیویاں بے عزت، کھیتیاں ویران، کارخانے تباہ، محل اور جھونپڑے برباد ہوئے ہیں اُن سے زیادہ ظلم اور اتیاچار کسی دھرم کی جنگ میں کبھی دیکھا یا سنا گیا ہے۔ آج کی بات ہے۔ ابھی صبح کی شام نہیں ہوئی"۔

ستیش: "سچ ہے۔ اس سے کون انکار کر سکتا ہے؟ مگر مذہبی جنگ ہو یا ملکی، کارن ایک ہی ہے۔ خود غرضی، من کی پالن، نفس پروری، تعصب۔ مذہب ان کے مٹانے ہی کو آئے تھے مگر امتداد زمانہ سے بگڑ بگڑ گئے، سڑ گئے، اور اپنی زہریلی ہوا سے سنسار میں زندگی کے عوض موت، صحت کے بدلے ہلاکت پھیلا رہے ہیں۔"

کبیر: "اسی دُکھ سے کمیونسٹ (اشتراکی) حکومت نے روس میں مذاہب کو ملیا میٹ کر دیا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس زمانہ میں مذاہب کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ ان کے ایک دم سے کھنڈن کی ضرورت ہے۔"

ستیش: "موجودہ روپ میں مذاہب کیسے ہی مضر ہو گئے ہوں تم اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ سارے سنسار کو پریم کے شیرازہ میں جمع کر کے یکجان کر دینے کی کوئی اُپاسے دھرم کے سوا سے کبھی نہیں۔ دوسرے لفظوں میں انسانی فکر ایسی مہم کے سر کرنے سے قاصر ہے۔ فلاسفہ و علما نے جتنے اصول بنائے اور تدبیریں نکالیں سب ناکام ہوئیں۔

جو نکتہ وروں سے حل نہ ہوا، جو فلسفیوں سے کھل نہ سکا وہ راز اک کملی والے نے بتلا دیا چند اشاروں میں۔"

کبیر: "تو کیا آپ مانتے ہیں کہ کسی جگ میں کوئی دھرم اپنی تازگی اور صحت و تندرستی کی حالت میں سنسار میں صلح و امن قائم کرنے میں کامیاب ہوا ہے؟"

ستیش: "ہاں پہلے دنیا آج کی سی وسیع نہ تھی۔ جغرافی حدود تنگ تھے۔ ہر ملک و نسل الگ الگ دنیا تھی۔ ایک دیس میں ایک دھرم وہاں کی مخصوص ضروریات کے لحاظ سے صلح و امن قائم کر دیتا تھا۔ ہندوستان میں ویدک دھرم، ایران میں زرتشتی، چین میں کنفیوشس کا دھرم، شام میں موسوی صدیوں کامیاب رہے۔ مذہبی جنگ ہمیشہ ایک نئے مذہب کے ارتقا، نئے دور کی قدرتی آمد، نئے حالات کی کشمکش یا نئے مذہب سے نقد دم کے وقتوں میں ودمنسا ہوا کی ہے۔ ٹھیک اسی طرح جیسے پرانی اور نئی تہذیبوں میں جنگ ہوتی ہے۔ بہار میں نئے پودوں کے لیے پرانے پودے یا خودرو جنگل جھاڑیاں کاٹ کے صاف کر دیے جاتے ہیں اور باغ میں کوڑوں کا ڈھیر ہو جاتا ہے۔ جیسے دست آور دواؤں سے مرتیں کوڑا کرکٹ پیٹ صاف کیا جاتا ہے۔ نشتر دیکر فاسد خون اور ریم جسم سے نکالی جاتی ہے، دانتوں کے نکلنے میں قدرت بچوں کو دکھ دیتی ہے، پرانے دانت نئے دانتوں کے لیے جگہ خالی کرتے ہیں۔ نئے پتوں کے پھوٹنے سے پہلے خزاں کے زرد پتے جھڑ جاتے ہیں۔ ہومیوپیتھی علاج میں امراض اپنی پوری شدت دکھانے کے بعد دفع ہوتے ہیں۔

"جوں جوں پیغمبر آتے اور گزرتے جاتے ہیں دنیا کی عام حالت بدلتی جاتی ہے۔ ضرورتیں اور تعلیمات

بدلتی رہتی ہیں۔ آج سے ڈھائی ہزار سال قبل اسرائیلی دنیا کو رحم و کرم، لطف و محبت، روحانیت شگفتگی یعنی اخلاق کے سدھار کی ضرورت تھی۔ عقائد و احکام درست تھے عیسیٰ مسیح نے اصلاح چاہی۔ کشمکش ہوئی۔ مسیح علیہ السلام کا جسم اس کشمکش کی نذر ہو گیا۔ مگر روح غالب آئی اور عیسائیوں پریم کی سگندھ پھیلاتی رہی۔ قانون الٰہی کے مطابق مسیحی دائرۂ اثر اسرائیلی دائرہ سے وسیع ہو گیا۔ اسی طرح ہندوستان میں جب ہندو دھرم صرف مورتی پوجا اور ہزاروں پیچیدہ رسوم و بدعات کا نام تھا اور خواص بھی جوگ اور سادھن کو دھرم کی غایت سمجھتے تھے۔ گوتم بدھ نے برسوں جنگل جنگل پربت پربت ڈھونڈھنے کے بعد یہ پرچار کیا کہ پرماتما نہ جنگل میں ہیں نہ پہاڑ میں نہ سمندر میں، وہ اپنی مخلوقات میں ہیں اور انھیں کی سیوا اور [illegible] سے ملتے ہیں۔ ویدک دھرم سے مقابلہ ہوا۔ جنگیں ہوئیں۔ آخر بدھ دھرم کو ہم وطنوں کے [illegible] سے وسیع تر ہو کر تبت چین، ترکستان اور ایران پر چھا گیا۔

آج سے چودہ سو برس پہلے دنیا کے مختلف حصوں میں [illegible] مذاہب بہت کچھ پھیل چکے تھے موسوی، عیسوی، زرتشتی اور بدھی تعلیمات خدا کو پہچنوا چکی تھیں۔ دنیا اصول اخلاق سے [illegible] ہو چکی تھی۔ مہذب دنیا اب زیادہ وسیع ہو چکی تھی۔ مگر صفات الٰہی نے [illegible] ایک [illegible] اور لطیف [illegible] تھا۔ پیغام حق کھوئی ہوئی بھیڑوں سے آگے بڑھ چکا تھا۔ [illegible] زبانوں، ملکوں، طبقوں اور ذاتوں کی چار دیواریاں توڑنا تھیں۔ جغرافی حدود [illegible] کے تمام بنی نوع انسان کو ایک برادری کے رشتے میں باندھنا تھا۔ انقلابی جنگیں ناگزیر تھیں، ہوئیں۔ یوں تو ہر دھرم [illegible] حق و صداقت [illegible] ہوتا ہے مگر دیکھنا یہ ہے کہ مظلوم اور پست حال طبقہ نے جو [illegible] ہے کس کا [illegible] دولت والے اپنی سلطنتوں کے لیے اور [illegible] عیسیوں، موحدوں نے اقتدار کے لیے کشمکش کی۔ مگر مفلس، نادار، بھوکوں، ننگوں، غریبوں نے فوراً اسلام کا پیغام [illegible] خوشی سے قبول کر لیا۔ اس لیے [illegible] جاؤ، عوام الناس اور پست طبقہ کی حالت پر نظر کرو جس سے عبارت ہے سوسائٹی اور ہیومینٹی (خلق اللہ)

کبیر: تو کیا اسلام کے بعد پھر جو بگاڑ پیدا ہو گئے ہیں ان کے سدھار کے لیے آج پھر ایک پیغمبر کی ضرورت ہے؟

ستیش: اس کا جواب مجھ سے بہتر تم کو دینا چاہیے تھا کہ [illegible] مسلمان ہو [illegible] تعلیم یافتہ خیر [illegible] مجھ سے سنو کہ اگر ٹھیٹھ مسلم نہیں تو نامسلم بھی نہیں ہوں۔ پیغمبر کی ضرورت ہے لیکن [illegible] اب بھی [illegible] پیغمبر [illegible] مفہوم میں آتے رہیں گے۔ ایک نہیں، لاتعداد۔ ان کو [illegible] مجدد، مجتہد [illegible] پیغمبر [illegible] میں مناقشہ کیا ہے۔ مگر وحی و الہام کے واسطوں کی اب ضرورت نہیں۔ دنیا ارتقا کی اس منزل سے گزر چکی ہے۔ جب خدا ساری قوم میں ایک فرد کامل کو منتخب کر لیتا تھا تاکہ [illegible] بندوں تک اپنا پیغام پہنچانے

کا آلہ بنا سکے - دوسرے لفظوں میں براہ راست تعلیم الٰہی یا ذہنی وحی و الہام کا حامل ہو - یوں سمجھو کہ نصاب تعلیم کامل ہے پڑھائی ناقص - اگر مدرسہ کا معلم شیکسپیئر اور ملٹن پر عبور نہیں رکھتا اور خراب پڑھاتا ہے تو شیکسپیر اور ملٹن میں ترمیم و اصلاح کی ضرورت نہیں معلم کی قابلیت کی ضرورت ہے - اسی طرح پڑھانے والے بدلتے رہیں گے - کبھی قابل آئیں گے کبھی ناقابل مگر شیکسپیئر اور ملٹن نہیں بدلیں گے -

غرضیکہ قرآن شریف اب تک آخری نصاب ہے کامل و اکمل - اس کا علم پرمیشور کو ہے کہ دنیا پر وہ دور کب آئے گا یا نہ آئیگا جب قرآن سے مختلف کوئی نصاب مقرر ہوگا - تم لوگ "ہمیشہ ہمیشہ" کے لیے قرآن کو آخری صحیفہ مانتے ہو مگر یہ ہمیشگی اور قیامت انسانی نقطہ نظر سے ہے - انسانی تصور اور قیاس تاریخی و شماری صحیح مدت کے ادراک سے قاصر ہیں - یہ ہمیشگی یہ قیامت و آخرت مجازی و اعتباری ہیں یا واسطہ ہیں - دنیا کی ایک خاص عمر یا ایک کے لحاظ سے ہیں مطلق نہیں - پرماتما کے سوا کوئی وجود کوئی زمان کوئی مکان مطلق یا حقیقی اور ازلی و ابدی نہیں - ہزاروں لاکھوں برس پہلے کیا تھا ہزاروں لاکھوں برس بعد کیا ہوگا - کتنی دنیائیں بنیں اور مٹیں یا بنیں گی اور مٹیں گی - ان کا ادراک ایک دنیا اور ایک دور عالم نہ کر سکتا ہے نہ کرنے کی ضرورت ہے -"

کبیر - "غرض یہ ہے کہ آپ نے اسلام کو مجھ سے اور عام علماء اسلام سے بہتر سمجھا ہے - اب سوال یہ ہے کہ قرآن مجید کامل سہی موجودہ زبوں صورت حال کا کیا علاج ہے؟ ہم کو کیا کرنا چاہیے؟"

ستیش - "قرآن کی اصلی تعلیمات کو سمجھنا سمجھانا اور برت کر نمونہ پیش کرنا -"

کبیر - "اول تو ہم خود ناقص - اور قادر بھی ہوں تو ایک ہماری ذات سے کیا ہو سکتا ہے"؟

ستیش - "تم کسی اور فرد یا افراد کے لیے راستہ تو صاف کر سکتے ہو - جو تم سے نہ ہو سکے ہو سکتا ہے کہ تمہارے بارے ہوئے دیا سے کوئی دوسرا یا تیسرا یا چوتھا ایک مشعل روشن کردے اور سنسار کی اندھیری کو اجالا کر دے جیسے مسیح بھگوان کے دیا کو محمد بھگوان نے مشعل بنا دیا - جو آج تک جل رہا ہے مگر ٹمٹمانے لگا ہے - صرف تیل ڈالنا ہے -"

کبیر - "تیل سے آپ کی مراد کیا ہے؟ ایک لفظ میں فرمائیے -"

ستیش "پریم"

کبیر "پریم کی شراب خلق کی حلق سے کیسے اتاری جائے؟"

ستیش "مساوات اور رواداری کے پیالے سے - تمام بنی نوع انسان کو ایک سمجھو اور سب کی یکساں خدمت کرو - وہ ایک ہو جائیں گے - اسلام یہی ہے یا اور کچھ؟ توحید یہی ہے یا اور کچھ ہے"

ویدانت کا وحدۃ الوجود جو اب مسخ ہو گیا ہے اس کے سوا کیا تھا کہ تمام مخلوقات ایک عکس ہیں ؎

حقیقت ایک ہے ہر شے کی نوری ہو کہ خاکی ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّے کا دل چیریں

غرض توحید مساوات، عبادت حق، یا خدمت خلق ایک ہی حقیقت کی مختلف تعبیریں اور تشریحیں ہیں۔ اور یہی حقیقت، دین حق ہے۔"

اس گفتگو کی نوبت میں گھنٹے نے گیارہ بجائے تو سب چونکے اور یہ مختصر صحبت منتشر ہوئی۔

دو مہینے کے بعد ان شبانہ صحبتوں کا مادی نتیجہ ایک ماہوار انگریزی جریدہ "ٹروتھ" کی شکل میں ظاہر ہوا۔ چند اشاعتوں میں یہ ہندوستان کے ہر طبقہ میں ہر دلعزیز اور انگلستان، امریکہ، جنیوا، جاپان کے خاص طبقوں میں مقبول ہو گیا۔ اسکے بعض مشہور اور معرکۃ الآرا مقالات کے موضوع اور خلاصہ مطالب یہ تھے:۔

خدا کہاں ہے؟ نہ جنگل میں، نہ پہاڑ میں، نہ سمندر میں، نہ کعبہ اور مسجد میں، نہ کاشی اور مندر میں، نہ گرجا اور آتشکدہ میں۔ تمام مخلوقات میں اسی کی ذات کا ظہور ہے۔ صفات ہمارے ادراک سے باہر ہیں۔

عبادت کیا ہے؟ عبادت اپنی پرستش ہے یعنی مخلوق کی خدمت۔ خالق ہماری پوجا سے بے نیاز اور بلند تر ہے۔ اس حدیث قدسی سے استدلال کہ قیامت میں خدا بندے سے سوال کریگا میں بھوکا تھا تو نے مجھے کھانا نہیں کھلایا، میں پیاسا تھا تو نے پانی نہیں پلایا، میں ننگا تھا بدن نہ ڈھانکا۔ بندہ کہیگا خداوند بے نیاز تو بھوکا پیاسا ننگا کیا معنی؟ خدا جواب دیگا میرا فلاں بندہ بھوکا تھا اگر اُسے کھانا کھلاتا تو مجھے کھلاتا۔ فلاں پیاسا تھا، تو اُسے پانی پلاتا تو مجھے پلاتا، فلاں ننگا ٹھنڈ سے ٹھٹھر رہا تھا تو اُسے کپڑا پہناتا تو مجھے پہناتا۔

جو شیخ کو کعبے میں نہ طاعت سے ملا جوگی کو نہ جنگل میں ریاضت سے ملا
اک رندِ خرابہ حال کو وہ خالقِ کُل بازار میں مخلوق کی خدمت سے ملا

نماز، روزہ، دھیان، تپسیا کا مقصد صرف اپنے نفس کو مٹانے اور دوسروں پر مرنے کی قابلیت پیدا کرنا ہے۔

بہشت و دوزخ کیا ہیں؟ صلح و جنگ، محبت و عداوت، پریم کا پھول اور کینہ کپٹ کی آگ۔ اپنے اعمال کے نتائج اپنے آگے یا اپنی آیندہ نسلوں کے آگے آنا۔

مرنے کے بعد کیا ہوگا؟ اپنے اپنے اعمال کے مطابق قطرہ سمندر سے ہم آغوش یا حباب ہم آغوش حقیقت مطلقہ کا انکشاف۔ آگے کچھ نہیں معلوم نہ علم کی ضرورت زندگی ایک امانت ہے خلق اللہ کی ؎

ایں جانِ عاریت کہ بحافظ سپرد دوست روزے رخش ببینم و تسلیم وے کنم

اسلام کیا ہے؟ سوال یوں کرو سچائی کیا ہے؟ دین کیا ہے؟ یہودیت، نصرانیت، ویدمت، بودھ مت، کیا ہیں؟ توحید! توحید کیا ہے؟ خداوند کے فرزندوں کی ایک برادری، ایک خاندان، ایک گھر جس پر ترت ایک ذاتِ واحد خدا کی حکومت ہو۔ اور کسی ماسوا کا دخل قابل قبول نہیں۔ آزادی، مساوات ان کو توڑنے والی ہر طاقت شرک و کفر اور قابلِ دفع و جہاد اور ہر حریف مشرک و کافر۔ وحدۃ الوجود بھی یہی ہے باقی دھوکا اور گمراہی۔

ٹروتھ کی اشاعت حیرت انگیز طور پر بڑھ رہی تھی۔ اسکے مضامین کے ترجم اور اقتباس سے شاید ہی ہندوستان کی کسی زبان کا رسالہ خالی رہتا ہو۔ اس کی آمدنی سے کافی رقم پس انداز ہوتی اور اس نئی برادری کے تبلیغی کاموں پر صرف ہوتی۔ اب تک سیکڑوں کی تعداد میں ارکان شریک ہو چکے تھے اور اب انکی تنظیم و تقسیم عمل کا سوال زیرِ غور تھا۔

قانون فطرت کے مطابق تارا اور کبیر کے تعلقات زیادہ عرصہ تک برادرانہ نہ رہ سکتے تھے۔ رفتہ رفتہ ان میں ایک خاص طور کی کشش پیدا ہوئی۔ جسے کشش ضدین کہیے، یعنی تارا ایک مختلف نسل، مختلف زبان، مختلف تہذیب و معاشرت والے خاندان کی لڑکی ہونے کے سبب سے کبیر کے لیے ایک انوکھی چیز تھی۔ اور انوکھے کی طرف ایک لپک ہوتی ہے، یا کشش مثلین یعنی دماغی وحدت و اشتراک خیال کا نتیجہ۔ سبب جو کچھ بھی ہو۔ انکے تعلقاتِ دوستی کا نشو و نما بتدریج اس حد تک ہو گیا کہ دونوں ذاتیں ایک شخصیت واحد میں جذب ہو جانے کا تقاضا کرتی تھیں سے یہ کہہ رہی تھی "انا القیس" وہ "انا لیلیٰ"

جزئی تفصیلات عشق و محبت سے قطع نظر کیجیے۔ اگر آپ کی رگ و پے میں گرم جوان خون دوڑتا رہا ہو تو یاد کیجیے اور سمجھ لیجیے۔ مجھے لیلیٰ مجنوں کی داستان سنانا نہیں۔ کبیر کی زندگی کے صرف چند ضروری اور سبق آموز حصے منظرِ عام پر لانا ہیں۔

ایک روز ٹروتھ میں کبیر کا ایک بسیط مقالہ "مذاہب عالم کا مشترک نقطۂ نظر" شائع ہوا جس میں مختلف مذاہب کے اساسی اصول و عقائد پر ان کے صحیفوں سے فقرے اور عبارتیں نقل کر کے ان میں اتحادِ غایت دکھایا تھا۔ دنیا پر خدائی سلطنت یا خدائی گھرانے کی تعمیر۔ ایک واحد طاقت کی پرستش میں آزادی، مساوات، محبت، خدمتِ خلق داخل ہیں۔ ایسی طاقت کا منکر صلح و امن کا منکر، اور قابلِ تعزیر و اصلاح ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

ستیش بابو اسے پڑھ کر ایسے خوش ہوئے کہ کمرے میں قدم رکھتے ہی اُسے گلے سے لگا لیا اور مدح و تحسین کا پُل باندھ دیا۔ کبیر نے غیر معمولی تعریفوں سے شرما کر یا بوکھلا کر سانس لینے کے لیے موضوعِ سخن بدل دینا چاہا، یا شاید وہ اپنے دلی مدعا کے لیے ایسے موقع کا منتظر تھا، اسے فوراً پا جاتا ہے۔ اس نے شوخی سے مسکراہٹ کے ساتھ کہا

"بابا آپ میری بہت زیادہ تعریف کرتے ہیں اور مجھ سے بہت خوش ہیں۔ اگر واقعی میں نے آپ کو خوش کیا ہے تو میں آپ سے کچھ مانگوں؟ بہت دنوں سے آپ نے مجھے کوئی پرائز (انعام) نہیں دیا ہے"

ستیش بابو (مسکرا کر) "اب تک تم اپنے آپ کو مدرسہ کا طالب علم ہی سمجھتے ہو؟ اب میں تمہارے لائق کیا رکھتا ہوں کہ دوں؟ ایک دولت ہے محبت وہ تم کو دے چکا"

کبیر: "اگر میں ایسی چیز مانگوں جو آپ کے پاس ہو تو آپ دریغ تو نہ کریں گے؟"

ستیش بابو۔ "پھر تم خود بتاتے ہو"

کبیر: "اگر آسمان کا تارا مانگوں؟"

ستیش بابو (حیران ہو کر) "یہ میرے پاس کہاں؟" (پھر تارا کی طرف غور سے دیکھ کر کچھ سمجھے اور مسکرائے) "آنکھوں کا ایک تارا ہے۔ سو آنکھیں ہی تمہاری ہیں۔ تم آسمان ہو تو یہ آسمان کا تارا ابھی بن جائے تو دور نہیں"

کبیر۔ "میں آسمان تو نہیں مگر ایک تارا مل جائے تو آسمان سے بلند ہو جاؤں"

ایک ہفتہ ہی میں ستیش بابو نے تارا کا ہاتھ کبیر کے ہاتھ میں دے کر کہا "تم روحانی حیثیت سے میرے بھائی تھے ہی۔ آج جسمانی رشتے سے بیٹے بھی ہوئے۔ جہاں عقائد اور مذہب و دین کا تعلق ہے تم میرے ہم مشرب ہو۔ گر کامنا یا نفس پرستی کی سنسانی ایک کٹھن گھاٹی ہے جس سے تم اب تک نا آشنا ہو اور مجھے اندیشہ ہے ایک مدت تک رہو گے۔ بالکل نہیں، ناممکن ہے۔ تمہارے ذہنی ماحول اور فضا کا اثر تمہیں چھوڑ نہیں سکتا —— (سوچ کر) صرف ایک اُپائے ہے … تم ٹھوکر کھا کر ایک اور زندگی دیکھو گے۔ جیسے سونا تپا کر عادت اور غلاظت جلا کر پاک کی جاتی ہے۔ کٹھن امتحان ہے۔ نارائن تمہیں اس میں کامیاب کریں۔ (مڑ کر آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ پھر کہتے ہیں) "ایشور کی جو خوشی۔ جاؤ تم دونوں ایک دوسرے کے صرف مادی نہیں، روحانی معاون و مددگار رہنا۔ تارا کی ماں مرتے دم تک پکی ہندنی تھی۔ توحید اس کی سمجھ سے باہر رہی ممکن ہے تارا ابھی وہ دودھ اور ابتدائی تعلیم کے اثر سے بالکل پاک نہ ہو۔ کبھی خامی دکھائے تو تم ہر قدم پر اس کی دستگیری کرو گے۔ لیکن یاد رہے کہ گرہستی اور دنیا میں جب سے اصلی زندگی شروع ہوتی ہے وہی تمہاری دستگیری کرے گی"

ہماری آپ کی طرح کبیر بھی سب تک کامیاب آرزو تھا۔ اپنی زندگی ہی کو سب کچھ سمجھتا تھا۔ اُسکی تارا ایک مدت کی کشمکش امید و یاس کی فتح، ہیجان و اضطرابِ محبت کی تسکین، بلند ترین منزلِ تمنا کی رسائی تھی۔ علوم و فنون، فضل و کمال، عزت و شہرت، وجاہت و صحت، حسن و تندرستی، دولت و ثروت سے کافی بہرہ یاب تھا۔ دولتِ فکر و تدبر سے وافی حصہ رکھتا تھا۔ سیر و سیاحت شروع ہی کرتا تھا اور شوق سے بھی۔ قدرت کے عظیم جمالی اور جلالی مناظر سے متاثر ہوتا۔ ہمالیہ کی سربفلک چوٹیوں کی عظمت، کشمیر کی رنگین وادیوں کی فرحت، جنگلوں کے وحشت ناک کُنجوں کی ہیبت، آبشاروں کی آواز، سمندر اور ریگستان کی ناپیداکنار وسعتوں کے سناٹے میں اسکا دل کوئی جھلک دیکھ لیتا جو چنگاری کی طرح ایک آن میں نظر آجاتی اور غائب ہو جاتی۔ پھر وہی تارا، وہی دُنیا رہ جاتی۔

تارا پر قدرت کے ان جلووں کا زیادہ اثر ہوتا۔ وہ ہری ہری بول اُٹھتی۔ زیرِ لب کچھ کہتی، کبھی آنکھیں پُرنم ہو جاتیں، کبھی ہاتھ اوپر اُٹھ جاتے۔ جس دن وہ شوہر کے ساتھ کوئی موثر قدرتی منظر دیکھ آتی گھنٹوں خاموش رہتی۔ عبادت زیادہ کرتی۔ کبیر ملامت کرتا "تم دل کی بہت کمزور ہو۔ کیا تاریک تنہائیوں میں گہرے گہرے غار دیکھ کر ڈر گئیں؟ کیا سمندر میں موجوں کے جھکولوں اور کشتی کے ہچکولوں نے خوفزدہ کر دیا؟ ہاں ضعیف دل ان تاثر قدرت میں ایک خوفناک ہستی کا پوشیدہ سمجھتے اور اُسکے راضی کرنے کو اپنے طور پر پرستش کرنے لگتے ہیں۔ یہ توہم پرستی ہے۔ اگر اُس ہستی کو خدا بھی فرض کر لو تو وہ ان بھیانک مناظر میں محدود نہیں۔ وہ تو ہر جگہ ہے۔ کیا مجھ میں تم میں نہیں؟ اُس کا جلوہ تو زیادہ تر تمھاری مخمور آنکھوں، گلابی گالوں اور برق ریز تبسم میں جھلک رہا ہے۔"
یہ کہکر وہ بیتابانہ حرکتیں کرنے لگتا۔

تارا جھینپتی ہے مسکراتی ہے۔ مسکراہٹ اُسکے لبوں پر تازہ آفت لاتی ہے "صبر صبر! کبھی تو سنجیدگی سے کچھ سوچا کرو اور سوچنے دو۔ کچھ دیر چپ رہا کرو اور رہنے دو۔ نفس کے جھمیلوں میں روح کو کبھی اُبھرنے کا موقع دو۔ سنو۔ میں کسی سے ڈرتی نہیں۔"

کبیر "اپنے خدا سے بھی نہیں؟"

تارا "خدا سے بھی نہیں"

کبیر "یہ کیا؟ پھر روح اور نفس کا جھگڑا کیا؟ تمھاری عبادت اور پرستش کے کیا معنی؟"

تارا "سب کے معنی ہیں۔ سنو۔ خدا سے میں نہیں ڈرتی۔ وہ ڈراؤنا نہیں۔ اس کی محبت اور احسان سے ایک مغلوبیت اور بیچارگی محسوس کرتی ہوں اور اس احساس سے جو کچھ میں آتا ہے کرتی ہوں"

کبیر آنکھیں بچا کر تارا کو گھورتا ہے۔ پھر ایک منٹ کو بند کر لیتا ہے اور کہتا ہے "تارا ستیش بابا نے سچ کہا تھا۔ تم میں ایک روحانیت کا نور ہے جو میری پہنچ سے بالاتر ہے۔ تم مجھ سے زیادہ مسلمان ہو۔"

"تارا" اگر یہ کچھ ہے تو میں نے تمھیں سے پایا ہے اور تمھیں تعجب کرتے ہو؟ پڑھو وہ آیتیں جو بابا تمھارے ساتھ پڑھ رہے تھے

"آسمان اور زمین کی خلقت میں، دن اور رات کے اُلٹ پلٹ میں، کشتی کے سمندر میں چلنے میں، آسمان سے گرنے والے مینہ میں جو مردہ زمین میں جان ڈال دیتا ہے، ہر قسم کے جانوروں میں جو اُس نے روئے زمین پر پھیلا رکھے ہیں، ہواؤں کے ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر پھرنے میں آسمان و زمین کے درمیان تابعدار بادلوں میں عقل والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔

ان فی خلق السموات والارض واختلاف الیل والنهار والفلک التی تجری فی البحر بما ینفع الناس وما انزل الله من السماء من ماء فاحیا به الارض بعد موتها وبث فیها من کل دابة وتصریف الریح والسحاب المسخر بین السماء والارض لآیات لقوم یعقلون (البقرة - ع ۲۰)

اُسکی نشانیوں میں سے آسمان زمین کی خلقت اور تمھاری زبانوں اور رنگوں کا اختلاف بھی ہے سمجھ والوں کے لیے ان میں نشانیاں ہیں ...... اُسکی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ وہ بجلیاں دکھا کر تم میں کبھی خوف اور کبھی امید پیدا کرتا ہے اور آسمان سے مینہ برسا کر مردہ زمین میں جان ڈال دیتا ہے - بیشک عقل والوں کے لیے ان میں نشانیاں ہیں -

ومن آیاته خلق السموات والارض واختلاف السنتکم والوانکم ان فی ذلک لآیات للعلمین .... ومن آیاته یریکم البرق خوفا وطمعا وینزل من السماء ماء فیحیی به الارض بعد موتها ان فی ذلک لآیات لقوم یعقلون (الروم - ع ۳)

"کیا لوگ اونٹ کو نہیں دیکھتے کہ اسکی خلقت کیسی ہے؟ آسمان کو نہیں دیکھتے کہ کتنا اونچا بنایا ہے؟ پہاڑوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے گڑے ہیں؟ زمین کو نہیں دیکھتے کتنا پھیلایا ہے؟ اے پیغمبر یہ سب بتا کر ان کو سمجھاؤ - تمھارا کام سمجھانا ہے -

افلا ینظرون الی الابل کیف خلقت ۝ والی السماء کیف رفعت ۝ والی الجبال کیف نصبت ۝ والی الارض کیف سطحت ۝ فذکر انما انت مذکر ۝ (غاشیہ)

"بھلا آسمان اور زمین کو کس نے پیدا کیا اور تمھارے لیے آسمان سے مینہ کس نے برسایا جس سے ہم نے دلکشا باغ اُگائے - یہ تمھاری قدرت نہ تھی کہ تم اُن باغوں کے درخت اُگاتے - کیا خدا کے ساتھ

امن خلق السموات والارض وانزل لکم من السماء ماء فانبتنا به حدائق ذات بهجة ما کان لکم ان تنبتوا شجرها ء اله مع الله بل هم قوم یعدلون

کوئی اور معبود بھی ہے؟ مگر یہ بے سمجھ اور کجرو لوگ ہیں۔

"بھلا کس نے زمین کو ٹھہرنے کے جگہ بنایا اور بیچ میں ندیاں بنائیں۔ اور اُنکے لیے پہاڑ بنائے اور دو سمندروں کے درمیان ایک روک کردی؟ کیا اللہ کے سوا کوئی اور معبود بھی تھا؟ مگر اکثر لوگ اتنا نہیں سمجھتے۔ ....

امن جعل الارض قرارا وجعل خللها انهارا وجعل لها رواسی وجعل بین البحرین حاجزا ء الٰہ مع اللہ بل اکثرهم لا یعلمون ....

"بھلا خشکی اور تری کی اندھیریوں میں تمہاری رہنمائی کون کرتا ہے اور اپنی رحمت (مینہ) کے آگے ہواؤں کی بشارت کون بھیجتا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود ہے؟ اللہ بلند تر ہے اس سے جسکے ساتھ اُس کو شریک ٹھیراتے ہیں۔

امن یهدیکم فی ظلمت البر والبحر ومن یرسل الریٰح بشرا بین یدی رحمته ء الٰہ مع اللہ؟ تعالی اللہ عما یشرکون۔

(نمل رع ٥)

اتنا ہی نہیں ہے۔ خدا اس درس عبرت کو مطالعہ فطرت کو ایمان والوں پر لازم قرار دیتا ہے۔ جو اس سے منہ موڑے اُسکو عذاب کی دھمکی دیتا ہے۔ ایسی ہی آیتوں یا منتروں نے مناظر قدرت کو میرے لیے صحیفہ بنا دیا ہے اور ہر مسلمان کے لیے ہونا چاہیے

کبیر "تم کہتی تو حق ہو۔ مگر اب یہ تاثر مسلمان کی خصوصیت نہیں۔ خدا کی توفیق ہے جسے یہ عبرت پذیر دل اور حق بیں آنکھیں دے۔

دوسرے دن پھر تارا اور کبیر اپنا اپنا رجحان طبیعت لیے سیر کو نکلے۔ سہ پہر کو کشتی میں بیٹھ کر سمندر کی ہوا کھانے کی رائے قرار پائی۔ تارا کبیر کی فرمائش سے گا رہی تھی اور آنکھیں افق سمندر اور آسمان کے ملنے کی جگہ پر لگی ہوئی تھیں۔ یوں ہی یہ دُور نکل گئے۔ شام ہو گئی۔ یکایک بے سان و گمان خدا جانے کہاں سے چشم زدن میں بادل چھا گئے۔ بجلی چمکنے لگی، بارش کے ساتھ موجوں میں سخت تلاطم شروع ہو گیا۔ تارا نے کبیر کے کاندھے پر سر رکھے، ہاتھ اس کی بغل میں حائل، آنکھیں بند کیے، کبیر اُسے گلے لگائے، ایک دوسرے میں گم ہو گئے تھے۔ دونوں ملاح چیخے، بجلی چمکی، بادل کڑکا۔ ساحل والوں نے پھر کچھ نہ دیکھا۔ بجلی کی دوسری چمک میں کچھ نظر نہ آیا۔ کنارے پر شور ہوا "کشتی ڈوب گئی! کشتی ڈوب گئی!" کسی کی ہمت نہ تھی کہ سمندر میں قدم رکھے، یا کشتی لیجائے۔ محافظین ساحل کی امدادی کشتیوں کے نکلتے نکلتے دس منٹ اور لگ گئے۔ وہ ناکام واپس

آئیں۔

صبح کے اخباروں میں نہایت نمایاں اور جلی سرخیوں میں یہ خبر شائع ہوئی کہ مسٹر اور مسز کبیر جو بمبئی کے فلاں ساحل پر ہنی مون منا رہے تھے، سمندر کی لہروں میں غرقاب ہو گئے۔ مسز کبیر بابو ستیش چندر چٹرجی ایم اے مشہور وظیفہ خوار ہیڈ ماسٹر کی اکلوتی بیٹی اور مسٹر کبیر الدین، محمد خان بہادر نصیر الدین احمد کے بیٹے، ٹروتھ کے ایڈیٹر، شیریں سخن مقرر اور مصلح تھے۔ حسرت و ماتم۔ دونوں کے والدین سے اظہار ہمدردی و تعزیت۔

ستیش بابو جیسے ہونے کا جاں نہ رہ کر زندہ دفن رہے تھے۔ اس خبر کی اشاعت کے ایک ہفتہ کے اندر بلا کسی ظاہری مرض کے صبر و خاموشی سے انتقال کر گئے۔ لاش پر ہندو، مسلمان، عیسائی، سب نے دعویٰ کیا مگر کسی مذہب کے باقاعدہ اعلان کی عدم موجودگی میں وہ آبائی مذہب کے مطابق جلائے گئے۔ مسلمان اور عیسائی حسرت سے انکی جلتی ہوئی لاش کو دیکھا کیے۔ ... اور اپنے اپنے طریقہ پر فاتحہ پڑھتے اور تکفیر کرتے گھر آئے۔ نادانوں میں آج تک چرچا ہے "وہ اصلاً سچا عیسائی مگر تمام ہندو ہلاک ہوا" "افسوس! اتنے پختہ مسلمان۔ قرآن شریف ہاتھ میں لیے مرے، مگر آخر وقت تک یہ کمزوری ان سے نہ گئی کہ کلمہ کا اعلان کر دیتے۔" حقیقت کو کوئی نہ سمجھا۔ سمجھنے والے پہلے ہی غرقاب ہو گئے اور یہ نذر آتش۔ شیشے پانی میں دھل کر صاف ہوتے، لوہا آگ میں جل کر پاک۔ عام کثافتیں مٹی میں دبا کر ظاہر کی جاتی ہیں۔ فرق طبیعتوں کی ساخت میں ہوتا ہے۔ اصول تدبیر اپنی اپنی جگہ سب درست ہیں۔

آکاس گری کی ایک جنگلوں اور ٹیلوں سے گھری ہوئی سرسبز وادی میں ایک جہاں مست درویش کی شہرت ہے۔ صبح شام نکل کر جنگلوں میں ٹہلتا اور جھرنے کے کنارے چٹان پر بیٹھا شفق کی طرف نظر گڑائے رہتا۔ باقی وقتوں میں وہ اپنی کٹیا میں بند رہتا۔ آس پاس کے منتشر جھونپڑوں میں بسنے والے نیم وحشی کسان اپنے مویشی چراتے اس کی کٹیا کے در پر استعجاب اور عقیدت سے خاموش کھڑے اسکو تکا کرتے۔ صبح شام جہاں نظر آجاتا اسکو ہاتھ جوڑ کر پرنام کرتے۔ اس سے کچھ کہنے سننے کی کوشش کرتے مگر جواب نہ پاتے۔ اپنے ہاتھ کے بنے ہوئے کپڑے، دودھ، موسم کے تازہ یا بے موسم خشک پھل رکھ جاتے۔ انھیں سے وہ تن ڈھانک اور پیٹ بھر لیا کرتا۔ رفتہ رفتہ دور دور سے اہل حاجت مرادیں لے لے کر آنے لگے۔ سب کا جواب ایک طرف سے خاموشی دوسری طرف رعب آمیز مایوسی تھی۔ کسی کو خطاب کا اہل سمجھ کر کچھ کہتا تو اتنا کہتا کہ

"میں خود آرزوؤں کا مارا ہوا ہوں۔ لاچار ہوں۔ تم ان کو دل سے مٹاؤ اور غنیمت سمجھو۔ میں خود کھویا ہوا ہوں۔ تمہاری رہبری کیا کر سکتا ہوں؟ جاؤ جاؤ۔ مایا کے جال کو توڑو، اسکے پھندوں

سے نکلو۔ مجھے اس کی یاد نہ دلاؤ۔ اسے دل سے بھلا دینے دو۔ ورنہ میں یہاں سے بھی چلا جاؤں گا
جس طرح دو کٹیاں تم لوگوں کے گاؤں چھوڑ چکا۔ بن باسی فقیر کے لیے کوئی جا گھر نہیں۔ ہر جگہ ہے
دھرتی کے اوپر، دھرتی کے نیچے آکاش کے اوپر
یہ دھمکی اہل حاجت کی زبان بند کر دیتی اور عقیدت بڑھا دیتی۔

کچھ عرصہ کے بعد ایک اور سادھو اسی قرب کی ایک اور وادی میں خود دار ہوئے۔ یہ سیلانی تھا۔ تمام تمام دن جنگلی آبادیوں میں مارا مارا پھرتا۔ جس کسی کا جانور کھو جاتا آپ سے کہتے اتفاقاً وہ آ جاتا اور اپنا جانور پا لیتا۔ کوئی بیمار ہوتا تو سادھو کی جڑی بوٹیوں اور تدبیروں سے اچھا ہو جاتا۔ رفتہ رفتہ ان کے ایک سچے شفقت، ایک بول یہاں تک کہ ایک نظر سے بیمار کو افاقہ ہو جاتا۔ وہ معافی اور اخلاق کے رنگ کا بڑا اثر پیدا کرتا۔ کتنی عورتوں نے خاوندوں کی زدوکوب سے، مردوں نے ... بیویوں نے آپس کے جھگڑوں سے، ... لعنت سے، شرابیوں نے نشہ خواری کی آفت سے، مفلسوں نے افلاس کی مصیبت سے، ... اور بھوکوں نے ... سے نجات پائی۔ تندرستی اور مرفہ حالی کے آثار چہروں سے جھلکنے لگے۔ درویش اپنے جاننے والوں سے اکثر آپ میں اس سادھو کا چرچا سنتا اور اپنے دھیان گیان میں محو ہو جاتا۔

ایک پورنماسی کی رات آدھی سے زیادہ گزر چکی ہے۔ چاندنی کے کھیت میں ساری وادی اجالی ہو رہی ہے۔ درویش کٹیا کے باہر الاؤ کے جھنجھل کے سامنے اپنے خیالات میں مست بیٹھا ہے۔ آپ ہی آپ بڑبڑانے لگا:۔
"زندگی کے دن پہاڑ ہو گئے۔ اے خدا تجھ کو معلوم تھا کہ ہم نے اپنی زندگیاں تیرے بندوں کی خدمت کے لیے وقف کر دی ہیں۔ پھر تیرے ہی آہنی ہاتھوں نے میرے اعضا شل کر دیے ؎
ناحق ہم مجبوروں پر تہمت ہے مختاری کی — چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا
سنتے آئے، پڑھتے آئے، سیکھتے آئے کہ طلب صادق، عزم خالص، ارادۂ راسخ کو کوئی طاقت روک نہیں سکتی۔ جھوٹ۔ بالکل جھوٹ۔ میں مفلوج کر دیا گیا، بالکل بیکار کر دیا گیا۔ کیا ہماری طلب صادق نہ تھی؟ عزم خالص نہ تھا؟ ارادہ راسخ نہ تھا؟ خدا، تو ہی خوب جانتا ہے۔
کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟ کس سے کہوں؟ ستیش بابا ہے؟ آہ کون منہ لیکر اُنکے پاس جاؤں؟ اُن کی وہ انمول امانت! وہ انوکھا ہیرا! وہ چمکتا تارا ڈوب گیا! اے ڈوبنے والے تارو، دیکھو تم روز ڈوبتے ہو، روز اُبھرتے ہو، میری تارا پھر نہ اُبھری؟" (سر تھام لیتا ہے)

"ہاں تارا پھر اُبھر گئی، زیادہ صاف آسمان میں، تیز چمک کے ساتھ - اس وقت بھی تارا موجود ہے مگر تمھاری گرد آلود فضا میں دکھائی نہیں دیتی - اپنی فضا کو گرد و غبار سے صاف کرو اور اُس کو دیکھو"

فقیر نے اس آواز پر سر اُٹھایا - تھر تھر کانپنے لگا - ستیش بابو اپنے معمولی لباس میں کھڑے تھے - اُس نے قدم لینا چاہا - اُنھوں نے ذرا پیچھے ہٹ کر تیز تیوروں سے گھور کر کہا

"تم اپنی طلب کو طلبِ صادق کہتے ہو، عزم کو عزمِ راسخ کہتے ہو اور استری کو ساری خدائی پر ترجیح دے رکھی ہے - نارائن کو چھوڑ کر ناری کی پوجا کی - اس کو کھو دیا تو خلق اللہ کو بھی چھوڑ دیا - یہی طلبِ صادق تھی؟ پھر بھگوان کو دوش دیتے ہو؟

میں نے پہلے ہی کہا تھا تم کچے ہو - مگر اتنا کچا نہ سمجھا تھا - کامنا نے پرماتما کو بُھلا دیا؟ مخلوق سے تم بھاگتے پھرتے ہو؟ بھاگ کر جاؤ گے کہاں - کیا تم بھول گئے کہ خدا ان سے جدا نہیں - یہ رباعیاں کس نے کہی تھیں اور کس نے تم میں شائع کی تھیں؟ تمھیں نے؟ جھوٹ تھیں؟ دھوکا تھا؟

خلاق کو مخلوق نے آب و گِل میں دیکھا　　عاصی کی کبھی چشمِ خجل میں دیکھا
ہر چند وہ ہے قیدِ مکاں سے آزاد　　اکثر اُسے میں نے دردِ دل میں دیکھا

وہ دردِ دل کیا ہوا؟ صرف تارا کے لیے تھا اور اُسی کے ساتھ ختم ہو گیا؟ پھر یہ کس نے کہا تھا؟

جو شیخ کو کعبہ میں نہ طاعت سے ملا　　جوگی کو نہ جنگل میں ریاضت سے ملا
اک رندِ تباہ حال کو وہ خالقِ کُل　　بازار میں مخلوق کی خدمت سے ملا

کیا وہ ملا اور پھر کھو گیا؟ ارے نادان کیا تو بھول گیا کہ انھیں میں خدا ہے؟ جا ان کو پریم دے اور خوش کر - ورنہ دنیا کے ساتھ دھرم بھی نشٹ ہوا جاتا ہے"

کبیر - "ستیش بابا! بڑے گاڑھے وقت میں درشن دیے - میں تو آپ کو منہ نہ دکھا سکتا تھا - آپ پہلے کیوں نہ آئے؟ بتائیے کیا کروں (رو کر) مجھ سے کچھ ہوتا نہیں - دل چاہتا ہے آٹھوں پہر آتما کہتی ہے خلق کی سیوا کروں، پر کلیجا بیٹھا جاتا ہے - اُٹھنے نہیں دیتا - کیا میرا سب کیا دھرا اکارت جائیگا؟ اُجالا دیکھ کر یہ اندھیرا برداشت نہیں! مجھے گلے لگائیے"

ستیش کی آواز - "کبیر میرا دیہ اب اس سنسار میں نہیں رہا، پھر بھی میں تم سے جدا نہیں - ٹھیک وقت پر آیا ہوں تمھاری آتما کو ضرورت تھی اتنی رگڑ، اتنی تپسیا اور ریاضت کی - لوہے نے دل کے زنگ کو تپا کر صاف کرنے کی - خودی سے روح کو پاک کرنے کی - مبارک ہو تم اُس کٹھن گھاٹی سے نکل گئے - جاؤ - یہاں سے جاؤ اپنا کام شروع کر دو"

کبیر کی آنکھ پھر جھپک گئی - اور دو سکنڈ میں کھلی - دیکھا تو ستیش بابو نہ تھے - ایک سادھو کھڑا اس کو گھور رہا تھا - کبیر نے آنکھیں ملیں - دیکھا - پھر آنکھیں ملیں پھر دیکھا - کھڑا ہوگیا -

کبیر "تم کون ہو بابا ؟ ابھی تمھیں مجھ سے باتیں کر رہے تھے ؟ تم تو نہ تھے - میں جس سے باتیں کر رہا تھا کدھر گیا ؟ تم نے کسی کو یہاں دیکھا ؟ تم کہاں سے ٹپک پڑے ؟"

سادھو "میرا استھان اسی پڑوس میں ہے - جو کچھ ہوں میری صورت سے ظاہر ہے " (کبیر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر گھورتا ہے) میں تو ابھی آرہا ہوں کسی کو بھی نہیں دیکھا "

کبیر "کیوں کرپا کی سادھو بابا ؟" (سادھو سے اور قریب ہو جاتا ہے اور چاند کی روشنی میں چہرہ کو گھورتا ہے -)

سادھو " یہ میں نہیں بتا سکتا - بے ارادہ کوئی چیز آپ ہی آپ کھینچ لائی - وہ چیز ایشور کی اِچھا کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے - اُس کا کوئی فیصلہ قریب ہے "

کبیر " ارے سادھو سچ سچ بتا تو ہے کون ؟ یہ میں کس کی آواز سن رہا ہوں ؟ (آنکھیں مل کر) بتا دے میں ہوش میں ہوں ؟"

سادھو " ہے پرماتما میں کس کی آواز سن رہی ہوں ؟"

ایک منٹ کے اندر کبیر اور سادھو ایک ساتھ بول اُٹھتے ہیں " میری تارا " " میرے کبیر " اور دونوں ایک دوسرے سے چمٹے ہوئے تھے - سپیدۂ صبح کی چادر پھیل رہی تھی چڑیاں گا رہی تھیں نسیم سحر کے ہلکے ہلکے جھونکے خودرو پھولوں کی خوشبو بکھیر رہے تھے - آبشار کی آواز اب بھیانک نہ تھی خوش آیند موسیقی تھی -

---

حقیقت یہ تھی کہ دونوں میں سے کوئی ڈوبا نہ تھا - موجوں نے ایک کو ایک ویران ساحل پر اور دوسرے کو دوسرے سرے پر ڈال دیا تھا - ایک نے دوسرے کو مردہ سمجھ لیا اور رو بیٹھا - مایوسی نے ترک دنیا پر آمادہ کردیا - ایک غیب کا ہاتھ تھا جو دونوں کو جس طرح چاہتا تھا نچاتا تھا - اور جب تک چاہا نچایا - یہ ستیش بابو کی ملاقات خواب نہ تھی، وہم نہ تھا - آفتاب کی سی روشن حقیقت تھی جس کی تعبیر ہم آپ تو کیا کہینگے خود کبیر اور تارا کو آج تک ڈھونڈھ رہے آیا یہ سب کچھ ہوش میں دیکھا اور جھیلا یا بے ہوشی میں - اگر انکی غرقابی کی خبر اخباروں میں محفوظ نہ ہوتی ، احباب انکے غائب ہونے کا چرچا نہ کرتے ، گردھم موقت نہ ہوتا ، کاغذات شہادت نہ دیتے تو یہ بھی ارونگ واشنگٹن کے رپ وین ونکل کا طلسم دماغی یا دوگانہ شخصیت کا ایک نفسیاتی ظہور تصور کرلیتے -

تارا اور کبیر نے اب تازہ جوشِ عمل کے ساتھ نئی زندگی اختیار کی - پردتھ انگریزی اشاعت کے علاوہ اُردو ہندی بنگلہ بسم خط اور زبانوں میں بھی جاری کیا گیا اور اُسے مقبولیت عام حاصل ہوتی جاتی ہے - تارا کے زیر نگرانی ایک مسکین خانہ قائم ہے جس میں ناقص العضو پرورش پاتے اور جزوی صلاحیت والے حسب صلاحیت پیشے سیکھنے اور کما کھانے کے لائق بنائے جاتے ہیں - قومی خیرات و صدقات انکے کفیل ہیں - ایک متحرک کتبخانہ کھلا ہوا ہے جس کی کتابیں اور اخبارات و رسائل گاؤں گاؤں ہر دار المطالعہ میں پہونچا پہونچا کر ایک ایک ماہ رکھے جاتے ہیں - غریب پیشہ وروں کے بچوں اور بچیوں کے لیے شبینہ مکتب جاری ہیں جن میں تارا ابھی ایک ایک گھنٹہ درس دے آتی ہے - ان کل اداروں میں انسانی محبت و مساوات کی عملی تعلیم دی جاتی ہے - خانگی صنعت و حرفت کے سامان اور ذرائع مہیا کرکے غریبوں کی رفاہ اور خوشحالی کی بنا ڈال دی گئی ہے - اول اول حکومت ان سے بھڑکتی اور عوام جھجکتے رہے، مفسدوں نے بدنامیاں پھیلائیں، مگر رفتہ رفتہ غلط فہمیاں دُور ہوئیں اور اب متعدد رؤساء و حکام ان کے معاون ہیں اور ہوتے جاتے ہیں - ان کی بنیادیں مضبوط ہو چکی ہیں اور اپنے بل پر کھڑے ہیں -

تارا اور کبیر آج بھی خلق میں پریم کا شراب خانہ کھولے بیٹھے ہیں لیکن اُس پر کوئی تختی، سائن بورڈ، اشتہار نہیں، پروپگنڈا نہیں - مگر پینے والوں کو اب تک چاٹ نہیں لگی - ادھر رُخ کم کرتے ہیں - لوگ سستی تیز شراب سے مخمور ہیں، سیاہ مست ہیں اور وہی پیے جاتے ہیں

ایں مے از قحطِ خریداری کہن خواہد شدن

وقت قریب ہے کہ خلق امتیاز سیکھ جائے - پھر اس پریم کے میکدہ میں ہُو حق کی صدائیں گونجتی ہوں گی اور فرقہ داری کے بھٹوں میں کتے لوٹتے ہوں گے -

غزل جناب محمد شرف الدین صاحب تسلیم بنگلوری

دشمنِ جاں شبِ فرقت ہوگی — جو گھڑی ہوگی مصیبت ہوگی
مدت و وہ ملے ہیں ہم سے — رات بھر آج شکایت ہوگی
آئے گا چاند سی صورت والا — میرے کاشانہ کی زینت ہوگی
گالیاں اور بھی دیتے جاؤ — کہ زیادہ مری عزت ہوگی
دلِ وارفتہ یہ کیا سمجھا تھا — کسی کافر سے محبت ہوگی

بے تحاب آئے جو وہ محشر میں
اے تسلیم اور قیامت ہوگی

آکاش کی دیوی

(ایک مختصر تمثیل)

(جناب سید حامد حسن صاحب بلگرامی بی اے (آنرز) ایم اے)

افراد:-

شانتی - ایک امیر خاندان کی خوبصورت لڑکی - کرشن کی بی بی

کرشن - شانتی کا شوہر -

کملا - کرشن کی بہن -

میکو - کرشن کے باغ کا مالی -

مختار

(کرشن اپنے مکان کے مغربی برآمدے میں ایک
البم کو نہایت دلچسپی سے دیکھ رہا ہے - عنقریب غروب
ہونے والے سورج کی ترچھی شعاعیں دروں کی لٹکتی
ہوئی بیلوں، اور پام کے طاؤس رقصاں پتوں سے گزرتی
ہوئی اسکے پیروں پر پڑ رہی ہیں، کرشن کے چہرے پر ہلکے
تبسم کی لطیف لہریں نمایاں ہیں ...... شانتی باغ
کے ایک حصہ میں چھوٹے چھوٹے پودوں سے دلبستگی
کر رہی ہے، ٹہلتے ہوئے ادھر آجاتی ہے - اسکی نگاہ
کرشن پر پڑتی ہے، کرشن کو مسرور دیکھ کر خود اسکی مسرتوں
میں شریک ہونے کے لیے ادھر مڑ جاتی ہے ......
پیروں کی آہٹ سے کرشن کی نظریں ادھر اُٹھ جاتی ہیں
شانتی کو آتا دیکھ کر مسکراتا ہے اور البم بند کر دیتا ہے)

شانتی - (ایک دلفریب تبسم کے ساتھ) آج ...... کیا دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہے ہیں؟

کرشن (کرسی پر کسی قدر سنبھلتے ہوئے) کچھ نہیں ایک پرانا البم دیکھ رہا تھا -

شانتی (نزدیک آتے ہوئے) اچھا - میں بھی تو دیکھوں -

کرشن (پاس رکھی ہوئی کرسی کو کچھ نزدیک کر لیتا ہے) بیٹھو تو سہی -

شانتی کرسی پر بیٹھتی ہے

شانتی - دکھائیے؟

کرشن - شانتی اسے نہ دیکھو - یہ تصویریں ... ایک ... پرانی ... داستان کی یادگاریں ہیں (منہ بنا کے) ابھرتے ہوئے زخموں سے کھیلنے سے کیا فائدہ -

شانتی - یہاں رہنے دیجیے - آپ ہمیشہ یوں ہی چھیڑا کرتے ہیں

کرشن - نہیں شانتی تمہارے سر کی قسم آج جھوٹ

نہیں ہوتا -

(کرشن کی بیاختہ قسم شانتی کو حیرت میں ڈال دیتی ہے - کرشن کی محبت قسم کو سچ ماننے پر مجبور کرتی ہے - اور وہی محبت اسکے یقین میں سدِ راہ ہے)

شانتی - نہیں پیارے کرشن میں سنوں گی اور ضرور سنوں گی - آپ جانتے ہیں کہ عورت حقیقت کو معلوم کرنے کیلئے اتنی ہی بیتاب ہوتی ہے جتنا کہ آپ لوگوں کے خیال سے وہ ایک راز کو ظاہر کرنے کیلیے -

کرشن - آج تو آپ نفسیات پر تُلی ہوئی ہیں - خیر سُنیئے لیکن مجھے الزام نہ دیجیے گا، ہر انسان سے لغزش ہوسکتی ہے اگر مجھ سے بھی ہوئی تو وہ ایک انسانیت کی دلیل ہے -

شانتی ! ؟ (یعنی سراپا سوال اور مجسم استعجاب)

کرشن (سگریٹ جلاتے ہوئے) اچھا سنیئے .. لیکن ایک شرط ہے -

شانتی - وہ کیا ؟

کرشن - کہ آپ کو پوری داستان سُننا پڑیگی -

شانتی - سنوں گی -

کرشن - آج چار سال کا زمانہ ہوا میں ایک لکچر میں گیا ہوا تھا - میری آنکھوں نے ایک جادو دیکھا - نظریں ٹھٹھک کے رہ گئیں - سمجھیں - یہ ایک حیا کی دیوی تھی جسکے رسیلے جسم کو سبز رنگ کی ایک ہلکی ساڑی اپنے آغوش میں لیے ہوے تھی - کالے بالوں کے سیاہ ہوتے بجلی کی تیز روشنی میں چمک چمک کر نگاہوں میں کھبے جاتے تھے - چہرے کی شگفتگی اور تازگی نظروں سے گزر کر دل کی گہرائیوں کا جائزہ لیتی تھی - اور دل کو درسِ محبت دیتی تھی - شانتی، مجھے محبت کا احساس پہلی بار وہیں ہوا - درد کی پہلی کھٹک، محبت کی لطیف گرانی، وہیں محسوس ہوئی - میں بیتاب تھا ... اور اُسوقت تک اس بیتابی میں تبدیلی نہ ہوئی جب تک کہ میرے ایک پیارے دوست نے اُس کی تصویر مجھے لادی ....

شانتی، دیکھو یہ اس کی پہلی تصویر ہے -

(شانتی کو تصویر دکھاتا ہے) (یہ شانتی ہی کی تصویر تھی جو شادی سے قبل .... کرشن نے حاصل کرلی تھی.

شانتی (کے چہرے پر حیا کی سرخی دوڑ جاتی ہے)

کرشن مسکراتا ہے ...

شانتی - بس رہنے بھی دیجیے - آپ نے کہیں نہ کہیں چھیڑ کی باتیں ....

کرشن (جوشِ محبت سے ....)

اب تو تمھیں پوری داستان سننا پڑے گی -

کرشن - ایک روز سخت گرمی پڑ رہی تھی، سمجھیں شانتی، بہت گرمی تھی - میں اپنی محبوبہ کے ساتھ تھا - دھوپ کی تپش اور گرمی کی زیادتی سے اُسکے گلابی چہرے پر پسینے کے قطرے آگئے - میں نے انھیں رومال سے خشک کرنا چاہا، لیکن وہ مجھے اتنے بھلے معلوم ہوے کہ جیسے چنبیلی کے پھولوں پر اوس کی بوندیں - شانتی میں نے اُس چہرے کی بھی تصویر لے لی - دیکھو یہ ایک دوسری تصویر ہے - (یہ بھی شانتی ہی کی تصویر تھی)

شانتی (چُپ ہے، کرشن کی دیوانہ وار محبت پر کچھ کہنا چاہتی ہے لیکن زبان ساتھ نہیں دیتی - چہرے پر حیا

کی سرخیاں آتی ہیں اور چلی جاتی ہیں)

کرشن - شانتی تیرتھ کے دن تھے، ہم لوگ اپنے اُن گناہوں کو جن کی وجہ سے ہمیں اپنی زندگی میں ملنے کے لیے عمر کے ۲۲ سال انتظار کرنا پڑا، اُن پاپوں کو دھونے گئے - گنگا کے کنارے بہت جاتری آئے تھے - شانتی ہماری محبوبہ بھی، اپنے لطیف جسم کو ہلکی سفید ساڑی میں چھپائے ہوئے نہانے گئی - تھوڑی ہی دیر میں لہروں کے جھولے میں تھی، پانی میں پہنچکر وہ ایسی خوش تھی جیسے ایک معصوم بچہ اس کی گود میں، گنگا کی پاک لہریں اُسکے جسم سے اٹھکھیلیاں کر رہی تھیں - اُس نے پانی میں ایک غوطہ لگایا لیکن گھبرا کر اُٹھ کھڑی ہوئی، مجھے یہ سمان بہت بھایا - میں نے اُسکی بھی ایک تصویر لے لی - دیکھو شانتی (تصویر دکھاکر) بھیگے بھیگے بال چاند سے چہرے پر کیسے چپکے ہوے ہیں شانتی مجھے یہ تصویر بہت پسند ہے -

شانتی - بس رہنے دیجیے - آپ پریم کے دیوتا ہیں - دو سال سے زیادہ مجھے آپ کے چرنوں کی سیوا کرتے ہوگئی لیکن آپ کی محبت بڑھتی ہی جاتی ہے -

کرشن - (شانتی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوے) شانتی میں اس فلسفہ کا قائل نہیں کہ محبت کو صرف تمناؤں تک محدود رکھا جائے، اور اس صداقت کو پاکر اُسکی اتنی ہی قدر نہ کی جائے - شانتی محبت ایک حسن ہے اور حسن صداقت - جس کو پاکر زندوں سے زیادہ خوشی ہوتی ہے - شانتی، .... مجھے یہ سبق تمہیں سے تو ملا ہے - ورنہ شاید میں بھی کسی فلاسفر کی طرح محبت کی ہجر نصیبی کو ازدواجی زندگی کی خوشگوار گھڑیوں سے بہتر سمجھتا -

شانتی - آپ مجھے کیوں شرمندہ کرتے ہیں - آپ ہمارے رام ہیں (حیا سے سر جھکاکر) کاش میں آپ کی سیتا بن سکتی -

کرشن (نرم انگلیوں پر محبت کی ایک یادگار قائم کرتے ہوے) یہ کیا اُلٹی گنگا بہا رہی ہو - لیکن .... ہاں ابھی داستان باقی ہے

شانتی - نہیں پیارے کرشن (ہاتھ چھڑاتے ہوے) اب رہنے دیجیے،

کرشن - اچھا خیر، یہ تصویر اور دیکھ لو (تصویر دکھاکر) بظاہر چہرے پر غصہ کے آثار ہیں - شاید اسوقت "انھیں" کوئی کام تھا اور مجھے الفت کی چھیڑیں سوجھی تھیں - وہ روٹھ گئیں، میں نے منانا چاہا - چہرے پر غصہ کے کچھ نشان ہیں نا؟ ... شانتی، مجھے غصہ بھی پیارا معلوم ہوتا ہے - کیمرا اُٹھا لایا، اور پاس رکھے ہوے ایک طشت پر گلدان گرادیا - وہ چونک پڑی کچھ غصے اور کچھ خوف سے چہرہ تمتما اُٹھا - دیکھو تصویر میں دونوں پہلو کتنے نمایاں ہیں - لیکن شانتی، مجھے اس میں بھی نینوں سے پریم ہی ٹپکتا معلوم ہوتا ہے - اور دیکھو .....

شانتی (البم ہاتھ سے کھینچ لیتی ہے اور اُٹھ کھڑی ہوتی ہے)

کرشن (مسکراتا ہے اور ....

پردہ گرتا ہے

دوسرا سین

(قریب ایک سال کے گزر گیا، فطرت کی ستم ظریفی تھی کہ شانتی کے خوبصورت اور سڈول جسم پر فالج کا اثر ہو گیا۔ وہ بچ گئی لیکن جسم کے بعض اعضا پر اُسکے اثرات رہ گئے۔ ...... شانتی گھر کے صحن میں دھوپ میں بیٹھی کتاب پڑھ رہی ہے، کسی قدر فاصلے پر ایک پلنگ پر اسکی ساس اور کرشن کی بہن کملا بیٹھی ہیں)

کرشن کی ماں - پرمیشور نے بڑی دَیا کی کہ بیٹی شانتی کو آٹھا کھڑا کیا۔

کملا (کرشن کی بہن) اور کیا، ماتا جی ملتیں تو بھائی کہیں کے نہ رہتے۔

ماں - دیکھتی تھی کہ اُس کی بیماری کے زمانہ میں کرشن کا کھانا پینا کیسا چھوٹ گیا تھا۔

کملا - کچھ بھگوان ہی کو کرشن کی خوشی منظور تھی، کچھ نام کی بھی برکت تھی۔

ماں - بیٹی سچ کہا۔ میں نے اس کا نام رکھنے کے لیے لاہور کا ایک پنڈت بلایا تھا۔ بڑا گیانی تھا۔ پوتھی کھولتے ہی بول اُٹھا، کرشن، نام رکھو۔

کملا - تبھی تو بہن شانتی کا سہاگ ملا۔

ماں - یہ اُنکا سہاگ، کملا یہی تجھے ایک ہی سوجھی۔

(شانتی کی نگاہیں کتاب پر ہیں لیکن وہ یہ گفتگو سن رہی ہے، پیشانی پر کچھ شکنیں نمایاں ہوتی جاتی ہیں)

شانتی (کتاب سے نگاہ ہٹا کر زمین کی طرف دیکھتے ہوئے دل ہی دل میں سوچ رہی ہے) کیا ماتا جی کا یہ خیال سچ ہے؟ یا میں ہی غلطی پر ہوں؟ کیا کرشن اب بھی مجھ سے اُتنی ہی محبت کرتا ہے؟ ..... اور اگر...... لیکن نہیں .. کرشن کا راتوں کو دیر سے آنا، مجھ سے زیادہ دوستوں کے پاس بیٹھ کر وقت گزاری کرنا .... اِس کل ہی کی تو بات ہے ... میں نے کرشن کو پکارا .... وہ باہر جا رہے تھے ...... لیکن .. چلے گئے .. شاید .. نہ سنا ہو .... مگر اس سے پہلے وہ اس سے دھیمی آواز سُن لیا کرتے تھے ..... یوں تو اور بھی بہت سی باتیں ہیں ... لیکن نہیں، اکثر انسان جب اپنے میں کوئی کمزوری محسوس کرتا ہے تو سمجھتا ہے کہ دنیا اُس کو ذلیل نظروں سے دیکھ رہی ہے ... شاید یہی ہو .. مگر میں ... اس کو کیا کروں ... دل نہیں مانتا۔

(پھر کچھ سوچ کر، کتاب بند کر دیتی ہے، اور کمرے کی طرف چلی جاتی ہے)

شانتی - ہائیں کرشن، آپ یہاں بیٹھے ہیں۔

کرشن - ہاں باہر سے آیا دیکھا آپ کتاب پڑھ رہی ہیں، میں بھی یہ کتاب پڑھنے لگا۔

(کرشن کی زبان سے آپ کا لفظ اسی طرف شانتی نے پھر سنا تھا)

کرشن - یہ بہت دلچسپ کتاب ہے۔ مسٹر بیگ[1] نے عورتوں کی کمزوریوں کا چربہ اُتارا ہے۔

شانتی - لیکن اُنھوں نے تصویر کا صرف ایک ہی رُخ دیکھا ہے۔ عورت بیشک کمزور ہے لیکن اُس کی کمزوری

---

[1] مسٹر عظیم بیگ چغتائی۔ مصنف "کمزوریاں"

دماغ و خیال کی کمزوری کہی جا سکتی ہے نہ کہ عمل کی۔

کرشن - یہ نظریہ عام خیالات سے کس قدر مختلف ہے۔

شانتی - ہاں اس لیے جدا ہے کہ ان بیچاریوں کے جذبات کی ترجمانی آپ کے بھائی بند کرتے ہیں اور شانتی کی زبان خود اُسکے جذبات کی ترجمانی کر رہی ہے۔

کرشن - تو کیا آپ مردوں کو عمل میں کمزور خیال کرتی ہیں۔

(شانتی کے دل پر آپ کے ارادے ایک تیر چوٹ لگتی ہے - گزشتہ محبت کی یاد آتی ہے۔ آنکھیں پُرنم ہوتی معلوم ہوتی ہیں لیکن خود دار شانتی آنکھوں ہی آنکھوں میں آنسو خشک کرکے جواب دیتی ہے)

اس بحث کی بنیاد خیالات پر ہے - ممکن ہے کہ ہمارے آپ کے خیالات کا سنگم اب نہ ملے - لیکن اتنا غالباً آپ بھی مانیں گے کہ عورت اپنے خیالات اور عقیدے میں مرد سے زیادہ دھنی ہوتی ہے - مرد کے خیالات بدلا کرتے ہیں ... کرشن؟ ... اُس کی محبت بھی بدلا کرتی ہے ... لیکن عورت اُسکے عقیدہ اور اُس کے جذبات آکاش پر قطب ستارے کی طرح چمکتے رہتے ہیں .... سمجھے کرشن - اسی کو مرد عورت کی کمزوری سمجھتے ہیں اور عورتیں اسی کو اپنا زیور۔

کرشن مسکرا کر چپ ہو جاتا ہے۔

(پردہ گرتا ہے)

تیسرا سین

(آدھی سے زیادہ رات گزر چکی ہے لیکن شانتی کی آنکھوں سے نیند کوسوں دُور ہے - رات کا سناٹا ہے، دور رکھی ہوئی شمع کی دھیمی لیکن اُداس روشنی کرشن کے بیخبر چہرے پر پڑ رہی ہے، اور شانتی کی ٹکٹکی کبھی شمع کی طرف بندھ جاتی ہے تو کبھی کرشن کے سوتے ہوئے چہرے پر -)

شانتی (کرشن کو سوتا دیکھ کر، دل ہی دل میں یا زبان یا اس سے) پیارے کرشن، اپنی بپتا بی میں تمہیں شریک غم کرنے کی ہمت اب نہیں - اور نہ تمہارے دل ہی کو وہ بے چینی ہے کہ شانتی کی ہلکی سی آہٹ سے بھی تمہاری آنکھ کھل جائے ... ہاں ... وہ تاریک رات جب ہم لوگ واہ کی پہاڑیوں اور آبشاروں میں اپنا راستہ بھول گئے تھے، کس بلا کی تاریکی تھی - مگر نہیں - اس تاریکی میں بھی ایک روشنی تھی - تارے نہ تھے .. چاند نہ تھا ... لیکن پریم کے دو دیئے ضرور جل رہے تھے ... آج کتنا اندھیرا ہے ....

(شمع کی لو تیز کرتی ہے)

پیارے کرشن کیا وہ محبت ... محبت نہ تھی، آہ محبت اور ہوس اپنی پہلی منزل میں کس قدر قریب ہیں ...... "بھیگے ہوئے بال چاند سے کیسے چھپے جاتے ہیں" .... "شانتی" گرمی کے دن تھے .. آہ (آنکھ سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں - شمع کی دھیمی روشنی پھر دھندلی ہو جاتی ہے) اُف، محبت، محبت دھوکا ہے .. وہم ہے، .. بیماری ہے ... حسن کی بیچین کر دینے والی جرأت، دل ہیں کیسے حسن کی سرشاریوں کے لطف اُٹھائے جانے کی تمنا ... کیا محبت اسی کا نام ہے

..... مگر نہیں - ہوس کے راون کا پریم کی شُند رتا سے کیا مقابلہ - دنیا کی سب چیزیں دھوکا ہو سکتی ہیں ... آکاش کی سب چیزیں ممکن ہے مایا ہوں ... محبت مایا نہیں — ہوں ... دُنیا (کرشن کروٹ بدلتا ہے - شانتی اپنے خیالات میں غرق ہے) ہم دُنیا کی مایا میں پڑکے یہاں کی رسیوں سے آزاد ہونے آئے ہیں، اور محبت کے دیوتا کے آگے پریم کے دیے جلانا ہیں .... تکلیفیں اُٹھا اُٹھا کے، مصیبتیں جھیل جھیل کے اس محبت کی آگ ... آگ کو روشن رکھنا ... یہی زندگی کا جوہر ہے - (شانتی کے چہرے پر سرخی دوڑ جاتی ہے - شمع گل تو جھلملانے لگتی ہے - شانتی اُٹھتی ہے شمع کی لَو کچھ اور تیز کرتی ہے - کرشن کی نظریں شانتی کے پُرنم چہرے اور غرقاب آنکھوں کے دیکھنے سے قاصر ہیں - شانتی پائنتی پکڑ کر کرشن کے قدموں پر پڑی ہوئی چادر کو عقیدت سے چومتی ہے)

(پردہ گرتا ہے)

چوتھا سین

(صبح کا وقت ہے، سورج ابھی نہیں نکلا لیکن صبح کی وہ کیف آور روشنی جو اس کی پیش خیمہ ہوتی ہے پھیلی ہوئی ہے - شانتی بنگلہ کے پھاٹک تک جا رہی ہے تاکہ گزشتہ رات کے لکھے ہوئے خطوں کو اپنے ہاتھ سے ڈاک کے حوالے کر دے —)

نیکو مالی (شانتی کو دیکھتے ہی سنبھلتے ہوئے گملے کو چھوڑ کر کھڑا ہو جاتا ہے) حضور بندگی

شانتی (ہاتھ میں لیے ہوئے لفافوں سے بلا نظر اٹھائے ہوئے سر ہلا دیتی ہے)

نیکو (دو پھول توڑ کر) حضور (پھول پیش کرتا ہے)

شانتی (مالی کی طرف نظر اُٹھا کر) پھول لے لیتی ہے (کچھ دیکھتی ہے اور پھر کچھ سوچ کر) مالی چنبیلی کے پھول نہیں ہے؟

نیکو - ہیں کاہے نہیں، حضور (پھول توڑنے بڑھتا ہے)

شانتی (کی نظریں باغ کے دلفریب پھولوں پر پڑتی ہیں، جن پر اوس کی بوندیں ہنوز چمک رہی ہیں) دیکھو اوس کے قطرے نہ گرنے پائیں -

مالی - سنبھال کر گچھا توڑتا ہے اور پیش کرتا ہے -

شانتی - پھول لے لیتی ہے آنکھ بغور دیکھتے ہوئے پھر لیٹر بکس کی طرف چل دیتی ہے —

شانتی - چنبیلی کے گچھے کو ایک بار پھر دیکھتی ہے - مسکراتی ہے اور ایک طرف بیل پر ڈال دیتی ہے) خط ڈالنا چاہتی ہے - لیٹر بکس پر لکھے ہوئے وقت کو دیکھتی ہے اور پھر ہاتھ رکھ کر کچھ سوچنے لگتی ہے - وہ ایک کشمکش میں ہے جس کو چہرے کی رنگت اور آنکھوں کی حیرت روشن کیے بغیر نہیں رہتی - چھوٹی چھوٹی چڑیاں چہچہاتی ہوئی پاس سے نکل جاتی ہیں - ایک بار پھر اُن نظروں سے جن میں کشمکش تیقن سے بدلتی نظر آتی تھی ایک لفافہ کو دیکھا - اور ایک عجیب کیفیت استقلال سے خطوں کو ڈاک کے حوالے کر دیا ——

شانتی واپس آتی ہے تو کرشن کو اٹھا پاتی ہے -

کرشن - آج آپ بہت صبح اُٹھ پڑیں -

شانتی - ہاں آنکھ کھل گئی، ذرا ٹہلنے کو جی چاہا، اور....

کرشن - اور کیا؟

شانتی - (میز کی چیزوں کو سنبھالتے ہوئے اور کرسی کو قریب کرتے ہوئے) دو ایک خط بھی ڈالنا تھے -

کرشن (جماہی لیکر) آج بڑے ضروری خط لکھ ڈالے؟

شانتی - بہت ضروری - پتا جی کو عرصہ سے کوئی خط نہ بھیجا تھا، ایک اور خط بھی ضروری تھا -

کرشن (چپ ہو جاتا ہے) میز پر رکھے ہوئے سگریٹ کیس کو اٹھاتا اور مسہری کے تکیہ سے ٹیک لگا کے سگرٹ پینا شروع کرتا ہے - دھوئیں کے حلقے کمرے میں پھیلتے جاتے ہیں -

شانتی - تو آج گاؤں جانے کا ارادہ ہے؟

کرشن - ضرور جاؤں گا ---- کاغذ دے دیکھیگا -

(پلنگ سے اٹھ پڑتا ہے)

پردہ گرتا ہے

پانچواں سین

کرشن اپنے گاؤں میں کاغذات کا معائنہ کر رہا ہے، ہر کارہ ڈاک دیتا ہے - اسکی نظریں ایک لفافہ پر جم جاتی ہیں - مانوس تحریر اسکو حیرت میں ڈالے ہوئے ہے - لفافہ کھولتا ہے ----

کرشن (دل ہی دل میں) یہ شانتی کی تحریر معلوم ہوتی ہے - لیکن شانتی کا خط اور ڈاک سے! (اب اسکی نظریں خط پر پڑیں - خط پڑھنا شروع کرتا ہے - آنکھوں سے حیرت اور چہرے سے پریشانی نمایاں ہوتی جاتی ہے) پھر اسکے منہ سے بیساختہ آہ نکل جاتی ہے "آہ شانتی... پیاری شانتی" وہ مکان کی طرف بے تحاشا بھاگنا چاہتا ہے -

(ہر شخص متحیر ہے)

مختار - خیر تو ہے حضور - (کرشن کی دیوانگی اس کو جواب نہیں دینے دیتی - وہ مکان کی طرف بھاگ رہا ہے)

مختار (فوراً موٹر منگاکے) حضور موٹر تیار ہے - آپ مکان جلد پہونچ جائیے گا -

کرشن - جلد پہونچ جاؤں گا (فوراً موٹر میں بیٹھ جاتا ہے) بہت تیز - ڈرائیور بہت تیز لیچلو - (موٹر چالیس میل کی رفتار سے جا رہی ہے)

کرشن - اُف کس قدر آہستہ - (کھڑا ہونے لگتا ہے) تیز لے چلو -- اور تیز - آہ - بہت تیز.... (جھنجلا کے) اُف - تم سے نہیں چلا جاتا -

(پھر خط کو دیکھنے کی جرأت کرتا ہے) آہ شانتی میں کس قدر پاپی ہوں -- موٹر سے کود پڑنا چاہتا ہے -

مختار فوراً پکڑ لیتا ہے -

کرشن - مجھے چھوڑ دو - میں مروں گا نہیں (گھڑی دیکھ کر) اُف - کل ۲ منٹ باقی ہیں (چیخ اٹھتا ہے - آنسو کے قطرے بے تحاشا نکلنا شروع ہو جاتے ہیں... ایک بار پھر چھڑانے کی کوشش کرتا ہے - گھڑی کی سوئی ایک پر آئی - کرشن کی ایک ہیبتناک آواز اسکے اوسان کی آخری الوداع تھی - اب وہ بیہوش تھا - ......

مختار نے ہاتھ سے خط لیکر پڑھنا شروع کیا -....)

(کرشن .... آہ پیارے کرشن - آپ کی شانتی

اپنے بڑھے اور خراب جسم سے اب آپ کی آنکھوں کو دکھ نہ پہونچائیگی .... میں جانتی ہوں کہ اب میں اُس جسم کی مالک نہیں جسکے پسینے کے قطرے چنبیلی کے پھولوں پر اوس کی بوندیں معلوم ہوں - میں جانتی ہوں کہ میرے چاند سے چہرے کو جسے کبھی بھیگے بالوں نے چھپا لیا تھا آج گرہن لگ چکا - اب نہ تو اس میں آنکھوں کے لیے تازگی باقی ہے اور نہ دل کے لیے مسرت ....

کرشن ... ہمارے ملک کی اکثر عورتوں نے چتاؤں میں جل جل کے زندگی کے جوہر دکھلائے ہیں، آج شانتی آپ کی خوشیوں کے لیے آپ کی زندگی میں ستی ہوتی ہے - میرے نزدیک حیات کا مفہوم اُس وقت ختم ہو جاتا ہے جب پریم کی نظر اُس پر سے اُٹھ جائے — اس وقت روح کی آزادیوں میں کسی خاکی جسم کو حائل رکھنا بزدلی ہے - آج میری چتا کے شعلے ایک بجے دن کو اُٹھیں گے اور آپ کے واپس ہونے تک شانتی کی آتما اُس دن کی منتظر ہوگی جب محبت ظاہری جسم اور لباس کی مایا سے گزر کے صرف آکاش کا تارا بن کے چمکے گی —

پیارے کرشن .... آپ نے مجھے دُکھ ....نہیں دیا - اگر مجھے دُکھ پہونچا تو اپنے مقدر سے - البتہ اگر یہ خط کچھ دیر کے لیے آپ کی آنکھوں کو پُرنم کر دے تو اسکی لکھنے والی کو معاف کیجیے گا

پیارے کرشن ..... الوداع

آپ کی .... شانتی

مختار کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں - ڈرائیور بدحواسی سے موٹر چلا رہا ہے - کرشن بیہوش ہے - کار بنگلے کے قریب پہونچتی ہے . جسکے اوپری صحن سے آگ کی تیز شعاعوں کے ساتھ دھوئیں کے تاریک بادل اُٹھ رہے ہیں - مختار کی آنکھوں سے آنسو کے قطرے اور تیزی سے ڈھلکنے لگتے ہیں .... اسی دھوئیں میں اُسے شانتی کی معصوم صورت نظر آتی ہے جو شعاعوں کے ساتھ آسمان کی طرف بلند ہو رہی ہے لیکن نظریں کسی کی آخری دید کی منتظر ہیں)

پردہ گرتا ہے

غزل مولوی محمد جمال احمد صاحب محوی - جلال پور (فیض آباد)

ہنس ہنس کے وہ ہماری نظر دیکھتے رہے
تاثیر تیری دیدۂ تر دیکھتے رہے

ارض و سما کو زیر و زبر دیکھتے رہے
ہم انقلاب شام و سحر دیکھتے رہے

محویتِ جمال کا اللہ رے اثر
اُن کی نظر میں اپنی نظر دیکھتے رہے

انجام جانتے تھے جو وعدہ کی رات کا
ہم شام سے نمودِ سحر دیکھتے رہے

وہ چونک چونک پڑتے تھے بستر سے بار بار
آہوں کا اپنی ہم یہ اثر دیکھتے رہے

محفل میں گو نہ تھا میں سزاوارِ التفات
جب تک رہا مجھے وہ مگر دیکھتے رہے

محوی ہنر کا ہم کو تو دعویٰ کبھی نہ تھا
لیکن نگاہِ اہلِ ہنر دیکھتے رہے

اُردو ادب پر ایک خطبہ

(جناب مولوی مشیر احمد علوی صاحب قادری بی اے)

سلسلۂ الناظر ماہ اپریل)

ہم نے اب تک شعر و شاعری سے بحث کی، لیکن اب ہم مختصراً دکن، دہلی، لکھنؤ، رامپور اور پٹنہ کی نثرنگاری پر بھی تبصرہ کرنا چاہتے ہیں جس کا مرکز بعد کو فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں قائم ہوا۔ وہاں ممتاز ادبا سرکاری اداروں کے لیے نصاب کی غرض سے مقرر کیے گئے۔ گو یہ اقدام وقتی تھا لیکن اُس نے اُردو کو بہت فائدہ پہونچایا اور ۱۸۳۶ء میں طباعت کی ایجاد سے کتابیں شائع ہو کر شوقین افراد تک پہونچنے لگیں۔ لیکن جو ضیا برطانوی دارالسلطنت کو روشن کیے ہوئے اور جگمگا رہی تھی دراصل وہ شاہان مغلیہ کے ظلِ عاطفت کی ساختہ پرداختہ تھی اور دہلی سے آئی تھی جو سلاطین مغلیہ کی واگذاشتہ راجدھانی تھی۔

اس تاراج شدہ قافلہ کے میر سالار میر امن اور اُن کے حاشیہ نشین افسوس اور جوان سب دہلی نژاد تھے۔ اُنھوں نے زبان اُردو کے عہد کو متبرک بنایا، اسالیب بیان اختراع کیے، نقش و نگار بنائے، ملائمت و سادگی بخشی اور ایرانی کلغی کی بدھیاں ڈالیں، منقش زیورات سے مماثت موتر مرصع اور طرحدار بنایا۔ اس طرح اسلوب ادبی انتہائی ارتفاع کے ساتھ ابھرتا گیا، سلجھتا گیا اور پھیل کر ظاہر ہوتا رہا۔ اور انیسویں صدی کے پہلے نصف حصہ تک یہی اسلوب بیان غیر منقطع افضلیت کی حیثیت سے برسرِ حکومت رہا۔

جب نثر اُردو فورٹ ولیم اسکول کے عقلا کی زیر نگرانی غیر معمولی ترقیاں کر رہی تھی تو شمالی ہند میں سید احمد (شہید) اسلام میں اصلاحات کا مطالبہ کر رہے تھے۔ اور اس مطالبہ نے ترقیوں کی جدید شاہراہیں کھول دی تھیں۔ نقطۂ خیال بدل گئے تھے، تخیلات کے مرکز جدا ہو گئے تھے۔ جماعتیں علٰحدہ ہو گئی تھیں۔ خوفناک مباحث و قضایا کا دروازہ کھل گیا تھا۔ مذہبی جنگ نے ان مباحث کے شعلوں کو ہوا دینا شروع کردی تھی اور اس جنگ (زرگری) میں جو اسلحہ مستعمل ہوئے وہ یہی زبان اُردو تھی جس پر اس طویل جاری شدہ جنگ میں صیقل کی ضرورت محسوس کی گئی۔ دھار رکھی گئی۔ مصنفین کرام کا اجتماع ہوا۔ زبان کی نامحدود گہرائیوں اور وسائل کا انکشاف ہوا۔ زبان میں ایک جدید روح پھونکی گئی۔ اور اُردو زبان کو اس جنگ

سے لطافت، نزہت، نفاست، اطمینان، سکون اور خود اختیاری لی۔ اور وہ حلیۂ تامکن البیان، غیر معین، نازک دشنۂ تیز اور سحر سامری بھی ملے جو اُسکے ادبی وقار و عزت کو قائم کرنے والے تھے۔ اور جنھوں نے ہر آئینہ اُردو زبان کی رونق و شکوہ، شان و شوکت، جاہ و جلال اور عظمت و کمال میں اضافہ کیا۔ غرض کہ اُس دَور کی وہابی تحریک نے بے شبہہ بہت کچھ ہماری زبان اُردو میں تعمیری عنصر پیدا کیا۔ شاہ عبد القادر کا کلام پاک کا ترجمہ جو ۱۸۰۳ء میں اصلاً مکمل ہوا تھا۔ وہ سید عبد اللہ (مقلد سید احمد) کے جوش مذہبی اور خروش اسلامی کی بدولت ۱۸۲۹ء میں گویا ۲۶ سال بعد نگی میں زیور طباعت سے آراستہ پیراستہ ہوکر منصۂ عام پر آیا۔ سید عبد اللہ سید احمد کے بہت پُرجوش مقلد تھے اُنھوں نے اپنے امام طریقت سید احمد (علیگڈھ کے سر سید نہیں) کی تنبیہ الغافلین کا اُردو ترجمہ بھی کیا اور ۱۸۳۰ء میں اسی مطبع سے شایع کیا۔ حاجی اسمٰعیل نے تقویۃ الایمان نامی رسالہ شایع کیا۔ جس نے سید کے مستفدین میں بڑا جوش و خروش پیدا کر دیا۔ طریقۂ محمدی کے مقتدین کی حسب ذیل تصانیف بھی اسی عصر کی ہیں جو ہر آئینہ مقبول و مشہور ہیں۔ ترغیب جہاد۔ ہدایۃ المومنین منفیح الکبائر، ہدایۃ الابداء، نصیحۃ المسلمین اور اٰۃ المسائل۔

لیکن محض وہابی تحریک ہی اس جذبہ کی محرک نہ تھی جس نے زبان کو ترقی کی شاہراہ۔۔۔۔ پر لاکر کھڑا کر دیا۔ بلکہ اُس وقت دوسری قوتیں بھی کارفرما تھیں۔ مثلاً (۱) ہندوستانی زبان کا ۱۸۳۲ء میں فارسی کی جگہ سرکاری حیثیت حاصل کرنا (۲) مغربی تعلیمات کا پرچار اور اُنکی غیر معمولی ہر دلعزیزی اور (۳) ہندوستانی اخبارات و مطابع کا اجرا۔ ان جملہ امور نے اُردو کی ترقی میں مساویانہ حصہ لیا۔ اس دور میں حب الوطنی اور اصلاحات کا جذبہ بہت کافی پیدا ہو چکا تھا۔ اور ہماری ادبیات متقدمین سے متاخرین تک اسی رنگ میں رنگی ہوئی ہیں۔ اور یہ فرق مستور نہیں ہے بلکہ ایک صاف اور بیّن نغمہ کا فرق ہے جو سالہا سال سے سنائی دے رہا ہے۔ میر تقی، ذوق و غالب ——— ابتدائی دَور کو چھوڑ کر ——— سب میں یہی نغمہ کارفرما نظر آتا ہے اور یہی واحد روح ہر ہر قدم پر منکشف ہو کر نسل انسانی کو مواخات و احساس فرائض کے شاندار اور شریفانہ کردار کی طرف اُبھار رہی ہے۔

لیکن جب شاعران نغمات قدسی کو سکون و عزلت، خلوت اور خاموشی سے الاپ رہا تھا تو بادشاہ بحر سر سید اعظم اس جنس گراں مایہ کو (عوام کے جذبات پسندیدگی کا عام احساس کرتے ہوئے) بازار میں لائے اور نہایت درجہ جفاکشی، آزاد منشی اور روشن خیالی سے اہل ملک سے برسرپیکار رہے اور خود اعتمادی اور

خودداری سے معترضین کو شکست قبول کرنے پر مجبور کیا ـــــ لیکن کسی مشکوک صدائے تخیف سے نہیں ـــــ بلکہ پیغمبرانہ عزم و استقلال سے اس کو ہرتا پاک کو بازار میں بہانگ دہل پیش کیا۔ اور یہ ثابت کر دیا کہ کوئی شخص بغیر اس سلاح کے اس کا مطلقاً مستحق نہیں ہے کہ وہ کسی دنیوی لائحہ عمل میں حصہ لے سکے۔ اُنکو کامرانیاں دوچند ہوئیں۔ اُنھوں نے اُردو نثر نگاری میں امتیازی حیثیت حاصل کی۔ اور اسکے لاانتہا ہی امکانات کے پہلو کو عوام کے روبرو پیش کیا۔ اور اصلاحات اور روشن خیالی کا مطالبہ کیا۔ غالباً اُنکی تعلیمات ومعتقدات اس قدر جلد اثر پذیر نہ ہوتے اگر اُنکو الطاف حسین حالی نہ ملتے۔ حالی غالب کے تربیت یافتہ تھے۔ ۴۰ سال کے سن میں سرسید کے پرچم کمال میں پناہ گزیں ہوئے اور یہیں اُنھوں نے اپنی افوق الفطرت شاعرانہ بلاغت اور موثر خطابت کو اُس غیر معمولی زعیم الملت اور ہم ملک و ہم مذہب و ہم مشرب کے نام نامی پر معنون کر دیا۔ ان کا مسدس ایک لافانی تحفہ ہے جو اُنھوں نے قوم کی خدمت میں پیش کیا۔ وہ اپنے عہد کی زندہ یادگار ہے۔ [Childe Herald کا جواب ایشیا میں مسدس ہی ہو سکتا ہے] صاعقہ قہر کی طرح وہ خرمنِ قلوب پر گری اور اکناف ہند میں اُس نے اپنی شعلہ نوائی کے طفیل میں آگ لگا دی۔ مسدس نے مضمحل، ناتوان، کمزور، اور بیکار دست نبضوں میں حرارت پیدا کر دی۔ جوش و خروش اور عمل کا ولولہ پیدا کیا۔ حیات انسانی میں تجدید کی اور جذبۂ عمل کی وکالت کی۔ اس سے بھی زیادہ کام یہ کیا کہ یہ پہلا علانیہ اور تیز خراج عقیدت انسانی عظمت و وقار کا تھا جو شاذ و نادر ہی ہمارے ملک میں پیشتر سنایا گیا تھا۔ اور شاید ہی اس سے زیادہ مقبول کوئی اور نظم ہندوستان میں ہو۔

اپنی خود کرتے تھے عزت گر نہ کرتا تھا کوئی
سر ہر اک فرعون کے آگے نہ ٹھکراتے تھے ہم

اُنھوں نے اپنے اشعار میں خود ایک شاعرانہ معیار (ورڈ سورتھ کی طرح!) پیش کیا ہے کہ شاعری ... "جو سادہ ہو، مبالغہ و کذب سے پاک ہو اور قلوب کو براہ راست متاثر کر سکتی ہو۔ اور سب سے ... یہ کہ اُسکے جذبات میں خلوص ہو"

اس وطنی پُرجوش ادب کا ذکر کرتے ہوئے ہم نذیر احمد کو فراموش نہیں کر سکتے جو بحیثیت نثر نگار کے نایاب خوبی کے مالک ہیں۔ اور نسلاً بعد نسل نہ صرف بحیثیت انشا پرداز کے بلکہ بحیثیت محب وطن کے بھی ان کا نام لوگ یاد رکھیں گے۔ اُنکو اپنے وطن سے محبت ہی نہیں عشق تھا۔ اُنھوں نے بہت ...

سے اپنے گرد و پیش کے ماحول کا مطالعہ کیا اور بہت صفائی سے تمام عیوب کو مضحک تمثیل کے ذریعہ سے آشکارا بھی کر دیا۔ انکی سنجیدہ ہلکی ظرافت کے پردہ میں دانشمندانہ مشورے اور مشفقانہ پند و نصائح ملتے ہیں۔ ——— لیکن کیا اس کی امید ہے کہ اُنکے ہم ملک اُنکی نصیحتوں کو قبول کریں گے اور اُس پر عمل پیرا بھی ہونگے

خدا شاہد ہے میرے دل میں گر کچھ بھی شرارت ہو
مگر دیکھا نہیں جاتا کہ اپنی قوم غارت ہو

اسی لئے میں اُنکی نظم شروع ہوتی ہے جس میں ذکاوت، ظرافت، سنجیدگی، طنز، انکار، نصیحت، تنقید، مشورہ اور ہدایت کی لڑیاں نہایت ہوشیاری، خوش اسلوبی اور دانشمندی سے حسن و لطافت کے ساتھ پروئی ہوئی ہیں ——— آج اسی صف اوّل میں اقبال (گل سرسبد متاخرین) عظمت و جلال کا شاندار فلک نما مینار بالکل علیحدہ جداگانہ حیثیت سے بنائے ہوئے ہیں۔ اُنکی شاعری سرود وطن ہے۔ جس میں ہر جگہ پُر شوق، شعلہ خو، پُر جوش اور وطنی عشق کی لافانی چنگاریاں موجود ہیں۔ جس سے ہمارے قلوب میں گرمی اور جسموں میں سنسنی اور حرارت پیدا ہو جاتی ہے اور [illegible] کی طرح ہم کو بھی یہ [illegible] ہے کہ [illegible] سے قبل کچھ اور بھی ہونا چاہیئے۔ اور کچھ اعلیٰ پیمانہ کا قابل قدر کام ابھی اور بھی سر انجام دینا ہے۔ سنیئے

رُلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھکو — کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں
نشانِ برگِ گل تک بھی نہ چھوڑ اس باغ میں گلچیں — تری قسمت سے رزم آرائیاں ہیں باغبانوں میں
وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے — تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
ذرا دیکھ اس کو جو کچھ ہو رہا ہے ہونے والا ہے — دھرا کیا ہے بھلا عہد کہن کی داستانوں میں
یہ خاموشی کہاں تک لذت فریاد پیدا کر — زمیں پر تو ہو اور تیری صدا ہو آسمانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو — تمہاری داستاں تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں

[illegible] ایک صدی کچھ زیادہ شاید گزری ہے) اللہ اکبر ہم لوگوں نے کس [illegible] اقبال کے سنین میں ہندوستان یادداشت و یادگار سے بھی [illegible] ہے زمانہ بدل گیا [illegible] تبدیلی ہوگئی، فضا وہ نہ رہی جس کائنات کا (خواب و خیال میں بھی) وجود [illegible] اُسکے [illegible] نہ ہوا ہوگا وہ آج موجودات کا جزو ہے۔ گزشتہ نتائج (انقلاب) اُس [illegible] اور استقلال اور اپنے حسب خواہش زندہ رہنے کا عزم دور [illegible] جدید کا [illegible] اس وقت تسلیم کیا جائے گا۔ خواجہ میر درد کا دعوے

اتہام اختیاری نیز بر من کردہ اند ۔۔۔ درحقیقت دردگوے اختیارم کردہ اند[1]

کی تردید اقبال کرتا ہے کہ

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا ۔۔۔ مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

اور یہی روح خاموشی سے اپنا کام کرتی رہی اور حالی تک سینہ بسینہ پہونچی جو حقیقتاً ہند جدید کے مبلغ اعظم تھے اور یہی روح نہایت درجہ جاہ و جلال سے اقبال کے ناصیۂ کمال پر روشن ہے - قرون اولیٰ کی شاعری شخصی ذاتی اثرات سے مسحور تھی - اور اب عہد کی شاعری عالمگیر نغمات سے تعبیر کی جا سکتی ہے جس میں سرود وطن سب سے زیادہ نمایاں ہے - دور حاضر کی شاعری طوفانی و انقلابی عصر کی شاعری ہے اور اس شاعری میں وہ جملہ محاسن موجود ہیں جو اس طوفانی شاعری میں ہونا چاہیے - اب آپ کو اس شاعری میں عاشق ناشاد اپنے خیالی محبوب کے قدموں پر لوٹتا نظر نہیں آتا - نہ تو اس میں گل و بلبل کا افسانہ ہے اور نہ اندوہ و غم کا دردناک ترانہ - نہ عاشق گل کے موثر دردناک نغمات کا ذکر ہے اور نہ کنول کے بن کھلے غنچوں اور گلاب کے کھلے ہوے پھولوں کا تذکرہ ہے اور نہ عشاق کی تکلیف دہ دور از خیال سفر کی مشکلات کا رونا ہے جو اس کو عشق میں کانٹوں اور جھاڑیوں سے گزر کر محبوب کی خواب گاہ تک لے جاتا ہے - نہ تو اب شاعری میں فیاضی کے لیے بعید از قیاس مبالغہ کی ضرورت ہے اور نہ کسی ادب پرست قدردان کی مدح و ثنا کا بازار گرم نظر آتا ہے بلکہ اب اس قسم کی شاعری کی فضا میں انقلاب ہو گیا ہے - آج کی شاعری بالکل جداگانہ حیثیت رکھتی ہے - اب شاعری کا رنگ زیادہ تر تند، تیز، تندرست، خوددار اور آزادی کی خوشبوں سے مملو ہو گیا ہے - اور یہ روح بے شبہ حالی اور نذیر احمد کی شاعری میں نظر آتی ہے اور بہت سختی سے یہی آواز اقبال میں سنائی دیتی ہے - خدا کرے یہ روح زیادہ ترقی کرے اور جیسے جیسے دن گزرتے جائیں اس روح کا بول بالا ہو اور یہ اس امر کی پیشگوئی کرتی ہے کہ نہ صرف نثر و نظم میں سنجیدگی سے اس کا اثر پڑے گا بلکہ ہر حیثیت سے یہی شاعری ہر فضا و ماحول میں کارفرما نظر آئیگی - جنگ عظیم کے دور کی اردو شاعری پر نظر ڈالیے، اندرونی جذبات کا محاسبہ کیجیے - اب شاعری میں وہ خیالات نظم ہونے لگے جن کا اعادہ ۲۰ سال قبل خوفناک تھا اور اب بھی انکی نشر و اشاعت خطرناک ضرور ہے -

---

[1] ناحق ہم مجبوروں پر تہمت ہے مختاری کی ۔۔۔ چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا (میر)
شاید ایک چراغ سے سو چراغ جلنا ایسے ہی موقع پر بولا جاتا ہے - ناظر

اُردو ادب کو ہم بہت آسانی سے دو حصوں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔ تخیلی اور ترجمہ۔ تخیلی ادبیات میں نظم نثر، فسانے، ڈرامے آسکتے ہیں۔ اور ترجمہ میں مشرقی اور مغربی تصانیف کے تراجم آتے ہیں۔ جنھوں نے ادب اُردو کو مالا مال کردیا ہے۔ جملہ شاعریوں کی طرح اُس عہد کی شاعری میں بہت وسیع میدان ہے جس میں رزمیہ شاعری خطابیہ شاعری، عشقیہ شاعری، نعت، منقبت، مراثی، مدحیہ شاعری اور طنزیات کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ اُس دور کی نثر بھی کافی مالا مال اور مسائل سے پُر ہے۔ اور تخیلات کی بدولت اور اظہار جذبات سے مالا مال نظر آتی ہے۔ یہ نقاب اُٹھاتی ہے اور اشیا کی صحیح تصویر کو منکشف کرتی ہے۔ اور عمرانی سماجی حالت کا سچا منظر ہمارے سامنے آتا ہے اور نہایت واضح، متحرک اور سنسنی پیدا کرنے والی تصاویر پردہ پر چلتی پھرتی نظر آنے لگتی ہیں۔ یہ شاعری پُرجوش تاریخ سے زیادہ قابل وثوق اور سرکاری یادداشتوں سے زیادہ محفوظ ہے اور اُس کی دستاویزیں زیادہ قابل اعتماد، اسکے رجسٹر داخلی کیفیات کے آئینہ دار اور ہند کے نصف اداکیے ہوئے جذبات کا صحیح مرقع ہیں۔ مورخ مستقبل یقیناً اس طرف حقیقت و صداقت کی جستجو میں توجہ منعطف کریگا اور کون ہے جو حالی، نذیر احمد و سرسید احمد خاں یا اُنکے معاصرین کی اُن تصنیفات کو پڑھے گا جو یقیناً ہندوستانی نقطۂ نظر کی مظہر ہیں اور یہ یقین نہ کہے گا کہ یہ لافانی کڑیاں ماضی کو حال سے جوڑے ہوئے ہیں اور آج کے امور تنقیح طلب کل کے ناقص ادھورے امور کی تفتیش میں مصروف ہیں۔ ہمارے پاس ورثہ بڑا ہے۔ ہم بغیر کسی امتیاز کے نہایت درجہ بے پروائی، بے غرضی، اور سادہ لوحی سے اپنے مفوضہ فرائض کو سرانجام دیں گے اگر اپنے حقیقی وارثوں کے اس متبرک ورثہ کو زیادہ زرخیز، زیادہ شاداب اور زیادہ مالا مال حیثیت سے نہ سونپیں گے۔

مولانا سید سلیمان ندوی نے ابھی بہت سخت الزام ہمارے خلاف لگایا ہے اور یقیناً وہ آپ لوگوں کے خیال میں لاجواب بھی ہے۔ اُنکے خیال میں سوا مخدوم الملک بہاری کی سوانح حیات و تصانیف کے بقیہ گنج شائیگاں کو ہمنے بے اتفاقی و گمنامی سے اُبھرنے نہیں دیا۔ اور وہ اس الزام کی تائید میں یہ بھی ثابت کرتے ہیں کہ شیخ بارہ جو بہار کے مشاہیر علما میں سے تھے، اُن کا تذکرہ چند سطور میں کیا گیا ہے۔ ایک ممتاز خاندان جو روایات قدیمہ کا حامل تھا وہ نظر انداز ہو گیا اور محض اس واقعہ کی بنا پر کہ ایک دستاویز چند خاندانی افراد کے دستخطوں سے پھلواری کے خزائن مخطوطات میں دستیاب ہو گئی تھی اُس کا بھی تذکرہ کیا گیا۔ اس امر کی بھی مطلقاً اطلاع نہیں ہے کہ فتاوٰے عالمگیری کے بہاری مددگار کون حضرات تھے اور نہ اسی طرح سلّم و مسلّم کے مصنفین کا بھی پتہ چلتا ہے۔ محب اللہ بہاری کا ذکر تذکرہ آزاد بلگرامی کی سبحۃ المرجان میں موجود ہے، لیکن

علامہ یحییٰ بہاری کا تذکرہ کہیں نظر نہیں آتا - گو فلسفہ میں انکی تصنیف بہت بلند پایہ تھی اور بہار کی نا تعداد طلبا کی نسلیں اُن سے مستفید ہو چکی ہیں - آزاد کے تذکرہ آب حیات میں ظہور خان جانان کے حالات میں تذکرۂ اُن کا بھی ذکر آگیا ہے - اگر سابقین کی نسلوں کو ایسی بے اتفاقی سے واسطہ رہا ہے تو دَورِ حاضر کے موجودہ اکابر کو بھی اس سے زیادہ متوقع نہیں رہنا چاہیے ——— یہ تنقید چونکہ ہماری جماعت کے کے ایک عالم و فاضل شخص کی طرف سے ہوئی ہے اس لیے ہر آئینہ قابل توجہ ہے -

---

اگر ہم کو دنیا کے سامنے اپنی سب گناہی ثابت کرنا ہے تو ہم کو کیا کرنا چاہیے - ہمیں دنیا ہی کے واسطے نہیں خود اپنے ضمیر (کے سچ و کھل کے) سامنے بھی ہم کو اپنی بے گناہی پیش کرنا ہے - یقیناً وہ بہلانے کے لیے یہ کافی ہے کہ اس دَور میں جامعہ عثمانیہ کا دارالترجمہ اور نگ آباد کی انجمن ترقی اردو اور اعظم گڑھ کی انجمن دارالمصنفین بہت شاندار حیثیت سے آپ کے علم و ادب کی بڑی شان سے خدمات انجام دے رہی ہیں لیکن ہم کو اپنی زبان اور اپنے ادب کی نشو و نما کے لیے اس سے زیادہ اور وسیع میدان عمل کی احتیاج باقی رہتی ہے - کیا ہم بغیر کسی شرم کے یہ خیال کر سکتے ہیں کہ ہماری ادبیات انجمن الصفوان ہو جائے - یا صرف کلن اور صول نسخے جو اسکی شان کے شایان نہیں شائع ہو جایا کریں - اور یہ سوچ کر کون شرم نہ کرے گا کہ ہمارے اکابر کی نہ تو شایاں یادگاریں ہیں اور نہ ان کی یادگار سوانح عمریاں ہیں -

---

کوئی مسلک غیب زیادہ دلکش زیادہ پر جوش ہمارے اکابر کی سوانح سے زیادہ نہیں ہے - ہم کو جو الہام غیبی ان تذکروں اور اپنی ادبیات کے ذریعہ سے ملتا ہے اس کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا - اور اس الہام سے ہم کو اس امر پر مجبور کیا جائے گا کہ اس شمع ادب کو جسے ہمارے پیشرو پہلے فروزاں کر چکے ہیں زیادہ مضبوطی سے پکڑیں اور متفقہ جد و جہد سے بہتر لگائیں - سوا اسکے نہ کچھ ہو سکتا ہے اور نہ ہو گا -

---

جب میں گزشتہ ستمبر میں بہار کی طلبا کو خطبہ دینے کے لیے پٹنہ آیا تھا تو میں انکے جوش اور شوق سے بہت متاثر ہوا تھا - یہ بہت تابناک امید افزا اور امید نشان ہے - انکو رہنمائی کی ضرورت ہے انکو آپ اپنا ادب پڑھا دیجیے اور اُس الہام سے ان کا قلب معطر کر دیجیے جو ادبیات سے حاصل ہوتا ہے - انکو اس امر کی تعلیم دیجیے کہ وہ جملہ اشیا سے محبت کرنا سیکھیں - انکو فرائض منصبی اور ذمہ داری کے حیات کی امانت کی بھی تعلیم دیجیے کیونکہ زمانہ آئندہ میں یہی نسل ہماری روایات سابقہ کی بہترین امین ہونے والی ہے اور

نصفت جو ملکی ہے۔ کیا کوئی وطنی عقیدت یا وطنی عشق کی صاعقۂ ہوش فرسا کی صدائے بازگشت کو ضائع کر سکتا ہے؟ اپنی ہستی، اپنی روح اور اپنے قلب کو علم کے کلیسہ کی تکمیل کے لیے وقف کر دیجیے جہاں خود آپ کی زبان (اردو) دیوی کی حیثیت سے صدارت عظمیٰ کے معزز عہدہ پر فائز نظر آئیگی۔

اس ——— دار العلم! جسکو ہم سب لوگوں نے متحدہ مساعی سے تعبیر کیا ہے۔ کیونکہ ہمارا ادب ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے متحدہ مساعیِ جلیلہ کا خوشگوار انجام کہا جاتا ہے۔ اور تخلیق و مشاہدت کی قوتیں جو ہمارے ادب میں نمایاں حیثیت رکھتی ہیں وہ انشاء اللہ زیادہ وسیع و کشادہ زاویہ پائیں گی۔ عام شغل کے تعاقب میں ہم زیادہ مشترک حیثیت سے تگ و دو کرتے نظر آئیں گے اور یہ ہماری بین الاقوامی زبان ایک حقیقی اور واضح اتحاد کی فضا پیدا کریگی اور وہیں سے شیرینی اور روح بخشی کا قومی کلیسہ ایک جدید بشری انجیل کی تبلیغ کریگا جو حسن و خوشنمائی کی حدود سے گزرتی ہوئی ہم کو ایک شائستہ و محبوب سانچہ میں متحد کر دیگی!

نوائے ثاقب

(جناب مرزا ثاقب صاحب قزلباش لکھنوی)

اُن کی آرائش سے میرا کام بن جائیگا کیا
دل کی گتھی شانہ ہائے زلف سلجھائیگا کیا

وصل کے وعدے سے خوش ہو کر نہ مر جائیگا کیا
نامہ بر ہنستا ہوا آتا ہے خود آ جائیگا کیا

قیدیٔ غم تربتوں میں اور اُنکو یہ خیال
کاٹنے میں اک شبِ فرقت کے مر جائیگا کیا

کام اپنا کر چکے اہلِ وفا شک ہے تو ہو
سر نہیں باقی تو وہ سر کی قسم کھائیگا کیا

عرضِ مطلب کے لیے دل زباں کھلتی نہیں
کچھ اشارے میں کرونگا وہ سمجھ جائیگا کیا

ہاتھ اُدھر اُٹھتا نہیں ہے تار ادھر باقی نہیں
دینگے وہ کیا اور ہم دامن کو پھیلائیگا کیا

قصۂ فرہاد و مجنوں کیوں سناتے ہو ہمیں
جب پریشانی سے مطلب ہے تو گھبرائیگا کیا

میہمانِ کوئے جاناں ہو کے دل تنہا بسے
میں تو سمجھاتا نہیں وہ بھی نہ سمجھائیگا کیا

مست رہتے ہیں ہمیشہ مے فروشانِ [illegible]
ہم تو مانگینگے کوئی ساغر وہ فرمائیگا کیا

تنکے تنکے کا خدا حافظ چلے ہم باغ سے
الوداع اے آشیاں اب جا کے پھر آئیگا کیا

دل کی بیماری کا عقدہ کھولنا دشوار ہے
جو نہیں سمجھے وہ ثاقب مجھکو سمجھائیگا کیا

ایک غلط فہمی کا ازالہ

(جناب مولوی عبد الشاہد خاں صاحب شاہد شروانی ناظم انجمن اشاعۃ الدین مدرسہ عربیہ نیازیہ خیر آباد)

جس طرح شعر کہنا، مصرعوں کا موزوں کر لینا اور فن شعر جاننا عروض و قوافی کا سمجھنا دو جدا جدا باتیں ہیں اسی طرح صاحب فن ہونا اور شاعر ہونا الگ الگ دو چیزیں ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ جو شخص شعر کہہ لیتا ہو وہ معائب و محاسن شعر سے بھی آگاہ ہو یا قادر فن مشہور کیا جاتا ہو خصوصاً اس ترقی کے زمانے میں جبکہ شاعری الشعراء دل الجہل بجائے الشعر آخر العلوم کا مصداق ہو رہی ہے۔

اس مختصر سی تمہید کے بعد یہ گزارش ہے کہ میرے محترم منشی انعام اللہ خاں صاحب عارف پنشنر سررشتہ دار بند و بست ساکن بہادر گڑھ ضلع میرٹھ کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ موصوف حضرت داغ کے خاص تلامذہ سے ہیں حضرت داغ کے بعد آپ نے لسان الملک خیام الہند حضرت ریاض مرحوم سے رجوع کیا اور برابر مشورۂ سخن کرتے رہے۔ جناب نیاز برادر حضرت ریاض سے برادرانہ تعلقات ہیں۔ مدتوں سلسلۂ ملازمت ساتھ رہا ہے۔ لسان الملک حضرت ریاض مرحوم کی ذات سے جو تعلق موصوف کو ہونا چاہیے اسکے بیان کی ضرورت نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ استاد کی وفات پر شاگرد نے دل کھول کر ماتم کیا اور "ماتم لسان الملک حضرت ریاض" کے نام سے ایک ڈیڑھ جزو کا رسالہ بھی شائع کیا جس میں اپنے تعلقات اور مرحوم کے حالات اور حسن اصلاح کو دکھایا ہے۔ شروع سے آخر تک حسن عقیدت جلوہ گر ہے اور غالباً کہیں مبالغہ نہیں پایا جاتا۔ ان تمام محاسن کے باوجود کچھ فروگزاشتیں بھی موصوف سے ہوگئی ہیں جن میں بعض خاندان ریاض سے متعلق ہیں۔ مجھے اس سے بحث نہیں نہ وہ کوئی ادبی بحث ہے۔ اس کے متعلق مرحوم کے اہل خاندان بہتر سمجھتے ہیں۔

صفحہ ۲۱ پر موصوف نے اپنے ایک شعر کی تقطیع کی ہے، جس میں ضمناً حضرت ریاض کا بھی ذکر ہے چونکہ حضرت ریاض سے مجھے بھی وہی نسبت ہے جو عارف صاحب کو۔ اس لیے میں مجبور ہوا کہ استادِ محترم کی نسبت جو سوءظنی اس شعر سے پیدا ہوتی ہے۔ وہ دور ہو جائے۔ اسی ضمن میں شعر مبحوث فیہ کی بحر سے متعلق بھی کچھ تفصیل کروں گا۔ چونکہ یہ ایک ادبی لغزش ہے اس کا اظہار نہ کرنا اور پردۂ کتمان میں رکھنا ادبی جرم ہے اس واسطے مجھے چند سطریں لکھنے کی جرأت ہوئی۔ دوسرے اگر استادِ محترم کی ذات کا تعلق نہ ہوتا جب بھی شاید مجھے ادھر متوجہ ہونے کی ضرورت پیش نہ آتی۔

ذیل میں عارف صاحب کی چند سطریں نقل کرتا ہوں تاکہ ناظرین کے سمجھنے میں کوئی دشواری نہ ہو۔ عارف صاحب صفحہ ۱۱۱،۱۱۲ پر تحریر فرماتے ہیں:۔

"حضرت احسن مارہروی نے جو حضرت داغ کے ارشد تلامذہ سے ہیں اور میری سمجھ میں جانشینی داغ کے سب سے زیادہ مستحق ہیں میرے ایک شعر پر مجھے لکھا کہ تقطیع سے گرتا ہے۔ وہ شعر یہ تھا

خسرو و جم سب کیا ہوئے لعل و گہر نے کیا کیا
باد و حشم سب کیا ہوئے کثرت زر نے کیا کیا

میں نے حضرت ریاض کو احسن صاحب کی تحریر بھیج کر لکھا کہ جناب اپنی عادت ترک فرما کر مجھے صاف طور پر یہ لکھیں کہ حضرت احسن کا اعتراض صحیح ہے یا کیا۔ حضرت ریاض نے اس کے جواب میں مجھے لکھا

مشفق اقدس تسلیم۔ والا نامہ پہنچ گیا۔ اتوار کو حاضری کا قصد ہے۔ خدا کرے کوئی سبب مانع نہ ہو۔ احسن صاحب نے خسرو و جم کو ناموزوں کہا۔ خدا جانے کیوں۔

ریاض - ۱۴ - جون ۲۱ء

حضرت ریاض اتوار کو تشریف لائے میں نے عرض کیا کہ حضرت آپ ہر امر کو ٹال دیتے ہیں۔ میں اس شعر کی تقطیع کرتا ہوں۔ اب جو نقص ہو اس کو صاف بتا دیجئے اور بتائیے کیا اسی کاغذ پر تحریر فرما دیجئے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اس پرچہ کی نقل حضرت ریاض کی تحریر کے ذیل میں نقل کی جاتی ہے۔

خسرو و جم	سب کیا ہوئے	لعل و گہر	نے کیا کیا
فعل و فعولن	فعل و فع	فعل و فعول	فعل و فع
باد و حشم	سب کیا ہوئے	کثرت زر	نے کیا کیا
فعل و فعولن	فعل و فع	فعل و فعول	فعل و فع

حضرت ریاض نے اس پرچہ پر تحریر فرما دیا کہ حضرت احسن نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ رمضان المبارک میں تحریر فرمایا ہے۔ میں اب تک اس کو سمجھا نہیں ہوں۔ ہائے کس وضع کا فرشتہ خصلت بزرگ تھا جسنے یہ کہنا گوارا نہ کیا کہ حضرت احسن سے غلطی ہوئی ہے"

یہاں تک جناب عارف کی عبارت ہے۔ تعجب ہے کہ مدتوں ساتھ رہنے کے باوجود عارف صاحب حضرت ریاض کے مزاج آشنا نہ ہو سکے مجھے زمانۂ تعلیمی ہونے کی وجہ سے بہت کم حضوری کا موقع نصیب ہوا اور صرف تین برس کے عرصہ میں روزانہ نہیں ہفتہ وار حاضری ہوتی تھی۔ اس پر بھی استاد محترم کی

اکثر عادات سے واقف ہوگیا تھا۔ حضرت ریاضؔ کی یہ عادت تھی کہ جب موصوف کسی بات کا کسی مصلحت سے جواب دینا یا اس کی تشریح کرنا نہ چاہتے تھے تو ایسے الفاظ فرماتے تھے جو دونوں پہلو لیے ہوں۔ اور سائل کی دلشکنی کا بھی خیال رکھتے تھے۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ کسی دوسری مجلس میں حضرت ریاضؔ نے شافی جواب دیا ہے۔ مثال کے طور پر ایک واقعہ پیش کرتا ہوں۔ گزشتہ سال سیتاپور ہائی اسکول کا سالانہ مشاعرہ تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے کیا رنگ محفل ہوگیا۔ مصرعہ طرح تھا۔ میں نے بھی غزل لکھی۔ استادِ محترم نے اصلاح فرماکر جب غزل واپس فرمائی تو غزل سے خود ہی ۱۲ اشعار منتخب فرما دیے کیونکہ اتنے ہی اشعار پڑھنے کی مشاعرہ میں اجازت تھی۔ میرا ایک شعر تھا ؎

اُس پری پیکر کے آتے ہی بڑھا جوشِ جنوں حشر کا میدان دیوانوں کی محفل ہوگیا

یہ شعر مجھے بہت پسند تھا۔ حضرت ریاضؔ نے اسکو انتخاب میں نہیں لیا۔ میں نے عرض کیا کہ یہ شعر مجھے بہت پسند ہے، فرمایا کہ میں نے اپنی پسند کے مطابق منتخب کیے ہیں انھیں کو پڑھنا۔ میں نے دوبارہ اس شعر کے پڑھنے کی اجازت چاہی سکوت فرمایا کوئی جواب نہیں دیا۔ یہ سکوت غالباً دلشکنی کی وجہ سے تھا۔ مجھے پہلے ہی فقرہ سے سمجھ لینا چاہیے تھا کہ میں نے اپنی پسند کے مطابق منتخب کیے ہیں۔ جب مشاعرہ ہوگیا تو مسکرا کر فرمایا کہ دیوانوں کی محفل نہیں ہوا کرتی۔ اس وقت میری غزل مع اصلاح کے واپس فرمائی۔ چنانچہ مندرجۂ بالا شعر پر چہ پارہ بنا تھا۔ اور یہی وجہ لکھی ہوئی تھی۔

عارف صاحب سے بھی اس موقعہ پر یہی الفاظ فرمائے۔ یعنی حضرت احسنؔ نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ رمضان المبارک میں تحریر فرمایا ہے میں اُس کو اب تک سمجھا نہیں ہوں۔ واقعہ بھی یوں ہی تھا کہ رمضان المبارک میں لکھا تھا — اس جملہ سے حضرت ریاضؔ نے وہ فائدہ اٹھالیا جو عام طور پر مشہور ہے کہ رمضان میں دماغ صحیح نہیں رہتا۔ اور یہ ذو معنی فقرہ لکھ کر عارف صاحب کی تشفی کردی۔ اب رہا یہ جملہ کہ میں ابتک نہیں سمجھا ہوں اس سے یہ ثابت ہوسکتا ہے کہ آپ کی تقطیع نہیں سمجھا۔

شعر کے تقطیع میں ہونے یا نہ ہونے سے قطع نظر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ عارف صاحب نے یہ اوزان کہاں سے نکالے ہیں۔ اور کس بحر کی تقطیع فرمائی ہے۔ دنیا کا کوئی شاعر ان کو اوزان نہیں کہہ سکتا۔ طرفہ تماشا یہ ہے کہ وہ اوزان بھی شعر کے مقابلہ میں صحیح نہیں۔ مثلاً سب کیا ہوئے کا وزن فعل دفع قائم کیا گیا ہے جو سب کیا ہو پر ختم ہو جاتا ہے اور (ئے) بچ رہتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس کسی وزن کی چول درست نہیں۔ نیز اگر اصل مادہ (فعل) کبھی ہر جزء میں باقی رہتا تاہم غنیمت تھا۔ عارف صاحب کے یہاں تو لفظ دفع بھی تقطیع کا جزو ہے۔

اگر اس میں استاد محترم حضرت ریاض کا ذکر نہ ہوتا تو میں ہرگز ادھر متوجہ نہ ہوتا۔ معلوم نہیں کہ اس رسالۂ ماتم نے میری طرح کتنوں کو نئے ماتم میں مبتلا کر دیا ہوگا۔ اور کتنے حضرات ہونگے جنکو سوء ظنی پیدا ہوگئی ہوگی میں اس شعر کی بحر کی طرف توجہ کرنے سے قبل یہ بتانا چاہتا ہوں کہ حضرت احسن نے صحیح فرمایا کہ شعر تقطیع سے گرا ہوا ہے۔ اور حضرت ریاض نے جو کچھ اس کے متعلق فرمایا وہ عارف صاحب کی دلشکنی کی وجہ سے تھا جسکا مرحوم کو عدد درجہ پاس تھا۔ مرحوم نے یہ سمجھ لیا ہوگا کہ جب تقطیع کے صحیح اوزان تک عارف صاحب کو معلوم نہیں تو غلط کہہ کے تمام فن عروض سمجھانے سے کیا حاصل۔ اس موقعہ پر میرا بے اختیار دل چاہتا ہے کہ عارف صاحب نے جو الفاظ حضرت ریاض کے متعلق تحریر فرمائے ہیں انکا اعادہ کروں۔

"ہائے کس وضع کا فرشتہ خصلت بزرگ تھا جسنے یہ کہنا گوارا نہ کیا کہ جناب عارف کو تقطیع کے صحیح اوزان تک معلوم نہیں۔"

عارف صاحب کے اس شعر کا تعلق بحر رجز سے ہے۔ اس بحر کا اصل عربی وزن مستفعلن مستفعلن مستفعلن چھ بار ہے اور عربی میں اس کی تین تقطیع ہیں۔

۱۔ مستفعلن مستفعلن مستفعلن — رجز مسدس سالم
۲۔ مستفعلن مستفعلن — رجز مجزو صحیح
۳۔ مستفعلن مستفعلن مفعولن — رجز مسدس مقطوع

فارسی شعراء نے اس بحر میں کافی تغیر تبدل کیا۔ دو اجزا اور بڑھائے زحافات وغیرہ کے بعد نو تفاعیل قائم کیں

۱۔ مستفعلن مستفعلن مستفعلن مستفعلن — رجز مثمن سالم
۲۔ مستفعلن مستفعلن — رجز مجزو صحیح
۳۔ مفتعلن مفتعلن مفتعلن مفتعلن — رجز مثمن مطوی
۴۔ مفتعلن مفاعلن مفتعلن مفاعلن — رجز مثمن مطوی مخبون
۵۔ مفاعلن مفتعلن مفاعلن مفتعلن — رجز مثمن مخبون مطوی
۶۔ مفتعلن مفاعلن مفتعلن مفعولن — رجز مثمن مطوی مخبون مقطوع
۷۔ مستفعلن مستفعلن مستفعلن — رجز مسدس سالم
۸۔ مفاعلن مفاعلن مفاعلن — رجز مسدس مخبون
۹۔ مفتعلن مفتعلن مفتعلن — رجز مسدس مطوی۔

اردو شعراء نے ان میں سے تین تقطیعیں لیں اور کثرت سے اسی میں غزلیں لکھیں۔ ان تین کے علاوہ شاذ و نادر ہی کسی نے اس بحر میں غزل لکھی ہو۔

۱۔ مستفعلن مستفعلن مستفعلن مستفعلن　　رجز مثمن سالم
۲۔ مفتعلن مفاعلن مفتعلن مفاعلن　　رجز مثمن مطوی مخبون
۳۔ مستفعلن مستفعلن مستفعلن مستفعلان　　رجز مثمن مذال

اس تطویل کے بعد اب میں اصل مقصد کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ عارف صاحب کا شعر ہے

خسرو و جم سب کیا ہوے۔ لعل و گہر نے کیا کیا
جاہ و حشم سب کیا ہوے۔ کثرت زر نے کیا کیا

اسکے پہلے مصرع کی تقطیع یوں ہوگی　خسرو و جم　سب کیا ہوے　لعل و گہر نے　نے کیا کیا
مفتعلن　مستفعلن　مستفعلن (مفتعلن)　مستفعلن

دونوں صورتوں میں بحر رجز کی تفاعیل مقررہ سے یہ کوئی تقطیع نہیں۔

اب دوسرے مصرع کو لیجیے：　جاہ و حشم　سب کیا ہوے　کثرت زر　نے کیا کیا
مستفعلن (مفتعلن)　مستفعلن　مفتعلن　مستفعلن

اس میں بھی دونوں صورتوں میں کسی مقررہ تقطیع کے تحت مصرع نہیں آتا۔ اور اس بحر کا آج تک کوئی قائل نہیں ہوا۔ لہذا دونوں مصرعے تقطیع سے گرتے ہیں۔ اِن مصرع اولی میں ایک تاویل ہوسکتی ہے کہ خسرو و جم (مفتعلن) کے بجائے خسرَو وَجم (مستفعلن) پڑھا جائے۔ پھر سوال یہ ہے کہ دوسرا مصرع کس طرح موزوں کیا جائے۔ دوسرے اس تاویل میں غریب اردو کی مٹی خراب ہو جائے گی۔ ہم اردو کُشی پر بھی صبر کرنے کو تیار ہو جاتے اگر عارف صاحب نے صحیح اوزان تقطیع ہی لکھ دیے ہوتے۔ عارف صاحب نے تقطیع کرنے میں جو جدت کی ہے اُس کی داد اہل فن اور عروض داں حضرات ہی دے سکتے ہیں۔

میں نے اب تک جو کچھ عرض کیا وہ صداقت و خلوص پر مبنی ہے۔ مجھے امید ہے کہ میرے محترم جناب عارف صاحب میری اس گستاخی کو معاف فرمائیں گے اور میرے ہمخیال ہوکر لسان الملک اُستاد محترم حضرت ریاض خیرآبادی مرحوم کے دامن سے اس بدنما دھبہ کو تردید کرکے دُور فرمائیں گے۔

سلام

از غیر مطبوعہ کلام حضرت امیرؔ مینائی مرحوم

اے سلامی گر نہیں شیدائے سرور چاندنی
پھر یہ کس کو ڈھونڈھتی پھرتی ہے گھر گھر چاندنی

پرتوِ رخسار و گردن سے دمِ قتلِ حسینؓ
دھوپ تھی بالائے خنجر زیرِ خنجر چاندنی

چاند زہراؑ کا چھپا ہے آج کی شب زیرِ خاک
خاک بر سر پھرتی یاں ہے کمتر چاندنی

قبرِ بے چادرِ شہیدِ کربلا کی دیکھ کر
آسماں سے گر پڑی بیتاب ہو کر چاندنی

فاطمہؑ کی بیٹیاں بیٹھی تھیں فرشِ خاک پر
شرم سے جاتی نہ تھی زنداں کے اندر چاندنی

بانو چلاتی تھیں ہے ہے چاند میرا کیا ہوا
جب نظر آتی تھی بعدِ قتلِ اکبرؓ چاندنی

دھوپ میں جلتی تھی دن بھر نعشِ عریانِ حسینؓ
رات کو آکر اُڑھا جاتی تھی چادر چاندنی

زہروانِ روضۂ شاہِ شہید ان کے لیے
فرش کرتا ہے قمر اک اک قدم پر چاندنی

جنکے گھر کی لونڈیوں کے واسطے ہر رات کو
بچھتی تھی چادر پہ چادر چاندنی پر چاندنی

ق

وائے قسمت بیبیاں اُن کی جب آئیں شام میں
تانتے کو بھی نہ تھی اُنکو میسر چاندنی

بانو کہتی تھیں سیہ خانے سے میرے ڈر گئی
جاتی ہے زنداں سے جو باہر ہی باہر چاندنی

دھوپ میں دن بھر رہی اولادِ ہاشم کی لاش
لوٹتی ہے خاک پر اس غم سے شب بھر چاندنی

جلوہ فرما تھے وہاں بُرجِ شرف کے آفتاب
دخل پاتی شام کے زنداں میں کیونکر چاندنی

روضۂ شہ تک جو ہوتا ماہِ تاباں کا گزر
چاندنی کا پھول بن جاتی سمٹ کر چاندنی

کس مہِ بُرجِ امامت کی شہادت ہے امیرؔ
بچھ گئی مثلِ صفِ ماتم جو گھر گھر چاندنی

عیاں ہیں سالِ وفات اس سے پنجتن کے امیرؔ
شرف عجیب یہ حاصل ہے یاسمن کے لیے

تاریخ وفات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم و جناب فاطمہ زہرا علیہا التحیۃ والثنا ۱۱ھ کہ از "یا" پیدا می شود و تاریخ وفات جناب امیر علیہ السلام ۴۰ھ کہ از "م" پیدا می شود و تاریخ وفات جناب امام حسن علیہ السلام ۵۰ھ کہ از "ن" پیدا می شود و تاریخ وفات حضرت امام حسین علیہ السلام ۶۱ھ از "س" پیدا می شود، پس در لفظ یاسمن تاریخ وفات پنجتن پاک برمی آید۔

مرسلہ اسمٰعیل احمد مینائی تسنیم

قطعۂ تاریخ وفات لسان الملک خیام العصر حضرت ریاض خیرآبادی مرحوم و مغفور

(جناب منشی خلیل احمد صاحب شمیم خلف حضرت نسیم خیرآبادی)

ہزار حیف کہ بزمِ سخن میں آج نہیں
تھی جن کی شعلہ بیانی چراغِ بزمِ ادب

جو موجِ بادۂ کوثر تھا آپ کا ہر شعر
تو ہر غزل کوئی مینائے سرور و طرب

اگر تھی ابرِ گہر بار ہر تراوشِ فکر
تو پھول لاکھوں کھلاتی تھی ایک جنبشِ لب

ہر ایک حرف میں پنہاں عجب نکات و رموز
ہر ایک لفظ سے پیدا ہزار ہا مطلب

عجیب طرز کی حاصل قبولِ خاطرِ عام
عجیب حسن سے محبوب اہلِ علم و ادب

قبولِ خاطر و لطفِ سخن خداداد است
سمجھ میں آئے حقیقت میں اسکے معنی اب

اُدھر یہ رنگ گزشتہ کہ ذرے بنتے خورشید
اِدھر یہ چرخِ مذاقِ [illegible] کے کوکب

اُدھر تو مجلسِ صوفی میں انکے ذکر سے وجد
ادھر کلام پہ اسکے نثار اہلِ طلب

جو اُن کی شوخ طبیعت پہ اہلِ دیر کو ناز
تو قائل ان کی متانت کے خانقاہ نشیں سب

جو قدرداں ہر اک [illegible] ان کی
تو لیتے [illegible] سے نام ان کا [illegible]

جناب شیخ اُدھر تھے جو محوِ لطفِ سخن
تو سرمستِ مدح ادھر رندِ میگسار کے لب

وہ زیرِ لب سہی ۔ دشمن بھی تھا ستائش گر
دبا ہوا سہی ۔ حاسد بھی مدح کو جب تب

پر اُنکے ذکر سے ہر خاص و عام کی محفل
کہ ابتدا ہی سے اُنکا تھا "صلح کل" مشرب[1]

اُدھر یہ رندوں میں شامل بایں سپید ریش
اِدھر نصیب انھیں اللہ والوں کا منصب

حضرت ریاض:
ہے ریاض آپ بھی پیتے ہیں بایں ریش سپید
ہائے یہ نور کی شکل اور سیہ کاروں میں

دیکھ کر ہنستے ہو کیا تم صورتِ پاکِ ریاض
یہ بڑے پہنچے ہوئے اللہ والے لوگ ہیں

متانت ایسی کہ سو شوخیاں فدا جس پہ
وہ شوخیاں کہ عیاں جن سے شانِ حسنِ ادب

درست ہے ۔ انھیں سحبانِ ہند اگر کہیے
کہ [illegible] بلبلِ سخن [illegible] عرب[2]

تھی ان کی ہستی معروف مستحق اس کی
[illegible] بجا تھا اگر تھا "لسان الملک" لقب

ہم ان کی ذات کو خیامِ عصر کیوں نہ کہیں
جدا تھا اہلِ زمانہ سے ان کا رنگِ طرب

ہزار رنگ سے ہوتے تھے اُسکے جلوے عیاں
جب انکی محفلِ رنگیں میں آتی بنتِ عنب

[illegible] "صلح کل" کے نام سے ایک مقدمہ [illegible] ہوا تھا [illegible] آپکا کلام [illegible] ہوتا ہے ۔

بیاضِ ساقیِ کوثر سے ڈھونڈھ کر نسخہ — وہ اس کی شکل بدل دیتے تھے سخن عجب

نسخۂ بیاضِ ساقیِ کوثر سے مل گیا (رباعی) گھر بیٹھے اب تو بادہ کوثر بنائیں گے

کبھی تو بزم میں لاتے اسے نقاب بہ رو — کبھی نکھاتے اسے بے حجابیوں کے ڈھب

ملتی ملتی ایک شے تھی آبِ زمزم سے بہت (ص) ہم چھپا کر پی چلے اہلِ حرم کے واسطے

کبھی بناتے اسے جلوہ دارِ دامنِ طور — کبھی اسی میں تھی پیدا ضیائے حضرتِ رب

یہ چھنتے پینے والے ہیں ریاض ان کے سب مرشد ہیں (ص) ہمیشہ جام مے میں نورِ حق کا دیکھنے والے

کبھی تھی نورِ خدا سے اسی کی ذات مراد — کبھی تھا گلشنِ جنت سے میکدہ مطلب

مے نورِ خدا ہوتی دل عرشِ خدا ہوتا
تھوڑی سی جو پی لیتے کیا جانیے کیا ہوتا

حضرتِ ریاض

کبھی ممکن نہیں میخانہ کا ویراں ہوتا
کبھی ممکن نہیں جنت کا بیاباں ہوتا

کبھی تھا پیرِ مغاں اِن کا ساقیِ کوثر — کبھی برستی تھی بن کر یہ ابرِ رحمتِ رب

کبھی اسی کا تھا ہر جرعہ دانۂ تسبیح — کہ چھوٹے دیر و حرم سے نہ رشتۂ مطلب

جرعۂ مے دانۂ سبحہ ہیں سب بھر شمار (") کعبہ ہو میخانہ ہو ہم کام سے غافل نہیں

کہیں تو نور کے سانچے میں ڈھالتے اسکو — کہیں بناتے اسے موجِ بحرِ رحمتِ رب

ساقی ہمارے سامنے رکھدے تو بھر کے جام (") لاؤ ختِ رز کو نور کے سانچے میں ڈھال کے

کبھی تو تھی یہ فقط ایک میکدے والی — کبھی تھا بادۂ تسنیم بھی اسی کا لقب

چھوٹی جو خانہ ساز خدا ساز مل گئی (") کوثر کی دی مجھے مرے پروردگار نے

کہیں وہ چیز اکہ دیکھیں تو روح کانپ اٹھے — کہیں وہ جام اکہ پی لیں تو آئیں وجد میں سب

نکلی حرام - پی تھی سمجھ کر طبیعت شے (") کیا بدمزہ کیا ہے سئے خوشگوار نے

کہیں مراد یہی رندِ پاک طینت کی — کہیں بزرگ تہجد گزار کی یہ طلب

یہ شن کے نصف شب کو درِ میکدہ کھلا (") مانگی ہے اک بزرگ، تہجد گزار نے

کہیں وہ جو ہر اعلےٰ پیے جو پیرِ کہن — تو ایک گھونٹ میں حاصل ہو اسکو لذتِ شب

کیا چھلکتا ہوا وہ جام شراب آتا ہے (") اسے میں قربان مرا عہدِ شباب آتا ہے

کہیں اسی میں نمایاں وہ بامزہ تلخی — کہ یاد آئے کریں نوش جام کوثر جب

ارے ساقی ذرا میری شرابِ تلخ تو لانا (") مئے کوثر تو بالکل انگبیں معلوم ہوتی ہے

ہیں اسی میں وہ شیرینیاں اگر چکھ لے — تو اک ذرا ہی میں بندھ جائیں ہر کسی کے لب

کہیں یہی تھی کسی کے شباب کی تصویر — کہیں یہی لبِ تو یہ سکونِ دل کا سبب

[چھلکائیں لاؤ بھر کے گلابی شراب کی
تصویر کھینچیں آج تمہارے شباب کی] حسرتؔ موہانی [بس تو یہ یہ عالم ہے مرے ساقی ترے صدقے
ٹھہر جاتا ہے دل گردش میں جب پیمانہ آتا ہے]

کہیں چھلکتے ہوئے جام تخت پریوں کے — کہیں تھی خنجرِ خوں ریز موجِ آبِ طرب

[تخت پریوں کے بنیں آج چھلکتے ہوئے جام
لاؤ مینا ہی ویرانہ پریخانہ بنے] (〃) [نشے کے پینگ میں جانا تھا کہیں پینے کو
موجِ مے تیغ بنی چل گئی میخواروں میں]

جو خشتِ خم کہیں بنتی جبیں فرشتے کی — تو زیرِ خم نظر آتی زمیں کعبۂ رب

تہِ خم ہم کو کعبے کی زمیں معلوم ہوتی ہے — (〃) کہ خشتِ خم فرشتہ کی جبیں معلوم ہوتی ہے

کبھی تھا جامۂ رندی میں ذکر و شغل نہاں — اُدھر تو جام بکف اور ادھر تھے تو بہ بلب

ایک حالت رات دن تو بہ بلب ساغر بکف — (〃) بادہ کش ہوں میں کوئی ذاکر نہیں شاغل نہیں

کبھی تھے ساتھ تو اضع کے رندِ قانع یہ — پییں خود اور پلائیں خوشی سے پائیں جب

رندِ قانع متوکل ہے خدا دیتا ہے — (〃) جب وہ پاتا ہے تو پیتا ہے پلا دیتا ہے

کہیں انھیں یدِ طولیٰ تھا مے چرانے میں — اُڑا کے لائیں اچھوتا سبو بہ حسنِ عجب

مے چرانے میں ہمیں ہے یدِ طولےٰ کیا — (〃) ہم اُڑا لائے سبو آج اچھوتا کیا

کہیں انھیں کا تھا عمامہ رہنِ بادۂ ناب — کہیں یہ مفت کی پینے کو جانتے انسب

[بک گیا عمامہ ہو کر رہن مے
بوجھ اُترا سر سے جھگڑا تو چکا] (〃) [نشہ بھی دیر پا ہے تو لذت بھی ہے سوا
وہ نقد میں کہاں جو مزا ہے اُدھار میں]

وہ ان کی وضع وہ دشنام مےفروش کا ذکر — وہ سُن کے پی گئے ان کا یہ مفلسی میں ڈھب

یہ اپنی وضع اور یہ دشنام مےفروش — (〃) ہم سُن کے پی گئے یہ مزا مفلسی کا تھا

کہیں تھی شوخی رنگِ خضاب شیخ کی فکر — کہیں تھا پینے میں مانع جناب ہی کا ادب

[ہلکی ہے ریش پر تری رنگت خضاب کی
کیا شیخ کوئی ڈالدے کُلّی شراب کی ؟] (〃) [ادب سے پی نہیں سکتا ہوں بے اجازتِ شیخ
ذرا یہ سر جو ہلا دے ابھی سبو آئے]

حرم کے گوشے میں ان کا وہ زمزمی رکھنا — جنابِ شیخ کا پینا چھُپا کے وہ دمِ شب

بھر کر حرم کے گوشے میں رکھدی تھی زمزمی — (〃) پی لی چھُپا کے زاہدِ شب زندہ دار نے

حبیب ایسی سحر بیانی جہاں سے ہو معدوم — تو گوشہ گوشہ بنے کیوں نہ بزمِ شور و شغب

ابھی نہ مجھ ہوا تھا غمِ فراقِ نسیم
گری ہے جانِ سخن پر یہ اور برقِ غضب
بحجرِ غم میں جو پوچھا کسی نے سالِ وفات
کہا شمیم نے - اُجڑا ریاضِ فنِ ادب

۱۳۵۳ھ

درسِ عبرت

(جناب مولوی اسمٰعیل احمد مینائی صاحب شمیم بی اے ایل ایل بی وکیل)

جب وقت نعش میری غسال دھو رہے تھے
یہ حال تھا فلک پر تارے بھی رو رہے تھے
رستا تھا آسماں کا سیماب طلائی
گردوں کے میکدے میں ماتم سے ہو رہے تھے
مہتاب کی شعاعیں دھندلی سی ہو گئی تھیں
جلوے بھی آنسوؤں میں تنویر کھو رہے تھے
چرخِ بریں پہ بادل آنسو بہا رہا تھا
سیارے کہکشاں میں موتی پرو رہے تھے
از خلد تا بہ سدرہ سیلابِ غم کی شدت
رضواں تو کیا فرشتے بے کیف ہو رہے تھے
جنت میں حور و غلماں مصروفِ آہ و زاری
قدسی بھی اپنے اپنے دامن بھگو رہے تھے
قوسِ قزح وفورِ گریہ سے تھی کبودی
نظارہ ہائے رنگیں نگہت کو کھو رہے تھے
طائر پروں سے اپنا سر دھن رہے تھے پیہم
تخمِ سرشک صحنِ گلشن میں بو رہے تھے
بے کل تھیں ماہیانِ آبی وفورِ غم سے
پانی میں اپنی عزت موتی ڈبو رہے تھے
جنگل کے وحشیوں میں برپا تھا شور و شیون
رو رو کے جان اپنی آہو بھی کھو رہے تھے
اوراق منتشر تھے ہر سو چمن میں گل کے
نظارہ ہائے قدرت برباد ہو رہے تھے
اشجار پر خموشی، سبزہ نڈھال غم سے
رہنے کی تھی نہ خواہش رہنے کو گو رہے تھے
نہروں میں، وادیوں میں، کہساروں میں، انجمن میں
ہر جا آغوشِ فطرت اس غم میں رو رہے تھے
لیکن مرے اعزا دورانِ زندگی میں
ہمدرد و ہمنوا و ہمراز جو رہے تھے

اُن کا یہ حال سن لو عبرت کا اک سبق ہے
آرام سے گھروں میں بستر پہ سو رہے تھے

نظرے خوش گزرے

اپریل نمبر کے صفحات ۲۸۶ - ۲۸۸ پر جناب حکیم آشفتہ صاحب کے مرثیہ کے جو بند شایع ہوئے تھے اُن میں کتابت کی بعض فاحش غلطیاں رہ گئیں - حکیم صاحب معاف فرمائیں اور ناظرین اپنے اپنے پرچوں میں مقاماتِ ذیل درست فرمالیں :-

پہلا بند یوں ہے :- پہچان لے کہ دھوپ سے تو دھندلا گیا ہے رُخ — وہ پیاس ہے کہ پیاس سے سنولا گیا ہے رُخ

نواں ،، ،، :- زخمی جو شیر ہے تو زمیں تھرتھراتی ہے — اُڑتا ہے خوں ہوا میں جدھر تیغ جاتی ہے

چودھواں ،، :- یہ بھیڑ کچھ تو چھانٹ دوں اکبر کے واسطے — فوجیں کچھ اور کاٹ دوں سرور کے واسطے

پنجاب کے نامور شاعر اور ڈراما نویس آغا حشر کشمیری نے چند روز کی علالت کے بعد لاہور میں انتقال کیا - انا للہ وانا الیہ راجعون - مرحوم کو ادب کے جس شعبہ سے شغف تھا اُس میں اُردو کے کسی ادیب وشاعر کو شہرت وقبولیت عامہ کے لحاظ سے غالبًا اُنکی ہمسری نصیب نہیں ہوئی اس لیے ایک امام فن کی وفات پر بزم اُردو میں بجا طور پر عام سوگواری کا اظہار ہو رہا ہے - جو لوگ تھیٹر اور سینما سے ذوق نہ رکھتے ہوں یا اُن میں شرکت کو معصیت جانتے ہوں وہ مرحوم کے کمالاتِ فن کی کیا داد دے سکتے ہیں - البتہ اُنکی یہ وضعداری کبھی فراموش نہیں ہوسکتی کہ اختلافِ مذاق کے باوجود وہ جب کبھی لکھنؤ تشریف لاتے تو دفترِ الناظر کو ضرور سرفراز فرماتے - اور ہمیشہ اپنی عنایت ومحبت کا گہرا نقش دل پر چھوڑ جاتے - ادب اور تاریخ کی عمدہ کتابوں کا بہت ذوق تھا - اکثر فرمایش کرتے رہتے اور جب آتے تو کچھ کتابیں اپنے ہمراہ لیجاتے - مجلسی امور میں عملی حصہ نہیں لیتے تھے مگر ملکی اور اسلامی سیاسیات سے پوری دلچسپی رکھتے تھے - اور بیشتر انھیں مباحث پر تبادلۂ خیالات ہوا کرتا تھا - ایک بڑی خوبی اُن میں یہ تھی کہ اثناے گفتگو میں کبھی شائبۂ تفاخر نہیں ظاہر ہوتا تھا اور معاصر شعرا وادبا کا ذکر بڑی عزت ومحبت سے کیا کرتے تھے - اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائیں اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا کریں -

---

ایسٹر کی تعطیلات میں مسلم لیگ کا جلسہ تو نہیں ہوا - البتہ علیگڈھ کے ایک قومی دنگل کے بدولت اخباری دنیا میں اچھی خاصی چہل پہل رہی - ۱۹ - و ۲۰ ، اپریل کو مسلم یونیورسٹی کورٹ کا جلسہ بعض ممتاز عہدہ داروں کے

انتخاب دلفریب کی غرض سے منعقد ہونیوالا تھا - ایک سابقہ جلسہ میں کہا جاتا ہے کہ سرفضل حسین کی تحریک یا حکومت کے اشارہ سے گیارہ "سر" دوردراز مقامات سے آکر جمع ہوگئے تھے کہ پرو وائس چانسلر کا عہدہ توڑدینے کی تجویز کو کامیاب نہ ہونے دیں - بعض راویوں نے یہاں تک بیان کیا کہ وائسرائے کا ذاتی ہوائی جہاز ان میں سے ایک "سر" کو علی گڑھ تک اُڑا لیگیا تھا - مگر کسی سبب سے اکثریت اُسی فریق کی رہی جو اُس عہدہ کو توڑنا چاہتی تھی - اس لیے سروں کی یہ جماعت اپنے منصوبہ میں کامیاب ہوئی۔

ابکی بار علاوہ دیگر عہدہ داروں کے وائس چانسلر کے انتخاب کا مرحلہ بھی درپیش تھا - وہ فریق جو پرو وائس چانسلر کا عہدہ توڑکر صرف وائس چانسلر کو ذمہ دار اور حاکم اعلیٰ بنانا چاہتا تھا اس عہدہ کے لیے قائم مقام وائس چانسلر نواب اسمعیل خاں صاحب کو موزوں سمجھتا تھا اور جن لوگوں کو اندرونی حالات کی خبر نہ تھی وہ سمجھتے تھے کہ کسی ایسے شخص کے امیدوار نہ ہونے کی صورت میں جو نواب صاحب سے زیادہ با اثر ہو، اُنکے انتخاب میں کوئی دشواری نہ ہوگی - کہ یکایک ڈاکٹر ضیاءالدین صاحب اس شان سے نمودار ہوے کہ مسلم یونیورسٹی کورٹ کے اتنا ارکان اُنکے منتخب کیے جانے کے محرک تھے - نواب صاحب کے حامیوں نے حتی المقدور بہت کچھ ہاتھ پاؤں مارے مگر اتنے ووٹ بھی حاصل نہ کرسکے جتنے ڈاکٹر صاحب کے محرکین ابتدائی تھے اور بالآخر ڈاکٹر صاحب وائس چانسلر منتخب ہوگئے۔

ڈاکٹر ضیاءالدین صاحب بحیثیت ماہر فن تعلیم ہندوستان میں اپنی نظیر آپ ہیں اس لیے مسلم یونیورسٹی کیا معنی ہندوستان بھر کی جس یونیورسٹی کے وائس چانسلر منتخب کیے جاتے اُنکے لیے اُن کا وجود گرامی باعث فخر ہوتا - اور اس لحاظ سے نواب اسمعیل خاں صاحب کو اُنکے مقابلہ میں کوئی ترجیح نہیں ہوسکتی تھی - مگر بدنصیبی سے ڈاکٹر صاحب کی سابقہ روایات ایسی مہیب تھیں کہ ابھی چند ہی سال قبل رحمت اللہ کمیٹی نے انکے اُن تمام کمالات کے باوجود مسلم یونیورسٹی سے اُنکا تعلق قائم رہنا یونیورسٹی کے مفاد کے لیے مضر تجویز کیا اور ان کو پرو وائس چانسلری کے عہدہ سے دست بردار ہونا پڑا تھا - مرحوم صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے ڈاکٹر صاحب کی بے عنایتیوں کے خلاف جو پمفلٹ شایع کیا تھا اُس کے ضروری اجزا اُسی زمانہ میں درج الناظر کیے گئے تھے - سنا جاتا ہے کہ رحمت اللہ کمیٹی کے روبرو جو شہادتیں گزریں اُن میں اُس پمفلٹ سے بھی زیادہ سنگین قسم کے الزامات عاید کیے گئے تھے - واللہ اعلم - کمیٹی کی رپورٹ بعینہٖ راز رہی - اس لیے سنی سنائی باتوں کا کیا اعتبار - البتہ یہ واقعہ سب کے علم میں آیا کہ اسکے بعد ہی ڈاکٹر صاحب یونیورسٹی سے تشریف لے گیے۔

دنیا میں ایسے حادثات پہلے بھی پیش آئے ہیں - عہدوں کا عزل و نصب کوئی نئی چیز نہیں اور جس قسم کے جمہوری نظامات اس ملک میں رائج کیے گئے ہیں اُنکا تو لازمی نتیجہ یہی ہے - ہوسکتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب

کا تقرر غلط ہوا ہو مگر بقول مہاتما گاندھی کے جمہور کو غلطی کرنے کا حق ہے اور اُن کو غلطیاں کرنے دو۔ اگر ڈاکٹر صاحب نے گزشتہ سے سبق حاصل کیا ہے اور اب اُس روش کی پابندی نہ کرینگے جسکے لیے وہ سابق میں بدنام تھے تو چشم ما روشن دلِ ما شاد۔

جہاں تک حکومت، والیانِ ملک اور حکومت کے سَروں کی اعانت حاصل کرنے یا علیگڈھ کے تعلیم یافتگان کو ملازمتیں دلانے کا سوال ہے بے شبہ ڈاکٹر صاحب کو نواب صاحب کے مقابلہ میں زیادہ کامیاب ہونا چاہیے اور چونکہ یہی دو امور مسلم یونیورسٹی کے مہمات میں داخل ہیں اس لیے ہم کو ہمیں کچھ زیادہ چون وچرا کی گنجائش نظر نہیں آتی۔

باقی رہے حسیاتِ قومی، مفادِ عامہ اور اصول وآئین وغیرہ تو یہ وہ دقیانوسی باتیں ہیں کہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے اکثر وبیشتر افراد ہر لمحہ اُن کی پامالی کے لیے تیار رہتے ہیں۔ نواب صاحب کے ہوا خواہوں میں بھی چند ہی افراد ایسے نکلیں گے جن کو سنجیدگی کے ساتھ ان چیزوں سے دلچسپی ہو۔ صرف پرچار کی غرض سے کچھ الفاظ زبان وقلم پر آجاتے ہیں جن کے معانی ومطالب اور نتائج وعواقب پر نظر رکھنا کسی کے نزدیک بھی خردمندی نہیں۔ ساتھ ہی اسکے اُن اصحاب کو جو نواب صاحب کے حامی تھے مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے حامیوں کی جماعت میں بہت سے اصحاب ایسے ہیں جو مسلم یونیورسٹی کے معاملات سے ایسی گہری وابستگی نہیں رکھتے کہ آئے دن اُن کی سرگرمی وستعدی کا اظہار ہوتا رہے۔ کچھ دنوں بعد جب یہ حضرات محوِ خوابِ غفلت ہو جائیں تو پھر پنجہ آزمائی کیجا سکتی اور یونیورسٹی کے نظم ونسق پر قابو حاصل کیا جا سکتا ہے۔

مسلم لیگ کا جلسہ ملتوی کر کے مسلمان سیاسیئین نے ایک بار پھر اپنے تدبر وفرض شناسی کا ثبوت پیش کیا۔ جس جماعت کے حقوق کی حفاظت کے لیے لندن کے ملاء اعلیٰ میں مسٹر میکڈانلڈ اور سر سیموئیل ہور مامور ہوں اُسکو ناحق کی دردسری مول لینے کی کیا حاجت ہے۔ ایک مقامی روزانہ اخبار نے نہایت سنجیدگی اور متانت کے ساتھ شکوہ کیا ہے کہ مسلم لیگ کا جلسہ محض مسٹر جناح کے اشارے پر کیوں ملتوی کر دیا گیا۔ اگر معاصر عزیز نے تجاہل عارفانہ سے کام نہیں لیا ہے تو ہندوستان کے تابناک آفتاب کی روشنی میں یہ امر اچھی طرح واضح ہو جانا چاہیے کہ عہد حاضرہ میں مسلمانوں کی سیاست کا مرکزی نقطہ شخصیت پرستی ہے۔ مسلم لیگ ہو یا جمیعۃ خلافت یا مسلم کانفرنس، سب کی بے عملی وبیچارگی کا یہی راز ہے۔

تعارف

تعلیمی ہند - حجم ۹۶ صفحے - پیمانہ شل بانگ درا - قیمت ۱۲ار ملنے کا پتہ :- ناظم صاحب مجلس قاسم المعارف - دیوبند ضلع سہارن پور -

اراکین مجلس قاسم المعارف دیوبند نے یہ رسالہ اُن یادداشتوں سے مرتب کیا ہے جو حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی، جانشین حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی محنت و جانفشانی سے جمع کی ہیں - اور جن کے مطالعہ سے ہر شخص کو بآسانی معلوم ہو سکتا ہے کہ اہل ہند کی تعلیمی حالت عہد سابق کے مقابلہ میں یا اس عہد کی دیگر اقوام کے مقابلہ میں کتنی پست ہے - حضرت مولانا اگرچہ انگریزی سے واقف نہیں مگر اعداد و شمار سے خاص ذوق رکھتے ہیں - اُنکی فراہمی میں اہتمام بلیغ فرماتے اور پھر اُنکو نہایت خوبی کے ساتھ اپنی تقریروں میں بیان فرماتے ہیں - اور ہمیں اس بات کا دلی ندامت سے اعتراف ہے کہ جو کام ہم انگریزی دانوں کے کرنے کا تھا اُسے مولانا نے اپنی علوِ ہمت سے اپنے ذمہ لے لیا ہے -

تعلیمی ہند میں کیا ہے ؟ اس کا اندازہ حسب ذیل عنوانات سے ہو سکتا ہے :- موجودہ حکومت سے پہلے ہندوستان کی تعلیمی حالت - ہندوستانیوں کی تعلیم سے دلچسپی - تعلیم میں روڑے اٹکانے کا اقرار - حکومت نے ہندوستانیوں کو کیوں جاہل رکھا - تاریخ تعلیم - تعلیمات سے حکومت کی عدم توجہی - تعلیمی حالت صوبہ وار - مختلف صوبوں میں بالغوں کی تعلیم - پست اقوام کی تعلیمی حالت - ہندوستان کی تعلیمی حالت عموماً - ہندوستان کا مقابلہ ممالک غیر سے - تعلیمی حالت قوم وار - ہندوستان کی تعلیم گاہیں اور متعلمین - ابتدائی تعلیم - تعلیم پر خرچ اور اُس کی تفصیلات - کالے گورے کا تعلیمی امتیاز - تعلیم یافتوں کی بیکاری - اخبارات و رسائل - مسلمانوں کی تعلیمی پستی - تعلیم یافتہ مسلمانوں کے پیشے - ہندوستان میں تعلیم کے رواج سے انگریزوں کا مقصد -

ہر عنوان کے تحت میں حسب ضرورت اعداد و شمار دیے گئے ہیں جن کی خاموش شہادت اس عہد میں سب سے زیادہ وزن رکھتی اور کسی کم تعلیم یافتہ اور مہذب طبقہ میں بے چون و چرا تسلیم کر لی جاتی ہے -

مولانا نے کمال دیانت سے جا بجا اپنے ماخذ کے حوالے بھی دیدیے ہیں اور یہ کچھ کم قابل قدر نہیں کہ اکثر و بیشتر خود انگریزوں کی کتابوں سے یا سرکاری رپورٹوں سے استناد کیا ہے -

کتاب کی لکھائی چھپائی صاف اور روشن ہے، البتہ فہرست مضامین نظر انداز ہو گئی جسے مرتب کی مولویت کے لیے سند تصور کرنا چاہیے -

نئی کتابیں

مجموعۂ نغز

حکیم قدرت اللہ قاسم کا نایاب تذکرہ شعرائے اردو پہلی بار پروفیسر محمود شیرانی صاحب نے مرتب کر کے شائع کیا ہے۔ یہ قدیم تذکروں میں سب سے زیادہ ضخیم ہے۔ اس کی قدر و قیمت کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ کہا جاتا ہے کہ شمس العلما آزاد کی آب حیات کی تعمیر اسی کی بنیاد پر ہوئی ہے۔ حجم ۹۰۰ صفحے۔ تقطیع کلاں۔ دیدہ زیب جلد قیمت للعہ ر

تاریخ حریت اسلام

پنجاب کے مشہور ادیب و مورخ منشی محمد الدین صاحب فوق کی قابل قدر کتاب کا تیسرا اڈیشن۔ زمانۂ رسالت، عہد خلافت راشدہ، دور خلفائے بنی امیہ و بنی عباس، بنی بویہ و سلجوقیہ، دولت ہسپانیہ و غزنویہ کے علاوہ ٹرکی، مصر، الجزائر و مراکش، فرماں روایان ہند (افاغنہ، غلامان و مغلیہ) بادشاہان دکن، سندھ و کشمیر کے عہد ہائے گزشتہ کے رہنمایان حق پرست اور حق گو بزرگوں کے حیرت خیز جرأت آفریں اور ولولہ انگیز استقلال، جوش و ایثار کے حریت آموز حالات اور عدل و انصاف، حریت و مساوات، خدا ترسی و پاکیزہ نفسی کے حامی بادشاہوں کے سبق آموز واقعات کے علاوہ پرستاران صداقت اور فدائے مذہب و ملت خواتین کے سوانحات درج ہیں۔ حجم ۷۰۶ صفحے۔ خوشنما جلد۔ قیمت ے ر

ہندوستان کی پولیٹیکل اکانومی

معاشیات ہند پر مسٹر امرناتھ بالی ایم اے معلم اقتصادیات ڈی اے وی کالج لاہور کی قابل قدر کتاب جسکے مطالعہ سے ہندوستان کی اقتصادی حالت سے پوری طرح واقف ہونے اور حکومت کی پالیسی اور قوم کی ضروریات کا صحیح اندازہ لگانے کا موقع ملیگا۔ حجم ۳۱۲ صفحہ۔ قیمت عہ ر

پیغام آزادی

مسٹر تلک کی انگریزی اور مرہٹی زبان کی سیکڑوں تقریروں میں سے منتخب تقریروں کا ترجمہ منشی رام رچھپال سنگھ صاحب شیدا نے اردو میں کیا ہے جنکا مطالعہ سیاسیات ملکی سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے مفید ہوگا۔ حجم ۳۲۴ صفحے۔ قیمت عہ ر

آئینۂ ہندوستان

ایک انگریز اخبار نویس مسٹر ایچ این بریلسفورڈ ہندوستان اس غرض سے آئے تھے کہ یہاں کے حالات کا بذات خود مشاہدہ کریں اور اپنے نتائج کتابی صورت میں شائع کریں جسکا ترجمہ حاضر ہے عہ ر

قوم کی آواز

مہاتما گاندھی گول میز کانفرنس کے موقع پر جب انگلستان گئے تھے وہاں انھوں نے جو تقریریں کیں انکا ترجمہ جامعہ ملیہ نے شائع کیا تھا جسکی قیمت عہ تھی یہ دوسرا اڈیشن زبان ترجمہ لاہور سے نکلا ہے اسمیں عکسی تصویریں بھی شامل ہیں ۸۰ صفحے قیمت عہ ر

ملنے کا پتہ۔ الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

لکھنؤ کے تحفے

راحت روح

یہ لاجواب عطر شاہی زمانہ کی ایجاد ہے جو اب صرف یہاں کے ایک قدیم کارخانہ عطر میں تیار ہوتا ہے اور خوش مذاق رئیسوں اور بڑی سرکاروں پر ہدیۃً لیا جاتا ہے فی تولہ عہ

مخلوط آصفی

نواب آصف الدولہ کے عہد میں یہ بےنظیر عطر تیار ہوا تھا اور انھیں کے نام سے موسوم ہے۔ جرمنی اور جاپان کے آئے ہوئے عطر خوشبو کی تیزی پائداری میں اسکا مقابلہ نہیں کر سکتے فی تولہ عہ

عزیز ناز

یہ عطر یہاں کے ایک مشہور کارخانہ کی سالہا سال کی کوشش کا ثمرہ ہے اور بھینی بھینی خوشبو والے کئی قسم کے پھولوں کی آمیزش سے تیار ہوا ہے۔ قیمت فی تولہ ے ر

عطر حنا فی تولہ عہ	سے عہ	عطر مشک	ہہ سے عہ ر
عطر جوہی	عہ ر ،، عہ	عطر زعفران	ہہ ر ،، شے ر
عطر چمپلی	عہ ،، عہ	عطر عنبر	عہ ،، عہ
عطر سابیہ	عہ ،، سے ر	عطر عود	عہ شے
عطر کیوڑا	عہ ،، سے ر	عطر پانڑی	عہ ر ،، عہ ر
عطر موتیا	عہ ،، عہ	عطر مخلوط عنبری	سے ،، شے ر
عطر چمپا	عہ ر ،، عہ ر	عطر شمامۃ العنبر	عہ ،، شے ر
عطر نرگس	عہ ،، سے ر	عطر شمامہ	عہ ،، شے ر
عطر موگرا	عہ ،، سے ر	عطر مجموعہ	عہ ،، سے ر
عطر سوہنگی	عہ ،، سے	عطر مدن بان	عہ ،، عہ ر

عینک نور سرمہ

یہ سرمہ مختلف دھاتوں سے مرکب ہے۔ اسکے استعمال سے بینائی کی قوت میں اتنی ترقی ہو جاتی ہے کہ عینک لگانے کی ضرورت نہیں رہتی۔ قیمت فی تولہ عہ ر

تمباکوے خوردنی

(زردہ)

پتی فی سیر ہہ ر ، ہہ ، ۃ ر للعہ ر شے ر
مشکی ے ر للعہ ر شے عہ
،، دانہ دار للعہ ر شے عہ عہ
،، نقرئی عہ عہ عہ ۳

(گولیاں)

طلائی فی تولہ ہہ ر
نقرئی ،، ۶ ر ، ۸ ر ، ۱۰ ر
سادہ ،، ۴ ر

(قوام)

مشکی فی تولہ ۲ ر ، ۴ ر ، ۵ ر ، ۶ ر ، ۸ ر
زعفرانی ،، ۲ ر ، ۴ ر
برقی ،، عہ ر ، ہہ ر ، ہہ ر
افشانی ،، عہ ر

پان کا مصالحہ

مشک و زعفران وغیرہ کی آمیزش سے نہایت خوشبودار ہو جاتا اور پان کو لذیذ اور خوش ذائقہ بناتا ہے فی ڈبیہ ۳ ر فی شیشی عہ

شاہی بڑی قوام

یہ خوشبودار مصالحہ قوام کی شکل میں ہے۔ تمباکو اسمیں بالکل نہیں۔ صرف پان کو لذیذ و خوش ذائقہ بنانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ فی تولہ عہ ر

خوشبودار کتھا

کیوڑے کے پھولوں سے بسایا ہوا کتھا۔ فی سیر للعہ ر

چکنی ڈلی

ایک رخی فی سیر عا ، عا ر
دو رخی ،، عا عہ
چورا عہ ر سے عا ر

تمباکوے کشیدنی

خوشبودار خمیرہ
فی سیر عا ، عہ ر ، ۸ ر ، ۶ ر ، ۴ ر

ظفر الملک اینڈ سنس لکھنؤ

بنامِ خداوندِ جان آفرین

الناظر

نمبر ۶ جلد ۲۹ جون سنہ ۱۹۳۵ء

زوالِ بنی اسرائیل

(جناب الحاج مولوی امیر احمد صاحب علوی بی۔ اے۔ ڈپٹی کلکٹر)

وفات حضرت سلیمان کا اعلان زوالِ سلطنت بنی اسرائیل کی عبرت ناک داستان کا عنوان تھا۔ فلاکت ومصیبت کے بادل عہدِ زریں کے تمام ہونے سے پہلے ہی جمع ہونے لگے تھے۔ ایک روشن ضمیر علیم "اہیجا" نام قبیلۂ افرائیم کے سردار "یربعام" کو سلطنت کی بشارت دے چکا تھا۔ اور شاہ موعود عقوبت سلطانی کے خوف سے فرار ہوکر مصر میں پناہ گزیں تھا۔ وہاں اب اُس فرعون کی حکومت نہ تھی جس نے اپنی بیٹی شہنشاہِ بنی اسرائیل کو نذر کی تھی اور جس کی شادی کا جشن بڑے دھوم دھام سے یروشلم میں منایا گیا تھا بلکہ اُس کا جانشین "شیشاک" فرمانروائے ارضِ مصر تھا جو اسرائیلیوں کی سلطنت کو اپنا حریف اور رقیب تصور کرکے اُس کو تباہ کرنے اور ہیکل سلیمانی کے گراں بہا خزانے تاراج کرنے کا خواب دیکھ رہا تھا۔

یربعام سے پہلے ادوم کے تباہ شدہ شاہی خاندان کا ایک رُکن "حدد" نام مصر میں پناہ لے چکا تھا۔ اور فرعونِ وقت کی سالی سے شادی کرکے صاحبِ مال ومنال ہوگیا تھا۔ کہتے ہیں کہ جب داودی سپہ سالار "یوآب" نے ادومیوں کا قتلِ عام کیا تھا تو یہ بچہ محافظوں کی جاں نثاری اور وفاشعاری سے مدین اور فاران کے علاقوں میں پوشیدہ رکھا گیا۔ بالغ ہوا تو مصر پہونچا۔ اپنی شجاعت وجاہت اور دانشمندی سے فرعون کا منظورِ نظر ہوکر اُس کا ہم زلف بنا۔ اور موقع محل دیکھ کر وطن واپس

آیا۔ غارت گروں کا ایک انبوہ فراہم کرکے شہنشاہ کے عاملوں سے نبرد آزمائی کرنے لگا اور بحیرۂ احمر کی اسرائیلی تجارت خطرے میں ڈال دی۔

شمال میں دمشق کے قدیم شاہی خاندان کا ایک ملازم "رزان" علم بغاوت بلند کیے تھا اور شاہی سپاہیوں کو شکست دے کر دمشق اور اس کے ملحقات پر متصرف ہوگیا تھا اور ماوراء ریگستان سے کنعان کی تجارت کا سلسلہ منقطع کر دیا تھا۔

ہداد اور رزان کی کامیابیاں دیکھ کر عمونیوں اور موآبیوں نے بھی کروٹ بدلی تھی اور پچھلی سفاکیوں کا عوض لینے کے لیے وقت کے منتظر تھے۔

شمال مغرب میں ایک زبردست طاقت دار الحکومت نینوا میں تیار ہو رہی تھی جو دمشق اور شام کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی اور چند روز میں دنیا کی تاریخ کا ورق الٹنے والی تھی۔

جب تک عظمت و اقبال سلیمانی کا آفتاب درخشاں رہا ہلکے بادلوں کی طرف کسی کی آنکھ نہ اٹھی۔ مگر سلطان السلاطین کی خبر وفات مشتہر ہوتے ہی آفات و بلیات کی گھنگھور گھٹائیں دنیائے بنی اسرائیل پر چھا گئیں اور زمین و آسمان تیرہ و تار ہوگیا۔

۹۳۱ قبل مسیح میں رحبعام بن سلیمان اپنے والد ماجد کے تخت پر جلوہ افروز ہو کر روساء قوم سے حلف وفاداری لینے سکم گیا۔ رعایا نے یربعام کو مصر سے بلوایا اور اس کو سردار بنا کر نئے بادشاہ سے محصولوں میں کمی کا مطالبہ کیا۔ رحبعام نے کہن سال اور جہاں دیدہ بزرگوں سے مشورہ کیا۔ انھوں نے "سپر باید انداختن" کی صلاح دی۔ نوجوان ارکان حکومت نے اس رائے سے اختلاف کیا۔ ناتجربہ کار بادشاہ نے اپنے ہمسنوں کی بات مانی اور روساء سلطنت کو جواب دیا کہ

"میرے باپ نے تم کو کوڑوں سے ٹھیک کیا تھا۔ میں تم کو بچھوؤں سے ٹھیک کروں گا"۔

سرکشی کی چنگاریاں پہلے سے سلگ رہی تھیں۔ یکایک آگ بھڑک اٹھی۔ اسرائیلیوں کے طاقتور قبیلے باغی ہوگئے اور "سلطنت اسرائیل" کے نام سے شمال میں جداگانہ حکومت قائم کرلی۔ صرف دو اسباط یہودا اور بنیامین وفادار رہے اور وہ شوکت و جبروت کی سلطنت جو حضرت داؤد نے اپنی جواں مردی اور شجاعت سے قائم کی تھی جس کو حضرت سلیمان کی اقبالمندی نے محسود عالم بنا دیا تھا دو ٹکڑوں میں تقسیم ہوگئی۔

شمالی حصہ زرخیزی اور سرسبزی کی وجہ سے فلسطین کا باغ مشہور تھا۔ یافہ سے صیدون تک ساحل بحر اس کے علاقہ میں تھا۔ دریاء یردن وسطی حصہ کو سیراب کرتا تھا۔ رملہ سے دان اور کوہ ہرمن کی ترائی تک اس کی وسعت تھی۔ دس اسباط اس وسیع خطۂ ارض میں آباد تھے اور ان سب نے

بالاتفاق یربعام کو اپنا بادشاہ بنایا۔

جنوبی حصہ رقبہ میں مختصر اور دولت میں کمتر تھا۔ پہاڑیوں کا سلسلہ تقریبًا سارے ملک میں پھیلا ہوا تھا موآبیوں اور ادومیوں کے صوبوں سے سرحد ملی تھی۔ لیکن یروشلیم کا مقدس شہر اسی حصہ میں واقع تھا اور رعایا نسبتًا بہادر اور جفاکش تھی۔ یہاں کی حکومت رحبعام کے تصرف میں رہی۔

ایک اقلیم میں دو بادشاہوں کا صلح و آشتی سے رہنا مشکل ہے فلسطین کے مختصر ملک میں دو حکومتیں متفق امن و عافیت سے کیونکر بسر کرسکتی تھیں۔ خانہ جنگی شروع ہوئی۔ دشمن شاد دوست پشیمان ہوئے۔ سلطنت کا نام ۲۴۴ سال تک قائم رہا لیکن سوائے تنزل و تباہی کے ترقی کا خواب دیکھنا بھی نصیب نہ ہوا۔

مورخین نے اس طویل مدت کو چار دوروں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا دور "مخالفت" کا تھا جس میں یربعام اور اس کے جانشین "سلطنت اسرائیل" کو برباد کرنے اور کھوئے ہوئے علاقوں پر دوبارہ متصرف ہونے کی کوشش کرتے رہے۔ اس کی میعاد ۶۰ سال تھی۔

دوسرا دور "ظاہری اتحاد" کا تھا۔ جس میں شام کی بڑھتی ہوئی قوت سے مقابلہ کرنے اور اپنے مرزبوم کو اغیار کے حملوں سے بچانے کے لیے دونوں سلطنتوں نے باہم اتفاق کیا۔ اس عارضی صلح کی میعاد ۸۰ سال تھی۔

تیسرا دور "دشمنی" کا تھا۔ دونوں حکومتیں لڑ لڑ کر کمزور ہوگئیں۔ نینوا اور بابل کا آفتاب اقبال بلند ہوا۔ آخر کار شمالی سلطنت تباہ ہوکر نینوا کا ایک صوبہ بن گئی۔ اس کی میعاد ۴۷ سال تھی۔

چوتھا دور "جانکنی" کا تھا۔ یروشلیم کی مختصر حکومت زمانہ متوسطہ کی سلطنت غرناطہ کی طرح ہر طرف دشمنوں سے گھری تھی۔ کبھی نینوا سے ساز کرتی۔ کبھی مصر سے امداد مانگتی۔ اور کبھی دونوں سے لڑتی تھی۔ بالآخر بابل نے اس حکومت کا نام و نشان مٹا دیا۔ اس عالم نزع کی میعاد ۱۳۰ سال تھی۔

ان عہدوں کے بادشاہوں کی فہرست صحیفہ "سلاطین" اور صحیفہ "تواریخ" میں موجود ہے مگر ان کی بد افعالیوں کی تفصیل ناظرین کے لیے دلچسپ نہیں اس لیے ہم حذف کرتے ہیں۔

مختصر یہ ہے کہ یربعام نے یہود کی ضد میں بتوں کی عبادت شروع کی۔ پرستش کے لیے مصریوں کی طرح طلائی گوسالے بنوائے۔ ہیکل سلیمانی کے جواب میں عالیشان صنم خانے تعمیر کرائے اور فسق و فجور کا دروازہ کھول دیا۔ اس کا بیٹا صرف دو ہی سال حکمران رہا تھا کہ باشا نام ایک سردار فوج نے اس کو قتل کرکے حکومت اپنے ہاتھ میں لی مگر یہ جدید خاندان بھی چند روز میں بے چراغ ہوگیا۔ سپہ سالار عمری سلطنت پر قابض ہوا اور یروشلم کے مقابلہ میں سامرہ آباد کرکے دارالحکومت بنایا۔

دمشق کی اجنبی سلطنت طاقتور ہو چلی تھی۔ آمری کے جانشین اخی اب نے دوبار شام کی فوجوں کو شکست دی مگر بعد کو نینوا کی روزافزوں شوکت سے نبرد آزما ہونے کے لیے دمشق سے صلح کر لی۔ نینوا کے بادشاہ شالمنیسر دوم نے اسی زمانہ میں سلطنت اسرائیل پر پہلی چڑھائی کی اور قرقار کی لڑائی میں اسرائیلیوں اور شامیوں کی متحدہ قوت کو شکست دی۔

اخی اب کی مشہور آفاق بیگم ایزبیل کا نام مسیحی دنیا میں آج تک ظلم و جور کے لیے ضرب المثل ہے۔ یہ خوبصورت اور دانشمند ملکہ صیدون کے بت پرست بادشاہ کی لڑکی تھی۔ اپنے حسن و جمال سے اخی اب کو غلام بنایا۔ اور زیرکی و ہوشمندی سے رعایا کے قلوب ہاتھ میں لیکر "سلطنت اسرائیل" کی نورجہاں بیگم بن گئی۔

اپنے خاندانی معبود "بعل" کی پرستش فرزندان یعقوب کے ملک میں جاری کی۔ اس بت کے ۸۵۰ پجاری روزانہ اُسکے دسترخوان پر شریک طعام ہوتے تھے۔ جزریل کا نیا شہر آباد کیا۔ جس میں ایک دلکش عمارت ہاتھی دانت سے ملکہ کے رہنے کے لیے بنائی گئی۔ بڑے بڑے مذبح تعمیر کرائے جن پر علی الاعلان "بعل" کے نام پر قربانی ہوتی تھی اور بخور جلائے جاتے تھے۔

کہتے ہیں کہ شاہی محل کے قریب ایک تاکستان تھا۔ بادشاہ اُس اراضی کو خرید کر کے اپنا باغ لگانا چاہتا تھا مگر مالک تاکستان اُن زمین کے جدا کرنے پر کسی طرح رضامند نہ تھا۔ بادشاہ کو آزردہ دیکھ کر ملکہ نے ایک جھوٹا مقدمہ اُس مالک پر قائم کرایا اور اُس کو قتل کرا کے زمین بادشاہ کو دلا دی۔ پیغمبر وقت حضرت الیاس نے بادشاہ کو بہت سمجھایا۔ بڑے بڑے معجزے دکھائے لیکن عورت کی طاقت ہر زمانہ میں مذہب پر غالب رہی ہے' بادشاہ کو سمجھ نہ آئی۔ سیکڑوں بیگناہ موحد پہلے خانماں برباد ہو چکے تھے۔ تاکستان کا مالک بیگم کے اشارے سے قتل کیا گیا تو پیغمبر کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا۔ اُنھوں نے بددعا دی۔

"شہر جزریل کی فصیل کے پاس کتے جزبیل کو کھائیں۔ اخی اب کا جو رشتہ دار شہر میں مرے اُسے جانور کھائیں اور جو بیابان میں مرے اُسے ہوا کے پرندے چٹ کر جائیں"

نبی کا قول پورا ہوا لیکن جزبیل کا نام مذہبی تواریخ کے صفحوں پر ہمیشہ کے لیے یادگار رہ گیا۔

بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہو گا۔

حضرت الیاس کے بعد ہوسیع نبی نے اسرائیلی بادشاہوں کو بہت فہمائش کی اور صاف الفاظ میں کہا " یہ ملک راستی۔ شفقت اور خداشناسی سے خالی ہو گیا ہے۔ بدزبانی۔ عہدشکنی۔ خوں ریزی۔

چوری - اور حرام کاری کے سوا سارے ملک میں کوئی فعل پسندیدہ نہیں ہے - دیکھو یہ ملک ماتم کرے گا - اس کے تمام باشندے - جنگلی جانور اور ہوا کے پرندے ناتوان ہو جائیں گے بلکہ سمندر کی مچھلیاں بھی نیست و نابود کر دی جائیں گی "-

مگر اسرائیلیوں کے حاکم نشۂ دولت سے سرشار اور فسق و فجور سے مخمور تھے - نہ رعایا پر اثر ہوا نہ حاکموں کی عقل درست ہوئی - بت پرستی اور بدکاری کا زور بڑھتا ہی گیا - یہاں تک کہ ۷۲۲ قبل مسیح میں نینوا کے بادشاہ سارگون دوم نے شمالی حکومت کے دارالسلطنت سامرہ پر قبضہ کر لیا - یربعام کی بنائی ہوئی ریاست جو فلسطین کا باغ کہلاتی تھی نینوا کا ایک صوبہ ہو گئی اور فرزندان یعقوب کے محلات میں بابل اور اسوریا کے سپاہیوں نے بود و باش اختیار کی ع تصرف زاغ نے پایا ہما کے آشیانے پر -

بنی اسرائیل کے دس قبیلے جو یہاں آباد تھے جلاوطن کیے گئے اور دریائے فرات کے اُس پار مختلف دیہات میں بسائے گئے - وہ ایسی سخت مصیبت، تباہی اور گمنامی میں گرفتار رہے کہ اُن میں سے دو اسباط کا اس وقت تک پردۂ عالم پر سراغ نہیں مل سکا - نہ یہ پتہ ہے کہ وہ کن اضلاع میں آباد کیے گئے تھے نہ یہ خبر ہے کہ ان کی نسل باقی رہی یا نہیں -

---

جنوبی ریاست وسعت اور زرخیزی میں جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے اپنے حریف سے کمتر تھی اُس کا مختصر رقبہ ایک طرف ریگستان اور دوسری سمت بحیرۂ روم سے گھرا ہوا تھا - افرائیم اور دان کے علاقے شمالی سرحد تھے اور جنوب میں ایدومی - عمالقہ اور موآبیوں کی حکومتیں تھیں لیکن یروشلم کا مقدس شہر اس حکومت کے زیرنگیں تھا اور وہ متبرک عبادت خانہ اسی حصہ میں واقع تھا جس میں تابوت سکینہ محفوظ تھا - لہذا عزت و توقیر میں یہ چھوٹی ریاست اپنے زبردست ہمسایوں سے بالاتر تھی اور تمام دنیاء توحید کی نظر میں اس ملک کے فرماں رواکی خاص وقعت تھی -

رحبعام بن سلیمانؑ کی ماں عمونی نسل کی تھی اور اپنے محترم شوہر کی حیرت انگیز رواداری سے ناجائز فائدہ اُٹھاکر آبائی مذہب پر قائم رہی تھی - اُس کا فرزند یروشلم کا بادشاہ ہوا تو اپنی ماں کے دیوتاؤں کی طرف نظر التفات سے دیکھنے لگا - ہر عیب کہ سلطاں بپسندد ہنر است - اصنام کی پرستش مضافات شہر اور کوہستان کی چوٹیوں پر ہونے لگی - بدکاری اور فسق کا آغاز ہوا - عمرانیات کے مسلمہ اصول کے مطابق مذہبی سلطنت میں پابندی شریعت کے ساتھ ملکی تنزل شروع ہوا -

شمالی سلطنت سے جنگ و جدال کا سلسلہ جاری ہی تھا - کارآزمودہ سپاہی اُدھر پھنسے ہوئے تھے

[redacted]

کہ اس بدنصیب بادشاہ کے پانچویں سنہ جلوس میں فرعونِ مصر نے کنعان پر حملہ کر دیا۔ اور بڑھتا ہوا یروشلیم تک پہونچ گیا۔ یہود میں مقابلہ اور مجادلہ کا دَم نہ تھا۔ فرعون بغیر کسی مزاحمت کے شاہی محل بلکہ مقدس ہیکل کے حدود تک پہونچ گیا۔ شاہی خزانوں کا ایک حصہ لوٹ لیا۔ اور ہیکل کے دروازے پر جو سونے کی ڈھالیں حضرت سلیمان نے نصب کی تھیں اُتار کر دوسرے مالِ غنیمت کے ساتھ مصر لے گیا۔

یہ پہلی دست درازی تھی جو مقدس عبادت گاہ کے مال و زر پر کی گئی۔ حالانکہ اس متبرک مکان کے برگزیدہ معمار کی وفات کو صرف پانچ ہی سال گزرے تھے۔

رحبعام نے اپنی ذلت مٹانے کے لیے پیتل کی ڈھالیں ہیکل کے دروازے پر نصب کیں گویا آبنوس میں چیر کی پچڑ لگائی لیکن بد اعمالیوں سے باز نہ آیا اور ملکی قوت کو زوال ہی ہوتا گیا۔ البتہ اُس کا پوتا آسا جو تقریباً ۴۱ سال تک تختِ سلطنت پر جلوہ افروز رہا پرہیزگار، دانشمند اور خدا ترس تھا۔ اُس نے شہر کے گرد و نواح سے صنم خانے دُور کرائے رعایا کو خدائے وحدہٗ لاشریک کی عبادت پر مجبور کیا بلکہ اپنی ماں کو بھی اس قصور پر رُتبہ سے گرا دیا کہ اُس نے ایک نفرت انگیز بت بنایا تھا اور اُس کی پرستش سے باز نہ آئی تھی۔ اُس نے کثیر مقدار میں زر و جواہر، ظروفِ طلائی وغیرہ ہیکل کی نذر کیے اور عبادت گاہ کی شان و شوکت بڑھائی نئے نئے شہر غیر محفوظ علاقوں میں بسائے۔ اور اُن کی حفاظت کے لیے فصیلیں اور برجیاں تیار کرائیں۔ فوج کو آراستہ کیا اور باپ دادا کی کھوئی ہوئی عزت دوبارہ حاصل کرنے کی سعی بلیغ کی۔

اُس کا فرزند یہوسفط اپنے باپ سے بھی زیادہ مستعد اور قابل ثابت ہوا۔ اُس نے حکومت کے رقبہ کو وسعت دی۔ جدید قلعے تعمیر کرائے اور اجناس کے انبار ملک کے ہر گوشے میں فراہم کر دیے۔ اُس کی دانشمندی اور شجاعت کی شہرت مشرق میں پھیلی۔ ہمسایہ سلطنتوں پر اُس کا رعب قائم ہوا۔ فلستیوں اور ادومیوں نے خراج دیا۔ آخر کار شمال کے بادشاہ اخی اب نے اُس سے صلح کر کے وہ طویل لڑائی ختم کی جو رحبعام کے وقت سے شمالی اور جنوبی حکومتوں کے درمیان جاری تھی۔ اور جس سے فریقین کو سخت نقصانات پہونچے تھے۔

جنوب کے ولی عہد یہورام کی شادی شمال کی شہزادی سے کی گئی اور اس طرح دونوں سلطنتوں میں رشتۂ اخوت مستحکم کیا گیا۔ لیکن یہ ولی عہد بادشاہ ہوا تو باپ کی نیکنامی پر پانی پھیر دیا۔ شمالی ریاست کی مشہور عالم سفاک ملکہ جزبیل کی لڑکی عتلیا سے اُس نے شادی کی جو اپنی ماں کی طرح بعل کی پرستش کرتی اور موحدوں سے عناد رکھنا جزوِ مذہب تصور کرتی تھی۔ بادشاہ نے ملکہ کے اثر سے اپنے آبا و اجداد کے خدا کو ترک کیا۔ بعل کی عبادت یروشلیم کے مقدس شہر میں ہونے لگی۔ شرفا بدکار ہوئے اور رعایا گمراہ۔ عیش و عشرت کا بازار گرم ہوا،

اور فوجی طاقت سرد۔

موقع محل دیکھ کر ادومیوں نے بغاوت کی اور اپنی خودمختار حکومت جداگانہ قائم کرلی۔ فلستیوں اور بادیہ عربوں نے کنعان کے خلاف ہتھیار اٹھائے۔ یروشلم تک پہونچ کر شاہی محلات کے خزانے لوٹ لیے اور بادشاہ کی بیویوں اور بچوں کو قید کرکے اپنے دیس لے گئے۔ صرف ایک بچہ اخزیاہ نام اور اُسکی بہن عتلیاہ گرفتاری سے محفوظ رہے جنکے تصرف میں یروشلم کی حکومت آئی۔ فتنہ و فساد اور خونریزی اور سیہ کاری کی دھوم مچی۔ اور سلطنت کی حالت بد سے بدتر ہوگئی۔

اخزیاہ اور اُسکے جانشینوں کے کارنامے دیکھنا ہو تو صحیفہ "تواریخ" کی ورق گردانی کی جائے ہم کو اس داستان کی تفصیل سے مطلب نہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ آحز کے عہد میں جو ۷۴۳ قبل مسیح میں حضرت سلیمانؑ کے تخت پر بیٹھا۔ سلطنت کی کمزوری انتہائی درجے پر پہونچ چکی تھی۔ ادومیوں نے کنعان پر حملہ کیا اور بیشمار قیدی پکڑ لے گئے۔ فلستیوں نے بعض مغربی شہروں پر قبضہ کرلیا۔ شمالی سلطنت کے بادشاہ نے شام کے حاکم سے سازکرکے یروشلم پر چڑھائی کی اور ایلات کے مستحکم بندرگاہ پر قبضہ کرکے اغیار کی چھاؤنی کنعان کے ایک گوشہ میں قائم کردی۔ روزروز کی نئی مصیبتوں سے تنگ آکر اور اپنے ہمسایوں کی غارت گری سے نجات پانے کے لیے آحز نے نینوا کے بت پرست بادشاہ سے امداد طلب کی۔ نذرانہ کے لیے ہیکل سلیمانی اور محلات شاہی سے سونا چاندی اُتار کر بادشاہ یہود کے قاصد نینوا کے دربار میں حاضر ہوئے۔ وہاں کا بادشاہ کنعان کے خزانوں پر دست تصرف دراز کرنے کے لیے موقع کا منتظر تھا۔ گدھ نے چڑیوں کی دعوت قبول کی اور شام کے دارالحکومت دمشق پر حملہ کردیا۔ دمشق فتح ہوا۔ وہاں کا حاکم قتل کیا گیا۔ اور شمالی سلطنت کا بازو ٹوٹ گیا۔ آحز اپنے ناصر و معاون سے ملاقات کرنے دمشق گیا۔ وہاں نینوا والوں کی خوبصورت قربان گاہ دیکھکر یہ تجویز ٹھہرائی کہ ایسا ہی معبد ہیکل سلیمانی کے سامنے بنوایا جائے۔ چنانچہ یروشلم واپس آنے کے بعد اُسی نمونہ کی عمارت ہیکل سلیمانی کے دروازہ پر بنوائی گئی اور دمشق کے دیوتاؤں کے لیے قربانیاں کی گئیں۔ جنوبی سلطنت کو سخت کمزوری کی مصیبت میں چھوڑکر آحز دنیا سے رخصت ہوا مگر اُسکے جانشین حزقیاہ نے مملکت میں اصلاح کی کوشش کی۔ خدائے واحد کی عبادت کا شوق دلایا۔ اور نینوا کے بادشاہ کو جو خراج کی رقم اُس کے باپ نے دینا منظور کی تھی یکقلم موقوف کردی۔

نینوا کی سلطنت اسوقت عروج وکمال کے اعلیٰ منازل پر تھی۔ اور بنی اسرائیل کی شمالی حکومت کو اپنا باجگزار صوبہ بنا چکی تھی وہ یروشلم کی بغاوت کیونکر برداشت کرتی۔ اس ملک کے صاحب داد

عیلام بادشاہ سنحاریب نے کنعان پر فوج کشی کی۔ حزقیاہ نے پہلے تو زر و جواہر دے کر یہ بلا ٹالنا چاہی لیکن بعد کو اپنی عزت سنبھالنے کے لیے مصر کے بادشاہ سے اعانت کا خواستگار ہوا۔ جاسوسوں نے یہ خبر سنحاریب تک پہونچائی تو اُس کے غصہ کی کوئی حد نہ رہی۔ وہ ٹڈی دل فوج لیکر ارض کنعان میں داخل ہوا۔ اپنے نہایت زبردست جنرلوں کی سرکردگی میں یروشلم کا محاصرہ کرلیا اور یہودیوں کی زندگی تلخ کردی۔

مصر سے امداد نہ پہونچی اور کوئی صورت بچاؤ کی نظر نہ آئی تو بادشاہ نے اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے اور ٹاٹ اوڑھ کر بصد عجز و نیاز ہیکل سلیمانی میں آہ و زاری کے لیے حاضر ہوا۔

شہ چو عجزِ آں ضعیفاں را بدید　　پا برہنہ جانب مسجد دوید
اے ہمیشہ حاجت ما را پناہ　　بار دیگر ما غلط کردیم راہ

اس زمانہ کے نبی حضرت اشعیاہ نے بشارت دی کہ

"سنحاریب اس شہر میں آنے یا یہاں تیر چلانے نہ پائے گا۔ وہ نہ تو سپر لیکر اسکے سامنے آئے گا اور نہ اسکے مقابل دمدمہ باندھے گا۔ بلکہ جس راہ سے آیا اُسی راہ سے لوٹ جائے گا"

تمام رعایا مضطرب الحال تھی اور اس بلائے ناگہانی سے دفعیہ کی کوئی صورت ظاہر نہ تھی۔ مگر پیغمبر کی پیشین گوئی پوری ہوئی۔ اُسی رات کو نینوا کی فوج میں جو یروشلم کے گرد خیمہ زن تھی ایسی سخت وبا پھیلی کہ ہزاروں سپاہی چند ساعتوں میں ہلاک ہوگئے۔ صبح کو شہر والوں نے فصیل سے جھانکا تو ہر طرف لاشیں ہی لاشیں نظر آتی تھیں اور بادشاہ سنحاریب مع اپنے باقیماندہ لشکریوں کے خوفزدہ ہوکر فرار ہوچکا تھا۔

سنحاریب یروشلم سے بھاگ کر نینوا پہونچا اور وہاں مندر میں اپنے ہی لڑکوں کے ہاتھ سے قتل ہوا۔ اسکی موت کے بعد نینوا کی طاقت پر زوال آیا اور وہ زبردست قوم برسرِ اقتدار ہوئی جسکو کاتب ازل نے یروشلم کی تباہی و بربادی کے لیے نامزد کر رکھا تھا۔

کردستان کے اضلاع سے کالدانیوں کے جنگجو قبیلے آندھی کے بگولے کی طرح اُٹھے۔ نینوا کو تاراج کیا اور ایک عظیم الشان سلطنت قائم کی جس کا پایۂ تخت بابل تھا۔ اور شمالی سلطنتِ اسرائیل کو تباہ کرنے والا نینوا اس کا ایک مختصر صوبہ ہ۔

بابل کے پہلے بادشاہ نے کنعان سے دوستانہ مراسم قائم کرنے کے لیے اپنے قاصد شاہ یہودہ کے پاس بھیجے۔ حزقیاہ نے نادانی سے یروشلم کے مخفی خزانے قاصدوں کو دکھا دیے۔ اشعیا نبی کو خبر ہوئی تو وہ بہت آزردہ ہوئے اور فرمایا۔

"اے حزقیاہ رب الافواج کا کلام سُن لے۔ دیکھ وہ دن آتے ہیں کہ سب کچھ جو تیرے گھر میں ہے اور جو کچھ تیرے باپ دادا نے آج تک جمع کر کے رکھا ہے بابل کو لیجائیں گے۔ خداوند فرماتا ہے کہ کچھ بھی باقی نہ رہیگا۔ اور وہ تیری ان اولاد کو بھی گرفتار کر کے لیجائیں گے۔ تاکہ شاہ بابل کے محلات میں خواجہ سرا بنائے جائیں"۔

بادشاہ اس خطرناک پیشین گوئی سے بہت رنجیدہ ہوا لیکن نبیؑ کے اعزاز و اکرام میں کوتاہی نہیں کی اور اپنا وقت امن و سلامتی میں پورا کر دیا۔ اُس کے جانشین منسّی نے جو بارہ برس کی عمر میں مسند حکومت پر بیٹھا تھا حضرت اشعیا کو بیدردی سے قتل کرا دیا۔ اور ملک میں دوبارہ اصنام پرستی کو رواج دیا۔ ارمیا نبیؑ نے خبر دی کہ منسّی بن حزقیاہ کے مظالم کی پاداش میں یروشلم پر سخت تباہی آئے گی۔

"خداوند فرماتا ہے کہ میں تجھکو تیرے لیے اور تیرے سب دوستوں کے لیے دہشت کا باعث بناؤنگا۔ تم سب دشمنوں کی تلوار سے قتل ہو گے اور میں تمام یہود کو شاہ بابل کے حوالہ کر دونگا جو تم کو اسیر کر کے بابل لے جائے گا یا تلوار سے قتل کریگا۔ اس شہر کی ساری دولت اور اسکے تمام محاصل اور بادشاہی خزانے دشمنوں کے حوالے کر دوں گا۔ جو انکو لوٹیں گے اور بابل لیجائینگے۔ یروشلم سامرہ کی طرح ویران ہوگا۔ اور اس طرح دھویا جائے گا جس طرح برتن مانجھے جاتے ہیں"

اس قسم کی پیشین گوئیوں کی سزا میں ارمیاؑ کو قید خانہ کی زندگی نصیب ہوئی۔ لیکن اُنکے قول کا ہر لفظ پورا ہوا اور غضب خداوندی کے ظہور کا سامان یوں ہوا کہ فرعون مصر نے جس کی حکومت اسوقت جنوب میں معراج کمال پر تھی، بابل کی روز افزوں شوکت و قوت مٹانے کے لیے شمال کی طرف پیش قدمی کی۔ شاہِ یہود غلطی سے مزاحم ہوا۔ فرعون کو کنعان سے جنگ منظور نہ تھی وہ اس ملک سے صرف راستہ مانگتا تھا لیکن زمانہ حال کے بلجیم کی طرح شاہ یہود نے منظور نہ کیا۔ مصر و کنعان سے لڑائی شروع ہو گئی۔ ہاتھی اور مچھر کا مقابلہ تھا۔ یہود کو شکست ہوئی۔ بادشاہ قتل ہوا۔ فرعون نے تاوان جنگ وصول کر کے ایک شہزادہ کو تخت پر بٹھا دیا۔ اور آگے بڑھ کر بابل کی سرحد تک پہونچا۔ دریائے فرات پر قارقمیز کی مشہور لڑائی میں بابل کے سپہ سالار و ولیعہد بخت نصر نے فرعونیوں کو ایسی شکست دی کہ دریائے نیل سے فرات تک کے کل صوبے مصر کے ہاتھ سے نکل گئے۔ اور فرعون ہزار خرابی اپنے ملک کو واپس پہونچا۔ اب بابل کو توسیع فتوحات کا شوق ہوا۔ اُس نے جنوب کی طرف قدم بڑھایا تو پھر کنعان درمیان میں حائل تھا۔ بادشاہ یہود نے کھو کر بھی نہ سیکھا اور اپنی طاقت کا غلط اندازہ کر کے اس بلائے آسمانی سے مقابلہ کی ہمت کی۔ جنگ کا نتیجہ ظاہر تھا۔ تاوان دینا پڑا اور بھاری ٹیکس ارض کنعان پر لگا دیا گیا۔ یہ خراج تین سال تک بمشکل ادا ہوا۔ مگر چوتھے

سال اس کی فراہمی نہ ہوسکی۔ یہ کوتاہی بغاوت کے مرادف قرار پائی اور بخت نصر نے کنعان پر حملہ کردیا۔ یروشلم کا محاصرہ ہوا۔ فوج کی کمان بخت نصر کے تجربہ کار سپہ سالار کے ہاتھ میں تھی۔ یہود کا بدنصیب بادشاہ عاجزی سے صلح کا خواستگار ہوا اور اپنے اعزہ اور رفقاء کو ساتھ لیکر بغداد کے مستعصم باللہ کی طرح دشمن کے خیمے میں امان مانگنے چلا گیا ع موت کے منہ میں مری جان چلا آپ سے تو۔ جنگ خود بخود ختم ہوگئی۔ بخت نصر نے عبادت خانۂ سلیمانی اور شاہی محل کے خزانے لوٹ لیے اور یروشلم سے دس ہزار قیدی لیکر اپنے ملک کی طرف واپس ہوا۔ ان قیدیوں میں بادشاہ، اُسکے خاندان والے، تمام اشراف اور اعیانِ ریاست تھے۔ مظلوم بادشاہ کے پیروں میں بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ یہ دردناک واقعہ ۵۹۷ق م کا ہے۔ کنعان کی حکومت شہزادہ صدقیاہ کے سپرد کی گئی اور سالانہ خراج کی رقم مقرر ہوئی۔ یہ بداقبال بادشاہ ۲۱ سال کی عمر میں اپنے آبا و اجداد کی تباہ شدہ سلطنت پر شاہ بابل کے باجگزار کی حیثیت سے متصرف ہوا۔ اُسکے کلیجہ میں ذلت اور رسوائی سے ناسور پڑے تھے۔ تلوار بابل کے ساتھ تھی اور دل اُسکے خلاف۔ خفیہ طور پر فرعون سے نامہ و پیام کرنے لگا۔ ارمیاہ نبی نے فہمائش کی۔ بغاوت اور سرکشی سے منع کیا لیکن نوشتۂ تقدیر مٹ نہ سکتا تھا۔ بادشاہ نے فرعون مصر سے معاہدہ کرلیا اور اپنے جلوس کے نویں برس خراج کی رقم موقوف کرکے کامرانیوں سے بغاوت کا اعلان کردیا۔

بابل کی چھاونیاں جگہ جگہ قائم تھیں اور زبردست فوجیں شام میں موجود تھیں اُنھوں نے فوراً دھاوا کردیا۔ اور یروشلم کا محاصرہ کرلیا۔ مصر نے امداد کی کوشش کی لیکن وہ بے سود ثابت ہوئی۔ اٹھارہ مہینے محاصرہ رہا اور مصیبتوں کے بادل دن بدن گہرے ہی ہوتے گئے۔ شہر میں قحط پڑا اور ماں باپ بچوں کو بھون بھون کر کھانے لگے۔ شہر پناہ میں رخنہ ہوگیا اور لوگوں نے بھاگ بھاگ کر بیابان کی راہ لی۔ بادشاہ صدقیاہ نے بھی مع اپنے اعزہ کے شہر سے فرار ہونے کی کوشش کی لیکن وہ مع دوسرے بھاگنے والوں کے تھوڑے ہی فاصلہ پر گرفتار کرلیا گیا اور شاہ بابل کے حضور میں پیش ہوا۔ بخت نصر نے صدقیاہ کے بیٹوں کو اُس کی آنکھوں کے سامنے ذبح کیا اور یہود کے سب امراء و شرفا کو قتل کرکے صدقیاہ کی آنکھیں نکال ڈالیں۔ اور اُس کو زنجیروں سے جکڑ کر بابل لے گئے۔

اب بابل کی خون آشام فوج یروشلم کی فصیل توڑ کر شہر میں داخل ہوئی۔ ہیکل سلیمانی میں آگ لگادی ہیکل کے ستون اور حوض جو خداوند کے گھر میں تھے توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کیے، شاہی محلات اور تمام عالیشان عمارتیں مسمار کردیں اور جس قدر زر و جواہر شہر میں دستیاب ہوسکا لوٹ لیا۔ ساری مملکت کی رعایا لونڈی غلام بنائی گئی اور یروشلم کا مقدس شہر بے چراغ ہوا۔ صرف کنگالوں اور زراعت پیشہ لوگوں کو چھوڑکر

کنعان کی تمام شریف آبادی بابل میں غلامی کی مصیبت اُٹھانے کے لیے بھیج دی گئی۔ ارمیا نبی قیدخانہ میں تھے اور بابلیوں کو معلوم ہوگیا تھا کہ اُنھوں نے بغاوت سے مخالفت کی تھی۔ اسی لیے وہ غلامی کی ذلت سے محفوظ رہے۔ اُنھوں نے اس مقدس شہر کی بربادی پر ایک دردناک مرثیہ کہا جو آج تک عہدنامۂ عتیق میں "نوحہ" کے عنوان سے موجود ہے۔ اس کے چند مصرعوں کا ترجمہ بطور نمونہ کے درج کیا جاتا ہے :-

وہ بستی جو خلقت سے معمور تھی کیسی خالی پڑی ہے۔
وہ خاتون اقوام بیوہ سی ہو گئی۔
وہ رات کو زار زار روتی ہے، اُس کے آنسو رخساروں پر بہتے ہیں۔
اس کے سب پھاٹک سنسان ہیں، اس کے کاہن آہیں بھرتے ہیں۔"
اس کی کنواریاں مصیبت زدہ ہیں اور وہ خود غمگین ہے۔
اس کی اولاد کو دشمن اسیری میں ہانک لے گئے۔
دختر صیون کی سب شان و شوکت جاتی رہی۔

. . . .

خداوند نے اپنے قہر میں دختر صیون کو کیسا بادل سے چھپا دیا؟
اس نے اسرائیل کے جمال کو آسمان سے زمین پر گرا دیا۔
اس نے اپنے قہر میں دختر یہوداہ کے تمام قلعے گرا کر خاک میں ملا دیے۔
اس نے فصیل و دیوار کو مغموم کیا۔ وہ باہم ماتم کرتی ہیں۔

. . . .

میری آنکھیں روتے روتے دھندلا گئیں، میرے اندر پیچ و تاب ہے۔
میری دختر قوم کی بربادی کے باعث میرا کلیجہ نکل آیا۔
کیونکہ چھوٹے بچے اور شیرخوار شہر کے کوچوں میں بے ہوش ہیں۔

. . . .

سونا کیسا بے آب ہو گیا۔ کندن کیسا بدل گیا۔
مقدس پتھر تمام گلی کوچوں میں پڑے ہیں۔
شیرخوار کی زبان پیاس کے مارے تالو سے جا لگی۔

"بچے روٹی مانگتے ہیں لیکن ان کو کوئی نہیں دیتا۔
"جو ناز پروردہ تھے گلیوں میں تباہ حال ہیں۔
جو بچپن سے ارغوان پوش تھے مزبلوں پر پڑے ہیں
ان کا چمڑا ہڈیوں سے سٹا ہے وہ سوکھ کر لکڑی سا ہو گیا۔

....

اے خداوند! جو کچھ ہم پر گزرا اُسے یاد کر
ہمارے گھر بیگانوں نے لے لیے
ہم یتیم ہیں ہمارے باپ نہیں
ہم نے اپنا پانی مول لے کر پیا
اپنی لکڑی بھی ہم نے دام دے کر لی
غلام ہم پر حکمرانی کرتے ہیں
ان کے ہاتھ سے چھڑانے والا کوئی نہیں
انھوں نے صیون میں عورتوں کو بے حرمت کیا
اور یہوداہ کے شہروں میں کنواری لڑکیوں کو۔
بزرگوں کی رو داری نہ کی گئی
جوانوں نے چکی پیسی
اور بچوں نے گرتے پڑتے لکڑیاں ڈھوئیں
ہمارا رقص ماتم سے بدل گیا
تاج ہمارے سر پر سے گر پڑا
کوہِ صیون کی ویرانی کے باعث۔
اس پر گیدڑ پھرتے ہیں
پر تو خداوند ابد تک قائم ہے
پھر تو کیوں ہم کو ہمیشہ کے لیے فراموش کرتا ہے
ہمارے دن بدل دے جیسے قدیم سے تھے
کیا تو نے ہم کو بالکل رد کر دیا؟

پندار

(جناب مسٹر سلطان حیدر جوش (علیگ) ڈپٹی کلکٹر)

I

پنڈت ہردے نرائن در، سچ پوچھیے تو بی۔اے۔ کی ڈگری لینے سے پیشتر ہی ایک بیوی کو سپرد گنگاجی کر چکے تھے، جس بیچاری نے اپنی کوئی یادگار انسانی شکل میں ہردے نرائن کے گھر میں نہیں چھوڑی تھی! اُن کے والد بزرگوار نے بی۔اے۔ کی تکمیل کے بعد ہی، آئی۔سی۔ایس، کے حصول کے لیے ان کو ولایت بھیجنے میں محض مفارقت ہی گوارا نہیں کی بلکہ اپنے تمام سرمایہ کو ہردے سے عزیز نہیں رکھا! ہردے نرائن در بی۔اے۔ جب انگلستان میں پہونچے تو نوجوان تھے، بیوی کے طوق سے گلو خلاصی حاصل کر چکے تھے، اور آج نہیں تو کل آئی۔سی۔ایس ہونے والے تھے! آئی۔سی۔ایس کی ڈگری، انگلستان کے طبقۂ نازک پر عموماً وہی عمل کرتی ہے جو مقناطیس لوہے پر۔ یا شمع پروانہ پر! جس قدر حصول مقصد میں بتدریج آگے بڑھتے جاتے تھے اُسی قدر اُن کو یہ علم بھی ہوتا جاتا تھا کہ وہ طبقۂ ناز کے متلاشیِ زوج افراد میں بڑی للچائی ہوئی نظروں سے دیکھے جاتے ہیں: مختصراً، اُن کو بی۔اے۔ سے آئی۔سی۔ایس بننے میں نام و نشان، شکل و صورت، عادات و اطوار، غرض ہر اعتبار سے بہت کچھ قطع و برید۔ یا تبادلہ و اضافہ کرنا پڑا۔ گھنی دار اور سیاہ مونچھیں ناموافقت آب و ہوا کے بدولت ہوا ہو گئیں: پنڈت کے لقب نے مسٹر کا جنم لے لیا: ہردے نرائن کو اختصار نے محض ایچ۔ان۔ بنا دیا: بی۔اے۔ مٹے، آئی۔سی۔ایس سے مرعوب ہو کر کنارہ کیا اور ساتھ چھوڑ جانے والی بیوی کی جگہ مس نائنا وڈ نے سنبھالی! قصہ مختصر پنڈت ہردے نرائن جب جہاز سے بمبئی میں اُترے تو سرے پیر تک مسٹر در۔ آئی۔سی۔ایس، تھے اور اُنکی آغوشِ محبت میں مس نائنا وڈ، مسز در کی صورت میں شریکِ زندگی تھیں!

یہ اسسٹنٹ کلکٹر ہوئے، جوائنٹ مجسٹریٹ بنے اور بالآخر ڈسٹرکٹ جج بنے۔ لیکن ان کے والد بزرگوار جو دراصل دقیانوسی تراش و خراش کے پنڈت تھے ان کی انتہائی آزاد خیالی کی تاب نہ لا سکے اور چند ہی سال میں انکا ساتھ چھوڑ کر کسی بہتر قالب میں تبدیل ہیئت کر گئے! کہا جاتا ہے کہ انکو بسترِ مرگ پر بھی کوئی خلش تھی تو صرف ہردے کی آزاد خیالی اور مغربی بیوی کی، مگر مسٹر در پر اُس خلش آخری کا بھی کوئی اثر مرتب نہیں ہوا! یہ چشم بد دور مسٹر در آئی۔سی۔ایس ہی رہے! اس میں شک نہیں کہ اس زمانہ میں آئی۔

سی۔ ایس کا نشان امتیاز رکھنے والے افراد ہندوستان کے طول و عرض میں محض انگلیوں پر گنے جانے کی حد تک محدود تھے اور اسی وجہ سے اُن گنے چُنے افراد کی زیادہ تعداد فخر و مباہات کو خود بینی کی حد تک روا رکھتی تھی! مسٹر در بھی اس لحاظ سے اُسی بڑی تعداد میں آ گئے تھے اور ان کا شمار مستثنیات میں نہ تھا!

مس اُناوڈ جو اپنے آپ کو اُناور لکھتی تھیں انگلستان سے رخصت ہونے کے وقت مسٹر در کو تموّل کے اعتبار سے خدا جانے کیا کچھ تصور کرتی تھیں! ہندوستان کی گرم آب و ہوا میں کالے اور گورے کا بیّن فرق اُن کی آنکھیں بھی دیکھنے لگیں مگر مسٹر در کا سرشارِ محبت ہونا اُس امتیازِ رنگ کی تلافی معقول حد تک کرتا رہا! بعض اوقات خود مسٹر در کا دماغ بھی یہ احتمال پیدا کیا کرتا کہ ان کی ذات کو ہندوستان کے یورپین احباب میں، با وجود آئی۔ سی۔ ایس ہونے کے، وہ مساوات آمیز بے تکلفی نصیب نہیں جو اُن کی بیوی کو تھی، مگر پھر بھی ترقی مدارج کے نازک موقعوں پر اُنا کا غیر معمولی حد تک مفید و کارآمد ہونا ایک ایسی خوبی تھی جو کسی طرح نظر انداز نہیں کی جا سکتی تھی! مسٹر اور مسز در بہرحال نہایت بے فکری کی زندگی بسر کرتے رہے! زمانے نے بھی ان کے تعلقات باہمی کو تین اولادوں کی صورت میں اور زیادہ جکڑ دیا اور شباب کا بہ یک چشم زدن ہوا ہو جانے والا زمانہ پوری فارغ البالی کے ساتھ گزرتا رہا! اس میں کلام نہیں کہ مصورِ حقیقی نے اولاد عطا کرنے کے وقت ہمیشہ صنفِ حسین کا ساںچا ہی استعمال فرمایا! تاہم تینوں لڑکیوں کا نوک پلک سے دلآویز حد تک درست ہونا بھی بجائے خود نہایت اطمینان بخش اور اُمید افزا تھا!

مسٹر در کا شباب صبح کی چاء کے ساتھ صحیفۂ پانیر کی باقاعدہ تلاوت میں، ججی کی بلند کرسی سے سربرآوردہ وکلا اور بیرسٹروں کی بڑی بڑی۔ اور بعض اوقات چکنی اور ملائمت شفاف۔ کھوپڑیوں کے مشاہدے میں، کلب کی سرور انگیز صحبتوں میں، اور پیاری اُنا کی کلفت زدا دل آویزی کے احساس میں، دیکھتے ہی دیکھتے ختم ہو گیا! مسز در نے اپنے نرم و نازک رخساروں پر جھرّیاں پیدا کرنے میں جو حصۂ عمر تلف کیا وہ نت نئی اور قیمتی پوشاکیں زیب تن کرنے کے ساتھ ہی مسٹر در کو معتقدات مذہبی سے یک لخت آزاد کرنے میں بھی صرف ہوا۔ اور ہاں! کسی قدر اس میں بھی صرف ہوا کہ تینوں صاحبزادیاں مسز در کے خاطر خواہ تعلیم و تربیت یافتہ ہوں! سوشیلا، سرلا اور کملا کے نام اگرچہ بادی النظر میں تینوں لڑکیوں پر ہندو ہونے کا گمان پیدا کرتے تھے لیکن فی الحقیقت وہ ہندو مذہب سے اسی قدر دور۔ اور عیسائی مذہب سے اسی قدر قریب تھیں جس قدر اُن کی ماں! اُنکی تمام تعلیم و تربیت مسوری کے یورپین گرلز اسکول میں ہوئی تھی اور وہ لباس و طرزِ زندگی کے ہی لحاظ سے نہیں بلکہ اعتقادات و عمل کے اعتبار سے بھی عیسائی ہی کہی جا سکتی

نھیں! مذہبی معتقدات کی فہرست اول تو کشمیری
پنڈتوں میں خود ہی مختصر ہوتی ہے پھر یورپ کی تعلیم سے
پیدا ہونے والی آزاد خیالی اور مغربی بیوی کی دل و
دماغ پر حکمرانی، ان سب باتوں نے مسٹر در کو مذہب
جیسی فضول اور غیر ضروری چیز سے استغنا، مستغنی و
بے پروا بنا دیا تھا کہ لڑکیوں کا عیسائی بن جانا اُنکی
نگاہ میں کوئی قابل لحاظ بات نہ تھی! ان سب
باتوں کے ساتھ ہی اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا
کہ اُفتادِ طبع کے اعتبار سے ایک لڑکی باپ سے
بہت کچھ ملتی جلتی تھی تو ایک ماں سے۔ اور ایک،
ماں اور باپ کے رجحانِ طبائع اور پسند و نفرت کا
مجموعہ تھی! ہردے نرائن در۔ باوجود تغیرِ عظیم۔
ذہانت، طعن آمیز بذلہ سنجی، خودداری و توہم
کی عجیب معجون مرکب تھے اور نانا و ڈانقص العقل،
تنگ خیال، اور متلون مزاج تھی یا وہ مایوس ہوتی
تو اپنے آپ کو اختلاجِ قلب کا شکار تصور کرلیتی!
جب آفتابِ عمرِ شباب کے خطِ نصف النہار سے گزر
کر مائل بہ کہولت ہوا تو مسٹر اور مسز در کی عادات میں
پختگی و عاقبت اندیشی کی جھلک ایک حد تک پیدا
ہونے لگی، پیانو کے مشغلہ اور کلب کی تفریح میں تین
اختصار پیدا ہو چلا؛ اور بعض بعض اوقات ملازمت
کے اختتام کا خیال آنے لگا! مسز در جو شباب کے
عالم میں مشغلۂ دل اور مرجعِ جذباتِ لطیف تھیں،
گھر کی منتظم اور شریکِ رنج و راحت ہو چلیں، اور
مسٹر در پہلے سے زیادہ وقت اپنے کے مطالعہ اور

کتب بینی میں صرف کرنے لگے! تاہم آزاد خیالی یا
مذہب سے بیگانگی طبیعت ثانیہ کے طور پر مسٹر در کے
دماغ پر حاوی رہی! قصہ مختصر ملازمت کے آخری
دور میں پانچ سال متواتر علیگڑھ کے ڈسٹرکٹ جج
رہ کر مسٹر در کو با دلِ ناخواستہ ایک دن ججی کی کرسی
کو چھوڑنا پڑا! علیگڑھ کے قیام میں انھوں نے
جہاں اور انتظامات کیے، ایک نئی کوٹھی دہلی میں
تعمیر کرائی؛ ہردے نرائن کا اصلی وطن لاہور تھا
مگر خدا جانے کس وجہ سے انھوں نے اپنی بقیہ زندگی
کے لیے ہندوستان کے نئے دار السلطنت کو ترجیح دی!
یوں تو علیگڑھ کے حکام اعلیٰ - کالے ہوں یا گورے -
ایم۔ اے۔ او۔ کالج کے پروفیسروں یا نو زائیدہ مسلم
یونیورسٹی کے با اثر و گردن فراز عہدہ داروں کی صحبت
و دست برد سے کبھی محفوظ نہیں رہے مگر جج صاحب
موصوف بدرجۂ اولیٰ اس سے فیضیاب ہوے!
اُنکی ذہانت و بذلہ سنجی کی وجہ سے، یا کسی اور وجہ سے،
انگلستان کی ڈگری رکھنے والے پروفیسروں، سائنس
اور فلسفہ کے لکچراروں اور بی۔ اے۔ اور ایم۔ اے۔
کے طالب علموں کو جج صاحب کے خالی اوقات پر
بہت کچھ دسترس تھی! چند نوجوان لکچرار اور دو ایک
ممتاز و سربرآوردہ طلبا جج صاحب کی صحبت میں
گھنٹوں باتیں کرنے یا برج کھیلنے کی عزت روزانہ نہیں
تو دوسرے تیسرے حاصل کرتے رہتے تھے! اب اگر
سنہ ۱۹۱۸ء کے آخر میں جج صاحب کے پنشن لینے کے
موقع پر، کالج کے ٹرسٹیوں کی جماعت سے لیکر یونین کلب

تک، متواتر ایک ہفتہ جج صاحب کی رخصتی دعوتیں اور جلسے کالج کی دنیا میں ہوتے رہے تو چنداں تعجب خیز نہیں

حکومت سے سبکدوش ہونے کا ردِعمل ہوا یا مقتضائے سِن مسٹر در جب مستعفی ہو کر دہلی پہونچے اور کشمیری دروازہ والی کوٹھی میں۔ جس کا نام انھوں نے درِولا Dree Villa رکھا تھا مستقل طور پر آباد ہوئے تو دراصل اُس کی چہار دیواری میں مقید ہو گئے۔ اُن کا بہت زیادہ وقت لائبریری کے کمرے میں نذرِ کتب ہوتا تھا اور بہت کم باہر جانے کے علاوہ وہ بہت کم مسز در کی صحبت میں بیٹھ کر تفریحِ دماغ کی کوشش کیا کرتے تھے۔ مسز در کا مقصدِ حیات اب محض یہ تھا کہ وہ جلد سے جلد اپنی لڑکیوں کو پروان پڑھتے اور موٹی سے موٹی چڑیا کو پھانستے دیکھ سکیں اس دُھن کا علاج آس پاس کی کوٹھیوں میں آباد ہونے والے گھرانوں سے میل جول پیدا کرنا، اور تعلیم یافتہ و غیر شادی شدہ نوجوانوں کے متعلق اپنی معلومات میں خاطر خواہ اضافہ کرنا تھا۔

درولا سے کم و بیش ایک فرلانگ پر — یا بہ الفاظِ دیگر، دو کوٹھی پرے - ایک نوتعمیر شدہ اور بلند کوٹھی تھی جسکے احاطہ کے دروازہ پر نصب ہونے والا پتھر اس کا نام "نسیم منزل" ظاہر کرتا تھا - اس کوٹھی سے ملحق ایک اور چھوٹی کوٹھی تھی جس میں فی الحال ہرکشن گوہر اپنی بیوی اور لڑکی کے فروکش تھے!

ہرکشن گوہر اور مسٹر در سے بہت کچھ ربط ضبط تھا اور دونوں گھرانوں کی بیویاں اور لڑکیاں اکثر ایک دوسرے کی کوٹھی پر روزانہ جایا کرتی تھیں! مسز در ہرکشن گوہر کے ہاں جاتے ہوئے ہمیشہ نسیم منزل کے سامنے سے گزرتیں اور اکثر ایسی بلند و خوشنما عمارت کے خالی ہونے پر متحیر ہوتیں! "نسیم منزل" دراصل محمد نسیم بیرسٹر کی تعمیر کردہ کوٹھی تھی جو انھوں نے نہایت شوق کے ساتھ اپنے رہنے کے لیے بنائی تھی: کوٹھی کی تعمیر میں اُنکی ذاتی نگرانی مضمر تھی یہ جس قدر بنتی گئی وہ خود بگڑتے گئے، حتیٰ کہ تکمیلِ تعمیر کے دو ہفتہ کے اندر دنیائے فانی سے کنارہ کر گئے! اس حادثہ نے اُنکے پسماندگان کی نظر میں کوٹھی کی وقعت ہی نہیں زائل کر دی بلکہ اُسے منحوس بنا دیا اور اس لیے سب نے تہیہ کر لیا کہ بجائے خود آباد ہونے کے اُسے ذریعۂ آمدنی قرار دیا جائے! یہی وجہ تھی کہ وہ ایک معقول و متمول کرایہ دار کے انتظار میں ہر وقت چشم براہ تھی!

نومبر [illegible]ء کی ایک خوشگوار صبح نے مسٹر در کو غیر معمولی حد تک مسرور کیا کہ وہ لائبریری کی آرام کرسی کو چھوڑ کر پشت والے برآمدے میں نکل آئے۔ اور گملوں میں سے سر نکالنے والے ننھے ننھے پودوں میں غالباً مطالعۂ فطرت کی کوشش کرنے لگے! گلابی موسم کے ایک خنک اور دبے پاؤں آنے والے ہوا کے جھونکے نے چہرے، سر اور ہاتھوں پر خصوصاً اور بقیہ جسم پر عموماً دلربا سرور انگیز کسل دیا! پھر ہونا تھا کہ مسٹر در ہری بھری اور نازک پتیوں سے چھیڑ چھاڑ کرنے

لگے! یہ کبھی اس پتے پر چمکنے والے شبنم کے موتی کو
چھونے اور کبھی اُس پتی پر نظر آنے والے کالے
بھنگے کو جھاڑنے میں مصروف تھے کہ مسز ور اپنے چہرہ
اور لباس کی خدمتِ ضروری سے فراغت حاصل
کرکے اسی طرف نکل آئیں اور یہ کہتی ہوئی مسٹر ور
کی طرف بڑھیں (انگریزی میں) "میرے پیارے
مسٹر ور! تم نے سنا ہے کہ "نسیم منزل" کرایہ پر
اُٹھ گئی؟"

"نہیں۔ میں نے نہیں سُنا!" مسٹر ور نے جواب
دیا۔ گفتگو انگریزی میں ہو رہی تھی اُردو کا لباس
پہنانے کا ذمہ دار مصنف ہے!۔

"تمھیں معلوم ہے کہ کس نے اس کو لیا؟"
مسز ور نے پھر پوچھا۔ اور مسٹر ور نے اسکے جواب
میں پھر اپنی لاعلمی ایک بے رخی سے اور بغیر کسی دلچسپی کے ظاہر کی!

"تم سننا چاہتے ہو کہ اُس میں کون آرہا ہے"
مسز ور نے پھر کہا

"مجھے اس میں کوئی دلچسپی نہیں! البتہ تم
سنانا چاہتی ہو تو میں سننے کو تیار رہوں"۔

اسقدر رضامندی مسز ور کے اظہار خیالات
کے لیے کافی سے زیادہ ہمت افزائی تھی؛ وہ
بولیں "میرے پیارے! نسیم منزل میں ایک شریف
نوجوان غالباً مع اپنے اعزہ کے عنقریب آنیوالا ہے!
مسز گوہر کل رات کو آئی تھیں اور بتاتی تھیں کہ
پرسوں وہ تعلیم یافتہ نوجوان اپنے ملازمان کے ساتھ
ایک موٹر میں کوٹھی دیکھنے آیا تھا اور کھڑے کھڑے
دو سو روپے ماہوار پر اُس نے کوٹھی لے لی! کہا جاتا ہے
کہ وہ اسی ہفتہ میں آجائے گا"۔

مسٹر ور (ابھی تک پودوں کی طرف متوجہ) "وہ
کس طبقہ کا شخص ہے؟"

مسز ور "کہتے ہیں ایک متمول سوداگر ہے۔ اُس کی ایک
بڑی دوکان لاہور میں ہے اور ایک کراچی میں"

مسٹر ور (بغیر کسی دلچسپی کے) "شادی شدہ ہے؟"

"نہیں!" انتہائے شوق کے ساتھ مسز ور
نے جواب دیا "کنوارا ہے" "تعلیم یافتہ ہے" "نوجوان ہے" اور
بہت بڑے کاروبار والا ہے! اسی لیے تو مجھکو مسرت ہے!"

"مجھے اس میں مسرت کی کوئی وجہ نظر نہیں آئی"

"تعجب ہے! ہمارے گھر میں تین جوان لڑکیاں
ہوں اور ہم کو ایسے ہمسایہ سے مسرت نہ ہو"

مسٹر ور "(اب مسز ور کی طرف دیکھتے ہوئے)" گویا وہ
میری لڑکیوں کے ارادہ سے یہاں آرہا ہے؟"

مسز ور "تمھیں کیا ہوگیا ہے! ارادہ کیسا! محض
میری امید ہے کہ میری لڑکیوں کی تعلیم اور خوبیاں اسے
گرویدہ بنالیں گی اور خدا نے چاہا تو کوئی نہ کوئی
پروان چڑھ جائیگی! اسی لیے تو میں یہ بھی چاہتی ہوں
کہ تم جلد سے جلد اُس سے تعارف حاصل کرلو اور
ملنے جاؤ"۔

"مجھے افسوس ہے کہ میں ایسا نہ کرسکوں گا!
میرے پاس کوئی زائد وقت نہیں"۔

"کیا تمھیں اپنی اولاد کی خاطر اس قدر زحمت
کرنا بھی محال ہے؟" پژمردگی کے ساتھ مسز ور نے کہا

"مگر اس کی چنداں ضرورت نہیں" مسٹرورسنے جواب دیا "تم اور تمھاری لڑکیاں شوق سے اُس سے ملنے جائیں بلکہ بہتر ہوگا کہ تم بھی نہ جاؤ محض لڑکیوں کو ملنے دو۔ تمھارے جانے میں مجھے احتمال ہوتا ہے کہ وہ تم ہی کو پسند نہ کرلے۔ کیونکہ تمھاری کوئی لڑکی تمھارے حسن کو نہیں پہونچتی!"

"تمھاری نظروں میں میں اب بھی ایسی ہی ہونگی مگر وہ اس میں اپنے شباب سے پورے طور پر فائدہ اُٹھا سکیں۔ تینوں جوان کنواریاں ہوتے کون ماں اپنی جوانی اور حسن کو یاد کرسکتی یا اُس کا تاسف کرسکتی ہے۔ مجھے اب ہر دم انکے حسن و دلآویزی کی فکر ہے۔"

مسٹرور (مسکراتے ہوئے) "ایسی صورت میں خیر تم بھی جاسکتی ہو اور میں تحریری اجازت دیدونگا کہ وہ جس لڑکی کو چاہے شوق سے پسند کرلے، البتہ میں کسی قدر اپنی سرلا کی سفارش ضرور کروں گا۔"

مسزور "واہ! سرلا نہ سوشیلا کے برابر حسین اور نہ کملا کے برابر تیز و طرار، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم سرلا کو کس لیے ترجیح دیتے ہو!"

مسٹرور "یوں تو تمھاری سب لڑکیاں معمولی قسم کی اور کند ہیں مگر سرلا میں کسی قدر ذہانت و متانت کی جھلک ضرور ہے۔"

مسزور (نہایت پژمردہ چشم و ابروسے) "سخت افسوس ہے کہ تم اپنی اولاد کی خود ہجو کرو۔ پھر انکی کون قدر کرے گا؟ تمھیں میرے تنگ کرنے میں کچھ لطف آتا ہے۔ اور میرے ضعیف دل پر رحم نہیں آتا!"

مسٹرور "میری پیاری! تمھارا یہ خیال صحیح نہیں! میں کبھی تمھیں تنگ نہیں کرسکتا۔ تمھارا دل میری تمام توجہ کا مرکز ہے۔ اس قدر عرصہ تک تمھارے دل کے خوش رکھنے میں میں نے اپنے آرام و آسائش تک کو پس پشت ڈال دیا۔ مجھے تمھارے دل کی بے حد قدر ہے۔"

مسزور "تمھیں کیا خبر کہ میں اختلاج قلب میں کس درجہ مبتلا ہوں۔"

"پریشان نہ ہو" مسٹرورسنے جواب دیا "مجھے یقین ہے کہ تم اس مرض سے جلد نجات پاجاؤگی اور عرصہ دراز تک مالدار اور تعلیم یافتہ نوجوانوں کی قسمت کا فیصلہ کرنے دنیا میں باقی رہوگی!"

"مجھے ایسے نوجوانوں سے مطلب ہی کیا؟ اگر ایسے ایک درجن بھی ہمارے پڑوس میں آباد ہوں تو مجھے کیا، کیونکہ تم اُن سے ملنا ہی نہیں چاہتے۔"

"نہیں! میری پیاری!" مسٹرورسنے پھر کسی قدر شوخی کے ساتھ کہا "یقین مانو! اگر ایسے نوجوان ایک درجن کی تعداد میں پڑوس میں آباد کریں گے تو میں پھر اُن میں سے ایک ایک سے ملوں گا!"

مصر کے طریقۂ تعلیم پر ایک نظر

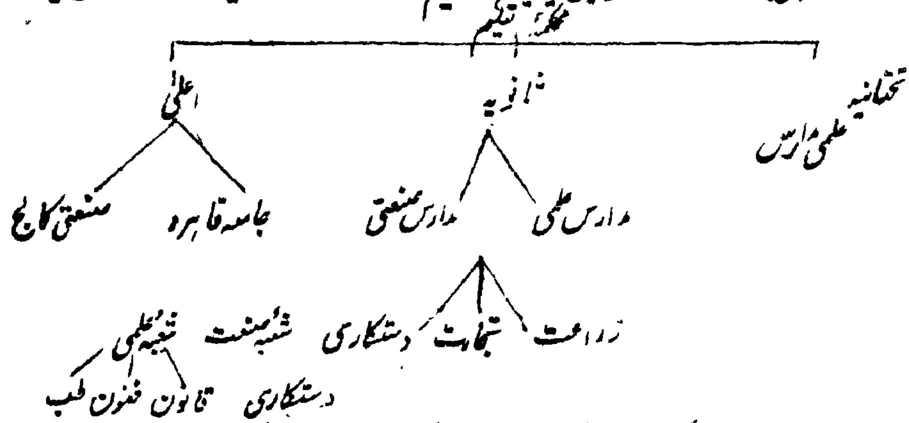
(جناب ریاض الدین احمد صاحب بی اے آنرس ایم اے بی ٹی (علیگ))

(یہ مضمون مسٹر اینی اسمتھ کے اُن خیالات پر مبنی ہے جن کا اظہار اُنھوں نے گذشتہ سال اپنے سفر مصر کے بعد کیا تھا)

مصر مسلمانوں کا ایک مرکز ہے۔ تعلیمی نقطۂ نظر سے ممالک مشرقی میں اس کی ایک خاص حیثیت ہے۔ یہاں کے تعلیمی حالات کے مطالعہ کے لیے یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ ہر ملک کے باشندوں کی طرح یہاں کے لوگ بھی طبقہ اعلیٰ و ادنیٰ میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں۔ اور سررشتۂ تعلیم نے علمی سہولتیں بھی بلحاظ ادنیٰ و اعلیٰ ہی قائم کی ہیں۔ طبقہ اعلیٰ کی تعلیم سرکاری مدارس میں حکومت کے زیر نگرانی ایک خاص محکمہ کے ماتحت دی جاتی ہے۔ عوام کی تعلیم کچھ عرصہ قبل تک کسی خاص اہمیت کی نظر سے نہیں دیکھی جاتی تھی اور نہ حکومت نے اپنی طرف سے اسکے انتظام میں کسی سرگرمی کا اظہار ہی کیا تھا۔ مگر زمانہ کی روش کے ساتھ یہ حالت بھی بدلی۔ اور بالآخر مصر نے بھی اشاعت و ترقی علم و ہنر کی طرف خاص توجہ مبذول کی۔ باایں ہمہ موجودہ نظام تعلیم ملک کی ضروریات خصوصاً زراعت پیشہ طبقہ کی ضروریات کے لیے قطعی ناکافی و ناموزوں ہے۔ اسی طرح عورتوں کی تعلیم کے لحاظ سے مصر اتنا ہی پیچھے ہے جتنا کوئی مشرقی ملک یا ہمارا غریب ہندوستان ہو سکتا ہے۔ البتہ مصر میں بیداری کے آثار نمایاں ہیں۔ اہل مصر اپنی اس کمزوری کو محسوس کر کے اسکے ازالہ کی کوشش میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ چنانچہ حال ہی میں ایک قانون بنایا گیا ہے جس کی رو سے ملک کے تمام بچوں کی تعلیم کی ذمہ داری حکومت نے خود اُٹھانے کا ارادہ کیا ہے۔ اور جبریہ تعلیم کا قانون ہر امیر و غریب پر نافذ کر دیا گیا ہے۔ اس طریقۂ تعلیم کو کامیاب بنانے کے لیے وزارت تعلیمات کے ماتحت ایک مجلس قائم کی گئی ہے جو اپنی رسلے اور تجربات سے ملک کے تعلیمی حوصلوں کو پورا کرنے میں مدد دیگی۔ ایک گزشتہ تحقیقات سے ظاہر ہے کہ مصر میں اُن لڑکوں کی تعداد جن کی عمر ۷ برس سے کم ہے ۲۰۰،۰۰۰ ہے۔ اس عمر کے تمام لڑکے آئندہ ۵ سال تک جبریہ اور بغیر معاوضہ تعلیم کے زیر اثر رہیں گے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ مصر کے جملہ اسکولوں میں ۱۵۰۰،۰۰۰ لڑکوں کے لیے جگہوں کے انتظام کی ضرورت ہے۔ اور ۳۰۰،۰۰۰ جگہوں کا اضافہ ہر سال ہونا چاہیے۔

مصر میں تعلیم جسکا مقصد زیادہ تر حصول ملازمت ہے، مدارس تحتانیہ سے شروع ہوتی ہے۔ یہاں کے تحتانات پاس کرنے کے بعد طلباء اوپر کے درجوں میں داخل ہو سکتے ہیں۔ اُس وقت انکو اختیار ہوتا ہے

کہ وہ عملی زندگی کے جس شعبہ کو اختیار کرنا چاہیں اُس میں مشق حاصل کریں۔ مدارس ثانویہ سے اعلیٰ کالجوں تک مختلف قسم کی عملی تعلیم حاصل کی جا سکتی ہے۔ علمی تعلیم کے آخری اور اعلیٰ درجوں کا انتظام جامعہ قاہرہ کے علاوہ اور بھی بڑے بڑے کالجوں میں کیا گیا ہے۔ تعلیم کے مدارج حسب ذیل نقشے سے واضح کیے جا سکتے ہیں



یہ نقشہ ان مدارس کا ہے جو حکومت مصر کے ماتحت ملک کی تعلیمی ضروریات کو پورا کرتے ہیں۔ مگر اسکے علاوہ ایسے مدارس کی بھی کافی تعداد ہے جو صرف حکومت کی مالی مدد سے قائم کیے گئے ہیں۔

سنہ ۱۹۲۹ء میں مصر میں طلباء کی تعداد حسب ذیل تھی :-

جامعہ

شعبۂ طب	۹۸۲ طلباء
" قانون	[illegible] "
" فنون	۱۴۳ "
" صنعت و حرفت	۱۵۹ "
	[illegible]

اس کے علاوہ ۱۲۰۰ طلباء اسوقت بیرونی ممالک میں زیر تعلیم تھے

مدارس

اکادمیۃ الاستاذین	۱۱۱۳ طلباء
مدارس الثانویہ برائے تجارت	۴۰۴ "
" برائے زراعت	۲۱۶ "
مدارس طب الحیوانات	۸۰ "

مدارس انجینرنگ	۵۰۱	طلبا ر
" فنون لطیفہ	۱۷۵	"
" صنعت	۲۱۳	"
" تجارت	۴،۲۵	"
مڈل اسکول		
صنعت	۱،۷۰۶	"
زراعت	۶۱۶	"
تجارت	۱،۰۶۷	"
مدارس الثانویہ	۲۰،۰۸۸	"
" تحتانیہ	۵۹،۴۰۲	

ظاہر ہو کہ اس تعلیم کا مقصد سوائے حصول ملازمت اور کچھ نہیں ہو سکتا مگر اس حصول کو ذلت کی نگاہ سے دیکھنے کا حق کسی کو حاصل نہیں ہو کیونکہ تعلیم کا مقصد قوم کو ملکی جذبات سے متاثر ہونیکے لیے تیار کرنا اور ملک کی ترقی کے لیے ایک کارآمد اور ضروری عنصر بنانا ہو اس تیاری کیلیے ایک گو نہ معاشی بےفکری و آزادی اب ضروری ہو لیکن یہ مقصد اسیوقت تک قابل تحسین ہو (ا) جب تک اسکا نتیجہ عادات انسانی کو مستحکم کرنا اور قومی و ملکی جذبات کو برانگیختہ کرنا ہے نہ کہ صرف ملازمت کی تلاش (ب) جب تک اس کا نتیجہ تعلیم یافتہ طبقہ پر معاش کا دروازہ کھولنا ہے نہ کہ انکی تعداد کو اس قدر بڑھا دینا کہ انکی زندگی خود وبال دوش ہو جائے (ج) اور جب تک لوگوں کو بحیثیت پیشہ و کاروبار کے مفید اور قابل بنانا ہے نہ کہ ان کی ترقی میں انحطاط پیدا کرنا اور ان کی طبعی پرواز خیال، عزم و تجسس کو متزلزل کر دینا۔ گر مصر کا موجودہ طرز تعلیم ان مقاصد کو عملی جامہ پہنانے سے معذور ہے۔

مدارس تحتانیہ اور ثانویہ میں لڑکوں کی تعداد بہت زیادہ ہے مگر طلباء کی ایک کثیر تعداد کبھی تحتانیہ سے آگے نہیں بڑھتی۔ وہ بہت جلد فرقہ وارانہ زندگی کے اس دور سے گزرنے لگتے ہیں جس کی بنیاد مدتوں پہلے پڑ چکی ہے اور جس کو اب انھیں دور حاضرہ کے ماتحت تبدیل کرنا ہے۔ بقیہ طلباء حکومت کے کسی شعبہ میں ملازمت پانے کی امید میں پے درپے امتحانات پاس کر کے مدارس ثانویہ۔ کالج۔ یونیورسٹی اور بیرونی تعلیم کے حدود تک پہونچ جاتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ نئے مصری اسکول ملک کے لیے قابل تحسین ہیں۔ اُن کی وسعت اور ساخت زمانۂ موجودہ کے لحاظ سے تمام تعلیمی ضروریات کے لیے کافی ہے۔ گر شاید یہاں کی آب و ہوا طلباء کو ایک مخصوص زمانہ میں زیادہ ذوق و شوق سے کام کرنے پر مجبور

کرتی ہے۔ امتحانات بہرحال اس جوش و خروش کی افزایش میں مدد دیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دماغ کی تمام قوتیں رفتہ رفتہ سلب ہونا شروع ہو جاتی ہیں اور آیندہ ترقی مفقود ہو جاتی ہے۔ یہ طریقہ تعلیم طلبا میں کوئی قابل قدر علمی ذوق پیدا کرنے سے قاصر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ طلبا خود اس تعلیم کو حاصل کرنے کی کوشش صرف اس لیے کرتے ہیں کہ ان کو بہرحال تعلیم حاصل کرنا ہے اور بلا اس تعلیم کے زندگی گزارنا انکے لیے مشکل ہوگا۔ ابھی حال ہی کی ایک تحقیقات مظہر ہے کہ اگر مصر کے تحتانوی اور ثانوی مدارس کے طرز تعلیم میں کوئی تبدیلی ظہور پذیر نہ ہوئی تو روشن خیال و سیاست داں طلباء کا فقدان ہوتا جائے گا۔

سرکاری ملازمت کی امید نے صنعتی و حرفتی کالجوں کی تعداد میں بھی بہت اضافہ کر دیا ہو لیکن تعلیم سے ملازمت حاصل کرنے کی تمناؤں میں درحقیقت ملک کی بہبودی کا عنصر شامل نہیں ہے۔ اسی کا نتیجہ یہ ہو کہ طلبا کی تعداد ملازمت کی جگہوں سے کہیں زیادہ ہو گئی ہے اور نوجوانوں کی کثیر تعداد سرگرداں و پریشاں ہے۔ دستکاری کی تعلیم ابھی مصر میں بمقابلہ جرمنی اور دیگر مشرقی ممالک کے محدود ہے۔ اسی طرح زراعت کی تعلیم میں بھی . . . . کافی بے توجہی سے کام لیا گیا ہے۔ اس معاملہ میں مغرب کی کورانہ تقلید نے مصر کو بہت نقصان پہونچایا ہے۔ مصر ایک ایسے موقع پر واقع ہے کہ ایک قابل قدر زراعتی ملک باسانی بن سکے۔ اس لیے اس کی ترقی اور بہبودی کا راز زرعی معلومات کی ترقی میں اسیقدر پنہاں ہے جس قدر ہندوستان کی ترقی کا راز یہاں کی زراعت میں۔ اس میں شک نہیں کہ موجودہ حکومت نے اس مسئلہ کی اہمیت کو محسوس کرنا شروع کر دیا ہے۔ اور اسکی ترقی کے لیے کوشاں ہے لیکن ابھی اس راہ میں بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑیگا۔ اور بڑی مصیبتوں کے بعد یہ منزل طے ہوگی۔ مصر کے طلباء کو اسوقت تک چین کی نیند نہ آنا چاہیے جبتک وہ دریائے نیل کی پوشیدہ دولت کو علم و حکمت کے آلات سے لینے اور اپنے ملک کے لیے کارآمد نہ بنالیں۔ جو زراعتی تجربات آجکل مصر میں کیے جا رہے ہیں انکا مستقبل بیشک بہت شاندار اور امید افزا ہے۔

مدارس اور کالجوں سے بہت ارفع قاہرہ کی وہ یونیورسٹی ہے جس نے ابھی زندگی کا بہت کم زمانہ دیکھا ہے۔ اس لیے فی الحال اس پر کسی قسم کی تنقید ذرا قبل از وقت معلوم ہوتی ہے۔ پھر بھی اسکے مخصوصات ہمارے لیے دلچسپی سے خالی نہ ہونگے۔ جامعہ قاہرہ وسطی مشرقی ممالک میں ایک خاص اور نمایاں حیثیت رکھتی ہے اور مشرقی اور مغربی تہذیبوں کو ہم آہنگ کرنے میں سرگرمی سے کوشاں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کے اساتذہ کا تقرر ملکی اصحاب تک محدود نہیں ہے۔ اور طلباء بھی دور دور کے ملکوں سے یہاں آکر تعلیم حاصل کرتے ہیں۔

قاہرہ پہونچنے کے ساتھ ہی ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ اس شہر پر فرانسیسی زبان و تہذیب نے کس قدر

تسلط پالیا ہے۔ گو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ملک کو انگریزی تعلیم کی کس قدر ضرورت ہے مگر جامعہ قاہرہ نے مصلحتِ برطانیہ کا پورا خیال رکھا ہے اور اساتذہ کی فہرست میں برطانوی اصحاب کو بھی جگہ دی جاتی ہے۔

ابتدائی تعلیم حاصل کرنیوالے طلبا کی تعداد مصر میں ۲۰۰۰۰۰ ہے۔ گزشتہ ۱۹۲۵ء کے قانون کی رو سے اور مدارس بھی کثرت کھولے جا رہے ہیں۔ موجودہ وزارت تعلیم نے ان مدارس کے تعلیمی اوقات صرف آدھے دن کے لیے مقرر کیے ہیں۔ اسکا مقصد یہ ہے کہ دن کا نصف حصہ لڑکوں کی تعلیم میں صرف کیا جائے بقیہ نصف لڑکیوں کے لیے مخصوص کر دیا جائے۔ اسکے فوائد اقتصادی اور معاشی نظر سے کثیر ہونیکے علاوہ زراعت کے لیے بھی نمایاں حیثیت رکھتے ہیں کیونکہ دن کا آدھا حصہ کھیت اور فصل کی دیکھ بھال کے لیے ضروری ہے اگر ایسا نہ ہو تو کسان کے بچے اپنے کاروبار سے نابلد رہنے کے باعث آیندہ چل کر اس سے بالکل مستغنی ہو جائیں اور ان کا حشر وہی ہو جو غریب ہندوستانی کسان کا ہوتا ہے۔ مگر آدھے دن کا اصول قاہرہ اور اسکندریہ جیسے بڑے شہروں کے لیے موزوں نہیں ہے۔ جہاں لڑکوں کو غیر پسندیدہ اور ناشایستہ کھیل کود میں وقت خراب کرنے اور اپنے آپ کو برباد کرنے کا موقع بآسانی مل سکتا ہے۔

یہ بتایا جا چکا ہے کہ مصر کی ترقی کا راز صرف وہاں کی زراعت کو فروغ دینے میں ہے۔ لیکن معلوم کر کے کہ ابھی تک وہاں کے تقریباً ۱۲ لاکھ کسان ایک ایکڑ سے زیادہ رقبہ زمین پر قابض نہیں ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہاں ترقی اور تبدیلی کی کس قدر ضرورت اور گنجایش ہے۔ مگر یہ ایک اہم اور مشکل کام ہے جس قدر اراضی اسوقت بلحاظ فی کس زیر کاشت ہے اس میں اضافہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ دو یا زیادہ خاندان آپس میں ملا دیے جائیں اور کاشتکاری کا کام اجتماعی حیثیت سے زمین کے بہت بڑے رقبہ پر کیا جائے۔ مگر اس اسکیم کو عمل میں لانا امر محال ہے اور اگر بالفرض ممکن بھی ہو تو وہاں کے کاشتکاروں کی زندگی حفظانِ صحت کے لحاظ سے بالکل ناقابل اطمینان ہے۔ چار میں سے ایک بچہ پیدایش کے سال ہی کے بعد موت کی نذر ہو جاتا ہے۔ اس کی ذمہ داری والدہ کی جہالت پر عائد ہوتی ہے۔ اس لیے زراعت اور خانہ داری دونوں کے اعتبار سے عورتوں اور لڑکیوں کی تعلیم میں کافی انتظام کی ضرورت ہے۔ اس وقت اسکول جانیوالے لڑکوں کی تعداد لڑکیوں سے تقریباً پانچ گونہ زیادہ ہے۔ اسکول کی تعلیم بہت گراں ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ مصر میں مغربی ممالک کی طرح تعلیم کے گراں ہونے کا سبب کیا ہے۔ سادگی اور آب و ہوا کی درستی تعلیم کے لیے خاص طور پر درکار ہیں مغربی ممالک میں سورج اور ہوا کی اہمیت کو بالکل پس پشت ڈالدیا ہے۔ ضروری نہیں کہ مصر بھی کورانہ تقلید میں اس اہم پہلو کو فراموش کر کے اپنے باشندوں کے جانی و مالی نقصان کا سبب بنے۔

مصر کا بہترین طریقہ تعلیم وہی ہوگا جو دیہاتی زندگی کو خوشگوار اور وہاں کے باشندوں کے لیے پسندیدہ بنانے میں کامیاب ہو مگر حالت موجودہ میں جبکہ وہاں کے رہنے والوں کو خود اسکا پورا احساس نہیں جبکہ اساتذہ کی تنخواہیں بے حد قلیل ہیں جبکہ عورتوں کا تعلیمی ذوق بھی بیدار نہیں ہوا ہے لیکن قابل ذکر ترقی ممکن نہیں ہے۔

ریاض اور خیرآباد

(مولوی عبداللہ خاں صاحب شاہد شروانی ناظم انجمن اشاعت الدین مظہر العلوم مدرسہ عربیہ نیازیہ خیرآباد اودھ)

خدا جانے یہ دُنیا جلوہ گاہ ناز ہے کس کی ہزاروں اُٹھ گئے رونق وہی باقی ہے مجلس کی (امیر)

قصبۂ خیرآباد امرشاہ خیرا، گہوارۂ علم وادب ہونے کے اعتبار سے ہندوستان کے مشہور مقامات کے صفِ اول میں شمار ہوتا رہا ہے۔ صدیوں سے ماہرینِ فنون کا مولد ومسکن رہا ہے۔ ایسے ایسے نامور حضرات اس قصبے میں گزرے ہیں جن کی نظیر شاید ہی کہیں ملتی ہو۔ تقریباً ہر فن کے ماہرین اس پاک خطّے میں ہوئے۔ چونکہ میرا موضوع علم وادب ہے اس لیے دیگر فنون کو بخوفِ طوالت نظر انداز کرتا ہوں

علوم دینیہ کی جو خدمت خیرآباد نے کی ہے وہ روزِ روشن کی طرح ظاہر وباہر ہے۔ ہر صاحبِ علم جانتا ہے کہ یہی وہ قصبہ ہے جو دو صدی قبل علوم دینیہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔

علمی دنیا میں وہ کون شخص ہے جو مولانا حاجی سید صفت اللہ صاحب محدثؒ خیرآبادی کے نامِ نامی سے واقف نہیں۔ موصوف نے جو فیض طالبینِ علوم حدیث وفقہ کو پہونچایا۔ اس کی شہادت موصوف کے قائم کردہ مدرسہ کے کھنڈر اب بھی دے رہے ہیں۔ یہ مقام اب بھی خیرآباد میں مدرسہ کے نام سے مشہور ہے۔ اور محدث رحمۃ اللہ علیہ کے موجودہ جانشیں مولوی حاجی سید فخر الحسن صاحب علوم عربیہ سے ناآشنائے محض ہونے کے باوجود مولوی اور مفتی کے لقب سے ملقب ہیں۔ قاموس کی شرح کے حاشیہ پر حضرت محدثؒ اور خیرآباد کا حال بھی تھوڑا سا درج ہے۔ حاجی سید فخر الحسن صاحب نے حال میں ایک کتاب شایع کی ہے جس میں اس خاندان کے مفصل حالات مرقوم ہیں۔ ومن شاء فلیطالعہا۔

حضرت محدث علیہ الرحمہ کے بعد آپ کے اخلاف یکے بعد دیگرے خدمتِ حدیث وفقہ انجام دیتے رہے۔ اور یہ سلسلہ تیرھویں صدی کے آخر تک جاری رہا۔ مگر افسوس کہ چودھویں صدی نے اس کی شمعِ حیات کو گل کر دیا۔ اسی مدرسہ میں لسان الملک خیام العصر حضرت ریاض مرحوم نے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ افسوس آج جبکہ میں یہ حالات قلمبند کر رہا ہوں، نہ مدرسہ ہی کا نام ونشان باقی ہے نہ اُس کے سپوت ریاض ہی دُنیا میں موجود ہیں۔ تلک الایام نداولہا بین الناس۔

علوم عقلیہ کی خدمت بھی خیرآباد نے کچھ کم نہیں کی۔ گزشتہ صدی میں خیرآباد سرچشمۂ فیض بنا ہوا تھا۔ جسکی مثال اور کہیں نہیں مل سکتی۔ امام ہمام حضرت مولانا فضل امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا نامِ نامی محتاجِ تعارف

نہیں۔ آپ کی تصنیفات داخلِ نصاب ہیں۔ آپ کے صاحبزادے فخر المتقدمین والمتاخرین علامہ فضلِ حق خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہ علوم عقلیہ ونقلیہ کے ایک بحرِ زخار تھے۔ اس وقت ہندوستان کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جو اس دریا سے سیراب نہ ہوا ہو۔ کوئی مقام ایسا نہیں مل سکتا جہاں آپ کے بالواسطہ یا بلاواسطہ شاگرد نہ ہوں۔ آپ کے بعد آپ کے خلف الرشید شمس العلما صدر الافاضل علامہ عبدالحق خیرآبادی علیہ الرحمہ نے زمام منطق وفلسفہ ہاتھ میں لی اور اس موروثی خدمت کو باحسن الوجوہ انجام دیا۔ ان حضرات کی تصانیف ہند اور بیرونِ ہند مصر وغیرہ میں داخلِ نصاب ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی مسلم ہے کہ آپ ہندوستان کے خاتم علوم عقلیہ مانے گئے ؎

مٹے ناموں کے نشاں کیسے کیسے　　　زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے　　(امیر)

طبقۂ شعراء کے اعتبار سے بھی خیرآباد کسی دوسرے مقام سے پیچھے نہیں رہا۔ عربی۔ فارسی۔ اردو۔ تینوں زبانوں کے شعراء یہاں گزرے ہیں۔ علامہ فضل حق کے عربی قصائد کی اہمیت کچھ نہ کچھ اہلِ عرب ہی جان سکتے ہیں۔ اہلِ زباں بھی انگوشن کر انگشت بدنداں نظر آتے ہیں۔ صرف دو اشعار ایک قصیدہ کے پیش کرتا ہوں ؎

ومن اطاع الهوى طوعاً ودان له　　　فلا محالة يعصى اللائم الزاري
كم بات في عضدي من لوعة ألمه　　　برّح لغاد وهلا لا ابيد ابداء

شعراے فارسی میں زائد تعداد اولیاء کرام کی ملتی ہے جن میں سے تین حضرات کا کلام زائد مشہور اور مقبول ہے۔ ہر ایک کا ایک ایک شعر نقل کرتا ہوں :-

مخدوم شیخ سعد علیہ الرحمہ ؎

اگر پرسند سعدا از عشق او حاصل چہ داری　　　بلا انتہاے گوناگوں جز انتہاے بے مرہم

حضرت حافظ محمد علی شاہ صاحب مشتاق علیہ الرحمہ ؎

چو گل رخ۔ نرگسیں چشمے بروش سنبلیں زلفے　　　لب نازک تر از لالہ قد سرو روان دارد

حضرت معشوق علی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ ؎

وقت آں آمد کہ من عریاں شوم　　　جسم بگزارم سراسر جاں شوم

یہ آخری شعر ہے جو وفات کے وقت حضرت نے فرمایا تھا۔ مجھے حضرت کی اردو کی رباعی ایک اور یاد آگئی ؎

کیا کہیں ہم کہ کیا ہیں ہم　　　مظہر ذات کبریا ہیں ہم
شرع نے کر دیا ہمیں مجبور　　　ورنہ کہہ بیٹھتے خدا ہیں ہم

ان حضرات کے بعد کا دور بھی کچھ کم اہمیت نہیں رکھتا۔ منشی قدرت حسین صاحب قدرتؔ، مولوی مظفر حسین صاحب شوخیؔ، منشی متولی محمد جعفر صاحب زہریؔ۔ منشی بہاری لال صاحب خاوریؔ۔ منشی موہن لال صاحب گرامیؔ۔ مولوی الٰہی بخش صاحب نازشؔ۔ جنابۂ والدۂ حضرت مضطرؔ متخلص بہ حرماںؔ اسی دور کی پیداوار ہیں۔ ان میں ہر ایک ماہر فن اور یگانۂ روزگار تھا۔ اکثر صاحب تصنیف بھی ہیں۔ زیادہ تر فارسی میں قصائد لکھے۔ آخر الذکر دونوں اردو۔ فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ میں اس موقع پر ایک ایک دو دو اشعار پیش کروں گا۔ ناظرین خود قدرتِ زباں اور سلاست بیان کا اندازہ فرمالیں :-

قدرتؔ	بیاضِ صبحِ نورانی ز نورِ عارضش روشن	سوادِ شامِ ظلمانی ظہورِ موئے پیچانش
شوخیؔ	دی نالہ ام کہ دم کشِ آہنگِ صور بود	شامِ فراق خندۂ صبحِ نشور بود
زہریؔ	اے بنامِ تو سخن تازہ چو گل	وے بحمدِ تو زباںہا بلبل
	دلربائی تو ہا ہا کہ کشد	دل سوئے کاکل و پیچ سنبل
منشی بہاری لال	دود آہِ دلِ ہم پیچید کہ کاکل ساختند	چوں گلستانِ رخش بر دند و سنبل ساختند
خاوریؔ	چوں احد بر صورتِ احمد عیاں شد در جہاں	عارفاں نامش پیمبر از تجاہل ساختند
گرامیؔ	می تواں جست از زبانِ شمع	قصۂ سوز و سازِ معشوقاں
	فرہاد نیستم کہ بسنگے زدہ است سر	از نالہ کوہ را بہ طپیدن در آوردم
نازشؔ	اٹھا تابوت یارب کس حریقِ سوزِ ہجراں کا	کہ شعلہ آگ کا نذر ہا دے گیا برقِ درخشاں کا
حرماںؔ (والدۂ	خانۂ یار کا کیا تم کو پتہ بتلاؤں	جیسا مشتاق ہو تو دیکھ بھی ہو دور بھی ہو
مضطرؔ مرحوم)	نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے	گھٹ کے مرجاؤں یہ مرضی مرے صیاد کی ہے
	جان جانے پہ تو جائے دردِ دل	دم بدم خالق بڑھائے دردِ دل

اب تیسرا دور ملاحظہ ہو جو ایک کامیاب دور کہا جا سکتا ہے۔ یہ تسبیلؔ و مضطرؔ و کوثرؔ و تسنیمؔ و ریاضؔ کا دور تھا۔ اور سچ پوچھیے تو لکھنؤ کے مدرسۂ شاعری کی عمارت انھیں حضرات کے ہاتھوں مستحکم ہوئی۔ نیز خدائے سخن امیرؔ مینائی کے بعد انھیں فرزندان خیرآباد نے ہر طرح زبانِ و ادب کی خدمت انجام دی۔ ہندوستان کے چپہ چپہ پر اپنا ڈنکا بجوا دیا بلکہ ان کی شہرت سات سمندر پار تک پہونچی۔ اور یورپ میں علم ادب اردو لہرانے لگا۔ یہ ریاضؔ ہی کا شعر ہے جس پر ولایتی اخبارات میں تبصرے کیے گئے۔ اور پائنیر اور سول ملٹری گزٹ نے بھی اپنے کالموں میں جگہ دی تھی۔

عالمِ ہُو میں اک آواز سی آجاتی ہے چپکے چپکے کوئی کہتا ہے فسانہ دل کا

اس طرح اس آخری دور میں بھی خیرآباد کسی دوسرے مقام سے پیچھے نہیں رہا۔ بلکہ ایک معنی میں ممتاز ہی رہا۔ ان حضرات کے تلامذہ کا آج مشاہیر میں شمار ہے۔ اور ہندوستان کا گوشہ گوشہ ان کی کارگزاریوں سے واقف ہے۔ اول الذکر چاروں شاعران باکمال کے کچھ اشعار نقل کرتا ہوں۔ حضرات ناظرین خود اُن کی مہارت فن اور اُستادیت کاملہ کو ملاحظہ فرما کر رائے قائم فرمالیں میں صرف وہ اشعار پیش کروں گا جو ہندوستان میں زبان زد خاص و عام ہیں۔

بسمل مرحوم

عاشق بدنام کو پروا ہے ننگ و نام کیا　　　آپ جو ناکام ہو اُس کو کسی سے کام کیا
ابتدا ہے عشق ہی میں ہم گئے جاں سے گزر　　　ہو محبت کا ہماری دیکھیے انجام کیا
اب لذت زخم جگری پوچھتے کیا ہو　　　جب تم ہو نمک پاش تو پھر کیوں نہ مزا ہو
آئینہ پیش تو اسے یار رسیدن ندہم　　　رشک من بیں کہ ترا ہم بتو دیدن ندہم
بسمل چہ ہوس کنی وصالش　　　او شاہ و تو بے نوا گدائی

اقبال الملک مضطر مرحوم

اسیر پنجۂ عہد شباب کر کے مجھے　　　کہاں گیا مرا بچپن خراب کر کے مجھے
زاہد تو بخشے جائیں گنہگار منہ تکیں　　　اے رحمت خدا تجھے ایسا نہ چاہیے
شکوہ ہے رفتگان مقام بعید کا　　　ایسے گئے کہ خط بھی نہ بھیجا رسید کا
ہاتھ پاؤں دونوں نکلے کام کے　　　جا رہا ہوں اُن کا دامن تھام کے
میرے ساقی نے مری قبر پہ آ کر مضطر　　　یہ دعا دی ہے کہ تربت تری میخانہ بنے
میرے مولا بلالے مدینے مجھے الخ

اس آخری شعر کی مقبولیت کا کیا پوچھنا میرے نزدیک اس کا ذکر ہی بیکار ہے۔ مشرق سے مغرب شمال سے جنوب تک ہر شہر اور ہر گاؤں میں بچے بچے کی زبان پر ہے۔

کوثر مرحوم

ہاتھ کاٹے گئے آغاز دعا سے پہلے　　　ہم سزایاب ہوئے جرم و خطا سے پہلے
صدمۂ رشک اُٹھانے کی اسے تاب نہیں　　　سلیے تلووں سے مرے دل کو حنا سے پہلے
عجب خوشنما ہیں مدینے کی گلیاں　　　حریم خدا ہیں مدینے کی گلیاں
مسکین فقیر کوثر حاضر ہے آستاں پہ　　　جو مانگے وہ دلادو بندہ نواز خواجہ

اُس کی برچھی میں چھید ہے جو گُلِ لالۂ تر — کاش اس پھول کے بدلے دل کو تر ہوتا
ہجر میں اک بتِ کافر کے ہوا حال تباہ — کوثر آگاہ نہ تھے آہ و بکا سے پہلے

آقائے سخن وسیم مرحوم

پھر نظر تھی زاہدِ خانہ خراب کی — ٹوٹی ہے کیا تڑاق سے بوتل شراب کی
پھیرے گئے وہ چشمِ کرم میں سمائیے — آنکھیں جھکائیے رہ گئی میزان حساب کی
کیا سیر ہو کہ اُٹھ کے پڑے روئے شیخ پر — بوتل کا کاگ جل کا طمانچہ کہیں جسے
جلوہ گہ میں تری ہم آنکھ سے کہتی ہے یہ آنکھ — کاش کہ پاسے گہ میں ترے چھالا ہوتا
رکھیں گی اب کہیں کا نہ پیری کی ٹھوکریں — رکھنا قدم وسیم بہت دیکھ بھال کے
وسیمِ حزیں کبھی ازل سے ہے شیدا — وہ صر بھی نظر آ سے نگاہِ دیدہ سے

لسان الملک سحبان الہند حضرت ریاض علیہ الرحمہ اس دور کی آخری یادگار تھے جو عمر کے لحاظ سے بعض مقدم الذکر حضرات پر مقدم تھے۔ ریاض کی قدر و قیمت کچھ وہی حضرات خوب جانتے ہیں جن کی آنکھوں نے اُن کی شاعری کا شباب دیکھا ہے۔ ریاض نے جو غیر فانی شہرت حاصل کی وہ فقط نام کی شہرت نہ تھی بلکہ حقیقۃً وہ اسی کے مستحق تھے اور کیوں نہ ہو جبکہ آپ یگانۂ روزگار اور امام فن تھے۔

آپ قصبہ خیر البلاد خیرآباد (اودھ) میں پیدا ہوئے۔ تاریخ پیدائش معلوم نہ ہو سکی۔ آپ کے والد ماجد منشی سید طفیل احمد صاحب ساداتِ کرمانی سے تھے۔ موصوف ایک جید عالم، زبردست مناظر اور فارسی کے ماہر تھے۔ انسپکٹری کے عہدہ پر مامور تھے۔ ریاض نے اپنے پدر بزرگوار سے فارسی وغیرہ پڑھی پھر آپ نے خیرآباد کے قدیم مدرسہ (جس کا ذکر میں ابتدا میں کر چکا ہوں) میں پڑھنا شروع کیا۔ علم عربی کی تحصیل شروع کی۔ ابھی آپ شرح جامی اور شرح وقایہ ہی تک پہونچے تھے کہ فطرت نے اپنا اقتدار حاصل کر لیا۔ چونکہ شاعر پیدا ہوتا ہے بنایا نہیں جاتا۔ اس کلیہ کے تحت میں ریاض کی منچلی طبیعت نے منچلا نہ بیٹھنے دیا۔ اور شعر گوئی کا شوق ہو ہی گیا۔ اور اس شوق نے یہاں تک ترقی کی کہ تعلیمی مشاغل کے ساتھ ساتھ خیرآباد کو بھی خیرباد کہلا دیا۔ اُس وقت نواحِ لکھنؤ میں حضرت اسیر کا طوطی بول رہا تھا۔ یہ قاعدہ ہے کہ ہر وہ شخص جو کسی فن سے کامل ذوق رکھتا ہو وہ کسی کامل الفن ہی کی تلاش کرتا ہے اور جہاں تک ہو سکتا ہے اُس سے فیض حاصل کرتا ہے۔ اسی وجہ سے آپ سیدھے لکھنؤ پہونچے اور اسیر مرحوم کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہو گئے۔ اور تھوڑے ہی دنوں میں انکی خوش طبعی نے اُستاد کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ اکثر مواقع پر اُستاد خود اس فطری شاعر کے مداح نظر آنے لگے۔ چھ برس تک متواتر مستفیض ہوتے

رہے۔ اس لحاظ سے ریاضؔ امیرؔ اور جلالؔ کے معاصر تھے۔ جب استاد نے داعیِ اجل کو لبیک کہا تو اس فخرِ استاد شاگرد نے استاد کے جانشین عذرائے سخن حضرت امیرؔ مینائی علیہ الرحمۃ کی طرف رجوع کیا۔ امیرؔ مینائی مرحوم نے اپنے استاد بھائی کے لیے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ غرضکہ تا زیست امیرؔ کی اطاعت گزاری کی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ امیرؔ کے بعد جب جانشینی کا سوال پیدا ہوا تو ملک کی نگاہیں ریاضؔ پر پڑنے لگیں۔ بلبلِ ہندوستان حضرت داغؔ دہلوی مرحوم نے جو خط لکھا اس میں اس کی پرزور تحریک کی اور بجنے پر ریاضؔ جانشینِ امیرؔ لکھا۔ ریاضؔ ایک آزاد طبیعت انسان تھے وہ ہر قسم کی پابندی سے بھاگتے تھے۔ وہ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ اگر یہ افتخار حاصل ہو گیا تو مصیبت کا سامنا ہوگا۔ کس طرح درباروں کی حاضری ہو سکے گی۔ اور کس صورت سے فرائضِ جانشینی انجام دے سکوں گا۔ ان سب باتوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے ریاضؔ نے اس تحریک کی اپنے لیے تائید گوارا کی اور ساتھ ہی ساتھ نواب فصاحت جنگ حضرت جلیلؔ کے لیے خود پرزور تحریک کی۔ چنانچہ حضرت جلیلؔ بلحاظ جانشین تسلیم کر لیے گئے۔ وہ ریاضؔ جس طرح کی آزادی چاہتے تھے۔ انھیں ہمیشہ حاصل رہی۔ ریاضؔ کے استغنا کا یہ عالم تھا کہ اس پرآشوب زمانے میں مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر مدار المہام دولتِ آصفیہ حیدرآباد دکن کے کئی بار طلب فرمانے کے باوجود حیدرآباد نہیں گئے۔ ظاہر ہے کہ حیدرآباد پہنچنے کے بعد ریاضؔ کے لیے مہاراجہ کیا کچھ نہ کرتے۔ مہاراجہ کو ریاضؔ سے جو عقیدت تھی اس کے لیے اتنا عرض کر دینا کافی ہوگا کہ ۱۳۳۲ھ میں جب مولانا حاجی محمد مصطفیٰ خاں صاحب مالکِ کارخانہ اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ حیدرآباد تشریف لے گئے اور مہاراجہ سے ملے تو مہاراجہ نے لکھنوی شعراء میں صرف ریاضؔ کا ذکر کیا اور متعدد اشعار کو [illegible] سنائے۔ جیسا کہ حاجی صاحب موصوف کے ان مضامین سے ظاہر ہوتا ہے جو آپ نے اخبار حقیقت لکھنؤ میں شائع کیے تھے۔ مہاراجہ محمود آباد نے جو قدر افزائی کی اس کا جواب نہیں ملتا۔ علاوہ داد و دہش کے بمبلغ للعہ روپیہ ماہوار آخر تک ریاست عالیہ سے ملتے رہے۔ مہاراجہ نے کیا کچھ نہ کیا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ممدوح کے انتقال کے بعد ریاضؔ فرمایا کرتے تھے کہ "مہاراجہ کا انتقال نہیں ہوا بلکہ ریاضؔ مر گیا" مہاراجہ نے متعدد بار لکھنؤ میں قیام کی تحریک کی مگر ریاضؔ کو نہ خیرآباد چھوڑنا تھا نہ چھوڑا۔ بالآخر ۹۵ برس کی عمر میں (۱۷ ربیع الثانی ۱۳۵۳ھ بروز دوشنبہ بوقت ۳ بجے شام) اپنے وطن ہی میں راہیِ خلدِ بریں ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ دنیا کی آنکھوں سے ایک درخشندہ آفتاب اوجھل ہو گیا۔ مگر اس کے کارنامے فراموش نہیں کیے جا سکتے۔

ریاضؔ نے ۱۸۹۶ء میں جبکہ بعنوان شباب تھا ریاض الاخبار گورکھپور سے نکالا جو ایک مدت تک کامیابی سے چلا۔ اسی کے ساتھ ساتھ صلحِ کل بھی نکالا۔ فتنہ اور عطرِ فتنہ بھی نہایت آب و تاب سے نکالا کیے۔

گلکدۂ ریاض اور گلچیں نے بھی خوب خوب خراج تحسین وصول کیا - حرم سرا ناول لکھا جس کی زبان کی خوبیاں بیان سے باہر ہیں - ناشاد ناول بھی آپ ہی کی تصنیف ہے۔ نظارہ ناول خالص اردو زبان میں ہے جس میں شروع سے آخر تک کہیں فارسی ترکیب نہیں مل سکتی - ان سب کے متعدد ایڈیشن نکلے اور فروخت ہوئے - ریاض نے مرگ غالب ایک دیوان عہد شباب میں لکھا جو بالکل غالب کے رنگ میں تھا - بعد میں کسی وجہ سے موصوف نے نذر آتش کر دیا - اس کا ایک شعر مجھے یاد ہے جو پیش کرتا ہوں - اس شعر میں جو فلسفہ بھرا ہوا ہے اسکو فلسفی اور منطقی ہی خوب سمجھ سکتے ہیں فرماتے ہیں

تہہ امکان امکین کے تصدیق تصور سے		نگار رکن ہوا آئینہ خانہ بزم حیرت کا

ایک دیوانِ مکمل چوری ہو گیا جس کا مرحوم کو آخر دم تک صدمہ رہا - اس کے بعد کے دو دیوان مکمل اس وقت گورکھپور میں موجود ہیں جو انشاء اللہ جلد سے جلد حلیۂ طبع سے آراستہ ہو کر ہمارے ہاتھوں میں ہونگے - ایک دیوان میں صرف غزلیات ہیں اور دوسرے دیوان میں قصائد - قطعات - نظمیں - دوہرے ہیں - اب تک یہ دونوں دیوان شایع ہو چکے ہوتے مگر ریاض امروز فردا پر ٹالتے رہے - خدا کی مرضی یہی تھی کہ انکے سامنے شائع نہ ہو - چنانچہ ایسا ہی ہوا -

ریاض کی ادبی قابلیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ حضرت امیر مینائی مرحوم کے دیوان کی طباعت کے بعد مختلف اعتراضات اُن کے اشعار پر ہوئے - مگر سب کا جواب ریاض نے دیا - مولوی غلام محمد صاحب اڈیٹر اودھ پنچ لکھنؤ ایک جید عالم اور انتہائی قابل تھے - موصوف نے بھی اعتراضات کیے - جنکے جوابات دیے گئے۔ مگر کچھ دن کے بعد انھوں نے ایک اعلان شایع کیا جس میں لکھا کہ مجھے دیوانِ امیر کے مختلف اشعار پر اعتراض ہے، جو شخص جواب دے میں مشروط طریقہ پر اُس کا فیصلہ کروں گا - ریاض نے بذریعہ اخبار جواب دیا کہ میرے پاس فضول وقت نہیں جو ضائع کروں - جتنے اعتراضات ہوں اُن سب میں جو اعتراض سب سے زیادہ اہم اور دقیق ہو وہ لکھیے - اگر میں اُس کا جواب دیدوں تو آپ ہارے میں جیتا اور عمر بھر کا قصہ ختم ہوا - اور اگر میں جواب نہ دے سکوں تو میں ہی نہیں بلکہ میری ساری جماعت ہاری اور آپ جیتے - اس کے جواب میں مولوی غلام محمد صاحب نے یہ شعر لکھا

ٹانکوں کا دیا حکم تو بولے دہنِ زخم		سلواتے ہو کیوں قابلِ سیون تو نہیں ہم

اور یہ اعتراض کیا کہ قابل عربی ہے اور سیون اُردو ہے - عربی یا فارسی کی اضافت اُردو کی طرف نہیں ہوتی نہ آج تک کسی نے لکھا ہے - ریاض نے اس کے جواب میں یہی شعر نقل کیا اور سیون پر چاء کی پیالی کے برابر تین نقطے لگائے اور لکھا کہ یہ شیون ہے سیون نہیں - کاتب کی غلطی سے نقطے رہ گئے - اور یہ آپ کی قابلیت

ہے کہ آپ اُسے سمجھ نہ سکے، اچھا اب میں سمجھائے دیتا ہوں کہ سیون کے تو کوئی معنی ہی نہیں بنتے، نہ اسکا یہ محل ہو سکتا ہے۔ مطلب شعر کا صاف ہے کہ جب کسی کا مُنہ بند کیا جاتا ہے تو اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ آواز نہ نکل سکے اور آہ وزاری، نالہ و فریاد نہ کرسکے۔ دہنِ زخم زبان حال سے کہتے ہیں کہ ہمارے سلوانے سے کیا نتیجہ، ہم میں نہ طاقت گویائی ہے نہ تاب آہ و زاری۔ ہم ویسے ہی خاموش ہیں۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ دادی غلام محمد عنایت اڈیٹری چھوڑ کر اپنے وطن تشریف لیگئے۔ اصل بات یہ ہے کہ جب قابل اور سنجیدہ شخص اپنی بات کا جواب پالیتا ہے تو اُس پر غم و غصہ کا اظہار نہیں کرتا بلکہ اُس کو تسلیم کر لیتا ہے۔ یہ ضدی اور کج فہم لوگوں کا خاصہ ہے کہ بات ماننے کے بجائے اپنی ہٹ پر قائم رہیں۔ اس قسم کے ہزاروں واقعات ملیں گے کہاں تک عرض کیا جائے۔ یہ تو ریاض کے ادبی کارنامے تھے۔ اب میں دوسری طرف رجوع کرتا ہوں۔

ریاض الاخبار اور ڈپٹی کمشنر گورکھپور سے کسی بات پر اَن بَن ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر ہوئی ڈپٹی کمشنر میں اُن سے چند باتیں ایسی سرزد ہوئیں جن سے ہندو مسلم دلآزاری ہوتی تھی۔ مثلاً ایک مسجد کو باورچی خانہ بنا رکھا تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔ ریاض الاخبار نے اچھی طرح مخالفت پر کمر باندھی۔ اور گورنر صاحب بہادر کے پاس ایک درخواست بھیجی جس پر کئی ہزار سربرآوردہ اشخاص اور پبلک کے دستخط تھے۔ یہ زمانہ سر انٹونی مکڈانلڈ کا تھا۔ نہایت باخبر اور منصف مزاج گورنر تھے۔ گورنر صاحب دَورہ پر نکلتے ہیں، بنارس سے اعظم گڈھ پہونچتے ہیں۔ ایک درخواست پھر گورکھپور سے ڈاکٹر ہوئی کے مظالم کی پہونچی۔ گورنر صاحب گورکھپور چل دیتے ہیں۔ ریاض نے اُس زمانہ میں منشی عبداللہ حسرتی کو بعض مصالح کی بنا پر اڈیٹر بنا دیا تھا۔ حسرتی ایک دلیر اور زبردست انشاپرداز تھے۔ ادھر گورنر صاحب آئے اور اُدھر یہ انتظام کیا گیا کہ شہر میں مکمل ہڑتال کی جائے۔ چنانچہ گورنر صاحب تشریف لاتے ہیں اور کسی چیز کی ضرورت ہوتی ہے۔ آدمی بھیجا جاتا ہے۔ بازار بند ملتے ہیں۔ ہڑتال کی وجہ پوچھی جاتی ہے۔ پبلک ڈپٹی کمشنر کی زیادتیاں بیان کرتی ہے۔ گورنر صاحب ایک تحقیقاتی بورڈ قائم کردیتے ہیں۔ (بہر حال پھر جو کچھ بھی ہوا ہو) مجھے صرف یہ دکھانا ہے کہ آج بات بات پر جو ہڑتال کردی جاتی ہے۔ جہاں کوئی بڑا آدمی مرا اور مکمل ہڑتال ہو گئی، گورنمنٹ سے کوئی شکایت پیدا ہوئی اور ہڑتال کردی گئی، یہ سب ریاض ہی کا نتیجہ ہے۔ ہندوستان میں پہلا وہ شہر جہاں مکمل ہڑتال ہوئی گورکھپور ہے۔ اور ہندوستانی ہڑتال کا پہلا موجد ریاض ہے۔ اس سے پہلے شاید ہندوستانی، ہڑتال کے لفظ سے بھی واقف نہ ہونگے۔ ریاض کا یہ ایسا کارنامہ ہے جسے آب زر سے ریاض کے نام کے ساتھ لکھا جا سکتا ہے۔ مگر یہ کام زندہ قوموں کا ہے، مُردہ قوم کیا کرسکتی ہے۔ کاش ریاض کسی ترقی یافتہ ملک اور زندہ قوم میں پیدا ہوتے۔

اُسی زمانے میں منشی عبداللہ حسرتی نے ریاض الاخبار کے ضمیمہ کے طور پر ایک کتاب لکھی تھی جس کی

مقبولیت اس درجہ کو پہونچی کہ سیکڑوں کی تعداد میں روز "وی پی" روانہ کیے جاتے - ہندو مسلم سب کی نظروں میں وہ کتاب مقبولیت حاصل کر چکی تھی - پہلے "وی پی" کا قاعدہ یہ تھا کہ جب مکتوب الیہ کے پاس سے قیمت آتی تھی تب ڈاکخانہ وی پی کا محصول مجرا کرتا تھا - جب ڈاکخانہ والوں نے یہ مصیبت نازل ہوتے دیکھی کہ کسی وقت "وی پی" لکھنے سے فرصت نہیں ملتی تو ایک درخواست دی کہ دو ایک منشی اور بڑھا دیے جائیں - چنانچہ ایسا ہی ہوا لیکن پھر بھی کوئی کمی محسوس نہ ہوئی تو دوبارہ درخواست دی - جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ "وی پی" کا محصول پیشگی لیا جانے لگا - جو اب مستقل قانون ہے - یہ جناب ریاض ہی کا کارنامہ ہے - میں آپ کا زیادہ وقت لینا نہیں چاہتا آپ خود سمجھ لیں کہ ریاض کیا تھے اور ان کی ہستی کس قدر اہم اور انسانی تھی - یہ واقعات ستے نمونہ از خروارے ہیں - ریاض کی سوانح لکھنے کے لیے کافی وقت اور اطمینان کی ضرورت ہے - وجہ یہ ہے اسکے واسطے مستقل کتاب چاہیے - بہرحال ریاض ایک صدی کی زندہ تاریخ تھے جس نے سیکڑوں جھڑ دیکھے ہوں گے - اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ مشرقی تہذیب کے غالباً آخری نمونہ تھے - (باقی)

جہانِ آرزو

(جناب منشی سید انور حسین صاحب آرزو لکھنوی)

نکل کے بھی جو نہ نکلے وہ جو تمنا نہ کرے
یقین ہے ہم سے گر نظر خطا نہ کرے

کرے تو وعدہ قسم کھا کے اور وفا نہ کرے
کیا جو تم نے ہم ایسا کریں خدا نہ کرے

یہ شوخی اُس کی مری موت ہے مگر دلچسپ
جو وعدے کرتا ہے اور سامنا نہ کرے

جمالِ خاص بصیرت کی حد سے دور سہی
ہٹے نہ آنکھ جہاں تک نظر خطا نہ کرے

رضائے دوست کے تابع بنا کے رکھا ہے
نہیں تو یہ دلِ تنہا خراب کیا نہ کرے

مرض نے عشق کے پیدا کیا ہے یہ وہ مزاج
ضرر ہو زہر کا باطل اثر دوا نہ کرے

وہ بامراد ہے یا نامراد کیا کہیے
اثر زباں میں جو رکھتا ہو اور دعا نہ کرے

یہی ہوا کبھی پلٹے گی رُخ زمانے کا
ہم آہیں کرتے رہیں گے وہ اعتنا نہ کرے

کہاں شریعتِ الفت کہاں مناسبتِ ترک
اکیلے کی ہے وہ ہمت کہ دوسرا نہ کرے

دعا بھی بابِ اجابت پہ کشمکش میں پھنسی
خدا کرے میں کہوں وہ کہے خدا نہ کرے

سکونِ دل ہے محبت میں مرگِ ناکامی
بس آرزو یہ دوا کام زہر کا نہ کرے

اصطلاحات فلسفہ پر تنقید

(سلسلۂ الناظر ماہ اپریل)

(جناب مولوی محمد اجمل خاں صاحب ایم اے، ایل ایل بی۔ وکیل)

ضمیمہ نمبر ۳ - اصطلاحاتِ نفسیات

اصطلاح انگریزی	ترجمہ	اصطلاح انگریزی	ترجمہ
Active Touch	لمس فعلی	Arrest (of development)	رکاوٹ۔ روک
Activity	فعلیت		
Adaptation (to conditions)	تطابق	Assimilation	انجذاب۔ کشش
Affinity	تعلق۔ رشتہ	Attention	توجہ
Aggression	حملہ	—— Sensorial	—— احساسی
Alimentary Canal	غذا کی نالی	Oscillation of attention	لرزش توجہ
Alteration of personality	شخصیت کی تبدیلی	Span of ——	عرصۂ توجہ
Ambition	حرص۔ جاہ طلبی	Derived ——	توجہ مشتق
Amnesia	نسیان	Threshold of ——	باب توجہ
Amorphous characters	بیقاعدہ شکل والے	Training of ——	تربیت توجہ
Anaesthesia	کم احساسی۔ انجماد حس ہو جانا	Attraction	کشش
		Avarice	لالچ۔ حرص
Anger	غضب	Aversion	کراہیت
Animism	روح پرستی	B	
Approbation	پسندیدگی	Bacteria	جراثیم
Apathy	نفرت۔ تیرہ	Beneficence	سخاوت
Antipathy	مخالفت۔ عداوت	Blind Impulse	اندھا دھند ہیجان

Blushing	جھینپنا۔ شرمانا
Brain function	فعلِ دماغ
Body	جسم
Bryozoa	ادنیٰ گھونگھا
Cannibalism	آدم خوری
Chemical action	عمل کیمیائی
Chloroform	دارو بیہوشی
Clan	قبیلہ
Combination	ملاوٹ۔ آمیزش
Complex	مضاعفت
Composition	بناوٹ
Conditioned	مشروط
Conflict	اختلافات
Contact	اتصال
Consciousness	آگہی۔ ہوش
focus of ——	مرکزِ آگہی
margin of ——	حاشیہ آگہی
field of ——	میدان آگہی
threshold of ——	بابِ آگہی
Conservation	تحفظ
Capacity	ظرفیت۔ بیت
Compassion	رحم۔ شفقت
Compunction	پشیمانی
Convergence	جھکاؤ
Cramming	رٹنا۔ ٹھونسنا
Cramp	اینٹھن
Culture	سلیقہ۔ تربیت

D

Deaf-mute	بہرا۔ گونگا
Decay of feelings	زوال احساسات
Deliberation	تامل۔ تفکر۔ سوچ
Depravation	خرابی۔ کمی
Development	ترقی۔ تدریج۔ ارتقا
Differentiation	تفریق۔ امتیاز
Diffustion	انتشار۔ پھیلاؤ
Dipsomania	جنون۔ شرابخواری
Discriminative Sensibility	احساسِ امتیازی
Disposition	مزاج
Disinterested Emotion	جذبۂ بے غرض
Double Contact	لمس دوگونہ
Domination	غلبہ
Duration of sensation	مدتِ احساس
Dynamometer	قوت پیما
Dynamo-metric Experiments	تجرباتِ قوت پیمائی۔
Ecstacy	حالتِ وجد
Emotional mood	جذباتی کیفیت
Endogamy	اپنے کفو میں شادی کرنا۔

اُمید	Hope	حالتِ نہائی	End-state
بھوک	Hunger	مرگی	Epilepsy
مسکین۔خاکسار	Humble	ناپائداری	Evanescence
رطوبتِ مزاج	Humour	ارتقا	Evolution
اختناق الرحم	Hysteria	سرافرازی	Exaltation
خیالی انا	Ideal self	تجربہ	Experience
خیالی میلان	Ideal Sentiment	اظہار	Expression
یکسانیت	Identity	وسعت	Extension
خیالی حرکتی	Idio-motor	خارجی (مادی)	External
غبی۔بیوقوف	Idiot	عمل	Function
عدم توجہی	Inattention	تکان	Fatigue
رکاوٹ۔مزاحمت	Inhibition	تھکن	
علم الصبیان	Infantilism	خوف	Fear
تقویت	Innervation	عجائب پرستی	Fetishism
سمجھ	Intellection	حاسہ۔احساس	Feeling
تکمیل	Integration	احساس حیاتی	Vital —
معاکست	Interaction	احساس گراں	massive —
استفہام	Interrogation		Voluminous —
احساس داخلی	Internal feeling	حالتِ حسی	Feeling tone
حرکتی جانی احساس	Kinaesthetic Sensation	غفلت۔بھول	Forgetfulness
		دوستی	Friendship
جاننا۔علم	Knowing	طباع	Genius
قانونِ اضافت	Law of relativity	کثیف۔وزنی	Gross
علم بالتجربہ	Learning by Experience	ہم آوازی	Harmony
		نفرت	Hate

Lovel	سطح
Localisation	تعین مقام
Love-animal	حب حیوانی
Lymphatis	بلغمی - کاہل
Majic	جادو
Mania	خبط - جنون - سنک
Mass	مادہ
Matter	مادہ
Mechanical Theory of nature	قدرتی میکانکی نظریہ
Medium activity	قلیت پذیر
Melacholia	الیخولیا
Melancholy	اداسی
Mixture	آمیختہ
Motor adaptation	حرکتی تطابق
Motor perception	حرکتی تصور
Notion	گمان
Nausea	کراہت - متلی
Need	ضرورت - احتیاج
Note-deafness	سُر بہرا پن
Nutrition	غذا
Object	شے
Observation	مشاہدہ
Obsession	محاصرہ - ستانا
Obstinacy	ضد - ہٹ

Odour	بو
Orator	جادو بیان
Organic Sensation	حاسہ عضوی
" Correlation	تناسب عضوی
Parallelism	متوازیت
Passive touch	لمس مجہول
Polymorphic	کثیر الصور
Phrenology	نفسیات دماغ
Present	موجود - حاضر
Presentation	استحضار
Preservation	حفاظت
Primary qualities	جواہر - صفات اولیہ
Primitive emotions	ابتدائی جذبات
Psychophysics	نفسیاتی طبیعیات
Reaction	ردِ عمل
— time	وقفہ ردِ عمل
Reality	حقیقت
Recognition	شناخت
Red-integration	تکمیل
Reflection	غور - تفکر
Repitition	دہرانا
Rest	سکون
Resignation	توکل
Reverence	تعظیم
Revival	احیاء

Ruling passion	جوش حاکم
Secondary qualities	صفات ثانویہ ۔ اعراض ۔
Self Consciousness	خود آگہی
Self projection	خود بالیدگی
Sense memory	یاد احساس
Sensibility	حسیت
Sensori motor	حسی حرکت
Sentiment	وجدان
Solidurity	یکجہتی
Spontaniety of interest	روانی ۔ توجہ
Stereoscope	سیٹراسکوپ
Spiritism	روح پرستی
Suicide	خودکشی ۔ انتحار
Stability	پائداری
Static	سکونی
Suffocation	دم گھٹنا
Surprise	تعجب
Suspicion	شک
Somnombulism	خواب خرامی
Tact	چال
Tactful	چالباز ۔ چالاک
Tear	آنسو
Temparament	مزاج
Temperate	معتدل
Temperature	حرارت
Tenderness	نرم دلی
Tendency	رجحان
Terror	ڈر
Thought	اندیشہ ۔ تخیل
Tongue	زبان
Touch	لمس
Trace	نشان
Truth	صدق ۔ سچ
Vascular reflex	رگوں کی تحریک
Vision	نظر
Vital	حیاتی
Will	مرضی
Wit	ذکا
Wonder	حیرت

ضمیمہ ۲ اصطلاحات مابعد الطبیعیات

اصطلاح انگریزی	ترجمہ
Abrogation	تنسیخ
Acatalepsy	تشکیک

Acomist	منکر وجود عالم
Actual	بالفعل
Adept	اکسیرگر۔ حوس
Adoration	بھگتی، پرستش محبت
Agnoilogy	جہلیات
Agnosticism	لاادریت
Analogousness of being	تشابہ ہستی
Animism	روح پرستی
Anthropomorphism	انس الہیت
Anima Mundi	روح عالم
Appearance	صورت
Archelogy	علم الاصول
Archetype	صورت ابتدائی
Atheism	انکار۔ کفر
Assumption	مفروضہ
Atom	ذرہ
Atomism	ذریت
Attribution	توصیف۔ نسبت
Automaton	کل۔ مشین
Automatic	خودرو
Autmatism	مادی فعلیت
Autonomy	آزادی۔ خودمختاری
B	
Beauty	جمال

Beautiful	جمیل
Being	ہستی۔ وجود
C	
Certainty	جزم۔ یقین کامل
Change	تبدیلی
Continuity	روانی۔ تسلسل
Contingency	شرط
Cosmogony	علم تخلیق عالم
Cosmography	تشریح عالم
Cosmology	نظریہ عالم
Creation	آفرینش
Critique / Criticism	تنقید۔ تعدیت
D	
Daemonism	بھوت پرستی
Deist	یزدانی
Deism	یزدانیت
Demiurge	معمار قدرت۔ خدا
Demon	بھوت۔ دیو
Delerminism	جبر
Discovery	ایجاد
Di-theism	دو یزدانیت
Dogma	عقیدہ
Dogmatism	اعتقادیت
Doubt	شک
Duration	مدت۔ زمانہ

E	
Ecstacy	حالتِ وجد
Election	انتخاب
Emanation	خروج۔ ظہور
Empiric	تجربی
Empiricism	تجربیت
Entelechy	حصولِ تام
Enthusiasm	سرگرمی
Ens	انس (وجود)
Entity	جوہر
Esoteric	تعلیمِ عوام
Exoteric	تعلیمِ خواص
Existence	ہونا۔ ہستی
Experimentum Crusis	تجربۂ آخری
Externality	خارجیت
F	
Faculty	قوتِ نفس
Faith	ایمان
Fancy	وہم
Fatalism	تقدیر پرستی۔ کرما
First cause	سببِ اول
Formalism	صوریت
G	
Genius	قدرتی قوت
Gnosticism	ادریت
H	
Harmony	یکسانیت
I	
Immaterism	غیر مادیت
Impossible	محال
Indefinite	غیر متعین
Innate	پیدائشی۔ جبلی
M	
Materialism	مادیت
Maxim	علم متعارف
Magnetism	مقناطیسیت
Metempsychosis	قالب بدلنا
Monotheism	وحدانیت
Misticism	تصوف
N	
Necessity	جبر
Norm	قانون۔ غایت
Numenon	نام
Optimism	زندہ دلی خوشحالی
Organ	آلہ
Outness	خارجیت
P	
Parallelism	متوازیت
Perfection	کمال
Phenomenon	مظہر

Philosophy	فلسفہ حکمت
PolyTheism	شرک
Potential	بالقوۃ
Possible	ممکن
Pragmatism or Humanism	انسی تجربیت
Sensism. Sensationalism Sensualism	مذہب الحسیت
Socialism	اشتراکیت
Spiritism	روح پرستی
Spiritualism.	روحانیت
Symbolism	تشبیہ
T	
Tabul Rasa	لوح سادہ
Theism	یزدانیت
Traditionalism	تقلیدیت / مدرسۂ تقلیدیہ
U	
Ubiety	موجودگی
Uniqueness	یکتائی
Unitarian	توحیدی
V	
Vitalism	حیاتیت

مجذوب کی بڑ

(جناب خواجہ سید عزیز الحسن غوری صاحب مجذوب بی اے اسسٹنٹ انسپکٹر مدارس)

بیاں ادنیٰ سا فیضِ صحبتِ پیرِ مغاں کر دوں ــــ جو گر جاؤں میں سجدہ میں زمیں کو آسماں کر دوں
کرو تم ظلم اور میں ترکِ فریاد و فغاں کر دوں ــــ زباں رکھتے ہوئے اپنے کو کیونکر بے زباں کر دوں
خودی کو بھی فنا کر دوں مٹا دوں بے نشاں کر دوں ــــ اڑا دوں جامۂ ہستی کے پرزے دھجیاں کر دوں
جو میں جوشِ جنوں میں خاک اڑا کر اک فغاں کر دوں ــــ تو گردوں کو زمیں کر دوں زمیں کو آسماں کر دوں
میں اپنے رنگ میں زاہد اگر ذکرِ بتاں کر دوں ــــ تو دم میں کافرِ صد سالہ کو تسبیح خواں کر دوں
ابھی اپنی ترنم ریزیوں سے وہ سماں کر دوں ــــ کہ پژمردوں کو زندہ اور پیروں کو جواں کر دوں
نہ گھبراؤ میں لو اب مختصر ہی داستاں کر دوں ــــ اک آہِ جانستاں میں حالِ شب اپنا بیاں کر دوں
نہ دنیا ہی کے میں لایق نہ عقبیٰ ہی کے میں قابل ــــ کہاں اپنے کو غائب اے زمین و آسماں کر دوں
ذرا ہشیار رہنا شیخ جی میں ہوں وہ مستانہ ــــ نظر میں زاہدِ صد سالہ کو پیرِ مغاں کر دوں
میں گو مجذوب ہوں لیکن بفیضِ مرشدِ کامل ــــ نظر میں راہزن کو رہنمائے سالکاں کر دوں

سلطنتِ اودھ اور زمیندار

(جناب مولوی تقی احمد صاحب ایم اے، ایل ٹی)

قصبۂ جرول ضلع بہرائچ کی ایک قلمی تاریخ دیکھنے میں آئی۔ مصنف اسی قصبے جرول کے خاندانِ سادات کے ایک نامور شخص تھے، جنھوں نے اپنے بزرگوں کے حالات قلمبند کیے ہیں اور اسی سلسلہ میں زمیندار طبقہ کی اقتصادی و معاشرتی حالت کا بھی خاکہ کھینچا ہے۔ تاریخ کے اس اہم پہلو پر روشنی ڈالنے والی تحریریں خصوصاً ہندوستانیوں کے قلم سے نہایت کمیاب ہیں۔ اسی لیے اس کتاب کے بعض اجزاء کی اشاعت ضروری معلوم ہوئی۔ چونکہ اسکے مطالعہ سے تصویر کا صرف ایک رُخ نظر آتا ہے، لہٰذا صحیح رائے قائم کرنے کی غرض سے ضروری ہے کہ فرمانروایانِ اودھ کی بے دست و پائی کا بھی لحاظ رکھا جائے۔ انگریز سیاح اور مورخین بھی اس سے انکار نہیں کرتے کہ سلاطینِ اودھ کے اختیارات اس قدر محدود تھے کہ امورِ سلطنت کو کامیابی سے انجام دینا قطعی ناممکن تھا۔ مثلاً ایک یورپین سیاح ۱۸۲۷ء میں اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے کہ "دیگر دیسی والیانِ ریاست کے جنھوں نے انگریزی ریزیڈنٹ اپنی سلطنت میں رکھ لیے ہیں شاہِ اودھ کی اس قدر نگرانی ہوتی ہے کہ امورِ سلطنت کا کیا تذکرہ یہ بھی ناممکن ہے کہ بلا اجازت ریزیڈنٹ کے اپنے حرم میں ایک عورت کا بھی اضافہ کرسکے"۔ تصویر کے دوسرے رُخ پر روشنی ڈالنے کے لیے یورپین مورخین اور سیاحوں کی کتابوں کے بعض حصے ترجمہ کرکے حاشیہ پر درج کردیے گئے ہیں تاکہ اس تحریر کو پڑھنے کے ساتھ ناظرین انکو بھی ملاحظہ فرمالیں اور صحیح رائے قائم کرسکیں۔ اب مصنف تاریخ مذکور کا بیان ملاحظہ ہو:-

تشخیص جمع کا کوئی اصول قائم نہ تھا۔ قانون گویوں اور چودھریوں نے کہدیا

سلہ یعنی نواب سعادت علی خاں کے زمانہ تک [illegible]۔ لیٹ صاحب اپنی کتاب [illegible] میں لکھتے ہیں کہ باوجود خرابیوں کے شروع [illegible] سے [illegible] ابتدائی دور حکومت سے مقابلۃً اچھا تھا۔ [illegible] و شجاع الدولہ [illegible] کے [illegible] وقتی [illegible] ملکی ضرورتوں کے لحاظ سے [illegible] نظام حکومت قائم کیا تھا کہ اودھ تمام دیسی ریاستوں سے زیادہ خوشحال تھا۔ آصف الدولہ بھی باوجود ذاتی خرابیوں کے یہ بہت بڑی قوت رکھتے تھے کہ [illegible] قابل کارکن لوگوں کی عزت [illegible] اپنی سرکار سے متعلق رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ)

وہی جمع صحیح - ابواب عذر مساودو - تکاسی پانچ سو ۔ جمع شخصہ ایک ہزار - قبولیت پر اکثر بعد تدارک بجراست دستخط بنوائے جاتے تھے - بلکہ دستخط قلمی لیسے ناظم یا چکلہ دار کے خیمہ کی چوب چھولینا کافی تھا - ایک جموگدار یا ضامن کا قطعہ ضمانت بھی فوراً داخل ہوا - یہ لوگ اکثر (قتلہ گران ؟) درباریں سے ہوتے تھے - یا اس تعلقدار کے دیرینہ دشمن جو اسی پردے میں اپنے دل کے پھپھولے پھوڑ لیتے تھے - گاؤں سب غیر آباد - فیصدی دس بیگہ بھی مزروعہ نہیں - فصل وچوب سے پہلے قرق - ضامن یا جموگدار صاحب قابض - شحنہ گاؤں گاؤں مقرر - رعایا مفرور - حسب عادت زیادہ ظلم ہونے لگا - زمیندار نے بھی موقع پاکر گھا گھرا پار کا راستہ لیا -

---

اخیر زمانہ کی بدنظمی کی بڑی وجہ ایلیٹ صاحب کی رائے میں ستاجری یا ٹھیکہ کے طریقہ پر عملدرآمد تھا - رزیڈنٹ صاحبان نے بھی بارہا اس طریقہ کے منسوخ کرنے کی رائے پیش کی تھی - گر دوسرے طریق عمل کا رواج یعنی امانی کے اصول کی پابندی کے لیے دو بڑی ضرورتیں تھیں - اول دیانتدار کارکنوں کی فراہمی، دوسرے مرکزی حکومت کا کامل اقتدار - مگر یہ دونوں باتیں اس وقت ناممکن تھیں اس لیے کہ شاہان اودھ کی حکومت محض نمائشی تھی کُل اختیارات سلب ہو چکے تھے -

۲ نواب سعادت علی خاں کے زمانہ میں ایک کروڑ تیئیس لاکھ کی جمع کا علاقہ سرکار کمپنی کو سپرد ہوا اور اسی وقت سے مجبوراً اخراجات کے پورا کرنے کے لیے بقیہ حصہ ملک بادشاہی محاصل کا اضافہ ضروری ہوگیا - سر انٹگمری Sir R. Montgomo کا بیان اناؤ گزیٹیر کے مصنف نے درج کرتے ہوئے لکھا ہے کہ نوابی کے دور میں کانپور سے ۲۲ لاکھ سے زیادہ کبھی وصول نہیں کیا گیا - انگریزی حکومت میں آتے ہی محاصل ۲۴ لاکھ پہلے ہی سال کر دیے گئے -

۳ آس پاس کے ملک کی حالت بھی مقابلتاً زیادہ اچھی نہ تھی - چنانچہ ہنٹر صاحب (Hunter) اینالز آف رورل بنگال میں لکھتے ہیں کہ ۱۷۸۹ء میں لارڈ کارنوالس نے تین سالہ تحقیقات کے بعد یہ اعلان کیا کہ بنگال میں کمپنی کے مقبوضات کا ⅓ حصہ محض جنگل ہے اور غیر آباد - ہر گاؤں کے گرد جنگل کی ایک پٹی ہے اور سرکاری کاغذات میں برابر یہ اندراجات موجود ہیں کہ جنگلی جانور ڈاک تک تھیلا گھسیٹ لے گئے -

۴ "رعایا کو سب سے کم تکلیف ہے ... اس لئے کہ جبر و تعدی کا اثر زیادہ تر گاؤں کے صاحب جائداد اور ذی وجاہت لوگوں پر پڑتا ہے کیونکہ بٹائی کا طریقہ جو اودھ میں جاری ہے رعیت کے لیے منفعت بخش ہے" (سینس آف ہندوستان - جلد سوم - رابرٹس ۱۸۳۵ء)

۵ یہ ماننا پڑیگا کہ لوگ کتنی ہی تکلیفیں کیوں نہ برداشت کرتے ہوں مگر ان تکالیف کو وہ قرب و جوار کے محکمہ مال کی سخت گیری اور محکمہ عدالت کی پریشان کن کارروائیوں سے بہتر خیال کرتے تھے" (اودھ گزیٹیر)

وصول کرنا خاک ہوتا۔ ہزارہا روپیہ باقی پڑا۔ زمیندار اگر پکڑ ملا تو قیدیں انواع و اقسام
کے وحشیانہ و ظالمانہ شدائد ان پر کیے جاتے تھے۔ زن و نابالغ بچے بھی دھمکی دینے کے
واسطے قید کیے جاتے تھے۔ ادھر تو سال قبولیت کا حساب و کتاب تمام نہیں ہوا
تھا۔ کہ دوسرے ٹھیکہ دار صاحب لکھنؤ سے خلعت پہن کر ڈنکا بجاتے ہوئے آ دھمکے۔ نئے
وہ اہلکار مفرور۔ وہ عملہ نائب۔ نئی دنیا نیا رنگ۔ پھر زمیندار تعلقدار پکڑ آئے۔ پھر
تشخیص ہونے لگی۔ الغرض یہی طوفان روز اٹھتا تھا۔ بطور نمونہ کے چند سال کی الٹ پلٹ
کو تحریر کرتا ہوں۔ ۱۲۴۲ف میں امداد علی خاں ناظم بہرائچ۔ علاقہ علی نگر حضور تحصیل۔ میر محمد جان
رسالدار ضامن میر عنایت علی جمعدار۔ فقط حساب اور واصلات سمجھنے میں سال ختم ہو گیا۔
۱۲۴۳ف راجہ درشن سنگھ ناظم پھر میر حسن زکی صاحب کی قبولیت اٹھائیس ہزار کی ہوئی۔ اسی
سال میں نصیر الدین حیدر بادشاہ کا انتقال ہوا۔ یہ فرو ہوئے طوفان بغاوت منا جان کے
محمد علی شاہ بادشاہ تخت نشین ہوئے۔ نواب روشن الدولہ وزیر اور سبحان علی خاں کمبوہ
وغیرہ کانپور کو نکالے گئے۔ باوجود ضعف پیری و معذوری قوائے جسمانی پانچ برس غنیمت
بادشاہت کی۔ اس طرفہ انتظام کو دیکھیے کہ ۱۲۴۵ف فصلی میں عہدۂ نظامت بہرائچ کا خلعت
مسماۃ وجیہۃ النساء بیگم زوجہ منیعت الدولہ کو مرحمت ہوا۔ تمام ضلع ملک گونڈہ اور بہرائچ دو
ضلعوں کی حکومت (جس کو اس وقت دو لائق ذی علم و تجربہ کار سولین انجام دیتے ہیں)
ایک[له] پردہ نشین جاہل عورت کے سپرد ہوئی۔ گرچہ نظامت الف ایلہ و... نے اشرف دین زندگی
کی بجا پیرا... کی امارت تھی۔ آغاز ۱۲۴۶ف میں خلعت نظامت امراؤ ہائشٹ کو عطا ہوا۔
ہمارے علاقے کی نمبر... صاحب... کے نام ہوئی۔ اسی سال

له جاگیرداری کا طریقہ نوابی کے زمانے میں بہت کچھ بدل گیا تھا۔ صرف فوجی خدمت یا منصب کے صلے
میں جاگیریں نہیں ملتی تھیں بلکہ بیگمات کو بھی عطا ہوتی تھیں۔ پردہ نشین مستورات خود انتظام کیا کرتیں ان کے
ملازمین خاص بڑی بڑی جاگیروں کا انتظام کرتے تھے۔ بہو بیگم کی جاگیر کا انتظام خواجہ سراؤں کے سپرد تھا۔
ایلیٹ صاحب کا بیان ہے کہ الماس علی خاں خواجہ سرا کے زیر انتظام لاکھ... قدر سرسبز و شاداب تھا کہ
ایک پر فضا باغ معلوم ہوتا تھا۔ اس موقع پر وجیہۃ النساء بیگم کو نظامت کا عطا ہونا بھی اسی طرح ہے تھا۔ نظامت
کے فرائض بھی جاگیرداری کے فرائض کی طرح سے عمدہ کارکنوں کی وساطت سے انجام دیئے جا سکتے
تھے۔

پرتھی پت سنگھ مورث تعلقہ مصطفیٰ آباد نے ہمارے گاؤں علی نگر میں ڈاکہ ڈالا - آگ لگادی۔ لوٹ لیا - چند سپاہی جو وہاں معین تھے مارے گئے ۔ اس کے تھوڑے دنوں کے بعد گیا پرشاد قانونگو حسام پور کا تحصیلدار ہوا - یہ شخص کینہ خصلت سراپا ظلم سیرت تھا - اس لیے ہمارے خاندان پر سخت تشدد کیے - موضع قصبہ گجیہ وکھونکرا ور صفہ جو دہ حسام پور اسی سال رہن ہوا - ۱۲۴۷ف میں خلعت نظامت شنکر سہائے پاٹک کو ملا میر یسین علی اس کے نائب تھے - یہ سال بھی بدستور قید وحراست میں گزرا - اخیر سال مذکور میں جناب میر علی اصغر صاحب کو خلعت میں ہاتھی مرحمت ہوا - ۱۲۴۸ف میں خلعت نظامت بہرائچ نواب سراج الدولہ بہادر کو عطا ہوا - یہ بیچارے لکھنؤ کے امیرزادے، انکو انتظام ملکی سے واسطہ ہی کیا - انکی نظامت کو رونق نہ ہوئی - کارندوں پر دارومدار تھا - ہمارے علاقہ کی قبولیت مشترکہ دادا صاحب اور نانا صاحب کے نام سے ہوئی مگر باوجود غل مچانے کے کسی نے سماعت نہ کی اور ہمارے دشمن نقلی سرب جیت سنگھ کی ضمانت کرائی گئی - ضامن صاحب نے اقرارنامہ ضمانت کے ساتھ ہی انجھاپور کا بیعنامہ لکھوالیا - ۱۲۴۹ف میں پھر راجہ درشن سنگھ ناظم ہوئے - اس حکومت کے آغاز ہونے سے پہلے ہی پرتھی پت مذکور نے پھر علی نگر پر ڈاکہ مارا - دوست محمد وغیرہ چار سپاہی گڑھی میں مارے گئے - یہاں سے بغرض انتظام فوج کشی کی گئی لیکن ڈاکو مذکور بھاگ گیا تھا نوکروں سے کچھ لڑائی ہوئی وہ بھاگ نکلے - چونکہ راجہ بہادر سے پرتھی پت خائف تھا بھاگ گیا اور تنہا بونڈے کو چلا گیا - اس سال وہی سرب جیت فصلی دونی جمع پر قبولیت لکھوائی گئی اور وہی سرب جیت سنگھ پھر ضامن ہوئے - کوئی عذر پذیرا نہ ہوا ضامن کی طرف سے بھاگی سنگھ ساکن انجھا پور مجوگزار ہوئے - یہ سات مواضع ان کی تحصیل میں تھے - بونڈھا - جھلار - کرا آسر - انجھا پور - صالح پور - غمریٰ - حسن پور - کبری - ہمارے کارندوں میں بھاگی کا سیتھ بڑا ظالم اور مفسد کارندہ تھا - اس کا شیوہ تھا کہ حکام وقت سے مل کر اپنے آقا کو انواع مصائب میں پھنسا دیتا تھا - گو خود بھی ذلتیں اٹھاتا تھا - بہت سے دستاویزات کے رہن نامے اور بیعنامے اسی سال نہایت جبروستم سے لکھوائے گئے - چونکہ ناظم نے مجبور تہ صیغہ داران پرگنہ سے گواہیاں لکھوائیں - اگرچہ والد ماجد مغفور نے لکھنؤ جاکر بہت سے عرائض استغاثہ نسبت اس بیجا برتاؤ طریق عمل کے

۵۷ "مگر اس قسم کی لڑائیاں اور مناقشات اس قوت کو زائل رکھنے والے طبقہ میں ایک روح پھونکدیتے تھے اوران سے تمدنی تازگی بھی مترتب ہوتی تھی" (لینڈ سسٹمس آف برٹش انڈیا مصنفہ بیڈن پاول)

پیش کیے لیکن نقارخانہ میں ایسی صدائے فریاد کون سنتا تھا۔ وہ عہد سلطنت حضرت
امجد علی شاہ مرحوم کا تھا۔ جو احکام بہ وقت اجرا ہوئے اُن کی حکام مفصل نے وقعت تک
نہ کی سماعت کون کرتا۔ سنہ ۵۰ فصلی میں نظامت بدستور راجہ بہادر کے متعلق رہی اور بوجہ
تشدد میر علی اصغر صاحب حضرت پور ضلع بارہ بنکی کو معہ عیال چلے گئے۔ سربجیت سنگھ کل علاقے
پر بطور خام تحصیل متصرف ہوگیا۔ والد مغفور شب و روز دربار لکھنؤ میں کوشش و فریاد کرتے
رہے مگر بمقابلہ تبروت راجہ درشن سنگھ اُن کی کون سنتا۔ سنہ ۵۱ فصلی میں خلعت نظامت
بہرائچ حکیم احسان علی خاں کو عطا ہوا اور ہادی حسن خاں صاحب اور نبی بخش خانصاحب
خان زادگان کھیوا منو ان کی سرکار میں مدار المہام ہوئے۔ امید تھی کہ یہ ہمارے جوار کے
رئیس اور ایک طرح کے رشتہ دار بھی ہیں انکے دور دورہ میں ابتر امور بھی درست ہوجائینگے
بوقت ملاقات بہت تشفی آمیز کلمات کہے۔ ابتدا میں تو عنوان توجہ اچھا رہا اور جو عرض کیا
پذیرا ہوا۔ چونکہ محرم قریب آگیا تھا، والد مغفور و جدامجد مرحوم اجازت لیکر گھر کو آئے وہاں
مفسدوں نے موقع پایا۔ خوانین ذی اقتدار کو ہر طرح سے آمادہ بمستعد ہموار کرکے سربجیت
سنگھ ٹھکور کو کل پرگنہ حسام پور کا اجارہ دار کروا دیا۔ افسوس ہے کہ ان حضرات نے کچھ پاس
اخوت ایمانی بھی نہ کیا۔ قرابت تو درکنار۔ مجبوراً عین ۱۲ محرم کو یعنی بغیر فاتحہ سوم امام شہید
کیے ہوئے خوف تاراجی سے معہ عیال گھر چھوڑنا پڑا اور اُس پار جاکر حضرت پور میں پناہ لی۔
وہ زمانہ وزارت نواب منور الدولہ بہادر کا تھا۔ سادات ظلم رسیدہ نے عرائض استغاثہ پیش
کیے اور ڈیوڑھی وزارت سے بعد ناظم بہ (سزاول؟) مقرر ہوئے۔ سربجیت سنگھ کا اجارہ داری
سے اخراج ہوا۔ یہ فریاد خوانین ناعاقبت اندیش کے خلاف مزاج ہوئی۔ اور بموجب تشخیص سنہ ۱۲۵ فصلی
جمع قبولیت قرار دی۔ باوجودیکہ دیہات تھوری خورد۔ تھوری بزرگ۔ سوتاری۔ سیمری۔
کھجوا۔ دھرم پور کو باوجودیکہ ہمارے علاقے سے بھی نکال کر بلا سماعت عذر سربجیت سنگھ کے
علاقہ و قبولیت میں شامل کر دیا۔ بقیہ علاقہ کی قبولیت ہوئی اور وہی ٹکرام کا رندہ وہاں
جمعدار مقرر ہوا۔ اُس نے خوب علاقہ کو برباد کیا۔ جو چاہا سرکار میں دیا جو چاہا عمال کو
دیا جس قدر چاہا خود تصرف و خورد برد کیا۔ نہ مالک کو کسی امر کی خبر کی نہ ایک حبہ علاقے سے
دیا۔ اور خاندان کی عسرت کو دیکھتا رہا بالآخر زیتی مرضی عمال کو پہونچا۔ یعنی قتل ہوا۔
سنہ ۵۱ فصلی میں خلعت نظامت بہرائچ میر امجد علی خاں کو ملا مگر فرامین شاہی میں نام ناظم کا

احمد علی خاں تحریر ہوتا تھا - بہرام گھاٹ پر جناب جد امجد نے ملازمت حاصل کی۔ حسام پور کے مقام میں عرضداشت متضمن شکایت - رنجیت سنگھ پیش ہوئی حکم دیا کہ پنچایت کرلو - فریق ثانی رجوع نہ ہوا لیکن علاقہ کی پوری قبولیت لکھانے پر سختی کی گئی یہاں تک کہ حراست کا حکم ہوا - وہ زمانہ نواب امداد حسین خاں کی وزارت کا تھا اور عہد سلطنت حضرت امجد علی شاہ باوصف استغاثہ وکد وکوشش کوئی نتیجہ نہ نکلا - ۱۲۵۳ھ میں راجہ رگھوبر سنگھ پسر اوسط راجہ درشن سنگھ کو نظامت ملی - بہاری لال ان کا نائب ہوا - بروقت تشخیص جمع بوجہ سنگینی جمع کی قبولیت پر دستخط کرنے سے عذر کیا گیا - نتیجہ یہ ہوا کہ جد امجد کو پرتھی پت سنگھ دشمن خاص کے سپرد کیا گیا اس نے بڑی سختی سے حراست میں رکھا - اہل وعیال بھاگ کر لکھنؤ گئے - وہاں استغاثہ کی شنوائی میں بہت عرقریزی کی گئی - آخرکار دو حبشی سوار تعینات ہوئے - وہ جد امجد کو حراست سے چھڑا کر نویں محرم کو لیکر لکھنؤ پہونچے - تیسرے روز رہائی ہوئی - لیکن درستی معاملہ علاقہ کی کوئی صورت نہ ہوئی - ۱۲۵۳ھ فصلی اسی دوا دوش میں تمام ہوگیا - اسی سنوات میں دیہات براہیم پور، بلہورہ وغیرہ ہمارے علاقہ سے نکل کر شامل تعلقہ گنڈارہ ہوئے - صرف علی پور باقی رہ گیا - اسی سال ۱۲۵۳ھ (مطابق ۱۵ محرم ۱۲۶۳ھ) کو دادی صاحبہ نے بمقام اودھ انتقال فرمایا - ۱۲۵۵ھ میں خلعت نظامت راجہ اچھا سنگھ کو عطا ہوا - اس کے دربار میں رام چرن کایستھ ساکن حسنہ پیش پیش تھا - اس نے اس قدر آدمیت کی کہ والد مرحوم[شہ] کو بلا کر علاقہ کی قبولیت کرادی اور خود منجانب راجہ گونڈہ ضمانت کرلی - بعد حصول پروانہ گھر کو آباد کرنے کی نوبت آئی - اسی سال میر بشارت علی کی قبولیت بھی بوساطت رام چرن ہوئی - اسی سال جد امجد میر حسن کی صاحب نے انتقال فرمایا - جس کا ذکر اوپر آچکا ہے - باوصف آشتی وانسانیت رام چرن کے تصفیہ مالگذاری کا نہ ہوا - فرضی بہت نامے لکھوا لئے گئے - ۱۲۵۶ھ میں میر محمد حسن خاں بارہوی کو خلعت اور نظامت کا خطاب عطا ہوا - والد مرحوم اسوقت میں علیل تھے بعد صحت لشکر ناظم صاحب

شہ علاقہ کی قبولیت کبھی مصنف کے دادا کبھی نانا اور کبھی والد کے نام ہو جاتی تھی اس طرح گویا علاقہ خاندان کے باہر نہیں جانے پاتا تھا - ایلیٹ صاحب لکھتے ہیں کہ نوابی اور انگریزی اصول میں یہ بڑا فرق تھا کہ انگریزی حکومت میں محاصل شاہی کی عدم ادائگی کے بعد اگر علاقہ ضبط ہوجاتا تو کوئی رعایت ممکن نہ تھی گرنوابی میں اس کا خیال رکھا جاتا تھا کہ پورا خاندان تباہ نہ ہونے پائے - اور اسی غرض سے اگر سزا کے طور پر ایک شخص کے نام سے علاقہ منضبط ہوگیا تو خاندان کے کسی دوسرے فرد کو بحیثیت پرورش پورا علاقہ یا کچھ کم دیدیا جاتا تھا -

میں حاضر ہو کر شرف ملازمت حاصل کیا۔ نانا صاحب مغفور نے بھی ملاقات کی۔ گر ہمراہی لشکر کا حکم والد مرحوم کو ہوا۔ یہ ساتھ رہے۔ علاقہ بدستور جھوگداروں کے تصرف میں رہا۔ گو زمانہ اور اور وقت مناسب نہ تھا مگر بلحاظ درستی اور زنانہ داری اسی سال بالکل سادے طریقہ سے حضرت والد مرحوم کی شادی دختر بزرگ میر علی اصغر صاحب یعنی حقیقی چچا کی لڑکی سے ہوئی چونکہ وہ بزرگ خانداں تھے۔ پھر قبولیت تعلقداری کی انھیں کے نام ہوئی۔ وہاں وہی نکرام کارندہ دخیل تھا۔ وہی حالت ابتری کی ہوئی جو ہوا کی تھی۔ آخر کار والد مرحوم کبیدہ ہو کر لکھنؤ چلے گئے۔ وہاں بذریعہ تحریر دریافت ہوا کہ جناب جد امجد میر علی اصغر صاحب نے بعارضۂ تخمۂ وبائی انتقال فرمایا۔ گو طبیعت کارہ تھی مگر مجبوراً والد مرحوم کو گھر آنا پڑا۔ آخر سال میں میر محمد حسین صاحب کا لشکر جر دل میں آ کر مقیم ہوا۔ چھ سو باقی نکلی۔ اسکے واسطے یخ نواب علی گولہ انداز کی قبض کرادی۔ ۱۲۵۷ف کا بھی خلعت نظامت سید موصوف کے واسطے آیا چونکہ ان کی نظر عنایت تھی۔ معاملات میں گونہ آسانی رہی۔ قبض و جھوگ سے تو نجات نہ تھی کہ یہی اصول عملداری تھے۔ اسی سال میں میر ظہور عباس صاحب مغفور کا صرف عقد شرعی میر حبیب اللہ کنتوری کی دختر بزرگ سے ہوا۔ اسی سال آٹھ برس کے بعد موضع آئمہ بیگھا پور کو قبضۂ تعلقۂ بہرام پور سے حاصل کر کے دخل پایا۔ ۱۲۵۸ف اس سال بھی خلعت نظامت سید بارہوی موصوف نے زیب تن کیا۔ اسی سال بوجہ دہانید سات روپیہ تنخواہ پلٹن کپتان نبیر صاحب کے مجبوراً اس پلٹن کے ساتھ سافر خانہ ضلع سلطان پور تک جانا پڑا۔ راستے میں بڑی صعوبتیں اُٹھائیں۔ جب ناظم صاحب کا پروانہ پہونچا تب رہائی ہوئی۔ براہ راست گونڈہ تک آئے۔ ناظم صاحب سے ملاقات کی اسی اثناء میں راجہ رام دت پانڈے مشہور و نامور رئیس گونڈہ محض فضولی و لفظی نزاع پر نظامت کے سپاہیوں کے ہاتھ مارے گئے۔ فوج نظامت نے راجہ کے گھر کا بھی محاصرہ کر لیا۔ بالآخر بتوسط صاحب رزیڈنٹ درثاء راجہ نے استغاثہ کیا۔ وہ عہد سلطنت واجد علی شاہ کا تھا انکا جلوس ۱۲۶۳ھ مطابق ۱۸۴۷ء میں تھا۔ مرافعہ شرعیہ گو اسقدر رواج پر نہ تھا مگر اقتدار ضرور باقی تھا۔ ناظم صاحب طلب ہوئے۔ بعد تحقیقات سید موصوف الزام خون سے بری ہوئے لیکن اپنے عہدۂ نظامت سے محروم ہو گئے۔ ۱۲۵۹ف مطابق ۱۸۵۲ء نظامت خلعت راجہ مان سنگھ خلعت راجہ درشن سنگھ کو ملا۔ وہاں بھی وہی قاعدہ ناپرسی اور زبردستی

قبولیت پر دستخط کرانے کا جاری تھا۔ علاوہ بریں سرو سامان جھوکداروں اور قبض والوں کا دخل و تصرف رہا۔ کارندے اور اہلکار گرفتار ہوئے۔ خود والد صاحب مرحوم لکھنؤ میں روپوش رہے۔ یہ زمانہ بھی بشکل سنہ ۱۲۷۵ و ۱۲۷۶ فصلی کے پریشانی میں گزرا۔

دونوں پہلوؤں کو دیکھنے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ طریقۂ حکومت کی خرابیوں سے رعایا کو پریشانی ضرور تھی۔ مگر اول تو یہ پریشانی اودھ کی رعایا کے لیے مخصوص نہ تھی اس لیے کہ بنگال اور دوسرے صوبوں کی حالت بھی مقابلتاً بہت زیادہ اچھی نہ تھی۔ جس کا پہلا ثبوت تو یہ ہے کہ رعایا نے اس صوبہ کی بود و باش ترک کرنا کبھی پسند نہیں کیا۔ دوسرے یہ کہ بعض واقعات اس کا پتہ بھی دیتے ہیں کہ انگریزی حکومت کے کامل تسلط سے پیشتر اٹھارویں صدی کا آخری دور اور انیسویں صدی کا آغاز ہندوستان بھر کے لیے بدامنی کا زمانہ تھا۔ ہنٹر نے اینالس آف رورل بنگال میں اسی زمانہ کا حال بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "پرانے لوگوں کو اس وقت تک وہ زمانہ یاد ہے جب کوئی شخص رات کو عمدہ شالیں اوڑھ کر چوروں اور ڈاکوؤں کے خوف سے باہر نہیں نکل سکتا تھا۔" جب قرب و جوار کے ملکوں کا یہ حال تھا تو اودھ کی سلطنت کو نشانۂ ملامت بنا لینا انصاف سے بعید ہے۔ علاوہ اس کے کمپنی کی حکومت اور سلطنت اودھ کے تعلقات کی پیچیدگی بھی بڑی حد تک اس بدامنی کی ذمہ دار تھی۔ [illegible] کا مصنف لکھتا ہے کہ "جو شخص مل صاحب کی مستند تاریخ کو غور سے پڑھے گا اس کا اس نتیجہ پر پہنچنا لازمی ہے کہ جس زمانہ میں فرمانروایان اودھ کو ملکی معاملات میں آزادی حاصل رہی ملکی اور مالی ترقی بھی ہوئی۔ مگر جب انگریزوں کی طرف سے مداخلت ہوئی تو بدنظمی اور گڑبڑ بھی ساتھ ساتھ شروع ہو گئی"۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ کمپنی نے سلطنت اودھ پر مالی ذمہ داریوں کا اتنا ناقابل برداشت بوجھ ڈال دیا تھا کہ اس کا اٹھانا ناممکن تھا۔ میجر برڈ نے اسپولیئشن آف اودھ میں لکھا ہے کہ "وارن ہیسٹنگز کا سا شخص بھی اودھ کے ساتھ کمپنی کی معاملات کا خاکہ کھینچتے ہوئے یہ بیان کرتا ہے کہ کمپنی کے وہ فوجی و غیر فوجی ملازمین جو سلطنت اودھ سے متعلق تھے اپنے اقتدار، تعداد، پنشن، انعامات اور تنخواہوں کی کثرت سے نواب وزیر کی طاقت اور مالی حالت پر ناقابل برداشت بوجھ ڈالتے ہیں"

(نوٹس آن انڈین افیرس)

نرنجن پور کے بابو

(جناب مولوی محمد اظہار الحسن صاحب بی اے ایل ایل بی (علیگ) وکیل غازی آباد)

نرنجن پور کے بابو کسی زمانے میں بڑے زمیندار تھے اور اپنی شاہانہ فضول خرچیوں کے لیے مشہور۔ ڈھاکہ کی ململ ان کے نازک بدن میں چبھتی تھی۔ گڑیوں کے بیاہ میں ہزاروں روپیہ خرچ ہو جاتا تھا۔ کہتے ہیں کہ ایک خاص جشن کے موقع پر رات کو دن بنانے کے لیے انھوں نے سینکڑوں شمعیں روشن کرائیں اور دھوپ کی شعاعوں کا سماں پیدا کرنے کے لیے فضائے آسمانی سے نقرئی تار برسائے گئے۔ یہ قصہ ہے جب کا کہ نقش جواں تھا۔ ان یادگار زمانہ رئیسوں سے سہولت و ثروت نے جلد منہ موڑ لیا۔ فتیلہ سوز میں بہت سی بتیاں روشن تھیں۔ تیل ختم ہو گیا۔ اور روشنی جاتی رہی۔

ہمارے ہمسایہ کیلاش بابو کی ذات چراغ کشتہ کی آخری بھڑک تھی۔ انکے ہوش سنبھالنے سے قبل انکے گھرانے کی شمع عظمت قریب قریب بجھ چکی تھی۔ باپ کے مرنے پر غمی کی رسوم دھوم دھام سے ادا ہوئیں اور پھر دیوالہ نکل گیا۔ جائداد قرضہ کی نذر ہو گئی۔ نقد سرمایہ جو کچھ رہ گیا تھا وہ خاندانی حشمت کی بقا کے لیے قطعی ناکافی تھا۔ کیلاش بابو نرنجن پور چھوڑ کر کلکتے چلے آئے۔ انکے صاحبزادہ نے عظمت رفتہ کی اس دنیا میں زیادہ عرصے تک قیام نہ کیا اور ایک بچی کو اپنی نشانی چھوڑ کر دوسرے عالم کی راہ لی۔

کلکتے میں ہم کیلاش بابو کے پڑوسی ہیں اور عجیب اتفاق ہے کہ ہمارے خاندان کی روداد اُن سے قطعی متضاد ہے۔ میرے والد نے اپنی قوت بازو سے روپیہ پیدا کیا اور اس پر فخر کرتے رہے کہ انھوں نے کبھی ضرورت سے زیادہ ایک پائی خرچ نہ کی۔ ان کا لباس اور انکے ہاتھ پیر کاروباری آدمیوں کے سے تھے۔ مسرفانہ شوکت و تجمل سے بابو کا خطاب حاصل کرنے کی ہوس اُن کو کبھی نہ ہوئی۔ میں اُن کا اکلوتا بیٹا ہوں اور انکی عادتوں کا شکرگزار۔ مجھے انھوں نے بہترین تعلیم دلائی اور دنیا میں اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے قابل بنا دیا۔ مجھے اپنی تجوری میں شکن آلود کرنسی نوٹ طویل نسب نامہ سے کہیں زیادہ عزیز ہیں۔

میرا خیال ہے کہ کیلاش بابو سے میری نفرت کا راز صرف یہی تھا کہ وہ اپنی بگڑی ہوئی ریاست کا سکہ جمانے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ اُن کی نگاہ میں میری وقعت محض اس وجہ سے نہ تھی کہ میرے والد نے محنت کرکے روپیہ پیدا کیا تھا۔

مجھے یہ احساس کر لینا چاہیے تھا کہ میرے سوائے کسی اور شخص کو کیلاش بابو سے کوئی شکایت نہ تھی بلکہ ان سے زیادہ مرنجاں مرنج بزرگ کا ملنا مشکل تھا۔ وہ شادی

اور غمی کے موقعوں پر مروت و ہمدردی کے اظہار کے لیے ہمیشہ آمادہ رہتے تھے اور اپنے ہمسایوں کے یہاں ہر تقریب اور تہوار میں شریک ہوتے اور ہر چھوٹے بڑے سے خندہ پیشانی سے ملتے۔ دوسروں کے خانگی حالات دریافت کرنے کا انھیں شوق تھا۔ راستہ میں آتے جاتے اگر کوئی شناسا ان کو مل جاتا تو مجبوراً اسکو کھڑا ہونا پڑتا اور وہ اس قسم کے سوالات کا ایک طویل سلسلہ شروع کر دیتے۔ "بھئی تم سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ شاسنی کیسی ہے؟ اور دادا تو اچھی طرح ہیں؟ آپ نے کچھ سنا؟ مجھے ابھی ابھی معلوم ہوا کہ مادھو کے لڑکے کو بخار آ گیا نہ معلوم اب کس طرح ہے؟ اور ہری چرن بابو سے تو مدت سے ملاقات ہی نہیں ہوئی اچھی طرح تو ہیں؟ رکھل کا کیا حال ہے؟ اور... ہاں... آپ کے یہاں کی مستورات تو بخیریت ہیں؟"

کیلاش بابو کا لباس ہمیشہ صاف ستھرا رہتا تھا گو ان کے پاس کپڑے زیادہ نہ تھے۔ وہ روزانہ اپنی قمیصیں، اسکیٹش کوٹ، پاجامے احتیاط سے نکالتے اور پلنگ کی چادر، تکیہ کے غلاف، اور اس مختصر فرش کے ساتھ جو روزانہ کی نشست کے کام آتا تھا انکو دھوپ دکھاتے۔ اسکے بعد وہ ان کو جھاڑتے برش کرتے اور پھر تہ کر کے رکھ دیتے۔ ان کا فرنیچر اگرچہ مختصر تھا لیکن کمرے کی آرائش کے لیے کافی تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ ضرورت کے لیے اور سامان بھی موجود ہے۔ ملازم نہ ہونے کی وجہ سے اکثر وہ تھوڑی دیر کو مکان کا دروازہ بند کر کے اپنی قمیصوں وغیرہ پر استری کرتے اور اسی قسم کے دوسرے معمولی معمولی کام اپنے ہاتھ سے انجام دیتے۔ اس کے بعد وہ دروازہ کھول دیتے اور دوستوں سے ملنے کے لیے تیار ہو جاتے۔

کیلاش بابو کی جائداد تو ان کے ہاتھ سے نکل گئی تھی لیکن کچھ خاندانی تبرکات باقی تھے۔ نقرئی گلاب پاش، نقشیں عطردان، طلائی کشتی، ایک بیش قیمت پرانی شال، بزرگوں کے وقت کی دستار، اور قدیم طرز کے خلعت، یہ چیزیں ابھی ان کے پاس موجود تھیں جن کو انھوں نے بڑی دقتوں سے قرضخواہوں کے چنگل سے بچایا تھا ہر مناسب موقع پر وہ ان کو بڑے تزک و احتشام سے نکالتے اور اس طرح نرنجن پور کے بابوؤں کی شہرۂ آفاق شان و شوکت کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرتے۔ بہ باطن وہ بہت حلیم اور بردبار انسان تھے لیکن روزانہ گفتگو میں اپنے خاندانی وقار کا آزادانہ تذکرہ ان کے نزدیک ایک مقدس فرض تھا۔ ان کے احباب کو اس میں خاص لطف آتا تھا اور وہ اپنی خوش طبعی سے ان کو اور کبھی بڑھا دیتے تھے۔

پڑوس کے لوگ انھیں ٹھاکر دادا کہنے لگے تھے وہ لوگ ان کے یہاں آ کر گھنٹوں بیٹھتے لیکن بعض زیاری سے بچانے کے لیے ایک نہ ایک دوست تھوڑا سا تمباکو لے آتا اور کہتا "ٹھاکر دادا آج میرے پاس گیا سے تمباکو آیا ہے۔ اسے دیکھیے آپ کو پسند ہے یا نہیں؟" ٹھاکر دادا ایک دو کش لگا کر رائے دیتے "بہت اچھا ہے" پھر کہتے "تمباکو تو ایک مرتبہ نرنجن پور میں میں نے بہت نفیس پیا تھا۔ ایک گنی فی اونس کے نرخ سے فروخت ہوتا تھا۔

آپ لوگوں میں سے کوئی صاحب اگر شوق کرنا پسند کریں تو میرے پاس ابھی کچھ تھوڑا سا باقی ہے حاضر کر دوں۔" لیکن سب جانتے تھے کہ اگر کسی نے فرمائش کر دی تو پھر یا تو الماری کی کنجی کھو جائیگی یا پھر گنیش ملازم اس کو کہیں رکھ کر بھول گیا ہوگا اور وہ فرمائینگے "نوکروں کے ہاتھ پڑ کر کوئی چیز ٹھکانے سے نہیں رہتی نہ معلوم کہاں ڈال دیتے ہیں۔ اب اس گنیش ہی کو دیکھ لیجیے، کیا کہوں کس قدر بیوقوف ہے لیکن اس کو علیحدہ کرتے ہوئے بھی جی دکھتا ہے۔" اور گنیش بھی آقا کی بات رکھنے کے لیے سارا الزام بے چون و چرا اپنے سر لینے کو تیار رہتا تھا۔ ایسے موقع پر حاضرین میں سے کوئی نہ کوئی کہتا "جانے بھی دیجیے۔ ٹھاکر دادا۔ آپ تکلیف نہ کریں۔ یہ تمباکو جو ہم پی رہے ہیں اچھا خاصا ہے۔ آپ کا تمباکو تو بہت تیز ہوگا۔" اب ٹھاکر دادا اطمینان سے بیٹھ جاتے اور گفتگو کا سلسلہ پھر شروع ہو جاتا۔

احباب رخصت ہوتے تو ٹھاکر دادا دروازے تک مشایعت کرتے اور دیوڑھی پر آکر کہتے "اور ہاں یہ تو کہیے آپ لوگ میرے یہاں کھانے پر کب تشریف لائیں گے۔" اس پر کوئی نہ کوئی جواب دیتا "ابھی نہیں ٹھاکر دادا ابھی نہیں۔ پھر کوئی تاریخ مقرر ہو جائے گی۔" وہ کہتے۔ "اچھا خیر بارش ہو جانے دیجیے۔ آجکل تو گرمی بہت ہے اور جیسی عظیم الشان دعوت میں آپ کو دینا چاہتا ہوں اس کی وجہ سے آپ سب کو ایسے موسم میں زحمت بھی ہوگی۔" جب برسات شروع ہو جاتی تو ہر شخص احتیاط رکھتا کہ انکو وعدے کی یاد نہ دلائے اور اگر کبھی یہ ذکر چھڑ بھی جاتا تو کوئی صاحب آہستہ سے کہہ دیتے "آجکل بارش میں کہیں آنے جانے سے بہت تکلیف ہوتی ہے برسات ختم ہو جائے تو دیکھا جائے گا۔" غرض یوں ہی یہ کھیل بنا رہتا۔

ٹھاکر دادا کا چھوٹا سا مکان ان کے شایان شان نہ تھا اور ہم سب اس معاملہ میں ان کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا کرتے تھے۔ ان کے دوست انھیں یقین دلاتے کہ ہمیں آپ کی دقتوں کا احساس ہے۔ کلکتہ میں کسی نفیس مکان کا دستیاب ہونا قریب قریب ناممکن ہے اور ہم سب عرصہ سے آپ کے لیے ایک مناسب مکان کی تلاش میں ہیں۔ شاید مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ان کے دوستوں میں سے ایسا بیوقوف کوئی بھی نہ تھا جو واقعی ان کے لیے کسی مکان کو حاصل کرتا۔ ٹھاکر دادا بانداز قناعت کہتے "معلوم تو یہی ہوتا ہے کہ مجھے اسی گھر میں بسر کرنا ہوگا۔" اسکے بعد وہ مسکرا کر فرماتے "آپ جانیں میں دوستوں سے علیحدہ تو رہ ہی نہیں سکتا۔ آپ لوگ نزدیک رہیں تو پھر مجھے کیا چاہیے آپ کے قرب سے ہر تکلیف کی تلافی ہو جاتی ہے۔"

نہ جانے کیوں ہمیں یہ باتیں ناگوار رہتیں۔ غالباً یہ وجہ ہوگی کہ جوانی میں انسان کے نزدیک سادہ لوحی بدترین جرم ہوتی ہے۔ کیلاش بابو دراصل سادہ لوح نہ تھے۔ روزمرہ کے کاروباری معاملات میں تو دوسرے لوگ بھی ان سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ ہاں نرنجن پور

کے متعلق ان کی گفتگو واقعی عقل سلیم سے بعید ہوتی تھی ان کی خاطر سے کوئی ان کی لن ترانیوں کی تردید نہیں کرتا تھا اس لیے وہ بھی حد سے متجاوز ہو جاتے تھے۔ جب لوگ ان کے سامنے زنجن پور کی تاریخ کے عظیم الشان واقعات غلو کے ساتھ بیان کرتے تو وہ سنجیدگی سے ان کو تسلیم کر لیتے اور انھیں کبھی خواب میں بھی یہ خیال نہ ہوتا کہ کوئی ان کی صحت میں شبہ کر سکتا ہے۔

کیلاش بابو کے متعلق میں اپنے محسوسات اور خیالات کا تجزیہ کرتا ہوں تو مجھے معلوم ہوتا ہے کہ میری ناخوشی کے اسباب ذرا اور گہرے تھے۔ بات یہ تھی کہ میں ایک متوسل گھرانے کا فرد ہوں اور کالج میں تفریح اوقات کر سکتا تھا لیکن میں نے محنت کر کے تھوڑی ہی سی عمر میں ایم اے پاس کر لیا۔ میرے چال چلن میں کوئی نقص نہ تھا اور میری شکل و صورت بھی اچھی تھی اگر میں اپنے کو خوبصورت کہوں تو ممکن ہے اسے خود ستائی پر محمول کیا جائے لیکن غلط نہ ہوگا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا کہ لڑکیوں والوں کی نگاہیں مجھی پر پڑتی تھیں۔ کم از کم مجھے خود تو اس بات کا یقین تھا اور میں نے شادی کے بازار میں اپنی پوری قیمت اٹھانے کا تہیہ کر لیا تھا۔ جب میں اپنے انتخاب کا تصور کرتا تو میری نگاہوں میں ایک دولتمند باپ کی اکلوتی بیٹی ہوتی نہایت حسینہ اور اعلیٰ تعلیم یافتہ۔ دور دور سے پیام آنے شروع ہوئے۔ بڑی بڑی رقمیں پیش کی گئیں۔ میں ان تمام پیاموں کو قطعی غیر جانبدارانہ انداز سے اپنے احساس خودی کی نازک میزان میں وزن کرتا لیکن اپنی شریک حیات بننے کی اہلیت کسی میں نہ پاتا۔ میں شاعر کی بھوتی کا ہمخیال ہو گیا تھا کہ اس دنیا کے غیر محدود زمان و مکان میں ممکن ہے کوئی ہستی ایسی بھی پیدا ہو جائے جو میرے حسن شاہانہ کی رفیق بننے کی اہل ہو۔ لیکن عصر نو کی قلیل مدت میں اور بنگال جدید کی مختصر سرزمین پر کسی ایسی بے نظیر ہستی کا وجود پایا جانا مشکوک تھا۔ اس اثنا میں متوقع والدین میرے گن مختلف شہروں اور نگروں میں گاتے رہے۔

میں ان کی لڑکیوں کو پسند کرتا یا ناپسند لیکن یہ پرستش بہر حال ناخوشگوار نہ تھی۔ میں اس کو اپنا حق تصور کرتا تھا۔ کیونکہ میں تھا بھی ایسا ہی حسین۔ کہتے ہیں کہ دیوتا فانی انسانوں پر کرم کریں یا نہ کریں لیکن وہ اپنے پرستاروں سے عقیدت و احترام کے متوقع رہتے ہیں اور اگر اس میں کوتاہی ہو تو ناراض ہو جاتے ہیں مجھ میں یہ الٰہیانہ خواہش بہت ترقی کر گئی تھی۔

میں یہ ذکر کر چکا ہوں کہ ٹھاکر دادا کی ایک اکلوتی پوتی تھی میں نے اسکو دیکھا اکثر تھا لیکن میری نگاہوں میں وہ کبھی نہ جنچی۔ مجھے کبھی گمان بھی نہ ہوا تھا کہ اس کا میری رفیقۂ زندگی بننا ممکنات سے ہو سکتا ہے۔ اسکے باوجود مجھے یقین تھا کہ میری بارگاہ میں کسی دن بصد نیاز کیلاش بابو یہ ہدیہ پیش کرینگے۔ درحقیقت میرے تنافر بیجاں کا باعث بھی یہی تھا۔ مجھے سخت حیرت تھی کہ اب تک انھوں نے ایسا کیوں نہیں کیا۔

مجھے معلوم تھا کہ ٹھاکر دادا اپنے دوستوں سے کہا کرتے تھے کہ زنجن پور کے بابو کبھی کسی سے خواستگار نہیں ہوتے۔ لڑکی بن بیاہی رہے تو ہا ہے، لیکن

خاندانی آن نہ توڑیں گے۔ مجھے ان کی اس بے نیازی پر غصہ آتا تھا۔ کچھ عرصہ تک تو یہ آگ اندر ہی اندر سلگتی رہی۔ لیکن میں قطعی خاموش رہا اور اس کو انتہائی صبر و سکون سے برداشت کرتا رہا۔ یہ بڑی خوبی تھی۔ جس طرح بادلوں کی گرج کے ساتھ بجلی کی چمک ہوتی ہے اسی طرح میرے مزاج میں غصہ کے ساتھ ظرافت بھی ودیعت کی گئی تھی۔ محض اپنے دل کا بخار نکالنے کے لیے تو میں بیچارے بڈھے کو ستا نہ سکتا تھا اس لیے عرصہ تک میں خاموش رہا۔ البتہ ایک روز مجھے ایسی دلچسپ تدبیر سوجھی کہ میں اُس کو عملی جامہ پہنانے سے باز نہ رہ سکا۔

میں کہہ چکا ہوں کہ کیلاش بابو کے اکثر احباب اُن کی خود پسند طبیعت کو مسرور کرنے کے لیے بیحد خوشامد کیا کرتے تھے۔ ان میں سے ایک شخص سرکاری ملازمت سے پنشن لیکر آیا تھا اور اُن سے کہا کرتا تھا کہ جب کبھی چھوٹے لاٹ صاحب کے یہاں حاضر ہونا ہوتا ہے تو وہ ہمیشہ نرنجن پور کے بابوؤں کا ذکر کیا کرتے ہیں۔ اُن کا قول ہے کہ بنگال بھر میں صرف دو خاندان حقیقی طور پر معزز ہیں۔ کاشی پور کے مہاراج اور نرنجن پور کے بابو۔ کیلاش بابو اس قسم کی خوشامد کو بہت غور سے سنتے اور کبھی کبھی خود بھی اس کو دہرایا کرتے۔ جب کبھی کسی محفل میں ان کی اس بوڑھے سرکاری ملازم سے ملاقات ہوتی تو وہ یہ ضرور پوچھتے "اور ہاں یہ تو فرمائیے۔ چھوٹے لاٹ صاحب کا مزاج تو بخیر ہے؟ کیا کہا آپ نے۔ اچھی طرح ہیں نا؟ واقعی مجھے یہ سُن کر بڑی مسرت ہوئی اور میم صاحبہ تو بخیریت ہیں؟ بابا لوگ اچھے ہیں؟ خوب! اس مرتبہ آپ کی ملاقات ہو تو میرا سلام ضرور کہیے۔"

کیلاش بابو اکثر لاٹ صاحب سے ملاقات کرنے کا قصد ظاہر کیا کرتے تھے لیکن یقین کیجیے کہ بہت سے چھوٹے اور بڑے لاٹ آئیں گے اور چلے جائیں گے اِدھر کی دنیا اُدھر ہو جائے گی لیکن نرنجن پور کی خاندانی سواری کیلاش بابو کو گورنمنٹ ہاؤس لے جانے کے لیے تیار نہ ہو سکے گی۔

ایک دن میں نے ان کو علیحدہ لے جاکر چپکے سے کہا "ٹھاکر دادا میں کل دربار گیا تھا۔ چھوٹے لاٹ صاحب نے اتفاقیہ نرنجن پور کے بابوؤں کا ذکر کیا میں نے کہا کہ کیلاش بابو شہر میں آگئے ہیں۔ آپ یقین کیجیے۔ ان کو سخت افسوس ہوا کہ آپ اب تک ان کی ملاقات کو نہیں گئے ہیں۔ اُنھوں نے فرمایا کہ "تکلف برطرف میں آج ہی سہ پہر کو اُن سے پرائیوٹ ملاقات کرنے آؤں گا۔"

اگر کوئی دوسرا ہوتا تو وہ اس راز کو فوراً سمجھ جاتا اور اگر یہ سازش کسی دوسرے کے خلاف ہوتی تو خود کیلاش بابو بھی اس مذاق کو سمجھ جاتے لیکن اپنے دوست سرکاری ملازم کی گفتگو اور خود اپنے بیانوں کے بعد لفٹنٹ گورنر کی آمد اُن کے نزدیک قطعی فطری ہو گئی تھی۔ وہ یہ خبر سُن کر بہت مضطرب ہوئے۔ آیندہ ملاقات کی تفصیل کا ایک ایک جزو اُن کے ہاتھ پیر پھُلائے دیتا تھا سب سے

زیادہ انھیں اپنے انگریزی نہ جاننے کا خیال تھا۔ اُس وقت کا کیا علاج ہوگا۔ میں نے کہا یہ تو کوئی دقّت نہیں ہے۔ انگریزی سے ناواقفیت بھی شانِ ریاست میں داخل ہے۔ اور اسکے علاوہ لفٹنٹ گورنر اپنے ساتھ ایک ترجمان ضرور رکھتے ہیں اور اس ملاقات کے لیے تو اُنھوں نے خاص طور پر کہہ دیا ہے کہ پرائیوٹ ہوگی۔

دوپہر کے قریب جب ہمارے بیشتر ہمسائے اپنے اپنے کاموں میں لگے ہوے تھے یا سو رہے تھے کیلاش بابو کے مکان کے آگے ایک جوڑی آکر ٹھہری۔ دو وردی پوش بیرا سیڑھی اوپر آئے اور چھوٹے لاٹ صاحب کی آمد کی اطلاع دی۔ کیلاش بابو خلعت دربر و دستار بر سر ہمہ تن انتظار موجود تھے۔ جلو میں گنیش اس موقعہ کے لیے اپنے آقا کے بہترین لباس میں ملبوس کھڑا تھا۔

چھوٹے لاٹ صاحب کی آمد کی اطلاع پاکر کیلاش بابو ہانپتے کانپتے دروازہ کی طرف بھاگے اور قدم قدم پر جھک کر مسلسل فرشی سلام کرتے ہوے اُلٹے پاؤں لاٹ صاحب کے بھیس میں میرے ایک دوست کو اندر لے گئے۔ ایک سخت چوبی کرسی پر اُنھوں نے اپنی کہنہ شال ڈال رکھی تھی۔ اُس پر لاٹ صاحب کو بٹھایا اور پھر صاحب لوگوں کی قدیم درباری زبان اُردو میں ایک فصیح و بلیغ تقریر کی۔ اور سونے کی کشتی میں رکھکر طلائی مُہروں کا ایک توڑا جو اُن کی بگڑی ہوئی ریاست کی باقیات میں سے تھا نذر گزرانا۔ خانہ زاد قدیم گنیش خوف و احترام کے مشترکہ جذبات کے ساتھ گلاب پاش لیے پیچھے کھڑا تھا اور لاٹ صاحب کو گلاب کے چھینٹوں سے بالکل بھگوئے دے رہا تھا اور عطردان سے بار بار عطر گلاب لگا رہا تھا۔

کیلاش بابو اپنی قدیم ریاست نرنجن پور کے شایانِ شان ہز آنر بہادر کا استقبال نہ کرسکنے پر بار بار افسوس کا اظہار کر رہے تھے۔ نرنجن پور میں وہ ان کا پورے اہتمام و انصرام کے ساتھ خیر مقدم کرتے۔ کلکتہ میں تو ان کی حیثیت بالکل مسافر کی سی تھی۔ یہاں وہ قطعی اجنبی ماہی بے آب تھے۔

میرے دوست رشیمی ریٹے لگائے ہوے تھے اور کیلاش بابو کی تمام تقریر کے جواب میں کبھی کبھی تمکنت سے صرف سر ہلا دیتے تھے۔ غالباً یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ انگریزی آداب مجلس کے مطابق کمرے میں پہنچنے کے بعد ہیٹ اُتار دینی چاہیے تھی لیکن افشائے راز کے خوف سے میرے دوست کو ہیٹ اُتارنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اور کیلاش بابو اور اُنکا ملازم گنیش آداب مجلس کی اس خلاف ورزی سے قطعی ناآشنا تھے۔

دس منٹ کے انٹرویو کے بعد جسکے درمیان میں اُنھوں نے محض کبھی کبھی جنبش سر کی تکلیف کی میرے دوست رخصت کے لیے اُٹھ کھڑے ہوے اور جیسا کہ پہلے ہی سے طے ہو چکا تھا دونوں وردی پوش سپاہیوں نے طلائی مُہروں کے توڑے، سونے کی کشتی، قدیم آبائی

شال، نقرئی گلاب پاش اور نقشیں عطردان کو بڑے
کروفر سے لے جا کر گاڑی میں رکھدیا۔ کیلاش بابو
نے اس کو بھی چھوٹے لاٹ صاحب کے معمول پر محمول کیا

میں یہ ساری کارروائی ایک برابر والے کمرہ
سے دیکھ رہا تھا اور ہنسی کو ضبط کرتے کرتے میری پسلیوں
میں درد ہوا جا رہا تھا۔ جب ضبط نہ ہو سکا تو میں
بھاگ کر ایک دور کے کمرے میں پہونچا۔ وہاں
ایک نوجوان لڑکی ایک گوشے میں کھڑی ہوئی اس
بُری طرح رو رہی تھی کہ کلیجہ بیٹھا جاتا تھا میرے قہقہوں
کی آواز سُن کر وہ غصہ کے مارے بھوت ہو گئی۔
اور اپنی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں سے بجلیاں گراکر
اُس نے گریہ گیر آواز میں مجھ سے کہا "بتائیے میرے
دادا نے آپ کا کیا بگاڑا ہے جو آپ ان کو فریب
دینے آئے ہیں۔ آپ یہاں کس لیے آئے ہیں۔
کیوں ..." اس سے زیادہ اُس کی زبان نے
یاری نہ کی۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا مُنہ
چھپا لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

میری ہنسی یکلخت کافور ہو گئی۔ مجھے کبھی خیال
بھی نہ آیا تھا کہ میری اس حرکت کے معنی اعلیٰ درجہ
کے مذاق کے علاوہ کچھ اور بھی ہو سکتے ہیں۔ اب
مجھے معلوم ہوا کہ میں نے ایک نازک دل کو سخت
ترین صدمہ پہونچایا ہے۔ میرے ستم کی مہیب ظلمت
مجھ پر نفریں کر رہی تھی۔ میں ڈگمگاتے ہوئے گتے
کی طرح دبے پاؤں کمرہ سے نکل گیا۔

اب تک میں کیلاش بابو کی پوتی کُسم کو شادی
کے بازار میں متاعِ ناقص سمجھتا تھا جو خریدار کے ٹھلّے
بے سود میں ہو۔ آج اس کمرے کے ایک گوشہ میں
مجھے ایک انسانی دل کی تڑپ کا احساس ہوا۔

رات بھر مجھے نیند نہ آئی۔ میرے دماغ میں ایک
ہیجان برپا تھا۔ اگلے روز علی الصباح میں مال مسروقہ
خفیہ طور پر گنیش کو واپس کرنے کے لیے کیلاش بابو کے
مکان پر گیا۔ دروازے پر پہونچکر میں نے انتظار کیا لیکن
جب کوئی نہ آیا تو میں کیلاش بابو کے کمرے میں اوپر گیا۔
غلام گردش میں مجھے کُسم کی آواز آئی جو بڑے پیارے
انداز میں اپنے دادا سے پوچھ رہی تھی "اچھے دادا۔
چھوٹے لاٹ صاحب نے کل آپ سے کیا باتیں کیں
مجھے سب سنا دیجیے۔ ایک ایک حرف۔ میں شوق
کے مارے مری جا رہی ہوں"

دادا کو کسی اور تحریک کی ضرورت نہ تھی۔ لاٹ
صاحب نے ازراہِ کرم نرنجن پور کے قدیم خاندان کے
متعلق جو کلماتِ تحسین ارشاد فرمائے تھے ان کو دوہراتے
وقت دادا کا چہرہ فخر و مباہات سے دمک رہا تھا
لڑکی ان کے سامنے بیٹھی تھی اور ہمہ تن گوش بنی ہوئی
ان کا مُنہ تک رہی تھی۔ اپنے دادا کی محبت کی خاطر
وہ اپنا پارٹ حتی الامکان اس خوبی سے ادا کرنے کی
کوشش کر رہی تھی کہ اُن کے دل میں بناوٹ کا شائبہ تک
بھی نہ پیدا ہو۔

میرے دل پر اس کا بہت گہرا اثر ہوا اور میری
آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ جب تک ٹھاکر دادا
چھوٹے لاٹ صاحب کی حیرت انگیز آمد کا ذکر فرمے

ٹے لے کر کرتے رہے میں غلام گردش میں کھڑا رہا۔ بالآخر جب وہ کمرے سے چلے گئے تو میں نے مالِ مسروقہ کو اپنی کر لڑکی کے قدموں میں رکھ دیا اور بغیر کچھ کہے چلا آیا۔

اس دن کچھ دیر کے بعد میں پھر ملنے گیا۔ نئی روشنی کے نامناسب طریقہ کے مطابق کمرے میں آتے وقت میں بڑے میاں کو سلام کرنے کا عادی نہ تھا لیکن آج میں نے جھک کر سلام کیا اور ان کے قدم لیے مجھے یقین ہے کہ بڑے میاں نے اس تعظیم و تکریم کو لاٹ صاحب کی آمد کا نتیجہ سمجھا۔ وہ اس سے بہت مسرور ہوئے۔ اور ایک لطیف سکون ان کی آنکھوں میں جھلکنے لگا۔ ان کے احباب آنے شروع ہو گئے تھے اور وہ لفٹننٹ گورنر کی آمد کی حکایت لذیذ کو عجیب و غریب افسانوں سے "درازتر" بنا کر بیان کر رہے تھے۔ اور یہ قصہ اپنی نوعیت اور طول کے اعتبار سے داستان امیر حمزہ ہوا جا رہا تھا۔

مہمانوں کے رخصت ہو جانے پر میں نے نہایت انکسار سے اپنا پیام پیش کیا اور کہا کہ "اگرچہ مجھے کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی ایسے عظیم الشان گھنے میں سلسلۂ مناکحت کی توقع نہیں ہو سکتی لیکن ..... وغیرہ وغیرہ"

میں اپنا پیام عرض کر چکا تو بڑے میاں نے مجھے گلے لگا لیا اور فرطِ مسرت سے کہہ اٹھے "میں تو غریب آدمی ہوں۔ مجھے کب ایسی خوش نصیبی کی توقع ہو سکتی تھی۔"

کیلاش بابو کی زندگی میں یہ پہلا اور آخری موقع تھا کہ انھوں نے اپنے افلاس کو تسلیم کیا اور یہی ان کی زندگی میں پہلا اور آخری موقع تھا کہ انھوں نے ایک ہی لمحہ کے لیے سہی نرنجن پور کے بابوؤں کی قدیم عظمت کو فراموش کیا۔

(رابندرناتھ ٹیگور)

غزل

(جناب منشی محمد حمید اللہ صاحب خلیق - راغبی برہان پوری)

تجھ پہ صدقے ہو کے اے شمعِ رُخ جانانہ ہم
اک جہاں کو دیں گے درسِ فطرتِ پروانہ ہم

بجلیوں کو کیوں بنائیں رونقِ کاشانہ ہم
خود بھڑک کر کیوں نہ بن جائیں چراغِ خانہ ہم

امتیازِ حسنِ کعبہ کو نہ سمجھے آج تک
ہو گئے کچھ ایسے محوِ جلوۂ بتخانہ ہم

رہروِ راہِ محبت بن کے یہ حاصل ہوا
ہر قدم پر دیکھتے ہیں منزلِ جانانہ ہم

کم سے کم اتنی تو فرصت دے ہمیں پیکِ اجل
کچھ مرتب زندگی کا کر سکیں افسانہ ہم

گردشِ ایام سے پھر کیوں ہراساں ہوں خلیق
دل میں جب رکھتے ہیں جوشِ ہمتِ مردانہ ہم

سائنس پر تاریخ کی افضلیت

(جناب محمد حیات شریف صاحب متعلم بی اے - بنگلور)

تاریخ کے ایک طالب علم سے شاید یہ توقع کی جائے کہ وہ دل کھول کر سائنس کی برائیاں دکھائے گا، اور اُس کے مقابلہ میں تاریخ کی جس قدر خوبیاں ذہن میں آسکیں گی بیان کرے گا مگر یہ طریقہ بحث سراسر مبنی بہ تعصب ہوگا - میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ سائنسداں اصحاب کو فن تاریخ کے متعلق جو غلط فہمی ہے اُسے رفع کروں اور یہ دکھاؤں کہ تاریخ کو کن امور میں سائنس پر فوقیت حاصل ہے -

سائنس اور تاریخ دراصل علم کے دو جداگانہ شعبے ہیں اور دونوں اپنی اپنی جگہ کارآمد و مفید ہیں - دو چیزوں کا موازنہ و مقابلہ اُسی حالت میں صحیح ہے جبکہ دونوں کا موضوع یکساں یا کم و بیش مماثل ہو تاکہ اُن کی جانچ ایک ہی معیار پر کی جاسکے - اس لیے بظاہر سائنس اور تاریخ کے درمیان اس قسم کا محاکمہ بے محل ہوگا - لیکن مشکل یہ ہے کہ طالبعلمی کے زمانہ میں ایک منزل ایسی آتی ہے جب دونوں علوم کے درمیان انتخاب کرنا اور ایک کو دوسرے پر ترجیح یا فضیلت دینا ضروری ہو جاتا ہے -

حامیان سائنس کے نزدیک تاریخ محض گزرے ہوے چند واقعات کے بیان سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی یا بالفاظ دیگر تاریخ اُن کے نزدیک نام ہے گڑے مُردے اُکھیڑنے کا - حالانکہ علوم انسانی کی تمام شاخوں میں تاریخ سب سے زیادہ مقبول و دلچسپ ہے اور اس پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور اہل علم کی عام رائے یہ معلوم ہوتی ہے کہ بحیثیت مجموعی مورخین کو اپنی محنت و جانفشانی کے مطابق کامیابی حاصل ہوئی اور جس قدر اس بحث پر غور و فکر اور مطالعہ سے کام لیا گیا اُسیقدر زیادہ وہ سمجھ میں آیا اور مفید ثابت ہوا - ایک بڑے مصنف نے تاریخ کی یہ تعریف کی ہے :-

"عالم فطرت کے واقعات نے انسان کے حالات میں جو تغیرات پیدا کیے اور انسان نے عالم فطرت پر جو اثر ڈالا اُن دونوں کے مجموعہ کا نام تاریخ ہے"

ایک اور حکیم نے علم تاریخ کی تعریف یوں بیان کی ہے :-

"اُن حالات و واقعات کا پتہ لگانا جن سے یہ دریافت ہو کہ موجودہ زمانہ گزشتہ زمانہ سے کیونکر بطور نتیجہ کے پیدا ہوا ہے - یعنی چونکہ مسلم ہے کہ آج دنیا میں جتنے تمدن، معاشرت، خیالات و مذاہب موجود ہیں وہ سب گزشتہ واقعات کے نتائج ہیں جو خواہ مخواہ اُن سے پیدا ہونا چاہیے تھے - اس لیے اُن

گذشتہ واقعات کا پتہ لگانا اور انکو اس طرح ترتیب دینا جس سے ظاہر ہو کہ موجودہ واقعہ گذشتہ واقعات سے کیونکر پیدا ہوا"

ان تعریفات کی بنا پر تاریخ کے لیے دو باتیں لازمی ہیں :-

(۱) جس عہد کا حال لکھا جائے اُس زمانہ کے ہر قسم کے واقعات قلمبند کیے جائیں یعنی تمدن، معاشرت اخلاق، عادات اور مذاہب سب کے متعلق سرمایہ فراہم کیا جائے۔

(۲) تمام واقعات میں سبب و مسبب کا سلسلہ تلاش کیا جائے۔

اب دیکھنا چاہیے کہ تاریخ کی تدوین میں مورخ کو کن کن علوم سے کام لینا پڑتا ہے۔ صرف واقعات کا سطحی علم تاریخ مرتب کرنے کے لیے کافی نہیں ہے۔ لڑائی اور معرکہ آرائی کے بیان کے لیے علم جنگ یا اصطلاحات فن حرب سے واقف ہونا لازمی ہے۔ نظم و نسق کی تحریک کے واسطے خود مورخ کا قانون داں ہونا ضروری ہے۔ علم طبقات الارض۔ علم آثار قدیمہ۔ علم الاعداد۔ علم طبعیات۔ علم اخلاق۔ علم سیاست اور دیگر علوم و فنون سے بھی وہ بے بہرہ نہ ہو۔ کہ یہ سب تاریخ نویسی کے لیے ناگزیر ہیں اور انھیں سے وہ جملہ اسباب ترکیب پاتے ہیں جو نسل انسانی کی افتاد مزاج و رجحانِ طبیعت پر موثر ہوتے ہیں اور جن میں اُن کا ظہور ہوتا ہے۔

تھوڑے غور و فکر سے معلوم ہو سکتا ہے کہ تاریخ کا عنصر ہر قوم میں موجود ہے۔ دنیا میں جہاں کہیں انسانوں کا کوئی گروہ موجود تھا، تاریخ و تذکرے بھی ساتھ ساتھ تھے۔ کیونکہ فخر و مباہات کے مواقع پر لوگ عموماً اپنے اسلاف کے کارنامے بیان کرتے تھے یا تفریح اور گرمیِ محفل کے لیے گزشتہ لڑائیوں اور معرکوں کا ذکر کیا جاتا تھا اس بنا پر عرب و عجم، ترک و تاتار، ہندی و افغانی، مصری و یونانی و چینی غرضکہ دنیا کی تمام قومیں فن تاریخ کی واقفیت کا یکساں دعویٰ کر سکتی ہیں۔

سولھویں صدی سے قبل فن تاریخ کا مواد افراط سے موجود ہونے کے باوجود ہمارے معلومات نہایت ناقص تھے۔ مگر اسکے بعد تحقیقات ایسے بلند پیمانہ پر شروع ہوئی اور سرتوڑ کوششیں اس باب میں کی جانے لگیں کہ تحقیقات کا یہ عظیم الشان اور کار آمد شعبہ بھی دیگر شعبہ جات کی سطح کے برابر پہونچ جائے۔ بڑی حد تک اس میں کامیابی ہوئی۔ چنانچہ سولھویں صدی کے بعد کے مورخین میں متعدد صورتوں سے یہ بات نظر آتی ہے کہ وسعتِ نظر میں بسط کے ساتھ اضافہ ہوا ہے اور تصانیف میں اُن اہم مباحث کو داخل کرنے کی رغبت پیدا ہو گئی جو اس سے پیشتر خارج از بحث سمجھے جاتے تھے۔ اس طور سے تاریخ کی ان تصانیف میں گو ناگوں مضامین سٹے ہوئے نظر آتے ہیں اور متوازی واقعات جمع اور بیان کر دینے سے ایسے کلیات

اخذ کرنے کی راہ کھل گئی ہے جن کا ابتدائی تصانیف میں کہیں پتہ نہیں ملتا ۔ وہ واقعات جو صد درجہ غیر منظم تھے اور محض حوادث اتفاقی معلوم ہوتے تھے اُن کی تشریح کرکے دکھایا گیا کہ وہ سب مقررہ قوانین کے مطابق ہیں ۔ جیسا تاریخ کی تعریف میں اوپر لکھا گیا ہے کہ عالم فطرت اور انسانی حالات کے ایک دوسرے پر موثر ہونے کے مجموعہ کا بیان تاریخ ہے ' واقعات فطری کو اب اس نگاہ سے دیکھنے لگے کہ اُن میں باقاعدگی کا سراغ ملے ۔ اور اسی طرح حالات انسانی کا بھی گہری نظر سے مطالعہ کیا جانے لگا ۔

واقعاتِ فطری اور حالاتِ انسانی کے مطالعہ میں فلسفی مورخ کو نہایت خطرناک مشکلات کا سامنا کرنا ہوتا ہے کیونکہ ایک طرف اُسکے مشاہدات میں ایسی غلطیوں کا بہت احتمال ہوتا ہے جو تعصب اور دیگر نفسانی جذبات کے سبب سے ہوتی ہیں اور دوسری طرف اُسے علوم طبیعی کے تجربات سے کام لینا پڑتا ہے ۔ علوم طبیعی میں واقعات کے اندر باقاعدگی کا ہونا اور اُن کے متعلق پیشین گوئی کرسکنا ایک مسلّمہ مسئلہ سمجھا جاتا ہے ۔ مگر تاریخ میں اس قسم کی باقاعدگی نہ صرف غیر مسلّم ہے بلکہ اس کو ماننے سے قطعاً انکار کردیا جاتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی مورخ چاہے کہ تاریخ کو ایسے درجہ پر پہونچا دے کہ وہ معلوماتِ انسانی کی دیگر شاخوں کے ہم سطح ہو جائے تو اُسکو ابتدا ہی میں سخت مزاحمتیں پیش آتی ہیں ۔ کیونکہ اُس سے کہا جاتا ہے کہ انسان کے معاملات میں کچھ رازہاے سربستہ اور کچھ امور محض قضا و قدر پر مبنی ایسے ہوتے ہیں جو ہماری تحقیقات کی دسترس سے باہر ہیں اور اسی وجہ سے اُن کی رفتار ہمیشہ پوشیدہ رہیگی ۔ یہ قول درست نہیں کیونکہ اس کی حقیقت پر غور کیا جائے تو اُس کا ثبوت نہیں مل سکے گا

عام عقیدہ یہ ہے کہ تاریخ ہمیشہ ظنی اور غیر حقیقی حالت میں رہیگی اور سائنس کے مرتبہ تحقیق پر کبھی نہ پہونچیگی یہ بہت بڑا مسئلہ ہے جسکا حل کرنا درحقیقت ہماری بحث کے لیے بمنزلۂ بنیاد کے ہے ۔ جو لوگ واقعاتِ تاریخی کی اس صلاحیت سے انکار کرتے ہیں کہ وہ کلیات کے تحت میں لائے جا سکتے ہیں اُن کی تشفی کے لیے کہا جا سکتا ہے کہ جو شخص اس سے ذرا بھی واقفیت رکھتا ہے کہ گزشتہ دو صدیوں کے اندر کیا کچھ کیا گیا ہے وہ اس سے بے خبر نہ ہوگا کہ ہر نسل ما بعد نے بعض اُن واقعات کو باقاعدہ بنا دیا اور پیشین گوئی کرنے کے لائق ثابت کردیا ہے جن کی نسبت نسل ماقبل کے لوگ یہی سمجھے ہوئے تھے کہ وہ کسی قاعدہ کے تحت میں لائے جا سکتے ہیں اور نہ انکی بابت کوئی پیشین گوئی کی جا سکتی ہے ۔

جب ہم سے کوئی فعل صادر ہوتا ہے تو وہ نتیجہ ہوتا ہے کسی سبب یا اسباب تحریک کا ۔ اور چونکہ وہ اسباب نتیجہ ہوتے ہیں حالات گزشتہ کا اس لیے اگر ہم کل واقعات ماقبل اور اُس تحریک کے جملہ قوانین سے واقف ہو جاتے تو ایسے یقین کے ساتھ جو کبھی خطا نہ کرتا ہم اس کے فوری نتائج کی بابت آسانی پیشین گوئی

کر سکتے اور غالباً یہی رائے ہر اُس شخص کی ہوگی جس کی طبیعت کسی خاص طریقہ کی دلدادہ یا جنبہ دار نہیں ہوگئی ہے۔ اور جو اپنی رائیں اُن شہادتوں کی بنا پر قائم کرنے کا خوگر ہے جو واقعتاً اُس کے پیش نظر ہوتی ہوں۔ مثلاً اگر ہم کسی شخص کی افتاد طبیعت سے بخوبی واقف ہوں تو اکثر اوقات ہم یہ بتا سکیں گے کہ فلاں فلاں حالات و معاملات میں وہ اس طرح کا برتاؤ کرے گا۔ اب اگر ہماری یہ پیشین گوئی پوری نہ ہو تو اپنی ناکامی کو اس بات پر محمول کرنا چاہیے کہ یا تو اُس شخص کے حالات و معاملات کے متعلق ہماری اطلاع غلط تھی یا ہم نے کافی طور سے اُس کی افتاد طبیعت کا مطالعہ نہیں کیا۔ بہر نوع اگر ہم میں صحیح طور سے استدلال کی قابلیت ہے اور ساتھ ہی اسکے ہم نے اُن حالات و واقعات کا علم کلی حاصل کر لیا ہے جو اُس سے تعلق رکھتے تھے تو ہم اُس طرز عمل کے متعلق بخوبی پیشین گوئی کر سکیں گے جو ان حالات و واقعات کے نتیجہ کے طور پر وہ آئندہ اختیار کرے گا۔

جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے تاریخ افعال انسانی سے بحث کرتی ہے اور چونکہ انسانی افعال و حرکات واقعات ماقبل کے سبب سے سرزد ہوتے ہیں اس لیے چاہیے کہ ایسی ہی قسم کے حالات و معاملات میں ایک ہی طرح کے نتائج پیدا ہوں۔ پھر تمام واقعات ماقبل نفس انسانی میں ہوتے ہیں یا اُس سے خارج اس لیے صاف طور سے یہ نظر آتا ہے کہ نتیجہ کے طور پر جس قدر تغیرات ہوتے ہیں یا بالفاظ دیگر وہ تمام انقلابات جنکے ذکر سے تاریخ کے صفحات رنگے ہوے ہیں اور نوع انسانی کی ساری گردشیں، اُس کی ترقی، اُسکا تنزل سب ایک دو طرفی تحریک کے نتائج ہوتے ہیں یا ہونا چاہیے۔ یہی وہ مواد ہے جسکے ذریعے ایک فلسفیانہ تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے۔ جیسا کہ ایک فاضل مصنف کا قول ہے:۔

"اس زمانہ میں مطالعہ تاریخ کا صحیح مفہوم اسباب و علل کے دریافت کرنے اور اُن سے نتائج وغیرہ وابستہ کرنے کے علاوہ اقوام و ملل کی ترقی و تنزل اور عروج و پستی پر اُن کی موجودہ ذہنی، اجتماعی، مذہبی اور سیاسی روشنی میں بحث کرنا ہے۔"

یہاں تک تو صرف اس امر سے بحث تھی کہ تاریخ حقیقت میں ہے کیا۔ ایک مورخ کو کن کن علوم سے واقف ہونا چاہیے اور تاریخ کی ترتیب میں اُسے کن کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس بحث نے مضمون کو کسی قدر خشک اور غیر دلچسپ ضرور بنا دیا مگر امید ہے کہ حامیان سائنس کے روبرو تاریخ کا صحیح مفہوم آگیا ہوگا۔ اب ہم اُن امور سے بحث کریں گے جن کی بنا پر تاریخ کو سائنس پر فوقیت حاصل ہے۔

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ موجودہ زمانہ میں سائنس کے حیرت انگیز انکشافات نے دنیا میں ایک انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ جن باتوں کو ہم افسانوں میں پڑھتے تھے اُن کو آج اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں

کُل امورِ دنیاوی کی انجام دہی کے لیے وہ وہ سہولتیں بہم پہنچائی گئی ہیں جو حضرت انسان کے خواب و خیال میں بھی نہ تھیں مگر آخر یہ حیرت انگیز ترقیاں جن پر سائنس والوں کو آج اس قدر ناز ہے صورت پذیر کیونکر ہوئیں - ماہیان سائنس تعصب کے چشمہ کو آنکھ سے اُتار کر اگر بہ نظر انصاف دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ یہ سب تاریخ ہی کا طفیل ہے - اس دعوے کی وضاحت کے لیے تمثیلاً ایک ایسا ملک فرض کر لیا جائے جس میں صرف سائنسداں ہی آباد ہوں - جن کو تاریخ سے کوئی واسطہ نہ ہو - اور دوسرا ایسا ملک تصور کر لیا جائے جس میں صرف وہ لوگ رہتے ہوں جنھیں تاریخ کے سوا کسی دوسرے علم سے کچھ سروکار نہ ہو - پہلے ملک میں جا کر دیکھا جائے تو سائنس دانوں کو سوائے اپنے تجربات، مشاہدات اور سائنٹفک تحقیقات Scientefic Researchs کے کوئی دوسرا کام نہ ہوگا اور وہ سلطنت کا بار گراں اپنے کمزور کاندھوں پر اُٹھانے کے قابل نہ ہوں گے - کیونکہ اہل سائنس کے درمیان ہمیشہ تنازع برپا رہتا ہے یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ خود اہل سائنس نے ہمیشہ سائنٹیفک تحقیقات کی مخالفت کی - جب کبھی اور جہاں کہیں سائنس میں کوئی نئی دریافت یا تحقیقات ہوئی تو سب سے پہلے اُس کی مخالفت میں سائنسداں ہی آستینیں چڑھا کر سامنے آئے - کوپرنیکس، گلیلیو اور ہاروے کی مخالفت سب سے پہلے نہایت شد و مد کے ساتھ سائنس دانوں ہی نے کی .... جب بنجمن فرانکلن نے رائل سوسائٹی کے سامنے برق Lightening Conductor کی بحث پیش کی تو تمام اہل سائنس نے اُسے بے وقعت بتایا اور رسالہ فلاسوفیکل ٹرانزکشن Philosophical Transaction نے اس مضمون کو درج کرنے سے انکار کر دیا حالانکہ وہی چیز آج کل کس قدر مفید اور کارآمد ثابت ہوئی اور اس کا استعمال کس درجہ عام ہو گیا ہے - جب نامور اور مشہور منجم ادرے گو نے برقی تار کے متعلق بحث کرنا چاہی تو فرنچ اکاڈمی آف سائنس نے اس کی خوب ہنسی اُڑائی اور اُسے بحث کرنے نہ دیا - یہ چند عام اور معمولی نظیریں پیش کی گئی ہیں ورنہ سائنس کی ہر شاخ کے متعلق صدہا مثالیں اسی طرح کی موجود ہیں - سائنس دانوں کے اس اختلاف و نزاع میں منہمک ہونے کے بعد اس کی کیا توقع ہو سکتی ہے کہ وہ کاروبار سلطنت سنبھال سکیں گے - بدنظمی کی وجہ سے امن و امان مفقود ہوگا اور سارے ملک پر جنگ و جدال باہمی کا اندھیرا چھایا رہے گا - ایسی صورت میں بچارے سائنس داں کیسے اپنی تحقیقات کا سلسلہ جاری رکھ سکیں گے - نتیجہ یہ ہوگا کہ ملک کی بربادی کے ساتھ ساتھ سائنس کی تحقیقات کا بھی دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے گا -

اب دوسرے ملک کو دیکھیں جہاں کے باشندے صرف علم تاریخ سے واقف ہیں اور جنکو سائنس

سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ یہاں لوگ ہر وقت اپنے آبا و اجداد کے کارہائے نمایاں پر فخر کرتے نظر آئیں گے۔ تاریخ ان میں حریت و آزادی کی روح پھونکے گی۔ سب بالاتفاق اپنے وقار قومی کو برقرار رکھنے میں کوشاں رہیں گے۔ ملک میں ہر طرف امن و امان کا دور دورہ ہوگا۔ تاریخ انھیں سلطنتوں اور قوموں کے عروج و زوال کی حکایتیں سنا سنا کر حکومت کی صحیح تعلیم دیتی رہے گی اور ہر باشندۂ ملک کو یہ فکر لگی رہیگی کہ علوم و فنون کی تحصیل اور دولت و ثروت کے حصول میں ہم دوسرے ممالک کے باشندوں سے پیچھے نہ رہیں۔ غرضکہ ساری آبادی بیداری، حمیت، اور ترقی کی نعمتوں سے مالامال ہوگی۔ اس ملک کو ہر طرح آباد اور یہاں کے باشندوں کو ہر آئینہ دل شاد دیکھ کر اول الذکر ملک کے پریشاں حال سائنس دانوں کے لیے بھی سوائے اسکے چارہ نہ ہوگا کہ اپنی لیبرٹریوں (معملوں) کو مقفل کرکے اور اپنے تمام آلات کو سر پر رکھ کر وطن سے بھاگیں اور ہجرت کرکے اس ملک میں جا بسیں جہاں کے پُرامن ماحول میں رہ کر وہ اپنی سائنٹیفک تحقیقات کو باطمینان جاری رکھ سکتے ہیں اور جہاں کی حکومت ہر طریقہ پر اُن کی ہمت افزائی اور اعانت کرسکے گی۔

اس تمثیل کے بعد غالباً حامیان سائنس کو اس امر کے تسلیم کرنے میں عذر نہ ہوگا کہ تاریخ کو سائنس پر صریح تفوق حاصل ہے۔ جو قوم کوئی تاریخ نہیں رکھتی یا اپنی تاریخ کو بھلا بیٹھی ہے وہ قوم قوم ہی کہلانے کی مستحق نہیں ہے۔ موجودہ زمانہ میں ایسی بہت سی قومیں نظر آتی ہیں جن کی تاریخ کا کچھ پتہ نہیں چلتا اور ہم دیکھتے ہیں کہ یہ قومیں کیسی پستی کی حالت میں ہیں۔ پستی کی انتہا یہ ہے کہ خود اُن کو اس کا احساس نہیں ہوتا۔ نہ اُبھرنے کا کچھ خیال ہے نہ ترقی کا۔ ایسی قوموں کا ہر فرد حقیر و ذلیل پیشے اختیار کرتا ہے۔ خود کو انسان تو تصور کرتا ہے مگر ایسا انسان جو ہر طرح کے احساسات سے عاری ہو — اُن کے ہر فرد کا ضمیر مردہ ہوگیا ہے اور انھیں کچھ خبر نہیں کہ انسان ہونے کی حیثیت سے اُن کے دنیا میں کیا فرائض ہیں۔ زندگی کا مقصد اُنکے نزدیک صرف اس قدر ہے کہ کسی نہ کسی طرح اپنا پیٹ بھر لیں یا تن ڈھک لیں۔ گویا وہ تمام قوتیں اُن سے سلب ہوگئی ہیں جو انسان کو حیوانات سے ممتاز کرتی اور اُسے پستی سے بلندی کی طرف لے جاتی ہیں۔ حتیٰ کہ نہ اُن کا کوئی مذہب ہے اور نہ مخصوص طریقۂ عبادت۔ آخر اس سب کا کیا سبب ہے۔ کیا خالق کائنات نے انسانوں سے جدا قسم کی یہ مخلوق بنائی ہے۔ بظاہر تو ایسا نہیں معلوم ہوتا۔ دیکھنے میں وہ عام انسانوں ہی کے سے جسم رکھتے ہیں۔ اُن ہی کے مانند دل و دماغ والے ہیں۔ وہ سب قوتیں بھی اُن کے اندر کہیں نہ کہیں ضرور پوشیدہ ہیں جن کی وجہ سے دوسری ترقی یافتہ اقوام نے انسانوں کی صفِ اول میں جگہ پائی ہے

ان قوموں کی پستی کے اسباب کی جستجو کی جائے تو سب سے پہلے ہمیں معلوم ہوگا کہ وہ کوئی تاریخی سرمایہ نہیں رکھتی ہیں۔ اگر اُن کی کوئی تاریخ ہے بھی تو وہ خود اُس کو بھلا چکی ہیں۔ نہ اُن کو یہ معلوم ہے کہ اُن کے اسلاف کون تھے اور دنیا میں کیا کارنامے وہ چھوڑ گئے ہیں۔ نہ اُن کو کبھی اس کا احساس ہوتا ہے کہ اپنے اسلاف کی یاد تازہ رکھنے اور اُن کی عزت و ناموری کو قائم رکھنے کے لیے ہمیں دنیا میں کیا کرنا چاہیے۔ آجکل دنیا کے ہر ہر گوشے میں آزادی، آزادی کا شور و غل ہو رہا ہے۔ ہر قوم دوسروں کی غلامی سے نکلنے اور آزادی کی نعمت حاصل کرنے کے لیے کوشاں ہے۔ کیا غلام قوموں کی یہ بیداری سائنس کی رہین منت ہے؟ کیا سائنس نے اُن میں آزادی کی روح پھونکی ہے۔ کیا ایک غلام ملک میں سائنس ترقی پا سکتی ہے۔ نہیں ہرگز نہیں۔ جب تک تاریخ کسی قوم میں آزادی کی روح نہ پھونکے اُسے خواب غفلت سے بیدار نہ کرے اُس وقت تک وہ علوم و فنون، صنعت و حرفت و تجارت غرضکہ کسی شعبہ میں بھی ترقی نہیں کر سکتی۔ آج سائنس داں اصحاب جس قدر اپنی حیرت انگیز ایجادات پر نازاں ہیں کیا یہ اُسی آزادی کا طفیل نہیں جس کی روح تاریخ نے اُن میں پھونکی تھی۔ جرمنی اسے بارہ سال قبل معاہدہ وارسائی کے رو سے غیر مسلح کر دیا گیا تھا۔ اور وہ اب مسلح یورپ کے عین وسط میں اپنے آپ کو بے اسلحہ کے پاتا ہے کیونکہ اُسے ایک لاکھ سے زیادہ فوج رکھنے کا اختیار نہیں اور وہ بھی زبردست توپ خانوں، فوجی طیاروں اور ٹینکیوں کے بغیر۔ اس لیے قدرۃً اُس کو ایسے دفاعی سامان حرب کی تیاری کا خیال پیدا ہوا جو اگرچہ ہلاکت خیزی کے لحاظ سے آہنی اسلحہ سے زائد خطرناک ہیں مگر معاہدۂ وارسائی کے رو سے ممنوع نہیں قرار دیے گئے ہیں۔ ضرورت کسی قانون کی پابند نہیں۔ قومیں اپنی حفاظت کے لیے قدرتی اصول کا تتبع کرتی ہیں۔ کسی ایسی قوم پر جس میں طبیعی اور موروثی عظمت و قوت موجود ہو زیادہ دباؤ ڈالنے کا اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی قوتوں کو مجتمع کرتی اور عین وقت پر بھڑک اُٹھتی ہے۔ اسی اصول کے ماتحت آج جرمنی کے سائنس داں اپنی جدید طرز کی تجربہ گاہوں میں موت اور تباہی کے لرزہ افگن طلسم کی تیاری میں مصروف ہیں۔ چنانچہ برلن یونیورسٹی کے کیمکل انسٹی ٹیوٹ کے افسر اعلیٰ ڈاکٹر شلنک کا بیان ہے کہ

"جہاں دوسری قومیں اسلحہ کی تیاری میں مصروف ہیں وہاں ہم بھی بیکار نہیں۔ ہماری حالت بہت خطرناک ہے۔ ہمیں اسلحہ کی ایک خاص حد کے اندر رہنے پر مجبور کیا گیا ہے اور وہ بھی جدید وضع کے ترقی یافتہ اسلحہ نہیں۔ اس کا مقصد عیاں ہے کہ جرمنی چھوٹے سے چھوٹے ہمسایہ ملک کے مقابلہ میں بھی بے دست و پا بنا دیا گیا ہے۔ لیکن تحفظ نفس ایک زبردست قوت ہے۔ اگرچہ

مجھے اجازت نہیں کہ اُن گیسوں اور دیگر اشیاء کے متعلق کوئی بات ظاہر کروں جن کو ہم نے قومی تحفظ کی غرض سے ایجاد کیا ہے۔ ہاں میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ہمارے سائنس داں جرمنی کے تحفظ کی تدبیروں میں بہت منہمک ہیں اور ہم اپنے اس کام میں بڑی حد تک کامیاب ہو چکے ہیں"۔

یہ جو قومی تحفظ کا ذکر پروفیسر صاحب نے کیا آخر اس کا احساس اُن میں کس طرح پیدا ہوا؟ عہد نامۂ وارسائی کے رو سے جو پابندیاں جرمنی پر عائد کی گئی تھیں آخر اُن سے بیزاری کا کیا سبب ہے؟ کیا یہ علم تاریخ ہی نہیں ہے جس نے جرمن قوم میں آزادی کی روح برقرار رکھی اور جب اُس پر زیادہ دباؤ پڑا تو اُس کی موروثی عظمت و شوکت کو کسی طرح گوارا نہ ہوا کہ ان پابندیوں میں جکڑا رہنا قبول کرے۔ انگریزی کا مشہور مقولہ ہے کہ Necessity is the mother of invention (ضرورت ایجاد کی ماں ہے) اسی ضرورت کے احساس نے جرمن قوم کو مختلف قسم کی ایجادات میں مصروف کر دیا۔ اگر اہل جرمنی اپنی تاریخ کو فراموش کر چکے ہوتے تو آج اُن میں یہ آزادی کی روح نظر آتی اور نہ ان پابندیوں کی ذلت کا احساس ہوتا۔ نہ اُنکو قومی دفاع کا خیال پیدا ہوتا اور نہ یہ حیرت انگیز سائنس کی ایجادات ظہور پذیر ہوتیں۔ یہ ہے تاریخ کی اہمیت سیاسی نقطۂ نظر سے۔

مذہبی نقطۂ نظر سے اگر سائنس اور تاریخ کا مقابلہ کیا جائے تو ظاہر ہوگا کہ سائنس کو ہمیشہ مذہب سے پرخاش رہی اور اس کی بنیاد محض ہٹ دھرمی اور جہالت پر ہے کیونکہ سائنس داں مذہب کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ اہل سائنس کا دارومدار عقلی استدلال پر ہے۔ وہ اسی معیار پر ہر بات کو پرکھتے ہیں اور جو باتیں اُنکے اصولوں کے مطابق نہیں ہوتیں اُنکو وہ فوراً انکار کر دیتے ہیں۔ حالانکہ وہ اس امر کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ صرف عقل ہی انسان کی واحد خصوصیت نہیں بلکہ اُس میں دوسری قوتیں بھی ہیں اور احقاق حق میں محض عقل ہی پہ دارومدار نہیں ہوتا۔ بلکہ اور قوتیں بھی کام میں آتی ہیں۔ مثلاً انسان کی اخلاقی و روحانی قوتیں کچھ کم اہم نہیں ہیں۔ عقل اُسی وقت تک کام دیتی ہے جب تک علت و معلول کا تعلق ہے۔ لیکن جہاں اسکے سوا اور بھی کچھ ہے وہاں روحانی عمل شروع ہو جاتا ہے۔ جب معمولی باتوں کی تحقیق میں حالات و عادات و اغراض کی بنا پر عقل بھٹک جاتی ہے تو اُن معاملات میں اس کی کیا پیش جا سکتی ہے جن کا تعلق زیادہ تر وجدان سے ہے۔ چونکہ مذہب کی بنیاد بعض مافوق العادت امور پر بھی ہے جو عقل سے بالاتر ہیں اس لیے اہل سائنس کی رسائی وہاں تک نہیں ہوتی اور وہ نافہمی سے مذہب پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ جب ایک سائنسداں کی سمجھ میں یہ باتیں نہیں آتیں تو وہ صاف کہہ اُٹھتا ہے کہ یہ قانونِ فطرت کے خلاف ہیں —— گویا

تمام قوانین فطرت اُس کے دیکھے بھالے ہیں اور وہ اُن سب پر حاوی ہو چکا ہے۔ حالانکہ وہ چند قوانین فطرت جن کے علم پر اہل سائنس کو ناز ہے، بالکل محدود ہیں۔ کیونکہ وہ صرف مادی حالات سے متعلق ہیں۔ عقل خود محدود ہے اور سائنس جس کی بنیاد اُس پر ہے اُس سے بھی محدود تر۔ اُسے غیر محدود کا علم یا معرفت کیسے ہو سکتی ہے۔ سائنس مادیات سے آگے نہیں بڑھ سکتا، اگرچہ اس میدان میں بھی اُس کا علم بہت محدود ہے۔ پھر اس محدود اور یک طرفہ علم پر اُسکے یہ دعاوی محض ہیچ ہیں اور بغیر اُس کوچہ میں قدم رکھے جو مادیات سے ماورا ہے اور اُس کی کامل تحقیقات کیے اُسکا انکار نا قابل سماعت ہے۔ ایسی صورت میں اہل سائنس کا مذہب سے انکار کرنا یا اُس کا مخالف ہونا سراسر نادانی و کم فہمی ہے۔

اس کے برخلاف تاریخ انسان میں ایسی روح پھونک دیتی ہے جسکے لیے انسان اپنی جان تک قربان کرنے سے دریغ نہیں کرتا۔ یہ تاریخ ہی ہے جو روحانی قوتوں کو نشو و نما دیتی، ہمارے اخلاق کو درست کرتی، نوع انسانی کا درد ہم میں پیدا کرتی اور انسان کو حقیقی معنوں میں انسان اور اشرف المخلوقات کے معزز لقب کا اہل بناتی ہے۔

حامیان سائنس اگر سرسری نظر سے تاریخ کا مطالعہ کرنے کے بجاے اس فن شریف کو بنظر غائر ملاحظہ فرمائیں گے تو امید ہے کہ ایسے حقائق اُن پر منکشف ہوں گے جن کا اُن کو خواب و خیال پر بھی گمان نہ ہوگا اور اُس وقت وہ تاریخ کی حقیقی اہمیت کے قائل ہو جائیں گے۔

غزل جناب منشی علی عظیم صاحب عظیم تمیزی عظیم آبادی

نگاہ نیچی ہے گردن جھکائے جاتے ہیں / ہمیں وہ خاک میں ناحق ملائے جاتے ہیں
غضب کے تیرِ نظر وہ چلائے جاتے ہیں / دل و جگر مرے چھلنی بنائے جاتے ہیں
کھنچی ہے آنکھوں کی ڈوری خمارِ مستی سے / اُٹھے ہیں سو کے وہ فتنے جگائے جاتے ہیں
الگ کھڑے ہیں وہ سرگوشیاں ہیں دشمن سے / ہمارے راز ہمیں سے چھپائے جاتے ہیں
ہماری مرگ سے کیا کیا رقیب ہیں شادان / چراغ گھی کے گھروں میں جلائے جاتے ہیں
جگر کی پوچھتے کیا ہو یہی غنیمت ہے / نگاہِ ناز سے دل کو بچائے جاتے ہیں
یہی بہت ہے کوئی ساتھ دیدے دنیا میں / لحد میں بھی کہیں اپنے پرائے جاتے ہیں
ٹھہر بھی اے دل مضطر یہ کیوں ہے بیتابی / شروع عشق میں سب آزمائے جاتے ہیں

صمیم قلب سے ملتے جو ہیں وہ کم ہیں عظیم
کہیں ہزار میں دو ایک پائے جاتے ہیں

تلوار ہم وہی ہیں لیکن وہ دم نہیں ہے

(جناب حکیم افتخار علی صاحب جگر صدیقی سہوانی)

اے امتِ محمدؐ کب تک یہ خوابِ غفلت — وہ کیا ہوئی شجاعت اب کیا ہوئی وہ جرأت
خالدؓ جری جناں میں بے چین ہو رہا ہے — بے ہمتی کا تیری رونا وہ رو رہا ہے
کہتا ہے آہ کیا تھے کیا آہ ہو گئے ہو — تم شیر تند خو تھے روباہ ہو گئے ہو
وہ دن ہیں یاد تم کو جیلے کے جب کنارے — ایرانیوں کا لشکر تھا سامنے ہمارے
ساز و یراق سب میں باہم تھے وہ زیادہ — ہم شیر تھے وہ آہو ہم کم تھے وہ زیادہ
شمشیرِ حق نے کردی کفار کی صفائی — اک نہر خوں کی بہہ کر دریا سے ملنے آئی
مسلم جو یا محمد کہہ کر پکارتے تھے — بڑھ بڑھ کے سب مجاہد تلواریں مارتے تھے

زندہ بچا نہ اُن میں آخر کوئی سپاہی
یوں فوجِ خسروی پہ نازل ہوئی تباہی

یرموک کا وہ دن بھی تاریخ کا ہے عنواں — لاکھوں تھے روم والے گنتی کے تھے مسلماں
کہتے تھے ہنس کے کافر ہاں ہاں ہیں مرنے آئے — دینِ محمدی پر قربان ہونے آئے
میداں میں سب سے آگے تھے خالدؓ دلاور — موئے محمدی کی پہنے کلاہ سر پر
اصحابِ مصطفےٰ کے حملے کیے ہوئے تھے — ضرارؓ و عبد رحماںؓ برچھے لیے ہوئے تھے
دریائے فوج رومی یوں جوش کھاکے اُمڈا — گویا کہ غرق ہوں گے سب کوہ و دشت و صحرا
چنگاریاں سناں کی ہر سو بھڑک رہی تھیں — تیغوں کی بجلیاں بھی کیا کیا چمک رہی تھیں
منہ پھر آسماں نے تھا خوف سے چھپایا — تیروں کا ابر روزِ یرموک ایسا چھایا
رومی تھا کوہ پیکر اک پہلواں جو آگے — ضرارؓ اس سے لڑنے گھوڑا بڑھا کے پہونچے
دل میں خیال آیا پہنے زرہ جو ہم ہیں — اچھا ہوا کہ اپنے دشمن سے قد میں کم ہیں
خدشہ جو دل میں گزرا میداں سے آپ پلٹے — تن سے زرہ اتاری عریاں بدن ہی پہونچے
خالدؓ کے پوچھنے پر ضرارؓ نے بتایا — تھا نفس نے محافظ میری زرہ کو سمجھا
خلاقِ دو جہاں کا ہے حافظ اور نگہباں — یہ کہہ کے آپ پہونچے سوئے حریفِ میداں

پیش وہاں تمہارا وہی غصہ میں بھی بھرا تھا   عمرؓ پر وہ خنجر سے وار کر رہا تھا

عمرؓ نے جو بڑھ کر پھر پہ رہا تھا مارا

وہ بھی تڑپ رہا تھا اور جسم تھا دو پارہ

افریقہ مصر سے وہ تا ہند ملک لینا   وہ ہر قدم پہ فتح و نصرت کا ساتھ دینا

اے قوم تو وہی ہے اے قوم تو وہی ہے   اب کیا ہوا ہے تجھکو تو کیوں بدل گئی ہے

بے خوف دل میں خالص نیت نہیں ہے باقی   ہم ہیں وہی مسلماں ہمت نہیں ہے باقی

اب کوئی ہم میں باقی خالدؓ حشم نہیں ہے

تلوار ہم وہی ہیں لیکن وہ دم نہیں ہے

کوئی عمرؓ سا نادل ہم کو اگر خدا دے   سوتا ہوا مقدر پھر وہ جگا دے

برشِ سیف

(حضرت سیف خیرآبادی)

دل مضطرب ہے جلوۂ دلدار دیکھکر   اے بیخودیِ شوق خبردار! دیکھ کر!

سودا کریں گے دل کا خریدار دیکھ کر   معشوق کوئی شوخ طرحدار دیکھ کر

بیخود ہوئے ہیں یار کا دیدار دیکھ کر   ہم وہ جہاں سے کھو گئے اکبار دیکھ کر

رکھتے ہیں دل میں یاد تری تازہ روز و شب   شمس و قمر ہیں ہم ترے انوار دیکھ کر

کچھ مقصدِ حیات کا سودا نہ کر سکے   کھوئے کچھ ایسے دہر کا بازار دیکھ کر

دل میں رہی ہمارے ہمیشہ تمہاری یاد   بھولے کبھی نہ ہم تمہیں اک بار دیکھ کر

پھولوں میں دیکھ لے نہ کہیں دام ہو چھپا   اے عندلیب زار خبردار دیکھ کر

حوروں سے اجتناب ہے جنت سے دل اچاٹ   آئے ہیں جب سے کوچۂ دلدار دیکھ کر

افسوس بیکسی میں کسی کا کوئی نہیں   اس نے جھڑک دیا مجھے اکبار دیکھ کر

کیا جانے کس خیال سے اس نے اٹھا دیا   بیٹھے تھے ہم تو سایۂ دیوار دیکھ کر

اتنا قلق ہوا ہمیں آنسو نکل پڑے   صیاد! بلبلوں کو گرفتار دیکھ کر

حق کہنے والے موت سے ڈرتے نہیں ہیں سیفؔ

منصور ہنس دیا رسن و دار دیکھ کر

(مرسلہ نائل انصاری خیرآبادی)

"سادگی و پرکاری"

(جناب احسان دانش صاحب کاندھلوی)

یہ سرد موسم، خموش جنگل، فضا میں مستی، ہوا میں نرمی
ہوا سے مژگاں پہ سرد بوندیں، جگر میں سوزِ الم کی گرمی

نکلتے سورج کی زرد کرنیں ہوا سے چھن چھن کے آرہی ہیں
درخت انگڑائی لیکے جاگے ہیں کھیتیاں لہلہا رہی ہیں

پرے کھٹولے پہ جھونپڑی میں کسان بیچارہ سو رہا ہے
بجائے پائے کے ایک پچکا ہوا کنستر لگا ہوا ہے

کڑھائی میں رس اُبل رہا ہے فضا میں خوشبو سی ہوگئی ہے
رچی ہوئی ہے دھوئیں سے کھوئی گھڑوں پہ کائی جمی ہوئی ہے

پڑی ہے اک الگنی پہ صافی سیاہ جالے لٹک رہے ہیں
اُڑے ہوئے پھُس کے جن میں کتنے مہین تنکے اٹک رہے ہیں

یہ شب کے جاگے ہوئے کمیروں میں ایک پُر خواب اضطراری
مگر ابھی تک جگا رہے ہیں غریب بیلوں کو باری باری

ہیں آگ کے گرد جمع دہقان دور حقّے کا چل رہا ہے
دھواں زمیں سے بلند ہو کر ہوا پہ کروٹ بدل رہا ہے

فضا میں بیلوں کی گھنٹیوں سے چھڑی ہوئی جلترنگ سی ہے
ہیں رقص میں زرفروش کرنیں ہر ایک شے پہ اُمنگ سی ہے

جو کھیت گنّوں کا کاٹتے ہیں اُٹھے ہیں خالق کا نام لیکر
کہ دن کی تکلیف اُنکو چھوڑ گئی رات کا انتقام لیکر

(۲)

یہ بات احسان راز کی ہے سوا مرے دل کے کون جانے
کہ سرفروشانِ خانقاہی سے پاک تر ہیں یہ کارخانے

یہاں کی تقدیس میں ریا ہے نہ آستینوں میں بت نہاں
یہاں تو ہر اک نظر ہے سجدہ یہاں ہر انسان فخرِ قرآں

بہارِ فردوس کا ہے ضامن ہر ایک رنگیں گناہ اُن کا
پناہ دیتا ہے شرک و بدعت کو نعرۂ لا الٰہ اُن کا

ان آدمی زاد بھیڑیوں نے ہزاروں کا قرباں لیے ہیں
گھنیری داڑھی کی جنبشوں نے چراغِ ایماں بجھا دیے ہیں

گزرتا ہے عرس کی بدولت قمر جبینوں میں سال انکا
خدا بچائے ریا میں ڈوبا ہوا ہے سب حال و قال انکا

جو دور انسانیت کی منزل سے ہیں وہی رہنما بنے ہیں
شریر، عصیاں شعار دیکھو خدا کے ہوتے خدا بنے ہیں

نوٹ - یہ نظم ایک سجادہ نشین کے حسنِ اخلاق سے متاثر ہو کر کہی گئی تھی، جنھوں نے صرف اس بنا پر مجھے سب سے بعد فاتحہ پڑھنے کی اجازت دی کہ میں تہیدست و تہی دامن تھا۔

انتخاب مشاعرۂ بزم جگر

مصرع طرح :- قربان ہوئی اُس بتِ کافر پہ خدائی

ماسٹر باسط بسوانی
گیسو جو ہوا دل تری صورت نظر آئی — اب وصل کا ہے وصل جدائی کی جدائی

سکریٹری بزم جگر
اس طرح مجھے دوست نے محفل میں ستایا — بیساختہ دینے لگا دشمن کی دوہائی
کس دشمنِ جاں سے ہے مرے دلکو محبت — یہ بات بتاؤں گا کسی کو نہ بتائی
خاطرے مری وہ نہ کہیں سست قدم ہو — رہبر پہ نہ ظاہر ہو مری آبلہ پائی
اُفتادہ پہ افتادہ تھی منزل نہیں چھوٹی — سرمایۂ ہمت ہے مری آبلہ پائی
آجائے جو باسط کوئی فریاد رسی کو — نالہ کی رسائی ہو مقدر کی رسائی

احمد خیرآبادی
بے علم نے تکلیف زمانہ میں اُٹھائی — بے علم نے راحت کبھی دنیا میں نہ پائی

ہدایت بسوانی
آنکھوں میں جو صورت ہے محمدؐ کی سمائی — اُس دن سے خدا ہی مجھے دیتا ہے دکھائی
خاک اہلِ جہاں نے مرے مدفن کی جو دیکھی — ہر ذرّے میں دنیا کی حقیقت نظر آئی
جنت نظر آنے لگی ایک ایک قدم پہ — دی جس نے سرِ حشر محمدؐ کی دوہائی

بیکس بلگرامی
کچھ میں ہی نہیں اُسکا زمانے میں فدائی — قربان ہوئی اُس بتِ کافر پہ خدائی
اچھا ہی سمجھ کر اُنھیں دل نذر کیا تھا — یہ کب تھی خبر اس میں بھی کچھ ہوگی بُرائی
اللہ ری تاریکی شامِ غمِ فرقت — ظلمت کے سوا کچھ نہیں دیتا ہے دکھائی
تقدیر ہی برگشتہ ہے میں کیا کروں بیکس — کرتا ہوں بھلائی بھی تو ہوتی ہے بُرائی

رام بسوانی
جو تجھ سے ملا اُسکو ملی عمرِ خضر کی — جو تجھ پہ مٹا موت اُسے پھر نہیں آئی

سوز بسوانی
آواز دھڑکتے ہوئے دل نے یہ سنائی — ہشیار رہو غافل اجل آئی اجل آئی
تڑپے کبھی روئے کبھی ٹکرایا کبھی سر — جب قیدِ قفس میں خبرِ فصلِ گُل آئی
شداد کی تربت یہ یہی کہتی ہے عبرت — بنتا تھا خدا کیا ہوئی وہ تیری خدائی

رتن اورنگ آبادی
وہ روح کہ تھی جسم میں ہے دستِ اجل میں — جو چیز کبھی اپنی نہ تھی ہوئی آج پرائی
فرماتے ہیں پوچھا گیا حال آپکا سب سے — جب ہم کو کبھی یاد رتن آپ کی آئی

حکیم
حسرت ہے کہ آجائے مجھے جسکی ہو آئی — دشمن کو بھی اللہ نہ دے داغِ جدائی

سید انوار حسین	اُف پیرہنِ زیست کی بھی نوبت آئی	اے عشق جنوں خیز دہائی ہے دہائی
رئیس خیرآبادی	یہ ہاتھ ہے تقدیر کے یہ قسمت کی ہے بات	قابو میں ہے اپنے نہ بُرائی نہ بھلائی
	تقدیر کی گتھی ہے یہ سمجھے یہ حکیم اب	کیا ناخنِ تدبیر سے ہو عقدہ کشائی
خلیل صدیقی	بیتابیِ دل ہجر کے صدموں نے بڑھائی	گنتے رہے تارے شبِ غم نیند نہ آئی
بسوانی۔	تم بیٹھے رہے لاش اُٹھانے بھی نہ آئے	دُنیا سے اُٹھا کشتۂ غمہائے جدائی
	منزل ہو مبارک تمھیں سب قافلے والو	اور مجھ کو مبارک ہو مری آبلہ پائی
	پھر کعبۂ دل میں بتِ کافر کو جگہ دی	شرم اپنے خدا سے نہ خلیل آپ کو آئی۔
عارف خیرآبادی	کب دیکھیے ہوتی ہے مدینے میں رسائی	بیچین کئے ہے مجھے اب دردِ جدائی
	صورت تری آئینہ مصور کا ہے گویا	یا اپنی ہی تصویر مصور نے بنائی
	ہم مجلس میں واعظ کے سوے میکدہ آئے	اس شان سے ہے آج خُم سے یہ چڑھائی
	کیوں چاک گریباں کیا آپنے عارف	اچھے بھلے بیٹھے تھے یہ کیا دل میں سمائی
ذاکر خیرآبادی	یہ ذائقہ یہ لطف یہ تیزی یہ صفائی	ساقی نے مئے تُند مجھے آج پلائی
	رُکنے کی قسم قافلے والوں نے ہے کھائی	چلنے نہیں دیتی ہے مجھے آبلہ پائی
	اُٹھے ہیں مرے قتل پہ یہ دستِ حنائی	اے یارِ طرحدار دہائی ہے دہائی
مختار بسوانی	نازاں رہے جلوے پہ دمِ جلوہ نمائی	موسیٰ کی غشی تم کو مگر یاد نہ آئی
نادر محمود آبادی	کہ لی شبِ غم مجھکو اجل بھی نہیں آئی	مرتا ہوں ہیں بے موت مسیحا کی دہائی
واثق بسوانی	جب سے تری صورت مری آنکھوں میں سمائی	ہر شے میں تو ہی تو مجھے دیتا ہے دکھائی
	ملتے نہیں خوش ہو کے بہم شیخ و برہمن	ہوتی نہیں آپس میں کسی طور صفائی
	عاشق کے مقدر میں تڑپنا ہے بہرحال	وہ وصل کی صورت ہو کہ ہو شکلِ جدائی
حکیم جگر صدیقی	یادِ بتِ کافر میں ہمیں نیند نہ آئی	ہم جاگتے تھے رات کو سوتی تھی خدائی
داوتی	ساتھی بھی چھٹے منزلِ مقصد بھی نہ پائی	روتی ہے مقدر کو مری آبلہ پائی
	دل خاک ہوا جل کے مگر ہم یہ نہ سمجھے	کب آگ لگی کیسے لگی کس نے لگائی
	اعمال بد و نیک پہ پردہ نہیں پڑتا	انسان کی چھپتی ہے بُرائی نہ بھلائی
	گل چلے وہ ہنس ہنس کے چڑھاتے رہے شبکو	پھر شمع مری قبر پہ رو رو کے جلائی
	تم کیسے مسلماں ہو جگر کیوں نہ حیا آئی	کہتی ہے خدا اُس بتِ کافر کو خدائی

نظرے سرخوش گزرے

بحمد اللہ، الناظر کی یہ جلد تکمیل ہو گئی اور دَورِ جدید کا سال اول بھی اتمام کو پہونچ گیا - چونکہ اس جلد میں مسلسل ہندسوں کا التزام رکھا گیا ہے اس لیے فہرست مضامین مرتب کر کے آخر میں اضافہ کی جاتی ہے۔ جو صاحب جلد بند ھوائیں اس فہرست کو شروع میں چسپاں کرادیں - اس دفعہ بنظر اختصار مضمون نگاروں کے اسمائے گرامی درج نہیں کیے گئے ہیں - آیندہ فہرستوں میں انشاء اللہ اس کا بھی التزام رہے گا -

جولائی نمبر انشاء اللہ جنوری نمبر کی طرح زیادہ ضخیم ہوگا - اور خدا نے چاہا تو آیندہ سال مستقل حجم ۸۰ صفحے کر دیا جاسکے گا -

جن اصحاب کو جولائی ۳۳ء سے پرچے بھیجے جا رہے ہیں اُنکی میعاد خریداری ختم ہوگئی - امید ہے کہ وہ جولائی نمبر کی اشاعت سے قبل چندہ بذریعہ منی آرڈر ارسال فرمائیں گے - ورنہ قسم اول کے خریداروں کے نام جولائی کا پرچہ بذریعہ وی پی روانہ ہوگا - مقامی خریداروں سے التماس ہے کہ وہ چندہ دفتر (جوہری محلہ - مکان محمد عمر محمد صدیق تاجران عطر و تمباکو) میں بھیجدیں یا جو آدمی جولائی کا پرچہ لے کر حاضر ہو اُسے مرحمت فرمائیں -

---

برادر مکرم جناب منشی امیر احمد علوی صاحب کا سلسلۂ مضامین اس نمبر سے پھر شروع ہوگیا ہے - امید ہے کہ اس سال کے اندر یہ دلچسپ اور پُر معلومات سلسلہ پایۂ تکمیل کو پہونچ جائے گا - منشی صاحب کی جدید کتاب "بہادر شاہ ظفر" جس کا ذکر کسی سابقہ پرچہ میں کیا گیا تھا اب چھپ کر تیار ہوگئی ہے - شائقین دفتر الناظر سے طلب فرمالیں - قیمت عہ ہے -

---

دس گیارہ سال بعد، گزشتہ مہینے میں لاہور جانے کا اتفاق ہوا - کاروباری مصروفیتوں نے اسکا موقع نہیں دیا کہ لاہور کے کثیر التعداد ادبی دوستوں اور اُردو نوازوں سے مل سکتا، سر اقبال، مولانا سید ممتاز علی، اُنکے صاحبزادے سید امتیاز علی تاج، اور مولانا تاجور سے مختصر سی ملاقاتیں ہوئیں جس سرگرمی اور جوش کے ساتھ زندہ دلان پنجاب اُردو کی نشر و اشاعت میں مصروف ہیں اُنکے خواہ

ہر طرف نظر آئے۔ مطابع کی کثرت، تجارتی کتبخانوں کی فراوانی، اخبارات و رسائل کی بہتات کے ساتھ ساتھ ہر در و دیوار پر اُردو کے سائن بورڈ، کتبے اور اشتہارات دیکھ کر مسرت ہوئی۔

یہ ضرور ہے کہ جو کچھ لاہور میں چھپتا ہے اُس کا بہت ہی قلیل حصہ ایسا ہوتا ہے جو اُردو زبان کے لیے باعثِ فخر کہا جا سکے۔ مگر امید قوی ہے کہ یہ حالت زیادہ دنوں تک برداشت نہ کی جائیگی۔

اب سے پچیس تیس سال قبل منشی محمد الدین صاحب فوق اور میر غلام بھیک صاحب نیرنگ کے سوا شاید کوئی تیسرا پنجابی ادیب و شاعر ایسا نہ تھا جسکا کلام زبان کی معمولی غلطیوں سے پاک اور جسکی انشا صحیح اُردو میں شمار ہونے کے لائق ہو۔ مولوی ظفر علی خاں صاحب اُس وقت اہل پنجاب میں شمار نہیں کیے جا سکتے تھے۔ مگر نئی نسل نے بہت سے اہل قلم ایسے پیدا کر دیے ہیں جن کی نظم و نثر اہل زبان کے معیار پر اگر نہیں تو زباندانوں کے معیار پر ضرور پوری اُترتی ہے اور آثار بظاہر بتاتے ہیں کہ ایسے اصحاب کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہوتا رہے گا۔

لاہوری مطبوعات کی ظاہری حالت اب بہت کچھ سُدھر چلی ہے۔ گو حقیقی زیبائش کے مقابلہ میں نمائشی آرائش پر زائد ہمت صرف ہوتی ہے۔ لیکن محاسن باطنی کی طرف افسوس ہے کہ بہت ہی کم توجہ کی جاتی ہے۔ درسیات اور طلبہ کے لیے جو کتب تیار کرائی جاتی ہیں اُن سے قطع نظر کر کے اگر دیکھا جائے تو سنجیدہ مذاق کی کتابیں بہت کم شایع ہوتی ہیں اور وہ بھی ادبی حیثیت سے چنداں قابل اعتنا نہیں کہ بیشتر حصہ ایسے اہل قلم سے تیار کرایا جاتا ہے جنکے نزدیک صحیح و فصیح اُردو لکھنے کی کوشش کرنا ایک فعل عبث ہے۔ تفریحی ادبیات پر زیادہ توجہ ہونا تعجب انگیز نہیں کیونکہ انکی تیاری میں محنت کم، نفع زائد ہے اور دلچسپی، تفریح و قبولیت عام مستزاد۔ لیکن ادبی نقطۂ نظر سے یا صحت زبان و فصاحت بیان کے اعتبار سے جانچا جائے تو یہ حصہ بھی زیادہ وقیع ثابت نہیں ہوگا کیونکہ اہل قلم اور اہل تجارت دونوں کو تیار شدہ مال کی نوعیت سے زیادہ بحث نہیں بلکہ کام کی کثرت اور کتابوں کی نکاسی کا خیال زائد رہتا ہے۔ خدا کرے کہ یہ حالات بھی جلد تبدیل ہو جائیں اور لاہور میں کوئی مرکزی ادارہ ایسا قائم ہو جائے جو شایع شدہ کتابوں پر مسلسل احتساب و تنقید کر کے لوگوں کو کھوٹے کھرے میں فرق و امتیاز کرنے کی دعوت دے اور صحیح و فصیح اُردو کی کتابیں تیار کرا کے نمونہ کے طور پر پنجاب میں شایع کرتا رہے۔

انجمن ترقی اُردو، دارالمصنفین، یا اُردو اکاڈمی کا سا بھی کوئی ادارہ لاہور میں نہیں جسکے مطبوعات سنجیدہ اور با مذاق اہل علم میں قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھے جائیں۔ اور جو نوجوانوں میں ٹھوس علمی و ادبی خدمت کا ولولہ پیدا کرنے کا ذریعہ بنے۔

بنام خداوند جاں آفریں

الناظر

نمبر ۱ جلد ۲۰ جولائی سنہ ۱۹۳۵ء

اسیری بنی اسرائیل

(جناب الحاج منشی امیر احمد صاحب علوی بی اے پنشنر ڈپٹی کلکٹر)

آج سے ڈھائی ہزار برس پہلے عراق و شام میں ایک زبردست سلطنت کلدانیوں کی قائم تھی۔ جسکی وسعت خلیج فارس سے بحیرۂ روم تک اور لنکا ارمن کے کوہستان سے دریائے نیل کی وادی تک تھی۔ اور جس میں مغربی ایشیا کے تقریباً کل زرخیز ممالک شامل تھے۔

اس شاندار حکومت کا پایۂ تخت "بابل" دنیا کا خوبصورت ترین شہر تھا۔ اُس کی فصیلیں اور باغات کا عجائبات عالم میں شمار ہوتا تھا۔ شہر کے چاروں طرف عمیق اور عریض خندقیں تھیں جو ہر وقت پانی سے لبریز رہتی تھیں اور جن سے عبور بغیر کشتی یا پُل کے محال تھا۔ شہر پناہ ۳۵۰ فٹ اونچی اور ۸۷ فٹ چوڑی تھی اور اُس پر ایسے مستحکم بُرج بنے تھے کہ فنون حرب کے اُستاد اس شہر کو ناقابل تسخیر قرار دیتے تھے۔

حفاظت مزید کے لیے اس محفوظ شہر پناہ کے اندر ایک اور دیوار پختہ اینٹوں کی ۹۰ فٹ بلند تھی جس پر دمدمے اور بروج اس قرینے سے بنائے گئے تھے کہ دیوار کوہستانی سلسلہ معلوم ہوتی تھی۔ اس فصیل میں پیتل کے سو پھاٹک لگے تھے جن سے شہر کے اندر داخلہ ہوتا تھا۔ یہ قلعہ نما بستی بہ شکل مربع ۶۰ میل کے دور میں آباد تھی۔ اس میں ۶۷۶ محلے اور ۵۰ سڑکیں تھیں۔ اس رقبہ کے اندر بے شمار چراگاہ اور باغات تھے جن میں سے بعض کے متعلق یونانی مورخوں کی روایت ہے کہ وہ ہوا پر

معلق تھے۔ اراضی مزروعہ مدتوں تک باشندگان شہر کے لیے سامان خوراک فراہم کرنے کو کافی تھی۔ برِ تگلہ دیوتا بعل کا مندر ۳ میل کے دور میں بنا تھا۔ ایک شاہی محل ۳ ½ میل اور دوسرا ۸ میل اراضی کا احاطہ کیے تھا اور ان دونوں رفیع الشان قصروں کے درمیان دریائے فرات موجزن تھا جو فصیل شہر کے نیچے سے دارالسلطنت کے اندر لایا گیا تھا اور ایک سرنگ ایسی حیرت انگیز تعمیر کی گئی تھی کہ ایک محل سے دوسرے محل تک آمد و رفت میں دریا حائل نہ ہوتا تھا بلکہ اس کا پانی سرنگ کے اوپر بہتا تھا اور چلنے والوں کو خبر نہ ہوتی تھی۔

غرض دنیا نے "بابل" سے زیادہ حسین اور حیرت خیز شہر نہ کبھی پہلے دیکھا تھا اور نہ آج تک دیکھا ہے۔

اس طلسمی شہر کا مالک بادشاہ بخت نصر تھا جس کی بابت عیش پسند اور بدکار اسرائیلیوں کو مخاطب کر کے ارمیا نبی نے بشارت دی تھی کہ "رب الافواج فرماتا ہے کہ میں تمام شمالی قبائل کو اور اپنے خدمت گزار شاہ بابل بخت نصر کو بلا بھیجوں گا اور میں انکو یروشلم پر چڑھا لاؤں گا۔ اور یہاں کے باشندوں کو بالکل نیست و نابود کر دوں گا۔ یہ ساری سرزمین ویرانہ ہو جائیگی اور یہاں کے باشندے ستر برس تک شاہان بابل کی غلامی کریں گے۔"

بخت نصر ... تمام کاسب سے زیادہ ... بلند ہمت اور دانشمند بادشاہ تھا۔ اس کی مسند نشینی کے وقت "بابل" کچے جھونپڑوں کا ایک گاؤں تھا۔ اس نے عالی نظری سے اس قریہ کو شہر بنایا۔ پختہ دلکش عمارات سے مزین کیا۔ مصر و شام و سواحل سے شاہی خزانے اور بیش بہا اجناس لاکر اپنے دارالحکومت کو سجایا بنایا۔ عالم میں شاندار قابل بنا دیا۔ اس کی داستان فتوحات و جہانستانی کی تفصیل سے ان اوراق کے جامع کو کچھ واسطہ نہیں مگر تاریخ یہود کے صفحے یہ عبرت ناک روایت فراموش نہیں کر سکتے کہ داؤد و سلیمان کی وراثت۔ ارض موعود کی خود مختار حکومت اسی خداوند کے خدمت گزار نے تباہ کی تھی اور پہلے ہی دھاوے میں احفاد اسرائیل سے دس ہزار قیدی اور عبادت گاہ سلیمانی سے متبرک طلائی اور نقرئی ظروف مال غنیمت میں لیگیا تھا۔ دوسرا حملہ قیامت کا نمونہ تھا۔ یروشلم کی تمام دولت کھنچکر بابل پہنچی۔ فرزندان یعقوب کا دارالسلطنت کنعان میں نشان نہ رہا اور بنی اسرائیل کا مقدس شہر بے چراغ ہوگیا۔

پہلے حملہ میں جو دس ہزار قیدی بابل لائے گئے ان میں یہود کا بدنصیب بادشاہ بھی تھا۔ جسکے پانوؤں میں بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ اسکے تمام اعزہ۔ رشتہ دار۔ اعیان ریاست۔ کنعان کے بہترین

کاریگر اور صناع اُسکے رفیقِ مصیبت تھے اور غلامی کے طوق گردنوں میں ڈالے تھے
یہ مظلوم اسیروں کا قافلہ خستہ اور ماندہ تقریباً ہزار میل کا سفر طے کرکے بابل پہونچا تو یہاں کے باغات
اور عمارات نے نظروں میں چکا چوندھ پیدا کردی مگر دلفریبیوں اور دلچسپیوں سے لطف اندوز کون ہو؟
جلا وطنی کا الم - غلامی کا غم - اور ایک حاکم جابر و قاہر کی فرماں برداری !!

ہجر میں عاشق ہنسے کیا رو سکے جی ٹھکانے ہو تو سب کچھ ہو سکے

ہوا مختلف تھی - پانی مختلف تھا - علوم مختلف - خیالات مختلف - مذہب مختلف - اور شہر کے معبود بھی
اُن کے خداؤں سے مختلف تھے -

ان قیدیوں کے انبوہ میں عالم و جاہل - نکوکار و بدکار - صالح و طالح - زاہد و فاسق - امیر و فقیر -
رئیس و غریب - سب ہی قسم کے لوگ تھے -

نازونعمت - عیش و عشرت میں پرورش پائے ہوئے - ارضِ کنعان کے وارث موجود - پیغمبروں کی اولاد -
اپنے خداوند کے محبوب اس قید مصیبت میں گرفتار ہوئے تو اُنکے دلوں کا کیا حال تھا - یہ داستان ایسی
درد انگیز و عبرت خیز ہے کہ "دوم گفتارنا" سے حلق میں چھریاں چبھوتے ہیں - زبان ٹکڑے ٹکڑے ہو ہوکر مرا افسانہ
آتا ہے نہ مقدس وطن اور متبرک ہیکل کی یاد دل سے فراموش نہ ہوتی تھی - صبح یا کہ جنگلوں میں جاتے اور
اپنے اُجڑے ہوئے نشیمن کی یاد میں حسرت کے آنسو بہاتے تھے -

یاد آئی جب قفس میں بربادیِ نشیمن جی بھر کے خوب روئے رویا گیا جہاں تک

اِن نوگرفتاروں کی ٹولیاں عراق کے مختلف مقامات پر آباد کی گئیں - جو صناع اور دستکار تھے - لکڑی
کے کام میں ہنرمند یا طلائی ظروف بنانے میں اُستاد تھے شہر بابل کی تزئین اور رونق افزائی پر مامور ہوئے -
جو کاشتکاری اور زراعت کی حرفت مائل تھے اجناس خوراک پیدا کرنے کی خدمت پر تعینات ہوئے - جنکے
پاس کوئی ہنر نہ تھا دیہات میں چھوڑ دئے گئے تا کہ محنت مزدوری سے پیٹ پالنے پر مجبور ہوئے -
اُن پر حکومت کے لیے سردار اُنھیں میں سے انتخاب کیے جاتے تھے اور کسی کے مذہب
سے تعرض نہیں کیا جاتا تھا -

اسی دورِ مصائب کے ایک شاعر نے اپنے جذبات ان دردناک الفاظ میں ظاہر
کیے ہیں :-

"ہم بابل کی ندیوں کے کنارے بیٹھے
اور صیون کو یاد کر کے روئے

بید کے درختوں پر ہم نے اپنے ستاروں کو ٹانگ دیا
کیونکہ وہاں ہم کو اسیر کرنیوالوں نے گیت گانے کا حکم دیا
اور تباہ کرنے والوں نے خوشی کرنے کا
اور کہا کہ صیون کے گیتوں میں سے ہم کو کوئی گیت سناؤ
ہم پردیس میں خداوند کا گیت کیسے گائیں
اے یروشلیم اگر میں تجھے بھولوں تو میرا داہنا ہاتھ اپنا ہنر بھول جائے -
اگر میں تجھے یاد نہ رکھوں
اپنی بڑی سی بڑی خوشی پر ترجیح نہ دوں
تو میری زبان میرے تالوے چپک جائے "

قاہر و ذوالجلال نے شریعت زادوں کو مصائب و آلام کا شکار بنایا - یہ اُنکے گناہوں اور بداعمالیوں کی سزا تھی لیکن نظر رحمت اُن کی طرف سے بالکل پھیر نہیں لی تھی اور ارحم الراحمین کو یہ منظور نہ تھا کہ اُس کے برگزیدہ بندوں کی اولاد پردۂ ہستی سے نابود ہو جائے - قیدیوں کی عزت و حرمت کلدانیوں کے قلوب میں باقی نہ رہے اور اُن کے معصوم بچے لونڈی غلام بن کر آبرو باختہ ہو جائیں -

ان محبوسان بلا کے انبوہ میں چار نوجوان پندرہ پندرہ سولہ سولہ برس کی عمر کے - دانیال - حنناہ - میسائیل - اور عزرا تھے جنھوں نے دشمنوں کی غلامی میں آزادی سے زیادہ ناموری حاصل کی اور جن کو مسبب الاسباب نے اسیران یہود کی ترفع جاہ اور ازدیاد حرمت کا آلۂ کار بنایا -

یہ دردمند گرفتار ہو کر بابل پہونچے تو تمنا کرتے تھے کہ کسی سنسان جھونپڑے میں بود و باش کی اجازت ملے تاکہ تنہائی میں خداوند قدوس کی عبادت کر سکیں مگر کاتب قضا و قدر کو ان بندوں سے دوسری خدمت لینا تھی - ما درچہ خیالیم و فلک در چہ خیال - بادشاہ نے حکم دیا کہ یہودی غلاموں میں سے چند حسین و جمیل نوجوانوں کو کلدانیوں کے علوم و فنون کی تعلیم دی جائے تاکہ وہ صاحب علم و فضل - منجم و دانشمند ہو کر قصر شاہی میں حاضری کے قابل ہوں اور شہنشاہ کے دربار میں خدمات شائستہ پر مامور ہو سکیں - دانیال اور اُن کے تینوں رفقا بھی اس انتخاب میں آئے اور محل شاہی میں قیام کا حکم ملا - شاہی دسترخوان سے اُنکے خور و نوش کے لیے گوشت اور شراب کا وظیفہ جاری ہوا اور یہودیوں سے تعلق قطع کرنے کے لیے اُن کے نام تبدیل کر دیے گئے - دانیال کا نام "بعل طشعز" رکھا گیا یعنی "بعل کے خزانوں کا محافظ" - اسی طرح اُنکے رفقا کے نام بھی سدرک

(یعنی شاگردِ آفتاب)۔ مشاخ (یعنی بندۂ زہرہ) اور عبدنجو (یعنی غلام آتش) تجویز کیے گئے۔ بابل میں تکمیل علوم و فنون کی سند تین سال میں ملتی تھی لہذا حکم ہوا کہ تین سال تک ان نوجوانوں کو تعلیم دی جائے اور اس کے بعد امتحانِ دانش و فراست کے لیے حضورِ سلطانی میں پیش ہوں۔

باشندگان بابل اصنام پرست تھے۔ وہاں جانوروں کے نام پر ذبح کیے جاتے تھے اور شراب خاص دیوتاؤں کے نذر کی جاتی تھی۔ دانیال اور اُنکے رفقاء اس قسم کے گوشت اور شراب سے محترز رہنے پر مذہبا مجبور تھے۔ علاوہ اسکے شاہی خوراک میں بعض ایسے جانوروں کا گوشت بھی ہوتا تھا جس کا استعمال مذہب یہود میں ممنوع تھا لہذا ان نوگرفتارانِ بلا نے محل کے داروغہ سے عرض کی کہ وہ اس خوراک سے معاف رکھے جائیں اور اُنکو ساگ پات کھانے کی اجازت دی جائے۔

داروغہ کو اس درخواست کے منظور کرنے میں تامل تھا کیونکہ یہ نوجوان شاہی خدمت کے لیے منتخب ہوے تھے۔ انکے چہروں پر تازگی اور جسم کی قوت برقرار رکھنا لازم تھا اور داروغہ کو خطرہ تھا کہ بغیر شراب اور گوشت کے استعمال کیے یہ فوائد حاصل نہیں ہوسکتے۔

دانیال وغیرہ نے اصرار کیا کہ اُنکو امتحاناً دس روز تک بجاے گوشت کے ساگ اور بجاے شراب کے پانی عنایت کیا جائے اور ختم میعاد کے بعد اُنکی قوت اور جسامت کا معائنہ ہو اگر اُنکے چہروں پر بحالی اُن جوانوں سے کم ہو جن کو گوشت کھلایا جاتا ہے تو یہ خوراک تبدیل کر دی جائے ورنہ ہمیشہ کے لیے یہی معین رہے۔

داروغہ نے یہ شرط منظور کی۔ دس روز کے بعد معائنہ کے لیے طلب ہوے تو ان ساگ پات کھانے والوں کے چہروں پر گوشت خوروں سے زیادہ رونق تھی۔ داروغہ کو تعجب ہوا مگر قول ہار چکا تھا۔ وعدہ پورا کیا اور ان بندگانِ توحید کو شاہی اغذیہ کے استعمال سے معاف رکھا۔ یہ پہلی فتح تھی جو ان نجیبوں کو دشمن کے محل میں نصیب ہوئی۔

اب تعلیم و تربیت شروع ہوئی۔ رفقاے دانیال نے حکمت و نجوم۔ الہیات۔ ریاضی اور زبانہاے میں درجۂ کمال حاصل کیا اور دانیال کو مبدأ فیاض نے علاوہ ان علوم ظاہری کے تعبیر خواب میں ید طولیٰ عنایت فرمایا اور علم معرفت سے بہرہ مند کیا۔

تین سال کی مدت معہود پوری ہوئی تو خواجہ سراؤں کا سردار یہود کے تربیت یافتہ نوجوانوں کو بادشاہ کے حضور میں لے گیا۔ اُن کی ذکاوت و دانشمندی۔ فہم و فراست کا امتحان لیا گیا۔ دانیال اور اُنکے تینوں رفقا بہترین ثابت ہوے اور دربار شاہی میں حاضر باشی کے منصب پر سرفراز کیے گئے۔

دوسرے ہی سال قدرت نے اُنکی عزت و مرتبت میں اضافہ کی ایک عجیب صورت پیدا کی۔ شاہ بابل ایک شب اپنے رفیع الشان محل میں سو رہا تھا کہ اُس نے ایک خوفناک خواب دیکھا۔ پیشانی پر عرق آیا۔ نیند اُچٹ گئی۔ کچھ دیر کروٹیں بدلتا رہا پھر گھبرا کر اُٹھ بیٹھا اور ٹہلنے لگا۔ رات کا باقیماندہ حصہ بے چینی سے گزرا۔ صبح ہوتے ہی حکم دیا کہ شہر کے سب نجومی، کاہن اور جادوگر طلب کیے جائیں وہ حاضر ہوئے تو ارشاد ہوا کہ "میں نے ایک خواب دیکھا ہے اور اُسکی تعبیر دریافت کرنا چاہتا ہوں" کاہنوں نے عرض کی کہ خواب بیان کیجیے ہم اُس کی تعبیر کریں گے۔ بادشاہ نے جواب دیا "اگر تم خواب نہ بتاؤ اور اُس کی تعبیر نہ بیان کرو تو ٹکڑے ٹکڑے کیے جاؤ گے اور تمھارے گھر مزبلہ بنا دیے جائیں گے البتہ خواب بیان کرو اور اُس کی تعبیر سناؤ تو تم کو انعام ملے گا" نجومیوں نے کہا کہ جب تک خواب نہ معلوم ہو اُس کی تعبیر بیان کرنے سے مجبور ہیں۔ بادشاہ کو یقین نہ آیا "تم باتیں بناتے ہو اور ٹالنا چاہتے ہو۔ تم ستاروں کی تاثیرات سے واقف ہو۔ علم نجومیات میں اُستاد ہو، میرا خواب بیان کرو" آخر تشویش سے عرض پرداز ہوئے کہ کوئی انسان بغیر خواب سنے اُس کی تعبیر بیان نہیں کر سکتا۔ اور بادشاہ کے دل کا راز سوائے دیوتاؤں کے کوئی جان نہیں سکتا۔

بخت نصر غضبناک ہوا اور حکم دیا کہ بابل کے تمام کاہن، نجومی اور حکیم قتل کر دیے جائیں۔ دانیال اور اُسکے رفقا بھی علم نجوم و حکمت میں ماہر تھے۔ تاہم وہ واجب القتل منجموں کی فہرست میں اُنکے نام بھی درج ہوئے اور جلاد ہر طرف حکیموں کی تلاش کرنے لگے۔

دانیال کو خبر ملی تو خدمت سلطانی میں باریابی حاصل کی اور تعبیر بیان کرنے کے لیے چند گھنٹوں کی مہلت طلب کی۔ درخواست منظور ہوئی۔ قیام گاہ پر دانیال نے اپنے رفقا کو جمع کیا اور حلال مشکلات سے گڑگڑا کر رحمت و عافیت کی التجا کی۔ غنودگی طاری ہوئی اور سارا بھید دانیال پر منکشف ہو گیا۔ وہ بادشاہ کے دربار میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ "وہ راز جو بادشاہ نے پوچھا، حکما۔ نجومی۔ جادوگر۔ اور کاہن بتا نہیں سکتے لیکن آسمان پر ایک خدا ہے جو راز کی باتیں آشکارا کرتا ہے۔ اے بادشاہ آپ بستر راحت پر اس تصور میں تھے کہ آئندہ آپ کی مملکت کا کیا حال ہونیوالا ہے۔ یکایک آپ کو نیند آگئی اور بھیدوں کے ظاہر کرنے والے نے بتا دیا کہ آخری ایام میں آپ کے ملک کا کیا حال ہوگا" بادشاہ نے تصدیق کی کہ فی الحقیقت رات کو نیند کی غفلت شروع ہونے سے پہلے یہ خطرہ غالب تھا اور اصرار کیا کہ وہ خواب بیان کیا جائے جسکے ذریعہ سے آئندہ کا حال دکھایا گیا ہے۔

دانیال نے کہا "اے بادشاہ! آپنے ایک بڑی مورت دیکھی جس کی رونق بے نہایت تھی

اور جس کی صورت ہیبتناک تھی اُس مورت کا سر خالص سونے کا تھا - اُسکے بازو اور سینہ چاندی کے
اس کا شکم اور رانیں تانبے کے - اُس کی ٹانگیں لوہے کی اور اُسکے پاؤں کچھ لوہے کے اور کچھ مٹی کے
تھے - آپ اُس بت کو حیرت سے دیکھ رہے تھے کہ یکایک ایک پتھر جو ہاتھ لگائے بغیر ہی پہاڑ سے
کاٹ لیا گیا تھا - مورت کے پاؤں پر جو لوہے اور مٹی کے تھے لگا اور وہ بت ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا — لوہا -
مٹی - تانبا - چاندی - اور سونا ریزہ ریزہ ہو کر تابستانی کھلیان کے بھسے کے مانند ہو گئی - اور ہوا اُنکو
اُڑا لے گئی - یہاں تک کہ اُنکا پتہ نہ ملا - اور وہ پتھر جس نے اُس مورت کو توڑا تھا ایک بڑا پہاڑ بن گیا
اور تمام زمین میں پھیل گیا "

" اُس خواب کی تعبیر یہ ہے کہ آپ شہنشاہ ہیں - آسمانی خدا نے آپ کو توانائی، قدرت و شوکت
بخشی ہے - میدان کے چرند - ہوا کے پرند - آپ کے حوالے کیے گئے ہیں اور آپ سب مخلوقات پر
حکومت کرتے ہیں - اُس مورت کا " سونے کا سر " آپ کی ذات والا صفات کی تمثال ہے - آپ
کے بعد ایک اور سلطنت برپا ہوگی جس کو آپ کی حکومت سے وہی نسبت ہوگی جو چاندی کو سونے
سے - اُسکے بعد تیسری سلطنت ہوگی جو تانبے کے مثل ہے اور تمام زمین پر حکومت کریگی - چوتھی سلطنت
لوہے کے مانند مضبوط ہوگی اور جس طرح لوہا سب چیزوں کو ٹکڑے ٹکڑے کرتا اور کچلتا ہے اُسی طرح وہ
سب کو کچل ڈالیگی - اُس مورت کے پاؤں کچھ مٹی اور کچھ لوہے کے تھے - اس کا مقصود یہ ہے کہ چوتھی
سلطنت کے آخری وقت میں تفرقہ پڑیگا - کبھی حکومت قوی ہوگی اور کبھی ضعیف -
جس طرح لوہا مٹی سے ملا تھا ویسے ہی وہ باہم آمیزش کی کوشش کریں گے - لیکن جیسے لوہا مٹی سے
میل نہیں کھاتا ویسے ہی وہ بھی متحد نہ ہو سکیں گے -

اُس زمانہ میں آسمان کا خدا ایک سلطنت برپا کریگا جو تا ابد نیست نہ ہوگی بلکہ تمام حکومتوں کو
ٹکڑے ٹکڑے کر دیگی اور وہی ابد تک قائم رہیگی " (صحیفۂ دانیال باب ۲ - آیت ۳۱ لغایت ۴۵ ملخصاً)
بادشاہ اپنا بھولا ہوا خواب اور اُس کی تعبیر سن کر سجدے میں گرا - دانیال کو خلعت و انعام سے
سرفراز کیا - بابل کے تمام علاقوں پر حکومت کا منصب دیا - اور اُسکے رفقا سدرک - میشاخ اور عبدنجو
کو بھی اعلیٰ عہدے عنایت کیے - ان اقبالمندوں کے عروج سے فاتحوں کے قلوب میں اسرائیلی غلاموں
کی وقعت بڑھی - شاہ یہود بدستور قید رہا لیکن اُسکے بھائی بند بہ نسبت سابق زیادہ راحت و آسائش سے
بسر کرنے لگے اور ملک کے ہر گوشہ میں مظلوم کنعانیوں کے ساتھ بہتر سلوک ہونے لگا -
بخت نصر کے خواب کو ہزاروں برس گزر گئے - سونے - چاندی - پیتل اور لوہے کی سلطنتیں بنیں

اور بگڑ گئیں۔ تاریخ بتا سکتی ہے کہ سرزمین بابل پر کلدانیوں کے بعد کن کن اقبالمند قوموں نے فتح و نصرت کے پرچم اُڑائے اور وہ چاندی۔ تانبے اور لوہے کا خطاب پانے کی کیونکر مستحق ہوئیں۔

اُس عہد تاریک کی کوئی مستند اور مبسوط کتاب موجود نہیں۔ کچھ حکایتیں یونانی مورخوں نے قلمبند کیں۔ کچھ افسانے شاہنامۂ فردوسی نے زندہ رکھے۔ کچھ روایتیں عہد نامۂ عتیق کی بدولت محفوظ رہیں اور کچھ واقعات زمانۂ حال میں ایران و بابل کے سنگین کتبوں کے نقوش سے دریافت ہوئے۔

اس مجمل تاریخ کی دھندلی روشنی میں دانیال کی تعبیر کا امتحان کرنا چاہیے۔

اگر صحیفۂ دانیال کی روایت جس کا خلاصہ اوپر درج کیا گیا صحیح ہے تو بخت نصر اس عجیب و غریب خواب کو دیکھنے سے پہلے "اپنے پلنگ پر لیٹا ہوا خیال کر رہا تھا کہ آیندہ کو کیا ہوگا"۔ یعنی اُس کو فکر دامنگیر تھی کہ بابل کی مملکت اُسکے بعد کیا کیا انقلابات دیکھے گی۔ لہذا اُسکو خواب میں دنیا کی تمام موجودہ اور آیندہ زبردست سلطنتوں کا حال نہیں بتایا گیا بلکہ صرف اُنھیں طاقتوں کا توازن دکھایا گیا ہے جو یکے بعد دیگرے بابل پر قابض و متصرف ہونگی۔

آنے والی نسلوں کی عظمت کا معیار بابل کے نقطۂ نظر سے قائم کیا گیا ہے۔ جس حکومت سے بابل کو سب سے زیادہ نفع پہونچا وہ درجۂ اول پر ہے اور جس نے سرزمین بابل کی طرف بالکل توجہ نہ کی وہ لوہے اور ٹھیکر کے مثل ہے چاہے شوکت و دبدبہ میں وہ اس مرتبہ کی ہو کہ بخت نصر اُس حکومت کی غلامی کرتا۔

مورت کا "سونے کا سر" حکومت بخت نصر کی مثال بتایا گیا ہے اور فرعون مصر کو جو اُس وقت ہیبت و جبروت میں شاہ بابل سے کسی طرح کم نہ تھا اس طلسمی پیکر میں کوئی جگہ نہیں دی گئی۔

فی الحقیقت بخت نصر کا عہد سلطنت شہر بابل کے لیے "سونے" کے مثل تھا۔ اُس نے بابل کو کچے جھونپڑوں کا گانوں پایا اور دنیا کا خوبصورت ترین شہر بنا کر چھوڑ گیا۔ اس سرزمین کو وہ شوکت و منزلت عافیت اور خوشحالی کبھی دوبارہ نصیب نہ ہوسکی جو اس عہد زریں میں میسر آئی تھی۔

کلدانیوں کے زوال کا عبرتناک افسانہ آیندہ اوراق میں نظر آئے گا۔ فی الحال اسی قدر بیان کافی ہے کہ تحقیق جدید کے مطابق ۵۳۸ قبل مسیح میں (ویرانی یروشلم سے ۴۸ سال بعد) اس سلطنت پر تباہی آئی۔ بنی اسرائیل کے قید خانے پر تاج کیانی کی حکومت قائم ہوئی۔ اور اس سرزمین پر ایرانی تقریبًا دو سو برس تک بڑے شان و شکوہ سے فرماں روائی کرتے رہے۔

اگر تعبیر دانیال صحیح ہے تو "چاندی کے سینے اور بازو" سے کیکاؤس اور کیخسرو کے جانشینوں کی طرف

اشارہ کیا گیا ہے جو دبدبہ و شوکت میں کسی طرح کلدانیوں سے کم رتبہ نہ تھے۔ طاقت میں اعلیٰ و ارفع بابل پر غالب آئے اور اس کو تباہ کیا۔ وسعت میں افضل و اکمل۔ بحیرۂ ایجین سے دریائے سندھ تک تمام ممالک اُنکے دائرۂ حکومت میں شامل اور بخت نصر کی ساری مملکت اُنکی عالمگیر شاہنشاہی کا ایک صوبہ!! اس رفیع الشان سلطنت کو پیکر طلسمی میں چاندی سے تشبیہ دینے کی صرف یہی وجہ ہو سکتی ہے کہ اُس دور میں بابل مدبرینِ عالم کی نگاہ میں "مرکزِ دولت" نہ رہا اور اُسکی قدر و قیمت میں وہ تفاوت ہو گیا جو چاندی اور سونے کے درمیان ہے ورنہ گشتاسپ و لہراسپ۔ اسفندیار و اردشیر کے جاہ و جلال سے بخت نصر کو کوئی نسبت نہیں۔

زمیں را سخن تاجِ تارک نشیں
میخنبان مرا تا نہ جنبد زمیں

۳۳۱ قبل مسیح میں سکندر یونانی نے دارا کو شکست دے کر سلطنتِ فارس کا شیرازہ ابتر کر دیا۔ بابل پر یونانیوں کی حکومت شروع ہوئی جنکے عہد کو تعبیر دانیال میں تانبے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ بشارت تھی کہ "تیسری سلطنت تمام زمین پر حکومت کرے گی"۔ آج دنیا جانتی ہے کہ سکندر نے تمام عالم کو تسخیر کرنے کا عزم کیا تھا۔ موت نے فرصت نہ دی تاہم وہ یوروپ کے جنوب سے پنجاب تک کشورستانی کا دائرہ وسیع کر چکا تھا۔

اُسکی ناگہانی وفات اور جانشینوں کی بداقبالی نے یہ منصوبہ پورا ہونے نہ دیا اور ۱۶۱ قبل مسیح میں اس سرزمین پر رومیوں کا ستارہ اقبال درخشاں ہوا۔ جنکی حکومت الہام کی زبان میں لوہے کی طرح مضبوط تھی اور تقریباً ۵۰۰ برس تک بخت نصر کے ممالک کو بیدردی سے کچلتی اور روندتی رہی۔ ہر کالے رازدار۔ وہ دن آیا جسکی بابت دانیال نے کہا تھا کہ چوتھی سلطنت کے آخری وقت میں تفرقہ پڑیگا۔ کبھی حکومت قوی ہوگی اور کبھی ضعیف۔ کیونکہ پیکر خواب کے پاؤں "کچھ مٹی اور کچھ لوہے کے تھے"۔ ۳۶۳ء میں ایران کے نامور بادشاہ شاپور نے قیصر روم جولین کو شکست دیکر بابل پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ اور عراق کا صوبہ ایران اور روم الکبریٰ کے درمیان گھوڑ دوڑ کا میدان بن گیا۔ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد روم اور فارس میں لڑائیاں ہوتیں۔ بخت نصر کا سرمایۂ ناز و افتخار کبھی ایرانیوں کے تصرف میں آتا اور کبھی روم کے قبضہ میں پہونچتا تھا۔ دونوں کی ضد نے شہر بابل کو خاک میں ملا دیا۔ اُسکے کھنڈروں کے قریب ساسانیوں کا مشہور دار الحکومت مدائن آباد کیا گیا اور کلدانیوں کے عشرتکدے میں جنگلی جانور رہنے لگے۔ شہر اُجڑ گیا لیکن مٹی اور لوہے میں آمیزش نہ ہو سکی" فارس و روم کی جنگ

جاری رہی۔ سلطنت کبھی قوی ہوتی تھی اور کبھی ضعیف۔ کبھی دنیا "غُلِبَتِ الرُّوم" کے ہنگامے سے متاثر ہوتی اور کبھی "سَيَغْلِبُونَ فِي بِضْعِ سِنِينَ" سے تسلی پاتی تھی اور صحائف آسمانی کے پڑھنے والوں کو اُس پتھر کا بے صبری سے انتظار تھا جو اس پیکر خواب کو چکنا چور کرنے کے لیے تعبیر دانیال کے مطابق کاتبان ازل نے مقرر کیا تھا۔

یوروپ کے مسیحی علما دعوے کرتے ہیں کہ اس تعبیر سے مذہب عیسوی کی طرف اشارہ ہے جو "تا ابد نیست نہ ہوگا اور اس کی حکومت کسی دوسری قوم کے حوالہ نہ کی جائیگی"۔

دانشوران فرنگ کی تحقیق و تدقیق پر حرف گیری کی مجال نہیں، مگر تاریخ وسوسہ پیدا کرتی ہے، کہ مذہب عیسوی نے آج دو ہزار برس کے بعد بھی بابل اور اس کے جوار پر قبضہ نہیں پایا۔ تو "سنگ موعود" سے "دین مسیحی" مراد لینا ایسی تاویل ہے کہ قائل اُس سے راضی نہیں ہو سکتا۔ دانیال کا ارشاد ہے کہ "وہ پتھر بغیر ہاتھ لگائے ہی پہاڑ سے کاٹا گیا تھا" اور اُس نے "لوہا، چاندی، تانبے اور سونے" کو ریزہ ریزہ کر دیا۔ اور وہ خود "ایک بڑا پہاڑ بن گیا اور تمام زمین میں پھیل گیا"۔

کیا اس سنگ ناتراشیدہ سے جزیرہ نمائے عرب کے وہ جاہل بادیہ نشین مراد نہیں ہو سکتے جنھوں نے ایک معجز نما روحانی قوت سے متاثر ہو کر چند سال کے اندر ایک طرف قیصر روم اور دوسری طرف شاہ فارس کی عزت خاک میں ملا دی۔ اور ایک غیر مسلح۔ غیر تربیت یافتہ اور قواعد جنگ سے ناآشنا فوج بھیج کر قادسیہ کی مشہور زمانہ لڑائی میں فارس کے زبردست جرنیلوں کو شکست دی۔ ۶۳۵ء میں بابل اور اس کے ملحقات پر قبضہ کیا اور ایک صدی کے اندر غرناطہ سے دہلی تک کوس لمن الملکی بجا دیا۔ انکے صرصر اقبال سے "لوہا۔ تانبا۔ چاندی اور سونا" ریزہ ریزہ ہو کر ایسا اڑ گیا جیسا کہ کھلیان کے بھوسے کے اندر ہو گئے۔ اور فارس۔ یونان اور روم کی حکومتوں کا براعظم ایشیا اور افریقہ میں نشان باقی نہ رہا۔ والغیب عند اللہ۔

قصہ مختصر۔ دانیال اور اُنکے نیک طینت رفقا کے عروج سے اسرائیلی اسیروں کی تکلیف و مشقت میں تخفیف ہوئی لیکن اُنکے مذہب سے کلدانیوں کو نفرت تھی۔ بادشاہ اور ارکین سلطنت یہودیوں کے خدا اور اُن کی شریعت کی تذلیل کیا کرتے تھے۔

بخت نصر نے ایک سونے کی مورت بنوائی جس کا طول ۶۰ ہاتھ اور عرض چھ ہاتھ تھا اور اسکو وسط شہر میں نصب کر کے اپنی مملکت کے سرداروں۔ ناظموں۔ مشیروں اور مفتیوں کو حکم دیا کہ وہ اس بت کی تقدیس کریں۔ اور جس وقت قرنا۔ ستار۔ رباب و بربط کی آواز سنائی دے اُس صنم کے

حضور میں سربسجدہ ہوں" اور جو کوئی سجدہ نہ کرے اُسی وقت آگ کی جلتی بھٹی میں ڈال دیا جائے"۔ اساطین حکومت نے فرمانِ شاہی کی تعمیل کی۔ دانیال اُس زمانہ میں دور اُفتادہ علاقوں کے بندوبست پر تعینات تھے۔ البتہ اُنکے رفقا۔ سدرک۔ میشاچ اور عبدنجو شہر میں موجود تھے اُنھوں نے اس معبودِ جدید کے سجدہ سے انکار کیا۔ حاسدوں نے بادشاہ سے شکایت کی۔ شہنشاہ غضبناک ہوا اور یہ تینوں سرکش باغی آگ کی جلتی بھٹی میں ڈال دیے گئے۔ قدرتِ ایزدی سے آگ سے اُن کو صدمہ نہ پہونچا یا اور یہ کرامت دیکھکر بادشاہ اُنکا معتقد ہو گیا۔ ارکینِ حکومت سے مخاطب ہو کر بولا کہ "ان تینوں کا خدا مبارک ہے"۔ جو شخص انکے معبود کی شان میں کوئی ناسزا کلمہ استعمال کرے اُسکے ٹکڑے ٹکڑے کیے جائیں گے کیونکہ کوئی دوسرا دیوتا یہ طاقت نہیں رکھتا کہ اپنے بندوں کو اس طرح آگ سے بچا سکے۔

اُس دن سے بابل میں یہودیوں کے مذہب کی حقارت و ذلت قانونی جرم قرار دیگئی اور اسرائیلی غلام آسائش و اطمینان سے زندگی کے دن گزارنے لگے۔

بابل کا ستارۂ اقبال ہنوز ترقی پر تھا۔ یروشلم فتح ہوا۔ سواحل پر قبضہ ہوا۔ مغربی ایشیا کے شاداب ترین ممالک تصرف میں آئے۔ فرعون مصر کو شکست ہوئی اور متمدن دنیا میں کلدانیوں کا حریف مقابل و مماثل کوئی باقی نہ رہا۔ بخت نصر کے دل میں یہ خیال جاگزیں ہوا کہ "ہمچو من دیگرے نیست" اور کلمات کبر اُس کی زبان پر آنے لگے۔

ایک شب قصرِ شہنشاہی میں بستر راحت پر مصروفِ خواب تھا کہ مصورانِ عالم مثال نے حیرت انگیز تماشہ دکھایا۔ اُس نے دیکھا کہ ناف زمین پر ایک بلند درخت ہے، وہ بڑھا۔ مضبوط ہوا اور اُس کی بالائی شاخ آسمان تک پہونچی۔ اسکے پتے خوشنما تھے اور میوہ فراوان۔ میدان کے چرند اُسکے سایے میں اور پرند اُسکی شاخوں پر بسیرا کرتے تھے اور تمام خلقت اُس میں پرورش پاتی تھی۔ یکایک ایک شخص آسمان سے نازل ہوا اور حکم دیا کہ اس درخت کو کاٹو۔ اس کی شاخیں تراشو۔ اس کے پتے جھاڑو اور پھل بکھیر دو۔ چرند اُسکے نیچے سے چلے جائیں۔ پرند اُسکی شاخوں سے اُڑ جائیں۔ لیکن جڑوں کا کندہ لوہے اور تانبے کی کڑیوں سے بندھا ہوا میدان کی ہری گھاس میں رہنے دو۔ وہ آسمان کی شبنم سے تر ہو۔ اُسکا حصہ زمین کی گھاس میں حیوانوں کے ساتھ ہو۔ اُس کا دل انسانی نہ رہے بلکہ حیوان کا دل اُس کو دیا جائے اور اُس پر سات دور گزر جائیں تاکہ سب ذی حیات پہچان لیں کہ خدا آدمیوں کی مملکت میں حکمرانی کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے حکومت دیتا ہے اور جسکو چاہتا ہے

ذلت دیتا ہے۔

یہ وحشت ناک خواب دیکھ کر بادشاہ خوف زدہ ہوا۔ رات تپش اور اضطراب میں گزری۔ سر بار بالیں تھا اور تن بار بستر۔ علی الصباح حکم دیا کہ شہر کے تمام علما اور نجومی جمع ہو کر اس خواب کی تعبیر کریں فرمان کی تعمیل ہوئی مگر کوئی معبر اس عقدے کو حل نہ کر سکا۔ بادشاہ نے مجبور ہو کر دانیال کو طلب کیا اور اُن سے اس رازِ سربستہ کے انکشاف میں استمداد کا خواستگار ہوا۔

دانیال خواب سُن کر ایک ساعت تک سر گریباں رہے اور متامل تھے کہ صاف الفاظ میں اس ہیبت ناک رویا کی تعبیر کیونکر بیان کریں۔ بادشاہ سمجھ گیا کہ دانیال کو تعبیر کے اظہار میں پس و پیش ہے اُس نے تسلی دی اور کہا کہ تعبیر بیان کرنے کے لیے پریشانی اور تردد کی ضرورت نہیں ہے۔ تب دانیال نے عرض کی "اے شہنشاہ یہ خواب آپ سے کینہ رکھنے والوں کو نصیب ہو اور اسکی تعبیر آپ کے دشمنوں پر صادق آئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ درخت جو آپ کو دکھایا گیا جس کے پتے خوشنما تھے اور میوہ فراواں۔ حضور کی تمثال ہے۔ اُس کی بزرگی بڑھی اور آسمان تک پہونچی۔ آسمان سے نازل ہونیوالے نے جو کہا کہ درخت کو کاٹ ڈالو لیکن جڑوں کا کُندہ زمین پر رہنے دو تاکہ میدان کی ہری گھاس میں شبنم سے تر ہو اور اُس پر سات دَور گزریں اسکا مفہوم یہ ہے کہ آپ کو بنی آدم کے مجمع سے خارج کر دیں گے۔ آپ میدان کے حیوانوں کے ساتھ رہیں گے۔ بیل کی طرح گھاس کھائیں گے۔ آسمان کی شبنم سے تر ہوں گے اور اس حالت پر سات برس گزریں گے۔ تب آپ کو یقین آئیگا کہ خداوند تعالیٰ دنیا کا حاکم مطلق ہے۔ جسکو چاہتا ہے نعمت دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے چھین لیتا ہے۔ اس آسمانی نازل نے جو کہا تھا کہ جڑوں کے کُندے کو باقی رہنے دو۔ اس سے یہ مقصود ہے کہ مرتبۂ عین الیقین پر فائز ہونیکے بعد آپ دوبارہ اپنی سلطنت پر قابض ہونگے اور آپ کے ہوش و حواس درست ہو جائیں گے۔ لہٰذا میری گزارش ہے کہ آپ اپنی خطاؤں کا راستبازی اور صداقت سے کفارہ ادا کیجیے اور اپنی بدکرداری کا مسکینوں اور ضعیفوں پر ترحم سے معاوضہ کیجیے۔ ممکن ہے کہ عفت اور نکوکاری سے آپ کے قلب کو اطمینان نصیب ہو اور مصیبت کا خطرہ دور ہو جائے۔"

کیسا بھیانک خواب اور کیسی ہولناک تعبیر! اقبالمندی کی چڑھتی دھوپ میں بادشاہ نے ان توہمات سے اپنی عیش و عشرت کو منغص ہونے دینا بزدلی اور کمزوری کا مرادف جانا۔ ابھی ایشیا کے مشرقی ممالک فتح کرنا باقی ہیں! بہت سی کمزور قومیں بابل کی حلقہ بگوش ہونے کو بیچین ہیں! مصر و یونان کی صناعی و دستکاری کے خزانے دارالسلطنت کلدانیاں کی زینت بڑھانے کے لیے وقت کا انتظار

کر رہے ہیں! جو ہستی تمام عالم کے طاقتوروں سے زیادہ مضبوط تمام دنیا کے شیر دلوں سے زیادہ بہادر۔ دولتمندوں کی سردار اور شاہوں کی حکمراں ہو اُسکو کسی دیوتا سے بھی خوفزدہ اور مرعوب نہ ہونا چاہیے۔ وہ خود اس لایق ہے کہ اُسکی پرستش کی جائے اور انا ربکم الاعلیٰ کا نعرہ بلند کرے!!

دانیال کی تعبیر نقارخانہ میں طوطی کی آواز تھی۔ سیلاب فتوحات تلاطم خیز رہا۔ اور بادشاہ کے دل میں غرور بڑھتا ہی گیا۔ ایک سال تک مہلت کی باگ ڈھیلی رہی۔ حلم حق با تو مواسا ہا کند۔

ایک دن شاہی محل کے بالاخانہ پر چہل قدمی کر رہا تھا کہ شہر کے دلکش باغات اور دلفریب عمارات پر نظر پڑی اور ثروت کی نخوت میں گم ہو کر کہنے لگا "کیا یہ عظیم الشان شہر بابل میری ملکیت نہیں ہے جسکو میں نے اپنی توانائی اور قدرت سے تخلیق کیا ہے تاکہ میرا دارالسلطنت بنے اور میرے جاہ جلال کا آئینہ ہو"

اُسی وقت غضب خداوندی کا ظہور ہوا۔ بادشاہ کے ہوش و حواس رخصت ہوے۔ بابل کی عظمت و شوکت سے لطف اندوز ہونے کی قابلیت سلب ہوگئی۔ جنون کے جوش میں کپڑے پھاڑ کر قلعہ سے نکل بھاگا۔ جنگل میں جانوروں کی طرح گھومنے اور بیلوں کی طرح گھاس چبانے لگا۔ صحیفۂ دانیال کی روایت ہے کہ "اُسکا بدن آسمان کی شبنم سے تر ہوا۔ یہاں تک کہ اُسکے بال عقاب کے پروں کے مانند ہوگئے اور اُسکے ناخن بڑھ کر پرندوں کے چنگل بن گئے"

سات برس تک سلطنت اُمرا اور ارکین کے ہاتھ میں رہی اور اُس کا لڑکا بطور ولیعہد کے امور مملکت انجام دیتا رہا۔ مفتوحہ قومیں خوشیاں مناتیں اور مسرت کے ترانے گاتی تھیں کہ اُنکا فاتح اپنی بداعمالی اور مظالم کی پاداش میں اسی جنم میں انسان سے بیل بنا دیا گیا اور اُنکی آنکھوں کے سامنے گھاس کھانے لگا۔ اسرائیلی علام طعنہ زنی کرتے تھے کہ ہیکل مقدس میں آگ لگانے اور نبی زادوں کی ذلت و رسوائی کی سزا مل رہی ہے۔ دانیال اور اُنکے ہوشمند رفقا جانتے تھے کہ یہ غرور اور سرکشی کا پھل ہے۔ تکبر عزازیل را خوار کرد۔ بزندان لعنت گرفتار کرد۔ اور منتقم حقیقی کی مقرر کردہ میعاد سزا کے اختتام کا انتظار کرتے تھے۔

ایک ایک دن گن کر سات سال کی طویل مدت پوری ہوئی۔ ارکین حکومت اپنے گمشدہ مجنون بادشاہ کو ڈھونڈھنے نکلے۔ گھنے جنگل میں پتہ چلا دیکھا کہ بخت نصر آسمان کی طرف آنکھیں اُٹھائے اُس حیّ و قیوم کی حمد و ثنا کر رہا ہے جسکی سلطنت ابدی اور مملکت دائمی ہے۔ فہم و شعور کی نعمت دوبارہ عطا ہو چکی ہے اور اپنے پرائے کی پہچان ہے۔ خوشامد کر کے عاجزی اور منت سے محل میں لائے تخت سلطنت پر بٹھایا اور مخلوقات

کی حکومت اُسکے سپرد کی۔

بادشاہ کا رعب و دبدبہ بحال ہوا تو اُس نے تمام علاقہ محروسہ میں ایک گشتی فرمان جاری کیا جو اس وقت تک صحیفۂ دانیال میں محفوظ ہے۔ اس میں اپنے عجیب احوال کی مفصل داستان بیان کرکے خاتمہ پر لکھا تھا "اب میں بخت نصر آسمان کے بادشاہ کی ستایش و تکریم و تعظیم کرتا ہوں کیونکہ وہ اپنے سب کاموں میں راست اور سب راہوں میں عادل ہے۔ اور جو مغرور ہو جاتے ہیں اُنکو ذلیل کرسکتا ہے"

اُس دن سے بخت نصر آسمانی خدا کا پرستار بنا۔ یہودیوں کے معبود کا حلقہ بگوش ہوا اور اسرائیلی غلاموں کو یہ شاندار فتح حاصل ہوئی کہ اُنکا فاتح اُنہیں کے مذہب کا مفتوح ہوگیا۔ صحیح روایات کے مطابق یہ فرمان بخت نصر کی موت سے ایک سال پہلے یعنی ۵۶۲ قبل مسیح میں جاری کیا گیا۔ اُسوقت دانیال کی غلامی اور بادشاہ یہوداہ کی گرفتاری کو ۴۳ سال گزر چکے تھے اور یروشلیم کو بے چراغ ہوئے چوبیسواں سال تھا۔

ارمیا نبی کا ارشاد تھا کہ "بنی اسرائیل ستر سال تک بابل کی غلامی کریں گے" اس میعاد کا نصف حصہ یوں گزرا۔ اب دیکھیے کہ بقیہ میعاد میں کیا پیش آتا ہے۔ شاد باید زیستن ناشاد باید زیستن۔

غزل شیخ محمد عبدالعزیز صاحب عزیز جالپوری

یہ مجبوریاں ہیں یہ لاچاریاں ہیں
کہ اُس بیوفا سے وفاداریاں ہیں

جسے خواب سمجھا ہے اہل جہاں نے
مقدر کی اپنے وہ بیداریاں ہیں

نہیں اُن کو باطن میں بھی ربط مجھ سے
رقیبوں کی ظاہر طرفداریاں ہیں

خدا اِن سے محفوظ رکھے جہاں کو
محبت، جنوں، عشق، بیماریاں ہیں

تمہارے تو لاکھ اک زمانہ ہے شاکی
مجھی پر فقط کیا جفاکاریاں ہیں

سمجھتے ہیں آزادیاں آپ جن کو
وہی فی الحقیقت گرفتاریاں ہیں

محبت ہو، سودا ہو، وحشت ہو، غم ہو
وہ آشنا کب یہ بیماریاں ہیں

دلِ آشنا دل کو جب دیکھتا ہوں
اُسی بے وفا کی طرفداریاں ہیں

دمِ نزع بیمارِ غم سے وہ بولے
کہاں آج جانے کی تیاریاں ہیں

عزیز اِن بتوں کی وفاداریاں بھی
جفاکاریاں ہیں، ستمگاریاں ہیں

پندار

II

گرمی کی ناقابلِ برداشت تپش اور برسات کی وبا پیدا کرنے والی گھٹن کے بعد، جب جاڑے کا آغاز ہوتا ہے، یا گلابی موسم آتا ہے، تو بیمار رو بصحت، تندرست جوان نما، اور جوان چست و چالاک بن جاتے ہیں! ٹھنڈی ہوا کے سرور انگیز جھونکے پژمردہ طبیعتوں کے ساتھ ہر صبح و شام شارٹونک کے ایک ٹیکے کا عمل کرتے ہیں اور خون جسم کی شرائین میں دوڑتا ہوا سفید رنگ والوں کے چہروں پر نمایاں ہو جاتا ہے! نومبر ۱۹۲۰ء نے بھی دہلی کی آبادی پر یہی عمل کیا اور ڈر ولا اس سے مستثنیٰ نہ تھا!

مسٹر ڈر اپنی کوٹھی کے مختصر باغیچہ میں ننگے سر، ایک ہاتھ پتلون کی جیب میں ڈالے، سوسن کے ایک پھول — ایسے پھول پر جو اپنی بہارِ زندگی دکھا چکنے کے بعد چند گھنٹوں میں کمھلانے والا تھا — نظر جمائے، محوِ نظارہ تھے، یا اُس سے رودادِ چمن اُسی کی معنی خیز زبانِ بے زبانی میں سننا چاہتے تھے کہ "قائیں قائیں" کی آواز نے اِن کی جھکی ہوئی گردن آسمان کی طرف اٹھا دی اور قازوں کی لمبی قطاریں ایک سب کے آگے اُڑنے والی قاز پر زاویہ کی شکل میں مل جانے والی دو قطاریں — فضائے اثیر میں نہایت ترتیب کے ساتھ کوچ کر رہی تھیں! وہ رفتہ رفتہ دور ہوتی جاتی تھیں اور اُن کے مشاہدے سے پیدا ہونے والی تحریکِ دماغی کی بدولت مسٹر ڈر کا ایک خاص زمانہ اُن کی یاد میں قریب ہوتا جاتا تھا! قوتِ حافظہ و اشتراک کے عمل نے تھوڑی دیر کے لیے مسٹر ڈر کو پھر اودھ کے ایک ضلع کا جوائنٹ مجسٹریٹ بنا دیا تھا جہاں وہ اپنے آپ کو ہاتھی پر سوار، ایک جھیل کے اندر، مشغولِ شکار پاتے تھے! چند زریں لمحے یادِ ماضی سے محفوظ ہونے میں گزرے ہونگے کہ دو گھڑی دن چڑھے کے آفتاب نے اُنکے اوپر اٹھے ہوئے چہرے پر اپنی گرم گرم نظریں ڈالیں اور یہ معاً اودھ سے دہلی میں، اور ماضی سے حال میں پہونچ گئے! یہ سحرکاریِ حافظہ، چشمکِ برق تھی کہ، "آناً فاناً" مسٹر ڈر کو "یادِ ایامِ عشرتِ فانی" کا چرکہ دے گئی!!

پس پشت ایک آہٹ معلوم ہوئی؛ مسٹر ڈر نے مڑ کر دیکھا؛ ایک نوجوان ان کی طرف بڑھتا آ رہا تھا! بیساختہ "آہا! گجلیا!" کہتے ہوئے مسٹر ڈر بھی اُس کی طرف بڑھے، دو بڑھے ہوئے ہاتھ نہایت تپاک کے ساتھ ملے اور مسٹر ڈر نے استعجاب کے ساتھ پوچھا

"تم کہاں ؟"

"آپ کے زیر سایہ !" کچلو نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

"میں نہیں سمجھا" مسٹر ڈر نے کہا "تم دہلی کب آئے ؟"

"چار روز ہوئے"

"اور ٹھہرے کہاں ہو ؟"

"آپ کے قریب : نسیم منزل میں"

"نسیم منزل میں !" نہایت حیرت کے ساتھ مسٹر ڈر نے دوہرایا "خوب ! مسٹر ڈر کو نسیم منزل کی بڑی فکر تھی : آؤ۔ اندر چلو !"

مسٹر ڈر آگے آگے اور کچلو انکے پیچھے کوٹھی کی طرف بڑھے !!

محمد صفدر کچلو، مسلمان سہی، مگر تھے کشمیری ! وہ ایم - اے - او کالج سے اسی سال گریجویٹ ہوئے تھے اور دہلی میں غالباً محض بغرض سیر و تفریح کچھ عرصہ کے لیے آئے تھے ! اُن کا وطن مالوف لاہور تھا اور اُنکے بڑے بھائی محمد اختر۔ پنجاب کے سربرآوردہ و متمول تجار میں سے تھے ! محمد صفدر کو مسٹر ڈر کے گھر میں علیگڈھ سے ہی بے تکلفی حاصل تھی ! مسٹر ڈر کی صفدر سے شناسائی "یونین" کی خوبصورت عمارت میں اُس روز سے شروع ہوئی تھی جب اُس نے برجستہ تقریر کہنے کے مقابلہ میں، کیمبرج کا عطیہ بطور انعام پایا تھا ! محمد صفدر اُسی دن سے جج صاحب کے منظور نظر قرار پائے تھے اور اُن کی کوٹھی میں فرصت کے اوقات بلا روک ٹوک کاٹا کرتے تھے ! اُن کو مسٹر اور مسز ڈر ہی کے مورد عنایات ہونے کا فخر حاصل نہیں تھا بلکہ اُن کی صاحبزادیوں کی صحبت میں شامل ہونے کی عزت بھی نصیب تھی ! اکثر و بیشتر جج صاحب کے ساتھ اُن کی دو ایک صاحبزادیاں بھی برج کھیلنے میں شریک ہوا کرتیں اور صفدر بھی اُس کھیل میں شریک کر لیے جاتے ! صفدر کے ساتھ مسز ڈر اور اُن کی لڑکیاں اکثر "ٹینس لان" پر شام کو دیکھی گئیں اور بعض اوقات ایک ہی موٹر میں قلعہ کی طرف جاتی ہوئی نظر آئیں ! دو برس تک یہ صحبتیں باقی رہنے سے صفدر کے تعلقات، تعلقات سے پیدا ہونے والی بے تکلفی، اور بے تکلفی کا لازمی نتیجہ لگاؤ، پختگی اختیار کرتے گئے ! بعض اوقات صفدر کی حرکات و سکنات سے کسی حد تک سوشیلا کی طرف نسبتاً زیادہ متوجہ ہونے کی جھلک معلوم ہوتی اور مسز ڈر اس توجہ سے کھٹکنا تو درکنار دل ہی دل میں مطمئن ہوتیں ! صفدر کی علمی قابلیت مسٹر ڈر کے لیے، اور تمول و شباب مسز ڈر کے لیے، کافی خوبیاں تھیں، اس پر طرحداری، خوش مزاجی اور خلوص آمیز ارتباط کا اضافہ، گویا سفارش اور سفارش قوی ! غرض صفدر نے مسٹر ڈر کی رواداری اور مسز ڈر کی ہمت افزائی کے زیر سایہ، دو برس کامل اپنے دل و دماغ میں سوشیلا کی حسین و ابرو دکھا گزیں ہونے دیا اور سوشیلا نے اسی عرصہ میں صفدر کے رنگ روپ اور خندہ پیشانی و ارتباط کو ——
خیر، اس کو فی الحال جانے دیجیے !

مسٹر ور اور صفدر آگے پیچھے کوٹھی کے برآمدے میں داخل ہی ہوئے تھے کہ مسز ور سامنے تھیں، تین چوتھائی بتیسی نمایاں کر دینے والی مسکراہٹ کے ساتھ مسز ور نے محمد صفدر کچلو سے ہاتھ ملایا اور ایک سانس میں حیرت و استعجاب، اطمینان و مسرت، خیر مقدم اور استفسار خیر و عافیت غرض بہت کچھ کہہ ڈالا۔ محمد صفدر ہر سوال کا معقول و مناسب جواب دیتا ہوا انکے ساتھ ساتھ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ ایک کرسی پر مسٹر ور اور ایک بڑے صوفے پر مسز ور اور صفدر بیٹھے اور باتیں شروع ہوئیں :—

مسٹر ور: "میری پیاری! اب شکایت نہ کرنا کہ میں نسیم منزل آباد کرنے والے کو تمہارے پاس پکڑ لایا!"

مسز ور (صفدر سے) "مجھے نہایت مسرت ہے کہ تم اس قدر قریب ٹھہرے ہو: نسیم منزل تو بہت بڑی عمارت ہے، غالباً تمہاری ضرورت سے کہیں زیادہ کمرے اس میں ہوں گے؟"

کچلو: "کمرے تو متعدد ہیں، مگر میرے ساتھ میری بہن اور بہنوئی کے علاوہ ایک دوست بھی ہیں اور اسی وجہ سے اسباب کا انبار اور ملازموں کی بھی خاصی پلٹن ہے"

مسز ور: "تمہاری بہن بھی دہلی کی سیر کرنے آئی ہونگی؟"

کچلو: "جی نہیں! ان کا اصلی مقصد علاج یونانی ہے: وہ ایک عرصہ سے چند شکایات کی شکار ہیں اور اسی غرض سے یہاں آئی ہیں — آپ جانتی ہیں دہلی علاج یونانی کے لیے بہترین جگہ ہے"

مسٹر ور: "اور تمہارے دوست کون ہیں؟"

کچلو: "انیس الزماں!"

مسٹر ور: "یہ کون ہیں - کیا ہیں - یہاں کیوں آئے ہیں؟"

کچلو: "میرے پرانے دوست ہیں، کالج میں مجھ سے سینیر تھے، اور وہ ایک بہت بڑے تعلقدار ہیں....."

مسٹر ور بات کاٹ کر "ریاست ماہ پارہ کے تعلقہ دار تو نہیں؟"

کچلو: "جی ہاں وہی"

مسٹر ور (عجلت کے ساتھ): "انکی آمدنی کیا ہوگی؟"

کچلو: "صرف ریاست ماہ پارہ کی آمدنی تقریباً دس بارہ لاکھ سالانہ ہوگی اور حال ہی میں ایک اور ریاست ہاتھ آجانے سے اب انکی مجموعی آمدنی کم و بیش بیس لاکھ ہو گی!"

"بیس لاکھ سالانہ!" انتہائی حیرت کے ساتھ مسٹر ور نے دوہرایا اور کہا "ان کی عمر کیا ہوگی؟ اولاد کتنی ہے؟"

"مجھ سے چار یا پانچ سال بڑے ہونگے" کچلو نے جواب دیا "اولاد کیسی! ابھی انکی شادی بھی نہیں ہوئی!"

اب مسٹر ور پر ایک ایسی کیفیت طاری تھی، جو حیرت، مسرت اور امید سے مل جل کر پیدا ہوئی تھی! ان کے شوق معلومات نے انھیں متعدد سوالات کرنے پر مجبور کیا اور صفدر ہر ایک بات کا جواب دیتا رہا، ابھی انیس الزماں کے متعلق، متعلقین، عمر اور مشاغل کے بابت مسٹر ور کی معلومات میں خاطر خواہ

اضافہ نہیں ہونے پایا تھا کہ سوشیلا اور سرلا برابر والے کمرے سے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئیں اور صفدر کی نظر بیتابانہ اُن کی طرف دوڑی! صفدر کی آنکھوں نے کم و بیش ایک سال کے بعد وہی گوری گوری شکل وہی سیاہ پتلیوں والی آنکھیں، وہی بھرے بھرے رخسارے اور وہی آفتابی چہرہ دیکھا جو پہلے بارہا دیکھا تھا، البتہ دماغ نے اسقدر ضرور بتایا کہ حسنِ موزوں نے شباب کا عالم نسبتاً زیادہ نمایاں کر دیا ہے! صفدر ان کے قریب پہنچتے ہی کھڑا ہو گیا! خندہ پیشانی کے ساتھ جانبین میں خیریت کے متعلق بھی مختصر گفتگو ہوئی اور سوشیلا و سرلا ایک ایک کرسی پر بیٹھ گئیں! صفدر اب قطع ہو جانے والے سلسلۂ گفتگو کو از سرِ نو چھیڑنے کے ارادہ سے اپنی جگہ پر بیٹھا تو سہی مگر مُہرِ سکوت نہ توڑ سکا وہ کچھ خاموش سا تھا کہ مسز ڈور نے کہا: "آج تم ہمارے ہاں کیوں نہ کھانا کھاؤ؟"

صفدر: "اس عزت افزائی کا شکریہ! مجھے یہاں کھانا کھانے میں ذرا بھی تکلف نہیں مگر میرے ساتھ میرے دوست انیس الزماں مقیم ہیں اور اس وجہ سے مجھے اُن کے ساتھ گھر پر کھانا ہی ضروری ہے۔"

مسٹر ڈور (مسز ڈور کی طرف دیکھتے ہوئے): "انیس الزماں بھی ہمارے ہاں کھانا کھائیں۔"

مسز ڈور (صفدر سے): "ہاں تم اور تمھارے مہمان دونوں، آج رات کو یہاں کھانا کھائیں۔"

صفدر: "مزید شکریہ! اول تو بغیر تعارف کے انیس الزماں شاید یہاں کھانے پر راضی ہی نہ ہوں، مگر اسکے علاوہ دوسری مجبوری یہ بھی ہے کہ آج ہم سب پکچر پیلس جانے والے ہیں! آج معاف کیجیے آئندہ انشاء اللہ پھر کسی روز سہی۔ اب تو میں آپ کے قریب ہی ہوں!"

مسٹر ڈور (سوشیلا سے): "آج ہم بھی سینما میں کیوں نہ چلیں......"

سوشیلا (اشتیاق کے ساتھ): "ضرور چلیے! ہم نے عرصہ سے دیکھا بھی نہیں۔"

مسٹر ڈور (سرلا سے مخاطب ہو کر): "کیوں؟ تمھاری کیا رائے ہے؟"

سرلا: "مجھے کوئی اختلاف نہیں! البتہ چلیے تو امفنسٹن میں چلیے!"

مسٹر ڈور (صفدر سے): "تمھاری پارٹی کہاں جا رہی ہے؟"

صفدر: "اس کی نسبت ابھی کچھ طے نہیں ہے۔ بہرحال، جہاں آپ تشریف لے چلیں وہیں ہم بھی چلیں گے۔"

مسٹر ڈور: "بس تو امفنسٹن میں چلیں گے اور شام کے چھ بجے۔ یعنی میٹنی میں۔"

گفتگو تھوڑے عرصے تک بائیسکوپ کے مختلف افسانہ والے اور مذاقیہ فلم کے متعلق ہوتی رہی! اثنائے گفتگو میں صفدر اور سوشیلا کی نظریں اکثر دوچار ہوئیں اور کبھی کبھی ایک نے دوسرے سے خطاب بھی کیا! محمد صفدر آخر کار بادلِ نخواستہ رخصت ہوئے اور سب نے نہایت مسرت کے ساتھ چلتے چلتے بائیسکوپ میں شام کو ملنے کا وعدہ دوبارہ لیکر انکو رخصت کیا!

صفدر کے جانے کے بعد تھوڑی دیر مسٹر درّاد ھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے اور پھر اپنی لائبریری والے کمرہ میں چلے گئے! اب مسز درّ نے اپنی صاحبزادیوں سے انیس الزماں کی داستان، جہاں تک اُنھوں نے صفدر سے معلوم کی تھی، سنائی: اس کے بعد مسٹر درّ کی شان میں مدحیہ قصیدہ پڑھنا شروع کیا جسکی اصلی غایت صرف اس قدر تھی کہ صاحبزادیوں کو اپنے والد والا شان کی محبت و شفقت پدری کا پورا یقین ہو جائے! جب مدح سرائی بھی اختتام پر پہونچی تو اب سوا اسکے اور کچھ چارہ نہ تھا کہ بائیسکوپ میں جانے کے انتظامات، خاص خاص لباس زیب تن کیے جانے کی ہدایت اور اثنائے تماشہ میں طرزِ گفتگو اور تذکرہ کے مشورات، کیے جائیں! بہرحال اشتیاق آمیز انتظار نے بمشکل تمام تیج سے دوپہر اور دوپہر سے شام کی!!

مسٹر اور مسز درّ معہ اپنی تینوں صاحبزادیوں کے ڈفرن برج کے قریب، ایلفنسٹن بائیسکوپ کے سامنے اپنی موٹر سے اتر کر سڑک کو طے کرتے ہوئے، بائیسکوپ کی عمارت کے پاس پہونچے ہی تھے کہ ایک دوسرا موٹر اسی جگہ آکر رُکا اور اُس میں سے محمد صفدر کچلو ایک گندمی رنگ کی عورت، ایک چالیس سال کی عمر والا مرد اور ایک کشیدہ قامت نوجوان اُترے! محمد صفدر کچلو مسٹر درّ کی طرف بڑھے جو ان سب کو دیکھ کر خود ہی اپنی جگہ پر ٹھٹک سے گئے تھے: رسم تعارف ادا کی گئی، ہاتھ ملائے گئے، اور معلوم ہوگیا کہ گندمی رنگ والی صفدر کی بڑی بہن - صغرلے فاطمہ - ہیں، چہل سالہ مرد اُن کے شوہر - غلام حیدر - ہیں اور کشیدہ قامت نوجوان انیس الزماں تعلقدار ماہ پارہ ہیں! صغرلے فاطمہ زعفرانی پنجابی پائجامہ، ریشمین دُہری ویسٹ کوٹ اور قمیص پہنے اور ہلکے رنگ کا دھانی چادرہ اوڑھے تھیں! غلام حیدر کشمشی رنگ کا سوٹ زیب تن کیے تھے اور محمد صفدر و انیس الزماں سیاہ ڈِنر ڈریس سوٹ میں تھے! یہ دونوں گروہ تعارف مزورانہ کے موقع پر - حسب تہذیب جدید - اظہارِ مسرت ظاہر کرنے کے بعد ٹکٹ کی کھڑکی کی طرف بڑھے، مسٹر درّ اور مسٹر کچلو نے اپنے اپنے گروہ کے لیے درجۂ اعلیٰ - یا رزروڈ کلاس - کے ٹکٹ خریدے اور ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہوئے پکچر پیلیس کی عالیشان عمارت میں، جو بجلی کی روشنی سے بقعہ نور بنی ہوئی تھی، داخل ہوئے!

درجۂ اعلیٰ میں موجود ہونے والی تماشائیوں کی نظریں اس نئے گروہ کے ایک ایک فرد پر پڑیں لیکن انیس الزماں کی قامتِ دراز کو خصوصیت کے ساتھ دیکھا گیا! یوں تو سیاہ اور خوشنما تراش کے ڈِنر ڈریس نے صفدر اور انیس الزماں کے گورے رنگ اور کیفیت شباب کو یکساں طور پر نہایت نمایاں کردیا تھا لیکن درازقامت، چکلے سینے، بھرے بھرے مونڈھے، اونچی گردن اور مضبوط ساخت نے انیس الزماں کو بجلی کی روشنی میں سینکڑوں آنکھوں کے لیے

نظارہ نظر گیر بنا دیا۔ مسٹر اور مسز در بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے!

درجہ اعلیٰ کی مخملی گدے دار کرسیوں پر مسز در کی چالاکی سے اس ترتیب کے ساتھ نشست ہوئی کہ سب سے پہلے کملا، پھر سرلا، پھر انیس الزماں، پھر غلام حیدر، پھر محمد صفدر، پھر سوشیلا، پھر صغرٰے فاطمہ، پھر خود مسز در اور دوسرے سرے پر مسٹر در، اس ترتیب کی بدولت سوشیلا کو محمد صفدر سے اور سرلا کو انیس الزماں سے تبادلۂ خیالات کا کافی موقع تھا! فی الحقیقت صفدر کا علیگڈھ سے ہی سوشیلا کی طرف راغب ہونا مسز در کی نگاہوں نے اچھی طرح تاڑ لیا تھا اس لیے اب اسے سوشیلا کی زیادہ فکر نہ تھی! اس وقت انیس الزماں کی متاثر کرنے والی وجاہت اور اس سے بھی زیادہ، غیر معمولی امارت مسز در کو از حد گرویدہ بنائے ہوئے تھی۔ اُس کو رہ رہ کر یہ خیال آتا تھا کہ سرلا سوشیلا کے برابر حسین نہیں اور صفدر کی وجہ سے کہیں انیس الزماں جیسی سونے کی چڑیا ہاتھ سے نہ جاتی رہے، وہ رہ رہ کر آگے جھکتی اور کسی نہ کسی بہانے سے سرلا اور انیس الزماں پر نظر ڈالتی۔ دونوں کو ایک دوسرے سے بات نہ کرتے پاکر اُسے افسوس ہوتا کہ اُس نے سوشیلا کو سرلا کی جگہ پر کیوں نہ بٹھایا! صفدر برابر سوشیلا سے گفتگو کرتا معلوم ہوتا تھا اور اب یہ غلطی ناقابل علاج تھی!

تماشہ شروع ہونے میں ابھی بظاہر دیر تھی اور تماشائیوں کی تعداد برابر بڑھتی جا رہی تھی۔ ہجوم کثیر اور باتوں کی آواز نے تمام عمارت میں ایک گونج سی پیدا کر دی تھی اور برق رفتاری روشنی اس چہل پہل کو "زندگی زندہ دلی کا نام ہے" کی تصویر بنائے تھی!

سوشیلا ایک طرف محمد صفدر سے اور دوسری طرف صغرٰے فاطمہ سے اختلاط آمیز گفتگو میں مصروف ہو کر ترنت مشدہ کا کام کر رہی تھی اور انیس الزماں دونوں پیر پوری حد تک پھیلائے، ٹانگ پر ٹانگ رکھے، کرسی کے تکیہ پر اوپر کا جسم ڈالے بیٹھے ہوئے ہیں۔ نیم دراز اپنے نرالا سگرٹ کے دھوئیں سے ہوا میں چھلے بنا رہے تھے! اُن کی اس حرکت یا شان بے اعتنائی سے سرلا کے دماغ کو کسی قدر گھبراہٹ آتی تھی اور اس لیے وہ خاموش تھی یا بات بھی کرتی تھی تو کملا سے! انیس الزماں کو چھلے بنانے سے اگر فرصت ملتی تو وہ غلام حیدر سے مخاطب ہوتے سرلا سے اسوقت تک اُنھوں نے خطاب نہیں کیا تھا!

غلام حیدر نے انیس الزماں سے کہا۔ "یہ عمارت تو نہایت عالیشان اور عمدہ ہے۔"

انیس الزماں۔ "ہاں اچھی ہے، مگر کچھ ایسی زیادہ قابل تعریف نہیں۔"

غلام حیدر۔ "لکھنؤ میں تو ایسا عالیشان تھیٹر ایک بھی نہیں ہے۔"

انیس الزماں۔ "ہاں ابھی تک تو نہیں ہے۔"

غلام حیدر (دوسرا تذکرہ چھیڑنے کے رنگ میں) "آپ اس وقت کسی خیال میں محو معلوم ہوتے ہیں۔"

انیس الزماں (غلام حیدر کی طرف دیکھتے ہوئے) "نہیں قطعی نہیں! محض تماشہ کا منتظر ہوں۔"

غلام حیدر: "مگر انتظار میں ایسا سکوت، و محویت تعجب خیز ہے۔"

"نہیں! کوئی خاص بات نہیں! آپ خاموش تھے اسلیے میں نے بلاضرورت گفتگو شروع کرنا مناسب نہیں سمجھا۔"

"لیکن میں ہی اکیلا زیر بحث نہیں۔" غلام حیدر نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا "آپ کسی اور سے باتیں کرتے۔"

"اور کس سے باتیں کرتا؟" انیس الزماں نے جواب دیا۔ "صفدر خود مشغول ہیں اور انکو مخاطب کرنا میں اس وقت ناجائز ظلم سمجھتا ہوں....."

غلام حیدر: (بات کاٹ کر) "صفدر کو چھوڑیے! انکے علاوہ اور لوگ بھی یہاں موجود ہیں۔"

انیس الزماں: "بیشک بہت لوگ ہیں، تمام تھیٹر بھرا ہوا ہے مگر میں اجنبی سے بلاوجہ مخاطب ہونا حماقت اور بدتمیزی سمجھتا ہوں۔"

"لیکن جن سے آپ کا تعارف ہوگیا ہو وہ تبادلۂ خیالات کے لیے اجنبی نہیں سمجھے جاسکتے۔"

"محض رسمی تعارف کی میری نگاہ میں کوئی وقعت نہیں! اس کے علاوہ ہر کس و ناکس کو میں محض رسمی تعارف کی بنیاد پر گفتگو کا اہل تصور نہیں کرسکتا۔ اور نا اُن سے تبادلۂ خیالات میرے لیے سخت سزا ہے۔"

یہ گفتگو اور کوئی سنتا ہو یا نہ سنتا ہو مگر سرلا یقیناً سن رہی تھی اور انیس الزماں کے کبر کا خیال اور زیادہ اُس کے دماغ میں جاگزیں ہوتا جاتا تھا!

گھنٹی بجی، بجلی کی روشنی چشم زدن میں غائب ہوگئی۔ سامنے والے پردے پر روشنی کا سفید حلقہ یا فوکس نمایاں ہوا، باتوں کے بند ہوجانے سے گونج کی آواز دھیمی پڑی اور تماشہ شروع ہوگیا! بائیسکوپ کے تیزی سے چلنے والے فلم کی مشین اپنی حرکت سے ایک ہلکی اور مسلسل آواز پیدا کر رہی تھی۔ تمام عمارت میں سوائے اُس روشنی کے جو مشین سے نکل کر تیز و منور شعاعوں کی چادر [illegible] سامنے والے پردے پر پڑ رہی تھی تاریکی تھی اور اُس تاریکی میں تماشائی نظریں متحرک تصاویر کے نظارے میں محو تھیں! چارلی چیپلن، اپنی انوکھی چال اور مخصوص چشم و ابرو کے ساتھ سفید چادر پر نمایاں ہو کر نوجوان طبیعتوں کے ساتھ گدگدی کا کام کرنے لگا، چھوٹے بچوں کے بیساختہ کھل کھلا کر ہنس پڑنے کی آوازیں عمارت کے مختلف تاریک حصوں سے گونجنے لگیں! [illegible]

فلم کے اختتام پر فتحمند افواج برطانیہ کا داخلہ ایک مفتوح مقام میں پیش ناظرین کیا گیا! جس وقت برطانوی فوج کے بشاش و بشاش سپاہی سفید پردہ کی سطح پر، سکوت کے عالم میں، نہایت باقاعدگی اور ترتیب کے ساتھ سامنے سے گزر رہے تھے سینما کے وائلین بجانے والے "رقص محل" کے لحاظ سے جنگ عظیم الشان کے دوران میں مشہور ہو جانے والا گیت

بجانے لگے، تماشائیوں میں موجود ہونے والے گوروں
نے جن کی کافی تعداد دوسرے اور تیسرے درجے میں
موجود تھی اس نظارے سے متاثر ہو کر ساز کے ساتھ ساتھ
پوری آواز میں "ٹرا اے لانگ لانگ وے ٹو ٹپاریری"
الاپنا شروع کر دیا اور ساری عمارت ایک دفعہ گونج اٹھی!

اس جنگی نمائش کے بعد وہ طویل عشقیہ افسانہ شروع ہوا جو آج کے تماشے کی جان سمجھا جاتا تھا۔ ایک انگریز نوجوان کا تمول، اس کا ایک حسین لڑکی کے عشق میں مبتلا ہونا، مختلف مصائب کا سامنا کرنا، اور بالآخر محبوبہ کے اصرار پر عظیم الشان جنگ کے دوران میں ایک لفٹننٹ کی حیثیت سے بھرتی ہو جانا یکے بعد دیگرے نہایت کامیاب اور دلچسپ رنگ میں ناظرین کے سامنے آتے [illegible] تماشائی ہمہ تن [illegible] تمام عمارت پر سکوت [illegible] طاری تھا اور [illegible] تھا کہ دو بے تکلف اور پاس پاس بیٹھنے والے احباب کی سرگوشی بھی ہمہ تن محو تماشا ہونے والے آس پاس والوں کو کسی قدر ناگوار ہوتی تھی! اسی سکوت و تاریکی میں صفدر نے سوشیلا سے چپکے چپکے پوچھا:

"کیوں ... یہ فلم کیسا ہے؟"

"[illegible] اچھا ... اور دلچسپ ہے۔" اسی آواز میں سوشیلا نے جواب دیا۔

"صرف دلچسپ ہی ہے۔ بس؟"

"اور کیا ہے؟"

"محرکِ جذباتِ شریف ہے!"

"میں نہیں سمجھی!" سوشیلا نے عجیب بھولی آواز میں کہا۔

"تم نہیں سمجھ سکتیں! یہ وہی سمجھ سکتا ہے جس کا دل درد آشنا ہو۔"

"دل کا درد آشنا ہونا بھی میرے لیے ایک تشریح طلب معما ہے۔"

"ضرور ہوگا! تمہارے دل کو خدا نے درد سے محفوظ رکھا ہے۔" صفدر نے عجیب درد کے ساتھ کہا۔

"کیا یہ کوئی بری بات ہے کہ میں دل کا درد آشنا ہونا نہیں جانتی؟" سوشیلا نے اسی سادگی کے ساتھ پوچھا۔

"بری تو میں نہیں کہہ سکتا: مگر۔ مگر...." وہ کہتے کہتے خاموش ہو گیا!

دلچسپ افسانہ کا پہلا حصہ ختم ہونے پر دفعتاً ساری عمارت بجلی کی روشنی سے جگمگا اٹھی اور تھوڑی دیر کے لیے تماشہ رک گیا! تاریکی کے جانے کے ساتھ ہی سکوت بھی غائب ہو گیا اور باتوں کی آواز ہر چہار سمت سے بلند عمارت میں گونجنے لگی! صفدر اپنی جگہ سے اٹھے، ان کی استدعا پر غلام حیدر انکی کرسی پہ تھوڑی دیر کے لیے بیٹھ گئے اور وہ خود غلام حیدر کی کرسی پر محض انیس الزماں سے قریب تر رہنے کی خاطر بیٹھ گئے! ان کے قریب آتے ہی انیس الزماں نے کہا "کیوں! تم اس طرف کیوں آ بیٹھے؟"

صفدر "محض تمہاری خاطر! میں تم کو اس طرح ہونٹ سے ہونٹ سیے دیکھنا گوارا نہیں کر سکتا۔"

انیس۔ اور میں تمہاری موجودگی میں خاموش نہیں رہ سکتا!

کیوں تمھیں اس کا تمھیں یقین ہے نا؟"

صفدر: "بیشک یقین ہے! آخر ایسی صحبت تبادلۂ خیالات کے لیے ہوتی ہے یا خاموشی کے لیے؟"

انیس: "لیکن تبادلۂ خیالات کے لیے کم از کم جانبین کا ہم خیال و ہم پلہ ہونا ضروری ہے۔"

صفدر: "کیا حسن و شباب تبادلۂ خیالات کے لیے غیر معمولی طور پر محرک نہیں ہوتے؟"

انیس: "ضرور ہوتے ہیں! اور اسی وجہ سے تم اس پر شیریں گفتاری سے محظوظ ہو رہے ہو؛ مجھے رشک نہیں بجز اسرت ہے کہ تم جیسا شخص جس پر مائل ہو وہ فی الحقیقت حسین ہے! اس وقت صرف تمھارے پہلو میں نظر آنے والی شکل ہی قابلِ ستائش ہے!"

"تو پھر" مسکراتے ہوئے صفدر نے کہا "تم میری جگہ پر بیٹھو اور میں یہاں بیٹھوں گا"

"توبہ! توبہ! میں اور ایسی ناجائز مداخلت! اور وہ بھی صفدر کے جذباتِ مسرت کے ساتھ! صفدر! تم میرے لیے وہی صفدر ہو جو آج سے بہت پیشتر تھے! خدا کی قسم مجھے نہایت اطمینان ہوا ہے کہ میں تم کو کسی معمولی صورت پر تضیعِ اوقات کرتے نہیں پاتا!"

صفدر: "پھر آخر تمھاری دلچسپی کا مشغلہ بھی تو کچھ نہ کچھ ہونا چاہیے: میں تم کو ایسا گم سم نہیں دیکھ سکتا!"

انیس: "مجھے تمھارے دلآویز مشغلہ کے نظارہ سے ہی کافی دلچسپی پیدا ہوتی ہے لیکن مجھے اس کا یقین تھا کہ صفدر جس طرف متوجہ ہو ممکن نہیں کہ اس کی توجہ کا معاوضہ اُس سے دوچند زیادہ توجہ کی صورت میں دوسری جانب سے اُسے نہ ملے؛ مگر احتمال صرف یہ تھا کہ صفدر جس طرف متوجہ ہوتا ہے وہ خود اُسکے اپنے مقابلہ میں اس توجہ کا مستحق بھی ہے یا نہیں! یہ احتمال آج جاتا رہا اور محض اس اطمینان سے میں بہت کچھ مسرور ہوں!"

صفدر۔ (مسکراتے ہوئے) "میری تعریف کو چھوڑو! یہ بتاؤ کہ آخر تم (آہستہ آہستہ) اپنے پہلو میں موجود ہونیوالی نوجوان اور حسین صورت سے کیوں اس قدر بے رُخی برت رہے ہو؟"

انیس (جواب دینے کے ساتھ سرلا کی طرف کچھ اس طرح دیکھتے ہوئے گویا سرلا کی موجودگی کا انکو علم ہی نہ تھا) "محض اس وجہ سے کہ مجھے دوسری طبیعت کی اُفتاد کا مطلق علم نہیں!"

صفدر: "تبادلۂ خیالات سے یہ علم حاصل ہوسکتا ہے۔"

انیس: "گر میں تاریکی میں قدم بڑھانے اور گہرائی معلوم کیے بغیر غوطہ لگانے کا قائل نہیں"۔

صفدر: "محض چند لمحے مسرت کے ساتھ گزارنے کے لیے ایسے گہرے معتقدات پر کاربند ہونا عموماً ناپسندیدہ سمجھا جاتا ہے"

انیس: "عام ناپسندیگی کی مجھے مطلق پروا نہیں۔ تم جانتے ہو میں اپنی عادات ترک نہیں کرسکتا!"

صفدر "تو میں یہ سمجھوں کہ تم اسی طرح خاموش بیٹھے رہو گے؟"

انیس: "خاموش رہنا، محض رسمی نمائش کی خاطر تپاک

کرنے سے بدرجہا بہتر ہے! میں تم سے کہتا ہوں کہ اپنا بیش بہا وقت ضائع نہ کرو: اپنی کرسی پر جاؤ! تمہاری گرویدہ کرنے والی صورت مجھ پر اپنے دل ہی دل میں نفرین کرتی ہوگی!"

صفدر کو یقین تھا کہ وہ انیس کو اسکے خیالات و فیصلۂ دماغی سے ایک انچ نہیں ہٹا سکتا اور ساتھ ہی اُس کا دل بُری طرح متقاضی تھا کہ وہ جلد سے جلد سوشیلا کے پاس پھر پہونچ جائے اس لیے وہ بالآخر اپنی کرسی پر چلا گیا اور غلام حیدر اپنی جگہ آگئے! روشنی آجانے کے بعد سے مسٹر صفدر نے چند بار اس طرف نظر دوڑائی اور اس امید پہ نظر دوڑائی کہ وہ انیس الزماں اور سرلا کو ایک دوسرے سے بے تکلف دیکھ لیں، لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شدہ' یہ اُمید محض آرزو ہی رہی! سرلا اس عرصہ میں بظاہر کملا سے مصروف رہی مگر دراصل صفدر و انیس الزماں کی گفتگو کے بہت زیادہ حصے اُس نے پوری طرح سُن لیے! صفدر کے اپنی کرسی پر واپس جانے کے بعد انیس الزماں نے اپنا نفیس طلائی سگریٹ کیس جیب سے نکالا اور کھولتے ہوئے غلام حیدر کی طرف بڑھایا: غلام حیدر نے شکریہ کے ساتھ سگریٹ لیا ہی تھا کہ تماشا دوبارہ شروع ہو جانے سے روشنی پھر غائب ہوگئی! تاریکی میں انیس الزماں کا ایک سگریٹ اپنے ہونٹوں میں لینا دیکھنے والوں کو نظر آیا ہو لیکن دیا سلائی جلانے پر غلام حیدر کی طرف پہلے بڑھانا اور پھر اپنا سگریٹ سلگانا صاف نظر آگیا!

غزل

(جناب حبیب صاحب سندیلوی)

پڑا ہے اک بتِ کافر سے پالا — خدا جانے کہ کیا ہے ہونے والا
نہ دیکھو مسکرا کر تم ادھر اب — وہ ٹوٹا پھر ہمارے دل کا چھالا
وہ رکھی سامنے ہے سرخ بوتل — ترے قربان اے ساقی اُٹھا لا
دلِ آوارہ کو الفت میں تمہاری — نہ سنبھلا سو طرح ہم نے سنبھالا
نہ تھا ڈھانے کے قابل کعبۂ دل — بُتِ کافر نے کچھ دیکھا نہ بھالا
سرہانے دم کے دم آجاؤ صاحب — کوئی بیمار شاید لے سنبھالا
غمِ عشق آہ لوہے کے چنے ہیں — یہ رستہ ہے ہمارا دیکھا بھالا

حبیب آساں نہیں ہے راہِ الفت
اسے سمجھے ہو تم منہ کا نوالا

انتخاب خزانۂ عامرہ

(جناب مرزا محمد عسکری صاحب بی اے)

علامہ میر غلام علی آزاد بلگرامی کا تذکرہ خزانۂ عامرہ بہت مشہور ہے۔ ۱۸۷۱ء میں نولکشور پریس نے چھاپا تھا۔ طبع ثانی کی نوبت نہیں آئی۔ اس لیے مدت سے بازار میں نہیں ہے۔ کرم و محترم جناب مرزا محمد عسکری صاحب بی اے کی ذات گرامی لکھنؤ میں منتنمات سے ہے۔ انگریزی اور اردو کے ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ عربی و فارسی ادب سے خاص ذوق رکھتے ہیں اور جب سے سرکاری ملازمت سے پنشن پاکر وطن میں قیام پذیر ہوئے ہیں۔ باوجود پیرانہ سالی کے برابر علمی و ادبی کاموں میں معروف رہتے ہیں۔ صاحب ممدوح کو ایک زمانہ میں خیال پیدا ہوا کہ موجودہ نسل کے اردو خواں اصحاب بھی خزانہ عامرہ سے بہرہ مند ہوں اور آپ نے اس کا اردو ترجمہ شروع کردیا۔ جو افسوس ہے کہ ناتمام رہا ناکمل ترجمہ کے مسودہ کے ساتھ ایک مختصر انتخاب بھی اردو میں ترتیب دیا تھا جسے ہم نذر ناظرین کرتے ہیں۔

ایڈیٹر

شیخ عبدالواحد متخلص بہ وحشت تھانیسری جن کا یہ مطلع مشہور ہے

چشم را خالی کن از دیدن تماشا نازک است — آرزو در سینہ بشکن جلوہ آرا نازک است

نقل کرتے ہیں کہ ان کے زمانے کے ایک مشہور رئیس عبید اللہ خاں کی تعریف میں انھوں نے ایک قصیدہ کہا تھا جس کے صلے کا خاں صاحب نے وعدہ کیا مگر کچھ نہیں دیا۔ ایک دن وحشت نے بسبیل تذکرہ ان سے کہا کہ میں نے اس شہر میں بارہ[۱۲] آدمی جنکا نام عبید اللہ ہے گنے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میں بھی انھیں میں سے ایک ہوں گا۔ وحشت نے جواب دیا کہ نہیں صاحب آپ کیوں ہونے لگے۔ آپ عبید اللہ زیاد ہیں۔ اس میں یہ لطیفہ ہے کہ ایک تو ان کو مشہور عبید اللہ ابن زیاد بنایا دوسرے یہ کہ تیرہ[۱۳] کا عدد مثل ہندوستان کے ایران میں بھی منحوس سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ جب کسی چیز کی گنتی میں تیرہ تک پہونچتے ہیں تو بجائے لفظ سیزدہ[۱۳] کے زیادہ کہتے ہیں۔

غالب آملی نے ایک مشہور قصیدہ قلم کی تعریف میں لکھا ہے۔ جس کے چند اشعار یہ ہیں:-

ہاں اے نگیں آہوے ششکین ختائی — از نرگس مستانہ کنی غالیہ سائی

آہو اگر آگاہ نبود نافہ کشا چیست؟ — برگوشۂ چشمت اثر نافہ کشائی

مستانہ روی بر ورقِ لالہ و نسرین — با آنکہ درین باغ نہ شبنم نہ صبائی
از مطرب کہ گیرد زحمتِ نغمۂ شب و روز — کارام نگیری دمے از نادرہ زائی
سر می‌بُرد بہ بدن نقد از حالتِ گفتار — تو با سرِ مقطوع چناں نغمہ سرائی
دائم بسر انگشت خرامی بہ نزاکت — مانند عروساں نفسِ جلوہ نمائی
داغ اند ز رفتارِ تو کبکان و تذروان — با آنکہ چو طاؤس ہمہ زشتیِ پائی
ہرگہ بہ سیہ چشمہ زنی غوطہ سراسر — صد گوہرِ ناسفتہ برآری چو برآئی
خاکِ قدمت صاف تر از آبِ حیات است — ہرچند کہ تا ساق نہاں در گل و لائی
زیرِ قدمت فرش ورقہائے زر افشاں — از جنبشِ سر تندی و از جنبشِ خطائی
با آنکہ بریدہ است سرِ ہر دو زبانت — صد نغمہ سرائی ہمہ رمزی و ادائی
آں لحظہ کہ طاؤس خرامی کُنی آہنگ — بر پاے تو افتند تذروانِ ہوائی
زاں رو کہ درا لازمۂ زانوِ ناقہ است — بر زانوے تو کردہ صریرِ تو درائی
اے خامۂ مشکیں رقم! اے حورِ سیہ‌ست! — اے شغلِ تو چوں زلفِ بتاں غالیہ سائی
داری بہ سرِ شیفتہ سوداے نہانی — در گوشِ دلم گوئی کہ مستِ چہ ہوائی

میر عبدالولی عزلت سورتی نقل کرتے ہیں کہ میرزا عبدالقادر بیدل کی تاریخ وفات پر اُنکی قبر پر عرس ہوتا تھا۔ جس میں تمام شعراے شاہجہان آباد جمع ہوتے تھے۔ ایک دفعہ اسی عرس کے موقع پر میں بھی حاضر تھا۔ دیکھا کہ وہاں میرزا کا کلیات موافق معمول کے رکھا ہے۔ میں نے دل میں سوچا کہ دیکھوں میرزا کو میرے آنے کی خبر ہے یا نہیں۔ اسی نیت سے ان کا کلیات کھولا۔ سب سے پہلے جس شعر پر نظر پڑی وہ یہ تھا

چہ مقدارِ خوں در عدم خوردہ باشم — کہ بر قاتلم آئی و من مردہ باشم

سب لوگ میرزا کی یہ کرامت دیکھ کر متعجب ہوئے۔

صاحب **ثمرات القدس** لکھتے ہیں کہ قاسم کاہی کی یہ رباعی ہے

ہر کس کہ ز اسرارِ خدا آگاہ است — پیوستہ میانِ بنگیانش راہ است
از بنگ شود سترِ اناالحق ظاہر — چوں ہر برگش بصورتِ اللہ است

جب شیخ عبدالنبی صدر الصدور نے سُنی تو اُس پر کفر کا فتوےٰ دیا اور اکبر کو مجبور کیا کہ اس کو بلا کر اس جرم کی پاداش میں سزا دیں۔ جب کاہی حاضر ہوا اور شیخ نے اس کو ڈانٹنا شروع کیا تو اُس نے اکبر

سے عرض کیا کہ حضور ان سے دریافت فرمائیں کہ انھوں نے کبھی بھنگ پی ہے یا نہیں۔ بادشاہ نے صدر الصدور سے مخاطب ہوکے فرمایا کہ دیکھو یہ کیا کہتا ہے۔ اس کا جواب دو۔ شیخ نے بہت لاحول اور استغفار کرکے جواب دیا کہ میں نے بھنگ کبھی دیکھی بھی نہیں پینا کیسا؟ اس پر مولانا نے کہا آپ بیشک سچ کہتے ہیں آپ کو بھنگ کے اسرار کیا معلوم۔ اگر آپ اس کو استعمال کریں اور اسکے اسرار آپ پر واضح نہ ہوں تو اس صورت میں میں ضرور سزا کا مستحق ہوں گا۔ اکبر اس جواب سے بیحد مسرور ہوا اور کاہی کو نہایت عزت کے ساتھ رخصت کیا۔

شیخ عبدالقادر بدایونی اپنی کتاب منتخب التواریخ میں لکھتے ہیں کہ سلطان سالکی ایک قلندر وضع اور آزاد روش شاعر تھا۔ ایک دن اس سے اور ملا قاسم کاہی سے ملاقات ہوئی۔ سلطان نے پوچھا کہ سن شریف کیا ہوگا؟ کاہی نے جواب دیا کہ خدا سے دو برس چھوٹا ہوں۔ سلطان نے کہا میں تو سمجھا تھا کہ جناب خدا سے دو برس بڑے ہوں گے۔ سن گھٹانے کی کیا وجہ ہے؟ کاہی یہ برجستہ جواب سن کر ہنسی کے مارے لوٹ گیا اور کہا کہ بیشک تو میری صحبت کے قابل ہے۔ قرینے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نکتہ شیخ بایزید بسطامی سے لیا گیا ہے کہ فرمایا انا اقل من ربی بسنتین یعنی میں خدا تعالیٰ سے دو برس چھوٹا ہوں۔ عرفاء نے اسکے یہ معنی لیے ہیں کہ سنۃ سے مراد صفت ہے یعنی دو صفتوں وجوب قدرت میں کم ہوں۔

ایک دن سلطان نے علی قلی خاں کی تعریف میں جن کا تخلص بھی سلطان تھا اور بڑے امیر کبیر مخاطب بہ خان زماں سخاوت و شجاعت میں مشہور تھے، ایک قصیدہ کہا۔ خان زماں کو یہ قصیدہ بہت پسند آیا۔ ایک ہزار روپیہ انعام اور خلعت دیا اور شاعر سے درخواست کی کہ چونکہ میرا بھی تخلص سلطان ہے لہذا اپنا تخلص بدل دو۔ شاعر نے غصہ ہوکر خلعت و انعام واپس کیا اور کہا کہ میرے باپ نے سلطان محمد میرا نام رکھا ہے اور آپ سے بہت پیشتر سے یہی تخلص کرتا ہوں، میں اس کو ہرگز نہ بدلوں گا۔ خان زماں کو یہ بات بہت ناگوار ہوئی اور غصہ میں آکر کہا کہ ایک مست ہاتھی لاؤ اور اس کو اسکے پاؤں میں باندھ دو۔ شاعر پر اس سے کچھ اثر نہ ہوا اور کہا کہ یہ تو میری عین سعادت ہے کہ شہادت نصیب ہو۔ اس حالت کو دیکھ کے مولانا علاء الدین لاری، خان زماں کے استاد نے سفارشاً یہ فیصلہ کیا کہ دیوان جامی منگایا جائے اور سلطان کو اس کی ایک غزل دی جائے کہ اگر اس پر فی البدیہہ کوئی غزل کہہ سکے تو اس کی جانبری کی جائے ورنہ جیسا کہ ارادہ ہے ویسا کیا جائے۔ دیوان کھولا گیا تو اتفاق سے یہ غزل نکلی:-

دل خلعت رارقم صنع الٰہی دانست　　برسر سادہ رخاں حجت شاہی دانست

سلطان نے فی البدیہہ غزل کہی جسکا مطلع یہ ہے ؎

ہرکہ دل را صدف سر الٰہی دانست　　قیمت گوہر خود را بہ کلاہی دانست

شانِ زاں اس غزل سے اس قدر مسرور ہوا کہ اس کی جاں بخشی کی اور نیز بہت کچھ انعام واکرام دیا۔

حکیم رکنا کاشی متخلص بہ مسیح ۔ شاہ عباس صفوی کے بہت منہ چڑھے مصاحب تھے شاہ موصوف دو مرتبہ ان کے گھر آئے تھے ۔آخر میں حاسدوں نے بادشاہ کا مزاج ان سے برہم کردیا اور مسیح کو ایران چھوڑنا پڑا۔ اس موقع پر کہتے ہیں ؎

گر فلک یک صبحدم بامن گراں باشد سرش　　شام بیروں می روم چوں آفتاب از کشورش

ایران چھوڑ کر ہندوستان آئے ۔ یہ زمانہ اکبر کا تھا ۔ایک مدت تک اکبر اور جہانگیر کے دربار میں رہے کچھ دنوں کے بعد الہ آباد میں چند دن قیام کرکے حیدرآباد گئے ۔ وہاں اس وقت میر محمد مومن استرآبادی وکیل السلطنت محمد قلی قطب شاہ کا دور دورہ تھا ۔ وہ حکیم صاحب سے ملنے آئے ۔حکیم صاحب نے رسم ایران کے مطابق ان پر گلاب چھڑکنا چاہا ۔ اتفاق سے گلاب اور شراب کے شیشے پاس پاس رکھے تھے ۔بجائے گلاب کے شراب کا شیشہ ہاتھ آیا اور وکیل السلطنت پر خوب شراب پاشی کی ۔ جس سے انکو سخت رنج وملال ہوا ۔ ادھر حکیم صاحب اپنی اس حرکت سے اس قدر نادم اور شرمندہ ہوئے کہ حیدرآباد سے بیجاپور کی راہ لی اور جب وہاں بھی کچھ نہ ہوا تو لشکر جہانگیری میں واپس ہوکر نہایت خان کے مقرب ہوگئے ۔ شاہجہاں کی تخت نشینی کی تاریخ انھوں نے خوب کہی ہے جس پر بارہ ہزار روپیہ انعام ملا تھا ؎

بادشاہ زمانہ شاہجہاں　　خرم وشاد وکامراں باشد

ہر سالِ جلوسش او گفتم　　در جہاں بادشاہ جہاں باشد　۱۰۳۵

مسیح کا انتقال کاشان میں ۱۰۶۶ھ میں ہوا ۔ اور انکی تاریخ وفات اس مصرعہ سے نکلتی ہے

"رفت بہ سوئے فلک باز مسیح دوم"

امیر نصیر الدین کبود جامہ ۔ سلطان تکش کے دربار کا بہت بڑا امیر تھا ۔فیروزہ کوہ اور چند دیگر قطعات زمین اس کی ملک میں تھے اور اپنے زمانہ کا ایک مشہور فاتح ذی رعب گزرا ہے ۔ اتفاق سے حاسدوں نے بادشاہ کا مزاج اس کی طرف سے اس قدر برہم کردیا کہ بادشاہ نے حکم دیا کہ اس کا سر دربار میں حاضر کیا جائے ۔ ایک جماعت اس کام پر مقرر ہوئی ۔ امیر نے ان کو

بہت روپیہ دے کر اس بات پر راضی کیا کہ اس کو دربار میں زندہ لے چلیں۔ چنانچہ وہ ایسے موقع پر جبکہ بادشاہ ایک جشن عظیم میں مصروف تھا حاضر کیا گیا۔ بادشاہ نے غصہ میں حکم دیا کہ اس کی گردن کیوں نہیں ماری جاتی۔ اُس نے فی البدیہہ یہ رباعی عرض کی۔

من خاک تو در چشم خرد می آرم　　عذرت نہ یکے نہ دہ نہ صد می آرم
سر خواستۂ بدست کسے نتواں داد　　می آرم و بر گردن خود می آرم ∴

بادشاہ اس معذرت سے اس قدر خوش ہوا کہ اُس کی جاں بخشی کی اور جس قدر مال و متاع اُس جگہ پر تھا سب اُس کو بخش دیا۔

عظیما - (وفات ۱۱۱۰ھ) اس کی یہ غزل مسلسل مشہور ہے ؎

قاصد آمد گفتمش آں ماہ سیمیں بر چہ گفت　　گفت با ہجرم بساز گفتمش دیگر چہ گفت
گفت دیگر پا ز حدِ خویش نگذارد بروں　　گفتمش جمع است از پا خاطرم از سر چہ گفت
گفت سر را پایدش از خاکِ رہ کمتر شمرد　　گفتمش کمتر شمردم از تنِ لاغر چہ گفت
گفت جسمِ لاغرش را از غضب خواہم بسوخت　　گفتمش من سوختم در بابِ خاکستر چہ گفت
گفت خاکستر چو گردد خواہمش بر باد داد　　گفتمش بر باد رفتم در حقِ محشر چہ گفت
گفت در محشر یکے من زندہ اش خواہیم کرد　　گفتمش من زندہ گردیدم ز خیر و شر چہ گفت
گفت خیر و شر نباشد عاشقاں را در حساب　　گفتمش ایں ہم حسابے از لبِ کوثر چہ گفت
گفت با ما بر لبِ کوثر نشیند عاقبت　　گفتمش گر عاقبت ایں است زیں خوشتر چہ گفت
گفت دیگر نگذرد بر خاطرش بارِ عظیم　　گفتمش دیگر مگو گفتا مگو دیگر چہ گفت

خان آرزو مجمع النفائس میں عظیما کے تذکرہ کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ نعمت خان عالی نے اس غزل کے جواب میں ایک غزل لکھی ہے جس میں عظیما پر اعتراض کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

ہست عالی از عظیما در غزل سہوِ عظیم　　زانکہ از قاصد بود یک گفت پس دلبر چہ گفت

مختصراً یہ کہ نعمت خان عالی کی یہ غرض معلوم ہوتی ہے کہ ہر جگہ دو گفت ہونا چاہیے تھا ایک گفت سے کام نہیں نکلتا یعنی ایک گفت سے قاصد کا قول معلوم ہوتا ہے اور دو گفت معشوق کے قول پر دلالت کرتے۔ یہ اعتراض غلط ہے۔ میں نے جو عالی کے کلیات میں اس غزل کے جواب میں غزل دیکھی وہ مسلسل نہیں ہے اور اُس کا مقطع وہ ہے جو خان آرزو نقل کرتے ہیں بلکہ یہ ہے ؎

عالی آخر نیست در از گفتگوے عشق راز　　تا بکے آخر کسے گوید فلاں دیگر چہ گفت

مولانا جمال الدین ابن حسام الدین دھلوی - صاحب ہفت اقلیم انکے متعلق لکھتے ہیں کہ انھوں نے سلطان محمد تغلق کی تعریف میں ایک قصیدہ کہا تھا جس کا مطلع ہے ؎

الٰہی تا جہاں باشد نگہدار ایں جہانباں را   محمد شاہ تغلق شاہ سلطان ابن سلطان را

بادشاہ نے یہ مطلع سُن کر باقی قصیدہ سننے سے انکار کیا اور شاعر سے کہا کہ میں اس ایک شعر کا صلہ کافی طور پر نہیں دے سکتا، پورا قصیدہ سُن کے کیا کروں؟ اور حکم دیا کہ روپیوں کی تھیلیاں لائی جائیں اور شاعر کے چاروں طرف گردن تک رکھ دی جائیں - چنانچہ ایسا ہی کیا گیا - جب تھیلیاں گردن کے قریب پہونچیں تو مولانا اُٹھ کھڑے ہوے - بادشاہ کو ان کی یہ حرکت بہت پسند آئی - ہنسے اور حکم دیا کہ اور روپیہ حاضر کیا جائے اور اُن کے سر تک لگا دیا جائے -

شیخ جمال دہلوی - مولانا جامیؒ اور ملا جلال الدین دوانی کے معاصر تھے - ان کا یہ شعر بہت مشہور و مقبول ہے ؎

موسیٰ زہوش رفت بہ یک پرتو صفات   تو عین ذات می نگری در تبسمے

سید حسن غزنوی - یہ بھی بارگاہ رسالت کے بڑے مداح ہیں — انکا ایک قصیدہ افتخاریہ جس کا مطلع ہے

دانند جہاں کہ قرۃ عین پیمبرم   شایستہ میوۂ دل زہرا و حیدرم

اس قدر مقبول ہے کہ اس وقت تک شعرا اس کا جواب کہنے کی کوشش کر رہے ہیں - سید مذکور غزنی سے حرمین شریفین کی زیارت کے لیے روانہ ہوے - جب مدینہ منورہ پہونچے اور مرقد مطہر نبوی کی زیارت کا شرف حاصل ہوا تو ایک ترجیع بند سات بندوں کا مرتب کرکے روضۂ شریفہ کے سامنے پڑھا جس کے چند اشعار یہ ہیں ؎

ابر رحمت سرورا یا زاں دست چوں جیحوں فرست   تشنگاں را شربتے گر ممکن ست اکنوں فرست
لا بنِ فرزندی بیارم زود ریں حضرت دلے   مدحتے آوردم اینک خلعتے بیروں فرست
سیم و زر قدرے ندارد نیستم در بند آں   از قبولِ خویشتن یک ذرہ ایں مجنوں فرست
یا رسول اللہ ! سزاواری کہ گویم لے خدا   بر رسول اللہ درود از ہر چہ ہست افزوں فرست

حمد اللہ مستوفی صاحب تاریخ گزیدہ نقل کرتے ہیں کہ جب سید موصوف اس شعر پر پہونچے "لا بن فرزندی بیارم الخ" تو ایک خلعت روضۂ منورہ سے باہر آیا - اور اس روایت کی صحت پر بڑا وثوق رکھتے ہیں - میں نے بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ جب یہ شعر پڑھا گیا تو خدام روضہ نے ایک خلعت شاعر کے واسطے حاضر کیا اور یہی روایت مجھکو زیادہ

صحیح معلوم ہوتی ہے۔

حکیم ابوالفتح خلف مرزا عبدالرزاق گیلانی۔ مع اپنے دو بھائیوں حکیم ہمام اور نورالدین کے ۹۸۳ھ میں اپنے ملک سے ہندوستان پہونچے۔ حکیم ابوالفتح کو دربار اکبری میں جو تقرب اور مرتبہ حاصل ہوا مشہور ہے۔ اگرچہ ان کا منصب ہزاری تھا مگر ان کے عروج کی کوئی انتہا نہ تھی۔ وہ جدت فہم اور جودت طبع کے لیے مشہور تھے۔ اپنی قابلیت کے سامنے کسی کی ہستی نہیں سمجھتے تھے۔ شیخ عبدالقادر بدایونی نقل کرتے ہیں کہ ان کی شہرت سن کے ایک مرتبہ میں بھی ان کی ملاقات کے واسطے گیا۔ اثنائے گفتگو میں اُنکو یہ کہتے ہوے سنا کہ خسرو کیا چیز ہے صرف دو ہی بارہ شعر۔ انوری (جسکو وہ حقارت سے انورک کہتے تھے) کیا ہے، وہ تو بادشاہوں کا بھاٹ اور مسخرہ جیسے کہ میر بادنجان تھا۔ خاقانی کی نسبت یہ ارشاد تھا کہ اگر اس زمانہ میں ہوتا تو خوب ترقی کرتا۔ اس طرح کہ جب میرے پاس آتا تو میں اُس کو دو طمانچے مارتا اور وہ اپنی طبیعت کی کاہلی بھول جاتا، اور جب میرے یہاں سے شیخ ابوالفضل کے یہاں جاتا تو وہ بھی اس کو دو چپتیں رسید کرتے۔

شہیدی قمی۔ سلطان یعقوب والی تبریز کا ملک الشعراء تھا۔ صاحب تاریخ فرشتہ اسمٰعیل عادل شاہ کے حالات میں لکھتے ہیں کہ جب سنہ ۹۳۰ھ میں قلعہ بیدر فتح ہوا اور سلاطین بہمنیہ کے پُرانے خزانے اسمٰعیل عادل شاہ کے ہاتھ آئے تو بادشاہ نے اُن کو بڑی سخاوت سے مستحقین پر لُٹانا شروع کیا۔ شہیدی مذکور جو گجرات سے آئے ہوے تھے بادشاہ کے بہت مقرب تھے۔ بادشاہ نے ان کو حکم دیا کہ خزانے میں جا کر جتنی اشرفیاں اُٹھا سکو، لے آؤ۔ چونکہ مولانا اسی زمانے میں گجرات سے سفر دور و دراز کرکے آئے تھے اور بہت کمزور خستہ ہو رہے تھے، بادشاہ سے عرض کیا کہ بالفعل بنا بر سبب صعوبت سفر ناطاقتی ہو رہی ہے، اگر یہ عنایت کسی وقت آیندہ پر ملتوی کی جائے تو عین عنایت ہے۔ بادشاہ نے ہنس کے جواب دیا کہ مولانا کیا آپ نے سنا نہیں

که آفتهاست در تاخیر و طالب را زیاں دارد

اگر آپ کمزور ہیں تو کچھ مضائقہ نہیں، دو مرتبہ کرکے جس قدر اُٹھ سکے اپنے ہمراہ لائیے مگر دیر نہ فرمایئے۔ چونکہ یہ حکم مولانا کا عین مدعا تھا۔ سنتے ہی شگفتہ ہوگئے اور خزانہ سے دو مرتبہ کرکے پچیس ہزار ہون طلائی جو اس زمانہ کے ایک لاکھ روپئے کے برابر ہیں، لیکر مع الخیر واپس آئے۔ جب خازن نے اس کی اطلاع بادشاہ کو کی تو ہنس کر فرمایا کہ شہیدی سچ کہتا ہے، اُس میں اس سے زیادہ اُٹھانے کی طاقت نہیں ہے۔

شریف تبریزی۔ لسانی شیرازی کے شاگرد تھے۔ انھوں نے اپنے اُستاد کے اکثر شوق

شعروں کا انتخاب کر کے ایک رسالہ تیار کیا تھا جس کا نام "سہو اللسان" رکھا تھا - اُستاد نے جب اس کا حال سُنا تو شاگرد کو ہزاروں صلواتیں سنائیں - مشہور ہے کہ شریف نے ایک قصیدہ خواجہ غیاث کبود چشم، شاہ طہماسپ صفوی کے وزیر اعظم کی تعریف میں کہا تھا - مگر کوئی صلہ نہیں پایا تھا - جل کر ایک ہجو لکھی جس کی اطلاع بادشاہ کو جو ہوئی تو اُنھوں نے اسکے پیش کرنے کا حکم دیا - شریف اسکو لیکر خود حاضر دربار ہوے اور بادشاہ سے عرض کیا کہ حضور ایک مرتبہ اس کو سماعت فرمالیں اسکے بعد جو سزا تجویز فرمائیں دیں - بادشاہ نے یہ عرض قبول کی اور جب ہجو سُنی تو بہت خوش ہوے اور فیصلہ کیا کہ شریف خواجہ غیاث سے معافی مانگیں اور خواجہ ان کو قیس تومان صلہ میں دیں - امیر علاؤ الدولہ قزوینی نے یہ ہجو جو بطور ترکیب بند کے ہے اپنی کتاب "نفائس الماثر" میں نقل کر دی ہے - میں نے بھی اسکا ایک بند تذکرۂ ید بیضا میں دیا ہے جس کا مطلع یہ ہے :-

کسے بچشم کبودِ تو کم نمود رواست چراکہ آئینہ را در حجاب زنگ راست

مُلا تقائی نے "مجمع الفضلاء" میں اور والۂ داغستانی نے "ریاض الشعراء" میں شریف کی یہ غزل نقل کی ہے :-

زدو دیدہ خوں فشاندم کہ نظر کنی نہ کردی بر ہِ تو خاک گشتم کہ گزر کنی نہ کردی
دم مرگ بیچدانی زچہ باز ماند چشمم ز تو بود چشم آنم کہ نظر کنی نہ کردی
چو نکرد یار رحمے زتو اے فغاں بہ حالم ز تو بود اُمید آنم کہ اثر کنی نہ کردی
ز نخست کردم اے دل بتو شرح غمزۂ او خبرت ز فتنہ دادم کہ حذر کنی نہ کردی
بوطن شریف روزے کہ ترا نماند قدرے بحزایں نماند چارہ کہ سفر کنی نہ کردی

شیخ سیف الدین محمد الوری نے جو ایک نہایت ثقہ فاضل شاعر تھے ایک مرتبہ حسب ذیل مطلع میر محمد حسین آسچا دکے نام سے میرے سامنے پڑھا اور بیان کیا کہ یہ مطلع خود میں نے انکی زبان سے سنا تھا :-

بر ہِ تو خاک گشتم کہ گزر کنی نہ کردی ز تو بود چشم آنم کہ نظر کنی نہ کردی

اس کو سُن کر مجھکو بے انتہا حیرت ہوئی کیونکہ یہ مطلع شریف کے مطلع اور حُسن مطلع کے دو آخری مصرعوں سے تیار کیا گیا تھا - سید موصوف سے ہرگز یہ احتمال نہیں ہے کہ اُنھوں نے کوئی سرقہ کیا ہوگا - گمان یہی ہے کہ توارد ہوا ہو - ایک دلچسپ توارد یہ بھی ہے کہ اُسی زمانہ کے ایک موزوں طبیعت شخص نے یہ بھی خوب کہا جو شریف کے تیسرے شعر سے اخذ کیا ہوا معلوم ہوتا ہے لیکن حق یہ ہے کہ اُس سے بڑھ گیا ہے :-

گلہ آہ از تو دارم کہ چہ کردۂ تو با من بفلک ترا رساندم کہ اثر کنی نہ کردی

سید شاہ جلال الدین المعروف بہ شاہ چندا حسینی رحمۃ اللہ علیہ[۵۱]

(حضرت "عبد اللہ")

آں سلطان ارباب مشاہدہ، آں سردار اہل مکاشفہ، آں گم گشتۂ وصال آں محبوب رب ذوالجلال، آں گنجینۂ شوق و اشتیاق، آں مست ذوق اہل عشق و اشتیاق، سلطان تارکان یعنی آں ناظر جمال حسینی سید جلال الدین المعروف بہ شاہ چندا حسینی اپنے زمانہ کے اکمل الکاملین جلیل القدر بزرگ اور نامدار اولیائے کرام سے ہیں۔ آپ علوم ظاہری و باطنی کے جامع اور صراط مستقیم کے عامل اور بحر ذخار طریقت کے شناور اور قوانین معرفت کے پیشوا تھے۔ آپ سے کرامات لاتعداد ظہور میں آئیں۔ آپ کا اصلی نام سید جلال الدین محمد و شاہ چندا و قمر الدین لقب ہے۔ آپکے والد ماجد کا نام نامی سید علی المشہور سید جوہان شیر حسینی الچشتی ہے۔ آپ ۷۹۴ھ میں بمقام موضع روتے واڑی تعلقہ اندولہ ضلع گلبرگہ بوقت صبح صادق عالم ارواح سے عالم اجسام میں تشریف فرما ہوئے۔

سلسلۂ نسب سید جلال الدین محمد بن سید علی بن سید خضر بن سید محمد بن سید احمد بن سید یحییٰ بن سید زید بن سید حسین بن سید سراج الدین بن سید شرف الدین بن سید زین الدین بن سید حسین بن سید عبداللہ بن سید محمد بن سید عزیز بن سید یحییٰ بن سید حسین بن سید حسن بن سید حسین اصغر بن سید علی اصغر بن سید زید مظلوم بن سیدنا امام زین العابدین بن سید الشہداء حضرت امام حسین بن امام المشارق والمغارب اسداللہ الغالب امیر المومنین سیدنا علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ

آباؤ اجداد کا وطن مالوف سے دکن میں تشریف لانا آپ کے جد امجد حضرت سید حسین رحمۃ اللہ علیہ جو ساتویں پشت میں آپ کے دادا ہوتے ہیں، علاقہ بغداد شہر سامرہ میں اقامت پذیر تھے۔ ۶۱۶ھ میں بعہد سلطنت ہلاکو خان بن چنگیز خان والی مملکت تاتار کے مظالم سے جو شہرۂ آفاق ہیں راہی ہند ہوئے۔ بعد طے منازل بعہد شہنشاہ ہند سلطان غیاث الدین بلبن داخل ہند ہوئے اور چندے شہر ملتان میں قیام پذیر رہے۔ سلطان بلبن کو حضرت سے عقیدت تھی آپ سے فیض باطنی حاصل کرتا رہا اور اخراجات لنگر کے لیے دو گاؤں جاگیر عطا کیے۔ ایک زمانہ کے بعد آپ ملتان سے دہلی تشریف لائے اور وہیں سکونت اختیار فرمائی بلکہ آپ کی اولاد کا بھی دہ چاند۔

---

[۵۱] یہ مضمون سید شاہ محمد حسینی سجادہ نشین درگاہ شریف کی تصنیف منیف موسوم بہ انوار جلالی سے ماخوذ ہے۔

پشت تک وہیں قیام رہا۔ ایک عرصۂ دراز کے بعد آپ کی اولاد میں حضرت سید خضر حسینی الچشتی رحمۃ اللہ علیہ بوجہ ناسازیٔ زمانہ وطن سے تنگ ہوکر مع دو صاحبزادگان حضرت سید علی جہاں شیر حسینی رحمۃ اللہ علیہ و حضرت سید احمد عجب شیر حسینی رحمۃ اللہ علیہ اور ایک ہو عصمت پناہ حضرتہ فردوس رضی اللہ عنہا کے عہد سلطان فیروز شاہ بہمنی والیِ حسن آباد گلبرگہ شریف وارد ملک دکن ہوئے اور بمقام فیروز آباد سکونت اختیار فرمائی۔ ان دنوں بادشاہ قلعہ کی تعمیر میں مصروف تھا۔ جب آپ کی تشریف آوری کی خبر بادشاہ کو ہوئی تو بادشاہ نے بڑی قدر و منزلت کی اور ہر دو برادر فوج کے اعلیٰ عہدوں پر مامور کیے گئے۔ کچھ عرصہ بعد حضرت سید خضر حسینی رحمۃ اللہ نے ضلع بیدر کی طرف کوچ فرمایا اور مدام وہیں کے ساکن ہوگئے۔ یہاں صرف حضرت سید علی جہاں شیر حسینیؒ مع محل مبارک حضرتہ عصمت پناہ بی بی فردوس جہاں اور ایک بھائی حضرت سید عجب شیر حسینیؒ رہے۔ تھوڑے عرصے میں آپ دونوں کا شمار خاص مقربان شاہی میں ہوا، حتیٰ کہ بادشاہ ان کے مشورہ کے بغیر کوئی کام نہ کرتا۔

انشائے رازِ ولایت

کہتے ہیں کہ ایک روز بادشاہ کو شکار کی خواہش ہوئی۔ حکم کی دیر تھی، سب تیاری آن واحد میں ہوگئی اور سواری مبارک مع ہمراہی خاصاں و میر شکاری و چندے سوار وغیرہ کے راہیٔ شکارگاہ ہوئی جس میں یہ ہر دو برادر بھی شریک تھے۔ بعد انفراغ شکار بادشاہ کی سواری بجانب آبادی مراجعت فرما ہوئی۔ اسوقت بادشاہ سلطان فیروز شاہ کی صاحبزادی بالاخانہ پر کھڑی سلطان کی تشریف آوری کا انتظار کر رہی تھی۔ جب آنے والوں کا جمگھٹا نظر پڑا تو کیا دیکھتی ہے کہ سلطان اپنے جملہ ساتھیوں سمیت واپس آرہا ہے اور تمام مجمع میں دو سوار ایسے نظر پڑے کہ جن کے گھوڑے ہوا پر معلق تھے۔ اس واقعہ کے مشاہدہ سے ایسی حیران ہوئی کہ جس کی کوئی انتہا نہیں۔ اور دل میں کہنے لگی کہ خدایا! نہ عالم یہ کیا ماجرا ہے جو میرے پیش نظر ہے۔ حالت حیرت میں نیچے اتری اور سلطان کی تشریف آوری کی منتظر رہی۔ جب سلطان محل خاص میں پہونچا تو لڑکی نے اپنا چشم دید واقعہ تفصیل سے بیان کیا اور استفسار کرنے لگی کہ وہ دو گھوڑے مع سوار جو معلق تھے کون ہیں؟ بادشاہ نے جواب دیا کہ میں نہیں جانتا کہ ایسے باکرامت حضرات میرے ارا کین میں کون ہیں۔ اس واقعہ پر بادشاہ کو نہایت تعجب ہوا۔ کہا کہ تاوقتیکہ ان کی تحقیقات نہ کی جائے صحیح طور پر معلوم نہیں ہو سکتا۔ بادشاہ کو بہت فکر لاحق ہوئی کہ یہ کون حضرات ہیں ان کی تحقیق ضروری ہے اور خفیہ طور پر تلاش جاری رکھی۔

کہتے ہیں کہ ایک رات آندھی اس شدت کی آئی کہ تمام اہالیان لشکر و ارا کین کے خیمے پراگندہ

بھ گئے اور کسی کے خیمہ میں چراغ نہ رہ سکا۔ بادشاہ کو فکر تھی کہ کوئی موقع ہاتھ آئے۔ چنانچہ اس موقع کو اس نے غنیمت جان کر تفتیش حال کے لیے جاسوس روانہ کیا تو معلوم ہوا کہ سوائے ایک خیمہ کے جس میں یہ دو حضرات سید علیؒ و سید احمدؒ سکونت پذیر تھے کسی خیمہ میں چراغ نہیں، اور نہ کوئی خیمہ اچھی حالت میں ہے۔ اور یہی خیمہ ہے جس پر آندھی کا کچھ بھی اثر نہیں۔ جب جاسوس خیمہ کے قریب پہونچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ دونوں حضرات تلاوت کلام اللہ میں مصروف و مشغول ہیں اور چراغ حسب معمول روشن ہے۔ بمصداق

اگر گیتی سراسر باد گیرد
چراغ مقبلاں ہرگز نمیرد

جاسوس نے فوراً واپس آکر بادشاہ کو اطلاع دی کہ اس آندھی کے سبب سب خیمے پراگندہ ہوگئے ہیں اور ایک خیمہ جس میں سید علیؒ و سید احمدؒ رہتے ہیں بدستور قائم ہے اور چراغ روشن اور دونوں بھائی تلاوت قرآن میں مصروف ہیں۔ اور خیمہ کا نمبر بھی نوٹ کرادیا۔ اس نتیجہ خیز واقعہ سے سلطان کو ایک گونہ تسلی ہوئی اور یہ خیال کیا کہ کل صبح اس کی تحقیقات کروں گا۔

جب سے یہ دونوں بھائی فیروزآباد (علاقہ حسن آباد۔ گلبرگہ) میں مقیم تھے اپنے کو پوشیدہ رکھ کر عبادت الٰہی میں مصروف رہا کرتے تھے، از راہ مکاشفہ ان دو حضرات نے بھی معلوم کرلیا کہ اب ہمارے کشف و کمال کی حقیقت بادشاہ پر ظاہر ہوئی، مناسب ہے کہ شباشب کسی طرف کوچ کریں۔ اُسی وقت ہر دو حضرات مع محل حضرت سید علیؒ چل کھڑے ہوے، اور رود بھیمراد پر پہونچے۔ چونکہ وقت رات کا تھا اور دریا بھی نہایت چڑھاؤ پر تھا۔ نہ وہاں کشتی نہ کشتیبان۔ دریا کا عبور کرنا نہایت مشکل و دشوار تھا۔ اس وقت سید علیؒ نے وضو کرکے دوگانہ ادا کیا اور بارگاہِ خداوندی میں دعا کرنے لگے کہ اے خداوند قدوس تو عالم الغیب اور حل کنندۂ مشکلات ہے اور ہم پر جو اس وقت مصیبت ہے اُس سے بخوبی آگاہ ہے، اپنی قدرت کاملہ کا صدقہ اور اپنے حبیب پاک صلعم کے طفیل میں اس سے سبکدوشی حاصل کرنے کے اسباب پیدا کردے۔ ان کی دعا بارگاہِ خداوندی میں مستجاب ہوئی اور غیب سے ندا آئی کہ فکر مت کر اور اپنا رومال دریا پر ڈال دے اور اُس پر سوار ہوجا اور قدرت کا تماشا دیکھ۔ اس بشارت سے آپ کو بہت خوشی حاصل ہوئی، رومال دریا پر ڈال کر ہر سہ حضرات، رومال کے [illegible] کونوں پر سوار ہوے۔ چوتھا کونا جو خالی تھا ہوا پر اُڑنے لگا، جس سے یہ کچھ خوف زدہ ہوکر درگاہِ رب العزت میں التجا کرنے لگے۔ پھر ندا آئی کہ رومال کے چوتھے کونے پر شاہ چند آہے۔ اُسی وقت وہ

کو پار کر گیا۔ خدا کے فضل و کرم سے دریا کے پار اتر کر کھڑے ہو گئے۔ چونکہ حضرت عصمت پناہ فردوس جہاں حاملہ تھیں اور زمانہ وضع حمل بھی بالکل قریب تھا بلکہ چند آثار بھی نمایاں ہو چلے تھے۔ مجبوراً موضع رمے واڑی میں جو بالکل دریائے گھاگھرا کے کنارے واقع ہے ٹھہرنا پڑا۔

ولادت

اُسی شب کی صبح صادق کے وقت حضرت مخدوم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے نورانی وجود سے دنیا کو منور فرمایا۔ کہتے ہیں کہ آپ عوام کی طرح بوقت پیدائش برہنہ نہیں تھے بلکہ تہبند بندھا ہوا تھا۔ اور سر پر تاج۔ بعد از فراغ غسل آپ کا اسم مبارک سید جلال الدین محمد رکھا گیا۔ آپ کی ولادت باسعادت سے والدین محترم کو ازحد خوشی ہوئی مگر ساتھ ہی یہ اندیشہ ہوا کہ سلطان فیروز اور اس کا لشکر دریا کے اُس پار قریب ہی ہے ہماری خبر سن پائے گا تو ضرور ہمارے درپے ہوگا، اب یہاں رہنا بھی خلاف مصلحت ہے لیکن کریں کیا کریں نہ پاس کوئی سواری ہے نہ اسباب سفر، ایک تو بچہ نومولود، دوسری ایک عورت وہ بھی زچہ، اس فکر و تردد میں بچے کو گہوارے میں لٹا کر خود محو فکر ہوئے۔ خداوند تعالیٰ کو یہ منظور نہ تھا کہ آپ کو کسی طرح کی فکر و زحمت ہو۔ بحکم خداوندی آپ کا گہوارہ مع آپ کے ہوا پر آسمان کی طرف اڑنے لگا یہاں تک کہ والدین کی نظروں سے غائب ہو گیا۔ اس وقت آپ کے والدین مضطرب الحال ہو کر گہوارے کی تلاش میں موضع رمے واڑی سے نکل کر جنگل کی طرف چل نکلے۔ اور مصروف بہ جستجو تلاش کرتے رہے لیکن عرصہ تک پتہ نہیں چلا

موضع گنوار، چندا پورہ

قصبہ گونڈہ کے جانب شمال گیارہ میل کے فاصلہ پر موضع گنوار واقع ہے۔ کہتے ہیں کہ حضرت کا گہوارہ ہوا پر اڑتا ہوا ایک جنگل میں جھاڑی سے لٹکا رہا۔ یہ وہی مقام ہے جہاں اب موضع گنوار واقع ہے۔ یہ حضرت کا تصرف ہے جو آپ کے وجود مبارک کی برکت سے کہ کچھ عرصہ وہاں قیام رہا تب جنگل سرسبز شاداب ہوا اور وہاں آبادی کی صورت ہوئی۔ اور اس موضع کا نام گہوارہ کی وجہ سے گنوار رکھا گیا۔ کچھ عجب نہیں کہ گہوارہ کثرت استعمال سے گنوار ہو گیا ہو۔ اس کے بعد گہوارہ کا دوسرا مقام ایک دوسرے جنگل میں ہوا جہاں اب موضع چنداپور واقع ہے۔ یہ آبادی بھی حضرت کے قدم مبارک سے ہوئی -------------- اور حضرت ہی کے نام نامی سے موضع کا نام چنداپور رکھا گیا جو قصبہ گونڈہ سے جانب مغرب پانچ میل کے فاصلہ پر آباد ہے۔ پھر وہاں سے گہوارہ اڑتا ہوا ایک نیم کے درخت سے آ کر لگا جہاں اب موضع گونڈہ میں درگاہ شریف واقع ہے یہاں پر نالا اور گنجان جھاڑی درندوں اور دیو وغیرہ کا مسکن تھا۔ کہا جاتا ہے کہ آپ کے ایک ہاتھ کی انگشت سے دودھ اور دوسرے ہاتھ کی انگشت سے شہد جاری رہا تھا اور آپ اسی سے سیر ہوتے۔

ایک زمانہ گزرنے کے بعد آپ کے والدین بعم بزرگوار تلاش کرتے ہوئے گوگی[1] پہونچے اور اپنے لخت جگر فرزند دلبند سے مل کر نہایت مسرور ہوئے اور بارگاہ ایزدی میں شکر بجا لاکر اطمینان سے رہنے لگے۔ یہ مشہور واقعہ ہے کہ جس وقت آپ کے والدین آپ سے ملے اُس وقت آپ کی شیر خوارگی کا زمانہ گزر چکا تھا۔ یہ بات زبان زد عام ہے کہ آپ نے اپنی والدہ ماجدہ کا دودھ نوش نہیں فرمایا اور آپ کی تعلیم و تربیت میں بھی کوئی دقت پیش نہ آئی، کیونکہ آپ کو علم غیب حاصل تھا جس کی وجہ آپ ولی بطنی مشہور ہیں۔

کہتے ہیں کہ گہوارہ مقام گوگی میں جس جھاڑے لٹکا تھا وہ جھاڑ حال میں گر گیا اور بلحاظ اعزاز اسکے اطراف گول وضع میں نہایت اونچا اور شاندار کٹہ بنا یا گیا ہے جو ابتک باقی ہے۔

کتخدائی — آپ کی شادی حضرت شیخ کاکو رحمۃ اللہ علیہ کی صاحبزادی پارسا مومنہ سے ہوئی (حضرت سلطان المشائخ شیخ محمود صوفی سرمست اسرار دنیا رحمۃ اللہ علیہ جن کی درگاہ مقام قصبہ سگر شریف میں قصبہ گوگی سے سات میل پر واقع ہے اُنکی نواسی جن کا نام نامی حضرت مخدومہ جہاں تھا) ہوئی تھی۔ اور آپ کے بطن سے اولاد بھی ہوئی جو قصبۂ گوگی اور ملک دکن کے دیگر مقامات میں پھیلی ہوئی ہے۔ جن میں ولایت کا سلسلہ پشتہا پشت تک برابر جاری رہا جس کا مختصر بیان آئے گا جو قابل ذکر ہے۔

بیعت و خلافت — آپ کو بیعت و خلافت حضرت خواجۂ خواجگان خواجہ سید عارف باللہ بن ضیاء الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ سے عطا ہوئی۔ جن کا واسطہ خواجگان چشت اہل بہشت رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے ہے۔ سید جلال الدین الملقب بہ چندا حسینیؒ مرید ہیں حضرت عارف باللہ[2] بن ضیاء الدین کے، وہ مرید ہیں حضرت سعد الدین سنجانیؒ کے، وہ مرید ہیں حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ کے، وہ مرید ہیں حضرت علاء الحقؒ پنڈوی کے، وہ مرید ہیں حضرت اخی سراج الدین عثمانؒ

---

[1] یہ مقام اب تحصیل شاہ پور علاقہ صرف مبارک ضلع گلبرگہ شریف میں ہے۔ شاہ پور وادگیری ریلوے اسٹیشن (جی، آئی، پی آر) سے سترہ اٹھارہ میل کے فاصلے پر ہے۔ وہاں سے گوگی   میل ہے۔ یہاں عادل شاہی خاندان کے ابتدائی تین بادشاہوں کی قبریں ہیں۔ جنھیں حضرت جلال الدین عرف چندا حسینی رحمۃ اللہ علیہ سے بہت عقیدت تھی۔

[2] شجرہ میں "بن" کا مقتضا ہے کہ عارف باللہ نام نہیں ہے، بلکہ اسمائے صفات ہیں اور نام ضیاء الدین ہے واللہ اعلم بالصواب۔ شجرہ میں جس طرح مرقوم ہے اُسی طرح متن میں لکھا گیا ہے۔

اودھی کے، وہ مرید ہیں حضرت سلطان الاولیاء شیخ نظام الدین محمد بدایونی کے قدس سرہٗ
یہاں سے سلسلہ مشہور معروف تا الی سیدنا حضرت خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ ومنہ الی حضرت ا
امیرالمومنین سیدنا علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہ ومنہ الی امام الانبیاء سرور اتقیا سردا
خلق کون ومکان خاتم النبیین حضرت ابی القاسم احمد مجتبیٰ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم ۔

اخلاق وعادات آپ کے اخلاق وعادات بالکل اخلاق وعادات نبوی صلی اللہ علیہ و
تھے ۔ آپ ہمیشہ اُسی درخت کے نیچے قیام فرمایا کرتے جس پر آپ کا گھو
عالم استغراق میں آپ کا وقت زیادہ گزرتا ۔ آپ کی مجالس میں جلیل القدر صوفی مشرب ۔
بھی شریک رہتے ۔ آپ ہر ایک سے نہایت خندہ پیشانی سے شفقت آمیز گفتگو فرماتے
سے پیش آتے ۔ جس کی جس قدر استعداد ہوتی اُس سے اُسی قدر تکلم و ارشاد فرماتے ۔
میں شاہ و گدا بالکل ایک نظر سے دیکھے جاتے تھے ۔ آپ نے اشاعت اسلام میں خو
پابندی شریعت گویا آپ کے عادات میں داخل تھی ۔ کوئی فعل آپ کا احکام شرعیہ
نہ تھا ۔ آپ زہد و تقویٰ دریا معرفت کے مشتاق اور دریائے معرفت کے تشنا رہتے ۔ آپ
عام تھا ۔ اور کبھی کبھی بحر جلال بھی موجزن ہوتا ۔ آپ کی ذات بابرکات ستودہ صفات
نہیں بلکہ لاکھوں نے فیض حاصل کیا ۔ آپ کو ہمیشہ اپنے ہمعصر بزرگوں کی ملاقات کا
سب سے ملاقات کا شرف حاصل فرمایا ۔ یہی وجہ تھی جو آپ نیک رکن کا کامل ر
سکے آپ میں ایک خاص وصف یہ تھا کہ جو بات آپ کی زبان فیض ترجمان سے نکا
عملی صورت میں نمایاں ہوتی ۔

کشف وکرامات نقل ہے کہ آپ کی عمر تین سال کی تھی، ایک روز شام کے وقت اُ
ا ۔ ہانکتی ہوئی آپ کی فرودگاہ سے گزر رہی تھی اتفاقاً گائے آپ کے قریب
آپ اُس کے تھن سے دودھ نوش فرمانے لگے ۔ عورت اس فعل سے ناخوش ہو کر بچھڑ گا
نکالنے گئی اور دودھ نکالنے لگی ۔ کیا دیکھتی ہے کہ گائے کے تھن سے بجائے دودھ
ہے ۔ فوراً اپنے فعل سے نادم ہو کر پھر گائے کو حضرت کے پاس لائی اور نہایت عجز سے حضر
لوٹنے اور گڑگڑانے لگی ۔ حضرت نے مکرر دودھ اُس گائے کے تھن سے نوش فرمایا ۔ ح
پھر جا کر دودھ نکالنے لگی تو بکثرت دودھ جاری ہوا ۔ جس سے نہایت معتقد ہو کر روزانہ گا
خدمت میں لاتی ۔ لیکن آپ جب طبیعت چاہتی تو نوش فرماتے ورنہ خاموش رہتے ۔

روایت ہے کہ جس روز آپ پیدا ہوئے اُس روز بمقام گلبرگہ شریف حضرت شہنشاہ دکن حضرت سید محمد حسینی مشہور خواجہ بندہ نواز رحمۃ اللہ علیہ صبح کی نماز کے بعد بہت دیر تک آسمان کی طرف نظر نفیس اٹھ فرماتے رہے۔ حاضرین مجلس میں سے ایک نے حضرت بندہ نواز رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا کہ حضور خلاف عادت بہت دیر تک آسمان کی طرف دیکھنے کی وجہ کیا تھی؟ آپ نے اپنی زبان فیض ترجمان سے یوں ارشاد فرمایا کہ آج امیر المومنین حضرت امام حسین علیہ السلام کی اولاد سے ایک صاحب کمال پیدا ہوا ہے جس کا نام شاہ چندا ہے اور وہ روئے زمین پر چاند کی طرح روشن ہوگا جس کی پیدائش کی خوشی آسمان پر منائی جا رہی ہے' اس لیے میں دیکھ رہا تھا۔

دیگر روایت ہے کہ جس وقت حضرت کی ملاقات حضرت خواجہ دکن خواجہ بندہ نواز رحمۃ اللہ علیہ سے بمقام گلبرگہ شریف ہوئی حضرت کا سن شریف صرف گیارہ سال کا تھا، اور حضرت بندہ نواز کا سن مبارک تقریباً سو سال کا تھا' باایں حضرت خواجہ نے چند قدم آپ کا استقبال فرمایا اور بہت تعظیم و توقیر فرمائی اور شاندار ضیافت کی اور آپ کو شاہ چندا کا خطاب بخشا۔ آپ غایت درجہ حسین و جمیل تھے اور آپ کا چہرہ مثل چودھویں رات کے چاند کے منور تھا۔ اس طرز عمل سے لوگوں نے پوچھا کہ ایک صغیر سن لڑکے کی جو آپ نے اس قدر تعظیم کی اور بغلگیر ہوئے اس کی وجہ کیا ہے؟ حضرت خواجہ بندہ نواز رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا، یہ لڑکا صحیح النسب ہے اور اس کے جسم سے جناب سرور دوعالم محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی بو آتی ہے' اس لیے اس کی تعظیم لازمی ہوئی۔

وصال — آپ نے بعمر ۸۶ سال بمقام گوگی شریف بتاریخ دہم اور بعض روایات سے بتاریخ پنجم ماہ شعبان المعظم ۸۵۸ھ ہجری نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اس دار ناپائدار سے دارالبقا کی طرف کوچ فرمایا۔ آپ کا مدفن زیارت گاہ خاص و عام ہے۔ سالانہ بتاریخ دہم شعبان بہت بڑا میلہ ہوتا ہے۔

تاریخ فرشتہ کے مولف نے آپ کو شیعہ لکھا ہے۔ جو بالکل غلط ہے اور مصنف تاریخ مذکور کا اتہام۔ عیاذاً باللہ۔ یہ صحیح ہے کہ سلاطین عادل شاہی کو آپ سے بہت عقیدت تھی۔ جن میں سے بعض اثنا عشری ہوئے ہیں اور بعض اہل سنت والجماعۃ۔

سلاطین عادل شاہی بیجاپور نے بصرف زر کثیر ازراہ عقیدت آپ کے مرقد پر ایک نہایت خوشنما چوکھنڈا تعمیر کردیا ہے۔ اور ایک مسجد اور احاطہ کی دیواریں اور دیگر عمارات بھی بنوائی ہیں اور خود بھی بعد وصال اندرون احاطۂ درگاہ شریف میں مدفون ہیں۔ برائے اخراجات عرس وعود وگل ولنگر و جاگیرات وغیرہ

بھی عطا کی تھیں۔ سلطنت عادل شاہی کے ساتھ ہی ساتھ اس کا بھی خاتمہ ہوا۔ اب صرف تحت درگاہ علیحدہ علیحدہ معاش از قسم نقدی و اراضی یہ اسے اخراجات عود و گل جاروب کشی وغیرہ سرکارِ عالی کی طرف سے مقرر و بحال جاری ہے۔

قطعہ تاریخ وصال حضرت سید چندا حسینی قدس سرہٗ از حضرت شیخ محمود بحری رحمۃ اللہ علیہ

اگر جوئی تو فردوس بریں را | بگوئی می روم گویم ہمین است
نہ گوئی قبلۂ روحانیان است | بگوئی رشک فردوس برین است
چہ روضہ روضۂ جنت بہ شانش | مثال آئنہ حیرت گزین است
گر آید جوہر اول بعونش | بدین نعمہ البتہ مدحت گزین است
نشانے از وصالش گر تو جوئی | رخ چندا زو بہر خوشتر ین است

مادۂ تاریخ (رخ چندا) کے اعداد بحساب ابجد ۸۵۹ھ ہوتے ہیں۔

محبت کی اسے ہم آخری منزل سمجھتے ہیں

(جناب حکیم افتخار علی صاحب جگر صدیقی وارثی)

تمھاری آنکھ کیا ہے تم ہو کیا بسمل سمجھتے ہیں
اُسے قاتل سمجھتے ہیں تمھیں قاتل سمجھتے ہیں

تمھارا روٹھ کر اُٹھنا ہمارا در سے اُٹھنا
نہ تم مشکل سمجھتے ہو نہ ہم مشکل سمجھتے ہیں

چھری صیاد کی چلتی نہیں کیوں اپنی گردن پر
رہا ہونا قفس سے ہم تو اب مشکل سمجھتے ہیں

خدایا دفن ہوں ہم اُس بت کافر کے کوچے میں
محبت کی اسے ہم آخری منزل سمجھتے ہیں

لہو کے چند قطروں کے سوا اب کیا ہے سینے میں
تم اُنکو دل سمجھتے ہو تو ہم بھی دل سمجھتے ہیں

ہمیں وہ بارگاہِ حسن میں کیوں باریابی دیں
نہ اس قابل سمجھتے تھے نہ اس قابل سمجھتے ہیں

جو اُس نے رکھدیا ہے پاؤں آکر میرے مدفن پر
تو اُسکے نقش پا کو سب مہ کامل سمجھتے ہیں

کوئی بھی داستاں کہتا ہوں سُن کر اُٹھ جاتے ہیں
وہ ہر قصے کو میری سرگزشت دل سمجھتے ہیں

زباں سے کچھ نہیں کہتے تمھارے چاہنے والے
مسیحا جانتے ہیں تم کو یا قاتل سمجھتے ہیں

یہ کیسی ہے نظر اُن کی یہ کیسی ہے سمجھ اُن کی
نہیں معلوم کس کے دل کو کس کا دل سمجھتے ہیں

جگر جن کو پڑا ہے سابقہ اُن کی محبت سے
وہ مرنا سہل اور جینا بہت مشکل سمجھتے ہیں

یتیم

(جناب ڈاکٹر اعظم صاحب کریوی)

"ہاتھ جوڑتا ہوں مولوی صاحب! اب نہ ماریے - میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں نے کسی سے یتیم خانہ کی شکایت نہیں کی۔" محمود کے اس جواب سے مولوی ذاکر علی کا اطمینان نہیں ہوا۔ اُنھوں نے محمود کو ٹھوکر مارکر کہا "جھوٹا کہیں کا کیسی باتیں بناتا ہے - دیکھ تو ابھی میں تیری کیا گت بناتا ہوں - جس پیالہ میں کھاتا ہے اُسی میں چھید کرتا ہے - حرام خور! صفدر! ادھر تو آؤ - تم کبھی تو نواب صاحب کے یہاں دعوت کھانے گئے تھے تم کو سب حال معلوم ہوگا۔"

صفدر مولوی صاحب کا بڑا لڑکا تھا - چغلخوری میں وہ اپنا جواب نہ رکھتا تھا - جھٹ سے کہنے لگا "ہاں ابّا! میرے سامنے محمود نے نواب صاحب سے یتیم خانہ کی شکایت کی - سب لڑکوں نے تو کہدیا کہ وہ بڑے آرام سے رہتے ہیں - لیکن محمود نے کہا کہ پیٹ بھر کھانے کو نہیں ملتا" صفدر کی بات پوری بھی نہ ہونے پائی تھی کہ مولوی صاحب پھر محمود پر پل پڑے - "کیوں بے حرام خور! تجھے پیٹ بھر کھانے کو نہیں ملتا - بتا پھر شکایت کرے گا بتا پھر شکایت کریگا؟" مولوی صاحب یہ کہتے جاتے تھے اور محمود کو پیٹتے جاتے تھے -

مظلوم یتیم محمود کی عمر تقریباً گیارہ برس کی ہوگی یتیم خانہ میں داخل ہوئے اسے دو مہینے گزرے تھے - ماں باپ کا پیار کیا ہوتا ہے اس سے وہ ناواقف تھا - آٹھ برس کی عمر میں وہ یتیم ہوا۔ عرصے تک وہ اِدھر اُدھر مارا مارا پھرتا رہا - اور پھر قسمت نے اسے مولوی صاحب کے یتیم خانہ میں بھیج دیا - جب مولوی صاحب کی مار وہ برداشت نہ کرسکا تو اُنکے قدموں پر گر کر منتیں کرنے لگا "مولوی صاحب میں سچ کہتا ہوں کہ میں نے یتیم خانہ کی نواب صاحب سے شکایت نہیں کی"

مولوی صاحب پھر گرجے "ابے تو شکایت ہی کر کے میرا کیا بگاڑ لیگا - تجھ ایسے چھوکروں سے ڈرنے لگوں تو یتیم خانہ کا کام کرنا دشوار ہوجائے اچھا اب تو اپنی خیریت چاہتا ہے تو اسی وقت میرے یتیم خانہ سے نکل جا" رات کے دس بجے ہوں گے - محمود نے کہا "رات کے وقت کہاں جاؤں، میں تو کسی کو جانتا بھی نہیں"۔

"مجھے اس کی کچھ پرواہ نہیں - جو تیرا حامی ہو اُسکے یہاں جا - اب میرے یہاں تیرا کوئی کام نہیں - تجھ ایسے لڑکوں کا یتیم خانہ میں رہنا بہت نقصان دہ ثابت ہوگا - احسان فراموش وہ دن

بھول گیا جب گلیوں میں مارا مارا پھرتا تھا۔ تجھے اپنی ماں کا نام معلوم نہ باپ کا۔ میں اب تک تیری خبر نہ لیتا تو بھوکوں مر جاتا۔ تو اس لائق ہی نہیں ہے کہ تیرے ساتھ کوئی احسان کیا جائے"۔ محمود نے آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا "رات بھر اور مجھے یتیم خانہ میں رہنے دیجیے۔ صبح ہوتے ہی میں یہاں سے چلا جاؤں گا"۔ ٹھیک اسی وقت کسی نے مولوی صاحب "مولوی صاحب" کہکر پکارا۔ مولوی صاحب سنبھل کر بیٹھ گئے اور صفدر سے کہا "دیکھ تو مجھے کون بلا رہا ہے" صفدر باہر چلا گیا اور وہاں سے ایک لفافہ ہاتھ میں لیے ہوئے واپس ہوا۔ مولوی صاحب نے لفافہ کھول کر پڑھا۔ نواب شمشیر جنگ نے لکھا تھا کہ وہ پرسوں یتیم خانہ کا معائنہ کرنے آئینگے۔ مولوی صاحب کی باچھیں کھل گئیں۔ اسی جوش مسرت میں انھوں نے محمود سے کہا "اچھا میں آج رات بھر کے لیے تجھ کو یتیم خانہ میں رہنے کی اجازت دیتا ہوں۔ صبح ہوتے ہی یہاں سے منہ کالا کیجیو۔ اگر کل صبح تجھ کو میں نے پھر دہاں دیکھا تو خیر نہیں ہوگی اور ہاں خبردار میرے یتیم خانہ کی پھر کسی سے شکایت نہ کرنا"۔ یہ کہکر مولوی صاحب اپنے زنانخانہ میں جو یتیم خانہ ہی کا ایک حصہ تھا چلے گئے۔

(۲)

مولوی ذاکر علی کچھ عجیب ہی قماش کے بزرگ تھے۔ ان کا لے کا عمامہ، اُلجھی ہوئی زلف، لمبی داڑھی، سیاہ داغدار پیشانی، شیروانی نما کرتا اور شرعی پاجامہ دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ وہ کوئی بڑے پہنچے ہوئے درویش ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مولوی صاحب کا ظاہر جتنا مقدس تھا اُتنا ہی زیادہ اُن کا باطن مکروہ تھا۔ ان کی درویشانہ ہیئت اور نمود و نمایش کا اس کے سوا اور کوئی مقصد نہ تھا کہ لوگوں کے دل پر ان کے زہد و تقوٰی کا اثر ہو۔ ان کی تمام بناوٹی باتیں صرف حب جاہ و دولت کے لیے تھیں۔ ان کا مذہب اکسیر خود پرستی، ان کا دین در کان سراسر کبر و غرور تھا۔ پڑھے لکھے برائے نام تھے کلام پاک کی دو چار آیتیں حفظ کر لی تھیں کتب احادیث کی کبھی شکل بھی نہ دیکھی تھی لیکن ایسی ڈون کی لیتے تھے گویا وہ بڑے متبحر عالم اور مستند فقیہ ہیں۔ وہ آواز میں ایک خاص قسم کا مصنوعی لوچ اور لحن پیدا کرکے گفتگو کرتے تاکہ لوگ ان کو قاری سمجھیں۔ چالیس سال کی عمر میں پانچ لڑکوں کے باپ ہو چکے تھے ان لڑکوں کو اگر برابر برابر کھڑا کر دیا جاتا تو اچھا خاصا زینہ بن جاتا۔ شہر بھاول پور میں انکا ذاتی مکان تھا اسی میں مولوی صاحب نے برائے نام یتیم خانہ کھول رکھا تھا۔ اس میں کُل بارہ لڑکے تھے جن میں پانچ لڑکے مولوی صاحب ہی کے تھے۔ باقی ماندہ ان کے رشتہ داروں کے لڑکے تھے یا لاوارث بچے۔ مولوی صاحب لاوارث یتیم بچوں سے اپنے گھر کا ذلیل سے ذلیل کام لینے میں نہ شرماتے۔ اگر کبھی کسی رئیس کو نوکر کی ضرورت ہوتی تو مولوی صاحب کسی یتیم بچہ کو نذر کرکے یتیم خانہ کے نام سے کافی عطیہ وصول

کر لیتے۔ مولوی صاحب کو اپنے حلوے مانڈے کے آگے ان یتیموں کا اتنا بھی خیال نہ تھا جتنا کسی کو اپنے کتوں کا ہوتا ہے۔ ان یتیموں کو جن کے طفیل میں مولوی صاحب کے گھر بھر کا خرچ چلتا تھا، سوا ان موقعوں کے جب کوئی مسلمان انہیں فقیروں کے لیے کھانا کھلاتا اور ان یتیموں کو بھی مدعو کرتا، کبھی پیٹ بھر کھانا نہیں ملتا تھا۔ دعوتوں یا عید بقرعید کے موقعوں پر مولوی صاحب ان بچوں کو ایک باقاعدہ فوج بنا کر دو دو کی قطار میں گائے بیل کی طرح ہانکتے ہوئے شہر کے کوچہ و بازار میں مارچ کراتے پھرتے۔ بچوں کے گلے میں فقیروں کی طرح جھولیاں بندھی ہوتیں اور وہ صدا لگاتے جاتے۔ "فقیر قوم کے آنے ہیں جھولیاں بھر دو" بچوں کی جسمانی صفائی کی طرف مولوی صاحب قطعاً کوئی توجہ نہ کرتے۔ تعلیم و تربیت کا بھی مولوی صاحب کو کچھ خیال نہ تھا۔ اگر بچوں کو کچھ تعلیم دی بھی جاتی تو ایسی جو انسان کو آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے ڈھکیل دیتی ہے۔ ہاں بھیک مانگنے کی تعلیم مولوی صاحب بچوں کو خاص طور سے دیتے تھے۔ کسی رئیس کو دیکھ کر کس طرح سلام کرنا چاہیے۔ چندہ مانگنے اور نظمیں سنانے کے وقت چہرہ کو کس طرح موثر بنانا چاہیے۔ سال میں دو چار مہینے کے لیے مولوی صاحب بہاول پور، دکن، بنگال یا مالاکات سلسلہ میں یتیموں کو اپنے ساتھ لیجاتے۔ انکا دورہ زیادہ تر دیہاتوں میں ہوتا۔ جاہل مسلمانوں کو جھوٹی روایتیں سناتے" علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل" کا وعظ کہتے۔ اور یتیموں سے نظمیں پڑھوا کر چندہ کے نام سے مسلمانوں کو خوب لوٹتے۔ جب کافی آمدنی ہو جاتی تو بہاولپور آ کر خوب چین کرتے۔ جو عمامے نذرانہ میں وصول ہوتے اُن سے "مولوائن" کے کُرتے اور دوپٹے بنائے جاتے۔ یہ تھی مولوی صاحب کی سیرت اور یتیم خانہ یا جیل خانہ کی کیفیت جس میں محمود کو انقلاب زمانہ نے ماں اور باپ کے آغوش شفقت سے محروم کر کے ڈال دیا تھا۔ اور جہاں سے اسے تھوڑے ہی دنوں کے بعد مولوی صاحب نے اپنی راہ کا کانٹا سمجھ کر بھوکوں مرنے کے لیے نکال باہر کیا۔

(۳)

"اجی میرا سونے کا کنگن کب تیار ہو جائیگا؟"

"یتیم خانہ میں جو روپئے آئے تھے وہ تم خرچ کر چکی ہو۔ اب میرے پاس کیا دھرا ہے جو کنگن بنوا دوں۔ ذرا اور ٹھہر جاؤ۔ میں دورہ پر جانے والا ہوں۔ پھر تمھاری فرمائش پوری کر دوں گا"

"تم تو ہمیشہ یوں ہی کہتے رہتے ہو۔ جو روپئے تم گجرات سے لائے تھے اُن کا پتہ ہی نہ چلا۔ اب میں تمھاری باتوں میں نہ آؤں گی، تم کو میرے کنگن بنوانے ہی پڑیں گے"

"تم تو ایسی باتیں کرتی ہو گویا میں روپئے کہیں اور پھینک آتا ہوں"

"نہیں تو کیا۔ میں نے تو یہاں تک سنا ہے کہ اب تم چھپ چھپ کر بازار کی بھی سیر کرنے لگے ہو۔ ماما کہتی تھی کہ اُس نے اپنی آنکھوں سے کسی رنڈی

کے کوٹھے سے رات کو اُترتے دیکھا ہے۔ میں صاف صاف کہے دیتی ہوں کہ اگر تم نے زیادہ پاؤں پھیلائے تو اس گھر میں آگ لگا دوں گی۔ مجھے ابھی اپنے پانچوں لڑکوں کا بیاہ کرنا ہے۔"

"لاحول ولا قوۃ کیسی بیوقوفی کی باتیں کرتی ہو۔ میں اور بازار کی سیر کسی بُری نیت سے کروں۔ استغفر واللہ توبہ کرو! رہ گیا طوائفوں کے یہاں جانا۔ میں اس سے انکار نہیں کرتا۔ میں اُن سے یتیم خانہ کا چندہ وصول کرنے جاتا ہوں۔"

"تو کیا چندہ وصول کرنے کے لیے دن کا وقت نہیں ہے؟"

"دن میں وہاں جاتے ہوئے شرم آتی ہے لوگ دیکھیں گے تو کیا کہیں گے۔ رات کے وقت طوائفوں کے پاس جانے میں ایک خاص مصلحت یہ بھی ہے کہ اُس وقت اُن کے پاس روپیوں کی کمی نہیں ہوتی۔ بڑی آسانی سے چندہ وصول ہو جاتا ہے۔"

"بڑے آئے کہیں کے باتیں بنانے والے! میں اب صبر نہیں کر سکتی۔ اگر تم نے میرے کنگن جلدی نہ بنوائے تو پھر سمجھ لینا کہ خیر نہیں"۔

"کہتا تو ہوں۔ گھبراتی کیوں ہو؟ آخر تم جو سونے سے لدی ہوئی ہو، یہ میری ہی کمائی تو ہے"۔

"آگ لگے اس کمائی میں! جب دیکھو اس کا طعنہ دیتے ہیں"۔

اتنا کہکر مولویائن کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ مولوی صاحب کی پہلی بیوی مر چکی تھیں۔ اُنکی یادگار تین لڑکے تھے۔ مولویائن کے متعلق لوگوں میں مشہور تھا کہ مولوی صاحب حیدر آباد سے بھگا لائے ہیں۔ اس دوسری بیوی سے دو لڑکے ہوئے۔ مولوی صاحب اپنی مولویائن سے بہت ڈرتے تھے۔ کبھی کوئی کام اس کی خلاف مرضی نہ کرتے تھے۔ مولویائن کو اشک آلودہ دیکھ کر خوشامدیں کرنے لگے "تم تو بڑی جلدی خفا ہو جاتی ہو۔ گھبراؤ نہیں، اگر ہفتہ کے اندر تمہارے کنگن نہ بنوا دوں تو میرا نام ذاکر علی نہیں۔ کل صبح کو نواب بشیر الدولہ ہمارے یتیم خانہ کا معائنہ کرنے آئیں گے۔ کچھ نہ کچھ ضرور دے مریں گے۔ تم گھبراتی کیوں ہو۔ میں تو اب یتیم بچیوں کے لیے بھی ایک یتیم خانہ کھولنے والا ہوں۔ تمھیں اُس کی منتظمہ بناؤں گا۔ اس طرح سے ہماری دُگنی آمدنی ہو جائیگی"۔

"میں اُس کی منتظمہ بن کر اپنی عاقبت خراب نہیں کروں گی۔ مجھ سے یتیم خانہ کا کام نہ ہو سکے گا"۔

"دُنیا لوٹ رہی ہے۔ ہم تو کچھ نہ کچھ کام بھی کرتے ہیں۔ عاقبت کے پیچھے کون مرے۔ بقول شخصے کہ ؎

اب تو آرام سے گزرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے

یتیم خانہ کا کام تو میں خود کر دوں گا۔ تم برائے نام منتظمہ رہو گی۔ میرے پاس اگر اس وقت کافی

روپے ہوتے تو یتیم خانہ کے لیے فوراً اشتہار دے دیتا۔"

"لڑکیاں کہاں سے لاؤ گے؟"

"یہ کون بڑی بات ہے۔ مسلمانوں میں آجکل یتیم لڑکیوں کی کمی نہیں ہے۔ سیکڑوں ماری ماری پھرتی ہیں۔ کوئی پرسان حال نہیں۔ کوئی ان کا ٹھیکہ نہیں لیتا۔ محلہ کی دو چار لڑکیوں کا نام رجسٹر میں لکھ لوں گا۔ بس اتنا ہی کافی ہے۔ باہر والے کوئی تحقیقات کرنے تھوڑی آتے ہیں۔"

"تم جانو تمھارا کام۔ میں اس کی منتظمہ نہیں بنوں گی۔ ہاں اگر تم نے میرے کنگن جلدی بنوا دیے تو پھر مجھے کوئی عذر نہ ہوگا۔"

(۴)

آج نواب مشیر الدولہ یتیم خانہ کا معائنہ کرنے آئیں گے۔ مولوی ذاکر علی ادھر اُدھر دوڑ رہے تھے۔ کاغذی بیلوں اور جھنڈیوں سے یتیم خانہ سجایا گیا تھا۔ فرضی یا اصلی یتیموں کو نئے نئے کپڑے جو خاص ایسے موقعوں کے لیے تیار رہتے تھے پہنا دیے گئے تھے۔ شعراء سے یتیموں کے متعلق نظمیں تیار کرائی گئی تھیں۔ ان میں سے ایک نظم "یتیموں کی فریاد" بچے رٹ رہے تھے۔ مولوی صاحب بتاتے جاتے تھے کہ پڑھتے وقت آسمان کی جانب نظر رکھنا، مسکین صورت بنا لینا، اور اگر کوئی لڑکا آنکھوں میں آنسو بھر لانے میں کامیاب ہو گیا تو میں اسکو خاص طور سے انعام دوں گا۔ خدا خدا کر کے نیچے دن کے نواب صاحب کی موٹر یتیم خانہ کے دروازہ پہ آ کر کھڑی ہو گئی۔ مولوی صاحب تو چشم براہ تھے ہی، فوراً پیشوائی کے لیے آگے بڑھے اور نواب صاحب کو مصافحہ کرتے ہوئے ادب سے سلام کیا۔ سب لڑکے ایک قطار میں سر بقد کھڑے ہو گئے۔ مولوی صاحب نے فوجی کمانڈر کی طرح اپنا ہاتھ بلند کیا۔ اور یتیم بچوں نے کچھ اس درد سے "یتیموں کی فریاد والی" نظم سنائی کہ نواب صاحب کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے مولوی صاحب کن انکھیوں سے نواب صاحب کی طرف دیکھتے جاتے تھے۔ اُن کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر مولوی صاحب نے دل میں کہا "وہ مارا! اب تو نواب صاحب یتیم خانہ کو خوب چندہ دینگے۔"

نظم ختم ہونے کے بعد نواب صاحب نے اپنے نوکر کو اشارہ کیا۔ اور اُس نے مٹھائیوں کا ایک خوان لا کر بچوں کے سامنے رکھ دیا۔ مولوی صاحب نے سوچا یہ تو بُرا ہوا۔ لڑکے سب مٹھائی کھا لیں گے۔ جھٹ بول اُٹھے "حضور اس کی ابھی جلدی کیا ہے۔ زیادہ مٹھائی کھانے سے ان کی عادت خراب ہو جائے گی۔ تھوڑی تھوڑی کر کے کھاتے رہیں گے۔"

"جی ایک دن میں ان کی عادت خراب نہیں ہو سکتی۔ لڑکو تم شوق سے مٹھائی کھاؤ۔"

لڑکوں نے ڈرتے ڈرتے مولوی صاحب کی طرف دیکھا۔ مولوی صاحب نے کچھ زبان سے تو نہ کہا لیکن اُن کی آنکھیں کہہ رہی تھیں، "دیکھو سب نہ کھا جانا، میرا بھی حصہ رکھنا۔ جب تک لڑکوں

نے سب مٹھائی کھالی' نواب صاحب وہاں سے نہ ہٹے۔ انھوں نے مولوی صاحب سے پوچھا "جو لڑکے میرے یہاں کھانا کھانے گئے تھے اُن میں سے ایک لڑکے کو آج میں یہاں نہیں دیکھتا۔"

"جی ہاں ایک لڑکا جس کا نام محمود ہے کل یتیم خانہ سے بھاگ گیا ہے۔"

"کیوں؟"

"جی وہ یتیم خانہ میں کیا آتا، بڑا اچکا اور بدمعاش تھا۔ اچھا ہوا۔ خس کم جہان پاک۔"

"بظاہر تو وہ لڑکا بڑا شریف و زیرک معلوم ہوتا تھا۔ آپکے یتیم خانہ میں کیا یہی بس گیارہ لڑکے ہیں؟"

"لڑکے تو بہت آنے کے لیے تیار رہیں مگر جگہ نہیں ہے۔ انھیں لڑکوں کا بڑی مشکل سے خرچ چلتا ہے۔ حضور میں تو یتیم خانہ کے پیچھے تباہ ہو گیا اب آپ جیسے اصحاب کی مدد کی سخت ضرورت ہے۔"

نواب صاحب نے ہمدردانہ لہجہ میں کہا "واقعی آپ نہایت ایثار سے کام لے رہے ہیں۔ خدا آپ کو جزائے خیر دے۔ فی الحال میں اس یتیم خانہ کو سو روپیہ سالانہ دوں گا۔ بعد میں کچھ اور نذر کروں گا۔"

"جزاک اللہ خدا حضور کو سلامت رکھے۔"

مولوی صاحب کا خوشی کے مارے بُرا حال تھا۔ نواب صاحب کے جانے کے بعد مولوی صاحب نے یہ مژدۂ جانفزا "مولویائن" کو سنایا۔

---

(۵)

یتیم خانہ سے نکل کر محمود کئی دن تک ادھر اُدھر مارا مارا پھرتا رہا۔ اُس کو ٹھیکیدار سعداللہ خاں کے یہاں مزدوروں میں جگہ مل گئی۔ سعداللہ خاں کا مکان آگرہ میں تھا۔ بھاول پور میں انکو محکمہ تعمیرات کی جانب سے ٹھیکہ ملا ہوا تھا۔ ایک دن محمود ان کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ اور اُس نے کچھ اس درد سے اپنا حال زار سنایا کہ سعداللہ خاں کا دل بھر آیا۔ انھوں نے محمود کو کسی معمولی کام پر لگا دیا۔ دن بھر محمود کام کرتا۔ اور شام کو سعداللہ خاں کے ہی مکان پر پڑ رہتا۔ محمود نے اس جانفشانی اور محنت سے اپنا کام سرانجام دیا کہ سب اس سے خوش ہو گئے۔ بھاول پور میں جب کام ختم ہو گیا اور سعداللہ خاں آگرہ واپس ہوئے تو وہ محمود کو بھی اپنے ہمراہ لیتے گئے اور وہاں پھر اپنے کسی ٹھیکے کے کام پر لگا دیا۔ محمود اب بیس روپئے ماہوار کما رہا تھا۔ خوراک اور مکان کا کرایہ اُسے نہیں دینا پڑتا تھا۔ کیونکہ سعداللہ خاں نے اُس کو اپنے مکان میں ایک کمرہ دیدیا تھا اور محمود کو اُن کے یہاں سے کھانا ملنے لگا تھا۔ محمود جو کچھ کماتا وہ سب ٹھیکیدار صاحب کے پاس جمع کر دیتا۔ کپڑے بنوانے کی ضرورت ہوتی تو دو چار روپئے لے لیتا۔ تین چار سال کے اندر ہی اس کے پاس ہزار بارہ سو روپئے جمع ہو گئے۔ ٹھیکیدار صاحب نے اپنی مہربانی سے وہ سب روپئے اپنے ایک ٹھیکہ میں لگا دیے

جس کا بہت منافع ہوا۔ لیکن محمود نے اُس میں سے
ایک پیسہ نہ لیا، بلکہ وہ سب پھر ٹھیکے میں لگا دیے
محمود نے سعد اللہ خاں کے یہاں رہ کر اردو اور
انگریزی کی بھی تعلیم حاصل کر لی تھی۔ اور ٹھیکیدار
صاحب کا معتمد خاص بن گیا تھا۔ ایک مرتبہ ٹھیکیدار
صاحب بہت بیمار ہوئے بچنے کی کوئی اُمید نہ تھی
کئی مہینے تک چلنے پھرنے سے معذور رہے۔ اس
عرصے میں محمود نے ایک طرف ٹھیکہ کا کام نہایت
ایمانداری اور محنت سے کیا، اور دوسری طرف اپنے
مالک کی تیمارداری اور علاج میں اس نے اپنی
جان کو جان نہ سمجھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب
سعد اللہ خاں صحتیاب ہوئے تو وہ محمود پر بہت زیادہ
مہربان ہو گئے۔ ایک لڑکی کے سوا انکے اور کوئی
اولاد نہ تھی۔ وہ محمود سے اتنا خوش ہوئے کہ جب
محمود بیس سال کا ہوا تو اُس کے ساتھ اپنی لڑکی
کی شادی نہایت دھوم دھام سے کر دی۔ ان کی
برادری والوں نے اس شادی کو اچھی نظر سے نہ
دیکھا۔ عزیزوں نے انتہائی کوشش کی کہ یہ شادی
نہ ہو لیکن ٹھیکیدار صاحب دُھن کے پکے تھے۔
اُنھوں نے کسی کی مخالفت کا کچھ خیال نہ کیا۔ محمود
کی دیانت اور شرافت اور اُس کی بے لوث خدمات
نے ان کو اپنا گرویدہ کر لیا تھا۔ وہ محمود کو اپنا داماد
بنا کر اتنا خوش ہوئے گویا ان کو کوئی نعمت مل گئی۔

اللہ رے انقلاب۔ وہی محمود جو دس سال
پہلے نانِ شبینہ کو محتاج تھا۔ وہ یتیم جسکا بھاؤ پوچھ
میں کوئی پرسانِ حال نہ تھا، جس کو مولوی ذاکر علی
نے مار پیٹ کر اپنے یتیم خانہ سے نکال دیا تھا، وہی
محمود اپنی ایمانداری، محنت اور جانفشانی سے لکھ پتی
ہو گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یتیم خانہ سے نکلنا ہی محمود
کی ترقی کا باعث ہوا۔ نہ وہ یتیم خانہ سے نکالا جاتا
اور نہ اُسے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا آتا۔

(۶)

جب سچائی ظاہر ہو جاتی ہے تو جھوٹ کو فروغ
نہیں ہوتا۔ مولوی ذاکر علی کی کاغذی ناؤ زیادہ دن
تک نہ چل سکی۔ جب شہر والوں کو پتہ چلا کہ یتیم خانہ
تو برائے نام ہے۔ اصل میں یہ اُنکے خاندان کی پرورش
گاہ ہے۔ تو سب ان کے دشمن ہو گئے۔ جب کسی
کی بے ایمانی ایک دفعہ ثابت ہو جاتی ہے تو اسکا
اعتبار ہمیشہ کے لیے جاتا رہتا ہے۔ نوجوانوں نے
شور مچایا، اخباروں میں مضامین نکلے، غرضکہ مولوی
صاحب کی خوب قلعی کھولی گئی۔ بسا اوقات ایک
مچھلی تمام تالاب کو گندہ کر دیتی ہے۔ مولوی صاحب
کا یتیم خانہ کیا بدنام ہوا، لوگوں کا اور یتیم خانوں پر
سے بھی اعتبار اُٹھنے لگا۔ سچ اور جھوٹ کا امتیاز
کرنا دشوار ہو گیا۔ لیکن آخرکار صداقت کو فتح نصیب
ہوئی۔ اصلی یتیم خانے تو باقی رہ گئے، لیکن مولوی
ذاکر علی کا یتیم خانہ اس بادِ مخالف میں نہ سنبھل سکا،
اور ٹوٹ گیا۔ مولوی صاحب نے انتہائی کوشش
کی کہ وہ اپنا گیا ہوا اقتدار پھر واپس لے لیں لیکن
اس میں اُنھیں ناکامیابی ہوئی۔ بہت دوڑ دھوپ

کی۔ رئیسوں اور نوابوں کی خوشامدیں کیں۔ لیکن ہر جگہ سے دھتکارے گئے۔ جامۂ تقدس پارہ پارہ ہوتے ہی غیروں کا کیا ذکر اب مولوی صاحب اپنی نگاہوں میں بھی ذلیل معلوم ہونے لگے۔ یتیم خانہ کے ٹوٹتے ہی ان کی آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ رہا۔ مفت کی روٹیوں اور حرام کی کمائی نے ان کے گھر بھر کو نکما اور اپاہج بنا دیا تھا۔ پانچ لڑکے تھے اور پانچوں نالائق۔ جن کو لڑکپن ہی میں بھیک مانگنے کی تعلیم ملی ہو وہ محنت کا کام کیسے کر سکتے تھے۔ ان کو جو مفت کے ٹکڑوں کی چاٹ لگ گئی تھی۔ وہ محنت اور مشقت کی طرف مائل نہ ہونے دیتی تھی۔ ایسی صورت میں جو نتیجہ ہونا چاہیے تھا وہی ہوا۔ مولوی صاحب کے گھر پر تباہی آگئی جہاں خرچ ہی خرچ ہو اور آمدنی کچھ نہ ہو وہاں کیسے کام چل سکتا ہے۔ جو کچھ جمع پونجی تھی وہ بہت جلد ختم ہو گئی۔ مولویانی کا صندوق جس میں انکے زیورات تھے کوئی چرالیگیا مصیبت پر مصیبت آگئی۔ جہاں کبھی سونا برستا تھا۔ جہاں لڑکے کبھی دودھ کی کلیاں کرتے تھے وہیں اب فاقوں پر نوبت آگئی۔ اس عالم پریشانی میں شہر میں بہت زور کا طاعون پھیلا۔ جس نے مولوی صاحب کے گھر بھر کا صفایا کر دیا۔ صرف مولوی صاحب اپنے اعمال کی سزا بھگتنے کے لیے رہ گئے۔ مکان قرض میں نیلام ہو چکا تھا وہ در بدر کی ٹھوکریں کھانے لگے۔ دس سال کے اندر ہی لوگ مولوی صاحب کا نام بھی بھول گئے۔

(۷)

بارہ برس کے بعد ایک مرتبہ محمود کو جو اب محمود علی خاں کے نام سے مشہور تھے۔ اپنے ایک ٹھیکہ کے سلسلہ میں بھادل پور جانا پڑا۔ وہاں انھوں نے مولوی ذاکر علی کی بہت تلاش کی۔ لیکن کہیں پتہ نہ چلا۔ جس محلہ میں یتیم خانہ تھا وہاں کے بڑے بوڑھوں سے دریافت کرنے سے صرف اتنا پتہ چلا کہ مولوی صاحب اب دردر بھیک مانگتے پھرتے ہیں۔ ان کا قیام کہیں ایک جگہ پر نہیں رہتا۔ مولوی صاحب کا حال سن کر محمود کو سخت صدمہ ہوا۔ جس مکان میں کبھی یتیم خانہ تھا وہ کسی بنیے کے قبضے میں تھا۔ محمود نے بڑی کوشش سے وہ مکان بنیے سے خرید کر وہاں پر ایک نہایت عالیشان مکان بنوایا۔ اور اسکو مسلمان یتیم بچوں اور بچیوں کے لیے وقف کر دیا۔ محمود نے اس یتیم خانہ کے انتظام کے لیے شہر کے معزز اور معتبر اصحاب کی ایک جماعت بنا دی۔ اور اس جماعت کے ارکان کا انتخاب سالانہ ہوتا تھا۔ یتیم خانہ میں مذہبی تعلیم کے علاوہ صنعت و حرفت کی بھی تعلیم دی جاتی تھی۔ یتیموں کو کسی رئیس کے ہاں دعوت میں جانے کی اجازت نہ تھی۔ ان سے بھیک مانگنے کا کام نہ لیا جاتا تھا۔ اس کے برخلاف یتیموں کو اپنے ہاتھ کی دستکاری سے دولت جمع کرنے کا طریقہ سکھایا جاتا تھا۔ ان کی صحت جسمانی کا بھی خاص طور سے خیال رکھا جاتا تھا۔ غرضکہ ان یتیموں کے آرام

وآسایش اور تعلیم و تربیت کا اتنا خیال رکھا جاتا تھا کہ کسی کو یہ احساس ہی نہ ہوتا تھا کہ وہ یتیم ہیں۔ ایک دن محمود اپنی موٹر پر بازار سے گزر رہا تھا۔ اس نے سڑک پر کئی بھکاری بیٹھے دیکھے۔ اس نے بڑا حساس دل پایا تھا۔ غریبوں کو دیکھ کر اس کا دل کانپ اُٹھتا تھا۔ گو وہ لاؤ وہ پیشہ ور گداگروں کی روش کو اچھی نظر سے نہ دیکھتا تھا۔ تاہم اس خیال سے کہ شاید گدڑی میں کوئی لعل ہو، کوئی حاجتمند ہو، وہ حتی المقدور کسی کا سوال رد نہ کرتا تھا۔ محمود کے نام اور اس کی فیاضی سے تمام شہر واقف ہو چکا تھا محمود کو دیکھتے ہی بھکاریوں نے اس کی موٹر کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ محمود نے ہر بھکاری کی جھولی میں کچھ پیسے ڈال دیے۔ ایک ضعیف نابینا فقیر سڑک کے کنارے بیٹھا ہوا صدائیں لگا رہا تھا "بابا اس اندھے فقیر کو بھی دیتے جانا" محمود نے اس کی طرف بھی کچھ پیسے پھینکے۔ لیکن قبل اس کے کہ وہ پیسے بڈھے کی جھولی میں گریں۔ جس طرح کتے ہڈی پر لپکتے ہیں۔ اسی طرح ایک تنومند فقیر ان پیسوں پر جھپٹا۔ اور ٹھوکر کھا کر بڈھے پر اس زور سے گرا کہ بڈھے کے سر میں سخت چوٹ آئی۔ اور خون بہنے لگا۔ محمود کا دل کانپ اُٹھا۔ وہ اپنی اس خیرات پر دل ہی دل میں بہت شرمندہ ہوا۔ وہ فوراً موٹر سے کود کر بڈھے کے پاس پہنچا۔ تنومند فقیر گرد جھاڑتا ہوا کھڑا ہو کر کہنے لگا۔ مالک میری کوئی خطا نہیں۔ مجھے پیسہ نہیں ملا۔ محمود نے حقارت آمیز نظروں سے اُسے دیکھا۔ اور آگے بڑھ کر بڈھے کو اُٹھانے لگا۔ بڈھا چوٹ کھا کر بھی یہی صدا لگائے چلا جا رہا تھا "بابا اس بھوکے اندھے کو بھی دیتے جانا" کسی نے کہا "ارے مالک تو تیرے پاس کھڑے ہوئے تجھ کو اُٹھا رہے ہیں"۔ اندھا یہ سنتے ہی محمود کے قدموں سے لپٹ کر اپنی آنکھیں ملنے لگا۔ اندھے کے لیے یہ معمولی بات تھی۔ بھکاری جتنی خوشامد کرے گا اُتنی ہی اُسے بھیک ملنے کی اُمید ہوتی ہے۔ محمود نے جلدی سے اپنے پاؤں ہٹا لیے سر سے خون برابر جاری تھا۔ ضعیفی اور نقاہت سے بڈھا فقیر بیہوش ہو گیا۔ محمود نے اپنے موٹر ڈرائیور کی مدد سے اُسکو اپنی موٹر میں ڈالا اور شہر کے ایک مشہور سرجن کے پاس لے گیا۔ ڈاکٹر نے زخم دھودھا کر پٹی باندھ دی اور کچھ دوا بھی پلائی جس سے بڈھے کی بیہوشی بالکل دور ہو گئی۔ ڈاکٹر نے محمود کو اطمینان دلا دیا کہ زخم معمولی ہے۔ دو چار دن میں اچھا ہو جائے گا۔ فقیر کو محمود وہاں سے اپنی کوٹھی میں لے گیا۔ جہاں اس کا باقاعدہ علاج ہونے لگا۔

ایک دن محمود نے یوں ہی اس فقیر سے پوچھا "کیوں بڑے میاں کیا تم پیدائشی اندھے ہو؟"

"نہیں بابا! میری یہ حالت صرف دو سال سے ہوئی ہے۔ پہلے کچھ دکھائی بھی دیتا تھا لیکن اب تو کچھ نہیں دکھائی دیتا"۔

"آپ کا گھر کہاں ہے؟"

بڈھے نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا "مالک یہ

نہ پوچھیے۔ فقیر کا گھر کہیں ہوتا تو مارا مارا کیوں پھرتا۔"

محمود نے سوچا یہ بڑھا ضرور مصیبت کا مارا ہے۔ کہنے لگا۔ "میں نہ مانوں گا۔ آپ کو اپنا اصلی حال بتانا پڑے گا"

کسی مصیبت زدہ کو آپ تسلی دیجیے تو وہ اور روئے گا۔ یہی حال بڑھے کا ہوا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اُس نے رُک رُک کر اپنے محسن سے کہنا شروع کیا۔

"آہ میں بہت گنہگار ہوں۔ میرا حال سن کر آپ کو مجھسے نفرت ہو جائے گی۔ خیر کچھ بھی ہو۔ میں اب آپ اپنے محسن سے اپنا حال نہیں چھپا سکتا۔ میں خانماں برباد اسی شہر کا رہنے والا ہوں۔ میں پڑھا لکھا تو بہت کم تھا لیکن اپنی چالاکی سے مولوی کے بھیس میں رہتا تھا۔ میری داستان بہت بڑی ہے لیکن میں آپ سے مختصر کہوں گا۔ میں نے برائے نام ایک یتیم خانہ اسی شہر میں کھولا تھا۔ اُس کا جو کچھ چندہ آتا تھا اُسی سے ہماری بسر اوقات ہوتی تھی۔"

محمود نے قطع کلام کر کے کہا "کیا آپکے نام مولوی ذاکر علی ہے" بڑھے کو سخت تعجب ہوا " جی ہاں اس گنہگار کا نام ذاکر علی ہے۔ حضور کو میرا نام کیسے معلوم ہوا۔ اب تو میرے پرانے جاننے والے بھی مجھکو نہیں پہچان سکتے۔"

محمود کو اصلیت معلوم ہو گئی۔ وہ اُٹھ کر بڑھے سے یہ کہتا ہوا بغلگیر ہو گیا۔ "مولوی صاحب! اب مجھے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ میں آپکو بخوبی پہچان گیا۔ ہائے آپ کا یہ کیا حال ہوا۔"

محمود کے اس فوری جذبہ پر بڑھے کو سخت حیرت تھی۔ ایک لکھپتی رئیس مجھ ایسے گداگر سے اتنی محبت کیوں کر رہا ہے۔ اس کی کوئی وجہ سمجھ میں آتی تھی۔ اُس نے کہا "حضور میں پاگل ہو جاؤں گا۔ آپ اس فقیر کو کیوں اتنی عزت دے رہے ہیں۔ یہ فقیر جو اپنے گناہوں کی سزا بھگت رہا ہے۔ یہ روسیاہ جس نے یتیموں کا مال کھایا۔ جس نے دغا و فریب سے دنیا کو لوٹا۔ کیا اس قابل ہے کہ حضور اس کو سر چڑھائیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا معاملہ ہے۔ بندہ نواز صاف بتائیے۔"

محمود۔ "مولوی صاحب! میں آپ کا ادنیٰ خادم محمود ہوں جو کبھی آپ کے یتیم خانہ میں تھا۔"

"کون محمود! محمود! وہی محمود جس کو میں نے اپنے یتیم خانہ سے —— یا اللہ رحم کر! محمود! میرے پیارے محسن محمود! میری خطا معاف کر دو۔"

محمود نے مولوی صاحب کو تسلی دیتے ہوئے کہا "گئی گزری باتوں کو بھول جائیے۔ جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔ میں اب بھی آپ کا ادنیٰ خادم ہوں۔ آپ اس گھر کو اپنا گھر سمجھ کر یہاں رہیے۔ میں جیتے جی آپ کو کوئی تکلیف نہ ہونے دونگا۔"

مولوی ذاکر علی نے محمود کو اپنے کلیجے سے لگا لیا۔ ان کی داڑھی آنسوؤں سے تر ہو گئی۔ ان کی ہر حرکت سے تشکر آمیز جذبات کا اظہار ہو رہا تھا۔ ان کے دل کی یہ کیفیت تھی جیسی کہ عموماً مفلسی میں انسان کی خواہش ہوتی ہے کہ اگر وہ صاحب دولت ہوتے تو اپنی

ساری دولت اپنے محسن پر قربان کر دیتے لیکن مولوی صاحب کے پاس دعاؤں کے سوا کچھ نہ تھا۔ چنانچہ اس میں انھوں نے کوئی کمی نہ کی۔ جب تک وہ زندہ رہے صادق دل سے محمود کے جان و مال کو دعائیں دیتے رہے۔

رباعیاتِ جلیل

(جناب پروفیسر جلیل احمد قدوائی صاحب جلیل ایم اے)

محفل ہے خلاف، چپ ہی رہنا بہتر دریا کے بہاؤ ہی میں بہنا بہتر
جو بات کی رمز کو سمجھ ہی نہ سکیں، ایسے لوگوں سے کچھ نہ کہنا بہتر

گل پھول نے مسکرا کے مجھ سے یہ کہا: "فانی ہے چمن' تو اس کے ظاہر پہ نہ جا"
تھی پاس ہی اک کلی، چٹک کر بولی: "فانی نہیں یہ چمن' یہ گُل تھا جھوٹا!"

اب ختم ہو جزو خواہ کُل ہو جائے لب تشنہ ہیں رند دَورِ گُل ہو جائے
بادِ صرصر ہے تیز، میرے ساقی! ایسا نہ ہو شمع بزم گُل ہو جائے

دنیا ہے دنی کی بھی عجب باتیں ہیں جتنی بھی ہیں اس کی پُر تعب باتیں ہیں
فرزند ہو، زن ہو یا ہو مادر کہ پدر ہیں جتنے تعلقات سب باتیں ہیں

تقدیر میں تیری تھی یہ خواری اے دل کلفت میں جو زندگی گزاری، اے دل
افسوس تجھے ملا نہ جینے کا مزا کرتا ہوں میں تیرے غم پہ زاری، اے دل

ریاض اور خیرآباد

(جناب مولوی محمد عبدالشاہد خاں صاحب شاہد شروانی ناظم انجمن اشاعت الدین منظر العلوم مدرسہ عربیہ نیازیہ خیرآباد)

(سلسلۂ الناظر ماہ گذشتہ)

اب میں ریاض کی شاعری کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں - یوں تو ریاض ہر صنف سخن پر قدرتِ تامہ رکھتے تھے مگر جس رنگ کو انھوں نے اپنا حصہ کرلیا تھا وہ خمریات ہیں - جسکے وہ بلا چون و چرا بادشاہ تسلیم کرلیے گئے - اور قوم نے اس کی بدولت "خیام عصر" کا خطاب دیدیا - اسم کو مسمّٰی کے ساتھ کچھ نہ کچھ تعلق ضرور ہوتا ہے - یہی وجہ ہے کہ ریاض اور "خیام عصر" کے عدد برابر ہیں - ریاض کی شاعری مجاز سے شروع ہوتی ہے اور مصداق "المجاز قنطرۃ الحقیقۃ" حقیقت پر ختم ہوتی ہے - خمریات یہاں سے شروع ہوتے ہیں :-

اچھی پی لی خراب پی لی　　　جیسی پائی شراب پی لی

بیچتے پھرتے ہیں سب اس طرح ہم رستے گلی　　　جا سے خم چھوٹی سی ہے مے کی دکاں بالائے سر

اسی کا نتیجہ تھا کہ زمانہ ریاض کو شرابخوار سمجھنے لگا تھا مگر یہ ریاض کی اعلیٰ ظرفی تھی کہ کبھی اسکو منہ تک نہ لگایا ارشاد ہوتا ہے

میرا یہی خیال ہے گو میں نے پی نہیں　　　کوئی حسیں پلائے تو یہ شے بری نہیں

مے نور خدا ہوتی - دل عرش خدا ہوتا　　　تھوڑی سی جو پی لیتے کیا جانیے کیا ہوتا

مری شراب کی کیا قدر جانے تو واعظ　　　جسے میں پی کے دعا دوں وہ جنتی ہوجائے

ہے ریاض اک جوان مست خرام　　　نہ پیے اور جھومتا جائے

ریاض حیدرآباد میں تشریف فرما ہیں - ایک ایرانی شاعر وہاں اقامت گزیں ہیں - ایرانی شاعر ریاض کے اشعار سن سن کر ان کو شراب خوار سمجھتا ہے اور ان کی دعوت کرتا ہے - دعوت میں شراب کا بھی اہتمام ہے کھانا کھانے کے بعد شراب پیش کی جاتی ہے - ریاض اپنی فطری خوش خلقی کے مطابق جام شراب اُٹھاتے ہیں اور منہ تک لیجاکر میز پر رکھدیتے ہیں - اور للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگتے ہیں - جب کئی بار ایسا کیا گیا تو میزبان سے نہ رہا گیا اور اس کی وجہ دریافت کی - ریاض نے بڑی متانت سے جواب دیا کہ کیا بتاؤں آج کل مجھے ایسا

مرض ہوگیا ہے کہ متفق علیہ ڈاکٹروں کی یہ رائے ہے کہ اگر ایک قطرہ بھی شراب کا میری حلق میں جائے گا تو موت واقع ہو جائیگی۔ ادھر جان کا خوف۔ اُدھر جان سے زیادہ عزیز چیز کا خیال۔

اسی طرح منشی رتن ناتھ صاحب سرشار لکھنوی نے حیدرآباد میں دعوت کی۔ کھانے کے بعد مئے ارغوانی پیش ہوئی۔ ریاض نے پیشاب کا بہانہ کرکے میزبان سے اجازت چاہی۔ میزبان نے اجازت دی۔ ریاض وہاں سے جو روانہ ہوئے تو سیدھے مکان تشریف لائے۔ جب اُنکو دیر ہو گئی تو تلاش کی گئی۔ پھر غالباً بیس برس کے بعد سرشار صاحب سے ملاقات ہوئی۔ یہ تھی ریاض کی شرابخواری۔ پھر تماشا یہ کہ کسی کو اس بات کا پتہ بھی نہ چلے کہ آپ نہیں پیتے۔

حدیث شریف میں ہے "انما الاعمال بالخواتیم" ہم دعوے سے کہہ سکتے ہیں کہ ریاض اور ریاض کی شاعری دونوں کا انجام بخیر ہوا۔ ریاض تو اس واسطے مقبول بارگاہ ہوئے کہ آخر وقت ہر سانس کے ساتھ اللہ زبان پر تھا جس کو فقط ایک میں نے ہی نہیں بلکہ بیسیوں اشخاص نے دیکھا اور سُنا۔ جناب مولوی نثار احمد صاحب عارف فاروقی رئیس خیرآباد نے اسی واقعہ کو اپنے قطعہ تاریخ میں نظم فرمایا ہے

نزع میں اللہ تھا وردِ زباں   کیوں نہ ہو آخر تھے وہ آلِ حسن ۱۳۵۲ھ

دوسرے یہ کہ جب حضرت ریاض نے رحلت فرمائی۔ اُس زمانہ میں معظمی و محترمی خان بہادر نواب حاجی محمد غلام خاں صاحب بالقابہ آف داد و ن ضلع علیگڈھ مدینہ طیبہ میں تشریف فرما تھے۔ نواب صاحب موصوف وائنا (آسٹریا) بغرض علاج چشم تشریف لے گئے تھے۔ وہاں سے واپسی میں لندن۔ پیرس۔ استنبول۔ نجف اشرف۔ کربلائے معلیٰ۔ بغداد شریف۔ مکہ معظمہ ہوتے ہوئے مدینہ طیبہ میں حاضر ہوئے تھے۔ چونکہ نواب صاحب موصوف اور لسان الملک مرحوم سے مخلصانہ تعلقات تھے۔ جس کا ثبوت آپ کو اس سے مل سکیگا کہ جب ۲۲ محرم الحرام ۱۳۵۲ھ کو خیرآباد شریف سے موصوف کی روانگی ہوئی ہے تو سبحان اللہ ریاض نے الوداعی قصیدہ فارسی زبان میں لکھا تھا جس کا آخری شعر یہ تھا ؎

وقت است کہ بیچارہ ریاض از تو بگوید   "بستی کمرِ خویش شکستی کمر ما"

چنانچہ یہی ہوا کہ نواب صاحب موصوف کی عدم موجودگی ہی میں حضرت ریاض ریاض خلد میں پہنچ گئے میں نے اس ناگہانی حادثہ کی اطلاع موصوف کو مدینہ شریف میں کی۔ موصوف نے اطلاع پاتے ہی دعائے مغفرت کی اور فوراً حرم پاک میں ختم قران شریف کرایا۔ میں اس کو شاعر کی انتہائی خوش نصیبی سمجھتا ہوں۔ اب اُن کی نجات میں میرے نزدیک شبہہ کی گنجایش نہیں رہی۔

شاعری کا اس لیے خاتمہ بالخیر ہوا کہ ریاض ایک غزل تحریر فرماتے ہیں جسکے دو اشعار پیش کرتا ہوں

سلہ مرحوم [illegible] سے تھے۔

بند آنکھیں ہوں مری آنکھوں میں صورت آپکی نزع میں آپ اس طرح مشکل مری آساں کریں
نشۂ مے سے جواں بنتے ہیں پیری میں ریاض وقت ہے توبہ کریں اب قبر کا ساماں کریں

آپ قبر کا جو سامان کرتے ہیں وہ بھی ملاحظہ ہو۔ نعت میں غزل لکھتے ہیں جسکا مطلع حسب ذیل ہے۔

یہ گنبدِ خضرا ہے کہ مینائے محمدؐ ہر ذرہ ہے جسکا خُمِ صہبائے محمدؐ

اس مطلع میں بھی ریاض نے اپنا رنگ ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ یہی وہ شراب ہے جسکے ریاض دلدادہ تھے۔ فرماتے ہیں۔

نشۂ بیاض ساقی کوثر سے مل گیا گھر بیٹھے اب تو بادۂ کوثر پئیں گے

پھر ریاض نے اُس نعت کی غزل کے بعد کوئی شعر نہیں لکھا۔ اس طرح ریاض کی شاعری کا بھی انجام بخیر ہوا۔

اب میں ریاض کے کچھ اشعار ادھر اُدھر سے پیش کروں گا اور جو وقت ناظرینِ کرام کا ضایع ہوا ہے اُس کی تلافی کر دوں گا۔ ریاض میں ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ مقطع لاجواب ہوتا ہے۔ اور اکثر مقطعے ضرب المثل ہیں۔ آخر میں کچھ مقطعے بھی پیش کروں گا۔

مجھے جناب مولوی سبحان اللہ خاں صاحب تخلیم رئیس گورکھپور سے اس خیال سے بالکل اتفاق ہے کہ اُردو شعرا نے خمریات میں جو کچھ آج تک کہا ہے اُس کو جمع کیا جائے تو وہ اتنا ہی ہوگا کہ جتنا خیام عصر حضرت ریاض نے کہا ہے یا اس سے بھی کم۔ بہرحال ریاض نے خمریات میں کوئی پہلو کسی کے لیے نہیں چھوڑا۔ لسان الملک خیام العصر حضرت ریاض رحمۃ اللہ علیہ مجھ پر جو شفقت فرماتے تھے اُسکو مرحوم کے اعزا اور اہل خاندان اچھی طرح جانتے ہیں۔ میری دُنیائے شاعری کی تمام امیدیں حضرت مرحوم سے وابستہ تھیں۔ افسوس کہ حضرت ریاض کی وفات نے مجھے کہیں کا نہ رکھا اور زندہ درگور کر دیا۔

خستہ دل میں ہی نہیں ہجر لسان الملک میں ساتھ دنیا دے رہی ہے شاہد دلگیر کا

خمریات

سلامت میکدہ یارب سلامت پیر میخانہ حرم میں بھی مری آنکھوں میں ہے تصویر میخانہ
کہیں کیا ہم۔ ہمارا میکدہ وابستہ ہے کس سے ملی ہے عرش کی زنجیر سے زنجیر میخانہ
فرشتے اُس کی چشم فیض سے انسان بنتے ہیں پلاتا ہے کچھ ایسی دُور ہی سے پیر میخانہ
خم سے پر چڑھائی کر کے توبہ بچ نہیں سکتی اُٹھی وہ موج بادہ وہ کھنچی شمشیر میخانہ
نظر آئے حرم میں جام و ساغر بھی اسی نقشے کے خطِ ساغر سے پھیلی ہر جگہ تحریر میخانہ
خم سے پر برس پڑتا ترا ابر سیہ بن کر رہے گی یاد اے واعظ تری تقریر میخانہ

ریاض اس میکدہ میں بھی شرف ہو کچھ سیادت کو
نہیں ہم پیر میخانہ مگر ہیں میر میخانہ

مری حلق سے اتر کرے ملامت اشک بنتی
ابھی میں گناہ کرتا ابھی اشکبار ہوتا

بُری کیا تھی نا توسی بڑے لطف سے گزرتی
پیے کچھ تو مے کی تلخی عشبہ روز گار ہوتا

لئے سلسبیل ہوتی نہ شراب حوض کوثر
جو ریاض سا مسلماں نہ شراب خوار ہوتا

شیخ نے مانگی ہے اپنی عمر کی
میکدے سے اب پرانی جائیگی

یہ اپنی وضع اور یہ دشنام مے فروش
سُن کر جو پی گئے یہ مزا مفلسی کا تھا

میکدے میں یہ طلسم آنکھ سے دیکھا میں نے
جو عرق مے میں جو گرا وہ لب کوثر نکلا

تیرے آگے دخترِ رز کو لائے ہیں پہلے پہل
یہ اچھوتی آج نذرِ پارسا ہو جائیگی

ریاض ایسی مرے دل میں لگی ہے جام کوثر کی
مئے انگور اب اچھی نہیں معلوم ہوتی ہے

اُتری ہے آسمان سے جو کل اُٹھا تو لا
طاقِ حرم سے شیخ وہ بوتل اُٹھا تو لا

مجھ کو بھی انتظار تھا ابر آئے تو پیوں
ساقی اگر یہ سچ ہے کہ بادل اُٹھا تو لا

طاقِ حرم میں شیخ گلابی ہے پھول سی
اس کام کا ملے گا تجھے میں اُٹھا تو لا

نکلتی سا تقدرندوں کے اعدے کشتی مے بھی
تو ان کا حشر کے طوفاں میں بیڑا پار ہو جاتا

ساقی ہمارے سامنے رکھدے تو بھر کے جام
لا دخترِ رز کو تو رکھے سامنے پیر حال کے

او چشم مست تیرے اشارے سے کیا ملا
ساغر ملا شراب ملی میکدا ملا

جیسے کسی نے پی ہی نہیں وہ حرام ہے
ہر رند میکدے میں ہمیں پارسا ملا

کتنی تمام عمر میں ہم نے شراب پی
شاید بتا سکے ہمیں میزان حساب کی

کمبخت نے شراب کا ذکر اس قدر کیا
واعظ کے منہ سے آنے لگی بو شراب کی

کام آئیگی ریاض کے مشق طواف خم
کعبے کے گرد ہونگے جو سوجھی ثواب کی

رفعتِ تخیل

گُل مرقع میں ترے چاک گریبانوں کے
شکل معشوق کی انداز میں دیوانوں کے

آتش رنگ حنا و زلف پیچاں دیکھیے
آگ تلووں میں لگی نکلا دھواں بالائے سر

اُگتے تھے جن میں نخل امید وصال کے
کیا ہوگئے وہ باغ طلسم خیال کے

انگشت نما ظاہر و باطن کا ہوا فرق
کیوں برگ حنا سبز ہے کیوں رنگ حنا سُرخ

لال آندھی جب اُٹھتی ہے تو اُٹھتی ہے یہیں سے
مقتل کی زمیں سرخ ہے مقتل کی ہوا سُرخ

لوٹتے ہیں لطف آنکھوں میں فرشتے ساتھ کے ان فرشتوں سے کبھی چھپ چھپ کے ہم عصیاں کریں
سیری ہوئی نہ لذتِ عصیاں سے عمر بھر کیا کچھ کیا، مگر نہ بھرا جی گناہ سے
داغِ سوزاں سے مرے چند شرارے نکلے چاند نکلا شبِ فرقت نہ ستارے نکلے
میرے گھر مثلِ تبرک کے یہ ساماں نکلا آستیں قیس کی فرہاد کا داماں نکلا
یہ وہ پتھر ہے جگر سے جو کبھی اٹھ نہ سکا سنگِ در سے بھی سوا آپ کا درباں نکلا
یہی چراغِ لحد تھے یہی تھے قبر کے پھول اب ان کے نقشِ قدم بھی سرِ مزار نہیں
کبھی میں بلائیں لیتا کبھی میں نثار ہوتا جو نصیب میں کبھی بھی خمِ زلفِ یار ہوتا
حشر کے دن ہمیں سوجھی یہ شرارت اچھی لے گئے چھانٹ کے ہم خلد میں صورت اچھی
نہ بنے کام تو کس کام کی نازک شکلیں نازک اچھے نہ حسینوں کی نزاکت اچھی
قیامت کی خلش کیوں ہر گھڑی ہے وہ تم سے قد میں کم سن میں بڑی ہے
چھلکائیں لاؤ بھر کے گلابی شراب کی تصویر کھینچیں آج تمھارے شباب کی
اب مجرمانِ عشق سے باقی ہوں ایک میں اے موت رہنے دے مجھے عبرت کے واسطے
بیٹھا ہے کوئی گیسوؤں کے بل نکال کے عکس آئینے میں آئے ذرا دیکھ بھال کے
مرے لوٹے کلیم اب بن پڑی ہے بڑی اونچی جگہ قسمت لڑی ہے
نکلے میرے جرم میرے علم سے باہر بہت روزِ محشر دم بخود ہوں فردِ عصیاں دیکھ کر
رنگ کیا کیا شام کو لائیں گے آنے کے لیے صبح سے بیٹھے ہیں جو مہندی لگانے کے لیے
لطف ہے مقتل میں چمکیں آج دو دو بجلیاں آستیں تو چڑھ چکی ہے تیغ بھی عریاں کریں
کوئی جانے یہی زیر، ایک جلوا دیکھنے والے بڑے وہ آئے موسیٰ جا کے تنہا دیکھنے والے
حنائی ہاتھ کا صدقہ بجھا دے اب لگی دل کی لگا کر آگ اس گھر میں تماشا دیکھنے والے
تازہ کہن افسانۂ موسیٰ جو ہوا آج یہ کون ہوا محوِ تجلا سے محمد

زبان

خیالِ شبِ غم سے گھبرا رہے ہیں ہمیں دن کو تارے نظر آ رہے ہیں
یہ الجھے ہیں رندوں سے کیا شیخ صاحب بڑھاپے میں کیوں داڑھی نُچوا رہے ہیں
دعا دے رہا ہوں یہ دیوانگی میں جنھیں پھول نکلے جو گُھنوا رہے ہیں
قیامت بچھی جاتی ہے ہر قدم پر یہ کون آ رہا ہے وہی آ رہے ہیں

کمر سیدھی کرنے ذرا میکدے میں / عصا ٹیکتے کیا ریاض آ رہے ہیں

مری جان میں تیرے قربان جاتا / مری بات چلتی ہے تو مان جاتا

اٹھا لی معاصی کی جی بھر کے لذت / لیے قبر میں کون ارمان جاتا

کبھی ہاتھ اٹھاتے نہ ہم ان بتوں سے / وہ ایمان رہتا کہ ایمان جاتا

میں نے چھیڑا تو کس ادا سے کہا / کچھ سنو گے مری زبان سے آج

چھانٹا وہ دل کہ جس کی ازل میں نمود تھی / پسلی پھڑک اٹھی نظر انتخاب کی

مرے ہاتھ سے پہنا انھیں اور بار رہتا / کمر اور بھی لچکتی جو گلے میں ہار رہتا

یہ بدلنے کے نہیں لاکھ زمانہ بدلے / مجھ سے کمبخت کا دن غیر سے بدذات کی رات

یاد آتا ہے ریاض اس سے وہ میرا کہنا / آج رہ جا ترے صدقے مرے گھر رات کی رات

آنکھیں چلمن سے لڑا لیتے ہیں آتے جاتے / پردہ پردہ میں نکل آئی یہ صورت اچھی

روگ تھا آزار تھا اچھا ہوا جاتا رہا / ایسے دل کا ذکر کیا جاتا رہا جاتا رہا

دست شفقت اس طرح اک رند نے پھیرا ریاض / بیٹھ کر یادِ خدا میں جھومتا جاتا رہا

نہ آیا ہمیں عشق کرنا نہ آیا / مرے عمر بھر اور مرنا نہ آیا

تو ہمیشہ رہی قاتل کی کمر میں اے تیغ / ترے صدقے تجھے قاتل کی ادا بھی آئی

توبہ شکن یہ کون ہوا ہم سے ہمکنار / کیا کیا ملی ہے ٹوٹ کے توبہ گناہ سے

ہم نے گھول کے پی لی توبہ / اچھے ہم ہیں اچھی توبہ

حضرتِ موسیٰ لڑائیں آنکھ کوہِ طور سے / ہم ہیں اُن میں دیکھتے ہیں جو تماشا دور سے

تمنا کو تم اپنی منع کر دو / ہماری جان کے پیچھے پڑی ہے

کیا پوچھتے ہو باتیں پیری میں جوانی کی / وہ اور زمانہ تھا یہ اور زمانہ ہے

وہ کہہ رہے ہیں اشک کو میرے لہو کی بوند / آنکھوں نے رکھ دیا ہے کلیجہ نکال کے

او زلف والے حشر ہے کچھ دل لگی نہیں / عقدے کھلیں گے آج ترے بال بال کے

مقاطع

بڑے پاک طینت بڑے صاف باطن / ریاض آپ کو کچھ ہمیں جانتے ہیں

ریاض اک مردِ آخر بیں ہو تم بھی / سمجھ کر عاقبت برباد کرنا

حنا لگا کے پہنچتے ہیں گلرخوں میں ریاض / کچھ ان کی ریشِ مبارک کا اعتبار نہیں

پینے آتے ہیں فرشتہ خو ریاض
حور کے دامن میں چھانی جائے گی

وقت کے ساتھ گئیں وقت کی باتیں بھی ریاض
اب نہ وہ ہم نہ وہ دل ہے نہ زمانہ دل کا

یہ یاد تو رہے کہ ملے تھے ریاض سے
او آنے والے ہاتھ تو مجھ سے ذرا ملا

کوئی جاکر ریاض کو سمجھا لے
کچھ خفا ہیں وہ اپنی جان سے آج

کانگرس کی بزم میں ہیں کام کی باتیں ریاض
جس میں دورِ جام رہتا ہو یہ وہ محفل نہیں

نگاہِ فیض سے تیری عجب نہیں وارث
ریاض سا سگِ دنیا بھی آدمی ہو جائے

ریاضِ خضر صورت جب سوِ میخانہ آتے ہیں
تو فوراً سر پھرا اک خم لیے پیمانہ آتا ہے

ریاض آتے ہیں شاید کہ غل ہے مسجد میں
تمام بادہ کشوں کا امام آتا ہے

ہم نے دیکھا کہ سوئے میکدہ جاتے تھے ریاض
اک عصا تھامے عبا پہنے عمامہ باندھے

ہندوستاں میں دھوم ہے کس کی زبان کی
وہ کون ہے ریاض کو جو جانتا نہیں

شاعری ہے ریاض کے دم تک
پھر کہاں لوگ اس طبیعت کے

قدرداں گوہر سخن کے ریاض
منہ مرا موتیوں سے بھرتے ہیں

دنیا کی پڑ رہی ہیں نگاہیں ریاض پر
کس نوک کا جوان ہے کس آن بان کا

وہی شباب کی چہلیں وہی شباب کا رنگ
تجھے ریاض بڑھاپے میں بھی جواں دیکھا

جب کہہ کے ریاض اس نے پکارا سرِ محفل
بن بن کے کئی آدمی اس نام کے اٹھے

افسردہ جان کر وہ ہمیں چھیڑیں ریاض
آجائے گا مزا جو طبیعت سنبھل گئی

بنتِ عنب کو چھیڑتے ہیں حضرتِ ریاض
کتنی ہے با مذاق طبیعت جناب کی

ریاض موت ہے اس شرط سے ہمیں منظور
زمیں ستائے نہ مرنے پہ آسماں کی طرح

روؤں کیا بیٹھ کے میں اپنے مصائب کو ریاض
اب تو رونا بھی مرے دیدۂ تر بھول گئے

سنا ہے ریاض اپنی داڑھی بڑھا کر
بڑھاپے میں اللہ والے ہوئے ہیں

واعظ آیا سوئے میخانہ تو بدست ریاض
عوضِ شیشہ لیے ہاتھ میں پتھر نکلا

جان کی طرح تمنا ہے یہی دل میں ریاض
مر رہیں کعبے میں تو رخ سوئے مدینہ ہو جائے

چکور اور چاند

(جناب حاجی محمود احسن صاحب محمود اسرائیلی)

میں دشت میں سرگرداں تو چرخ پہ نور افشاں
رہ رہ کے میں تاکتا ہوں
جب دیدۂ محزوں سے
تارا سا چمکتا ہے
تو گوشۂ گردوں سے
پہونچے ترے کانوں تک
آواز کہاں اتنی!
میں تجھ سے ملوں جا کر
پرواز کہاں اتنی!
میں دشت میں سرگرداں تو چرخ پہ نور افشاں

تو چرخ پہ نور افشاں میں دشت میں سرگرداں
تو پردۂ مہجوری
جب چاہے اُٹھا جائے
اک شکل خفی بن کر
ذرے میں سما جائے
یا آب مصفا میں منہ دھونکو آجائے
جب چاہے غرض مجھ کو
سینے سے لگا جائے
تو چرخ پہ نور افشاں میں دشت میں سرگرداں

گیت

(جناب مولوی محمد اسحٰق صاحب مائل انصاری خیرآبادی)

من کی مالا پھیرا!
بابا۔ من کی مالا پھیرا

مندر مسجد ڈھونڈھ پھرا ہے — اور کلیسا میں بھی گیا ہے
سچ کہنا وہ کہیں ملا ہے — تجھ کو ناحق وہم ہوا ہے

من کی مالا پھیرا!
بابا۔ من کی مالا پھیرا!

دھن دولت پر کیوں ہے پھولا — اپنی خاطر اپنے کو بھولا
مٹ جائے گا تیرا ہولا — جھول رہا ہے کیسا جھولا

نفس کو کرلے زیر!
بابا۔ من کی مالا پھیرا!

روح تری دکھ جھیل رہی ہے — دنیا تجھ سے کھیل رہی ہے
تو مقابل تیرے کیا کیا — دیکھ تو وہ ڈنڈ پیل رہی ہے

رہنا مثل شیر!
بابا۔ من کی مالا پھیرا!

کام آئے گی تیرے نیکی — دنیا تجھ کو یاد کرے گی
لیکن تجھ کو وقت کہاں ہے — کرنا ہے جو کرلے جلدی

نا کر دیر سویر!
بابا۔ من کی مالا پھیرا

موت سے ہے سب کو لاچاری — سانس کریگی کب تک یاری
چلنے کی کرلے تیاری — اے مائل! وہ ریل پکاری

اب کاہے کی ہے دیرا!
بابا۔ من کی مالا پھیرا!

نظرے خوش گزرے

یہ پرچہ زائد حجم کے بجائے معمول سے کم حجم کے ساتھ بھی اگر اس ماہ کے اندر اندر شائع ہو جائے تو غنیمت سمجھیے۔ کیونکہ ہمارے نزدیک مہینے کے مہینے پرچہ کا نکل جانا اوراق کی بیشی کے مقابلہ میں زیادہ ضروری ہے۔ جون کے آخر میں ایک حادثہ ایسا پیش آگیا جس کی بنا پر بعض اور منصوبوں میں بھی فرق آیا اور اس پرچہ کی تیاری میں بھی تاخیر ہوئی۔ میرا سب سے چھوٹا لڑکا دیوبند میں تھا۔ خبر آئی کہ اس کے چھوٹی چیچک (خسرا) نکل آئی ہے۔ واپسی کا ٹکٹ لیکر دو دن کے لیے گیا کہ اسے گھر لے آؤں۔ وہاں پہونچکر دیکھا تو وہ سر سے پاؤں تک بڑی چیچک سے لدا ہوا تھا۔ اس کو اس حال میں چھوڑ آنا ممکن نہ تھا اس لیے مجبوراً قیام کرنا پڑا، اور جب تک وہ سفر کے قابل نہ ہوا میں دیوبند میں گویا نظر بند رہا —

بزرگان دیوبند کی عقیدت و محبت اگرچہ ایک مدت سے دل میں جاگزیں تھی لیکن اس دینی دارالعلوم کی زیارت کا شرف اسی سال حاصل ہوا۔ گزشتہ اپریل میں جب پہلی بار حاضر ہوا تو قیام بہت مختصر تھا، اس لیے صرف دارالعلوم کی مختلف عمارتوں کے معائنہ اور وہاں کے اساتذۂ کرام کی دست بوسی پر قناعت کی گئی۔ وہاں کی اصلی آبادی یعنی طلباء عزیز کی جماعت میں سے بھی بعض سے اسوقت سرسری ملاقات ہوئی تھی لیکن اب کی نظر بندی کے زمانہ میں خدمت تیمارداری کی مصروفیتوں کے باوجود دارالعلوم کی زندگی کے بعض پہلوؤں کو قریب سے اور اطمینان کے ساتھ مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔

خدا کا شکر ہے کہ دیوبند کے طلباء و اساتذہ سب میں دینی شغف پایا جاتا ہے۔ اور جس مقصد کے لیے یہ عظیم الشان درس گاہ قائم ہوئی تھی وہ بدرجۂ احسن پورا ہو رہا ہے۔ قلوب کا حال اللہ ہی بہتر جانتا ہے لیکن ایک ظاہر بین کی آنکھوں کی ٹھنڈک کے لیے یہ نظارہ کافی تھا کہ ہر طرف دینداری کے چرچے اور اسلامی زندگی کے نمونے دکھائی دیتے تھے۔ دیوبند میں کوئی خاص وردی رائج نہیں، اور ہندوستان کے ہر صوبہ کے علاوہ بیرون ہند کے بھی طلباء وہاں موجود ہیں۔ اس لیے مرز و بوم کے اختلافات کے باعث لباس میں بظاہر یکسانیت نہیں لیکن شرعی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو سب میں ایک طرح کی یکرنگی پائی جاتی ہے۔ دارالعلوم کی مسجد ہر وقت بھری رہتی ہے۔ گرمیوں کی راتیں چھوٹی، اس پر بعض طلباء کے اسباق کا سلسلہ عشاء کے بعد تک اور مطالعہ کی مصروفیت اسکے بھی بعد تک لیکن فجر کے وقت بھی یہ ڈنگت میں

رہنے والے طلبہ کی اکثریت جماعت میں شریک۔ چہرے عموماً اللہ کے نور سے مزین بلکہ بہتوں کی پیشانیاں سیماہم فی وجوہہم من اثر السجود کی مصداق - ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء -

علیگڈھ کی سی شائستگی اور فرنگیت کا کیا ذکر یہاں فرنگی محل اور ندوہ کی سی آرائش زیبائش کا بھی وجود نہیں - سادگی اور دینداری سے ساری فضا معمور - نماز فجر کے بعد مسجد کے علاوہ طلبہ کے کمروں سے قرآن خوانی کی آوازیں سنائی دیتیں اور بعض اساتذہ کے یہاں حدیث و تفسیر کے اسباق شروع ہو جاتے - دارالعلوم کے مقررہ اوقات تعلیم ۶ گھنٹے کے ہیں لیکن بعض اساتذہ اوقات تعطیل میں بھی سبق پڑھاتے ہیں اور بہت سے طلبا ۹ - ۱۰ گھنٹے زیر تعلیم رہتے ہیں - غرضکہ طلبہ و اساتذہ سب تعلیم و تعلم میں صبح سے شام تک مصروف رہتے ہیں - اللہ تعالیٰ اس دینی درس گاہ کو ابدالاباد تک قائم رکھیں اور مسلمانوں کو اس کے چشمۂ فیض سے سیراب کرتے رہیں -

---

جون کا الناظر مرتب ہو کر مطبع کو جا چکا تھا جب یہ المناک خبر ملی کہ شمس العلما مولوی سید ممتاز علی مالک اخبار تہذیب النسواں و دارالاشاعت پنجاب نے جو کچھ عرصہ سے علیل تھے اس دار فانی سے رحلت کی - انا للہ و انا الیہ راجعون -

مرحوم نے اپنے خیال کے مطابق مسلمانوں میں تعلیم نسواں کی اشاعت کے لیے جو بلیغ کوششیں کیں انکی قدر و قیمت کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ آج تہذیب النسواں عورتوں کا سب سے پرانا اردو پرچہ ہے - نیز عورتوں اور بچوں کے پڑھنے کے لیے جو کتابیں ملک میں رائج ہیں ان میں سب سے زیادہ وہی ہیں جو انکی زوجہ مرحومہ محمدی بیگم صاحبہ (تہذیب النسواں کی مدیرۂ اول) کے نام سے یا ان کے کارخانہ دارالاشاعت پنجاب سے شایع ہوئی ہیں -

وہ اگرچہ دیوبند کے رہنے والے اور قدیم طرز کے تعلیم یافتہ تھے مگر پنجاب میں رہ کر اور انگریزی پڑھ کر انکا رو خیالات کے لحاظ سے سرسید اور انکے رفقا کے دوش بدوش تھے اور تعلیم نسواں کے مسئلے میں ان سب سے بھی آگے -

اردو ادب پر انکے خاص احسانات ہیں - عورتوں اور بچوں کی کتابوں کے علاوہ دارالاشاعت پنجاب نے بہت سی اور اچھی کتابیں شایع کیں بلکہ شاید یہ کہنا بیجا نہ ہو کہ پنجاب میں یہی ایک کارخانہ ایسا ہے جس نے سنجیدہ ادب میں کافی اضافہ کیا ہے - خود مرحوم نے متعدد کتابیں لکھیں جن میں سب سے زیادہ قیمتی ان کی آخری اور ضخیم تالیف تفصیل البیان فی مقاصد القرآن ہے جسکی ترتیب اور تیاری پر

بیس سال سے زائد وقت اور ہزاروں روپیہ صرف ہوا۔ اسکے چھ جزو شایع ہو چکے ہیں اور امید ہے کہ بقیہ دو جزو بھی جلد شایع ہو جائیں گے۔

اس عاجز کو پچیس سال سے مرحوم کی خدمت میں نیاز حاصل تھا اور ملاقات کی نوبت باوجودیکہ جلد جلد نہیں آتی تھی مگر جب ملتے تھے تو ایسے عزیزانہ لطف و کرم سے پیش آتے تھے کہ اُس کی یاد برسوں تک قائم رہتی تھی۔

مرحوم نے پچھتر سال کی عمر پائی اور دو صاحبزادے یادگار چھوڑے ہیں۔ بڑے سید حمید علی صاحب دارالاشاعت کے مہتمم اور کاروباری آدمی ہیں، اور چھوٹے سید امتیاز علی صاحب تاج بی اے ادیب شاعر و مصنف ہیں۔ اور امید ہے کہ دونوں مل کر اپنے نامور والد کے لگائے ہوئے چمنستان کو ہمیشہ سرسبز و شاداب رکھینگے۔

اس نمبر سے برادرم مولوی اسمٰعیل احمد صاحب تسنیم مینائی کا ایک تنقیدی رسالہ "دو میرزا" کتابی صورت میں شایع کیا جاتا ہے۔ اس دفعہ صرف آٹھ صفحے پیش کیے جاتے ہیں آیندہ حسب موقع انشاءاللہ ایک جزو شامل کیا جائے گا تاکہ اسی سال کتاب مکمل ہو جائے۔

الناظر کا عام حجم اب مستقلاً ۴ جزو رہے گا تا آنکہ خریداران قسم اول کی تعداد میں اتنا معقول اضافہ ہو جائے کہ اضافۂ حجم کے مصارف کا بار آسانی سے برداشت کیا جا سکے۔ کتاب کے اوراق شمار میں نہ آئیں گے۔

ارزاں ایڈیشن محض طلبا اور غیر مستطیع لوگوں کے لیے نکالا گیا ہے۔ اور اب تک عام پرچوں میں اور اُس میں سوائے کاغذ کے اور کسی قسم کا امتیاز نہ تھا۔ مگر ایک سال کے تجربہ کے بعد معلوم ہوا کہ اگر قسم عام میں کوئی امتیاز نہ پیدا کیا گیا تو ممکن ہے کہ کچھ دنوں میں خریداران قسم عام کی تعداد گھٹ جائے اور رسالہ کی بقا معرض خطر میں پڑ جائے، اس لیے جب تک کوئی دوسرا سامان نہ ہو یہ امتیاز قائم رکھنے کی کوشش کی جائیگی کہ ایک مسلسل کتاب قسم عام کے پرچہ کے ساتھ شایع ہوتی رہے۔

الناظر نے پہلے دور میں بھی چھوٹی بڑی بہت سی کتابیں اسی طریقہ پر شایع کی ہیں اور اس جدید دور میں بھی خدا نے چاہا تو یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

مسلمانان صوبۂ متحدہ کو خوشخبری ہو کہ الہ آباد کی طرف سے جو بادل اُمنڈ اُمنڈ کر آ رہے تھے وہ بالآخر مینی تال میں برس ہی گئے۔ یعنی حاجی سید محمد حسین صاحب بیرسٹر الہ آباد نے جنکے دل میں برسوں کے بعد اس صوبہ کے مسلمانوں کی سیاسی تنظیم کا درد بڑی شدت سے پیدا ہوا ہے، اور جو اپنے درد کا اظہار گزشتہ سات ماہ کے اندر کئی بار اخبارات کے ذریعہ سے کر چکے تھے بالآخر نواب صاحب

چھتاری اور نواب سر محمد یوسف وغیرہ کی معیت میں نینی تال میں ایک محاسبہ کرکے اس صوبہ میں مسلم لیگ قائم کرنے کا اعلان فرما دیا ہے۔ اور امید کرنا چاہیئے کہ آئندہ چند ماہ کے اندر نواب صاحبان کی دولت اور حاجی صاحب کی محنت صوبہ کے ہر ہر ضلع میں مسلم لیگ کا اکھاڑا قائم کردیگی تاکہ آنے والے انتخابات کے موقع پر ان اکھاڑوں کے پہلوانوں سے رائے دہندگان کو مرعوب کرنے میں پوری پوری مدد ملے۔ اور نواب صاحبان کے خوان نعمت کی ذلہ ربائی کرنے والوں کی معقول جماعت کونسل میں پہونچ کر اپنے ولی نعمتوں کی وزارتوں کے ثبات و استحکام کا ذریعہ بنے۔

حاجی صاحب کے متعلق راویان معتبر کا بیان ہے کہ اُن خدماتِ عظمیہ کے معاوضہ میں جو انھوں نے ترک موالات کے دور میں صوبہ متحدہ کی مجلس خلافت کے معتمد ہونے کی حیثیت سے انجام دی تھیں اور جن کے بار احسان سے مسلمان کبھی سبکدوش نہیں ہوسکتے ایک انصاف پسند اور منصف مزاج فرنگی نے سفارش کی تھی کہ حاجی صاحب نے اپنے پیشۂ وکالت کو قوم پر جس طرح قربان کیا ہے اُسکے صلہ میں ہائیکورٹ کی ججی سے اُنکو سرفراز کرنا چاہیے۔ افسوس ہے کہ کسی سبب سے اب تک اس سفارش پر عمل نہیں ہوسکا، ورنہ حاجی صاحب اس دردِ سر میں مبتلا ہونے سے بچ جاتے۔ خدا کرے نوزائیدہ مسلم لیگ کی خدمت اُنکے لیے زیادہ بارور ہو۔

صوبہ متحدہ میں مسلمانوں کی آبادی ۱۵ فیصدی سے بھی کم اور نیابتی اداروں میں نمائندگی لیگ کانگریس کے ۱۹۱۶ء والے سمجھوتے کی بنا پر ۳۰ فیصدی ہے۔ ایک طرف یہ عددی اور نیابتی اقلیت ہے اور دوسری طرف یہ عافیت و اطمینان کہ نہ کوئی صوبجاتی سیاسی تنظیم ہے نہ ضلعوار۔ سب کچھ اور سمجھ رہے ہیں کہ گزشتہ ۲۰ سال کے اندر بورڈوں اور کونسلوں کا اقتدار کسقدر بڑھ گیا اور ان اداروں کا اثر شخصی اور جماعتی زندگی پر کس کس رنگ میں پڑ رہا ہے، اور اس سے بھی غالباً بیخبر نہیں کہ اب جو نیا قانون برطانوی حکومت بنا رہی ہے اُسکے نفاذ کے بعد ان نیابتی اداروں کی قوت میں کتنا اضافہ ہو جائیگا، مگر انگریزوں کی پشت پناہی اور سرکاری افسروں کے عدل و انصاف پر شاید خدا کی رزاقی اور قہاری سے بھی زائد اعتماد ہے کہ سب ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں — عام مسلمانوں کی بےحسی خصوصاً پڑھے لکھے متوسط طبقہ کے لوگوں کی بے پروائی کا یہ نتیجہ ہے کہ مسلمانوں کی سیاست چند رئیسوں اور اُنکے خوشامدیوں کے ہاتھوں کا کھلونا بنی ہوئی ہے، جنکی پُرعشرت زندگی کا شخصی ترفع اور ذاتی سربلندی کے سوا کوئی دوسرا مطمح نظر ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ حال جیسا کچھ شاندار ہے مستقبل کا قیاس اُسی پر کیا جائے تو ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آئے گا۔

دو میرزا

(ایک آیاتِ وجدانی کا مصنف دوسرا اُس کا مفسّر)

بانگِ قلم دریں شبِ تار — بس معنیِ خفتہ کردہ بیدار
دروازۂ صبح بر رُخم باز — کلکم ز شگافت بہ دو انداز (فیضی)

(۱)

گزشتہ نصف صدی میں اُردو اپنے ارتقا کے جن دشوار گزار منازل سے گزری ہے، اُنھوں نے اپنا اثر زبان اور ادب دونوں پر نہایت گہرا چھوڑا ہے۔ تحریر و تقریر، نظم و نثر، تاریخ اور تذکرے، افسانے اور داستانیں، غرض تمام اصناف میں نمایاں تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ کل جن اشعار پر محفلیں سر دھنتی تھیں آج وہ سننے کے قابل بھی نہیں سمجھے جاتے۔ جس نثر پر ہمارے بزرگ جان دیتے تھے ہم اسے بے معنی اور فرسودہ کہکر پھینک دیتے ہیں۔ جو داستانیں "دربارِ عالم" میں دلچسپی کی نظروں سے دیکھی جاتی تھیں وہ موجودہ مہذب طبقے میں "قصۂ پارینہ" اور "عرضِ فضول" سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں۔ کل غالبؔ کی زبان سے "انتظارِ ساغر کھینچ" کا نغمہ سُن کر محافل کے سامعین تیوریاں چڑھا لیتے تھے، آج اقبالؔ کے لبوں سے "سجدے تڑپ رہے ہیں" کا ترانہ سُن کر انھیں محفلوں میں غلغلہ برپا ہو جاتا ہے۔ نصف صدی پیشتر جن نقادوں کو ترنم کی قافیہ پیمائی گراں گزرتی تھی، جنگِ عظیم کے بعد انہی کے طبقہ کے نقاد "غازی پوری" اور "فتحپوری" کی "غوغائے سکوت" والی اُردو کی داد دیتے ہیں۔ غرضکہ ادب و زبان کے ہر شعبہ میں نظم و نثر کی ہر صنف میں "ادبِ لطیف" کا دور دورہ ہے، حالی کا ترانہ سنج بانگِ دہل پکارتا ہے "فطرتِ برہنہ تیرے نورانی آئینوں میں" اور کوئی زبان نہیں پاتا۔ ماضی کے نغمہ سرائے "کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا" پہ ہر طرف سے صدائے احتجاج بلند ہوتی تھی۔ کل آتشؔ کے "حباب کے جو برابر کبھی حباب آیا" اور داغؔ کے "مٹی کی بھی ملے تو روا ہے شباب میں" پر ہندوستان کے جن کونوں سے اعتراض کی پے در پے آوازیں آتی تھیں آج وہی چاروں کونے نظم طباطبائی مرحوم کے "پریشاں بانسہ کر چھوڑا دوپٹہ اوڑھ کر گرما" پر تحسین و آفریں کے نعرے لگاتے ہیں۔ اُردو پراکرت کی زائیدہ نہیں ہے عربی فارسی

کی یہ دردناک داستان مشرق کی زبان نہیں ہے مغرب کی گفتگو ہے

ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا

کبھی کبھی لوگ مجھ پر الزام لگاتے ہیں کہ میں قدامت پسند ہوں، لیکن میں نے کبھی دنیا کی بڑھتی ہوئی تہذیب اور اس کے ترقی پذیر تمدن کی مخالفت میں ایک لفظ نہیں کہا، میری زبان سے کسی وقت بھی یہ نہیں نکلا کہ فرسودہ رسم و رواج پارینہ ذہنیت و خیالات کے پابند رہو۔ میرے قلم نے کسی حالت میں بھی یہ نہیں لکھا کہ موجودہ تہذیب و تمدن، حال کے انکشافات و ایجادات سے کنارہ کشی کرو۔ میں نے جو کچھ کہا یہی کہ اندھی تقلید نہ کرو، کسی چیز کو اختیار کرو تو سوچ کر، سمجھ کر، دیکھ بھال کے، اس کے خوب و زشت پر غور کر کے، اس کے حسن و قبح کو جانچ کر، اس کے محاسن و معائب پر نظر کر کے۔ جب کبھی لکھا یہی کہ مشرق اپنی انفرادیت کو زائل کیے دے رہا ہے، اپنی خصوصیات کو کھوئے دے رہا ہے، اپنی روایات کو مٹائے دے رہا ہے، کہ جو مغربی صفات کے پردے میں ہیں عیوب، چار اچھی باتوں کی آڑ میں آٹھ بُرے سبق، ایک زرق برق تہذیب کے دھوکے میں وہ قابلِ ملامت حرکات اختیار کر رہے ہیں۔ مشرق اچھائیوں کا گھر نہیں رہا ہے لیکن برائیوں کی بستی ہونا بھی لازم نہیں، مغرب محاسن کا مرکز سہی لیکن معائب سے خالی وہ بھی نہیں ہے۔ اسی ذہنیت نے نہ صرف ہند بلکہ مشرق کے تمام ممالک، بحیرۂ قلزم سے اس طرف کے تمام بلاد کو قعرِ مذلت میں ڈال رکھا ہے۔ معاشرت ناکمل، اخلاق ناپسندیدہ، طرزِ زندگی ناہموار، نیکی سے کوسوں دور، حمیت سے بالکل بیگانہ، مذہب سے یک لخت معرّا۔ یہ ہے موجودہ مشرق کی حالت۔

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں

ہندوستان مشرقی ممالک میں اپنی چند خصوصیات کی بنا پر سب سے بدتر ہے۔ کورانہ تقلید کی صلاحیت، نقش و بے حمیتی کی اہلیت، خوشامد و تملق کی قابلیت جتنی اس ملک کے باشندوں میں ہے شاید ہی کہیں اور ملے۔ دنیا بھی عجیب و غریب جگہ ہے، اس نے عروج و زوال کے ہزاروں منظر دیکھے ہیں، اس نے بڑی بڑی سلطنتیں بنتے بگڑتی دیکھی ہیں، تلک الایام نداولہا، بادشاہتیں بگڑیں، اس نے مسلمانوں کا وہ زمانہ دیکھا ہے جب اسپین سے ہند تک اور فرانس سے چین تک دنیا اذانوں کی آواز سے گونجتی تھی، جب اللہ اکبر کے نعروں سے سمندروں میں تہلکے پڑ جاتے تھے، جب فوجوں کے قدموں کے شور سے پہاڑوں میں زلزلے آ جاتے تھے، جب مسلمان نام تھا صداقت کا، حریت کا، ایمان کا، خدا پرستی کا —— وہی دنیا آج یہ حال دیکھ رہی ہے کہ مراکش سے لنکا تک، انگلستان سے جاپان تک ایک چپہ زمین ایسی نہیں

ہے جہاں اسلام کا بول بالا ہو۔ آج مسلمان نام ہے تمام عیبوں کے مجموعہ کا، تمام برائیوں کے مخزن کا، تمام خرابیوں کے پتلے کا،

کم ہوتے ہیں زمانہ میں ایسے بھی انقلاب

ایک چیز ہو تو شکایت کی جائے، ایک دکھ ہو تو رو دیا جائے، ایک زخم ہو تو علاج کیا جائے۔ اپنے اسلاف سے انھیں دشمنی، اپنے بزرگوں کے یہ درپے آزار، اپنے علماء کے یہ منکر، اپنے نگاروں سے انھیں عداوت، اپنے شعراء سے انھیں بغض، بس شہرت اور دولت کی دھن ہے، کون سی شہرت؟ جھوٹے موتیوں کی سی شہرت، جس میں نہ آب نہ تاب، سراپا نام و نشان، جو دھوکا ہی دھوکا ہے۔ کس قسم کی دولت، حباب کی سی دولت، جو پلک اٹھتے ہی ہوا ہو جائے، خواب کی سی دولت جو آنکھ کھولنے میں غائب ہو جائے۔ نمود، جو دوسروں کی عزت پر بیجا حملہ کر کے حاصل کی جاتی ہے، نام، جو اوروں کی شخصیت پر اتہام لگا کر پیدا کیا جاتا ہے۔ نشان، جو دیانت، راستبازی، صاف گوئی، ایمان کو بیچ کر خریدا جاتا ہے۔ یہ سودا ہے جو اسے حاصل ہے جسے جانتے ہیں کہ پا نہیں سکتے

ڈھونڈنے اس کو چلا ہوں جسے پا بھی نہ سکوں

یہ جنون ہے کہ ان مسائل کی تحقیق کریں جنھیں سمجھتے ہیں کہ نہیں سمجھ سکتے، یہ خبط ہے کہ ان لوگوں میں شامل ہوں جن سے جانتے ہیں کہ احتراز کرنا چاہیے۔ اور اس اضطراب نے اس حد تک ترقی کی کہ مشرق کے ممتاز ترین شعراء حافظ و غالب پر گستاخ چھینٹیاں کی گئیں، ادب کے سرتاج سرور و آزاد کی ہتک کی گئی، ان پر غلط الزامات عائد کیے گئے۔ اور یہ سب کس لیے۔ صحیح اعتراض کی خاطر نہیں بے لوث تنقید کی نیت سے نہیں، بے لاگ اظہار رائے کے خیال سے نہیں، نام و نمود کے لیے پروپیگنڈا کی خاطر، شہرت کے واسطے، غرض کوئی رکیک حرکت نہیں چھوڑی جو حصول مدعا کے لیے عمل میں لائی گئی ہو۔ ان تمام کو معائب کہیے یا محاسن، عیوب کہیے یا صفات، سب پر پردہ ڈالنے والی، غلط بیانیوں اور غلط گوئیوں کا مجموعہ، شیخیوں اور مغالطوں کا مرقع، رکیک چھینٹیوں اور عیب بینیوں کا موضوعہ

آیاتِ وجدانی ہے

جو ایک میرزا کی تصنیف ہے اور دوسرے میرزا کی تالیف۔ ایک میرزا کی مدح ہے اور دوسرے میرزا کی مداحی۔ ایک میرزا کی تخیل نگاری ہے اور دوسرے میرزا کی تحسین نوازی۔

آپ کہتے ہیں کہ کیا خوب کہا ہے واللہ

میں یہ کہتا ہوں کہ آئینہ اب سجا لاتا ہوں۔

(۲)

فلسفیوں نے انسانی ذہانت کے تین درجے مقرر کیے ہیں ——— پہلے درجے سے وہ لوگ تعلق رکھتے ہیں جو اپنی فطری استعداد و ذکاوت کی وجہ سے ہر شعبۂ حیات میں جدت طرازی کر سکتے ہیں۔ دوسرا درجہ اُن لوگوں سے متعلق ہے جو پہلے درجہ کے اشخاص کی جدت طرازی سے مستفید ہونے کی اہلیت رکھتے ہیں، تیسرے درجہ میں وہ لوگ آتے ہیں جن میں نہ جدت طرازی کی اہلیت ہے، نہ دوسروں کی جدت طرازی سے مستفید ہونے کی صلاحیت ——— پہلی صنف بہترین ہے اور کمیاب، کیونکہ وہ موجد طبقہ ہے، دوسری صنف قابلِ تحسین ہے کہ اس میں مقلد بننے کی صلاحیت ہے، تیسری صنف نہ تو موجد، نہ محرک ہے نہ مقلد اور مؤید، نہ اس میں فطری ذکاوت ہے نہ محصلہ ذہانت، جو اپنے وجود اور قیام کے لیے پہلے دو صنف کی دست نگر ہے اور انھیں کی دشمن۔

میرے خیال میں ان تینوں کے سوا ایک اور طبقہ بھی ہے جس کی بابت شاید فلسفیوں سے فروگذاشت ہو گئی، وہ طبقہ جس میں مذکورہ بالا تینوں طبقوں کی خصوصیات اجتماعی حیثیت سے پائی جاتی ہیں ——— اور اس طبقہ کے ایک فرد کا نام میرزا واجد حسین یاس عظیم آبادی یگانہ لکھنوی اور دوسرے کا میرزا مراد بیگ شیرازی۔

میرزا مراد بیگ شیرازی بہ زعم خود تنقید کے پیغمبر ہیں، نہایت صحیح، بے لوث اور بے لاگ تنقید کرنے والے، ان کی تنقید میں جھوٹی تعریف کا نام نہیں ہوتا، نہ چشم پوشی عیوب کا شائبہ نہیں ہوتا۔ ان کے معلومات فلسفہ میں، منطق میں، اخلاقیات میں، ادب میں اتنے وسیع ہیں کہ ان کی تنقیدیں علوم کی بوقلمونی اور فنون کی گوناگونی کا مرقع ہوتی ہیں، ان کا علم بے پناہ ہے، ان کی قابلیت بے تھاہ ہے، مثال کے طور پر لیجیے انھیں یہ معلوم ہے کہ "سوائے آتش ہے کون ہمزباں اپنا" میں دوسرے رکن پر تسکین اوسط کا زحاف واقع ہوا ہے اس وجہ سے اس مصرعہ کی تقطیع مفاعلن، فعلاتن، مفاعلن، فعلن کے بجائے مفاعلن، مفعولن، مفاعلن فعلن سے ہوگی ——— انھیں اس کا علم ہے کہ غالب کو شاعری کی زبان نہیں ملی تھی، جیسے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں جو کچھ کہہ سکتا تھا کہہ گیا ——— ان کی معلومات میں یہ داخل ہے کہ میرزا یگانہ "پہلو نشین شکور" اور بالا نشین غالب ہیں کہ بیسویں صدی کے ربع اول تک ہند نے صرف تین سخنور علی الاطلاق پیدا کیے، یگانہ، اکبر، شکور ——— وہ یہ جانتے ہیں کہ یگانہ کے تمام اشعار میں سے کسی ایک کا بھی جواب دنیا کے کسی شاعر کے کلام سے، خواہ وہ کسی ملک اور کسی زبان کا ہو، نہیں مل سکتا۔

میرزا یگانہ، جیسا کہ ان کے تخلص سے ظاہر ہے، فن شعر کے تمام نکتوں، ادب کی سب باریکیوں،

زبان کے جمیع محاسن سے واقف ہیں۔ ان کو مشرقی علوم میں یدطولیٰ حاصل ہے، مغربی علوم میں اُستادانہ دخل ہے، حقائق و رموز فطرت انسانی پر کامل دسترس ہے۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ان کی شہرت سطح ہند پر پانی کی لہر کے مانند پھیل گئی ہے۔ چونکہ میرزا مراد بیگ شیرازی مداح ہیں اور میرزا یگانہ ممدوح اس لیے میرزا یگانہ کو وہ سب کچھ معلوم ہے جس کا میرزا مراد بیگ شیرازی کو علم ہے، نیز اسکے علاوہ بہت کچھ معلومات ہیں جس سے ان کے بحر کمال کو نہ صرف میرزا مراد بیگ شیرازی کے دریائے علم سے وسیع تر بنا دیا ہے بلکہ اسے اتنی وسعت دے دی ہے کہ ایک کنارے سے دوسرا کنارہ نظر آنا تو درکنار مخالف ساحل کہیں ملتا ہی نہیں (سکندر نے ہزار دقتوں کا سامنا کیا کہ سمندر کی تھاہ معلوم کرے لیکن ناکام رہا، کاش اسوقت زندہ ہوتا تو علم کے اس بحر بے پایاں کا عرض معلوم کرنے کی کوشش کرتا) اس لیے میرزا یگانہ کے علم و فن کا ذکر ہی فضول ہے، مختصراً اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ انھیں معلوم ہے، کہ "منشی فاضل کی سند حاصل کر لینا دوسری بات ہے اور شعر و سخن پر محاکمہ کرنا اہل الرائے کا منصب ہے" ان کے ہاتھ میں ادبی فضا کی نبض ہے جس کی ہر حرکت سے، جس کی ہر چال سے، ہر تڑپ سے، وہ ملک کی ذہنیت، ملک کے ذوق شعری، ملک کے جذبۂ شاعر پرستی پر نہایت صحت کے ساتھ رائے زنی کر سکتے ہیں اور جب جی چاہتا ہے کہہ دیتے ہیں:-

"مژدہ باد اے اہل دل غالب پرستی ہو چکی — شورشِ شعرِ یگانہ آج ہر محفل میں ہے"

الٰہیات اور روحانیات پر انھیں کامل عبور ہے اور ان کی فطرت، ان کی طبیعت اتنی صداقت گو، اتنی راستباز واقع ہوئی ہے کہ وہ اپنے اس لا انتہا علم کے راز کو چھپاتے نہیں بلکہ اس کا اعلان کرتے ہیں۔ وہ صاف صاف کہتے ہیں اور ڈنکے کی چوٹ کہلواتے ہیں کہ ان کا شعر

حسنِ فطرت بولتا ہے پردۂ اسرار میں — معنی بے لفظ پنہاں ہیں زبانِ خار میں

عالم بالا میں فرشتے ورد کرتے ہیں۔ انھوں نے ایک نئی منطق دریافت کی ہے جسکے ایک اصول کی بنا پر تو یہ جائز ہے کہ اگر کوئی غالب کو ان پر ترجیح دے تو وہ غالب کی تنقیص کریں، اسے گالیاں دیں، اسکے کلام کی صوری اور معنوی خوبیوں سے آنکھ بند کر لیں، دوسرے اصول کے تحت یہ عین صواب ہے کہ خود پرستی و خودنمائی اس حد تک کی جائے کہ وہ عزازیل کے تکبر، شداد کی فرعونیت، اور نمرود کے غرور سے بڑھ جائے، خودستائی اس درجہ کی جائے کہ لوگ نیرو کو بھول جائیں، نپولین کو فراموش کر دیں

آج ہم ہیں زمیں سے آسماں تک

اور پھر اس کا دعوے کیا جائے کہ خودستائی ایک فرض ہے، ایک تبلیغ ہے، خود پرستی ایک ضرورت ہے

ایک حاجت ہے جو نبیوں نے بھی انجام دی اور ولیوں نے بھی، جو اماموں کی جانب سے بھی عمل میں آئی اور فقیروں کی طرف سے بھی،

درازدستیِ ایں کوتہ آستیناں بیں

(۳)

ہر کتاب کی اشاعت کا کوئی مقصد ضرور ہوتا ہے۔ بغیر کسی سبب کے، بلا کسی مطمح نظر کے، ایک صفحہ بھی نہیں لکھا جاتا "آیاتِ وجدانی" کو شروع کیجیے مشکل سے دو چار صفحے پڑھیے گا کہ طبیعت منغض ہونا شروع ہو جائیگی، ابھی وسط تک آپ نہیں پہنچیں گے کہ مصنف اور مولف دونوں کی ذہنیت پر آپ کو ہنسی آنے لگے گی اور کتاب ختم کرتے کرتے آپ یہ نتیجہ اخذ کرلیں گے کہ اس کتاب کے تین کھلے کھلے مقاصد ہیں اور تینوں لائق طعن، قابل تشنیع، بجا طور پر لایق ملامت، صحیح اصول پر قابل نفرت —— ایسے مقاصد جن کی بنا پر حاجت ہے کہ اس کتاب کے ایک ایک حرف سے تعرض کیا جائے، ایک ایک لفظ کی اصلیت کھول دی جائے، ایک ایک جملے کی دھجیاں اُڑادی جائیں، ایک ایک سطر کے تار و پود بکھیر کر رکھ دیے جائیں —— اصولی غلطیاں ایک طرف، واقعات کی غلط بیانی علیحدہ —— زبان کے اغلاط سے کتاب بھری پڑی ہے، صرف ایسی غلطیوں کی وضاحت کے لیے ایک دفتر درکار ہے، نمونے کے طور پر چند خامیاں ملاحظہ کرکے آپ اندازہ لگالیں گے کہ اس کتاب کی اشاعت و طباعت کے ذمہ دار کس لیاقت کے لوگ ہیں۔

زبان اُردو نے گزشتہ چند سال میں جو حیرت انگیز ترقی کی ہے وہ اس زبان کو مکمل اور دوسری زبانوں کے "بارِ احسان" سے آزاد کرنے کے لیے کافی نہ سہی لیکن ایسی ضرور ہے کہ اب یہ کمزوری کہ اُردو عبارت میں جا بجا، جا و بیجا، انگریزی اور دوسری غیر زبانوں کے الفاظ کو داخل کرکے عبارت کو نہ اُردو رکھا جائے نہ انگریزی یقیناً دُور کی جا سکتی ہے، اس میں شک نہیں کہ اُردو اب بھی ذخیرۂ الفاظ کے اعتبار سے اتنی غریب ہے کہ ٹھیٹھ اُردو کے الفاظ مغربی خیالات کے حامل نہیں ہو سکتے،

گیسوئے اُردو ابھی منت پذیرِ شانہ ہے

مگر فن مترجمی نے اس قلیل عرصہ میں جو رتبہ حاصل کیا ہے اُسے دیکھتے ہوئے غیر زبانوں کے الفاظ کا مترادف اُردو ترجمہ عبارت میں لکھنا نہ صرف زیادہ مستقل اور مستحسن ہے بلکہ مستند بھی —— میرزا امراد نے جن تیوروں سے اس کتاب کو شایع کیا ہے اُس سے تو یہ گمان ہوتا ہے کہ اُن کا وسیع علم، انکا عمیق مطالعہ اس کتاب کو کیا عبارت، کیا زورِ تحریر، کیا پذیرائی مسائل و دلائل میں اول سے آخر تک، ابتدا سے انتہا تک، آغاز

ے انجام تک، اسی ڈھنگ سے پہونچائے گا اور کسی کو کہیں حرف رکھنے کی گنجائش نہ ہوگی لیکن جوں جوں کتاب کے ورق اُلٹتے جایئے پتہ چلتا جاتا ہے کہ

برباد کر رہا ہوں متاعِ ہنر کو میں

ہر ہر قدم پر انگریزی الفاظ، انگریزی محاورات، انگریزی عبارت، کی اتنی بھرمار ہے کہ دیکھنے والا شش و پنج میں پڑ جاتا ہے کہ یہ کتاب دراصل اردو میں لکھی گئی ہے یا انگریزی میں —— پھر اگر انگریزی کے استعمال کا ایسا ہی شوق تھا تو کیا یہ ممکن نہ تھا کہ ہر انگریزی لفظ سے پیشتر، ہر انگریزی محاورے کے پہلے، اسکا اردو ترجمہ بھی لکھ دیا جاتا تاکہ غیر انگریزی داں طبقہ کو عبارت کے معانی و مطالب سمجھنے میں دقت نہ ہوتی لیکن عمل نہ صرف اسکے بالکل برعکس ہے بلکہ انگریزی الفاظ کا استعمال اُن مقامات پر بھی کیا گیا ہے جہاں آسانی سے اردو کا ساتھ کا لفظ مل سکتا تھا۔

صفحہ ۱۴۲ سطر ۹ فلاسفی استعمال کیا ہے دراںحالیکہ فلسفہ موجود ہے

صفحہ ۴۲ سطر ۱۵ اسپرٹ استعمال کیا ہے دراںحالیکہ روح اور جذبہ دونوں موجود تھے

صفحہ ۵۴ سطر ۹ جنرل بجائے عام کے استعمال کیا گیا ہے

صفحہ ۹۱ سطر ۱ کانشنس کے بدلے ضمیر کا لفظ استعمال ہو سکتا تھا

صفحہ ۱۴۷ سطر ۸ ماسٹر پیس کی جگہ شاہکار لکھا جا سکتا تھا

یہ ہیں چند نظیریں اُن الفاظ کی جن کے بجائے بالکل ہم معنی اردو کے الفاظ بلا کسی کوشش و کاوش کے مل سکتے تھے۔ ان کے سوا تمام کتاب میں متعدد جگہ انگریزی الفاظ مثل Irony, Ideal Originality وغیرہ کے استعمال کیے گئے ہیں جن کے اردو مرادف کی طرف کتاب بھر میں کہیں بھی اشارہ نہیں ہے۔

یہ تو ایک ایسا سامنے کا نقص ہے جس پر ہر شخص کی نظر فوراً پڑیگی اور جو کسی باخبر اور فہمیدہ اردو داں کی تحریر میں نہ ملیگا۔ اسکے علاوہ میرزا ئے شیرازی نے اکثر موقعوں پر ایسی رکیک اور متانت سے گری ہوئی عبارت لکھی ہے جو کسی مہذب اور سنجیدہ انسان کو کسی حالت میں نہ لکھنا چاہیے، آخر تہذیب ادب متانت بھی تو کوئی شے ہے۔

صفحہ ۳۱ سطر ۸ "جو آگ کھاؤگے تو انگارے ......"

صفحہ ۳۲ سطر ۹ "ملاے لکھنؤ کی جوتیوں کو کیا غرض پڑی تھی"

صفحہ ۴۳ سطر ۳ "کبڈی مارتا ہوا کے مینے یا لندن پہونچ جائے"

صفحہ ۱۲۵ سطر ۳ "غالب کے پنڈت تو ہر طرف چھوٹے ہوئے ہیں"

کیا یہ جملے کسی مہذب اُردو نویس، کسی متین مضمون نگار کے قلم سے نکل سکتے ہیں اور یہ صرف "مشتے نمونہ از خروارے" ہیں۔ کتاب میں جگہ جگہ ہماہا غلطیاں ہیں جن میں سے بعض کو تو کھینچ تان کر کتابت کے نقائص میں شامل کیا جا سکتا ہے گو اس میں مجھے بہت کلام ہے کیونکہ پوری کتاب سے میرزا صاحب کے علم و فہم کا پتہ چل رہا ہے

اپنے پہ اعتماد ہے غیر کو آزمائے کیوں

صفحہ ۲۷ سطر ۷ "مگر لکھنؤ میں ایک کمرے پر سائل دہلوی کی زبان سے اچانک ایک ایسا لفظ نکل گیا تھا" الفاظ "کمرے پر" میں جو رکیک اور ذم کا پہلو ہے اُسے ہر شخص بآسانی سمجھ سکتا ہے۔

صفحہ ۴۸ سطر ۹ "ورنہ میرزا صاحب کے طرز زندگی پر غور کی جائے"

کیوں جناب میرزا امراد صاحب، یہ غور مونث کب سے ہو گیا۔ کیا اب الفاظ میں بھی آپ کے یہاں عمل جراحی سے تبدیل صنف کی جا سکتی ہے، جہاں تک مجھے علم ہے غور دلی، لکھنؤ کہیں بھی مونث نہیں بولا جاتا، پھر مذکورہ بالا جملہ کانوں کو کسقدر گراں گزرتا ہے۔ کاش میرزا امراد صاحب کے کانوں میں یہ صلاحیت ہوتی کہ وہ "سماعت پر گرانی" کا اندازہ کر سکتے۔

صفحہ ۷۶ سطر ۱۵ "گر وائے بر حال میرزا یگانہ کے"

اس جملے کی داد تو بجز میرزا امراد کے اور کوئی شاید دے سکے، اگر کسی کی طرف سے اسکا امکان ہے تو وہ میرزا یگانہ ہیں

صفحہ ۲۳۱ سطر ۱۲ "کیا براہ کرم ٹیگور اور غالب کا مطالعہ کرنے والے میرزا یگانہ کے ان اشعار کے مقابلے میں ایسے ہی کمل نمونے پیش کر سکتے ہیں" —— اس جگہ براہ کرم کے ساتھ پیش کر سکتے ہیں کا استعمال کس قدر صحیح ہوا ہے۔ واقعہ تو یہ ہے کہ میرزا امراد بیگ نثر نویسی میں اسی طرح یکتا ہے روزگار ہیں جس طرح میرزا یگانہ شعر گوئی میں۔

یہ تھے چند نمونے میرزا امراد بیگ شیرازی کے زور قلم کے؛ آپ انکو دیکھکر بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ جناب میرزا صاحب کس پایہ کی اُردو لکھتے ہیں۔

اسکے علاوہ یہ غلطی کہ کہیں مخاطب آپ سے کیا گیا ہے اور کہیں تم سے، تو بہت عام کیا کتاب میں موجود ہے، کہیں میرزا صاحب نے اپنے لیے ہم استعمال کیا ہے کہیں میں، اہل زبان اور اہل قلم کے لیے یہ امر جس قدر معیوب ہے وہ سب ارباب ذوق اور اصحاب نظر پر خوب واضح ہے۔ مثال کے لیے میں صرف ایک نمونہ پیش کرتا ہوں۔

بنام خداوند جاں آفریں

الناظر

ماہ اگست ۱۹۳۵ء

جلد ۴۰ نمبر ۲

رہائی بنی اسرائیل

بابل کی قدیم کلدانی سلطنت کا جلیل القدر بادشاہ۔ یروشلیم کا فاتح۔ فرزندان یعقوب کو غلام بنانیوالا۔
بخت نصر ۵۶۲ قبل مسیح میں دنیا سے رخصت ہوا۔ اُس نے سرکشوں اور مغروروں کو زیر کیا۔ مفتوحہ ممالک
کی دولت سے اپنے دارالحکومت کی شان بڑھائی۔ اسرائیلیوں کو تاج و تخت سے محروم کیا۔ اُنکے بادشاہ
کو زندان بلا میں محبوس کیا۔ حکیموں۔ عالموں۔ نبیوں کی اولاد سے خدمت اور مشقت لی لیکن از منہ مظلمہ
کی خونخواری اور سفاکی دیکھتے اُس کا سلوک اپنی رعایا کے ساتھ چنداں خراب نہ تھا۔ لڑائی کے میدان
۔ شہروں اور قلعوں کے محاصرے میں۔ فتحمندی کے جوش نے اُس کو قتل و غارت کا ملزم بنایا
لیکن امن و صلح کے وقت اُسکا طرز عمل اپنے زیردستوں کے ساتھ قابل ملامت نہ تھا۔

اسرائیلی قیدی اپنے عزیز وطن سے گرفتار کر کے بابل لائے گئے اور عراق کے وسیع ملک میں
مختلف مقامات پر آباد کیے گئے مگر اُنکے اسباب معیشت اور سامان خوراک سے بادشاہ بے خبر نہ تھا۔
فوجی خدمت کے وہ لایق نہ تھے مگر اور سب ذرایع معاش اُنکے لیے کھلے تھے۔ اُن کے منتخب نوجوان
اعلیٰ ملکی عہدوں پر تعینات کیے گئے۔ حکیم دانیال تمام سلطنت کے قاضی القضاۃ تھے اور اسرائیلی
غلاموں کو اپنے مذہبی فرائض ادا کرنے کی ممانعت نہ تھی۔

بخت نصر کا لڑکا عامل مردک اپنے اقبالمند باپ کی جگہ تخت نشین ہوا تو اُس نے بھی یہودیوں کے

قدر و منزلت میں کوتاہی نہیں کی۔ اُنکے مراتب و مناصب بحال رکھے بلکہ اسرائیلیوں کے بدنصیب بادشاہ یہویکین کو جو ۳۷ برس سے جیلخانے کے مصائب برداشت کر رہا تھا محبس سے نکال کر اپنی مجلس خاص میں طعام و شراب کا شریک بنایا۔ اُس کو دربار میں سب مغلوب حکمرانوں سے بلندتر کرسی عنایت کی خلعت و منصب سے سرافراز کیا۔ اور اس طرح فاتح و مفتوح کے درمیان رنجش کی آخری کڑی کاٹ دی۔

شجاع اور بلندہمت باپ کا بیٹا۔ جفاکشی و مردانگی میں نمونۂ اسلاف نہ تھا۔ وہ فوجی زندگی کی سختیاں برداشت نہ کر سکتا تھا۔ عیش و عشرت میں مصروف رہا اور توسیع مملکت کی طرف توجہ نہ کی۔ صرف دو سال حکومت کی تھی کہ اُسکے بہنوئی ترگلیسر نے موقع پاکر عالم غفلت میں اُسکو قتل کر دیا اور زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔ ۵۵۶ قبل مسیح میں یہ قاتل بھی مقتول کے پاس پہونچا اور اُس کا لڑکا لباشی مردوک جانشین ہوا مگر ایک بابلی سردار نبونڈس نے اولادِ بخت نصر کی حمایت کے لیے علم بغاوت بلند کیا۔ نرگلیسر کا لڑکا نو مہینے حکومت کرکے قتل ہوا اور نبونڈس ایک نابالغ لڑکے بلشیزر نام کو شریک سلطنت بنا کر بابل کا بادشاہ بنا۔

مشتبہ ہے کہ بلشیزر بخت نصر کا بیٹا تھا یا نواسہ؟ عہد نامۂ عتیق کی عظمت کرنیوالے اُسکو بخت نصر کا لڑکا بتاتے ہیں، اور آزاد خیال مسیحی اُسکو بخت نصر کا نواسہ لکھتے ہیں لیکن زمانۂ حال کے محققین کو اُس کی بادشاہی کا یقین نہیں۔ وہ نبونڈس کو بابل کا آخری فرماں روا قرار دیتے ہیں اور ثبوت میں چند کتبے پیش کرتے ہیں جو حال میں عراق کے کھنڈروں سے برآمد ہوے ہیں اور جن سے کلدانیوں کی سلطنت کا نبونڈس پر ختم ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ وہ تسلیم کرتے ہیں کہ نبونڈس کے فرزند کا نام بلشیزر تھا لیکن مدعی ہیں کہ اُس نے زمام حکومت کبھی ہاتھ میں نہیں لی۔

صحیفۂ دانیال میں بلشیزر کا نام کئی جگہ آیا ہے اور نبونڈس کا کہیں تذکرہ نہیں۔ ظاہرا بابل کی رعایا بلشیزر کو سلطنت بخت نصر کا حقیقی وارث اور اپنا جائز بادشاہ مانتی تھی، اور نبونڈس کی وقعت غاصب سے زیادہ نہ تھی۔ ممکن ہے کہ نبونڈس نے حکومت پر متصرف ہوکر بلشیزر کو عیش و عشرت میں پھنسا دیا ہو۔ اور خود تمام نظم و نسق کا مختار بنا ہو جیسا کہ یوروپ اور ایشیا کے بہت سے غاصبوں نے کیا ہے اور اس وجہ سے کتبے میں بلشیزر کا نام کندہ نہ ہو سکا ہو۔ ان روایات کی تطبیق یوں بھی ہو سکتی ہے کہ نبونڈس کی بغاوت کے وقت بلشیزر نابالغ تھا اور انتظام سلطنت بطور ولی اور سرپرست کے ایک مدت تک نبونڈس کے ہاتھ رہا۔ جب وہ بالغ ہوا اور امور ریاست میں دخل دینے لگا تو رعایا اُسی کو شاہ بااختیار تصور کرنے لگی اور اسرائیلی اپنے مخطوطات میں بلشیزر

ہی کو بادشاہ لکھنے لگے اگرچہ نبونڈس ملک پر بدستور حاوی تھا مگر اس دور کو تین ہی برس گزرے تھے (اور یہودیوں کی روایات کے مطابق بلشیزر نے تین ہی سال بادشاہی کی تھی) کہ زمانہ بدل گیا۔ نہ نادر بچا نہ نادری۔

بہرحال سترہ برس۔ ۵۵۵ سے ۵۳۸ قبل مسیح تک نبونڈس اور بلشیزر نے کلدانیوں پر حکومت کی اور یہ عہد اسرائیلی قیدیوں کے لیے بہت سختی اور تکلیف کا تھا۔ بابل کی عیاشی پسند آب و ہوا نے اُنکے عادات و اطوار بگاڑ دیے تھے۔ کلدانیوں کی مذموم خصلتیں کنعانیوں میں سرایت کر گئی تھیں۔ فسق و فجور کا بازار گرم تھا۔ احکام شریعت کا کوئی لحاظ نہ تھا۔ مذہبی واقفیت صرف کہن سال ضعیفوں تک محدود تھی اور فرزندان اسرائیل اُن تمام ملاہی اور مناہی میں آلودہ تھے جو دولت کی افراط نے بابلیوں کی سرشت میں داخل کر دی تھیں۔

اس عہد میں اصنام پرستی کا زور بڑھا۔ بادشاہ وقت نے قدیم صنم خانوں کی مرمت کرائی اور بعض جدید عبادت کدے تعمیر کرائے۔ بخت نصر کے فرامین، رواداری فراموش ہوئے مفتوحہ اقوام کی دلجوئی فضول سمجھی گئی۔ اور یہودی غلاموں کے حقوق پامال ہونے لگے۔ چند متبرک ہستیاں ہنوز زندہ تھیں اور وہ ارمیا نبی کی قدیم بشارت یاد دلا کر اپنے اعزہ و اقارب کو تسلی دیتی تھیں کہ "خداوند فرماتا ہے جب ستر برس پورے ہوں گے تو میں شاہ بابل اور اُسکی قوم کو بدکرداری کی سخت سزا دوں گا اور اُنکی بستی کو ویران کر دوں گا کہ ہمیشہ ویران رہے"۔ بنی اسرائیل کو مذہب سے دلچسپی باقی نہ تھی لیکن آزادی کا شوق تھا اور خود مختاری کی ہوس۔ دعائیں مانگتے تھے کہ "خدا شرے برانگیزد کہ خیر ما دراں باشد" اور لطیفۂ غیبی کا انتظار کرتے تھے۔

بابل و نینوا کے شمال میں ایک وسیع اور زرخیز ملک بنی آدم کی قدیم شائستگی اور تمدن کی یادگار تھا۔ مشرق میں رود جیحوں اور دریائے سندھ۔ مغرب میں سرچشمۂ فرات اور بحر اسود۔ شمال میں کوہ البرز اور بحر خزر اُسکے حدود تھے۔ مشہور ہے کہ جہانداری کا سلسلہ ایشیا میں اسی قطعۂ ارض سے شروع ہوا اور کیومرث پہلا شخص تھا جس نے بادشاہی کا لقب اختیار کیا

نخستیں خدیوے کہ کشور کشود — سر پادشاہاں کیومرث بود

قدیم ایرین قوم جس نے ہندوستان فتح کیا اور یورپ تک پہونچی اسی سرزمین سے جلاوطن ہو کر نکلی تھی۔ جمشید جس کا جشن شاہانہ آج تک ضرب المثل ہے اور جو آئین جہانبانی کا مشرق میں موجد خیال

کیا جاتا ہے اسی شادابِ ملک کی پیداوار تھا۔

ہوشنگ کی کشورکشائی - طہمورث کی دیوبندی - فریدون کی دادگستری اسی سرسبز خطے سے تعلق رکھتی تھی - پہلے بلخ اس کا مرکزِ حکومت تھا - بعد ازاں اصطخر کو یہ عزت نصیب ہوئی اور "پیشدادیوں" نے وہ ہیبت و جبروت کی سلطنت کی کہ تمام ایشیا میں کوئی حکومت اُنکی مماثل و مقابل نہ تھی -

طہمورث اور جمشید کی اقبالمندی فراعنۂ مصر اور راجگانِ ہند کو خاطر میں نہ لاتی تھی - شام و عراق کی کیا ہستی تھی کہ وہ ممالکِ محروسہ کی فہرست بے عزت سے شمار کیے جاتے - ضحاک کے مظالم نے رعایا کو بغاوت پر آمادہ کیا - مرکزی حکومت پر زوال آیا اور یہ دُنیا کی جنت شام و بابل کی تابع ہوکر گمنام ہوگئی -

کاوۂ آہنگر کے استقلال - دُرفش کاویانی کے اقبال نے فریدون کو سلطنت دلائی اور سلطنتِ ایران کا نام دوبارہ زندہ ہوا اگر اصطخر میں وہی پولیٹکل غلطی ہوئی جو تین سو برس ہوئے بادشاہ بلی نے کی تھی - آیندہ نزاعات کو دُور کرنے کے لیے فریدوں نے اپنی مملکت فرزندوں میں تقسیم کی - ترکستان کا علاقہ بڑے بیٹے سلم کو دیا - تاتار منجھلے بیٹے تور کو اور جنوب کا کوہستانی قطعہ جس میں دارالسلطنت بھی شامل تھا سب سے چھوٹے بیٹے ایرج کو عنایت کیا - اس تقسیم کا وہی نتیجہ ہوا جو ہندوستان نے سترہویں صدی عیسوی میں دیکھا تھا - بیٹوں نے باپ کی زندگی ہی میں جدال و قتال شروع کیا - ایرج قتل ہوا اور اُسکے فرزند منوچہر نے خونِ پدر کے عوض میں سلم اور تور کو خاک و خون میں غلطاں کرکے اُس خانہ جنگی کا بنیادی پتھر رکھا جو ایران اور توران کے درمیان کئی صدی تک جاری رہی - سلطنت کے اعضا و جوارح منتشر ہوگئے - اغیار نے فائدہ اُٹھایا - مغلوب غالب - زبردست زیردست ہوئے

پراگندہ شد رایِ بےتخت و شاہ ہمہ کار بے روے و بے سر سپاہ

یہ بدامنی - خانہ جنگی اور لامرکزی کا دور ضحاک کے جلوس سے کیقباد اور کاؤس کے وقت تک تقریباً دو ہزار سال رہا - نینوا اور بابل کا عروج ہوا - سارگون اول نے ایلام سے بحیرۂ روم تک تصرف کرلیا نرم سین نے "شاہِ چہار اقطاعِ عالم" کا متکبرانہ خطاب پسند کیا - شالمنسر اول نے دریاۓ فرات کو عبور کرکے بلخ تک دھاوے کیے - ایران و توران بابل کے باجگزار صوبے بنے اور یونان و مصر کے مورخ جمشید و فریدون کی عظمت فراموش کرکے اُنکے وجود کو افسانہ بتانے لگے -

اس طویل طوائف الملوکی کے دور میں بنی اسرائیل نے کنعان پر قبضہ کیا - اُنکے اولوالعزم سلاطین داؤد و سلیمان نے شہرت جاوید پائی - نینوا کے سارگون دوم نے سامرہ فتح کرکے شمالی سلطنت اسرائیل کا خاتمہ کیا - سنحاریب نے یروشلم کا محاصرہ کیا - اور بخت نصر نے کنعان و علاقہ سواحل کو غارت کرکے

ایشیا کے کُل مغربی ممالک کو اپنا باجگزار بنا لیا - ایران کی ریاست کبھی توران کی ماتحت ہوتی کبھی اُس سے کلّہ بکلّہ لڑتی اور کبھی بابل کے بادشاہ سے مقابلہ کے لیے اتحاد کرتی تھی کہ یکایک فارس کی سوئی ہوئی قسمت بیدار ہوئی۔ شاہ توران کا نواسہ اور ایک مقتول ایرانی کا لڑکا کاؤس ایلامی کی مختصر ریاست کا وارث ہوا - ایران کی سرزمین جگمگا اُٹھی اور دنیا تاج کیانی کے اقبال کی قسم کھانے لگی۔

اس بیدار بخت بادشاہ کی ولادت - پرورش - تعلیم اور تربیت کی داستان حیرت انگیز ہے - عالم اسباب کے نقش بر آب پیکروں کو قدرت کی ڈورے گردش دینے والے جس پتلی سے کوئی مہتم بالشان خدمت لینا چاہتے ہیں اُس کی پرورش بھی اکثر انوکھے انداز سے کرتے ہیں!

سیاوش (جس کو یونانی مورخ کیمبیسز اول کہتے ہیں) صوبۂ ایلام کے رئیس کاؤس کا لڑکا اپنی سوتیلی ماں کے ناجائز پیام محبت کو ٹھکرا کر اور باپ کے ناپسندیدہ کردار سے عاجز آکر افراسیاب شاہ توران کے پاس (جس کا نام یونانی استیاجس بتاتے ہیں) پناہ گزین ہوتا ہے - فرنگیس دختر افراسیاب سے شادی کرتا ہے - اور ایک صوبہ جہیز میں پاتا ہے - تورانی امرا حسد کرتے ہیں - بادشاہ کا بھائی امیروں کا ہمزبان ہو کر سیاوش کے تغلب اور تصرف کی جھوٹی شکایتیں کرتا ہے - اور سیاوش حیلے سے جام زہر پلا کر قتل کیا جاتا ہے -

اُس وقت فرنگیس حاملہ تھی اور اُسکی نسل سے فتنہ و فساد کا افراسیاب کو اندیشہ تھا - افعی را کشتن و بچہ اش نگاہ داشتن کار خردمنداں نیست - بیٹی کے ہلاک کرنے پر مستعد ہوا - ارکین سلطنت مانع ہوئے اور اُنکی خاطر سے لڑکی کی جان بخشی ہوئی - وہ پیران ویسہ وزیر کے سپرد کی گئی اور ہدایت کی گئی کہ اُسکے بطن سے فرزند پیدا ہو تو فوراً قتل کر دیا جائے -

بچہ پیدا ہوا مگر وزیر نے ایک بے گناہ معصوم کے خون سے اپنے ہاتھوں کو آلودہ کرنا مناسب نہ سمجھا - اور اُس طفل کو پرورش کے لیے ایک چرواہے کے سپرد کر کے دربار شاہی میں رپورٹ پیش کر دی کہ مولود نامسعود جنگل میں پھینکوا دیا گیا ہے -

وزیر نے اس بچہ کا نام کیخسرو رکھا - علوم ضروری اور فنون حرب کی تعلیم دلائی اور باحسن وجوہ اُس کی تربیت کی - افراسیاب کو اُس کی زندگی کی خبر ملی تو لڑکے کو پاگل اور دیوانہ مشہور کر کے اُسکی جان بچائی -

اُدھر سیاوش کے قتل کی خبر ایران پہونچی اور بڑی شورش برپا ہوئی - کاؤس کے سپہ سالار نے توران پر فوج کشی کی - میدان کارزار میں افراسیاب کو شکست ہوئی - شاہ توران فرار ہوا اور اُس کے

دار الحکومت پر ایرانی فوج نے قبضہ کر لیا۔ کیخسرو کی جستجو شروع ہوئی اور بڑی جد و جہد سے اُسکا سراغ ملا۔ کاؤس نے بلند اقبال پوتے کو تخت سلطنت پر بٹھایا اور اپنے ہاتھ سے اُسکے سر پر تاج شاہی رکھا تحقیق جدید کے مطابق یہ قصہ ۵۵۹ قبل مسیح یعنی بخت نصر کی موت سے تین سال بعد کا ہے۔

کیخسرو کے دل پر مظلوم باپ کے خون کا داغ تھا۔ دشت پیمائی اور کس مپرسی کی مصیبت یاد تھی جوش انتقام نے چین نہ لینے دیا۔ زبردست فوجیں منتخب جنرلوں کی ماتحتی میں افراسیاب کی تذلیل کے لیے روانہ کیں۔ بعد کو خود بنفس نفیس میدانِ حرب میں آیا۔ تقریباً نو سال تک کُشت و خون کا بازار گرم رہا اور خون سیاوش کے عوض میں ہزاروں بیگناہ قتل ہوئے۔

ز توران زمیں تا بہ سقلاب روم نہ دیدند یک مرز آباد بوم
ہمہ سر بریدند برنا و پیر مذن و کودک و خورد کردند اسیر

آخر کار ۵۵۰ قبل مسیح میں افراسیاب گرفتار ہوا۔ اور وہی زہر آمیز شربت پلا کر اسکی جان لی گئی جو مظلوم سیاوش کی ہلاکت کے لیے استعمال کیا گیا تھا۔

توران کی مہم سے فارغ ہو کر شمالی سرحد محفوظ کر کے وہ جنوب اور مغرب کی طرف متوجہ ہوا۔ پہلے ہی حملہ میں نینوا کو تاراج کرتا ہوا ایشیاء کوچک کے ساحلی علاقہ تک جا پہونچا۔ شاہ لیڈیا نے فرعون مصر۔ حاکم بابل اور جنگجویان یونان سے مدد مانگی گر دولت کا پانی کیا نیوں کی فوج ظفر موج پر سایہ افگن تھا اتحادیوں کو شکست ہوئی۔ اقبال کیخسروی کی دھوم مچی اور ایلام کا رئیس زادہ مغربی ایشیا کا شہنشاہ ہو گیا۔ سرحدِ حکومت مغربی سمندر تک پہونچا کر مشرق کی خبر لی اور اُسکے جنرلوں نے ہندوستان میں فتح و نصرت کے ڈنکے بجائے۔

جنوب مشرق میں بابل کی سلطنت مصر اور کنعان کا راستہ روکے تھی۔ لہذا ۵۳۹ء میں اس خار راہ کو دور کرنے کا ارادہ کیا۔ اوپی کے میدان میں بابل کی مدافعانہ قوت تباہ کر کے دار السلطنت کی فصیل تک جا پہونچا اور اُس عظیم الشان دار الحکومۃ کا محاصرہ کر لیا۔

شہر پناہ نصف فرلانگ بلند اور ۲۹ گز چوڑی ناقابل شکست تھی اور شہر ۶۰ میل مربع کے دور میں آباد و ناقابل تسخیر۔ حملہ ناممکن۔ اور محاصرہ دشوار!!

شہر کے اندر باغات اور چراگاہ بہ افراط۔ دریائے فرات جاری۔ اراضی مزروعہ اور قابلِ زراعت کافی۔ فصیل کی نگرانی کے لیے آزمودہ کار سرداران لشکر۔ باغبانی اور غلہ رانی کے لیے اسرائیلی غلام۔ عیش و عشرت کے لیے کنعانی کنیزیں۔ تو بہ اور تقدیس کے لیے بعل کے مندر۔ جانہ

سورج - زہرہ - مشتری کے صنم خانے - بیسیوں برس کے لیے سامان خوراک مہیا - مدتوں کے لیے اسباب بادہ نوشی فراہم - غرض کوئی شے نہ تھی جس کی تلاش میں کلدانیوں کو شہر سے باہر نکلنے کی احتیاج ہو -

فوجی خدمت گزار ممالک کے ہر گوشہ سے آ آ کر دارالسلطنت میں جمع ہو گئے - یہودی قیدی عراق کے مختلف حصوں سے فرار ہو کر شہر میں آ گئے - بادشاہ بابل اس محفوظ و مستحکم قلعہ نما شہر میں محاصرین اور حملہ آوروں سے بے خوف ہو کر داد عیش و کامرانی دیتا رہا - ایک رات فصیل شہر کے پاس محاصرہ کرنے والے تسخیر کی ایک نئی ترکیب پر عمل کرنے والے تھے اور شہر کے اندر فتح یروشلیم کی چہل و ہشتم سالگرہ کا جشن ہو رہا تھا -

شہر پناہ کے استحکامات سے عاجز آ کر اور محاصرے کی طوالت بے نتیجہ تصور کر کے دارالسلطنت پر قبضہ پانے کی ایرانیوں نے یہ انوکھی تجویز سوچی تھی کہ چند میل کے فاصلہ پر ایک عریض اور عمیق جھیل بنا کر دریائے فرات کا پانی اس میں گرا دیا جائے اور جس راہ سے دریا شہر میں جاتا تھا اسی راستہ سے فوج شہر میں داخل ہو کر محلسرائے شاہی پر قابض ہو جائے -

جھیل کی تکمیل ہو چکی تھی - ایرانی فوج کا ایک دستہ اس خدمت پر مامور تھا کہ سپہ سالار کا اشارہ پاتے ہی دریا کا رخ پھیر کر نو تعمیر جھیل میں پانی گرا دے - لشکر کا بڑا حصہ فصیل کے پاس اس مقام پر صف بستہ تھا جہاں سے کہ دریا شہر کے اندر جاتا تھا اور دوسرا ٹکڑا اس جگہ استادہ تھا جہاں سے کہ دریا شہر کے باہر نکلتا تھا اور ان دونوں گروہوں کو حکم تھا کہ جب دریا پایاب ہو جائے تو وہ بہاؤ اور نکاس کے راستے سے شہر میں داخل ہوں اور شاہی محل کے پاسبانوں پر اچانک حملہ کر کے قصر سلطانی پر قبضہ کر لیں -

کلدانی سرپنچۂ شاہین قضا سے غافل سالگرہ کا جشن منا رہے تھے - شراب کی ندیاں بہ رہی تھیں ہر طرف رقص و سرود کی محفلیں تھیں اور رعایا نشۂ دولت و عیش سے سرشار - قصر شاہی چراغاں سے بقعۂ نور تھا - چاندنی کھلی تھی - فوارے اچھل رہے تھے -

بخت نصر کی دولت و حشمت کا وارث بلشیزر آبنوس کے مطلا تخت پر تاج شاہانہ بر سر اور لباس سرخ در بر کبرا اور تجبر سے زینت بخش تھا - ایک ہزار امرا اور ارکین ریاست ضیافت میں مدعو تھے - سونے اور چاندی کی قابوں میں مشرق کے نایاب فواکہ اور بیش بہا طعام حاضر - ستار اور بربط کے ترانے رقاصوں کی غلغال سے ہم آواز حسین اور نازک اندام گانے والے موسیقی کے کمالات دکھا رہے تھے - ساغر چھلک رہے تھے - شراب ناب کے دور چل رہے تھے آنکھوں میں سرور دلوں میں لوٹے مے مرد افگن کے جام

اور نزاکت کی پتلیاں۔ متوالی نگاہوں کی گردش اور حسن و محبت کی دیویاں!! دنیا تمام بزم خرابات ہوگئی!!

اس مستی انبساط میں بادشاہ کو یاد آیا کہ آج فتح یروشلیم کی سالگرہ ہے۔ حکم دیا کہ سونے اور چاندی کے مقدس ظروف جو یہودیوں کا عبادت خانہ تباہ کرکے حاصل کیے گئے تھے اور فاتح کنعان نے اپنے خزانۂ عامرہ میں با احترام محفوظ رکھے تھے اس مجلس نشاط میں حاضر کیے جائیں تاکہ میزبان و مہمان۔ انکی بیویاں اور حرمیں اُن ظروف میں شراب پییں۔ بیلشیزر سے پہلے کسی ظالم و جبار نے ہیکل سلیمانی کے مقدس برتنوں کو ایسی غلاظت سے آلودہ نہیں کیا تھا۔ ارکان سلطنت خاموش ہوئے اور دربار پر سناٹا چھا گیا۔ مگر ایسے سلطان کے خلاف زبان کھولنے کی کس کو مجال تھی۔ ظروف لائے گئے ناپاک لبوں سے اُن پاک برتنوں میں ناپاک شراب پی گئی اور بابل کے دیوتاؤں کا شکریہ ادا کیا گیا کہ انھوں نے اپنے خدمت گزاروں کو عزت دی اور اپنے رقیب آسمانی خدا کے پرستاروں کو ذلیل کیا۔ یہ مدح و منقبت کے ترانے ختم نہ ہوئے تھے کہ اجل نصیب بادشاہ کی آنکھوں کے سامنے ایک غیبی ہاتھ نمودار ہوا۔ اُسنے شمعدان کے مقابل دیوار کی گچ پر ایک عبارت لکھی۔

بادشاہ نے وہ انگلیاں دیکھیں جو لکھ رہی تھیں۔ وہ عبارت دیکھی جو لکھی گئی تھی۔ طرز تحریر ناآشنا تھا اور مفہوم نامعلوم۔ بہجت و سرور کافور۔ خیالات پریشان کا ہجوم۔ چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ نشہ ہرن ہوا۔ کمر کے جوڑ ڈھیلے ہوگئے اور گھٹنے ایک دوسرے سے ٹکرانے لگے۔ خوفزدہ ہو نجومیوں، کاہنوں اور حکیموں کو طلب کیا اور اُن سے اس عجیب امر کی حقیقت دریافت کی "جو کوئی اس نوشتہ کو پڑھے اور اس کا مطلب مجھ سے بیان کرے وہ ارغوانی خلعت پائے گا۔ اُسکے گلے میں زریں طوق پہنایا جائے گا اور وہ مملکت میں تیسرے درجہ کا حاکم ہوگا"

"تیسرے درجہ کی حکومت" کا مطلب حاضرین مجلس نے سمجھا ہوگا لیکن آج اسکی تشریح مفسرین عہد نامہ عتیق کو دشوار معلوم ہوتی ہے۔ فقیر کاتب الحروف قیاس کرتا ہے کہ یہ الفاظ صحیفۂ دانیال کی روایت کو انیسویں صدی عیسوی کی تحقیقات سے منطبق کرنے کے لیے لکھے گئے تھے یعنی اول درجہ کی حکومت بیلشیزر کو نصیب تھی۔ دوسرے درجہ پر نبونیدس تھا جسکو زمانۂ حال کے محققین بابل کا حقیقی بادشاہ تصور کرتے ہیں۔ اور تیسرے کا وعدہ جس دانشمند سے کیا گیا جو اس نوشتۂ غیبی کو پڑھ سکے۔

بہرحال۔ حکما اور اختر شناس اس تحریر کو پڑھ نہ سکے اور اپنے عجز کا اظہار کیا۔ بادشاہ کی پریشانی دوچند ہوئی اور اسکی بدحواسی سے تمام محفل سراسیمہ ہوگئی۔ بیلشیزر کی ماں کو خبر ہوئی وہ جشن گاہ میں آئی اور بیٹے سے مخاطب ہوکر بولی۔ تیرے خیالات تجھ کو پریشان نہ کریں۔ اور تیرا چہرہ

متفکر نہ ہو۔ تیری مملکت میں ایک شخص ہے جس میں قدوس کی روح ہے اور تیرے باپ کے ایام میں نور و دانش اُس میں پائی جاتی تھی۔ بادشاہ نے اُس کو ساحروں۔ نجومیوں اور فالگیروں کا سردار بنایا تھا کیونکہ اُس میں خوابوں کی تعبیر۔ عقدہ کشائی اور حلِ مشکلات کی قوت تھی۔ اُس کا نام دانیال تھا۔ اُسکو بلوا۔ وہ مطلب بتائے گا"۔

بنوکدنضر کے آغاز حکومت سے اصنام پرستی کا زور ہوا تھا۔ دانیال مجلس شاہی سے کنارہ کش ہوگئے تھے۔ اور امرائے سلطنت کو اُنکی یاد باقی نہ تھی۔ وہ دور افتادہ صوبوں میں فرائض منصبی انجام دیتے اور بادشاہ کے سامنے نہ جاتے تھے۔ ایرانیوں کا سیلاب فتوحات کلدانی ممالک کو بہالے گیا۔ عراق و نینوا کے اہل قلم۔ صاحبِ شمشیر۔ فاضل و حکیم سمٹ کر دارالحکومت میں آگئے۔ دانیال بھی شہر پناہ کی حفاظت میں آئے۔ اور اس وقت دارالسلطنت میں موجود تھے اگرچہ اراکین دربار کو اُنکے وجود کا علم نہ تھا — بادشاہ نے یاد کیا۔ ہرکارے ڈھونڈھنے نکلے۔ معلوم ہوا کہ وہ شہر ہی میں موجود ہیں۔

ولی نعمت کے قاصد طلب کا فرمان لیکر آئے تو حاضری سے چارہ نہ تھا۔ بادشاہ نے کہا "کیا تو وہی دانیال ہے جو یہوداہ کے اسیروں میں سے ہے جن کو میرا باپ یہوداہ سے لایا؟ میں نے تیری بابت سنا ہے کہ نور اور دانش اور کامل حکمت تجھ میں ہے۔ میرے حکیم اور نجومی اس نوشتے کا مطلب بیان نہیں کرسکے۔ اگر تو اس کو پڑھے اور اسکا مطلب سمجھائے تو ارغوانی خلعت پائے گا۔ تیری گردن میں زریں طوق پہنایا جائے گا اور تو مملکت میں تیسرے درجہ کا حاکم ہوگا"۔

دانیال نے عرض کی کہ حضور انعام اپنے ہی پاس رکھیں اور صلہ کسی دوسرے کو دیں تب بھی صاحب امر کی تعمیل ارشاد کے لیے میں اس نوشتہ کو پڑھونگا اور اسکا مطلب عرض کرونگا۔

"اے بادشاہ خدا تعالیٰ نے بخت نصر کو سلطنت حشمت شوکت و عزت بخشی اور تمام قومیں اُسکے حضور میں لرزاں و ترساں ہوئیں۔ اُس نے جسکو چاہا ہلاک کیا اور جسکو چاہا زندہ رکھا۔ جسکو چاہا سرفراز کیا اور جسکو چاہا ذلیل کیا۔ لیکن جب اُس کی طبیعت میں گھمنڈ سما یا اور اُس کا دل غرور سے سخت ہوگیا تو وہ تخت سلطنت سے اُتار دیا گیا اور اُس کی حشمت جاتی رہی۔ وہ بنی آدم کے درمیان سے ہانک کر نکال دیا گیا۔ اُس کا دل حیوانوں کا سا بنا اور گورخروں کے ساتھ رہنے لگا۔ اُسکا بدن آسمان کی شبنم سے تر ہوا یہاں تک کہ اُسکو یقین آگیا کہ خدا انسان کی مملکت میں حکمرانی کرتا ہے اور جسکو چاہتا ہے اُس پر قائم کرتا ہے۔

اے بادشاہ آپ اُسی بلند اقبال کے فرزند ہیں - باوجودیکہ آپ سب واقعات سے آگاہ تھے آپ نے دل سے عاجزی نہ کی بلکہ آسمان کے خداوند کے حضور اپنے کو بلند کیا۔ اُسکی ہیکل کے ظروف میں اپنے امرا - بیویوں اور حرموں کے ساتھ میخواری کی - اُن بتوں کی حمد کی جو نہ دیکھتے نہ سنتے اور نہ جانتے ہیں اور اُس خدا کی تمجید نہ کی جسکے ہاتھ میں آپ کا دم ہے اور جسکے قابو میں سب راہیں ہیں۔ پس اُسکی طرف سے ہاتھ کا ایک حصہ بھیجا گیا اور یہ نوشتہ لکھا گیا —

اس میں لکھا ہے   منے منے تقیل و فرسین

منے منے کے معنی یہ ہیں کہ خدا نے تیری مملکت کا حساب کیا اور اُسے تمام کر ڈالا -

تقیل کا مطلب یہ ہے کہ تو ترازو میں تولا گیا اور کم نکلا -

فرسین سے مراد یہ ہے کہ تیری سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہوئے اور فارسیوں کو دی گئی "-

وعید سخت تھی مگر بادشاہ صادق الوعد تھا - دانیال کو ارغوانی خلعت پہنایا گیا - زریں طوق گلے میں ڈالا گیا اور منادی کی گئی کہ وہ مملکت میں تیسرے درجہ کا حاکم ہے امرا و ارکین دانیال کی مدح و ستائش کرنے لگے - ابھی بابل کا غلغلہ ختم نہ ہوا تھا کہ ایرانی فوج یکایک شاہی محل میں داخل ہوگئی - بیلشیزر قتل ہوا اور کلدانیوں کے جاہ و جلال کا خاتمہ ہوگیا -

اقبال را بقا نہ بود دل برو منہ   اقبال را چو قلب کنی لا بقا بود

اس عبرت انگیز روایت پر صحیفہ دانیال کی مہر تصدیق ثبت ہے اور ڈھائی ہزار برس تک یہ واقعہ بے چون و چرا تسلیم کیا گیا لیکن انیسویں صدی عیسوی میں بابل کے کھنڈروں سے دو سنگین کتبے دستیاب ہوئے جن سے عقلاء فرنگ نے یہ نتیجہ اخذ کیے کہ بیلشیزر کی دعوت کا قصہ غلط ہے - ایرانی فوج بغیر جنگ اور خونریزی کے شہر بابل میں داخل ہوئی اور کلدانیوں کا آخری بادشاہ نبونڈس گرفتار ہوگیا -

حسب ذیل کتبہ کیخسرو کی طرف منسوب کیا جاتا ہے :-

"ماہ تموز میں خسرو نے اکاد کے بہادروں سے جنگ کی ، رعایا شہر نے فوج کا ساتھ نہ دیا - شہر سپار بغیر جنگ کے فتح ہوا - نبونڈس بھاگ گیا - سولہ تاریخ کو خسرو کے جنرل نے بابل کا رُخ کیا - نبونڈس شہر میں خندقیں کھود کر پناہ گزیں ہوا مگر وہ گرفتار کر لیا گیا - مہینے کے ختم تک ایساگلا کا محاصرہ رہا لیکن کسی قسم کے آلے مندروں پر استعمال نہیں کیے گئے - اور نہ کوئی مورت وہاں سے اُٹھائی گئی - مرشسوان کی تیسری تاریخ کو خسرو بابل میں داخل ہوا - شہر کی سڑکیں تماشائیوں سے بھری تھیں - اُس نے

شہر میں امن کا اشتہار دیا۔ ایک جنرل کو بابل کا صوبہ دار بنایا اور نبونڈس نے جو دیوتاؤں کی مورتیں دوسرے مقامات سے لاکر بابل میں نصب کی تھیں۔ اپنی پرانی جگہوں پر واپس کردیں۔ اسی ماہ کی گیارہ تاریخ کو بادشاہ مر گیا۔ ۲۷ آذر سے ۳ نیساں تک ماتم رہا۔ چوتھی تاریخ کیمبیز خسرو کا لڑکا سندر میں گیا۔ وغیرہ وغیرہ"

پرستاران مذہب کا دل خوش کرنے کو دانشمندان فرنگ یہ شوشہ کہ اس کتبہ سے اشعیا نبی کی قدیم بشارت کی تصدیق ہوتی ہے جنھوں نے فرمایا تھا کہ

"خداوند اپنے ممسوح خورس کے حق میں فرماتا ہے کہ وہ میرا چرواہا ہے۔ میری مرضی بالکل پوری کرے گا۔ میں اس کا داہنا ہاتھ پکڑ کر امتوں کو اس کے سامنے زیر کروں گا۔ اور بادشاہوں کی کمریں کھلوا دوں گا۔ دروازوں کو اس کے لیے کھول دوں گا اور پھاٹک بند نہ کیے جائیں گے"۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یورپ کے آزاد خیال محقق جب کسی مذہبی روایت کی تکذیب پر مستعد ہوتے ہیں تو منطق و فلسفہ بھول جاتے ہیں۔ اور الفاظ کو توڑ مروڑ کر اپنے مطلب کے موافق معانی پیدا کر لیتے ہیں۔

اس کتبہ میں بلشیزر کا نام درج نہ ہونے کی وجہ پہلے بیان ہو چکی ہے اور ایک مبہم دستاویز میں دعوت و ضیافت کا تذکرہ نہ ہونے سے واقعہ کی تکذیب نہیں ہو سکتی۔

بغیر جنگ و جدال کے شہر پر قبضہ ہونا اس کتبہ میں درج ہے اور روایت دانیال کا مقصود بھی یہی ہے۔ ممکن ہے کہ بادشاہ کے یکایک قتل ہونے اور نبونڈس کی گرفتاری کے بعد امرائے سلطنت نے مزاحمت فضول سمجھ کر ایرانیوں کی اطاعت قبول کر لی ہو اور اسرائیلی غلاموں نے شہر کے پھاٹک کھول دیے ہوں یا نبونڈس نے گرفتار ہونے کے بعد سلامتی جان اور ازدیاد مراتب کے لیے خود ہی دروازے کھولنے اور شاہ ایران کی تکریم کا حکم دیا ہو۔ رات کی تاریکی میں چوروں کی طرح سرنگ سے گھس کر دشمن پر شبخون مارنا اور اس عالی خاندان بادشاہ کو جس کے موروثوں کے سامنے کیخسرو کے آبا و اجداد نے سر اطاعت خم کیا تھا دھوکے سے قتل کرنا شہنشاہ ایران اور اس کے سرداران لشکر کے لیے باعث شرم شاید ہو لیکن کارنمایاں ہرگز نہ تھا۔ سنگین کتبہ پر آئندہ نسلوں کے لیے یادداشت نقش کرنیوالوں نے اس حرکت کو بہادروں اور شجاعوں کے لیے ننگ و عار سمجھ کر پوشیدہ رکھا اور اس کی تشہیر کو خلاف مصلحت جان کر تاریخ کے سنگین صفحوں پر درج نہیں کیا۔

تعصب کی حیرت انگیز مثال یہ ہے کہ یورپ کے محققوں نے جس کتبہ پر استدلال کر کے

صحیفہ دانیال کو مترلزل کرنا چاہا اُسکے آخری فقرہ سے بالکل چشم پوشی کر گئے۔ اور ان کو یاد نہ رہا کہ
"اسی ماہ کی گیارہ تاریخ کو بادشاہ مر گیا۔ اور کمبیسز جانشیں ہوا"

یونانی مورخوں کے قول کے مطابق بخت نصر فتح بابل سے دس سال بعد (یعنی ۵۲۹ء قبل مسیح میں) فوت ہوا اور کمبیسز (لہراسپ) اُسکی جگہ تخت نشیں ہوا۔ لہذا بخت نصر کی اس کتبہ کو بابل کی پہلی فتح اور بیلشیزر کے قتل سے کوئی واسطہ نہیں ہو سکتا۔

یونانی مورخ لکھتے ہیں کہ بابل نے ایران کی شہنشاہی سے کئی بار سرتابی کی تھی۔ دارائے اول (گشتاسپ) کے عہد میں نبونڈس کا ایک لڑکا بخت نصر سوم کے لقب سے بابل کا بادشاہ بنا تھا اور ۵۱۸ء قبل مسیح میں گرفتار ہو کر قتل کیا گیا تھا اسی طرح اسفندیار کے دورِ سلطنت میں بھی بابل نے سرکشی کی تھی اور ۵۱۴ء قبل مسیح میں بغاوت فرو کر کے یہاں کے مندر مسمار کیے گئے تھے۔ لہذا اقرین قیاس ہے کہ بخت نصر کی تسخیر بابل سے چند سال بعد اُس عالی منزلت اور رفیع حوصلہ فاتح کی زندگی ہی میں نبونڈس نے ایرانیوں سے پہلی بغاوت کی۔ گرفتار ہوا اور عایا نے بخت نصر کا ساتھ دے کر شہر کے پھاٹک کھول دیے۔ شاہِ ایران کا گرمجوشی سے خیر مقدم کیا اور اسی واقعہ کا کتبہ میں اندراج کیا گیا ہے۔

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم   چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

بہرصورت کلدانیوں کی سلطنت ختم ہوئی۔ بخت نصر کے تخت گاہ پر خورش کا ویانی سایہ گستر ہوا اور اور بنی اسرائیل ایک مالک کی حکومت سے نکل کر دوسرے آقا کی غلامی میں آئے۔

ایرانی اصنام پرستی کے مخالف تھے۔ یہودیوں کی شریعت کو بابلیوں کی توہم پرستی سے بہتر سمجھتے تھے۔ اُن کو یروشلم کی تباہی۔ بنی اسرائیل کی جلاوطنی کا غم تھا اور کلدانیوں کو ذلیل کرنے کے لیے ان کی مفتوحہ قوموں کو عزت دینا مصلحت ملکی تصور کرتے تھے۔ بخت نصر نے دانیال اور اُنکے رفقا کی عزت و توقیر میں کمی نہیں کی بلکہ بابل پر متصرف ہونے کے چند ہی مہینے بعد ایک تاریخی فرمان جاری کیا:

"شاہ فارس خورس یوں فرماتا ہے کہ خداوند نے زمین کی سب مملکتیں مجھے بخشی ہیں اور مجھے تاکید کی ہے کہ میں یروشلیم میں اُسکے لیے ایک مسکن بناؤں۔ پس تمھارے درمیان جو کوئی اُسکی ساری قوم میں سے ہو وہ یروشلیم کو جائے اور اسرائیل کے خدا کا گھر جو یروشلیم میں ہے بنائے۔ اور جو کوئی نہ جانا چاہے وہ چاندی سونے مال اور مویشی سے مدد کرے۔ اور خدا کے گھر کے لیے جو یروشلیم میں ہے ہدیہ بھیجے"

یہ فرمان یہودی قیدیوں کی رہائی کا پہلا اعلان تھا۔ بنی اسرائیل میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

آخری اسرائیلی بادشاہ کی جاہ و حشمت دیکھنے والے نوجوان سن رسیدہ اور ضعیف ہو چکے تھے۔ بوڑھے مر چکے تھے اور لڑکے بوڑھے تھے۔ یروشلیم کی رونق اور آبادی چند ہی نفوس کو یاد تھی۔ مگر آباو اجداد کی رہائش گاہ دیکھنے کا شوق اور ہیکل سلیمانی میں عبادت کرنے کی آرزو۔ باپ دادا سے میراث میں ملی تھی۔ دل کھل گئے۔ اور ساری قوم یک زبان ہو کر کیخسرو کی عظمت اور عالی ہمتی کے ترانے گانے لگی۔ جو اسرائیلی بابل میں معزز عہدوں پر ممتاز تھے یا تجارت زراعت صناعی اور ہنرمندی سے دولتمند ہو گئے تھے عراق کی سکونت ترک کرنے پر راضی نہ ہوئے۔ دل کے جوش کو دبانے اور نفس کو تسلی دینے کے لیے کہتے تھے کہ تبدیل مقام سے غلامی کی ذلت مٹ نہیں سکتی۔ یروشلیم میں بھی آزادی اور خودمختاری نصیب نہ ہوگی بلکہ فارس کے قوانین کی پابندی اور ایران کے صوبہ داروں کی اطاعت کرنا ہوگی تو اس سفر دور و دراز کی زحمت برداشت کرنے سے کیا حاصل ہے۔ البتہ غربا اور مساکین نے وطن کی واپسی کے لیے تیاری شروع کر دی۔

بابلیوں نے اپنے مہمانوں کو عزت و تکریم سے رخصت کیا۔ طلا و نقرہ۔ زیورات اور ریشمی تحفتا نذر کیے۔ شاہ ایران نے علاوہ زادراہ کے نئے دیس میں مسکن بنانے اور روزگار شروع کرنے کیلیے مال و زر سے امداد کی۔ تقریباً پانچ ہزار چار سو ظروف طلائی و نقرئی جو بخت نصر ہیکل مقدس سے لایا تھا اور جنکو اُسکے بعض جانشینوں نے بے حرمت کیا تھا ان آزاد شدہ قیدیوں کے سپرد کیے تاکہ ہیکل مقدس کی جدید عمارت کے لیے موجب زینت و زیبائش ہوں۔

غرض عورت مرد بچے ملاکر ۴۲۳۶۰ نفوس کا قافلہ وطن مالوف کی طرف رخصت ہوا۔ اس مجمع میں زیادہ تعداد غربا اور محتاجوں کی تھی۔ گیہوں بابل میں رہ گیا۔ صرف بھوسی یروشلیم پہنچی۔ انھوں نے سکونت کے لیے حتی الامکان وہی قصبے اور دیہات انتخاب کیے جہاں اُنکے آبا و اجداد اسیری سے پہلے بود و باش رکھتے تھے۔ شہر یروشلیم ویران تھا اور تباہ شدہ ہیکل مقدس کی جگہ مٹی اور پتھروں کا انبار۔

نہ تو گُل تھا نہ نشیمن نہ نشیمن والے　　چھُٹ کے آئے جو قفس سے تو وہ گلزار نہ تھا

قدیم متبرک مقام پر ایک عارضی قربان گاہ بنائی اور فرائض مذہبی کی بجاآوری میں مصروف ہوئے۔ دوسرے ہی سال (۵۳۶ قبل مسیح میں) عبادت خانہ کی تعمیر شروع کی۔ متوسط الحال خاندانوں نے بڑی فیاضی سے مال دیا۔ غربا نے بھی اپنی حیثیت سے زیادہ امداد کی۔ بنیادی پتھر بڑے جوش و خلوص سے رکھا گیا۔ لیکن چند ہی روز کے بعد تعمیر ملتوی ہوئی اور اپنے ہی بھائی بندوں نے اس کارِ خیر میں مخالفت اور مزاحمت کی۔

بادشاہ نینوا شالمنسر اول نے اسرائیل کی شمالی سلطنت فتح کرکے اسباطِ یعقوب کو جلاوطن کیا تھا تو سامریہ میں توران اور ایران کے مختلف قبائل لاکر بسا دیے تھے - ان نو واردوں نے قدیم باشندوں سے گھل مل کر اپنا موروثی طریقہ عبادت فراموش کر دیا تھا - اور مقامی آب و ہوا سے متاثر ہو کر شریعت موسوی کے پابند ہو گئے تھے - یہ جدید قوم سرزمین کنعان میں سامری کے لقب سے مشہور تھی - انھوں نے سنا کہ یروشلم کے یہودیوں کو وطن میں واپس آنے کی اجازت مل گئی ہے اور وہ ہیکل سلیمانی کی دوبارہ تعمیر کرنا چاہتے ہیں - اس مقدس کام میں شرکت کی اجازت طلب کی - یہودی سامریوں کو کمینہ اور ذلیل سمجھتے تھے شرافت کی نخوت میں مست ہو کر سامریوں کی درخواست رد کر دی - "تمہارا کام نہیں کہ ہمارے ساتھ ہمارے خدا کے لیے گھر بناؤ ہم آپ ہی خداوند اسرائیل کے لیے اسے بنائیں گے جیسا شاہ فارس خورس نے حکم دیا ہے"

"سامری دشمنی پر تیار ہوئے اور قدم قدم پر روڑے اٹکانے لگے - فارس کے امیروں اور وزیروں کو ہموار کرکے دربار شاہی میں اسرائیلیوں کی شکایت لکھی "یہ شہر فتنہ انگیز ہے جو بادشاہوں اور صوبوں کو نقصان پہونچاتا رہا ہے اور قدیم زمانے سے اس میں فساد ہوتا رہا ہے - اسی سبب سے یہ شہر اجاڑ دیا گیا تھا — اگر یہ تعمیر ہوا اور اسکی فصیل بن جائے تو اس صورت میں حضور کا حصہ دریا پار کچھ نہ رہے گا - یہ لوگ خراج، چنگی یا محصول نہیں دینگے اور بادشاہ کو نقصان پہونچے گا"

شہنشاہ کو وہم ہوا - حکم دیا کہ کام بند کر دیا جائے اور عبادت گاہ کی تعمیر ملتوی رہے - کیخسرو نے ہیکل بنانے کی اجازت دی تھی - اسی نے ممانعت کی - اسکے جانشین لہراسپ کے وقت میں کسی کو یاد دہانی کی مجال نہ ہوئی یہاں تک کہ دارا اول (گشتاسپ) فارس کا حکمراں ہوا - یہ شہنشاہ بنی اسرائیل کے حال زار پر مہربان تھا - حکیم دانیال کی بہت عزت کرتا تھا - اس نے اپنی وسیع سلطنت ۱۲۰ صوبوں پر تقسیم کی تھی اور ہر صوبہ پر ایک ناظم مقرر تھا -

ان ناظموں کی نگرانی تین وزیروں کے سپرد تھی - جن میں سے ایک حکیم دانیال تھے - اور سب امراء و وزراء سے زیادہ عالی مرتبت اور سلطنت کے مختار کل سمجھے جاتے تھے -

اس موقع سے فائدہ اٹھا کر یہودیوں نے دوبارہ ہیکل کی تعمیر شروع کی - کنعان کے عاملوں نے بادشاہ کو اطلاع دی کہ عبادت خانۂ یہود "بڑے بڑے پتھروں سے بن رہا ہے - دیواروں پر کڑیاں رکھی جا رہی ہیں اور کام خوب کوشش سے ہو رہا ہے" دربار پر حکیم دانیال کا اثر تھا - شاہی کتبخانے سے وہ فرمان برآمد کیا گیا جس میں کیخسرو کی اجازت تعمیر درج تھی اور اسی طومار کا حوالہ دے کر

صوبہ دار کنعان کو اس تعمیر میں امداد کی ہدایت کی گئی "اس گھر کے کام میں دست اندازی نہ کرو۔ شاہی مال سے اُن لوگوں کو بلا توقف خرچ دیا جائے تاکہ اُن کو رُکنا نہ پڑے۔ اُن کو قربانی کے لیے جانور۔ نیز گیہوں۔ نمک۔ شراب۔ اور تیل سے مدد دی جائے تاکہ وہ بادشاہ کی عمر درازی کے لیے دعا کریں"۔

اب عمارت زور شور سے بننا شروع ہوئی اور شہنشاہ دارا کے چھٹے سال جلوس میں (یعنی ۵۱۶ قبل مسیح میں) تباہی یروشلیم سے پورے ستر سال کے بعد یہ مقدس عمارت پایۂ تکمیل کو پہونچی۔ وہ ۶۰ ہاتھ اونچی اور ۶۰ ہاتھ چوڑی تھی۔ "تین ردّے بھاری پتھروں کے اور ایک ردا لکڑی کا تھا" نمونہ قدیم معبد سلیمانی کا تھا مگر مسالہ کم قیمت استعمال کیا گیا۔ نہ طلائی دروازے تھے نہ جواہر کی گلکاری۔ سِن رسیدہ نفوس ضعیفوں نے قدیم عالیشان عمارت کی زیارت کی تھی اس گھر کو دیکھ کر رونے لگے اور نوعمروں نے شادمانی کے ترانے شروع کیے۔ خوشی کا شور اور غم کی صدائیں ایک ساتھ بلند ہوئیں۔ بوڑھے چند تھے اور جوان بہت۔ لیکن اغیار کو یہ امتیاز دشوار تھا کہ بنی اسرائیل اس تعمیر جدید پر مسرت کے شادیانے بجا رہے ہیں یا پرانی یادگار کی تباہی پر بین کر رہے ہیں۔

قطعۂ تاریخ وفات حسرت آیات لسان الملک سحبان الہند حضرت ریاض رح

(جناب مولوی سید الشاہد خاں صاحب شاہد شروانی)

آں ریاضِ خضر صورت خوش خصال — در حقیقت بود معدوم المثال
من ندیدم ہمچو تو سحبانِ ہند — نکتہ سنج و خوش بیاں شیریں مقال
از وفاتِ تو - شہِ مُلکِ سخن — آمدہ اقلیم اُردو در زوال
سوزِ ہجرت کرد چشمم شعلہ بار — پارہ پارہ شد دل از حزن و ملال
سینہ کوبد - اشک بارد بہرِ تو — روز و شب ایں شاہدِ آشفتہ حال
آمد اندر گوشم ایں آواز - چوں — فکر کردم بہر حالِ انتقال

رفت آں قلب ادب جانِ ادب
سوے جنت شد ریاضِ باکمال

۱۹۳۴

فسانۂ عجائب

(جناب حکیم خواجہ شمس الدین صاحب پرنسپل کمشنر لکھنؤ)

اردو نثر نگاری کے دو طرز ہیں۔ ایک یہ کہ عبارت صاف اور سلیس ہو، مضمون رنگینی، تکلف، اور آورد سے پاک ہو اور انداز تحریر ایسا ہو جیسے معمولی بات چیت کا ہوا کرتا ہے۔ دوسرا طرز یہ ہے کہ عبارت مقفیٰ و مسجع ہو مضمون میں رنگینی اور تکلف ہو اور روشِ بیان معمولی بول چال اور روزمرہ سے الگ ہو۔ اردو زبان میں دونوں طرز کے نمونے بکثرت موجود ہیں اور دونوں طرز کے نثر نگار اپنے اپنے رنگ میں کمال دکھا چکے ہیں۔ اردو نثر نگاری کے قدیم نمونے داستانوں اور قصہ کہانی کی کتابوں میں خوب ملتے ہیں۔ طرز اول کا بہترین نمونہ قصہ چہار درویش ہے کہ ۱۲۱۵ھ میں میر امن دہلوی نے جان گلکرسٹ صاحب کی فرمائش سے لکھا اور طرز ثانی میں فسانہ عجائب سب سے بہتر ہے جس کو مرزا رجب علی بیگ سرور لکھنوی نے ۱۲۴۰ھ میں تحریر کیا۔

فارسی کی تقلید میں اردو کے انشا پردازوں کا عام انداز یہی تھا کہ وہ اردو نثر کو صنائع و بدائع سے آراستہ کر کے رنگین بناتے تھے اور قابل ذی استعداد و صاحب ذوق رنگین طبع حضرات اسی کو پسند فرماتے تھے۔ البتہ جان گلکرسٹ صاحب کے حکم سے جو قصے کہانیاں لکھی گئیں وہ اس سے مستثنیٰ ہیں کیونکہ صاحب موصوف کی یہ تاکید تھی کہ زبان صاف اور سلیس ہو، جیسا کہ میر امن قصہ چہار درویش میں لکھتے ہیں۔

"اب خداوند نعمت صاحب مروت نجیبوں کے قدردان جان گلکرسٹ صاحب نے کہ ہمیشہ اقبال ان کا زیادہ رہے جب تک گنگا جمنا بہے لطف سے فرمایا کہ اس قصہ کو ٹھیٹھ ہندوستانی گفتگو میں جو اردو کے لوگ ہندو مسلمان، عورت، مرد، لڑکے بالے، خاص و عام آپس میں بولتے چالتے ہیں ترجمہ کرو، موافق حکم حضور کے میں نے بھی اسی محاورہ سے لکھنا شروع کیا جیسے کوئی باتیں کرتا ہے"

فسانۂ عجائب کی حالت اس سے مختلف تھی، وہ نہ کسی صاحب بہادر کی فرمائش سے لکھا گیا اور نہ جس سوسائٹی کے لیے لکھا گیا وہ روکھا پھیکا اور سیدھا سادا طرز بیان پسند کر سکتی تھی۔ وہ اس وقت لکھا گیا جب کہ لکھنؤ اپنے کمال عروج پر تھا، سرور رسیدہ و خاص لکھنؤ کے باشندے تھے اور یہاں کی ہر ادا پر جان فدا کرتے تھے۔ لکھنؤ کے لوگ شگفتہ مزاج اور رنگین طبع تھے، تکلف اور تصنع ان کے خمیر میں داخل تھا، تقریر اور تحریر میں بناوٹ اور رنگینی ان کا خاص شیوہ تھی۔ صنائع و بدائع اور محاسن لفظی و معنوی عام گفتگو میں برتے جاتے تھے۔

خصوصاً صنعت رعایت ان کو اس قدر محبوب تھی کہ جاہل و عالم، عام و خاص، روزمرہ کی گفتگو اور بول چال میں بھی کسی وقت اس کو نظر انداز نہ کرتے تھے اور اس کو کلام کا سب سے بڑا زیور سمجھتے تھے۔ صنعت رعایت نے ترقی کرتے کرتے ضلع و جگت کی صورت اختیار کر لی تھی اور اہل لکھنؤ نے اس میں انتہائی مہارت پیدا کر لی تھی۔ جس شخص کا کلام صنعت رعایت سے خالی ہوتا یا جو ضلع و جگت بولنے پر قادر نہ ہوتا اہل لکھنؤ اس کو دیہاتی اور بیوقوف کہتے اور اس سے بات کرنا بھی ناپسند کرتے تھے۔

تربیت و تعلیم کی وسعت، فیض صحبت اور سوسائٹی کے اثر نے لکھنؤ کے ناخواندہ لوگوں کو بھی اس حیثیت پر کر دیا تھا کہ وہ قابل اور خواندہ لوگوں کی طرح بات چیت میں منعلیق ہو گئے تھے۔ باہر کے لوگوں کو اگر انکے ساتھ بات چیت کا اتفاق ہوتا تھا تو وہ دھوکے میں آ کر ان کو خواندہ اور قابل سمجھنے لگتے تھے۔ اور مدتوں کے بعد انکے اصلی حال سے آگاہ ہوتے تھے۔ یہاں کے جاہل اور بازاری لوگ اور گھریلو ناخواندہ عورتیں جب زبان کھولتیں تو یہ معلوم ہوتا کہ فصاحت و بلاغت کے دریا بہہ رہے ہیں۔ عربی فارسی کے الفاظ، لطیف فقرے، اور جملے، نفیس محاورے، اور کنائے اور برمحل استعارے اس برجستگی سے ان کی زبان پر جاری ہوتے کہ سننے والا دم بخود رہ جاتا، اور اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ آ سکتی کہ یہ لوگ نوشت و خواند سے عاری اور علم و فضل سے بے بضاعت ہیں۔

لکھنؤ کے لوگوں کو داستانوں اور قصے کہانیوں کا بہت شوق تھا خاص کر وہ داستانیں اور قصے جن میں مافوق العادت باتیں اور دیو پری کی حکایتیں ہوتی تھیں۔ شاہوں سے لیکر گداؤں تک سب کو ان سے ذوق تھا اور اوقات فرصت میں انکو پڑھ کر یا سن کر ان سے جی بہلایا کرتے تھے۔ بعض سادہ لوح اور بھولے بھالے لوگ ایسے بھی ہوتے تھے جو ان قصے کہانیوں کی صداقت کا یقین رکھتے تھے، اور ان افسانوں سے جہاں جی بہلتا تھا اور لٹریچر ترقی پاتا تھا وہاں انکی بدولت اخلاق بھی بگڑتے تھے اور بے اصل و بے حقیقت باتوں کو سن سن کر لوگ وہم پرستی اور ضعیف الاعتقادی کے مرض میں بھی مبتلا ہو جاتے تھے، اور ان کو ہر جگہ دیو و پری نظر آنے لگتے تھے۔

ہمارا خیال ہے کہ اس زمانہ میں لکھنؤ کے عوام الناس کی ترقی زبان و شستگی تقریر کا بڑا سبب یہ افسانے تھے۔ وہ ان کو شب و روز جو سنا کرتے تھے تو بہت سے عربی و فارسی الفاظ اور انکے برمحل استعمال معلوم ہو جاتے تھے اور جملے کے جملے اور فقرے کے فقرے حفظ ہو جاتے تھے جن کو وہ اپنی ذکاوت و ذہانت سے موقع اور ضرورت پر استعمال کرتے تھے اور اس طرح کم مایگی علم پر پردہ پڑ جاتا تھا اور وہ قابل و خواندہ معلوم ہوتے تھے، اگر یہ قصے اور داستانیں صاف بول چال اور روزمرہ میں ہوتیں تو یہ فائدہ

ہرگز حاصل ہو سکتا۔ سرور میرور لکھنؤ کے قدیم انشاپردازوں میں مسلم الثبوت استاد گزرے ہیں اور دہلی والوں نے بھی ان کا لوہا مانا ہے۔ وہ شاعر بھی تھے اور نواب نوازش علی خاں نوازش برادر نواب سالار جنگ کے شاگرد تھے جن کو مومن دہلوی سے تلمذ تھا مگر ان کی شہرت نظم سے نہیں ہے نثر سے ہے۔ لکھنؤ کی انشاپردازی اور نثر نگاری میں ان کا وہی مرتبہ ہے جو ناسخ مرحوم کا شاعری اور نظم میں ہے۔

نواب سعادت علی خاں کے زمانۂ حکومت میں پیدا ہوئے تھے اور نصیر الدین حیدر بادشاہ کے عہد میں فسانہ عجائب کانپور میں ختم کیا۔ ان کے نواسہ مرزا امیر بیگ کہتے تھے کہ وہ افیم بھی پیتے تھے۔ پہلے لکھنؤ میں رہتے تھے اس کے بعد راجہ بنارس کے نوکر ہوئے، غدر کے زمانہ میں ٹٹو پر بیٹھ کر رام پور چلے گئے اور نواب کلب علی خاں مرحوم کے ملازم ہوئے اور تمام عمر وہیں رہے قبر بھی رامپور ہی میں ہے۔

انھوں نے شبستان سرور لکھی جس میں ہزار راتیں نئے نئے پہلو سے دکھائی ہیں، گلزار سرور ترجمۂ حدائق العشاق، شگوفۂ محبت، سرور سلطانی، ترجمہ شمشیر خانی، سارس نامہ، انشائے سرور، فسانۂ عبرت، محمد علی شاہ بادشاہ اودھ کے حالات لکھے، مگر سب سے زیادہ شہرت اور مقبولیت فسانہ عجائب کو حاصل ہوئی اور حقیقت یہ ہے کہ وہ ان کے کمال کا عمدہ ترین نمونہ ہے، لکھنؤ میں گھر گھر فسانہ عجائب پڑھا جاتا تھا اور لوگ نہایت شوق اور دلچسپی سے اس کو سنا کرتے تھے۔

ناسخ کی طرح سرور کو بھی لکھنؤ سے عشق تھا، مگر جس طرح ناسخ کو شہر بدر ہونا پڑا تھا سرور کو بھی بارہ برس تک لکھنؤ چھوڑ کر کانپور میں رہنا پڑا، باہر رہے تو لکھنؤ کی یاد میں تڑپتے رہے۔ کہتے ہیں ؎

الٰہی لکھنؤ بستا رہے روز قیامت تک سرور دشت پیما کا کبھی وہ شہر مسکن تھا

فسانہ عجائب میں ایک غزل بھی لکھنؤ پر لکھی ہے جس کے چند اشعار درج ذیل ہیں ؎

تا ابد قائم رہے فرمانروائے لکھنؤ یہ نصیر الدین حیدر بادشاہ سے لکھنؤ
گو ملے جنت بھی رہنے کو بجائے لکھنؤ چین تک ہم کھٹکتے ہوں تب ہر دم کہاں کے اے لکھنؤ
یا تو ہم پھرتے تھے ان میں یا ہوا یہ انقلاب پھرتے ہیں آنکھوں میں ہر دم کوچہ ہائے لکھنؤ
دشت غربت میں کیا برباد وحشت نے تو کیا دل سے اڑتی ہے کوئی اپنے ہوائے لکھنؤ
تا رہے آباد یا رب تا بہ دور مشتری میں کہیں ہوں مانگتا ہوں پر دعائے لکھنؤ
بلبل شیراز کو ہے رشک ناسخ کا سرور اصفہاں اسنے کیے ہیں کوچہ ہائے لکھنؤ

خدا جانے کیا مجبوری تھی جو سرور کانپور میں جا کر رہے۔ انکو کانپور سے سخت نفرت تھی۔ لکھتے ہیں:۔

"ربیع الثانی کے مہینے میں کہ سن ہجری نبوی صلی اللہ علیہ وسلم بارہ سے چالیس تھے، آنے کا

اتفاق مجبور کو ادھر کانپور میں ہوا، لیکن یہ بستی ویران، پوچ و لچر ہے، شرفا یہاں عنقا صفت ناپید ہیں اور جو ہوں گے تو گوشہ نشین، عزلت گزیں، مگر چھوٹی امت کی بڑی کثرت دیکھی۔"

لکھنؤ کی تعریف میں ایک جگہ برسات کا ذکر آگیا ہے اور عالم غربت میں عیش باغ کے ساون بھادوں کے میلے یاد آگئے ہیں تو اس پر ظلم کی آنکھوں سے آنسوؤں کی گنگا جمنا بہاتے ہوئے کانپور کی برسات کا ذکر خیر اس طرح فرماتے ہیں :-

"نہ کہ کانپور کی برسات، ہیہات ہیہات، دخل کیا دروازے سے باہر قدم رکھے اور پھسل نہ پڑے، گلی میں پاؤں رکھا اور کیچڑ کا چھپکا سر پر پہونچا۔ دو دو پہر فصل میں باہم نہ دیکھے گر چھلے کے پٹنے اور جنھیں سواری کا مقدور نہیں، دخل کیا جو وہ جا بجا کہیں، انکے حق میں ایام برسات حوالات گھر، جیل خانہ، کیچڑ کے مقید، کہیں جانا نہ آنا، اگر خواب میں کہیں نکل گئے، تو چونک پڑے کہ پھسل گئے، اور جو بازاری کاروباری ہیں ان کا یہ نقشہ دیکھا، ہاتھوں میں جوتیاں، پائنچے چڑھا، کیچڑ میں لت پت یہاں گرے وہاں گرے، خدا خدا کر کے جیتے گھر پھرے، اور جو شیخی کے مارے ننگے پاؤں نہ نکلے، فرد

دیکھی ہے یہ رسم اس نگر میں   جوتا ہے گلی میں آپ گھر میں"

لکھنؤ کی تعریف جیسی سرور نے لکھی ہے شاید کسی نے لکھی ہو اور حق یہ ہے کہ انکے زمانہ میں لکھنؤ ہندوستان کیا ایشیا کا عروس البلاد تھا۔ رونق، آبادی، دولت، تہذیب، علم و ہنر اور فضل و کمال میں کوئی شہر اس کا ہم پلہ اور ہمسر نہ تھا، ہر فن کے اہل کمال اور برگزیدہ اشخاص دور دور سے کھنچ کھنچ کر یہاں آگئے تھے، اس لیے سرور نے جو تعریف کی ہے وہ بے جا نہ تھی، فسانہ عجائب کے شروع میں انھوں نے اپنے رنگ میں یہاں کی ایک ایک چیز کی تعریف کی ہے، کہیں کھانوں کا ذکر کرتے ہیں تو اس طرح مزے لے لے کے کہتے ہیں :—

"نانبائی خوش سلیقہ، شیرمال، کباب، نان، نہاری بلکہ جہان کی نعمت اس آبداری کی جس کی بو باس سے دل طاقت پائے، دماغ معطر ہو جائے، فرشتہ گزرے تو سونگھے مست ہو جائے غنودگی میں، اونگھے کیسا ہی سیر ہو ذرا نہ دیر ہو دیکھنے سے بھوک لگ آئے، وہ سرخ سرخ پیازے نہاری کا بگھار، سڑلی چھنکار، شیرمال شنگرف کے رنگ کی خستہ بھربھری ایک بار کھائے نان نعمت کا مزا پائے تمام عمر ہونٹ چاٹتا رہ جائے، کباب اس آب و تاب کے کہ مرغان ہوا ماہیان دریا کا دل سیخ آہ پر متصل حسرت محرومی سے کباب، اور ورق کا بچھا میاں خیر اللہ کی دوکان کا بال سے باریک کترا، ضمیر حسینی کے حلوا سوہن پر عجیب جوبن، اسکی شیرینی کی گفتگو میں لب سے لب، زبان کو لپ سندا

پڑے لاؤ دیر نہ ہونے پائے بیٹھ کر دمڑی کی ہونٹ سے جبائے، دانت کا نام عمر اس پر دانت رہے لگانے کی نوبت نہ آئے۔ جوزتی خوب اچھی اہل ہند کو مرغوب، دودھ یا شیر خوار نوش کر جائے۔"

اس کے بعد کنجڑوں اور تنبولیوں کی تعریف ہے، مٹھائیوں کا نام بنام ذکر ہے، حقوں کی اور تمباکو کی توصیف ہے، زرگروں کی دست کاری، حماموں کی چابکدستی دکھائی ہے، پھر عطر، تیل اور نیم کی مدح و ثنا کی ہے، لکھنؤ کی برسات کا دلچسپ بیان پیش کیا ہے اور کانپور کی برسات کا اس کے مقابلہ میں خاکہ اڑایا ہے۔ پھر عمارتوں اور محلوں کی تصویر کھینچی ہے۔ یہاں کے خوشنویس، ماہران موسیقی، داستان گو، اطبا، علماء، شعراء، مرثیہ گو، بھانڈ، نقال وغیرہ اور شہزادے، حضرت بیان کی ہے، مزارات، اولیا کا تذکرہ کیا ہے۔ یہاں کی پتنگ بازی کی بھی ہدح کی ہے اور یہ فقرے لکھے ہیں :—

"پتنگ ایسا بنا، ایسا لڑا کہ تو دیکھے وہ مشہور ہے، ستر چھیر تارو در اس کا پتنگ، بجرانی یا چھنگو کے ہاتھ کا لڑائی دیکھے تو ہمتر کی عافیت تنگ کردہ اس ہاتھ پاؤں پر موسوی عمدہ سے ایسا لڑایا، عمدہ آسمان پر بڑھایا کہ جو دیکھے اس پیچ میں عبادت چھوٹی، دوڑ دوڑ کر ڈور لوٹی، آنکھ بچا کر بیٹا توڑا، فرشتہ خاں کا پتنگ نہ چھوڑا، مرزا نظر علی نے ہاتھ اور نظر میں یہ زور بہم پہنچایا کہ ساتھ تارکا پتنگ بڑھا ایک کر بڑھایا، سات سیر ڈور پر گٹ بڑھو دیکھی کنا کسی کے ہاتھ نہ آیا، مردان جگسانا بجھا دینے والا دکھا دیا۔"

اسکے بعد لکھنؤ کے امرا کی ستائش گری کرتے ہوئے سخاوت دریا دلی میں حاتم سے ان کا مقابلہ کیا ہے اسی ضمن میں پیر بخارا کے شہدے، ٹھگوں کی گیرگی اور خیرات کا بھی ذکر کر دیا ہے۔ آخر میں نصیرالدین حیدر بادشاہ وقت کی خوب مدح خوانی کی ہے۔ لکھتے ہیں :—

"اللہ اللہ عجب شاہ جہاں دار کو نقش ہوا کہ عالم کا نام صفحہ ہستی سے مثل حرف غلط مٹا دیا، فقیروں کو امیر بنا دیا، عیش و نشاط کی طرف طبیعت جو آئی ایک ایک ادنیٰ کو غیرت ہفت ہزاروں سے اعلیٰ بنائی۔ شہزادیوں کو کہاریوں پر شفقت آیا، خواصوں کا صاحب نوبت کیا، چنڈول سکھپال میں چڑھایا، ہاتھی پالکی کو علاوہ پایا، ہزار ہا روپے دیئے، لاکھ روپیہ بخشا، کروڑ گوئے زنان نغز گفتار از پا تا فرق دریائے جواہر میں غرق ہو کر دست ستم ہم لکھ کی رہے جہاں کی نعمت ان کے سامنے پڑی رہتی، ایسیوں کو دروں و دیتے ہیں، خدمتوں نے بادشاہت کی چین کی۔ قدسیہ محل کہ طبیعت جو آئی مثا دیا، رفعت و شان ملکہ معظم پہنچا کر لاکھوں روپیہ

منظورِ نظر نے صرف کیے خزانے خالی کر محتاجوں کے گھر بھر دیے۔"

غرضکہ سلسلۂ کلام کو مدحِ شاہ میں بہت طول دیا ہے، جو کچھ لکھا ہے سراسر واقعہ لکھا ہے، جھوٹی خوشامد یا تعریف نہیں کی ہے۔

اس کے بعد فسانہ کا سببِ تالیف یہ لکھا ہے کہ ایک دوست نے غم غلط کرنے کے لیے فسانہ لکھنے کی فرمائش کی جس کو پورا کرنے کی نوبت نہ آئی۔ ۱۲۳۹ھ میں کانپور آئے اور وہاں قیام کرنے کا اتفاق ہوا۔ اس زمانہ میں لکھنؤ کو چھوڑنا بہشت کو چھوڑنا تھا، کانپور ایک کورِ دہ ویران مقام تھا، وہاں جو جا کر رہے دل سخت گھبرایا، اس وقت دوست کی فرمائش یاد آئی اور اس کو پورا کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ لکھتے ہیں: —

"دلِ وحشت منزل اس مقام سے سخت گھبرایا، قریب تھا جنون ہو جائے، تیرہ بختی روزِ سیاہ دکھائے، لیکن بہ شربتِ عنایت و معجونِ شفقت ارسطوئے فطرت، بقراطِ حکمت، حار و بارد زمانہ دیدہ، تجربہ رسیدہ، حکیم سید اسد علی صاحب، شیرِ بیشۂ علم و کمال، سخن فہم، ظریف، خوش خصال، بلطف سودا خیز ازسر جنون انگیز کو آرام و تسکین حاصل ہوئی۔ اکثر حالِ نقیر دلگیر پہ الطاف و کرم فرماتے تھے، تدبیریں نیک و احسن دافعِ رنج و محن بتاتے تھے۔ ایک روز بہ اظہارِ حالِ کلفت فسانہ دوستانہ یہ بھی کہا کہ حسبِ ... ایک کہانی لکھا چاہتا ہوں۔ سن کے فرمایا بیکار رہنا کچھ کیا کر۔ میر سوز

میر نہیں پیر تم کاہلی اللہ رے — کام خدا ہو جواں تجھ کو تو کیا چاہیے

اس وقت یہ کلمہ اس طبع کو تازیانہ ہوا، تحریر کا ساماں ہوا۔"

سببِ تالیف ذکر کرنے کے بعد دہلی والوں سے نوک جھونک کی ہے اور میر امن دہلوی پر طنزاً فقرے کسے ہیں جنھوں نے دہلی کی زبان اور محاوروں کی توصیف قصہ چہار درویش میں کی ہے۔ اس کے بعد داستان یہ شروع کی ہے کہ فیروز بخت نامی کوئی بادشاہ تھا جس کے اولاد نہ ہوتی تھی اور وہ ہمیشہ حسرت میں رہتا تھا کہ خدا کی قدرت سے ساٹھ برس کی عمر میں ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام جانِ عالم رکھا، بادشاہ نے اس کی ولادت پر بہت کچھ خوشی کا اظہار کیا۔ حسبِ رواج نجومیوں اور پنڈتوں کو مولود کا زائچہ دیکھنے کے لیے بلایا۔ یہاں پر سرورؔ کا کمال دیکھیے کہ برہمنوں کا مطلب کس خوبی کے ساتھ انھیں کی اصطلاح اور زبان میں ادا کیا ہے جس پر تصنع کی تہمت نہیں ہے۔ لکھتے ہیں:

"بہت سوچ بچار کر برہمنوں نے عرض کی، مہاراج کا بول بالا رہا، تم ہر دم بڑھے، مرتبہ دوبالا اعلیٰ رہے، ہماری پوتھی کہتی ہے بھگوان کی دیا سے شاہزادہ کا چندرماں بلی ہے، پرتاپ سورج ..."

جوگرہ ہے وہ بجلی ہے۔ دگمبنگ کا ماتا ہے، دھرم مورت یہ بالک رہے، جلد راج پر براجے، پرتھمی میں دھوم مچے ایسی شادی رچے، استری تین ہو وے کا پر ان ایک کے ہن ہو مگر پندرہویں برس مشتری بارہویں آئیگی، سنیچر پاؤں پڑے گا، ایک ٹھکیرو سُوے کے برن میں ہاتھ آئیگا ترپائی کھٹ پٹ سے وہ بچن سنائے گا کہ راج پاٹ چھوڑ دیس سے بدیس لے جائے گا، ڈگر میں شہزادہ بھٹکے گا کوئی مانس پاس نہ پھٹکے گا۔ ساتھی چھٹیں اپنے ڈیل سے ڈانواڈول رہے، پھر ایک منکھ ٹھاکر کا سیوک کرپا کرے راہ لگانے کو، ہاکلنکن لو بھی ہو کشٹ دکھائے، وہاں سے جب چھُٹے رانی ملے مہا سُندر، وہ چرن پر پران وارے تبا اُس کا گیا ملی، گن کی کتھنی دے اس سے کئی مچھ مارے، دُکھ میں آڑے آئے، بگڑے کاج بنائے، جب اس نگر پہونچے جسکے چت میں گھر چھوڑے تو لاب بہت ہو درب گھنے ہاتھ آئیں دورسب کلیس ہو جائیں پر ایک ہتی من کا کپٹی استری پر دو چت ہو کر گُمڑائی کرے، جُجھ پڑیں، نرناری لڑیں اور کچھ پل میں بھی الجھل پڑے پر بھی لوگ چھٹ جائیں، ناز نگر کھوج میں پھر آئیں سب بچھڑے مل جائیں، ماتا پتا کے بھاگ آئیں بڑا راج کرے، دیا دھرم کے کاج کرے، کسیا ل کی کرپا سے جان کی کھیر ہے، بڑی بڑی بھرتی کی سیر ہے۔"

فسانہ نگاری کا کمال یہ ہے، کہ جس کی جو گفتگو نقل کی جائے ہو بہو اُسی کی زبان اور محاورہ میں ہو یہاں برہمن کی تقریر اُسی زبان میں اور اُسی طرز و آئین سے ہے جو خاص جوتشیوں اور پنڈتوں کا ہے اور لطف یہ ہے کہ برہمنوں کی تقریر میں بھی سرور سپرور فسانہ کا رنگ تحریر اور انداز بیان ہاتھ سے جانے نہیں دیتے جس سے ان کی وسعت علم و نظر اور قدرت تحریر معلوم ہوتی ہے۔

فی الحقیقت مرزا رجب علی بیگ سرور کو زبان پر پورا عبور حاصل تھا، ہر قسم کے لغات و محاورات اور اُن کے محل استعمال اور ہر قسم کی بول چال اور گفتگو سے اُن کو کامل واقفیت تھی، کس طبقہ کے لوگوں کی کیا بول چال ہوتی ہے، مختلف پیشہ وروں کی کیا اصطلاحیں اور محاورے ہیں، مختلف فرقوں اور جماعتوں کے امتیازات کلام و خصوصیات زبان کیا ہیں، ان سب باتوں پر ان کی نظر تھی۔

درباروں اور جشنوں، مذہبی تقریبوں اور شادی و غمی کی مجلسوں کے کل آئین اور طریقے اُن کو معلوم تھے، اس زمانہ کے جتنے رسوم و رواج تھے اور سوسائٹی کے جس قدر آداب اور قرینے تھے اُن سب سے وہ بالتفصیل باخبر تھے، ہر طرح کی سوسائٹی اور ہر قسم کے لوگوں سے شب و روز اختلاط اور میل جول رکھتے تھے، اس لیے سب کی فطرت، مذاق اور بول چال سے واقف تھے۔ یہی سبب ہے کہ جس مضمون پر قلم اُٹھاتے ہیں اُس کو ادھورا نہیں چھوڑتے اور جس چیز کی تصویر کھینچتے ہیں اُسکو دھندلا نہیں رکھتے

وہ جس منظر کو پیش کریں گے اس قدر صاف، واضح اور جلی ہوگا کہ اصل شے آنکھوں کے سامنے آجائے گی، اور ہم اس کے تمام لوازمات اور جزئیات آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔ یہاں پر بطور مثال فسانۂ عجائب سے دو ایک نمونے دیے جاتے ہیں، مثلاً جان عالم سفر کو روانہ ہوتا ہے، جلوس ہمراہ ہوتا ہے جس میں ہاتھی، گھوڑے، اونٹ، ماہی مراتب، شکاری جانور، سقے، کہار، سپاہی، سکھپال وغیرہ وغیرہ شامل ہیں۔ سب کو الگ الگ مع اوصاف کے بیان کیا ہے۔ گھوڑوں کی تعریف میں اشہب خامہ کی روانی ملاحظہ فرمائیے۔

"یہ جب بڑھے تو سواری کے خاص خاصے نظر آئے، عربی، ترکی، تازی، عراقی، یمنی اور کاٹھیاواڑ کا دکھنی، وہ گھوڑا جو ابلق لیل و نہار کی نظر سے نہیں گزرا۔ بیکرو ایسے کہ جو دریا میں درآئیں سوار بجرے کا مزا لوٹیں، سُم کے تلے حباب نہ ٹوٹیں، ہڑا نہ موتر انہ رس کا خلل، ڈنک اُجا ڑنہ کھونٹا اُکھاڑ، سانپن نہ ناگن، عقرب نہ اژدر، شبکور نہیں، مُنہ زور نہیں کم خورہ نہ مٹھا نہ کھونٹا، بال بہ نرمی سے صاف، حشری نہ کمری، گردن تنگ نہیں، سینہ کا تنگ نہیں ہمہ تن اوصاف، کسی پر جڑاؤ زین بندھا الماس زمرد کی ہرنی، کسی پر جامہ دوالگو کسا، بنابنا کر زمین پر پاؤں دھرتے، کودتے پھاندتے لیلیاں بھرتے، کسی کی نقدہ گردنی اُلٹی موتیوں کی جھالر لٹکتی، گنڈہ ٹپا، ساز یراق جواہر نگار پوزی مُرصّع طرحدار، پر ہما کی کلغی لگی، ماکھر پر کلف گچھوں پر پٹے تن، دوگاما گام خرگام براغہ، جیسے راہوار، دُلکی کا منجا دُلیں کرتا، جلو دار چنچل رسیے مشغول گلس رانی میں، ہمرکاب، تیاری بردار معقول سے گرم جاں فشانی میں، باگ ڈوریں پُرزر سائیس لیکر نکلے"۔

باغ کی کیفیت کئی مقام پر دکھائی ہے اور خوب خوب گل بوٹے کھلائے ہیں ایک جگہ لکھتے ہیں:

"وہاں کے باغ کا کیا کہنا، اگر ایک تختے کی صفت تحریر کروں ہزار تختۂ کاغذ پر خط ریحاں اس گلزار کی تعریف نہ لکھ سکوں، دم تسطیر قلم میں برگ نکالتے لکھنا بار ہوتا ہے ہاتھ پاؤں بالکل پھولتے ہیں صفحۂ قرطاس پر گل پھولتے ہیں حاسد شاخسانے نکالتا ہے، خار ہوتا ہے، صریر خامہ میں بلبل کے چہچہے پیدا ہوتے ہیں، باغبان کو حالت حال کی ہوتی ہے اور سطر ریحاں میں طائر مضمون پھنستے ہیں، بعینہٖ کیفیت صیاد کے جال کی ہوتی ہے بہت آراستہ و پیراستہ عرض مربع میں چاروں کونوں پر چار بنگلے گرد سبزۂ نو خاستہ دروازہ عالیشان نفیس مکان زیر دیوار خندق پر کیلے اکیلے نہیں قطار در قطار، تختہ بندی کی بہار، روش کی پٹریاں قرینے کی مہندی کی ٹٹیوں میں نزاکت مینے کی، گل مہندی سرخ زرد پر اثنا عباسی کے پھولوں سے قدرت حق نمایاں، نرگس دیدۂ منتظر کی شکل آنکھیں دکھاتی

تھی، گُل شبو سے بھینی بھینی بو باس آتی تھی، میوہ دار درخت یک لخت جدا بار کے بار سے ٹہنیاں
جُھکی، درخت سرکشیدہ، پھل لطیف و خوشگوار، پھول نازک قطع دار، روشیں بلور کی، نہریں نور کی
حوض و نہریں فوارے جاری، چمنوں میں باد بہاری، موسم کے آگے مینہ کا مستوں کی روش
بھیو سنا، غنچۂ سربستہ کا مُنہ تاک تاک کے نسیم کا چومنا۔ انگور کے خوشوں میں دل آبلہ دار کا پتا،
زربفت کی تھیلیاں چڑھی، نگہبانی کو گوشوں میں، خیابان الست گڑھیں ہر تختہ ہرا بھرا، روش کے برابر
چمنی کے نالوں میں درخت گلدا معنبر و معطر، بیلا چنبیلی موتیا موگرا مدن بان جوہی کیتکی کیوڑا نسرین و
نسترن کی ترائی آن بان، ایک سمت تختوں میں لالہ خوف خزاں سے با دل داغدار، گرد اُس کے
نافرمان کی بہار، سرو و شمشاد لب ہر جو، فاختہ اور قمری کی اُس پر تو تو حق سرہ، شاخ گل پر بلبل
شوریدہ کا شور، چمن میں رقصاں مور، کہیں خندہ کبک دری، کہیں تدرو بسر جلوہ گری، نہروں میں
قاز بلند آواز نیز مرغابی، کسی جا بط اپنے داو لیں خو غلطاں، ایک طرف قرقرے دو رویہ درخت گل کے
بار سے بھرے، سیب سے زنخ گلعذاروں کی کیفیت نظر آتی، ناشپاتی اور بہی آسیب دست باغباں
سے بری، ہر شاخ ہری، سنبل سلسل میں پیچ و تاب زلف مہوشاں کا ڈھنگ، سوسن کی اُداہٹ
مسی لب نو عروسوں کا جوبن دکھاتی، داؤدی زیر منت پروردگار عیاں، صد برگ میں ہزار جلوے
نہاں، آم کے درختوں میں کیریاں زمردنگار، مولسری کے درخت سایہ دار، خیابانیاں خوبصورت
سرگرم کار، خواجہ سرا امرد اُس مدد گار، حور و غلمان کا عالم، بیلچے کھرپیاں جواہر نگار مرصع ہاتھوں
میں باہم درخت اور روشوں کو دیکھتی جاتی، گل و بار چمن سے چنتی، گلا برگ سڑا بار جھڑا پڑا
خار صحن سے نکالتی پھرتی تھیں"۔

اب باغ سے جیت باغ باغ ہو چکی آئیے اور ایک صحرائے بے آب و گیاہ کا چل کر نقشہ دیکھیے کہ سرور
میرو رنے کن الفاظ میں اس کا سماں کھینچا ہے لکھتے ہیں :-

"ایک روز آفتاب کی تمازت بدرجۂ اتم تھی، پیاس کی شدت ہوئی، آب وہاں گوہر نایاب،
تھا، خضر تک اس دشت میں لاعلاج پانی کا محتاج تھا۔ زبان میں کانٹے پڑے، ریت کی گرمی سے
تلوے جلتے تھے، دو گام قدم نہ چلتے تھے، لو کا شعلہ یہ سرگرم آزار جگر سوختگاں تھا کہ پرندے
پتوں میں منہ چھپاتے تھے، کوسوں دم سے نظر نہ آتے تھے، دشت کورۂ آہنگراں تھا، ہر طرف
شعلۂ جوالہ دواں تھا، ریگ صحرا کیفیت دریا دکھاتی، پیاسوں کی دوڑ دھوپ میں جان جاتی تھی،
صدائے زاغ و زغن سے سناٹا، دھوپ کا تڑاقا، دشت کا تھپیڑا نے لگا تا تھا، جانور

ہر ایک پیاس کا مارا تھا، وہ تابش شمس جس سے ہرن کالا ہو، مذکور ہے زبان میں چھالا ہوا بادسموم سے وحشیوں کے منہ پر سیہ تاب تھا، لوں سے گاو زمیں کا جگر کباب تھا، سیپیوں نے گرمی کے مارے لب کھولے۔ تھے حباب دریا کی چھاتی میں پھپھولے تھے، ہر ذی حیات حرارت سے بیتاب تھا، سوا نیزہ پر آفتاب تھا، مچھلیاں پانی میں بھنی تھیں، جل جل کر کنارے پر سرد مثل تھیں، سرطانِ فلک جلتا تھا، کیکڑا لب دریا اُبلتا تھا، ایسے موسم کے سفر میں سفر کیونکر ہو، مسافر خواب میں بڑاتے چُلّو بھر پانی، درخت خشک سوکھے پتے کھڑکھڑاتے تھے، جانور رکھے پھڑپھڑاتے تھے، چارپائے ایک سمت ہانپتے تھے، گرمی کے خوف سے کانپتے تھے، یہ حرارت مستولی تھی کہ دستوں کی گرمی سے جی جلتا تھا، مسافر وہم پاسے گمان سے راہ نہ چلتا تھا، خورشید حشر کی طرح آفتاب تاباں تھا۔
صحرائے قیامت وہ بیاباں تھا"

آخر میں جانِ عالم اور انجمن آرا کی شادی کا حال بڑے لطف و خوبی سے لکھا ہے، شادی کی کل تقریبیں اور ریت رسمیں وضاحت و تفصیل سے دکھائی ہیں، اور بادشاہوں کی شادی میں جو سامان اور لوازم و تکلفات ہوا کرتے تھے اُن کا ایسا نقشہ کھینچا ہے کہ گویا سب باتیں آنکھوں سے دکھا دی ہیں۔

سرور نے جس طرز پر فسانۂ عجائب یا دوسرے فسانے لکھے ہیں، اس پر اس زمانہ کے لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ یہ طرز فسانہ کے لیے موزوں اور مناسب نہیں ہے، واقعات خواہ اصلی ہوں یا فرضی اُن کا بیان ایسی زبان میں ہونا چاہیے جو صاف سلیس اور عام فہم ہو، اور تکلفات، آورد اور مبالغہ سے بری ہو۔ یہ خیال انگریزی فسانہ نگاری کے طرز کو دیکھ کر آجکل کے نوجوانوں میں پیدا ہوا ہے اور اس سے ایک حد تک ہمیں اتفاق ہے۔ واقعی بات یہ ہے کہ فسانہ نگاری میں رنگینی عبارت اور تکلفات بیجا کو اس قدر بڑھا دینا کہ مطلب خبط ہو جائے اور مضمون الفاظ کی بھول بھلیوں میں پھنس کر رہ جائے داستان کو چیستاں بنا دینا ہے اور اس سے اصل مقصد فوت ہو جاتا ہے، اور ایسے فسانوں کا مطالعہ عام طبائع پر بارِ گراں بن جاتا ہے، تاہم جس طرح زیور سے حسن کی افزائش ہوتی ہے اور صورت کی خوشنمائی بڑھتی ہے اسی طرح صنائع و بدائع اور تکلفات رنگین سے حسن کلام لاکلام بڑھتا ہے بشرطیکہ وہ حد اعتدال سے متجاوز نہ ہوں۔ فسانوں اور قصہ کا خاص مقصد مثلاً حظ طبع اور تفریح خاطر ہوا کرتا ہے۔ اگر ان کو عبارت رنگین میں لکھا جائے تو یہ مقصد بدرجۂ اتم پورا ہوگا اور رنگین مزاج، خوش طبع حضرات سیدھے سادے اور روکھے پھیکے افسانوں کے مقابلہ میں ان کو زیادہ پسند کریں گے مگر موجودہ زمانہ کے نوجوان اصحاب جو عموماً فارسی اور اردو میں کم استعداد ہوتے ہیں، اور انگریزی لٹریچر کے دلدادہ ان

مطالعہ سے طرزِ جدید کے دلدادہ ہو جاتے ہیں اردو افسانوں میں وہی طرزِ تحریر پسند کرتے ہیں جو انگریزی افسانوں کا ہے اور اپنے بزرگوں کے تمام قابلِ فخر ادبی کارناموں سے نفرت رکھتے ہوئے ان کی طرف رُخ کرنا بھی نہیں چاہتے، اُن کو جاننا چاہیے کہ اردو ایک ایشیائی زبان ہے اور ایشیائی زبانوں کی بعض خصوصیات ہیں جو یورپین زبانوں کی خصوصیات سے بالکل علیحدہ ہیں۔ ان خصوصیات میں کمی بیشی اور اصلاح کی جاسکتی ہے لیکن انکو فنا نہیں کیا جاسکتا، جو لوگ اسکے درپے ہیں کہ اردو طرزِ تحریر کو ہو بہو انگریزی طرزِ تحریر سے ملا دیں وہ اپنی قوم اور اپنی زبان کے نادان دوست ہیں اور انگریزوں کی کورانہ تقلید میں لطفِ زبان کو برباد کر رہے ہیں۔

فسانۂ عجائب پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ اس میں صنعت رعایت اور ضلع جگت بہت ہے اور مشکل سے کوئی فقرہ اس سے خالی ملتا ہے ہمارے نزدیک یہ کوئی عیب نہیں ہے بلکہ سرور کے کمال کی دلیل ہے کلام میں صنائع و بدائع کی رعایت کوئی عیب نہیں بلکہ ہنر ہے بشرطیکہ ان میں آورد اور تکلف نہ ہو اور وہ اس صفائی اور بے ساختگی سے کلام میں لائے جائیں کہ سرسری اور سطحی نظر سے انکا پتہ بھی نہ چلے، سرور مرحوم کے متعلق ہم کو اس کا اقرار ہے کہ وہ جادۂ اعتدال سے ہٹ گئے ہیں اور ضرورت سے زیادہ تکلف برت گئے ہیں، تاہم یہ ہر مقام پر نہیں ہے کہیں کہیں ہے اور ان مشکل پابندیوں کو دیکھکر جو شروع سے آخر تک انھوں نے ملحوظ رکھی ہیں یہ بے اعتدالی قابلِ معافی ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی تو دیکھنا چاہیے کہ جس شرح و بسط سے انھوں نے یہ افسانہ یا دوسرے افسانے لکھے ہیں انکا جواب بھی کسی سے ممکن ہوا ہے؟ سیدھی سادھی زبان میں صفحے کے صفحے لکھتے چلے جایئے کوئی مشکل بات نہیں ہے اور سرور کے انداز تحریر میں چند سطریں لکھنا بھی کارے دارد کا مضمون ہے یہ امر بھی قابلِ لحاظ ہے کہ سرور نے جو زمانہ پایا اور جس زمانے میں فسانہ تحریر کیا وہ کون زمانہ تھا اور اُس وقت سوسائٹی کا کیا مذاقِ طبع تھا۔ وہ لکھنؤ کے رہنے والے تھے، یہاں کے رنگ شناس تھے۔ وہ یہاں کے رہنے والوں کے لیے انھوں نے افسانہ لکھا تھا، اُس وقت کا لکھنؤ آج کا لکھنؤ نہ تھا۔ بلکہ یہاں کی زبان کے جھنڈے تمام ہندوستان میں گڑے ہوئے تھے، یہاں کی بول چال معمولی بول چال نہ تھی کہ سیدھی سادھی باتوں میں مطلب ادا کرلیا اور جو کہنا ہو وہ کہہ لیا۔ اہل لکھنؤ کی شان تو یہ تھی کہ روزمرہ کی گفتگو میں بھی وہ صنائع و بدائع صرف کرتے تھے اور مرصع الفاظ اور فقرے بولتے تھے انکی ہر بات میں ایک بات ہوتی تھی اور انکے ناخواندہ طبقے کے لوگ بھی دوسرے مقامات کے پڑھے لکھے لوگوں کا گفتگو میں ناطقہ تنگ کر دیتے تھے، انکو ایسی باتوں سے نفرت تھی جو سیدھی سادھی ہوں اور جن میں کوئی حسن و خوبی نہ نظر آتی ہو، سوسائٹی میں ان

لوگوں کی قدر و منزلت سب سے زیادہ ہوتی تھی جو قادر الکلام زیادہ ہوتے تھے، جیسا کہ ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں لکھنؤ کے عام لوگ صنعتِ رعایت کے عاشق تھے، یہ صنعت اگرچہ صنائع معنویہ میں داخل ہے وہ اس کو رعایت لفظی کہتے تھے اور اس میں ایسا کمال پیدا کر لیا تھا کہ برجستہ اور بے تکلف عام گفتگو اور بول چال میں اسکی رعایت برتتے جاتے تھے۔ سرور مرحوم نے جو افسانہ لکھا اُس میں حضرات لکھنؤ کے اس مذاق کا پورا پورا لحاظ رکھا، اگر وہ ایسا نہ کرتے تو فسانۂ عجائب ہرگز اتنا مقبول نہ ہوتا۔ اس لیے اگر بے اعتدالی اور افراط کے ساتھ اسکے برتنے میں وہ لغزشیں کر گئے تو نظر انداز کیے جانے کے قابل ہیں۔

سرور سے کچھ پہلے یا اُن سے قریب زمانے میں بہت سے افسانے لکھے گئے، مثلاً باغ و بہار حاتم طائی، طوطا کہانی، گل بکاولی، الف لیلہ، گل صنوبر وغیرہ وغیرہ لیکن فسانۂ عجائب کو کوئی نہ پہنچا۔ باغ و بہار قصہ دلچسپ ہے اور صفائی زبان، روانی بیان میں سب سے بہتر ہے مگر وہ رنگینی بیان کہاں جو فسانۂ عجائب میں ہے۔ فسانۂ عجائب کا قصہ بھی دلچسپ ہے اور اسمیں خاص بات یہ ہے کہ خوشی غمی، سفر، حضر، رزم، بزم، غرضیکہ جس حالت کی تصویر کھینچی ہے اس وضاحت و تفصیل سے کھینچی ہے کہ تمام جزئیات اور لوازم دکھا دیے ہیں اور چھوٹی سے چھوٹی باتوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے۔ یہ بات دوسرے افسانوں میں نہیں ہے۔

جس طرح فسانۂ عجائب زمانۂ قدیم میں مقبول ہوا اور اُس کی قدر ہوئی، ویسا ہی زمانۂ حال میں اس کے ساتھ بے اعتنائی برتی جا رہی ہے اور اس کی بیقدری ہے۔ پہلے گھر گھر میں پڑھا جاتا تھا، اور عورتیں بچوں کو یہ افسانہ سنا کر انکو بہلایا کرتی تھیں، اور صحبتوں اور مجلسوں میں لوگ اس کو سنا کرتے تھے، اب مدتوں سے طاقِ نسیاں پر رکھا ہوا ہے، اور بازاروں میں کتب فروشوں کی دکانوں پر بھی مشکل سے ملتا ہے[1] ۔ سچ یہ ہے کہ دنیا میں ہر چیز کی ایک عمر ہوا کرتی ہے، کتاب کی بھی ایک عمر ہوتی ہے، جب وہ عمر پوری ہو جاتی ہے تو پھر کوئی اُس کو نہیں پوچھتا، اور وہ گوشۂ گمنامی اور کنج کسمپرسی میں چھپ جاتی ہے یہی حال اس کتاب کا ہے کہ اب اس کا ذکر خیال اور افسانہ سے زیادہ نہیں ہے۔

اگلے زمانہ کے لوگ دنیا سے اُٹھ گئے اور اُن کے ساتھ اُس زمانہ کا مذاق طبیعت اور انداز تقریر و تحریر بھی رخصت ہو گیا، اب نیا زمانہ ہے، اور نئی روشنی کے لوگ ہیں جن کے خیالات اور بات چیت کے ڈھنگ بھی نئے ہیں۔ انکے نزدیک صنائع و بدائع تکلفات محضہ اور ضلع جگت لغو اور مہمل چیزیں ہیں، جن سے زبان کی ترقی رُکتی ہے اور ادائے مطلب میں دشواری ہوتی ہے اور کلام میں طول و طوالت

[1] ایسا تو نہیں ہے۔ خدا سلامت رکھے نولکشور پریس کو، دو قسم کا تو وہیں چھپا ہے، ایک جلی قلم، دوسرا متوسط یا خفی قلم کا۔ اس کے علاوہ الہ آباد اور لاہور کے طبع شدہ نسخے بھی ملتے ہیں۔ ایڈیٹر

ہوتا ہے۔ وہ نہ ان باتوں کو جانتے ہیں، نہ ان میں کبھی پڑتے ہیں، انکی تقریر و تحریر کی مثال بیوہ عورت کی سی ہے جو زیور سے معرّیٰ اور آرائش و زیبایش سے خالی ہو، ان کی زبان اور انکا قلم مافی الضمیر اور مطلب کو ادا کر دیتا ہے مگر اس طرح کہ نہ خاص تاثیر پیدا ہوتی ہے اور نہ طبیعت کو شگفتگی اور دل و دماغ و سرور حاصل ہوتا ہے۔

کاش کوئی جماعت ایسی پیدا ہوتی کہ طرز رنگین اور طرز سادہ دونوں میں اصلاح کر کے اعتدال اور امتزاج قائم کرتی اور ہماری زبان میں تحریر و تقریر کا ایسا راستہ نکالتی جس میں لفظی و معنوی دونوں محاسن جمع ہوتے۔

اعتمادِ محبت

(جناب حکیم سید علی صاحب آشفتہ لکھنوی)

بےمروت سے جفا کی ابتدا ہونے تو دو
میری دنیا سے تمنا کو فنا ہونے تو دو

بیکسی کر دیگی آسودہ زمانے سے مجھے
دردِ دل کو بڑھتے بڑھتے لادوا ہونے تو دو

رخ بدل دونگا زمانے کی ہواؤں کا مگر
خونِ ناحق سے مرے رنگیں فضا ہونے تو دو

پوچھ لوں گا آسماں کی گردشوں کا بھی مزاج
اک ذرا اونچے مرے دستِ دعا ہونے تو دو

دل کے زخموں پر بہارِ جاوداں چھا جائیگی
اُنکے ہاتھوں سے ذرا خونِ وفا ہونے تو دو

اک دنیا منتظر ہے بیان دینے کے لیے
جور کے قابل اُنھیں نامِ خدا ہونے تو دو

دیکھ ہی لے گا جہاں نیرنگ سازِ حسن و عشق
شمع کے شعلوں سے پروانہ جدا ہونے تو دو

دیدنی ہوگی چمن زارِ محبت کی بہار
بیوفا سے پھر نیا عہدِ وفا ہونے تو دو

ہر تمنا میکدہ بردوش آئے گی نظر
دل سے دل ملنے تو دو شکوا گلا ہونے تو دو

اک بہارِ کیف ہوگی ہر طرف چھائی ہوئی
مد بھری آنکھوں سے دل کا واسطا ہونے تو دو

اک نگاہِ ناز سے دل کی گرہ کھل جائیگی
بےمروت کو مروت آشنا ہونے تو دو

میری چشمِ شوق لیتی ہے بلائیں کس طرح
اُنکو بزمِ ناز سے جلوہ نما ہونے تو دو

پھر جنونِ عشق کی معجز نمائی دیکھنا
اُنکو برہم وقتِ عرضِ مدعا ہونے تو دو

اپنی آشفتہ بیانی کی دکھاؤں گا بہار
اک ذرا پیدا طبیعت میں مزا ہونے تو دو

ناظر بنام الناظر

(جناب چودھری خوشی محمد خاں صاحب ناظر بی اے)

الناظر کے جاری ہونے کے چند ہی ماہ بعد میں اپنے عزیز مکرم شیخ مقبول حسین صاحب تعلقہ دار گدیہ سے ملنے جموں گیا جو اُس زمانہ میں ریاست کشمیر کے وزیر مال تھے۔ حضرت ناظر ریاست میں پہلے سے سلسلۂ ملازمت مقیم تھے اور میری تحریک پر شیخ صاحب نے اُن کو الناظر کی قلمی اعانت کی دعوت دی۔ جموں سے واپسی پر الناظر حضرت ناظر کی خدمت میں روانہ کیا گیا تو انہوں نے یہ مراسلہ بھیجا جو اُس وقت خدا العلوم کیوں شایع ہونے سے رہ گیا۔ حال ہی میں تبدیلی مکان کی وجہ سے تمام پرانے کاغذات الٹ پلٹ گئے اور ایک ضروری خط کی تلاش میں کئی دن تک مصروف رہنا پڑا۔ وہ خط تو نہیں ملا البتہ بعض اور قیمتی تبرکات نکل آئے جن میں سے ایک یہ غیر شایع شدہ مراسلہ بھی تھا۔ اس مضمون کی وہ اہمیت تو باقی نہیں جو الناظر کے ابتدائی عہد میں تھی مگر حضرت ناظر کا تبرک سمجھ کر اسے ناظرین تک پہونچا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ایڈیٹر

مخدومی مکرمی جناب ایڈیٹر صاحب

رسالۂ الناظر نظارہ افروز دیدۂ ناظر ہوا۔ اور دلی مسرت سے میں نے اس کا خیر مقدم کیا۔ حبذا حبذا تعال تعال۔ میرے شاعرانہ نام کو الناظر سے جو نسبت ہے وہ ظاہر ہے۔ صرف الف لام کا فرق ہے اور یہ الف لام کا طرہ آجکل ایسا فیشن ایبل اور دلکش سمجھا جاتا ہے کہ جب سے اخباروں کی اشاعت ہوئی میاں بڈھے خاں اور جمعے خاں اپنا نام البڈھا و الجمعہ لکھتے ہیں۔ غرض ناظر اور الناظر میں کچھ فرق نہیں۔ ہر شخص کو اپنے نام کی لاج ہوتی ہے اور میری عین آرزو ہے کہ جہاں تک ممکن ہو الناظر کی خدمت کروں مگر افسوس یہ ہے کہ علائق روزگار نے مجھے اُس کولھو کے بیل سے مشابہ کر دیا ہے جس کی شان میں شیخ شیرازی فرماتے ہیں ؎

چو گاوے کہ عصار چشمش ببست ۔۔۔ دوان تا بشب شب ہمانجا کہ ہست

ملازمت اختیار کرتے وقت میں نے یہ خیال کیا تھا کہ سرکاری کام چار یا پانچ گھنٹے کا مشغلہ ہوگا اور اوقات فرصت میں وہی یاران ہم نوا کی صحبتیں ہوں گی مگر یہ بار امانت اٹھانے کے بعد معلوم ہوا کہ سب علمی

اُمنگیں اور شاعرانہ شغلے فرضِ منصبی کی نذر ہوئے اور سب گلستاں بوستاں نقش و نگار طاقِ نسیاں ہو گئیں ؎

مری خواب و خور بھی حرام ہے شب و روز کام ہی کام ہے
یہی شام ہے یہی صبح ہے یہی صبح ہے یہی شام ہے

نتیجہ یہ ہے کہ ایسی حالت میں الناظر کی خدمت کے لیے احرام باندھنا سودائے خام ہے۔ میں اسی حیص و بیص میں تھا کہ الناظر ہی سے پیغام پہونچا کہ کوئی عذر پذیرا نہ ہوگا۔ الناظر کی خدمت ناظر کو ضرور کرنی ہوگی ؎

تمھیں کاروبار کا شوق ہے ہمیں نظم و نثر کا ذوق ہے
تمھیں اپنے کام سے کام ہے ہمیں اپنے کام سے کام ہے

سنگ آمد و سخت آمد۔ عالم سفل کے رہنے والوں کی عالم بالا کے ہاتھ میں زمام ہے۔ بجز امتثال امر چارہ نہیں۔ مگر دیگر رسالوں کے کرنیل صاحبان سے جو صاحب ہو چکے ہیں اور جو عدم فرصت کی وجہ سے ایفا نہ ہونے پائے اُنکی طرف سے اب نالشیں دائر کی جائیں گی۔

آمدم برسرِ مطلب۔ اس میں شک نہیں کہ صوبۂ اودھ سے ایک علمی رسالہ کا شایع ہونا نہایت موجب مسرت ہے۔ یہ خطہ مردم خیز علم و کمال کا گہوارہ رہ چکا ہے خصوصاً زبان اُردو کی نشو و نما پر جو اس کے احسانات ہیں وہ شاہجہاں آباد سے کچھ کم نہیں۔ اُردوئے معلی نے دہلی میں جنم لیا اور یہیں کے آغوشِ محبت میں پرورش پائی مگر شباب کے ناز و ادا غمزہ و کرشمہ بہت کچھ مشاطۂ لکھنؤ سے سیکھے۔ زمانہ حال میں جبکہ عروسِ دہر کی طرح عروسِ اُردو بھی نیا چولا بدل رہی ہے اور نئے نئے آرایش کے سامان ہو رہے ہیں اہل اودھ کا عموماً اور اہل لکھنؤ کا خصوصاً فرض ہے کہ اس خانہ زاد کی تربیت میں نمایاں حصہ لیں۔ فی زمانہ یہ امر مسلمات سے ہے کہ تمام علمی سوشل، پولیٹکل، اخلاقی، ادبی وغیرہ امور میں بہترین ذریعہ ترقی کا اخبارات و رسائل وغیرہ ہیں۔ اس نئی روش میں حمایتِ اُردو کا بیڑا سب سے پہلے ایک زندہ دل پنجابی شیخ عبد القادر بی اے (بار ایٹ لا) نے اُٹھایا۔ اور یہ فخر ہمیشہ کے لیے ان کا طرۂ دستار رہیگا۔ اگرچہ وہ دستار کے عادی نہیں اور یہ طرہ اُنھیں ترکی ٹوپی کے پھندنے میں ہی لٹکانا پڑیگا۔ اسکے بعد بہت سے دلچسپ اور مفید رسالے اسی ڈھنگ پر شایع ہوئے اور اُن کی تعداد میں روز افزوں ترقی ہو رہی ہے۔ مگر علاوہ فضلِ تقدم کے قبولِ عام کا خلعت بھی مخزن کو ہی عطا ہوا۔ مخزن کا دارالاشاعت پنجاب ہے جسکی شان میں ایک پنجابی شاعر کہتا ہے ؎

چہ پنجاب انتخاب ہفت کشور قسم خوردہ بخاکش آب کوثر

مگر جسکو بیدرد اہل زبان پنجابی ڈنگروں کی چراگاہ قرار دیتے ہیں۔ یہ لوگ کچھ ہی کہیں مگر تمام کرۂ ارض

ایک ڈھکے ہوئے سینگوں پر پڑا لٹک رہا ہے ۔ ارے دور کیوں جاؤ سورۂ بقرۂ اس سادہ مخلوق کی ہستی پر مہر استخارہ ہمیشہ کے لیے لگا دی ہے ۔ غرض چند نگہوں کی تلطف رانی سے زعفران زار مخزن کا بیج بو دیا گیا۔ یہ نونہال اس تماک پاک میں پھلا اور پھولا ۔ اور اسکے مشام جاں پرور اطراف و اکناف ہند میں پہونچی۔ امراے یورپ کا عام دستور ہے کہ نوجوان لیڈی کی تعلیم ناز آفرینی مکمل کرنے کے لیے انکو شاطی فرانس کے حوالہ کیا جاتا ہے اور کچھ عرصہ کے لیے پیرس کے دبستان میں ان کی درس بازی ہوتی ہے۔ شاید اسی خیال سے شیخ صاحب بھی اس بھولے بھالے محبوب کو لاہور سے لے اڑے اور نکتہ نوازان دہلی کے سپرد کیا ۔ پنجابی ارباب مخزن کے دلوں میں خدشہ سا لگ رہا تھا کہ کہیں اس تعلیم ناز میں مخزن کی مردانہ جدت طرازی بے معنی نزاکت و زنانہ پن سے مبدل نہ ہو جائے ۔ مگر شیخ صاحب ایک استاد تھے ۔ انھوں نے اسکے قدرتی حسن و جمال کو کسی غنج و دلال سے چار چاند لگا دیے اور اس تبادلہ مکان سے مخزن کے جواہر کی آب و تاب اور بھی زیادہ ہو گئی ۔ استعارہ برطرف مخزن کو جو ہر دلعزیزی آغاز اشاعت سے حاصل رہی ہے اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اسکے اڈیٹر کا مذاق شہد کی مکھی کا سا واقع ہوا تھا ۔ اس نے سیکڑوں باغوں کی سیر کی اور ہزاروں پھولوں کا رس چوس لیا اور اپنی کی دلآویز شکل میں دوکان مخزن میں اس کو لا سجایا ۔ یعنی مختلف مذاق کے اہل قلم کی امداد سے زیب اختلاف پیدا ہو گیا ۔ ان میں بہت سے ایسے اشخاص تھے جن کی زبان صاف نہ تھی بعض متعارفہ بحور و اصول عروض سے بھی واقف نہ تھے ۔ بعض ایسے آزاد تھے کہ زبان یا طرز بیان میں کسی کا تتبع باعث عار سمجھتے تھے اور ادبیت کے جنگلی ہرنوں کی طرح طرارے بھرتے تھے ۔ مگر یہی ان کا طبعی جوش اور جدت طرازی مخزن کی ہر دلعزیزی کا باعث ہوگئے ۔ اب دہلی میں آنے سے مخزن کی زبان بھی ٹکسالی ہوتی جاتی ہے اور اسکے قلمی معاونین کی جودت طبع کا خاص رنگ بھی ترقی پر ہے۔

مخزن کی مدحت سرائی اس غرض سے کی گئی ہے کہ الناظر کو مخزن سے مقابلہ درپیش ہے اور اس کی کامیابی کا راز الناظر کو معلوم ہو جانا چاہیے ۔ الناظر کے اڈیٹر صاحبان[1] کی خدمت میں مجھے ذاتی طور پر نیاز حاصل نہیں ، مگر انکے رشحات قلم سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ قابل انشا پرداز ہیں

---

[1] افسوس کہ میرے ابتدائی رفیق کار منشی وصی حسن بی اے ایل ایل بی وکیل لکھنؤ جن کا نام ابتدا میں الناظر کے سرورق پر درج ہوا کرتا تھا اور جو صرف میرے قریبی عزیز ہی نہیں بلکہ بچپن کے ساتھی ہونے کی وجہ سے عزیز ترین دوست بھی تھے تقریباً آٹھ دس سال ہوئے کہ اس دار فانی سے رحلت کر گئے ۔ ایڈیٹر

لیکن صرف اڈیٹر صاحبان کے رشحات قلم سے الناظر سرسبز نہیں ہو سکتا اور چند زندہ دل و با مذاق اربابِ فن کی قلمی آبیاری کی سخت ضرورت ہے کیونکہ ایک ہی قسم کی طرز تحریر سے زمانۂ حال کے سیماب طبع ناظرین اکتا جاتے ہیں۔ نیز رسالہ کے ہر دلعزیز کرنے کے لیے چند دیگر امور کا مدنظر رکھنا مناسب ہوگا۔ جن کا مختصر ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے

عام طور پر مضامین سریع الفہم اور دلچسپ ہوں اور حتی الوسع مبالغہ اور خود فروشی سے کام نہ لیا جائے۔ موجودہ زمانہ سخت دماغ و کار زار کا زمانہ ہے اور جس شخص نے دن بھر کالج یا کچہری میں دماغ خالی کیا ہے وہ وقت فرصت میں تفنن طبع کا سامان چاہتا ہے۔ اُس کو کیا مصیبت پڑی ہے کہ اٹ ابجر کا مطالعہ کرنے کے لیے قاموس و برہان قاطع کی ورق گردانی کرے۔ یورپین ممالک میں ایسے رسائل کا طرز بیان ایسا سبک و سریع الفہم ہوتا ہے کہ اس کو لائٹ لٹریچر کہتے ہیں اور مضمون نگار کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ ہلکی نیچرل زبان میں دلچسپ اور اچھوتے خیالات ادا ہو جائیں جو ناظرین کی تفریح طبع کا کام دیں بخلاف اس کے ہمارے بعض پرانی وضع کے اہل قلم پبلک کی ضیافت طبع کے لیے ایسے سنگین نوالے تجویز کرتے ہیں کہ نہ تو حلق سے نیچے اُتریں نہ معدہ میں جا کر ہضم ہوں۔ ایسی لن ترانیوں سے تفاخر اور تعلّی کی غرض تو پوری ہو جاتی ہے مگر عام ناظرین ایسے مضامین کی چند سطریں پڑھ کر چھوڑ دیتے ہیں۔ ان لوگوں کو ایسا طرز بیان مطبوع ہے جو بے تکلف دوستوں کی بے تصنع گفتگو سے مشابہ ہو۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ جس مضمون کے معنی فی بطن الشاعر کے مصداق ہوں اُس سے نہ پبلک کو کچھ فائدہ پہونچ سکتا ہے نہ دلچسپی ہو سکتی ہے۔ اُس پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ عالمانہ مضامین کے واسطے عالمانہ طرز بیان لابدی ہے اور عامیانہ مذاق کی دلآلی کرنا خاصوں کی شان سے بعید ہے مگر میرے اس دعوے کی تائید شموس ثلاثہ مولانا حالی۔ مولانا شبلی۔ اور مولانا آزاد کی تصانیف سے ہو سکتی ہے کہ نہایت باریک علمی مسائل کو عام فہم زبان میں ادا کر دیا ہے۔ شمس العلما مولوی ذکاء اللہ صاحب نے سپکٹیٹر کا حوالہ الناظر میں دیا ہے[1]۔ جب تک انگریزی لٹریچر دنیا میں قائم ہے سپکٹیٹر کے خاص سٹائل کی تعریف کم نہ ہوگی مگر سب سے بڑی خوبی اس پرچہ کی یہی تھی کہ اعلیٰ اخلاقی و فلسفیانہ مضامین کو نہایت پُرلطف و سہل الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ اڈیٹر کا یہ دعویٰ تھا کہ ہم نے اخلاق اور فلسفہ کو کالجوں سے نکال کر قہوہ خانوں میں رکھ دیا ہے۔ اور درحقیقت ایسے ادق مضامین کا لکھنا بے سود ہے جن کا سوسائٹی کے مذاق پر کچھ اثر نہ ہو۔

چہ سود افسوس گری اے دل کہ یا دلبر نمی گیرد

[1] مرحوم کا یہ مضمون الناظر ماہ ـــــــــ میں شایع ہوا تھا۔

الناظر کے ایک قدامت پسند اور محترم مضمون نگار سے میرا کلی اتفاق ہے کہ زمانۂ حال کے اہل قلم کو باعتبار تبحر علمی مشق سخن و زباں دانی کے اساتذۂ سلف سے کوئی نسبت نہیں - مگر انکے اس قول کو تسلیم کرنا مشکل ہے کہ زمانۂ غدر کے بعد کی کوئی تصنیف نظم و نثر کسی اعتبار کے قابل نہیں - میرے خیال میں لفظی رعایتوں اور بعینہٖ استعاروں کی زنجیروں کو روز بروز زیادہ کستے جانا دائرہ ادب کو نہایت محدود کرنا ہے - مثلاً اس التزام سے کہ کمر کے لیئے عدم و جود ، زنخداں کے لیے چاہ اور ابرو کے لیے کمان وغیرہ کی رعایت ضروری ہے - ہماری مضمون آفرینی کا دائرہ نہایت تنگ ہو گیا ہے اور اس ریوڑی کے پھیر میں جودت طبع دکھانے کا کوئی موقعہ نہیں ہوتا - حال کے تعلیم یافتہ ان قیود کی چنداں پروا نہیں کرتے اور اس آزادی کی برکت سے انکے کلام میں جدت اور شگفتگی پیدا ہو جاتی ہے - بطور نمونہ ملاحظہ ہو کلام ذیل -

ایک کہنہ مشق بزرگ فرماتے ہیں : " قد خراماں اُس کا سرو جوئبار رعنائی - عارض درخشاں رشک گلزار زیبائی - ابروئے خمدار آبروریز تیغ اصفہانی - زلف دراز جفا آموز بلائے آسمانی " علیٰ ہذا القیاس

اب ملاحظہ ہو نئے فیشن کا نمونہ - مسٹر ملیدرم[1] مخزن میں لکھتے ہیں " اتنے میں ایک انبت فرنگ ہوٹل سے نمودار ہوئی - گورے گورے گالوں والی بھورے بھورے بالوں والی - نیلی نیلی آنکھیں اسکی مست نشیلی آنکھیں اسکی اور (جب گھور کر دیکھو تو) شرمیلی آنکھیں اسکی ایک تیتری کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہی ہیں ؎

اے دل عشاق بدام تو صید   من بتو مشغول و تو با عمرو زید

تیتری کا یہ عالم ہے کہ اس پھول سے لپٹی اُس پھول پہ جھپٹی - اس کا رس چوسا اُس سے ہم آغوش ہوئی - مس ڈورا ہزار ڈورے ڈالتی ہے مگر یہ تیتری پھندے میں نہیں آتی " - الخ (مخزن پاس نہیں لفظی تغیر معاف ہو)

ان دونوں نمونوں کا فرق ظاہر ہے - بڑے میاں کی پختہ انشاپردازی قابل داد ہے مگر ملیدرم کی چلبلی تیتری کے سامنے انکا رنگ نہیں جمتا - بھورے بھورے بالوں کی سند اساتذۂ سلف کے کلام میں ملنے سے رہی مگر مس ڈورا کے بال ہی بھورے بھورے ہوں تو مسٹر ملیدرم کیا کریں - ایسے ہی بڑے استادوں نے بلبل کو عشق گل کا ٹھیکہ دار بنا رکھا ہے مگر انصاف کی بات یہ ہے کہ پھولوں کی محبت میں تیتری کا مرتبہ بلبل سے کہیں زیادہ ہے - تیتری کا پھول سے ویسا ہی تعلق ہے جیسا شمع سے پروانہ کا - بلکہ سچ تو یہ ہے کہ بلبل کو تو عشق سے مس نہیں - یہ صرف ایرانی عاشق مزاجوں اور انکے ہندی تابعین کا ایجاد طبع

[1] مشہور ادیب سید سجاد حیدر صاحب کبھی اس فرضی نام سے مضمون نگاری کیا کرتے تھے -

تھا کہ اس کی خوش نوائی سے مسرور ہو کر بلبل کو زمرۂ عشاق میں داخل کر لیا ؎

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں
تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

نتیجہ یہ ہے کہ خذ ما صفا و دع ما کدر پر عمل ہونا چاہیے۔ انظر الی ما قال ولا تنظر الی من قال۔ مگر اس سے میرا یہ مطلب نہیں کہ سنجیدہ مضامین نکلنے پائیں اور سرخ نیزئی اور جپیری کی سو انحمری سے اوراق الناظر کو مزین کیا جائے تاکہ بہتر ہوگا کہ اموات متقدمین لکھنؤ کا انتخاب کلام وقتاً فوقتاً ہدیۂ ناظرین کیا جائے اور انکے حالات زندگی نہایت تلاش سے فراہم کیے جائیں۔ لکھنؤ کے بہت سے خاندانوں میں یہ علمی ترکہ ابھی موجود ہوگا۔ کیونکہ

بزم کو برہم ہوئے مدت نہیں گذری بہت
اُٹھ رہا ہے گل سے شمع بزم کے اب تک دھواں

ایک اور مشورہ آپ کو دینا چاہتا ہوں۔ اور وہ یہ ہے کہ الناظر کو جمیع علوم کی انسائکلوپیڈیا بنانے کی کوشش نہ کریں۔ مثلاً علم ہیئت کا ایک مضمون جو گزشتہ اشاعت میں شایع ہوا ہے ایسے رسالے کے لیے کسی طرح موزوں نہیں۔ ایسے ادق مضامین جو کسی خاص فن سے متعلق ہوں عام ناظرین میں پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھے جاتے۔ اور ترقی یافتہ ممالک میں اس قسم کے مضامین صرف انھیں رسائل میں طبع ہوتے ہیں جو اسی خاص فن کے لیے مخصوص ہوں۔ اور اسی فن کے شایقین میں شایع ہوتے ہوں۔

شعر و سخن کے متعلق میری یہ رائے ہے اگر چہ مغربی ممالک میں اب ذوق سخن بہت ہی کم ہوتا جاتا ہے۔ اور زیادہ تر مضامین نثر میں لکھے جاتے ہیں مگر فن شعر پا سرار مشرق کے اسرار میں سے ایک سر خاص ہے۔ اور مشرقی طبائع کے لیے جو دلآویزی نظم میں ہے وہ نثر کو ابھی نصیب نہیں ہوئی۔ شعر و سخن ایک لایعنی شغل ہے مگر اور بہت سے لایعنی مشغلوں سے بہتر ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ بزرگوں کی یادگار ہے۔ مگر یہ ضروری نہیں کہ خانہ پری کے لیے رطب و یابس کی بھرتی کی جائے اور عامیانہ بازاری غزلوں سے اوراق الناظر سیاہ کیے جائیں یا مبتذل اور بے لطف نیچرل نظمیں شایع کی جائیں۔ مثلاً ؎

ایک گھوڑے نے یہ خچر سے کہا
تجھ سے کرنا ہے مجھے کچھ مشورہ
لالہ جی کو تو جو دھرلے پشت پر
تو مجھ میں پھر اتنی سکت لوں ؟ اٹھا

ہاں ایک بات اور یاد آگئی۔ دہلی اور لکھنؤ کے اہل کمال میں مدتوں سے مناظرہ اور مناقشہ چلا آیا ہے۔ دنیا عالم کون و فساد ہے اور چھیڑ چھاڑ سے اس کی رونق ہے کیا خوب ہو اگر آپ بھی اس قول پر کاربند ہوں کہ ۔ چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد۔ میرے خیال میں تحریری اور مناظرانہ نوکوں کی دلچسپی اس چھیڑ چھاڑ سے زیادہ ہو جائیگی۔ مگر مہذبانہ اور شریفانہ نوک جھونک ہو۔ جس سے کسی کی دل آزاری اور تذلیل مقصود

نہو اور پُرلطف جنگ زرگری کے پیرایہ میں ہو گر اس جنگ کے واسطے پہلے تو اعلان دالنٹیر آپ بھرتی کرنے ہوں گے کیونکہ غنیم کی فوج بہت زیادہ ہے - اعلان جنگ کے واسطے رقعہ مندرجہ ذیل کافی ہوگا - والسلام۔

پیاری بہن زینت الوقت سلامت رہو -

جنوری کے مخزن میں تمہارا مضمون پڑھ کر نہایت خوشی ہوئی - تمھارے بیان اور تمھاری زبان کا کیا کہنا - وہ چُلبلا پن اور نزاکت ہے کہ جب تک مضمون ختم نہ ہولیا مجھے چین نہیں آیا۔ میاں بیوی کی محبت کا تو جو نقشہ تم نے دکھایا ہے وہ نہایت پُرلطف ہے مگر دبی زبان سے جو تھیٹر کا شوق ظاہر کیا ہے وہ مجھے پسند نہیں آیا - تمھیں معلوم ہوگا کہ ہندوستان کے تھیٹروں میں جو لوگ ناچ تماشا کرتے ہیں سو ماتیح ذات کے ہوتے ہیں - اور جو ٹھیک مروج ہیں وہ بھی بازاری اور ادنیٰ درجہ کے ہیں - اگر خدانہ کرے تم تھیٹر میں جا آئیں تو سب سے پہلے تم خود تماشا بن جاؤگی - اور سب ایکٹر اور تماشائی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تمھاری طرف دیکھیں گے - تھوڑی دیر میں ایک ایکٹر آئے گا اور تم سے یوں مخاطب ہوگا "لال گڑھے والی نادان تیرا نخرہ - نادان تیرا نخرہ ترسے گزرتے ہیں" ہم سمجھ اسکے بعد ایک بیگم صاحب آئیں گی اور تمہارے دوپٹہ کی طرف اشارہ کر کے یوں غزلسرا ہونگی سہ

اری ... کی سبز اوپ ... مرے سامنے جلد آ ... دا ش

اس راگ رنگ سے یقین ہے کہ تم خوش نہ ہوگی - اس لیے پیاری بہن ایسی تھیٹر کا شوق رہنے دو شریفوں کی بہو بیٹیوں کو خدا تھیٹر نہ دکھائے لیکن اگر تم ایسی ہی بیتاب ہو تو اس دن کا انتظار کرو کہ تمھارے میاں "وہ" جیسے خاندانی اور ولایت کے تعلیم یافتہ ایکٹر ہوں اور زینت الوقت جیسی شریف زادیاں ایکٹرس بن جائیں -

"زینت الحجاب"

حرقات رقم

یہ ابر کے جو ٹکڑے مغرب سے آ رہے ہیں
فتوے یہ زمزمے کے کعبے سے لا رہے ہیں

ساغر بکف شگوفے اُگنے لگے زمیں سے
پھر توبہ توڑنے کے ایام آ رہے ہیں

یہ کون زیر گردوں ہے بیقرار و گریاں
بجلی ہے زلزلوں سے طوفان آ رہے ہیں

کیا پوچھتے ہو باعث اس نالہ و فغاں کا
تقدیر سو رہی ہے اُس کو جگا رہے ہیں

دُنیا سے ہاتھ خالی جانے سنا تھا سب کو
ہم لے کے دل میں صدہا ارمان جا رہے ہیں

ہونا تھا ہم کو جب تک ہم ہو چکے اُسی کے
اب جور و داد و انجم ناحق رچا رہے ہیں

کیا خاک اس چمن میں ہنسنے رقم دلا دیں
شیون پہ بلبلوں کے گل مسکرا رہے ہیں

انتخاب خزانۂ عامرہ

(جناب مرزا محمد عسکری صاحب بی اے)

(سلسلہ گذشتہ)

شانی تکلو شاہ عباس صفوی کے دربار کا مشہور شاعر تھا۔ بادشاہ نے سنہ ۱۰۱۱ھ میں بمقام قزوین اس بیت کے صلہ میں ؎

اگر دشمن کشد ساغر وگر دوست　　بطاقِ ابروِ مستانۂ اوست

اس کو روپیہ سے تلوایا تھا۔ چنانچہ ملا طغرا اس کی طرف اشارہ کرکے کہتے ہیں ؎

شاہا ز کرم جہاں ہنر کردی　　ملک دلِ عالمے مسخر کردی

شانی سر کہ بخاک رہ پایت سودہ بود　　بر داشتی و بہ زر برابر کردی

مشہور ہے کہ شانی کے معاصرین نے اس واقعہ کے متعلق اس کی بہت مذمت اور ہجو کی تھی حالانکہ اس کا اصلی سبب رشک تھا نہ شانی کی کسرِ شان۔ میں کہتا ہوں کہ روپیہ سے تلوانے میں شانی کی کیا کسر شان ہوئی کہ اس بیچارے کو اس قدر پریشان کیا۔ پرانے زمانہ سے یہی دستور چلا آتا ہے کہ شعراء کو بادشاہان وقت ہمسنگِ زر کرتے تھے۔ چنانچہ سلطان قطب الدین خلجی نے امیر خسرو دہلوی کو ہموزن فیل زر عنایت کیا۔ جہانگیر نے حیاتی کاشی کو روپیہ سے تلوایا۔ شاہجہاں نے متعدد شعراء مثلاً کلیم، قدسی، آقیا، سعیدا کو مختلف موقعوں پر اسی طرح وزن کرایا۔ علماء میں مولوی عبد الحکیم سیالکوٹی دو مرتبہ (۶۰۰۰ روپیہ) قاضی محمد اسلم پدر میرزا ہد صاحب حواشی مشہور (۶۵۰ روپیہ)۔ شیخ عبد الحمید لاہوری مؤلف شاہجہاں نامہ (۳۰۰۰ روپیہ) جگنناتھ گویندہ بصلۂ بارہ دھرپد جو بادشاہ کی تعریف میں کہے گئے اور عمدہ دھنوں میں باندھے گئے تھے (۲۵۰۰ روپیہ)۔ رنگ خاں گویندہ (۴۵۰۰ روپیہ)۔ عارف خدمتگار (۷۰۰۰ روپیہ) ملا درویش (زر ہموزن جہاں آرا بیگم) بصلۂ غسل صحت بیگم موصوفہ جو آگ سے جل جانے پر ملا کی مجرب دوائے تین دن کے استعمال سے اچھی ہوگئی تھیں۔ یہ سب لوگ ہموزن زر کیے گئے۔

شانی کا انتقال سنہ ۱۰۲۳ھ میں ہوا۔ "بادشاہ سخن" اس کی تاریخ وفات ہے۔

ایک دن نواب نظام الدولہ ناصر جنگ شہید مرحوم کی صحبت میں مرزا صائب کے اس شعر پر

اہل کمال را لبِ اظہار خامشی است　　منت پذیر او تمام از ہلال نیست

بڑا ہنگامہ ہوا۔ ہر شخص اپنی سمجھ کے موافق کچھ معنی کہتا تھا مگر کسی کے معنی ٹھیک نہیں بیٹھتے تھے۔ میں بھی سوچتا رہا اور صحیح مطلب ذہن میں آگیا۔ جب نواب صاحب اور حاضرین محفل نے سنا تو بہت خوش ہوئے اور میری بہت تعریف کی۔ دقت اس شعر میں لفظ "ماہ تمام" سے پڑتی ہے جسکے معنی اور لوگ لفظ ہلال کی مناسبت سے ماہ کامل یعنی پورے چاند کے لیتے تھے حالانکہ شاعر کا مطلب یہاں لفظ "ماہ" سے چاند نہیں بلکہ مہینے سے ہے۔ اب معنی واضح ہوگئے۔

میر صیدی طہرانی ۔ خان آرزو "مجمع النفائس" میں لکھتے ہیں کہ ایک دن نواب جہاں آرا بیگم بنت شاہجہاں بادشاہ شاہجہاں آباد میں ایک باغ کی سیر کے واسطے گئیں صیدی اوقت باغ کے باہر ایک کمرے سے بیگم کی پر تکلف سواری کا تماشہ دیکھ رہا تھا۔ بیگم ہاتھی پر سوار برقع اوڑھے ہوئے نقش جوں ہی ہاتھی قریب آیا صیدی نے کھڑکی سے سر نکال کر یہ شعر پڑھا ؎

برقع برخ افگندہ برد ناز بباغش   تا نکہت گل بیختہ آید بدماغش

بیگم نے یہ شعر سنا تو غصہ سے فرمایا کہ یہ کون ہے۔ اسکو پکڑ لاؤ۔ خواجہ سرا جو ہمراہ تھے صیدی کو گرفتار کرکے لائے۔ بیگم نے صیدی سے کہا کہ جو شعر تونے پڑھا تھا وہ پھر پڑھ۔ صیدی نے تعمیل حکم کی۔ بیگم مسکرائیں اور کہا کہ اسکو پانچ ہزار روپیہ دے کر شہر سے نکال دو۔

نواب صمصام الدولہ شہید خوافی اورنگ آبادی مؤلف جو میرے اوپر بڑی عنایت کرتے تھے۔ تذکرۃً مجھ سے کہا کہ فیضی کے اس مشہور مطلع سے ؎

مرا براہ محبت دو مشکل افتادہ است   کہ خوں گرفتہ ام و یار قاتل افتادہ است

بظاہر ایک مشکل تو عاشق کا خوں گرفتہ ہونا اور دوسری مشکل معشوق کا قاتل ہونا ہے لہذا عاشق کی نجات کسی طرح ممکن نہیں۔ میں نے عرض کیا کہ میرے دل میں دوسرے معنی آتے ہیں یعنی یہ کہ ایک مشکل تو یہ ہے کہ عاشق کے خوں گرفتہ ہونے سے ممکن ہے سوائے معشوق کے کوئی دوسرا اُس کو مار ڈالے۔ دوسری مشکل یہ ہے کہ یار چونکہ قاتل واقع ہوا ہے لہذا احتمال ہے کہ سوائے عاشق کے کسی دوسرے کو ہلاک کردے۔ پس یہی دونوں امر عاشق پر ناگوار ہیں اور وہ چاہتا ہے کہ اُس کی موت صرف اپنے معشوق ہی کے ہاتھ سے ہو۔

میرزا روشن ضمیر ضمیر ۔ اخلاص شاہجہاں آبادی اپنے تذکرہ ہمیشہ بہار میں لکھتے ہیں کہ ضمیر اس لڑائی میں شریک تھے جو عالمگیر اور شجاع کے درمیان بمقام کھجوہ واقع ہوئی تھی اور عین لڑائی کے موقع پر انھوں نے فتح کی تاریخ کہی تھی جو عالمگیر کو باوجود شعر و شاعری سے نفرت ہونے کے بہت پسند آئی اور

ایک ہزار روپیہ انعام اُسی وقت عنایت کیا۔ تاریخ یہ ہے ؎

اے حرز تو سورۂ تبارک بادا پیوستہ ترا تاج تبارک بادا
چیترے شگون تہنیت تاریخ دل گفت شود فتح مبارک بادا

تیر خاں تذکرہ "مراۃ اعیان" میں لکھتے ہیں کہ جب عالمگیر بادشاہ نے قرآن شریف حفظ کیا تو تمیر نے یہ رباعی تہنیت میں لکھکر نظر مبارک سے گزرانی اور سات ہزار روپیہ انعام پایا۔ رباعی ؎

محی الدین مصطفیٰ حافظ تو [illegible] و مرتضیٰ حافظ تو
تو حامی شرع و حامی نوشہ تو حافظ قرآن و خدا حافظ تو

تمیر کی وفات ۱۱۰۰ ہجری میں ہوئی انکی قبر سورت میں ہے۔ میں نے اسکو دیکھا ہے اور فاتحہ بھی پڑھا ہے۔ تمیر ہندی میں بھی شعر کہتے تھے اور علم موسیقی میں کامل استاد تھے۔ ہندی میں [illegible] تخلص کرتے تھے۔ [illegible] ہندی میں عشق کو کہتے ہیں۔

والہ داغستانی - [illegible] قلی خاں والہ داغستانی کا نسب حضرت عباس عم رسول اللہ صلعم تک پہونچتا ہے چنانچہ خود کہتے ہیں ؎

[illegible] زلف [illegible] زدہ دامن دست آرخ دلستان ما

انکے جد اعلیٰ [illegible] ... [illegible] لڑکی سے جو اپنا سلسلہ خلفائے عباسیہ تک پہونچاتے تھے [illegible] داغستان میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ [illegible] کی بنا پر انکا خیر مقدم کیا اور اپنے [illegible] کی سپردگی۔ [illegible] کہتے ہیں اور اب تک انکے بنی اعمام وہاں کی ریاست پر قابض ہیں۔ [illegible] الوزیر میرزا [illegible] صفی کی ملازمت کے ارادہ سے داغستان چھوڑکر دار السلطنت آئے اور بخطاب صفی قلی خاں [illegible] کی بیگلربیگی پر فائض ہوئے۔ الخاص میرزا کے دو لڑکے تھے۔ ایک اعتماد الدولہ [illegible] علی خاں [illegible] میرزا کی وزارت پر سرفراز ہوئے۔ دوسرے مہر علی خاں [illegible] کے بیٹے تھے۔ [illegible] چھوٹے کا نام محمد علی خاں تھا۔ جنکے صلب سے علی قلی خاں والہ پیدا ہوئے۔ محمد علی خاں [illegible] ترقی کرتے کرتے [illegible] کی بیگلربیگی پر پہونچے مگر ۱۱۲۹ ہجری میں انھوں نے انتقال کیا۔ [illegible] کی تمام اولاد بڑے بڑے درجوں پر [illegible] اور اُن میں امرائے عظام تھے۔ علی قلی خاں کی ولادت ۱۱۲۴ھ میں بمقام اصفہان ہوئی۔ اس زمانہ میں نسبی سے انکے چچا اعتماد الدولہ [illegible] میں وزارت سے معزول ہو گئے بلکہ انکے تمام اعزہ جو حکومت کے [illegible] سے [illegible] دار الحرب [illegible] گئے اور عجیب تفرقہ پڑ گیا۔ ۱۱۳۴ھ میں

محمود خاں افغان نے قندھار سے لشکرکشی کرکے اصفہان کا محاصرہ کیا اور دوسرے سال اصفہان پر اسکو پورا قبضہ حاصل ہوگیا۔ سلطان حسین مرزا والی اصفہان مارے گئے اور تقریباً سات سال تک افاغنہ کا علم حکومت عراق و فارس پر لہراتا رہا۔ اس زمانہ میں یعنی افاغنہ کی حکومت کے اثناء میں اہل ایران کو بڑی بڑی مصیبتیں اٹھانا پڑیں بالآخر ۱۱۴۲ھ میں اصفہان اور دیگر ممالک پٹھانوں کے تصرف سے نکل کر شاہ طہماسپ خلف سلطان حسین میرزا کے قبضہ میں آگئے۔ محاصرۂ اصفہان کے وقت سلطان نے اپنے بیٹے طہماسپ کو کمک حاصل کرنے کے واسطے آذربائیجان بھیجا تھا اور اُنھوں نے موقع پاکر اپنے باپ کی عین حیات میں دارالسلطنت قزوین میں تخت نشینی حاصل کرلی تھی۔ ابتداء میں علی قلی خاں اسی شاہ طہماسپ کے منظور نظر تھے۔ جب نادرشاہ نے ۱۱۴۴ھ میں شاہ طہماسپ پر فتح حاصل کرکے زمام سلطنت اپنے ہاتھ میں لی تو علی قلی خاں چند دن اصفہان میں گوشہ نشیں رہے۔ اور اسوقت ایک عجیب واقعہ پیش آیا وہ یہ کہ علی قلی خاں کو اپنی چچازاد بہن خدیجہ سلطان سے جو بچپن میں اسکے ساتھ ہم مکتب رہی تھی دلی عشق ہوگیا تھا اور گویا لیلیٰ مجنوں کی حالت تھی۔ جب اصفہان میں محمود خاں افغان کا تسلط تھا تو کریم داد محمود خاں کے غلام نے بجبر خدیجہ سلطان کے ساتھ نکاح کرلیا۔ آخرکار جب شاہ طہماسپ کا ستارہ چمکا تو اُسکے ملازمین نے کریم داد کو قتل کردیا۔ اسکے بعد نادرشاہ نے خدیجہ سلطان کے حسن و جمال کا شہرہ سُن کر اُسکو اپنے محل میں داخل کرلیا۔ مگر تھوڑے عرصے کے بعد نادرشاہ ہی کے حکم سے وہ نجف قلی بیگ حاکم یزد اپنے برادر چچازاد کے حبالۂ نکاح میں آگئی۔ جب نادرشاہ مرا تو نجف قلی بیگ کی وہی گت ہوئی جو کریم داد کی ہوئی تھی۔ اسکے بعد نادرشاہ کے قاتل صالح خاں کے ساتھ خدیجہ کا نکاح ہوا مگر صالح خاں بھی تھوڑے ہی دنوں کے بعد کریم خاں زند کے ہاتھ سے مارا گیا۔ صالح خاں کے بعد میرزا محمد وزیر کے ساتھ اس کا نکاح ہوا اور وہ بھی کریم خاں کے ہاتھ سے مارا گیا۔ اب خدیجہ سلطان نے ہندوستان کا ارادہ کیا اور کربلائے معلے کی طرف روانہ ہوئی تاکہ وہاں سے براہ بصرہ ہندوستان پہنچکر اپنے سب سے پہلے عاشق علی قلی خاں والہ کے آغوش محبت میں پہنچے مگر موت نے فرصت نہ دی۔ راستہ ہی میں بمقام کرمان شاہ وفات پائی مگر نعش کربلائے معلی میں دفن کی گئی۔

ادھر علی قلی خاں والہ کی یہ حالت ہوئی کہ معشوق کے ہاتھ سے نکل جانے اور نادرشاہ کے خوف سے اُس نے ہندوستان کا قصد کیا۔ مجھسے اُن سے لاہور میں ۱۱۴۷ھ میں اُسوقت ملاقات ہوئی جب میں ملک سندھ سے ہندوستان کی طرف آرہا تھا۔ ہم دونوں آدمی لاہور سے شاہجہان آباد

تک ہمسفر رہے۔ شاہجہان آباد پہونچ کر میں ایک ہفتہ وہاں ٹھہر کر الہ آباد کا عازم ہوا اور واله وہیں ٹھہر گئے۔ اس کے بعد میں حرمین شریفین کی زیارت کو چلا گیا اور وہاں سے معاودت کر کے ملک دکن میں میرا قیام ہوا۔ اس عرصے میں ایک دوسرے کی متعلق ہم کو خبر نہ ہوئی۔ یہاں تک کہ واله کا انتقال ہو گیا۔ اسی وجہ سے میں ان کا کوئی حال "سرو آزاد" میں نہ لکھ سکا اور نہ وہ میری نسبت اپنے تذکرہ ریاض الشعراء میں کچھ ذکر کر سکے۔

مجھے ان سے اکثر صحبتیں رہتی تھیں اور انکی باتوں سے انکے علوے مزاج اور بلند ہمتی کا پورا پتہ چلتا تھا۔ ایک دن کہنے لگے کہ میں نے خواب دیکھا کہ بادشاہ ہندوستان کو میں نے اپنے ہاتھ سے تخت پر بٹھایا۔ ایک موقع پر جب میں اور وہ ساتھ سفر کر رہے تھے کہنے لگے کہ آؤ گھوڑا دوڑائیں۔ میں نے ہرچند انکار کیا مگر دوڑانا پڑا۔ میرا گھوڑا باوجود اس کے کہ ہندی النسل تھا انکے ولایتی گھوڑے سے نکل گیا جو انکو ناگوار ہوا۔ شاہجہان آباد پہونچنے کے بعد وہ اعلیٰ مراتب پر پہونچے۔ نواب روشن الدولہ کی وساطت اور برہان الملک نواب سعادت خاں نیشاپوری کے سفارشی خط سے محمد شاہ کے دربار میں رسائی ہو گئی جہاں وہ چار ہزاری منصب اور خطاب ظفر جنگ سے سرفراز ہوئے اور میر توزک دوم کا عہدہ بھی ملا۔ احمد شاہ خلف محمد شاہ کے زمانہ میں وہ شش ہزاری اور خان زماں بہادر کا خطاب پایا۔ ۱۱۶۶ھ میں صفدر جنگ کے ہمراہ شاہجہان آباد سے اودھ آئے اور عالمگیر ثانی کے زمانہ میں شجاع الدولہ خلف صفدر جنگ کے امور کی اصلاح کے واسطے اودھ سے پھر شاہجہان آباد گئے۔ انکی مرتبہ عماد الملک وزیر بن امیر الامراء فیروز جنگ بن نواب آصف جاہ کے پوتے کی وساطت سے ہفت ہزاری کے درجہ تک پہونچے مگر ہندوستان میں جب تک رہے اپنی پرانی معشوقہ خدیجہ سلطان کا خیال انکے دل سے کسی طرح نہیں گیا۔ جس زمانہ میں مشارٌالیہا میرزا احمد کے نکاح میں تھی جسکا ذکر اوپر ہوا، واله نے ایک شخص میرزا شریف نامی کو خدیجہ کے لانے کے واسطے ولایت بھیجا تھا مگر اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ واله نے اکثر درد انگیز اشعار اسی مضمون کے کہے ہیں اور بعض "ریاض الشعراء" میں لکھی ہیں بلکہ خدیجہ سلطان کے حالات میں ایک طویل مثنوی بھی لکھی ہے جس کا ایک شعر یہ ہے ؎

از گلشن حسن تازہ سروے
نہ نشستہ بہ شاخ او تذروے

اس سرو کی شاخ پر تین تذروؤں کے آشیاں کرنے کا حال سابق میں معلوم ہو چکا۔ پس سمجھ میں نہیں آتا کہ واله کا مطلب اس شعر سے کیا ہے۔ واله ایک امیرانہ زندگی بسر کر کے ۱۱۷۰ھ میں بمقام شاہجہان آباد راہیِ ملک بقا ہوئے۔ شاہ عبد الحکیم حاکم لاہوری نے مادۂ تاریخ نکالا اور

راقم نے اُس کو نظم کیا ؎

ظفر جنگ امیرِ گہر سنج معنے　　بحکم قضا از جہاں کرد رحلت
طلب کرد دل سال تاریخ فوتش　　خرد گفت پیوست واله برحمت

وآله مرض الموت میں یہاں تک کہ حالت احتضار میں بھی فکر شعر سے غافل نہ ہوئے تھے۔ مولوی عبداللہ کشمیری نے جو اُس وقت موجود تھے کہا کہ یہ شعر کہنے کا کون موقع ہے۔ اسوقت کلمہ پڑھیے اور ایمان تازہ کیجیے۔ یہ سُن کر وآله نے بہت غصہ کیا اور یہ رباعی جو سابق میں کہی تھی پڑھی ؎

گر جاں برود ز تن نخواہم مُردن　　ور خاک شود بدن نخواہم مُردن
گویند علی قلی بمرد ایں غلط است　　او ہم تو مُردمن نخواہم مُردن

ان کا تذکرہ ریاض الشعرا جس میں سلف و خلف کے اکثر شعرا کے حالات درج ہیں اس کتاب کی تحریر کے وقت راقم کے پاس پہونچا۔ اُسی سے چند شعر یہاں اخذ کیے جاتے ہیں ؎

جاناں بسرِ مزارم آمد　　آخر مردن بکارم آمد

بپائے خویش ہر دم شمع زاں خاکستر اندازد　　کہ سیخوا ہد برا ے خستہ خود بستر اندازد
در سینہ کاوِ کاوِ نگاہش ہماں کہ ہست　　ما را دلے نماندہ و او را گماں کہ ہست
آبحیات و کیمیا عمر دوبارہ و وفا　　ایں ہمہ می رسد بہم یار بہم نمیرسد

ایک دفعہ راقم نے اپنا یہ شعر وآله کے سامنے پڑھا ؎

زدہ ام بر سر جہاں پاپوش　　بے سبب ایں برہنہ پائی نیست

وآله نے اعتراضاً کہا کہ لفظ "پاپوش" جوتے کے معنی میں میں نے ولایت میں نہیں سُنا۔ میں نے چند شعر اُستادوں کے سند میں پڑھے منجملہ ان کے صائب کا یہ شعر ؎

چرخ دود یست کہ از خرمن من خاستہ است　　خاک گردیست کہ افشاندۂ پاپوش من است

اسی طرح ایک دن لفظ طیار کے متعلق مجھ سے اُنھوں نے پوچھا کہ اسکا صحیح املا 'ط' سے ہے یا 'ت' سے۔ میں نے کہا کہ مرزا محمد رفیع واعظ قزوینی کے کلام سے 'ط' معلوم ہوتا ہے ؎

دارد چہ مرغ عمرت پرواز بس بسرعت　　اسباب عیش و عشرت طیار گو نباشد

راقم کے دل میں یہ گزرتا ہے کہ جب شکار کرنے والی چڑیاں مثلاً باز اور جرہ وغیرہ کے شکار کرنے کے لائق ہو جاتی ہیں اور اُنکے بال و پر اچھی طرح نکل آتے ہیں تو اُنکو طیارے پرواز کہتے ہیں۔ اس اعتبار سے اس لفظ کے معنی عام طور پر "طیار" ہوگئے۔

کامیاب ناکامی

(مولوی اسمٰعیل احمد صاحب تسنیم مینائی بی اے، ایل ایل بی۔ وکیل)

شاید اسکا سبب یہ ہو کہ کمرے میں داخل ہوتے وقت کھڑکی کے نزدیک سے گزرنے کی وجہ سے ڈوبتے ہوئے سورج کی عقیق رنگ کرنوں نے اُسکے حسین چہرے اور سنہرے بالوں کو قوس قزح کے رنگوں سے رنگ دیا، لیکن غیر روشن کمرے کے ایک خصوصاً تاریک کونے میں آرام کرسی پر پڑے ہوئے مجھے تو ایسا معلوم ہوا کہ داراب اپنے ہمراہ سبزہ زاروں کی تمام رنگینی، مرغزاروں کی سب شادابی، اور لالہ زاروں کی تمام دلکشی کمرے میں لیتا آیا، اور قبل اسکے کہ وہ اِدھر اُدھر گھوم کر مجھے دیکھے میں آہستہ سے ہنسا۔ اُسنے ایک خوشی کا نعرہ لگایا، اور کمرے کے اس سرے سے کودتا ہوا اِس سرے تک میرے پاس آیا، اُس کی آنکھیں روشن تھیں، اُسکی چال سے مسرت ٹپکتی تھی اور اُسکی نگاہوں سے سکون کامل نمایاں تھا، اور جب وہ مجھ سے مصافحہ کر رہا تھا، یعنی بالفاظِ دیگر میرے ہاتھ کو اپنے دونوں بڑے ہاتھوں میں دبا کر اس طرح ہلا رہا تھا گویا وہ کسی ریلوے اسٹیشن کے پانی کے نل کا دستہ ہے تو مجھے اُسکے جسم اور کپڑوں سے بہت نفیس خوشبو آتی ہوئی معلوم ہوئی۔ جیسی بارش ہونے کے فوراً ہی بعد گلاب اور دوسرے پھولوں کے پودوں سے نکلتی ہے۔

میں بہت حیران تھا، داراب کو میں اُسوقت سے جانتا تھا جب میں اور وہ دونوں ننگے پاؤں اور ننگے سر، آدھے پائنچوں کا پاجامہ پہنے، دن بھر، صبح سے شام تک، درختوں پر چڑھتے، باغ میں لوٹتے، مٹی اُڑاتے، اور نہر میں پیرتے رہا کرتے تھے۔ اور گو بچپن میں وہ بہت خوش مزاج اور ہنسمکھ بچہ تھا، مگر بیرسٹری کے لیے انگلستان جانے سے کچھ قبل سے وہ بہت متین سنجیدہ، خاموش اور غمگین سا رہنے لگا تھا، اور میرا خیال ہے کہ اس تبدیلی اور تغیر کا بڑا باعث اُنکے والدین اور چھوٹے بھائی کی دفعتاً اموات تھیں، وہ عموماً کھویا ہوا سا، کسی سوچ میں مستغرق رہتا تھا، مگر اسوقت یہ معلوم ہوتا تھا کہ اُسکی کایا پلٹ ہوگئی ہے، اور بلا مبالغہ میں اُس سے چڑتا جا رہا تھا۔

"داراب" میں نے کہا "بھئی اسوقت تم سے مل کر بڑی ہی مسرت ہوئی، اللہ علیم و دانا ہے میں بیان نہیں کر سکتا کہ تمہارے آنے سے مجھے کسقدر خوشی ہوئی ہے۔ بیٹھو، نہیں نہیں، یہاں نہیں، اس کرسی پر بیٹھو اور جتنی باتیں ہو سکیں کرو۔" اس موقعہ پر مجھے بجبر اُسے کرسی پر بٹھانا پڑا ورنہ اُسکی

کچھ عجیب و غریب حالت تھی، مارے خوشی کے اچھلا جاتا تھا۔ "سگریٹ پیوگے"

"جس میں کمرے کی ہوا خراب ہو جائے نہیں اسمٰعیل نہیں، البتہ تم اتنا کرو کہ ذرا اس کھڑکی کو کھول دو تاکہ خالص ہوا اندر آسکے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو، سچی اور صحیح زندگی کا نام ہے" میں نے کھڑکی کھولتے ہوئے کہا، وہ گردن موڑے ایک تصویر کو دیکھ رہا تھا، میرے الفاظ سن کر اُسے میری طرف منہ پھیرا۔

"کیا مطلب، اس آخری فقرے سے تمہارا اس موقعہ پر کیا مقصد ہے؟"

"کھلے میدانوں اور رنگین وادیوں میں زندگی کا وقت گزارنا میرا خیال ہے کہ تم پچھلے چھ سات مہینے اسی قسم کی سیر و تفریح میں مشغول رہے کیونکہ میں نے تم کو اس عرصہ میں نہیں دیکھا، اور اب واپس آئے ہو تو معلوم ہوتا ہے تم میں کسی نے نئی روح پھونک دی ہے جیسے بارش سے بسنت کے شروع میں زرد اور خشک پتیوں میں از سر نو جان آجاتی ہے"

وہ تبسم جو اب تک محض اس کی آنکھوں میں یا ہونٹوں کے کناروں پر نمایاں تھا، ایک طویل اور مسلسل قہقہے کی صورت میں تبدیل ہوگیا۔ "کھلے میدانوں میں، رنگین وادیوں میں ہائے پیارے اسمٰعیل تم معلوم نہیں کیا کہہ رہے ہو، ارے بھائی برخلاف اس کے میں نے تو ان مہینوں کا بڑا حصہ بند کمروں اور تاریک مکانوں میں گزارا ہے اور سیر و تفریح کے بجائے مشغول اور اہم ترین کام میں" اور پھر اُس نے قہقہے لگانا شروع کر دیے، اُسکی ہنسی ناقابل تدارک تھی، جیسے پریوں کی داستان میں طلسمی گھڑے سے دودھ کا لا متناہی سمندر اُبلنا شروع ہوا تھا اسی طرح اسوقت داراب سے قہقہے اُبل رہے تھے۔

"کہیں نہ کہیں" میں نے فیصلہ کن انداز سے کہا "ضرور تم کو آب حیات کا چشمہ مل گیا اور تم نے جی بھر کے اُسکے پانی سے اپنی پیاس بجھائی ہے، ورنہ آخر تم میں اس تغیر کی کیا وجہ ہے، تم کلیتہً بدل گئے ہو، بالکل تبدیل ہوگئے ہو جیسے کسی معمولی لوہے کے ٹکڑے میں مقناطیسی کشش پیدا ہوگئی ہو۔ مجھے بھی دنیا کی ہنگامہ آرائیوں پر اسی استغنا آمیز انداز سے ہنسنا سکھا دو اور میں تمہارا غلام ....."

"بہت آسان کام ہے، تم بس اتنا سمجھ لو کہ دنیا ہماری کچھ نہیں ہے محض ایک عظیم تو نہ مذاق ہے، صرف ایک عظیم الشان طریقہ ظرافت"

"یہ کہنا تو بہت سہل ہے مگر داراب یہ تصور کرنا اُتنا ہی دشوار ہے، جب تک آدمی اس مذاق اور اُس ظرافت کو آنکھوں سے نہ دیکھ لے کس طرح اس امر کا قائل ہو سکتا ہے؟"

"یہ تو آسان تر ہے، جس وقت تم مغموم اور افسردہ ہو، اُسوقت ایک گہری سانس لو، پنجوں کے بل کھڑے ہو جاؤ اور خود کو یہ باور کرا دو کہ یہ تمام دنیوی ہنگامہ آرائیاں، تصادم و تضارب، شکست و فتح عیش

وغم، لوازم و ملحقات، تمنائیں اور کاوشیں، یہ سب
محض تمھیں دکھانے کی غرض سے ایک تماشا ہیں،
ایک سینما کی فلم ہیں، ایک اٹلس کا پردہ ہیں ۔۔۔
زندگی نام ہی بےحسی کا ہے، تقدیر سچ ہو کر باقی
سب نقوش اور اکار ہیں اور تم ناظر ۔۔۔ فرض
کرو کہ تم کسی امیر یا نواب کی دولت اور امارت کے
سبب اس سے رشک کرتے ہو تو سوالات یہ یاد
کرلو کہ اس نواب یا رئیس کا مزہ یقینا اپنے دل میں
یہی سمجھتا ہے کہ اُس کا یہ شخص ایک [illegible] مست
احمق ہے ۔۔۔ یا فرض کرو کہ تم کو کسی عورت سے
عشق ہو اور ...... اس مقدمہ پر [illegible]
ہنسی اُس کی اب تو اپنی غالب آئی [illegible]
میرے جذبات کو دھیمی آگ لگی تھی اور مجھے اس کی
باتوں میں دلچسپی ہو چلی تھی اس لیے میں نے کہا
"عشق اور عورت ۔۔۔ اور اب تم کیا جانو عشق
کسے کہتے ہیں اور اس کا کیا مفہوم ہے"

"اسمٰعیل عشق تو تمام ستم ظریفیوں میں
سب سے بڑی ستم ظریفی ہے۔ عشق ہی تو تھا۔ (قہ
قہ، قہ قہ قہ) جس نے مجھ کو اس نے لیکن سیدھے راستے
پر ڈالا اور ایک عورت ۔۔۔ (قہ قہ قہ قہ) ہی
تھی، میری آنکھیں کھولنے کا سبب، میری اس
لا انتہا ہنسی کا بیج، اور ہنسنا ۔ (قہ قہ قہ قہ قہ)
ہنسنا، اسمٰعیل جانتے ہو کیا ہے، کامیابی کا راز،
کامرانی کی کنجی" اس نے آنکھوں سے آنسو پونچھے
اور مسکراتے ہوئے سلسلۂ کلام جاری رکھا،

دیکھو، اسمٰعیل، میری طرف دیکھو ۔ آج سے پہلے
پہلے تک مجھ سے زیادہ سنجیدہ اور خاموش مجھ سے
بڑھ کر محنتی، اور دماغ سوز بیرسٹر شہر بھر میں نہیں تھا
میں کبھی کہیں نہیں جاتا تھا، لوگ مجھے کبھی نہیں
دعوت دیتے تھے اس لیے کہ میرے چہرے پر بس
ایک نظر ڈالنے سے انھیں پتہ چل جاتا تھا کہ میں
کیا ہوں اور کس قسم کا آدمی ہوں اور اب .....
اور دیکھو، یہ ٹینس کلب کے سالانہ جلسے کا دعوتی رقعہ
ہے، یہ گورنر کے یہاں عصرانے کا بلاوا، یہ رنگین کی
[illegible] ڈانس پارٹی، یہ لیڈی [illegible]
[illegible] کے یہاں ڈنر اور رقص کا دعوت نامہ اور
یہ باقی سب لفافے بھی اسی قسم کی چیزیں ہیں"
اس نے [illegible] ایک درجن سے زیادہ
رنگین اور معطر لفافے جیب سے نکال کر میری گود
میں ڈال دیئے

"ان کی خوشبو سونگھو اسمٰعیل، خوشبو، میں تم سے
کہتا ہوں کہ بلا مبالغہ اس زمانے میں میں عطر و
رنگ میں رہتا ہوں، انھیں سے صبح کو ناشتہ کرتا
ہوں، انھیں میں دن کا غسل، اور انھیں کا شب
کو کھانا، کسی کو بھی نہیں معلوم کہ میں ہوں کیا اور
یہ معلوم کرنے کی غرض سے لوگ مجھے مدعو کرتے ہیں
لیکن بیچارہ وہ شخص کیسے ادھر اُدھر پھر سکتا ہے جس کی
عنقریب شادی ہونے والی ہو"

"اور اب" میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا "تمھاری شادی
ہونے والی ہے، کہاں، کب، کس سے، مائی ڈیر ڈاراب"

تم نے مجھے پہلے سے کیوں نہیں بتایا؟" میں یہ کہتا جاتا تھا
اور دل میں رشک کا دریا موجزن تھا
"گرداراب خدا را مجھے بھی تو وہ ترکیب بتاؤ
جس سے تم نے یہ کامیابی حاصل کی، مجھے بھی اس
خزانے کا "کھل سمسم" سکھا دو، پھر میں تمہیں پوری
مبارکباد دونگا"
تھوڑی دیر تک فلسفیانہ انداز سے اُس نے
میرے چہرے کی طرف دیکھا پھر آنکھ مار کر بڑے زور
سے ہنسا۔
"اچھا تو یہ سبب ہے تمہاری اس تمام افسردہ
دلی کا، یہ راز ہے اس حلیہ بے کیفی کا" میں نے
بے سبب نہیں غالب میں نے اُس کے اس بیان
کی صحت کو تسلیم کر لیا اور سب کچھ قبول دیا
"گرداراب، وہ تو سب رضی ہیں، اُس کے والدین
میرے ماں باپ، ہم دونوں کے حملہ عزیز، مگر وہ
فی الحال خود رضامند نہیں وہ ایک بار سے دوسری
بار میری طرف دیکھنے پر تیار نہیں"
"اس کا علاج یہ ہے کہ تم بھی دل میں تصور کر لو
کہ پچیس سال کے بعد وہ ایسی ہو جائیگی کہ کوئی
مرد اُس کی جانب دوبارہ نہیں دیکھے گا، اس سے
تمہیں یقینی تسلی ہو جائیگی"
"یہ تو خیر تم مذاق کر رہے ہو گرداراب میں
تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اُسکے بغیر میری زندگی محال
ہے"
"اس قدر شدید محبت" اُس نے مصنوعی
سنجیدگی سے بھویں اوپر چڑھا کر کہا
"اور اس درجہ ناکام اور مایوس کن" میں نے
ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے جواب دیا
اُسکے لاتے ہی قہقہے پھر کمرے میں گونجنے لگے
اور اُس کی ہنسی اس قدر متعدی تھی کہ مجھ سے بھی
بھی مسکرائے بغیر نہ رہا گیا
"ایک عورت کا معاملہ اور مایوس کن
اسمٰعیل —— مائی ڈیر اسمٰعیل —— عورت کا معاملہ کبھی
بالکل مایوس کن نہیں ہوتا کوئی نہ کوئی صورت
اُس کو کامیاب بنانے کی ضرور ہوتی ہے ——
ایک مدت پیشتر میرا بھی یہی خیال تھا اور یہی حال
میرا بھی اُسی بہار میں تھا جس میں اسوقت تم
ہو داراب —— میری طرف دیکھو اسمٰعیل
(قہ قہ قہ قہ، ہا ہا ہا ہا)"
"لیکن داراب، میری معشوقہ لاکھوں میں ایک
ہے —— خوبصورت، امیر، عالی نسب، تعلیم یافتہ،
جوان"
"یہ تو تم بالکل میری معشوقہ کی تصویر کھینچ رہے
ہو، اور اسے میں بالآخر راہ راست پر لے ہی آیا ——
لو سنو —— (قہ قہ، ہا ہا) کاش تمام عالم میرے
اس بیان کو سننے کے لیے اسوقت یہاں ہوتا
(قہ قہ قہ قہ ہا ہا ہا ہا)"
"داراب" میں نے سختی سے کہا "داراب،
خدا کے واسطے اپنے ان قہقہوں کو بند کرو، یہ مجھے پاگل
بنائے دیتے ہیں .... تو اب خیر بیان"

"سنو —— وہ اُس قسم کی لڑکیوں میں سے ہے جنکی تصویر اور جنکی یاد مردوں کے دلوں میں ہمیشہ باقی رہتی ہے، میں نہیں کہتا کہ وہ خوبصورت ترین عورت ہے لیکن شوخ ترین ضرور ہے، اور تم اگر بغور سوچوگے تو اس نتیجے پر پہنچ جاؤگے کہ عورت کے لیے شوخ ہونا ہی حسین ہونے کا مرادف ہے۔ کم سے کم شادی کے سال بھر بعد تو یہ چیز بالکل صحیح ثابت ہوتی ہے، تم اُسکے خاندان سے ضرور واقف ہوگے اور ممکن ہے کہ کسی جلسے یا پارٹی میں یا کہیں کسی اور کھیل تماشے میں اسے کبھی دیکھا ہو —— فیروز دپستن جی ڈنشا —— مشہور پستن جی ڈنشا"

میں نے نفی میں سر ہلایا، دادا بھائی نوروجی، داراب جی ٹاٹا، فریدون جی ملا، داراب ڈنشا۔ میں نے ان پارسیوں کے اتنے نام سنے تھے اور اتنے پیچیدہ کہ اگر میں نے کبھی پستن جی ڈنشا کا نام سنا بھی تھا تو مجھے یاد نہ تھا۔ ٹاٹا کا نام تو البتہ میرے ذہن میں اُسی طرح محفوظ ہے جس طرح دہلی کے قلعہ کا نام لال قلعہ، باقی اور نام مجھے کبھی یاد نہ رہ سکے۔

داراب کے خوش وضع چہرے پر تکلیف کے آثار نمایاں ہوئے۔

"مائی ڈیر اسمٰعیل —— تمنے پستن جی ڈنشا کا نام نہیں سنا ہے، بعض وقت مجھے احساس ہوتا ہے کہ تمہاری قابلیت کے یہ تمام شہرے محض ڈھونگ ہیں اور تم نہایت نالائق ہو" (قہ قہ قہ ہا ہا ہا)

اُسکی ہنسی اور قہقہوں نے مجھے اُسکے ایک گھونسا مارنے سے باز رکھا کیونکہ میری رائے میں بے اختیارانہ انداز سے ہنستا ہوا مرد مثل عورت کے ہے، اور کوئی شریف النفس مرد عام طور سے عورت پر ہاتھ نہ اُٹھائے گا۔

"میں تم سے کیا بیان کروں کہ وہ کیسی ہے، بس اتنا کہہ سکتا ہوں کہ وہ کمال کی معراج ہے۔ اسکی حیثیت ایک اونچے مینار یا بُرج کی سی ہے کہ خود تو اپنے باپ کی لا انتہا دولت پر استادہ ہے —— وہ پستن جی ڈنشا کی اکلوتی لڑکی ہے —— اور اُس کا سایہ دور تک اور چیزوں پر پڑتا رہتا ہے"

داراب نے کہا

"اور تم —— داراب، —— تم اُسی سے منسوب ہو اور عنقریب شادی ہونیوالی ہے" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا

داراب نے زور سے ہاتھ ہلایا "دیکھو جی اسمٰعیل، جب میں اُس کا تذکرہ کرتا ہوں کبھی مجھے موضوع سے دور کرنے کی کوشش نہ کرنا، سمجھے —— تو ہاں بڑی دلکش لڑکی ہے، خوش مزاج، خوش طبع، خوش رو، خوش آئین، مخلص، سیدھی، کالج سے واپس ہوتے ہوئے اُس کا ایک دن مجھ سے سامنا ہو گیا، میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اُس نے میری طرف نگاہ بھی نہیں اُٹھائی کیونکہ پانچ ہندسوں سے کم کی آمدنی والے شخص کو دیکھنے کے لیے اُسے عینک استعمال کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور تنخواہ دار

شخاص کے لیے تو بڑی خاقتور خوردبین کی"

میری نظر میں دارب کی وقعت بہت بڑھ گئی۔ ایک شخص جو اپنی بنگیتر کا اس آزادانہ طریقے سے ذکر کرے کہ اُسکا عیب، عیب ہوا و صفت، صفت، وہ یقیناً قابل عزت ہے

"تم فیروزہ کو ان جزیات کی وجہ سے بُرا نہیں ٹھہرا سکتے، یہ اُسکے خمیر میں محلول ہیں، اُسکے خاندان کی امارت اور دولت کچھ آج کی نہیں، صدیوں کی ہے، بلکہ بعض آدمیوں کا تو خیال ہے کہ آدم کا وہ بیٹا جو اِنکا مورث اعلیٰ تھا وہ بھی کروڑپتی تھا" —— "تو اب تم کو کچھ کچھ اندازہ ہو گیا ہوگا کہ فیروزہ کیا چیز ہے" —— وہ چھچھوری یا شیخی خوری نہیں گرکولمبس کے لیے نئی دنیا دریافت کرنا آسان تھا بہ نسبت اسکے کہ فیروزہ کسی ایسے شخص سے ملاقات کرے جس کے نام کے ساتھ دو چار طویل دستے نہ لگے ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام امور مجھ کو دفعتاً نہیں معلوم ہوگئے رفتہ رفتہ میں نے یہ تمام حالات جمع کیے ہیں، تو ہاں کالج سے وہ ایک دن موٹر میں واپس جا رہی تھی کہ میں نے اُسے دیکھ لیا اور بس عاشق ہوگیا، اگلے دن ایک عصرانہ تھا جس میں مخصوص رؤسا مدعو تھے، مگر میں تکڑم لڑا کر پہونچ ہی گیا، پہلے تو وہ مجھ سے اس شبہ میں باتیں کرتی رہی کہ میں بھی کوئی لکھ پتی ہوں، لیکن جب اُسے معلوم ہوا کہ میں ٹاٹا کے خاندان کا داماد نہیں ہوں

تو پھر اُس نے میری طرف مُڑ کر دیکھا بھی نہیں، دوسرے دن میں اُس کے مکان پر گیا، معلوم ہوا اُن کے سر میں درد ہے مل نہیں سکتیں، اور دو گھنٹے کے بعد میں نے اُنھیں ایک نہایت مُنہ زور گھوڑے پر سوار پارک میں گھومتے ہوئے دیکھا، ظاہر ہے کہ سمجھدار آدمی کو یہ اشارہ کافی ہونا چاہیے تھا مگر میرا عشق ایسا ویسا تھوڑا ہی تھا، میں نے بھی سوچ لیا کہ ایڑی چوٹی کا زور لگا دوں گا پھر معاملہ تو قسمت کے ہاتھ ہے —— "میں نے اپنے تمام ایسے دوستوں سے جو کھاتے پیتے تھے اشارۃً کہدیا کہ مس فیروزہ پیشین جی ڈنشا کی صحبت مجھے عزیز ہے، بس پھر کیا تھا، ہر موقعہ پر جہاں وہ جاتی میں پہلے سے ڈٹا ہوتا، یہ ضرور ہے کہ وہ مجھ سے بہت شاذ ہی باتیں کرتی تھی، اتنی جتنی ابوالہول تم سے یا مجھ سے، مگر جو کچھ میں کہتا تھا اُسکے سننے پر تو وہ مجبور تھی، اور رفتہ رفتہ میں نے اُس میں اپنے متعلق دلچسپی پیدا کر ہی دی، تم عورت کی فطرت سے واقف ہو، خواہ وہ ملکہ ہی کیوں نہ ہو مگر اس کا احساس، یہ علم کہ ایک شخص اُس کی پرستش کرتا ہے، اُس کی روندی ہوئی خاک کو آنکھوں سے اور ماتھے سے لگاتا ہے، اُسے متاثر کیے بغیر رہ ہی نہیں سکتا، اور میرا عشق تو بالکل واضح اور عریاں تھا میں اُسے چھپانے کی کوشش ہی نہیں کرتا تھا — رفتہ رفتہ میں نے اس کا روزانہ کا پروگرام معلوم کر لیا، اب یہ ہوا کہ بغیر مجھ سے ملے یا مجھے دیکھے وہ گھر سے نکل نہیں سکتی تھی، اُس کے لیے تو خیر یہ تکلف تھا ہی لیکن

میرے سے لے مکلف تر میرا وزن کم ہو گیا، میری شری سب چہ لطف بھاڑ میں گئی، مسکرانا میں بھول گیا، غذا میں نے کم کر دی حتی کہ محض سگریٹ اور چائے پر میری گزر ہونے لگی، نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دن جب میں بستر سے اٹھا تو دنیا میری نظروں میں تاریک ہو گئی، میز کرسیاں گھومتی ہوئی معلوم ہوئیں، سر ناچتا ہوا، اور میں بیہوش ہو گیا، یہ باعث ہوا میرے گنگولی کے پاس جانے کا، ڈیر، ڈیر گنگولی" قہقہہ قہہ ہاہاہا، قہ قہ قہ، ہا ہا ہا) ہنستے ہنستے اُسکے آنسو نکل آئے، سانس پیٹ میں نہیں سماتی تھی "کون گنگولی" میں نے کہا "ڈاکٹر گنگولی ہندوستان کا مشہور ترین ماہر اعصاب ڈاکٹر" "وہی وہی، جسکا ذاتی سینٹوریم سمندر کے کنارے ہے، ظاہر ہے کہ اُس کی فیس میرے امکان سے باہر تھی، لیکن میں اور وہ کالج میں کبھی ساتھ پڑھے ہوئے تھے اور کیمبرج میں بھی، میں اُس سے خوب واقف تھا، سلسلہ یہ ہے کہ اُس کے باپ اور میرے والد میں بہت گاڑھی چھنتی تھی، [illegible] وہ کالج کا بدصورت ترین لڑکا مشہور تھا، مجھ سے مل کر بہت اچھا لگو دا، جب مصافحہ اور معانقہ سے فرصت ہوئی تو میں نے سب کچا چٹھا بیان کیا، پانچ منٹ میں اسنے کرید کرید کر مجھ سے رتی رتی حال معلوم کر لیا، جتنے سوالات اُس نے مجھ سے پوچھے اسی قسم کے تھے "آپ تم پہلی بار اُس سے کب ملے" ——— وہ دوسری ملاقات میں کتنی دیر ساتھ رہا —— غلطی ہوا ——— جب میں نے فیروزہ کی بہت ہوئی ——— غلطی ہوا ——— جب میں نے فیروزہ کی بہت

ہوئی ——— غلطی ہوا ——— جب میں نے فیروزہ کی بہت

اور اُسکے حسن کا حال بیان کرنا شروع کیا اور آدھ گھنٹے میں محض سر کے بالوں سے گزر کر آنکھوں کے بیان تک پہونچا تو اُس نے مجھے روک دیا" سنو دا، اب" اُس نے کہا "میری کامیابی کا راز اس میں مضمر ہے کہ میں انسان کو محض مضغۂ گوشت و خون سمجھتا ہوں جس میں اتنے اعصاب ہوتے ہیں اور اتنے اعضاء ——— اور ظاہر ہے کہ ہر عورت خواہ وہ قلوپطرہ ہو یا ملکۂ بہشتی ہو یا نورجہاں، گریٹا گاربو ہو یا مس فیروزہ سبتن بی ڈیشا، بہرحال انسان ہوتی ہے، کھانا پینا اُسکے لیے ضروری ہے، بوڑھا ہونا اُس کے لیے لازمی ہے، بظاہر اسباب تمہاری صحت کا ایک ہی طریقہ ہے کہ اُس سے تمہاری شادی کر دی جائے، میں تمہارا علاج کر دوں گا" ——— خوشی کے مارے میں اُچھل پڑا اور گنگولی سے لپٹ گیا، بمشکل اُس نے خود کو مجھ سے جدا کیا، میں نے کہا گنگولی تم میری مدد کرو گے، تمہارے ذہن میں کوئی ترکیب ہے، کوئی امید کامیابی کی پڑتی ہے، اُس نے کہا ہاں کل اسی وقت آؤ تو میں ترکیب بتاؤں گا ——— میں اُس وقت چلا آیا، لیکن چوبیس گھنٹے یہ معلوم ہوتا تھا کہ میں ہوا میں اڑ رہا ہوں [illegible] وقت پر میں دوسرے دن گنگولی کے پاس پہونچا اُس نے کہا "میں نے تمہارے مسئلے کا مطالعہ کر لیا" میں اُچھل پڑا "گنگولی کہیں تم نے اُس سے میرا ذکر تو نہیں کر دیا" اُس نے اس سوال کو

کو کلیۃً نظرانداز کرکے سلسلہ جاری رکھا "تمہاری خوش
قسمتی سے میں اُس سے اور اُس کے باپ سے
پیشتر سے واقف ہوں میں نے ایک بار اُسکے باپ کا
علاج بہت کامیابی سے کیا تھا"
"کیوں گنگولی یہ نہیں وہ خوبصورت ہے؟"
میں نے کہا
"لیکن تم سے کم اس عشق کے بخار سے متاثر ہو"
اُس نے جواب دیا
"اسکے معانی یہ ہوئے کہ میرا معاملہ بالکل یاس
کُن ہے" میں نے کہا اور کرسی پر گر پڑا
"ہر طرح تندرست آدمیوں کو بھی بر انجم ہو تیار
امر حقیقت میں مبتلا کیا جا سکتا ہے" گنگولی نے بولے یا
میرے دل کے اندر رقابت کی آگ بھڑکنے لگی
کیونکہ میرا عشق بہت ترقی کر گیا تھا
"شاید تم خود" میں نے برجستہ جواب دیا
میرے اس جواب پر گنگولی قریب قریب مسکرا دیا
"نہیں وارب، نہیں، ڈاکٹر کے لیے اور خصوصاً
میرے لیے قلب ایک عضو سے زیادہ وقعت
نہیں رکھتا، میرا مقصد تندرست آدمیوں کی جانب
اشارہ کرنے سے لڑکی سے تھا"
میں نے گنگولی کو سہرے پھیر کے کہا، وہ اسکا
مطمئن ہو گیا کیونکہ گنگولی دنیا کے شفقت ... میں
میں سے ضرور ہے، اُس نے سلسلۂ کلام جاری
رکھا "ملاقات محض سرسری تھی اور میں اتنا ظاہر کر
سا تھا کہ گفتگو میں دلچسپی پیدا کرنے کی غرض سے

اس فیروزہ کو بھی حالات بحث میں لا پڑے
پہلے وقت میں نے ان باتوں میں اُس سے
اخبار میں آئے ہوئے انگلستان کے اس عجیب واقعہ
کا ذکر کیا جسکی رو سے ایک نوجوان کو محض اس
سبب سے فالج ہو گیا کہ اُس کی معشوقہ نے اس سے
عقد سے انکار کر دیا تھا اور وہ اسی میں مر گیا
"یہ واقعہ کس اخبار میں تھا" میں نے بے چینی سے
دریافت کیا
"مجھے اخبار کا نام اس وقت یاد نہیں"
گنگولی نے انگڑائی لیتے ہوئے جواب دیا "لیکن
اس فیروزہ کو فوراً اس واقعہ میں دلچسپی پیدا ہو گئی
اور اُس نے مجھ سے مزید تفصیلات دریافت کیں
میں نے اُسے بتایا کہ اس قسم کے واقعات بھی
دنیا میں کچھ نادر نہیں اور کوئی اچانک صدمہ
انسان کے اعصابی اور اعضائی کل نظام عمل کو
معطل ہو ڈال سکتا ہے جس وقت میں
رخصت ہوا اُسے اچھی طرح یقین تھا کہ زندگی محبت
کے سبب مر بھی سکتے ہیں سمجھے وارب، اسکے
معنی یہ ہیں کہ بالفاظ دیگر لیلا رسمی اور اُس کے
میاں بیوی ہونے میں اب کوئی کسر باقی نہیں"
"گنگولی" میں نے چیخ کر کہا "خدا کے لیے بتاؤ
کہ کس طرح [illegible]
تب گنگولی نے [illegible]
ی اور مجھے ... دھکے باہر کر دیا میں گھر واپس
آیا اور دوسرے دن تک تیار ہو ... آخر تار

مجھے موقع مل گیا اور جب وہ پارک میں تنہا سواری کر رہی تھی میں نے اُسے گھیر لیا، میری شکل دیکھ کر اُسے ایک حد تک خوف معلوم ہوا، کیونکہ اسکا رنگ بدل گیا اور وہ اپنا گھوڑا پیچھے ہٹانے لگی، لیکن پھر فوراً ہی سنبھل گئی، اُس وقت وہ بہت حسین معلوم ہوتی تھی، ورزش اور کھلی ہوا نے اُسکے عارض کو رنگین بنا یا تھا، سواری کا لباس اُس پر پری طرح کھل رہا تھا، میں یہ مرقعِ حسن دیکھ کر چند سکنڈ خاموش رہا پھر آگے بڑھ کر میں نے کہا "فیروزہ، میں نے اس وقت تم کو ایک مجنونانہ درخواست کرنے کیلیے روکا ہے، میں تم سے محبت کرتا ہوں"

اُس کا دہانہ اور سخت ہوگیا، اُس نے میری طرف دیکھا لیکن اس طرح جیسے کوئی بیمار بچے کو دیکھتا ہے،

"واقعی" اُس نے محض ایک لفظ جواب میں کہا،

مجھے اُس وقت ایسا احساس ہوا گویا میدان جنگ میں محض ایک کاغذ کاٹنے کا چاقو لیے ہوئے میں جرمنی کے توپ خانے پر حملہ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں، میری ناامیدی قریب تھا کہ میری ہمتوں کو پست کردے مگر گنگولی کی ہدایات نے یاد آکر مجھے ازسرنو امید دلائی

"فیروزہ" میں نے بیکیانہ انداز سے کہا "فیروزہ کیا میں کوئی اُمید نہ رکھوں کہ تم کبھی میری بیوی بن سکو گی"

"مجھے نہایت افسوس ہے، اور آپ کی حالت پر سخت رحم، مگر یہ ناممکن ہے، براہ کرم راستے سے ہٹ جائیے"

مجھے یقین ہے کہ میں نے اس وقت کا پارٹ بہت عمدگی سے انجام دیا، میرا سر زمین پر گر پڑا، میرے بازو مُردوں کی طرح بیجان ہو کر لٹک پڑے، میری گردن آگے جھک گئی اور میں درختوں کے جھنڈ میں شرابیوں کے مانند جھومتا لڑکھڑاتا چل دیا ——لیکن اصلیت میں میری یہ حالت نہیں تھی، چوری سے میں نے مُڑ کر اُس کی طرف ایک نگاہ کی اب تک وہ وہیں تھی اور میری جانب عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھی، میں سیدھا گنگولی کے یہاں پہونچا اُس نے مجھے فی الفور اپنے سینیٹوریم میں بھجوا دیا اور اُسی نے تمام سربرآوردہ اخباروں میں یہ خبر بھجوائی کہ مشہور اور لائق بیرسٹر —وارث ہمایوں —— جن کے متعلق اہل ملک کو بڑی بڑی امیدیں تھیں دفعتاً اور بلا کسی ظاہری سبب کے فالج میں مبتلا ہوگئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ بالکل غلط تھا مگر گنگولی نے خوب نمک مرچ لگا کر اس واقعہ کو اچھی طرح رنگ دے کر کچھ اس قسم کا مضمون شائع کرا دیا کہ گویا میں بمشکل چوبیس گھنٹے یا اڑتالیس گھنٹے اور زندہ رہوں گا۔ شام کے قریب گنگولی میرے کمرے میں آیا جہاں میں سفید صاف شفاف لباس پہنے، بستر پر بیٹھا ہوا مرغ کھا رہا تھا، اُس نے کہا کہ ابھی ابھی مس فیروزہ

کے یہاں سے ٹیلیفون آیا تھا کہ آج کے ٹائمز میں مطبوعہ واقعہ کے متعلق مزید تفصیلات درکار ہیں کیا مریض کا نام واقعی داراب ہمایوں ہے اور وہ بیرسٹر ہے۔ گنگولی نے اُسے یقین دلایا کہ واقعی اسکے زیرِ علاج مریض کا یہی نام ہے وہی پیشہ اور ساتھ ساتھ مزید ایسی تفاصیل بڑھا دیں جن سے اُسے یقین ہوگیا کہ مریض وہی داراب ہمایوں ہے جس کی درخواست کو اُس نے گزشتہ روز مسترد کردیا تھا، مثلاً اُس نے یہ کہا کہ مریض کی حالت سرسامی ہے اور عالم بیہوشی میں اُسے برابر لفظ "فیروزہ" کی رٹ ہے ـــــ مس فیروزہ یہ سنتے ہی ڈر گئی اور اُس نے اُسی رات میری خیریت دریافت کرنے کے لیے دوبارہ آدمی بھیجا، صبح کو گلاب کے سفید پھولوں کا ایک خوشنما گلدستہ بھی آیا بس پھر کیا تھا میں نے اُسی سفید لباس میں کمرے بھر میں ناچنا شروع کردیا، نرس نے میری یہ حالت دیکھ کر ایک چیخ ماری اور گو وہ اچھی خاصی ہٹی کٹی تھی مگر میں نہ آیا اُس سے سنبھلا، جب دو چپراسی باہر آئے تو میں بستر پر لٹایا جا سکا، نرس نے فوراً ڈاکٹر گنگولی کو مطلع کیا، وہ ہانپتا کانپتا آیا، مجھے دیکھا، نبض، دماغ، معدہ، سب کا امتحان کیا، اور نرس کو اطمینان دلایا کہ اس قسم کے دورے مریض کو پڑنا لازمی ہیں، مرض کی نوعیت ہی ایسی ہے، مگر نرس سمجھدار تھی وہ مشتبہ رہی، آخر کار مناسب یہی سمجھا گیا کہ اُسے بھی اس سازش میں شریک کیا جائے، جب نرس نے یہ سب قصہ سنا تو ہنستے ہنستے اُسکے آنسو نکل آئے۔ لیکن وہ بڑی عمدہ طبیعت کی نرس تھی اُس نے دل و جان سے میری شرکت گوارا کی، اور گنگولی نے حکم دیدیا کہ آئندہ سے مسٹر داراب کی حالت کے متعلق تمام ٹیلیفونی پیغامات کا جواب مس بون دیگی، ٹیلیفون میرے کمرے کے دروازے کے برابر تھا، اور مس بون جو کچھ کہتی تھیں میں اُس کا حرف حرف سُن لیتا تھا، پہلا پیغام دوپہر کے قریب آیا جب میں بستر پر بیٹھا انڈوں اور مکھن کا چپ چاپ لنچ کر رہا تھا،

"ہلو، ہاں، میں مس بون ہوں، مسٹر داراب کی نرس، جی، ہاں بہت عجیب وغریب واقعہ ہے، نہیں کوئی امید زندگی نہیں، ممکن ہے وہ ایک روز اور جی جائیں، جی، ہاں سرسامی کیفیت بدستور ہے برابر فیروزہ کا لفظ زبان پر ہے، نہیں نہیں دیدہ کوئی سوال نہیں، ایسا مریض کبھی نہیں ہوتا ـــــ ہرگز نہیں، ڈاکٹر کی اجازت نہیں کہ کوئی شخص بھی مریض کو دیکھنے آسکے، معمولی سے معمولی دھچکا بھی ممکن ہے کہ قاتل ثابت ہو"

"بالکل مہمل اور لغو" ـــــ میں نے چیخ کر کہا "مس بون، مس بون، آخر یہ تم نے کیا کیا، ارے مقصد تو یہی ہے کہ کسی طرح فیروزہ کو اس کمرے میں بلایا جائے اور تم نے اُسے ٹکا سا جواب دیدیا کہ کوئی مریض کے پاس نہیں آسکتا"

"ہاں مقصد تو یہی ہے مگر ابھی اُسے ایک دو دن

اور انتظار کرنے دو"

چند منٹ تک تو میری سمجھ میں اسکی آہٹ نہیں آئی پھر میں دھم سے بستر پر گر پڑا ——— عورت کا وار بظاہر بہت معمولی اور خفیف ہوتا ہے مگر نہ کبھی خالی جاتا ہے نہ جلد بھرتا ہے ——— اسی روز سہ پہر کو مس فیروزہ پیشن جی ڈنشا سیٹوریم خود بنفس نفیس تشریف لائیں اور ڈاکٹر گنگولی سے پرائیوٹ ملاقات کی۔ میں اپنی زندگی کا ایک قیمتی سال اس موقعہ پر موجود ہونے کے لیے دینے کو تیار تھا مگر ظاہر ہے کہ ایسا ممکن نہ تھا۔ گنگولی نے بعد کو مجھ سے مفصل اس ملاقات کا حال کہا

اس نے اسے پہلے تو ڈرائنگ روم میں دس پانچ منٹ منتظر رکھا، پھر خود آپریشن روم کے تمام حفاظتی لباس اور آلات سے مکمل طور پر تیار ہوا، سفید ٹوپی، ڈھاٹا، وغیرہ سب پہنے اور پر صورت تو وہ خوشنما سے خوشنما لباس میں بھی معلوم ہوتا تھا، اس صورت میں تو بالکل تھا سے یہاں کے ٹیمرین سے مشابہ ہو گیا، اور وہ بھی بہت خوفناک ٹیمرین، اسکے بعد وہ ڈرائنگ روم میں آیا۔

"مس ڈنشا، میں بہت مسرور ہوں، کہیے کیا کہنا ہے، ذرا جلدی کیجیے"

"میں معافی چاہتی ہوں کہ آپ کے کام کے وقت میں مداخلت کی، میرا خیال ہے کہ مجھے آپ کی فرصت کے اوقات میں حاضر ہونا چاہیے تھا"

"یقیناً" گنگولی نے درشتی سے کہا اور مڑ کر دروازہ کی جانب چل دیا، جب دروازے تک پہنچا تو ایک خفیف آواز نے اسے مخاطب کیا "ڈاکٹر گنگولی" ——— تیزی سے وہ پلٹا "ہاں کیا کہتی ہیں آپ"

فرط اضطراب ندامت سے اسکا رنگ سفید ہو گیا، لیکن دل کڑا کرکے اس نے تمام قصہ گنگولی سے بیان کر ہی دیا کہ کس طرح وہ چند بار دارا ب ہمایوں سے ملی، کیسے اس نے اس سے شادی کی درخواست کی ظاہر ہے کہ اس میں مس فیروزہ میں اتنا فرق تھا کہ ایسا خیال ہی مضحکہ خیز تھا جسکی وجہ سے گمان ہے کہ شاید یہ داراب ہمایوں مخبوط الحواس اور کمزور دماغ کا آدمی ہے"

اس موقع پر گنگولی نے اپنا بم پھینکا، اس نے مس فیروزہ سے کہا کہ جہاں تک دماغ اور حواس کا تعلق ہے ان میں کمزوری کا صرف ایک شائبہ جو اس نے داراب میں پایا ہے وہ یہ ہے کہ وہ بیوقوفوں کی طرح ایک معمولی عورت کیلیے اپنی جان دیے دے رہا ہے، اب رہا سوال ذہانت کا تو داراب کیمبرج میں ایسا طالب علم تھا اور ایسا مقرر تھا، اور شہر کے بیرسٹروں کے زمرے میں اسکے متعلق ایسا خیال تھا ———

آخر میں اس نے یہ کہا کہ داراب جو اسکے لیے اپنی جان دیے دے رہا ہے ذہانت اور قابلیت دماغی میں آدم سے لیکر اب تک کے تمام ستیجیوں اور ڈنشاؤں سے کہیں بڑھ کر ہے۔ اسمعیل تم نے گنگولی کو دیکھا ہے ——— اچھا ——— اب ذرا

تصور کرو، جھٹ، وہ ربڑ تا گنگولی غصہ سے چقندر کی طرح لال، کمرے میں بپھرے ہوئے گینڈے کی طرح ادھر سے اُدھر پھر رہا ہے، وہ بیچاری فیروزہ زمین کے مادھو کی طرح خاموش، تصویر سنگ کی طرح ساکت بیٹھی ہوئی یہ سب کچھ سن رہی ہے۔ آخرکار وہ رونے لگی، گنگولی نے دیکھا کہ اب موقعہ نازک ہے، بس اس نے باتوں کا رُخ بدل دیا، اُس نے معذرت کی کہ شاید غصہ کے دوران میں وہ ایسی باتیں کہہ گیا جو کہنا اُسکا منصب نہیں تھا، بہرحال اُسکا وقت قیمتی ہے اس لیے مس فیروزہ کو جلد بتانا چاہیے کہ وہ کس غرض سے اس وقت سینیٹوریم آئی ہیں فیروزہ نے جواب دیا کہ وہ اپنے طرزِ عمل پر پشیمان ہے اور اُسکے یہاں آنے کا مقصد محض بسترِ مرگ پر پڑے ہوئے مریض کی آخری ساعتوں کو آسائش آمیز بنانا ہے۔ ——— اس پر گنگولی نے اپنا آخری حربہ استعمال کر ڈالا، اُس نے کہا کہ مریض کی زندگی سے تو یوں ہی بالکل مایوسی ہے لیکن ایک خفیف سا شائبہ امید کا یہ ہے کہ اس (فیروزہ) کو دیکھ کر یا تو وہ فوراً مر جائے گا یا پھر دفعتاً بچ جائیگا۔ کل صبح سویرے سورج نکلتے وقت وہ آئے۔ اگر مریض اُس وقت تک بقیدِ حیات ہوا تو وہ اُسے ملا دے گا۔

آدھی رات کے بعد سے ہم لوگوں نے فیروزہ کے آنے کی تیاری شروع کر دی، لیکن اگر نرس نہ ہوتی تو سارا منصوبہ بگڑ جاتا۔ اُس کو تھیٹر میں کام کرنے کا موقعہ مل چکا تھا جس کی وجہ سے وہ بھیس بدلنے اور میک اپ کے نسخہ ہائے سے بخوبی واقف تھی، اُس نے میرے منہ پر اسپرٹ اور پاؤڈر ملا کہ چہرے کا رنگ تھوڑے فاصلے سے بالکل زرد معلوم ہونے لگا، میری آنکھوں کے نیچے جلی ہوئی دیا سلائیوں کی راکھ سے سیاہی نمودار کی۔ غرض پورے طریقے سے مجھے موت کے منہ میں پھنسے ہوئے مریض کی طرح بنا دیا۔ کھڑکیوں کے پردے گرا دیئے۔ لیمپ کی روشنی بالکل دھیمی کر دی کہ کمرے میں صرف دھندلی دھندلی دکھائی دے، پانچ بجے سے کچھ پہلے موٹر کے آنے کی آواز آئی اور میں نرس سے ہاتھ ملا کر بستر پر مُردے کی طرح پڑ گیا ——— دروازہ کھلا ——— میں نیم وا آنکھوں سے سب دیکھ رہا تھا ——— پہلے نرس اندر داخل ہوئی۔ اس کے بعد ڈاکٹر گنگولی اور ڈاکٹر گنگولی سے چند قدم پیچھے فیروزہ، ——— نرس اور گنگولی تو میرے بستر کے پاس آ کر کھڑے ہوگئے لیکن فیروزہ دروازے ہی پر ٹھٹک گئی۔

"ان چھتیس (۳۶) گھنٹوں میں اُس میں کس قدر تغیر ہو گیا ہے" گنگولی نے میری نبض دیکھنے کا بہانہ کرتے ہوئے کہا۔ گنگولی کے اس جملے پر فیروزہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ ظاہر ہے کہ باہر کی تیز روشنی کے بعد کمرے کی تاریکی سے عادی ہونے کے لیے اُس کی آنکھوں کو دیر لگی مگر جب

اُسے پیر میں نظر آنے لگیں تو اُسکی نگاہ میرے زرد پڑتے ہوئے چہرے پر پڑیں اور مجھے خوب یاد ہے کہ اس کے لبوں سے ایک آہ سرد نکلی، اُس نے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں اور دروازے کے پاس کی کرسی پر گر پڑی۔

گنگولی نے میری نبض کو تین بار آہستہ سے دبایا! اسکا مطلب تھا — پولا مارا گیا ہے —

"دارا ب کی حالت اس وقت گو بہت سکوت پذیر ہے مگر نبض اب بھی غیر منظم ہے۔ مس فیروزہ، اگر کہیں اس وقت وہ آنکھ کھول کر تم کو دیکھ لے اور پہچان لے تو میں نتائج کا ذمہ دار نہیں ہونگا"

"وہ بالکل مردہ معلوم ہوتا ہے" فیروزہ نے دھیمی آواز میں ترس سے کہا

"بظاہر تو اصلیت میں اسکے مردہ ہوجانے میں کچھ زیادہ وقت باقی نہیں"۔ گنگولی نے اتنی ہی نیچی آواز سے کہا

فیروزہ اُٹھ کر قریب آنے لگی لیکن گنگولی نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے روک دیا۔ ممکن تھا کہ نزدیک آنے پر وہ پوڈر وغیرہ دیکھ لیتی،

"کیا وہ کبھی آنکھیں کھولتا ہے"

گنگولی نے میری نبض کو آہستہ سے دبایا۔ میرے لیے اشارہ کافی تھا، آہستہ آہستہ بہت ہی آہستہ میں نے کروٹ بدلنے کی کوشش کی آدھی آدھی آنکھیں کھولیں اور نہایت کمزور آواز میں کہا "فیروزہ، فیروزہ"

یہ آخری حربہ بہت موثر تھا اور میں نے کیونکہ یہی بہت لاجواب کی تھی، فیروزہ کا رہا سہا استقلال بھی ختم ہوگیا اور اُس نے کرسی پر بیٹھ کر دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا اور رونے لگی، جب کچھ آنسو تھمے تو اُس نے کہا "اور میں اس تمام مصیبت اور تکلیف کی ذمہ دار ہوں، اس عظیم گناہ کے لیے قابل ملامت" اُس وقت اسکی حالت مجھ سے دیکھی نہیں گئی اور میں نے آہستہ آہستہ دوسری طرف کروٹ لینا شروع کی، فیروزہ کھڑی ہو گئی "وہ بیدار ہو رہا ہے، وہ بیدار ہو رہا ہے" اُس نے گھبرا کر کہا میں نے اُس سے قبل کبھی اتنی درد انگیز اور سنجیدہ آواز اپنی عمر میں نہیں سنی تھی جیسی اس وقت گنگولی کی ہوگئی "ہاں وہ جاگ رہا ہے، چنانچہ مس فیروزہ، میرا گمان ہے کہ حالت بیہوشی میں بھی اُسے اسکا ادراک ہے کہ تم اُس سے قریب ہو —— ابتدا سے اُس کی یہی حالت ہے، تمہارا نام ہمیشہ اُسکے ورد زبان رہتا ہے، اور اسیطرح وہ مر جائے گا کہ تمہارا نام اُس کی زبان پر ہوگا اور روح پرواز کر رہی ہوگی"

"خدا را اسے بچا لو ڈاکٹر گنگولی اسے نہ مرنے دو"

"میں اپنی کسی مکانی کوشش سے دریغ نہ کروں گا"

"میں جانتی ہوں واقعی آپ ڈاکٹروں کی بھی کیا ہستی ہے، دوسروں کو موت سے بچانا، اوروں کو نئی زندگی عطا کرنا۔ بالفاظ دیگر ایسا معلوم ہوتا ہے گویا آپ خود اپنی رگوں کا خون مریض

کی رگوں میں پہونچائے جا رہے ہیں کس قدر عظیم الشان ایثار ہے" فیروزہ نے رقت آمیز انداز سے کہا

جب فیروزہ نے یہ الفاظ کہے میں نے محسوس کیا کہ میری نبض پر رکھی ہوئی گنگولی کی انگلیاں ایک عجیب انداز سے مرتعش ہوئیں، اس سے زیادہ انتظار میرے امکان سے کبھی باہر تھا، میں نے اپنا سر اُس کی طرف پھرا، آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں اور بغور فیروزہ کی طرف دیکھا، اُسکے بعد میں کراہا، گنگولی فوراً میری پٹی کے پاس بیٹھ گیا

"گنگولی، انتقام شاید بہت قریب ہے میں ..... میں اُسے ...... میں نے اُس ...... میں اُسے اس کمرے میں دیکھتا ... ہوں ..... ہاں ..... کھڑا ہوا ...... وہاں کھڑا ہوا ......" میں نے ضعیف ترین آواز سے کہا

بعد کو گنگولی نے بھی تسلیم کیا کہ یہ پارٹ میں نے خوب ادا کیا تھا——جوں ہی میں خاموش ہوا فیروزہ ایک سسکی لیکر اُٹھی اور میرے بستر کی طرف بڑھی، میں نے خوف سے آنکھیں بند کرلیں، لیکن گنگولی نے اُسے روک دیا——"مس فیروزہ اب جائیے، وہ بہت کمزور ہے"

"لیکن اُس نے مجھے پہچان لیا" اُس نے مسرت بھری آواز میں کہا

گنگولی نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور آہستہ آہستہ دروازے کی طرف بڑھا

"خدا کا شکر ہے مس فیروزہ، تم نے اس کی جان بچالی، اب وہ اچھا ہوجائے گا. تم نے ایک شخص کو موت کے منہ سے باہر نکال دیا"

"تو میں پھر اسے دیکھنے کے لیے دوبارہ آسکتی ہوں"

"ہاں، لیکن بہت تھوڑی دیر کے لیے"

"بخدا اسمٰعیل، جب میں اس موقع کو یاد کرتا ہوں، اُس مجسمۂ حسن و خوبی کی اُسوقت کی حرکات کا دھیان کرتا ہوں، اُس کی آواز کو تخیل میں لاتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک خواب تھا جس کے حقیقت میں عالم وجود میں عمل میں آنے کا امکان ہی نہیں——دروازے سے گزرتے وقت میں نے اُسے کہتے سُنا

"ڈاکٹر گنگولی، اب تک مرد میری نظر میں بہت حقیر چیز تھے، لیکن آج مجھے معلوم ہوا کہ مرد کیا چیز ہو سکتے ہیں، جب میں نے آپ کو داراب کے پلنگ کی پٹی کے پاس کھڑے ہوئے دیکھا، اسکو موت کے دروازوں سے بزور باہر لاتے ہوئے، تو میری نظر میں مرد فرشتوں سے برتر و بالاتر ہوگئے"

دروازہ بند ہوگیا اور تھوڑی دیر کے بعد گنگولی میرے پاس واپس آیا، مس بوس کھڑکیوں کے پردے اُٹھا رہی تھیں، اور میں بستر کی برابر فرش پر ایک پیر سے ناچ رہا تھا

"اب وہ میری ہوگئی" میں نے انتہائے مسرت میں گنگولی سے کہا

اُس نے سر ہلایا۔ مجھ میں غصہ کا جذبہ پیدا ہوا۔ میں نے کہا

"ادھر دیکھو گنگا بی بی! اس کا مطلب یہ ہے کہ کچھ عرصہ تم میں اور شوخ لڑکی وشنا [illegible] اور اتنی آرائش ہے۔ کچھ [illegible] تھا اسے سردہ مُردہ دل میں کوئی گرمی اور روح [illegible] پیدا ہوئی کیا تم انسان نہیں ہو"

اُس نے اسکا بھی کوئی جواب نہ دیا اور چلا گیا۔ اسکے بعد بھی اس کا یہی معاملہ گذر گیا ہوتا، لیکن اُس نے انکار کردیا۔ [illegible] اُس نے میرے [illegible] اس اس طرح تبدیلیاں نہیں [illegible] کبھی [illegible] تک نہیں ہوا۔ آخر کار [illegible] اس کی اجازت دی کہ مجھ سے چپکے چپکے باغ میں باتیں کر سکے۔ [illegible] سے میرے لیے شور [illegible] نوجوان کے لیے [illegible] زندگی بسر [illegible] اُس کے چلے جانے کے [illegible] ساتھ بیٹھ کر خوب مزے [illegible] اسمٰعیل، اُس [illegible] وہ شوخ اور حسین چہرہ، [illegible] آنکھیں [illegible] روز نیا لباس، اُس کی آنکھوں کی مسکراہٹ جب اُسے پہلی بار [illegible] صحت بہتر ہو رہی ہے [illegible]

رنگین تکیوں پر لیٹے رہنا اور اس کی [illegible] بالوں میں کنگھی کرتی ہوئی اسمٰعیل وہ [illegible] یاد ہے"

"کتنے دن یہ ڈھونگ جاری رہا، داراب" میں نے پوچھا

"دس دن اسمٰعیل، دس دن" اُس نے [illegible] کہا۔ "مجھے اُس سے دوبارہ شادی کی درخواست کرتے ڈر لگتا تھا کہ کہیں یہ سب خواب نہ ہو اور میں چونک پڑوں"

"اور گیارہویں دن تم نے اُس سے درخواست کی [illegible] داراب شادی کب ہے" میں نے [illegible] کر کہا

"ہاں گیارہویں دن میں اُس سے درخواست کرنے والا تھا" داراب نے پھر چپکے چپکے [illegible] قہقہہ لگاتے ہوئے جواب دیا (قہ قہ قہ - ہا ہا ہا - قہ قہ قہ، ہا ہا ہا قہ قہ قہ، ہا ہا ہا) لیکن مشکل یہ آ پڑی کہ وہ اس سے قبل ہی [illegible] بن چکی تھی اور [illegible] سے [illegible] ہا ہا ہا، قہ قہ قہ ——— [illegible] ساڑھے نو بجے صبح کا وقت ہے، دیکھو آنا ضرور"

(ہا ہا ہا، قہ قہ قہ، ہا ہا ہا)

غالب کا ایک شعر

(جناب مولوی محمد اظہار الحسن صاحب بی اے ایل ایل بی وکیل)

کیا آئینہ خانہ کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے　　　کرے جو پرتوِ خورشید عالم شبنمستاں کا

مرزا غالب کی خوش قسمتی سمجھو یا بدقسمتی کہ ان کے شارحین کی تعداد اسقدر کثیر ہے جو کسی دوسرے اردو شاعر کو میسر نہیں آئی اور انکے اشعار کا مفہوم سمجھنے میں اتنا زیادہ اختلاف ہے کہ کوئی انکے کلام کو مہمل سمجھا اور کسی نے ان کو ملہم ٹھہرایا۔ دورِ موجودہ کے بعض گرامی قدر اساتذہ نے کلام غالب کی شرح لکھنے کی تکلیف گوارا فرمائی ہے اور فصاحت و بلاغت، شعر فہمی اور نکتہ سنجی کے حیرت انگیز نمونے پیش کیے ہیں چنانچہ اکثر اشعار کا مفہوم مع شد پریشاں خواب من از کثرتِ تعبیرہا کی تفسیر ہوکر رہ گیا ہے۔ زیب عنوان شعر بھی انھیں میں سے ہے۔

علامہ نظم طباطبائی کا ارشاد ہے "جس طرح آفتاب کے سامنے شبنم نہیں ٹھہر سکتی اسی طرح تیرے مقابلہ کی تاب آئینہ نہیں لا سکتا"۔ جانشینانِ داغ میں سے ایک صاحب فرماتے ہیں "تیرے جلووں نے آئینہ خانہ کا بالکل ایسا نقشہ کردیا جیسے سورج کے نکلنے سے باغ میں شبنم کا ہوجاتا ہے یعنی جس طرح سورج کے مقابلہ میں شبنم نہیں ٹھہر سکتی اسی طرح تیرے جلووں کے مقابلہ میں آئینہ کی آب و تاب بھی نہ ٹھہر سکی"۔

فاضل شارحین کی استادی میں تو کلام نہیں مگر افسوس ہے کہ زیر نظر شعر کی شرح کرنے میں ان حضرات نے دقتِ نگاہ سے کام نہیں لیا اور بادی النظر میں جو معنی ذہن نشین ہوئے وہ بیان کردیے۔ میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ انکے بیان کیے ہوئے معنی بالکل غلط ہیں ہاں یہ ضرور عرض کیا جا سکتا ہے کہ غالب غالب نہ ہوتے اگر انکے پیش نظر یہی مفہوم ہوتا۔

علامہ طباطبائی وغیرہ کو غالباً مرزا کے اس شعر سے مغالطہ ہوا

پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم　　　ہم بھی ہیں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

اول تو غزل کے ایک شعر سے دوسرے شعر کے مفہوم سمجھنے میں مدد لینا اصولاً غلط ہے۔ غزل کا ہر شعر بجائے خود مستقل ہوتا ہے۔ مسلسل غزل کو مستثنیات میں سمجھنا چاہیے۔ اکثر شاعر ایسی کیفیتوں کی تصویریں بھی کھینچتا ہے جو ایک دوسرے سے قطعی متضاد ہوتی ہیں۔ مثلاً نواب فصیح الملک کے یہ دو شعر ملاحظہ فرمایئے

چڑھی ہے یہ آندھی اتر جائے گی　　طبیعت کوئی دن میں بھر جائے گی

طبیعت کوئی آج بھر جائے گی　　رہیں گی دمِ مرگ تک خواہشیں

دوسرے تھوڑے سے تامل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس شعر میں فنا کی
نہیں بلکہ عنایت کی نظر ہے اس لیے پرتو سے مراد اثر ہوگا اس کے برعکس زیرِ بحث
کی روشنی ہے۔ ظاہر ہے کہ سورج کی روشنی سے شبنم کو کوئی نقصان نہیں پہونچتا
بھاپ بنا کر اڑا دیتی ہے اس لیے فنا کی تعلیم والے شعر سے استدلال صحیح نہیں۔
کسی روشن تر چیز کے سامنے آئینہ کی چمک کا مدھم پڑ جانا بھی صحیح نہیں۔ آئینہ کی
عکس لیکر اس کو اور جلا دیدیتا ہے۔ مان لیجیے کہ جلوۂ محبوب کے سامنے آئینہ کی
سکتی لیکن آئینہ اپنی جگہ پر بدستور قائم رہیگا اور سورج کے مقابلہ میں خود شبنم فنا ہو
بھی اسکے قطروں کی تابانی زائل نہیں ہوگی۔ یہ امر قابلِ لحاظ ہے کہ شاعر نے شبنم
شبنمستاں اور آئینہ خانہ استعمال کیا ہے۔ شبنمستاں سے اگر وہ سبزہ زار مراد لیا جا
ہوئی ہو تو شعر کا مفہوم یہ ہوگا کہ پرتوِ خورشید نے شبنمستاں کی رونق کو پھیکا کر دیا۔ حا
کہ پرتوِ خورشید سے قبل شبنمستاں میں کوئی نظر فریب کوئی تابانی نہیں ہوتی۔ میر انیس نے
ان الفاظ میں کی ہے

تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا

وہ پرتوِ خورشید ہی کا رہینِ منت ہے۔ یہ مانا کہ فروغِ شبنمستاں کا زمانہ بہت مختصر
خورشید سے جہاں شبنمستاں جگمگا اٹھتا ہے وہاں شبنم فنا بھی ہو جاتی ہے۔ مگر یہ تو اصول
مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی۔ کلی چٹکنے کے بعد پھول کی زندگی بھی تو مختصر
کوئی کہہ سکتا ہے غنچۂ گل سے زیادہ حسین ہے۔
جلوۂ یار کے مقابلہ میں آئینوں کی چمک کیا روشن سے روشن تر چیز کا نسبتاً مدھم ہو
کو کیا ضرورت تھی کہ اس مضمون پر خامہ فرسائی کرتے جو مسلمات شاعری میں داخل ہے
برابر کی چیزوں میں۔ آفتاب اور شبنم جمالِ محبوب اور آئینہ خانہ کی آب و تاب کو آپس
ان کے مقابلہ کا خیال غالب ایسے سلیم المذاق شاعر پر بہتان ہے۔
یہ شعر محاکات و تخئیل کے امتزاج کی ایک لطیف مثال ہے۔ غالب نے ا
کی تصویر کھینچی ہے۔ برسات یا جاڑوں میں سورج نکلنے کے بعد کسی سبزہ زار میں جا کر

منظر ملاحظہ کیجیے۔ آفتاب کی شعاعوں سے شبنم کے قطرے موتیوں کی طرح چمکنے لگتے ہیں۔ بالکل یہ معلوم ہوتا ہے کہ مخمل کی زمردیں چادر پر بیشمار موتی ٹنکے ہوئے ہیں لیکن یہ چمک دمک ذاتی نہیں ہوتی بلکہ جمالِ ہمنشیں کا اثر ہوتا ہے شبنم میں فی نفسہ کوئی چمک نہیں ہوتی سورج کی کرنیں اُسے لے اڑتی ہیں اور پورا شبنمستان جگمگ جگمگ کرنے لگتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ بالکل اسی طرح رخِ محبوب کے عکس سے آئینہ خانہ جگمگا اٹھتا ہے۔ شیش محل میں برقی قمقمہ روشن کر دیجیے پھر دیکھیے آئینوں کے فروغ کا کیا عالم ہوتا ہے نظر خیرہ ہو جائیگی۔ شاعر کے نزدیک رُخِ محبوب میں بدرجہا زیادہ تابانی ہوتی ہے۔ اب اگر محبوب آئینہ خانہ میں جلوہ فگن ہو اور ہر طرف اُسکا عکس نظر آئے تو رونق کا کیا عالم ہوگا۔ اسکو غالب ایسے ذکی الحس اور لطیف الخیال شاعر کے دل سے پوچھیے۔

جہانِ آرزو

(جناب منشی سید انور حسین صاحب آرزو لکھنوی)

قربت بڑھا بڑھا کے بیخود بنا رہے ہیں
میں دور ہٹ رہا ہوں وہ پاس آ رہے ہیں

وہ دل سے غم بھلا کر دل کو لُبھا رہے ہیں
گزرے ہوئے زمانے پھر پھر کے آ رہے ہیں

اعجازِ پاکبازی حیرت میں لا رہے ہیں
دل مل گیا ہے دل سے پہلو جدا رہے ہیں

چوتھے فلک پہ کوئی عرشِ علیٰ پہ کوئی
اُن تک پہونچنے کو زینے بنا رہے ہیں

سینے میں ضبطِ غم سے چھالا اُبھر رہا ہے
شعلے کو بند کر کے پانی بنا رہے ہیں

خود اُن کی جستجو میں ہم دُور بھاگے ورنہ
وہ کب الگ رہے ہیں وہ کب جدا رہے ہیں

ٹھوکر قدم قدم تھی زنداں سے کیا نکلتے
آزادیوں کے خطرے زنجیرِ پا رہے ہیں

اے بیخودی کہاں ہے جلدی مری خبر لے
بھولے تھے جو مشکل پھر یاد آ رہے ہیں

لیں کام ضبط سے کیا اُٹھا ہے دل کا پھوڑا
اُتنا اُبھر رہا ہے جتنا دبا رہے ہیں

سکتے کی ترجمانی کرتی ہیں ٹھنڈی سانسیں
تم بھید کھولتے ہو اور ہم چھپا رہے ہیں

فرقت میں سازِ راحت سامان عذاب کا ہے
ٹھنڈی ہوا کے جھونکے جی کو جلا رہے ہیں

معنی نہ پوچھ ظالم کچھ عذرِ بے گنہ کے
اپنے کو او دل دیکر تجھکو بچا رہے ہیں

دیکھ آرزو یہ رونا تھا نہ بلا بلا کے
تو آج خواب میں ہے اور وہ جگا رہے ہیں

حالِ زارِ وطن

(جناب مولوی محمد یونس حسن صاحب فروغ کاکوروی)

کیسی تباہیوں میں اب مادرِ وطن ہے　　کس برہمی کو پہونچی اپنی یہ انجمن ہے
کیسی خزاں ہے جس سے پامال یہ چمن ہے　　دوزخ نظیر کیسی یہ جنتِ عدن ہے
بتلاؤں کیا کہ کیا ہے حالِ زبوں ہمارا
بس رنگ لا رہا ہے بختِ نگوں ہمارا

علم و کمال اپنا سب ہم سے جا چکا ہے　　مال و منال اپنا ادبار کھا چکا ہے
تدبیر کا خزانہ سو دا اُلٹا چکا ہے　　تقدیر کا ستارہ گردش میں آچکا ہے
منجدھار میں پھنسی ہے کشتی مرے وطن کی
نکبت آستیں ہے بستی مرے وطن کی

وہ اتحاد جس سے امیدِ ارتقا تھی　　وہ انتظام جس پر خود منحصر بقا تھی
وہ اعتماد جس کی وحدت ہی انتہا تھی　　وہ اعتبار بیشک اک چیز بے بہا تھی
رخصت ہوئی یہ ساماں سب لُٹ گیا ہمارا
بے ساز و برگ ہے اب یہ قافلہ ہمارا

اُجڑے ہوئے پڑے ہیں کشمیر کے چمن بھی　　بے ربط ہو رہے کچھ گنگ اور جمن بھی
ہے ہلکا رہی کچھ تاج کی پھبن بھی　　غفلت میں سو رہا ہے کچھ خطۂ دکھن بھی
افسوس! کیا بتاؤں کیا حال ہے وطن کا
صبر آزما ہے کتنا منظر ہمارے دن کا

رگ رگ میں بجلی ہے اور دل میں اک جلن ہے　　اک آگ سی لگی ہے شعلوں میں تن بدن ہے
ہاں اے فروغ کوئی حدِ غم و محن ہے　　اور اس پہ ضبط اپنا آفت کا نیش زن ہے
ہر دم بس اک طرح کی گویا لگن لگی ہے
اک پھانس ہے کہ دل میں رہ رہ کے چبھ رہی ہے

انتخاب مشاعرہ بزم جگر بسواں

مصرع طرح "پھر نہ دامن نظر آیا نہ گریباں مجھکو"

استر باسط بسوانی

دین پیارا بت کافر ہے نہ ایماں مجھکو — سخت کافر ہیں جو کہتے ہیں مسلماں مجھکو
دستِ وحشت سے یہ کہتا ہے ہمارا دامن — تیرے قربان بنا دے تو گریباں مجھکو
کعبے والوں نے دیا کفر کا فتوے لیکن — دیر والے ابھی کہتے ہیں مسلماں مجھکو
آپ کے عذرِ جفا سے مجھے شرم آتی ہے — ہاتھ اپنے نہ کریں آپ پشیماں مجھکو
آگیا عہدِ جنوں یاد مجھے بھی باسط — نظر آیا جو کوئی چاک گریباں مجھکو

بیکس بلگرامی

دل پریشان ہے میرا تو عجب حالت ہے — ایک عالم نظر آتا ہے پریشاں مجھکو
کچھ سمجھ بوجھ کے تم طور پہ موسیٰ آنا — یاں نظر آتے ہیں کچھ اور ہی ساماں مجھکو
راحتیں ایسی ملیں مجھکو قفس میں صیاد — یاد آتا نہیں بھولے سے گلستاں مجھکو
جانے کیا کہدیا بیکس بتِ کافر نے مرے — کعبے والے نہیں دیتے ہیں مسلماں مجھکو

اخگر بسوانی

لیکے دل دل کی جگہ پر دیا پیکاں مجھکو — سنگدل نے دیا آرام کا ساماں مجھکو

احقر بسوانی

ہاتھ سے اپنے مجھے دفن کیا ہے تم نے — یاد رکھوں گا نہ بھولوں گا یہ احساں مجھکو

جوہر بسوانی

چھوڑ دے چھوڑ دے گر سارا زمانہ چھوٹے — چھوڑنا تو نہ کبھی اے غمِ جاناں مجھکو

خلیل بسوانی

یا خدا حشر کے دن سے یہی ارماں مجھکو — خلد زاہد کو ملے کوچۂ جاناں مجھکو
بھیجا ہے بتِ کافر کو مجھے کچھ پیغام — کوئی مل جائے حجِ کعبے میں مسلماں مجھکو
داغِ دل جسنے دیا اُسکا بھلا ہو یارب — مل گیا خوب چراغِ شبِ ہجراں مجھکو
سنگِ اسود پہ ہوں قرباں میں دل جلنے خلیل — مل گیا کعبے میں سنگِ درِ جاناں مجھکو
گھیرے رہتے ہیں خدایا مرے عصیاں مجھکو — پھر بھی رحمت تری کہتی ہے مسلماں مجھکو

رضا بسوانی

انجمن کا ہے رضا عاشقِ شیدا دل سے — کہتے ہیں لوگ فدا کار مسلماں مجھکو

مومن بسوانی

مذہبِ عشق کی باتوں سے نہیں تو واقف — کیوں سکھاتا ہے عبث زاہدِ ناداں مجھکو
حال ایسا تھا زبوں رات کو مومن تا صبح — شمع بھی روتی رہی دیکھ کے گریاں مجھکو

محمد بسوانی

کچھ نہیں راحت آرام کا ساماں مجھکو — چھوڑ کر جائے نہ یارب غمِ جاناں مجھکو
نہیں معلوم کہ کعبے کو کہ بتخانے کو — کھینچ لیجائے کدھر حسرتِ جاناں مجھکو

مائل انصاری
خیرآبادی

میرے صیاد فقط ایک ہے ارماں مجھکو
ذبح سے پہلے دکھا چل کے گلستاں مجھکو

بال و پر ٹوٹ چکے ہیں جو قفس میں میرے
ہنستی ہے کوشش دیدارِ گلستاں مجھکو

وہم ہی وہم ہے لے بندۂ خود بیں تیرا
کعبہ و دیر نظر آتے ہیں یکساں مجھکو

برہمن پوجتا تھا تجھکو یہ دل کا مندر
اس میں آتا ہے نظر جلوۂ جاناں مجھکو

نشاط بلونی

تجھ پہ کرنا ہیں فدا دین و دل و جاں مجھکو
اک نظر دیکھ بت دشمن ایماں مجھکو

آپ اور لاش اٹھائیں یہ نہیں ہو سکتا
آپ کیوں کرتے ہیں شرمندۂ احساں مجھکو

میں وہ دیوانہ ہوں صحرا کو ضرورت ہے مری
ڈھونڈنے آیا جنوں تا درِ زنداں مجھکو

رات کو یار کی زلفوں کا جو رہتا ہے خیال
دن کو آتے ہیں نظر خواب پریشاں مجھکو

ہوتی ہے بزم ادب بزم جگر میں جو نشاط
کھینچ لیتا ہے کوئی جانب بستاں مجھکو

ہنر ہیبت پوری

موسم گل میں نہیں یادِ گلستاں مجھکو
لیے جاتا ہے کوئی سوئے بیاباں مجھکو

درد دے درد دے بیدرد مجھے اور دے درد
درد بڑھ بڑھ کے ہوا جاتا ہے درماں مجھکو

پھول ہنستے ہیں تجھے دیکھ کے اس محفل میں
شمع روتی ہے ہنر دیکھ کے گریاں مجھکو

ہمسر باڑوی

ہوں پرستار ازل سے میں بتِ کافر کا
لوگ صورت سے سمجھتے ہیں مسلماں مجھکو

سیف خیرآبادی

دل سے منظور نہیں درد کا درماں مجھکو
چارہ گر کرتے ہیں بیکار پریشاں مجھکو

لطف صیاد سے احساس اسیری نہ رہا
آشیاں اور قفس ہو گئے یکساں مجھکو

چھیڑ کر اے نگہ شوق بھری محفل میں
انکو حیران کیا اور پریشاں مجھکو

دوستوں سے بھی کچھ امید نہیں ہے اے سیف
اپنے بیگانے نظر آتے ہیں یکساں مجھکو

جگر صدیقی
بسوانی

داورِ حشر یہ ہے حشر میں ارماں مجھکو
بدلے جنت کے ملے کوچۂ جاناں مجھکو

لے گئے لے گئے دل کر گئے بیجاں مجھکو
دے گئے دے گئے داغِ غم ہجراں مجھکو

میں تو کعبے کی طرف دل کو چلا تھا لیکر
لیچلا دل طرفِ کوچۂ جاناں مجھکو

اشک شوئی غم فرقت میں یونہی ہوتی ہے
ہنس دیا کرتے ہیں وہ دیکھ کے گریاں مجھکو

جس طرف کوچۂ قاتل میں گزر ہوتا ہے
نظر آتے ہیں ادھر موت کے ساماں مجھکو

میری تقدیر کہ تم سا تو مسیحا پایا
اور پھر بھی نہ ملا درد کا درماں مجھکو

یوں اکیلے ترا جانا نہیں اچھا سرِ حشر
ساتھ لیجائے بت غارت گر ایماں مجھکو

کافر عشق بتاں ہوں میں تعجب ہے جگر
کیوں مسلمان سمجھتے ہیں مسلماں مجھکو

نظرے خوش گزرے

اکیس سال کے بعد گزشتہ مہینے حیدرآباد آنا ہوا۔ اس پرچہ کی تکمیل کے وقت تک واپسی کی توقع تھی مگر اندازہ سے بہت زائد قیام کرنا پڑا۔ اب بھی نہیں معلوم کہ کب تک لکھنؤ پہنچوں گا۔ اس لیے اگست کا پرچہ یہیں سے مرتب کر دیا گیا ہے۔ اور یہ تحریر بھی مختصر رہی۔ میری غیرموجودگی میں انشاءاللہ پرچہ تو وقت پر شایع ہو جائے گا لیکن طباعت میں غلطیاں زائد رہ جانے کا اندیشہ ہے اُمید کہ ناظرین کرام معاف فرمائیں گے۔

عثمانیہ یونیورسٹی کے دارالترجمہ سے جو قیمتی کتابیں شایع ہوئی ہیں، افسوس ہے کہ اب تک حیدرآباد کے باہر انکی اشاعت کا دائرہ بہت ہی محدود رہا اور یہ زیادہ تر اس سبب سے کہ یہاں کے ارباب حل وعقد نے تاجران کتب کے لیے وہ آسانیاں نہیں بہم پہونچائیں جن کی وجہ سے ان کتابوں کی فروخت میں ان کو حصہ لینے کا موقع ملتا۔ کچھ دن پیشتر سابقہ شرائط میں کچھ نرمی کی گئی تھی لیکن وہ بھی ایسی نہ تھی کہ عام طور پر لوگ اس طرف متوجہ ہوتے۔ مقام شکر ہے کہ اب زاویۂ نظر میں تبدیلی واقع ہوئی ہے اور عنقریب ان کتابوں کے عام طور پر بازار میں فروخت کیے جانے کے انتظامات مکمل ہو جائیں گے

ایک اخبار میں یہ پڑھ کر بڑا صدمہ ہوا کہ لکھنؤ کے مشہور شاعر جناب مرزا محمد ہادی عزیزؔ کا انتقال ہوگیا۔ اِنّا للہ و اِنّا الیہ راجعون۔ مرحوم عرصے سے ذیابیطس میں مبتلا تھے اور اُسی کے بدولت دق ہوگئی تھی۔ میڈیکل کالج میں علاج ہونے کے بعد طبیعت کچھ سنبھل گئی تھی اور بظاہر امید نہ تھی کہ اتنی جلد پیامِ اجل آجائے گا مگر اذا جآء اجلہم لایستأخرون ساعۃ ولایستقدمون۔ موت کا فرشتہ وقت معینہ پر آیا اور ایک خوشگو شاعر، ایک شیریں بیاں ادیب، ایک دیرینہ رفیق کار کو ہمیشہ کے لیے جدا کر گیا۔

لکھنؤ کی شاعری میں جو خوشگوار تبدیلی اسوقت نظر آتی ہے اس میں حضرت عزیزؔ نے اپنے استاد شفیق حضرت صفیؔ کی معیت میں بہت بڑا حصہ لیا تھا۔ جس کا کچھ اندازہ اُنکے دیوان غزلیات "گلکدہ" کے مطالعہ سے ہوسکتا ہے اور زیادہ صحیح طور پر اُسوقت ہوگا جب اُنکی نظموں کا مجموعہ شایع ہوگا۔

نئی کتابیں

مرآتِ مصطفیٰ آباد

گجرات کے نامور مورخ شیخ غلام محمد مصنف مرآۃ تکارس کی قابل دید کتاب جوناگڈھ کی اسلامی ریاست کی تاریخ میں۔ جس میں جوناگڈھ کے فرمانروایان خاندان بابی کے مفصل حالات، عہد بعہد کی تبدیلیاں، ملکی انقلابات و حوادث وغیرہ کے مفصل و مستند واقعات درج ہیں۔ اور شہنشاہان مغلیہ اور ان سے سلطان تاجداران ہند کے زمانہ کے حالات بھی بیان ہوئے ہیں۔ حجم ۸۶۰ صفحے کلاں۔ ریاست جوناگڈھ کا نقشہ اور ستر تصاویر جن میں بعض رنگین ہیں مستزاد۔ دیدہ زیب جلد۔ قیمت صرف للعہ

ایوان تصور

مسز سروجنی نائیڈو کے انگریزی نغموں نظموں اور غزلوں کا اردو ترجمہ از مسٹر ظفر قریشی دہلوی بی اے حجم ۳۳۶ صفحے معہ شاعرہ و مترجم کی تصاویر کے۔ نظر فریب جلد۔ قیمت عہ

نغمۂ روح

مسٹر اختر انصاری بی اے کا مجموعۂ کلام معہ مقدمہ از اسیں احمد صاحب رشدی دہلوی ایم اے۔ حجم ۱۱۰ صفحہ معہ تصویر شاعر۔ قیمت ۱۲ر

اصلاح الاصلاح

خواجہ عبدالرؤف صاحب عشرت لکھنوی کے رسالہ اصلاح زبانِ اردو کی اصلاحات از صفدر مرزاپوری معہ تنقیدات مولوی محبوب علی صاحب و حکیم برہم مرحوم و تبصرۂ منشی عبدالرحیم لکھنوی مرحوم۔ حجم ۶۰ صفحے قیمت ۱۰ر

حسنِ خیال

شعرائے فارسی و اردو کے ان اشعار کا لطیف مجموعہ جن سے کسی دلچسپ قصہ یا لطیفہ کا تعلق ہے۔ از صفدر مرزاپوری مرحوم مولف بزم خیال وغیرہ حجم ۱۵۰ صفحے۔ قیمت عہ

مشاطۂ سخن (جلد دوم)

صفدر مرزاپوری مرحوم کی مقبول کتاب کا دوسرا حصہ۔ جس میں کامل الفن و مسلم الثبوت اساتذہ کی نادر و نایاب اصلاحیں جمع کی گئی ہیں۔ حجم ۲۶۳ صفحے۔ قیمت عہ

ناٹک ساگر کے دو باب

یہ کتاب نور الٰہی صاحب و محمد عمر صاحب کی عرصہ ہوا شائع ہوکر قبولیت حاصل کرچکی ہے۔ اب کتاب کے ۲ باب جن میں ہندوستان اور ایران کے ڈراما کی تاریخ ہے افادی ضرورت سے علیحدہ شائع کئے گئے ہیں۔ قیمت عہ

صفحہ ۱۷ سطر ۱۵ "آنکھیں کھولیے اور غور سے دیکھیے کہ اس عظیم آبادی کی نسبت یہ کہنا کہ اس خود پرستی کی کیا ضرورت ہے آپ میں جوہر ہوگا تو سیالب خود پکار لیگی ذرا غور تو کرو کہاں تک ٹھیک ہے۔"

ابتدا میں کھولیے اور دیکھیے اور آخر میں غور تو کرو، یہ کہاں تک درست اردو کا نمونہ ہو سکتا ہے۔ مزید برآں اس پورے جملہ کی ساخت پر غور کیجیے اور دل ہی دل میں اس شخص کی اردو نویسی کی داد دیجیے جسکے قلم سے یہ اور اسی قسم کے متعدد جملے نکلے ہیں اور جو اس پر بھی اس کا مدعی ہے کہ اس کا سا اردو لکھنے والا آج روئے زمین پر نہیں۔

(۴)

تمام کتاب میں ابتدا سے انتہا تک، خواہ دیباچہ ہو خواہ محاضرات، کہیں اس کا لحاظ نہیں رکھا گیا ہے کہ جہاں کوئی دعویٰ کیا جائے وہاں اس دعوے کے لیے کوئی دلیل بھی ہو، جس جگہ کوئی ادعا کیا جائے وہاں اس کی تائید میں براہین پیش کیے گئے ہوں۔ اگر کسی مقام پر بھولے سے کسی بیان کا ثبوت دیا بھی گیا ہے، کسی امر کے لیے دلیلیں پیش کی بھی گئی ہیں تو وہ منطق سے بالکل بیگانہ اصول بحث سے بالکل علیحدہ، قواعد مباحثہ سے یک لخت خالی ——— مضمون کی طوالت کے خوف سے میں صرف چند مثالیں اس نوع کی پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔

صفحہ ۵ و ۶ پر تحریر ہے۔

"اگلے اساتذہ کے دواوین تو موجود ہیں مگر ان کے سوانح کے متعلق ہمیں کوئی مفصل اطلاع نہیں، اس لحاظ سے میں نے اس دیباچہ میں مصنف کے حالات زندگی اور طرز زندگی کو زیادہ واضح کرنا چاہا ہے۔"

میرزا مراد بیگ شیرازی نے میرزا یگانہ کے حالاتِ زندگی اور طرز زندگی کے متعلق جو کچھ دیباچہ میں رقم فرمایا ہے وہ مختصراً یہ ہے ——— "میرزا یگانہ کے خاندانی حالات، ان کا سلسلۂ نسب، انکی شادی، ان کے ذوق شاعری کی نشوونما اور پرورش، ان کے قیام لکھنؤ کے واقعات، اور انکی خود پرستی کے وجوہ" ——— ان امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے میں یہ سمجھنے سے بالکل قاصر ہوں کہ "اگلے اساتذہ کے سوانح کے متعلق ہمیں کوئی مفصل اطلاع نہیں" کون سا ایسا مشہور شاعر ہے جسکے سوانح حیات کے متعلق اردو میں کم سے کم اتنا ہی مواد موجود ہو جتنا "آیاتِ وجدانی" سے میرزا یگانہ کی بابت ہمارا [illegible] کون سا ایسا استاد ہے جسکے حالات اور طرز زندگی کے متعلق ہمیں میرزا یگانہ کے حالات سے کم معلوم ہوا ہے۔ میر، غالب، امیر، انیس ان لوگوں کو ابھی رہنے دیجیے ان کے متعلق تو اردو میں مستقل کتابیں

موجود ہیں جن سے ہمیں ان اساتذہ کے متعلق دس درجہ زیادہ علم حاصل ہوتا ہے۔ سودا، ذوق، مومن، آتش و ناسخ، داغ، درد، شیفتہ، رند، وزیر، مصحفی و انشا، نسیم و چکبست، کس کی بابت ہمیں اتنی معلومات نہیں جتنی میرزا مراد نے آیاتِ وجدانی میں میرزا یگانہ کی بابت جمع کی ہیں، ایک بحیات کو لے لیجیے، مذکورہ بالا متعدد شعرا کے حالات اس میں قریب قریب اتنی ہی تفصیل اور وضاحت سے درج ہیں، پھر ایسی متعدد کتابیں موجود ہیں جو اسی موضوع پر کثیر معلومات فراہم کرتی ہیں، شعرالہند، گل رعنا، خمخانۂ جاوید، کس کس کا نام لیا جائے۔ کیا ان تذکروں میں قدیم اساتذہ کی بابت اتنا بھی ذخیرہ نہیں ہے جتنا آیاتِ وجدانی میں میرزا یگانہ کی بابت ہے——اب آئیے یادگارِ غالب، یادگارِ انیس، موازنۂ انیس و دبیر، طرۂ امیر، سوانحِ امیر، حالاتِ میر پر——کیا یادگارِ غالب میں غالب کا نام و نسب مذکور نہیں ہے، کیا اس کے طفلی و شباب کے حالات نہیں مرقوم ہیں، اسکی معاصرین سے نوک جھونک، اس کا طریقۂ زندگی، اسکے واقعاتِ حیات، ان امور کے متعلق آیاتِ وجدانی سے بہتر صورت میں زیادہ مواد نہیں موجود ہے۔ کیا امیر کے حالاتِ زندگی، انکے عروج کے مختلف ادوار کا ذکر، داغ سے ہمچشمی کے تذکرے، طرۂ امیر اور سوانحِ امیر میں تفصیل سے نہیں ملتے ہیں، میر اور انیس کے متعلق ایک چھوڑ دو دو کتابیں موجود ہیں مفصل، مبسوط، جامع، اور پھر بھی ایسے اشخاص پائے جاتے ہیں جو اس کے مدعی ہیں کہ ان شعرا کے متعلق کوئی معتبر کتاب نہیں ملتی——کوئی شک نہیں کہ ابھی مشرق میں لوگوں کو ادبِ اُردو سے اتنا شغف نہیں پیدا ہوا ہے کہ وہ اپنے مشاہیر اساتذہ کے حالاتِ زندگی کی بابت اتنی ہی کد و کاوش کریں، اتنی ہی تحقیق و تدقیق کریں جتنی اہلِ مغرب اپنے شعرا اور نثر نگاروں کے لیے کرتے ہیں، مغرب کے باشندوں نے شیکسپیر کی حیات کے ایک ایک منٹ کا حال دریافت کیا ہے، چاسر کی زندگی کے ہر ہر پہلو پر روشنی ڈالی ہے، ڈکنس کی لائف (حیات) کے ہر ہر پہلو کو واضح کر دیا ہے، لیکن کیا مشرق میں مغرب کی تقلید سود مند ہوگی کیا اہلِ مشرق کو ان امور کے متعلق دیدہ ریزی سے کوئی مزید منفعت حاصل ہو سکے گی علاوہ بریں بحث تو یہاں اس سے ہے کہ کیا میرزائے شیرازی نے میرزا یگانہ کی بابت آیاتِ وجدانی میں اسی کوشش و کاوش سے کام لیا ہے اسی دماغ سوزی اور تحقیق کی کوشش کی ہے جو اہلِ مغرب اپنے اساتذہ کے متعلق کرتے ہیں——بہر حال جس پہلو سے نظر ڈالیے آپ اسی نتیجہ پر پہنچیں گے کہ میرزا یگانہ کے جو حالات آیاتِ وجدانی میں مندرج ہیں اُن کو دیکھتے ہوئے میرزائے شیرازی کا یہ دعوےٰ کہ اگلے اساتذہ کے متعلق ہم کو کوئی مفصل معلومات نہیں، نہ صرف غلط ہے بلکہ مہمل اور واقعات کے بالکل خلاف۔

صفحہ ۱۲ پر مرقوم ہے :-

" ان حسد شعاریوں نے میرزا صاحب کے دشمنوں کی کمزوریوں کا یقین دلا دیا۔ اور اسی کے ساتھ ان کی خود پرستی کی نشو و نما ہونے لگی "

عجیب غریب منطق ہے۔ حسد شعاریاں دشمنوں کی کمزوریوں کا ثبوت تو ضرور ہو سکتی ہیں لیکن جذبۂ خود پرستی و خود ستائی کی محرک، مادۂ تعلّی و شیخی کی متحرک کیونکر ہو سکتی ہیں۔ خود پرستی اگر وہ خود پرستی ہوتی جو میرزا مراد بیگ شیرازی نے رسول اکرمؐ اور مولائے مشکل کشا سے منسوب کی ہے تو مضائقہ نہ تھا، خود ستائی اگر وہ خود ستائی ہوتی جسے آیاتِ وجدانی میں سیدنا امام حسینؑ سے نسبت دی گئی ہے تو چنداں حرج نہ تھا تعلّی اگر اعتدال کے حدود میں رہتی تو کوئی اعتراض نہ تھا۔ شیخی اگر باسبب ہوتی تو کسی قسم کا احتجاج نہ تھا لیکن ستم تو یہ ہے کہ خود پرستی اور خود ستائی کی دُھن میں، تعلّی اور شیخی کے جنون میں تمام حد بندیوں سے قطع نظر کر لی گئی، سب حدود کو خیرباد کہہ دیا گیا، غلط گوئی اور مغالطہ دہی کا بازار گرم کر دیا گیا، سہواً نہیں بھول کر نہیں، قصداً ارادتاً، عوام کو دھوکا دینے کی خاطر، پبلک کی آنکھوں میں خاک ڈالنے کی غرض سے، پیغمبروں اور اماموں کے اظہارِ حق کو، ولیوں اور درویشوں کی سعی وضاحت واقعات کو، میرزا یگانہ کی خود غرضانہ تعلّی سے منسوب کیا گیا، حریصانہ خود پرستی سے نسبت دی گئی، عیارانہ خود ستائی سے مقابلہ کیا گیا، بیباکانہ شیخی سے موازنہ کیا گیا اور اس غرض کے لیے فلسفے کی ٹانگ توڑ دی گئی، منطق کی دھجیاں بکھیر دی گئیں، تاریخ کے پُرزے اُڑا دیے گئے

نا ریل جیسے لگا ہاتھ وہ ..... بندوں میں

صفحہ ۳۲ پر گہر افشانی ہوتی ہے :-

" بیسویں صدی کے ربع اول تک ہندوستان نے تین سخنوران علی الاطلاق پیدا کیے۔ اکبر، ٹیگور، اور یگانہ "۔

پچھلے اساتذہ تو دور رہے، اُن میں تو کوئی سخنور تھا ہی نہیں، اُن میں سے تو کسی میں ذکاوت و قابلیت تھی ہی نہیں، موجودہ دور کے مسلم الثبوت شعرا، مانے ہوئے سخنور ----- ڈاکٹر اقبال اور مسز سروجنی نائیڈو ---- بھی کسی شمار میں نہیں آتے، انکی شاعری میں بھی کہیں حقیقت کی جھلک میرزا صاحب کو نہیں نظر آئی، انکے کلام میں بھی کہیں حسنِ معنوی، کسی جا اوصافِ ظاہری کے نمونے میرزا صاحب کو نہیں ملے، ان کے جذبات میں بھی کہیں رفعت کا پتہ نہیں چلا، ان محاسن کا وجود میرزا صاحب کو ملا تو کہاں، میرزا یگانہ کے تخیل میں، میرزا یگانہ کے تغزل میں،

قیاس کن زگلستان من بہار مرا

اور اسی پر اکتفا نہیں کی گئی ہے، اکبر اور ٹیگور کی شہرتیں، ان کی مادی زندگی کی کامیابیاں، ان کی شاعری کے غلغلے محض مبالغہ ہیں، اصلیت سے کوسوں دور ہیں، پروپگنڈے کا نتیجہ ہیں بس صرف یگانہ کا کلام ایسا ہے جو وجدان صحیح کا مظہر ہے، جو حقایق و معارف کا گنجینہ ہے، جو کمالات معنوی کا آئینہ ہے، اور جو مبالغہ اور جھوٹی شہرت سے یک لخت معرا ہے۔

صفحہ ۳۹ پر یوں خامہ فرسائی کی جاتی ہے

"افسوس ہے کہ ہندوستان کے بہتیرے تعلیم یافتہ اصحاب نے نیچرل شاعری کا مفہوم بس اتنا سمجھ لیا ہے کہ مظاہر اور مرئیات کی بے سود نقالی کی جائے، جیسے مینہ جھما جھم برس رہا ہے کوئل کوک رہی ہے، دریا بہہ رہے ہیں، چشمے اُبل رہے ہیں، آبشاروں سے سریلی صدائیں آ رہی ہیں، بھلا اس قسم کی بیہودہ اور بے نتیجہ محاکات سے انسانی جذبات کی گہرائیوں پر کیا روشنی پڑ سکتی ہے نیچرل شاعری کا صحیح مفہوم تو یہ ہے کہ مناظر و مظاہر واقعات و واردات کے مشاہدے سے فطرت انسانی میں جو فاعلی و انفعالی کیفیتیں پیدا ہوتی رہتی ہیں ان کی بولتی ہوئی تصویریں کھینچی جائیں۔ محض بے نتیجہ محاکات کوئی شاعری نہیں ہے"

صفحہ ۱۵۸ پر پھر میرزا صاحب نے اسی خیال کا اعادہ کیا ہے وہ ہندوستان کے تعلیم یافتہ طبقہ کو اس کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں کہ اس نے نیچرل شاعری کا مفہوم غلط سمجھ رکھا ہے حالانکہ اصلیت یہ ہے کہ خود میرزا صاحب نے نیچرل شاعری کے معانی سمجھنے میں ٹھوکر کھائی ہے اور اپنے اس نظریے کے بیان میں ایسے الفاظ استعمال کر گئے ہیں جو کسی طرح نقاد کے شایان شان نہیں، قدرتی مناظر کا اظہار کرنے والی شاعری کو "بیہودہ محاکات" کہنا کہاں تک مناسب ہے، مظاہر و مرئیات کو "بے سود نقالی" سے تعبیر کرنا کس حد تک صحیح ہے۔ اصل میں میرزا صاحب قدرتی شاعری اور فطری شاعری میں دھوکا کھا رہے ہیں، وہ جسے نیچرل شاعری سمجھ رہے ہیں وہ اصل میں قدرتی شاعری ہے فطری شاعری نہیں، اور قدرتی شاعری کا مفہوم بعینہ وہی ہے جو آجکل کے تعلیم یافتہ طبقہ نے سمجھ رکھا ہے، اس میں صرف وہی اصناف سخن داخل ہیں جنھیں موجودہ زمانہ کے مغربی خیالات سے متاثر شعراء نے اپنا شعار بنا رکھا ہے۔ مشہور انگریزی شاعر ورڈس ورتھ ([illegible]) کی شاعری پر بھی کسی زمانہ میں بجنسہ اسی قسم کے اعتراضات کیے گئے تھے جنکا جواب نہایت مدلل اور دندان شکن دیا گیا، خصوصاً [illegible] ([illegible]) نے جو مقالہ جواب میں لکھا وہ بیمثل ہے۔ میرزا مراد بیگ شیرازی

نے جو طریقہ اس کتاب میں ابتدا میں اختیار کیا ہے، جس طرز سے انھوں نے آغاز کتاب میں اپنی قابلیت کا سکہ جمانے کی کوشش کی ہے اس سے ہر شخص کو لامحالہ یہ غلط فہمی ہوتی ہے کہ میرزا صاحب نے پل کے مقالے کا ضرور مطالعہ کیا ہوگا، مگر معلوم یہ ہوتا ہے کہ میرزا صاحب کا علم محض سطحی ہے اور انکی واقفیت ان امور میں بالکل ابتدائی، ان کا دماغ شاعری کی گہرائیوں، شعری باریکیوں تک پہونچا ہی نہیں ہے، وہ اگر غور کرتے تو انھیں پتہ چلتا کہ کوئل کے کوکنے کا منظر، دریا کی آہستہ خرامی کا نظارہ، آبشاروں سے سُریلی صداؤں کے آنے کا سماں، بے سود نقالی، بے نتیجہ محاکات نہیں ہیں جو انھوں نے اپنی کم علمی اور بے مائگی کی بنا پر سمجھ رکھا ہے۔

شیکسپیر نے اپنے مشہور طربیہ ڈرامے (As you like it) میں ایک جگہ لکھا ہے

درختوں میں زبانیں مضمر ہیں (There are tongues in trees)

بہتے ہوئے چشموں میں صحیفے پوشیدہ ہیں (Books in running brooks)

اور پتھروں میں حقایق معرفت چھپے ہوئے ہیں (and sermons in stones)

قدرت کے خوبصورت اور خوشنما مناظر کا خاکہ کھینچنے سے شاعر کا مقصد صرف ان مناظر کا اظہار نہیں ہے بلکہ ہر منظر سے انسان کو ایک سبق دینا ہے، ہر سماں سے ہستی کا ایک باریک فلسفہ سمجھانا ہے، ہر نظارہ سے کور باطنوں کو حقائق و معارف قدرت الٰہی کی الجھی ہوئی گتھیاں سلجھوانا ہے۔ میرزا صاحب کی نظر شاعری کے صرف اُس پہلو پر پڑتی ہے جس میں فطرت انسانی کی کیفیتوں کی بولتی ہوئی تصویریں کھینچی جائیں، جس میں سے صرف انسان اور اُسکے متعلقات سے بالراست بحث کی جائے۔ وہ قصداً یا سہواً شاعری کے اور پہلوؤں کو نظر انداز کرتے ہیں، لیکن اصل یہ ہے کہ مذکورۂ بالا پہلو گو شاعری کا اہم ترین پہلو ہے مگر صرف ایک۔ شاعری کے اور بھی متعدد پہلو ہیں جن تک جانبدار نظریں شاید نہیں پہونچ سکتیں، میرزا صاحب کو اگر ان پہلوؤں پر شاعری کے نمونے دیکھنا ہوں تو انھیں چاہیے کہ ورڈسورتھ (Wordsworth) رازیٹی (Rossetti) کیٹس (Keats) اسکاٹ (Scott) شیلی (Shelley) امرسن (Emerson) رومی، اور اقبال کے کلام کا بغور مطالعہ کریں۔

صفحہ ۵۵ پر میرزا صاحب تحریر فرماتے ہیں

"مگر بالغ نظروں کو اس کا بھی اندازہ ہے کہ ڈاکٹر اقبال نے فلسفۂ خودی کی جو تعلیم دی ہے وہ محض نظری حیثیت رکھتی ہے، مگر حضرت میرزا یگانہ نے فلسفۂ خودی و خودداری کی محض نظری تعلیم نہیں دی ہے

بلکہ عملی بھی۔ آپ کی زندگی سے اس بات کا ثبوت قدم قدم پر ملتا ہے"

میرزا صاحب اس جگہ یا تو اتنا زبردست دعویٰ کر رہے ہیں جو کسی بالغ عقل کے انسان کو نہ کرنا چاہیے، یا قصداً واقعات کی طرف سے آنکھیں بند کر کے عوام کو مغالطہ دینے کی کوشش کر رہے ہیں، اصل یہ ہے کہ اقبال نے جو تعلیم اس مسئلہ پر دی ہے وہ گو ایک حد تک نظری ہے مگر اتنی بلند، اتنی مفصل، اور اتنی جامع ہے کہ اسکے سامنے یگانہ کا تمام فلسفۂ خودی و خودداری ہیچ ہے۔ علاوہ بریں میرزا یگانہ نے جو گنتی کے چند اشعار تو ویسے تک بندی تو ہر شخص کر لیتا ہے] اس مسئلہ پر کہے ہیں انکی بابت یہ کہنا کہ وہ فلسفۂ خودی کی عملی تعلیم دیتے ہیں کیونکہ یگانہ کی زندگی خودی و خودداری کا نمونہ ہے کہاں تک منطقی اصولوں کے تحت صحیح ہو سکتا ہے۔ ہر شاعر انسان ہونے کی حیثیت سے سوسائٹی کا ایک جزو ہے اور اس لحاظ سے اسکی عملی زندگی سوسائٹی کے حدود کے اندر، سوسائٹی کے دوسرے اجزاء، اور افراد کے لیے ضرور نمونۂ عمل بن سکتی ہے لیکن شاعر کے روزمرہ کے سوانح سے اسکے اشعار کے معانی نکالنا اسکے خیالات کو مطالب کا جامہ پہنانا، اس کی تخئیل کی تزئین کرنا ایسا ہی ہے جیسا کوئل کی کوک سے اس کی خوبصورتی اور خوشنمائی کا تصور کرنا۔ اگر اس اصول پر عمل کیا جائے تو شاید دنیا کے کسی شاعر کے فلسفۂ حیات کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ آپ داغ کے حالاتِ زندگی کو اس کے مخصوص رنگ سے تو منطبق کر سکیں گے لیکن اس کے اور کلام مثلاً مناجاتوں، نعتیہ غزلوں کو کس طرح متعلق کریں گے، آپ امیر کے حالاتِ زندگی کے مدنظر ان کے نعتیہ دیوان، اور مرأۃ الغیب کی توضیح توضیح کر سکیں گے لیکن صنم خانہ کو کس ضمن میں لائیے گا، پھر دور کیوں جائیے، اقبال کے طرزِ زندگی کو، انکے مشاغل کو انکی شاعری سے کس طرح مطابق کیجیے گا۔ حافظ کے کلام کو کس نظر سے دیکھیے گا —— اسی لیے میں نے یہ عرض کیا کہ شاعر انفرادی شخصی حیثیت سے تو ضرور اپنی زندگی کو نمونۂ عمل بنا سکتا ہے لیکن اسکے افعال اور اعمال کی بنا پر اسکا مدعی ہونا کہ اسکے اشعار جو لفظِ محض نظری حیثیت رکھتے ہیں، کسی نوع کی عملی تعلیم دیتے ہیں سراسر "حسنِ ظن" ہے۔

صفحہ ۶۲ پر میرزا صاحب ہندوستان اور ہندوستانیوں کے خلاف یوں زہر اگلتے ہیں

""اگر یہی میرزا یگانہ یورپ میں ہوتے تو غیر ممکن تھا کہ وہاں کی زندہ قومیں آپ کے آیاتِ وجدانی اور کمالِ سخنوری کی طرف سے چشم پوشی کرتیں"۔

بسم اللہ، میرزا یگانہ یورپ کو بھی اپنا وطن بنا کر دیکھ لیں، در کارِ خیر حاجتِ ہیچ استخارہ نیست۔ آیاتِ وجدانی میں میرزا سے شیرازی نے جو نقشہ میرزا یگانہ کے کمالات کا کھینچا ہے اور جو راگ انکی ذہانت

اور طباعی کے گن گاتے ہیں انکی بنا پر تو قیاس کچھ غلط نہ ہوگا کہ میرزا یگانہ کے لیے اتنی انگریزی یا فرانسیسی سیکھ لینا کہ ان زبانوں میں شاعری کرسکیں کچھ زیادہ دشوار اور وقت طلب کام نہیں شوق سے سیکھیں، اور ان دونوں زبانوں میں سے کسی میں ایسی ہی شاعری فرمائیں جیسی اردو یا فارسی میں فرماتے ہیں، پھر دیکھیں کہ انگریز یا فرانسیسی اس کی کیا وقعت کرتے ہیں اور ان کی کیا درگت —— میرزا شیرازی کو ہندوستان کی، حجیبی بات بھی بری معلوم ہوتی ہے اس لیے کہ ہندوستان نے اُنکے ہیرو میرزا یگانہ کی قدر نہیں کی، بیشک ہندوستان اور اُس کے باشندوں میں ابھی وہ آزادیٔ خیالات اور وہ وسعت نظر نہیں پیدا ہوئی ہے جو مغرب کے باشندوں میں اس درجہ عام ہے مگر کیا اسکے یہ معنی ہیں کہ واقعات کو غلط ظاہر کرکے ہندوستان پر باوجود اتنے سب درست الزامات کے ایک غیر درست اتہام بھی لگا دیا جائے - میرزا صاحب نے اہل ہند کو جس ناقدری کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے وہ دنیا کی تاریخ میں کوئی نئی بات نہیں ہے، مغرب آج اپنے باعظمت لوگوں کی قدر کر رہا ہے مگر ہمیشہ سے ایسا نہیں تھا، ایک زمانہ وہ بھی تھا جب مغرب کے قابل اور لائق فنکار، بلند نظر اور بلند تخیل شعراء اسی طرح دربدر پریشاں حال خستہ نواں پھرتے اور فقدان مذاق، عدم وقعت، اور ناپید ئی قدر کی شکایت کرتے تھے، اور اب بھی مغرب وہ مغرب نہیں ہے جسکا تصور میرزا مراد کے ذہن میں ہے جس کی بابت اُنھوں نے اتنے شیریں اور دل خوش کن خواب دیکھے ہیں، آج بھی مغرب کے دامن پر اس کی ناقدری کا دھبہ ہے، آسکر وائلڈ (oscar wilde) کی بے وقعتی کا داغ ہے — میرزا صاحب کا بیان ان کی تاریخی ناواقفیت کی بھی دلیل ہے شکسپیر، مارلو، اسٹیونسن، جانسن، دولٹیر، ٹالسٹائی، وغیرہ نے جس کس مپرسی اور تنگدستی کی حالت میں اپنی حیات کے بیشتر ایام بسر کیے اسکا علم ہر ادب سے ذوق رکھنے والے کو ہونا چاہیے -

جناب میرزا صاحب دنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں ہے جہاں لایق اشخاص کی ناقدری نہ ہوئی ہو، جہاں علماء اور فضلاء کی مٹی نہ پلید ہوئی ہو، جہاں ذہانت اور ذکاوت پر خاک ڈالنے کی کوشش نہ کی گئی ہوں، خود اپنی اور میرزا یگانہ کی مثال لیجیے، آپ دونوں حضرات نے غالب کی تنقیص میں کوئی کسر اٹھا رکھی ہے، اسکی شہرت پر حرف لانے میں کوئی کمی چھوڑ رکھی ہے، آپ ہی کے سے اللہ کے بندے اور دیگر ممالک میں بھی ملتے ہیں - پھر بھی آپ کو یہ شکایت ہے کہ ہندوستان میں صحیح اور سچی قدردانی نہیں ہوتی - باوجود اسکے آپ کو گلہ ہے کہ شرق میں نا قابلوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے، ذرا پہلے اپنے آپ کو تو دیکھیے - منہ ذرا اپنے گریبان میں ڈالا ہوتا -

(Read)

مذکورۂ بالا نقل شدہ عبارت کے بعد ہی میرزا صاحب چند ایسے جملے لکھتے ہیں جن کا مطلب سمجھنے سے کم از کم میں بالکل قاصر ہوں، آخر ان کا مطلب اعلیٰحضرت شہریارِ دکن اور مہاراجہ محمود آباد کی خدمات میں مبارکباد کے تار روانہ کرنے سے کیا ہے، اس سلسلہ میں جو بات انھوں نے سب سے زیادہ قابلِ اعتراض اور لغو لکھی ہے وہ اُن کا نواب صاحب رامپور پر حملہ ہے۔ آیاتِ وجدانی ۱۹۲۶ء کی نوشتہ ہے، اسوقت نواب حامد علی خاں صاحب جنت مکاں بقیدِ حیات تھے، ان کے وہ افعال جو اُن کی ذات تک محدود تھے خواہ کیسے ہی ہوں لیکن اُن کی بابت یہ غلط بیانی کہ "اُنھیں اہلِ علم کا درد کیوں ہونے لگا" محض تہمت ہے۔ شاید میرزائے شیرازی کو اسکا علم نہیں یا اُنھیں اس علم کے باوجود مغالطہ دہی میں مزا آتا ہے کہ نواب حامد علی خاں صاحب مغفور کی ذات باوجود اپنی تمام کمزوریوں اور خامیوں کے مغتنماتِ روزگار میں سے تھی۔ ان کی علم دوستی اور غربا پروری کے ایک نہیں سیکڑوں نمونے پیش کیے جا سکتے ہیں، میرزا صاحب ہندوستان کے والیانِ ممالک کے متعلق کوئی مستند کتاب دیکھتے تو اُنھیں اس کا پتہ چلتا کہ رامپور کی ریاست سے کتنے مدرسوں، کتنے اسکولوں، کتنے علمی اداروں کو امداد ملتی تھی، رامپور کے دربار سے کتنے علماء، کتنے شعراء، کتنے دوسرے مشاہیر متعلق تھے، اس میں شک نہیں کہ اُنکے دور میں رامپور میں علم کے وہ درخشاں نورتن جمع نہیں تھے جن سے نواب خلد آشیاں کا دربار جگمگاتا تھا لیکن باوجود اس کے اپنے عہد میں رامپور کے اس عالی ظرف حکمراں نے اپنی ریاست کی قدیم روایات کو بڑی حد تک برقرار رکھا تھا، اس نے سیکڑوں علمی اداروں کی ہمت افزائی کی اور بے دریغ، لاکھوں ادبی اسکیموں میں حصہ لیا اور بے دھڑک، شاہانہ ظرف سے علویانہ ہمت سے، اسکا دخل نہ ہوتا اسکی مدد نہ ہوئی ہوتی تو آج سیکڑوں کتابیں غیر مطبوعہ ہوتیں، ہزاروں رسائل ناپید ہوتے۔ ایسے علم دوست حکمراں کی بابت اتنی غلط گوئی کہ اُس پر علم اور علم والوں سے دشمنی کا الزام لگایا جائے خبثِ نفس کی دلیل نہیں تو اور کیا ہے۔

صفحہ ۶۴ پر میرزائے شیرازی مدعی ہیں کہ

"خواجہ آتش اور میر تقی میر کی زندگی بھی اس کس مپرسی میں نہیں گذری تھی جس میں میرزا یگانہ کی گزر رہی ہے اور ان دونوں حضرات نے بھی اپنی شان خودداری اس طرح برقرار نہیں رکھی تھی جس طرح میرزا یگانہ نے رکھی

مجھے میرزا یگانہ کے سوانح حیات کا مفصل علم نہیں کہ میں تحقیق سے کہہ سکوں کہ آیا اُن پر اتنے ہی

بنام خداوند جاں آفریں

المنتظر

نمبر ۳ جلد ۴۰ ماہ ستمبر ۱۹۳۵ء

نیم آزادیِ بنی اسرائیل

(جناب الحاج منشی امیر احمد صاحب علوی بی اے پنشنڈ ڈپٹی کلکٹر)

دودمانِ کیانیانِ ایران کا نامور بادشاہ بہمن عرف آردشیر درازدست" جسکو یونانی مورخ ارٹازرکسیز لانگ ہونس" کے نام سے یاد کرتے ہیں ۴۶۲ سنہ قبل مسیح میں تخت نشیں ہوا اور ۴۰ سال تک شان وشوکت سے فرمانروائے فارس رہا۔

اسے توران ۔ سیستان ۔ اور مصر کی بغاوتیں فرو کیں اور ارتابان کے خاندان کو مغلوب کیا۔ یہ ارتابان وہی ملیتن سپہ سالار ہے جسکو فردوسی نے اپنی رزمیہ نظم کا ہیرو بنا کر حیات جاوید کا مستحق قرار دیا ہے۔

منش کردہ ام رستم داستاں وگرنہ یلے بود از سیستاں

گشتاسپ اور اسفندیار کے دور میں ایران اور یونان سے زبردست معرکے ہوئے تھے جنکی تفصیل ہیرو ڈوٹس کے دلآویز صفحات میں محفوظ ہے۔

بہمن کے کارنامے بھی اپنے گرامی قدر اسلاف سے کم بتہ نہ تھے اور دانشوری میں وہ اُنسے چار قدم آگے تھا ۔ اُس نے یونان سے صلح کی اور وادیٔ نیل پر دوبارہ قبضہ کر لیا ۔

یورپ کے موشگاف محقق کہتے ہیں کہ جس عالی ہمتی اور ہنرمندی سے بہمن نے لشکر آراستہ کیا۔ بحری اور بری قوت میں اضافہ کیا ۔ جس روشن ضمیری اور دانشمندی سے حملوں اور لڑائیوں کے

نقشے تیار کیے۔ جرنلوں کا انتخاب کیا۔ بغاوتیں دبائیں اور مملکت بڑھائی اُسکی نظیر تاریخ ایران میں دستیاب نہیں ہوتی اور یہ دعویٰ یقیناً کیا جا سکتا ہے کہ کیانیوں میں اُس سے زیادہ دُور اندیش اور دانشمند کوئی بادشاہ نہیں ہوا۔

اُس کی داستان کشور کشائی سے ہماری کہانی کو کچھ تعلق نہیں البتہ مظلوم بنی اسرائیل کے ساتھ اُسکا خسروانہ سلوک آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔

ہزاروں یہودی ڈیڑھ سو برس سے عراق و فارس میں نظر بند تھے۔ اسنے بیک جنبش لب سب قیدی آزاد کر دیے اور اختیار دیا کہ اُن میں سے جو چاہے اپنے قدیم وطن کو واپس جائے۔ شہر یروشلم بخت نصر کے وقت سے ویران تھا اور شہنشاہِ فارس کی محبوب ملکہ استر کو بھی اُس مقدس بستی کی فصیل تعمیر کرنے کی اجازت نہ ملی تھی لیکن "دراز دست" نے اولوالعزمی سے فرزندان یعقوب کو داود و سلیمان کا دارالحکومت آراستہ کرنے میں امداد کی اور یہودیوں کو اپنے فراموش شدہ مذہبی قوانین پر عمل کرنے کی اجازت عطا فرمائی۔

جلوس میمنت مانوس کے ساتویں برس اُس نے ایک فرمان جاری کیا جس کی نقل عہدنامۂ عتیق کے "صحیفۂ عزرا" میں موجود ہے اور چند فقرے سننے کے قابل ہیں:۔

"ارتخششتا شاہنشاہ کی طرف سے عزرا کاہن آسمانی خدا کی شریعت کے فقیہ کامل کے نام ....

اسرائیل کے جو لوگ میری مملکت میں ہیں اُن میں سے جتنے اپنی خوشی سے یروشلم کو جانا چاہتے ہیں تیرے ساتھ جائیں ....

تو بادشاہ اور اُسکے ساتوں مشیروں کی طرف سے بھیجا جاتا ہے تاکہ اپنے خدا کی شریعت کے مطابق جو تیرے ہاتھ میں ہے' یہوداہ اور یروشلم کا حال دریافت کرے ....

میں ارتخششتا بادشاہ دریا پار کے سب خزانچیوں کو حکم دیتا ہوں کہ جو کچھ عزرا کاہن آسمانی خدا کی شریعت کا فقیہ تم سے چاہے وہ بلا توقف کیا جائے ....

اس گھر کے خادموں میں سے کسی پر خراج، چنگی یا محصول لگانا جائز نہ ہوگا ....

اے عزرا تو اپنے خدا کی دی ہوئی دانش کے مطابق حاکموں اور قاضیوں کو مقرر کرنا تاکہ سب لوگوں کا انصاف کریں۔ اور جو کوئی تیری شریعت اور بادشاہ کے فرمان پر عمل نہ کرے اُسکو بلا توقف قانونی سزا دی جائے"۔

عزرا کاہن پندرہ سو اسرائیلیوں کا مختصر قافلہ لیکر یروشلم آئے ——— الہام کی زبان میں

"خدا کا ہاتھ اُنکے ساتھ تھا اور اُس نے راستے میں گھات لگانے والوں سے بچایا" منازل اور مراحل طے کرکے وطن پہونچے تو دیکھا کہ چالیس ہزار بنی اسرائیل جو کیخسرو کے عہد میں بابل سے آئے تھے تباہ اور پریشاں حال ہیں۔ معبد سلیمانی قدیم نمونے پر تیار کرلیا گیا ہے لیکن عبادت کرنے والے معدوم ہیں۔ پرانے رسوم وضوابط کسی کو معلوم نہیں۔ نہ مذہب ہے نہ کتاب نہ صحیفہ۔ یبوسیوں، عمونیوں، موآبیوں، اور مصریوں سے سلسلۂ مناکحت جاری ہے اور خداوند کا حکم کسی کو یاد نہیں کہ "وہ ناپاک جسے تم میراث میں لینے جاتے ہو دوسری قوموں کی نجاست سے ناپاک ہے۔ سو تم اپنی بیٹیاں اُنکے بیٹوں کو نہ دینا اور اُنکی بیٹیاں اپنے بیٹوں کے لیے نہ لینا"

عزرا نے اپنا لباس چاک کیا۔ روزے رکھے۔ ہیکل مقدس میں مناجات کی۔ خدا کے گھر کے آگے رو رو کر اور اوندھے مُنہ گر کر دعا مانگی۔ اُنکی آہ وزاری رنگ لائی۔ قوم کو اپنی بداعمالی کا احساس ہوا۔ عزرا کی نصیحت وہدایت قبول کی۔ اپنی اجنبی بیویوں کو چھوڑنے اور سنت ابراہیمی پر عمل کرنے کا عہد کرلیا۔ معاشرت میں اصلاح کرکے وہ تعلیم شریعت کی طرف متوجہ ہوے۔ قوانین مذہب کی مقدس کتاب بخت نصر کے حملے میں ناپید ہوگئی تھی۔ جو کاپیاں ہیکل میں تھیں جلادی گئیں۔ عابدوں اور زاہدوں کے پاس جو نسخے تھے وہ محاصرے اور اسیری میں غارت ہوے۔ تابوت سکینہ نذر آتش ہوا یا گم ہوگیا۔ صحف انبیا کا یروشلم میں نشان نہ رہا۔ بنی اسرائیل مذہب کی طرف مائل ہوے تو وہ کتابیں ہی مفقود تھیں جن سے اصول شریعت دریافت ہوسکتے۔ آں دفتر را گاؤ خورد۔ گاؤ را قصاب برد و قصاب بمرد۔

عزرا نے فوق العادت قوت حافظہ سے امداد لیکر عہد نامۂ عتیق کے سب پُرانے صحیفے لکھوائے اور شریعت موسوی کو زندہ کردیا۔

اُنکے جوش۔ خلوص۔ ہمدردی اور قابلیت نے آل داؤد کو ملت و مذہب کا پرستار بنایا اور وہ قدامت پرست و متحمل قوم مرتب کی جو ہزاروں برس کے مظالم سہنے کے بعد بھی آج تک دنیا کے ہر بّر اعظم میں اپنے مخصوص رسوم و قواعد کے ساتھ زندہ ہے۔ ایشیائی خلاقی یورپ کا فیشن۔ امریکہ کی سائنس اُنکے ہزارہا سال کے آداب و دستور کو ترمیم کرنے سے عاجز۔ وہ سب میں ملے ہوے اور ہر ایک سے الگ۔ "خلوت در انجمن" اور "بے ہمہ باہمہ" کا مصداق ہیں۔

عزرا کو اُنکے ہم عصر "کاہن" اور "فقیہ کامل" کہتے تھے۔ آیندہ نسلوں نے مجدد ملت کا خطاب

دیا۔ جہلا ممکن ہے جوش عقیدت میں حد سے بڑھ گئے ہوں اور انکو منصب نبوت سے بھی بلندتر اعزاز عطا کیا ہو لیکن اس میں کلام نہیں کہ موجودہ مذہب یہود۔ عزرا کا شرمندۂ منت ہے اور اسوقت موسیٰ اور ہارون کے احکام سے دنیا کے روشناس ہونے کا وسیلہ صرف عزرا کی شفقت و محبت ہے۔ لولاک عزرا لہلک الیہود۔

المختصر۔ یہود کا مذہب مرتب ہوگیا۔ قوانین شریعت زندہ ہو گئے۔ فرزندان اسرائیل دوبارہ قوم کا خطاب پانے کے مستحق ہوے لیکن یروشلیم کی آبادی اور شہرپناہ کی تعمیر ملتوی رہی۔ اس زمانے میں شام سے مصر تک بغاوت کی آگ سلگ رہی تھی۔ عمال سلطنت ملکی فسادات میں مصروف تھے۔ سامری اسرائیلیوں کے مخالف تھے۔ اور متبعین عزرا نے ایک جدید گروہ دشمنوں کا اجنبی عورتوں کو طلاق دیکر اور انکی اولاد کو عاق کرکے فراہم کیا تھا۔ ان بیرونی فسادات اور اندرونی سازشوں کا نتیجہ تھا کہ فصیل تعمیر کرنے کا کام یا تو شروع ہی نہیں کیا گیا یا اسکا آغاز ایسی ساعت نامسعود میں ہوا کہ کوشش ناکام رہی۔

آردشیر دراز دست کے بیسویں سنہ جلوس میں چند یہودی "قصر سوسن" پہونچے اور شہنشاہ فارس کے ملازم معتمد نحمیاہ سے کہا کہ "یروشلیم کی فصیل ٹوٹی ہوئی ہے اور اس کے پھاٹک آگ سے جلے ہوے ہیں"۔

نحمیاہ آتش پرست بادشاہ کو آب آتش پلانے پر مامور تھا مگر تھا اسرائیل کا فرزند اور دردمند دل رکھتا تھا۔ اپنے عزیز وطن کی تباہ حالی سُن کر نہایت غمگین ہوا۔ افسردہ اور ملول دربار میں حاضر ہوا اور ولی نعمت کے سامنے مے اندوہ رُبا کا جام پیش کیا۔ بادشاہ نے اداسی کا سبب پوچھا تو عرض کی "میرا چہرہ اُداس کیوں نہ ہو جبکہ وہ شہر جہاں میرے باپ دادا کی قبریں ہیں اُجاڑ پڑا ہے اور اُسکے پھاٹک آگ سے جلے ہوے ہیں۔ اگر خادم پر کرم کی نظر ہو تو وہ یہوداہ جاکر اپنے بزرگوں کے شہر کی مرمت کرے"

شہنشاہ نے رخصت دی۔ پروانہ راہداری عطا فرمایا۔ فوجی سردار اور شاہی باڈی گارڈ کے سوار اُسکے ہمراہ کیے۔ جنگلوں کے نگہبان کے نام فرمان جاری کیا کہ پھاٹکوں اور عمارتوں کے لیے جسقدر لکڑی اسرائیلیوں کو درکار ہو مفت دی جائے۔ اور اس طرح نحمیاہ کنعان کا چھوٹا گورنر بنکر یروشلیم پہونچا۔

تین دن آرام کرنے کے بعد فصیل کی تعمیر شروع کی۔ شہنشاہی احکام کے باوجود سامریوں اور

مخلوط النسل اسرائیلیوں نے مخالفت پر کمر باندھی۔ معماروں اور مزدوروں کو ستانے لگے۔ مجبوراً مزدور مسلح کیے گئے اور اس طرح فوجی خدمت کا بنیادی پتھر رکھا گیا۔ دشمنوں کے خوف سے رات کے وقت فصیل نو تعمیر کی حفاظت کے لیے سنتری اور پہرے دار مقرر کیے گئے اور اس طرح محکمۂ پولیس نے نشوونما پایا۔

شب و روز کی جفاکشی، محنت اور استقلال کا یہ ثمرہ ہوا کہ باون روز کی قلیل مدت میں شہر پناہ تیار ہوگئی اور پھاٹک جڑ دیے گئے۔ یہودی اسیری بابل کے بعد دیہاتی زندگی کے عادی ہوگئے تھے اور شہر میں رہنا پسند نہ کرتے تھے لہٰذا یروشلم کو آباد کرنے کے لیے کنعان کی ۱/۱۰ آبادی کو بالجبر شہر میں منتقل کرنے کا تصفیہ کیا گیا۔ اور ان خوش نصیبوں کا قرعہ اندازی سے انتخاب ہوا۔ نحمیاہ اختتامِ رخصت کے بعد ایران واپس گیا اور عزرا بھی غالباً چلے گئے کیونکہ اُنکی قبر اسوقت تک عراق میں موجود ہے۔ لیکن ان بلند ہمت بزرگوں کی برکت سے ارضِ موعود میں اسرائیلی سلطنت کی بنیاد دوبارہ قائم ہوگئی۔

عبادتگاہِ سلیمانی کے متولی "سردار کاہن" کے اختیارات وسیع تھے۔ وہ چُنگی اور محصولات سے مستثنےٰ تھا۔ شاہی خراج اُسکے ذمہ نہ تھا۔ قاضی اور حاکم مقرر کرنے کی اجازت پہلے ہی مل چکی تھی۔ پولیس اور خزانہ اُسکے اختیار میں تھا۔ فوجی خدمت کا سلسلہ خود بخود شروع ہوگیا تھا۔ قلعہ کی مرمت ہوگئی تھی۔ شہر پناہ کی تعمیر کے بعد یہودیوں کی جداگانہ ریاست بن گئی اور متولی اعظم اس حکومت کا بادشاہ تھا اگرچہ تخت و تاج نہ رکھتا تھا۔ چوں نداری سر شاہی ناچار حاکم و والی و داور گویم۔

بنی اسرائیل کے گروہ گروہ عراق سے واپس آئے۔ نسل میں افزائش ہوئی اور چند سال کے اندر ارضِ کنعان کی آبادی ویسی ہی گنجان ہوگئی جیسی بخت نصر کی غارت گری سے پہلے تھی۔ سرسبز باغات۔ شاداب زراعت۔ زرخیز و دولت انگیز تجارت نے یروشلم کو پھر فلسطین کا مرکز بنا دیا۔ دولت بڑھی۔ ملکی قوت میں اضافہ ہوا۔

اردشیر اور اُس کے جانشینوں کا طرزِ عمل اس دردچشیدہ قوم کے ساتھ مخلصانہ اور مشفقانہ رہا۔ تقریباً ایک صدی تک شہنشاہ ایران کی سیادت میں یہود کی جمہوری ریاست جسمیں متولی اعظم کو اختیاراتِ شاہی حاصل تھے روز افزوں ترقی کرتی رہی اور فرزندان یعقوب امن و عافیت سے عبادت کرتے اور شاہان فارس کو دعا دیتے رہے۔ ۳۳۲ء قبل مسیح میں ان کی

وفاداری کا امتحان ہوا - فیلقوس یونانی کے بلند اقبال جانشین نے جو سکندر اعظم کے نام سے دُنیا کی تاریخ میں مشہور ہے مملکت ایران پر تاخت کی - مارچ یا اپریل ۳۳۴ ق م میں وہ تیس ہزار پیادے اور ۴ ½ ہزار سوار ہمراہ لیکر ایشیا کے ساحل پر لنگر انداز ہوا - اسکی مختصر حکومت کا رقبہ سلطنت ایران کے پانچویں حصہ کے برابر تھا - اور اُسکے پاس زر نقد ایشیاء کوچک کی سرزمین پر قدم رکھتے وقت اس سے زیادہ نہ تھا کہ ایک ماہ کے لیے فوج کی خوراک کو کافی ہوسکے - دریاء گرنیکس کے کنارے ایران کے آزمودہ کار جنرلوں سے مقابلہ ہوا اور اختر اقبال کی بلندی سے یونانیوں کو فتح نصیب ہوئی -

اُسوقت دارا ے سوم فارس کا شہنشاہ تھا - سرداران فوج کی ناکامی سے بد دماغ ہوکر خود میدان جنگ میں آیا - کہا جاتا ہے کہ چار لاکھ پیادے اور ایک لاکھ سوار اُسکے ہمراہ تھے - یہ تعداد ممکن ہے کہ مبالغہ آمیز ہو کیونکہ ہمارے پاس یہ تفصیلات یونانی مورخوں کے وسیلے سے پہونچی ہیں - قلم درکف دشمن است لیکن ایرانی فوج کی کثرت تعداد اس روایت سے ثابت ہوتی ہے کہ یہ عظیم الشان انبوہ پانچ دن میں اُس پُل سے عبور کر پایا تھا جو دریاء فرات پر اس جمعیت کے لیے عارضی طور سے بنایا گیا تھا -

شہنشاہ کی والدہ - ملکہ - حریم اور مصاحبین خاص دلچسپی کے لیے ساتھ تھے - اسباب عیشت اور سامان راحت بے شمار - چھ سو خچروں اور تین سو اونٹوں پر صرف سونے اور چاندی کا انبار تھا - ہر شخص کو فتحمندی کا یقین کامل تھا - لشکر ایران کی تعداد اسقدر زیادہ تھی کہ ایک ایک مٹھی خاک ڈالتے تو یونانی فوج چھپ جاتی - بقول شاعر[۱] زمین کے طبقے چھ رہتے اور آسمان آٹھ ہو جاتے !!

نومبر کا مہینہ تھا کہ اِسّس کی وادی میں مشرق و مغرب کا اصادم ہوا - مشرق کے آفتاب اقبال میں گرہن لگا - دس ہزار سوار اور ایک لاکھ پیادے شہنشاہ پر قربان ہوئے - دارا فرار ہوا - اُسکا خیمہ و خرگاہ دشمنوں کے تصرف میں آیا - اُسکی ماں - بہن - بیوی - بچے بھی گرفتار ہوئے - شاہی رتھ - موروثی سپر - کیانی کمان پر یونان کا قبضہ ہوا - دارا کے پاس تقریباً چار لاکھ فوج باقی تھی لیکن اِسّس کی ہزیمت سے سپاہیوں کے دل افسردہ ہوگئے اور اپنے اعزہ و متعلقین کی گرفتاری سے بادشاہ کی ہمت پست - اُس نے سکندر کے پاس ایلچی روانہ کیے اور اپنے اعزہ کو

---

[۱] بجسم ستوران دراں پہن دشت - زمیں شش شد و آسماں گشت ہشت - (نظامی)

واپس مانگا مگر سکندر فتح و ظفر کے نشہ میں تھا۔ ایسی شرطیں پیش کیں کہ دارا کو مجبوراً ایک فیصلہ کن جنگ کے لیے تیار ہونا پڑا۔

سکندر فارس کی طرف پیشقدمی کرنے سے پہلے علاقۂ سواحل اور وادیٔ نیل پر قبضہ ضروری سمجھتا تھا تاکہ اُسکی واپسی کے لیے راستہ صاف رہے۔ بندرگاہ صور پر حملہ کیا۔ باشندوں نے مزاحمت کی۔ محاصرے کو طول ہوا اور سات مہینے تک یونانی فوجیں سمندر کے کنارے پڑی رہیں۔ اس نازک وقت میں سکندر نے یروشلم کے متولی اعظم سے مدد مانگی۔ فوجی اعانت اور رسد طلب کی۔ "سردار کاہن" شہنشاہ فارس کا وفادار دعاگو تھا۔ اُس نے یونانیوں کو کسی قسم کی مدد دینے سے انکار کردیا۔ سکندر خفا ہوا اور یروشلیم کے باشندوں سے اس تمردی کا عوض لینے کی قسم کھائی۔

صور اور غزا کے بندرگاہ فتح کرکے مصر جانے سے پہلے وہ یروشلیم کی طرف بڑھا جو غزا سے صرف چند میل کے فاصلے پر تھا۔ کنعان میں دہشت اور سراسیمگی پھیلی۔[1] "سردار کاہن" زندگی سے مایوس ہوا۔ یہود کو ہر طرف تباہی اور خانہ ویرانی نظر آنے لگی۔

متولی۔ سردار۔ علما و احبار۔ مذہبی لباس میں رؤسا، شہر طلب امان کے لیے سفید پوشاک سے ملبوس سکندر کے استقبال کو نکلے۔ بادشاہِ یونان غضب آلود تھا اور یروشلیم کی اینٹ سے اینٹ بجانے کی قسم کھا چکا تھا مگر متولی اعظم کے نورانی چہرے پر نگاہ پڑتے ہی یکایک خاموش ہوگیا۔ غصہ دُور ہوا۔ رُعب چھایا۔ سردار کاہن کو جھک کر سلام کیا اور مودبانہ گفتگو کرنے لگا۔

حاشیہ نشیں متحیر ہوئے اور اس تقلب ماہیت کا باعث دریافت کیا۔ سکندر نے جواب دیا کہ مقدونیہ میں خواب دیکھا تھا جس میں ایک نورانی صورت بزرگ نے جو متولی اعظم کے حلیہ اور لباس کا تھا اُسکو ایشیا پر حملہ کرنے کی صلاح اور فتح عظیم کی بشارت دی تھی۔ فوج نے سر تسلیم خم کیا۔ سکندر مسکنت و عاجزی سے یروشلیم میں داخل ہوا۔ ہیکل مقدس میں حاضر ہوکر نیاز پیش کی۔ علماء و احبار کو گراں بہا تحفے دیے۔ یہودیوں کو اپنی شریعت کے مطابق عمل کرنے کی اجازت

[1] یہ روایت جوزیفس نے تاریخ یہود میں درج کی ہے اور تالمود میں بھی اس کی تفصیل ہے لیکن یونانی مورخ اس واقعہ کا بالکل تذکرہ نہیں کرتے۔ غزا یروشلیم سے اس قدر قریب ہے کہ سکندر کا وہاں حاضر ہونا ذرا بھی تعجب انگیز نہیں۔ اصنام پرست یونانی یہودیوں کے قدر شناس نہ تھے۔ لہٰذا یونانی تاریخوں میں سکندر کے داخلۂ یروشلیم کا مذکور نہیں۔ البتہ مصر میں بتوں پر نذر چڑھانا مفصل لکھا ہے۔

عطا فرمائی اور اس مظلوم قوم کے وہ سب حقوق بحال رکھے جو ایرانیوں کی سیاد
فلسطین اور مصر پر قبضہ کر کے شہنشاہ فارس سے آخری جنگ کے۔
دریائے فرات سے عبور کیا۔ خبر ملی کہ دارا ایک عظیم الشان لشکر لیے دجلہ کے
خیمہ زن ہے۔ چار روز کی مسافت طے کرنے کے بعد ایرانی فوج کا جنگل ز
ہیں کہ دس لاکھ پیادے۔ ۴۰ ہزار سوار۔ دو سو مسلح رتھ۔ اور پندرہ ہاتھی
تھے۔ سکندر کے پاس صرف ۴۰ ہزار پیادے اور سات ہزار سوار تھے لیکن
فنون جنگ سے ماہر۔ بہترین آلات حرب سے آراستہ۔ اپنے آقا پر قربان ہو
لیاقت اور اقبالمندی کے عاشق زار تھے۔ اور سب کو یقین کلی تھا کہ اسی جنگ
کا فیصلہ ہے۔

کوہستان۔ کردستان اور وادی دجلہ کے درمیان وسیع میدان میں جو گ
شہر اربلا سے ۲۰ میل کے فاصلہ پر دونوں لشکروں کا مقابلہ ہوا۔ سکندر کی فوج
دارا کی نشیب میں۔ میدان جنگ کا نقشہ اور لڑائی کی تفصیل ارسٹی بولس یونا
بڑے جوش و خروش سے درج ہے مگر ہماری داستان کو اس بیان سے علاقہ
سکندر کی جمعیت قلیل اور دارا کی فوج کثیر۔ داؤد و جالوت۔ ابراہیم و نم
شالی ہیئت تھی یا محاربین قادسیہ و یرموک۔ مقاتلین پانی پت اور پلاسی کی خ

کَم مِن فِئَةٍ قَلِیلَةٍ غَلَبَت فِئَةً کَثِیرَةً

اکتوبر کی پہلی تاریخ ۳۳۱ قبل مسیح میں صبح کے وقت سکندر کی فوج نے لڑ
اور چند گھنٹوں میں جنگ کا فیصلہ ہو گیا۔ مشرق کو مغرب نے کچل دیا۔ ایشیا کو
ایرانی تین لاکھ مقتول میدان میں بے گور و کفن چھوڑ کر فرار ہوئے اور کیانی سلطنت
ہو گیا۔

نسب نامۂ دولت کیقباد ورق بر ورق ہر سوئے

سکندر ایشیا کا شاہنشاہ ہوا اور فرزندان اسرائیل اُسکے فرماں بردار۔ لیکن
انقلاب کے آٹھ ہی سال بعد ۱۱۔ جون ۳۲۳ کو شام کے وقت خاندان کیقباد
منزل عدم کا مسافر ہوا اور اُسکی وسیع سلطنت چند روز کے اندر چار جنرلوں میں تقسیم
یورپ کا علاقہ ایک سپہ سالار نے پایا۔ ایران و توران دوسرے سردار

سلیکیوس کے حصہ میں آئے اور مصر ٹالمی کو ملا - علاقہ سواحل اور کوہ لبنان - مصر کی حفاظت کے لیے ضروری تھے مگر وہ شام کا جزو بنائے گئے - ٹالمی نے ۳۱۲ء میں عزا کے مقام پر ولیعہد شام کو شکست دیکر فلسطین پر قبضہ کرلیا - وہ سبت کے دن یروشلم میں داخل ہوا - موسوی شریعت کے پابند سنیچر کے روز کوئی دنیوی کام نہ کرتے تھے - وہ مزاحمت نہ کرسکے - اور یہود کی جمہوری ریاست چشم زدن میں مصر کی ماتحت ہوگئی - چند سال تک شام و مصر کے درمیان فلسطین مابہ النزاع رہا - یہودیوں کی اطاعت ٹھوکریں کھاتی رہی مگر ۳۰۱ء کی خون ریز جنگ نے اس قصہ کا فیصلہ کیا اور مصریوں کا کنعان پر مستقل تسلط ہوگیا جو تقریباً ایک صدی تک قائم رہا - سیادت فارس کے بعد یہ دور بنی اسرائیل کے لیے امن و عافیت کا تھا - سرکاری محصول اور شاہی خراج اُنکو دینا پڑتا تھا مگر اندرونی آزادی حاصل تھی - اس زمانہ میں یہود کی ایک بڑی جماعت مصر میں آباد ہوئی - اُنھوں نے علم و فضل میں ترقی کی اور اپنی مقدس کتابوں کا یونانی زبان میں ترجمہ کیا - شام کے بادشاہ موقع کے منتظر اور فلسطین کو زیرنگین کرنے کی گھات میں تھے - ۲۰۳ء قبل مسیح میں مصر کی حکومت ایک طفل نیجبالہ کو میراث میں ملی اور شامیوں کی دیرینہ تمنا پوری ہوئی -

شاہ انٹیوکس سوم نے یکایک فلسطین اور سواحل پر قبضہ کرکے کنعان کو دوبارہ شام کا صوبہ بنالیا یہاں تک خیریت تھی لیکن جب ۱۷۶ء میں انٹیوکس چہارم مسندنشین ہوا تو یہود پر آفت و مصیبت کے بادل پھٹ پڑے اور اُنکو وہ اذیت و تکلیف برداشت کرنا پڑی جو کلدانی و حقیوں کی حکومت اور بابل کی اسیری میں بھی نہ اُٹھائی تھی -

یہ بدطینت بادشاہ عیش و عشرت کا بندہ - لالچی - ضدی - دغاباز - اور ظالم تھا - اُسکو یونانی مذہب - یونانی فنون - یونانی شاعری سے عشق تھا - اسکی آرزو تھی کہ تمام ممالک محروسہ میں یونانی اوضاع و اطوار رائج کرے اور اپنی کل رعایا کو یونانی خیالات - یونانی عادات اور یونانی لباس کا شیدا اور شفیتہ بنائے - یہود قدامت پرست تھے اور اُنکے مذہب کو یونانیوں سے اصولی اختلاف تھا - انھوں نے مذہب اور معاشرت تبدیل کرنے سے انکار کیا اور حکومت نے اُنکو ظلم و جور کا تختۂ مشق بنایا -

بدقسمتی سے بنی اسرائیل میں خود اتفاق و اتحاد نہ تھا - بھائی بھائی کا بدخواہ تھا - باپ بیٹے میں صفائی نہ تھی گروہ بندی اور فرقہ پرستی کے وہی مہلک جراثیم پھیلے ہوے تھے جنکا ہمارے بدقسمت مُلک میں آجکل زور شور ہے -

ہیچ الفت نہ برادر بہ برادر دارد　　　پسراں را ہمہ بدخواہِ پدر می بینم

اجنبی حکومت کے لیے یہ نفاق باہمی نعمت خداداد تھا۔ بھائیوں کی لڑائی سے دشمنوں نے خوب فائدہ اُٹھایا۔ متولی اعظم اونیاس کے بھائی یوشع نے بادشاہ شام کو رشوت کی کثیر رقم دے کر برادر بزرگ کا منصب خرید کیا اور یروشلیم کا گورنر بنا۔ یونانیوں کو خوش کرنے کے لیے اپنا نام بھی تبدیل کر دیا اور جیسن کے عرف سے شہرت پائی۔

موسوی شریعت کو مٹانے کے لیے متبرک صیئون کے پہاڑ کے نیچے ایک یونانی اکھاڑہ بنوایا۔ جس میں برہنہ ورزشیں سکھائی جاتی تھیں۔ یونانی علوم کی تعلیم عبرانیوں کے مرکز میں جاری کی۔ یونان کی فلاسفی۔ یونان کی شاعری۔ یونان کا لباس مقبول عام بنانے کی سعی بلیغ کی۔ ہیکل مقدس سنسان۔ مذہبی مدرسے ویران ہوئے۔ عبادت روزانہ موقوف ہوئی اور یروشلیم کی بستی مقدونیہ کی نو آبادی معلوم ہونے لگی۔

جیسن کی حکومت کو تین ہی سال گزرے تھے کہ اُسکا چھوٹا بھائی مینی لاس بڑے بھائی کی بیاض سے ورق پھاڑ کر دربار شام میں حاضر ہوا اور بادشاہ سے گراں بہا نذرانے کا وعدہ کرکے متولی اعظم کا عہدہ خرید کر لیا۔ وہ شان و شکوہ سے یروشلیم میں داخل ہوا۔ موعودہ پیشکش مہیا کرنے کے لیے اپنے ہم قوموں پر سخت ٹکس لگائے لیکن مقررہ تاریخ پر رقم فراہم نہ ہو سکی۔ جوابدہی کے لیے دربار میں طلب ہوا۔ بادشاہ کی عادات و اطوار سے آگاہ تھا۔ ہیکل مقدس کے چند طلائی ظروف رشوت میں پیش کرنے کے لیے ہمراہ لیگیا۔ سابق متولی اونیاس مدت سے روپوش تھا۔ ظروفِ ہیکل پر تصرف کی خبر سن کر پردۂ خلوت سے باہر آیا۔ مینی لاس کی قابل نفرت حرکات پر ملامت کی اور روساء قوم کو اُس کی بداعمالی سے آگاہ کیا۔ ایسا خطرناک مقرر کیونکر زندہ رکھا جا سکتا تھا۔ حکومت کے اشارے سے قتل ہوا۔ یہودی رعایا اس خونِ بے گناہ سے ناراض ہوئی۔ اکابر بادشاہ کے پاس فریاد لیکر گئے۔ مینی لاس کے ظلم و تعدی کی شکایت کی۔ بادشاہ نے پہلے غصہ کا اظہار کیا مگر زر بر سر فولاد نہی نرم شود۔ رشوت حاضر کی گئی۔ گورنر کا قصور معاف ہوا اور شکایت کرنے والے گستاخوں کا فوراً قتل کر دیا گیا۔ مینی لاس نے پہلے سے بھی زیادہ سخت مظالم شروع کیے۔ رعایا میں بغاوت کی آگ بھڑکی۔ معزول متولی جیسن نے ایک ہزار سپاہیوں کی جمعیت سے یروشلیم پر حملہ کر دیا۔ انٹیوکس نے مقامی حکومت کی مدد کی۔ جیسن فرار ہوا۔ سیکڑوں بیگناہ مارے گئے اور ہزاروں معصوم لونڈی غلام بنانے کے لیے ایشیا اور افریقہ

کی بازاروں میں فروخت ہوئے۔ بادشاہ شام مینی لاس کو ساتھ لیکر ہیکل مقدس میں داخل ہوا۔ پاک برتنوں کو ناپاک کیا اور ۱۸۰۰ مثقال چاندی غارت کرلایا۔ اُس نے صیون کے پرانے قلعہ کو آلات حرب سے مسلح کیا۔ اُسکے گرد ایک نئی مستحکم دیوار بنوائی۔ بلند برج تعمیر کیے اور وہاں شامی فوج کا ایک زبردست دستہ یہودیوں کی نگرانی اور سرکوبی کے لیے متعین کیا۔ یہود کی نیم آزادی جو شہنشاہ بہمن دراز دست کی یادگار تھی اور جس کو سکندر کے جانشینوں۔ مصر کے حاکموں نے برقرار رکھا تھا اب خانہ جنگی اور باہمی مخالفت کی برکت سے مسترد ہوئی۔ قدیم حقوق ضبط۔ رواداری کے قوانین منسوخ۔ یہود کو اپنا آبائی مذہب ترک کرنے پر علی الاعلان مجبور کیا گیا۔

شریعت کی کتابیں جسقدر دستیاب ہوسکیں پھاڑ ڈالیں یا جلا دیں۔ ہیکل سلیمانی کا نام "معبد مشتری" رکھا اور اُس میں یونانی دیوتاؤں کے بت نصب کیے۔ مقدس قربان گاہ پر نجس گوشت رکھا گیا اور ہیکل کے حدود میں ناپاک گیت اور برہنہ ناچ کے جلسے ہونے لگے۔

بتوں کے مندر شہر کی ہر گلی میں بنائے گئے اور ہر گھر میں یونانی دیوتاؤں کے نام پر بخور جلائے گئے۔ رعایا کو سبت منانے کی ممانعت تھی۔ وہ مشرکانہ قربانیوں میں شریک ہونے اور یونانی دیوتاؤں کے جلوس کے ساتھ عشق پیچے کے ہار پہن کر گانے بجانے پر مامور و مجبور تھے۔

یہود کی قومیت اور قدامت کا نشان ختنہ تھا۔ حکومت نے اس کی سخت مخالفت کی اور اس وحشیانہ رسم پر عمل کرنے والوں کو مستوجب قتل قرار دیا۔ سلطنتیں جلد جلد بدل سکتی ہیں لیکن معاشرت میں تبدیلی دشوار ہے۔ بعض ناسمجھ ماؤں نے اس جدید حکم کی مخالفت کی۔ اُنکے معصوم بچے انکی گردنوں میں باندھ کر بلند دیواروں سے نیچے گرائے گئے اور اس طرح بیرحمی سے انکی جان لی گئی۔ انکار کرنے والوں کا مال و متاع لوٹا گیا اور ختنہ کرنے والے قتل کیے گئے۔

جس یہودی کے پاس کوئی مذہبی کتاب پائی جاتی یا جس کی بابت یونانی دیوتاؤں کی عبادت سے روگردانی کا شبہہ ہوتا فوراً قتل کیا جاتا تھا۔ ہزاروں مذہب پرست کنعان سے فرار ہوگئے وہ غاروں اور پہاڑوں میں پوشیدہ رہتے اور وہاں چھپ چھپ کر خدائے وحدہٗ لاشریک کی پرستش کرتے تھے۔

تاریخ یہود کے صفحات اس دور مظالم اور حکومت خون کی دردناک حکایات سے سیاہ ہیں۔ جوش ایمان۔ ہمت و استقلال کی دو روایتیں یہاں نقل کی جاتی ہیں :—

ایک پیر نود سالہ الیزر نام تمام عمر مذہبی قوانین اور آبائی شریعت کا پابند رہا۔ تہذیب جدید

کے دور میں اُسکو لحمِ خنزیر کے استعمال پر مجبور کیا گیا۔ اُس نے انکار کیا ۔ مارا گیا۔ بدن لہولہان ہوا لیکن اُسکے صبر و ضبط میں فرق نہ آیا۔ اُسکی پیرانہ سالی پر ظالموں کو بھی ترس آیا۔ اُنھوں نے آنکھ بچا کر کہا کہ پاک گوشت کہیں سے منگا کر مجمع کے سامنے کھالے ۔ کون جانے گا کہ یہ سُور کا گوشت نہیں ہے۔ حاکموں کا غصہ دُور ہو جائیگا اور تیری جان بچیگی۔ لیکن بلند ہمت بڈھے نے منظور نہ کیا۔ اُسکا مردانہ جواب یاد رکھنے کے قابل ہے۔ "اس نازک وقت میں غداری اور فریب دہی کسی طرح جائز نہیں۔ میری کمزوری سے قوم کے جوانوں پر خراب اثر پڑیگا - وہ کہیں گے الیزر نے نوّے[۹۰] برس کی عمر میں موسیٰؑ کی شریعت سے رُوگردانی کی اور ایمان بیچکر جان بچائی۔ نہیں - ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا - میں ایک مثال ہونگا جسکو دُنیا ہمیشہ یاد رکھے ، اور میری قوم کے نوجوانوں کو معلوم ہو جائے کہ مراسم آبائی اور قوانین مذہب کی حفاظت جسم کے خون سے کی جاتی ہے"۔

یہ جواب سُن کر تازیانوں کی بارش شروع ہوئی۔ الیزر پہلے ہی سے زخمی تھا - کچھ دیر ضبط کیا۔ آخر بولا کہ "میرے جسم کو ان کوڑوں سے سخت تکلیف ہے لیکن روح کو اطمینان ہے - اے خدائے قدوس گواہ رہنا کہ میں عذاب آخرت کے خوف سے یہ اذیت برداشت کرتا ہوں"۔ مطمئن روح فوراً عالمِ بقا کی طرف پرواز کر گئی اور ظالموں کو سوائے حسرت و ندامت کے کچھ ہاتھ نہ آیا۔

اس روایت سے زیادہ دردناک اور صبر آزما ایک ماں اور اُسکے سات لڑکوں کا قصہ ہے۔ ان بدنصیبوں کا راز کسی طرح آشکارا ہوا۔ حکام کو خبر ملی کہ وہ آبائی مذہب پر قائم ہیں۔ وہ بیتوں اور کوڑوں سے زخمی کیے گئے۔ شفیق ماں کی آنکھوں کے سامنے لڑکے خون سے لال ہوئے۔ بڑا لڑکا بولا "ظالمو! تم ہم سے کیا چاہتے ہو۔ ہم مرنے کو تیار ہیں مگر اپنے آبا و اجداد کی شریعت ترک نہ کرینگے" یہ گستاخانہ جواب کیونکر برداشت کیا جاتا۔ لڑکے کی زبان نکلوائی گئی - ہاتھ کٹوائے پاؤں کٹوائے مگر وہ اپنے دین پر ثابت قدم رہا۔ ماں اور بھائی صبر و استقلال کی ہدایت اور بہادری سے جان دینے کی تلقین کرتے رہے - آخرکار وہ کھولتے ہوئے تیل کے کڑھاؤ میں ڈالا گیا مگر آخری سانس تک اُسکا دل خدا کے ساتھ رہا۔ اُسکے پانچ بھائی اسی طرح یکے بعد دیگرے بیدردی اور سفاکی سے ہلاک کیے گئے مگر غم نصیب ماں ہر ایک مرنے والے کو صبر و تحمل کی تاکید کرتی رہی اور شاداں و فرحاں تھی۔

جب صرف ایک بیٹا رہ گیا تو یونانی ظالم نے شرمندہ ہو کر اُسکو دولت و عزت کا سبز باغ دکھایا اور ماں کو حکم دیا کہ وہ اپنے کلیجے کی ٹھنڈک کے لیے ایک بچے کو بچالے - خیر دل ماں

عبرانی زبان میں بیٹے سے بولی کہ "اس ظالم سے خوف نہ کھا - اپنے بھائیوں کی طرح بہادری سے موت قبول کر - تب میرے حق سے ادا ہوگا اور میں اپنے مالک کے حق سے سبکدوش ہونگی" خلعت رشید کو تاکید کی احتیاج نہ تھی - وہ شامیوں سے مخاطب ہوا کہ "تم کس خیال میں ہو اور میرے قتل میں کیوں لیس و پیش کر رہے ہو - میں بادشاہ کا حکم نہیں مانوں گا - مجھ پر اُس فرمان کی تعمیل فرض ہے جو میرے دائم اور باقی خداوند نے موسیٰ کی معرفت بھیجا تھا"

ظالموں نے اسکو بھی ہاتھ پاؤں کاٹ کر آگ میں جھونکا - اب ماں کی باری آئی - وہ ہنستی ہوئی کھولتے کڑھاؤ میں پھاند پڑی اور مذہب پر قربان ہوگئی -

اے منتقم جبار! کیا یہ قربانی رائیگاں جائیگی؟ اے قاہر ذوالجلال! کیا یہ خون ہدر ہو جائیگا؟ رومی عقاب! جھپٹ کر آ اور یونان کا تختہ اُلٹ دے - مقابی بہادر اُٹھ اور اپنے بھائی بندوں کے خون کا عوض لے!!

دوستو! متاعِ آزادی بہت گراں ہے - اسکا سودا نقدِ جاں سے ہوتا ہے - اور گاہک ہتھیلی پر سر رکھکر اسکی تلاش میں نکلتے ہیں - مشقت و مصیبت صبر و شکر سے برداشت کی جاتی ہے - دارورسن کی معراج کے لیے تمنائیں اور دعائیں ہوتی ہیں - مشتاقوں کا ہر قطرۂ خون تبرک سمجھ کر سینے اور چہرے پر مَلا جاتا ہے - تب اس نایاب جنس کی جھلک نظر آتی ہے - جسکو ہو جان و دل عزیز اُسکی گلی میں جائے کیوں!

بنی اسرائیل کاہل - آرام پسند - اور عیاش تھے - بداعمالیوں سے سلطنت کھوئی - صبر کیا - فقر و فاقہ سے دوچار رہوے برداشت کیا - جلا وطنی کی سزا ملی، سرِ تسلیم خم کیا - کلدانیوں اور ایرانیوں کی حکومت و سیادت قبول کی - اغیار کی حفاظت میں عافیت کی زندگی اور خانگی آزادی پر قانع رہے لیکن انٹیوکس نے نادانی اور ضد سے ہزاروں برس کے رسوم و قواعد کو بزورِ شمشیر تبدیل کرنا چاہا نصیحت و ہدایت کی جگہ تیغ و سنان سے کام لیا - مذہب میں مداخلت، اصولِ معاشرت میں رخنہ اندازی کی تو اُنکے ضبط و تحمل کا پیمانہ لبریز ہوا - وہ آزادی کے طلبگار رہوے اور اس گم شدہ دولت کے حاصل کرنے کے لیے ہر طرح کی مالی اور جسمانی قربانیاں پیش کرنے کو تیار ہوگئے -

دریں دریاے بے پایاں دریں طوفانِ موج افزا
دل افگندیم بسم اللہ مجرہا و مرسٰہا

قصبۂ مودن کا ایک ضعیف اور بلند ہمت مومن متھیاس نام یونانیوں کے زہرہ شگاف

مظالم دیکھ کر زیست سے بیزار ہوا اور غلامی کی زندگی پر باعزت موت کو ترجیح دینے لگا۔ دنیا کی مشکلیں اُسی وقت تک سدِّ راہ ہوتی ہیں جب تک موت کا خوف ہو۔ انسان فرشتۂ اجل سے محبت کرنے لگے تو ہر مشکل آسان ہے۔ حکومت کے سپاہی کنعان کے ہر قصبہ اور ہر گانوں میں یونانی دیوتاؤں کی پرستش کے لیے قربان گاہ بنواتے پھرتے تھے۔ اُنھوں نے موودن میں بھی بتخانہ بنایا اور رعایا کو حکم دیا کہ وہ اصنام پر نذر بھینٹ چڑھائے۔ متھیاس کو معتبر اور معزز سمجھکر ہدایت کی کہ وہ اس جدید پرستش کا آغاز کرے تاکہ دوسروں کے لیے مثال ہو۔ بڈھے نے انکار کیا اور دولت و عزت کے لالچ کو ٹھکرا دیا۔ ایک بندۂ زر انعام و اکرام کی طمع سے جدید قربان گاہ پر نذر چڑھانے آیا تو متھیاس نے تلوار کھینچکر اُس کا سر اُڑا دیا۔

اس بڈھے کے پانچ لڑکے تھے وہ باپ کی امداد کو آئے اور بادشاہی سپاہیوں کو قتل کر دیا۔ قصبہ میں ہنگامہ ہوا۔ قربان گاہ کھود ڈالی گئی۔ متھاس نے منادی کی کہ جو شریعت سے محبت رکھتا ہو اور اسرائیل کی عزت پر قربان ہونے کو تیار ہو وہ ہمارے ساتھ آئے۔ جوش سے متاثر ہو کر ایک مختصر جماعت ہمراہ ہوئی اور وہ سب گھر بار چھوڑ۔ عورتوں اور بچوں کو ساتھ لیکر ریگستان میں پناہ گزیں ہوئے۔ ان باغیوں کا تعاقب کیا گیا۔ سبت کے دن اُن پر حملہ ہوا۔ وہ مذہبًا اُس روز دنیوی امور سے محترز رہنے پر مجبور تھے۔ حفاظت نہ کر سکے۔ اور بیشتر افراد قتل ہوئے۔ پسماندگان کو متھاس نے تلقین کی کہ سبت کے دن حملہ کرنا ہم کو جائز نہیں مگر دشمن حملہ آور ہو تو حفاظت خود اختیاری سے کام نہ لینا گناہ ہے۔ اسرائیلیوں نے منظور کیا اگلے سبت کو پھر سرکاری سپاہیوں نے ریگستان پر دھاوا کیا تو بجائے مرنے مارنے پر مستعد تھے۔ سپاہی بھاگے اور اسرائیلی کامیاب ہوئے۔

گرد و نواح سے مصیبت زدہ اسرائیلیوں کے قافلے ریگستان میں آنے لگے اور متھاس اپنی بے خوف جماعت کے ہمراہ ملک کا دورہ کرنے لگا۔ وہ کمزوروں کو تسلی دیتا۔ دشمنوں کے عبادت خانے برباد کرتا اور ہر جگہ شریعتِ موسوی کو رائج کرتا تھا۔ اُسکی موت نزدیک آئی تو حالت نزع میں اپنے پانچوں بیٹوں کو قوم و ملت پر فدا ہونے کی وصیت کی اور تیسرے بیٹے یہودا "مقابی" کو جماعت احرار کا سردار بنا کر دنیا سے رخصت ہوا۔

متھاس کے سب بیٹے سعادتمند۔ قابل۔ ہوشیار اور جری تھے لیکن جانبازی۔ شجاعت۔ اور بلند ہمتی میں یہودا کا جواب نہ تھا۔ وہ آلاتِ حرب سے مسلح ہو کر دیو کی طرح میدان میں

گرجتا اور شیر کی طرح شکار پر جھپٹتا تھا۔ اُس نے یوشع اور داؤد کی دلیری کا نمونہ دکھایا اور چھ سال کی خفیف مدت میں بنی اسرائیل کی مردہ قوم کو زندہ کردیا۔

وہ دنیا کی اُن عظیم الشان ہستیوں میں سے تھا جنھوں نے تاریخ کے ورق اُلٹ دیے اور آلِ یعقوب کے کارنامۂ فتوحات میں اُسکا نام سونے کے حرفوں سے لکھا ہے۔ اُسکے کارنامہ کی عزت وعظمت "یہوداہ مقابی" کے مبارک نام سے ہے۔

زندۂ عشق نہ مُرد است و نہ میرد ہرگز لایزالی بود ایں بیخودی ولم یزلی

اسکی ہمت وشجاعت کا غلغلہ سُن کر سیکڑوں جانباز اُسکے ساتھ ہوے اور غلامی کی زنجیریں کاٹنے کے لیے باعزت موت کے مشتاق ہوکر ملک ومذہب پر نثار ہونے کی قسم کھالی۔

شام کے گورنر نے باغیوں کے اس گروہ پر حملہ کیا۔ شکست پائی۔ میدان میں ذلت سے قتل ہوا اور اُسکی بیش بہا تلوار مدۃ العمر یہوداہ کے ہاتھ میں رہی

اس اچانک نقصان کا بدلہ لینے شام کا سپہ سالار بڑی فوج لیکر آیا۔ مختصر جمعیت کے کمزور دل والے لرز گئے۔ یہوداہ نے سمجھایا "فتح وظفر تعداد کی کثرت پر منحصر نہیں۔ اگر ہمت ہو تو جماعت کثیر کا قلیل سے مغلوب ہونا ممکن ہے۔ نصرت خدا کی طرف سے آتی ہے"۔ ساتھیوں کا دل بڑھا کر دشمنوں پر جھپٹا۔ آٹھ سو یونانی قتل ہوے اور بقیہ فرار ہوگئے۔

یہوداہ کی شجاعت ومردانگی کی دھوم مچی۔ وہ مظلوموں کا پشت پناہ مشہور ہوا۔ تمام قوم میں جوش پھیلا اور سارا ملک لڑائی کے لیے تیار ہوگیا۔

انٹیوکس یہ ناکامیاں سُن کر غضبناک ہوا۔ اور اس قابل حقارت مختصر گروہ کو نیست ونابود کرنے کا عزم بالجزم کرلیا۔ اُسکی ٹڈی دَل فوج اسرائیلیوں کو کچلنے آئی۔ فلستیوں اور یہود کے دوسرے موروثی دشمنوں نے مدد بھیجی۔ سپاہیوں کو ایک سال کی پیشگی تنخواہ دیدی گئی۔ دولتمند بردہ فروش لوہے کی زنجیریں لیے فوج کے ساتھ تھے کیونکہ فرمان شاہی جاری ہوچکا تھا کہ سب اسرائیلی غلام بناکر فروخت کیے جائیں گے اور ایک مثقال چاندی ۹۰ یہودیوں کی قیمت ہوگی۔

اِماوس کے میدان میں یونانیوں کے ۴۰ ہزار پیادے اور ۷ ہزار سوار خیمہ زن ہوے۔ یہودیوں کی مجموعی تعداد اُس جگہ صرف تین ہزار تھی مگر وہ سر پر کفن باندھے مرنے کو تیار تھے۔ ایک شامی جنرل نے رات کی تاریکی میں اسرائیلیوں کو پیس ڈالنے کا فیصلہ کیا۔ یہودکو

خبر لگی۔ انھوں نے خیمے خالی کر دیے اور جب دشمن زد پر آگئے تو انکا محاصرہ کر لیا۔ تین ہزار یونانی قتل ہوئے اور بقیہ سراسیمہ ہو کر فرار ہوئے۔ تھوڑی دیر کے بعد دشمن کی تازہ دم فوج مقابلہ پر آئی۔ یہاں شامیوں کے خیمہ و خرگاہ میں آگ لگ چکی تھی دُور ہی سے یہ منظر دیکھ کر حواس باختہ ہوئے اور ایسے بے تحاشا بھاگے کہ فلستیوں کے ملک میں جا کر دم لیا۔ یہود کو بیشمار مال غنیمت ملا اور انکو اپنی قوت پر بھروسہ اور طاقت کا احساس پیدا ہو گیا۔

انٹیوکس کا سپہ سالار لاسیاس ۶۰ ہزار پیادے اور پانچ ہزار سوار لیکر حملہ آور ہوا۔ یہودا نے دس ہزار سرفروش ساتھ لیکر مقابلہ کیا۔ یونانیوں کے پانچ ہزار بہادر قتل ہوئے اور مقابی تمام ارض کنعان کا مالک ہو گیا۔

اب اُس نے یروشلیم میں قدم رکھا جو سنسان اور نصف ویران تھا۔ ہیکل کو تباہ۔ قربانگاہ کو ناپاک۔ دروازوں کو سوختہ۔ ریاضت خانوں کو گندہ اور دالانوں میں قد آدم گھاس کا جنگل پایا۔

اُس نے ہیکل مقدس کو اصنام کی آلایش سے پاک کیا۔ "معبد مشتری" کو پھر "عبادتگاہ سلیمانی" بنایا۔ اور تین سال کے بعد اس متبرک مقام پر شریعت موسوی کے مطابق خدائے وحدہٗ لاشریک کی پرستش شروع ہوئی۔ یہ واقعہ ۱۶۴ سنہ قبل مسیح کا ہے۔

عبرانیوں کی حیرت انگیز کامیابی سے خوفزدہ ہو کر پروسی قوموں نے اپنی یہودی رعایا کو قتل کرنے کا ارادہ کیا مگر یہودا ہر ضرورت کی جگہ پہونچا اور اپنے ہم قوموں کی اعانت کرتا تھا۔ اُس نے ایدومیوں۔ فلستیوں۔ عمونیوں کے پنجے سے یہود کو چھڑایا اور فلسطین کے گرد و نواح میں اسرائیلی شجاعت کا ڈنکا بجا دیا۔

انٹیوکس اُسوقت فارس کے دُور افتادہ علاقہ میں حیلہ ہائے مشکلات تھا۔ بیمار ہوا اور سخت تکالیف اُٹھا کر مرگیا۔ اسکا لڑکا ایک لاکھ پیادے ۔۔ ا ہزار سوار اور ۳۲ ہاتھی لیکر بنی اسرائیل کا نام و نشان مٹانے آیا۔ یہودا مقابلہ نامناسب سمجھ کر یروشلیم کی طرف پسپا ہوا۔ بادشاہ نے محاصرہ کیا۔ مگر خانگی تردّدات سے مجبور ہو کر صلح کا پیام دیا اور اسرائیلیوں کے قدیم ملکی اور مذہبی حقوق بحال کر دیے۔ لڑائیوں کا سلسلہ جاری رہا۔ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد جنگ شروع ہو جاتی تھی۔ کبھی یہود کامیاب ہوتے تھے اور کبھی شامی مگر ۳ ادار ۱۶۰ سنہ کو بیت ہاردن کی لڑائی میں یونانیوں کو کامل شکست ہوئی۔ یہودیوں نے دشمنوں کی راہ فرار مسدود

کردی ۔ سپہ سالار زنیکانور قتل ہوا اور اسکا سر یروشلیم کے صدر دروازے پر آویزاں کیا گیا ۔

یہودا نے یونانیوں کو پست کر دیا لیکن مغرب میں ایک جدید قوت تیار ہو رہی تھی۔ رومتہ الکبریٰ کی طاقت روز افزوں ترقی کر رہی تھی۔ یہودا نے دور اندیشی سے اپنے ایلچی روما بھیجے اور سنہ ۱۶۱ میں وہاں کی مجلس حکومت سے معاہدہ کر کے دُنیا کی جنگی طاقت میں اپنا دبدبہ قائم کر لیا ۔

یونانی شرارت سے باز نہ آتے تھے ۔ ایک لڑائی میں یہودا شہید ہو گیا مگر اُسکے بھائی جوناتھن نے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لیکر اسرائیلیوں کی قیادت کی ۔

اُسوقت شامی سلطنت کے دو دعویدار باہم لڑ رہے تھے اور دونوں کو یہود کی امداد کی احتیاج تھی ۔ ایک نے جوناتھن کو کنعان کا گورنر مقرر کیا اور فوج جمع کرنے کی اجازت دی ۔ دوسرے نے سونے کا تاج اور شاہی خلعت نذر کر کے متولی اعظم کا قدیم عہدہ بحال کیا ۔ ہوشیار سردار نے دونوں دعویداروں کے تحفے قبول کیے ۔ وہ گورنر بنا اور متولی اعظم بھی مگر کسی فریق کو زبان نہ دی ۔ چند روز کے بعد دشمنوں نے اسکو فریب سے گرفتار کیا تو اُسکا چھوٹا بھائی شمعون مقابی یروشلیم کا متولی اعظم ہوا ۔ اُس نے ارض کنعان کو قلعہ بند کیا اور کافی سامانِ رسد فراہم کر کے سنہ ۱۴۳ قبل مسیح میں اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا ۔ اسرائیل کا سکہ جاری ہوا اور یہودیوں کی آزاد سلطنت دوبارہ ارض موعود میں قائم ہو گئی ۔

ذرّہ بھی چمک کے ہو ستارہ قائم جو زمین و آسماں ہے

غزل

(جناب منشی واحد علی صاحب واحد بلگرامی)

چراغِ غم سے زینت خاک ہوتی بزمِ ارماں کی
ارے او بیخبر یہ روشنی تھی داغِ ہجراں کی

عنایت ہے بہت ہم پر جنونِ فتنہ ساماں کی
نہ یہ ہوتا نہ ہوتیں دھجیاں جیبِ گریباں کی

نظر اُن کی طرف کرتے ہوئے اب دل لرزتا ہے
کہیں بجلی نہ گر جائے نگاہِ برق ساماں کی

وہ میری آرزو ہو کر ضیا سے بزمِ دشمن ہیں
کہاں پہونچی تجلی جا کے میرے داغِ ہجراں کی

سنجانے کتنے اس انداز پر بنجائیں گے وحشی
ہزاروں گھر بگاڑے گی ادا زلفِ پریشاں کی

اسیرانِ قفس اپنے چمن کو کس طرح بھولیں
نظر کے سامنے تصویر پھرتی ہے گلستاں کی

میں واحد ناتواں ہوں دو قدم چلنا بھی مشکل ہے
کشش کھینچے لیے جاتی ہے لیکن بزمِ جاناں کی

شیفتہ

(مولوی محمد یحییٰ صاحب تنہا بی اے ایل ایل بی وکیل)

آپ کا نام نواب محمد مصطفٰے خاں اور شیفتہ تخلص ہے۔ فارسی میں آپ حسرتی تخلص کرتے تھے۔ نواب عظیم الدولہ سرفراز الملک نواب مرتضٰی خاں بہادر مظفر جنگ کے فرزند رشید تھے۔ ولادت ۱۸۰۶ء میں بمقام دہلی ہوئی اور بڑے اچھے طریقہ پر تعلیم و تربیت ہوئی۔ آپ نے فارسی عربی پڑھی اور علوم مروجہ حاصل کیے۔ علوم دینی سے ایسا شوق و شغف تھا کہ طلب کی تشنگی کسی وقت کم نہ ہوتی تھی۔ باختلاف موسم دو بجے سے ۳ بجے تک تہجد کے واسطے بیدار ہوتے تھے۔ اور صبح کی نماز مسجد میں جاکر سفر ہو یا حضر اول جماعت کے ساتھ ادا کرتے تھے اور اکثر مسجد سے واپس آکر اشراق تک وظائف و اذکار میں مشغول رہتے تھے۔ جو خطوط آپ کے پاس آتے تھے اُن کا جواب ہر روزہ تحریر کرادیتے تھے۔ فارسی خطوط کا جواب فارسی میں اور اُردو خطوط کا جواب اُردو میں بھیجتے تھے۔ آپ کے بڑے صاحبزادہ نواب محمد علی خاں صاحب خطوط نویسی کے کام پر مامور تھے۔ کبھی کبھی یہ خدمت مولانا فرخی صاحب بھی انجام دیتے تھے۔ ایک مرتبہ مولانا نے لفظ "تمنے" ملاکر لکھ دیا تو اُس کو آپ نے کاٹ کر "تم نے" بنا دیا۔ یعنی آپ ہر لفظ کو علیحدہ علیحدہ لکھنے کے حامی تھے اور اُردو املا کے اس رسم خط کی ضرورت کو جسے آج کل لوگ رواج دینا چاہتے ہیں آپ نے آج سے ستر برس پہلے محسوس کرلیا تھا۔ نواب صاحب کا خط نہایت پاکیزہ تھا۔ جوانی میں آپ کو گھوڑے کی سواری کا بہت شوق تھا۔ بزرگوں سے بیحد عقیدت رکھتے تھے۔ مذہب کا احترام اور شرعی پابندی آپ میں بہت تھی۔ آپ کے پاس ایک موضع گرو تھا۔ بہت مدت کے بعد مالک نے اُس کو چھڑانا چاہا۔ ہر چند کہ رہن نامہ میں تمام منافع موضع مرہونہ کا مرتہن کو معاف و مباح کر دیا گیا تھا اور فک رہن کے وقت مالک بخوشی کل زر رہن ادا کرنا چاہتا تھا اور مفتیوں نے بھی اباحت کا فتوےٰ دیدیا تھا لیکن آپ نے جس قدر محاصل اس موضع سے وصول ہوا تھا زر رہن میں سے سب مجرا دے کر باقی روپیہ راہن سے لے لیا۔ آپ نے سفر حجاز کیا اور حج بیت اللہ سے فارغ ہوے۔ جب آپ زیارت مدینہ منورہ کے لیے روانہ ہوے اور آپ کا قافلہ قریب شہر پہونچا تو شیخ الحرم تشریف لائے۔ اور پوچھا کہ محمد مصطفٰے خاں نامی کوئی شخص اس قافلہ میں ہے۔ لوگوں نے نواب صاحب کی طرف اشارہ کیا۔ شیخ نے نواب صاحب سے کہا کہ آپ میرے مہمان ہیں۔ نواب صاحب نے جواب دیا کہ مجھے اس سے زیادہ کیا فخر ہو سکتا ہے۔ لیکن چونکہ میرا ابھی

یہاں تو وارد ہوں سر دست مجھ کو اس عزت سے معاف فرمایا جائے - اس پر شیخ نے صاف طور پر اپنے تشریف لانے کی وجہ بتائی اور فرمایا کہ "نہ میری مجال کہ معافی دوں نہ آپ کی طاقت کہ آپ معافی مانگ سکیں - اس لیے کہ مجھ کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہوا ہے کہ میں جا کر حضور کی طرف سے شرطِ مہمانی بجا لاؤں" یہ سنتے ہی آپ پر ایک حالت وجد طاری ہو گئی - آپ نے سفر حجاز کا ایک سفرنامہ فارسی میں تحریر کیا جس کا نام "رہ آورد" ہے - ایک تذکرۂ شعرائے اردو بھی تحریر کیا ہے جس کا نام گلشن بیخار ہے - یہ تذکرہ فارسی میں لکھا ہے لیکن شعراء کے منتخب اشعار بھی درج کیے ہیں - میرے نزدیک جو رائے اردو شعرا کے کلام کی نسبت آپ نے ظاہر فرمائی ہے اگرچہ وہ مختصر ہے لیکن نہایت جچی تلی ہے اور میں اسکو تمام تذکرہ نویسوں کی رائے سے افضل اور اصح مانتا ہوں - تعجب ہے کہ آزاد سید انشا کے حالات میں حسب ذیل الفاظ لکھتے ہیں

"نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کا گلشن بیخار جب دیکھتا ہوں تو خار نہیں کٹار کا زخم دل پر لگتا ہے"۔

کیوں؟ اس وجہ سے کہ نواب مرحوم نے صحیح اور سچی رائے انشا کے کلام کے نسبت ظاہر فرمائی اور صاف صاف کہدیا کہ "ہیچ صنعت را بالطریقۂ راسخہ شعر انگیختہ" واقعی کسی نے سچ کہا ہے الحق مرٌ۔

اسی طرح نظیر اکبر آبادی کے ایک شاگرد نے یہاں تک کیا ہے کہ تذکرۂ گلشن بیخار کے جواب میں ایک نیا تذکرہ گلستان بیخزاں کے نام سے تصنیف کر ڈالا اور اس میں یہ التزام کیا ہے کہ نواب شیفتہ نے جن شعرا کے کلام کی نسبت اچھی رائے دی تھی اسنے انکی برائی کی اور جنکی نسبت شیفتہ نے نکتہ چینی کی تھی انکی تعریف لکھی -

آپ حکیم مومن خاں کے شاگرد تھے - انکے انتقال کے بعد مرزا غالب سے مشورۂ سخن کرنے لگے - آپ کی عمر اکیس برس کی تھی کہ آپ نے اردو کا دیوان مکمل کر لیا تھا - فرماتے ہیں

اے شیفتہ اس فن میں ہوں اک پیر طریقت　　گو عمر ہے میری ابھی اکیس برس کی

حج کے بعد آپ نے قریب قریب شعر گوئی ترک کر دی تھی - آپ کا دیوانِ فارسی بھی عمدہ اور منتخب اشعار سے مملو ہے - آپ کا انتقال ۱۸۶۹ء میں بعمر ترسٹھ سال ہوا - آپ اخلاق مجسم تھے متین اور سنجیدہ تھے - اکثر بزرگوں سے آپ کے حلم و استقلال اور مروت و انکسار کا ذکر سنا گیا ہے

کلام پر تبصرہ | اس میں شک نہیں کہ آپ بڑے سخن فہم اور نکتہ سنج تھے - مرزا غالب نے آپکی نسبت لکھا ہے کہ

غالب بفن گفتگو نازد بریں ارزش کہ او　　ننوشت در دیواں غزل تا مصطفےٰ خاں خوش نکرد

مولانا حالی مرحوم فرماتے ہیں

حالی سخن میں شیفتہ سے مستفید ہوں　　غالب کا معتقد ہوں مقلد ہوں میر کا

آپکا گلشن بیخار ہمارے پیش نظر ہے - ہم جب کسی شاعر کی نسبت اپنی رائے ظاہر کرتے ہیں اور گلشن بیخار کو دیکھتے ہیں تو ہم کو نواب مرحوم کی آزادانہ رائے دیکھکر بیحد مسرت ہوتی ہے - ہمکو اگر شکایت ہے تو یہی کہ آپکی رائے اگرچہ بے لاگ ہوتی ہے لیکن مختصر

جامع اور مانع نہیں ہوتی۔ بعض بعض جگہ ہمکو نواب شیفتہ کی رائے سے ممکن ہے اختلاف ہو لیکن جن خیالات کا نواب مرحوم نے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے اُن پر نظر کرتے ہوئے ہم آپ کی سخن فہمی کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ کسی نے سچ کہا ہے ع از سخن فہمی سخن گوئی زیادہ مشکل است۔

لیکن یہ ضرور نہیں کہ ایک اعلیٰ درجہ کا سخن فہم سخنگوئی میں بھی کامل ہو۔ بلحاظ سخن فہمی آپ کا درجہ میر قائم حسن اور مصحفی سے برتر و فائق ہے مگر اسکے یہ معنی نہیں کہ بلحاظ سخن گوئی بھی آپ ان سب سے برتر و فائق ہیں۔ آپ نے اُس زمانہ کی روش کے مطابق اپنا زور کلام فارسی میں صرف کیا ہے۔ تفریح طبع کے لئے کچھ اُردو میں بھی کہا ہے اور بعض اوقات احباب کی فرمائش پر بھی اُردو میں طبع آزمائی کی ہے۔ اس پر بھی آپکا دیوان گلستان بیخزاں بنا ہوا ہے۔ آپ کے دیوان ریختہ میں صرف غزلیات ہیں یا ایسے قطعات ہیں جو غزلیات کے جزو لاینفک ہیں۔ دیگر اصناف سخن سے آپ نے کلام اُردو میں کام نہیں لیا۔ فارسی میں البتہ قصائد و رباعیات وغیرہ بھی موجود ہیں۔ لیکن ہم کو آپ کے فارسی کلام سے کچھ تعلق نہیں ہم کو جو کچھ کہنا ہے وہ آپ کے صرف اُردو کلام کی نسبت عرض کرنا ہے۔ آپکا درجہ بلحاظ شاعری دوسرے درجہ کے شعرا میں ہے اگرچہ آپ نے اپنے اُستادِ فن ہونے کا دعوی اس طرح کیا ہے کہ

دلّی میں تو شیفتہ ہے استاد ہم قصد سوے عجم کریں گے

لیکن یہ شاعرانہ تعلّی ہے اور بس۔ ہرگز آپ غالب و مومن و ذوق کے ہم پلہ نہیں ہیں۔ بیشک آپ دوسرے درجہ کے شعرا میں ممتاز ہیں لیکن اُس زمانہ کے اُستادوں کی ہمسری آپ سے نہیں ہو سکتی۔ ممکن ہے کہ آپ نے کسی طرحی غزل میں بعض قافیے ان ہر سہ اساتذہ سے کچھ بہتر باندھ دیے ہوں لیکن آپ کی عام شاعری پر نظر کرتے ہوئے ہم آپ کو ان استادوں کے برابر نہیں سمجھتے۔

شیفتہ	وہ اپنے باغ میں ہم کو ضرور رکھے گا	جو بلبلوں کو نہ دے حکمِ آشیاں کے لیے
"	قفس زمانہ و جاں مرغ و آشیاں ملکوت	قفس میں مرغ ہے بیتاب آشیاں کے لیے
مومن	کہاں وہ عیش اسیری کہاں وہ امن قفس	ہے بیم برقِ بلا روز آشیاں کے لیے
غالب	مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر	کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لیے
ذوق	صبا جو آئے خس و خار گلستاں کے لیے	قفس میں کیونکہ نہ پھڑکے دل آشیاں کے لیے
شیفتہ	آرام سے ہے کون جہانِ خراب میں	گُل سینہ چاک اور صبا اضطراب میں
"	اُس نے دمِ وداع کیے عہدِ التفات	افسوس میں نے کچھ نہ سُنا اضطراب میں
مومن	کہتے ہیں تم کو ہوش نہیں اضطراب میں	سارے گلے تمام ہوئے اک جواب میں

مومن بے نالہ منہ سے جھڑتے ہیں بے گریہ آنکھ سے اجزائے دل کا حال نہ پوچھ اضطراب میں
" پیہم سجود پائے صنم پر دمِ وداع مومن خدا کو بھول گئے اضطراب میں
غالب میں اور حظ وصل خدا ساز بات ہے جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں
ذوق یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں واں ایک خامشی تری سب کے جواب میں
خط پڑھ کے اور بھی وہ ہوا پیچ و تاب میں کیا جانے لکھ دیا اُسے کیا اضطراب میں

نواب شیفتہ نے آشیاں کا قافیہ ذوق سے کسی قدر بہتر باندھا ہے لیکن مومن سے کمتر ہے اور غالب کے مقابلہ میں نہایت پست ہے۔ اضطراب کا قافیہ شیفتہ نے بہت خوب باندھا ہے لیکن ان ہر سہ اساتذہ نے بھی بہت عمدہ طور پر "اضطراب" کو باندھ دیا ہے۔ مومن کے تینوں اضطراب اور ذوق کا پہلا اضطراب شیفتہ کے اضطراب سے بہتر ہے اور غالب کا اضطراب اپنی جدت کی وجہ سے اگر بہتر نہیں تو فروتر بھی نہیں ہے۔

آپ کے یہاں فارسی تراکیب بکثرت پائی جاتی ہیں۔ جن میں سے اکثر وبیشتر عمدہ طور پر استعمال ہوئی ہیں:-

خراش ناخن غم - طالع خفتہ - اشک گل ریز،

گرم گرم اس رخ نازک پہ نظر کی کس نے اشکِ گلریز ہے کیوں دیدۂ گریاں میرا

خلش خار، بر سرِ پرخاش و کیں، حرفِ ملامت، عجز گستر، بلائے عقل و دیں، سودا زدہ، نوازن

پروانہ ہے خموش کہ حکم سخن نہیں بلبل سے لذّت گو کہ نوازن بنا دیا

مطرب جادو ترانہ، نقابِ جمالِ شوق، ہم رستا خیز، ہوس انگیز، ظن نیم تبسم

لاتا ہے ظن نیم تبسم سے جوش میں دل کو قلق، قلق کو بکا اور بکا کو ہم

زود آشنا، دل شورش ادا، مستیِ نیم خام، شوقِ غلط کار، کاسہ لیس، سجدہ ریز، بیگانہ وشی، شوق ہرزہ تکاز،

ارباب خلل -

اکثر ایسے وقت کم آتے ہیں اربابِ خلل ہے کشتی کا خلل وقت ابر وباراں چاہیے

توبۂ ژولیدہ، زیب طاق نسیاں وغیرہ وغیرہ

فصل گل ہے میکدے کا ساز وساماں چاہیے توبۂ ژولیدہ، زیبِ طاقِ نسیاں چاہیے

آپ کے یہاں مقامی رنگ بھی پایا جاتا ہے لیکن کم

وادیِ نجد کو دلّی سے نہ دینا نسبت ہے وہ مجنوں کا بیاباں یہ بیاباں میرا

ہند کی وہ زمیں ہے عشرت خیز — کہ نہ زاہد جہاں کرے پرہیز

آپ نے بعض اشعار میں الفاظ کے اُلٹ پھیر سے خوب لطف پیدا کیا ہے :-

ترے گھر سے مرے گھر کا ہو اُنکو قصد لے دشمن — تری تقدیر پھرتی ہے، مری تقدیر پھرتی ہے

پہلے فقرہ میں تقدیر پھرنے سے بدنصیبی اور دوسرے فقرے میں تقدیر پھرنے سے خوش نصیبی مراد ہے۔

ہر چند کہ ہے آپ سے ملنے کی تمنّا — پر آپ سے ملنے کی تمنا نہیں رکھتے

پہلے مصرعہ میں 'آپ سے' معشوق مراد ہے اور دوسرے مصرعہ میں 'آپ سے' اپنے آپ مراد ہے یعنی مطلب یہ ہے کہ ابتدا آپ کی طرف سے ہونی چاہیے، ہم ذلیل ہوکر آپ سے ملنا نہیں چاہتے۔

میں لہو روتا ہوں ناحق اُن کا دامن دیکھ کر — اُن کا دامن بھر گیا ہے میرے ہی خونناب سے

اُس کی جب آنکھ پھری، پھر گئیں اُسکی آنکھیں — شیفتہ مرنے پہ تیار ہی کیا پھرتا تھا

پہلے مصرعہ میں پہلی آنکھ سے معشوق کی آنکھ مراد ہے یعنی جب معشوق ہم سے برگشتہ ہوا اور اُس نے کم التفاتی شروع کردی۔ دوسری آنکھوں سے عاشق کی آنکھیں مراد ہیں یعنی آنکھیں پتھرا گئیں۔

آپ کے کلام میں تصوف کا رنگ بہت زیادہ ہے مثالاً چند شعر لکھتا ہوں۔

تیرے گدا کو سلطنت جم سے کیا کہ ذوق — ہے کاسۂ شکستہ میں جام دو نیم کا

یاں خار و خس کو بے ادبی سے نہ دیکھنا — ہاں عالم شہود ہے آئینہ ذات کا

وجد کو زمزمۂ مرغ سحر کافی ہے — شیفتہ نازِ مغنی و مزامیر نہ کھینچ

اکثر ہوا ہے مجکو سفر در وطن مگر — لایا نہ دوستوں کے لیے ارمغاں ہنوز

میخانہ میں تمام جوانی بسر ہوئی — لیکن ملا نہ منصب پیر مغاں ہنوز

بدمست جہان ہو رہا ہے — ہے یار کی بو ہر ایک شے میں

آپ کے دیوان میں بھرتی کے اشعار کم نظر آتے ہیں۔ تمام کا تمام انتخاب ہے۔ آپ کی متانت اور چاشنیِ تصوف سے نہ یہ امید تھی اور نہ ہم آپ کے دیوان میں کوئی رکیک شعر پاتے ہیں۔ کلام پختہ، قابل دید اور سود مند ہے۔ اگر آپ کی مشق سخن برابر جاری رہتی اور آپ شاعری کو تضیع اوقات نہ سمجھتے تو اس میں ہم کو ذرا بھی شک نہیں کہ آپ کا کلام اپنے اُستاد مومن سے بھی بہتر اور افضل ہوتا۔ آپ کے اکثر اشعار طرز مومن خاں میں اعلیٰ پایہ کے ہیں :-

آپ جو ہنستے رہے شب بزم میں — جان کو دشمن کی میں رو یا کیا

یاں یک حرفِ ملامت داں گراں عرضِ نیاز — سخت جاں میں کب نہ تھا اور نازنیں تو کب نہ تھا

کب ہمیں حاجتِ پرہیز پڑی — غم نہ کھایا تھا کہ سم یاد آیا
اُس سے میں شکوہ کی جا شکرِ ستم کر آیا — کیا کروں تھا مرے دل میں سو زباں پر آیا
میرے آنے سے تم اُٹھ جاتے ہو — بزمِ دشمن میں نہ آؤں کیونکر

آپ نے گلشنِ بیخار میں اپنے متعلق یہ لکھا ہے کہ

"در مراتبِ سخن اگرچہ ادائے خاص با من است اما طبع با ہر روش چناں مناسب افتادہ کہ بہر شیوہ سخن می کنم کہ ہمانا طرزِ خاص منست"

ہم کو اس رائے سے کلی اتفاق ہے اور جو صاحب آپ کے دیوان کا مطالعہ بغور کریں گے ہم کو یقین ہے کہ وہ ضرور ہم سے اس بارے میں متفق ہوں گے۔ غالب نے کیا خوب کہا ہے۔

غالب ز حسرتی چہ سراید کہ در غزل — چوں او تلاشِ معنی و مضموں نکردہ کس

یہ رائے شیفتہ کے اُردو دیوان پر بھی منطبق ہوتی ہے۔

بعض بعض مقام پر آپ کے ادق اور ثقیل الفاظ ناگوارِ طبع ہوتے ہیں:۔

مشکل	نہیں نخچیر تری صید گہ میں اے خنکارِ افگن	مشکل آرزوے خاطرِ نخچیر پھرتی ہے
مرسل الریاح	یا مرسل الریاح ادھر کو بھی بھیجیے	وہ بوے خوش کہ جیبِ نسیمِ یمن میں ہے
ایضاح	اے اہلِ نظر ذرہ میں پوشیدہ ہے خورشید	ایضاح سے حاصل بجز ابہام نہ ہوگا
لانشعت	سو خوف کی ہو جائے گر رندِ نظرباز	دل جلوہ گہ لانشعت و شعت نہیں کرتا
عمل سیمیا	مشاطہ نے گر عملِ سیمیا کیا	گل برگ کو بھی غنچۂ سوسن بنا دیا
بعدالوقوع	تاثیرِ نالہ نکتۂ بعد الوقوع ہے	یہاں غیر رسم اور کوئی مدعا نہ تھا
مظاہر کونی	افسوس وہ مظاہرِ کونی میں پھنس گیا	جو عالمِ عقول سے نا آشنا نہ تھا
استار	پردہ کسی کا یاد نہ لے پردگی ہے یاد	غش ہو گیا اس کعبہ کی استار دیکھ کر

بعض جگہ آپ نے واوِ عطف کا بھی بیجا استعمال کیا ہے مثلاً

عنانِ ضبط کوئی شیفتہ سے تھمتی ہے — کہ ہر کرشمہ ہے چالاک و ہر ادا گستاخ

یہاں واؤ کی جگہ اور ہونا چاہیے۔ حالانکہ اس مصرع میں اگر واؤ نہ بھی ہو تو کچھ ہرج واقع نہیں ہوتا۔

کہیں کہیں تعقید کی بری مثالیں بھی ہیں مثلاً

شیفتہ نے قصۂ مجنوں سنایا رات کو — آ گیا میرا اُنھیں سنتے ہی افسانے کے پاس

بعض فارسی تراکیب بھی ناپسندیدہ طور پر استعمال ہوئی ہیں۔ مثلاً

کھٹکوں عدو کی آنکھ میں تا بعد مرگ بھی   کانٹے مرے مزار پہ رکھنا بجائے گل
نہ ملا ہم کو کبھی تیری گلی میں آرام   نہ ہوا ہم پہ بجز آزار ترے کوچے میں

اگرچہ آپ کے زمانہ میں کبھو بجائے کبھی استعمال نہیں ہوتا تھا لیکن آپ نے غالب اور ذوق کی طرح کبھو کا استعمال بطور قافیہ جائز سمجھا ہے

تغیر رنگ کہتی ہے وصلِ عدو کا حال   یعنی نقاب رُخ پہ کبھو ہے کبھو نہیں

سمجھیے کو سمجھیئے لکھتے ہیں جیسا کہ متقدمین نے لکھا ہے

ذات و صفات میں بھی یہی ربط سمجھیئے   جوں آفتاب، روشنی آفتاب میں
گزرا میں اعتقادِ محبت کے فخر سے   مجھکو رقیب سمجھیئے پر آپ آیئے

حسب ذیل شعر میں کو کی جگہ میں استعمال ہونا چاہیے۔ یہ کو خلاف محاورہ ہے۔ ممکن ہے اُسوقت اس استعمال کو بھی جائز سمجھتے ہوں۔ نیز میں نے رو دیا میں نے زائد ہے

دیکھ کر چشمِ غضب کو اُسکی میں نے رو دیا   چاہیے پانی ملا لینا شراب تیز کو

ذیل میں آپ کے منتخب اشعار درج کیے جاتے ہیں :۔

۱۔ تیرے نسیم لطف سے گُل کو شگفتگی   وابستہ تیرے حکم پہ چلنا نسیم کا
۲۔ طاعت اگر نہیں تو نہ ہو یاس کس لیے   وابستہ سبب ہے کرم کب کریم کا
۳۔ اے جانِ بیقرار ذرا صبر چاہیے   بے شک ادھر بھی آئے گا جھونکا نسیم کا
۴۔ تقویٰ مرا شعار ہے عصمت سرشت و بست   پھر مجھ سے کونسا ہے سبب احتراز کا
۵۔ عجیب حال میں ہے شیفتہ معاف کرو   جو کچھ قصور بھی ہو اس غلام دیریں کا
۶۔ تیری گلی سے آگے نہ ہرگز ہوا چلے   کوچے سے تیرے پاؤں نہ اُٹھے غریب کا
۷۔ تسلیم سے وفاق، رضا سے ہے اتفاق   نے چرخ کا گلہ نہ گلہ ہے نصیب کا
۸۔ سب حوصلہ جو صرف ہوا جورِ یار کا   مجھ پر گلہ رہا ستم روزگار کا
۹۔ بیفائدہ ہے وہم کہ کیوں بے خبر آیا   اس راہ سے جاتا تھا ہمارے بھی گھر آیا
۱۰۔ ایک نالے میں ستمہائے فلک سے چھوٹے   جسکو دشوار سمجھتے تھے سو آساں دیکھا
۱۱۔ جفا و جور کا اُس سے گلا کیا   جو پوچھے مہربانی کیا وفا کیا
۱۲۔ یاس سے آنکھ بھی جھپکی تو توقع سے کھلی   صبح تک وعدۂ دیدار نے سونے نہ دیا
۱۳۔ بسکہ آغازِ محبت میں ہوا کام اپنا   پوچھتے ہیں ملک الموت سے انجام اپنا

۱۴۔ تپشِ دل کے سبب سے ہے مجھے خواہشِ مرگ　　کون ہے جسکو نہ منظور ہو آرام اپنا
۱۵۔ پروانہ بنا میرے جلانے کو وفادار　　محفل میں کوئی شمع بدل جائے تو اچھا
۱۶۔ دل زار کا ماجرا کیا کہوں　　فسانہ ہے مشہور سیماب کا
۱۷۔ صیاد کا دل اس سے پگھلنا متعذر　　جو نالہ کہ آتش فگنِ دام نہ ہوگا
۱۸۔ جس سے ہے مجھے ربط وہ ہے کون کہاں ہے　　الزام کے دینے سے تو الزام نہ ہوگا
۱۹۔ ہم طالب شہرت ہیں ہمیں ننگ سے کیا کام　　بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا
۲۰۔ تم دیتے ہو تکلیف مجھے ہوتی ہے راحت　　سچ جانیے میں اس میں تکلف نہیں کرتا
۲۱۔ کیا حال تمہارا ہے ہمیں بھی تو بتاؤ　　بے وجہ کوئی شیفتہ اف اف نہیں کرتا
۲۲۔ صحرا بنا رہا ہے وہ افسوس شہر کو　　صحرا کو جسکے جلوہ نے گلشن بنا دیا
۲۳۔ مشاطہ کا قصور سہی سب بناؤ میں　　اُس نے ہی کیا نگہ کو بھی پُرفن بنا دیا
۲۴۔ اس قوم کی سرشت میں ہے کم محبتی　　شکوہ جو اُس سے تھا مجھے ہرگز بجا نہ تھا
۲۵۔ وحشت تھی مجھ کو پہلے بھی پر یہ تپش نہ تھی　　شورش تھی مجھ کو پہلے بھی پر یہ مزا نہ تھا
۲۶۔ حسرت سے اُسکے کوچے کو کیونکر نہ دیکھیے　　اپنا بھی اس چمن میں کبھی آشیانہ تھا
۲۷۔ یوں بزمِ گلرخاں میں ہے اس دل کو اضطراب　　جیسے بہار میں ہو عنادل کو اضطراب
۲۸۔ شیفتہ آیا ہوں میں کس کا تماشا دیکھ کر　　رہ گئے حیران مجھ کو سب خود آرا دیکھ کر
۲۹۔ مجھ کو سنا کے کہتے ہیں ہمدم سے یاد ہے　　ایک آدمی کو چاہتے تھے ہم بھی اب سے دور
۳۰۔ مدت ہوئی بہار جہاں دیکھتے ہوئے　　دیکھا نہیں کسی نے گلِ بے خزاں ہنوز
۳۱۔ اے تابِ برق تھوڑی سی تکلیف اور بھی　　کچھ رہ گئے ہیں خار و خسِ آشیاں ہنوز
۳۲۔ کہتے ہیں بیوفا مجھے میں نے جو یہ کہا　　مرتے رہیں گے آپ پہ جیتے ہیں جب تلک
۳۳۔ ایسی ہی بیقراری رہی متصل اگر　　اے شیفتہ ہم آج نہیں بچتے شب تلک
۳۴۔ اہل طریق کی بھی روش سب سے ہے الگ　　جتنا زیادہ شغل زیادہ فراغ بال
۳۵۔ بچتے ہیں اس قدر جو اُدھر کی ہوا سے ہم　　واقف ہیں شیوۂ دلِ شورش ادا سے ہم
۳۶۔ جو جان کھو کے پائیں تو فوزِ عظیم ہے　　وہ چیز ڈھونڈھتے ہیں تن آسانیوں میں ہم
۳۷۔ شکوہ جفا کا کیجے تو کہتے ہیں کیا کروں　　تم سے وفا کروں کہ عدو سے وفا کروں
۳۸۔ آتا ہوں پیرِ دیر کی خدمت سے مست میں　　ہاں زاہدو تمہارے لیے کیا دعا کروں

۳۹۔ اب کے ارادہ ملکِ عدم کا ہے شیفتہ
گھبرا گئے کہ ایک جگہ کیا بسر کریں

۴۰۔ کیا ہو سکے کسی سے علاج اپنا شیفتہ
اُس گل پہ غش ہیں جس میں محبت کی بو نہیں

۴۱ نہ ہمارا کوئی دشمن نہ ہمارا کوئی دوست
وہ نظر اور ہے جو اہلِ نظر رکھتے ہیں

۴۲ دل کے بدلے میں طلبگار نہیں کچھ تم سے
شیفتہ زمرۂ اصحابِ تجارت میں نہیں

۴۳۔ جو بچے کارِ تصرفِ ساقی سے اہلِ بزم
ہو بچی نہیں شراب صراحی سے جام میں

۴۴۔ تم کو نہیں جو عجب تعجب ہے شیفتہ
ہے فی زمانِنا یہ سرشتِ کرام میں

۴۵ جی جائے پر جفا میں ہمارا زیاں نہیں
قدرِ وفا نہیں ہے اگر امتحاں نہیں

۴۶۔ دل کا گلہ فلک کی شکایت بیاں نہیں
وہ مہرباں نہیں تو کوئی مہرباں نہیں

۴۷ مشہورِ روزگار رہے محسودِ روزگار
بے التفاتیوں سے ہمارا زیاں نہیں

۴۸ قطعِ نظر جو نقشِ نگارِ جہاں سے ہو
دیکھو وہ آنکھ سے جو نہ دیکھا ہو خواب میں

۴۹ مرنے کے بعد ہی کہیں شاید پتا لگے
کھویا ہے ہم نے آپ کو عہدِ شباب میں

۵۰۔ وہ قطرہ ہوں کہ موجۂ دریا میں گم ہوا
وہ سایہ ہوں کہ محو ہوا آفتاب میں

۵۱۔ اے آفتِ زمانہ ترے دور میں شکیب
بلبل کو باغ میں ہے نہ ماہی کو آب میں

۵۲۔ اُس کا پتہ ملے تو ہمارا پتہ ملے
کھویا ہے ہم نے آپ کو جس کے سراغ میں

۵۳۔ ہے گونہ گونہ شک ابھی عفوِ گناہ میں
جو ہے زبان پر وہ نہیں ہے نگاہ میں

۵۴۔ افسردہ خاطری وہ بلا ہے کہ شیفتہ
طاعت میں کچھ مزا ہے نہ لذت گناہ میں

۵۵۔ جو قیس کی روش تھی وہی اپنی راہ ہے
دونوں سلیم، فکر میں کیوں اختلاف ہو

۵۶۔ اے دل جو ہو سو ہونے دے سرگرمِ فغاں ہو
یہ جورِ یار ہے ستمِ آسماں نہ ہو

۵۷۔ نفسِ سرکش کی کسی ڈھب سے رعونت کم ہو
چاہتا ہوں وہ صنم جس میں محبت کم ہو

۵۸۔ گردِ کلفت، خاکِ صحرا، دشنۂ غم، نوکِ خار
تیرے وحشی کے لیے ایسا بیاباں چاہیے

۵۹۔ بھڑک گئی نمِ شبنم سے اور آتشِ گل
یہ کیسی آگ ہے دونی ہوئی جو پانی سے

۶۰ یہ ہے نصیحتِ پیرانِ کار افتادہ
کہ بد بلا ہے جوانی ڈرو جوانی سے

۶۱۔ تنگ ستم نے اور بھی مایوس کر دیا
اس بات کا وہ غیر سے شکوا کیا کیے

۶۲۔ نرالی سب سے ہے اپنی روش اے شیفتہ لیکن
کبھی دل میں ہوا سے شیوہ ہائے میر پھرتی ہے

۶۳۔ یہ کیسا تفرقہ ہجراں نے ڈالا
کہیں کیا ہم کہیں اور دل کہیں ہے

٦٤ رقیب بوالہوس کا منہ ہے لطف جور کو دیکھے ۔۔۔ وہ اپنی وضع کو دیکھے ہمارے طور کو دیکھے

٦٥ ناصح تری زبان ترے بس میں جب نہ ہو ۔۔۔ انصاف کر کہ دل پہ مرا زور کیا چلے

٦٦ وہ شیفتہ کہ دھوم ہے حضرت کے زہد کی ۔۔۔ میں کیا کہوں کہ رات مجھے کس کے گھر ملے

٦٧ شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ ۔۔۔ اک آگ ہے کلیجہ کے اندر لگی ہوئی

٦٨ کس واسطے ہم آئے ہیں دنیا میں شیفتہ ۔۔۔ اس کا جو دیکھیے تو بہت کم خیال ہے

٦٩ ستمگر کہے سے برا مانتا کیوں ۔۔۔ ستم کو اگر وہ بھلا جانتا ہے

٧٠ ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں ۔۔۔ جسے غرور ہو آئے کرے شکار مجھے

٧١ فسانے اپنی محبت کے سچ ہیں پر کچھ کچھ ۔۔۔ بڑھا بھی دیتے ہیں ہم زیب داستاں کے لیے

وارداتِ قلب

(جناب منشی علی عظیم صاحب عظیم تینوی عظیم آبادی)

کیا کہوں کس سے کہوں گھر کے اجڑ جانے کا حال ۔۔۔ ہے نہایت دردآگیں میرے کاشانے کا حال

کیوں نہ چھا جائے دلوں پر دیکھ کر افسردگی ۔۔۔ کیا کہیں ہوتا ہے خوش آئند ویرانے کا حال

جھونکوں سے بادِ حوادث کے اندھیرا چھا گیا ۔۔۔ عبرت آگیں بن گیا میرے سیہ خانے کا حال

سنتے ہی دل تھام کر سب ہمنشیں رونے لگے ۔۔۔ ہے زسرتاپا مصیبت میرے غم خانے کا حال

ہائے گلچینِ قضا نے چن لیے گلشن کے پھول ۔۔۔ لٹ گئیں ساری بہاریں اب ہے ویرانے کا حال

لکھ گیا ہے بیخودی میں خامۂ رنج آشنا ۔۔۔ کچھ بیانِ درد و غم کچھ دل کے مرجھانے کا حال

ہاں زبانِ حال سے اے جوشِ محرومی تو ہی ۔۔۔ کہدے کچھ اس دل گرفتہ کے سیہ خانے کا حال

ہر در و دیوار پر حسرت برستی ہے عظیم ؎

ہے سراپا عبرت آگیں میرے کاشانے کا حال

عجائب وغرائب اعداد

(۱)

(جناب منشی منظور علی صاحب علوی مولف واقعات کربلا)

زمانۂ قدیم میں لوگ قائل تھے کہ حروف اور اعداد میں عجیب وغریب اثرات ہیں۔ اس مبحث پر حکمائے قدیم کی تصنیفات تھیں جن میں طرح طرح کے نقوش والواح حروف اور اعداد کو مختلف صورتوں میں ترتیب دے کے درج کیے گئے تھے اور اُنکے فوائد بھی لکھے تھے۔ مگر اس بیسویں صدی عیسوی میں کون ہے جو ایسی بات زبان پر لائے اور پاگل نہ قرار دیدیا جائے۔ راقم الحروف کا مقصد فی الحال اس بحث میں پڑنا نہیں ہے۔ ذیل میں صرف وہ اعمال ریاضی پیش کیے جاتے ہیں جنکا تعلق جمع تفریق اور ضرب سے ہے مگر اُن سے چند حیرت انگیز نتائج حاصل ہوتے ہیں۔

(نوٹ۔ اس تمام مضمون میں اکثر جگہ الفاظ "آخری ہندسہ" استعمال کیے گئے ہیں۔ اس سے مراد وہ ہندسہ ہے جو کسی عدد کے تمام ہندسوں کو برابر جمع کرتے چلے جانے کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ مثلاً ایک عدد ہے ۷۴۳۸۶ اس کا آخری ہندسہ '۱' ہے۔

کیونکہ ۷۴۳۸۶ = ۷ + ۳ + ۴ + ۸ + ۶ = ۲۸

۲۸ = ۸ + ۲ = ۱۰

۱۰ = ۰ + ۱ = ۱ (آخری ہندسہ)

یہ مضمون عجائبات اعداد ۹ و ۱۰ سے شروع کیا جاتا ہے

۱۔ ابتدائی ہندسے ایک سے ۹ تک اگر جمع کیے جائیں تو ۴۵ جواب ہوتا ہے۔ اور ان دونوں ہندسوں کا مجموعہ ۹ ہے۔

۱ + ۲ + ۳ + ۴ + ۵ + ۶ + ۷ + ۸ + ۹ = ۴۵ اور ۴ + ۵ = ۹

۱۱ سے ۱۹ تک اعداد کا مجموعہ ۱۳۵ ہے اور ۱ + ۳ + ۵ = ۹

۲۱ سے ۲۹ تک اعداد کا مجموعہ ۲۲۵ ہے اور ۲ + ۲ + ۵ = ۹

اسی طرح جہاں تک جی میں آئے برابر عمل کرتے چلے جائیے، جواب ہمیشہ ۹ ہوگا۔

اس اجمال کی تفصیل ذیل میں ملاحظہ فرمائیں

مجموعہ	۱ تا ۹ = ۴۵	۵ + ۴ = ۹	
	۱۱ تا ۱۹ = ۱۳۵	۵ + ۳-۱ = ۹	
	۲۱ تا ۲۹ = ۲۲۵	۵ + ۲ + ۲ = ۹	
	۳۱ تا ۳۹ = ۳۱۵	۵ + ۱ + ۳ = ۹	
	۴۱ تا ۴۹ = ۴۰۵	۵ + ۰ + ۴ = ۹	
	۵۱ تا ۵۹ = ۴۹۵	۵ + ۹ + ۴ = ۱۸	۸ + ۱ = ۹
	۶۱ تا ۶۹ = ۵۸۵	۵ + ۸ + ۵ = ۱۸	۸ + ۱ = ۹
	۷۱ تا ۷۹ = ۶۷۵	۵ + ۷ + ۶ = ۱۸	۸ + ۱ = ۹
	۸۱ تا ۸۹ = ۷۶۵	۵ + ۶ + ۷ = ۱۸	۸ + ۱ = ۹
	۹۱ تا ۹۹ = ۸۵۵	۵ + ۵ + ۸ = ۱۸	۸ + ۱ = ۹

۲۔ ابھی تو ۱ سے ۹ تک ہندسے آپ نے جمع کیے تھے اب دس بھی شامل کر دیجیے تو اور بھی عجیب نتائج برآمد ہوں گے۔

مجموعہ	۱ تا ۱۰ = ۵۵	۵ + ۵ = ۱۰
	۱۱ تا ۲۰ = ۱۵۵	۵ + ۵ + ۱ = ۱۱
	۲۱ تا ۳۰ = ۲۵۵	۵ + ۵ + ۲ = ۱۲
	۳۱ تا ۴۰ = ۳۵۵	۵ + ۵ + ۳ = ۱۳
	....	
	۹۱ تا ۱۰۰ ۹۵۵	۵ + ۵ + ۹ = ۱۹

غور سے معلوم ہوگا کہ ہر عمل کے نتیجہ میں التزام کے ساتھ ایک کا اضافہ ہو جاتا ہے

اب کچھ تفریق کے اعمال ملاحظہ فرمائیے۔

۳۔ ایسا عدد لیجیے جس میں آخر کا ہندسہ اکائی کے ہندسہ سے بڑا ہو، تاکہ جب اس عدد کو اُلٹ کے لکھیے تو پہلے عدد سے تفریق ممکن ہو۔

ایسا عدد لے کے اُسے پلٹ دیجیے اور ایک کو دوسرے میں سے تفریق کر دیجیے۔ حاصل تفریق

یا تو ۹ ہوگا یا کوئی ایسا عدد جو نوٗ سے پورا تقسیم ہو جائے۔ فرض کیجیے کہ یہ عدد ۳۷۱ ہے جسکا آخر کا ہندسہ ۳، اکائی کے ہندسہ ایک سے بڑا ہے۔ اسے پلٹ دیا تو ۱۷۳ ہوا۔ اب اسے ۳۷۱ سے منہا کر سکتے ہیں۔

۵۸۴۱۲ − ۲۱۴۸۵ = ۳۶۹۲۷ = ۲۷ = ۹

۹۸۳۴ − ۴۳۸۹ = ۵۴۴۵ = ۱۸ = ۹

۳۷۱ − ۱۷۳ = ۱۹۸ = ۸ + ۹ + ۱ = ۱۸ = ۹

۴۔ اس عمل کی ایک عجیب خصوصیت یہ ہے کہ اگر عدد اختیار کردہ کے ہندسے طاق ہوں یعنی ۳ ہوں یا ۵ یا ۷ یا ۹ تو حاصل تفریق کا درمیانی ہندسہ ۹ ہوگا یا صفر۔

۸۷۵۱۷۲۵ − ۵۲۷۱۵۷۸ = ۳۴۸۰۱۴۷

۶۹۳۱۲ − ۲۱۳۹۶ = ۴۷۹۱۶

۸۲۲۴۵ − ۵۴۲۲۸ = ۲۸۰۱۷

اب تفریق کے اس سے بھی عجیب تر اعمال ملاحظہ فرمائیے

۵۔ کوئی دو ہندسوں والا عدد لیجیے جس میں بائیں طرف والا ہندسہ داہنی طرف والے ہندسے سے بڑا ہو۔ اسکو پلٹ دیجیے اور ایک کو دوسرے میں منہا کر دیجیے۔ پھر پلٹ دیجیے اور اگر منہا ہو سکے تو منہا کر دیجیے ورنہ دونوں کو جمع کیجیے۔ ہمیشہ جواب ۹۹ ہوگا۔

۶۴ − ۴۶ = ۱۸؛ ۱۸ + ۸۱ = ۹۹

۸۵ − ۵۸ = ۲۷؛ ۲۷ + ۷۲ = ۹۹

۹۱ − ۱۹ = ۷۲؛ ۷۲ − ۲۷ = ۴۵؛ ۴۵ + ۵۴ = ۹۹

۶۔ یہ عمل اسی طرح تین ہندسوں والے عدد میں بھی کیا جا سکتا ہے لیکن جواب ہمیشہ ۱۰۸۹ ہوگا۔

۸۷۵ − ۵۷۸ = ۲۹۷؛ ۲۹۷ + ۷۹۲ = ۱۰۸۹

۹۱۲ − ۲۱۹ = ۶۹۳؛ ۶۹۳ − ۳۹۶ = ۲۹۷؛ ۲۹۷ + ۷۹۲ = ۱۰۸۹

۸۳۲ − ۲۳۸ = ۵۹۴؛ ۵۹۴ + ۴۹۵ = ۱۰۸۹

۷- اگر چار ہندسوں والا عدد ہو تو جواب ہمیشہ ۹۹۹۹ یا ۱۰۸۹۰ ہوگا

۹۳۱۲	۹۲۴۷	۹۹۱۱
۲۱۳۹	۷۴۲۹	۱۱۹۹
۷۱۷۳	۱۸۱۸	۸۷۱۲
۳۷۱۷	۸۱۸۱	۲۱۷۸
۱۰۸۹۰	۹۹۹۹	۶۵۳۴
		۴۳۵۶
		۲۱۷۸
		۸۷۱۲
		۱۰۸۹۰

۸- اگر پانچ ہندسے ہوں تو جواب ہمیشہ ۹۹۰۹۹ ہوگا یا ۱۰۹۸۹۰

۹۱۹۷۱	۸۳۳۶۵	۹۸۷۶۵
۱۷۹۱۹	۵۶۳۳۸	۵۶۷۸۹
۷۴۰۵۲	۲۷۰۲۷	۴۱۹۷۶
۲۵۰۴۷	۷۲۰۷۲	۶۷۹۱۴
۴۹۰۰۵	۹۹۰۹۹	۱۰۹۸۹۰
۵۰۰۹۴		
۹۹۰۹۹		

اب کچھ ضرب کے اعمال پیش کیے جاتے ہیں

۹- کوئی بھی عدد ہو اگر اسے ۹ سے ضرب دیجیے تو حاصل ضرب کے اعداد کا مجموعہ ہمیشہ ۹ ہوگا:-

۹ = ۷ + ۲   ۷۲ = ۹ × ۸

۹ = ۱ + ۰ + ۸   ۱۰۸ = ۹ × ۱۲

۹ = ۱ × ۲ + ۸۱ + ۵   ۱۲۱۵ = ۹ × ۱۳۵

۹ = ۱ + ۸   ۱۸ = ۲ + ۱ + ۷ + ۵ + ۳   ۲۱۷۵۳ = ۹ × ۲۴۱۷

۱۰- مندرجۂ بالا حاصل ضرب میں اگر ۱۰ کا اضافہ کردیجیے تو ہندسوں کا مجموعہ ۱۰ ہو جائے گا

۱۰ = ۸ + ۲   ۸۲ = ۱۰ + ۷۲

۱۰ = ۱+۱+۸
۱۰ =   ۱۱۸ = ۱۰ + ۱۰۸

۱۰ = ۱+۲+۲+۵   ۱۲۲۵ = ۱۰ + ۱۲۱۵

۱۰ = ۱ × ۹   ۱۹ = ۲ + ۱ + ۷ + ۶ + ۳   ۲۱۷۶۳ = ۱۰ + ۲۱۷۵۳

۱۱۔ اگر ایک کو ۹ سے ضرب دیجیے اور حاصل ضرب کو پھر ۹ سے ضرب دیجیے اور اس حاصل ضرب کو بھی ۹ سے ضرب دیجیے۔ اور جہاں تک جی میں آئے ضرب دیتے جائیے۔ ہمیشہ اعداد کا مجموعہ ۹ ہوگا۔

	۹ =	۹ = ۹ × ۱
	۹ = ۸ + ۱	۸۱ = ۹ × ۹
۹ = ۱ + ۸	۱۸ = ۷+۲+۹	۷۲۹ = ۹ × ۸۱
۹ = ۱ + ۸	۱۸ = ۶+۵+۶+۱	۶۵۶۱ = ۹ × ۷۲۹
۹ = ۲ + ۷	= ۵+۹+۰+۴+۹	۵۹۰۴۹ = ۹ × ۶۵۶۱

۱۲۔ اگر ۹ کو ۹ میں ضرب دیجیے اور حاصل ضرب کو ۹ سے ایک عدد کم میں، اور اس حاصل ضرب کو ۹ سے دو عدد کم میں، اور اسی طرح ہر بار میں ایک عدد کم کرتے جائیں، ان صورتوں میں بھی ہر حاصل ضرب کا مجموعہ ۹ ہوگا۔

۹ =	۸۱ = ۹ × ۹
۹ = ۱ + ۸	= ۶۴۸ = ۸ × ۸۱
۹ = ۱ + ۸	۱۸ = ۴۵۳۶ = ۷ × ۶۴۸
۹ = ۱ + ۸	۱۸ = ۲۷۲۱۶ = ۶ × ۴۵۳۶

و علیٰ ہذا القیاس تا ایک

اسی طرح کی اور مثالیں ملاحظہ فرمائیے

۱۳۔ کسی عدد کو چاہے وہ کتنا ہی بڑا عدد ہو ۹ سے ضرب دیجیے اور حاصل ضرب کو ۸ سے اور اس حاصل ضرب کو ۷ سے، اسی طرح برابر ایک تک۔ ہر حالت میں حاصل ضرب کے ہندسوں کا مجموعہ ۹ ہوگا یا ایسا عدد جو ۹ سے پورا تقسیم ہو جائے

۲۵۶۰۳۲	۳۶۵۷۶	۴۵۷۲	۵۰۸
۶	۷	۸	۹
۹ = ۲۷ = ۱۵۳۶۱۹۲	۹ = ۱۸ = ۲۵۶۰۳۲	۹ = ۲۷ = ۳۶۵۷۶	۴۵۷۲

۱۴۔ اگر کسی عدد کو ۹ سے ضرب دیجیے اور پھر ۱۰ سے اور پھر ۱۱ سے اور پھر ۱۲ سے جہاں تک جی میں آئے، نتیجہ وہی ۹ ہوگا

۵۰۱۹۳۰	۴۵۶۳۰	۴۵۶۳	۵۰۷
۱۲	۱۱	۱۰	۹
۹ = ۱۸ = ۶۰۲۳۱۶۰	۹ = ۱۸ = ۵۰۱۹۳۰	۹ = ۱۸ = ۴۵۶۳۰	۴۵۶۳

۱۵- اس سے بھی عجیب تر یہ ہے کہ اگر کسی عدد کو ۹ سے ضرب دیجیے اور حاصل ضرب کا مربع کیجیے اور اس مربع کا مربع کیجیے جہاں تک جی میں آئے، ہمیشہ جواب کے ہندسوں کا مجموعہ ۹ ہوگا۔

۹ × ۵ = ۴۵

۴۵ × ۴۵ = ۲۰۲۵ = ۹

۲۰۲۵ × ۲۰۲۵ = ۴۱۰۰۶۲۵ = ۱۸ = ۹

۱۶- اگر کسی عدد کو ۹ سے ضرب دیجیے اور حاصل ضرب کو مکعب کیجیے اور ہر جواب کو مکعب کرتے جائیے۔ جواب وہی ۹ ہوگا۔

۹ × ۵ = ۴۵

۹ = ۱۸ = ۹۱۱۲۵ = ۴۵ × ۴۵ × ۴۵

۱۷- ایک سے ۹ تک ہندسوں کو ۹ سے ضرب دیجیے۔ جواب میں ۹ دفعہ ایک کا ہندسہ اور ایک صفر ہوگا اور ان ہندسوں کا مجموعہ ۹ ہے

۱۲۳۴۵۶۷۸۹ × ۹

۹ = ۱۱۱۱۱۱۱۱۰۱

۱۸- ۹ سے ایک تک ہندسوں کو ۹ سے ضرب دیجیے جواب میں ۹ بار ۸ کا ہندسہ اور ایک بار ۹ ہوگا اور حاصل ضرب کے سب ہندسوں کا مجموعہ ۹

۹۸۷۶۵۴۳۲۱ × ۹

۹ = ۸۱ = ۸۸۸۸۸۸۸۸۸۹

۱۹- ۹ کو ایک، اور دو کے ہندسوں سے ضرب دیجیے پھر ایک اور دو اور تین سے اور پھر ۱، ۲، ۳، اور ۴ سے اسی طرح سے ایک ایک ہندسہ بڑھاتے ہوئے ۹ تک چلے جائیے ہر حاصل ضرب کا مجموعہ ۹ ہوگا۔

۹ = ۹ × ۱

۹ = ۱۰۸ = ۹ × ۱۲

۹ = ۱۱۰۷ = ۹ × ۱۲۳

۹ = ۱۱۱۰۶ = ۹ × ۱۲۳۴

۲۰- علیٰ ہذا القیاس ۹ کو ۹ سے ضرب دیجیے پھر ۹ کو ۱ اور ۹ سے۔ پھر ۷، ۸ اور ۹ سے ضرب دیجیے۔ اسی طرح ایک ایک ہندسہ بڑھاتے ہوئے ایک تک چلے جائیں۔ ہر حاصل ضرب کا مجموعہ ۹ ہوگا

۹ = ۸۱ ۹ × ۹

۹ = ۱۸ = ۸۸۲ = ۹ × ۹۸

۹ = ۲۷ = ۸۸۸۳ = ۹ × ۹۸۷

۹ = ۳۶ = ۸۸۸۸۴ = ۹ × ۹۸۷۶

پہلی مثال میں حاصل ضرب کی اکائی کا ہندسہ ۹، ۸، ۷ اور ۶ ہے اور اسی طرح ۱ تک چلا جائے گا اور دوسری مثال میں اکائی کا ہندسہ ۱، ۲، ۳ اور ۴ ہے اور اسی طرح ۹ تک چلا جائے گا

۲۱- ۹ کا پہاڑا لکھیے تو ۲ سے ۵ تک ہندسوں کو ۹ سے ضرب دینے میں جو ہندسے حاصل ہوئے ہیں ۶ سے ۹ تک وہی ہندسے ہونگے مگر معکوس یعنی بائیں طرف والا ہندسہ داہنی طرف آگیا ہوگا۔

۹ × ۹ = ۸۱	۱۸ = ۲ × ۹
۹ × ۸ = ۷۲	۲۷ = ۳ × ۹
۹ × ۷ = ۶۳	۳۶ = ۴ × ۹
۹ × ۶ = ۵۴	۴۵ = ۵ × ۹

۲۲- ۹ سے ایک تک کے ہندسوں کو ۹ سے اور ۶ اور ۳ سے الگ الگ ضرب دیجئے اور حاصل ضرب میں تین تین ہندسوں کے ٹکڑے کر دیجئے۔ ہر سہ حاصل ضرب میں ۲ ٹکڑے یکساں ہوں گے اور تیسرا مختلف

۱ ،۱۱۱ ،۱۱۱ ۱۰۱ =	۱۲۳۴۵۶۷۸۹	× ۹
۷۴۰ ۷۴۰ ۷۳۴ =	ایضاً	× ۶
۳۷۰ ۳۷۰ ۳۶۷ =	ایضاً	× ۳

۹ کے ہندسہ میں جب اسقدر ظاہری کرامات ہیں تو پرانے زمانے کے بھولے لوگ اگر اس بات کے قائل ہو گئے کہ اس میں کچھ مخفی اثرات بھی ہیں تو کیا وہ قابل معافی نہیں ہیں۔

غزل جناب جوہر چاندوڑی

سلسلۂ عشق کس سے پاتا ہے — آہ کیا بے وفا زمانا ہے
ڈگمگانے لگے ابھی سے قدم — کوئے جاناں میں ہم کو جانا ہے
موت آئی عدم کو جاتے ہیں — اُن سے ملنے کا تو بہانا ہے
مجھ کو پامال کرکے کہتے ہیں — تیری عزت ہمیں بڑھانا ہے
نام دیر و حرم کا ہے لیکن — دل مومن ترا ٹھکانا ہے
برق کو اس سے کیوں ہے جوہر لاگ — چار تنکوں کا آشیانا ہے (۳۴۴)

کچھ کا کچھ

(جناب مسٹر سراج احمد صاحب علوی قانی بی اے)

(افراد تمثیل)

یوسف - انگلینڈ سے واپس آنیوالا طالب علم
مرزا ہمایوں :- یوسف کا باپ
مرزا فیروز :- یوسف کا خسر
نوشابہ :- یوسف کی بی بی
دردانہ بیگم نوشابہ کی ساس

ریحانہ بیگم :- نوشابہ کی ماں
غنی، حامد :- مرزا ہمایوں کے نوکر
تمیزا :- دردانہ بیگم کی ملازمہ
کریا ریحانہ بیگم کی ملازمہ
جائے وقوع :- ایک شہر

(ایک ایکٹ)

پہلا منظر

(نوشابہ کا میکہ - ریحانہ بیگم بیٹھی ہوئی پان بنا رہی ہیں کریا ہانپتی ہوئی دروازے سے داخل ہوتی ہے)

(چلا کر) ارے بیگم صاحب غضب ہوگیا!

کیوں، خیر تو ہے! (بیگم کا ہاتھ رک جاتا ہے)

کریا :- ہائے کیونکر کہوں بڑے غضب کی بات ہے۔

بیگم (جھنجلا کر) یا اللہ توبہ - کچھ کہیگی بھی!

کریا - اے بی بی میرے تو منہ سے نہیں نکلتی۔

بیگم - تو تو مجھے سر کٹن بنا دیگی آخر کچھ معلوم تو ہو ابھی اچھی خاصی بازار گئی تھی - اتنی دیر میں کیا آفت نازل ہوگئی۔

کریا (سانس درست کرتے ہوے) میں ابھی ابھی بازار سے سودا سلف لیکے آ رہی تھی کہ بٹیا کی سسرال کا آدمی غنی ملا - میں نے اس سے پوچھا کہ یوسف بھیا کب آ رہے ہیں - ہائے بی بی! اسکا جواب سننے سے پیشتر زمین کیوں نہ پھٹ گئی کہ میں سما جاتی - ہائے اللہ! ہائے میری بٹیا! تیری تقدیر!

بیگم - (گھبرا کے) خدا کے لیے پوری بات تو بتا،

کریا - اسنے کہا کہ یوسف بھیا! ہائے میں تمھیں ایسا نہ سمجھتی تھی۔

بیگم - پھر بکنے لگی

کریا - ہاں تو یوسف بھیا اگلی جمعرات کو آئینگے۔ اور اپنے ہمراہ ایک کرسٹان بی بی لائینگے۔ خدا موئی کو غارت کرے!

"آیں یوسف انگلینڈ سے بی بی لا رہا ہے۔ آہ میری نوشابہ!

"جتنی بی بی اور بنیے اس کے دو بچے بھی

بھی ہیں ..... اور ..... اور تار آیا ہے کہ انھوں
نے نوشابہ بٹیا کو طلاق دیدی اور یہ بھی حکم دیا ہے
کہ انکے آنے سے پیشتر وہ اپنے گھر چلی جائیں۔
"ارے تو کیا بک رہی ہے اور میں سُن
کیا رہی ہوں؟ یا میرے اللہ یہ اُس یوسف کا
ذکر ہے جسے میں اتنا بھولا سمجھتی تھی، کیا یہ سچ ہے؟
کریا! تجھے کس نے بہکایا۔"
"بی بی، مجھ پر کھڑے کھڑے قد بجلی گرے جو میں
جھوٹ کہتی ہوں۔ غنی نے یہی کہا ہے۔"
"ارے میرے اللہ! ہائے میری نوشابہ!
تیرے دل پر کیا گزری ہوگی! ارے ذرا نوشابہ کے
ابا کو تو بلانا باہر سے ... کوئی ہے ......!!
(پکارتی ہے)
(ایک چھوکری باہر جاتی ہے۔ تھوڑی دیر
میں مرزا فیروز تشریف لاتے ہیں۔ بی بی کا چہرہ
اُترا ہوا دیکھ کر کہتے ہیں)
"کیوں خیریت تو ہے۔ اس وقت تم نے
کیسے بُلایا۔ طبیعت تو اچھی ہے؟"
"آپ نے کچھ سُنا یہ کریا کیا خبر لائی ہے؟"
"کیسی خبر، کس کے متعلق؟"
(جھلا کر) آپ کے سعادت مند داماد کے متعلق!
آپ اسے بڑا نیک، سعادت مند اور خوش اطوار
سمجھتے تھے۔"
"کیوں کیا ہوا؟ ابھی تو شاید وہ آیا بھی
نہیں، کل مرزا ہمایوں کہہ رہے تھے کہ اگلے ہفتے کو
آ جائے گا۔
"جی ہاں آئے چاہے بھاڑ میں جائے
میری جوتی کی نوک سے۔ میری بیٹی کی زندگی
تو اُس نے خراب کی۔ وہ تو کہیں کی نہ رہی۔"
"معاملہ کیا ہے۔ کچھ معلوم تو ہو۔ ناحق اُس پر
غصہ کیوں ہو رہی ہو"
"اے اُس مُوے سے آپ کو۔ یا سرکار
جو اُس کی طرفداری کر رہے ہیں۔"
(بات کاٹ کر) "میری سمجھ میں یہ معمہ نہیں آتا۔"
"کونسی خوشی کی بات ہے جو کہوں۔ ہائے
میری بچی اب تو کیا کرے گی! میں تو یہ سمجھتی تھی کہ
یوسف بڑا نیک ہے۔ اگر جانتی ہوتی کہ آئندہ
جا کر یہ گل کھلائے گا تو ہرگز ہرگز نہ جانے دیتی۔"
"تو کیا مجھے اسی لیے بلایا ہے کہ بے تکی
ہانکے چلی جاؤ۔ سمجھ سے کام لو۔ کچھ بتاؤ تو سہی
کہ آخر معاملہ کیا ہے۔"
"بتاؤں کیا، ابھی ابھی کریا یہ خبر لائی ہے
کہ یوسف کا تار آیا ہے اور وہ ایک کرسٹان بی بی
بچوں کے ہمراہ آ رہا ہے اور اس نے نوشابہ کو
طلاق دیدی ہے، اسکی صورت پر نظر ڈالنا نہیں
چاہتا۔ لہذا اسکے آنے سے پیشتر نوشابہ میکے
چلی جائے۔ سُن لیا یا ابھی اور کچھ باقی ہے!"
(ٹھہر کر) "کریا کو یہ خبر کہاں سے معلوم ہوئی؟"
"بازار میں، مرزا کے نوکر سے۔"
"ممکن ہے کہ نوکر نے جھوٹ کہہ دیا ہو"

"نوکر کو جھوٹ بولنے کی وجہ۔ اُس نے یہ بھی تو کہا کہ نوشابہ کا شاید اسباب آنے کے لیے تیار ہو رہا ہے"

"اول تو مجھے اس خبر کی صحت ہی میں کلام ہے اس لیے کہ میں یوسف کی طبیعت سے واقف ہوں، دوسرے اُس کی شادی اُس کی رضامندی سے ہوئی تھی، زبردستی نہیں ہوئی تھی (تیوریوں پر بل ڈال کر) لیکن اگر اس خبر میں اصلیت ہے تو میں ابھی جاتا ہوں اصل معاملہ دریافت کر کے میاں یوسف کے سب ہتکھنڈے بھلائے دیتا ہوں، طلاق دینا آسان نہیں ہے کسی شریف کی آبرو ریزی ہنسی کھیل نہیں۔ ابھی نوشابہ کے مہر کا دعویٰ ٹھونک دیتا ہوں۔ صاحبزادے جہاز سے اُترتے ہی پولیس کی حراست میں ہوں گے۔ بچوں کی تعلیم کا ماہوار خرچ کا الگ دعویٰ ہوگا۔ ۲۰ ہزار روپیہ دینا ہنسی کھیل نہیں ہے۔ سب انجر پنجر ڈھیلے ہو جائیں گے۔ تم گھبراؤ نہیں میں ابھی آتا ہوں" (کھڑے ہو جاتے ہیں)

"تو میں بھی چلوں گی۔ اگر یہ خبر صحیح ہے تو اپنے ہمراہ نوشابہ کو لیتی آؤں گی۔ اب تو میں ایک منٹ اس گھر میں اسکے رکھنے کی روادار نہیں"

"اچھا تو میں فٹن کی تیاری کا حکم دیتا ہوں اتنی دیر میں کپڑے پہن لوں"

"اچھا میں بھی ذرا کپڑے درست کر لوں"

(دونوں جاتے ہیں)

دوسرا منظر

(مرزا ہمایوں کا گھر:- باہر کا کمرہ - ہمایوں مرزا بیٹھے حقہ پی رہے ہیں)

ایک فٹن آکر رکتی ہے [ریحانہ بیگم پردہ کرا کر زنانہ میں داخل ہوتی ہیں] نوکر، مرزا فیروز کے آنے کی خبر کرتا ہے اور مرزا صاحب استقبال کے لیے آگے بڑھتے ہیں۔

مرزا ہمایوں:- اخاہ مرزا صاحب السلام علیکم۔ تشریف رکھیے۔ (کرسی بڑھاتے ہیں)

"وعلیکم السلام" (مرزا بیٹھ جاتے ہیں)

"کہیے اس وقت کیسے تشریف لائے اور سمدھن صاحبہ بھی تشریف لائی ہیں، آپ کچھ پریشان نظر آتے ہیں"

"جی ہاں وہ کچھ آئی ہیں۔ بات ہی ایسی ہے"

"کیسی بات؟ سب خیریت تو ہے"

(جھلا کر) :- آپ تجاہل عارفانہ فرما رہے ہیں"

(تعجب سے) "واللہ مجھے نہیں معلوم کہ آپ کیا فرما رہے ہیں۔ میں کل شام کو گاؤں چلا گیا تھا کوئی دو گھنٹے ہوئے واپس آیا ہوں"

"تو اسکے معنی یہ ہیں جو خبر میں نے سُنی ہے وہ غلط ہے"

(حیرت سے) "کون خبر؟ جلد فرمائیے مجھے حیرت ہو رہی ہے"

"یہی کہ یوسف کا تار آیا ہے اور انھوں نے نوشابہ کو طلاق دیدی ہے اور ایک میم کو جو تین برس سے

ان کی بیوی ہے اپنے ہمراہ لا رہے ہیں اور اسکے روادار نہیں کہ نوشابہ انکے پہونچنے پر گھر میں ملے۔"

(ہکا بکا ہوکر) "یہ میں کیا سُن رہا ہوں۔ جناب مرزا صاحب آپ کو سہو ہوا۔ یوسف کا تار ضرور آیا تھا جس کا میں نے آپ سے ذکر کیا تھا مگر یہ لغو خبر کس نے اُڑائی۔ کیا آپ یقین کر سکتے ہیں کہ اس قسم کی خدانخواستہ کوئی بات ہوتی اور اس کا ذکر آپ سے نہ کیا جاتا اور پھر اُس ناشدنی کو میں گھر میں آنے کی اجازت دیتا"

"خدا کا شکر ہے کہ میرا خیال صحیح نکلا اور یہ خبر غلط ہے"

"اور آپ نے سُنا کس سے ؟"

"آپ کی سمدھن صاحبہ سے۔"

"ایں، سمدھن صاحبہ سے ! انھیں کس نے بہکا دیا۔ بیچاری مفت میں پریشان ہوئی ہونگی"

"انھیں یہ خبر کریما نے دی اور وہ اس وقت سے تمام گھر سر پر اٹھائے ہوئے ہیں۔ میں نے اُنکو سمجھایا کہ اس خبر میں ذرا بھی اصلیت نہیں ہے کریما یوں ہی بکتی ہے، مگر انکو اطمینان نہ ہوا آخر میں نے کہا چلو مرزا صاحب کے یہاں چلے چلیں، بچے کو بھی دیکھ لیں گے اور خبر کی اصلیت بھی معلوم ہو جائے گی۔"

"خوب ! آخر کریما کچھ بتاتی ہے کہ اُس نے کس سے یہ خبر سُنی۔"

"غنی سے، بازار کسی کام سے گئی تھی راستے میں غنی مل گیا اسی نے شاید یہ خبر سنائی اور وہ بلبلائی ہوئی گھر پہونچی۔"

"میں ابھی غنی کو بلاتا ہوں، اُسے یہ کیا بیہودگی سوجھی اور اس سے اُسکا مقصد کیا تھا (غصے سے) اگر صحیح بتایا تو خیر ورنہ اُسکی خیر نہیں" (بڑھکر گھنٹی بجاتے ہیں)

"جی حضور !......" (حامد نوکر داخل ہوتا ہے)

"غنی موجود ہے ؟"

"جی حضور"

"اُسے فوراً یہاں بُلاؤ......" (نوکر آداب کرکے چلا جاتا ہے چند منٹ میں دونوں واپس آتے ہیں)

"غنی !"

"جی حضور"

(حامد سے) "تم جاؤ"

"غنی تم بازار گئے تھے ؟"

"جی حضور"

"راستہ میں تمہیں کریما ملی تھی ؟"

"جی حضور"

"تم نے اُس سے کیا باتیں کیں ؟"

" (منہ کا رنگ فق ہو جاتا ہے) حضور کچھ نہیں"

" (غصے سے) جھوٹ بولتا ہے مردود ! تو نے یوسف کے متعلق اُس سے کیا کہا تھا ؟"

(ڈر کر) حضور یہی کہا تھا کہ یوسف میاں جمعرات کو آئیں گے"

"بس اور کچھ نہیں کہا تھا ؟ ٹھیک بتا ورنہ

(ہنس کر ہاتھ میں لیکر) بدت کی خیر نہیں"

"حضور یہ بھی کہا تھا کہ وہ اپنے ہمراہ اپنی میم صاحبہ کو بھی لا رہے ہیں اور اُنکے بچے بھی ہیں"

"اور کچھ؟"

"حضور اتنا اور کہنے کا گنہگار ہوں کہ چھوٹی سرکار کو اللہ خوش رکھے۔ کہیں یوسف میاں انھیں چھوڑ نہ دیں"

"بس اور کچھ"

"حضور اس سے آگے ایک لفظ کہنے کا گنہگار ہوں تو جو سزا چاہیں حضور دیں"

"ہوں! اچھا تم کو یہ باتیں کیسے معلوم ہوئیں؟"

"حضور صبح کو تمیزاً ڈیوڑھی پر کام سے آئی تھی اُسی نے یہ خبر سنائی تھی"

"اچھا تم جاؤ اور آئندہ سے احتیاط رکھو کہ گھر کی بات ادھر اُدھر مت کہو ورنہ بُری طرح خبر لی جائے گی۔

"بہت اچھا حضور" (جاتا ہے)

"(مرزا فیروز کی طرف مڑکر) سنا آپ نے اب تو آپ کو یقین ہو گیا کہ یہ افواہ کس طرح پھیلی۔ اب آئیے گھر میں چلیں دیکھیں تمیزاً کیا کہتی ہے"

"مجھے خود یقین تھا کہ اس خبر میں اصلیت کا شائبہ نہیں مگر بیگم زبردستی کھینچ لائیں"

(ہنس کر) "چلیے ان سے بھی معذرت کرونگا اس لیے کہ غلطی میرے نوکر نے کی ہے"

(دونوں مرزا گھر میں داخل ہوتے ہیں اور زنانے مکان کی طرف جاتے ہیں)

تیسرا منظر

(سب لوگ انکے استقبال کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں)

مرزا ہمایوں (سمدھن سے) بیٹھیے بیٹھیے میں بہت شرمندہ ہوں کہ آپ کو ناحق تکلیف اُٹھانا پڑی"

ریحانہ بیگم۔ مجھے افسوس ہے اور ندامت کہ میں نے آپ لوگوں کے متعلق سوءِظن سے کام لیا"

"مگر آپ کا کیا قصور، آپ حق بجانب ہیں"

دردانہ بیگم۔ (میاں سے مخاطب ہوکر) اور کچھ سنا آپ نے یہ بِس کس کا بویا ہوا ہے۔ آپ کی چہیتی بی تمیزاً کا؟"

"جی ہاں"

"میں یہ کہتا ہوں اس کو کیا سوجھی کہ اس دروغ بیانی سے اس نے کام لیا"

"میں سمدھن سے سب کچھ سُن چکی ہوں۔ میرے خیال میں تمیزاً زیادہ قصوروار نہیں ہے"

"یہ کیسے؟ ابھی تو تم اُسے بِس بونے والی بتا رہی تھیں؟"

"بیشک لتراپن اُسی نے کیا مگر زیادہ گنہگار نہیں ہے"

"آخر اس نے غنی سے کیا کہا تھا؟"

"وہ تو یہ کہتی ہے کہ اس نے غنی سے صرف اتنا کہا تھا کہ یوسف میاں آئندہ جمعرات کو آئینگے شاید کوئی میمن لانے والے ہیں۔ بیگم میں اور میاں میں کچھ گفتگو اسکے متعلق ہو رہی تھی"

ہمایوں مرزا۔ (زور سے) استغفراللہ یہ تمام طوفان اسی مذاق کا نتیجہ تھا"

دردانہ بیگم "جی ہاں اور ایسا مذاق کیجیے کہ سمدھن ڈنڈا لیکر چڑھ دوڑیں"

ریحانہ بیگم۔ بہن معاف کرنا خبر ہی کچھ اس نوعیت کی تھی کہ میں آپے میں نہ رہی۔ مجھے خود شرمندگی ہے"

دردانہ بیگم۔ "تو بہن میں تو مذاق کر رہی تھی"

ہمایوں مرزا۔ (سمدھن سے) آپ نے وہ مذاق بھی سنا جسکا یہ حشر ہوا؟"

"جی نہیں"

"کل صبح کو بیگم نے پوچھا کہ آج کون دن ہے؟ میں نے کہا دوشنبہ کہنے لگیں پرسوں میرا یوسف آجائے گا" میں نے کہا تم کو خوشی تو بہت ہے اور جو وہ ایک بہن لے آئے تو کیا کروگی۔ وہ بولیں "نوج۔ تم ایسی بدشگونی کی باتیں منہ سے نہ نکالا کرو۔ اللہ رکھے اس کی بی بی موجود ہے بچے موجود ہیں وہ سوتن کیوں لانے لگا"

میں یہ سن کر ہنستا ہوا باہر چلا گیا۔ یہ ہے بنیاد سارے افسانے کی"

ریحانہ بیگم "لاحول ولا قوۃ کیسی غلط فہمی ہوئی (ٹھہر کر) میں تکلیف دہی کی معافی چاہتی ہوں"

"آئیے چلیں"

مرزا فیروز "بہت خوب، چلو"

مرزا ہمایوں (نوشابہ کی طرف دیکھ کر جو چپ چاپ بیٹھی یہ تماشہ دیکھ رہی تھی۔ اور مرزا سے مخاطب ہوکر) "دولھن اپنے دل میں کہہ رہی ہوگی کہ واہ سب نے مل کر میرے میاں کو جھوٹ موٹ ملعون کیا۔ لہذا ہم سب کو دلھن سے معافی مانگنا چاہیے"

سب۔ بیشک بیشک۔ قہقہہ .....

....

دلھن نے شرما کر سر جھکا لیا

(ریحانہ بیگم اور مرزا فیروز دروازہ کی طرف جاتے ہیں)

(پردہ)

غزل

(جناب شیخ محمد عبدالعزیز صاحب عزیز فاضل پوری)

مجھے کہنا پڑا ناقص اگرچہ ماہ کامل ہے
ذرا صورت تو دیکھو، میرے ہوش سے مقابل ہے

صد افسوس اے دل "شکر وہ برہم ہو کے یوں بولا
کہ کیسا ہے، دیا کس کو، لیا کس نے، کہاں دل ہے

تڑپتا چھوڑ کر مجھکو چلے جانا نہیں ممکن
جو تیرا نام قاتل ہے تو میرا نام بسمل ہے

محبت سے نہیں واقف جو دل رکھتا ہے پہلو میں
خبر اسکو ہے دل کے کھوئے جانے کی جو بیدل ہے

نہ ہرجائی زمانے میں کوئی ہوگا مرے دل سا
ابھی تھا میرے پہلو میں ابھی یہ آپ کا دل ہے

شرارت میں، صندوں میں، شوخیوں میں ہے ترا ہمسر
مرا دل اے ستمگر ہر طرح سے تیرے قابل ہے

عکس بر عکس

(جناب مسٹر محمد ابراہیم خاں صاحب)

آخرکار ریل کی لائن بنتے بنتے ہمارے قصبہ تک آ گئی۔

ہمارا قصبہ ایک ایسے حصۂ ملک میں واقع ہوا تھا جہاں سے قریب ترین ریلوے اسٹیشن پچاس میل کے فاصلہ پر تھا، قصبہ کے لوگ زیادہ تر کاشتکار یا کاروباری آدمی تھے، سوائے معدودے چند نوکری پیشہ اشخاص اور تاجروں کے جن کو اپنے کاروبار کی وجہ سے باہر جانا پڑتا تھا، قصبہ کی آبادی کے ایک کثیر حصہ نے صرف ریل کا نام ہی نام سُنا تھا۔ اسی لیے جب ہمارے قصبہ کے قریب سے ایک ریلوے لائن کے نکلنے کا فیصلہ ہوا تو قصبہ کے لوگ بڑے شوق سے انتظار کرنے لگے مگر اُن کا یہ شوق جلد پورا نہ ہوا۔ انجنیئر آئے اور زمین کی پیمائش کرکے چلے گئے، ٹھیکیدار آئے اور زمین پر داغ بیل ڈال کر چلے گئے، اسی تگ و دو میں دس سال کا عرصہ گزر گیا۔

وہ دن جبکہ ریل کی لائن بنتے بنتے یہاں تک آ گئی ہمارے قصبہ کی تاریخ میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے، اُس روز جو خوشی ہر بڑے اور بچے کے چہرہ سے ظاہر ہو رہی تھی جب تک آپ نے دیکھی نہ ہو اُس کا اندازہ کر ہی نہیں سکتے۔ قصبہ کے لوگوں کا یہ حال تھا کہ صبح ہوئی اور لائن پر جا پہونچے اب کوئی کھڑا کوئی بیٹھا مزدوروں کو مختلف کام کرتے ہوئے دیکھ رہا ہے اور کوئی بلا ضرورت اِدھر اُدھر گشت لگا رہا ہے۔ لوہے کا مختلف قسم کا سامان اور سلیپروں کے انبار قصبہ والوں کے لیے ایک عجب دلچسپی کا سامان بن گئے تھے۔ گھنٹوں لوگ ان کو دیکھتے رہتے اور اپنی اپنی سمجھ کے مطابق رائے زنی بھی کرتے۔ لوگوں کا کھانا پینا چھوٹ گیا تھا، زراعت اور دوکانداری کے کاموں سے غفلت برتی جانے لگی تھی۔

آخرکار دنیا کے قاعدہ کے مطابق لوگوں کی دلچسپی کم ہونی شروع ہوئی اور اب سوائے مجھ جیسے بیکار لوگوں کے کوئی اُس طرف کا رُخ بھی نہ کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ کھیت لہلہانے لگے اور دوکانوں کی رونق بڑھ گئی، لائن اب بڑھکر آگے چلی گئی تھی۔

جس مقام پر ہمارے قصبہ کے لیے اسٹیشن بنا تھا اُسکے قریب ابھی تک سلیپروں کا ایک انبار پڑا ہوا تھا، بیچ میں سڑک تھی اور اُس طرف راجہ صاحب کا ایک عالیشان مکان معہ ایک مختصر باغیچہ کے واقع تھا۔ یہ راجہ صاحب اس مقام سے کوئی بارہ میل کے فاصلہ پر رہتے تھے۔

مجھے یاد نہیں کہ میں نے اس مکان کو کبھی آباد دیکھا ہو، جب دیکھا مقفل ہی دیکھا، مگر اب چند روز سے یہ مکان آباد تھا جسکا پتہ اسی امر سے چلتا تھا کہ اسکی بالائی منزل کی کھڑکی سے کبھی کبھی رات کو روشنی نظر آتی تھی۔

میرا روزانہ معمول ہوگیا تھا کہ شام کو ایک آدھ گھنٹہ ان سلیپروں کے انبار پر بیٹھ کر ہوا کھاتا تھا۔ میں اکثر دیکھتا کہ شام کو اُس مکان کا دروازہ کھلتا اور اُس میں سے ایک ملازم وضع شخص نکل کر پہلے تو دہلیز پر کھڑا ہوتا اور پھر تیزی سے سڑک پار کرکے سلیپروں کے انبار تک آتا، وہاں کچھ دیر کھڑا رہتا اور پھر مکان میں داخل ہوکر دروازہ اندر سے بند کرلیتا، مجھے قدرتی طور پر اُس شخص سے بات چیت کرنے اور اُس مکین کے حالات معلوم کرنے کا شوق تھا۔ مگر سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ایک بالکل اجنبی شخص سے کس طرح راہ و رسم پیدا کی جائے۔ آخر ایک روز ہمت کرکے میں نے اپنے سگرٹ کیس سے ایک سگرٹ نکال کر اُس اجنبی کے سامنے پیش کی۔ اُس نے کوئی مزاحمت نہ کی اور شکریہ ادا کرکے سگرٹ لیکر پینے لگا۔ رفتہ رفتہ بیگانیت دور ہونے لگی اور معمولی سی گفتگو بھی ہونے لگی۔ ایک روز میں نے اُس سے اُسی مکان کے مکین کا حال پوچھ ہی ڈالا۔ وہ کہنے لگا:—

”اس مکان میں ایک رئیس رہتے ہیں جنکا نام یوسف ہے۔ بیچارے بہت بیمار رہتے ہیں۔ وہ اور میں صرف دو آدمی اس مکان میں رہتے ہیں، تمام تیمارداری کا کام اور خورد و نوش کا اہتمام میرے متعلق ہے۔ تقریباً پانچ سال سے میں اُنکے ہمراہ ہوں۔ بیماری نے بیچارے کو گھلا ڈالا ہے، اور مجھے ہر وقت اُنکی حالت غیر ہو جانے کا دھڑکا لگا رہتا ہے' اس لیے گھر سے باہر نکلنے کی فرصت ہی نہیں ملتی“۔

میں نے پوچھا ”یہ رئیس کہاں کے رہنے والے ہیں اور اس دور اُفتادہ غیر معروف مقام پر انکی رہائش اختیار کرنے کا کیا سبب ہے اس ملک میں بڑے بڑے شہر موجود ہیں جہاں انکا علاج بہت اچھی طرح ہو سکتا تھا اور جیسا کہ تم کہتے ہو کہ رئیس ہیں اس لیے خرچ کا سوال تو اُنکے لیے ہو ہی نہیں سکتا“۔

اُس نے جواب دیا ”بات یہ ہے کہ آپ کے قصبہ کے ڈاکٹر موہن ان کے پرانے دوست ہیں اور وہی اُن کا علاج کرتے ہیں۔ قربت کی وجہ سے وہ اپنا دولت پور والا عالیشان مکان چھوڑ کر یہاں آگئے ہیں“۔

میں نے دریافت کیا ”اور اُن کو شکایت کیا ہے“۔

”میں نہیں جانتا۔ بظاہر کوئی علامت بیماری کی نہیں ہے۔ بہرحال پانچ سال سے میں برابر دیکھ رہا ہوں کہ روز بروز گھلتے جا رہے ہیں“ تھوڑے سکوت کے بعد وہ پھر بولا ”اور

میں ایک عجیب بات آپ کو بتاؤں۔ اس مکان بھر میں ایک بھی مُنہ دیکھنے کا آئینہ نہیں ہے۔"

"ایں! ایک بھی آئینہ نہیں۔ یہ چیز تو اب ضروریاتِ زندگی میں داخل ہو گئی ہے اور ایک رئیس کے سامان کا تو یہ ضروری جزو ہونا چاہیے۔"

"بے شک، مگر یہ حالت یہاں پر ہی نہیں ہے بلکہ میں جب ان کے ساتھ دولت پور میں تھا تو وہاں کا بھی کُل انتظام میرے ہی ہاتھ میں تھا۔ مجھے خاص طور پر ہدایت تھی کہ مکان میں کوئی آئینہ نہ رہے، نہ کوئی ملازم اپنے پاس رکھے۔ اس لیے ہر نئے ملازمت کے متلاشی سے پہلی شرط یہ ہوتی تھی کہ وہ آئینہ اپنے پاس نہ رکھے گا۔ مجھے اس حکم کی بجاآوری میں جو جو دقتیں پیش آئی ہیں آپ سے کیا بیان کروں، مرد ملازمین کی نگرانی تو اتنی مشکل نہ تھی، مگر عورتوں کے معاملہ میں بالکل بے بس تھا۔ ان میں جو جتنی بدصورت ہوتی اُتنی ہی آئینہ دیکھنے کی شوقین ہوتی اور اس سے مجھے سخت نفرت تھی۔ میں آپ کو ایک واقعہ سناؤں۔ ایک مرتبہ ایک عورت ملازمت کے لیے آئی۔ آئینہ والی شرط اُسنے فوراً قبول کر لی۔ ابھی اُسے آئے ہوئے تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا کہ میں نے دیکھا کہ وہ پڑھنے کی بڑی شائق ہے جب کام سے اُسے فراغت ہوتی تو کتاب لیکر بیٹھ جاتی۔ میں نے ایسی پڑھنے کی شوقین اب تک کوئی عورت نہ دیکھی تھی مگر ایک روز جو اُسکے پیچھے سے آکر دیکھتا ہوں تو میں نے دیکھا کہ کتاب ہے نہ وتاب صرف دو پٹھوں کے درمیان ایک آئینہ لگا ہوا ہے اور وہ صاحبہ طرح طرح پر اپنا چہرہ بنا بنا کر خود بینی میں مشغول ہیں۔ میرے غصہ کی انتہا نہیں رہی۔ اُسی روز اُس خادمہ کا حساب کر دیا گیا۔ اسی طرح پر ایک روز میرے مالک نے کوئی چیز آتشدان پر رکھی دیکھی اور پیشتر اس کے کہ میں وہاں تک پہونچوں اُنھوں نے دوڑ کر اس کو اُٹھا لیا۔ یہ کوئی چھ انچ لانبا شیشے کا ٹکڑا تھا اور ایک خادمہ کا تھا اُنھوں نے اُس ٹکڑے کو اُٹھا کر دیکھا اور پھر بڑے غصہ سے زمین پر پٹک دیا جسکے ہزاروں ٹکڑے ہو گئے۔ اسی پر انھوں نے بس نہیں کیا بلکہ جوتی کے تلووں سے رگڑ رگڑ کر اسکا سُرمہ بنا دیا۔ آپ ان واقعات کو سن کر تعجب تو ضرور کریں گے مگر میں ان کی حقیقت سے اتنا ہی بے خبر ہوں جتنے کہ آپ۔ یہ نہ خیال کیجیے گا کہ میرے مالک کوئی بدصورت آدمی ہیں، اُنکا شمار خوبصورت ترین لوگوں میں ہو سکتا ہے اور اپنے شہر میں تو اُنکی خوبصورتی کا کوئی مدِمقابل ہے ہی نہیں۔ اُنکی آئینہ سے نفرت کا سبب آج تک سمجھ میں نہ آیا۔"

وہ یہ واقعات بیان کر رہا تھا اور میری حیرت بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

میں نے کہا۔ "پھر بھی تم نے کچھ غور تو کیا ہی ہوگا تمہاری عقل میں بھی کوئی بات آتی ہے یا نہیں۔ واقعات بالکل غیر معمولی ہیں اور نہایت تعجب خیز۔"

"میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ جیسے اکثر رئیسوں کی بعض نہایت عجیب و غریب حرکات ہوتی ہیں، ویسے ہی انکی بھی یہ کوئی حرکت ہے۔"

"ممکن ہے۔ مگر یہ جواب تسلی بخش نہیں"۔

"اچھا آپ کو اگر ایسا ہی شوق ہے تو ابھی ڈاکٹر موہن آتے ہونگے۔ وہ ایک زمانہ سے یوسف صاحب سے واقف ہیں، آپ اُن سے دریافت کیجیے گا۔ ڈاکٹر صاحب بڑے بھلے مانس ہیں جو کچھ اُنکو معلوم ہے وہ آپ کو بتانے سے انکار نہ کریں گے۔"

یہ تجویز واقعی معقول تھی۔ میری ڈاکٹر صاحب سے پہلے سے ملاقات تھی۔ میں اُن کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔ چنانچہ جلد ہی ڈاکٹر صاحب آئے اور مکان میں چلے گئے۔ آدھ گھنٹہ کے بعد جب ڈاکٹر صاحب باہر آئے تو میں مکان کے قریب اُن کا منتظر کھڑا تھا۔ صاحب سلامت کے بعد ڈاکٹر صاحب نے میری وہاں موجودگی کا سبب دریافت کیا تو میں نے وجہ پوری وضاحت سے اُن کے گوش گزار کر دی۔ یہ سن کر وہ ہنسے اور کہنے لگے۔

"اچھا یہ بات ہے، تو آؤ میرے گھر تک چلیے جو کچھ میں جانتا ہوں وہ آپ سے بیان کر دونگا گو زیادہ میں بھی نہیں جانتا۔"

میں نے کہا "آپ نہ جانتے ہونگے تو کون جانے گا۔ آپ یوسف صاحب کے پرانے ملاقاتی ہیں اور پھر انکے معالج بھی۔ آپ سے تو اُن کا کوئی راز پوشیدہ نہ ہونا چاہیے۔"

"یہ درست ہے کہ میری اُنکی ملاقات چھ سات سال سے ہے۔ اور اُسی وقت سے میں اُنکا علاج بھی کر رہا ہوں۔ مگر پھر بھی مجھے یہ کہنا پڑتا ہے کہ میں کچھ زیادہ واقف نہیں۔ بہرحال جب یوسف صاحب سے میری پہلی ملاقات ہوئی ہے اُسوقت سے اتبک جو جو واقعات پیش آئے ہیں وہ بلا کم و کاست آپ سے عرض کیے دیتا ہوں۔ اب جو نتیجہ آپ چاہیں وہ نکال لیں۔"

راستہ ہی میں ڈاکٹر صاحب نے اپنی داستان یوں شروع کی۔

"میری اور یوسف صاحب کی پہلی ملاقات کا واقعہ بھی نہایت دلچسپ ہے۔ کوئی سات سال کا عرصہ ہوا کہ میں اپنی ڈاکٹری تعلیم ختم کر کے سری نگر کے ایک ہوٹل میں مقیم تھا۔ وہاں اور بھی بہت سے سیاح ٹھہرے ہوئے تھے۔ کیونکہ یہ بہار کا موسم تھا اور اس زمانہ میں ہر طرف کے آدمی بغرض سیر و تفریح وہاں جمع ہو جایا کرتے ہیں۔ ایک روز صبح کو میں اپنی میز پر سامنے آئینہ رکھے ہوئے اپنی داڑھی اُسترے سے بنا رہا تھا۔ دونوں کلّے صاف کر چکا تھا صرف ٹھوڑی کا نچلا حصہ باقی تھا جہاں میرا اُسترا

مصروف کار تھا۔ اتنے میں کسی نے دفعتاً پیچھے سے آکر میرے سامنے سے آئینہ اُٹھالیا۔ یہ واقعہ ایسا اچانک پیش آیا کہ حیرت و استعجاب کی حالت میں میری ذراسی ٹھوڑی بھی اُسترے سے کٹ گئی۔ پیچھے مڑکر کیا دیکھتا ہوں کہ ایک اجنبی شخص آئینہ لیے ہوئے غصہ سے دیکھ رہا ہے۔ دیکھتے دیکھتے اُس نے آئینہ زمین پر پٹک دیا۔ اور اُسکے ٹکڑے ٹکڑے کرڈالے۔ غصہ کی حالت میں جو کچھ میرے مُنہ میں آیا میں نے بھی خوب خوب اُس کو بُرا بھلا کہا۔ اور منیجر ہوٹل سے اُس کی شکایت بھی کردی۔ چونکہ آئینہ ہوٹل کی ملکیت تھا اس لیے اُس شخص نے نہایت فراخدلی سے اُس کی قیمت مالکِ ہوٹل کو ادا کردی۔ مجھ سے بہت بہت معذرت چاہی اور اپنی اس حرکت پر بہت کچھ اظہار افسوس کیا۔ اُس نے نہایت عاجزی سے کہا معاف فرمائیے میں سخت نادم ہوں معلوم یہ حرکت مجھ سے کیونکر سرزد ہوئی۔ مجھے یہ الفاظ سن کر اپنی سخت گفتگو پر افسوس بھی ہوا۔ خیر بات گئی گزری ہوگئی۔ آپ سُن کر حیرت کریں گے کہ یہ حرکت کرنے والے صاحب مسٹر یوسف تھے۔ جنکے متعلق آپ اسقدر دلچسپی لے رہے ہیں میں نے بعد میں اس بات پر غور کیا کہ ایسی حرکت کسی شخص سے کیونکر سرزد ہوسکتی ہے اور میں اس نتیجے پر پہونچا کہ ہو نہ ہو یہ بھی کوئی بیماری ہے۔ چونکہ میرا علم ابھی تازہ تازہ تھا اور عملی تجربہ کا محتاج، اس لیے مجھے مناسب معلوم ہوا کہ یوسف صاحب سے راہ و رسم پیدا کرکے اُن سے مزید حالات معلوم کیے جائیں۔ اب اکثر ہوٹل میں یوسف صاحب سے ملاقات ہونے لگی اور میں نے محسوس کیا کہ یوسف صاحب کی اگر یہ حرکت نظرانداز کردی جائے تو وہ بہترین آدمی ہیں۔ اُنکی گفتگو نہایت پسندیدہ اور دلآویز تھی۔ اکثر ہم دونوں گھنٹوں ایک ہی جگہ بیٹھ کر مختلف موضوع پر گفتگو کیا کرتے تھے۔ یہ اول اول کی شناسائی آخر کار گہری دوستی میں تبدیل ہوگئی۔

" اُسی زمانہ میں ہم لوگوں کی طبیعت سری نگر سے سیر ہوچکی تھی اور میں کسی دوسرے مقام پر جانا چاہتا تھا کہ یوسف صاحب نے گلمرگ جانے کا ارادہ ظاہر کیا اور مجھ سے بھی چلنے کے لیے کہا۔ چونکہ کوئی خاص مقام میرے مدنظر نہ تھا اسلیے میں اُنکے ہمراہ جانے پر رضامند ہوگیا دوسرے یہ بھی خیال تھا کہ اُنکے ہمراہ رہنے اور اُن کی بیماری کا مطالعہ کرتے رہنے سے میرے علم میں اور اضافہ ہوگا۔ چنانچہ ہم دونوں گلمرگ پہونچکر ایک ہی ہوٹل میں مقیم ہوئے۔ اتفاق سے اُسوقت وہاں پر آدمیوں کا ہجوم زیادہ نہ تھا۔ دو برابر کے کمرے ہم دونوں کے لیے مخصوص کردیے گئے۔ دونوں کمروں کے درمیان ایک دروازہ تھا جو مقفل تھا۔ رات کو یوسف صاحب سونے کے لیے اپنے کمرے میں چلے گئے اور میں اپنے

کمرے میں آگیا - مگر نہ معلوم کیا بات تھی کہ باوجود تکان کے میں بستر پر کروٹیں لیتا ہی رہا ہرچند چاہا کہ نیند آجائے مگر توبہ کیجیے نیند کا پتہ بھی نہ تھا - اپنے اندر ایک بےچینی سی محسوس کرتا تھا - جب دیر تک نیند نہ آئی تو نہ معلوم کیوں میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ یوسف صاحب والے کمرے میں کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آرہا ہے - یوسف صاحب خطرے میں ہیں اور اُن کی جان کی خیر نہیں - میں سمجھتا تھا کہ یہ خیال محض بے بنیاد ہے اور دماغ کی پراگندگی اس قسم کے خیالات اختراع کر رہی ہے، مگر بےچینی بڑھتی ہی گئی - آخر کار نہ رہا گیا تو میں اپنے کمرے سے نکل کر یوسف صاحب کے کمرے کے دروازہ پر آکھڑا ہوا - پہلے تو آہستہ آہستہ دروازہ کھٹکھٹایا پھر زور زور سے، مگر کوئی جواب نہ ملا - اسکے بعد میں نے دروازہ سے کان لگا کر سننا چاہا شاید یوسف صاحب کے خراٹوں کی آواز کان میں آجائے مگر یہاں بھی ناکامی ہوئی - اب میرا اضطراب اور بھی بڑھنے لگا - آخر کار میں دروازہ زبردستی کھول کر اندر داخل ہوا - یہ ایک بڑا کمرہ تھا جس میں کچھ زیادہ فرنیچر نہ تھا - سامنے دیوار کے قریب ایک پلنگ بچھا ہوا تھا - برابر میں ایک میز لگی ہوئی تھی جس پر صرف ایک موم بتی جل رہی تھی - اس مدھم روشنی میں اول اول تو مجھے کچھ نظر نہ آیا - پھر جب ذرا آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کی عادی ہوئیں تو میں نے دیکھا کہ یوسف صاحب کا بستر خالی ہے اور یوسف صاحب میز کے پاس کھڑے ہوئے ہیں - میں دروازہ سے چل کر اُن کے قریب پہونچ گیا مگر اُن کو مطلق خبر نہ ہوئی - میز پر ایک بڑا سا آئینہ لگا ہوا تھا اور یوسف صاحب ٹکٹکی باندھے آئینہ کو ایک عالم محویت میں دیکھ رہے تھے - میں ذرا اور قریب گیا تو اتفاق سے میرا ہاتھ یوسف صاحب کے شانہ سے مس ہو گیا - اُنھوں نے بغیر نگاہ پھیرے ہوئے میرے ہاتھ کو شانہ سے ہٹا دیا - صرف ذرا سی جنبش اُنکے جسم کو ہوئی اور پھر اُسی طرح خاموش کھڑے ہو گئے - گو اُن کا چہرہ میری طرف نہ تھا مگر انکا عکس آئینہ میں نظر آرہا تھا - میں نے دیکھا کہ اُنکا رنگ زرد ہو گیا ہے اور آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے ہیں اور گال اندر کو دھنس گئے ہیں - صرف ایک رات کے عرصے میں اُنکی حالت میں اتنا تغیر دیکھ کر میری تشویش بڑھنے لگی - میں نے اپنے ڈاکٹری علم سے فائدہ اُٹھانا چاہا - یوسف صاحب کو میں نے زبردستی وہاں سے ہٹا کر پلنگ پر بٹھا دیا، مگر اُن کی نگاہ بدستور آئینہ پر جمی رہی -

میں نے کہا " بھائی یوسف تم کو کیا ہو گیا ہے؟ ذرا بستر پر لیٹ کر سو جاؤ - طبیعت درست ہو جائے گی "

وہ بولے :" الٰہی توبہ " پھر تھوڑے وقفہ کے بعد بولے " تمہیں آئینہ میں کیا نظر آرہا ہے؟"

میں نے جواب دیا "مجھے ایک چہرہ نظر آ رہا ہے جسکا رنگ زرد ہے۔ آنکھوں کے گرد حلقے ہیں اور گال پچکے ہوئے ہیں۔" یہ درحقیقت میں نے خود اُن کا حلیہ بیان کیا تھا۔ یوسف صاحب چونک کر بولے:۔

"کیا کہا؟ پچکے ہوئے گال۔ کیا تم کو بھی وہی نظر آ رہا ہے جو مجھے نظر آتا ہے۔"

میں نے کہا "مجکو تو تمہارا ہی چہرہ نظر آ رہا ہے۔ تم آئینہ میں کیا شکل دیکھتے ہو؟"

"ہمیشہ وہی چہرہ۔ وہی چہرہ —— الٰہی توبہ —— الٰہی توبہ۔"

"آخر کسکا چہرہ۔ کچھ بتاؤ تو" مگر اس کا اُنھوں نے کوئی جواب نہ دیا۔

اب مجھ میں زیادہ صبر کی تاب نہ تھی میں دیکھ رہا تھا کہ کسی سخت بیماری نے یوسف صاحب کی طبیعت پر غلبہ پا لیا ہے اور وہ بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں۔ میرے پاس دواؤں کا ایک سفری بیگ تھا وہ جا کر میں اپنے کمرے سے لے آیا اور خواب آور دوا کی ایک خوراک میں نے ان کو زبردستی پلا دی۔ وہ پی کر یوسف صاحب غافل سو گئے اور میں اپنے کمرے میں چلا آیا۔

دوسرے روز صبح مجھے یہ مناسب معلوم ہوا کہ یوسف صاحب کو میں اُنکے مکان پر پہونچا دوں چنانچہ کشمیر کی سرحد سے نکل کر ہم دونوں دولت پور آ گئے۔ یوسف صاحب نے باصرار چند روز کے لیے مجھے اپنے پاس روک لیا۔ مجھے یاد نہیں کہ یوسف صاحب اُس زمانہ میں کبھی دن میں باہر نکلے ہوں جب باہر نکلتے تو رات کو۔ پھر بھی اگر کسی آئینہ فروش کی دوکان کے سامنے سے گزر ہوتا تو یوسف صاحب کی حالت غیر ہونے لگتی اور انکا رنگ زرد پڑ جاتا۔ میں یوسف صاحب کو چند ادویات کا استعمال کرا رہا تھا جو میں اُنکے لیے ایسی حالت میں مفید سمجھتا تھا اور جسکے لیے مجھے زیادہ اُنکے پاس ٹھہرنے کی ضرورت بھی نہ تھی، دوسرے، گھر سے میری طلبی کے خطوط بھی آ رہے تھے، اسلیے میں نے اپنے قدیم ملازم کو جسے آپ ابھی دیکھ چکے ہیں گھر سے بلا کر یوسف صاحب کے پاس بغرض نگرانی چھوڑا اور ادویات کے متعلق اُسکو ضروری ہدایات دیکر میں یوسف صاحب سے رخصت ہو کر یہاں آ گیا۔

اسکو چند سال گزر گئے میرا ملازم یوسف صاحب ہی کے پاس رہا اور یوسف صاحب کو بھی اُس سے بوجہ اُس کی خدمات کے محبت ہو گئی تھی مگر کچھ روز ہوئے کہ یوسف صاحب کی طبیعت پھر خراب رہنے لگی۔ اور اس خیال سے کہ وہ میرے قریب رہیں اپنے مکان کو چھوڑ کر اس کرایہ کے مکان میں آ کر رہنے لگے۔ میرا ملازم بھی اُنکے ہمراہ یہاں آ گیا اور یہ دونوں اس مکان میں تنہا رہتے ہیں۔ میں روزانہ شام کو یوسف صاحب کی خیریت معلوم کرنے جاتا ہوں

اور جو دوا ضروری سمجھتا ہوں وہ ان کو بھجوا دیتا ہوں "۔

ڈاکٹر صاحب یہاں تک پہونچے تھے کہ اتنے میں کمرے کا دروازہ زور سے کھلا اور وہی ملازم بڑی عجلت سے کمرے میں داخل ہوا۔

ڈاکٹر صاحب اُس سے ہنسکر کہنے لگے "میں ابھی تمھارے مالک کا ان سے تذکرہ کررہا تھا۔ تم اُن سے تو واقف ہو ہی"۔

وہ کہنے لگا "ڈاکٹر صاحب کیسے مالک! جلد چلیے، میں اُنکی حالت غیر چھوڑ آیا ہوں۔ شاید وہ اب تک ختم ہو گئے ہوں"۔

ہم دونوں گھبرا گئے اور ڈاکٹر صاحب مجھے ہمراہ لیکر فوراً چلنے کے لیے تیار ہو گئے۔ جلدی جلدی چل کر ہم اُس مکان پر پہونچے۔ ملازم نے قفل کھولا اور ہم مکان میں داخل ہو کر زینہ کے راستہ بالائی منزل پر پہونچے تو میں نے دیکھا کہ ایک سادہ کمرے میں پلنگ کے اوپر ایک جوان شخص چادر اوڑھے لیٹا ہوا ہے۔ ہمارے قدموں کی آواز سُن کر اُس نے اپنے چہرہ سے چادر ہٹائی اور اُٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ ڈاکٹر صاحب نے اشارہ سے منع کر دیا۔ میں نے دیکھا کہ اُس شخص کا چہرہ بالکل زرد پڑ گیا ہے۔ آنکھوں کے ارد گرد بڑے بڑے حلقے پڑے ہوے ہیں، رخسار اندر کو دبے ہوے ہیں اور اسکا سانس مشکل سے آجا رہا ہے۔ اُس نے پہلے تو ڈاکٹر صاحب کو دیکھا، پھر مجھے دیکھ کر کہنے لگا "یہ کون صاحب ہیں؟ میں ان سے واقف نہیں"۔

ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا "یہ میرے ایک دوست ہیں جو میرے ساتھ چلے آئے ہیں اگر انکی موجودگی آپ کو ناپسند ہو تو ان کو واپس کر دوں"۔

"نہیں نہیں۔ انکو رہنے دیجیے۔ اب میرا آخری وقت قریب آگیا ہے۔ مہربانی فرماکر مجھے ایک آئینہ منگا دیجیے"۔ "یہ میری آخری خواہش ہے"۔

یہ سُن کر میں ڈاکٹر صاحب کا اور ڈاکٹر صاحب میرا مُنہ تکنے لگے۔ مگر ہم تینوں میں سے کسی کی ہمت نہ ہوتی تھی کہ آئینہ لاکر یوسف صاحب کو دے، کیونکہ آئینہ کا جو اثر اُن پر ہوتا تھا اُس سے ہم سب واقف تھے۔ آئینہ لانے کے یہ معنی ہوتے کہ مریض کی زندگی اور مختصر ہو جاتی۔

ہماری یہ حالت دیکھ کر یوسف صاحب بولے "آپ اس قدر پس و پیش کیوں کرتے ہیں۔ یہ میری آخری خواہش ہے۔ اچھا جو راز میں سالہا سال سے اپنے سینے میں پوشیدہ کیے ہوے ہوں آج آپ لوگوں کے سامنے بیان کرتا ہوں، امید ہے کہ اسکے سننے سے آپ کو میری حالت کا پورا پورا اندازہ ہو جائیگا"۔

یہ کہکر وہ کچھ دیر ستانے کی غرض سے خاموش ہو گئے۔ پھر ہر جملہ کے درمیان تھوڑا تھوڑا

وقفہ دے کر اُنھوں نے بیان کرنا شروع کیا"
" غالباً آپ کو یہ نہ معلوم ہوگا کہ میری شادی ہوچکی ہے - یہ واقعہ بمبئی میں پیش آیا - میں اُس وقت بغرض سیر و تفریح وہاں مقیم تھا - اکثر ہوٹل اور تماشاگاہوں میں میں ایک دوشیزہ کو دیکھتا تھا جس کا حُسن حد درجہ جاذب نظر تھا - اور جس کی صورت میرے دل میں کھپ گئی تھی - میں اُس کا نام نہ بتاؤں گا - رفتہ رفتہ میری اُس سے ملاقات ہوگئی - اور پھر یہ ملاقات ایسے تعلقات میں تبدیل ہوگئی کہ آخر کار ہماری دونوں کی شادی ہوگئی اور ہم نہایت خوش و خرم زندگی گزارنے لگے - میری بیوی کو تصویر کشی کا شوق تھا اور اسکے لیے اُس کو ایک رہنما کی ضرورت تھی - میں نے اُسکا یہ شوق دیکھ کر اُسکے خوش کرنے کے لیے ایک مشہور نوجوان مصور کو تصویر کشی کی تعلیم کے لیے ملازم رکھ لیا - اس کو چند ماہ کا عرصہ ہوگیا - مگر مجھے اس کا قطعاً علم نہ تھا کہ یہ مصور صاحب درحقیقت میری بیوی کو کچھ اور ہی تعلیم دے رہے ہیں - میری گنہگار اور بیوفا بیوی نے اپنے حرکات و سکنات سے مجھے شبہ کرنے کا کوئی موقع ہی نہ دیا - مگر میں نے ایک روز اتفاق سے اُن دونوں کو کچھ اس طرح باتیں کرتے ہوئے دیکھا کہ مجھے پہلی مرتبہ اپنی بیوی کے مجرم ہونے کا شبہ ہوا - مجھے ثبوت کی ضرورت تھی اور وہ موجود نہ تھا - کچھ عرصہ کے بعد مجھے ایک خادمہ نے بتایا کہ کس طرح اُسکے ذریعہ میری بیوی اور اُس مصور میں خط وکتابت ہوتی ہے - یہ خادمہ ایک زمانہ میں ان مصور صاحب کی منظور نظر رہ چکی تھی مگر اب وہ اسکو چھوڑ چکا تھا' اور اسی لیے وہ بدلہ لینے کی فکر میں تھی - اُسنے مجھے یہ بھی بتایا کہ اس وقت وہ مصور اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا میری بیوی کو خط لکھ رہا ہے - یہ سُن کر میرے تن بدن میں آگ سی لگ گئی اور میرا جذبۂ انتقام بھڑک اُٹھا - میں اپنے کمرے میں گیا اور بغیر اس احساس کے کہ میں کیا کر رہا ہوں میں نے میز کی دراز سے اپنا ریوالور نکال کر کوٹ کی جیب میں ڈال لیا - جب میں اس مصور کے کمرے میں داخل ہوا ہوں تو وہ میز پر بڑے انہماک کے ساتھ لکھنے میں مشغول تھا - میرے کمرے میں داخل ہونے کی اُسکو مطلق خبر نہ ہوئی - اُسکی پشت میری جانب تھی - میز پر ایک شمع روشن تھی اور وہ میز پر جھکا ہوا لکھنے میں مشغول تھا - میں دبے پاؤں اُسکے پیچھے جا کھڑا ہوا اور دیکھنے لگا کہ وہ کیا لکھ رہا ہے وہ ابھی اتنا ہی لکھنے پایا تھا

" میری جان سے زیادہ پیاری .....

خط میری بیوی کے نام تھا - یہ پڑھ کر مجھے اپنے اوپر قابو نہ رہا اور میں نے فوراً ریوالور نکال کر اُسکی کنپٹی میں گولی ماردی - گولی کھا کر وہ اپنی جگہ سے قدرے اُچھلا' میز پر ایک آئینہ رکھا ہوا تھا - میری نگاہ فوراً اُس پر پڑی تو سامنے میرے عکس کے

اُس میں اُس مصور کا عکس نظر آ رہا تھا۔ وہ تو اُسی وقت ٹھنڈا ہوگیا مگر اسکے بعد سے جب کبھی میری نگاہ کسی آئینہ پر پڑی ہے تو ہمیشہ بجائے میرے عکس کے اُسی کا عکس نظر آیا ہے۔ یہ ہی واقعہ پچھلے سات آٹھ سال سے میری جان کو روگ لگائے ہوئے ہے اور یہ ہی وجہ ہے کہ مجھے آئینہ سے اس قدر نفرت ہوگئی ہے۔ نہ مجھے کوئی بیماری ہے نہ مجھے کوئی فکر ہے۔ صرف اُس مصور کا عکس میرے لیے سوہان روح بنا ہوا ہے۔ زندگی تلخ ہوگئی ہے اور اب تو زندگی ہی چند لمحہ کی باقی ہے۔ مہربانی فرما کر مجھے ایک آئینہ لادو آخری بار میں ایک مرتبہ اور آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھنا چاہتا ہوں"

یہ کہکر وہ خاموش ہوگئے۔ ملازم باہر چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد وہ ایک آئینہ لیے ہوئے کمرے میں داخل ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے وہ آئینہ لیکر مریض کے ہاتھ میں دیدیا۔ یوسف صاحب نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں میں آئینہ لے لیا اور تھوڑی دیر تک بڑے غور سے اُس میں دیکھتے رہے۔ اسی حالت میں اُنکی روح پرواز کرگئی۔ آئینہ اُنکے ہاتھ سے چھوٹ کر پلنگ پر گر پڑا۔ مجھے کچھ باتیں یوسف صاحب سے اُنکی بیوی کے متعلق دریافت کرنا تھیں، مگر وہ دل کی دل ہی میں رہ گئیں۔

یوسف صاحب کے چہرہ پر ایک قسم کا سکون اور طمانیت تھی اور خوف و دہشت کے کوئی آثار نہ تھے۔ اس سے میرا اور ڈاکٹر صاحب کا یہ خیال ہے کہ آخری مرتبہ آئینہ سے اُس مصور کا عکس محو ہو چکا تھا اور یوسف صاحب نے جو کچھ آئینے میں دیکھا وہ خود اُن کا ہی عکس تھا۔

جذباتِ ترمذی

(جناب مولوی سید سراج الحسن ترمذی صاحب وکیل ہائیکورٹ حیدرآباد دکن)

آنسو بہا نہ لاش پہ قاتل قضا کے بعد ہونا تھا جو ہوا ستم ناروا کے بعد
ہاں شرمِ وفا یہ بڑھا اور جور تو ظالم گنہ میں آتی ہے لذت سزا کے بعد
اظہارِ آرزو سے کیا مجھ کو منفعل اک بات تھی سو وہ بھی گئی التجا کے بعد
سرخی افق کی اصل میں خونِ حسینؑ ہے عقدہ کھلا یہ سحر کے کربلا کے بعد
چمکا نصیب رحمتِ ہل من مزید سے کانٹے بھی پھول ہوگئے میری دعا کے بعد

کہتے ہیں موت جسکو وہ جینا ہے ترمذی
ہوتا بشر ہے اصل میں زندہ فنا کے بعد

نامۂ ریاض بنام شفق

(جناب مولانا حسن مرتضیٰ صاحب شفق عمادپوری)

راقم سطور شفق خواجہ آتش حضرت ریاض مرحوم کی نسبت لکھے تو کیا لکھے۔ قطعہ تاریخ وفات میں کہہ چکا ہے

پرانا تھا ساقی وہی ایک باقی ۔۔۔ مرید سخن بزم پیر مغاں میں

پیر مغانِ مینائی کی بزم ایسی خالی نہیں ہوئی تھی جیسی حضرت ریاض کے لب کوثر پہونچتے ہی ہو گئی۔

نہ وہ پینے والے ہیں اب نہ پلانے والے باقی
جو ملے تو تھوڑی پی لوں ترا نام لے کے ساقی

حضرت ریاض کا ایک نامۂ دلنواز جو درج ذیل ہے رنگین مستانہ طرز رقم کے علاوہ اشاعت دیوان کے تاخیر طلب واقعہ سے بھی تعلق رکھتا ہے۔ میرے ناچیز تخلص شفق پر نثر میں جو شاعری کی گئی ہے اور جابجا برجستہ اشعار لکھے گئے ہیں الناظر کے صفحات سے ذوق نظر حاصل کرنے والوں کو "داماں نگہ تنگ گل حسن تو بسیار" کا لطف دیں گے۔

حضرت ریاض نے "گلدستۂ نسیم سحر" کی اشاعت کے زمانے میں میری فرمایش سے ایک غزل بھیجی تھی اور خط میں لکھ دیا تھا، میرے نام کے ساتھ ریاض کے سوا کچھ نہ لکھا جائے مگر میں نے حسب دستور حضرت ریاض لکھ دیا تھا اور چھپی تھی، یہ مدتوں کی بات ہے۔ اس غزل کا ایک شعر یاد آگیا۔ ملاحظہ ہو

"قفس سے ہم چلے بجلی سے بھی تیز ۔۔۔ وہ پہونچی ہم نہ پہونچے آشیاں تک"

اللہ اللہ بجلی سے تیز چلنے پر یہ کہہ دینا کہ وہ پہونچی اور ہم آشیاں تک نہ پہونچے کس غضب کی تیزی ہے۔ سخن فہم ہی اس انداز بیان کا اندازہ کر سکتے ہیں

مقطع کا پہلا مصرعہ یاد نہیں، دوسرا یہ تھا "یہ فن ہے اب اسی جادو بیاں تک" واقعی حضرت ریاض کی خاص جادو بیانی اب کہاں؟ اتنی مدت گزرنے، زمانے کا رنگ سخن بدلنے پر بھی حضرت مرحوم کی جادو بیانی کا اثر اب تک باقی ہے ورنہ اس مے و میخانہ کی یاد میں الناظر یا دوسرے رسالے یوں جام پر جام پیشکش نہ کرتے۔ اچھا اب اس نامۂ گرامی کی سطروں کو دوسرے قلم سے صفحہ کاغذ پر دیکھیے۔ میں کیا خامہ فرسائی کروں۔ خاص ان کے قلم کا نوشتہ

میرے پاس محفوظ ہے
حضرت ریاض نے دیوان کے متعلق مجھے لکھا۔ اُنکے عالم حیات فانی میں نہ باقی کا عہد آگیا خدا جانے دیوان کی اشاعت و طبع کا انتظام کون کرتا ہے چھپنے پایا ہوگیا ہے اور کہاں؟ اس سے میرا اطمینان ہو جاتا تو سمجھتا مرحوم کی یادگار رستا پہونچ گئی۔
شفق عفی عنہ

"کوئی دیکھے تو خوشی غیر کے گھر جانے کی
شام سے پہلے وہ بنکر شفقِ شام چلے"

شفیق نے شفق کا اتنا مشتاق بنا دیا ہے کہ نام اور خیال آتے ہی افقِ شعور پر سرخی آجاتی ہے۔ خدا آپ سے جلد ملائے۔

آج اپنے آقا سر مہاراجہ کے وصال کی تاریخ آپ کو بھیج رہا ہوں۔ ممکن ہے کہ بعض اشعار پسند آئیں۔

کیا آپ میرے دیوان کی طباعت میں میری مشکلیں آسان کر سکتے ہیں۔ اعلیٰ اور کی بیل سے اعلیٰ کاغذ پر طبع کرانا چاہتا ہوں۔ قیمت فی جلد عسہ / اور یہ صرف دوسرا اڈیشن بھی اچھے کاغذ پر ہوگا قیمت غالباً للعہ، تخمیناً، خراجات دو ہزار۔ جو صاحب مصارف طبع برداشت کریں با ضابطہ تحریر کے رُو سے کُل جلدیں اُنکے جب تک روپیہ ادا نہ ہو جائے۔

کیا آپ اس کے متعلق کچھ تجویز فرما سکتے ہیں۔ جز اکل جو صورت پختگی کے چودھری شفیق الزماں صاحب کو مطلع فرما سکتے ہیں۔ بے تکلفانہ خیالات کے اظہار سے مسرت ہوگی۔ میں نے آپ کو بھی تکلیف دی ہے اور جناب حسن امام صاحب کو ہونے کے لحاظ سے۔

"میرے نالے تھے مقاماتِ اثر سے واقف۔ کچھ سوے چرخ گئے کچھ طرفِ جواب دیجیے تو خوش نہ دیجیے تو خوش، یعنی جو دے اُسکا بھی بھلا نہ دے اُس کا بھی
" فقیر مست ہوں اُس بت کی بولی ٹھولی کا لب مسیح بھی ٹکڑا ہے میری "

واضح ہو کہ اس خط میں لفظ شفیق سے چودھری موصوف مراد ہیں اور سر مہاراجہ سے مرحوم والیٔ محمود آباد ... چلے" والے دو شعر خاص حضرت ریاض کے ہیں اور تیسرا شعر "میرے شکوہ" ... کا ہے جو حسب محل مرحوم نے ...

مجھے بہت مسرت ہوتی ہے جب میں آپ کا پختہ کلام دیکھتا ہوں جس سے یقیناً اُستاد کی روح خوش ہوتی ہوگی - والدعا

ریاضؔ خیرآباد اودھ ضلع سیتاپور ۲۰ اگست ۳۱ء

نعرۂ مجذوب

(جناب خواجہ عزیز الحسن غوری صاحب مجذوبؔ بی اے اسسٹنٹ انسپکٹر مدارس)

عیاں حالِ دلِ بے بیاں ہو رہا ہے　　　کہ عاشق سراپا زباں ہو رہا ہے
وہ جلوہ تو ہر سو عیاں ہو رہا ہے　　　حجابِ خودی درمیاں ہو رہا ہے
وہ نامہرباں مہرباں ہو رہا ہے　　　دلِ بدگماں بدگماں ہو رہا ہے
بہار آئی دل شادماں ہو رہا ہے　　　مگر یہ تہِ آسماں ہو رہا ہے
ترا ذکر وردِ زباں ہو رہا ہے　　　یہاں ہو رہا ہے وہاں ہو رہا ہے
گھٹا چھائی ہے کیا سماں ہو رہا ہے　　　فلک پر ہے جوبن جواں ہو رہا ہے
تصور کی دیکھو تو سحر آفرینی　　　کہ مجھ پہ تمھارا گماں ہو رہا ہے
یہ کیوں پڑ رہی ہیں غضبناک نظریں　　　یہ کیا آج اے مہرباں ہو رہا ہے
گھٹا چھا رہی ہے برستی ہے مستی　　　فلک آج پیرِ مغاں ہو رہا ہے
کوئی شاید آنے کو ہے پھر مصیبت　　　دلِ زار پھر شادماں ہو رہا ہے
جوانی ڈھلی مٹ چلے دل کے ارماں　　　بھرا باغ نذرِ خزاں ہو رہا ہے
چڑھی ہے کچھ ایسی کہ تیور تو دیکھو　　　ق　　　جواں آج پیرِ مغاں ہو رہا ہے
دمکتا ہے چہرہ چمکتی ہیں آنکھیں　　　بڑھاپے میں بھی جانِ جاں ہو رہا ہے
نکلنے لگیں تن بدن سے شعاعیں　　　یہ کس مہ کا جلوہ عیاں ہو رہا ہے
ٹپکتی ہے ہر ہر بنِ مو سے مستی　　　سراپا مئے ارغواں ہو رہا ہے
نگاہوں سے بھر دی رگ و پے میں بجلی　　　نظر کردۂ برقِ تپاں ہو رہا ہے
پلا دی ہے باتوں ہی باتوں میں اتنی　　　کہ آنکھوں سے دریا رواں ہو رہا ہے
کوئی کر چلا زندہ در گور مجھ کو　　　عبد اپنے جی جانِ جاں ہو رہا ہے
جبھی کچھ میں کہتا ہوں جب دیکھتا ہوں　　　کہ دل بھی مرا ہمزباں ہو رہا ہے
میں مجذوب ہوں میری باتیں ہیں سچی　　　عبث معترض بدگماں ہو رہا ہے

ماتم عزیز

(مسدس)

(جناب مرزا جعفر علی خاں صاحب اثر بی اے ڈپٹی کلکٹر)

دل حزیں پہ چھری چل گئی یہ سنتے ہی — عزیز اُٹھ گئے دُنیا سے، راہِ جنت لی
یہ مرنے والے کو تم سے اثر محبت تھی — کہ فکر اپنی تھی کچھ اور نہ اپنے بچوں کی
اگرچہ ضعف سے کب گفتگو کا یارا تھا
زباں پہ نام دمِ مرگ بھی تمہارا تھا

جو آرزو تھی تو وہ آرزو تمہاری تھی — جو گفتگو تھی تو وہ گفتگو تمہاری تھی
پلٹتی پتلیوں کو آرزو تمہاری تھی — نہیں تھے، شکل مگر روبرو تمہاری تھی
عزیز اور اقارب سے پھیر لیں آنکھیں
کہا بس "آہ اثر" اور بند کیں آنکھیں[1]

کہاں میں ڈھونڈنے جاؤں تمہیں عزیز عزیز — قدم نہ چھوڑوں جو پاؤں تمہیں عزیز عزیز
خفا ہو؟ آؤ مناؤں تمہیں عزیز عزیز — پھر اپنا حال سناؤں تمہیں عزیز عزیز
اُسی سے کھنچتے ہو عاشق ہو جسکی صورت کے
تمہیں پہ ختم یہ انداز ہیں محبت کے

عزیز تم نہ کبھی ایسے بے مروت تھے — وفا کے پتلے تھے، خوش خُلق و پاک طینت تھے
زمانہ آنکھیں بچھاتا وہ نیک سیرت تھے — قناعت ایسی کہ مرعوب اہلِ ہمت تھے
اثر کو ناز تھا، ہے اُسکا قدرداں تم سا
سلوک ایسا کرے اُس سے مہرباں تم سا

کرو تو یاد کہ آپس میں پینگ کیسے تھے — غلط ہے کیا کہ لڑکپن کے ملنے والے تھے
تمہارے شعروں پہ ہم تبصرہ جو کرتے تھے — ہمارے فہم و ذکاوت کی داد دیتے تھے
اُسی کے ساتھ تعقید تھی شاعری بھی کرو

[1] مرحوم کے انتقال کے وقت میں منصوری میں تھا۔ جناب اشہر کے خط سے اس واقعہ کی اطلاع ہوئی۔ اثر

یہ شغلہ بھی رہے فکرِ روزی کی بھی کرو

غزل کہی لئے اصلاح دے کے چمکایا   مشاعروں میں لیا ساتھ اور پڑھوایا
اُبھار اُبھار کے آخر ہوا دُکھلوایا   تمھارے فیضِ تلمذ سے نام آخر پایا
گلے لگا لو، ادھر دیکھو، دل کو صاف کرو
مری خطا جو ہو تشد وہ معاف کرو

گر ہو تم بھی تو مجبور، بس اجل سے کیا   مٹا کے رکھ دیئے ظالم نے شیوہائے وفا
حیات و مرگ میں وقفہ ہی کتنا؟ دَم بھر کا   اگر کشش ہے محبت میں ہوگا پھر ملنا
تمھاری یاد رہے باقی، کلام باقی ہے
تمھارے نام سے اپنا بھی نام باقی ہے

رموزِ حسن و محبت کا آشنا تھا عزیز   وفا کو ناز تھا جس پر وہ باوفا تھا عزیز
سرشت جس کی صفا تھی وہ باصفا تھا عزیز   غیور و سالکِ سرمنزل رضا تھا عزیز
عزیز کشورِ معنی تھا، فن میں یکتا تھا
"لسانِ ہند" کا اُس کو خطاب پھبتا تھا

خیال و نُطق کی باہم وہ کارفرمائی   ادا کی ندرتیں اور ندرتوں میں گہرائی
وہ چست بندشیں، اسلوب کی وہ رعنائی   کمال آپ محاکات کا تھا شیدائی
ہزار حیف چمن سازِ رنگ و بو نہ رہا
عزیزِ نکتہ سرا فخرِ لکھنؤ نہ رہا

انوکھے طرز کی وہ نغمہ خوانیاں نہ رہیں   چمن کی زیب تھیں جو گُل فشانیاں نہ رہیں
وہ حسن و عشق کی رنگیں کہانیاں نہ رہیں   خطا معاف وہ شیوا بیانیاں نہ رہیں
مناسبت تھی عجب طبع کو سخن کے ساتھ
کہیں جو سادگی بھی تھی تو بانکپن کے ساتھ

کِھلے وہ نازک و دلکش شگوفے، گُل، بوٹے   ستارے جھکے نظارے کو چرخ سے ٹوٹے
نگاہِ اہلِ ہنر نے ہیں وہ مزے لوٹے   محال ہے کہ یہ چسکا چُھڑائے سے چھوٹے
وہ باغباں جو نہیں، "گلکدہ"[1] تو باقی ہے

[1] گلکدہ = مرحوم کا دیوان۔

آثر سے پوچھو کہ وہ دل زدہ تو باقی ہے

سب اہل ذوق افادات کے ہیں سودائی سنا نہیں کہ طبیعت پہ بیخودی چھائی
ہجوم ثابت و سیار ہو تماشائی فلک کے دل میں رہے حسرت جبیں سائی

"صحیفۂ ولا"[1] اُس کا جو آفتاب پڑھے
تو یہ سپہر کی زریں نہ پھر کتاب پڑھے

(قطعہ)

چین آتا نہیں عزیز عزیز جب سے او جھل ہوئے نظر سے تم
میں کروں آہ نارسا کب تک کھینچ لو تیر یہ جگر سے تم
کانپتا ہوں کہ خون حسرت ہے پونچھ دو اشک چشم تر سے تم
تاب و طاقت نہ صبر و ہمت ہے غافل اور مجھ سے نوحہ گر سے تم!
گو یہ سنتا ہوں میرے دیکھنے کو آنکھیں پتھرا گئیں یہ ترسے تم
آرزو دید کی یہاں تک تھی فال لیتے تھے بام و در سے تم
بھائی کہتے زبان سوکھتی تھی دیکھتے بھی اُسی نظر سے تم
شاد مجھ خستہ جاں کو کرتے تھے نامے سے، خیر سے، خبر سے تم
کوئی پُرسا بھی اب نہیں آتا ہو سے مجبور کس کے ڈر سے تم
خلق سے، مہر سے، مروت سے پیش آتے تھے ہر بشر سے تم
یا یہ عالم ہے پاؤں پھیلائے پڑے بے حس ہو کس ہنر سے تم
ہاے غربت پسند آئی ہے یا تو گھبراتے تھے سفر سے تم
اپنی بستی الگ بسائی ہے ایسے بیزار کیوں ہو گھر سے تم
بچے رو رو کے ہوتے ہیں ہلکان اور سوتے ہو بے خبر سے تم
عید اک دن تھا میرا نظارہ آنکھیں پھیرے ہو یا ادھر سے تم
جاؤ اب ہم بھی روٹھے جاتے ہیں مُنہ سے بولو نہ کھیلو سر سے تم

مر گئے تم، عزیز آہ عزیز
لے گئے لطف زیست اثر سے تم

[1] صحیفۂ ولا = مجموعۂ قصائد

قطعہ تاریخ وفات لسان الہند حضرت عزیزؔ مرحوم

جناب حکیم سید علی صاحب آشفتہؔ لکھنوی

سنائیں شومیِ قسمت کی داستاں کس کو
بہارِ چاکِ گریباں اُجاڑ ہے گلشن

کلی کلی کے کلیجے میں پڑ گئے ناسور
رنگے ہوئے ہیں لہو سے گلوں کے پیراہن

نہ بلبلوں کے ترانے نہ قمریوں کی پکار
نہ وہ بہارِ گلستاں نہ وہ شبابِ چمن

جگر سے دجلۂ خوں ریز تا بمژگاں ہے
بنا ہوا ہے دلِ زار غم سے دارِ محن

یہ کون اٹھ گیا سونا بنا کے محفل کو
اُداس سی نظر آتی ہے آج بزمِ سخن

یہ کس کے غم میں سیہ پوشِ لیلیِ شب ہے
کیے ہوئے ہے گریباں کو چاک صبحِ وطن

مگر اجل نے وہ صاحبِ کمال چھین لیا
لسانِ ہند کہ جو تھا عزیزِ مصرِ سخن

اُسی کے غم میں ہے سیلابِ اشکِ خوں جاری
اُسی کے ہجر میں ہیں اہلِ ذوق تر دامن

وہ ذاتِ مرکزِ علم و کمال تھی کل جو
لحد کو آج بنائے ہے مستقل مسکن

ہے تیری شومیِ قسمت کا لکھنؤ رونا
کہاں سے لائے گا اب اس طرح کے ماہرِ فن

کمالِ حسنِ فصاحت بھی تھا بلاغت بھی
ہر اعتبار سے قائم تھا اعتبارِ سخن

مبالغہ نہیں اس میں کہوں جو جو ہر فرد
غلط نہیں ہے بتاؤں اگر میں فخرِ زمن

اُسی کے ذوق کی منت پذیر ہے دُنیا
اُسی کے دم سے بڑھا شعر و شاعری کا چلن

اُسی نے نظم کے قالب میں روح پھونکی تھی
اُسی نے نثر کے دامن کو کر دیا گلشن

اُسی کی طبع میں مضمر جواہراتِ کمال
اُسی کی فکرِ رسا تھی علوم کا مخزن

کیا ہے جانِ متکلم نے بسکہ عہدِ سکوت
خموش شامِ لحد ہے اُداس صبحِ کفن

عزیزِ مصر سے آشفتہ اس کو کیا نسبت
جو ہو عزیزِ شہِ ملکِ علم شعر و سخن

۱۹۳۵ء

آہ! عزیزؔ!

(جناب مرزا محمد جعفر حسین صاحب کوکب عرف پیارے نواب صاحب آف شیش محل)

عزیزؔ سخن سنج و نازک خیال — فقید المثال آسمانِ کمال
شہنشاہ و دارائے اقلیم فن — خدیوِ معانی خدائے سخن
بہ دنیائے شعر و سخن آفتاب — کلامش گُلِ گلشنِ انتخاب
فصاحت بلاغت بہ زیرِ نگیں — بیانش زبانش اثر آفریں
چو طبعِ رواں موجۂ سلسبیل — بہ ہر موج پنہاں چو صد رود نیل
ز طبعش مضامیں رواں فوج فوج — بہ ذہنش معانی رواں موج موج
ز شبدیزِ فکرش صبا پا بہ گِل — ز طبعِ رسا طبعِ عالَم خجل
قیاس از روانیِ او منفعل — ہم اندیشہ از تیزیش مضمحل
بہ عادات سنجیدہٗ و باتمیز — بہ افعال شایستہ ہردل عزیز
بہ اوجِ فلک چوں کمالش رسید — بہ زیرِ زمیں رفت و شد ناپدید
برائے رگِ جاں غمش نیشتر — جگر خوں چوں آب و برآب اثر
رواں دجلۂ خوں ز چشمِ فلک — بپا محشرے از سما تا سمک
نہ سروِ چراغاں لبِ جوئبار — نہ جوشِ بہاراں سرِ مرغزار
نہ در بزم رقصِ پری پیکراں — نہ در عشوہ سرگرمیِ دلبراں
نہ میکش نہ ساقی نہ خُم خانۂ — نہ مطرب نہ محفل نہ جانانۂ
خزاں راہ بادِ بہاراں ببست — بہاراں طلسمِ خزاں را شکست
زمانہ نماند بیک حالتے — تغیر پذیرد بہ ہر ساعتے

بہ یک گردشِ چرخِ نیلوفری
ز نادر بجا ماندنے نادری

…قالِ و ارتحال جناب لسان الہند مرزا محمد ہادی صاحب عزیز مرحوم

جناب فریدون مرزا صاحب مجروح

…ب عصر کا ہنگام آیا گونج اُٹھا شیون و فریاد سے ایوانِ عزیز
…وح تھا پُر حسرت و یاس گرد تھے نوحہ کناں سارے عزیزانِ عزیز
…دل ہل گئے فرطِ غم سے گھر سے روتے ہوئے جب نکلے یتیمانِ عزیز
…و دا یا اولی الابصار کی جمع دروازے پہ جتنے تھے بہی خواہِ عزیز
…سرت کی صدا ہیم تھی بعدِ مُردن نہ ہوا کوئی بھی پرسانِ عزیز
…ہمراہ گئے ناصرِ دیں اے زہے منزلت و جاہ زہے شانِ عزیز
…ے گیا مرزا محمد ہادی ہٹ گیا فرق سے شاگردوں کے دامانِ عزیز
…پہنچے دمِ آخر افسوس سنتے کانوں سے ہم اپنے کوئی فرمانِ عزیز

کلکِ مجروح نے تاریخ کا مصرع یہ لکھا
سنگدل موت نے لوٹی ہے عجب جانِ عزیز

۱۳۵۴ ہجری

دیگر

…ں اے شاعرِ شیریں مقال تیرے مرنے سے ہوا کمزور بابِ شاعری
…کیوں نہ ہو ظلمت کدہ چھپ گیا زیرِ زمیں دُرِ خوشابِ شاعری
…قدرت بھی ہر اک چیز پر برگزیدہ فرد تھا نزدِ جنابِ شاعری
…پر شاہد ہے خود تیرا کلام اے عزیزِ مصرِ مضموں انتخابِ شاعری
…ی آلِ نبی کی عمر بھر فیض پائے حق سے تو اے فیضیابِ شاعری
…یں رُو پوش تو زیرِ زمیں کس طرح برسے گا اب تیرا سحابِ شاعری
…نے فتنہ جو بادِ اجل کر دیے ویران اوراقِ کتابِ شاعری
…بال اوج و رشید و افضل جیسے گھٹ گیا جن کے نہ ہونے سے نصابِ شاعری
…عروج و ناصری رسوا جیسے ان سبھوں کے فیض سے تھی آب و تابِ شاعری

چھٹ گئے وا حسرتا بہار آبرو فصاحت اور شرر　　بانٹتے تھے جو زمانے کو شراب شاعری
ڈھونڈتی ہیں آنکھیں اور کوئی نظر آتا نہیں　　ہو گئے ایسے نہاں یہ ماہتاب شاعری
رہ گئے ہیں دو نقطہ خالق انہیں زندہ رکھے　　اک صفی اک آرزو عزت مآب شاعری
پہونچے تیری روح کو میرا سلام آخری　　اے عزیز من زلیخائے شباب شاعری

سال رحلت خون دل سے یہ لکھا مجروح نے
ہو گیا آنکھوں سے اوجھل آفتاب شاعری

۱۳۵۴ ہجری

قطعۂ تاریخ وفات حضرت عزیز لکھنوی

(جناب حافظ علی صاحب بیکس بلگرامی از محمود آباد)

بزم عالم کی ہیں کیوں آج فضائیں خاموش　　آج افسردہ نظر آتی ہے دنیا کیسی
آج چھایا ہوا عالم میں ہے اک سناٹا　　کیوں نظر آتی ہے ہر چیز میں افسردہ دلی
آج رہ رہ کے امنڈتا ہے مرا دل کیسا　　اشک حسرت مری آنکھوں سے ہیں کیسے جاری
بزم عشرت مری کیوں ہو گئی بزم ماتم　　ہو گئی ہے مرے اللہ یہ حالت کیسی
میں اسی فکر میں تھا حال یہ میرا کیوں ہے　　غیب سے خود مرے کانوں میں یہ آواز آئی
آج تم ہی نہیں دنیا میں پریشاں بیکس　　سارے عالم کی اگر دیکھو تو حالت ہے یہی
ہے سبب اس کا فقط مرگ عزیز دوراں　　ساری دنیا جنہیں کہتی تھی محمدؐ ہادی
آہ جولائی کی انتیس ۲۹ تھی اور رات کا وقت　　بزم دنیا سے ہوئے سوئے عدم وہ راہی
رہ گیا تھام کے دل ہاتھوں سے سارا عالم　　اور منہ تکتی ہوئی رہ گئی دنیا ساری
صبر آخر کیا دنیا نے بھی یہ ہو کر مجبور　　یہ سمجھ کر کہ مشیت تھی خدا کی یوں ہی
صبر لازم ہے تجھے بھی مرے بیکس مغموم　　اب تو للّٰہ نہ کرنا نالہ و آہ و زاری
چاہیے کہنا تجھے مصرعۂ تاریخ وفات　　اور پھر جس میں ہوں سن تیرہ سو چوّن ہجری
میں اسی فکر میں بیٹھا ہی ہوا تھا خاموش　　دفعتاً ہاتف غیبی نے کہا لکھ دے یہی

چل بسے عالم فانی سے اے بیکس افسوس
عزت بزم سخن آہ محمدؐ ہادی

۱۳۵۴ ہجری

قطعہ تاریخ انتقال لسان الہند مرزا محمد ہادی صاحب عزیز مرحوم

جناب واقف لکھنوی

شاہد معراج ہیں جن کے زمین و آسماں — حضرت جبریلؑ جنکے در کے تھے اک پاسباں
وہ محمدؐ ہادیِ دیں اور ائمہ ہیں کہاں — ایک ہیں اُن میں سے باقی وہ بھی آنکھوں سے نہاں
از محمدؐ تا محمدؐ ہادیِ را و خدا — سب کے سب درجہ بدرجہ بادشاہِ دوجہاں
ماہِ کنعاں کا تنزل اور ترقی دیکھیے — از ازل یونہیں چلا آتا ہے دورِ آسماں
کچھ قصائد اور دیوانوں سے چلتا ہے پتا — آج خاقانیؔ و عرفیؔ کا نہیں ملتا نشاں
دہر تو باغِ جہاں میں نام سعدیؔ کا چلا — اب نہ ہے قدرِ گلستاں اور نہ قدرِ بوستاں
مرگئے سوداؔ و ناسخؔ اور میرؔ و مصحفیؔ — ڈھونڈتی پھرتی ہے موت آج اُنکے مرقد ہیں کہاں
تھا عزیزؔ ان کا تخلص اور مرزا تھا لقب — اور محمدؐ ہادی ان کا نام فخرِ شاعراں
اپنے فن میں تھے وہ کامل اور تھے اُستاد بھی — یاد رہ جائیگی اُنکی مثلِ یادِ رفتگاں
روز دوشنبے کا تھا بست و نہم جولائی کی — شام کا تھا وقت دُنیا سے گئے سوے جناں
ہم پہ کیا آشفتہ ہوں محشرؔ ہوں یا احسنؔ صفی — اُنکے مرنے کا اثر لیتا ہے ہر پیر و جواں
قدر ان سب کی کرو نا اہل واقفؔ کیجے سوا — کیا عجب گوشہ نشیں ہو جاے خود اُردو زباں

فکر کی تاریخ کی واقفؔ تو ہاتف نے کہا
کہہ - عزیزِ خلق تھے ایسے عزیزِ دوستاں
۱۹۳۵ع

دیگر

اے غافل نہیں اس دم کا دم بھر بھی بھروسا — قضا ہر ایک کے ہمراہ دامنگیر پھرتی ہے
نہیں کچھ اختیار اپنا جو ہوتا ہے وہی ہوگا — بنائے سے نہیں بنتی ہے جب تقدیر پھرتی ہے
تصور کیجیے پھر معجبہ تاریخ بھی سنیے ؎
اب اُس مرحوم کی آنکھوں تلے تصویر پھرتی ہے
۱۳۵۴ھ

نظرے خوش گزرے

۱۔ یہ پرچہ بھی حیدرآباد میں بیٹھ کر مرتب کیا گیا ہے۔ اگست نمبر میں جیسا کہ اندیشہ ظاہر کیا گیا تھا بہت غلطیاں ہوگئیں۔

میری عدم موجودگی میں برخوردار حافظ محمد داؤد سلمہ اللہ تعالیٰ پرچہ کی طباعت و اشاعت کے نگراں ہیں اور اتفاق سے اگست نمبر کی تیاری کے زمانہ میں وہ علیل ہوگئے تھے۔ امید ہے کہ اب وہ زیادہ توجہ سے کام کرسکیں گے اور اس قدر غلطیاں نہ ہوں گی

۲۔ عزیز مرحوم کے متعلق قطعات تاریخ اور ماتمی نظمیں وصول ہونے لگی ہیں۔ کچھ اسی پرچہ میں درج ہیں اور باقی آیندہ پرچوں میں شایع ہوتی رہیں گی۔ جن احباب کی تاریخیں یا نظمیں اس پرچے میں شامل نہیں ہوسکیں امید ہے کہ سفری زندگی کی معذوریوں اور الناظر کے محدود حجم پر نظر فرماکر معاف فرمائیں گے۔

عزیز کے حالاتِ زندگی، ادبی خدمات، اور کمالاتِ شاعری کے متعلق بھی مضامین کی اشاعت کا انتظام ہو رہا ہے

الناظر نے سالہا سال تک سرکاری اشتہارات کی اشاعت سے اجتناب کیا کسی قسم کی تحریک کرنا تو درکنار جب کبھی ازخود کسی تعلیمی محکمہ یا عدالت نے کوئی اشتہار بھیجا تو اُسے بھی واپس کردیا یا نظرانداز۔ اور یہ اس سبب سے کہ سنہ ۱۹۲۰ء میں مجلس خلافت اور کانگریس نے کونسلوں، عدالتوں اور درس گاہوں کے مقاطعہ کا حکم دیا تھا اور اڈیٹر الناظر ان اداروں سے وابستہ تھا۔

مجلس خلافت نے سنہ ۲۹ء میں ترک موالات کی منسوخی کا اعلان کردیا تھا۔ کانگریس نے ابتک کوئی باضابطہ اعلان نہیں کیا مگر کونسلوں کے متعلق اُس کا رویہ صریحاً تبدیل ہوگیا ہے اور عدالتوں یا درسگاہوں کے بارے میں بھی ممتاز کانگریسی رہنماؤں کی روش بدلی ہوئی نظر آتی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اب ترک و اختیار محض انفرادی پسند و رائے پر منحصر ہے۔

اِن حالات کی بنا پر مہاتما گاندھی سے خط و کتابت کرنے کے بعد ہم نے بھی یہ فیصلہ کیا ہے کہ الناظر سے یہ بندش دُور کردی جائے اور آیندہ محکمہ تعلیم کے اشتہارات یا عدالتوں کے اعلانات شایع کیے جائیں۔

۳۔ ہندستانی اکیڈمی کے قیام کے بہت پیشتر ایک دیرینہ کرم فرمانے جو حکومت کے شریک راز تھے

تفصیلات ظاہر کیے بغیر محض اُردو کی خدمت کے خیال سے اس جدید تنظیم میں شرکت کا وعدہ لے لیا تھا۔ مگر جب اکیڈمی کا ابتدائی خاکہ وصول ہوا جو الناظر میں شایع کر دیا گیا تھا تو مہاتما گاندھی سے مشورہ کرنے کے بعد ہمیں اپنی راے بدلنا پڑی اور اُن کرم فرماؤں کو اپنی معذوری کی اطلاع دیدی گئی۔ گزشتہ سال پھر ایک دوست نے یہ تحریک کرنے کا ارادہ ظاہر کیا کہ اڈیٹر الناظر بحیثیت ایک Co-opted member (رکن اختیاری) کے اکیڈمی میں شریک کیا جائے تو اُن سے عذر کیا گیا لیکن تبدیل شدہ حالات کی بنا پر اس بارے میں ہم بھی اپنی روش بدلنے کا اعلان کر دینا چاہتے ہیں۔

۴۔ حال ہی میں اطلاع ملی ہے کہ ۱۹۲۸ء کے بعد اکتوبر ۱۹۳۵ء میں صوبۂ متحدہ کی مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس منعقد ہونیوالا ہے۔ گویا مسلم لیگ کے عہدہ داروں اور صوبہ کے سیاسی رہنماؤں کے نزدیک مسلسل آٹھ سال تک زمین کی گردش رُکی رہی اور آسمان کا جور موقوف۔

۱۹۲۸ء میں آل پارٹیز کانفرنس کا انعقاد اور نہرو رپورٹ کا ہنگامہ، سائمن کمیشن کی آمد اور آل انڈیا مسلم لیگ کا دو ٹکڑے ہو جانا، ۱۹۲۹ء میں آل انڈیا مسلم کانفرنس کا اجتماع اور گول میز کانفرنس کا اعلان۔ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۴ء تک کی جنگ آزادی اور اس دوران میں سائمن کمیشن کی رپورٹ شایع ہونے کے بعد لندن میں گول میز کانفرنسوں کے جلسے، فرقہ وارانہ نیابت کے متعلق وزیر اعظم کا فیصلہ، مشترکہ پارلیمنٹری کمیٹیوں کی کارروائی، مسودۂ قانون ہند کی اشاعت اور بمبئی، کانپور، اجودھیا اور مرزاپور وغیرہ کے فسادات، سارداایکٹ، حاجیوں کے قانون اور مزارعین و قرضہ جات کے قوانین کی منظوری، قاضیوں کا تقرر اور اوقاف کی نگرانی وغیرہ کے مسائل میں سے کوئی امر اہم ایسا نہ تھا جسکے متعلق صوبہ مسلم لیگ کے ارکین محترم کو تبادلۂ خیال کی ضرورت محسوس ہوتی یا عام مسلمانوں کے حقوق و مفاد کی ترجمانی اور ان کی راے کے منظم مظاہرہ کی حاجت پیش آتی۔ لیگ کے ذمہ دار بزرگوں اور قوم کے محترم رہنماؤں کی دردمندی ملت کا اس سے بہتر اور کیا ثبوت درکار ہے۔

۵۔ ڈاکٹر ضیاءالدین صاحب نے سنا ہے کہ مسلم یونیورسٹی کے طلبا کو ارکان مذہب کی پابندی پر توجہ دلانا شروع کی ہے۔ اگر یہ محض اخباری داعیہ (پروپگینڈا) نہیں ہے تو ڈاکٹر صاحب کی اُن کوششوں کا خیر مقدم کرنا چاہیے۔ بعض جرائد نے ڈاکٹر صاحب کو مشورہ دیا ہے کہ طلبہ سے زائد منتظمین و معلمین کی حالت پر نگاہ رکھیں کہ رہبروں کی گم گشتہ راہی پیرووں کو منزل مقصود پر پہونچنے سے روکتی ہے۔ خدا کرے ڈاکٹر صاحب بھی اس حقیقت کو تسلیم کر لیں اور انکی کوشش سے مسلم یونیورسٹی کا سارا ماحول اس طرح بدل جائے کہ مسلمانوں نے جو توقعات قائم کی تھیں وہ بدرجۂ احسن پوری ہو سکیں۔ آمین

اسی سلسلہ میں بیجا نہ ہوگا اگر آنے والے انتخابات کو پیش نظر رکھ کر اسمبلی، کونسلوں اور بورڈوں کے امیدوار بھی ارکان اسلام کی پابندی کے متعلق اپنا ارادہ یہ خیال اور طریق عمل تبدیل فرمالیں کہ مرزا غالب کے بقول

کافر نتوانی شد ناچار مسلماں شو

تصحیح

(۱) الناظر ماہ جولائی ۱۹۳۵ء میں "دو مرزا" کے صفحہ ۸ سطر ۴ پر جس جگہ یہ عبارت ختم ہوئی ہے کہ "پوری کتاب سے مرزا صاحب کے علم و فہم کا پتہ چل رہا ہے" اسکے بعد یہ عبارت چھوٹ گئی ہے:-

"بہرحال اگر ان سے قطع نظر کر بھی لیا جائے تو بھی بیشتر ایسی ہیں جنھیں بجز مولف اور مصنف کی جانب منسوب کرنے کے اور کوئی چارہ نہیں"

ناظرین کرام اپنے اپنے پرچوں میں اس عبارت کا اضافہ کرلیں اور ہم مولوی اسمعیل احمد صاحب تسنیم مینائی سے اس فروگزاشت کی معافی چاہتے ہیں۔

(۲) الناظر بابت ماہ اگست ۱۹۳۵ء میں صفحہ ۹۶ پر کسی گزشتہ مضمون کا حوالہ دیا گیا تھا، لیکن اُس وقت غلطی سے پرچہ کا نمبر اور سنہ درج نہیں ہوا۔

شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ صاحب کا وہ مضمون الناظر ماہ جنوری ۱۹۱۰ء میں شایع ہوا تھا۔

ناظرین اپنے اپنے پرچہ میں تصحیح کرلیں۔

ارزاں ایڈیشن کے خریداروں کو

ختم میعاد پر وی پی نہیں بھیجا جاتا جب تک وہ خود وی پی طلب نہ فرمائیں۔ بلکہ اُن کی کفایت اور دفتر کو نقصان سے بچانے کے لیے توقع کی جاتی ہے کہ ختم میعاد کی اطلاع پاکر چندہ بذریعہ منی آرڈر ارسال فرمائیں گے۔

مینجر الناظر لکھنؤ

مصائب و آلام گزرے ہیں جتنے خواجہ آتش یا میرؔ پر بیتے تھے، لیکن میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ان دونوں بزرگوں نے جس خودداری اور جس آن بان سے زندگی گزاری اس کی ہوا بھی اگر میرزا یگانہ کو لگ جاتی تو آج مجھے یہ مضمون تحریر کرنے کی ضرورت پیش نہ آئی ہوتی۔ کیا میرزا صاحب کے نزدیک صرف فاقہ کرنا خودداری ہے، صرف ہجو کا جواب نہ دینا خودی ہے، کیا اپنی شان میں قصیدے پر قصیدے لکھنا، اپنی خود پرستی اور خود ستائی میں خطبے کے خطبے پڑھنا، اپنی خودنمائی اور اپنی بڑائی میں قطعات کے قطعات کہنا خودداری ہے، کیا اساتذۂ قدیم و جدید پر اتہامات لگانے کو ان کے ادبی کارناموں کی تنقیص و تذلیل کرنے کو خودداری کہا جا سکتا ہے، کیا اپنے ہمعصروں کی تضحیک کرنے کو خودی سے موسوم کیا جا سکتا ہے، کیا خواجہ آتش نے کبھی بھی شیخ ناسخ کے لیے یہ سلوک روا رکھے تھے، کبھی بھی اُن کی بُرائی کی تھی، کسی وقت بھی اُن پر بہتان لگائے تھے، ایک بار بھی ان کی شہرت اور قابلیت کے خلاف پروپیگنڈا کیا تھا۔ کیا میرؔ نے باوجود سوداؔ کی طرف سے ہجو کہے جانے کے کہیں بھی سوداؔ کو یوں ذلیل کرنے کی کوشش کی تھی، کیا میرؔ نے کسی وقت بھی اساتذہ پر یوں بیجا اعتراضات کیے تھے۔ کیا لکھنؤ والوں نے اقبال کے کلام کی مخالفت میں کوئی دقیقہ اُٹھا رکھا، لیکن کیا کبھی ڈاکٹر اقبال نے بھی اُسی نوع کے جوابات دیے، پھر آج یگانہ اور اقبال کا مقابلہ کر لیجیے، اقبال کو دُنیا میں کون نہیں جانتا اور یگانہ کو کون جانتا ہے،

قسمت بادہ باندازۂ جام ست اینجا

آتش نے زیادہ سے زیادہ کیا تو یہ غزل کہی — سُن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا ——

میر کو بہت بُرا معلوم ہوا تو اُنھوں نے یہ قطعہ پڑھا — کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو ——

کیا میرزا یگانہ نے بھی اسی پر اکتفا کی، اور پھر بھی میرزا مراد بیگ کو دعویٰ ہے کہ میرزا یگانہ نے آتش اور میرؔ سے زیادہ خوددار زندگی بسر کی ہے۔

صفحہ ۲۱۵ پر پھر میرزا مراد صاحب ایک ایسی بات تحریر فرماتے ہیں جس کا نہ اُلٹا سمجھ میں آئے نہ سیدھا، اور وہی بُرانی چال کہ نہ کوئی دلیل ہے نہ کوئی برہان، جو جی میں آیا لکھ دیا۔ فرماتے ہیں:—

"دُنیا میں بہتیری باتیں جس قدر مشہور اور مسلّم ہوتی ہیں اُسی قدر غلط اور بے معنی ہوتی ہیں"

پہلے تو لفظ بہتیری کی فصاحت پر غور کیجیے، پھر غلط اور مسلّم کے اجتماع کی بوالعجبی پر، ان مراحل کے

بعد اب اصل مسئلے کی طرف توجہ منعطف کیجیے کہ وہ منطق کے کن اصولوں کی بنا پر درست ہے، واقعات کے کس سلسلہ کی پشت پناہی پر صحیح ہے، حالات کے کس مجموعہ کی بنا پر قابل وثوق ہے۔ یہ امر مسلم اور مشہور ہے کہ شیکسپیر دنیا کا سب سے بڑا ڈرامہ نگار تھا کیا یہ امر اسی نسبت سے غلط اور بے معنی ہے، یہ کلیہ مسلم اور مشہور ہے کہ زمین میں کشش ارضی ہے، کیا یہ کلیہ غیر صحیح ہے، یہ بات مسلم ہے کہ دھیان چند ہاکی کا سب سے عمدہ کھلاڑی ہے، کیا یہ دعویٰ نادرست ہے، یہ خبریں سب کی سب بہت مشہور اور مسلم ہیں کہ "وکٹوریہ بہت اچھی ملکہ تھی، قلوپطرہ بہت حسین و جمیل عورت تھی، روما کی سلطنت بہت وسیع اور طاقتور تھی، یونان کی تہذیب بہت اعلیٰ اور ارفع تھی، عرب کے باشندے آنحضرتؐ کی بعثت سے قبل بہت وحشی اور غیر مہذب تھے، ہلٹن عدیم المثال سخنگو تھا" ۔ کیا یہ سب اخبار لاطائل اور مہمل ہیں؛ زندگی کے ہر شعبہ سے یہ مثالیں جمع کی گئی ہیں، دنیا کے ہر خطہ سے یہ نظائر پیش کیے گئے ہیں، ان میں سے کسی ایک کو تو میرزا صاحب غلط اور بے معنی ثابت کر دیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ بعض مسلم موعاقیت کے کسی ایک پہلو پر کبھی کمزور ثابت ہوئے ہوں لیکن انکے زد پر اس قسم کا کوئی کلیہ بنانا عدد درجہ نابالغیت کی دلیل ہے۔

ٹیگور اور انکی شاعری کے متعلق یوں تو میرزا صاحب موصوف نے کتاب بھر میں رطب زنی کی ہے اور اسی نوع کی چیلکے وہ عادی معلوم ہوتے ہیں، اس لیے اس سے سروکار رکھنا تضیع اوقات ہوگا مگر دو مقامات پر جو خامہ فرسائی ان کی جانب سے اس موضوع پر عمل میں آئی ہے وہ ایسی نہیں کہ اسے یوں ہی چھوڑ دیا جائے۔

صفحہ ۳۵ و ۵۵ پر رقمطراز ہیں

"ٹیگور کی شاعری تو پھر بھی حقیقت کی جھلک دکھاتی ہے، اسکی شہرت اگرچہ مبالغہ سے خالی نہیں مگر کچھ نہ کچھ بلکہ بہت کچھ وجدانی کیفیت رکھتی ہے" (ذرا اس جملہ کی ساخت ملاحظہ ہو)
"انسان اس پیکر خاکی کے ساتھ ٹیگور کے منتہائے نظر تک پہونچ ہی نہیں سکتا"

اسکا خیال رہے کہ یہ سب میرزا یگانہ کی شاعری کے مقابلہ میں لکھا جا رہا ہے۔ جناب میرزا صاحب کی اس قطرازی کے متعلق میں کوئی تنقید کرنا نہیں چاہتا صرف چند اشعار میرزا یگانہ کے اور چند سطریں ٹیگور کی لکھے دیتا ہوں، ارباب ذوق دنظر خود اندازہ لگالیں گے کہ کس کی شاعری میں زیادہ حقیقت ہے۔ رہا یہ امر کہ ٹیگور کی شہرت مبالغہ سے خالی نہیں، اسکا جواب یہ ہے کہ آجکل شہرت نام ہی مبالغہ کا ہے، پھر ہر وہ شخص جو کسی کے مقابلہ میں بازی نہیں لے جا سکتا ہے جیتنے والے کے لئے یہی کہتا ہے کہ اس کی

خصوصیات کے بیان میں، اسکے محاسن کے تذکرہ میں، اصلیت کی جھلک کم ہے اور لوگ اس کی ستایش میں بہت غلو سے کام لیتے ہیں، یہ انسانی فطرت ہے اور یگانہ ہوں یا شیرازی دونوں اس کمزوری سے بیرا نہیں ہوسکتے۔

یگانہ

اُلٹی تھی مت زمانۂ مردہ پرست کی
میں ایک ہوشیار کہ زندہ ہی گڑ گیا

گوشم از ذوقِ اسیری بزتابد مژدۂ
جانِ ایذا دوست دارد شوقِ زندانے دگر

نا خدا کچھ زورِ طوفاں آزمائی بھی دکھا
فکرِ ساحل چھوڑ لنگر ڈالدے منجدھار میں

نگاہ شوق سے کیا کیا گلوں کا دل دھڑکتا ہے
مبادا رنگ و بو اُڑ جائے پابندِ نظر ہو کر

سنیں گے چھیڑ کے افسانۂ دلِ مرحوم
ادھر سے ملک عدم کا جو کاروان نکلا

چاندنی کی سیر کرتے ہم سے آنکھیں مانگ کر
ہیں کدھر پروانۂ شمعِ شبستانِ بہار

ایسی پلا کہ ساقیا فکر دہو نجات کی
نشہ کہیں اُتر نہ جائے روزِ شمار دیکھ کر

ٹیگور

(۱) میرے مالک میری یہ دعا ہے کہ تو میری تنگنیالی کو قطعاً دور کر، مجھے رنج و راحت مساوی طور پر برداشت کرنیکی قوت عطا کر، مجھے یہ قوت عطا کر کہ میں محبت کے ساتھ دوسروں کی خدمت کر دوں، مجھے یہ قوت دے کہ میں غریبوں کو اپنے سے علٰحدہ نہ سمجھوں اور مغرور اور طاقتور آدمیوں کے سامنے کبھی گردن نہ جھکا دوں مجھے یہ قوت عطا کر کہ میں روزمرہ کی تکالیف سے کبھی متاثر نہ ہوں، مجھے یہ قوت عطا کر کہ میں اپنی طاقت تیری مرضی کے موافق محبت سے کام میں لاؤں" [گیتان جلی، مترجمہ رائے بیجناتھ صفحات ۱۷و۱۸]

(۲) وہ لوگ جو اس دنیا میں مجھ سے محبت کرتے ہیں مجھے قید رکھنے کی ہر طرح کوشش کرتے ہیں، لیکن تیری محبت جو انکی محبت سے بدرجہا ذیادہ ہے دوسرے قسم کی ہے اور مجھے آزاد رکھتی ہے۔ اس خیال سے کہ میں کہیں اُنکو بھول نہ جاؤں وہ مجھے تنہا نہیں چھوڑتے لیکن دن پر دن گزرتے چلے جاتے ہیں اور تو نظر بھی نہیں آتا۔

میں تیرا نام نہیں لیتا ہوں، دل میں تیرا خیال نہیں رکھتا ہوں۔ لیکن باوجود اسکے تیری محبت میری محبت کا انتظار کرتی رہتی ہے۔

(گیتان جلی، مترجمۂ رائے بیجناتھ صـ۳۱)

میں ٹیگور کے کلام سے مزید مثالیں پیش کر سکتا تھا مگر میرزا مراد بیگ (جن کو ان حالات سے باخبر

کرنا میرا اصل مقصد ہے) انگریزی شاعری سے کچھ زیادہ واقف نہیں معلوم ہوتے اس لیے اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔

اب سوال درپیش ہوتا ہے کہ "اس پیکر خاکی کے ساتھ انسان ٹیگور کے منتہائے نظر تک پہونچ سکتا ہے یا نہیں" تو بندہ نواز میرزا امراد صاحب یہ تو فرمائیے کہ اس پیکر خاکی کے ساتھ کس شاعر کے منتہائے نظر تک پہونچنا ممکن ہے یگانہ کے منتہائے نظر تک؟ تو مذکورۂ بالا افکار یگانہ کو غور سے پڑھکر دیکھیے کہ انکے منتہائے نظر کا حصول تو اس مادی اور سفلی دنیا میں ممکن ہے نہ علوی اور روحانی میں۔ شاعر کا منتہائے نظر اکثر خیالی اور ناقابل رسائی ہوتا ہے اور عموماً ہر شاعر کا کچھ نہ کچھ کلام ایسے ہی منتہائے نظر کے فلسفہ کا حامل ہوتا ہے

صفحہ ۱۵۷ پر خامہ فرسا ہیں

"برخلاف اس کے ٹیگور کے ہاں (music of light) ایک بےمعنی استعارہ ہے۔

اس قسم کے بےمعنی استعاروں کی اس کے ہاں بھرمار ہے"

مجھے میرزا امراد بیگ معاف کریں گے اگر میں یہ کہوں کہ ان کی انگریزی کی قابلیت بہت ابتدائی معلوم ہوتی ہے اول تو میں یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ ٹیگور کے یہاں بےمعنی استعارات کی بھرمار ہوتی ہے میرزا صاحب کو شاید استعارات زبان انگریزی کے سمجھنے میں اسی طرح دقت پیش آتی ہے جس طرح قدیم رنگ کے اردو شعرا کو جدید شاعری کی نئی نئی اور اچھوتی تشبیہیں اور استعارات سمجھنے میں آپ اُن میں سے کسی سے پوچھ لیجیے کہ "جلووں کی پریشانی، ردائے نور میں عریانی، نظر کی شعاعوں میں گھرجانا، طشت گردوں میں شفق کا خون ناب ٹپکنا، بحر نیل میں سیم خام کی مچھلی، وغیرہ وغیرہ" کا کیا مطلب ہے اور وہ ان سب کو بےمعنی کہدے گا، بعینہ یہی حال ہمارے میرزا صاحب کا انگریزی میں معلوم ہوتا ہے، مہربان من میرزا صاحب یہ استعارہ نہ صرف یہ کہ مہمل نہیں ہے بلکہ شاعری کی دنیا میں اتنا مکمل استعارہ ہے کہ اس کی لذت صرف ذوق صحیح سے لبریز دلوں کو حاصل ہوسکتی ہے۔ آپ جو کچھ غلطی کر رہے ہیں وہ یہ کہ آپ کے نزدیک نور کی موسیقیت کوئی شے نہیں اور موسیقت آواز سے جدا کوئی چیز نہیں کسی انگریزی لغت میں دیکھ لیجیے آپ کو music (موسیقی) کے معانی harmony کے بھی ملیں گے جسکے لیے صدا لازم نہیں، پھر music کا جرمن مرادف ہے mousika جسکے معنی ہیں ہنر (art) کے اب بھی اگر آپ کی سمجھ میں اس استعارہ کا مطلب نہ آئے تو بس اتنا سمجھ لیجیے کہ موسیقی سے نہ صرف انسان کا سامعہ متاثر ہوتا ہے بلکہ دماغ بھی، جسکے بعد نور کی موسیقی سمجھنے میں کوئی دقت نہ ہونی چاہیئے۔

معذوری اگر مطلب من زود نیابی

میرزا صاحب موصوف کی اس دریدہ دہنی کی آخری مثال میں صفحہ ۱۲۸ سے پیش کرتا ہوں، رقم فرماتے ہیں :-

"میرزا یگانہ خواجہ آتش کے فدائیوں میں ہیں اور غالب کے بھی بڑے معتقد تھے مگر جب انھوں نے دیکھا کہ ان کے حریف جو غالب کے مرتبہ سے قطعاً ناآشنا ہیں جھوٹ موٹ اُسکی تعریفیں کیا کرتے ہیں اور خواہ مخواہ خواجہ آتش پر منہ آیا کرتے ہیں تو پھر مقامی ضرورتوں نے انھیں اس بات پر مجبور کر دیا کہ غالب کی حقیقت بھی واضح کر دی جائے۔"

اس عجیب استدلال کے کیا کہنے، ذوق سلیم سر دھننے لگتا ہے، عقل معاملہ فہم حیران ہو جاتی ہے کہ یا اللہ یہ کونسی منطق ہے، کیا "مقامی ضرورتیں" کبھی بھی اس کو جائز کر سکتی ہے کہ ایک مسلم الثبوت اُستاد اور بے مثال شاعر کی، جسکے کمالات کا تمام مشرق و مغرب معترف اور خود تنقیص کرنے والے صاحب بھی بخیال خویش "معتقد ہیں"، اس طرح تضحیک و تذلیل کی جائے جو کچھ منہ میں آ جائے بھلا بُرا کہہ دیا جائے اُس کی تخئیل اسکے کلام پر طعن کیے جائیں، جس دماغ کو اصول سے ذرا بھی لگاؤ ہے وہ یہ محسوس کرے گا کہ کسی کے معتقد کا حریف اگر اسکے معتقد الیہ کے مرتبہ سے ناشناس ہے اور اسکی جھوٹی تعریفیں کرتا ہے تو اس مرتبہ داں اور جائز اعتقاد رکھنے والے کو کسی طرح زیبا نہیں کہ وہ حریف کے حسد میں معتقد الیہ کا بھی حریف بن جائے اور انسانیت کے دامن پر ہمیشہ کے لیے ایک بدنما داغ لگا دے

بریں عقل و دانش بباید گریست

جس انسان میں ذراسی بھی عقل ہوگی وہ اسکو خوب سمجھ لیگا کہ "خواجہ آتش پر کسی کا منہ آنا" غالب کے کمال پر خاک ڈالنے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتا ہے، اس کی تابندگی کمال سے آنکھیں بند کر لینے کا کوئی استدلال نہیں ہوتا ہے۔

(۵)

پیشتر میں عرض کر چکا ہوں کہ اس کتاب کا ہر مطالعہ کرنے والا بآسانی اس امر کا اندازہ کر لیگا کہ کتاب کی اشاعت کے تین مقصد ہیں۔ ان میں سب سے پہلا اور اہم ترین مقصد ہے "میرزا یگانہ کی ستایش"۔ واقعی اور نفس الامری ستایش نہیں جائز اور واجبی ستایش نہیں، ایسی ستایش جس میں شاعری کوٹ کوٹ کر بھر دی گئی ہو، ایسی ستایش جسے دیکھکر انسان بے اختیار ہنس پڑے، جسے سنکر لامحالہ طبیعت کو تکدر ہو۔ ایک فرانسیسی فلسفی کا قول ہے "بالکل بُرا دنیا میں کوئی شخص نہیں" بالفاظ دیگر ہر شخص میں کوئی نہ کوئی صفت

ضرور ہوتی ہے' اس نقطۂ نظر کے ماتحت ہر شخص کی تھوڑی بہت تعریف، کم و بیش ستائش، ضرور کی جا سکتی ہے' اچھی' صحیح' اور اعتدال سے مطلق غیر متجاوز تعریف کرنے والے تو آج دنیا میں بہت کم ہیں' جو شخص بھی کسی دوسرے کی تعریف کرتا ہے وہ تھوڑے بہت غلو سے ضرور کام لیتا ہے' بالکل یہی حال تنقیص کا ہے۔ غرض تعریف ہو یا تنقیص' بیان حد اعتدال سے کچھ نہ کچھ متجاوز ہو ہی جاتا ہے' لیکن اس تجاوز' اس مبالغہ کی ایک حد ہوتی ہے' جسکے بعد تعریف ہو یا تنقیص محض خوشامد یا بد نفسی رہ جاتی ہے' جو ہر طبیعت پر گراں گزریگی ۔۔ آیاتِ وجدانی میں میرزا یگانہ کی جو تعریف کی گئی ہے' جس ستائش کے مستحق وہ قرار دیے گئے ہیں وہ نہ صرف حد اعتدال سے متجاوز اور غلو سے پُر ہے بلکہ اس درجہ خلاف واقعہ اور غیر مہذب ہے کہ دیکھنے والا تکدر اور تنفس کے علاوہ اپنے دل میں نفرت کا احساس لے کر اُٹھتا ہے

اے شیخ گفتگو تو شریفانہ چاہیے

قبل اسکے کہ میں اپنے اس بیان کی تائید میں کتاب سے نمونے پیش کروں اور اُن سے بحث کیجائے یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں میرزا یگانہ کے کلام کا واجبی حد تک معترف بھی ہوں۔ مسلم بورڈنگ ہاؤس الہ آباد کے ۱۹۲۶ء والے مشاعرہ میں مجھے ان کی زبان سے ان کا کلام سننے کا بھی موقع مل چکا ہے' اور آیاتِ وجدانی کے مطالعہ سے پیشتر میں نے انکا مختصر سا دیوان "نشتر یاس" بھی توجہ سے پڑھا ہے' اور میں اسکا مقر ہوں کہ مجھے نہ صرف عمدہ اور دلکش اشعار اس میں ملے بلکہ میں نے میرزا یگانہ کے اشعار میں اکثر وہ معنویت بھی پائی جو دور حاضرہ کے چند شعرا کے کلام سے مفقود ہے' آیاتِ وجدانی میں بھی جو غزلیں اور اشعار میرزا یگانہ کے مرقوم ہیں اُن میں سے اکثر غزلیں مرصع اور بعض اشعار بلند پایہ اور اُستادانہ ہیں اور کتاب کے اس حصہ سے یہ بھی ٹپکتا ہے کہ انھیں زبان پر خاصہ عبور ہے۔ اُنکے اشعار میں انقلاب انگیزی کا حسن بھی موجود ہے گو بدرجۂ اتم نہیں' اور طنزیات میں بھی انھیں ایک حد تک مہارت ہے مجھ میں عادت ہے کہ جو شعر اچھا دیکھتا ہوں یاد کر لیتا ہوں' میرزا یگانہ کے اکثر اشعار مجھے حفظ یاد ہیں اور اُن کی بابت میرے اعتراف کمال کے جذبہ کا اس سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے

(۱) ہر رات ہوئی صبح کو اک خوابِ فراموش ۔۔۔ دُنیا یہی دنیا ہے تو کیا یاد رہیگی

مذکورہ بالا شعر پر روح وجد کرتی ہے

(۲) عشق کا حسن طلب اک معنیٔ بے لفظ ہے ۔۔۔ کھلکھلی بندھ جائیگی مطلب ادا ہو جائیگا

اس شعر کا میں اس قدر قدر دان ہوں کہ کسی اُستاد کی ہم طرح غزل میں رکھنے کو تیار ہوں۔ لیکن بس'

یہاں میرے اعتراف کی انتہا ہے، اس سے زیادہ بڑھنے کو میں تیار نہیں، میں یہ کہنے پر آمادہ نہیں، کہ میرزا یگانہ، غالب، ٹیگور، شبلی، اور ہومر سے بہتر شاعر ہیں، میں یہ ماننے پر راضی نہیں کہ میرزا یگانہ حافظ، سعدی، نظیری پر فوقیت رکھتے ہیں، میں یہ قبول کرنے پر تیار نہیں کہ میرزا یگانہ میرزا اقبال سے برتر ہیں، ممکن ہے کہ میرا اعتراف اصلیت سے کچھ کم ہو لیکن اگر کم ہے تو وہ کمی اتنی نہیں جتنی میرزا امراد بیگ کے اعتراف میں زیادتی ہے۔

کتاب کے شروع میں میرزا یگانہ کی تصویر ہے، تصویر کے اوپر لکھا ہے،

A man who knows himself [ایک خود شناس شخص]

تصویر کے نیچے لکھا ہے

A living mind of the East [مشرق کا ایک زندۂ جاوید شاعر]

کتاب میرزا یگانہ کی تصنیف ہے اور گو میرزا امراد بیگ معاصرات اور دیباچہ کی حد تک ذمہ دار ہیں لیکن اصل ذمہ داری تمامتر میرزا یگانہ ہی کے سر ہے۔ میرزا امراد دیباچہ میں لاکھ لکھیں کہ خود ستائی ایک تبلیغی فرض ہے، میرزا یگانہ ابتدا میں کتنا ہی چیخیں کہ

خود پرستی کیجیے یا حق پرستی کیجیے آہ کس دن کے لیے ناحق پرستی کیجیے (یگانہ)

لیکن کوئی عقلمند اور سمجھدار آدمی ایسا نہ نکلے گا جو میرزا یگانہ کے اس فعل کو سراہے کہ وہ خود اپنی تصویر کے متعلق وہ الفاظ لکھیں جو اس کتاب میں لکھے گئے ہیں کیا ان جملوں میں نازیبا اور ناجائز تعلی نہیں ہے کیا ان الفاظ سے بے معنی اور بیگانۂ حقیقت خودستائی کی بو نہیں آتی ہے۔

انسانی فطرت ہے اور اس کی مطابقت میں ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ اُسکے ہیرو سے زیادہ لائق و فائق، اسکے ہیرو سے بڑھ کر عالم و فاضل، اسکے ہیرو سے زیادہ ذہین و ذکی دنیا میں کوئی نہیں ہے کہ جس صنف علم سے وہ تعلق رکھتا ہے اُس صنف میں اسکا کوئی ہم عصر اس سے برتر نہیں ہے، اُس کا یہ عقیدہ خواہ غلط ہو یا صحیح، خواہ درست ہو یا نادرست، زیادہ قابل اعتراض نہیں ہے، لیکن اگر کوئی شخص اس کا مدعی ہو کہ ابتدائے آفرینش سے آج تک اس مخصوص شعبۂ علم و کمال میں اس کے ہیرو جیسا آدمی پیدا ہی نہیں ہوا، حالانکہ وہ ہیرو موجودہ تمام معاصرین ہی پر فوقیت پانے کا مستحق نہ ہو تو جو شخص سنے گا اُس کو ناگوار ہو نا ضروری ہے۔ اسی لئے مجھکو میرزا اسے شیرازی سے شکایت ہے کہ انھوں نے بغیر کسی سوچ بچار کے، بلا کسی نسبت و تناسب کے، اغماض و عند، آنکھ بند کرکے، اگلوں پچھلوں، متقدمین و متاخرین، عرب و عجم، یورپ و ایشیا، سب پر میرزا یگانہ کو

ترجیح دیدی - ایسی تعریف کی جسکی نہ کوئی حد ہے نہ انتہا؛ اتنی ستائش کی جس کا نہ آغاز ہے نہ انجام - وہ خوشنما کی جسکا سر ہے نہ پیر' وہ تحسین و آفریں کی جسکی نہ حاجت ہے نہ اہلیت' اور الٰہیات کے دفاتر اس میں بیکار کر دیے' تاج محل کی صنعت کو اس میں نگاہوں سے گرا دیا' نبوت کی سرحدوں سے اس میں ڈانڈا ملا دیا' عقل و سمجھ کے حدود اس میں باطل کر دیے

فریاد از قطا ول مشکیں کمند تو

صفحہ ۳۷ سطر ۱۷

"دردمندانہ جذبات کی ایسی تصویر کھینچی ہے جو کسی مرقع سخن میں نہ ملیگی"

ذرا "کسی مرقع سخن" کے ٹکڑے پر غور کیجیے' یعنی میرزا یگانہ کے شعر کا جواب نہ مشرقی ادب میں ملیگا نہ مغربی لٹریچر میں' نہ ماضی کے شعرا کے یہاں دکھائی دیگا نہ حال کے سخنوروں کے کلام میں - اور یہ سب کس شعر کیلیے

منکر بزنی تا ہم دردِ زیستن تنہا — صبحدم چساں بینم شمع انجمن تنہا

میرزا مراد مدعی ہیں کہ شمع کی بیکسی کا خاکہ کھینچنے میں ایسا شعر کسی اور شاعر کے قلم سے نہیں نکلا' مہربانِ من میرزا صاحب' فارسی' عربی' انگریزی اور لاطینی تو دور ہیں ان میں تو لاکھوں اس سے بہتر نمونے ملیں گے - اردو کے دو شعر اس شاعر کے ملاحظہ فرمائیے جس کی تضحیک و تذلیل میں آپ کو اسقدر غلو ہے

کیا شمع کے نہیں ہیں ہوا خواہ اہلِ بزم — ہو غم ہی جاں گداز تو غمخوار کیا کریں
داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی — اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے (غالب)

صفحہ ۴۲ سطر ۱۴ "اسکے سامنے فلسفۂ الٰہیات کا سارا دفتر باطل نظر آتا ہے" -

مندرجۂ بالا بیان حسب ذیل شعر کے متعلق ہے

ذوق میتواں دانست رنگِ حسنِ نادیدہ — ہست شاہدِ عادل بوے پیرہن تنہا

شعر کی اچھائی میں کوئی شبہہ نہیں' لیکن اس سے یہ استنباط کہ فلسفۂ الٰہیات باطل نظر آتا ہے' کسقدر پوچ ہے - داغ کا شعر ہے

کیونکر اس کی نگہِ ناز سے جینا ہوگا — زہر دے اُسپہ یہ تاکید کہ پینا ہوگا

میں اس کی تعریف میں کہوں کہ اس کے سامنے مسئلہ قضا و قدر کی تمام توضیحات لغو ہیں' یا اسکے مقابلہ میں جبر و اختیار کے تمام اسرار فضول ہیں' تو آخر کس حد تک بجا ہوگا - شعر اچھا ہے اور بہت اچھا - اپنی جگہ پر میرزا یگانہ کے شعر سے بدرجہا بلند ہے' لیکن اسکے لیے یہ کہنا کہ قدرت کے دفاتر باطل نظر آتے ہیں

بنام خدا وند جاں آفریں

الناظر

نمبر ۴ جلد ۴۰ — اکتوبر ۱۹۳۵ء

ریاست بنی اسرائیل

(جناب الحاج منشی امیر احمد علوی صاحب بی اے پنشنر ڈپٹی کلکٹر)

بخت نصر کی غارت گری - بابل کی غلامی - شامیوں کی سفاکی کے بعد بنی اسرائیل کی ارض کنعان میں خود مختار حکومت - قوم کی جانبازی - سرفروشی - اور شوق شہادت کا حیرت انگیز کارنامہ ہے - ایک ہزار برس پہلے طالوت اور داؤدؑ نے اس سرزمین پر سلطنت کا بنیادی پتھر رکھا تھا مگر اُس وقت اطراف و جوانب میں کوئی زبردست منظم قوت موجود نہ تھی - ایران میں طوائف الملوکی تھی - بابل و نینوا عالم طفلی کے خواب راحت میں تھے - یونان بے دست و پا تھا اور مصر میں خانہ جنگی ہو رہی تھی - مگر جس وقت انٹیوکس بادشاہ شام کے مظالم سے عاجز آکر یہود انقابی نے علم آزادی بلند کیا ہر طرف طاقتور حکومتیں حرص و طمع کے دانت نکالے باغیوں کی سرکوبی کے لیے تیار رہتیں -

شمال و مشرق میں سلطان شام سطوت و جبروت سے کوس لمن الملکی بجا رہا تھا - جنوب میں سکندر کے جانشین مصری طالمیوں کا زور شور تھا - مغرب میں رومۃ الکبریٰ کی جمہوری حکومت روز افزوں ترقی کر رہی تھی اور یونان کو مغلوب کر چکی تھی - یہود کا ملجا و ماویٰ مقدس یروشلم

دشمنوں کے تصرف میں تھا حتیٰ کہ عبادت گاہ سلیمانی میں بھی یونانی دیوتاؤں کی خدائی تھی۔ اس عاجزی۔ بےبسی اور نااُمیدی کے احوال میں حصول آزادی کی کوشش اور کامیاب انقلاب کی سعی مشکور یہوداہ مقابی کے صدق و خلوص کی کرامت تھی اور صفحات تواریخ اسکی ہمت۔ شجاعت اور دانشمندانہ قیادت پر جس قدر آفریں ارپیا کیا جائے درست ہے۔ اُس نے خون جگر سے نخل آزادی سیراب کیا اور جان بیچ کر قوم کو ظالموں کے پنجے سے رہائی دلائی۔

اُسکا جانشین یوناتھن مدبری اور حکمت عملی میں برادر بزرگ سے زیادہ کامیاب ہوا۔ دشمنوں سے ہیکل مقدس کی تولیت کا خلعت اور ارض موعود کی حکومت کا تاج وصول کیا

شمعون

مگر یہ سعادت شمعون مقابی کی قسمت میں تھی کہ اُس نے اپنے اولوالعزم بھائیوں کے نصب کردہ باغ کا پھل کھایا اور خودمختاری کا اعلان کرکے سلطنت یہوداہ کا پہلا بادشاہ ہوا

اُس نے رومۃ الکبریٰ سے رشتۂ اتحاد مستحکم کیا۔ اسرائیلی سکہ ملکی نام سے نیز جاری کیا۔ شریعت موسوی کی ترویج کی۔ زراعت وتجارت کو ترقی دی۔ رعایا کی رفاہ و فلاح کی تدابیر میں مصروف رہا۔ قوم پروری اور دادگستری کو اپنا شعار بنایا۔ شہروں کو قلعہ بند کیا۔ سامانِ خوراک میں افزائش کی۔ بادشاہِ شام نے خراج کا مطالبہ کیا تو اپنے لڑکے جان کو فوج کا سپہ سالار بنا کر جنگ کے لیے روانہ کیا اور ۱۳۹ق م میں اشدود کے مقام پر شامیوں کو سخت شکست دی۔ اُس نے فلسطین میں امن قائم کیا اور اُس کی شہرت دنیا میں پھیلی۔ فرزندانِ یعقوب زیتون اور انجیر کے درختوں کے نیچے آرام کرتے اور کوئی انکو ستانے والا نہ تھا ہیکل مقدس کی آرائش وزیبائش میں اضافہ کیا اور بعض بیش بہا ظروف عبادت خانہ کی نذر کیے۔

اُسکے عالی منزلت بھائیوں کو بستر سلامت پر موت نصیب نہ ہوئی۔ شجاع یہوداہ میدان جنگ میں شہید ہوا۔ مدبر یوناتھن فریب سے گرفتار کیا گیا اور قتل ہوا۔ البتہ شمعون اس منزل میں سابقین اولین کا ہمقدم نکلا۔ اگلوں کو دشمنوں نے ہلاک کیا اس کی جان خویش نے لی۔ اسکا داماد حکومت اور ریاست کی ہوس میں سسر کا خون بہانے پر مستعد ہوا۔ شمعون اور اُسکے لڑکوں کو دعوت کے بہانے اپنے گھر بلایا اور فریب سے قتل کر دیا۔ مگر اس بے گناہ خون سے داماد کو کچھ نفع نہ ہوا۔ سسر اور دو سالے مارے گئے لیکن تیسرا ضیافت میں حاضر نہ تھا اور وہی شمعون کا پسر اکبر تھا۔ جلاد اُس کی تلاش کو نکلے مگر وہ اُنکے دام سے بچ کر یروشلم پہنچا اور سلطنت کا کاروبار ہاتھ

جان ہرکینس — میں لیکر جان ہرکینس کے لقب سے یہود کا دوسرا خود مختار بادشاہ ہوا - اندرونی سازشوں کو مٹا کر اور ظالم یہوداؤں کی جاگیر ضبط کر کے آبادی ریاست کے استحکام کی طرف متوجہ ہوا - پہلے بادشاہ شام سے خراج روکا، فوجی امداد کا سبز باغ دکھا کر اتحاد لیا اور اُن سے نصرت و حمایت کا معاہدہ کیا - اُس نے تیس برس شان و شوکت سے حکومت کی اور اُسکا عہد بنی اسرائیل کے لیے تاریخ اقبال اور مرفہ الحالی کا مسلسل جشن تھا - بستر مرگ پر سلطنت کا انتظام اپنی بیوی کے سپرد کیا اور خلف اکبر کو متولی اعظم کا منصب عنایت کر کے سنہ قبل مسیح میں دنیا سے رخصت ہوا -

شاہزادے نے ماں کو قید کر کے فاقوں سے ہلاک کیا اور خود ارسٹی بولس کے لقب سے تخت سلطنت پر جلوہ افروز ہوا - بھائیوں کو اسیر کیا - اعزہ ناراض ہوئے اور رعایا بدظن - سال ہی بھر کے بعد حسرت و اندوہ سے مر گیا اور اُس کا بھائی سکندر مقابی قید خانہ سے نکل کر سلطنت یہود کا چوتھا بادشاہ ہوا -

سکندر مقابی — سکندر بہادر اور جنگجو تھا - سلطنت کا رقبہ وسیع تھا اور اُسکے عہد میں حکومت کے وہ قدیم حدود بحال ہوئے جو حضرت داؤد کے زمانے میں تھے لیکن وہ کینہ پرور اور بدطینت بھی تھا - شراب اُس کی گھٹی میں پڑی تھی اور عورتوں کا مشتاق رہتا تھا - اکابر قوم اُس کے افعال ناپسندیدہ سے بیزار تھے

اُس زمانہ میں بیرونی حملوں اور دشمنوں کی لوٹ مار سے مطمئن ہو کر یہودی مذہبی مسائل کی موشگافی میں مصروف تھے - جس طرح آجکل ہندوستان کے مسلمان بدقسمتی سے فرعی مسئلوں کے اختلافات پر ایک دوسرے کی تکفیر کار ثواب سمجھتے ہیں ویسا ہی اُس امن و عافیت کے عہد میں بنی اسرائیل کا حال تھا -

ایک گروہ علی الاعلان شریعت موسوی سے روگرداں اور یونانیوں کی ہر ادا پر قربان تھا - دوسرا گروہ حفاظت مذہب کے نام سے اہل مذہب کا حقیقی دشمن تھا - ایک جماعت صدوقی کہلاتی تھی - مذہب کو عقل سے مطابق کرنے کی سعی میں تقدیر کی قائل نہ تھی - روح کی بقا - عذاب دائمی اور وجود ملائکہ سے انکار کرتی تھی - دوسری جماعت فریسی - شریعت کے الفاظ ظاہر کی پابند تھی اور کسی تاویل کو جائز نہ سمجھتی تھی - تیسرا طبقہ ایسینی ترک لذات دنیوی کو نجات کے لیے لازم سمجھ کر شراب اور گوشت سے محترز تھا - شب و روز ریاضت و عبادت میں منہمک رہنا شرط ایمان

تصور کرتا تھا۔

سامری ان سب سے الگ مذہبی روایات میں قسم قسم کے افسانے شامل کرتے تھے۔ سب فرقے ایک دوسرے کو گمراہ اور مرتد خیال کرتے تھے۔ ہر جماعت کی تمنا تھی کہ کنعان میں صرف اُسی کا وجود رہے اور بقیہ گروہ فنا ہو جائیں۔ مباحثے اور مناظرے جدال و قتال کے میدان بنتے تھے۔ آزاد خیالی اور اختلاف نظریات کی بدولت عابدوں اور زاہدوں سے مذہب کے نام پر درندوں کے سے افعال سرزد ہونے تھے۔ سکندر صدوقیوں کا طرفدار تھا۔ اسکے خلاف سازشوں کا جال پھیلا۔ راز قبل از وقت فاش ہو گیا اور بادشاہ نے ہزاروں یہودی صلیب پر آویزاں کردیے۔ فریسی قتل ہوتا تو صدوقی خوشیاں مناتے۔ ایسی مارا جاتا تو سامری تالیاں بجاتے۔ قوم تباہ ہو رہی تھی اور ہمقوم خوش تھے۔ بریں عقل و دانش بباید گریست۔

۲۵ سال حکومت کرکے ۷۹ق م میں سکندر دنیا سے رخصت ہوا اور اُسکی بیوہ ملکہ الیگزنڈرا سلطنت یہود کی فرماں روا ہوئی۔ ہیکل مقدس کی تولیت عورت نہ کرسکتی تھی لہذا یہ منصب اُسکے بیٹے ہرکینس کے سپرد ہوا اور انتظام جہاں داری دانشمند ملکہ نے کیا۔ اُس نے شوہر کی وصیت کے مطابق فریسیوں کی امداد کی اور اُسکے عہد میں امن رہا۔ فوج اور خزانہ کی نگرانی ہوئی سلطنت کے دبدبہ میں فرق نہیں آیا۔ مگر اُس کی آنکھ بند ہوتے ہی سکندر کے بیٹوں نے خانہ جنگی شروع کی۔ ارسطو بولس دوم کامیاب ہو کر یہود کا چھٹا بادشاہ ہوا۔ اور متولی اعظم ہرکینس یروشلم سے فرار ہو گیا۔

ایدوم کے گورنر انٹی پیٹر نے ہرکینس کی اعانت کی اور بعض عربی قبائل کی مدد سے فوج اکٹھا کرکے شاہ یہود سے جدال و قتال شروع کیا۔ جنگ کا انجام ظاہر نہ ہو پایا تھا کہ رومیوں نے مداخلت کی اور فریقین کو اپنا فیصلہ منظور کرنے پر مجبور کیا۔

پامپی رومۃ الکبریٰ کی جمہوری سلطنت کا نامور سپہ سالار پامپی جس نے ۲۵ سال کی امارت میں ۲۱ بادشاہوں کو زیر کیا۔ ۸۰۰ جہاز۔ ایک ہزار قلعے۔ نو سو شہر فتح کیے اور ۲۹ جدید شہر آباد کیے۔ آرمینیا اور شام کی حکومتیں تباہ کرکے ۶۳ق م میں جنوب کی طرف پیشقدمی کر رہا تھا کہ اُسکو شہزادگان یروشلم کے نزاع اور جدال کی خبر ملی۔ وہ اُن کے جھگڑے کا تصفیہ کرنے آیا۔ ہرکینس کے حقوق مرجح قرار دیے مگر یہودیوں کی ایک جماعت نے اُسکی حکومت تسلیم کرنے سے انکار کیا اور رومی سپہ سالار کو یروشلم کا محاصرہ کرنے کے لیے بہانہ ملا۔

اسرائیلیوں نے ہمت و استقلال سے تین مہینے تک شہر کی حفاظت کی۔ سامانِ خوراک

ختم ہوا۔ فاقہ کشی کی نوبت پہونچی۔ ضبط و تحمل کی قوت گھٹی۔ فصیل میں رخنے پڑ گئے اور شہر بزور شمشیر فتح ہوا۔ ۱۲ ہزار یہودی قتل ہوئے۔ یروشلیم کی شہر پناہ مسمار کی گئی۔ پامپی ہیکل سلیمانی میں داخل ہوا بلکہ اُس مقدس ترین حصہ میں بھی قدم رکھا جو ہمیشہ غلاف پوش رکھا جاتا تھا۔ جسکے پردے سال میں صرف ایک بار اُٹھائے جاتے تھے اور عوام کو اُسکے اندر جانے کی اجازت نہ تھی۔ جنگ کا انجام یہ ہوا کہ سامرہ خود مختار۔ گلیلی وغیرہ بعض شہر ریاست کنعان سے خارج کرکے صوبۂ شام میں شامل کیے گئے۔ ہرکینس متولی اعظم بنا یا گیا اور سالانہ خراج مقرر ہوا۔ ارسطو بولس کو فاتح گرفتار کرکے اپنے لشکر کے ہمراہ لے آیا۔

اس طرح ایک صدی کے بعد۔ یہود کی خود مختار سلطنت کا خاتمہ ہوا مگر حکومت کا نام ہنوز باقی تھا۔ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے۔

سکندر یونانی کے انتقال کے بعد اسکا مفتوحہ علاقہ فوجی سرداروں میں تقسیم ہوا تو مملکت مصر ٹالمی کے حصہ میں آئی تھی۔ تقریباً تین سو برس تک اُسکے جانشین وادی نیل پر حکومت کرتے رہے۔ سنہ ۵۱ قبل مسیح میں ٹالمی اولیٹس فوت ہوا تو اُس کی اولاد نابالغ تھی۔ بستر مرگ پر وصیت کی کہ اس کا بڑا لڑکا ٹالمی اور لڑکی کلوپٹرا مشترکاً فرماں روائے مصر ہوں اور دوران نابالغی میں روما کی جمہوری سلطنت ان کمسنوں کی سرپرستی اور حفاظت کرے۔ رومیوں نے خندہ پیشانی سے یہ ذمہ داری منظور کی۔ اور اپنے سپہ سالار پامپی کو ان نوعمر وارثوں کا ولی مقرر کردیا۔ یروشلیم کی آزادی سلب کرنے کے بعد وہ مصر کی طرف جاتا مگر شدید ضرورتوں سے اُسکو دارالسلطنت کی طرف واپس جانا پڑا۔ وہاں فرقہ بندی کی نزاعات میں پھنسا۔ روما کے شہرۂ آفاق جنرل جولیس

جولیس سیزر

کا آفتاب اقبال چمکا۔ پامپی کا ستارہ گردش میں آیا۔ لڑائی میں شکست ہوئی۔ اور وہ عزت بچانے کے لیے مصر کی طرف فرار ہوا۔ نابالغ ٹالمی اُسوقت صرف تیرہ برس کا تھا۔ رفیقوں نے صلاح دی کہ وہ پامپی کو قتل کراکے روما کے نئے سردار سیزر سے رشتۂ اتحاد مستحکم کرے تاکہ آیندہ فسادات میں شریک سلطنت بہن سے مقابلہ کے وقت رومیوں کی حمایت سے فائدہ پہونچے۔ پامپی کی کشتی ساحل مصر پر پہونچی۔ ٹالمی فوج و لشکر لیے اپنے ولی کے استقبال کو حاضر تھا مگر جیسے ہی بدنصیب سردار نے خشکی پر قدم رکھا ایک مصری نے پشت سے خنجر کا وار کیا۔ دو پہلوانوں نے ہاتھ پکڑ لیے۔ مقابلہ فضول تھا۔ ٹالمی نے چادر سے اپنا چہرہ

چھپا لیا۔ زمین پر گرا اور تڑپ تڑپ کر جان دی۔ جولیس سیزر فتحمندی کے نشہ سے جھومتا پامپی کے تعاقب میں آرہا تھا مگر اُس کی آمد سے پہلے ہی پامپی قتل ہو چکا تھا۔ وہ ۱۰۰ سوار اور ۳۲۰۰ پیادے کی مختصر جمعیت سے اسکندریہ کے ساحل پر لنگر انداز ہوا اور مصر کی حکومت نابالغ بادشاہ کے ولی اور سرپرست کی حیثیت سے اپنے ہاتھ میں لینا چاہی۔

اُس نے دیکھا کہ ملک میں بدامنی ہے۔ ٹالمی اور کلوپیٹرا میں عداوت پڑ گئی ہے۔ بہن منافع سلطنت سے محروم ہے اور بھائی کُل علاقے پر قابض ہے۔ اُس نے فریقین کو اپنی فوجیں منتشر کرنے کا حکم دیا اور دونوں نابالغوں کو تنازعات کے تصفیہ کے لیے اپنے حضور میں طلب کیا۔ مصر خودمختار تھا۔ یہ خودسرانہ احکام حقوقِ شاہی میں مداخلت تصور کیے گئے۔ قوم پرست ناراض ہوئے اور جنگ پر تیار ہو گئے۔ سیزر نے سمجھایا کہ وہ بادشاہ متوفی کی وصیت کے مطابق نابالغوں کا ولی ہے اور اُس کو اُنکی باہمی رنجشوں کے تصفیہ کا حق ہے۔ رعایا خاموش ہوئی۔ مقدمہ کی سماعت شروع ہوئی فریقین کے وکلا بحث کرنے لگے۔ کلوپیٹرا نہایت چالاک۔ زیرک و دانا تھی۔ سوچا کہ اُس کا حسنِ گلوسوز مقدمہ کے فیصلے میں بہت مؤثر ہوگا۔ انوکھی ترکیب سے سیزر کی خلوت میں پہونچی۔ ملازم خاص ملکہ کی ہدایت کے مطابق اُس کو کپڑوں سے ڈھانک۔ گٹھری بنا۔ رسیوں سے کس۔ لکڑی کے سہارے کاندھے پر رکھ کر سیزر کے دروازے پر لایا۔ پھاٹک کے محافظوں کی معرفت اطلاع کرائی کہ وہ رومی سردار کے لیے تحائف لایا ہے۔ داخلہ کی اجازت ہوئی۔ خلوتِ خاص میں رسائی پاکر نذرِ اطاعت کی پونجی سردار کے قدموں پر نثار کی۔ سپہ سالار نے حیرت و استعجاب سے گٹھری کی گرہ کھولی تو خوبصورت کلوپیٹرا اُس میں سے نکل کر سامنے کھڑی ہوئی اور سرِ تسلیم خم کیا۔

داورِ حشر ہو گیا اُن کا تھے وہ اندازِ محبتیں انکے

رنگین مزاج جنرل حسن و جمال کی مجسم تصویر دیکھ کر دنگ ہو گیا۔ جن آنکھوں میں خوبصورت عورتیں بسی ہوں اُنکے لیے دُنیا تاریک ہے۔ ملکہ کی سب آرزوئیں پوری ہوئیں اور سیزر نے فیصلہ کیا کہ بھائی بہن مشترکاً حکومت کریں۔

مصر کا وزیرِ اعظم کلوپیٹرا کے خلاف تھا۔ اُس نے سیزر کے خلاف ملک میں پروپیگنڈا کیا۔ ملکہ کی بداخلاقی مشہور کی۔ اور رعایا کو بھڑکایا کہ سیزر چند روز میں ٹالمی کو امورِ مملکت سے بےدخل کرکے کلوپیٹرا کو فرماں روائے مطلق بنانے والا ہے۔ بغاوت کی آگ بھڑکی۔ مصری سپہ سالار ۲۰ ہزار فوج لیکر سیزر کو اسکندریہ سے نکالنے آیا۔ رومی سپہ سالار نے اپنی مختصر جماعت کو شہر کی گلیوں اور کوچوں

میں پھیلا کر دشمنوں سے عزت بچائی۔ مصریوں نے اسکے بیڑے میں آگ لگانا چاہی۔ سیزر نے تیزدستی سے اُنکے جہازات جلا دیے۔ شعلہ فشاں جہاز بہتے ہوئے گھاٹ کے قریب آگئے۔ شہر کے مکانات میں آگ لگی اور اسکندریہ کا مشہور عالم کتب خانہ جس میں چار لاکھ بے نظیر اور نایاب کتابیں جمع تھیں جل کر راکھ کا ڈھیر ہوگیا۔

(یہی وہ کتب خانہ تھا جسکے برباد کرنے کا الزام آٹھ سو برس کے بعد عرب کے جاہلوں پر لگایا گیا اور غلط منطقی استدلال کی مثال یورپ میں ضرب المثل کی طرح استعمال ہونے لگی کہ "وہ کتابیں اگر قرآن کے مطابق ہیں، تو اُن کا رکھنا فضول ہے اور اگر قرآن کے خلاف ہیں تو اُنکو جلا دینا چاہیے۔ بہرحال وہ جلا دی جائیں۔")

ملک کی حالت روز بروز بدتر ہونے لگی۔ جنگ کو طول ہوا۔ سیزر نے دوسرے ممالک سے مدد منگائی۔ ایشیاء کوچک سے جہازات کا بیڑا آیا۔ شام اور سواحل کے علاقوں نے فوج بھیجی۔ ایدوم کا انٹی پیٹر جو ہرکینس شاہ یہود کا دستِ راست تھا۔ تین ہزار یہودی لیکر سیزر کی مدد کو آیا۔ مصر کے راستے یہودیوں کے قبضے میں تھے۔ اُنھوں نے امدادی فوجیں اپنے ملک سے بے مزاحمت گزرنے دیں اور انکو رسد پہونچائی۔ اس تازہ دم فوج کی آمد سے لڑائی کا پانسہ پلٹا۔ دریائے نیل کے قریب باغیوں سے فیصلہ کن جنگ ہوئی۔ سیزر کو کامل فتح نصیب ہوئی۔ ٹالمی بھاگا اور دریا میں غرق ہوگیا۔ اسکندریہ اور کل مملکت مصر نے روما الکبریٰ کی اطاعت کرلی

سیزر عرصہ تک مصر میں بے نس و غش عیش کرتا رہا۔ آخرکار ملکی ضرورتوں سے اُس کو روما واپس جانا پڑا۔ اور کلوپیٹرا وادی نیل کی مطلق العنان فرماں روا ہوگئی۔

انٹی پیٹر | انٹی پیٹر نے بڑے نازک وقت میں مدد کی تھی۔ اُسکے گراں بہا خدمات کے عوض میں وہ یہودیہ۔ سامرہ۔ اور گلیلی کے تمام ملکی اور مالی امور کا مہتمم و منتظم مقرر ہوا۔ ہرکینس ہیکل مقدس کا پیشوائے اعظم رہا لیکن کنعان کی حکومت درحقیقت انٹی پیٹر کو تفویض کی گئی۔ اُس کی سفارش سے یہود کو قوانین شریعت پر عمل کرنے کی اجازت ملی۔ وہ جبریہ فوجی خدمت سے معاف کیے گئے۔ سالانہ خراج میں کمی ہوئی۔ یروشلم کی فصیل دوبارہ بنانے کی ممانعت منسوخ کی گئی۔ انٹی پیٹر صوبۂ ایدوم کا رہنے والا۔ کنعانیوں کا پڑوسی تھا۔ اُسکے آباؤاجداد نے بنی اسرائیل کی فرمانبرداری کی تھی اور شریعت موسوی کے پابند ہوگئے تھے۔ وہ مذہبًا یہودی تھا مگر نسلًا اسرائیلی نہ تھا۔ جولیس سیزر کی عنایت سے اسکو شاہی اختیارات حاصل ہوئے تو وہ مذہب اور ملک کا بہی خواہ ثابت ہوا۔

اُس نے علاقۂ محروسہ کا دَورہ کیا اور سب بدانتظامیاں دور کیں۔ اپنے لڑکے کو یروشلم کا گورنر مقرر کیا اور دوسرے لڑکے ہیرڈ کو گلیلی کا حاکم بنایا۔ ہیرڈ نوجوان ذہین شجاع اور ہونہار تھا۔ دبدبہ سے حکومت کی۔ چوروں اور راہزنوں کو تہ تیغ کیا اور صوبہ میں امن قائم کیا۔ لیکن انٹی پیٹر کی حکومت رعایا کو پسند نہ تھی وہ دیکھتے تھے کہ بادشاہ ہرکینس بے اختیار ہے اور سیاہ وسفید کا انٹی پیٹر مختار ہے۔ ہیرڈ کی مطلق العنانی خصوصاً ناگوار تھی۔ اُس پر قتل و غارت کے الزام عاید کیے گئے اور اکابر قوم کی مجلس انتظامی کے سامنے جوابدہی کے لیے طلب کیا گیا۔ وہ اپنے باپ کے حکم سے الزامات کا جواب دینے حاضر ہوا مگر شام کے رومی گورنر کا ایک خط ہرکینس کے نام لایا جس میں متولی اعظم کو بحیثیت میر مجلس جلسہ انتظامی کے ہدایت کی گئی تھی کہ ہیرڈ کی مدد اور حفاظت کرے۔ کہتے ہیں کہ ہیرڈ جو ملزم کی حیثیت سے طلب کیا گیا تھا شہزادوں کی طرح شان و شکوہ سے مجلس میں آیا۔ وہ سرخ لباس پہنے تھا۔ بالوں کو پٹیاں بنی تھیں۔ اور مسلح محافظ اُسکے ساتھ تھے۔ یہ آن بان دیکھ کر اکابر خوف زدہ ہوے۔ فرد جرم سنانے کی کسی کو ہمت نہ ہوئی اور وہ بری کر دیا گیا۔

اس واقعہ کے تین سال بعد ایدومیوں کا پشت پناہ جولیس سیزر دارالسلطنت میں قتل ہوا اور رومی دنیا میں ہلچل پڑ گئی۔

سیزر

سیزر مصر سے واپسی کے بعد رومۃ الکبریٰ کی وسیع سلطنت کا قائد اعظم (ڈکٹیٹر) مقرر ہو گیا تھا اور اُس کو تمام شاہی اختیارات حاصل تھے۔ وہ پانچ سو لڑائیوں میں کامیاب ہوا تھا۔ ایک ہزار شہر فتح کیے تھے اور ایک کرور سے زیادہ بنی آدم کا خون اُسکی گردن پر تھا۔ لیکن امن و سکون کی زندگی اُس کی قسمت میں نہ تھی۔ جب ملکی خطرے دُور ہوے۔ تخت و تاج کے راستے میں پھول بچھے۔ مجلس واضعان قوانین میں سونے کے تخت پر بیٹھا تھا اور عنقریب بادشاہی کا خطاب ملنے والا تھا کہ ایک دغاباز نے اُسکے سینے میں خنجر بھونکا۔ پانچ سات سازشی جھپٹ پڑے۔ وہ ۲۳ زخم کھا کر گرا اور مر گیا۔ یہ واقعہ ۴۴ سنہ قبل مسیح کا ہے۔

یہود نے مراسم تعزیت بجا لانے کے لیے مجلس واضعان قوانین کی خدمت میں سفیر بھیجے اور قدیم مراعات و مناصب کی تجدید چاہی۔ روما میں اُس وقت پریشانی پھیلی ہوئی تھی۔ یہود کی درخواست منظور ہوئی۔ ہرکینس کی تولیت اور انٹی پیٹر کی حکومت بحال رہی۔ لیکن اسی زمانہ میں ایک ہردلعزیز یہودی جنرل نے انٹی پیٹر کو زہر سے ہلاک کر دیا۔ ہیرڈ نے شام کے رومی گورنر سے شکایت کی۔ قاتل قصاص میں مارا گیا۔ اُس کی موت کا یہودیوں کو بہت رنج ہوا۔ ہیرڈ سے عام ناراضی پیدا ہوئی اور

اس کے خلاف ایک درخواست قیصر متوفی کے شریک امارت مارک انٹنی کے پاس روانہ کی گئی۔

انٹی

نوعمری میں انٹنی ایک معمولی فوجی سوار تھا۔ سیزر نے اس کو باڈی گارڈ کے رسالہ میں لیلیا آہستہ آہستہ اعلیٰ ملکی مناصب تک پہونچا یا اور اپنی امارت وحکومت کا شریک بنا لیا۔ سیزر کی موت کے وقت اس کا بھتیجا آکٹوئیس روما میں موجود نہ تھا۔ لہذا متوفی کا کُل مال ومتاع انٹنی کے قبضہ میں آیا اور وہ رومۃ الکبریٰ کا زبردست ترین مدبر ہوگیا۔

یہودیوں کی استدعا پر وہ شام آیا۔ شکایات سنیں اور انٹی پیٹر کی سابقہ خدمات کا لحاظ کرکے ہیرڈ کو اپنی حفاظت میں لیا۔ مگر وہ زیادہ قیام نہ کرسکا اور ملکی ضروریات سے اسکو فوراً اطالیہ جانا پڑا۔ یہود کو زک ہوئی مگر چند ہی روز میں ایسا پانسا پلٹا کہ اسرائیلیوں کو اپنی خفت مٹانے اور ادومیوں کو ستانے کا موقع مل گیا۔

اقوام پارتھیا

فارس کے شمال میں ترکمانوں کی ایک جنگجو قوم آباد تھی جو تاریخ کے صفحات پر "پارتھین" کے نام سے مشہور ہے۔ شام میں سکندر کے جانشین یونانی بادشاہوں کی کمزوری سے فائدہ اُٹھا کر انھوں نے ۲۵۰ء قبل مسیح میں علم بغاوت بلند کیا تھا رفتہ رفتہ ایران وتوران کے کُل علاقے پر قابض ہوگئے اور تقریباً پانچسو برس تک فارس پر حکومت کی۔ اپنے عروج کے وقت انھوں نے رومۃ الکبریٰ کے دانت کھٹے کردیے تھے اور رومی سپہ سالار کریسس کی اندوہناک پر شکست پر اس وقت تک روما کے مورخ آنسو بہاتے ہیں۔ اس قوم کے آخری بادشاہ اردوان کو ۲۲۶ء عیسوی میں ہلاک کرکے آردشیر نے دولت ساسانیہ کا بنیادی پتھر رکھا تھا اور عربوں کے حملے تک ایران پر ساسانیوں کی حکومت رہی۔

المختصر۔ انٹنی کی غیر حاضری سے فائدہ اٹھاکر شامیوں اور یہودیوں نے ترکمانوں کو اپنے ملک پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔ شام، فلسطین اور ایشا، کوچک پر پارتھیوں کا قبضہ ہوگیا اور اُن کی سرپرستی میں معزول شاہ یروشلیم ارسٹی بولس کا لڑکا انٹگونس بنی اسرائیل کا بااختیار بادشاہ ہوا۔ ہرکینس گرفتار ہوا اور اُسکے بال کاٹ دیے گئے تاکہ وہ دوبارہ متولی اعظم نہ ہوسکے کیونکہ موتراشیدہ ہیکل یہود کا متولی نہ ہوسکتا تھا۔ ہیرڈ کے بھائی نے قیدخانہ میں خودکشی کی لیکن ہیرڈ بچکر نکل گیا۔ اپنے اہل وعیال۔ مال و دولت کو محفوظ جگہ چھوڑکر روما پہونچا۔

جولیس سیزر کے قتل کے بعد روما میں جو فساد ہوے۔ قاتلوں سے جو سلوک کیا گیا۔ قیصر کے بھتیجے آکٹوئیس اور انٹنی سے جو جھگڑے بکھیڑے رہے اُنکی تفصیل سے ہماری داستان کو کچھ سروکار نہیں۔ البتہ

یہ جاننا چاہیے کہ جس وقت ہیرڈ خانہ برباد ہوکر دارالسلطنت پہونچا تو آکٹویس اور انٹنی کے حصہ میں آیا تھا اور مغرب دوسرے کو ملا تھا۔ باہمی تعلقات شگفتہ تھے۔ آکٹویس کی بہن آکٹویا سے انٹنی نے عقد کرلیا تھا اور امور مملکت دونوں سرداروں کے مشورے سے طے ہوتے تھے۔

ہیرڈ نے اپنی داستان غم انٹنی کو سنائی۔ اُس نے آکٹویس کو اپنا ہمخیال بنایا اور مجلس وضعانِ قوانین کے سامنے ان دونوں نے انٹی پیٹر مرحوم کے خدمات اور ہیرڈ کے مصائب کا پُرزور الفاظ میں اظہار کیا۔ مجلس ملی نے متفقہ طور ہیرڈ کو کنعان کا حاکم تسلیم کرلیا۔ انٹگونس مجرم۔ قومی دشمن اور قابل سزا قرار دیا گیا اور یہ کل کارروائی بالکل اُسی طرح ہوئی جیسے کسی ماتحت صوبہ کا انتظام کیا جاتا ہے۔ مجلس کے تصفیہ کے بعد ہیرڈ کی رسم مسند نشینی بھی وہیں ادا کردی گئی۔

ہیرڈ کی مسند نشینی

اور رومی دیوتاؤں کے نام پر قربانیاں کی گئیں۔

حکومت کی ہوس میں ملک کی خود مختاری قربان کرنے کے بعد ہیرڈ فلسطین آیا۔ اس دوران میں رومی جنرلوں نے پارتھیوں کو شام سے بے دخل کردیا تھا اور کنعان میں اُنکا اثر زائل ہوچکا تھا۔

ہیرڈ نے فوج جمع کی۔ انٹی گونس سے متعدد معرکے ہوے۔ بدنصیب بادشاہ کو شکست ہوئی اور وہ یروشلم میں محصور ہوگیا۔ کنعان کا کل رقبہ ہیرڈ کے تصرف میں تھا۔ لیکن یروشلم کی وفادار رعایا اور مستحکم دیواروں نے تین سال تک شہر میں قدم رکھنے نہ دیا۔ اُس نے رومی سپاہیوں سے مدد کی التجا کی اور انکی اعانت سے بہزار مشکل شہر فتح ہوا۔ رومی محاصرے کی طوالت سے برافروختہ تھے۔ اُنھوں نے فتح کے بعد قتل و غارت کا اعلان کیا۔ اندیشہ تھا کہ دارالحکومت بالکل تباہ ہوجائے گا مگر ہیرڈ نے اپنے معاونوں کو رقم کثیر دے کر اس بلا کو ٹالا۔ انٹی گونس گرفتار ہوا اور قتل کیا گیا۔ مقابی خاندان کا خاتمہ ہوگیا۔ اُنکے اعوان و انصار قتل کیے گئے اور انکی جائدادیں ضبط ہوئیں۔ متولی اعظم کا عہدہ وراثتاً ہرکینس کے لڑکے کو ملنا چاہیے تھا جو ہیرڈ کا سالا بھی تھا۔ اور ہر طرح اس منصب جلیلہ کا مستحق تھا مگر مقابیوں کی ضد میں بابل کے ایک اسرائیلی کو یہ مذہبی خدمت عطا ہوئی اور وہ لڑکا محروم کیا گیا۔ بیوی کو ناگوار ہوا۔ اُس نے ہیرڈ کی خانگی زندگی تلخ کردی اور اپنے بھائی کے حقوق کے لیے پوشیدہ تدبیریں شروع کیں۔ مصر کی ملکہ کلوپٹرا کی خدمت میں نیاز حاصل تھا اُس کی معرفت انٹنی سے سفارش چاہی۔

انٹنی اور کلوپیٹرا

انٹنی اور آکٹویس میں کشیدگی ہوگئی تھی۔ انٹنی ایک ملکی ضرورت سے مصر بھیجا گیا یہاں کلوپٹرا کے حسن و جمال کا شکار ہوا اور اُسکے دامِ عشق میں ایسا پھنسا کہ مصر کی بود و باش اختیار کرلی۔ اپنی بیوی آکٹویا کو طلاق دی۔ ایشیا کے مقبوضہ صوبے ملکۂ مصر کی

نذر کیے - فتح وظفر کا جشن اسکندریہ میں منایا اور شب و روز عیش و عشرت میں مستغرق رہنے لگا - کلوپٹرا کے اشارے سے اُس نے ہیرڈ کو تولیت کا انتظام منسوخ کرنے پر مجبور کیا اور اس طرح ہزار خرابی ہرکینس کا لڑکا ارسٹی بولس متولی اعظم کے منصب پر سرفراز ہوا - چند ہی روز میں اس قدر ہر دلعزیزی حاصل کی کہ ہیرڈ رشک کرنے لگا اور اُس کے خون کا پیاسا ہو گیا - ارسٹی بولس ایک دن حوض میں غسل کر رہا تھا کہ ہیرڈ کے اشارے سے غرق کر دیا گیا - اکابر یہود سخت ناراض ہوے - کلوپٹرا کو اس جرم کی اطلاع دی گئی - وہ ہیرڈ سے پہلے ہی ناراض تھی کیونکہ اُسنے چند سال ہوے ملکہ مصر کے پیام محبت کی قدر نہ کی تھی - اب اُسے بدلہ لینے کا موقع ملا اور انطنی سے اصرار کیا کہ ارسٹی بولس کے قصاص میں ہیرڈ قتل کیا جائے - انطنی کی مجال نہ تھی کہ ملکہ کے احکام سے سرتابی کرے - مگر ہیرڈ کی زندگی باقی تھی - اتفاق سے اُسی زمانہ میں سلطنت روما نے انطنی کے شرمناک حرکات سُن کر ملکہ کلوپٹرا کے خلاف اعلان جنگ کیا - یہ لڑائی در اصل انطنی کے خلاف تھی کیونکہ وہی مدار المہام تھا اور جنگ کا باعث یہ تھا کہ آکٹویس نصف سلطنت پر قانع نہ تھا وہ انطنی کو تباہ کرکے تمام متمدن اور مہذب دنیا کا مطلق العنان بادشاہ بننا چاہتا تھا - انطنی کو روپیہ کی ضرورت تھی - ہیرڈ نے رشوت دے کر اپنی جان بچائی اور یروشلم پر بدستور حکومت کرتا رہا -

انطنی نے جزیرہ ساموس کے قریب اپنا بیڑہ جمع کیا - دو لاکھ پیادے اور بارہ ہزار سوار اسکی رکاب میں تھے - چھ سلطنتوں کے بادشاہ بہ نفس نفیس ہمراہ تھے اور یروشلم وغیرہ پانچ ریاستوں کی فوجیں اُس کی قیادت میں تھیں - پانچ سو جہازات عجیب و غریب نمونوں کے جمع تھے - جن میں سے بعض میں متعدد درجے اور برج و مینار تھے - کلوپٹرا کی کشتی سب سے زیادہ خوبصورت تھی - اُسکے گلابی جھنڈے اور سرخ بادبان ہوا میں لہراتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ سونے کا محل شفق کے نیچے حرکت کر رہا ہے - انطنی کا جہاز بھی قریب قریب ایسا ہی آراستہ تھا - فوجی باجے بجتے تھے اور اُن کی ولولہ خیز موسیقی کے ترانے آسمان تک پہونچتے تھے - مورخ لکھتے ہیں کہ دنیا نے اس بیڑے سے زیادہ شاندار اور دلکش اور باعظمت فوجی منظر کبھی نہیں دیکھا - متوالی ملکہ عارضی شوکت و حشمت سے مدہوش ہو کر تمام عالم میں اپنا کوئی مقابل نہ سمجھتی تھی - اور رومیوں کے دار السلطنت کو تباہ کرنیکا گھمنڈ رکھتی تھی - آکٹویس کے پاس اسکے نصف جہاز بھی نہ تھے اور صرف ۸۰ ہزار پیادے ہمراہ تھے لیکن انطنی کے ملاح ناآزمودہ کار اور قالین کے شیر تھے - تجربہ کار جنرلوں نے صلاح دی کہ وہ سمندر میں جنگ نہ کرے کلوپٹرا کو مصر بھیجدے اور خشکی میں دنیا کی قسمت کا فیصلہ ہو مگر جس کو خدا تباہ کرنا چاہتا ہے پہلے اُسکی

عقل سلب کرلیتا ہے۔ عشق و محبت کا مجنون کلوپٹرا کو آزردہ نہ کر سکتا تھا۔ ملکہ نے بحری جنگ کی رائے دی اور اُسکے ارشاد کی تعمیل واجب تھی۔

۲۔ستمبر ۳۱ سنہ قبل مسیح کو شہر اکٹیم کے قریب لڑائی شروع ہوئی اور دُنیا کی حکومت کا پانسا پھینکا گیا نازک مزاج معشوق نکہت گل سے بدماغ ہوتے ہیں، اور شور بلبل بارِ خاطر ہوتا ہے۔ قتال وجدال کا شور و ہنگامہ کلوپٹرا سے کیسے دیکھا سنا جاتا۔ جب لڑائی پورے زور پر تھی اور قریب تھا کہ مصریوں کو فتح نصیب ہو کلوپٹرا کا دل گھبرایا اور مصری بیڑے کے ساٹھ جہاز اپنے ہمراہ لیکر وطن کی سمت واپس ہوئی۔ انٹنی نے معشوق کے جہازات مصر کی طرف جاتے دیکھے تو سودائے محبت میں دنیا کی سلطنت کو طاق پر رکھ کر خود بھی اُسی کے تعاقب میں روانہ ہوا۔ خشکی کی عظیم الشان فوج نے یہ حیرت انگیز تماشہ دیکھ کر ہتھیار رکھدیئے اور آکٹویس کی اطاعت قبول کرلی۔ لڑائی ختم ہوئی اور انٹنی کی بزدلی اور حماقت سے آکٹویس کامیاب ہو گیا۔

انٹنی کی شکست سن کر کلوپٹرا کی نیت بدل گئی اس نے آکٹویس کو اپنے دام محبت میں گرفتار کرنے کا عزم کیا۔ اس کوشش میں ناکام رہی۔ ذلت و رسوائی کا خطرہ ہوا تو ایک تہ خانہ میں پوشیدہ ہوکر اپنی موت کی خبر مشہور کی۔ انٹنی نے یہ سن کر اپنے سینے میں خنجر بھونک لیا اور اُس کی لاش پر کلوپٹرا نے بھی خودکشی کرلی۔ مشہور ہے کہ سانپ سے کٹوا کر جان دی۔ بہرحال آکٹویس روم الکبریٰ کی وسیع مملکت کا تنہا حاکم و مختار ہو گیا۔

ہیرڈ کی کامیابی

ہیرڈ نے مبارکباد کی نذر پیش کی اور خوشامد و چاپلوسی سے آکٹویس کو اپنے حال پر ویسا ہی مہربان بنالیا جیسا کہ انٹنی تھا۔

بیرونی خرخشوں سے مطمئن ہوکر ہیرڈ نے اپنی حکومت کو مستقل اور شاندار بنانے کی کوشش کی۔ اُسکے دور میں کنعان کو وہ سرسبزی اور فلاح نصیب ہوئی جو مدت سے معدوم تھی۔ مملکت میں عالیشان قلعے تعمیر ہوئے۔ دارالسلطنت میں وسیع محل بیش قیمت سامان اور رسالے سے تیار ہوا۔ رومی کھیل تماشے یروشلیم میں جاری ہوئے۔ تہذیب و تمدن میں ترقی ہوئی لیکن بنی اسرائیل اُس سے بدستور ناراض تھے۔ کیونکہ وہ غلام زادہ بھی تھا اور ایک اجنبی طاقت کے زیر اثر حکومت کرتا تھا۔

ہیرڈ نے ہیکل مقدس کی عمارت از سر نو بنانے کا ارادہ کیا کیونکہ بابل کی اسیری سے واپسی کے بعد افلاس کے زمانہ میں موجودہ عبادت خانہ تعمیر ہوا تھا اور اُسکا سامان ناقص اور کم قیمت

تھا۔ اکابر قوم تعمیر جدید کے خلاف تھے۔ جب تک نئی عمارت کے لیے کُل سامان فراہم نہیں کر دیا گیا یہودنے قدیم معبد کو مسمار کرنے کی اجازت نہ دی۔ آٹھ سال میں جدید عمارت تیار ہوئی جو یونانی طرز کی خوبصورت، دلکش اور وسیع تھی۔ بیش قیمت سنگ مرمر استعمال کیا گیا اور بے دریغ روپیہ صرف کیا گیا۔ اس بلند ہمتی سے اسرائیلی خوش ہوئے اور ہیرڈ کو کسی قدر ہر دلعزیزی حاصل ہوئی۔ لیکن اُس کے اعزہ اور رشتہ دار ہنوز خفا تھے۔ ایک روز غصہ میں بیوی کے قتل کا حکم دیا۔ اُس کی اولاد کو بھی ہلاک کیا۔ دشمنوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا۔ سکون قلب کے لیے متعدد شادیاں کیں لیکن حقیقی راحت میسر نہ آئی۔ ہر وقت اپنی جان کا اندیشہ رہتا تھا۔ اور جس بد نصیب پر شبہ پیدا ہوتا تھا وہ فوراً جلاد کے سپرد کر دیا جاتا تھا۔

آخر کار ۴ء قبل مسیح میں سخت بیمار ہوا۔ بستر مرگ پر اپنی ریاست بیٹوں میں تقسیم کی، ارخلاؤس کو ادومیہ، یہودیہ اور سامریہ کی حکومت دی۔ ہیرود اس کو گلیلی کا حاکم بنایا اور فلپ کو اتوریہ وغیرہ متفرق صوبے عنایت کیے۔

ارخلاؤس کا دار الحکومت یروشلم تھا۔ اُس کے ظلم و جور سے عاجز آ کر یہودیوں نے رومۃ الکبریٰ کے شہنشاہ سے شکایت کی۔ ارخلاؤس معزول ہوا۔ جلا وطن کیا گیا اور یروشلم کی حکومت ایک رومی گورنر کے سپرد ہوئی۔ یعنی سنہ ۶ء سے سلطنت کنعان کی حیثیت باجگزار ریاست کی بھی نہ رہی بلکہ وہ سلطنت روما کا ایک معمولی صوبہ بن گئی۔

غزل شیخ ارشاد حسین صاحب واثق وکیل ہائیکورٹ حیدر آباد دکن

کیف حج کا سا مجھے اجمیر کے آنے میں ہے　　خم میں بھی آخر وہی مے ہے جو پیمانے میں ہے

ہاں مرے ساقی ترے بذل و عطا کے میں نثار　　میری قسمت کا کوئی قطرہ بھی میخانے میں ہے

تشنہ لب ہوں اک غضب ہیں حلق کے کانٹے مرے　　بھول اسے ساقی مجھے دینا جو پیمانے میں ہے

ساقی تھوڑی بھی بہت ہے تیرے میخانے کی مے　　مجھکو سو خم کے برابر ہے جو پیمانے میں ہے

اُٹھ گئی پھر ساقی اجمیر کی آنکھ اس طرف　　مژدہ مے خوار و کہ اذن عام میخانے میں ہے

الله الله مجھ سا تشنہ کام بھی کہتا ہے آج　　سب مرے حصہ کا ہے جو کچھ کہ میخانے میں ہے

دور سے آیا ہے واثق آجکل اجمیر میں
طور سے اُتری ہوئی مے اُسکے پیمانے میں ہے

کلامِ ریاض

(جناب سید محمد محسن رضوی صاحب ایم۔ اے)

یہ تحریر جب وصول ہوئی تھی اُس وقت محسن صاحب الہ آباد یونیورسٹی میں ایم لے (اُردو) کے آخری سال میں پڑھ رہے تھے۔ افسوس ہے کہ اس موضوع پر مضامین کی جو کثرت رہی اُسکے سبب اسکی اشاعت بہت دیر میں ہو رہی ہے۔ امید ہے کہ اس اثنا میں وہ ایم لے کامیاب ہو گئے ہوں گے۔

ایڈیٹر

دو باتیں شائقین ادب اُردو کا دل سخت دُکھاتی ہیں۔ ایک تو عوام الناس کا اُردو کی قرار واقعی قدر نہ کرنا، دوسرے اس زمانہ میں ذی استعداد شعرا کی فی الجملہ قلت۔ ایسی حالت میں جب کوئی اپنا نازش شاعر دنیا سے اُٹھ جاتا ہے تو درد دل میں سوا ہوتا ہے۔ ۳۰ جولائی ۱۹۲۸ء کو حضرت ریاؔض نے جو آجکل جانِ سخن سمجھے جاتے تھے دنیا کو خیرباد کہکر اُردو سے ذوق رکھنے والے طبقہ کو ایسا غم دیا کہ اب اُنکی آنکھوں میں "گویا وہ آسمان نہیں وہ زمین نہیں"

ریاض کی فطرت میں قدرت نے ملکۂ شاعری ودیعت کیا تھا، اپنے وطن خیرآباد کے درسہ عربیہ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے کہ یکایک طبیعت شعر و سخن کی طرف مائل ہو گئی اور ابتدائی مشق کے زمانہ میں دماغ سوزی سے کام لیکر ایسے شگفتہ اشعار نکالے کہ قبول خاطر ہوئے۔ نصیب سے امیر سا اُستاد ملا جس نے ان کی خداداد طبیعت کو اور بھی سنوار دیا۔ عمر کے ساتھ ساتھ شاعری کا ذوق بھی ترقی کرتا گیا۔ شعر و سخن کے نام سے ایک پرچہ "گلکدۂ ریاض" جاری کیا جس میں انکی غزلیات شایع ہو کر لوگوں کے سامنے آنے لگیں۔ اس پرچہ نے ان کا نام وطن سے باہر بھی مشہور کر دیا۔ یہاں تک کہ ان کی روز افزوں شہرت کا غلغلہ نواب کلب علی خاں والی رامپور کے کانوں تک پہونچا جنکے دربار میں اُسوقت منیر و جلال، امیر و داغ کے سے شاہیر فن جمع تھے۔ نواب صاحب نے انھیں بھی طلب فرمایا اور از راہ قدردانی خلعت و انعام سے سرفراز فرمایا۔ لیکن بوجوہ چند در چند یہ وہاں قیام نہ کر سکے اور بہت جلد اپنے وطن واپس آکر خدمت زبان میں منہمک ہو گئے حقیقت یہ ہے کہ زبان و ادب کی خدمت کسی دربار کے دائرہ تک محدود نہیں بلکہ دربار سے علحدگی میں بھی سچی خدمات انجام دینے کا موقع دستیاب ہوتا ہے۔

ریاض نے زبان کے ساتھ قابل ستائش ریاضت کی اور عمر کے مختلف حصوں میں برابر علمی جدوجہد جاری رکھی۔ متعدد رسائل و جرائد مثل فتنہ، عطر فتنہ، ریاض الاخبار کے مختلف مقالات سے جاری کیے لیکن بدقسمتی سے انھیں عمر بھی کم نصیب ہوئیں۔ امیر اللغات اردو اور امیر پر جو اعتراضات اور نکتہ چینیاں کی گئیں اُن کے معقول و شافی جوابات مسلسل دو برس تک ریاض الاخبار میں شایع کرتے رہے جس سے انکی سخن سنجی اور قوت تنقید کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں بارہ بنکی سے ایک ماہانہ رسالہ اعجاز جاری کیا جس میں اُن کے گراں مایہ ادبی و تنقیدی مقالات و غزلیات شایع ہوتی تھیں لیکن یہ پرچہ بھی زیادہ عمر حاصل نہ کر سکا اور دو ہی برس میں اُسکا پیانہ حیات لبریز ہو گیا۔

ریاض کو زندگی میں اطمینان کم نصیب ہوا اور مختلف پریشانیاں ہمیشہ دامنگیر رہیں جیسا کہ خود فرماتے ہیں ؎

دنیا کے مخمصوں سے ہمیشہ رہا اُداس پر آدمی ریاض بڑی دل لگی کا تھا

اُنھیں قسمت و ناچاری نے ایسا مجبور کر دیا تھا کہ خلاف ضمیر باتیں کرنا پڑتی تھیں اور اس سے اُن کے شیشۂ دل کو سخت چوٹ لگتی تھی ؎

سرا جھکا نا مرا تقدیر سے سب کے آگے کوئی بھی ہو مجھے شرمندۂ احساں ہونا

زمانۂ قدیم سے تنگدستی ہمارے شعرا کے حال پر ایسی عنایت فرما رہی ہے کہ آج تک ساتھ نہیں چھوڑا۔ شعرا بھی اُس کے اس احسان کا برابر شکریہ ادا کرتے آئے ہیں چنانچہ موجودہ شعرا میں سے جناب آرزو فرماتے ہیں ؎

سخت ترننگ سے ہاتھے کی لکیریں نکلیں لکھا قسمت کا مٹایا نہ جبیں سائی نے

اور ریاض اپنی قسمت کا یوں رونا روتے ہیں ؎

رہا تقدیر کا رونا ہمیشہ ہماری عمر تو گزری اسی میں

مہاراجہ محمود آباد مرحوم نے کچھ عرصے تک انکی ذاتی قابلیت کی بنا پر دستگیری کی۔ ریاض نے اسے بہت غنیمت جانا اور اُنکے اس احسان کے عوض میں اپنے بعض اشعار میں اُنکی تعریف بھی کی ؎

جبہہ سائی جس نے کی قسمت چمک اُٹھی ریاض حضرت ساحر[1] کے در سے کیوں ہما دا سر اُٹھے

---

[1] مہاراجہ مرحوم کا تخلص تھا۔

ایک اور شعر میں فرماتے ہیں پاؤں پر حضرتِ ساحر کے رہے سر میرا

لیکن اس کا کیا علاج کہ مہاراجہ صاحب کی ناوقت موت نے اس سلسلہ کو بہت جلد توڑ ڈالا۔ ورنہ ممکن تھا کہ ریاضؔ کو یک گونہ اطمینان حاصل ہوتا اور فکرِ سخن کا زیادہ موقعہ ملتا۔

ابتدائے عمر میں ریاضؔ کو مشاعروں میں شریک ہونے کا بڑا شوق تھا۔ خواجہ عشرت "آبِ بقا" میں لکھتے ہیں "کوئی مشاعرہ ایسا نہ ہوتا تھا جس میں یہ شریک نہ ہوتے تھے" مشاعروں کے سلسلہ میں انھیں کئی شہروں میں جانے اور قیام کرنے کا موقع ملا اور ہر جگہ اپنی ظرافت و بذلہ سنجی سے قدردان پیدا کر لیے اس اعتبار سے لکھنؤ اور گورکھپور قابلِ ذکر ہیں خصوصاً گورکھپور میں تو قریب قریب اُن کی جوانی گزری۔ وہ اس شہر کے والہ و شیدا تھے۔ چنانچہ گورکھپور کی شان میں ایک غزل بھی کہی ہے جس کا مطلع یہ ہے ؎

ہوئی ہے میری جوانی فدائے گورکھپور لحد سے آئیگی آواز ہائے گورکھپور

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں گورکھپور سے کس قدر الفت تھی اسی غزل کے چند شعر مندرج ہیں جس سے اس حقیقت کا اور زیادہ اظہار ہوتا ہے ؎

یہاں کی موت بھی ہے زندگانی جاوید ہوا ہے باغِ جناں ہے ہوائے گورکھپور
پرستش انکی ہمارا تو دین و ایماں ہے عجیب چیز ہیں اہلِ وفائے گورکھپور
ہم اپنے خونِ تمنا سے سینچ آئے ہیں حسین لگائیں لگا کر حنائے گورکھپور
نہ مٹ سکیں گے کبھی نقش بھولی باتوں کے ہمارے دل میں بسی ہے ادائے گورکھپور

ریاضؔ پرانی وضع اور تہذیب کے آدمی تھے اور خلق و مروت کا گویا مجسمہ ؎

پرانی چیزوں میں ہے اک خمِ گلی میرا پرانے لوگوں میں یہ خاکسار باقی ہے
مرا یہ خم ہے پرانا خمِ فلاطوں سے پرانے وقت کی یہ یادگار باقی ہے

نئی روشنی انکی وضع قدیم پر ذرہ برابر بھی اثر نہ ڈال سکی وہ دورِ حاضر کے شاکی نظر آتے ہیں کہ اس نئی روشنی نے ایمان رخصت کر دیا ؎

کیا زمانہ ہے کہ دشوار نظر آتا ہے لاکھ دو لاکھ میں بھی صاحبِ ایماں ہونا

بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ جاتے ہیں اور کہتے ہیں ؎

کس قدر ہیں اثر انداز بتان کافر اس زمانے میں بہت ہے جو خدا یاد رہے

طبیعت میں بذلہ سنجی و ظرافت زیادہ تھی اور شوخی تو کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی جو آخر عمر

تک دگنی۔ اُنکے ایک محب خاص نے لکھا ہے کہ "وہ پیرانہ سالی میں بھی اس قدر شوخ تھے کہ متین بننا چاہتے تھے مگر نہ بن سکتے تھے" انکی آخر عمر کا یہ شعر انکی شوخی کا آئینہ ہے ؎

ریاض اب شکل بھی بدلی مذاقِ طبع بھی بدلا ۔۔۔ یہ سن کا ہے تقاضا جو خیالِ نو در آتا ہے

اس شعر کی بھی شوخی ملاحظہ ہو ؎

سنتے ہی میرا شعر وہ یہ کہہ کے اُٹھ گئے ۔۔۔ اس عمر میں بھی ان کی طبیعت جوان ہے

ان کی شاعرانہ شوخی کے متعلق یہ لکھنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس صفت میں یہ غالب اور داغ سے بھی بڑھے ہوئے نظر آتے ہیں کیونکہ ان دونوں کی شوخی صرف ایسی ہوتی ہے جو زیرلب مسکراہٹ بن جاتی ہے لیکن ریاض کی شوخی اس پہ اکتفا نہیں کرتی اور پڑھنے والے کو بغیر اچھی طرح ہنسائے نہیں رہتی۔ مثال کے لیے غالب کا یہ شعر ملاحظہ ہو ؎

ان پریزادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام ۔۔۔ قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں

اسکے مقابلہ میں ریاض کا یہ شعر ملاحظہ ہو

وہ آ رہا ہے عصا ٹیکتا ہوا واعظ ۔۔۔ بہا دے آنی کہ ساقی کہیں نہ تھا دے

لوٹتے ہیں لطف آنکھوں میں فرشتے ساتھ کے ۔۔۔ ان فرشتوں سے بھی اب چھپ چھپ کے ہم عصیاں کریں

ذرا سے درد نے ڈھائی ہیں آفتیں کیا کیا ۔۔۔ پٹک دیا ہے زمیں پر اُٹھا اُٹھا کے مجھے

یہ کہنا نامناسب نہیں معلوم ہوتا ہے کہ شوخی کے اعتبار سے بسا اوقات یہ ظریف کے ہم رنگ ہو جاتے ہیں موخر الذکر شعر کو ذہن میں رکھ کر ظریف کا یہ شعر پڑھیے اور دیکھیے کہ دونوں کس قدر ہم آہنگ ہیں ؎

وفورِ بے خودی میں یار کو دے دے پٹکتا ہوں ۔۔۔ خدا غارت کرے ایسے جنونِ فتنہ ساماں کو

شراب و ساقی کے متعلق ابتدا ہی سے ہمارے شعرا خیال آفرینی کرتے رہے ہیں اور اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بعض نے اس میں کیف و اثر بھی پیدا کر دیا ہے۔ ریاض کی خصوصیت یہ ہے کہ اُنھوں نے اس قسم کے مضامین کثرت سے نظم کیے اور اُن میں تنوع پیدا کر دیا ہے۔ عموماً اُنکے اس قسم کے اشعار اگرچہ کسی قدر بے کیف سے ہوتے ہیں لیکن بعض ایسے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک پکے شرابی کے حقیقی جذبات ہیں جو ریاض کے قلم نے نظم کر دیے ہیں۔ لطف مے نوشی کو وہ ایک خاص انداز میں بیان کرتے ہیں اور قرض کی پینے میں انھیں خاص لطف آتا ہے ؎

ہم جانتے ہیں لطف تقاضائے مے فروش ۔۔۔ وہ نقد میں کہاں جو مزا ہے اُدھار میں

قرض پی آئے اک دکان سے آج — نیچی داڑھی نے آبرو رکھ لی

اگر ساقی نیچی داڑھی کی بھی رعایت نہیں کرتا اور قرض دینے سے انکار کرتا ہے تو انھیں منت سے بھی ننگ و عار نہیں سے

دیدے دیدے مرے ساقی تیرے صدقے دیدے — دستِ سیمیں سے چھلکتے ہوئے پیمانے سے

قدح خواری کے نئے ظرف ملاحظہ ہوں سے

ہمارے، شیشہ وساغر ہیں یہ مہ وخورشید — ہمارے پینے کا اک خُم ہے آسمان نہیں

انتہائے شوق مینوشی کا یہ حال ہے کہ بعد مرگ بھی اُسی کی تمنا کرتے ہیں سے

کھُلیں نہ قبر میں جنت کی کھڑکیاں رندو — دماغ میں جو بسی ہے اُسی کی بو آئے

بلکہ ایسی پی کے دنیا سے جاتے ہیں کہ حشر کے دن بھی خمار باقی رہتا ہے سے

یہ کیسی پی کے گئے تھے لحد میں سونے ہم — کہ آج حشر کے دن بھی خمار باقی ہے

انھیں خمریات کے باعث معاصرین نے انھیں "خیام الہند" کا خطاب بھی عنایت کیا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ اگر اُردو شعرا میں کسی پر یہ خطاب زیب دیتا تھا تو وہ ریاض کی ذات تھی سے

'در سخن پنہاں شدم مانند بو در برگ گل

ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا'

پر یقین رکھنے والے بلا خوف تردید کہدیں گے کہ ریاض ایک پکّے مے آشام تھے۔ کیونکہ جو شخص ایسے شعر کہتا ہو کہ سے

نظر بچا کے بغل میں دبا کے شیشۂ مے — کہیں ریاض بھی پینے پلانے جاتے ہیں

ہے ریاض اک جوانِ مست خرام — نہ پیے اور جھومتا جائے

یا اس سے بڑھ کر یہ کہ سے

ریاض ہائے رے تیرا وہ خواب کا انداز — سبو تو سر کے تلے دستِ شوق ساغر پر

ناممکن ہے کہ تردامنی سے پاک ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ انکی یہ سب باتیں صرف زبانی تھیں، پینا تو درکنار دُختِ رز کی صورت سے نفرت کرتے تھے۔

خمریات تو ریاض کی شاعری کا خاص رنگ ہے لیکن وہ زاہد و شیخ کی خبر لینے سے بھی غافل نہیں رہے۔ اور یہ انکی شوخی طبع کا مقتضا تھا۔ انکی شوخی نے زاہد عورتوں اور پارسا وضعوں کا تو کیا ذکر ہے "یہ اہل صومعہ چھپ چھپ کے کیا نہیں کرتے" حسینوں پر بھی جا بجا چوٹیں کی ہیں۔ یہ

دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

ابھی چُپ ہوں محشر میں افشا کر دوں گا　　حسینوں کے رازِ نہاں کیسے کیسے
ہے شکل میری مقدس تو پوچھتے ہیں سب　　انھیں بھی گیا کوئی دنیا کا کام آتا ہے

معاملاتِ عشق میں وہ معشوق سے دب کے نہیں رہتے، تیوریاں چڑھانے سے ڈرتے نہیں بلکہ خود دھمکی دیتے ہیں ؎

میں ڈرتا ہوں یہ کہہ کے حسینوں کو ریاضؔ　　جو نہ پورا ہو وہ ارمان مرے دل میں نہیں
وصل کی شب نہ چلی ایک بھی شوخی اُنکی　　کچھ نہ بن آئی تو چھلے سے کہاں مان گئے

اس بات میں ابھی ریاضؔ کا قدم بہت آگے بڑھ گیا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ آج تک معشوقوں نے جتنے ستم عاشقوں کی جان پر ڈھائے ہیں وہ ان سب کا انتقام لیتے ہیں۔ دیگر شعراء کے کلام میں عاشق معشوق کی ناز برداریاں کرتا نظر آتا ہے لیکن ریاضؔ معشوق سے بھی نازک مزاج تر ہیں۔ بہت جلد روٹھ جاتے ہیں اور پھر معشوق انھیں منانے پر مجبور ہو جاتا ہے ؎

چھیڑ کیسی، بات کہتے روٹھ جاتے ہیں ریاضؔ　　اک حسیں ہر وقت ہو انکو منانے کے لیے
ہم سے دیوانے ریاضؔ اور کہاں نازک طبع　　کہ جو وہ پھول سے بھی ماریں تو فریاد کریں

ریاضؔ نے شیخ و ناصح کی ایسی خبر لی کہ اُسکا شہرہ شہر لندن تک جا پہونچا۔ چنانچہ جناب ہادی صاحب لکھنوی نے جب اُنکا یہ شعر ؎

ناصح کے سر پہ ایک جمائی تڑاق سے　　پھر ہاتھ مل رہے ہیں کہ اچھی پڑی نہیں

ایک تقریر کے سلسلہ میں وہاں بیان کیا تھا تو اس کی وضاحت پر تمام ہال چیرز سے گونج اُٹھا تھا بلکہ اس شعر کو وہاں ایسا حسن قبول حاصل ہوا تھا کہ اخبارات میں بھی اسکی تعریف پُر زور الفاظ میں کی گئی تھی۔ اسی زمرہ کے اور چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

دل نہ مانا حضرتِ واعظ کو آتا دیکھ کر　　کچھ یوں ہی تھوڑی سی پی لی دل لگی کے واسطے
منبر نہیں ہے تختِ شہی ہے یہ وقتِ وعظ　　واعظ نہیں ہے جھوٹوں کا یہ بادشاہ ہے
جیب سے غافل حرم والو نہیں رہتے کا وہ　　آنے والا کچھ بہت ہی ہوشیار آنکلو ہے

ریاضؔ شوخ غزل گوئی کے لیے پیدا ہوئے تھے۔ جس کی مثال اُنکی ہر غزل میں قدم قدم پر ملتی ہے اسے ایک طرف رکھ کے اگر ان کی غزلیات پر نظر ڈالی جائیگی تو درد۔ تغزل۔ سوز و گداز۔ تاثیر اور بلندی خیالات وغیرہ کی ایسی مثالیں بھی ملیں گی جنھیں ہم اُردو شاعری کا

اعلیٰ نمونہ کہہ سکتے ہیں۔ تغزل دراصل غزل کی جان ہے اور جب کبھی اسکا ساتھ حُسن بیان سے ہوتا ہے تو شعر کا درجہ بہت بلند ہوجاتا ہے۔ ذیل کے اشعار اس اعتبار سے خاص طور پر قابلِ ملاحظہ ہیں ؎

نالہ نالہ رہے، فریاد نہ فریاد رہے
کوئی کہہ جائے کہ ناشاد مرا شاد رہے

سمجھ کر سرگزشت غیر اُنکو لطف آتا ہے
سنا کرتے ہیں پہروں مُنہ سے میرے داستاں میری

کیوں مجھے رخصت کریں کیوں حشر کا پیماں کریں
نزع میں کیوں آئیں مجھ پر آپ کیوں احساں کریں

اُجڑے دل میں گشت کرتا ہے حسینوں کا خیال
وہ پریخانہ ہے جس گھر کو حسیں ویراں کریں

کیوں اُڑے پھرتے ہیں مجھسے دل ہدف کیونکر بنے
رُخ ذرا میری طرف بھی ناوکِ مژگاں کریں

جفا میں نام نکالو نہ آسماں کی طرح
کُھلیں گی لاکھ زبانیں مری زباں کی طرح

جو ہوکے سیہ مست لپٹتی ہیں بلائیں
بے تیرے مزا اے شبِ ہجراں نہیں ہوتا

کچھ آئینہ نے اور ہی عالم دکھا دیا
دونوں کو ایکدوسرے نے کیا بنا دیا

وہ ستاتا ہے ستاتے جو نہیں تم مجھ کو
دھوکے دیتا ہے بُری طرح توہم مجھ کو

اسی تخئیل سے ملتا جُلتا مصحفی کا بھی شعر ملاحظہ ہو ؎

وجہ جمعیتِ خاطر سرو ساماں نہ ہوا
دل ہوا اور پریشاں جو پریشاں نہ ہوا

ہمارے شعرا کے دواوین میں ایسے اشعار کی تعداد بہت زیادہ ہے جن میں درد وغم اور رنج وبیکسی کا اظہار کیا گیا ہے اور جو باعثِ انقباض ہوتے ہیں خصوصاً حضرت عزیزؔ لکھنوی کا کلام۔ لیکن اسکے برخلاف ریاضؔ کے کلام کا بیشتر حصہ ایسا ہے جس میں خوشی ومسرت کا اظہار کیا گیا ہے اور جو باعث انشراح وانبساط ہوتا ہے۔ ذیل میں اس قسم کے اشعار ملاحظہ فرمائیے ؎

بہار آتے ہی پھولوں نے چھاؤنی چھائی
کہ ڈھونڈتا ہوں مجھے آشیاں نہیں ملتا

دام اس رنگ سے گلشن میں بچھانا صیاد
میں سرِ شاخ چلوں سایہ تہِ دام رہے

گلوں کے بھیس میں شکلیں ہیں مہ جبینوں کی
یہ ڈالیاں ہیں کہ ہیں ڈولیاں حسینوں کی

مزہ ہو کہ جُھک جُھک کے رہ جائے بجلی
گلوں سے چھپا ہو نشیمن کسی کا

گیا چمن میں تو جھک کر بہت ملیں شاخیں
لیا گلوں نے مجھے میرے آشیاں کی طرح

لیکن ریاضؔ جب درد انگیزی کی طرف مائل ہوتے ہیں تو شعر میں ایسی تاثیر درد بھر دیتے ہیں کہ سننے والا تڑپ جاتا ہے ؎

ہنگام نزع گریہ عجب بیکسی کا تھا — تم ہنس دیے یہ وقت بھلا کیا ہنسی کا تھا

اُٹھاؤ پھول کہ بستر بنے گا بستر مرگ — نہ رات کچھ ہے نہ اب انتظار باقی ہے

آرزو کا ہائے یہ کہنا کسی مایوس سے — اب چلے ہم بھی خدا حافظ بہت دل میں رہے

سوکھے ہوئے مرجھائے ہوئے پھول لحد پر — آجاتے ہیں دو چار کبھی اُڑ کے ہوا میں

ریاض نے غزل میں مضمون آفرینیاں بھی کی ہیں لیکن تغزل کے سررشتہ کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا اور داخلی پہلو کا رنگ دے کر مضمون کو خوبصورت بنا دیا ہے جس سے اشعار دائرۂ غزل سے باہر نہیں ہونے پائے بلکہ اُن میں ایک خاص لطف پیدا ہو گیا ہے ؎

خون میں ڈوبی ہوئی جنبش ہیں نازک نازک — مہندی کے رنگ کی پوریں کفِ قاتل میں نہیں

چھپ کے وہ میری نگاہوں سے مرے دل میں رہے — شمع خلوت میں رہی پروانے محفل میں رہے

یہ بن بن کر حبابِ نرگسِ مستانہ آتا ہے — کفِ گلرنگ پر ساقی کے کیوں پیمانہ آتا ہے

گلے مل کر جھکی۔ جھک کر رُکی۔ رُک کر کھنچی قاتل — تری شمشیر کو بھی نازِ معشوقانہ آتا ہے

لطف ہے مقتل میں چمکیں آج دو دو بجلیاں — آستیں تو چڑھ چکی ہے تیغ بھی عریاں کریں

اُن کا شہبازِ فکر جب بلندی کی طرف پرواز کرتا ہے تو اعلیٰ مضامین شکار کر لاتا ہے۔ ان چند شعروں کی علوِ تخیّل قابل ملاحظہ ہے ؎

اس نزاکت سے مہِ نو کا نمایاں ہونا — چاہتا ہے کوئی نازک سا گریباں ہونا

کتنے کعبے ملے رستے میں کئی طور ملے — ان مقامات سے ہم کو وہ بہت دور ملے

سحر ہوتے وہ اپنا چاک دامن لے کے بیٹھے ہیں — رفو کرنے کو تارِ دامنِ مریم نکلتا ہے

جہاں ہم خشتِ خم رکھ دیں بنائے کعبہ پڑتی ہے — جہاں ساغر پٹک دیں چشمۂ زمزم نکلتا ہے

ریاض کی شاعری میں اُن کی زبان بھی خاص طور پر قابل توجہ ہے۔ وہ الفاظ سادہ اور سلیس استعمال کرتے ہیں۔ اشعار میں بیساختگی پائی جاتی ہے اور عموماً صاف و سادہ ہوتے ہیں زبان پر انھیں قدرت کاملہ حاصل تھی انداز بیان تکلف اور تصنع سے پاک ہے اور آمد نمایاں ہے۔ محاورے اس قدر آسانی کے ساتھ نظم کر جاتے ہیں کہ یہ اُنکے آگے ایک کھیل معلوم ہوتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ہم کو نہیں چین آگ لگے سوزِ دروں کو — ٹھنڈے ہیں چراغ سرِ تربت بھی ہوا میں

مے چرانے میں ہمیں ہے یدِ طولیٰ کیسا — ہم اُڑا لائے سبو آج اچھوتا کیسا

بلا کر بام پر فریاد تم سنتے ہو نادان ہو — کھو گیا ہو جو اب سے دور سن لے آسماں میری
لگا لاتے ہیں اپنے ساتھ یہ گم کردہ راہوں کو — ہمارے رہنما ہیں پاس جو رہزن کے بیٹھے ہیں
بھرے خم کی طرح ہم میکدے سے اٹھ نہیں سکتے — یہاں بھی ہم جو بیٹھے ہیں تو لاکھوں من کے بیٹھے ہیں
ایک کانٹے کی تلی ایک ہی سانچے کی ڈھلی — بچی کلیاں ہیں کہ دل کے ترے چھالے بلبل
زہر کے سب ہیں بجھے ایک سے ہیں ایک بڑھے — ان کے ناوک، مری آہیں، ترے نالے بلبل

غرضکہ ان کا سارا کلام زبان و محاورہ کی خوبیوں سے مالا مال ہے۔

ریاض کی طبیعت ہمہ گیر واقع ہوئی تھی اور معاملہ بندی میں بھی بند نہ تھے معلوم ہوتا ہے کہ اس صنعت میں اپنے استاد کی تقلید کرتے ہیں لیکن آزادنگاری میں ان سے بھی بڑھے ہوئے نظر آتے ہیں ؎

بیٹھ جاؤں میں انھیں چھپا کے یوں حشر کے دن — لوگ سمجھیں تو کہیں وعدہ وفا ہوتا ہے
وقت ہی ایسا تھا رخصت ہوگئی انکی حیا — بات ہی ایسی تھی کھل کھیلے وہ شرمانے کے بعد

ان کی طبیعت کی شوخی نے بعض اشعار کو لباس تہذیب میں نہ رہنے دیا اور ابتذال پیدا کر دیا ؎

کہتا ہے پکار کے یہ ترا جوش جوانی — سینے سے لگا لے کوئی سینے سے لگا لے
جو مجھ کو گدگدائے وہ جوبن کا ہے ابھار — جو تم کو گدگدائے وہ میری نگاہ ہے
کہتے ہو برگ گل سے سبک تھے سب رقیب — نازک سے گورے گالوں کی رنگت گواہ ہے

جیسا کہ اس کے قبل بیان کیا گیا ریاض معاملات عشق میں معشوق سے دب کے رہنا نہیں چاہتے بلکہ اپنی شوخی سے اسے رام کر لیتے ہیں لیکن ان کی شوخی بعض اوقات حدود سے اس قدر تجاوز کر جاتی ہے کہ شعر میں واسوخت کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے نمونہ کے طور پر ہم ذیل میں صرف ایک شعر لکھنے پر اکتفا کرتے ہیں ؎

غیر کی جان کو رونے گئے تھے غیر کے گھر — زلفیں کھولے تو گئے بال سنوارے نکلے

لیکن اس قسم کے اشعار کی تعداد بہت کم ہے اور نہ یہ خامیاں انکی شہرت و کمال پر حرف لاتی ہیں۔ ہرچند کہ ہر شاعر کے کلام میں رطب و یابس اشعار کا ہونا لازمی ہے لیکن اس کی قدر و منزلت کے لیے یہ کافی ہے کہ اسکے محاسن کا پلہ معائب سے زیادہ بھاری ہو اور یہی حال ریاض کی شاعری کا ہے۔

ریاض پرانے شاعروں کی ایک یادگار تھے۔ اُنکے کلام میں قدیم رنگ جو اب شاید کسی میں نہیں پایا جاتا کافی حد تک موجود ہے۔ لکھنؤ کا رنگ ملاحظہ ہو ؎

دل مشتاق سے کہتی ہے یہ گھونگھٹ کی نگاہ　　　پاؤں نکلا نہیں گھر سے کبھی باہر میرا
جو گونج اُٹھی بالے کی جھنجلا کے بولے　　　لگے پیار کو آگ ابھی کان جاتا
کہاں سے چلے ہیں حبیبیں پہ چنے ہوئے افشاں　　　کہاں وہ حسن کی دولت لٹانے جاتے ہیں

ابتدا ہی سے رعایت لفظی ہمارے شعرا کے مرغوب طبع رہی ہے بلکہ بعض تو اس صنعت کے عاشق تھے۔ آمانت نے اسی کے پیچھے اپنی شاعری کو ڈبو دیا۔ اس صنعت کی خوبی یہ ہے کہ مناسبت سے الفاظ اس طرح استعمال کیے جائیں کہ تصنع کا شائبہ بھی نہ پیدا ہو۔ ہر لفظ معنی دیتا ہو اور پڑھنے والے کو اس کا ادراک و احساس نہ ہو۔ ریاض کی شاعری میں اسکے بہترین نمونے ملتے ہیں ؎

حنا دل میں صبا میں چل گئی تھی　　　اُڑا دی بات پھولوں نے ہنسی میں
سو گیا ہوں دھوپ میں تو میرے جاگے ہیں نصیب　　　آج مجھ تک سایۂ دیوار یار آنے کو ہے
پڑ گئی ہے شام سے دن کے پھولوں پر کچھ اوس　　　ہنسنے والا آج شاید اشکبار آنے کو ہے
لیے بیٹھے رہو اپنے لیے تم آرسی اپنی　　　خوشامد خوری نہ دیکھی ہماری دیکھی بھالی ہے

اسی ضمن میں یہ ذکر کرنا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ریاض نے اب تک چند قدیم محاوروں کو جاری رکھا اور اُنکو اپنے اشعار میں اس طرح جگہ دی کہ وہ خوشنما معلوم ہوتے ہیں ؎

شمع کھل کھیلی ہے پروانوں سے آج　　　کچھ سُنے گی وہ لب گلگیر سے
اتنے لیے کہ آؤ بھگت میکدے میں ہو　　　پوچھا جو گھر کسی نے تو کعبہ بتا دیا
میں نے اے صبا دھر پایا قفس میں رہ کے خوب　　　مجھے آزاد کریں وہ مجھے آزاد کریں
کہتا ہے پکار کے یہ مرا جوش جوانی　　　سینے سے لگا لے کوئی سینے سے لگا لے
اشک کے چلتے آہ کے مارے　　　آسماں بھی نہیں زمیں بھی نہیں

اب ہم اُنکے کلام سے انتخاب کر کے چند اشعار لکھتے ہیں تاکہ ارباب سخن اچھی طرح مستفید ہوں

قیامت اور قیامت میں آئی خوب ہوا　　　بتوں نے چھیڑ دیا سامنے خدا کے مجھے
شوخی سے ہر شگوفہ کے ٹکڑے اُڑا دیے　　　جس غنچہ پر نگاہ پڑی دل بنا دیا
گل مرتے ہیں ترے چاک گریبانوں کے　　　شکل معشوق کی انداز ہیں دیوانوں کے

مقبول دعائیں نہیں ہوتیں نہیں ہوتیں — قسمت میں ترسنا ہے ترستے ہیں اثر کو
بیدرد تجھ کو بات کا جب بھی یقیں نہ ہو — ہم رکھدیں سامنے جو کلیجہ نکال کے
سُنکے نالے مرے مُنہ پھیر کے ہنسنا اُنکا — ہنس کے کہنا کوئی دیوانہ ہے سودائی ہے
چھیڑتے ہیں پا کے موقع اُنکے اُترے ہار بھی — بنتے ہیں کیوں دل ہمارا پھول مرجھانیکے بعد
کوئی ہیرے کی کنی سے کم نہ تھا ہنگام ضبط — کچھ ہمیں پینے پڑے آنسو بھی غم کھانیکے بعد
یہ بدلنے کے نہیں لاکھ زمانہ بدلے — مجھ سے بدبخت کا دن غیر سے بدذات کی رات
مجھ سے بے پردہ ملے مل کے کیا گم مجھ کو — ایک اس ساری خدائی میں ملے تم مجھ کو

حقیقت یہ ہے کہ ریاض دَورِ قدیم کے ایک قابل عظمت یادگار اور اس عہد میں جہان سخن کی جان تھے۔ تمام ہندوستان میں ان کی شاعری کی دھوم تھی اور سب انکی سیف زباں کا لوہا مانتے تھے ؎

یادگار اسوقت ہم بھی ہیں زمانہ میں ریاضؔ — مانتے ہیں سب ہمیں ہم مانتے ہیں میر کو
ہندوستاں میں دھوم ہے کس کی زبان کی — وہ کون ہے ریاضؔ کو جو جانتا نہیں

اختتام کلام پر ہم ریاضؔ کے مخصوص رنگ یعنی خمریات سے چند شعر درج کرکے اس مضمون کو ختم کرتے ہیں ؎

اُٹھے کبھی گھبرا کے تو میخانے کو ہو آئے — پی آئے تو پھر بیٹھ رہے یادِ خدا میں
مرگیا ہوں یہ تعلق ہے جو میخانے سے — میرے حصے کی چھلک جاتی ہے پیمانے سے
کس غضب کی ہوا میں مستی ہے — کہیں برسی ہے آسمان سے آج
کاٹے کٹتی نہیں مجھ مست سے برسات کی رات — میکدے والی جو مل جائے تو کچھ کام چلے
توبہ سے ہماری بوتل ابھی — جب ٹوٹی ہے جام ہو گئی ہے

بوتل جام بنی ہو یا نہ بنی ہو بلکہ ٹوٹی ہو یا نہ ٹوٹی ہو، ہمیں ریاضؔ کے لیے افسوس سے لکھنا پڑتا ہے کہ

آں قدح بشکست وآں ساقی نماند

بدنام ترک

(جناب مولوی خلیل الرحمن صاحب مترجم اخبار الاندلس وغیرہ)

پندرہ سولہ برس ہوئے کہ ایک صاحب، مسٹر سٹڈرڈ، امریکی نے دو تین کتابیں مسلمانوں کے متعلق لکھی تھیں۔ ان میں مسلمانوں کی بے حد تعریفیں کی گئی تھیں۔ شاید انسان کی فطرت ہی ایسی ہے کہ وہ اپنی تعریفیں سننے سے بہت خوش ہوتا ہے۔ یہ کتابیں بہت شوق سے پڑھی گئیں، اور شاید ایک کا اردو ترجمہ بھی شائع ہوا۔ اہل نظر حضرات اسی وقت سمجھے تھے کہ یہ نظر بندی اس لیے ہے کہ رقیب اصلی حالت سے واقف ہو کر جن کی تعریف کی گئی ہے ان کی تباہی کا فکر کریں۔ چناں چہ اسی وقت سے کانٹے بونے کا فکر شروع ہوا۔ اُن میں سے بعض اس قابل ہو چکے ہیں کہ جسم میں چبھنے لگے ہیں۔ اللہ کریم انکے زہروں سے محفوظ رکھے۔

اب ایک دوسرے امریکی مسٹر ای الگزینڈر پاویل نے ادھر توجہ فرمائی ہے اور ایک کتاب، موسومہ "مسلم ایشیا میں حکومت کی جد و جہد" شائع فرمائی ہے۔ اس کے دیباچے میں ناظرین کو یہ یقین دلایا گیا ہے کہ وہ بدنیت نہیں ہیں۔ ہم مسلمان گرم دودھ سے ایسے جلے ہیں کہ چھاچھ کو بھی پھونک پھونک کر پیتے ہیں؛ اس واسطے مترجم صرف اتنا ہی کہنے کی جرأت کرتا ہے کہ "اللہ کرے کہ مسٹر پاویل بدنیت نہ ہوں۔" ذیل میں اس کتاب کے ایک باب کا ترجمہ درج ہے۔ شاید ناظرین کو بالا لحاظ ملت و قومیت، پسند آئے اور نئی باتیں معلوم ہوں، اس کتاب کے کُل ۳۱۲ صفحات ہیں اگر کوئی صاحب اس کا ترجمہ کر دیں تو غالباً دلچسپ ہو گا۔ اگر اور کچھ نہیں تو اس ہی وجہ سے کہ اس میں زیادہ تر مسلمانوں کی تعریف کا پہلو نکلتا ہے۔

جو بزرگ کہ اردو کی رصدگاہوں میں صرف انشاء اردو کی دوربین سے کچھ نکالنے کے لیے مرتب اور دنیائے اردو کے محسن ہیں اُن کی خدمت میں التماس ہے کہ یہ ترجمہ قریباً تحت اللفظ ہے۔ اس صورت میں انشاء میں نمایاں ہونی مسلّم۔ یہ حضرات مترجم کو۔

اگر بخشیں زہے رحمت نہ بخشیں تو شکایت کیا

ہم نے تاریخ عالم کے نہایت حیرت ناک اور عجیب و غریب ڈراموں میں سے ایک تماشا اپنی

آنکھوں سے دیکھا ہے۔ ایک مختصر سے عرصے میں، جو پانچ برس سے بھی کم کا تھا اور جو ۳۱ راکتوبر ۱۹۱۸ء
کو مُدرانیا کے عارضی معاہدہ التوائے جنگ سے شروع ہو کر ۲۴ رجولائی ۱۹۲۳ء کو لوزان کے معاہدے
پر دستخط ہونے کے دن ختم ہوتا ہے، ہم نے ایک نئے ٹرکی کو اس طرح اُٹھتے دیکھا، جیسے ایک ضعیف البنیان،
حقیر و ذلیل کھنڈر سے زمانۂ حال میں ایک ابوالہول اُٹھ کھڑا ہو۔ ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ اس
جواں عمر قوم (ٹرکی) نے جو اندرون حکومت موجودہ جمہوری حکومتوں سے بھی زیادہ جمہوری ہے،
کامیابی کے ساتھ فتح مند اتحادیوں کا مقابلہ کیا ہے؛ حال آں کہ یہ اتحادی، اطمینان کے ساتھ،
یہ یقین کیے بیٹھے تھے کہ ہم نے اُس (عثمانیہ) سلطنت کو اتنا کم زور کردیا ہے کہ وہ بالکل عاجز و فرماندہ
ہوگئی ہے اور اُس میں ہم سے کھڑے ہونے کی طاقت ہی نہیں چھوڑی۔ اسی شکستہ و فرسودہ سلطنت
نے اُس معاہدے کے پُرزے کر کے پھینک دیے جس کو تسلیم کرلینے کے لیے اتحادی اُسے مجبور
کر رہے تھے۔ اُس مقہور سلطنت نے یونانیوں کی اُس فوج کو نیست و نابود کردیا، جو اُس کے خلاف
بھیجی گئی تھی۔ اُس نے برطانیۂ عظمیٰ، فرانس، اٹلی اور یونان کو مجبور کیا کہ وہ اپنی اُن چالوں پر جو
وہ ایشیاء کوچک میں اپنے حدود کے اضافے کے لیے چل رہے تھے "تمت تمام شد" لکھ دیں۔ اُس نے
یورپ کے کابینوں کو توڑنے اور یورپ کے ایک بادشاہ سے تاج و تخت چھوڑانے میں کامیابی
حاصل کی؛ ایک لایق ترین سیاست داں کو، جو کونسل کی میز پر بیٹھا حکم رانی کر رہا تھا، نیچا دکھلایا۔ اُس نے
اپنے فوجی اقتدار میں وہ تفوق حاصل کیا جو سلطنت عثمانیہ پر کسی سلطان نے پچھلے ڈھائی سو برس
میں نہیں دیکھا تھا۔ اُس نے حکومت اور دین کو ایک دوسرے سے جدا کردیا، اور اس پر لطف
یہ ہے کہ پھر بھی دُنیا، اسلام کا وہ غیر متنازعہ راہ بر و راہ نما بنا رہا۔ ہماری آنکھوں نے اُن سلاطین
کے آخری جانشیں کو معزول ہوتے دیکھا ہے، جو چھ سو برس سے ترکوں پر بہت بُری طرح حکومت کرتے
آرہے تھے۔ ہم نے ترکوں کے دارالسلطنت کو باسفورس کے کنارے سے اندرون ایشیا کے ایک
غیر معروف مقام پر منتقل ہوتے دیکھا ہے؛ حال آں کہ مقدم الاسم وہ مقام تھا، جو بازنطینیوں کے
انتزاع کے بعد سے اُن کا مستقر چلا آتا تھا۔ ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ جن مارے کوٹے اور
ناکارہ ترکوں کے متعلق یہ یقینی خیال تھا کہ وہ یورپ سے لات مار کر نکال دیے جائیں گے، اُنھوں
نے یہ کر دکھایا کہ اپنی حدود سلطنت کو اُس مقام سے بھی اور آگے بڑھا لے گئے جہاں وہ جنگ عظیم
سے پہلے تھے۔ ہماری آنکھوں نے دیکھ لیا کہ اُن کے متعلق جتنی پیشین گوئیاں تھیں اُن کے برخلاف
پیش آیا۔ میں اوراق مابعد میں ایک قوم کے از سر نو اقتدار حاصل کرلینے کی وہ داستان بیان

کرنا چاہتا ہوں، جو نہ صرف حیرت انگیز ہے، بلکہ قسمت کی ایسی نیرنگی کا قصہ ہے جس پر اگر ہم خود نہ دیکھ لیتے تو اعتبار کرنا مشکل تھا۔ تاریخ میں اس کی بہت کم مثالیں ملتی ہیں۔ یہ اولوالعزمی و بلند نظری، بدظنی و شکوک، رشک و حسد اور سازشوں کی ایک وا شگاف حکایت ہے جس نے یہ صورت ممکن کر کے دکھلا دی۔

امر واقعہ یہ ہے کہ امریکہ کے لوگوں کو غلط خبریں دی گئیں، اور اُن کو اس دعائیہ[1] نے بالکل اندھا کر دیا، جو ترکوں کے برخلاف کیا گیا؛ اخبارون کے کالموں اور گرجاؤں کے منبروں نے اُن کے خلاف ایسی کارروائیاں کیں کہ بیان کا نہ جھوٹ اور دروغ بافی میں اُن کی مثال شاید نہ ملے یا بہت ہی کم ملے۔ یہ دعائیہ ایسی عیاری، مکاری، دغابازی، مگر باقاعدگی سے کیا گیا اور داعیوں نے ایسی ہوشیاری کے ساتھ ہماری قوم اور ہمارے مذہب کے تعصبات سے کام لیا کہ ہم نے اس کی ظاہری صورت پر اعتماد کر لیا اور ہمیں اس کا یقین آ گیا کہ تُرک کی صحیح تصویر ویسی ہی ہے جیسی کہ اُسکے دشمنوں نے کھینچی ہے۔ ترکوں کے خصائل کا ہمیں صرف سماعی علم تھا؛ کیونکہ امریکہ میں فی الحقیقت کوئی تُرک ایسا نہیں ملتا جو اپنا حال خود بیان کرے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب لفظ "تُرک" ہمارے سامنے بولا جاتا تھا تو ہمارے روبرو ایسی ہستی آ جاتی تھی، جو عداوت و فساد، تعصب و غیر رواداری اور شک و شبہ کا ایک مجسمہ ہوتی تھی۔ ہمارے ذہن میں وعایٹ بیپل کے گُنڈوں کی بات آ جاتی تھی کہ "یار دیکھو تو! وہ اجنبی آ رہا ہے؛ اس کے ایک لات تو لگے"۔

مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اب وہ وقت آ گیا ہے کہ امریکہ والے تُرک اور ٹرکی کے متعلق صحیح بات سنیں۔ وہ وقت آ گیا ہے کہ وہ آنکھیں کھول کر صحیح طور سے واقعات پر نگاہ ڈالیں اور اُس عجیب و غریب بڑے جزیرہ نما کے اندرونی اور واقعی حالات معلوم کریں، جو بحر اسود کو بحر روم سے جدا کرتا ہے۔ وہ وقت آ گیا ہے کہ وہ ترکوں کی حالت اُس عینک سے دیکھیں، جس پر ناواقفیت، تعصب یا غلط فہمی نے اپنا رنگ نہیں چڑھا دیا ہے۔ یہ نہایت موزوں وقت ہے کہ وہ اتحادیوں کے اُن

---

[1] پروپےگنڈا ایسا لفظ ہے کہ اس کے لکھنے میں کوفت اور پڑھنے میں زبان کو سکتہ ہوتا ہے: اس کی مکروہ صورت کو تو کون کہے۔ مسلمانوں کے یہاں یہی چیز کئی بار اسی کیفیت کے ساتھ ہو چکی ہے۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ سختی کے ساتھ۔ انھوں نے اس کو دعوۃ یا دعوے کہا ہے؛ مثلاً دعوۂ عباسیہ، جس نے کامیابی کے ساتھ عربی سلطنت بنو امیہ کی جڑیں اکھاڑ دیں؛ دعوت اسمٰعیلیہ، جس نے عارضی کامیابی حاصل کی وغیرہ وغیرہ۔ میں نے حیدرآباد کے لفظ دعائیہ کو پروپےگنڈا کا مترادف استعمال کیا ہے۔ اگر میں غلطی پر ہوں تو امیدوار اصلاح ہوں (مترجم)

سیاست دانوں کی پالیسیوں کو غور سے دیکھیں، سمجھیں اور جانچیں جو مشرقِ قریبہ کے سوالات کا بیکار ڈھنڈورا پیٹ پیٹ کر دنیا کے امن وامان میں خلل ڈال رہے ہیں۔

ترکوں کے متعلق ان ابواب کے لکھنے میں اُن لوگوں کو میں مخاطب نہیں کرتا جو گلیڈسٹون کی پرانی روایات سے ایک ہی طرف کو مائل ہو گئے ہیں اور اس کا یقین رکھتے ہیں کہ ان "ناقابلِ بیان" (ترکوں کو انھوں نے یہی خطاب دے رکھا ہے) کو نہ صرف یورپ سے بلکہ دنیا بھر سے نکال باہر کرنا چاہیے۔ میں اُن لوگوں کو سمجھانے کی کوشش نہیں کرتا، جو تعصب کے رنگ میں اتنے سرشار ہیں کہ وہ ترک کی بات سننا ہی نہیں چاہتے، اور جن کے دل اتنے سخت ہو گئے ہیں کہ وہ یقین کیے بیٹھے ہیں کہ "امریکہ کا پرانا باشندہ صرف وہی اچھا تھا جو مر چکا ہے"۔ میرا روئے سخن اُن معقول پسند اور فراخ دل لوگوں کی طرف ہے جن کے متعلق مجھے یقین ہے کہ وہ ترکوں کی عادات کے متعلق صحیح و بے لوث بات سننا چاہتے ہیں، خواہ وہ کیسی ہی ناگوار کیوں نہ ہو اور خواہ اُن کو اپنی رائیں ہی کیوں نہ بدلنا پڑ جائیں۔

لیکن قبل اس کے کہ آگے بڑھوں، میں بالکل صاف طور پر یہ بتلا دینا چاہتا ہوں کہ میرے پاس ترکوں کی طرف سے کوئی وکالت نامہ نہیں ہے۔ میں ترکوں کا ہرگز طرف دار نہیں ہوں؛ نہ کوئی شخص مجھ پر یہ الزام لگا سکتا ہے کہ میں یونانیوں، ارمنیوں یا انگریزوں کا معاند ہوں۔ میں یہ ابواب صرف اس لیے نہیں لکھ رہا ہوں کہ ترکوں کی طرف سے عذر خواہ ہوں، یا ان کو الزامات سے بری کرانا چاہتا ہوں، بلکہ اس لیے لکھ رہا ہوں کہ اب تک وہ رائے عامہ کے سامنے بالکل گونگا بہرا بنا ہوا کھڑا ہوا ہے، اُس کی طرف سے کوئی بولنے والا بھی نہیں۔ یہ صورت ایسی ہے کہ امریکہ کے طرزِ عدل و انصاف سے بالکل بعید ہے۔ ممکن ہے کہ ایک شخص مجرم ہو، مگر مہذب برادری میں یہ دستور ہے کہ سزا دینے سے پہلے اُس کا بیان بھی سُن لیتے ہیں۔

ترکوں کی طرف سے بیان دیتے وقت میں اپنے آپ کو اُس حالت میں پاتا ہوں جس میں میرا ایک نہایت لائق وکیل تھا۔ ہم دونوں اٹھارویں دفعہ اور اُس کی ترمیم پر بحث کر رہے تھے۔ وہ کہنے لگا کہ: "اگرچہ میں خود شراب کو کبھی چھوتا نہیں، مگر اُس کی ممانعت میں جو قانون بنا ہے اُس کو میں پسند نہیں کرتا۔ مجھے اس کا یقین ہے کہ وہ اصولاً غلط ہے۔ باوجود اس کے میں یہ بات علی رؤس الاشہاد بھی نہیں کہنا چاہتا جیسے کہ وہ مشہور و معروف اور ایمان دار آدمی نہیں کہہ سکتے جو اس قانون کے خلاف رائے رکھتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اگر میں ایسا کروں تو گویا میں اُن متقیوں اور

بڑی منظم جماعت اور صاحب اثر لوگوں کے مقابلہ میں کھڑا ہوتا ہوں جو یہ ظاہر کریں گے کہ شراب کی ممانعت کے خلاف کہنے کی وجہ سے میں ایک گناہ میں شامل ہو رہا ہوں"۔

اگر ترکوں کے متعلق سوالات پر صاف صاف طور سے بحث کی جاوے تو بعینہ یہی بات سامنے آتی ہے۔ میں اپنی حیثیت کو اس معاملے میں صاف کرنے سے اسی لیے مایوس سا ہوں۔ میں اس بات کو اچھی طرح جانتا ہوں کہ امریکہ کی پبلک کا ایک بڑا قوی اور معزز گروہ ایسا ہے (جس میں زیادہ تر مذہبی لوگ شامل ہیں) جو ترکوں کے سخت خلاف ہے اور یہ نیک نہاد لوگ یہ دیکھ کر بہت خوش ہوں گے کہ اگر ممکن ہو تو ترکوں کو اقوام دنیا کی برادری سے خارج کر دیا جاوے۔ میں اس سے بھی واقف ہوں کہ اگر میں اُن کے سامنے ترکوں کے متعلق اپنا مقصود اصلی ظاہر کروں تو وہ اسکو دوسرے معنوں پر محمول کریں گے اور مجھ پر یہ الزام لگائیں گے کہ میں اُن کے قتل عام کرانے اور اُن کی بدعملی کی حمایت کر رہا ہوں۔ میں ترکوں کی خوفناک بے رحمی اور ظلم کے معاملے میں، جس نے اتنے عرصے تک ترکوں کی حکومت کو بدنام کیے رکھا، اُن کو ملامت کرنے میں کسی سے دبنے والا نہیں ہوں؛ مگر یہ کہنا بھی بالکل سطحی ہے کہ ترکوں نے ارمینیوں کا قتل عام کیا، اُنھوں نے اپنی رعایا پر ابتری کے ساتھ حکومت کی، وہ نہ کبھی اچھے رہے، نہ اچھے رہیں گے۔ میں اتنا ہی کہہ کر اس معاملے کو یہیں چھوڑ دوں گا۔ باوجود اس کے کہ مجھے یہ خطرہ ہے کہ میں جو کچھ کہوں گا اُس کو توڑ مروڑ کر یہ کہا جاوے گا کہ میں ترکوں کے جرائم کو کم کر کے دکھلا رہا ہوں، میں یہ چاہتا ہوں کہ اوراق مابعد میں اپنی قابلیت کے موافق ٹرکی کے متعلق جو پیچیدہ سوال ہے اُس کو بغیر کسی کی حمایت کیے کھول کر دکھلا دوں۔

امریکہ والوں کے دلوں میں ترکوں کی دشمنی گہری بیٹھی ہوئی ہے، جس کے کئی وجوہ ہیں۔ کوئی شبہ نہیں کہ ان میں سے بڑی وجہ تو یہ ہے کہ زمانہ گزشتہ میں اُنھوں نے اپنی عیسائی رعایا کے ساتھ بڑا بے رحمانہ سلوک کیا، خاص کر ارمنیوں کے ساتھ؛ دوسری وجہ یہ ہے کہ اُن سے دینی تعصب ہے اور اُن کے خلاف سیاسی دعائیہ کیا گیا ہے۔ اب یہ کہنا مشکل ہے کہ پہلا سبب کہاں ختم ہوتا ہے اور دوسرا کہاں سے شروع ہوتا ہے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ ہم کو اس معاملے میں ناکامی ہوئی اور اس سے چڑ گئے ہیں کہ وہ قوم جس کو ہم شکست خوردہ اور تباہ شدہ فرض کیے ہوئے تھے وہ پھر واپس آ گئی؛ آخری وجہ یہ ہے کہ ترک اس بات پر اڑے ہوئے ہیں کہ وہ اپنے الزامات کی جوابدہی نہیں کریں گے۔

انھوں نے ارمنیوں کے ساتھ جو سلوک کیا اُس کا جواب تو دیا جا سکتا ہے (جسکے لیے میں آگے چل کر ایک مستقل باب محفوظ کرتا ہوں) مگر یہ ممکن نہیں ہے کہ اُن پر سے یہ الزام بالکل ہی اُٹھ جائے۔ مانا کہ ارمنی بڑے غیر ہر دل عزیز ہیں اور اس قابل نہیں کہ کوئی اُن کو پسند کرے، وہ اپنی حرکات سے اوروں کو غصہ دلاتے ہیں مگر ترکوں نے اُن کے ساتھ جو کچھ بھی کیا، اس کی وجہ سے ہر سمجھ دار آدمی کو ترکوں پر لعنت ملامت کرنی چاہیے۔

ترکوں کے خلاف جو سیاسی دعائیہ ہو رہا ہے وہ سالہا سال سے چلا آتا ہے؛ اگرچہ بعض اوقات ایسے ہوتے ہیں کہ اُن کے خلاف جو کچھ کہا جاتا ہے وہ صحیح ٹھیرتا ہے؛ مثلاً اُن کی لبنان میں بے رحمیاں جن کی بناء پر اُن کے خلاف گلیڈسٹون کا مقولہ مشہور ہے۔ لیکن یوروپین اقوام نے اس دعائیہ سے اپنی سیاسیات اور اپنی حدود مملکت بڑھانے میں کام لیا۔ جب ۱۹۰۸ء میں آسٹریا ہنگری نے بوسینا اور ہرزی گوینا کو اپنی سلطنت میں ضم کیا ہے تو ترکوں کے خلاف دعائیہ سے یوروپ بھر میں ایک غلغلہ ڈال دیا تھا۔ پہلی بلقان کی جنگ کے موقعہ پر بلغاریہ، سرویہ، مانٹی نگرو اور یونان نے اس دعائیہ سے کام لیا؛ اور جنگ بلقان سے پہلے اس کو انھوں نے اس غرض سے استعمال کیا کہ جو بربریت و خوں خواری اُن کے اپنے کا ہشاجیوں نے ترکی رعایا و مقدونیہ کے ساتھ کیں اُن کی طرف دُنیا کا خیال نہ جانے پائے۔ اٹلی نے اس سے اُس وقت کام لیا جب اُس نے زمانۂ حال کی تاریخ میں سب سے بڑی ناجائز اور غیر منصفانہ لڑائی طرابلس سے اُس پر قبضہ پانے کے لیے چھیڑی۔ جنگ عظیم کے پورے چار برسوں میں اتحادیوں نے ترکوں کے خلاف دعائیہ بطور ایک جائز ہتھیار کے بالکل اسی طرح جاری رکھا جیسے جرمنی کے خلاف۔ انگلستان اور یونان اُس سے جنگ عظیم سے لے کر اُس وقت تک برابر کام لیے جا رہے ہیں۔ یہ جاری و ساری گولہ باری ایسی ہے جس کے گولہ و بارود کے اجزاء مساوی الوزن سچ، آدھے جھوٹ اور بالکل جھوٹ پر مشتمل ہیں؛ اور اسکے جواب دینے کا کوئی موقعہ ترکوں کو نہیں ملا۔ اس کے دو وجوہ ہیں: اول یہ کہ مغربی یوروپ اور امریکہ میں ترکوں کی طرف سے بولنے والے آدمی بہت کم تھے؛ دوسرے یہ کہ مغربی یوروپ اور امریکہ کی تار برقیاں اور اخباروں کے کالم ضرورتاً اُن کے لیے بند تھے۔ جہاں تک کہ اپنے مقدمے کو دنیا کے سامنے پیش کرنے کا سوال تھا ترکوں کی زبانیں بالکل بند کر دی گئی تھیں، اور اب تک بند چلی آتی ہیں۔

کچھ عجب نہیں کہ اہلِ امریکہ اس بات سے پوری طرح واقف نہیں ہیں کہ شرق قریب کے متعلق جو خبریں التواء جنگ کے چار برس بعد تک امریکہ کے اخباروں میں شائع ہوتی رہی ہیں اُن کے دس

حصوں میں سے نو حصے ایسے ہوتے تھے جو ترکوں کے دشمنوں کے ذرائع سے آتے تھے۔ اس عرصے میں قسطنطنیہ برطانیہ کے زیرِ تسلط تھا، سمرنا پر یونانیوں کا قبضہ تھا اور انگورہ (انقرہ) کا تعلق بیرونی دنیا سے اس طرح مقطوع تھا گویا وہ مریخ کے ستارے میں واقع ہے۔ کیا اہالی امریکہ اتنے بھولے بھالے ہیں کہ وہ یہ خیال کرلیں گے کہ جو خبریں ترکوں کے موافق ہوتی ہوں اُن کو قسطنطنیہ اور سمرنا کے محتسبین (سنسر) انگلستان و یونان، بغیر قطع و برید، امریکہ میں آنے دیتے ہوں گے؟ ہرگز نہیں۔ اس کے علاوہ اس امرِ واقع کو بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ خبروں کے جتنے تار یوروپین نامہ نگار امریکہ کے اخباروں کو بھیجتے تھے اُن میں سے ۹۰ فی صدی وہ ہوتے تھے جو لنڈن کے راستے سے آتے تھے۔ یہ ہرگز نہیں سمجھنا چاہیے کہ برطانیہ میں تاروں کے سنسر کرنے والا محکمہ جنگ کے بعد موقوف کردیا گیا تھا۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ ترکوں کی تار برقیوں کے ذرائع رسل و رسائل برطانیہ اور اُس کے حلیف یونانیوں کے قبضے میں تھے۔ اس وجہ سے اُن کو یہ تمہ حاصل تھا کہ جن خبروں کو چاہتے اُن کی قطع و بُرید کرکے امریکہ کے رہنے والوں کے سامنے پیش کرتے یا اُنکے بھیجنے میں دیر کرتے، یا بالکل دبا ہی بیٹھتے اور ایسی خبریں بھیجتے جو ترکوں کے موافقت میں نہیں ہوتی تھیں۔ یہ صحیح ہے کہ وہ اس ملک میں پہنچتے پہنچتے تو پُرانی ہوچکی تھیں۔ وہ اگر چھپتی بھی تھیں تو اُن کو اخبارات کے سب سے آخری صفحات میں چھپایا جاتا تھا؛ یوں اُن کا کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔ یہ ایک طرفہ "نئی خبریں" ہوتی تھیں جن پر امریکہ کے رہنے والے ترکوں کے متعلق اپنی رائیں قائم کرتے تھے۔

اتحادیوں نے جو یہ عزمِ مصمم کر رکھا تھا کہ دنیا کے سامنے کوئی ایسی بات نہ آنے دیں گے جس کا نتیجہ ترکوں سے ہمدردی ہو۔ اس کی ایک مختصر مثال یہ ہے کہ جو بین الاقوامی کمیشن اس لیے قائم کرکے سمرنا بھیجی گئی تھی (اور جس میں امریکہ کا جنرل بسٹرول بھی شامل تھا) کہ وہ اُن بے رحمیوں کی تحقیقات کرے جو یونانیوں نے ۱۹۱۹ء میں سمرنا میں اُس موقعے پر کی تھیں کہ جب انھوں نے اُس شہر پر قبضہ کیا تھا، اُس کمیشن کی رپورٹ دبا لی گئی (اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے دی گئی) اس کے مقابلے میں اتحادیوں نے اُن زیادتیوں کا حال ساری دنیا میں پھیلا دیا جو ترکوں سے وقوع میں آئی تھیں۔ انھوں نے دنیا کو اُن خوں ریزیوں کی خبروں کے دینے سے قطعی انکار کردیا، جو عیسائیوں نے ترکوں پر کی تھیں۔

ترکوں کے خصائل، اُن کے نصب العین، اُن کے مسائل حاضرہ اور اُن کے مستقبل کے متعلق تخمینہ لگانے میں اہالی امریکہ کو اُن راؤں اور پیش گوئیوں پر بہت زیادہ اعتبار کرنا

پڑتا ہے، جو آرام کرسی پر بیٹھنے والے مبصروں اور ناقابلِ اعتبار ماہروں نے ظاہر کی تھیں۔ ان لوگوں کو ترکوں کے ملک یا ٹرکی کے لوگوں کے متعلق کوئی براہِ راست اطلاع نہیں ہے۔ ایسے ہی لوگ ترکوں پر خامہ فرسائی فرماتے ہیں۔ آج کل کے مشرقِ قریبہ کے سوال پر دو کتابیں ایسی ہیں کہ سب سے زیادہ پڑھی جاتی ہیں اور اُن کے اقتباسات لیے جاتے ہیں۔ ان کا مصنف ایک ایسا شخص ہے جو اگرچہ مشرقِ قریبہ کے معاملات کا غائر مطالعہ کرنے والا آدمی ہے، مگر اُس نے ترکوں کے حدودِ اراضی کو کبھی اپنی آنکھ سے نہیں دیکھا۔ امریکہ کے اخباروں میں جو ترکوں کے معاملات پر اڈیٹوریل لکھنے والے ہیں اُن میں ۹۹ فی صدی ایسے لوگ ہیں جنھوں نے کبھی ٹرکی کی صورت نہیں دیکھی اور میں شرط لگاتا ہوں کہ ان کا ایک بھی صورت آشنا عثمانی ترکوں میں نہیں ہے۔ امریکہ کے وہ نامہ نگار جنھوں نے لوزان اور دوسرے مقامات میں صلح کی کانفرنسوں میں کام کیا ہے مقابلۃً بہت ہی کم ایسے ہوں گے جن کو ٹرکی اور ترکوں کے متعلق کوئی براہِ راست علم ہو؛ اگر انھوں نے کچھ رواروی میں معلومات حاصل کی ہیں۔ صرف اُن چند ہفتوں میں جب وہ قسطنطنیہ میں مقیم تھے، یا سمرنا اور انگورہ میں کھڑے کھڑے گئے تھے بھلا ایسے مصنفین، خواہ وہ کیسے ہی مخلص اور دل سوز ہوں، کسی مستند طریقے سے اُن لوگوں کے دلی منشا اور رمزوں پر بحث کرسکتے ہیں جو ایسے دشوار گزار مقامات میں رہتے ہوں جیسے اناطولیہ، آرمینیہ، کردستان، سلیشیا اور عراق ہیں؟ باوجود اس کے ایسے ہی لوگوں کی تحریرات کی بنا پر جن کو خود ہی بہت کم علم ہے، اہلِ امریکہ اُن مسائل کے متعلق اپنا فیصلہ صادر فرماتے ہیں جو شاید دنیا بھر میں سب سے زیادہ پیچیدہ ہیں اور جن میں بہت غلط فہمیاں ہو چکی ہیں۔

ایک مرتبہ ایک اخبار نویس نے سر ایڈون پیرس سے جو اپنے زمانے میں یوروپ کے مسائل کا سب سے بڑا ماہر تھا، یہ سوال کیا کہ "مجھے ترکوں کے متعلق جو مسائل ہیں اُن کو سمجھنے میں کتنی دیر لگے گی؟" سر ایڈون نے اُس کو یہ خشک جواب دیا کہ "حقیقت یہ ہے کہ میں ٹھیک نہیں بتا سکتا؛ میں ٹرکی میں صرف چالیس برس رہا ہوں؛"

امریکیوں کو جو ٹرکی کے متعلق بدگمانیاں ہیں وہ مشنریوں کی وجہ سے ہیں۔ میں جو یہ کہہ رہا ہوں اُس سے میرا مقصود اُن لوگوں کی تنقیص نہیں ہے۔ امریکہ کے مشنریوں نے جو کوششیں پرانی عثمانی سلطنت میں کی ہیں وہ سب کو معلوم ہیں، مگر اہلِ امریکہ کی رایوں پر جو اس کا اثر پڑا وہ غالباً کم لوگوں کو معلوم ہے۔ امریکہ کے مشنریوں نے جب وہاں کام شروع کیا ہے تو ان کو شروع ہی

میں معلوم ہوگیا تھا کہ مسلمان اپنا دین نہیں بدلتے۔ جب وہ ترکوں کو عیسائی بنانے میں ناکام رہے تو انھوں نے اپنی تمام تر توجہ عیسائیوں کی دینی، تعلیمی اور طبی معاملات کی طرف مرکوز کر دیں خاص کر ارمنیوں کی طرف۔ نصف صدی، بلکہ اس سے بھی زیادہ عرصے تک یہ مشنری مشرق قریب و متوسطہ کے متعلق ذریعہ خبر رسانی رہے اور امریکہ نے اپنی آراء کو ان ہی کی دی ہوئی خبروں کے مطابق ڈھالا۔ مسلمان ترکوں نے ان لوگوں کی مزاحمت کی تو عیسائی ارمنیوں نے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اس صورت میں یہ بات بمشکل تعجب خیز ہوگی کہ انھوں نے موخر الذکر لوگوں کی حمایت کی۔ اور جو رپورٹیں اور اطلاعیں انھوں نے وطن (امریکہ) کو بھیجیں، اور جب رخصت لیکر امریکہ آئے تو جو تقریریں انھوں نے کیں وہ سب مظلوم عیسائیوں کی طرف سے گویا جواب دہی کے لیے تھیں اور ان میں ترک ظالموں کو پیٹ بھر کر برا بھلا کہا۔ حاضرین میں وہ لوگ تھے جو مشنریوں کی پرورش کرتے تھے، انھوں نے بغیر چون و چرا کے ان ہی کی رائے کو صحیح مان لیا۔ اس طریقے سے ہمارے گرجاؤں اور کلیساؤں میں ترکوں کے خلاف بڑی قوی رائیں پیدا ہوئیں اور بڑھیں۔

جب جنگ ختم ہوئی تو یہی مشنری اور ان کے رفقائے کار وہ لوگ تھے جنھوں نے وہ قابل الذکر چیز پیدا کی جو بعد کو "مشرق قریب کی امدادی کمیٹی" کہلائی۔ اس نے جو کام کیا اس کی نسبت مختصراً صرف اتنا کہتا ہوں کہ اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ لیکن اس کمیٹی کے اکثر و بیشتر کارکن مشنری تھے، یا وہ لوگ تھے جو ان کے زیر اثر کام کر رہے تھے۔ اس کمیٹی کے اثرات امریکہ کے گھر گھر میں پہنچے ہوئے تھے۔ جیسی کہ امید کی جا سکتی ہے سب کے سب ترکی عیسائیوں کے حامی بن گئے۔ اس خصوص میں اتنا کہہ دینا بعید از انصاف نہ ہوگا کہ اس کمیٹی نے محتاج مسلمانوں کو مدد دینے میں بھی اتنی ہی محنت کی جتنی عیسائیوں کو۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کمیٹی نے سیاسی تحریکات میں بھی اپنا پیر پھنسایا تھا۔ گو ہر شخص جانتا تھا کہ اس کی ہمدردی کس کے ساتھ ہے — لیکن دانستہ، یا نادانستہ یہ ترکوں کے خلاف دعائیہ بن گیا؛ وجہ یہ تھی کہ مشنری کارکنوں نے اس کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ ایک آزاد اور قوی ترکی سلطنت کے قیام کے یہ معنی تھے کہ ٹرکی میں جو ان کے اثرات تھے وہ بہت کچھ زائل ہو جائیں گے اور بہت سی رعایتیں جو ان کو جنگ کے پہلے سے ملی ہوئی تھیں چھن جائیں گی۔

مسٹر ولیم ٹی ایلس مشرقی معاملات پر ایک مستند آدمی ہیں۔ انھوں نے "سیٹرڈے پوسٹ" میں لکھا تھا کہ:—

"معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ہم وطنوں کا اب بھی یہ خیال ہے کہ اب بھی جہاں کہیں ترک اور عیسائی ملتے ہیں وہاں خوں ریزیاں ہوتی ہیں، حالانکہ جب سے کہ پسپا ہونے والی یونانیوں کی فوج نے ترکوں کے گانوں لوٹے اور جلادئے اور وہاں کے باشندوں پر دست درازی کی اور اُن کو قتل کیا اور اس کا انتقام ترکوں نے سمرنا میں لیا، اُس وقت کے بعد سے خوں ریزی نہیں ہوئی۔ مغربی تھریس سے یہ رپورٹیں آرہی ہیں کہ یونانیوں نے مسلمانوں کو قتل کیا ہے، لیکن ایشیاء کوچک میں جو قتل عام ہوچکا ہے اُس کے مقابلے میں یہ بہت چھوٹی چیز ہے۔ خوں ریزی کے قصوں میں مبالغے سے کام لیا گیا ہے؛ اب سے چند روز پہلے قتل عام کے بعض حادثات کا جو ذکر کیا گیا ہے وہ بالکل غلط ہے۔ متذکرۂ بالا امدادی کمیٹی کے ایک مقامی (قسطنطنیہ) رکن نے جس کا تعلق اخباروں سے تھا اپنے ایک دوست سے صاف صاف کہا کہ وہ امریکہ کو ترکوں کے خلاف اس لیے رپورٹیں بھیجتا رہا کہ اس سے اُس کو روپیہ وصول ہوتا تھا!"

باشندگانِ امریکہ کے کانوں تک اصلی اور سچی بات پہنچانے میں ٹرکی کو ایک رکاوٹ بھی رہی ہے کہ امریکہ میں جو ترک رہتے ہیں اُن کی تعداد بالکل بے حقیقت ہے۔ امریکہ میں جو یونانی اور ارمنی رہتے ہیں اُن میں اور ترکوں میں کم از کم ایک اور تیس کی نسبت ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ امریکہ والوں کو اتفاقاً کہیں کوئی ترک نظر پڑ جاتا ہے، تو یونانی اور ارمنی اُنھیں اکثر ملتے رہتے ہیں۔ جب کبھی اور جہاں کہیں کوئی امریکی جوتوں پر روغن کرنے والے، یا میوہ فروش سے، یا ارمنی قالین فروش سے کہیں مل جاتا اور اُن سے باتیں کرنے لگتا ہے تو دس میں سے نو دفعے وہ اس موقعے کو ترکوں کو بدنام کرنے کا بہت اچھا ذریعہ بنا لیتے ہیں۔ جو حملے وہ کرتے ہیں وہ شاید ایک شخص پر نہ کرتے ہوں گے، لیکن بے خبر امریکیوں پر اس کا جو مجموعی اثر ہوتا ہے وہ بہت زیادہ ہے۔ اُس چمکدار آنکھوں والے یونانی نے، جو گلی کے آخر میں جوتوں کو چمکانے کی دوکان رکھے ہوئے ہے، یقیناً آپ کو یہ بتلایا ہے۔ اور بڑی تفصیل سے بتایا ہے کہ جب مصطفےٰ کمال کی فوج ماہ ستمبر ۱۹۲۲ء میں سمرنا میں داخل ہوئی ہے تو اُس نے اُس کے رشتہ داروں کے ساتھ کیا کیا (ظلم) کیا ہے۔ لیکن کوئی ترک ایسا نہیں ملتا جو آپ کو یہ بتلائے کہ چند ماہ پیشتر جب کانسٹین ٹن کی فوج اناطولیہ سے پسپا ہوئی ہے تو اُس نے اُس کے رشتہ داروں کے ساتھ کیا کیا کیا ہے۔ اسی سے آپ سمجھ لیجیے کہ آپ تصویر کا صرف ایک رخ دیکھ رہے ہیں۔

ہم کو جو ترکوں کے بہت ہی کم حالات معلوم ہیں اُس میں بھی ترکوں ہی کا قصور ہے؛ اور وہ یہ ہے کہ وہ اپنا معاملہ دنیا کے سامنے نہیں رکھتے۔ اس کی یہ وجہ نہیں ہے کہ ان کے راہ نماؤں کو عالم کی

کے ساتھ دعاؤں کو پیش کرنے کے بہت بڑے مفید اثرات معلوم نہیں ہیں، یا یہ کہ وہ ان کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتے؛ بلکہ وجہ یہ ہے کہ اول تو ان کو تشہیر جیسے بڑے اور اہم کام کی مہم کو اپنے ہاتھ میں لینے کی سکت نہیں (ترکوں کی مالی حالت ایسی نہیں ہے کہ وہ غیر ممالک میں خبر رسانی کے محکمے قائم کریں، مصنفین اور لکچراروں کو مالی مدد دیں، تصویریں شایع کریں اور بذریعہ سنیما اپنی شہرت پھیلادیں) دوسرے یہ کہ اُن کو یقین کامل ہے کہ اُن کے خلاف ممالک غیر میں جو تعصبات ہیں وہ ایسے ہیں کہ شہرت کی یہ صورتیں بالکل بے کار رہیں گی۔ مجھے سنہ ۱۹۲۲ء کے موسم گرما میں سلطان محمد ششم کی خدمت میں یلدیز کوشک کے اندر باریابی کا موقع ملا؛ میں نے یہ مشورہ دیا کہ اگر ترکوں کے خلاف غلط بیانیاں ہوتی ہیں اور اُن کے متعلق غلط فہمیاں ہیں تو اس کا علاج خود اُن ہی کے ہاتھ میں ہے۔ سلطان نے جواب دیا کہ:

"کیا فائدہ ہے؟ اگر ہم ترکوں کے لکھے ہوئے مضامین بھیجیں تو تمہارے اخبار اور رسالے اُن کو شایع نہ کریں گے، اور اگر شایع ہو بھی گئے تو تمھارے یہاں کے عوام الناس نہ پڑھیں گے اور اگر پڑھ بھی لیں تو اُن کا اعتبار نہ کریں گے۔ اگر ہم کسی طرح اپنے ایسے آدمی امریکہ بھیج بھی دیں، جو امریکہ والوں سے خود اُن ہی کی زبان میں ترکوں کا نقطۂ نظر بیان کرسکیں، تو کیا وہ اُس کو غیر جانب دار ہو کر سُن لیں گے؟"

اب میں صورتِ معاملہ کو خوب اچھی طرح سمجھ سکتا اور عوام الناس کی غلطیوں اور غلط فہمیوں کو بہ نظر اعمان دیکھ سکتا ہوں؛ کیوں کہ آخر امریکہ کے عوام کے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں ہے جس سے وہ یہ معلوم کرسکیں کہ اُن لوگوں کو باقاعدہ طور سے دھوکا دیا گیا ہے؛ لیکن میں اُن اخبارات کے لیے کوئی وجہ معافی نہیں پاتا، جو ترکوں کو بدنام کرنے کی پالیسی کو مضبوطی کے ساتھ پکڑے ہوئے ہیں اور اُن کے کالموں میں ترکوں کے خلاف جو الزامات تراشے گئے ہیں اُن کے دفعیہ کی کوئی ترکیب نہیں کرتے، حال آں کہ منصف مزاج لوگوں کو بالکل تسلی ہے کہ یہ الزامات غیر منصفانہ اور ناجائز ہیں۔ مثال کے طور پر سمرنا میں ستمبر سنہ ۱۹۲۲ء میں آگ لگنے کا واقعہ ہے۔ امریکہ کا شاید ایک بھی بڑا اخبار ایسا نہ ہوگا جس نے اپنے ایڈیٹوریل مضامین میں اس زیادتی کا الزام ترکوں کے سر نہیں لگایا۔ اُنھوں نے اس کا بھی انتظار نہیں کیا کہ ترکوں کا بھی جواب سُن لیں۔ آخر فرانسیسیوں کی ایک کمیشن اس واقعے کی تحقیقات کے لیے قائم ہوئی اس میں امریکیوں، انگریزوں اور فرانسیسیوں نے اپنا مشاہدہ بتلایا کہ یونانیوں اور ارمنیوں نے

اس شہر کو اس لیے آگ لگادی تھی کہ وہ ترکوں کے ہاتھوں میں نہ پڑ جائے۔ کتنے اخبار ایسے تھے جنھوں نے ہمت کرکے یہ مان لیا ہو کہ ترکوں کے ساتھ سخت بے انصافی کی گئی ہے؟ پھر، عالیائے تبادلے پر ایک شور وشغب برپا ہوا۔ بہ جائے اس کے کہ اس واقعہ کو ترکوں کی بربریت کی مثال بنا کر پیش کیا گیا، ہمارے اخباروں نے یہ کیوں نہ لکھا کہ یہ طریقہ ترکوں کی ایجاد نہیں ہے، بلکہ لیگ آف نیشنز کا پیدا کردہ ہے؟ خدا ہی جانتا ہے کہ ترکوں پر کتنے الزامات لگ چکے ہیں جن کے جوابات انھیں دینے ہیں؛ پھر ایسے الزامات اُن پر کیوں لگائے جا رہے ہیں جن کے وہ ملزم نہیں ہیں؟

اناطولیہ میں یونانیوں نے جو شور وشر پیدا کیا تھا اُس وقت امریکہ کے اخباروں کے لہجے سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ مشرق قریب کے مسائل کو مطلق نہیں سمجھتے ہیں۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ ہم، یا اتحادی اس قابل ہی نہیں رہے ہیں کہ درمیان میں پڑ کر اپنا اثر ڈالیں۔ ایک زیرک اور خوددار سیاسی مدبر کا اور ایک زیرک اور خوددار اخبار نویس کا یہ اصول موضوعہ ہونا چاہیے کہ جو الفاظ کسی کے منہ سے نکلتے ہیں وہ اُس قوت و اقتدار سے کچھ بڑے ہی ہوتے ہیں، جو کہنے والے کی حمایت کرسکتی ہوں۔ باوجود اس کے جب مصطفےٰ کمال کے فاتحانہ حملے اور یونانی فوج کی تباہی کامل کی خبر اس ملک (امریکہ) میں پہنچی ہے تو ہر منبر اور ہر اخبار سے ان دھمکیوں کی متفق اللفظ صدا نکلی کہ "ترکوں کو اُن کے بورے بدھنے سمیت یوروپ سے لات مار کر نکال دو"، یا یہ کہ "نقشے پر سے ترکوں کا نام ونشان مٹا دو"۔ چند ہی ہفتے نہ گزرے تھے کہ یہ بات فتح مندانہ طور سے پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ یہ دھمکیاں خالی خولی، بچوں کی سی تھیں؛ کیوں کہ بہ جائے اس کے کہ ترکوں کو لات مار کر یوروپ سے نکال دیا جاتا اُن کے قبضے میں آج یوروپ کا اُس سے زیادہ حصہ ہے جتنا ۱۹۱۴ء میں تھا، اور اُنھوں نے یوروپ کے لوگوں کو، اُن کے بوریئے بدھنے سمیت، ٹرکی سے لات مار کر نکال دیا ہے۔ بہ ہرحال یوروپ کا ایک حصہ اُن کے ہاتھ میں ہے۔ میں اس بات کو اچھی طرح جانتا ہوں کہ جہاں اور بہت سی مشکل باتیں ہیں وہاں ایک یہ بھی ہے کہ کسی کی رائے یکایک نہیں بدلی جاسکتی؛ مگر ایک پختہ کار اخبار نویس کی بڑی قابلیتوں میں سے ایک یہ ہے کہ وہ اپنی رائے پر نظرِ ثانی کرے، خاص کر اُس وقت کہ جب غیر ممالک کے معاملات پر بحث کر رہا ہو۔

سچی بات یہ ہے کہ امریکہ کے اخبارات اور عوام الناس نے اپنے فیصلوں کو تعصب اور غلط اطلاعوں کی رسیّ سے باندھ رکھا ہے اور اُنھوں نے مشرق قریب کے گھوڑ دوڑ کے میدان میں غلط گھوڑے پر بازی لگا رکھی ہے۔ اُنھوں نے بہ آوازِ بلند اس کا اعلان کیا کہ ترک ہرگز یوروپ

میں واپس نہیں آسکتے؛ باوجود اس کے وہ بڑے اطمینان کے ساتھ واپس آگئے اور یورپ کی اُس سے زیادہ زمین پر قابض ہو گئے جس پر وہ پہلے قابض تھے۔ اُنھوں نے تیقن کے ساتھ یہ کہا کہ آرمینیہ آزاد ہونا چاہیے اور سمرنا یونانیوں کے قبضے میں رہنا چاہیے؛ مگر آج بھی بے غل و غش ترکوں کا جھنڈا ان دونوں سرزمینوں پر اُڑ رہا ہے۔ اُنھوں نے یہ اعلان کیا کہ مغربی سلطنتیں اسکو کبھی نہیں مانیں گی کہ شرائط عہدنامہ (متعلقہ ملاقیجات مفوضہ) ٹوٹ جائیں؛ لیکن وہ ٹوٹ گئیں۔ انھوں نے بہ ضد یہ کہا کہ ٹرکی کو نہ بری فوج رکھنے کی اجازت دی جائے، نہ بحری؛ باوجود اس کے آج اُس کی بری فوج دنیا کی بہترین فوجوں میں سے ایک ہے، اور اُس کے جنگی جہازات بہ رو معاہدہ اُس کو واپس دے دیے گئے ہیں۔ امریکہ کے اس انداز سے مجھے ایک وکیل عدالت یاد آتا ہے، جس نے اپنے موکل کو قید خانے میں دیکھ کر کہا تھا کہ: "نیک مرد! تم کو قید خانے میں نہیں ہونا چاہیے۔ موکل قیدی نے جواب دیا کہ: "مجھے بھی اچھی طرح معلوم ہے کہ مجھے نہیں ہونا چاہیے؛ مگر میں قید خانے میں ہوں"۔

ترکوں کے خصائل اور حالات سے جو ہم کو ناواقفیت ہے اُس کی وجہ یہ بھی ہے کہ ہم، من حیث القوم، تعمیم کی طرف مائل ہیں۔ اس طریقے سے دوسرے لوگوں کا اندازہ کرنا ہمیشہ غلط اور خطرناک ہوا کرتا ہے؛ پھر ایسی قوم جیسے ترک ہیں اُس کا اندازہ اس طرح کرنا اور بھی دوگنا خطرناک ہے۔ وہ امریکی بھی جو اس پر فخر کرتے ہیں کہ ہمیں پورے حالات معلوم ہیں اور وہ لوگ بھی جن کی رائیں عزت کی نگاہ سے دیکھی اور سنی جاتی ہیں، ترکوں اور ٹرکی کے متعلق ناواقفیت کا مضحکہ خیز اظہار کرتے ہیں۔ اس تمام قوم کے متعلق ہمارے خیالات مشنریوں کی رپورٹوں پر مبنی ہوتے ہیں، جنھیں ترکوں کو عیسائی کرنے میں ناکامیابی ہوئی ہے، یا اُن باتوں پر جو ہم کو یونانی اور ارمنی داعیوں نے سنائی ہیں، یا پائرٹی لوٹی اور ڈی سٹرا وانکا کے ناولوں پر۔ اگر ہم چند روز کے لیے سردی کے موسم میں بحر روم میں سفر کریں تو ہم کو بہت سے کالی رنگت کے آدمی ترکی ٹوپی سر پر رکھے قہوہ خانوں، بازاروں وغیرہ میں ملیں گے، جن میں ارمنی، شامی، یونانی، اور یہودی، سب ہی طرح کے لوگ ہوتے ہیں، یہی ہمارے اطلاع دہندہ ہوتے ہیں۔

ہم ترکوں سے اس واسطے ناراض ہوتے ہیں کہ اُن میں تعدد ازواج کی رسم ہے (حالاں کہ امر واقعہ یہ ہے کہ ترکوں کی تمام آبادی میں صرف چار فی صدی ایسے آدمی نکلیں گے، جن کی ایک سے زیادہ بیویاں ہیں) اور ساتھ ہی توریت میں ابراہیمؑ، یعقوبؑ، سلیمان (علیٰ نبینا و علیہم السلام)

اور بطریا ترکوں کا حال بڑے اطمینان اور ادب کے ساتھ پڑھتے ہیں: ان کے بھی تو کئی کئی بیویاں تھیں؛ یا بعض امریکی ساہوکاروں اور ریلوے کے متموّل مالکوں کو جانتے ہیں جو بیسیوں عورتوں کا گلے کا گلہ رکھتے ہیں۔ ان میں اور ترکوں میں کیا فرق ہے؟ صرف یہ کہ ترکوں کے یہاں یہ جائز ہے اور اُن کے یہاں یہ سب پوشیدہ کیا جاتا ہے۔ اس خصوص میں یہ بتلا دینا باعثِ دلچسپی ہوگا کہ ٹرکی میں قومی حکومت کے قائم ہونے کے صرف دو برس بعد ۱۹۲۲ء میں ایک سے زیادہ بیویاں رکھنا ناجائز قرار دے دیا گیا ہے، مگر امریکہ میں انقلاب کے قریباً ایک صدی بعد تک اس کی ممانعت نہیں ہوئی۔ اور اوٹاہ میں تو کھلے خزانے اب سے چند روز پیشتر تک تعددِ ازدواج پر عمل ہوتا رہا ہے۔ بہت عرصہ نہیں گزرا کہ ایک معزز مورمن اوٹاہ میں مر گیا تو اُس کی چار بیویاں مذہبی رسم تجہیز و تکفین ادا کرتے وقت اُس کے جنازے کی گرد بیٹھی ہوئی تھیں! ہم ترکوں کی عورتوں کی حالت پر ماتم کرتے ہیں، لیکن اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ دنیا بھر میں ٹرکی ہی ایسا ملک ہے جہاں عورتوں کو کابینۂ سلطنت میں وزارت تک پہنچا دیا گیا ہے؛ اور اس کو بھی بھول جاتے ہیں کہ کوئی ترکی عورت پیشہ نہیں کرتی۔ جس وقت امریکہ کے ضلع جارجیا میں عورتوں کو بیدیں لگانا ممنوع قرار دینے کی کارروائی ہوئی ہے اُسی کے قریب زمانے میں ترکی عورتوں کا جبریہ برقعہ اوڑھنا ممنوع ہوا ہے۔ ہم لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ترک غیر روادار اور عیسائیوں سے نفرت کرنے والا آدمی ہوتا ہے، اور بڑی خوب صورتی کے ساتھ اس کو بھول جاتے ہیں کہ اُس نے نہ صرف غیر مسلموں کو اس کی اجازت دی ہے کہ وہ اپنے مذہبوں پر قائم رہیں، بلکہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے قرآن (مجید) کی ایک سورۃ میں صاف صاف طور پر اپنے غلاموں کو یہ ہدایت فرمائی ہے کہ اگر عیسائی اپنا گرجا بنائیں اور اُن کو مدد کی ضرورت ہو تو اُن کو مدد دیں۔ کیا کوئی شخص اس کا دعویٰ کر سکتا ہے کہ اس ملک (امریکہ) میں مسلمان مشنریوں کے ساتھ وہی روادارانہ سلوک مرعی رکھا جائے گا، یا یہ کہ اُن کو وہی رعایتیں اور حقوق دیے جائیں گے جو ہمارے مشنریوں کو ٹرکی میں اُن کے کام شروع کرنے کے وقت سے دیے جاتے ہیں؟ ہم ترکوں کو وحشی کہہ کر کوستے ہیں اور برطانیہ اور فرانس کے اُن سپاہیوں کی شہادتوں کا لحاظ نہیں کرتے جو ترکوں کے خلاف لڑتے رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ ترک ہمیشہ صفائی کے ساتھ لڑنے والے ہیں؛ ہم اس امر واقعہ کو بھی بھول جاتے ہیں کہ تمام دورانِ جنگ میں اُنھوں نے مہذب ممالک کی ایجاد، خلافِ انسانیت چیز، زہریلی گیس کے استعمال سے اس بنا پر قطعی انکار کر دیا کہ وہ شریف آدمیوں کا ہتھیار نہیں ہے۔ ہم ترکوں کو بالکل صحیح طور پر اس لیے بدنام

کرتے ہیں کہ اُنھوں نے ارمنیوں اور یونانیوں کا قتل عام کیا، مگر ساتھ ہی اُن لاتعداد ترکوں کو بھول جاتے ہیں جن کا ارمنیوں اور یونانیوں نے ایشیاء کوچک میں، ارمنیوں نے اور روسیوں نے قفقاز میں، یونانیوں نے البانیا اور کریٹ میں، اور سرویوں اور یونانیوں نے مقدونیہ اور تھریس میں قتل عام کیا۔ ہم ترک کو ظالم سمجھتے ہیں۔ اور وہ ظالم تھا بھی۔ باوجود اس کے اُس نے عراق عرب اور شام کے لوگوں کو اُس سے زیادہ خودمختاری عطا کی جتنی برطانیہ اور فرانس کی عملبرداری نے عطا کر رکھی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اُن علاقوں کے اکثر لوگ اب بھی اُسے اپنے ملک میں لے آنے کے متمنی ہیں۔ ہم کو یہ کہنے کا بڑا شوق ہے کہ جہاں تُرک کھڑا ہوتا ہے وہاں کی گھاس مرجاتی ہے۔ یہ یونانیوں کی پرانی ضرب المثل ہے۔ حال آں کہ میں اپنے ذاتی علم کے مطابق یہ شہادت دے سکتا ہوں کہ جب تک یونانیوں کی سنگینوں نے ترکوں کے ہلوں کو وہاں سے خارج نہیں کر دیا، تھریس اور اناطولیہ زرخیز علاقے اور نسبتۃً مرفہ الحال تھے۔ ہمارا یہ دعوے ہے کہ ترکوں پر اعتبار نہیں کرنا چاہیے، لیکن اس قول کو آپ اس امر واقعہ سے کیسے مطابقت دیں گے کہ مغربی ایشیا کے ایک کونے سے لے کر دوسرے کونے تک ترکوں کے معمولی بیانات پر اعتبار کر لیا جاتا ہے اور دیسی عیسائیوں کی قسموں پر۔ خواہ وہ کیسی ہی ہوں۔ اعتبار نہیں کیا جاتا۔ براہِ عنایت اتنی بات اور بتلا دیجیے کہ اگر تُرک ایسا ہی کالا ہے جیسی ہم اُسکی تصویر کھینچتے ہیں تو اس امر واقعہ کی کیا وجہ ہے کہ ہر ملک غیر کا آدمی جو ترکوں کو جانتا ہے، خواہ وہ سیاسی مدبر ہو یا کانسل، یا بری و بحری فوج کا افسر، یا تاجر، یہاں تک کہ مشنری بھی، اُس کی تعریف بحیثیت ایک فرد کے بکارے گلے کرتا ہے؟ ہم یہ سوچ کر خوش ہوتے ہیں کہ وہ سیاسی اور فوجی نقطۂ نظر سے ناقابل اعتنا ہے، باوجود اس کے اُس نے یونانیوں کی ایک فوج کا، جو اُس کی فوج سے، بہ اعتبار ذرایع و آراستگی، بہت زیادہ اچھی تھی، کس طرح نام و نشان مٹا دیا، تمام اناطولیہ اور مشرقی تھریس کو لے لیا؛ اٹلی والوں کو کس طرح مجبور کیا کہ وہ اڈالیہ سے اپنے ہاتھ اُٹھا لیں؛ فرانس کو کس طرح مجبور کیا کہ وہ سلیشیا کو خالی کر دے اور شام کے حدود کو اپنی مرضی کے موافق کس طرح تبدیل کرا لیا؛ برطانیہ کو کس طرح مجبور کیا کہ وہ قسطنطنیہ اور دردانیال سے نکل جاوے؛ اسی میں لائڈ جارج نے اپنی وزارت کھو دی گونارس اور اُس کے رفقاء جی جانیں گئیں، کانسٹنٹائن نے اپنا تخت کھویا، کرزن اور وینی زولاس پر ہر طرح کی سیاسی فتح حاصل ہوئی، سیورے کا ناپاک معاہدہ چاک ہوا اور اُس کی جگہ لوزان کا معاہدہ رکھا گیا اور امریکہ کے ساتھ ایک معاہدہ ہوا، جو ٹرکی کے موافق مطلب ہے۔ ترکوں کی اس روش نے عیسائی دنیا میں اتحادیوں کی عزت و آبرو کی جڑیں اُکھاڑ کر پھینک دیں۔ یورپ اور امریکہ کے عذر خواہ اس کی بیکار کوشش کر رہے ہیں

کہ ان تمام کامیابیوں کو کم کرکے دکھلائیں، واقعات خود اپنی شہادت دے

اگر در خانہ کس است ہمیں قدر بس است

"فلسفۂ عشق"

(جناب مولوی اسمٰعیل احمد مینائی صاحب تسنیم بی اے ایل ایل

گیتوں کے نرم راگ سے مسحور ہے فضا — معمور وجدِ روح سے
موسیقیت کے تار پہ رقصاں ہے ہر نفس — کیفیتِ سرور سے لب
لیکن ذرا سی دیر میں مٹ جائیگا یہ لطف — کیفِ آفریں رباب
جس طرح لَو بھڑکتی ہے بجھتے چراغ میں
نغموں کا ارتعاش رہے گا دماغ میں

گُل کی شمیم خوش سے معطر ہے گلستاں — احساسِ شامہ میں اس
اتنے لطیف ہوتے ہیں اس کے تاثرات — برگ و ثمر پہ چھایا ہے
توام چمن میں گرچہ ہیں گُل اور بوئے گُل — اس کی فنا کے بعد بھی ہے
بعدِ فنا ہیں خاک بھی پھولوں کی ہو گئی
تخئیل بو کی پھر بھی دماغوں میں رہ گئی

اک پھول ہے گلاب کا گلشن میں جلوہ بار — جیسے کوئی حسین کسی جا
اس کا وجود باعثِ تزئینِ حسنِ مست — اس کے سبب سے عشق ک
گو موسمِ بہار تک اس کی بہارِ حسن — دورِ خزاں کے آنے تک
مرجھا کے بھی ہے مشغلۂ خوب کے لیے
سیجیں بنائی جائیں گی محبوب کے لیے

نغموں کے بعد بھی رہا نغموں کا ارتعاش — پس از فنا بھی صورت ر
گلشن میں پھول کا نہیں باقی ہے کچھ نشاں — نکہت کی سے بھری ہے دماغ
بیکار ہے خزاں میں گلابِ چمن مگر — اوراقِ منتشر ہیں حسینوں
یوں ہی ہمارا نام رہے گا بنامِ عشق
"ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ عشق"

محبت

(جناب مسٹر مظفر علی صاحب قدوائی)

آپ نے محبت تو کی ہی ہوگی۔ اور اگر ابھی تک اس جذبہ سے آپ روشناس نہیں ہوئے ہیں تو اب آپ کو ہونا پڑیگا۔ کیونکہ یقین جانیے کہ یہ مرض خسرہ سے کسی طرح کم نہیں ہے جو ہر شخص کو زندگی میں ایک مرتبہ ضرور ہوتا ہے۔ اور بالکل اُسی طرح یہ زندگی میں صرف ایک ہی مرتبہ ہوتا بھی ہے۔ جو ایک مرتبہ اُسے جھیل گیا اُسے دوبارہ پھر اس کا اندیشہ نہیں ہوتا۔ جو شخص محبت کا شکار ہو چکا ہے وہ بڑی خاطر جمعی سے خطرناک ترین مقامات پر جا سکتا ہے اور ہر قسم کی حماقتوں کا مرتکب ہو سکتا ہے خطرناک مقامات سے میرا مقصد تو دہشت خیز جنگل ہے اور نہ حماقتوں سے مقصد خودکشی۔ میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ وہ ہر قسم کے باغوں میں ہر وقت تفریح کر سکتا ہے۔ گنجان درختوں کی چھاؤں میں اطمینان قلب کے ساتھ بیٹھ، لیٹ، بلکہ سو بھی سکتا ہے۔ سمندر کے کنارے ڈوبتے سورج کے سحر آگیں نظارے سے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ عورتوں کے مجمع میں شریک ہو کر دریا کی سیر کر سکتا ہے۔ حتیٰ کہ دوست کی شادی میں شرکت کرکے رسوات کے خطرناک زنانہ میں بھی بے کھٹکے گھس سکتا ہے۔

وہ محفل رقص و سرود میں اپنے دماغی توازن کو قائم رکھ سکتا ہے۔ اور سرد سے سرد مقام پر چاندنی راتوں میں گھس سکتا ہے۔ پھر بھی میں یقین دلاتا ہوں کہ اُسے بجز خفیف سے زکام کے اور کوئی مرض لاحق نہیں ہو سکتا۔ وہ بیخود کر دینے والے نغمے سنتا ہے اور اُسکا "حقوق محفوظ شدہ" دل اُن سے کوئی اثر نہیں لیتا۔ وہ نازک، نرم، سڈول اور حسین ہاتھوں سے مصافحہ کرتا ہے لیکن کوئی "برقی لہر" اُسے اس پر مجبور نہیں کرتی کہ وہ ان ہاتھوں میں ایک کھلونے کی طرح بے بس ہو جائے۔

ہرگز نہیں۔ محبت کا مرض کبھی دوہراکے ہوتا ہی نہیں۔ معصوم فرشتۂ محبت ایسا اناڑی نہیں ہے کہ ایک دل کی خاطر دو تیر خراب کردے ―― اور محبت کی نگاہیں "رفیق دائمی" ہوا کرتی ہیں۔ اُدھر محبت خانۂ دل میں جلوہ گر ہوئی اُدھر خانۂ دل کے تمام پھاٹک، دروازے اور کھڑکیاں کھل گئیں۔ لیکن معزز نازنینِ محبت صرف ایک مرتبہ ان راہوں سے گزر کر مملکت قلب پر قابض

ہو جاتی ہے اور تمام حقوق بحق مالک و مختار محفوظ ہو جاتے ہیں۔ اب اگر ہم کو کوئی چیز بھلی بھی معلوم ہو تو ہم اُسکی تعریف کرنے کے مجاز نہیں —— ہاں یہ ضرور ہو سکتا ہے کہ ہم کسی کی دوستی کی یاد اور اُس کی گدگدی کے کیف کو دل میں محسوس کریں۔

انسان کا دل ایک آتشبازی ہے جو تمام عمر میں صرف ایک مرتبہ چھوٹ جاتی ہے۔ اور شہاب ثاقب کی طرح ایک لمحہ کے لیے روشن ہو کر تمام کائنات کو اپنی ضیاء سے ماموں کر دیتی ہے —— اسکے بعد ہماری روزمرہ زندگی کی تاریک راتیں ہمارے گرد احاطہ کر لیتی ہیں۔ چھوٹی ہوئی آتشبازی زمین پر پڑی رہ جاتی ہے —— محبت کے جذبات سے متاثر ہو کر ہم قدرت کی سختیوں سے یکایک اتفاقاً آزاد ہو جاتے ہیں، بہادروں کی طرح بلندیوں پر چڑھنے کی سعی کرنے لگتے ہیں۔ اور کوہ طور سے آگ لانے کے دعویدار ہو جاتے ہیں سچ ہے کہ ''وہ لوگ جو شرارہائے جذبات کے سرد ہونے سے پیشتر ہی اپنے دلوں کی شمعیں محبت کی دیا سلائی سے روشن کر لیتے ہیں بڑے خوش نصیب ہوتے ہیں۔ لیکن محبت ان مسموم ہواؤں میں جن سے دنیا کی فضا بھری ہوئی ہے بہت دنوں تک زندہ نہیں رہ سکتی۔ پھر بھی قبل اسکے کہ دنیا کی ناپاک ہوا اس مقدس شعلہ کو بجھا دے ہم کو چاہیے کہ ہم اپنے دلوں کی تاریکی میں یہ روشنی پیدا کر لیں۔ اور اس حشر جذبات کو احساس لطف و سکون میں تبدیل کر لیں۔

اگر توجہ کی جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ ہماری دنیا کے چھوٹے اور غریب گھروں کے ''لطف و ستائش'' کی خفیف گرمی'' '' محبت کی دہکتی ہوئی آگ سے زیادہ موزوں ہے۔ محبت کو تو دراصل کسی عبادتگاہ کی دہکتی اور بھڑکتی ہوئی شمع ہونا چاہیے۔ یہ مست کر دینے والا راگ دراصل نغمۂ کائنات ہے ''لطف و ستائش'' کے احساسات صرف اُسی وقت خوشگوار گرمی پہونچا سکتے ہیں، جبکہ محبت کے بھڑکتے ہوئے شعلے خاموش ہو جائیں۔ کیونکہ ''لطف و اُنس'' کی آگ میں آپ روز تھوڑا تھوڑا ایندھن ڈال سکتے ہیں اور اس ایندھن کے انبار کو اتنا بلند کر سکتے ہیں کہ ضعیفی کی سردیوں میں بھی اسکی گرمی قائم رہ سکے۔ عمر رسیدہ مرد اور عورتیں اس کی ہلکی گرمی سے لطف اندوز ہو سکیں بچے اپنے ہاتھ تاپ سکیں اور دوست اور ہمسائے کو اس سے گرمی حاصل کرنے کی دعوت دی جا سکے۔ برخلاف اسکے محبت کا بلند شعلہ جہاں خود انتہائی تپش کا حامل ہوتا ہے وہاں ہر اس اُس چیز کو جو اُسکے قریب پہونچ جائے خاکستر کر دیتا ہے۔ اس لیے ''آتش لطف و ستائش'' میں گرمی قائم رکھنے کے لیے ہمیں ہر وقت ''مہربانی'' کے ایندھن کی ضرورت ہے۔ نرم اور ملیس

گفتگو، دوستانہ تعلقات اور پیار اسکی گرمی کو دیرپا بناتے ہیں۔ اگر اس میں خوش مذاقی، صبر اور عفو کی ہوا دی جائے تو ہم کو نہ توسیل گریہ کا اندیشہ، نہ طوفان باراں کا خطرہ، کیونکہ باوجود زمانے کی مخالفت کے وہ گھر جس میں ایسی آگ موجود ہو ہر وقت بشاش رہ سکتا ہے۔

مجھے اندیشہ ہے کہ نوجوان "محبت" سے خلاف معمولی توقعات رکھتے ہیں۔ ان کو یقین ہوتا ہے کہ ان کے جذبات کی گرمی اس آگ کو ہمیشہ روشن رکھ سکتی ہے۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتے کہ اس غیر مستقل شعلہ پر اتنا اعتماد مناسب نہیں۔ زمانہ اس شعلہ کو بجھانا چاہتا ہے۔ اور پھر اسکے قیام کی کوئی صورت ممکن ہی نہیں ہوتی۔ ہر شخص اسکو بجھتا ہوا دیکھتا ہے اور ناامید ہو جاتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قصور دراصل فریق ثانی کا ہے ——— "زاہد" کو یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ اب اسکے استقبال کے لیے اُس کی "زاہدہ" مسکراتی ہوئی دروازے تک دوڑ کر نہیں آتی۔ اور جب اُسے کھانسی ہو جاتی ہے تو "زاہدہ" حسب معمول روتی نہیں اور اُسکے گلے میں گداز بانہیں ڈال کر یہ نہیں کہتی کہ "پیارے زاہد، تم کو کیا ہو گیا۔ تمھارے بغیر میں کیسے زندہ رہونگی؟"۔ بلکہ وہ کھانسی کی گولیاں بڑی سنجیدگی سے تجویز کر دیتی ہے اور وہ بھی اس انداز میں کہ گویا زاہد کی کھانسی کا شور ناگوار ہے ورنہ علالت چنداں پُر تردد نہیں ہے۔

بیچاری "زاہدہ" اس لیے روتی ہے کہ اب "زاہد" نے اُس کا "پُرانا رومال" اپنی شیروانی کی جیب میں رکھنا چھوڑ دیا ہے۔ غرضکہ دونوں ایک دوسری کی کمی پر متحیر ہوتے ہیں اور اپنی تبدیلی پر نظر نہیں ڈالتے۔ اگر ان کو اپنی لغزشوں کا احساس ہو جائے تو شاید اتنی تکلیف نہ ہو اور وہ ان ظاہری بے التفاتیوں کے وجود کا مناسب سبب معلوم کر لیں، اپنی غلطیوں کو مان کر ایک دوسرے کے شریک کار ہو جائیں اور اپنی زندگی کو دنیا کے مطابق بنا کر ایک مضبوط ترین بنیاد قائم کریں۔

لیکن انسان آنکھیں ہونے پر بھی اندھا ہی ہوتا ہے۔ اُسے اپنی لغزشوں کا اندازہ ہوتا نہیں اور دوسروں کی کمزوریوں کا متلاشی رہتا ہے۔ ہر شخص کا یہ ایمان ہوتا ہے کہ اسکے ساتھ بدسلوکیاں ہو رہی ہیں وہ مطلقاً کسی دوسرے کی غلطیاں ہیں ورنہ اُس نے تو کچھ نہیں کیا۔

"زاہدہ" ہمیشہ ہمیشہ اور ہمیشہ زاہد سے محبت ہی کرتی رہتی اگر "زاہد" خود اتنا سرد اور بے توجہ نہ ہو گیا ہوتا۔ "زاہد" اسی طرح "زاہدہ" کی پرستش کرتا رہتا اگر "زاہدہ" بالکل ویسی ہی ہوتی جیسی کہ ابتدائے محبت میں تھی۔ "چراغ محبت" کے خاموش ہونے سے "آتش لطف و اُنس" کے جلنے تک جو وقفہ ہوتا ہے وہ ہر شخص کے لیے غیر دلچسپ ہوتا ہے۔ کیونکہ اس وقت انسان کو سرد فضا

میں گرمی کی جستجو ہوتی ہے ۔ خدا کرے کہ یہ آگ دن ڈھلنے سے پہلے جل جائے ۔ بہت سے لوگ تو ٹھنڈی راکھ کے پاس بیٹھ کر اُس وقت تک کانپا کرتے ہیں جب تک کہ روزِ حیات تاریکیِ ممات سے نہیں بدل جاتا ۔

لیکن اس نصیحت سے کیا حاصل ؟ کس "چاہنے والے" کو اس کا گمان بھی ہوتا ہے کہ یہ جذبہ کبھی سرد پڑ جائے گا ۔ ایک بیس برس کا لڑکا یہ کیسے باور کرے گا کہ جب وہ ساٹھ برس کا ہوگا تو اُس کے جذباتِ محبت اتنے ہی حشر خیز نہ رہیں گے ۔ اُسے کوئی ایسی نظیر یاد ہی نہیں آتی لیکن نظیر یاد کرنے کا وقت بھی کسے ملتا ہے — اُس کو یقین ہوتا ہے کہ اُس کی محبت کبھی کم نہیں ہو سکتی، خواہ تمام کائنات سے محبت مفقود کیوں نہ ہو جائے ۔ وہ اپنے دل میں سمجھتا ہے کہ آج تک دنیا میں کسی نے اُس جیسی محبت نہیں کی اور اس لیے دوسروں کے تجربے اُس کے لیے کوئی نظیر نہیں بن سکتے ۔ ایک حد تک اس کا قصور نہیں ہے ۔ ہمارے جذبات خواہ بُرے ہوں یا بھلے ، ہمارے شباب کے ساتھ بڑھتے اور گھٹتے ہیں ۔ ہم تیس برس کی عمر کو پہنچ کر بیس برس والوں کی طرح نہ تو محبت کر سکتے ہیں اور نہ اتنی نفرت ۔ کیونکہ کبر سنی میں نہ تو ناکامیاں جذبۂ خودکشی پیدا کر سکتی ہیں اور نہ کامیابیاں بیخود بنا سکتی ہیں ۔

جیسے جیسے ہم معمر ہوتے جاتے ہیں ہر چیز کے جزئیات پر بھی نظر غائر ڈالنے کے عادی ہو جاتے ہیں ۔ زندگی کے اس دور میں شاذ ہی کوئی ایسا موقع ہوتا ہے جسے "شاہی عظمت کا مترادف کہا جا سکے ۔ حوصلے پست ہونے لگتے ہیں ۔ عزت اور آبرو احاطۂ عقل میں آ جاتی ہیں" اور زندگی رفتہ رفتہ اتفاقات کے مطابق ہو جاتی ہے — رہی محبت ! سو محبت تو مردہ ہو چکی ہوتی ہے — "جوانی کے خوابوں کی بے عظمتی" ہمارے دلوں پر دم گھونٹنے والے کہر کی طرح چھا جاتی ہے — نرم کونپلیں اور خوش رنگ کلیاں کھلنے سے پہلے مرجھا جاتی ہیں اور شراب کے اُس سرور کے عوض جو کبھی تمام کائنات کو محیط کیے تھا ایک بیجا اور مایوس کن خمار رہ جاتا ہے ۔

میں جانتا ہوں کہ میرے حسین اور نوجوان ناظرین اسے ہذیانِ مطلق تصور کریں گے ۔ کیونکہ اُس وقت تک کسی انسان کی باتیں قابلِ توجہ نہیں ہوتیں جب تک کہ اس کے بالوں کی سفیدی اُس کی کہنہ مشقی کی تائید نہ کرے — اور بوڑھا ہو کر آدمی سٹھیا جاتا ہے — نوجوان عورتیں ہم مردوں کا اندازہ اُن ناولوں سے لگاتی ہیں جنھیں عورتیں ہی تصنیف کرتی ہیں ۔ اور یہ دنیا پر

روشن ہے کہ ان ناولوں میں جس طرح مردوں کو پیش کیا جاتا ہے اُسکے مقابلہ میں "پائی تھاگورس" کی "لنڈوری چڑیا" اور "فرنیکنسٹین کا بھوت" بھی جذبۂ انسانیت کے زیادہ حامل سمجھے جاتے ہیں۔
ان کتابوں میں اصلی عاشق کو "یونانی دیوتا" کہا جاتا ہے جو بذات خود تحسین حسن کا کافی ثبوت ہے۔ لیکن اسکا پتہ نہیں چلتا کہ یہ "یونانی دیوتا" دراصل کون سا "دیوتا" ہے۔ ممکن ہے کہ اس فقرہ سے "کوزہ پشت ولکن" مراد ہو یا "دو رخہ جینس"۔ ممکن ہے کہ "بدطینت سا ٹینس" سے مراد ہو جسکو خدائے شیطنت کہا جاتا ہے۔ غرضکہ وہ یونانی دیوتاؤں کے پورے خاندان کا مجموعۂ واحد ہوتا ہے۔ اور اس لیے بے مناسب کچھ۔ اور شاید یہی اس "دیوتاؤں کی مشابہت" سے مقصد بھی ہو
ممکن ہے کہ وہ اپنی ثقاہت، کمزوری اور خلقی ناتوانیوں کے باعث اس مفروضہ شجاعت کا بھی دعوے دار نہ ہو جو کتابوں میں اس کے نام سے منسوب کی جاتی ہیں۔ اور چالیس سال کی عمر کو تجاوز کرکے "لاغر اتنا ہوں کہ تو گر بزم میں جا دے مجھے + میرا ذمہ دیکھ کر گر کوئی بتلا دے مجھے" ہو جائے۔ لیکن اس عمر رسیدہ لوگوں کے اُن جذبات کی گہرائیاں جو کسی کمسن لڑکی کو دیکھ کر ان میں پیدا ہو جاتے ہیں ایسی ہوتی ہیں کہ اُن کی تہ تک پہونچ جانا مشکل ہی نہیں ناممکن ہوتا ہے۔ اس لیے اس مجمع میں جہاں عمر رسیدہ اور "سفیدمو" عاشق موجود ہوں نوجوان "فرہادوں" اور "مجنونوں" کا گزر ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ ان کی محبت کی سرگرمیاں اتنی زوردار ہوتی ہیں کہ انھیں احاطۂ بیان میں لانا ہی غیر ممکن ہو جاتا ہے۔
ہم ایسے "پرانے گناہگاروں" کے لیے یہی اچھا ہے کہ معزز خواتین صرف کتابیں ہی پڑھا کرتی ہیں اگر ان کو "نفسیات انسانی" سے ذرا سا بھی تعلق ہو جائے تو وہ بخوبی سمجھ سکیں گی کہ ایک لڑکی کی "چھپتی ہوئی لکنت" ایک معمر انسان کی "مردانہ گوئی" سے کہیں زیادہ "صادق الجذبات" اور قابل وقعت ہوتی ہے۔ ایک کمسن لڑکا اگر محبت کرتا ہے تو اُسکے جذبات بالکل سیدھے دل ہی سے پیدا ہوتے ہیں اور ایک عمر رسیدہ مرد کے جذبات "غلہ کی مستی" سے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک معمر مرد کی سست گفتگو محبت سے تعبیر نہ کی جاسکے گی۔ اور خاص کر اس حالت میں جب اس کا مقابلہ ایک نوجوان کے جذبات سے کیا جائے گا جو اس کے دل سے اُس وقت اُبلنے لگتے ہیں جب آتش حسن اُس کو گرم کر دیتی ہے۔ اگر کسی کو لطف محبت کی تمنا ہے تو اُسے اُس چشمہ سے پانی پینا چاہیے جسے جوانی اُس کے قدموں پر بہا دیتی ہے۔ یہ مناسب نہیں ہے کہ دریا کی موجوں کو پکڑنے کے لیے اُس وقت تک انتظار کیا جائے جب تک کہ پانی گندلا نہ ہو جائے —— کیا آپ ایک

بودار پانی کو صاف اور شفاف پانی پر ترجیح دیں گے؟ کیا پانی کی گندگی آپ کے "مقدس ہونٹوں" کو زیادہ مرغوب ہے؟ کیا ہم یہ یقین کرنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ ایک نوعمر دوشیزہ اُسی ہاتھ پر اعتماد کر سکتی ہے جو گنہگار زندگی کی گندگیوں سے آلودہ ہو چکا ہے۔

غرضکہ ایسے ناولوں کے "زرد اوراق" اسی قسم کی تبلیغ کیا کرتے ہیں۔ کیا انکے مصنف ایک لمحہ کے لیے کبھی اس پر غور کرتے ہیں کہ وہ خدا کی بخشی ہوئی زندگی میں یوں پوشیدہ طور پر چل پھر کر کیا گندگی پھیلا رہے ہیں اور معصوم "کنواروں" اور "بے گناہ آدمیوں" کو یہ بتلا رہے ہیں کہ "گناہ" کی برابر شیریں چیز اور کوئی ہے ہی نہیں — اور شرافت اور انسانیت سراسر بیہودگی ہے —— کتنی معصوم لڑکیاں ان ناولوں کو پڑھ کر آوارہ خیال نہیں ہوتیں؟ اور کتنے مرد [illegible] ان کے ذریعہ اُس غلیظ راہ سے آگاہ نہیں ہو جاتے جو ان ناولوں کے بقول سیدھی نوعمر دوشیزاؤں کے دلوں تک جاتی ہے —— وہ زندگی کو اس رنگ میں ہرگز نہیں دکھاتے جو واقعی اس کا ہے۔ انسان اگر سچ بولے تو صداقت اُس کی خود نگرانی کرتی ہے — لیکن وہ تصاویر جو ان ناولوں کے ذریعہ پیش کی جاتی ہیں درحقیقت ایسی بدنما خیال آرائیاں ہیں جو اُن کے پراگندہ دماغوں سے نکلتی ہیں۔

ہمارا خیال عورتوں کی بابت ایسا نہیں ہے جیسا کہ وہ خود اپنے کو ظاہر کرتی ہیں —— اُنکے خیال میں عورت ایک ایسی کھو دینے والی چیز ہے جو انسان کو مجنوں بنا کے تباہی کی طرف لیجاتی ہے۔ لیکن ہم عورت کو ایک نیکی کا فرشتہ تصور کرتے ہیں جو انسان کو رفعت عرش کی طرف راغب کرتا ہے۔ عورتوں میں اچھائی بُرائی کی ایسی بڑی طاقتیں ہیں جنکا خود اُن کو گمان بھی نہیں ہے۔ جس عمر میں انسان کے چال چلن کو پختگی ہوتی ہے اُسی عمر میں وہ "شکارِ محبت" ہوتا ہے۔ اور اُس وقت اسکی محبوبہ کے اختیار میں ہے کہ اُسے بلند کر دے یا ذلت اور رسوائی کے گڑھے میں دھکیل دے۔ نادانستہ طور پر وہ اپنے کو اپنی محبوبہ کے مطابق نیک یا بد جیسا وہ چاہتی ہے بنا لیتا ہے —— اور مجھے یہ لکھتے ہوئے افسوس ہوتا ہے کہ عورتیں اپنے اس اثر کو ہمیشہ بہتری کی طرف کام میں نہیں لاتیں —— اکثر عورتوں کی دنیا "عامیت" سے محدود ہوتی ہے۔ ان کے "مطمح نظر" پست اور کم حوصلہ ہوتے ہیں اور اس معیار پر اُترنے کے لیے اکثر طاقتور مرد محبت سے مبہوت ہو کر اپنی زندگی گمنامی اور پستی میں بسر کر دیتے ہیں۔

پھر بھی اگر عورت چاہے تو مرد کو بہت اچھا بنا سکتی ہے اور تمام [illegible] کے مقابلہ میں اس

دنیا کو بہشت بنا دینے کے لیے ایک عورت کی بھی کوشش زیادہ کامیاب ہوسکتی ہے - ابھی تک عالی ہمتی مردہ نہیں ہوئی ہے - لیکن بیکار رہنے کی وجہ سے سو ضرور گئی ہے اور صرف عورتیں ہی اسکو بیدار کرسکتی ہیں - عورتوں کو اس قابل ہونا چاہیے کہ بڑے بڑے جوانمرد ان کی پرستش کریں —— دنیا کی بڑی جنگوں میں سے اکثر صرف عورت ہی کی خاطر ہوتی ہیں —— آدم نے بھی عورت ہی کی خاطر جنت کو ترک کیا تھا - اس لیے اسے حسین عورتو - تمہارے لیے یہ ضروری ہے کہ حسن صورت کے ساتھ تم میں حسن سیرت بھی ہو — تاکہ اعلیٰ ہمت مرد تمہاری خدمت سے عظمت اور نام حاصل کریں -

اپنے "خودغرضی کے لباس" کو اتار کر پھینک دو اور "ظاہری نمائش" سے درگزرو - اور ایک مرتبہ پھر "فطری نفاست" کے ساتھ ملکہ کی طرح اپنی مملکت میں کھڑی ہوجاؤ —— ہزاروں تلواریں جو اس وقت بیکار پڑی ہوئی باعث زنگ کھا رہی ہیں تمہاری عزت کے قیام کے لیے نیاموں سے نکل پڑیں گی اور دنیا کی تمام گندگیاں تمہاری پاک طینتی کے پریم کے سامنے نیست و نابود ہوجائیں گی

"محبت کے زمانے" میں انسان کس شریف کام کا اہل نہیں ہوتا ؟ —— اور اپنی محبوبہ کی خاطر کون سی "پاک زندگی" گزارنے سے گریز کرسکتا ہے —— ایک زمانہ میں محبت ایک مذہب تھا جس کی خاطر لوگ جانیں دے دیا کرتے تھے —— اس وقت انسان اپنی طرح کے جسم خاکی سے محبت نہ کرتا تھا —— وہ ایک ملکہ کا پجاری ہوتا تھا اور ایک مقدس دیوی کا پجاری —— آہ! وہ پرستش کس قدر مجنونانہ تھیں اور کیسی دلچسپ

لڑکو! محبت کے خوابوں سے اس وقت تک لطف اٹھاؤ جب تک کہ وہ ختم نہ ہوجائیں اور تم کو معلوم ہو جائے گا کہ زندگی میں کوئی چیز اتنی شیریں نہیں ہے —— محبت میں جو مصیبتیں پڑتی ہیں وہ بھی بڑی دلچسپ اور عجیب ہوتی ہیں —— جب انسان جذبۂ محبت کھو بیٹھتا ہے اور اس کی زندگی سے یہ روشنی جاتی رہتی ہے —— اسوقت اسے یہ دنیا ایک وحشت خیز تاریکی معلوم ہونے لگتی ہے اور اس حالت میں بھی ناکامیوں میں ایک خاص لطف ہوتا ہے —— پھر خود ہی سوچو کہ اس کے لطائف حاصل کرنے کے لیے کون دشواریوں کا سامنا بخوشی نہ کرے گا —— وہ خوشیاں کس قدر روح پرور ہوسکتی ہیں جنکا خیال ہی انسان کے جسم میں سنسنی پیدا کردیتا ہے - کسی عورت سے اظہار عشق کرنا کتنا پر لطف ہوتا ہے —— انسان یہ کہکر کہ "وہ اس کی خاطر جیتا ہے اور اسی کی خاطر مرنے پر آمادہ ہے" کس قدر ناز کرتا ہے - اور جب عورت اس اظہار کے بعد بھی تجاہل سے اس پر بے اعتمادی کا اظہار کرتی ہے تو مرد کی کیا حالت ہوجاتی ہے - لیکن ان

تمام باتوں کے باوجود مرد ہمیشہ عورت کی فریب کاریوں میں لطف حاصل کرتا ہے اور اپنی بیگناہی کا یقین رکھ کر بھی اُس سے معافی مانگنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔

عورت اکثر مرد کو محض دق کرنے کے لیے اُسے ٹال جاتی ہے۔ اُسے مرد کی مظلومانہ حالت میں میں لطف آتا ہے اور جب وہ مسکراتی ہے تو تمام کائنات مسکرا اُٹھتی ہے۔ مرد اپنی محبوبہ کے سایہ سے بھی رشک کرتا ہے۔ ہر اُس مرد سے نفرت کرتا ہے جس سے وہ مصافحہ کرتی ہے اور ہر اُس عورت سے جلنے لگتا ہے جسے وہ بوسہ دیتی ہے۔ مختصر یہ کہ اُسے اُس کی خادمہ، اُسکے ملازم، حتیٰ کہ اُسکے کتے تک سے جلن ہو جاتی ہے۔ اور وہ یہ چاہتا ہے کہ ایک اُسی کی ذات میں وہ سب باتیں ہو جائیں جو اتنوں میں علیحدہ علیحدہ ہیں تاکہ وہ تنہا ہی اپنی محبوبہ کے ہمراہ رہ سکے۔

وہ حماقت کے دن بھی کتنے پُر لطف تھے جب انسان خود غرض نہ تھا اور اسکے خیالات برائیوں سے بری تھے — جبکہ اس کا دل نیکیوں سے معمور تھا، اور اب وہ زمانہ آگیا ہے جبکہ انسان اپنے خیال میں دانشمند اور مہذب ہو گیا ہے۔ لیکن اسکے دلوں میں بغض و حسد کی لپٹیں اُٹھ رہی ہیں۔ وہ خیال کرتا ہے کہ صرف روپیہ ہی حاصل حیات ہے، اُسے صرف دروغگوئی اور کمینہ پن پر اعتماد ہے اور اپنے سوا کسی کی پرواہ بھی نہیں کرتا ہے۔

بال جبریل کی ایک طرح پر

حیات خونِ جگر کے سوا کچھ اور نہیں
علاج اس کا گزر کے سوا کچھ اور نہیں

یہ حُسن و عشق یہ دنیائے آب و گل یہ حیات
فریبِ حسنِ نظر کے سوا کچھ اور نہیں

یہی تو تیری عطا تھی سو وہ بھی ہے ناقص
بشر کے پاس نظر کے سوا کچھ اور نہیں

دل ایک چیز ہے دنیائے جذب و مستی میں
چمن میں اس گُلِ تر کے سوا کچھ اور نہیں

الٰہی اب یہ دعا ہے کہ ہو عطا مجھ کو
وہ اک نفس کہ شرر کے سوا کچھ اور نہیں

ہم اہلِ عشق کریں نذر کیا اُنھیں کہ یہاں
متاعِ دردِ جگر کے سوا کچھ اور نہیں

بیانِ حالتِ دل کو ہم اہلِ عشق کے پاس
زبانِ دیدۂ تر کے سوا کچھ اور نہیں

عزیز نفع ہو جس کو ادھر نہ آئے جلیل
مآلِ عشق ضرر کے سوا کچھ اور نہیں

جلیل قدوائی

قزّاق

(جناب مولوی مطلب حسین صاحب عالی بی اے لکھنوی)

گرمی کا موسم تھا اور سہ پہر کا وقت۔ دن بھر سخت گرمی پڑ چکی تھی۔ جسکی وجہ سے حدت کا کافی اثر موجود تھا۔ حسب معمول مکان سے باہر نکل کر چبوترہ پر بیٹھا ہوا میں اخبار دیکھ رہا تھا کہ داروغہ صاحب آ گئے۔ داروغہ محمد جنید صاحب کہیں دور سے آ رہے تھے، پسینے میں تربتر تھے۔ آتے ہی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئے میں نے پان پیش کرکے پوچھا "معلوم ہوتا ہے آج آپ بہت دور سے آ رہے ہیں"؟

داروغہ صاحب جو اپنی ملازمت کا زمانہ ختم کر چکے تھے اور پنشن پاتے تھے، بولے "جی ہاں وقف کے قصے میں مصروف تھا۔ اُسکا کام بھی مجھے دیکھنا پڑتا ہے"۔

میں نے کہا "کونسا وقف؟"

داروغہ صاحب نے جواب دیا "وہی مسجد و سرائے کا قصہ ہے"

میں نے اُس سے اپنی لاعلمی ظاہر کی۔

داروغہ صاحب نے کہا "کیا میں نے کبھی آپ سے اس وقف کا تذکرہ نہیں کیا؟"

میں نے کہا "نہیں"

وہ بولے "اچھا، آج آپ کو اس کا واقعہ سناتا ہوں۔ کافی دلچسپ افسانہ ہے"

میں ہمہ تن گوش ہو گیا، اور داروغہ صاحب نے کہنا شروع کیا۔

اب سے تقریباً سات سال پہلے جب میں اپنی ملازمت کا زمانہ قریب قریب ختم کر چکا تھا، ایک دن ایک تحقیقات کے سلسلے میں بازار سے گزر رہا تھا۔ بازار میں ایک جگہ دو آدمیوں میں کچھ سخت کلامی ہو رہی تھی۔ ایک نوجوان اپنے روپیہ کو اچھا ثابت کر رہا تھا اور دوسرا اس کو کھوٹا بتاتا تھا۔ لوگوں نے مجھے گھوڑے پر گزرتے دیکھا تو جھگڑنے والوں سے کہنے لگے کہ داروغہ جی کو دکھا دو اگر وہ اچھا کہیں تو لے لو ورنہ واپس کر دو۔ اس پر سب لوگوں نے اتفاق کیا، لیکن مجھکو، ابھی جب کہ میں کسی قدر فاصلہ ہی پر تھا، اُس نوجوان نے بھی دیکھا اور فوراً اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر ایک سمت کو چل دیا۔

میں معاملہ کی اہمیت کو بالکل نہیں سمجھا۔ نہ یہ سمجھ سکا کہ وہ نوجوان مجھکو دیکھ کر کیوں بھاگ گیا۔ اسی خیال میں تھا کہ میں نے بھی اپنے گھوڑے کو تیز کیا اور اس کا تعاقب شروع کیا۔ شہر

سے باہر نکل کر میں نے اس نوجوان کو بہت دور پر جاتے دیکھا۔ وہ اُسی تیزی سے جا رہا تھا۔ میں نے اپنے گھوڑے کو اور تیز کیا۔ میں بہت تیز جا رہا تھا، لیکن ہمارے درمیان فاصلہ بہت تھا۔ میرا گھوڑا بہت عمدہ تھا، لیکن پھر بھی میں اُس نوجوان تک نہ پہونچ سکا۔ اس دوڑ میں کئی گھنٹے گزر گئے اور شام ہوگئی۔ لیکن ابھی وہ نوجوان میری نظروں سے اوجھل نہ ہوا تھا۔ میں برابر اس کے پیچھے چلا جاتا تھا۔ تقریباً آدھ گھنٹہ اور گزرا ہوگا کہ رات ہوگئی۔ سورج غروب ہوگیا۔ لیکن چونکہ چاند نکل آیا تھا لہذا اب بھی میں اُسے دیکھ رہا تھا۔ اور برابر چلا جاتا تھا۔ میرے دل میں ایک عجیب قسم کا شوق پیدا ہوگیا تھا کہ معلوم کروں کہ وہ کون ہے اور کیوں اس طرح خوفزدہ ہو کر بھاگ رہا ہے۔ اس بنا پر میں نے تعاقب جاری رکھا۔ چاندنی نکلی ہوئی تھی اور میں برابر اس کو دیکھ رہا تھا۔ لیکن اب مجھے نا امیدی شروع ہوئی کہ میں کبھی اُس نوجوان تک نہ پہونچ سکوں گا، اس لیے میں نے اُس سے ٹھہرنے کا اشارہ کیا لیکن معلوم نہیں کہ اُسنے میرے اشاروں کو دیکھا یا نہیں۔ اُس نوجوان نے اپنی رفتار حسب دستور قائم رکھی یکایک وہ میری نظروں سے غائب ہوگیا۔

میں شہر سے کم از کم چالیس پینتالیس میل کے فاصلہ پر ایک گھنے جنگل میں تھا۔ رات کا وقت تھا۔ میں بے انتہا تھک گیا تھا۔ اور اب یہ خیال آیا کہ رات کہاں اور کیسے بسر ہوگی۔ راستہ یاد نہ تھا اور یاد بھی کیسے ہوتا، جنگل میں سوائے درختوں اور جھاڑیوں کے اور کچھ نہ تھا۔ اس لیے میں جس طرف سے گیا تھا اُسی طرف سے واپسی ناممکن تھی۔ رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ میں تھک کر چُور ہوگیا تھا۔ پیاس شدت سے لگی تھی اور دل چاہتا تھا کہ ذرا دیر لیٹ کر آرام کروں لیکن پریشانی میں کوئی بات بن نہ پڑی۔ سونے میں صحرائی جانوروں کا خطرہ تھا۔ اسی پریشانی میں آہستہ آہستہ چلا جاتا تھا کہ میں نے بہت دور پر پھر اُس نوجوان کو جاتے دیکھا اور اس امید پر کہ شاید اس کی مدد سے پانی مل سکے میں نے گھوڑا تیزی سے دوڑایا۔ اُسنے بھی اپنا گھوڑا تیز کیا اور چند منٹ میں پھر نظروں سے غائب ہوگیا۔

میں بالکل مایوس ہوگیا اور سمجھ گیا کہ رات اسی عالم میں بسر ہوگی۔ گھوڑا پھر آہستہ آہستہ چلنے لگا اور میں نے لگام ہاتھ سے چھوڑ دی کہ جدھر چاہے لیجائے۔ اس حالت کو بھی عرصہ گزر گیا اور پیاس کے مارے میرا دم نکلنے لگا۔ شاید رات کے دو بجے ہونگے کہ میں نے بہت دور پر ایک جانور کو کھڑے دیکھا۔ میں پہلے تو یہ سمجھا کہ شاید وہ کوئی صحرائی جانور ہوگا لیکن قریب جانے پر معلوم ہوا کہ گھوڑا ہے اور زین اس پر

بندھا ہوا ہے - اب کسی قدر ہمت بڑھی اور میں نے ادھر اُدھر تلاش شروع کی کہ ضرور اسکا مالک بھی قریب ہی ہوگا - یہ گھوڑا وہی تھا جس پر وہ نوجوان جسکو میں تلاش کر رہا تھا سوار ہو کر بھاگا تھا -

تھوڑی دیر تک تلاش جاری رہی یکایک جنگل کے ایک بہت گھنے حصے میں ایک چھوٹا سا مکان نظر آیا جو پتھر کا بے ڈھنگا سا بنا ہوا تھا - لیکن بہت مضبوط تھا - میں بیتابی سے مکان کی طرف بڑھا - قریب پہونچکر دیکھا کہ دروازہ کھلا ہوا ہے - میں بلا کسی خوف کے اندر چلا گیا -

مکان کے اندر عمارت بہت مختصر تھی - ایک دالان تھا اور ایک کوٹھری - صحن میں ایک بڈھا زانو پر سر رکھے بیٹھا تھا اور اُسکے پاس ایک شخص چادر اوڑھے لیٹا تھا -

---

میں نے بڈھے سے پانی کا سوال کیا لیکن شاید اُس نے نہیں سنا - میں اور اسکے قریب گیا اور شانہ ہلا کر پانی مانگا - بڈھے نے سر اُٹھایا اور ایک سمت کو اشارہ کیا - میں اُس طرف گیا - دو گھڑے پانی سے بھرے رکھے تھے - میں نے پانی پیا اور پھر بڈھے کے پاس واپس آیا - بڈھے نے پھر اسی انداز سے سر جھکا لیا تھا - میں اُسکے قریب چٹائی پر بیٹھ گیا اور اُس کا انتظار کرنے لگا کہ وہ سر اُٹھائے تو گفتگو کروں - لیکن جب تھوڑی دیر گزر گئی تو میں نے پھر اُس کو مخاطب کیا - بڈھے نے مجھ سے پوچھا کہ تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو - میں نے مختصر الفاظ میں تمام واقعہ کہہ سنایا میری باتیں سن کر بڈھے نے ایک پُردرد آہ کھینچی اور کہا کہ "تم ہی میرے بیٹے کے قاتل ہو" یہ کہکر اُس نے چادر کی طرف اشارہ کیا اور بیہوش ہو کر گر پڑا -

میں متحیر تھا کہ کیا معاملہ ہے - اور میں اسکے بیٹے کا قاتل کیسے ہوگیا - میں نے جلدی سے بڈھے کے مُنہ پر پانی چھڑکا اور دامن سے ہوا دینے لگا - تقریباً پندرہ بیس منٹ میں اُسے ہوش آیا - میرے دل میں خلش تھی کہ واقعہ معلوم کروں لیکن اس خیال سے کہ وہ بہت کمزور ہے میں خاموش رہا -

آخر کار - بڈھے نے کہا "ہاں تم نے میرے بیٹے کو قتل کیا ہے"

میں نے کہا "میں نے تو کسی کو بھی نہیں مارا" اُس نے پھر چادر کی طرف اشارہ کیا - میں نے اُٹھ کر چادر اُلٹی تو دیکھا کہ اسکے نیچے اُسی نوجوان کی لاش رکھی ہوئی ہے جسکا میں تعاقب کر رہا تھا -

میں نے پوچھا کہ یہ موت کیسے واقع ہوئی؟ بڈھا بولا "یہ تو مجھے نہیں معلوم - لیکن کچھ دیر

ہوئی کہ گھوڑا خالی واپس آیا تو مجھے بہت تشویش ہوئی اور میں خود اُس پر سوار ہو کر لڑکے کی تلاش میں نکلا۔ میل بھر کے فاصلے پر جو نالہ ہے اُسکے اس طرف لڑکا گرا ہوا ملا۔ کچھ جان باقی تھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ تمہارے خوف سے اس نے گھوڑے سمیت جست کی لیکن سنبھل نہ سکا۔ گرا اور چوٹ کھائی۔ میں اسکے قریب بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر میں میرا اکلوتا بیٹا مجھکو اس دنیا میں ٹھوکریں کھانے کے لیے چھوڑ کر جنت کو سدھارا۔" بڈھے نے پھر ایک آہ کھینچی جس سے میرا دل پاش پاش ہو گیا۔

میں نے لڑکے کی نبض پر ہاتھ رکھا نبض کا پتہ نہ تھا۔ قلب پر ہاتھ رکھا اسکی حرکت بھی بالکل بند تھی۔

میں بہت شرمندہ تھا کہ میری وجہ سے ایک نوجوان کی جان مفت میں گئی۔ میں نے بڈھے سے کہا "نہیں نہیں معذرت کی کوئی ضرورت نہیں میرا کیا میرے سامنے آیا۔ جو ہوا سو ہوا۔ اب غور سے سنو۔ میں بھی اب تھوڑی دیر کا مہمان ہوں۔

بڈھا بولا "تم نے شہباز کا نام تو سنا ہی ہوگا" میں نے کہا "کون شہباز؟ ڈاکو؟"

بڈھے نے کہا "ہاں، میں وہی شہباز ہوں جسکے نام سے زمانہ تھراتا تھا"

"سنو، جب میں بچہ تھا اور میری عمر میں چار سال سے زیادہ کی نہ تھی۔ مجھے خواب سا یاد ہے کہ میں اپنے عزیزوں کے ساتھ جا رہا تھا کہ ایک سامنے سے پچاس ساٹھ ڈاکوؤں کا ایک گروہ نمودار ہوا۔ اُنکے ہاتھوں میں مختلف قسم کے ہتھیار تھے۔ اُنھوں نے قافلہ کو لوٹنا شروع کیا۔ قافلہ میں بہت سے مرد تھے، اُنھوں نے مقابلہ کیا، بڑی سخت لڑائی ہوئی، ڈاکوؤں کے بھی دو تین آدمی مارے گئے، اور کئی زخمی ہوئے۔ قافلے والے گو بہت بہادری سے لڑے لیکن بہت سے مارے گئے۔ انھیں میں میرے والد مرحوم بھی تھے جو بچ گئے تھے مگر زخمی تھے، انکو بھی ڈاکوؤں نے گولی مار دی اور سب کو ایک گڑھا کھود کر دفن کر دیا۔

عورتوں میں یاد نہیں کہ کتنی تھیں۔ وہ سب مال و اسباب کے ساتھ تقسیم کر دی گئیں۔ میری والدہ اور میں ڈاکوؤں کے سردار کے حصہ میں آئے۔

میری والدہ جو بہت امیر گھرانے کی تھیں۔ اور میرے والد کے گھر میں نہایت آرام سے رہتی تھیں، اب ڈاکوؤں کے سردار کے گھر میں ماماؤں کی طرح رہنے لگیں۔ انکو کھانا پکانا پڑتا تھا جھاڑو دینا ہوتی تھی اور برتن وغیرہ صاف کرنا ہوتے تھے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ وہ اکثر رات کو چپکے چپکے اپنی حالت اور اپنے خاندان کی تباہی پر روتی تھیں اور اپنی موت کی دعائیں مانگتی تھیں کہ کسی طرح اس ذلت کی زندگی سے

نجات ملے۔

سردار اسی گھر میں رہتا تھا۔ گھر میں سردار اور اسکی بیوی کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ انکے یہاں کوئی اولاد نہ تھی۔ لیکن میرے آنے کے کچھ دن بعد ان کے یہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی جسکا نام منیرہ رکھا گیا۔ زمانہ گزرتا گیا۔ یہاں تک کہ سردار کی لڑکی اس قابل ہوئی کہ چلنے پھرنے لگی۔ اور چونکہ اس جنگل میں اور کوئی نہ تھا اسلیے وہی میری رفیق ہوئی۔ میں زیادہ تر اسی کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔

اس وقت میری عمر بارہ تیرہ برس کی تھی، منیرہ کی عمر چھ سات سال کی تھی۔ ایک دن ہم دونوں اس نالے کے قریب جسکو پھاندتے وقت میرے بچے کی جان گئی، بیٹھے کھیل رہے تھے کہ ایک سانپ نکلا اور ہماری طرف بڑھا۔ میں نے جلدی سے ایک لکڑی کا ڈنڈا اٹھا کر اسکو مارنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ وہ مر گیا۔

میں اور منیرہ گھر واپس آئے۔ منیرہ نے اپنے والدین سے اس واقعہ کا ذکر کیا۔ سردار اور اسکی بیوی دونوں نے جا کر سانپ کو دیکھا، میری بہادری کا اعتراف کیا اور میرے بڑے شکر گزار ہوئے۔

میری زندگی میں پھر ایک خفیف تغیر ہوا۔ اب تک میں گھر میں ایک نوکر کی حیثیت سے رہتا تھا، لیکن اس واقعہ کے بعد سے میری خاطر مدارات ہونے لگی اور سردار مجھکو اپنا بیٹا کہکر پکارنے لگا۔ اس نے اپنے ساتھیوں میں سے ایک کو میرا استاد مقرر کیا جس کا کام یہ تھا کہ مجھے شہسواری اور ہتھیار چلانا سکھائے۔ مجھے خود بھی ان چیزوں کا شوق تھا۔ میں نے بہت جلد یہ فن سیکھ لیے۔

سردار اکثر گھر سے غائب رہتا تھا اور ادھر ادھر ڈاکے ڈالا کرتا تھا۔ جب میں سترہ اٹھارہ برس کا ہوا تو پہلی مرتبہ ڈاکہ زنی میں شریک ہونے کا موقع ملا۔ ایک مرتبہ جب وہ ڈاکہ مارنے جا رہا تھا تو اس نے ایک عمدہ گھوڑا مجھے دیا اور میں ہتھیار لیکر اس کے ساتھ ہو لیا۔ مجھے مظلوموں کی چیخ پکار سے بہت تکلیف ہوئی۔ اور میں نے سردار سے خواہش کی کہ مجھے ان موقعوں پر نہ بھیجا کرے۔ سردار نے ہنس کر جواب دیا کہ "تم کسی کو مارو پیٹو نہیں، محض میرے ساتھ رہا کرو۔"

میں برابر اس کے ہمراہ جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ میرا دل بہت سخت ہو گیا اور لوٹ مار میں مجھے لطف آنے لگا اور میں شوق سے ڈاکہ زنی میں شریک ہونے لگا۔

میری والدہ اکثر چپکے چپکے مجھے نصیحت کرتی تھیں کہ میں اس کام میں شریک نہ ہوا کروں۔ لیکن خاموش فقرتیں بڑے بڑے

میرا دم گھبراتا تھا۔ ہاں اگر گھر میں دل لگتا تھا تو منیزاؔ کی باتوں میں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اُس کے ساتھ مجھے سچی محبت تھی۔

ایک دن جبکہ میں عرصے سے کسی ڈاکے میں شریک نہیں ہوا تھا، میری والدہ رات میں میرے پاس آئیں۔ اُنکی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ میں اُنکو روتے دیکھنے کا عادی تھا۔ لیکن اُس دن وہ بہت ہی زیادہ اُداس تھیں۔ میں نے اُن سے اُداسی کا سبب پوچھا۔ اُنھوں نے جواب دیا کہ کیا گھر کی بربادی، تمھارے والد اور دیگر عزیزوں کی ناگہانی موت، تمھاری یتیمی، اپنی بے بسی اور یہ روز روز کی ذلت ایسی چیزیں نہیں ہیں کہ انسان کے دل پر اثر ہو"؟

میں نے اقرار کیا کہ بے شک یہ چیزیں قابل افسوس ہیں۔ اسکے بعد والدہ نے کہا کہ آج میں نے سردار اور اُسکی بیوی کو یہ ذکر کرتے سنا ہے کہ تمھاری شادی منیزاؔ کے ساتھ ہو جائے۔ لیکن میں تم کو تمھارے مرحوم باپ کا واسطہ دے کر کہتی ہوں کہ خبردار منیزاؔ کے ساتھ شادی نہ کرنا۔ تم ایک شریف خاندان کے چشم و چراغ ہو۔ ہرگز ہرگز اپنی نسل نہ خراب کرنا۔ اور جس قدر جلد ہو سکے اس جنگل سے بھاگنے کی کوشش کرو۔

میں نے والدہ کی تسلی کے لیے اُن سے وعدہ تو کر لیا۔ لیکن منیزاؔ سے مجھے معمولی محبت نہیں بلکہ عشق تھا۔ اس لیے دل میں یہ خواہش تھی کہ خدا کرے شادی ہو جائے"۔

بڈھا تھک گیا تھا۔ اور ذرا دم لیکر اور ایک سرد آہ کھینچ کر اُس نے اپنا افسانہ پھر شروع کیا۔

"والدہ کے چہرے پر میں نے کبھی ہنسی نہیں دیکھی تھی۔ اُنکو اپنی اور اپنے خاندان والوں کی تباہی کا ایسا صدمہ تھا کہ اس غم نے رفتہ رفتہ اُنکے دل و دماغ پر اثر کرنا شروع کیا تھا۔ وہ بیمار ہوئیں اور کچھ دن بیمار رہ کر وفات پا گئیں۔ مرتے وقت پھر مجھسے وعدہ لیا کہ میں منیزاؔ کے ساتھ شادی نہ کروں گا۔

مجھکو والدہ کے مرنے کا بڑا صدمہ تھا۔ کئی دن تک تو مجھ سے کچھ کھایا پیا نہیں گیا لیکن جس خلوص سے منیزاؔ نے میرے ساتھ ہمدردی کی وہ میں کبھی بھول نہیں سکتا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اگر وہ اتنی ہمدردی نہ کرتی تو میں سردار سے بالکل متنفر اور اس زندگی سے دل برداشتہ ہو گیا ہوتا۔

رفتہ رفتہ والدہ کا غم فراموش ہونے لگا میں سیر و شکار اور ڈاکہ زنی سے دل بہلاتا، اور جب گھر پر رہتا تو منیزاؔ کی باتوں سے۔

کچھ زمانہ اور گزرا۔ ایک دن ہم سب یعنی سردار، اُس کی بیوی اور منیزاؔ اور سردار کا ایک ساتھی سب مل کر ایک گاڑی میں سوار ہو کر ایک سمت

چلے - مجھے معلوم نہ تھا کہ ہم کہاں اور کیوں جا رہے ہیں - سفر بہت طویل اور دشوار تھا - ہم سب نے اپنی وضع تبدیل کر لی تھی - اور کوئی یہ نہ کہہ سکتا تھا کہ ہم لوگ سیدھے سادے امن پسند دیہات کے باشندے نہیں ہیں -

راستہ میں منیرؔا نے مجھے بتایا کہ ہم لوگ گاؤں کو جا رہے ہیں جہاں میرے اور تمہارے تعلقات ہمیشہ کے لیے وابستہ ہو جائینگے اور میں تمہاری اور تم میرے ہو جاؤگے - والدہ مرحومہ کی نصیحت پھر یاد آئی لیکن میں منیرؔا کی جدائی کسی طرح گوارا نہ کر سکتا تھا - اس لیے خاموش ہو رہا -

شادی ہوئی، ہم لوگ اپنے گھر واپس آئے اور آرام سے زندگی بسر کرنے لگے - میری زندگی مسرتوں سے لبریز تھی - کوئی غم کوئی رنج نہ تھا لیکن چند سال کے بعد سردار کے ایک [illegible] پر گولی لگی - وہ زخمی ہوا - اُس کے رفقائے گھر پہونچا گئے - میں نے حتی الامکان اس کی خدمت کی - وہ کئی دن بیمار رہا - اس خوف سے کہ کہیں کوئی پہچان نہ لے اسکو شہر بھیجا کر علاج کرنا مناسب نہ تھا - اور وہ خود بھی شہر میں جانا نہ چاہتا تھا - نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ دن بیمار رہ کر وہ مر گیا -

سردار کے مرنے پر تمام ڈاکو جمع ہوئے - بیگہ دفن کیا - اسکے بعد اُنھوں نے مجھکو اپنا سردار تسلیم کیا - وفاداری کی قسمیں کھائیں، اور آخری دم تک ساتھ دینے کا عہد و پیمان کیا - مجھے اور منیرؔا اور اُسکی ماں کو صبر کی نصیحت کی اور اپنے اپنے مقام کو چلے گئے -

"میرا دل سخت تو ضرور ہو گیا تھا اور کشت و خون میں مجھے لطف بھی آنے لگا تھا لیکن والدہ مرحومہ کی نصیحت کا کبھی کبھی خیال آتا تھا - اور میں اس پیشہ سے تائب ہونا چاہتا تھا - لیکن مشکل یہ تھی کہ اگر میں ڈاکوؤں کا ساتھ چھوڑتا تو وہ مجھے زندہ نہ چھوڑتے - منیرؔا بھی میرے ہمخیال تھی - لیکن ہم دونوں مجبور تھے -

کچھ عرصے کے بعد منیرؔا کی ماں نے بھی وفات پائی اور ہم دونوں میاں بیوی تنہا رہ گئے - میری عمر اُسوقت پینتیس کے قریب تھی - شادی کو کئی سال ہو چکے تھے لیکن اولاد کی نعمت سے ہم ابتک محروم تھے - لیکن کچھ زمانہ کے بعد منیرؔا کو حمل رہا اور میرے یہاں یہ لڑکا جسکی لاش تمہارے سامنے پڑی ہے پیدا ہوا -

---

بڈھے پر پھر ضعف کا غلبہ ہوا - اُس نے گھڑے سے لیکر پانی پیا - پھر ایک آہ سرد کھینچی اور بولا

"میں اب بچ نہیں سکتا - قلب کی حالت بدتر ہوتی جاتی ہے - اور مجھے بھی اب زندگی کی کوئی تمنا نہیں - سنو - ورنہ یہ واقعہ تمھارے

لیے راز ہی رہ جائیگا۔

اس لڑکے کی پیدائش کے وقت سے منیرہ کو بخار رہنے لگا۔ اور پندرہ سولہ دن کی بیماری کے بعد اُس نے وفات پائی۔

میرے لیے اب دو مصیبتیں تھیں۔ ایک منیرہ کی جدائی دوسرے بچے کی پرورش۔ میرے ساتھیوں نے یہ تجویز پیش کی کہ اگر بچے کی جان بچانا ہے تو فوراً دوسری شادی کرلینا چاہیے۔ لیکن میں نے منیرہ کے بعد کسی دوسری عورت سے شادی کرنے سے قطعی انکار کردیا۔

دوسری تجویز یہ پیش ہوئی کہ کوئی عورت مہیا کردی جائے جو اسکو پرورش کرے۔ لیکن یہبھی مجھے منظور نہ تھا۔ کیونکہ اس میں افشاے راز کا اندیشہ تھا۔

آخرکار میں نے یہ فیصلہ کرلیا کہ میں خود ہی بچہ کی پرورش کرونگا۔ اور ڈاکوؤں سے کہدیا کہ بھائیو اب میرا دل دماغ اس قابل نہیں رہا کہ تمھارا ساتھ دے سکوں۔ اس لیے کسی اور کو اپنا سردار مقرر کرلو۔

اُنھوں نے میری حالت دیکھ کر اسے منظور کرلیا۔

اب میرا مقصد زندگی صرف اتنا تھا کہ منیرہ کی قبر پر بیٹھا رہتا اور اپنے بچہ کی پرورش کرتا۔ میں اس بچے کے لیے ——— "

اور یہ کہتے ہوئے بڈھے نے لڑکے کی لاش پر نظر کی اور ایک دلخراش نعرہ مارا۔ کچھ دیر خاموشی کے بعد اُس نے پھر کہنا شروع کیا۔

"ہاں۔ میں یہ کہ رہا تھا کہ میں اپنے لخت جگر کی پرورش کرتا رہا۔ اسی زمانہ میں میرے خیالات میں تبدیلی واقع ہوئی۔ ڈاکہ زنی سے تائب میں پیشتر ہی ہوچکا تھا۔ اب جو وقت مجھے ملتا اُس میں دوسروں کے ساتھ حتی الامکان بھلائی کرتا۔ اور منیرہ کی روح کو ثواب پہونچانے کی ہر امکانی کوشش کرتا۔ میرے بچے نے اپنی بے زبانی سے مجھے وہ تعلیم دی جو پہلے کبھی نہیں ملی تھی۔ اور اس بچے نے میری زندگی کا سیاہ ورق پلٹ دیا۔

خیر وقت گزرتا رہا۔ یہاں تک کہ لڑکا جوان ہوا۔ وہ حسب معمول شہر سے جاکر ضروریات زندگی لے آتا تھا۔ آج بھی حسب معمول شہر گیا تھا وہاں اُس نے تم کو دیکھا اور اس خوف سے کہ کہیں تم کو میرا پتہ نہ مل جائے۔ اس نے بھاگنے کی کوشش کی۔ اور اس کا انجام یہ ہوا جو تمھاری آنکھوں کے سامنے ہے۔ میرا مال و اسباب ان تہ خانوں میں پوشیدہ ہے۔ اب میں یہ تمھارے سپرد کرتا ہوں۔ اس میں سے اگر دل چاہے تو میرے اور میرے بیٹے کے نام سے کسی نیک کام میں صرف کرنا ورنہ جس طرح چاہو اپنے کام میں لانا۔"

بڈھا پھر خاموش ہوگیا۔ دیر تک خاموشی طاری رہی

یکا یک اُس نے اپنا مُنہ آسمان کی طرف بلند کیا اپنے گناہوں کا اعتراف کیا - انجام بخیر ہونے کی دعا مانگی، بیٹے کی لاش پر سے چادر کا کونا ہٹا کر اُس کے منہ پر بوسہ دیا اور اُس کے برابر لیٹ گیا - لبوں کو خفیف سی جنبش ہوئی اور دم نکل گیا -

صبح صادق کا وقت تھا - چڑیوں نے چہچہانا شروع کر دیا تھا - میں نے اُٹھ کر نماز صبح ادا کی - گھوڑے پر سوار ہو کر شہر میں آیا - وہاں سے تین چار آدمیوں کو لیجا کر دونوں لاشوں کو برابر برابر دفن کیا - جتنا مال و اسباب تھا اُس سے میں نے ایک مسجد اور ایک سرائے تعمیر کرادی اور اُس کے متعلق جائداد وقف کر دی جس سے مسجد اور سرائے کا خرچ چلتا ہے

تو اے ثاقب

جناب مرزا ثاقب قزلباش صاحب لکھنوی

عشق کہنے کے لیے سلسلۂ اسرار ہے
چند باتیں تھیں، جنھیں کہنا بھی اب دشوار ہے

خواب میں ہیں وہ تو یوں اے دل تڑپتا جا یونہی
اُن کی قسمت کا ستارہ چرخ پر بیدار ہے

کروٹیں لیتی ہے دنیا آفریں اے دردِ دل
بوجھ میرا ہے مگر سارے جہاں پر بار ہے

فاصلہ سا مجھ میں اور اُن میں ہے پر کھلتا نہیں
اُس سے میں بیزار ہوں یا مجھ سے وہ بیزار ہے

ایک چھوٹی سی حقیقت چشم گریاں ہے مگر
کون سے بادل کا ٹکڑا ہے کہ دریا بار ہے

ذرہ ذرہ سے عیاں ہے گردشِ تقدیرِ دل
ہر بگولا دشت میں میرا علم بردار ہے

موت وہ اچھی کہ جسکے بعد مل جائے حیات
جو سبب ہو موت کا وہ زندگی بیکار ہے

غیر ہیں پھر غیر، دل اپنا ہے، اس سے پوچھیے
کیا خطا کی تھی جو اتنا درپئے آزار ہے

بیچنے لایا تھا تیروں پر چراغِ سوزِ غم
کون لے گا روشنی سویا ہوا بازار ہے

اپنی حالت کے سوا کچھ بھی نظر آتا نہیں
جس کی صورت دیکھتا ہوں میں وہی بیمار ہے

آ ادھر ثاقب میں دیکھوں تو گریباں میں ہے کیا
طوقِ طاعت ہے کہ مخفی رشتۂ زنار ہے

ترکیب بند بر وفات عزیز

جناب ابوالکمال امید صاحب امیٹھوی

(۱)

اے زلیخائے سخن وے جانِ جانانِ سخن گریہ کن ہاں گریہ بر مرگِ عزیزانِ سخن
آفتابِ تیرہ روز اکنوں شدہ ظلمت فروز در خسوفِ مرگ آمد ماہِ کنعانِ سخن
با ہمہ سودائے غم اکنوں چہ کوتہ دستیش تا بدامن چاک بایستے گریبانِ سخن
کے شود آئینہ دردِ دل بہ ماتم دیدگان گر بتا پوشش نہ بندی چشمِ حیرانِ سخن
لاجرم از خود بزندانِ خموشی شد اسیر کاں عزیزے شد رہا از رنجِ زندانِ سخن
ایں کہ دادند بے عزیزاں بر عزیز ما چہ رفت بوئے خوں آمد بما لیکن ز داماںِ سخن
چوں عیاں بینم کہ کس بادل نمی سوزد بکس بر مزارش کشتہ ام شمعِ شبستانِ سخن
گر سرِ گنج ارم داری دمے با من بساز تا بجمعیت دہم زلفِ پریشانِ سخن
گر دلت بر جاست دہم طاقتِ دیدن کجاست سینہ بشگافم نمایم داغِ پنہانِ سخن

بلبلِ دستاں سرائے گلکدہ از من برفت
فاسش می گویم خدائے گلکدہ از من برفت

(۲)

از غمِ مرگِ عزیزاں انچہ پیش آمد مرا برنمی تابد شنیدن گر بگویم بر ملا
چوں ہزار و سی صد و پنجاہ و چار آمد پدید اندریں سالِ غم افزا داد ریغا حسرتا
آں عزیزِ مصرِ شعر و شاعری یعنی عزیز رہروِ ملکِ بقا شد زیں جہانِ بے بقا
شاہدِ اردو زباں را زیبد اندر ماتمش سینہ کوبد گریہ و برہم زند زلفِ دوتا
آں عزیز با عزیز ہند دہندم مصر بود مصرِ ما شد بے عزیز مصرِ ما ماتم سرا
نشتر از مصراعِ خود اندر رگِ جاں میزنم تا سرشکِ خوں چو فوارہ جہد از دیدہا
گر بہ تکرارِ قوافی ساختم عیبم مکن امتیازِ ما و من از سطوتِ غم باشد کرا

مصرعِ سالِ وفاتش گفت امید انچنیں
مصرِ ما زندانِ من شد بے عزیزِ مصرِ ما
۱۳۴۲ھ

قطعہ تاریخ ارتحال حضرت لسان الہند مولوی میرزا محمد ہادی عزیز مغفور

جناب مولانا عالم صاحب لکھنوی

سوے ارم رواں شدہ از دارِ پُرمحن — طودِ کمال و قلزمِ ذخارِ شاعری
زیبِ سریرِ ملکِ سخن شاہِ شہرِ نظم — کنز العلوم و طرۂ دستارِ شاعری
عرشِ کمال و چرخِ فصاحت بلیغِ عصر — بدرے بہ ہر مطلعِ انوارِ شاعری
بر رُو خورد و طپانچہ ز دستِ نہیبِ علم — حاسد گر از حسد کند انکارِ شاعری
آں بلبلے کہ نغمۂ او بے عدیل بود — رونق فزا و زیبِ چمن زارِ شاعری
غواصِ بحرِ نظم چو شد طبعِ انورش — آمد بدست گوہرِ شہوارِ شاعری
رنگیں نمود چہرۂ محبوبۂ غزل — شد خونِ قلب غازۂ رخسارِ شاعری
از صدقِ دل ازو ہمہ اقسامِ شعر گفت — اے آں تولی کہ واقفِ اسرارِ شاعری
در فنِ نظم داشت عزیز آں تخلصے — از ذاتِ اقدسش شدہ اظہارِ شاعری
افسوس جاں بحق شدہ آں زبدۂ جہاں — برباد رفت رونقِ دربارِ شاعری
ناوقت آہ آہ ز عالم سفر نمود — سوے بہشت مالک و مختارِ شاعری

عالم نوشت مصرعِ ہجری ز خونِ دل
افسوس مُرد بلبلِ گلزارِ شاعری
۱۳۵۴ھ

(جناب سید ہادی صاحب ہادی لکھنوی)

ہائے وہ مرزا محمد ہادی والا صفات
جن کے دم سے تھی زمینِ شعر میں جلوہ گری
گُل ہوئی شمعِ حیات اُن کی ہوائے موت سے
یوں چلی بادِ فنا مانند بادِ صرصری
بادلِ غمناک ہادی نے لکھا یہ سالِ فوت
بجھ گیا خلوت گزیں مصباحِ بزمِ شاعری
۱۹۳۵ء

قطعہ تاریخ وفات حضرت لسان الہند مرزا محمد ہادی صاحب عزیز لکھنوی

جناب پروفیسر آغا اشہر صاحب لکھنوی ایم - اے

جس کو کہتے تھے سب لسان الہند / تھا جو اک پختہ کار فکر سخن
لکھنؤ تو نے کھو دیا اک لال / یعنی مرزا عزیز کامل فن
جام بردار ساقی کوثر / مدح پیرائے آل شاہ زمن
ضو فشان شمع محفل آرائی / دلستان نغمہ ریز بزم سخن
نہ ہوا کوئی تاجدار اودھ / تجھکو ملتا خطاب مستحسن
تیرا پیکر جو قابل خلعت / آج اس کو پنہا دیا ہے کفن
اب کہاں خوابگہ بنائی ہے / اب کہاں ہے عزیز تیرا وطن
ہاں اسی عالم خموشاں میں / جس کو غالب نے کر لیا مسکن
بن کے زلف سخن میں شانہ کش / کر کے نام کمال کو روشن
تو نے اس خاک کو سنوار دیا / جس جگہ پر بنا ترا مدفن

لب اشہر سے نکلی یہ تاریخ
ہے جناں میں عزیز مصر سخن
۱۳۵۴ ھ

خون کے آنسو

(جناب حکیم سید علی صاحب آشفتہ لکھنوی)

کون اُٹھ گیا پہلو سے کہ نشتر رگ جاں ہے / دل درد ہے اور درد میں طوفان فغاں ہے
تاریک ہے دُنیا کوئی پتہ بتا دے / وہ شمع شبستان کمالات کہاں ہے
اک نشتر سر تیز ہے یا حسرت دیدار / ارماں ہے کہ اک برق کلیجہ میں تپاں ہے
خاموش ہے محفل کہ عزیز آج نہیں ہے / چُپ چُپ سی خدائی ہے کہ گم حسن بیاں ہے
فریاد کہ اب طاقت فریاد نہیں ہے / پہلو میں مرے دل نہیں شعلہ ہے دھواں ہے
یہ تذکرۂ غم کہ لحد میں تجھے سونپ آئے / اک زہر میں ڈوبا ہوا نشتر ہے سناں ہے

افسوس ترے نام سے شہرت ہوئی ممتاز
اللہ! وہی تو ہے کہ بے نام و نشاں ہے

ہاں ہاں تجھے بیمہریِ عالم کے گلے تھے
اللہ قسم اب ترا مشتاق جہاں ہے

دنیا کی نگاہیں تجھے اب ڈھونڈ رہی ہیں
ہر آنکھ تری یاد میں خوننابہ فشاں ہے

اک درد کی تصویر تھا ہر حرفِ شکایت
اب تو ہے نہ وہ شکوۂ اربابِ جہاں ہے

سکّے ہیں ترے نام کے خورشید و قمر میں
یہ بات کوئی کم ہے نہاں ہوکے عیاں ہے

آئینۂ حیرت ہے ترا پیکرِ خاموش
خاموشیِ تصویر میں بھی شانِ بیاں ہے

اب شکوۂ بے مہریِ گردوں نہ کریں گے
گنجینۂ اخلاق تو مٹی میں نہاں ہے

پھر ہوں گی منوّر ترے دیدار سے آنکھیں
دھوکا ہے، تخیّل ہے، توہم ہے، گماں ہے

ہر ذرۂ خاموش ہے اک دفترِ فریاد
دل چاک ہے اس غم میں جگر نوحہ کناں ہے

مل جائیں عزیزؔ آپ تو آنکھوں میں بٹھالیں
افسوس مگر آج یہ امکان کہاں ہے

آشفتہ سے کے ہوش کہ اپنی خبر ہے
قابو میں نہ آنکھیں ہیں نہ دل ہے نہ زباں ہے

مٹتے جاتے ہیں جہاں سے گلستانِ شاعری

(جناب حافظ علی صاحب بیکسؔ بلگرامی)

کیوں نہ مٹ جائے بھلا اب اوجِ شانِ شاعری
مل چکا خاکِ لحد میں آسمانِ شاعری

کس طرح پھولے پھلے پھر گلستانِ شاعری
اُٹھ گیا باغِ جہاں سے باغبانِ شاعری

خشک ہو جائے نہ کیوں علم و ہنر کی شاخ شاخ
خونِ دل سے کون سینچے گلستانِ شاعری

اُٹھتے جاتے ہیں جہاں سے بلبلانِ خوشنوا
مٹتے جاتے ہیں جہاں سے گلستانِ شاعری

ہو چلے وہ ماہرِ فن ساکنِ خلدِ بریں
کہتی تھی دُنیا جنھیں روحِ روانِ شاعری

اُٹھتے جاتے ہیں جہاں سے مالکِ علم و ہنر
رہ گئیں کچھ صورتیں اب نوحہ خوانِ شاعری

آج کیسے سو رہے کنجِ لحد میں ہیں عزیزؔ
کل تو تھے دنیا میں یہ معجز بیانِ شاعری

چل بسے دنیا سے کچھ پوچھو نہ تنہا عزیزؔ
ساتھ اپنے لے گئے گویا جہانِ شاعری

ہم کہاں اور پھر کہاں بیکسؔ عزیزؔ نامور
گلکدہ[1] سے ہوگی ہاں اب یادِ شانِ شاعری

---

[1] "گلکدہ" مرحوم کا ایک مجموعۂ غزلیات ہے جو شائع ہو چکا ہے۔ بیکسؔ

نظرے خوش گزرے

اگست نمبر کی خراب چھپائی کی بنا پر ستمبر نمبر کے لیے نیا اہتمام کیا گیا، مگر چونکہ ہمارے صوبہ میں میونسپل اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کے انتخابات ہونے والے ہیں، مطبع کو رائے دہندوں کی فہرستوں نے مبتلا رکھا اور الناظر دو ہفتے سے زائد تاخیر کے بعد شایع ہوا۔ موقع پر موجود ہونے کی صورت میں شاید بروقت کچھ تدارک ممکن ہوتا، اب صرف دلی ندامت کے ساتھ عذر خواہی کی جا سکتی ہے۔ خدا کرے یہ پرچہ اسی ماہ کے اندر شایع ہو جائے اور آیندہ بدنظمی کا سلسلہ جاری نہ رہے۔

پرچہ کا حجم کم ہو، طباعت خراب ہو، یا اور صوری و معنوی نقائص رہ جائیں، بے وقت اشاعت کے مقابلہ میں یہ سب کچھ گوارا کیا جا سکتا ہے، مگر مہینے کے اندر اندر پرچہ شایع نہ ہو تو ناقابل بیان تکلیف ہوتی ہے۔

مولانا حالی مرحوم کی صد سالہ سالگرہ کا جشن اُنکے وطن پانی پت میں ۲۶ر اور ۲۷ر اکتوبر کو منایا جائے گا۔ اس اجتماع کا بڑا مقصد یہ ہے کہ حالی میموریل فنڈ کے لیے جس کی نگرانی میں "مرحوم کا قائم کردہ ہائی اسکول، متعدد ابتدائی مدارس، ایک علمی رسالہ اور ایک کتب خانہ چل رہا ہے" چندہ جمع کیا جائے۔ نواب صاحب بھوپال اس جشن کی صدارت فرمائیں گے اور امید ہے کہ اُن کی فیاضانہ امداد اور دیگر اکابر ملک کی اعانت و توجہ سے حالی فنڈ کے لیے اتنا سرمایہ فراہم ہو جائیگا کہ "آئے دن کی مالی پریشانیوں سے" نجات مل جائے۔

سفر میں ہونے کی بنا پر اس کی توقع نہیں کہ اس جشن میں شرکت کا موقع ملے گا، البتہ ایک امر کی طرف عقیدتمندان حالی و بہی خواہان اُردو کی توجہ منعطف کرانا شاید بے محل نہ ہو۔

حالی میموریل فنڈ کے ماتحت مدارس یا کتب خانہ کی حیثیت بالکل مقامی ہے۔ "علمی رسالہ" جسکا اپیل میں ذکر کیا گیا ہے اُس کی زیارت سے ہمیں محروم نہیں بلکہ اُسکے نام نامی سے بھی ہنوز ناواقف ہیں، اس لیے اُس کے متعلق اس بات کا اندازہ کرنے سے قاصر ہیں کہ وہ کس حد تک ایک مرکزی یادگار کا قائم مقام ہو سکتا ہے۔ مولانا حالی کی خدمات پر نظر کی جائے تو وہ ساری قوم کے مخدوم تھے اور اس لیے اُن کی یادگار ایسی ہونی چاہیے کہ پانی پت یا اُسکے گرد و نواح کے علاوہ ہندوستان کے مختلف صوبوں

کے رہنے والوں کو بھی اُس سے تعلق نفع یا دلچسپی ہو۔

ہمیں اپنا حال بخوبی معلوم ہے اس بنا پر نہ تو یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ جشن کے سلسلے میں اتنا سرمایہ فراہم ہو جائے گا کہ مقامی اداروں کی امداد کے ساتھ ساتھ کوئی مرکزی یادگار قائم کی جائے اور نہ کوئی ایسی تجویز پیش کرنے کی ہمت پڑ سکتی ہے جس کے لیے صرف کثیر کی حاجت ہو۔ بلکہ ہماری تجویز سادگی و نفاست کے لحاظ سے ایسی ہے کہ اس پر عمل پیرا ہونے میں زائد صرفہ نہ ہوگا اور کل اہل ملک کو اس میں شرکت ہونے اور دلچسپی لینے کا پورا موقع رہے گا۔

مولانا حالی کی جو عظمت اہل ہند کے دلوں میں ہے وہ تمام تر اُن کی تصانیف نظم و نثر کے باعث ہے مسدس حالی کو جو حسن قبول حاصل ہوا اس کی بنا پر یہی نہیں کہ اُس کے سیکڑوں ایڈیشن اب تک ملک کے مختلف حصوں میں شایع ہوئے بلکہ اُس کی عمدہ طباعت میں بھی بعض کارخانوں نے خاص اہتمام کیا مگر افسوس ہے کہ اُن کی دیگر تصانیف اس قسم کے التفات سے محروم رہیں۔ حتیٰ کہ اس وقت بازار میں اُن کے دیوان کا کوئی اچھا ایڈیشن ملے گا نہ اُن کے مجموعۂ نظم کا اور نہ اُن کی قابل قدر تصانیف نثر کا۔ اگر حالی میموریل فنڈ کے ارباب حل و عقد توجہ فرمائیں اور دس پندرہ ہزار روپیہ لگا کر جملہ تصانیف حالی کو دس پندرہ یکساں جلدوں میں دیدہ زیب طریقہ پر اور صحت کے ساتھ طبع کرائیں تو سارے اہل ملک اُس کی اشاعت میں حصہ لیکر مستفید ہو سکیں گے اور ممکن ہے کہ اس صورت سے خود حالی فنڈ کے لیے مستقل آمدنی کا ایک اچھا ذریعہ پیدا ہو جائے۔ یوروپ و امریکہ میں یہ طریقہ بہت عام ہے اور ایک ایک مصنف کی یادگار کی شاید سب سے اچھی صورت بھی یہی ہے کہ اُس کی کتابیں آنے والی نسلوں کے روبرو، تبدیل شدہ مذاق کے بموجب، بہتر سے بہتر حالت میں پیش کی جائیں۔ شکسپیر، اسکاٹ، میکالے، ٹمنی سن، وغیرہ کی تصانیف آج اسکولوں اور کالجوں کے تمام کتب خانوں میں اسی انداز سے موجود ہیں اور انگریزی زبان کی قدردانی کو دیکھ دیکھ کر حوصلہ مند ناشرین کتب آئے دن نئے نئے ایڈیشن تیار کرتے رہتے ہیں، اور یہ تمام سلسلے بہت پسند کیے جاتے اور ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوتے ہیں تصانیف حالی کا ایک ایڈیشن اس اہتمام سے شایع کر دیا جائے تو امید ہے کہ ہندوستان میں بھی یہ طریقہ مقبول ہوگا اور اس کی تقلید میں دوسرے اساتذۂ اردو کی تصانیف کے سلسلے بھی شایع کیے جائیں گے۔

ہماری غیر حاضری کے زمانہ میں لکھنؤ کے بعض اہل قلم نے "اردو اکیڈمی" کے نام سے ایک [illegible]

قائم کی ہے جس کی شرکت کا مطبوعہ دعوت نامہ حیدرآباد میں ملا۔ اس قسم کے جتنے ادارے بھی بنائے جائیں اُنکا دلی خیر مقدم کرنا چاہیے بشرطیکہ علمی کام ہونے کی توقع ہو۔ محض انجمن سازی اشخاص متعلقہ کے لیے نفع بخش ہو تو ہو قوم و ملک کے لیے مختلف حیثیات سے موجب نقصان ثابت ہوتی ہے اس لیے جب تک لکھنؤ پہونچکر حالات کا پوری طرح علم نہ ہو جائے اُردو اکیڈمی کے متعلق ابھی کچھ عرض کرنا مناسب ہے اور نہ اُس کی شرکت وعدم شرکت کے بارے میں کوئی رائے قائم کی جا سکتی ہے۔

برانیہمہ بے محل نہ ہوگا اگر یہ ظاہر کر دیا جائے کہ سنہ ۱۹۲۳ء میں ایک انجمن اُردو لکھنؤ میں قائم ہوئی تھی جس کا ذکر بارہا ان اوراق میں ہو چکا ہے۔ سنہ ۱۹۳۱ء میں جناب سید آل رضا صاحب ایڈوکیٹ اُس کے سکریٹری منتخب ہوئے تھے، اُس وقت سے انجمن حالتِ تعطل میں ہے۔ انجمن اُردو کے پاس غالباً کچھ نقد سرمایہ، فرنیچر اور کتابیں بھی تھیں۔ ایسی صورت میں کسی نئے ادارہ کی بنا ڈالنے کے بجائے اگر اُسی کی ازسرنو تنظیم کر دی جاتی تو شاید زیادہ قرین مصلحت اور سودمند ہوتا۔

انجمن اُردو کا دستورالعمل بڑی محنت اور مسلسل بحث و مباحثہ کے بعد تیار کیا گیا تھا اور اُس وقت لکھنؤ میں جتنے خدمت کرنے والے تھے اکثر و بیشتر اس انجمن سے وابستہ تھے۔ چنانچہ جب گورنمنٹ نے ہندوستانی اکیڈمی بنائی تو لکھنؤ کی نمایندگی کے لیے جو ارکین نامزد ہوئے وہ ایک کے سوا سب اسی انجمن سے تعلق رکھتے تھے۔ نئے ادارہ کے کارکن اگر اپنی سرگرمیوں کا مرکز انجمن اُردو کو بنا لیتے تو یہی نہیں کہ ابتدائی مراحل پر اُنکے قیمتی اوقات و توجہ کا ضیاع نہ ہوتا بلکہ انجمن کی شہرت، اُس کی روایات اور اُس کا مختصر اثاثہ بھی کام میں آ جاتا۔ ممکن ہے کہ دستورالعمل کے بعض اجزا امرورِ زمانہ سے اپنے کارکنوں کے مخصوص خیالات کی بنا پر ترمیم طلب ہوں تو دستورالعمل میں اس کی پوری گنجایش موجود تھی کہ حسب ضرورت تبدیلیاں کر لی جائیں۔

اُردو اکیڈمی، اگرچہ جامعہ ملیہ کے تحت میں ایک موجود ہے مگر ذاتی طور پر ہمیں یہ نام بھی پسند نہیں ہے۔ قطع نظر اس کے کہ انجمن کے مقابلہ میں اکیڈمی زیادہ اجنبی اور بعید الفہم ہے، اگر معنوی حیثیت سے غور کیا جائے تو جدید ادارہ کے اغراض و مقاصد و طریق کار کے لحاظ سے اکیڈمی کا محدود اصطلاح کے مقابلہ میں انجمن کا وسیع المعنی لفظ زیادہ موزوں اور جامع ہے۔ البتہ جدت پسند طبائع کے لیے اب یہ لفظ پُرانا اور فرسودہ ضرور ہو گیا ہے۔

خط و کتابت میں اپنا پکیل اور صاف لکھیے۔ نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیجیے۔ ورنہ عدم تعمیل کی شکایت عبث۔ منیجر

منطق و فلسفہ گنگ ہو جاتے ہیں، غالب، بیدل، فیضی، عرفی، نظامی، خسرو کسی کے یہاں اسکے مقابلے کا شعر نہ نکلے گا کس قدر مضحکہ خیز ہے۔

صفحہ ۴۶ سطر ۹۔

"مگر اس شعر میں مصنف کے زور بیان نے وہ دلآویزی پیدا کر دی ہے کہ اگلے اساتذہ کے سیکڑوں اشعار سامنے لائے جائیں تو بھی یہ شعر اپنے منہ سے آپ بولتا نظر آئے گا"

طرز بیان کو جانے دیجیے، سیدھی سادی زبان میں اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ اگلے اساتذہ کے بیشتر حصہ کلام پر میرزا یگانہ کے شعر کو فوقیت حاصل ہے۔ شعر یہ ہے:۔

طرفہ محشر ہے وارہ از فریب فردائے   زندہ زیر پیراہن مردہ در کفن تنہا

میں نہایت ادب سے میرزا یگانہ سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ وہ فارسی سے قطع نظر کر کے صرف اردو کو اظہار خیال کا ذریعہ بنائیں تو بہتر ہوگا، وہ لاکھ بلند پروازی کریں، ہزار اُن کا مرغ تخیل سدرہ و طوبیٰ کی خبر لائے، مگر اُنکی فارسی سے نہ صرف "ہندی کھچڑی" کی بو آتی ہے، بلکہ وہ شگفتگی اور معنویت بھی اس میں موجود نہیں ہے جو چند اور ہندی اساتذہ کے فارسی کلام میں پائی جاتی ہے۔ یہ تو مسلم ہے کہ ہندی شعرائے فارسی اور فارسی شعرا کے کلام میں ہمیشہ تمیز کی جا سکتی ہے۔ اول الذکر کے کلام میں عموماً وہ شیرینی اور بلاغت نہیں ہوتی جو آخر الذکر کے یہاں کم و بیش کلام کا جزو لاینفک ہوتی ہے مگر بعض ہندی شعرائے فارسی نے اپنی قابلیت اور ذہانت سے اپنے فارسی کلام میں بڑی حد تک اُن خصوصیات کو داخل کر لیا ہے جو عموماً اہل فارس کے کلام کا امتیاز سمجھی جاتی ہیں۔ ایسے شعرا کی ایک زندہ مثال ڈاکٹر اقبال ہیں۔ میرزا یگانہ کے فارسی کلام میں جو خشکی اور خشونت ہے وہ ابتدا ہی میں فارسی داں کو اس قدر گراں گزرتی ہے کہ وہ ان کے اشعار کے معانی پر غور کرنے سے پیشتر یہ تصفیہ کر لیتا ہے کہ ان کا فارسی شاعری سے باز رہنا ہی بہتر ہے۔ مندرجہ بالا شعر ہی میں دیکھ لیجیے عبارت کی کرختگی کس قدر نمایاں ہے۔ میرزا مراد بیگ نے اسی کتاب میں کسی جگہ غالب کے ایک شعر کے متعلق لکھا ہے کہ "معلوم ہوتا ہے الفاظ جنگل سے لا کر کٹہرے میں بند کر دیے گئے ہیں" اس اعتراض کا جواب میں انشاء اللہ موقعہ پر دوں گا، فی الحال عرض کرنا یہ ہے کہ کیا یگانہ کے مذکورۂ بالا شعر میں الفاظ جنگل سے پکڑ لائے ہوئے نہیں معلوم ہوتے۔ کیا ان میں وہ بے ڈھنگا پن نہیں ہے وہ حیوانیت نہیں ہے جو وحشی درندوں میں پائی جاتی ہے۔

صفحہ ۶۶ سطر ۹۔ " اس تخیل اس بیان کی مثال، اردو کیا فارسی لٹریچر میں بھی نہیں

مل سکتی۔"

سطر ۱۱ "الفاظ کے انتخاب پر غور کرو تو تاج محل کی صنعت نگاہوں سے گر جائے۔"
جس شعر کی تعریف کے یہ پل باندھے گئے ہیں ذرا وہ بھی سُن لیجیے

جو اب کیا وہی آوازِ بازگشت آئی — قفس میں نالۂ جانکاہ کا مزا نہ ملا

آپ نے دیکھا میرزا مراد نے اس شعر کی تعریف میں کیا زمین و آسمان کے قلابے ملائے ہیں اُنکے نزدیک اساتذہ کے دواوین عالم تنہائی و بیکسی کے مضامین سے بھرے پڑے ہیں مگر اس شعر کا جواب ان میں نہ ملیگا۔ ان کا مطالعہ اس کی شہادت دیتا ہے کہ اس شعر کی ٹکّر کا شعر کسی لٹریچر میں نہیں ہے۔ ان کی نظر میں اس شعر میں الفاظ کی نشست ایسی ہے کہ تاج محل کی صنعت نگاہوں سے گر جاتی ہے" اور حقیقت یہ ہے کہ میرزا یگانہ کے وجود سے برسوں پیشتر اُردو کے دو غزلخوانی سخنوروں نے بیکسی و تنہائی کے اس سے بہتر مضامین اس سے زیادہ موثر پیرایہ میں ادا کیے ہیں

(۱) امیر ایسی کہاں قسمت کہ پہونچوں اُڑکے پھولوں تک — کبھی چاکِ قفس سے جھانک لیتا ہوں گلستاں کو (امیر مینائی)

(۲) ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے — اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے (غالبؔ)

میرزا مراد بیگ کی وسعتِ مطالعہ کی اصلیت کا جگہ جگہ اندازہ ہوتا جاتا ہے۔

صفحہ ۶۹ سطر ۱۴۔ "اسکا جواب میر و غالب تو کیا، عرفی و نظیری کے ہاں بھی ڈھونڈے سے نہ ملیگا۔"

معاذ اللہ اس جہل مرکب کی کوئی حد ہے۔ عرفی، نظیری، میر، غالب، سب کے مجموعہ کلام کی کتنی بڑی تنقیص ہے اور بلا دلیل۔ شعر زیرِ بحث کو بھی ملاحظہ فرمالیجیے:۔

امید و بیم نے مارا مجھے دوراہے پر — کہاں کے دیر و حرم گھر کا راستا نہ ملا

بجز اس کے کیا کہا جا سکتا ہے کہ میرزا مراد کی سخن فہمی کی حقیقت ہر ہر قدم پر واضح ہوتی جا رہی ہے۔

صفحہ ۷۶، سطر ۱۲۔ "کیا غالب، ٹیگور، براؤننگ، اور شیلی کے کلام سے اسکا جواب پیش کیا جا سکتا ہے"

وہ شعر جسکی تعریف میں ان مسلم الثبوت اساتذہ کی اتنی ہراسانی کے ساتھ تنقیص کی گئی ہے حسبِ ذیل ہے

بجز ارادہ پرستی خدا کو کیا جانے — وہ بدنصیب جسے بختِ نارسا نہ ملا

سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر تعریف و تحسین کا یہ کون سا طریقہ ہے کہ مخصوص اور مشہور شعرائے دہر کا نام لیکر ان کے کلام پر حرف گیری کی جائے۔

صفحہ ۹۷ - "

اجل سے بڑھ کے محافظ نہیں کوئی اپنا　　خدا کی شان کہ دشمن نگاہباں نکلا

اس شعر کی تعریف میں حضرت علی مرتضیٰ ؑ کے مشہور قول " اجلک حافظک " کی ترجمانی پر میرزا مراد بیگ نے یہ کہہ دیا کہ " ترجمہ کی اس سے بہتر مثال اردو میں مفقود ہے " معلوم ہوتا ہے انھوں نے نظم طباطبائی مرحوم کی نظم گورِ غریباں اور نادر کاکوروی مرحوم کی نظم " یادِ ایامِ گزشتہ " کا مطالعہ نہیں کیا ہے ورنہ اگر انصاف پسند ہیں تو کبھی ایسی بات نہ کہتے - سچ تو یہ ہے کہ اس شعر میں میرزا یگانہ نے جدتِ تخئیل کی کوئی مثال نہیں دی - اسی مضمون کو فارسی اور اردو کے مختلف اساتذہ متعدد بار اور مختلف پہلوؤں سے بہت پیشتر کر چکے ہیں اور بعض کا اندازِ بیان میرزا یگانہ سے یقیناً بہتر ہے :-

(۱) بڑے نادان ہیں جو لوگ ڈرتے ہیں اسیر اس سے　　اجل تو نام ہے اک زندگانی کے نگہباں کا (امیر مینائی)
(۲) امانت کی طرح رکھا زمیں نے روزِ محشر تک　　نہ اک مو سے بدن کم تھا نہ اک تارِ کفن گم تھا (آتش لکھنوی)

صفحہ ۱۰۲

جرس نے مژدۂ منزل سنا کے چونکایا　　نکل چلا تھا دبے پاؤں کارواں اپنا (یگانہ)

اس شعر کی ستائش میں ارشاد ہوتا ہے " دنیا کے وسیع لٹریچر میں شاید ہی کوئی نمونہ میرزا صاحب کے اس شعر پر فوق لیجا سکے " میرزا مراد نے شاید ٹینیسن Tenny son کی مشہور نظم Crossing the bar اور براؤننگ کی نظم " ربّی بن عذرا " کا مطالعہ نہیں کیا ہے ورنہ اتنا مہمل دعویٰ زبان سے نہ نکالتے ۔

صفحہ ۱۲۱ -

خاک کا پتلا بگولا دشت کا ہو جائے گا　　مٹ کے بھی اک پیکرِ نشو و نما ہو جائے گا (یگانہ)

اسکی تعریف یوں کی جاتی ہے

" میر، سودا، درد، غالب، ذوق، مومن اور جملہ اساتذہ اور شعرا کے دواوین پڑھ جاؤ
مگر اس معنیٔ بیگانہ کا سہرا مرزا آپ ہی کے سر رہے گا "

تعجب ہے کہ میرزا مراد کو اردو ادب میں اس مضمون کے اشعار نہ ملے - انکے استفادہ کے لیے میں ایک شعر لکھتا ہوں زیادہ خلش ہو تو نئے پرانے اساتذہ کے دواوین کا مطالعہ کریں - یوں ہی بغیر پڑھے لکھے کوئی لاطائل دعوے زبان سے نہ نکالیں -

(۱) بعد مردن بھی مری گردشِ قسمت نہ گئی　　خاک ہو کر بھی بگولا ہوں بیابانوں میں

یہ تخئیل اس قدر کہنہ ہے کہ کسی موجودہ شاعر کے متعلق یہ کہنا کہ اس کی ایجاد کا سہرا اس کے سر ہے سراسر جہالت اور ناواقفیت کی دلیل ہے

پہلے اپنی قابلیت آزمانا چاہیے   پھر کہیں غالب کے منہ لگنے پاس آنا چاہیے

صفحہ ۱۲۳

عشق کا حسنِ طلب اک معنیِ بے لفظ ہے   ٹکٹکی بندھ جائے مطلب ادا ہو جائے گا (یگانہ)

اس کی ستایش کا طرز دیکھیے

"اگر اساتذۂ عجم میں سے کسی کے ہاں اس شعر سے لڑتا بھڑتا کوئی شعر نکل آئے تو بڑی بات ہو"

صفحہ ۱۲۶

تماشا ہے مری تصویر کا بیکار رہ جانا   قلم کے زخم کھا کر پیکرِ خونبار رہ جانا

"اس رنگینی تخئیل کی مثال لکھنؤ کا سارا لٹریچر ایک طرف رکھا جائے تو بھی پیش نہیں کرسکتا"

اس جملے میں جو سقم ہے وہ جانے دیجیے ذرا اس اندھا دھند تعریف کو تو دیکھیے پھر "تماشا یہ ہے" کہ "لکھنؤ کے تمام لٹریچر" میں خواجہ آتش کا کلام بھی شامل ہے جس کے بزعم خود میرزا یگانہ اور میرزا مراد دونوں اس قدر قدردان ہیں۔ رہا یہ شعر، مجھے تو اس میں نہ کوئی جدت معلوم ہوتی ہے نہ بلندیِ تخئیل، بلکہ اصل میں اس میں جو خیال پیش کیا گیا ہے وہ اصلیت سے اتنا دور ہے کہ کسی کو بھی پسند نہیں آ سکتا۔ افسوس ہے کہ مجھے اس وقت میرزا صاحب کو ترکی بہ ترکی جواب دینا پڑ رہا ہے مگر وہ خود آیات وجدانی میں فرما چکے ہیں کہ "اینٹ کی لینی اور پتھر کی دینی کا زمانہ ہے" میری رائے میں تو لکھنؤ کا بُرے سے بُرا شعر بھی میرزا یگانہ کے اس شعر سے اچھا ہے۔

صفحہ ۱۵۰

"پیدا نہ ہو زمیں سے نیا آسماں کوئی   دل کانپتا ہے آپ کی رفتار دیکھ کر" (یگانہ)

"اردو اور فارسی کا ادب تو کیا دنیا کا کوئی لٹریچر اس شعر کا جواب شاید ہی پیدا کر سکے"

اور لطف یہ ہے کہ اس قدر پامال مضمون، اتنی بدمذاقی سے ادا ہوا، شاید ہی کسی اور شاعر کے کلام میں ملے۔ اسی زمین میں غالب نے رفتار کا قافیہ ایسا نظم کیا ہے کہ یگانہ کے مذکورۂ بالا شعر کو اس کی ہوا بھی نہیں لگی ہے۔

ثابت ہوا ہے گردنِ مینا پہ خونِ خلق   لرزے ہے موجِ مے تری رفتار دیکھ کر (غالب)

صفحہ ۱۶۸۔ رہائی کا خیال خام ہے یا کان بجتے ہیں   اسیرو بیٹھے کیا ہو گوش بر آوازِ در ہو کر

"میر تقی میر کا سارا دیوان اُلٹ جاؤ اس درد انگیز صدا کا جواب نہ پاؤ گے"

الامان، میرزا صاحب میر کے دیوان میں تو ہزاروں اس سے زیادہ دلدوز تیر ہیں، لاکھوں اس سے بڑھ کر کلیجہ چھیدنے والے ناوک ہیں۔ میر کے منکسر المزاج معتقدین میر پر جان نثار کرنے والوں کے اشعار میں میرزا یگانہ کے اس شعر سے زیادہ درد ہے اس شعر سے زیادہ اثر ہے۔ آپ کو متنبہ کرنے کی غرض سے میں صرف دو شعر لکھے دیتا ہوں

(۱) اے جرس تو تو نہیں قافلہ والوں سے جدا — تیری آواز میں یہ درد کہاں سے آیا (امیر مینائی)

(۲) اجل اُس گلی سے ہو کر مرے گرد گزر آئے — دم واپسیں سے شاید مجھے بوئے یار آئے (تسلیم لکھنوی)

صفحہ ۱۷۴

زمیں کروٹ بدلتی ہے بلائے ناگہاں ہو کر — عجب کیا سر پہ آئے پاؤں کی خاک آسماں ہو کر

"یہ غزل بیسویں صدی کا اسٹرپیس ہے۔ خواجہ وزیر کے مطلع اور اس مطلع میں زمین آسمان کا فرق ہے"

وزیر کا مطلع ہے:

چلا ہے او دلِ راحت طلب کیا شادماں ہو کر — زمین کوئے جاناں رنج دیگی آسماں ہو کر

بجز اس کے کیا کہا جا سکتا ہے کہ میرزا صاحب کو نہ تغزل سے لگاؤ ہے نہ ذوقِ سلیم ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ کبھی اتنی بدذوقی کے الفاظ نہ لکھتے، وزیر کے مطلع کی شادابی کے سامنے یگانہ کے مطلع کی کرختگی صاف ظاہر ہے

صفحہ ۱۸۹

اُف رے تصرفات عشق آگ لگے دھواں نہ ہو — ڈوبے ہوئے ہیں سنگدل لذت سوز و ساز میں

"ایسی الہامی زبان پر غالب تو کیا میر کا دسترس مشکل سے ہو سکتا تھا"

واللہ، کیا تعریف ہے اور کتنی صحیح زبان میں۔ میرزا صاحب کو اس مغالطہ دہی میں شرم بھی نہ آئی، خدا کی شان میرزا مراد بیگ، غالب اور میر کی زبان دانی پر اعتراض کریں، وہ جنھیں خود اردو کے چند صحیح جملے لکھنا نہیں آتے اساتذہ پر حرف گیری کریں، پھر آخر اس شعر میں خوبی کیا ہے۔ اول تو اس کا مطلب بھی واضح نہیں ہوتا، دوسرے شعر کچھ ایسا گنجلک اور پھیکا سا ہے کہ کسی مذاق کے شخص کو اس میں لطف نہیں مل سکتا۔

اس شعر کی تعریف میں دو اور ارشادات حسب ذیل ہیں:—

صفحہ ۱۹۱۔ "اے حکیم فرزانہ، تیری فکر رسا عام سطح سے بلند ہو کر اپنے اصلی کاشانے کا سراغ

لگ نئے تو تیری قلمرو کا ڈانڈا نبوت کی سرحد سے مل جائے"

صفحہ ۱۹۲ " تو ان سے اعراض کر اور پیغمبرانہ اولوالعزمیوں سے کام لے کر بارگاہ احدیت میں عرض کر"

نعوذ باللہ من ذالک - میرزا صاحب نے یہ کیوں نہ کہدیا کہ " میرزا یگانہ پیغمبر ہیں اور خدا کا قرآنی ارشاد کہ رسول اکرم پیغمبر آخرالزماں تھے غلط ہے " ڈاکٹر بجنوری نے تو دیوان غالب کو الہامی اور آسمانی صحیفے سے نسبت دی تھی، میرزا مرادنے یگانہ کو پیغمبر بنا ہی دیا -

صفحہ ۱۹۵

حسنِ فطرت بولتا ہے پردۂ اسرار میں معنی بے لفظ پنہاں ہیں زبانِ خار میں

" کیا شیخ سعدی کا شعر بھی فی الحقیقت اسی مرتبہ پر فائز ہے "

لیجیے شیخ علیہ الرحمہ بھی لپیٹ میں آ گئے - اُن کا شعر ہے

برگ درختان سبز در نظر ہوشیار ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

بھلا اس شعر کی رنگینی اور معنویت کی گرد کو بھی یگانہ کا شعر پہنچتا ہے ، کیا صرف " معنی بے لفظ " کا ٹکڑا رکھ دینے سے شعر میں تمام حسن پیدا ہو گئے - سعدی کے شعر کی سی شیرینی اور بلاغت کیا یگانہ کے خشک شعر میں کہیں بھی ہیں

اس موقعہ پر یہ اعتراض کرنا بیجا نہ ہوگا کہ یگانہ کے کلام میں چند مخصوص ٹکڑے بہت استعمال ہوتے ہیں جس سے پتہ یہ چلتا ہے کہ انکی قوت ابداع بہت محدود ہے

معنی بے لفظ ، صدائے بازگشت ، منزل نافرس بازیچۂ شام وسحر ، طلسم بندی نقش و نگار وغیرہ -

صفحہ ۱۹۷

عمر گھٹنے کے لیے ہے وقت کٹنے کے لیے مفت دن گنتے کو ہم کپڑے گئے بیگار میں

" میر و غالب تو کیا عرفی و نظیری نے بھی ایسا فلسفہ نہ بیان کیا ہوگا "

مرزا صاحب سچ فرماتے ہیں ، غالب اور عرفی وغیرہ اس قسم کا شعر کہنا اپنی ذلت سمجھتے تھے -

صفحہ ۲۵۷

ناخدا کو نہیں اب تک تہِ دریا کی خبر ڈوب کے دیکھے تو یگانہ ساحل ہو جائے

" مذہب کے فلسفے کو اس قادرالکلامی سے آج تک کسی نے نہیں بیان کیا "

گویا مرزا صاحب نے تمام عالم کے ، اگلے پچھلے شاعروں کا کلام ، صوفیوں کے اقوال ، مبلغوں کے

خطبے، فلسفیوں کے مقالے، سائنسدانوں کے مکالمے، سیاست دانوں کی تقریریں دیکھی اور پڑھی ہی تو ہیں جو اس بے دردی اور اطمینان سے کہہ دیتے ہیں کہ "آج تک کسی نے نہیں بیان کیا" اور لطف یہ ہے کہ خود اس شعر کا مطلب نہیں سمجھے ہیں، فرماتے ہیں کہ "ملّا جو رسمیاتِ بیہودہ کی اشاعت کرتے ہیں ذرا ڈوب کر تو دیکھیں کہ کتنے پانی میں ہیں" واہ کیا سخن فہمی ہے "وائے بر جانِ سخن" افسوس ہے کہ میرزا صاحب اس صاف شعر کا مطلب سمجھنے سے بھی قاصر رہے۔ فلسفہ شناس صاحب، اس شعر میں نہ مذہب کا فلسفہ ہے نہ مذہب کے پیروؤں کا، یہ شعر تصوف سے متعلق ہے ذرا غور و فکر سے کام لیجیے، مطلب واضح ہو جائے گا۔

(۶)

آیاتِ وجدانی کا دوسرا مقصد جو پہلے مقصد سے کم اہمیت نہیں رکھتا ہے، غالب کی تعریض و تنقیص رہا ہے — اندھا دھند، بے سوچے سمجھے، بے موقع و محل، بار بار — ہر چار سطروں کے بعد یگانہ اور غالب کا موازنہ ہے، ہر ہر صفحہ پر یگانہ اور غالب کا تقابل ہے، ہر شعر کی تفسیر کے آخر میں میرزا مراد بیگ شیرازی نے یہی راگ الاپا ہے کہ میرزا یگانہ کو غالب پر فوقیت ہے۔ دیکھنے والا اس سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ یہ کتاب یگانہ کی تعریف و توصیف میں لکھی گئی ہے یا غالب کی تنقیص میں۔ اس میں یگانہ کی عظمت کے راگ گائے گئے ہیں یا غالب کی ناقابلیت کا رونا رویا گیا ہے، مگر میرزا صاحب کو اس کا کوئی احساس اور خیال نہیں۔ وہ خوشامد خصلتی کی طوفانی زدمیں اور حسد پیشگی کی مجنونانہ دھن میں ہوش و خرد بالکل کھو بیٹھے۔ ان کو بس ایک سبق یاد ہے کہ غالب و مومن، میر و سودا، عرفی و نظیری، حافظ و سعدی، ٹیگور و ملٹن، غرضکہ عالم سفلی و علوی کے جملہ اہل کمال پر یگانہ کو افضلیت و فوقیت ہے۔ وہ اتنا نہیں سمجھتے کہ اس بیگانگی جو اس کا دنیا پر کیا اثر پڑے گا، اس مذبوحیت سے لوگ کیا نتیجہ اخذ کریں گے، اس گھبراہٹ کے اظہار سے دنیا کیا سمجھیگی، آیا جو ان کا مطلب ہے، جس سطح نظر کو وہ پیش کرنا چاہتے ہیں، جس چیز کو وہ باور کرانا چاہتے ہیں، وہی ہو رہا ہے یا اسکے بالکل برعکس، اسکا بالکل اُلٹا، اس کے بالکل مخالف۔ وہ ہر سطر میں لکھتے ہیں کہ "غالب شاعر نہ تھا"۔ دیکھنے والا سوچتا ہے "وہ شاعر نہ تھا تو یگانہ کا اس سے مقابلہ چہ معنی دارد"۔ وہ ہر ورق پر دوہراتے ہیں "غالب زباندان نہیں تھا"۔ ناظر خیال کرتا ہے "وہ زبان داں نہ تھا تو اسکے مقابلہ میں یگانہ کی زباندانی کا علم گاڑنے کی کوشش کرنا اس کا مطلب"۔ وہ ہر ہر شعر پر چیختے ہیں "غالب نے کبھی اس پایہ کا شعر نہیں کہا" شعر کو جانچنے والا غور کرتا ہے "اس نے کبھی اس پایہ کے

اشعار نہیں کہے تو یگانہ کے اشعار کے ساتھ اس کے اشعار کے ذکر کا کیا مقصد"۔ غالب "برا تھا" نالایق تھا، جاہل تھا، بے عقل تھا" لاکھ سہی۔ غالب شاعر نہ تھا، جدت طراز نہ تھا، اہل زبان نہ تھا، صاحب ذوق صحیح نہ تھا" ہزار سہی۔ مگر متواتر یگانہ کا اس سے مقابلہ، بار بار یگانہ کا اس سے موازنہ، جگہ جگہ یگانہ کے اشعار کو اس پر ترجیح، قدم قدم پر یگانہ کی تخئیل کو اس کی تخئیل پر فوقیت" اس کی کوئی نہ کوئی وجہ ہے۔

کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

بیشک ہے اور بلا شبہ ہے، وہ کیا ہے ابھی اس سے بحث نہیں، لیکن میرزا صاحب نے خود اپنے ہاتھ سے اپنے پاؤں میں کلہاڑی مارلی، خود اپنی تلوار سے اپنے اوپر وار کیا، اپنی بوکھلاہٹ سے اپنے اغراض کا قلع قمع کردیا، اپنی گھبراہٹ سے اپنے مقاصد پر پانی پھیر لیا۔ چلے تھے غالب کی وقعت کم کرنے، بجائے اسکے اسکی قدر بڑھادی، روانہ ہوئے تھے یگانہ کا رتبہ بلند کرنے، اسکے بدلے انکی توقیر گھٹا دی۔ حقیقت میں میرزا مراد کی بیکسی اور کس مپرسی یہاں پر بڑی مضحکہ خیز ہے ؎

کرنے کیا آئے تھے اور کیا کر چلے۔

لائق، مشہور، اور باعظمت آدمی کو حاسدوں اور دشمنوں کی کمی نہیں ہوتی پہلے اسے اپنے سے نسبتاً کمتر آدمیوں سے مقابلہ کرنا پڑتا جنکی اُمیدیں جنکی کامیابیاں اسکے سبب سے بار آور نہیں ہو سکتیں جنھیں وہ ہر شعبہ اور ہر مقابلہ میں شکست دیتا ہے۔ بعد ازاں اسے ان غیر معروف اور غیر مشہور، خفیف اور کمظرف، دنیوی جراثیم کے خلاف مدافعت کرنا پڑتی ہے جو دامن انسانیت پر داغ ہوتے ہیں، جو ہمہ قسم کی ذہانت و ذکاوت، ہر نوع کی جدت و قابلیت، سے قطعاً معرا ہوتے ہیں، جن کی جانب سے کوئی ایسا فعل عمل میں نہیں آتا جو ملک کو فائدہ پہونچا سکے یا قوم کے لیے مفید ہو سکے، جن میں نہ اتنی سمجھ ہوتی ہے کہ خود کوئی نفع بخش خلائق، سودمند عوام فعل کریں، نہ اس کی استعداد ہوتی ہے کہ اپنے سے برتر دماغ، اپنے سے بہتر ذہانت و قابلیت، کے اشخاص کے احکام پر، اپنے سے بلند ذکاوت افراد کے نقوش قدم پر عمل پیرا ہوں۔ اس طبقے کے اصحاب کو اپنی بے بضاعتی کا اچھی طرح اندازہ ہوتا ہے اور اس احساس پر نہ صرف دل ہی دل میں جل بھُن کر خاک ہو جاتے ہیں بلکہ اپنی سم آلودہ ذہنیت کا زہر اُس پر اُگلتے ہیں جو صحیح معنوں میں قابل اور مشہور ہے، جو حقیقی طور پر باعظمت اور لائق ہے۔ اور ایسا کرنے میں وہ صرف اپنی ذلیل فطرت کے احساسات، اپنی کمینی طبیعت کے الہامات کی تعمیل کرتے ہیں، اپنے کمزور دماغ کے جذبات کی تکمیل کرتے ہیں۔ دوسرے کی عظمت ان کی ذاتی خودداری

بنام خداوند جہاں آفریں

الناظر

نمبر ۵ جلد ۴ نومبر ۱۹۳۵ء

تباہی بنی اسرائیل

(جناب الحاج منشی امیر احمد علوی بی اے پنشنر ڈپٹی کلکٹر)

سلطنت رومتہ الکبریٰ کے باج گزار بادشاہ کنعان - ہیروڈ کے عہد میں یروشلم کے ایک "راست باز اور بے عیب" کاہن زکریا نام کو بڑھاپے میں اپنی سن رسیدہ بیوی سے ایک لڑکا عنایت ہوا جس کا نام اشارۃ غیب سے یوحنا (یحیٰی) رکھا گیا حالانکہ "اُن کے کنبے میں کسی کا یہ نام نہ تھا"- یہ لڑکا بڑا ہوا تو خدا کا کلام اُس پر اُترا" اور وہ "یردن کے سارے گرد و نواح میں گناہوں کی معافی کے لیے توبہ کی منادی کرنے لگا"-

یوحنا | وہ اونٹ کے بالوں کا لباس پہنتا - چمڑے کا پٹکا کمر سے باندھتا - جنگلی شہد کھاتا اور منادی کرتا تھا کہ "میرے بعد وہ شخص آنے والا ہے جو مجھ سے زور آور ہے - میں اس لائق نہیں کہ جھک کر اُس کی جوتیوں کا تسمہ کھولوں"- اُس زمانے میں ہیرودیس بن ہیروڈ گلیل کا حاکم تھا اور اس نے اپنے بھائی فلپ کی بیوی ہیرودیاس سے تعلق پیدا کیا تھا - مقدس یوحنا نے زجر و توبیخ کی - بد اعمالیوں سے منع کیا - حکومت کے نشہ میں ملامت کی - یہ مصلح بے ہنگام حاکم کو ناگوار ہوئی - فساد اور بلوے کے خوف سے ناصح کو زندہ رہنے دیا لیکن محبس میں بند کیا - ہیرودیاس اپنے عہد کی

جز بیل تھی۔ وقت کی منتظر رہی۔ سال گرہ کے جشن میں اُس کی نوجوان بیٹی نے محفل میں ناچ کر بادشاہ کا دل خوش کیا اور بقسم وعدہ لیا کہ "جو مانگے سو پا دے" قول و قرار کے بعد بولی کہ "یوحنا کا سر تھال پر یہیں مجھے منگوا دے"۔ بادشاہ غمگین ہوا مگر اپنی قسموں اور مہمانوں کے سبب اس نے حکم دیا کہ دے دیا جائے۔ آدمی بھیج کر قید خانہ میں یوحنا کا سر کٹوایا۔ اُس کا سر تھال میں لایا گیا اور لڑکی کو دیا گیا"۔

کہتے ہیں کہ یوحنا کے سر سے خون کا فوارہ جاری تھا جو اُس وقت تک بند نہیں ہوا جب تک شہر کی گلیاں حاکموں۔ امیروں۔ رئیسوں اور عوام کے خون سے سیراب نہ ہوئیں۔ اور ایک مشتِ قیمت جان کے بدلے لاکھوں یہودیوں کا خون نہیں بہایا گیا۔

گلیلی میں اس خون ناحق سے ہیرودیس اور اُس کی ظالم بھاوج نے شہرت پائی۔ یروشلیم میں روسا اور اکابر نے دوسرا ظلم کیا۔ ہیرڈ کے آخری زمانہ میں یوحنا کی ولادت سے چند ماہ بعد حضرت عیسیٰؑ پیدا ہوئے تھے۔ یہودیوں نے ان پر مذہب میں رخنہ اندازی کرنے۔ آسمانی بادشاہت کی بشارتیں دینے اور حکومت کے خلاف بغاوت پھیلانے کا الزام لگا کر ۳۳ء میں عید کے دن گرفتار کر کے رومی گورنر پیلاطس کے سامنے سزا کے لیے پیش کیا۔ جرم کا ثبوت نہ تھا۔ گورنر نے تعزیر مناسب نہ سمجھی اور یہود سے کہا کہ تم اپنی شریعت کے موافق فیصلہ کرو مگر اکابر قوم مصر ہوئے کہ "صلیب دی جائے"۔ عیسیٰؑ

"پیلاطس نے دیکھا کہ کچھ بن نہیں پڑتا ہے اور بلوہ ہوا جاتا ہے تو پانی لے کر لوگوں کے روبرو اپنے ہاتھ دھوئے اور کہا کہ "میں اس راستباز کے خون سے بری ہوں۔ تم جانو۔ سب لوگوں نے جواب دیا کہ اس کا خون ہماری اور ہماری اولاد کی گردن پر .... تب یسوعؑ کو کوڑے لگوا کر حوالے کیا تا کہ صلیب دی جائے"۔

ان بے پناہ مظالم کی سزا قوم کو ملنا ضرور تھی۔ بنی اسرائیل ظلم و جور کا شکار ہوئے۔ فلسطین سے جلا وطن کیے گئے اور اُن کی تاریخ کا ورق چاک کر دیا گیا۔

پاداش بد اعمالی کے ظہور اور غضب خداوندی کے نزول کی ظاہری صورت یہ ہوئی کہ یہود نے

سلہ حضرت عیسیٰ کی ولادت ۴ سنہ قبل مسیح میں ہوئی تھی۔ سنہ عیسوی جو اس وقت رائج ہے وہ مسیح کی ولادت سے نہیں شروع ہوتا بلکہ اسی سنہ کے آغاز سے ۴ ½ برس قبل حضرت عیسیٰ دنیا میں تشریف لا چکے تھے۔

روح القدس الکبریٰ کی حکومت سے بغاوت کی۔ وہ نازک مزاج اور جنگجو تھے۔ مذہبی امور میں کسی قسم کی مداخلت گوارا نہ کرتے تھے۔ ہر وقت بلوے اور فساد کے لیے تیار رہتے تھے۔ شہنشاہ کے حکم سے فلسطین کی مردم شماری ہوئی تو بلوہ کیا۔ شاہی جھنڈوں پر انسان کی تصویر نظر آئی تو گلا کٹانے پر تیار ہو گئے۔ آب رسانی کے لیے حوض بنانے کو ہیکل مقدس کے خزانے سے روپیہ لیا گیا تو فساد کیا۔ رومی گورنروں کو یروشلم میں امن قائم رکھنا دشوار تھا۔ فریسی۔ صدوقی۔ سامری وغیرہ فرقے باہم کشت و خون کرتے تھے اور جب حکومت کی طرف سے تشدد ہوتا تھا تو گورنر کو خطا کار ٹھہراتے تھے۔

سنہ ۶ء سے سنہ ۶۶ء تک ۶۰ برس میں ۱۴ گورنر تبدیل کیے گئے مگر کوئی حاکم سب فرقوں کو جو ایک دوسرے کو کافر اور مرتد سمجھتے تھے رضامند نہ رکھ سکتا تھا۔ آخری گورنر

بغاوت یہود

فلورس نے حقیقتاً سختی کا برتاؤ کیا اور ساری قوم کو ناراض کر دیا۔ مقابیوں کی کامیابیاں یاد آئیں اور یروشلم میں علی الاعلان بغاوت ہو گئی۔ سرکاری فوج کو زیر کیا۔ گورنر کا محل جلایا۔ حکومت کے موافقین قتل کیے اور شہر میں اپنا راج قائم کر دیا۔

فلورس نے پہلے تو بغاوت کی آگ سلگنے دی تاکہ فساد اور خوں ریزی کے بعد فرقہ پرستی کا زور شروع ہو۔ حکومت کی مخالفت نمائندہ جنگی سے سرد پڑ جائے اور تب سرکشوں کو سخت سزائیں دے کر ہمیشہ کے لیے خود سری کا جنون یہود کے دماغ سے نکال دیا جائے۔

لیکن اتفاق سے جس دن یروشلم میں خود مختاری کا اعلان ہوا اسی روز قیصریہ میں رومی گورنر کے حکم سے بیس ہزار یہودی قتل کیے گئے تھے۔ خبر بجلی کی طرح شہر میں پھیلی۔ یہود کے سب فرقے متحد ہو گئے اور ہر جگہ رومیوں کا قتل عام کرنے لگے۔ دارالسلطنت سے سمندر کے ساحل تک بغاوت پھیلی اور بیشتر قلعوں پر یہود نے قبضہ کر لیا۔

جب پانی سر سے گزرا تو فلورس نے باغیوں کی سرکوبی کے لیے اپنے مستقر سے حرکت کی۔ یروشلم سے دو فرسخ کے فاصلے تک پہنچ گیا تھا اور شہر کے بزدلوں نے بھاگنے کی تیاری شروع کر دی تھی کہ بعض نامعلوم وجوہ سے وہ رات کی تاریکی میں سامان جنگ اور خیمہ و خرگاہ چھوڑ کر یکایک پسپا ہو گیا۔ یہودیوں کی ہمت بڑھی۔ اُنھوں نے تعاقب کیا اور تقریباً چھ ہزار رومی سپہ سالار قتل کر دیے۔ اس شکست سے افسردہ اور دل شکستہ ہو کر فلورس مر گیا۔ شہنشاہ روما نیرو نے ایک

سپہ سالار روم

تجربہ کار سپہ سالار کو جو جرمنی اور برطانیہ میں داد شجاعت دے چکا تھا مشرقی حکومت کا مدار المہام بنایا۔ ویسپیسین ایشیائے کوچک کے راستے سے شام آیا اور سنہ ۶۷ء کے موسم سرما میں ساٹھ ہزار

فوج لے کر گلیلی میں داخل ہوگیا۔ تیس برس پہلے اس صوبہ پر ہیرودس حکمراں تھا اور بے گناہ یوحنا کا خون ایک رقاصہ کو خوش کرنے کے لیے بہایا گیا تھا، اب وہ خون رنگ لایا۔ باغیوں کی عملداری ہوئی اور رومیوں سے مقابلہ اور مجادلہ کے لیے یہاں کی حکومت جوزیفس کے سپرد کی گئی۔

جوزیفس

وہ جنگ میں شجاع سپاہی۔ مدبر جنرل۔ اور وفا شعار قوم پرست ثابت ہوا لیکن جس کارنامہ نے اُس کی شہرت کو حیاتِ جاوید عطا کی وہ اُس کی بے نظیر "تاریخ یہود" ہے جو تباہی یروشلم کے کئی سال بعد اُس نے روۃ الکبریٰ میں تالیف کی تھی اور اس وقت تک احوال بنی اسرائیل کی جستجو کرنے والوں کے لیے مشعل ہدایت ہے۔ روما کی کارآزمودہ فوج سے کھلے میدان میں جنگ خلاف مصلحت سمجھ کر وہ "جوٹاپٹ" کے غیر معروف قصبہ میں قلعہ بند ہوگیا۔ یہ قصبہ ایک بلند چٹان پر آباد تھا جس کے چاروں طرف عمیق وادیاں تھیں اور اُن کو اونچے پہاڑ اس طرح گھیرے ہوئے تھے کہ جب تک کوئی شخص وادیوں میں پہونچ نہ جائے وہ شہر کو دیکھ بھی نہیں سکتا تھا۔ ویسپیسین نے اس بستی پر قبضہ پانے کے لیے پوری فوجی قوت صرف کردی لیکن وہ کسی طرح وادیوں سے عبور نہ کرسکا مجبوراً

محاصرۂ جوٹاپٹ

اُس نے بڑے بڑے متحرک کشتے تیار کرائے۔ تاکہ اُن کی وساطت سے شہر کی دیواروں تک رسائی ہوسکے لیکن جوزیفس نے شہر کی دیواریں بلند تر کرانا شروع کیں۔

دیواروں کا بلند کرنا آسان نہ تھا کیونکہ چاروں طرف دشمن محاصرہ کیے تھے اور جو شخص دیوار پر نظر آتا تھا وہ تیر یا پتھر کا نشانہ بنتا تھا۔ اس کا تو یوں کیا گیا کہ بیلوں کی تازہ کھالیں دیوار سے لٹکائی گئیں تاکہ سنگ وسنان کو روک لیں یا کم ازکم اُن کی قوت کم کردیں اور آگ نیچے سے پھینکی جائے تو وہ کھالوں کی رطوبت سے ٹھنڈی ہو جائے۔

غرض بہزار مشکل دیواریں بلند کی گئیں۔ رومیوں کی ہمت پست ہوئی اور اُن کے جنرل نے جنگی کارروائی ملتوی کردی۔ اُس نے سوچا کہ چند روز میں یہود کے پاس سامان خوراک ختم ہوجائیگا اور اُس وقت وہ خود امان کے طالب ہوں گے۔ محاصرے میں سختی کی گئی۔ شہر والوں کی آمدورفت کے سب راستے مسدود کردیے گئے اور محصورین کو رسد کی تکلیف محسوس ہونے لگی۔ جوزیفس نے کئی دن تک شبانہ روز لڑائی کا سلسلہ جاری رکھا۔ یہودی بے جگری سے لڑتے تھے اور رومیوں کو شکست ہوتی تھی۔ آخرکار دشمنوں کے متحرک برج تیار ہوگئے اور اُن کی بلندی سے قلعہ کی دیوار پر پتھروں کی بارش شروع ہوئی۔ منجنیقوں کی سنگباری سے دیوار کا ایک حصہ کمزور ہوگیا۔ جوزیفس

نے ریت سے بھرے ہوئے تھیلے اُس مقام پر لٹکائے جہاں دیوار میں رخنے پڑگئے تھے تاکہ پتھروں کا زور دیوار پر نہ پڑے مگر اسکے جواب میں رومیوں نے بانسوں میں کانٹے لگاکر تھیلوں کے رسے کاٹ دیے۔ عاجز آکر یہودیوں نے دیوار سے کھولتا ہوا تیل اور دہکتی ہوئی آگ دشمنوں پر برسانا شروع کی۔ رومی سراسیمہ ہوکر دیوار کی زد سے دور ہو گئے اور منجنیقوں سے سنگباری کا سلسلہ شروع کرنے لگے۔ تمام رات بغیر کسی وقفے کے پتھروں کی بارش ہوتی تھی۔ دیوار کی حفاظت میں ہزاروں یہودی قتل اور زخمی ہوئے لیکن صبح ہوتے دیوار کا ایک حصہ گرگیا اور رومیوں کے لیے راستہ صاف ہوگیا۔ جوزیفس نے معذوروں اور بوڑھوں کو دیوار کے مضبوط حصے کی طرف تعینات کیا۔ عورتوں کو جو شور وغل کر رہی تھیں مکانوں میں بند کیا اور سب جوان و مضبوط سپاہیوں کو زرہیں پہنا کر شکستہ دیوار کے سامنے کھڑا کردیا اور ان کو ہدایت کی کہ جب رومی رستے دیوار کے نزدیک آجائیں تو اُن پر گرم تیل پھینکا جائے۔ حکم کی تعمیل ہوئی اور رومیوں کو ایک مرتبہ پھر شہر سے پسپا ہونا پڑا۔ ویسپیسین نے پچاس پچاس فٹ اونچے لکڑی کے مینار بنوائے اور اُن پر لوہے کی چادریں جڑوائیں تاکہ آگ اُن پر اثر نہ کرسکے اور ان مضبوط میناروں کو سنگباری کے پشتوں پر کھڑا کرکے شہر میں تیروں اور پتھروں کی بوچھاڑ کردی۔ یہود کے پاس اس کا کچھ جواب نہ تھا۔ وہ مجبور ہوکر شہر سے نکلے اور دشمنوں پر اس تیزی سے حملہ کیا کہ کچھ دیر کے لیے رومی فتح سے مایوس ہوگئے۔ ہزاروں یہودی اس کوشش میں بھی کام آئے۔ غرض ۴۷ دن تک محاصرے کی سختی قائم رہی اور لڑائیوں کا سلسلہ جاری رہا۔ لیکن رومی شہر میں داخل نہ ہوسکے۔ تب ایک بزدل اور کم ہمت یہودی شہر والوں کی آنکھ بچاکر کسی طرح دشمن کے کیمپ میں پہنچا اور مخبری کی کہ شہر کی آبادی بہت تھوڑی رہ گئی ہے۔ کسی حملہ آور سے مقابلہ کا دم باقی نہیں ہے۔ رات کے آخری حصے میں سب سپاہی تھک کر سو جاتے ہیں اُس وقت دھاوا کیا جائے تو بغیر مزاحمت کے شہر پر قبضہ ہوجائیگا۔ ویسپیسین کو خیال تھا کہ کوئی یہودی اپنے ہمقوموں سے بیوفائی نہیں کرسکتا اور وہ اس مخبر کی روایت پر اعتماد نہ کرتا تھا لیکن افسروں کے مشورے سے مخبر کو نظر بند کرکے رات کے آخری حصہ میں شہر پر یکایک حملہ کردیا گیا۔ سپہ سالار کا دست راست طیطوس پہلا شخص تھا جو ایک رومی دستہ لے کر شکستہ دیوار کے راستے شہر میں داخل ہوا۔ دیوار کی حفاظت کرنے والے حقیقتاً غافل تھے۔ اُنکو فوراً قتل کردیا گیا اور بقیہ رومی فوج بھی داخل ہوگئی۔ دشمن شہر کے اندر تھا۔ قلعہ فتح ہوچکا تھا۔ سورج نکل آیا تھا لیکن شہر والوں کو خبر نہ تھی وہ ہنوز خواب خرگوش

میں تھے۔ بیشتر سوتے ہی مارے گئے۔ جو بیدار ہوئے وہ لڑ کر قتل ہوئے۔ رومی محاصرے کی طوالت سے پریشان ہو چکے تھے۔ انھوں نے یہودیوں کو پکڑ پکڑ کر پہاڑ کے نیچے پھینکنا شروع کیا۔ بدحواسی پھیلی۔ یہود خود یہود کے ہاتھوں مارے گئے۔ ۴۰ ہزار مرد قتل ہوئے اور بارہ سو عورتیں اور بچے گرفتار ہوئے۔ شہر کی دیواریں مسمار کی گئیں۔ عمارتیں جلا کر خاک سیاہ کی گئیں۔ یہ واقعہ ۶۸ء مطابق سنہ ۱۳ جلوس شہنشاہ نیرو کا ہے۔

جوزیفس اس قتل عام سے بھاگ کر ایک غار میں چھپا اور چند روز کے بعد رومیوں کے لشکر میں طلب امان کے لیے حاضر ہوا۔ انھوں نے جان کی امان دی اور نظر بند کیا۔

جوٹاپٹ کی تسخیر کے بعد سامریوں نے ایک پہاڑی پر مورچہ بندی کی۔ ان کے گیارہ ہزار چھ سو جوان مارے گئے۔ شہر قیصریہ یونانی باشندوں نے رومیوں کے حوالہ کر دیا۔ کل یہودی آبادی قتل کی گئی۔ تاریچا نے مقابلہ کیا۔ قتل عام ہوا۔ بہت سے باشندے ہلکی کشتیوں پر سوار ہو کر جھیل کے راستہ سے فرار ہوئے۔ رومیوں نے تعاقب کیا۔ بھاگنے والوں نے رومیوں پر پتھر پھینکے۔ ساحل پر دشمنوں کی فوج تھی۔ اس نے تیر برسائے۔ بعض بھاگنے والے برچھیوں کا نشانہ ہوئے۔ کچھ تلواروں سے مارے گئے۔ بعض کشتیاں دلدل میں پھنسیں اور کچھ غرق ہو گئیں۔ یہودی پانی سے سر نکالتے تھے تو تیروں کا نشانہ ہوتے تھے۔ دشمن کی کسی کشتی کا سہارا لیتے تھے تو ہاتھ کاٹ دیے جاتے تھے۔ بدحواس ہو کر خشکی کی طرف جاتے تھے تو تلوار سے سر کاٹا جاتا تھا۔ جھیل کا نیلا پانی خون سے سرخ ہو گیا۔ ساحل ٹوٹی ہوئی کشتیوں اور لاشوں سے پٹا تھا۔ چھ ہزار آدمی جھیل پر قتل ہوئے۔ بارہ سو بوڑھے اور کمزور شہر میں مارے گئے۔ چھ ہزار غلامی کے لیے یورپ بھیجے گئے اور تیس ہزار بازاروں میں فروخت ہوئے۔ شہر گمالا کا چار مہینے محاصرہ رہا۔ ۹ ہزار یہودی قتل ہوئے۔ غرض صوبہ گلیلی کے تمام شہر یکے بعد دیگرے رومیوں کے قبضہ میں آ گئے اور اب سوائے یروشلم کے کوئی مقام باغیوں کے پاس نہ رہا۔

محاصرۂ یروشلیم

یہود میں باہم اتفاق ہوتا تو دارالسلطنت کی تسخیر آسان نہ تھی مگر بدقسمتی سے شہر کے اندر مخالف فرقوں میں جنگ شروع ہو گئی اور اس کا سلسلہ ختم نہ ہوا تھا کہ ۷۰ء میں طیطوس رومی نے محاصرہ کر لیا۔ اس وقت شہر میں تخمیناً دس لاکھ نفوس موجود تھے جن میں سے ۲۴ ہزار مستقل سپاہی تھے۔ رومی فوج اسّی ہزار کے قریب تھی۔ یہود کو اپنے بیرونی بھائیوں سے امداد کی توقع

لہ سپہ سالار ویسپیسین ۶۹ء میں روۃ الکبریٰ کا قیصر ہو گیا تھا۔ وہ اطالیہ چلا گیا اور فوج کی کمان اس کے بیٹے طیطوس کے ہاتھ آئی۔

تھی مگر طیطوس نے شہر کو اس طرح سب طرف سے گھیر لیا کہ نہ کوئی بستی کے اندر جا سکتا تھا اور نہ وہاں سے باہر نکل سکتا تھا - بیرونی فصیل دشمنوں کی سنگباری سے مسمار ہوگئی اور یہودی شہر کے اندرونی حصے میں پناہ گزیں ہوئے - سامان خوراک کا ذخیرہ کافی نہ تھا - ایک مذہبی تیوہار کے سبب سے شہر کی آبادی اُس وقت بہت بڑھی ہوئی تھی - گرانی شروع ہوئی اور لڑائی کی تکالیف کے ساتھ قحط کی مصیبت بھی سر پر آن پڑی - جوزیفس نے یہ دردناک داستان بڑے جوش و خروش سے بیان کی ہے اور اُسی کی زبان سے سننے کے قابل ہے :-

قحط کی کہانی جوزیفس کی زبانی

"سامانِ خوراک کی کمی سے شہر والوں کا حال ایسا دردناک تھا کہ اُس کے تصور سے بھی آنکھیں تر ہوتی ہیں سرداروں اور دولتمندوں کے پاس ضرورت سے زیادہ غذا موجود تھی مگر غربا اور کمزور فاقوں سے آہ و نالہ کرتے تھے - قحط کی مصیبت نے سب تعلقات فراموش کرا دیے تھے - شرم و حیا مفقود - خودداری اور عصمت نابود تھی - جو ہستیاں واجب الاحترام تھیں نفرت خیز ہوئیں - جن رشتہ داروں سے محبت تھی بیگانے سمجھے گئے - بچے اپنے باپ کے منہ سے آخری ریزہ چھیننے کو تیار رہتے - مائیں خوردسال بچوں سے روٹی چھین کر کھاتی تھیں - عزیز ترین قرابت دار تڑپ تڑپ کر مر رہے تھے مگر پاس والوں کو اُن کے ہاتھ سے ایک قطرہ پانی چھین لینے میں تامل نہ تھا - اُس پر ستم یہ کہ باغی سپاہی گھر گھر تلاشی لیتے تھے - جو کچھ غربا نے چھین جھپٹ کر حاصل کیا وہ اُن سے لے جاتے تھے -

جس دروازے کے کواڑ بند نظر آئے باغیوں نے سمجھا کہ گھر والے چھپا کر کھا رہے ہیں - مکان پر حملہ کیا - درندوں کی طرح کواڑ توڑے اور گھر میں گھس کر جو کچھ پایا اُڑا لے گئے - اگر کسی نے روٹی کا ٹکڑا منہ میں رکھا تو وہ زبردستی اُس کی حلق سے نکلوایا جاتا تھا -

بوڑھے مرد روٹی چھپاتے تھے تو مارے جاتے تھے - عورتیں اجناس پوشیدہ کرتی تھیں تو اُن کے بال نوچے جاتے تھے - چھوٹے بچے اُلٹے لٹکائے جاتے تھے اور بے دردی سے فرش زمین پر پٹک دیے جاتے تھے - اگر کوئی شخص ان باغیوں سے مزاحمت کرتا تو وہ قانون سے سرتابی کا ملزم تصور کیا جاتا اور سخت وحشیانہ سزاؤں کا مستوجب ہوتا تھا -

پوشیدہ اجناس کے ذخیرے دریافت کرنے کے لیے باغیوں نے ہولناک طریقے ایجاد کیے تھے - بول و براز کے راستے مسدود کرتے اور ایسے ناقابل بیان شرمناک مظالم کرتے تھے کہ مالک مکان مجبوراً قبول کرتا تھا کہ اُسکے گھر میں روٹی کا ٹکڑا یا ایک مٹھی جَو موجود ہیں -

یہ مظالم اُس وقت ہو رہے تھے جبکہ سپاہی غذا کے محتاج نہ تھے۔ اگر ان کے پاس کھانے کو نہ ہوتا اور بھوک کی بے قراری میں وہ ایسے وحشیانہ حرکات کرتے تو اس قدر افسوسناک بات نہ تھی مگر واقعہ یہ تھا کہ فوج والوں کے پاس کھانا موجود تھا اور وہ غربا پر ظلم اس لیے کرتے تھے کہ اُن سے سامان غذا چھین کر آئندہ کے لیے جمع کریں۔

بعض غربا رات کے وقت شہر سے باہر نکل جاتے اور رومیوں کے لشکر کے قریب تک جاتے تھے کہ جنگل سے جڑی بوٹی جمع کرکے بچوں کے لیے لائیں۔ جب وہ اس خطرناک سفر سے واپس ہوتے تو ظالم باغی اُن سے یہی گھاس پھوس چھین لیتے تھے۔ وہ روتے چلاتے اور خوشامد کرتے کہ بچوں کے لیے کچھ رہنے دو۔ خدا سے بزرگ کا واسطہ دلاتے مگر یہ ظالم ایک ریزہ بھی اُن کے پاس نہ چھوڑتے تھے۔ بدنصیب خدا کا شکر کرتے کہ سامان گیا تو گیا۔ ان درندوں سے جان بچی یہی لاکھ غنیمت ہے۔

باغیوں کے مظالم کی تفصیل غیر ممکن ہے۔ مختصر یہ ہے کہ جو مصیبت اس زمانہ میں شہر پر نازل ہوئی وہ ابتدائے آفرینش عالم سے کسی ملک میں نہ دیکھی گئی اور نہ سُنی گئی۔ کسی عہد میں ایسی بدکار نسل نہیں پیدا ہوئی جیسی کہ اس وقت یروشلم میں تھی۔ اس نے اپنی سیہ کاریوں اور بداعمالیوں سے عبرانی قوم کو ذلیل کیا اور اجنبیوں کی نگاہ میں ہمیشہ کے لیے اپنے بھائی بندوں کو خطاکار بنا دیا۔ طیطوس رومی کے فوجی دستے شہر پناہ کے قریب تھے۔ اُن پر فصیل سے سنگ باری ہوتی تھی۔ سپہ سالار کو خبر ملی کہ شہر والے خوراک جمع کرنے کے لیے رات کے وقت بیرونی گھاٹیوں میں آتے ہیں۔ اُس نے ایک رسالہ کمین گاہ میں بٹھا دیا اور حکم دیا کہ جو یہودی شہر سے باہر نکلے وہ گرفتار کیا جائے۔

ان باہر نکلنے والوں میں لڑنے والے جوان بہت تھوڑے ہوتے تھے۔ زیادہ تعداد غریبوں کی تھی جن کو شہر میں کسی جگہ خوراک میسر نہ آتی تھی۔ وہ عزیزوں اور رشتہ داروں کو چھوڑ کر شہر سے فرار نہ ہو سکتے تھے۔ اگر بیوی بچوں کو ساتھ لے کر بھاگتے تو حکومت سے بغاوت کے ملزم قرار دیے جاتے۔ گرفتار ہوتے اور قتل کیے جاتے۔ اور اگر اہل و عیال کو چھوڑ کر فرار ہوتے تو سب متعلقین موت کے گھاٹ اُتارے جاتے۔ قحط کی مصیبت میں زندگی سے بیزار ہو کر قوت لایموت کی جستجو میں باہر نکلتے تھے۔ ڈاکوؤں سے چھپ کر جاتے اور دشمنوں کے پنجے میں پھنستے تھے۔ رومی سپاہی اُن کا تعاقب کرتے اور وہ حفاظت خود اختیاری کے لیے جنگ پر مستعد ہوتے تھے۔ لڑنے کے بعد زخمی ہو کر رحم کی التجا بیکار تھی۔ وہ گرفتار کیے جاتے اور کوڑوں سے مارے جاتے تھے۔ جب ضربات سے ہلاک ہوتے تو شہر کے دروازے کے سامنے صلیب پر آویزاں کیے جاتے تھے۔ پانچ سو یہودی ایک ایک دن میں اس طرح صلیب پر لٹکائے گئے۔ طیطوس کو اُن کے حال زار پر رحم آیا لیکن وہ

مجبور تھا۔ اگر اس جماعت کو حراست میں رکھتا تو اُس کی فوج کا بڑا حصہ حفاظت پر مامور کیا جاتا اور جنگ میں کام نہ آسکتا۔ اسکے علاوہ ایک مصلحت بھی مضمر تھی کہ شہر کے باشندے یہ عبرتناک منظر دیکھ کر خوفزدہ ہوں اور اطاعت قبول کرلیں۔ رومی سپاہی روزانہ ان گرفتاران بلا کو لوہے کی سلاخوں سے صلیبوں پر چڑھاتے تھے یہاں تک کہ مجبوسوں کے لیے شکنجے اور شکنجوں کے لیے میدان میں جگہ باقی نہ رہی۔

باغیوں پر اس مہیب کارروائی کا کچھ اثر نہ تھا۔ وہ مظلوم گرفتاروں کے اعزہ کو شہر کی دیوار پر لاتے اور یہ خونی منظر دکھا کر سمجھاتے تھے کہ ان لوگوں کو فصیل سے باہر نکلنے اور رومی حدود میں پناہ لینے کی سزا مل رہی ہے۔ کمزور دل والے یہ وحشیانہ سزا دیکھ کر دہل جاتے تھے اور شہر سے فرار ہونے کا خیال چھوڑ دیتے تھے مگر اہل ہمت پھر بھی باہر نکلتے اور کہتے تھے کہ قحط کی روزانہ تکلیف سے ایک دن کی موت بہتر ہے۔

طیطوس نے اس سفاکی سے تنگ آکر حکم دیا کہ آئندہ جو قیدی پکڑے جائیں انکو صلیب نہ دی جائے بلکہ اُنکے ہاتھ کاٹ کر شہر پناہ کے قریب چھوڑ دیا جائے اور ان کی معرفت یروشلم کے سرداروں کے پاس پیام بھیجا جائے کہ وہ اپنی حماقت سے باز آئیں اور رومیوں کو شہر کے تباہ کرنے پر مجبور نہ کریں تاکہ انکا خوبصورت دارالسلطنت اور مقدس عبادت خانہ بربادی سے محفوظ رہے۔ اسکے جواب میں باغیوں نے قیصر روم کو گالیاں دیں اور بآواز بلند اعلان کیا کہ وہ موت سے نہیں ڈرتے بلکہ غلامی کی زندگی پر مرگ کو ترجیح دیتے ہیں۔ شہر پناہ ہو تو کچھ مضائقہ نہیں ہیکل مقدس مسمار ہو تو کچھ خوف نہیں۔ تمام دنیا خدا کا عبادت خانہ ہے۔ آخری سانس تک وہ بزرگوں کی نشانی کی حفاظت کریں گے اور کسی شرط پر اطاعت منظور نہ کریں گے۔

اب یہودیوں کا شہر سے باہر نکلنا موقوف ہوگیا اور قحط کی سختیاں بڑھیں۔ ہر ایک قبیلہ اور خاندان پر خوراک کی قلت کا اثر ہوا۔

مکانات کی چھتوں پر عورتیں اور بچے جمع تھے جو بھوک کی تکالیف سے بدحال تھے۔ شہر کی گلیاں بڈھوں کی لاشوں سے پٹی ہوئی تھیں۔ جوان اور نوعمر لڑکے بازاروں میں بھوتوں کی طرح پھرتے تھے۔ اور جس جگہ طاقت جواب دیتی وہیں گر کر ٹھنڈے ہو جاتے تھے۔ ان لاشوں کی تجہیز و تکفین محال اور تدفین دشوار تھی۔ جو بیمار تھے وہ اس خدمت سے معذور۔ جو تندرست تھے وہ احتراز و انکار کرتے تھے۔ بہت سے بندگان خدا دوسروں کو دفن کرتے وقت خود موت کا شکار ہوئے اور کچھ قبروں میں گر کر قبل از وقت دنیا سے رخصت ہوئے۔ ان اموات پر نہ کوئی آہ وزاری کرتا تھا اور نہ

کسی گھر سے ماتم کی آواز آتی تھی۔ قحط کی مصیبت ہر غم سے زیادہ جگر دوز تھی۔ مرنے والے مُردوں کو سوکھی ہوئی آنکھوں اور کھلے ہوئے مُنہ سے دیکھتے تھے اور خوش تھے۔

تمام شہر میں سناٹا چھایا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دن کو بھیانک رات ہے۔ مصیبت پر مصیبت یہ کہ ڈاکو اور چور اس حالت میں بھی اپنے حرکات سے باز نہ تھے۔ وہ دروازوں کو توڑ کر مکانات میں داخل ہوتے اور بسا اوقات وہاں بجز لاشوں کے کچھ نہ پاتے تھے۔ اُن کو لاشوں سے کفن اُتارنے میں بھی باک نہ تھا۔ وہ برچھیوں بھالوں خنجروں اور تلواروں سے مردوں پر نشانہ بازی کی مشق کرتے تھے۔ اگر کوئی نیم جان گھر میں ملا اور اُس نے عاجزی سے درخواست کی کہ اپنی تلوار سے اُسکا خاتمہ کر دیا جائے تو وہ استدعا کو ٹھکرا کر باہر نکل جاتے اور اُسکو بھوک کی تکلیف سے ہلاک ہونے کے لیے چھوڑ جاتے تھے۔ یہ مظلومین ہیکل مقدس کی طرف اپنا مُنہ پھیرے ہوئے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دیتے تھے۔ جب لاشوں کا تعفن شہر میں ناقابل برداشت ہوا تو باغیوں نے حکم دیا کہ بیت المال سے روپیہ خرچ کر کے ان لاشوں کی تدفین کی جائے۔ مگر مُردوں کی تعداد اس قدر زیادہ تھی کہ اس پر عمل درآمد نہ ہو سکا اور لاشیں شہر پناہ کی دیوار سے گھاٹیوں میں پھینکی گئیں۔

ایک دن طیطوس گشت کرتا ہوا ان گھاٹیوں کے قریب پہونچا۔ وہاں کا عبرتناک منظر دیکھ کر اور غلیظ تعفن سے بدحواس ہو کر آسمان کی طرف ہاتھ اُٹھا کر کہا کہ "اے خدائے لایزال آپ شاہد ہیں کہ یہ فعل میرا نہیں ہے۔"

بہت سے یہودی مصائب سے عاجز آ کر فصیل شہر سے کود پڑے بعض لڑائی کا بہانہ کر کے پتھروں سے مسلح ہو کر شہر سے باہر نکلے اور رومیوں کے لشکر میں امان طلب کرتے ہوئے چلے گئے۔ وہاں تازہ آفت سے دوچار ہوئے یعنی بھوک کی بدحواسی میں رومیوں کے دسترخوان پر اس قدر کھایا کہ اُنکے معدے پھٹ گئے یا ہولناک بیماریوں میں مبتلا ہوئے۔

قحط کی مصیبت سے بڑھ کر ہولناک آفت یہ نازل ہوئی کہ رومیوں کے لشکر میں خبر پہونچ گئی کہ جو یہودی یروشلم سے فرار ہو کر آتے ہیں اُنکے پیٹ میں سونا بھرا ہوتا ہے یعنی شہر سے ہجرت کے وقت وہ ڈاکوؤں سے حفاظت کے لیے سونا اور اشرفیاں نگل لیتے ہیں۔ دشمن کے سپاہیوں نے مصیبت زدہ مہاجروں اور امان طلب کرنے والوں کے شکم چاک کرنا شروع کیے تاکہ اُن سے سونا نکالا جائے۔ ہزارہا نفوس ہلاک ہوئے۔ صرف ایک شب میں دو ہزار یہودیوں کے پیٹ پھاڑے گئے اور اسقدر کثیر مقدار سونے کی رومی کیمپ میں پہونچی کہ بارہ درہموں میں اتنا سونا بکنے لگا جتنا پہلے پچیس درہم میں

ملتا تھا۔

شہرپناہ کے باہر یہ آفت تھی اور شہر کے اندر باغی سرداروں نے رعایا کا لہو چوسنے کے بعد ہیکل مقدس کے خزانوں پر ہاتھ صاف کیا۔ مقدس ظروف پگھلا کر چاندی سونا باہم تقسیم کرلیا ہیکل کی دیگیں۔ رکابیاں اور میزیں وغیرہ جن کی روزانہ عبادت اور نیاز کے لیے ضرورت ہوتی تھی آپس میں بانٹ لیں۔ بادشاہوں نے جو قیمتی سامان نذر چڑھایا تھا اُس پر بھی تصرف کیا۔ ہیکل کی مقدس شراب اور روغن کے برتن بھی خالی کیے اور کہتے تھے کہ وہ خدا کے لیے اور ہیکل کی حفاظت کے لیے جنگ کرتے ہیں لہذا لڑائی کا خرچ بھی ہیکل کو برداشت کرنا چاہیے۔

اس مقام پر میں (جوزیفس) اپنا خیال ظاہر کرنے پر مجبور ہوں کہ اگر رومی اس شہر کو تباہ کرنے میں زیادہ تامل کرتے تو عجب نہ تھا کہ زمین پھٹ جاتی اور یروشلم والے اُس میں دھنس جاتے یا سیلاب آتا اور سب یہودی غرق ہو جاتے یا بجلی گرتی اور سب کے سب خاک سیاہ ہو جاتے۔ کیونکہ یہ بدکار نسل کفر و الحاد، فسق و فجور میں اُن سب قوموں سے فوق رکھتی تھی جو ازمنہ گزشتہ میں ایسے آفات سے ہلاک کی گئی تھیں۔ حقیقتاً انھیں بدمعاشوں کی دیوانگی کا نتیجہ تھا کہ تمام قوم یہود تباہ اور برباد ہوگئی۔

میرے سامنے ایک شخص نے جو شہر کے دروازہ کے قریب تعینات تھا طیطوس سے بیان کیا کہ ماہ نیسان کی چودہ تاریخ (یعنی آغاز محاصرہ) سے تموز کی پہلی تک ایک لاکھ پندرہ ہزار آٹھ سو اسی لاشیں یہودیوں کی نکالی گئیں تھیں۔ یہ تعداد اُن لاشوں کی تھی جنکے اُٹھانے کا خرچ بیت المال سے دیا گیا۔ اسکے علاوہ ہزاروں لاشیں رشتہ داروں نے اپنے صرف سے پھیکوائی تھیں۔ میرے سامنے کئی معتبر اشخاص نے کہا کہ کم سے کم چھ لاکھ غریبوں کی لاشیں فصیل سے پھینکی گئیں۔ اور کئی لاکھ گھروں میں بند تھیں کہ اُنکا اُٹھانے والا کوئی نہ تھا۔ گرانی کا یہ حال تھا کہ ایک مٹھی گیہوں ایک مثقال میں ملتا تھا۔

محاصرہ کی سختی بڑھی اور باہر سے جڑی بوٹی لانا بھی مسدود ہوا تو مویشیوں کے گوبر اور رسنڈاسوں کے غلیظ سے دانے چُن چُن کر کھانے لگے۔ پہلے جس غلاظت کا آنکھ سے دیکھنا ناگوار تھا وہ اب بے تکلف حلق سے اُتاری جاتی تھی۔ بھوک کی تکلیف سے سوکھی گھاس چباتے اور جوتیوں کا چمڑا کھاتے تھے۔ اگر کسی خوردنی شے کا سایہ بھی نظر آیا تو باہم کُشت و خون کی نوبت آتی تھی اور زبردست کمزور سے چھین کر کھا جاتا تھا۔

میں یہ شرمناک حرکات کیوں بیان کرتا ہوں؟ میں ایسا واقعہ لکھنے والا ہوں جس کی نظیر یونانیوں

اور وحشیوں کی تاریخ میں بھی نہیں مل سکتی۔ مجھکو اس قصہ کے درج کرنے میں پس وپیش تھا کیونکہ آئندہ نسل شاید اس روایت کو غلط سمجھے لیکن اس وقت متعدد چشمدید گواہ اس حکایت کے موجود ہیں پہنچنے والے اردن کی ایک شریف اور دولتمند عورت مریم نام عرصے سے یروشلم میں مقیم تھی۔ محاصرہ کے ایام میں اُسکا اثاث البیت لُٹ گیا۔ جو دولت اُس کے پاس تھی چھین گئی۔ کسی قسم کا اناج گھر میں باقی نہ رہا حتی کہ کوڑا تک ڈاکو اُٹھا لے گئے۔ وہ عورت سخت پریشان اور تباہ تھی۔ سپاہی روز اُس کے گھر میں گھُستے تھے اور جب کوئی شے نہ پاتے تو گالیاں دیکر واپس جاتے تھے۔ ایک دن بھوک سے جاں بلب ہوکر اُس نے دوزخ بھرنے کی یہ ترکیب نکالی کہ اپنے شیرخوار بچے کو سوکھی چھاتی سے چھُڑا کر کہا "اے بدنصیب لڑکے میں اس لڑائی کے وقت تجھ کو کس دن کے لیے زندہ رکھوں۔ اگر رومیوں نے قتل نہ کیا تو غلام بنائیں گے اور اُن کی غلامی کی ساعت آنے سے پہلے ہی قحط میرا اور تیرا خاتمہ کر دے گا۔ شہر کے ڈاکو سپاہی غلامی اور قحط کی مصیبتوں سے زیادہ خطرناک ہیں۔ تو میری خوراک بن تا کہ یہ قصہ دنیا میں یادگار رہے اور یہودیوں کی مصیبت اور فلاکت عالم آشکارا ہو"۔

یہ کہکر اُس نے معصوم بچے کو ذبح کیا اور بھون کر نصف خود کھایا اور نصف چھپا رکھا۔ سپاہی گوشت کی بو پاکر مکان میں داخل ہوئے اور عورت کو دھمکانے ڈرانے لگے۔ عورت بولی کہ آج مجھکو نفیس گوشت دستیاب ہوا۔ آدھا میں نے کھا لیا اور آدھا تمھارے لیے رکھا ہے"۔ یہ کہکر اپنے بچے کے جسم کا بقیہ حصہ اُن کے سامنے پیش کیا۔ یہ ہولناک منظر دیکھ کر سپاہی بدحواس ہوئے اور ایک دوسرے کا مُنہ تکنے لگے۔ پھر وہ عورت بولی "یہ میرا ہی بیٹا ہے۔ میں نے ہی اسکو ذبح کیا ہے۔ آؤ اس میں سے کھاؤ۔ میں نے خود کھایا ہے۔ تم عورت سے زیادہ نرم دل اور ماں سے بڑھکر محبت کرنے والے نہیں ہو سکتے۔ اگر تم کو اس غذا کے استعمال میں پس وپیش ہے تو جاؤ۔ آدھا میں کھا چکی ہوں۔ یہ بقیہ بھی میرے ہی لیے رہنے دو"۔ سپاہی خوف زدہ ہوکر مکان سے بھاگے اور گوشت بدنصیب ماں کے لیے چھوڑ گئے۔

یہ ہولناک واقعہ تمام شہر میں مشہور ہوا۔ ہر شخص کانپ اُٹھا۔ لوگ موت کی تمنا کرتے تھے کہ اس آفت سے نجات ملے۔ اور جو مر چکے اُن پر رشک کیا جاتا تھا کہ وہ آرام کی جگہ پہونچ گئے۔ یہ المناک خبر رومیوں کے لشکر تک پہونچی۔ اکثر کو یقین نہ آیا۔ بعض غم واندوہ سے متاثر ہوئے اور بعض کو قوم یہود سے نفرت وعداوت پیدا ہو گئی۔ قیصر روم کو معلوم ہوا تو اُس نے اپنے خدا کے حضور میں معذرت کی اور کہنے لگا کہ میں نے یہودیوں کو امن وآزادی کی دعوت دی تھی مگر انہوں نے بغاوت کو پسند کیا اور

اپنی قوم کی بربادی کے خواہشمند ہوے - بچہ کا گوشت کھانا ایسا سنگین جرم ہے کہ اس کی پاداش میں اُن کی سب بستیاں اُجاڑنا چاہیے - ایسا شہر صفحۂ ہستی پر سورج کی روشنی میں باقی رہنے کا مستحق نہیں جہاں کی مائیں یہ ناپاک غذا کھاتی ہوں "

اب اس کو یقین آگیا کہ یروشلم کسی طرح اطاعت پر تیار نہ ہوگا اور ایسی سخت مصیبتیں برداشت کرنے کے بعد وہاں کے رہنے والوں میں اتنی سلامتی حواس اور درستی عقل باقی ہی نہیں رہ سکتی کہ وہ اپنا نیک وبد سوچیں اور طالبِ امان ہوکر قحط کی آفت سے نجات پائیں -

---

تباہی یروشلم

باوجود مصائب قحط کے جنگ زور شور سے جاری تھی - رومی دھاوے کرتے تھے اور پسپا ہوتے تھے - آخرکار رومیوں کے قلعہ شکن آلات نے ایک جگہ دیوار میں رخنہ کردیا - طیطوس نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ اُس مقام پر قبضہ کریں - ۱۲ سپاہی بڑھے مگر وہ مغلوب ہوے - دو دن تک کسی کو پیش قدمی کی ہمت نہ ہوئی - رات کے وقت ۲۰ سپاہی اُس شگاف سے داخل ہوے اور شہر کے ایک محلہ پر قبضہ کرلیا - طیطوس نے امن کا اشتہار دیا اور باغیوں کے عفو تقصیر کا اعلان کیا - بعض نے اس رحم وکرم سے فائدہ اُٹھایا - مگر بیشتر صیون اور ہیکل مقدس میں پناہ گزیں ہوے - طیطوس نے سرداران فوج سے مشورہ کیا کہ عبادت خانہ محفوظ رکھا جائے یا تباہ کردیا جائے بیشتر جنرلوں کی رائے تھی کہ وہ جلا دیا جائے مگر طیطوس نے طے کیا کہ دھاوا کرکے یہودیوں کو خارج کیا جائے اور ہیکل کی خوبصورت عمارت مسمار نہ کی جائے - محاصرہ کی طوالت سے سپاہی مشتعل تھے ایک دل جلے نے جلتی ہوئی مشعل عمارت پر پھینک دی - شعلے بھڑک اُٹھے - یہودیوں نے یہ منظر دیکھ کر چیخ ماری اور تلواریں کھینچکر دشمنوں کو مارنے اور ہیکل پر اپنی جانیں قربان کرنے لگے - طیطوس فوراً موقع پر پہونچا - شور مچایا اور آگ بجھانے کا حکم دیا مگر تلواروں کی جھنکار میں اُس کی آواز کون سنتا - سپاہی برابر بڑھتے رہے - ہر شخص اندرونی حصہ میں داخل ہونے کی کوشش کرتا اور بے پناہ یہودیوں کو قتل کرتا تھا -

آج قوم یہود پر غضب خداوندی نازل تھا - ہزاروں بیگناہ قربان گاہ کے گرد کٹے ہوے پڑے تھے - ہیکل کی سیڑھیوں سے خون کے پرنالے بہ رہے تھے اور لاشیں بہ بہ کر نیچے گرتی تھیں - قبل اسکے کہ ہیکل کے مقدس ترین مقام تک آگ کے شعلے پہونچیں طیطوس نے اُسکو بچانے کی کوشش کی مگر اُس کی آنکھوں کے سامنے مغلوب الغضب سپاہیوں نے الہام گاہ کے عالی شان

دروازے میں آگ لگادی اور ساری عمارت ایک ساعت میں جل کر خاک کا ڈھیر ہوگئی۔

اس طرح یروشلم کا خاتمہ ہوا اور جوزیفس کے تخمینہ کے مطابق گیارہ لاکھ یہودی مقدس شہر کی حفاظت میں قتل ہوئے۔

بعد ازاں انطاکیہ وغیرہ دوسرے مقامات پر تشدد شروع ہوا۔ یہودی جلائے جاتے تھے اور اُن پر وحشیانہ مظالم ہوتے تھے۔ طیطوس نے مزاحمت کی اور سپاہیوں سے جھڑک کر کہا کہ "یہود کا ملک تباہ ہو گیا۔ وہ اب یہاں واپس نہیں آسکتے۔ کیا تم چاہتے ہو کہ دنیا میں کسی جگہ اُن کو امن نہ ملے۔"

یہود کی تاریخ ختم ہو گئی۔ بنی اسرائیل کا من حیث القوم وجود باقی نہ رہا۔ کنعانی غلام یوروپ ۲
اور ایشیا کے بازاروں میں علی الاعلان فروخت ہوئے۔ ایک معمولی گھوڑے کے دام اور اُن بدنصیب غلاموں کی قیمت برابر تھی۔ یہودیوں کا ملک ریگستان ہو گیا۔ اور بھیڑیے اور درندے اُن شہروں میں رہنے لگے جہاں اسرائیلیوں نے عیاشی اور بدکرداری کی داد دی تھی۔

دیدی کہ خونِ ناحقِ پروانہ شمع را
چنداں اماں نداد کہ شب را سحر کند

مسلم کا دورِ جمود

(جناب مولوی حاجی محمود حسن خاں صاحب محمود اسرائیلی)

ہم نشیں کچھ انقلابِ ہستیِ فانی بھی دیکھ
دیکھ لی بزمِ طرب اب اسکی ویرانی بھی دیکھ!

بخت و تدبیر رسا کی سحرِ طولانی بھی دیکھ
غیر کی فرزانگی اور اپنی نادانی بھی دیکھ

جس کا سینہ تھا امینِ نکہتِ گلزارِ دہر
اس گلِ راحت چشیدہ کی پریشانی بھی دیکھ

عرش مسکن تھا کبھی جو لامکاں پرواز تھا
اُس سبک رفتار کی تو اب گراں جانی بھی دیکھ

گوشۂ داماں بنا تھا جن کا ستارِ عیوب
آج اُسکے جامۂ عصمت کی عریانی بھی دیکھ

جسکی ہستی تھی کبھی آئینہ دارِ رمزِ کُن
آج اس ننگِ جہاں کا نورِ ایمانی بھی دیکھ

جسکی رگ رگ میں کبھی برقِ عمل تھی موجزن
آج اُس سیماب پیکر کی تن آسانی بھی دیکھ

جو کبھی افلاک پر چمکا تھا بن کر مہرِ علم
تیرگیِ جہل کی اُس میں فراوانی بھی دیکھ

دیدۂ عبرت سے کر اقبالِ مسلم پر نگاہ
اور مری انجام بیں نظروں کی حیرانی بھی دیکھ

خود نوشت میرزا محمد خاں قزوینی

(جناب مرزا محمد عسکری صاحب بی اے)

چہار مقالۂ عروضی کو قدیم فارسی ادب میں جو منزلت حاصل ہے وہی درجہ عجب نہیں جو آیندہ زمانہ میں بیست مقالۂ قزوینی کو حاصل ہو۔ ہمارے مکرم جناب مرزا محمد عسکری صاحب نے چاہا تھا کہ یہ کتاب بھی لباس اُردو سے آراستہ ہو جائے اور اسی خیال کی بنا پر نہایت ذوق و شوق سے اُس کا ترجمہ شروع کر دیا تھا، اور ایک ثلث کے قریب کام ہو چکا تھا کہ "کاپی رائٹ" کے جھگڑے کی وجہ سے قلم رُک گیا۔

مصنف نے مقالۂ اول میں مختصراً خود اپنے حالات تحریر کیے ہیں، جو مرزا صاحب کی عنایت سے درج الناظر کیے جاتے ہیں۔ امید ہے کہ علم و ادب کے شائقین اس کے مطالعہ سے محظوظ ہوں گے۔ انشاء اللہ ترجمہ شدہ اوراق کے بعض دیگر اجزا بھی وقتاً فوقتاً نذر ناظرین ہونگے جن سے ان مقالات کی قدر و قیمت کا اندازہ اُن اصحاب کو بھی ہوگا جو اصل کتاب کے مطالعہ سے بہرہ مند نہیں ہو سکے۔

ایڈیٹر

تاریخ و جاے ولادت - ابتدائی تعلیم

بندہ کا نام محمد اور میرے والد کا نام عبد الوہاب بن عبد العلی قزوینی ہے۔ میرے والد "نامۂ دانشوراں" کے چار مولفوں میں سے ایک تھے۔ اور نحویوں اور اہل لغت اور ادبا و فقہا کے حالات جو اس کتاب میں درج ہیں غالباً انھیں کے سپرد تھے۔ اُن کا نام اُس کتاب کے مقدمہ میں موجود ہے اور نیز اُنکے کچھ مختصر حالات مرحوم اعتماد السلطنت محمد حسن خاں کی کتاب "المآثر و الآثار" میں بھی مذکور ہیں۔ میرے والد کا انتقال سنہ ۱۳۰۶ھ میں طہران میں ہوا۔ اور میری ولادت بھی طہران ہی میں محلۂ دروازۂ قزوین میں پندرھویں ماہ ربیع الاول سنہ ۱۲۹۴ھ کو ہوئی۔

اساتذہ کا ذکر

علوم متداولۂ اسلامی کی تحصیل اُسی طہران میں میں نے کی۔ صرف و نحو اپنے والد سے اور مرحوم آقائی حاجی سید مصطفے[1] (جو قناعت آبادی کے لقب سے مشہور تھے) سے

[1] تقریباً سنہ [illegible]ھ میں یا کسی قدر کم و بیش وفات پائی۔

مدرسہ معیر الممالک میں پڑھی اور فقہ انھیں بزرگوار اور مرحوم حاجی شیخ محمد صادق[1] طہرانی مدرس مدرسہ مذکورسے اور چند دن مرحوم حاجی شیخ فضل اللہ نوری[2] سے اور علم کلام اور حکمت قدیم آقائی حاجی شیخ علی نوری سے مدرسہ خان مروی میں اور اصول فقہ مرحوم ملا محمد آملی[3] سے مدرسہ خازن الملک میں اور اسکے بعد اصول فقہ خارجًا مرحوم آقا میرزا حسن اشتیانی[4] کی خدمت میں ان مرحوم کے آخری تین چار سال کی مدت میں حاصل کیے۔ ان بزرگ کا تبحر اور احاطۂ معلومات تمام جزئیات علم اصول میں واقعی حیرت انگیز تھا۔ مثل ان کے کم کوئی شخص اس واقفیت اور معلومات کا پیدا ہوا ہوگا ایک آدمی کسی ایک علم کے فروع و مسائل پر حاوی اور اتنا ذہین و طباع قیاس میں نہیں آسکتا۔

ادبیات عربی سے طبعی ذوق

میں نہیں کہہ سکتا کہ بچپن ہی سے ان تمام علوم متداولہ میں ادبیات عربی سے اس قدر شوق و ذوق مجھ کو کیوں تھا۔ بچپن اور شباب کا زیادہ تر زمانہ اسی فن کے مختلف شعبوں خصوصًا علم نحو میں صرف ہوا اور عمر گرانمایہ اسم و فعل و حرف کے شغل میں ختم ہوئی۔ اب بھی جب میں اُن گزشتہ ایام پر غور کرتا ہوں اور تلف کی ہوئی عمر پر تاسف کرتا ہوں تو میری بہترین تفریحات اب بھی شرح رضی اور "مغنی اللبیب" ہیں جو میرے واسطے وصل حبیب سے بھی زیادہ خوشگوار اور مزیدار رہیں اور گویا عادت طبیعت ثانیہ ہوگئی ہے۔

درس تدریس فیض حاصل کیا

اُن لوگوں کا ذکر جن سے بغیر درس و تدریس فیض حاصل کیا۔ اُن بزرگواروں میں کہ جنکی مبارک ذات سے بغیر درس و تدریس کتب رسمی کے میں نے اپنی استعداد کے بموجب کسب فیض کیا۔ مرحوم حاجی شیخ ہادی نجم آبادی ہیں[5]۔ قریب دو تین سال تک ہر روز غروب آفتاب کے بعد جب وہ ایک گھنٹے کز رجاتے تھے اپنے ایک دوست کے ساتھ ان بزرگوار کی مجلس میں جبکہ یہ اپنے مکان کی بیرونی منزل حسن آباد میں ریگ و زمین پر بے فرش تشریف فرما ہوتے تھے میں حاضر ہوا کرتا تھا اور اس مقدس ہستی اور اُنکے اصحاب اور شاگردوں کی صحبت سے مستفید ہوتا تھا......

---

[1] ناصر الدین شاہ کے آخری عہد یا مظفر الدین شاہ کے شروع عہد میں طہران میں وفات پائی۔

[2] ۱۳۔ رجب ۱۳۲۶ھ میں طہران میں پھانسی پائی۔

[3] تشکیل سلطنت موجودہ یعنی ۱۳۲۲ھ تک زندہ تھے۔ اسکے بعد مجھکو نہیں معلوم کہ کس تاریخ وفات پائی۔

[4] مظفر الدین شاہ کے شروع عہد میں یعنی تقریبًا ۱۳۱۶ھ میں طہران میں وفات پائی۔ انکے جنازہ پر تقریبًا تمام اہل شہر شریک تھے۔ تمام دکانیں اور بازار بند کردیے گئے تھے۔ اور وہ ایسا دن تھا کہ جو کبھی بھول نہیں سکتا۔

[5] مظفر الدین شاہ کے شروع عہد میں یعنی ۱۳۱۳ھ کے بعد طہران میں انتقال کیا۔

اُنکی زندگی کی سادگی، اُنکے خیالات کی صحیح معنوں میں آزادی، جو خدمت کہ ملک کی بیداری اور موہومات کے پردوں کو چاک کرنے میں اور اُس عہد کے لوگوں کی آنکھوں اور کانوں کے کھولنے میں اُنھوں نے انجام دی۔ اُن کی مجلس کی عجیب و غریب وضع اور مختلف مذاہب و ملل مسلمان و یہود و بابی وغیرہ کی اُس میں شرکت اور مختلف مسائل مذہبی پر اُنکے مباحث کمال آزادی کے ساتھ جس میں کبھی کبھی طنز و استہزا بھی اُن بزرگوار اور اُن کے اصحاب و تلامذہ کی شان میں شامل ہوتا تھا۔ اور جو احترام و بزرگی کہ اُنکے اصحاب اُنکے ساتھ کرتے تھے۔ یہاں تک کہ کوئی حرکت بلکہ مسکراہٹ بھی اُن کے سامنے نہیں آسکتی تھی۔ غرضکہ یہ سب امور اُس زمانہ کے عجائب و واقعات سے ہیں جو کبھی نہیں بھول سکتے اور جن کو مفصل بیان کرنے کے لیے ایک کتاب چاہیے۔ بہرحال اسکو ایک جملۂ معترضہ سمجھ کے میں آگے بڑھتا ہوں۔

دوسرے اُستاد معظم کہ جن کے افادات کثیرہ سے میں مستفید ہوا، بقیۃ الفضلا خاتمۃ الادبا آقائی سید احمد ادیب پشاوری مدظلہ العالی ہیں۔ ان بزرگوار کی عادت تھی کہ گرمی کے موسم میں سب عادت کسی ٹھنڈی جگہ پر امام زادہ صالح تجریش کے صحن میں تشریف فرما ہوے اور دو ایک گھنٹے اُسی جگہ ایک کونے میں نشست کرتے تھے۔ میں باوجود یکہ اُنکی تنک مزاجی سے ڈرتا تھا مگر حیلے بہانے ڈھونڈھ کر اُنکی خدمت میں ضرور حاضر ہوتا اور ڈر ڈر کے کوئی سوال اُن سے ضرور پوچھتا جسکا جواب شافی وہ دیتے اور میں اُس کو فوراً اپنے دماغ کے خزانہ یا کسی نوٹ بک میں محفوظ کرلیتا۔ ان کا تبحر ادبیات فارسی و عربی میں اور ان کا عجیب و غریب حافظہ کہ ہزارہا اشعار علی الخصوص عربی اشعار ان کو ازبر تھے۔ فی الواقع آجکل کی اصطلاح میں محیر العقول تھا۔ مثلاً ہر وقت اور ہر مجلس میں جب کوئی شعر عربی پڑھا جاتا اور اہل مجلس کو یہ نہ معلوم ہوتا کہ وہ شعر کس کا ہے یا کس زمانہ میں کہا گیا ہے تو وہ اُس کو سن کر تمام اشعار اُس قصیدہ کے جسکا وہ شعر ہوتا مع نام شاعر اور حالات شاعر اور معنی شعر وغیرہ وغیرہ کے بے تامل نہایت تفصیل کے ساتھ بیان فرما دیتے۔ میں جب اُنکو دیکھتا تھا تو مجھ کو وہ حکایت یاد آجاتی جو عربی کی ادبی کتابوں میں حماد راویہ کے متعلق مشہور ہے کہ جس کو فقط شعرائے جاہلیت کے حروف تہجی کے اعتبار سے ہر ہر حرف کے سو سو بڑے بڑے قصیدے علاوہ مقطوعوں کے حفظ تھے اور شعرائے اسلام کا کلام مزید براں۔ چنانچہ خلیفہ ولید نے جب یہ حال سنا تو اُسکو یقین نہ آیا اور اپنے ایک آدمی کو مقرر کیا کہ وہ جائے اور اُن کا امتحان لے۔ اُس نے دو ہزار نو سو قصیدے تفصیل مذکور سے اُن سے نقل کیے[1]۔ غرضکہ اُن کی قوت حافظہ، کثرت معلومات،

---

[1] دیکھو ابن خلکان حرف حاء ذکر حماد۔

حفظ اشعار و لغت اور نیز اُن کا فلسفیانہ مزاج، زہد و تقویٰ اور گوشہ نشینی اور اُنکے جمیع حالات اطوار کو دیکھ کر میں ہمیشہ اُنکا مقابلہ ابو العلاء معری سے کیا کرتا تھا اور اُس میں بھی یہ فرق تھا کہ ابو العلا صرف ادبیات عربی میں نادرۂ دہر تھا اور یہ بزرگ دو زبانوں یعنی عربی و فارسی میں نابغہ عصر۔ اُنکے اشعار کا دیوان اب سے دو تین سال قبل پیرس میں میں نے شاہزادہ نصرۃ الدولہ فیروز میرزا کے پاس دیکھا تھا - ہزار افسوس ہے کہ اب تک وہ چھپا نہیں ہے -

اُن بزرگوں میں کہ جنکا حق تربیت میرے اوپر ہے مرحوم شمس العلماء شیخ محمد مہدی[۱] قزوینی عبدالرب آبادی ہیں - جو اپنے زمانہ کے مشہور ادیب اور میرے والد کے دوست اور "نامۂ دانشوراں" کے چار مؤلفوں میں سے ایک تھے - والد کے انتقال کے بعد ان بزرگ نے ہم یتیم چھوٹے بچوں کو اپنے سایۂ عاطفت میں لیا - اور والد کی تنخواہ میں سے ایک تھوڑا سا حصہ ہم لوگوں کے واسطے مقرر کرا دیا - جسکی مدد سے میری نیک ماں نے کہ اللہ اُن کی روح کو منور کرے ہم کو پالا اور پروان چڑھایا -

دوسرے وہ بزرگ کہ جنکے احسانات عظیم دربارۂ تعلیم و تربیت میری گردن پر ہیں مرحوم میرزا محمد حسین خان اصفہانی متخلص بہ فروغی ملقب بہ ذکاء الملک ہیں جو موجودہ ذکاء الملک آقائی میرزا محمد علی خان مدظلہ العالی کے پدر بزرگوار تھے - تقریباً دس بارہ سال تک اپنے عہد شباب میں برابر اور اکثر ان بزرگوار کی صحبت میں جو اُس زمانہ کے شعرا و ادبا اور اہل ذوق کا مجمع تھی حاضر ہوتا اور اُن کی صحبت سے برابر مستفید ہوتا - یہ اُنھیں کی مشفقانہ توجہات اور پدرانہ تربیت کا نتیجہ ہے کہ میں نے کسب اخلاق حمیدہ کیا - اس دس بارہ سال کے عرصہ میں برابر اُنکے دونوں صاحبزادوں یعنی آقائی میرزا محمد علی خان ذکاء الملک اور آقائی میرزا ابو الحسن خان فروغی کے فیض صحبت سے بھی مستمراً فیضیاب ہوتا رہا - شروع میں میں موجودہ ذکاء الملک کی خدمت میں فرنچ پڑھتا تھا اور وہ مجھ سے درس عربی حاصل کرتے لیکن تھوڑے ہی عرصہ میں بوجہ موافقت مزاج و اخلاق و خیالات کے تعلیم و تعلم سے آگے بڑھ کے ایک مضبوط باطنی دوستی کا سلسلہ قائم ہوگیا جو آجکل کے ابنائے زمانہ کی دوستی کے موافق نہیں اور اس کا مدار حصول نفع اور دفع نقصان پر نہیں بلکہ اُس کی جڑ یگانگی مشرب اور اتحاد مذاق پر قائم و برقرار اور تدریجاً مضبوط ہوتی گئی اور میں امیدوار ہوں کہ یہ دوستی کہ جو اخوان الصفا کی دوستی سے کم نہیں ہے جب تک میری اور اُن کی حیات باقی ہے انشاء اللہ محکم و مضبوط رہیگی

دوسرے اکابر علما میں سے کہ جو میرے ساتھ خاص لطف رکھتے تھے مرحوم آیۃ اللہ شیخ فضل اللہ نوری

---

۱ جنگ عمومی کے زمانہ میں طہران میں وفات پائی - ٹھیک سنہ وفات اسوقت یاد نہیں ہے ۱۳۳۵ھ میں طہران میں وفات پائی

تھے کہ جنھوں نے اپنے دو صاحبزادوں یعنے آقائی ضیاء الدین اور آقائی حاجی میرزا ہادی کی نحو کی تعلیم میرے متعلق کی تھی اور میں نے ان دونوں آقازادوں کو سلسل دو تین سال تک پڑھایا اور اپنی ناقص معلومات کے مطابق اُن کو اُس فن سے آگاہ کرایا۔ جب میں پیرس میں پہلی مرتبہ مقیم تھا تو اُن مرحوم کے خط جو اُن کے خاص قلم کے تھے میرے پاس کبھی کبھی آتے رہتے تھے۔ جن کو ابتک بطور اُنکی یادگار رکھنے میں نے رکھ چھوڑا ہے۔ انکے حرکات و اعمال کا بُرا نتیجہ کہ جو ان مرحوم کی آخری عمر میں اُن سے سرزد ہوئے تھے جسکی وجہ سے اُنکی زندگی کا دفعتاً خاتمہ ہو گیا اس سے اُن مرحوم کے مقامات علمیہ سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اُنھوں نے اپنے اعمال کا نتیجہ اس دنیا میں بھگتا۔ اصل واقعہ کا علم خدا کو ہے اور اب وہ پیوند خاک ہیں اور دنیا سے انکا کوئی تعلق نہیں ہے اور یہ قدیم مقولہ ہے کہ "اُذکروا موتاکم بالخیر" (اپنے مرے ہوؤں کو نیکی سے یاد کرو) راقم الحروف کو اس مقام پر اُنکے ذکر سے اُنکے افعال کی مدح و قدح مراد نہیں۔ صرف یہ غرض ہے کہ اس جگہ اُنکی عنایتوں کا شکریہ اور قدیم حقوق محبت کا ذکر کیا جائے اور بس۔ زمانۂ گزشتہ کے واقعات یاد کرکے بقول بیہقی کے میں نے قلم کو تھوڑا سا اُنکے رونے پر لگایا۔

لندن کا سفر

شروع ١٣٢٢ھ میں میرے بھائی میرزا احمد خاں نے جو بالفعل مفتش ادارۂ مالیات غیر مستقیم (Auditor of Indirect Revenues) ہیں اور جو اُسوقت لندن میں تھے چونکہ قدیم کتب کے ساتھ میرے شوق بلکہ میرے عشق سے واقف تھے، مجھکو لکھا کہ "نامناسب نہیں ہے کہ جب تک میں یہاں ہوں تم بھی لندن میں آجاؤ اور یہاں کے بڑے کتابخانہ (British museum) کی سیر کرو اُس کے بعد ہم دونوں مل کے وطن واپس چلیں گے" میں نے بھی اس مشہور مثل کے موافق کہ "اندھا کیا چاہے دو آنکھیں" بلا تامل اس دور و دراز سفر کا ارادہ کر لیا۔ اور اپنی مادر مشفقہ سے ہمیشہ کے واسطے رخصت ہو گیا کہ جو اُس وقت میرے پہونچانے کے واسطے دروازۂ قزوین کے باہر آنکھوں میں آنسو ڈبڈبائے ہوئے کھڑی تھیں اور جس وقت ڈاک کی گاڑی چلنے لگی تو اُنھوں نے مجھ سے فرمایا کہ "بیٹا مجھکو یقین ہے اب میں تیرا چہرہ نہ دیکھ سکونگی" الغرض پانچویں ربیع الثانی ١٣٢٢ھ کو طہران سے رخصت ہو کر براہ روس و جرمنی و ہالینڈ (Holland) میں لندن پہونچا اور وہاں اُس کتابخانہ عظیم اور اُس کی عربی و فارسی نادر الوجود کتابوں کو دیکھ کر اُنکے مطالعہ کا اتنا شوق مجھ پر غالب ہوا کہ

سلہ ١٣ ار رجب ١٣٢٧ھ کو طہران میں پھانسی پائی۔

بے اختیار اپنے خاندان اور وطن کو یہ میں نہیں کہہ سکتا کہ بالکل بھول گیا مگر البتہ تھوڑے وقت کے واسطے (کہ یہ تھوڑا وقت بھی اب بیس سال سے گزر گیا ہے) اُن کا خیال میں نے اپنے دل سے نکال دیا۔

قیام لندن | قریب دو سال تک میں لندن میں رہا اور وہاں انگریز مستشرقین کی ایک جماعت سے ملاقات ہو گئی از انجملہ پروفیسر ایوان (A. A. Bevan) ہیں کہ جو ادبیاتِ عرب علی الخصوص جاہلین اور مخضرمین کے اشعار کے متخصص[1] ہیں اور اس شعبہ میں کمتر کوئی شخص اُنکی قابلیت کا ہوگا۔ اپنے فن میں بہت بڑے متبحر اور اپنے کام میں انتہا درجہ دقت اور احتیاط سے کام لیتے ہیں جو بعض وقت وہم و وسواس کی حد تک پہونچ جاتی ہے چنانچہ نقائض جریر و فرزدق کو تین بڑی جلدوں میں بیس سال کی محنت میں سنہ ۱۹۰۵ء لغایت سنہ ۱۹۱۲ء میں بمقام لیڈن Holland طبع کرایا اور بے تکلف یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کتاب کی طباعت کو اتنی صحت و دقت کے ساتھ اس آخری صدی میں یورپ کا ایک بڑا ادبی شاہکار سمجھنا چاہیے۔

دوسرے مسٹر ایلیس (A. G. Ellis) ہیں جو "برٹش میوزیم" کے کتابدار سابق اور اوقاف گیب (Gibb Memorial) کے ایک ٹرسٹی ہیں۔ کتب قدیمہ کے پہچاننے اور کتب عربی و فارسی و ترکی کے نام اور انکے مصنفین کے عادات اور تعداد تصانیف کی واقفیت میں یدطولے رکھتے ہیں۔ انکی تیار کردہ "برٹش میوزیم" کی فہرست کتب مطبوعہ عربی کی دو بڑی جلدوں میں ایک نہایت بیش قیمت تالیف ہے۔

دوسرے اسفت علیہ[2] مسٹر آمدروز[3] (H. F. Amedroz) اوقاف گیب کے ایک رکن۔ ہلال صابی کی "تاریخ الوزراء" اور ذیل تاریخ دمشق ابن القلانسی کی طباعت انکی یادگار ہیں۔

دوسرے مشہور مستشرق پروفیسر ادوارد براؤن (Edward G. Browne) کہ انکی شہرت میری ہر طرح کی وصف و تعریف سے مستغنی ہے یہ بھی اوقاف گیب کے ایک مشہور رکن اور انھیں کے توسط سے بعض کتابوں کی تصحیح و طبع کا کام اعضائے مذکور کی طرف سے اس حقیر کو سپرد

---

[1] متخصص کی جگہ بالعموم اردو میں "ماہر خصوصی" کہتے ہیں۔ میں نے "متخصص" کو اس لیے بحیثیت اصطلاح رہنے دیا کہ اس میں ایک ہی لفظ ہے۔ مترجم

[2] یہ لفظ اُس موقع پر استعمال کیا گیا ہے جہاں آجکل ہماری زبان میں "آنجہانی" بولتے ہیں۔ میں "اسفت علیہ" کو "آنجہانی" پر ترجیح دیتا ہوں کیونکہ مؤخر الذکر لفظ میں اظہار تاسف و ملال کا پہلو نہیں ہے۔ جو ہونا چاہیے۔ [redacted] مترجم

[3] سنہ ۱۹۱۷ء میں وفات پائی۔

ہوا تھا - (۲۰ رجمادی الآخر ۱۳۴۴ھ مطابق ۵ رجنوری ۱۹۲۶ء کیمبرج میں وفات پائی) ۱۳۲۴ھ
کے شروع میں اوقاف گیب کے ٹرسٹیوں نے "تاریخ جہاں کشائے جوینی" کی تصحیح و طباعت مجھکو
سپرد کرنا چاہی اور میں نے بھی باوجود اپنی بے بضاعتی اور عظیم الشان محنت و وقت کے اس
کام کو متوکلاً علی اللہ قبول کرلیا اور اس مقصد کی انجام دہی کے واسطے ۱۱ ربیع الثانی ۱۳۲۴ھ
میں لندن سے پیرس کو روانہ ہوا کیونکہ وہاں متعدد نسخے اس کتاب کے موجود ہیں اور آخر ۱۳۳۲ء
تک پیرس ہی میں رہا -

پیرس میں فرانساوی مستشرقین سے ملاقات

پیرس میں جن مستشرقین سے ملاقات ہوئی اور ان سے میں نے استفادہ کیا حسب ذیل ہیں :-

(۱) اُسوت علیہ ہرتویک درنبورگ[۱] (Hartwig Derenbourg) مشہور عربی داں اور طابع کتاب سیبویہ "صاحب تالیفات مشہورہ - میں انکے لکچروں میں جو یمن کے قدیم خط حمیری (جسکو خط مسند بھی کہتے ہیں) اور اُسی خط کے قدیم کتبوں اور پتھروں کے متعلق عجائب خانہ لوور (Louvre) میں ہوتے تھے اکثر شریک ہوا ہوں اور غالباً وہ لکچر ہی لوور ہی میں ہوتے تھے -

(۲) اُسوت علیہ باربیہ دومنار[۲] (Barbier de Meynard) جنھوں نے مسعودی کی "مروج الذہب" کا ترجمہ مع اصل نو جلدوں میں چھاپا ہے اور اسکے علاوہ اور بھی کتابیں طبع کرائی ہیں -

(۳) میسو میہ (A. Meillet) مشہور لغوی و نحوی - انھوں نے ہندوستان اور یورپ کی مختلف زبانوں کے صرف و نحو کا موازنہ کیا ہے - چندوں انکے لکچروں میں جو سوربون (Sorbonne) میں ہوتے تھے حاضر ہوا ہوں -

(۴) مسیو ہوارت (Clément Huart) جنھوں نے عربی و فارسی و ترکی کی اکثر تصانیف کا ترجمہ یا تصحیح کی مگر کسی خاص فن میں متخصص نہیں ہیں -

پیرس ہی کے قیام میں آقائی میرزا علی اکبر خاں دہخدا سے شرف ملازمت حاصل ہوا -

---

[۱] ۱۹۰۸ء میں پیرس میں وفات پائی -
[۲] ۱۹۰۸ء میں پیرس میں وفات پائی -
[۳] دسمبر ۱۹۲۶ء میں پیرس میں وفات پائی

یہ ایک مشہور عالم و مصنف شروع استبداد صغیر[1] میں ایک جماعت اہل ایران کے ساتھ اپنا وطنِ مالوف چھوڑ کر پیرس آ گئے تھے۔ انکی خدمت میں میں اکثر حاضر ہوتا اور انکی صحبت سے بہت محظوظ ہوتا۔ سچ پوچھیے تو جو لطف میں نے اپنی عمر بھر اس دنیا میں اُٹھایا وہ وہی زمانہ تھا اور میں آرزو کرتا ہوں کہ ایک مرتبہ مرنے سے پہلے یہ سعادت پھر نصیب ہو۔

انکے علاوہ جناب آقائی حاجی سید نصر اللہ اخوی دامت برکاتہ سے جو زمانۂ موجودہ کے مشہور عالموں، شاعروں اور ادیبوں سے ہیں مجھکو غائبانہ ملاقات نصیب ہوئی یعنی جس زمانہ میں میں "مرزبان نامہ" کی تصحیح و طباعت میں مشغول تھا ان بزرگ نے کمال اطمینان و فیاضی کے ساتھ کہ جو صرف اُنھیں سے متوقع ہو سکتی تھی اپنا صحیح کیا ہوا نسخۂ اصل کتاب کا بلکہ بغیر کسی سابقۂ ملاقات اور اعتماد کے مجھکو عنایت کیا اور اُسی وقت سے اب تک سلسلۂ خط و کتابت اُن بزرگ کے ساتھ جاری ہے جو میری سرفرازی کا باعث ہے۔

آخر ۱۳۳۲ھ میں جب جنگ عمومی چھڑ گئی اور دنیا کے تمام کاروبار معطل ہو گئے (وجہ یہاں لکھنا بے موقع ہے) جس کی وجہ سے میرا خاص کام پیرس میں رہ کر انجام پانا ناممکن ہو گیا تو آقائی حسین قلی خاں نوّاب نے جو میرے قدیم عنایت فرما اور اُس وقت پیرس میں تھے اور اتفاق سے برلن کی سفارت پر مقرر ہو کر جانے والے تھے مجھ سے فرمایا کہ اب تم پیرس میں رہ کر کیا کرو گے آؤ ہمارے ساتھ برلن چلو اور دو تین مہینے وہاں رہو۔ وہاں کی بھی سیر کرو اور دو تین مہینے کے بعد جب جنگ ختم ہو جائے گی اور کاروبار اپنی اصلی حالت پر آ جائے گا پیرس پھر واپس آنا۔

اس تجویز کو کمال شوق سے قبول کر کے ۱۴ ذی الحجہ ۱۳۳۲ھ مطابق ۲۳ اکتوبر سنہ ۱۹۱۴ء پیرس سے روانہ ہوا اور سوئیس (Switzerland) کی راہ سے اُنھیں کی ہمراہی میں چار دن کے بعد برلن پہونچا۔ راستہ میں باوجود سخت دقتوں کے جو جنگ کی وجہ سے تمام مسافروں کو سفر میں ہوتی تھیں خاص کر جب سفر ایک محارب ملک سے دوسرے میں ہوتا۔ مگر چونکہ میں ایک وزیر مختار کی ہمراہی میں اور گویا اُنھیں کے اسٹاف میں تھا الحمد للہ کہ ان دقتوں اور تکالیف کا سامنا ہم لوگوں کو نہیں ہوا البتہ ہمارے داخلۂ برلن کے تھوڑے ہی دنوں بعد تمام آمد و رفت لوگوں کی جرمنی سے قطعاً بند ہو گئی اور دو تین مہینے دو تین سال ہو گئے اور پھر بھی جنگ کا خاتمہ

[1] "استبداد صغیر" سے غالباً وہ زمانہ مراد ہے جو مظفر الدین شاہ کے آخر عہد میں آزادی پسندوں کے ساتھ سخت جبر و ظلم کا تھا بمقابلہ "استبداد کبیر" کے کہ جو محمد علی شاہ کے زمانہ میں ہوا۔ (مترجم)

نظر نہیں آتا تھا۔ الغرض ساڑھے چار برس یعنی اختتام جنگ تک میں برلن ہی میں رہا اور جو صدمے اور مصیبتیں کہ اس مدت میں "قحط عام" کے تمام اہل ملک نے اُٹھائیں اُن کا ذکر اس مختصر مقالہ میں قطعاً محال ہے۔ اُس کے لیے ایک کتاب "روضۃ الصفا" کے حجم کے برابر چاہیے اور میں اس کام کو اُن لوگوں کے حوالے کرتا ہوں جو آیندہ جنگ عظیم کی تاریخ لکھیں۔

قحط عام کا لفظ جو میں نے اوپر کے فقرے میں استعمال کیا اُس سے میرا مطلب یہ ہے کہ قحط میں معمولاً تنگی رزق صرف دو ایک چیزوں کی ہو سکتی ہے مثلاً روٹی یا گوشت یا اسکے سوا کوئی چیز۔ مگر اس جنگ عظیم کے اثناء میں چونکہ جرمنی کا محاصرہ بری، بحری دونوں تحفظ نے پوری طرح کر رکھا تھا اس طرح کہ جنگی جہازوں اور پندرہ ملین فوج کے ذریعہ سے گویا اُس کے گرد اگرد ایک لوہے کی دیوار قائم کر دی گئی تھی کہ جس کا ٹوٹنا یا پھٹنا غیر ممکن تھا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ تمام چیزیں مطلقاً اور کلی طور پر روٹی، آٹے، گوشت وغیرہ کی قسم سے یہاں تک کہ آلو، چاول، تمام اقسام غلہ، دودھ، پنیر، روغن اور تمام چیزیں کہ جو ان سے بنتی ہیں اور قند و شکر، مربے، شہد، صابون، جوتے، تولیے، کمبل، اونی کپڑے تمام ماکولات اور کل استعمال و ضرورت کی چیزیں بالکل نایاب اور عنقا ہو گئی تھیں وجہ یہ تھی کہ ضروری اشیاء کو سلطنت نے اپنے تصرف میں لے لیا تھا اور ملک کے رہنے والوں پر فی کس ایک معین حصہ اور ایک معین مدت کے واسطے تقسیم کیا جاتا تھا۔ مگر اسکی مقدار سنیے! مثلاً ہفتہ بھر کے لیے فی کس ۲۶ سیر[ل] روٹی - ۳ سیر گوشت - ۵ مثقال یعنی ۲۵ گرام روغن اور مہینہ بھر کے واسطے ½ ۴ سیر شکر، ایک انڈا اور تمام اشیا اسی پر قیاس کرنا چاہیے۔ اور یہ بھی بتائے دیتا ہوں کہ ہم ایرانی نسبت اہل ملک کے بہت خوش نصیب تھے اس واسطے کہ آقائی تقی زادہ کی کوشش بلیغ سے چونکہ ہم لوگ جنگ سے بے طرف (نیوٹرل) اور دولت جرمنی کے مہمان تھے ہم کو فی کس اشیائے مذکورہ کا دونا حصہ دیا جاتا تھا۔ یعنی ہفتہ میں بجائے ۵ مثقال روغن کے ۱۰ مثقال اور بجائے مہینہ میں ایک انڈے کے دو انڈے بلا کسر مرحمت ہوتے تھے۔

مختصر یہ کہ اس چار پانچ سال کی مدت اپنے قدیم دوست اور عنایت فرما محترم آقائی سید حسن تقی زادہ کی مصاحبت میں بسر ہوئی اور اُن فاضل علامہ کی علمی و ادبی صحبتوں سے میں برابر مستفید ہوتا رہا۔ ان بزرگوار نے اُس زمانہ میں سلطنت جرمنی کی اعانت سے ایک انجمن موسوم بہ "کمیتۂ ایرانی"

[ل] سیر سے ایرانی سیر مراد ہے جو تقریباً ڈیڑھ چھٹانک کا ہوتا ہے۔ ۲۶ سیر تقریباً ½ ۲ سیر ہندوستانی کے برابر ہوئے۔ دوسرے اوزان بھی اسی پر قیاس کر لینا چاہئیں۔ (مترجم)

(Iranian Committee) قائم کی تھی جس میں تمام معزز اہل ایران جو اس اثناء میں بسبب راہ آمد و رفت بند ہو جانے اور روابط اتحاد و دوستی منقطع ہو جانے کے مثل بیچارے مسافروں کے ادھر ادھر سرگرداں تھے - ہر چند کہ وہ اپنے وطن میں خوش حال اور متمول تھے - آقائی تقی زادہ نے اس کمیٹی کے ذریعے ان سب کو ایک جگہ اکٹھا کر لیا تھا جس کی وجہ سے ایک جماعت کثیر ہمارے ہموطنوں کی اس عالمگیر طوفان کے صدموں سے بے خطر اور اس گرم ہوا کے تیز جھونکوں سے کہ جو خشک و تر ہر چیز کو جلائے ڈالتی تھی ہماری جانیں محفوظ رہیں -

بلکہ سچ پوچھیے تو اس چار یا پانچ سال کے عرصہ میں فضلائے ایران کی ایک منتخب اور عمدہ جماعت ۲ برلن میں قائم ہو گئی تھی اور مختلف اشخاص جو ایسے مشاغل و کاروبار کے ذریعہ سے مختلف شہروں میں پھیلے ہوئے تھے - آقائی تقی زادہ کی کوششوں سے ایک نقطہ پر جمع ہو گئے تھے اور جس طرح بھیڑیوں کا گلہ طوفان کے وقت سر جوڑ کے اکیجا جمع ہو جاتا ہے اسی طرح ہم مصیبت زدہ بھی کمال اتحاد کے ساتھ بسر کرتے تھے اور میلین انسانوں کی قربانی جو ہمارے چاروں طرف مختلف میدان جنگ میں ہو رہی تھی - ہم کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ ہم کسی سینما میں چند متحرک صورتیں دیکھ رہے ہیں یا کبھی زخمی ہاتھ پاؤں کٹے ہوئے سپاہیوں کا منظر کسی راستہ گلی میں ہمارے پیش نظر ہو جاتا - یا بڈھوں اور عورتوں کی لمبی لمبی قطاریں نانبائی و قصاب و بقال کی دوکانوں کے سامنے جبکہ برف پڑتی ہوتی یا مینہ برستا ہوتا اور یہ بیچارے چپکے اپنے مقررہ حصوں کے انتظار میں کھڑے ہوتے - بس اس کے علاوہ جنگ کے خارجی آثار ہمارے دیکھنے میں نہیں آتے تھے اور نہایت آرام و اطمینان ظاہری کے ساتھ ہمارا یہ زمانہ گزرتا تھا - (باقی)

انسان

(جناب میاں عبدالعزیز صاحب فطرت)

دستِ قدرت کی گو ہے صنعت انسان
بزم فطرت کی بھی ہے زینت انساں
سب کچھ ہے مگر ہے ایک مشتِ گل بھی
بھولے نہ کبھی بھی یہ حقیقت انساں

بدنام ترک کس طرح واپس آیا

(جناب مولوی محمد خلیل الرحمٰن صاحب مترجم اخبار الاندلس)

"بدنام ترک" کی یہ دوسری قسط حاضر ہے اور امید ہے کہ دلچسپی سے پڑھی جائے گی۔ بزرگ محترم مولوی محمد خلیل الرحمٰن صاحب دلی شکریہ کے مستحق ہیں کہ اس پیرانہ سالی کے باوجود ترکوں کے متعلق بہترین کتاب کے نہایت پرمعلومات اور منصفانہ مضامین کا ترجمہ کرنے کی زحمت گوارا فرمائی اور الناظر کو اس بات کی عزت حاصل ہوئی کہ یہ قیمتی تحریر شایع کرکے اردو داں طبقے کے روبرو پیش کرے۔

ترک اور ترکوں کے متعلق اردو میں بہت سا سالہ موجود ہے اور محاربۂ عظیم کے سلسلے میں بھی بہت سی کتابیں، رسائل اور مضامین نکل چکے ہیں مگر یہ مضامین نہایت قیمتی ہیں اس لیے کہ ایک ایسے غیر مذہب اور غیر ملک کے منصف مزاج اہل قلم کے لکھے ہوئے ہیں جسکے معلومات کا ذخیرہ بہت وسیع ہے۔

ہماری دلی تمنا ہے کہ مولوی صاحب ممدوح اس کتاب کے بقیہ ابواب کا بھی ترجمہ کر ڈالیں اور اس کا انتظار نہ فرمائیں کہ دوسرا کوئی اہل قلم اس زحمت کو برداشت کرے۔ اہل قلم کی ملک میں کمی نہیں مگر خاص خاص لوگوں کے سوا عام طور پر ترجمہ کرنے میں لوگ بہت بیباک ہیں اور اہل منصف کی دھن میں مصنفین کی محنت و جاں فشانی کی پروا نہیں کرتے اور اس بے احتیاطی سے ترجمہ کرتے ہیں کہ اصل کتاب کے مطالب اور مصنف کے منشا سے بہت دور جا پڑتے ہیں۔

ایڈیٹر

جب وقت، ہیسے کے ویدے کھولے گا، تو معلوم ہوگا کہ دنیا کے التوائے جنگ کے وقت سے لے کر لوزان کے معاہدے پر دستخط ہونے کے وقت تک، جو پانچ برس گزرے ہیں، اس تھوڑے سے زمانے میں اتحادیوں کی جو پالیسی ترکوں کے متعلق رہی ہے وہ نہایت ناقابل معافی تھی اور تنگ نظری پر مبنی تھی؛ اور جو کارروائیاں اس عرصے میں ہوئی ہیں وہ ناقابل فہم تھیں۔ دنیا کی بڑی بڑی اقوام اس قسم کے جرائم کی شاید اتنی مجرم کبھی نہ ہوئی ہوں گی، جیسی کہ اس وقت۔ جب اکتوبر ۱۹۱۸ء میں ترکوں نے یکایک اپنی لڑائی کو ختم کیا ہے، تو باسفورس کے کناروں پر ٹوٹے پھوٹے، خراب خستہ، کیڑوں کے کھائے ہوئے عثمانی ترکوں کے جہازوں کے ڈھیر ہی نظر آتے تھے۔ شکست خوردہ،

پریشان، اپنی حفاظت کے ناقابل، مردہ دل، ٹرکی کا ملک پوری طرح اتحادیوں کے رحم پر تھا۔ ترک جنگ سے تھکے ہوئے تھے، اور وہ اپنے پرانے رہنماؤں سے بیزار تھے، کیوں کہ اُنھوں نے قوم بھر کو آفت و مصیبت میں پھنسا دیا تھا۔ معلوم ایسا ہوتا تھا کہ تمام ملک بس ایک لفظ "قسمت" کہکر صبر کر بیٹھنے والا ہے اور اُن کی تقدیر کی لکھی جو تدبیر و ترکیب، خواہ وہ تقسیم ملک کی ہو یا کسی کے پناہ میں آجانے کی، اتحادی اُن کو تبلائیں گے اُس پر وہ قناعت کرلیں گے۔ اگر صلح کی کوئی فوری کارروائی انصاف سے اور واجبی طور پر کی جاتی تو وہیں کا وہیں فیصلہ ہوجاتا؛ لیکن خود مطلبی، ایک دوسرے کی نااعتباری اور جلاپے، خفیہ سیاسی ریشہ دوانی، شہنشاہی طمع و آز و بلند نظری، ناانصافی، نفرت اور لالچ نے طول دیا اور فیصلہ نہ ہونے دیا۔ اس میں لازماً دیر لگی اور اس دیر نے ترکوں کو کچھ سانس لینے کی مہلت دی، جس کی اُنھیں سخت ضرورت تھی۔ اُنھیں اتنا موقعہ ملا کہ اُنھوں نے آنکھیں کھول کر یہ دیکھ لیا کہ اُن کے لیے کیا کیا تیار رکھا ہے۔ اس مہلت نے اُنھیں اس قابل بنا دیا کہ اُنھوں نے بالکل نئے اور مضبوط مسالہ سے ایسا جہاز بنا لیا جس پر وہ طوفان خیز سمندر میں سفر کرکے پار اُتر جائیں۔ چنانچہ جب جولائی ۱۹۲۳ء میں لوزان کے معاہدے پر دستخط ہوئے ہیں تو تمام مشرق قریبہ اتحادیوں کی سیاسی تدابیر، اتحادیوں کی بلند نظری اور اتحادیوں کی عزت و آبرو کے کوڑے کرکٹ کے ڈھیر سے چھپا ہوا نظر آتا تھا۔ قسمتوں کے پلٹے کھانے کی ایسی مثالیں تاریخوں میں بہت ہی کم نظر آویں گی!

جن وجوہ سے کہ ترکوں کو آخرکار اتنی کامیابی نصیب ہوئی، اُن کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ان پانچ سالوں کے واقعات و حالات مختصر طور پر بیان کر دیے جائیں۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ اگر تمام نشانات و قیاسات نہ مٹ جاتے تو یہ اندازہ تھا کہ اس زمانے سے ایشیا کی تاریخ اور مشرق اور مغرب کے دَور کا ایک نیا باب شروع ہونے والا ہے۔

جس باہمی نااعتباری اور رشک و حسد نے سب سے بڑا کام یہ کیا کہ اتحادیوں کے اتحاد کو توڑ پھوڑ ڈالا، اُس نے صلح کے فیصلے میں اتنی دیر لگا دی کہ ترکوں کو ایک موقعہ مل گیا، جس کو اُنھوں نے نہایت کامیابی کے ساتھ ضایع نہیں ہونے دیا۔ اس کی وجہ میری رائے میں وہ خفیہ من سمجھوتا تھا جو سائکس اور پیکاٹ کے درمیان میں ہوا۔ جنگ عظیم کی خفیہ سیاسی ریشہ دوانیوں کی تاریخ میں میرے جیسے آدمی کے خیال کے موافق، کوئی ایسا واقعہ نہ ملے گا جیسا کہ ان دو آدمیوں کے خفیہ ... کا واقعہ۔ ان دو آدمیوں میں سے ایک سر مارک سائکس ایک انگریز

سیاح اور مستشرق تھا اور دوسرا جارج پکاٹ، جو کسی زمانے میں دمشق میں فرانس کا کانسل رہا تھا۔ یہ دونوں ماہ مئی ۱۹۱۶ء میں کہ ابھی جنگ عظیم کے ختم ہونے میں دو سال باقی تھے، ایک جگہ مل کر بیٹھے اور انھوں نے نہایت اطمینان کے ساتھ تمام مغربی ایشیا کے حصے بخرے کر کے اپنے اپنے ملکوں کو بخش دیے۔ اس عطا پاشی کے وقت نہ انھوں نے اتحادیوں سے راے لی، نہ منقسمہ ملک کے باشندوں کے حقوق کا خیال کیا، نہ اُن کی خواہش معلوم کی۔ لطف یہ ہے کہ چند روز بعد اس ضرر رساں معاہدے کو برطانیۂ عظمیٰ اور فرانس کی حکومتوں نے شرفِ قبولیت بخش دیا۔ اس معاہدے کے ذریعے سے بیس ملین انسانوں کی قسمت کا اس بے دردی سے فیصلہ کر دیا گیا کہ گویا وہ بنی نوع انسان نہ تھے بلکہ کوئی بے روح جانور تھے۔

سائکس۔ پکاٹ کا معاہدہ مختصر طور پر یہ تھا کہ فرانس کے حلقۂ اثر میں شام، سلیشیا اور جنوبی آرمینیہ رہے؛ دمشق، حلب، عُرفہ[1]، دیر الزور اور موصل فرانس کی "حکومت حکم برداری" میں دے دیے جائیں۔ فلسطین ایک بین الاقوامی ریاست بنا دی جاوے۔ عراق عرب، اس شرط کے ساتھ کہ اُس کو بندر حیفہ کی راہ سے بحر روم کا راستہ دیا جاوے، برطانیہ کے حلقۂ اثر میں رہے اور اس میں تمام ملک عرب شامل ہو۔ مگر ۱۹۱۸ء میں لائڈ جارج نے کلیمنشو کو اس پر آمادہ کر لیا کہ موصل برطانیہ کو دے دیا جاوے اور اس کے معاوضے میں لائڈ جارج مدد کرے گا کہ فرانس کے حقوق شام پر قائم ہو جائیں۔ لیکن جب ورسیل کی کانفرنس ہوئی تو اس عہد نامے کے متعلق کچھ غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں۔ برطانیہ نے اس پر زور دیا کہ اُس کو موصل بلا کسی شرط کے دیا گیا ہے؛ دوسری طرف فرانس نے یہ ضد کی کہ موصل صرف اس شرط اور سمجھوتے پر برطانیہ کو ملا ہے کہ فرانس کو وہاں کے تیل کا ایک حصہ دیا جاوے گا۔ یوں اتحادیوں کے ان دونوں فریق ہاے اعظم میں کٹا چھنی شروع ہو گئی۔

اب اس بات کو بھی سمجھ رکھنا چاہیے کہ مشرق قریبہ کے معاملے میں برطانیۂ عظمیٰ اور فرانس کی پالیسیاں ایک دوسرے کے بالکل خلاف ہیں اور ہمیشہ سے خلاف رہتی آئی ہیں۔ مشرق قریبہ میں فرانس کے جو ارادے ہیں، اُن کو برطانیہ نے کبھی دوستانہ، بلکہ بے غرضانہ نگاہ سے بھی نہیں دیکھا۔ اسی طرح برطانیہ کا جو اثر و رعب اُس علاقے میں برابر بڑھتا جاتا ہے اُس کو فرانس ہمیشہ مشکوک نگاہوں ہی سے دیکھتا رہا ہے:

---

[1] مقامات کے جو نام اس تمام مضمون میں آ رہے ہیں اُن کی صحت کی ذمہ داری راقم آثم اپنے ذمے نہیں لیتا۔

جس دن سے کہ برطانیہ نے ترکوں کے خلاف مہم شروع کی ہے، انگریز اگرچہ بظاہر اس پالیسی پر چل رہے ہیں کہ تمام رعایا کا لحاظ و خیال رکھا جاوے گا، مگر فی الحقیقت وہ پالیسی "شاہنشاہانہ" تھی۔ یہ اصطلاح یقیناً اس کو چاہتی ہے کہ تمام عربی ایشیا پر حقیقی طور سے قبضہ کر لیا جاوے اور اس ذریعے سے ہندوستان اور افریقہ کو ایک دوسرے سے ملا دیا جاوے۔ برطانیہ کے سیاسی مدبرین اتنے تو ضرور ہوش دار تھے کہ وہ یہ جانتے تھے کہ دنیا اُن کے عراق عرب پر قبضہ کر لینے کو گوارا کر جاوے گی (اگرچہ یہ علاقہ اتنا دُور اُفتادہ ہے کہ نہ اُس کی کوئی پروا کرتا ہے، نہ کسی کو اس کی خبر ہے) مگر دنیا کا ہر شخص یقیناً خاص ٹرکی کے کسی حصے پر برطانیہ کے قبضے کو ناپسندیدگی اور شک کی نگاہ سے دیکھے گا۔ انھوں نے یہ بھی معلوم کر لیا کہ اگر برطانیہ اُن وعدوں سے روگرداں ہو جاوے جو اُس نے اپنی رعایا، ہندوستانی مسلمانوں سے کیے ہیں کہ ترکوں کا کوئی علاقہ اپنی سلطنت کے ساتھ ضم نہ کرے گا، تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ اُن کو بغاوت پر خود ہی آمادہ کر دیا؛ اور اس صورت میں بغاوت ہو جانے کا امکان کچھ بعید بھی نہ تھا۔

لیکن انگلستان یورپ میں رائے عامہ کو نہیں ٹھکرا سکتا تھا، نہ اپنی مسلمان رعایا کو، ٹرکی کے علاقے اپنے ساتھ ضم کر کے اپنا مخالف بنا سکتا تھا، نہ وہ اپنے پہلو میں ایسی ٹرکی کو پال سکتا تھا، جو اُس سے ایک تو ناراض تھی، اور دوسرے ممکن تھا کہ چند روز کے بعد اتنی قوی ہو جاتی کہ مغربی ایشیا میں جو انگلستان کے اغراض و مقاصد تھے اُن کو نقصان پہنچانے کی دھمکی دے سکتی۔ برطانیہ کو کوئی ایسی ترکیب ایجاد کرنی پڑی کہ جس کے ذریعے سے وہ بالواسطہ ٹرکی کو ہمیشہ کے لیے کم زور کر دے۔ اس معمے کو اس نے یوں واقعی یا خیالی طور پر حل کیا کہ یونانیوں کو اپنے ملک کی حدود بڑھانے کی جو خواہشیں ہیں اُن کی اور تشویق کی جاوے اور اُن کی اس جوع الارض کا شکار ٹرکی کو بنایا جاوے۔ یہ فرض کر لیا گیا تھا کہ یونان کو مدد پہنچانے کے بدلے میں وہ لیوانٹ میں ہمارا دیسا ہی غلام بن جاوے گا، جیسا کہ فرانس مشرقی یورپ میں یہ امید کر رہا تھا کہ پولینڈ میں (یونانیوں کا سا) کھیل کھیلے گا۔ صاف الفاظ میں یہ کہنا چاہیے کہ یونان کو انگلستان اپنا ایسا دسپنا بنانا چاہتا تھا کہ اُس سے پکڑ کر آگ پر سے اپنی ہانڈی اُتارے۔ اس لیے لائڈ جارج کی گورنمنٹ نے شروع ہی سے تھریس اور اناطولیہ پر یونان کے دعوے کی حمایت کی؛ بالکل اُسی طرح جیسے اُس نے حجاز کے بادشاہ (شریف) حسین کے دعوے کی سرزمین عرب کے لیے کی تھی۔ اس گورنمنٹ نے یہ حساب لگا لیا کہ اگر اور جب تک یہ حکومتیں برطانیہ کی مٹھی میں رہیں اُس وقت تک اُس کی پروا نہیں کرنی چاہیے کہ اُن علاقوں پر کس کا پرچم لہرا رہا ہے۔

مقصود اصلی تو یہی تھا کہ یہ علاقے برطانیہ کی مٹھی میں رہیں۔ انگلستان نے کبھی اس کی پروا نہیں کی کہ برائے نام حکومت کس کی ہے، بہ شرطے کہ اصل دھن دولت اُسی کو ملتا رہے۔

قسطنطنیہ کے متعلق برطانیہ کے جو ارادے تھے اُن کا اہم اندازہ و قیاس ہی لگا سکتے ہیں۔ مگر بہرحال یہ یقین کر لینے کے پورے دلائل موجود ہیں کہ باوجود ہر طرح کے انکاروں کے برطانیہ عظمیٰ کا یہ ارادہ تھا کہ درہ دانیال کو اپنا ویسا ہی مضبوط قلعہ بنالے جیسا کہ جبل طارق اور سوئز میں بنائے ہوئے ہے اور اس ذریعہ سے بحر روم، ہر ضرورت کے لحاظ سے، برطانیہ کی گویا ایک جھیل بن جائے۔ یہ امر کہ یہی مقصود اصلی تھا، مشکوک ہے؛ لیکن فرانس اور اٹلی کو اس کا یقین کامل تھا کہ انگلستان کے یہی ارادے تھے۔ اُن کے تشکک میں اس وجہ سے اور بھی کمی نہیں آرہی کہ جوں جوں وقت گزرتا جاتا تھا آہستہ آہستہ یہ بات معلوم ہوتی جاتی تھی کہ اس پالیسی سے برطانیہ کا اصل مقصد یہ تھا کہ بحر روم میں فرانس اور اٹلی کی بحری طاقت کے مقابلے میں ایک غلاموں کی سی یونانی حکومت آہستہ آہستہ کھڑی ہو جائے۔

مشرق قریبہ کے مسئلے پر جس وقت ایک شور و شغب برپا تھا تو امریکہ میں بار بار یہ پوچھا جاتا تھا کہ: "فرانس اور اٹلی وہ پالیسی کیوں اختیار کیے ہوئے ہیں جس پر وہ اس وقت لیوانٹ میں عمل کر رہے ہیں؟ عیسائی اقوام اپنے حلیف انگلستان کے خلاف ترکوں کی کیوں حمایت کر رہی ہیں؟" اس سوال کا جواب اتنا صاف و صریح ہے کہ اسی پر تعجب ہوتا ہے کہ یہ سوال کیا ہی کیوں گیا! ٹرکی کے متعلق جو فرانس کی پالیسی تھی وہ اس امر پر موقوف تھی کہ فرانس کو نقصان پہنچا کر انگلستان لیوانٹ میں نفع اُٹھا رہا تھا۔ ٹرکی کے متعلق اٹلی کی پالیسی کی اصلیت یہ تھی کہ انگلستان کا حلیف یونان، اٹلی کو نقصان پہنچا کر لیوانٹ سے فائدہ اُٹھا رہا تھا۔ اگرچہ اٹلی بحر روم کی بڑی طاقت ہے اور جنگ عظیم میں اُس نے نقصان بھی بہت اُٹھایا تھا مگر ٹرکی کی لوٹ سے اسے جو کچھ ملا وہ صرف یہ تھا کہ ایشیائے کوچک کے جنوبی کنارے پر اُس کے زیر اثر ایک علاقہ تسلیم کر لیا گیا۔ دوسری طرف یونان تھا۔ شروع زمانۂ جنگ میں اُس کا رویہ قریباً قریب کارانہ رہا تھا اور جب وہ لڑائی میں شامل ہو چکا تو اس کو نقصانات بھی برائے نام ہی پہنچا تھا۔ مگر جب وہ لڑائی میں سے نکلا ہے تو، خواہ کاغذوں ہی پر سہی، اُس کو اٹلی کے مقابلے میں اضعاف حصہ ملا۔ رہ گیا فرانس، اُس کو "مرد بیمار" کے ترکے میں سے صرف شام اور سلیشیا پر قناعت کرنا پڑی۔ دوسری جانب برطانیہ عظمیٰ نے خاموشی کے ساتھ فلسطین، عراق عرب اور عرب کو ہضم کر لیا۔ اُس کو وہ علاقہ ملا جس کو مسٹر ونسٹن چرچل نے "نئی وسطی مشرقی سلطنت" سے موسوم کیا تھا۔ ایک اور مصنف کہتا ہے کہ: "اُس

(برطانیہ) نے مغربی ایشیا کے ساتھ وہ تمام علاقہ لیا جو قاہرہ اور کلکتے کے درمیان اور خلیج فارس اور بحیرۂ خزر کے درمیان واقع ہے؛ اور اُن کے علاوہ اُس نے قسطنطنیہ پر قبضہ جما لیا۔" یونان کو اپنا غلام بنا کر برطانیہ کا اگر پرچم نہیں تو اُس کا اثر اُس وسیع علاقے تک پہنچ گیا جو جبال بلقان سے آبناء ملاکا کے درمیان اور بحر خزر اور راس امید تک پھیلا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہوئی کہ جب فرانس اور اٹلی نے غور کیا تو یہ دیکھا کہ اُن کے فوائد انگریزی-یونانی حلیفوں کی وجہ سے معرض خطر میں ہیں؛ بالآخر اُنھوں نے سخت گھبراہٹ کے عالم میں ہر سہ طاقتوں کے عہد نامے کی طرف سے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور ترکی قوم پرست فریق سے علٰحدہ عہد نامہ کر لیا۔ یہی وجہ ہے کہ فرانس سلیشیا سے اور اٹلی اڈالیہ (عدلیہ؟) سے ہٹ آئے اور ترکوں کی کثیر التعداد فوج کو یونان کے خلاف اناطولیہ میں اور برطانیہ کے خلاف دردانیال میں کام کرنے کے لیے اکیلا چھوڑ آئے۔ یہی وجہ ہے کہ فرانس اور اٹلی نے ترکوں کو سامان حرب و ضرب دیا۔ ان دونوں کا فائدہ اسی میں تھا کہ بحر روم کے مشرقی ساحل پر قوی اور دوست ترکی رہے، مگر برطانیہ عظمیٰ کا دست پروردہ یونان نہ رہے۔ مختصر یہ ہے کہ اس کا نام ہے "شہنشاہیت کی رقابت!"

مُدانیا کا التواء جنگ کا معاہدہ، جس پر ۳۰ / اکتوبر ۱۹۱۸ء کی آدھی رات کو دستخط ہوئے ترکی کی شرکت جنگ عظیم کا خاتمہ کر دیتا ہے۔ اس عہد نامے کی شرائط کے موافق اتحادیوں نے فی الفور قسطنطنیہ اور دردانیال پر قبضہ کر لیا اور اناطولیہ میں جو ترکی فوجیں تھیں اُن سے ہتھیار رکھوا لینے اور اُن کو موقوف کرنے کی کارروائی شروع کر دی۔ اگرچہ صلح کرانے والوں نے ۱۹۱۹ء کے موسم بہار میں پیرس میں جمع ہو کر ترکوں کے مسئلے پر بحث و تمحیص کی تھی، مگر صلح نامے کے مسودے کو تیار کرنے کے سوال پر فروری آئندہ تک سنجیدگی سے غور نہیں کیا گیا۔ اس دیر کی وجہ کچھ تو یہ اُمید تھی کہ امریکہ صلح کی ایک فریق بنے گا؛ اور کچھ یہ کہ خود اتحادیوں کے آپس میں اس مسئلہ پر اتفاق نہ تھا کہ سلطنت عثمانیہ کے غیر ترکی حصص کی "حکم برداری" کس کو ملے۔

پریزیڈنٹ وِلسن کی صلح کی قرارداد چودہ قراردادیں سے بارہویں قرارداد یہ تھی کہ ان غیر ترکی علاقوں کو "بغیر کسی قسم کی دست اندازی کے یہ موقع دیا جائے گا کہ وہ اپنی خودمختاری کی نشوونما کریں گے"۔ معاہدہ ورسیل کی بائیسویں دفعہ کا یہ مطلب تھا کہ اُن میں سے کم از کم چند کو، جس کسی کی حکم برداری اُنھیں منظور ہو اُسی کے تحت میں، بہ حیثیت آزاد اقوام کے تسلیم کر لیا جائے گا۔ ان حکم برداریوں کے بڑے دعوے دار دو تھے: ایک برطانیہ عظمیٰ اور دوسرے

فرانس ۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ اس وقت سے تین برس پیش تر ان میں خفیہ سمجھوتا (سائکس اور پکاٹ کا معاہدہ) ہو چکا تھا کہ مغربی ایشیا کے کون کون سے حصص آیندہ کہاں کہاں اور کس کس کے زیر اثر رہیں گے۔

فوائد و مقاصد کا سب سے بڑا تصادم فرانس اور حجاز کے درمیان شام کے عربی اضلاع کے متعلق تھا۔ اس کے متعلق میں اگلے باب میں تفصیل بیان کروں گا۔ سردست یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ حجاز "برطانیہ کی ایک نئی پیداوار" تھا، اور اس کا بادشاہ (شریف) حسین برطانیہ ہی کا دست پروردہ تھا۔ اب یہ امکانات پیدا کیے گئے کہ فرانس، اٹلی اور یونان کے دعاوی کی اشک شوئی کر دی جاوے اور اُن کو ایشیائے کوچک میں علاقے دے دیے جاویں؛ حال آں کہ پریزیڈینٹ ولسن کا حتمی وعدہ تھا کہ ٹرکی کے رہنے والوں کا اتحاد ملحوظ رکھا جاوے گا اور قسطنطنیہ کا تصفیہ (آیندہ) کیا جاوے گا۔ اس اشکال کا ماہ فروری سنہ ۱۹۲۰ء میں لنڈن کانفرنس میں یوں دفعیہ کیا گیا کہ یہ اعلان کر دیا گیا کہ قسطنطنیہ ترکوں کا دارالسلطنت رہے گا؛ مگر اس کے ساتھ ہی ترکوں کو مطلع کر دیا گیا کہ یہ رعایت اُن کی آیندہ "نیک چلنی" پر مشروط ہے۔ دو ہی ہفتوں کے بعد سین ریمو کی کانفرنس نے برطانیہ کو عراق عرب اور فلسطین کی حکم برداری دے دی اور فرانس کو شام اور سلیشیا کی۔ لیگ آف نیشن اور امریکہ کی سے نیٹ نے آرمینیہ کو کسی کی بھی حکم برداری میں دینے سے انکار کر دیا۔ آخر ۱۱ مے کو عہد نامے کا مسودہ سیورے میں ترکوں کے سفیروں کے حوالے کر دیا گیا اور اُنھوں نے ۱۰ر اگست سنہ ۱۹۲۰ء کو اس پر دستخط کر دیے۔

آیندہ جو واقعات پیش آوے ان کی روشنی میں اس دستاویز پر ایک اُچٹتی ہوئی نظر ڈالنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ اس معاہدے کی شرائط کے موافق دردانیال، مارمورا اور باسفورس کے ساحلی علاقے، بعض خاص ضرورتوں کے لیے، ایک کمیشن کی تحت میں دے دیے گئے تھے، جو مختلف سلطنتوں کے نمایندوں سے بننے والی تھی۔ قسطنطنیہ کا شہر سلطان کے پاس اس شرط سے چھوڑ دیا گیا تھا کہ اگر ٹرکی نے معاہدے کی کسی شرط کی خلاف ورزی کی تو وہ (قسطنطنیہ) ضبط کر لیا جاوے گا۔ ٹرکی نے، اصل معنوں میں، شتلجا کی لائن کے مغرب میں جتنا کچھ تھریس تھا نیز ٹینے ڈوس، امبروس اور دوسرے جو اُن کے وہ تمام جزیرے، جو یونانیوں کے قبضے میں تھے، یونان کے حوالے کر دیے تھے۔ لیکن یونان کو یہ اجازت نہ تھی کہ وہ اُن جزائر کو قلعہ بند کرے، جو آبنائے کے متصل ہیں۔ اور اُس سے یہ کہہ دیا گیا تھا کہ اُس کو ایک معاہدے پر دستخط کرنے پڑیں گے جس کے موافق وہ (یونان) اپنی سلطنت میں جو ترک

تھوڑی تعداد میں رہ گئے ہیں اُن کے حقوق کی حفاظت کرے گا. سمرنا اور اُس کے اِرد گِرد جتنا چھوٹا سا علاقہ تھا اور جس میں آیڈین کی نصف ولایت شامل تھی، پانچ برس تک ٹرکی کے زیرِ حکومت یونان کے زیرِ نظم و نسق رہنے والا تھا اور اس کے بعد اگر وہاں کے باشندے راضی ہوں تو یونان سے ضم کر دیا جاوے گا. عراق عرب، شام، فلسطین، آرمینیہ، اور حجاز آزاد ریاستیں تسلیم کر لی گئیں. ان میں سے پہلی تین ریاستیں حکم برداری میں رہنے والی تھیں. کُردستان کو حکومت خود اختیاری مل گئی. کاسٹلاریزو اور سپوراڈی جزائر میں سے بارہ چھوٹے جزیرے، جن پر ۱۹۱۲ء کی جنگ میں اٹلی نے قبضہ کر لیا تھا اُسی کے پاس چھوڑ دیے گئے. برطانیہ کی مصر پر حفاظت اور قبرس پر قبضہ تسلیم کر لیا گیا. فوج کے متعلق اس معاہدے میں جو دفعات تھیں اُن میں سے بڑی دفعہ یہ تھی کہ ٹرکی کوئی فوج سوائے سلطان کے باڈی گارڈ کے نہ رکھ سکے گا؛ اور اس باڈی گارڈ میں قریباً سات سو آدمی ہوں گے اور کچھ جنڈرمہ؛ سرحد کی حفاظت کے لیے جو فوج ہو گی اُس کی تعداد پچاس ہزار سے تجاوز نہ کرنے پاوے گی.

اس کے یہ معنی تھے کہ اس حیرت انگیز عہدنامے کے مطابق سلطنت عثمانیہ اپنی دو تہائی سلطنت اور تین چوتھائی آبادی سے محروم کر دی گئی تھی. چار لاکھ چالیس ہزار مربع میل کا رقبہ ارضی اور بارہ ملین سے زیادہ آبادی ترکوں کے ہاتھ سے نکال لی گئی تھی؛ بہ تبدیل الفاظ قریباً آٹھ ملین ترک ایسے علاقے میں بند کر دیے گئے تھے جس کا رقبہ ضلع کیلیفورنیا کے برابر تھا، اور جس کا کوئی راستہ صحیح معنوں میں سمندر کی طرف نہیں تھا. باوجود اتحادیوں کے بار بار وعدوں کے کہ یہ لڑائی فتوحات کے لیے نہیں لڑی گئی تھی اور اس سے حدود سلطنت بڑھانی مقصود نہیں تھی. یہ ناقابل انکار امر موجود رہا کہ بہت سے وہ حدود ارضی جن سے ترک محروم کر دیے گئے تھے حکم برداری، محافظت، حدود اثر، رقبہ مقبوضہ، بین الاقوامی رقبہ یا حقوق ضم شدہ کے نام یا بھیس میں اتحادیوں کی قوموں کے ہاتھ میں پہنچ گئے. شاید ایسی ستمگارانہ اور روز روشن کی فسادانگیز دستاویز دنیا میں کبھی کسی کاغذ پر نہیں لکھی گئی ہو گی.

پیرس، لنڈن، سین ریمو، سیپا اور سیورے میں اتحادیوں کو اس سودے پر لڑتے اور دلالوں کی سی باتیں کرتے ہوئے چھوڑ کر یہ دیکھنا چاہیے کہ ٹرکی میں کیا ہو رہا تھا. ترکوں کے لیے یہ زمانہ بہت ہی بھاری گزر رہا تھا. اُن کا ملک بے دست و پا ولاچار و عاجز ہو کر فاتحوں کے قدموں کے نیچے روندا جا رہا تھا. دردانیال پر جو مقامات فوجی نقطۂ نظر سے اہم تھے وہ اتحادیوں کے تصرف میں تھے؛

اتحادیوں کے کچھ جہاز مارمورا میں گشت لگا رہے تھے اور کچھ گولڈن ہارن کے بندروں پر لنگر ڈالے ہوئے تھے؛ اتحادیوں کی فوجِ محافظ قسطنطنیہ میں خیمہ زن تھی؛ دارالسلطنت میں فوجی حکم جاری تھا، جو سخت نامعقول اور رعایا کو پیس ڈالنے والا تھا۔ شاید جرمنوں نے فرانس اور بلجیم میں بھی اتنی سختی نہ کی تھی، جیسی اس وقت یہاں ہو رہی تھی۔ ہر قسم کی تحریرات پر احتساب اپنے پورے زوروں پر تھا؛ زبان پر قیود تھیں؛ اخبارات میں کچھ لکھنا یا اُن کو پڑھنا ممنوع تھا؛ خفیہ طور پر گرفتاریاں ہونا اور ملک بدر کیا جانا روزمرہ کا معمول ہو رہا تھا۔ اتحادیوں کی پولیس اور اُن کے جاسوس ہر جگہ موجود تھے۔ دارالسلطنت کے اُس محلّے میں جو پیرا کے نام سے موسوم ہے، یونانیوں اور ارمنیوں نے ترکی ٹوپیاں اُتار کر یورپین ٹوپیاں زیبِ سر فرمالی تھیں اور وہ جوش میں بیخود گلی گلی گشت لگا رہے تھے۔ سنہ ۱۹۱۹ء کے شروع ہی میں یونانی اور ارمنی بطریقوں نے اپنے تعلقات عثمانی گورنمنٹ سے توڑ دیے تھے اور اپنے اپنے مقلدین میں اعلان کر دیا تھا کہ اب وہ ترکی رعایا نہیں رہے۔ ترکوں کی پارلیمنٹ اب بھی استنبول میں اجلاس کر رہی تھی، مگر مردہ دلی بےحسی اور نااُمیدی کی حالت میں۔ بابِ عالی میں ہر چیز پر اُداسی چھائی ہوئی تھی اور ہر بات سے مایوسی ٹپک رہی تھی۔ سلطان محمد ششم شفیق، نیک دل اور کم زور طبیعت کے معمر آدمی تھے اور تنہا یلدیز میں رہتے تھے۔ سلطنت کا (بلکہ صحیح طور پر یہ کہنا چاہیے کہ سلطنت کے اُن ٹوٹے پھوٹے ٹکڑوں کا، جو باقی رہ گئے تھے) نظم و نسق وزیرِ اعظم، داماد فرید پاشا کے ہاتھ میں تھا۔ یہ بڑے ہوشیار، فہیم، اور غیر محتاط سیاسی شخص تھے۔ اگر وہ برطانیہ کے ہاتھ بکے ہوئے نہ تھے تو کم از کم ان کے دست پروردہ ضرور تھے۔ باسفورس کے اُس طرف کئی مقامی حفاظتی چیزیں ایسی پیدا ہو گئی تھیں جو ایشیائے کوچک کی طرف کی چھوڑی ہوئی سرحد کی نگرانی کرتی تھیں، کیوں کہ یہ اندیشہ تھا کہ شاید کوئی اتحادیوں کے جہازوں کی نظر بچا کر اُدھر سے حملہ کر دے۔

قوم بھر کے معاملات زیر و زبر ہو رہے تھے اور ایک آفت برپا تھی؛ یکایک اس تماشا گاہ پر ایک ایسا نیا ایکٹر آتا ہے کہ اُس جیسا طاقتور اور لائق ایکٹر ایشیا نے پچھلی نسل میں پیدا نہیں کیا۔ یہ شخص فوراً ہی دنیا کے سامنے آ کھڑا ہوتا ہے۔ اس سے پہلے بھی ایسے آدمی دنیا میں ہو گزرے ہیں جن کے نام تاریخ میں اس حیثیت کے ساتھ درخشاں ہیں کہ وہ اپنے ملک اور اپنے آدمیوں کے ناجی تھے؛ مجھے یقین کامل ہے کہ اس ایکٹر، مصطفےٰ کمال، کا نام ان ہی ناجیوں کے نام کے ساتھ ہمیشہ چمکتا رہے گا۔ یہ سالونیکا میں پیدا ہوئے اور سپاہیوں کا پیشہ اختیار کیا؛ اپنی ذاتی قابلیت سے

جلدی جلدی ترقی کرکے ایک ڈویژن کے جنرل اور جنرل سٹاف کے ممبر ہو گئے۔ جب انور بے سالونیکا میں انجمن اتحاد و ترقی قائم کی تو چوں کہ کمال نہایت دل سوز محب وطن تھے اور ناانصافی و ظلموں کو دیکھ دیکھ کر حب الوطنی کی آگ میں پھنکے جاتے تھے اس لیے وہ نوجوان ترکوں میں جا شامل ہوے۔ وہ ۱۹۰۹ء کی اُس بغاوت میں شامل ہوے، جس نے سلطان عبدالحمید (اب مرحوم) سے تخت چھڑایا۔ لیکن جیسے ہی اُنھیں معلوم ہوا کہ انور اور اُن کے رفیق، سلطان معزول (مرحوم) کی پالیسی پر دوسرے نام سے عمل پیرا ہیں، تو وہ اُن سے الگ ہو گئے۔ گیلی پلی کی مہم کے موقعے پر کمال ایک ڈویژن کے کمانڈر تھے اور اُس وقت کی خدمات کی وجہ سے قومی ہیرو بن گئے تھے۔ لیکن اُن کی ہر دل عزیزی کی وجہ سے انور کو، جو اس وقت ٹرکی میں کُل کُلاں بنے ہوے تھے اُن سے رشک پیدا ہوا اور کمال کو ایک ڈویژن کے بعد دوسرے ڈویژن سے موقوف کیے جاتے رہے آخر وہ ایشیاء کوچک میں نظر بند کر دیے گئے، وہ اُڈانہ میں تھے کہ انور کی پالیسی کے موافق بار بار بے جا حملے کیے گئے۔ جن کا یہ تلخ انجام ہوا جو اس وقت نظر آ رہا ہے کمال اس کی کئی بار پیشین گوئی کر چکے تھے۔ جب ۳۰ راکتوبر ۱۹۱۸ء کو مُدانیا میں التواء جنگ کے عہد نامے پر دستخط ہوے، تو انور اور اُن کے رفیق ممبران اتحاد و ترقی دارالسلطنت سے اپنی جان بچا کر بھاگے، کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ اتحادیوں کے ہاتھوں اُن کا کیا انجام ہونے والا ہے۔ اُس وقت کمال قسطنطنیہ میں واپس آ گئے۔

اس درہم و برہم شاہ شہر میں جو کچھ اُنھوں نے آکر دیکھا اور سنا اُس سے اُن کی یہ رائے اور بھی پختہ ہو گئی کہ اگر ایشیاء کوچک کو، جو ترکوں کا تاریخی وطن تھا، دشمنوں نے اُس کیا ٹے سے صاف نہیں کیا، جو اب سے چند روز پیشتر ترکوں کی سلطنت تھی، تو ترکوں کو خود یہ کام کرنا پڑے گا۔ جب امریکہ نے مشرق قریب کے معاملے میں دست اندازی کرنے سے انکار کر دیا، تو ترکوں کی یہ امید کہ کوئی غیر سلطنت اُن کی مددگار ہوگی، بالکل ٹوٹ گئی۔ اگرچہ شرائط صلح اب تک شائع نہیں ہوے تھے، مگر اس بات سے سب واقف تھے کہ اتحادی تصد مصمم کر چکے ہیں کہ سلطنت عثمانیہ کے پرخچے اُڑا دیں گے پریزیڈنٹ ولسن نے اپنے چودہ قرارداد صلح میں جو یہ پالیسی وعدہ کیا تھا کہ ایشیاء کوچک ترکوں کے پاس چھوڑ دیا جاے گا، اُس سے یوں مایوسی ہوئی کہ یہ افواہ سنی گئی کہ اس بلا شرکت غیرے ترکی علاقے پر یونان کا دانت ہے اور وہ اس کے بھی ٹکڑے ٹکڑے کر دینا چاہتا ہے۔ یہ افواہ غلط نہ تھی، جیسا کہ بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا۔ ٹرکی میں کوئی گورنمنٹ ایسی نہیں رہ گئی تھی

کہ اُس کے جھنڈے تلے جمع ہو کر مقابلہ کیا جا سکتا۔ یہ صحیح ہے کہ اُس وقت بھی پارلیمنٹ کا اجلاس ہو رہا تھا، لیکن اُس پر وہ آزاد خیال گروہ قابض تھا جو یہ چاہتا تھا کہ صلح ہو جائے، خواہ اُسکی کچھ ہی قیمت کیوں نہ ادا کرنا پڑے۔ یہ گروہ "یا فریق" وزیرِ اعظم "داماد فرید" کی مٹھی میں تھا اور داماد فرید، برطانیہ کا دست پروردہ تھا۔ اگر سلطانِ وقت زوردار شخصیت کے آدمی ہوتے، تو وہ بحیثیت خلیفۂ اسلام اپنے اختیارات کو کام میں لاکر کوئی صورت پیدا کر دیتے (جس کی اشد ضرورت تھی) اور وہیں سے تباہ شدہ ملک کے لیے کوئی بہتری کی صورت پیدا ہو جاتی، لیکن پارلیمنٹ کی طرح، سلطان محمد ششم بھی بالکل داماد فرید کی اور اُن کے ذریعے سے برطانیہ کی مٹھی میں تھے۔

کمال نے فوراً تاڑ لیا کہ اناطولیہ، یا فی الحقیقت ٹرکی کی آزادی کے نام و نشان کو بچا لینے کی اگر کوئی امید ہے تو صرف اس میں کہ مقامی محب وطن انجمنوں کو ایک ایسا سیاسی گروہ بنا لیا جائے کہ وہ پارلیمنٹ کے آزاد گروہ کو معزول کر کے تمام پارلیمنٹ پر قبضہ کر لے۔ اسکے بعد یہ ہو سکے گا کہ داماد فرید پاشا کو معزول کر کے برطانیہ کی من مانی پالیسی کا خاتمہ ہو جائے اور ترکوں کے موافق پالیسی قائم ہو جائے۔ لیکن کمال کو بالکل صاف طور پر نظر آ رہا تھا کہ جب تک اتحادیوں کی فوج قسطنطنیہ پر قابض ہے وہ خود اور اُن کے رفقاء اپنی تدابیر کو پورا کرنے کے لیے شہر میں محفوظ نہیں رہ سکتے؛ کیوں کہ وہ روزمرہ یہ دیکھتے تھے کہ سینکڑوں وہ ترک جن پر برطانیہ کے خلاف ہونے کا شبہ بھی ہوتا تھا، راتوں رات گرفتار کر کے مالٹا بھیج دیے جاتے تھے۔ یہاں مجھے مختصر الفاظ میں یہ کہہ دینا چاہیے کہ انسداد و اندفاع کا یہ سخت اور غیر منصفانہ طریقہ، جو برطانیہ نے اُس وقت مرعی رکھا تھا، بالکل ناقابل فہم اور بے اثر تھا؛ کیوں کہ بجائے اس کے کہ اس سے انگریزوں کے خلاف ترکوں کے ارادوں کو بالکل ملیا میٹ کر ڈالا جائے، اُن کی مخالفت اور بھی بڑھتی چلی جاتی تھی۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ظلم و جبر سے آدمی عارضی طور پر ہار مان لے اور بہ ظاہر تابعداری دکھلا دے، لیکن تاریخ ایسی بہت سی مثالیں پیش کرتی ہے کہ اس کا آخری انجام یہ ہوتا ہے کہ یہ چنگاری سلگ سلگ کے ایک بڑا الاؤ بن کر ملک بھر میں غدر و بغاوت کی آگ بھڑکا دیتی ہے۔

بہرکیف، معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت قسمت کمال کا ساتھ دے رہی تھی؛ کیوں کہ سنہ ۱۹۱۹ء کے موسم بہار کے شروع ہی میں وزیرِ جنگ نے اُن کو اس غرض سے "ایشیا، کو چک" میں بھیج دیا کہ وہ وہاں فوج کے ہتھیار لے لینے میں مدد کریں۔ جیسے ہی فرید کو اس کی اطلاع ملی کہ کمال روانہ ہو گئے تو اُن کو اپنے وزیرِ جنگ کی غلطی پر تنبیہ ہوا اور اُن کے وہاں جانے کے جو نتائج ہونے والے تھے

وہ نظر آنے لگے۔ اُنھوں نے فوراً کمال کو حکم دیا کہ وہ فی الفور دارالسلطنت میں واپس آجاویں۔ کمال کو خیال ہوا کہ اس حکم کے معنی اتحادیوں کے غداروں کے ہاتھوں میں قید ہونا ہے؛ اس لیے اُنھوں نے بڑی سختی کے ساتھ تعمیل حکم سے انکار کر دیا۔ چوں کہ فرید، سلطان کی گورنمنٹ کے حاکم اعلیٰ تھے اس لیے اُن کے حکم کی تعمیل نہ کرنا خود سلطان کی نافرمانی تھی، اس طرح کمال گویا اپنے بادشاہ کے باغی ہوگئے۔

اب اناطولیہ بدترین کشاکش کا اکھاڑا بن گیا؛ ایک طرف کمال اور ان کے طرف دار تھے اور دوسری جانب فرید اور اُن کے حمایتی۔ صوبوں کے وہ حکام، جو فرید کے وفادار تھے، کمال کے آدمیوں کو پکڑ کر قسطنطنیہ بھیجنے لگے؛ جو لوگ بچے اُنھوں نے مشرقی صوبوں میں فرید کے آدمیوں کے ساتھ وہی سلوک کیا۔ ٹرکی، اپنی اس بدترین حالت نظارہ میں، گویا دو اکھاڑوں میں تقسیم ہوگئی۔ ان میں سے ایک گروہ، جو فرید کی سرکردگی میں تھا، اپنے آپ کو فریق خلافت کہتا تھا۔ ان میں وہ لوگ شامل تھے جو خوف یا لالچ کے مارے یہ چاہتے، اور اسی پر زور دیتے کہ ٹرکی کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو اتحادیوں کے رحم و کرم کے حوالے کر دے۔ یعنی جو قیمت بھی دینی پڑے دے کر صلح کر لے۔ دوسرا گروہ، جس کے سرکردہ مصطفےٰ کمال تھے، قومی فریق کہلانے لگا۔ اس فریق میں ٹرکی کے بہترین آدمی شامل تھے۔ طالبان علم، عقیل و فہیم لوگ، پرانی بری و بحری فوج کے افسر، پیشہ ور، تاجر اور دہاقین، سب کے سب جوش حب الوطنی سے سرشار تھے اور قصد مصمم کیے ہوئے کہ جس طرح ہوگا اپنی آزادی کو قائم رکھیں گے، خواہ اس کی کوئی بھی قیمت دینا پڑے۔

اس موقعے پر یہ امر یاد رکھنا چاہیے کہ جب ۱۹۱۹ء کے موسم بہار میں مصطفےٰ کمال اناطولیہ پہنچے تھے اور اُنھوں نے اپنی قومی تحریک شروع کی ہے تو اُن کا ہرگز یہ ارادہ نہ تھا کہ عہدنامہ مدانیا کی خلاف ورزی کریں۔ وہ اس ارادے سے وہاں گئے ہی نہ تھے کہ اتحادیوں کا شمشیر بکف ہو کر مقابلہ کریں، یا یہ کہ قسطنطنیہ کی باضابطہ گورنمنٹ کے خلاف ایک رقیب گورنمنٹ بناویں۔ وہ اس غرض سے گئے تھے کہ ایک نیا سیاسی گروہ بنا دیں، جو اتنا قوی ہو کہ ترکی پارلیمنٹ پر قبضہ کر سکے، جس میں نمک حرام اور دشمنان ملک و ملت بھرے ہوئے تھے، اور اس ذریعے سے اتحادیوں کا مقابلہ کر کے اُن کی یہ تدبیر نہ چلنے دیں کہ ٹرکی کے حصے بخرے کر دیے جاویں۔ لیکن جب ماہ مئی ۱۹۱۹ء میں یہ خبر پہنچی کہ یونانیوں نے سمرنا پر قبضہ کر کے نہتے ترکوں کا قتل عام کر دیا ہے، تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ جیسے ایشیاء کوچک پر بجلی گری، اور تمام صوبے گویا مصطفےٰ کمال کے جھنڈے تلے ٹوٹ پڑے اور ان کی پالیسی طرفۃ العین میں بدل گئی۔

یہ بات اب تک نہ کسی نے بتائی ہے، نہ سمجھ میں آئی کہ آخر اتحادیوں کو کیا سوجھی کہ انھوں نے یہ احمقانہ فعل کیا کہ یونانیوں کو اپنی فوجوں سے مدد تو دی نہیں اور اُن سے کہہ دیا کہ اناطولیہ جیسے علاقے پر حملہ کر دو، جہاں ترکوں کی آبادی بہت ہی زیادہ ہے۔ اُس وقت یہ کہا گیا تھا کہ اس سے مقصود صرف یہ تھا کہ مصطفےٰ کمال اور اُن کی نئی قومی غیر قواعد داں فوج کے سامنے یونانی فوج کا مظاہرہ کیا جائے، تاکہ وہ مرعوب ہو جائیں؛ کیوں کہ انھوں نے اتحادیوں کو تکلیف دینا شروع کیا تھا۔ لیکن قیاس غالب یہ ہے کہ یہ ترکیب انگلستان اور فرانس کی تھی کہ اٹلی سے پیش دستی کریں، کیوں کہ اُس (اٹلی) کو ترکوں کے ملک کی لوٹ میں سے جو حصہ ملا تھا وہ اُس پر راضی نہ تھا اور یونانیوں کی جو طمع ایشیاء کوچک میں نظر آ رہی تھی اُس سے وہ بہت ہی ناراض تھا؛ اس لیے یہ دونوں یہ خفیہ چال چلے کہ یونان سمرنا پر یکایک قبضہ کر لے اور پھر اتحادیوں سے یہ کہہ دیا جائے کہ جو کچھ ہونا تھا سو ہو چکا، اب یہ بدلا نہیں جا سکتا۔ بہر حال اس قبضے کے لیے جو کچھ بھی بہانہ بنایا جاتا، اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اتحادیوں نے یونانیوں کو اپنا آلۂ کار بنایا، اور صرف یہی نہیں بلکہ یونانی سپاہیوں نے شہر کے غیر مصاف نہتے باشندوں کا قتل عام کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مصطفےٰ کمال نے عہد نامۂ التوائے جنگ کو پھاڑ چیر کر پھینک دیا۔ اس سب نے مل کر ترکوں کی دبی ہوئی قومیت کی آتش غیظ و غضب اور حب الوطنی کو ایسا بھڑکایا کہ ایشیاء کوچک کو مارمورا کے کنارے سے کردستان کی پہاڑیوں تک گرم و روشن کر دیا۔

قسطنطنیہ کی گورنمنٹ اور قومی فریق میں جو نفاق پیدا ہو گیا تھا وہ اور بھی بڑھ گیا۔ ۱۱ر جولائی ۱۹۱۹ء کو فرید نے مصطفےٰ کمال کے باغی ہونے کا اعلان کر کے اُس کے خلاف تھوڑی سی فوج بھیج دی۔ اناطولیہ کے دہقین کی طبیعتوں میں فرماں برداری اور تعلیم پذیری کا مادہ ہے اور اُن کے دل ایک ہی سمت میں کام کرتے ہیں۔ اب تک یہ لوگ سیاسیات میں کوئی دخل نہ دیتے تھے اور ان مسائل کو انھوں نے سیاست دانوں کے لیے چھوڑ رکھا تھا؛ لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ فرید کی فوج میں، جس کا باشان و شکوہ نام "فوج خلافت" تھا، یونانی اور ارمنی بھی ہیں، تو اُن کو شبہہ پیدا ہوا اور انھوں نے کمال کا ساتھ دیا؛ گو اس سے اُن کی سلطان خلیفہ کی وفاداری میں نقص آ گیا، جو اتنے قدیم زمانے سے چلی آتی تھی، جتنی ترکی سلطنت ہے۔

سلطنت ٹرکی کی مجوزہ تقسیم پر اظہار ناراضی اور یونانیوں کے خلاف تدابیر اختیار کرنے کے لیے ستمبر ۱۹۱۹ء میں ارض روم میں کمال نے ایک کانگریس منعقد کی جس میں اناطولیہ کی حمایت و حفاظت کی

تمام انجمنوں کے نمایندے شامل ہوے۔ اس کے دو مہینوں کے بعد ایک اور کانگریس منعقد کی گئی۔ اس مرتبہ اس میں تمام ایشیائی حصے کے منتخبہ لوگ شامل ہوے۔ اس کانگریس کا اجلاس سیواس میں ہوا اور وہیں قومی تحریک کی اصل بنیاد اس طرح پڑی کہ بارہ ارکین کی ایک قومی کونسل قرار دی گئی۔ یہ کونسل انگورہ میں مسلسل اجلاس کرتی رہی۔ انگورہ اور قسطنطنیہ کے درمیان میں آساتی کے ساتھ بہ ذریعہ تار برقی برابر مراسلت رہی۔ باوجود اس کے کہ فریدنے کمال کو باغی قرار دے دیا تھا، مگر قوم پرستوں نے ابھی تک عثمانی گورنمنٹ سے اپنا تعلق نہیں توڑا تھا۔ اس سال کے تمام موسم گرما و خزاں میں ہر حیثیت کے محبان وطن ترک، مع کثیر التعداد قومی فریق نمایندگان پارلیمنٹ، اسٹنبول سے سیکڑوں بیسوں میں، پیدل، گھوڑے پر سوار ہو کر اور ریلوں میں بیٹھ کر انگورہ پہنچ گئے۔ اتحادیوں نے جو گھیرا ڈال رکھا تھا اسکو انھوں نے جس طرح ہو سکا، توڑ دیا۔ مصطفےٰ کمال پر اس نئے گروہ کے بنانے اور اس کے منتظم کرنے کا بوجھ تو پڑا ہوا تھا ہی، مزید بار یہ بھی پڑا کہ جنگ کے اس تھکے ماندے، مفلس اور دور افتادہ حصۂ ملک سے انھیں ایک فوج بنانا اور اس کو مسلح کرنا تھا، تاکہ یونانیوں کو آگے نہ بڑھنے دیا جاوے۔ میرے ان الفاظ کو یاد رکھیے کہ ایک وقت آنے والا ہو کہ جب اس نوجوان ترک راہ نما کے اُن کارناموں کا ذکر، جو اس نے اناطولیہ جیسے سنسان قطعۂ ملک میں دکھلا دے، اُن سیاست داں سپاہیوں کے ساتھ ساتھ کیا جاوے گا، جو اپنے ملک و قوم کے ناجی ہوے ہیں اور جن کی کمریں ایک قوم کی ذمہ داریوں کے بوجھ سے خم ہوگئی ہیں؛ بالکل یہی حال اس بطل اعظم کا تھا، جو اس وقت تمام ملک وملت کے بوجھ سے خمیدہ کمر ایک برف سے ڈھکی ہوئی پہاڑی کی ناک گھاٹیوں میں بڑے غور و فکر میں ٹہل رہا تھا۔

فرید کا کوئی حمایتی ملک میں نہیں رہا؛ یہاں تک کہ بیچ کارہ پارلیمنٹ بھی اُس کی نہ رہی۔ تاہم اُس (پارلیمنٹ) کو اس نے اس لیے زندہ رکھ چھوڑا تھا کہ وہ اُس کی تدبیروں (یا بدتدبیریوں) کا ایک قانونی ہیولیٰ بنا سکے؛ مگر بہت جلد یہ کیفیت ہوگئی کہ اس نے بھی فرید کے اشاروں پر ناچنا چھوڑ دیا تھا۔ اگرچہ قریباً سب کچھ جاتا رہا تھا مگر اس کے پاس بڑی چیز برطانیہ کی حمایت بدستور باقی تھی اور برطانیہ تھا کہ سیورے کے معاہدہ کا مسودہ گھڑنے میں مصروف تھا۔ ادھر یہ ہو رہا تھا، اُدھر انگورہ کی قومی کونسل اپنا الٹی میٹم (اعلان آخر) دینے کی فکر میں تھی یہ الٹی میٹم ایسے الفاظ میں ہونے والا تھا کہ جن سے یہ صاف ظاہر ہو جاوے کہ راضی نامے کی کوئی صورت باقی نہیں رہ گئی تھی؛ اگر تھی تو صرف ذیل کی شرائط، جن کو اگر اتحادی مان لیں تو ترکی اتحادیوں کے ساتھ صلح

کر سکتا تھا۔ یہ اقل و دل، پُرمغز دستاویز بہت جلد "قومی عہد و پیمان" کے نام سے مشہور ہونے والی تھی۔ اس میں یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ ٹرکی کی سیاسی، عدالتی اور اقتصادی آزادی کو، بلا کسی شرط کے تسلیم کیا جاوے اور تمام ایشیاء کوچک اور مشرقی تھریس اُس کے قبضے میں چھوڑ دیے جاویں۔ یہ ٹرکی کی آخری شرط تھی؛ یہ ٹرکی کا آخری اعلان آزادی تھا۔ یہ عظیم القدر دستاویز فوراً قسطنطنیہ کی پارلیمنٹ کو بھیج دی گئی اور وہاں فوراً ہی ۲۸ جنوری سنہ ۱۹۲۰ء کو منظور کر لی گئی۔ اس سے فریڈ کو جو کچھ پریشانی ہوئی ہوگی اُس کا بیان کرنا لا حاصل ہے۔ برطانیہ نے اپنی دست پروردہ کٹ پُتلی کو بچانے کے لیے قدم آگے بڑھایا، اور اُس نے وہی من مانی ترکیبیں چلیں جو مصر، آئرلینڈ وغیرہ میں چل چکا تھا۔ ۱۱ اپریل کو برطانیہ نے ترکی پارلیمنٹ توڑ دی اور اُس کے تقریباً چالیس اراکین اور قریباً ایک سو ایسے آدمیوں کو، جو قومی تحریک کے ہم زبان تھے، گرفتار کر کے مالٹا جلا وطن کر دیا۔ اس سے زیادہ تنگ نظرانہ کارروائی قیاس میں بھی نہیں آسکتی؛ کیوں کہ قسطنطنیہ کی پارلیمنٹ کا توڑا جانا وہ بات تھی جس کو قوم پرست خدا سے چاہ رہے تھے۔ اُنھوں نے یہ سنتے ہی انگورہ میں فوراً ایک نئی پارلیمنٹ قائم کر لی؛ اور انگورہ وہ مقام تھا جہاں تک کسی غیر ملک کی دست اندازی یا دھمکی کام نہیں کر سکتی تھی؛ اس طرح انگریزوں نے گویا اپنے ہاتھ سے مقام حکومت و اختیارات کو باسفورس کے کنارے سے قلب اناطولیہ میں پہنچا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ برطانیہ کو جو قابو ٹرکی کی گورنمنٹ پر حاصل تھا وہ اس نے کھو دیا، اور قوم پرستوں کو خود وہ موقعہ دے دیا جس کے وہ آرزومند تھے اور جس سے اُنھوں نے فوراً فائدہ اُٹھایا۔

قسطنطنیہ کی پارلیمنٹ کو بہ جبر توڑنے سے قوم پرست گروہ ایشیاء کوچک میں گویا اپنے پورے شباب پر آگیا اور اُس نے اس واقعے کے بارہ ہی دن بعد، ۲۳ اپریل سنہ ۱۹۲۰ء کو، ایک نئی پارلیمنٹ بہ نام نہادِ "مجلس ملیۂ اعظم" بہ صدارت مصطفےٰ کمال کھول دی۔ اس مجلس ملیہ کا سب سے پہلا قدم یہ تھا کہ اُس نے فی الفور یہ اعلان کر دیا کہ "ٹرکی میں اصل اور باضابطہ گورنمنٹ وہ ہے جس کو یہ مجلس تسلیم کرے؛ چنانچہ یہ مجلس اپنے آپ کو، موافق قانون مروجہ وقت صحیح گورنمنٹ قرار دیتی اور تمام عاملانہ اور وضع آئین و قوانین کے اور عدالتی اختیارات اپنے ہاتھوں میں لیتی ہے۔" اگرچہ یہ مجلس، محض براہ نام و نمود، خلیفۂ اسلام کی وفادار رہی، مگر دنیاوی اختیاراتِ شہنشاہ و سلطان ٹرکی کو اُس نے بالکل ختم کر دیا۔ یوں وہ سلطنت ختم ہو گئی، جو عثمان سے شروع ہو کر چھ سو برس سے اب تک نسلاً بعد نسلٍ ایک ہی خاندان میں چلی آتی تھی۔[1]

---

[1] شاید یہاں یہ کہہ دیا جاتا زیادہ موزوں ہوتا کہ ان سلاطین کی جگہ ٹرکی نے ایک نیا جنم لیا۔ (مترجم)

اس قومی مجلس نے اپنے پہلے ہی اجلاس میں دو دستور العمل (ایکٹ) بنا دئے، جن کی وضع ہی اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ اس نئی حکومت کی صورت، مقصود اور کام کیا ہوگا۔ ان میں سے پہلے ایکٹ میں اُس قومی عہد و پیمان کی تصدیق و توثیق کی گئی جس کا میں اوپر ذکر کر آیا ہوں اور وہی جدید ٹرکی کا اصل اصول حکومت قرار پایا۔ دوسرے ایکٹ کے مطابق کانسٹی ٹیوشنل لا قرار پایا۔ یہ لا تمام دنیا میں یکتا ہے؛ اس کے موافق ترکوں میں نہ مانرکی ہے[1] نہ ری پبلک[2]، نہ کوئی بادشاہ ہے نہ پریزیڈینٹ۔

۱۱ رمئی کو اتحادیوں نے سیورے کا عہدنامہ بہ ہمہ نوع مکمل کرکے فرید کے پاس بھیج دیا اور ان کو حکم دیا کہ جس قدر جلد ہوسکے اس کی اپنی گورنمنٹ سے منظوری لے دیں۔ میں پہلے بھی کہیں کہہ چکا ہوں کہ اس معاہدے کے مطابق تمام یوروپین ٹرکی، شتلجہ کے خط تک، یونان کو دی جانے والی تھی۔ جس کے معنی تھے کہ یونانیوں کی سنگینیں ایا صوفیہ کی مسجد کے میناروں سے نظر آسکتی تھیں؛ اس کے علاوہ سلطان اپنے باڈی گارڈ میں سو آدمیوں سے زیادہ نہیں رکھ سکتے تھے؛ آبنائے کے دونوں طرف ایک وسیع علاقہ چھوڑا جانے والا تھا، جو بین الاقوامی ماتحتی میں رہتا؛ آرمینیہ، سلیشیا اور سمرنا نکال لینے کے بعد ایشیاء کوچک کا جو حصہ رہ جاتا وہ دوامًا اتحادیوں کے فوجی، مالی اور اقتصادی انتظام میں رہتا۔

قسطنطنیہ میں کوئی پارلیمنٹ تو رہ ہی نہیں گئی تھی، مگر فرید اپنے دل و دماغ کو کسی قانون کی پابندی کی تکلیف نہیں دیا کرتے تھے؛ اُنھوں نے فورًا اپنی بڑے بڑے نام و نمود کے ترکوں کو، جو اُن کے ہم زبان تھے، یلدیز کوشک میں بلا بھیجا کہ وہ اس معاہدے کو منظور کرکے اُس کی توثیق کردیں۔ وہاں جو کچھ کارروائی ہوئی وہ بالکل خلاف ضابطہ تھی، مگر فرید اپنے برطانوی آقاؤں سے کہہ سکتے تھے کہ "دو دوستوں کے درمیان قانون و ضابطے کی ضرورت ہی کیا ہے؟" اُنھوں (فرید) نے اس عہدنامے پر کسی بحث کی اجازت نہیں دی اور یہ حکم دیا کہ جو لوگ اس معاہدے کے موافق ہیں، وہ کھڑے ہو جاویں۔ چوں کہ اُن کو معلوم تھا کہ اس معاملے میں اتفاق رائے نہ ہوگا اور فتنہ و فساد پیدا ہو جاوے گا اس لیے اُنھوں نے سلطان کے کان میں کہہ دیا کہ "حضور بھی کھڑے ہو جاویں۔" سلطان محمد ششم ہزار کمزور اور غیر مستقل طبیعت کے آدمی تھے، مگر تھے تو پادشاہ ظل اللہ اور خلیفۂ اسلام؛ وہ کھڑے ہوئے تو تمام حاضرین اُن کی تعظیم کے لیے کھڑے ہوگئے۔ بس یہ عیار وزیر اعظم صاحب اتنی

[1] Monorchy بادشاہی حکومت۔
[2] Republic یا جمہوریہ

ہی بات تو چاہتے تھے؛ اُنھوں نے فوراً اس کا اعلان کر دیا کہ اس عہدنامے کو سب نے۔ یہاں تک کہ سلطان نے بھی۔ متفقہ طور پر کھڑے ہوکر مان لیا۔ مگر ایک گرگِ باراں دیدہ، بوڑھے سپاہی، فیلڈ مارشل علی رضا پاشا، نے فوراً کانپتی ہوئی آواز میں فرید کو ٹوکا اور کہا کہ تمام حاضرین اس معاہدے کی توثیق کے لیے نہیں، بلکہ سلطان کی تعظیم کے لیے کھڑے ہوئے تھے؛ نیز یہ کہ اس انجمن کو اس مسئلے کے فیصلہ کرنے کا کوئی حق نہیں تھا؛ اور اگر حق ہوتا بھی تو وہ اس معاہدے کو اس وقت تک منظور نہیں کر سکتے، جب تک کہ وہ پارلیمنٹ جو انگورہ میں ہے منظور نہ کرے۔ اُنھوں نے کہا کہ حقیقت یہ ہے کہ تمام ایشیاء کوچک اسی معاہدے کے خلاف بغاوت کیے ہوئے ہے۔ لیکن فرید پاشا جو حکم اُس کے آقا نے دیا تھا، اُس کی تعمیل فرض تھی، اُس نے پھر بآوازِ بلند یہی کہا کہ "جہاں تک میرا تعلق ہے اس معاہدے کو سب نے منظور کر لیا ہے؛ باقی رہا ایشیاء کوچک وہ جہنم میں جاوے!" اگرچہ اس معاہدے پر ۱۱ اگست ہی کو فرید کے بھیجے ہوئے دو نمایندوں نے دستخط کر دیے تھے، مگر یہ بات بالکل صاف ظاہر ہوگئی کہ اس کی توثیق انگورہ کی مجلس ملی ہرگز نہیں کرے گی اور ٹرکی کی اصل گورنمنٹ وہی تھی۔ ؎۲

اس نے اتحادیوں کو سخت پریشانی اور اضطراب میں ڈال دیا۔ انگلستان، فرانس اور اٹلی چار برس کی لڑائی سے تھک چکے تھے؛ نہ اُن کے پاس اتنے آدمی رہ گئے تھے، نہ اتنا روپیہ کہ وہ اندرونِ اناطولیہ میں ایک محبِ ملک، جنگجو اور مرنے مارنے، آزادی لینے پر تہیہ کیے ہوئے لوگوں سے اُن ہی کے ملک میں ایک ایسی طویل جنگ میں پڑ جاتے جس میں بہت زیادہ خرچ تھا۔ اس کے علاوہ اُن ملکوں کی گورنمنٹ نے بہت جلد یہ معلوم کر لیا کہ وہاں کی رائے عامہ بڑی سختی کے ساتھ یہ تھی کہ ایسے جھگڑے میں پھنسنے کا اقدام نہیں کرنا چاہیے۔ اصل بات یہ تھی کہ مغربی یورپ کے لوگوں کو جنگ کا کافی سابقہ پڑ چکا تھا، وہ تھک چکے تھے۔ جب یہ امر صاف ظاہر ہو گیا کہ یورپ کی کوئی بڑی سلطنت، ترکوں کو سزا دینے کی مہم کو اختیار نہیں کرنا چاہتی، تو یونانیوں کے وزیر وینی زیلوس نے یہ دیکھا کہ اُس کو جو فوائد اس جنگ سے حاصل ہوئے ہیں اور جو ملک اُس کو ملے ہیں، وہ معرضِ خطر میں

؎۱ مقابلہ کیجیے غرناطے کے اُس واقعہ سے جب ابو عبداللہ، آخری تاجدار غرناطے کو عیسائیوں کے حوالے کرنے پر تیار ہو گیا تھا تو ایک جنرل "بزدل بادشاہ" سے یہ کہہ کر چلا گیا تھا کہ مجھ سے یہ گوارا نہ ہوگا کہ مسلمان ذلت کے ساتھ مارے جاویں اور ان کی خواتین کی بے عزتی کی جاوے، وغیرہ وغیرہ (مترجم)

؎۲ اس خصوص میں مسٹر کلیبر اوس کے مضامین رسالۂ "کرنٹ ہسٹری" میں ملاحظہ فرمائیے۔

ہیں؛ اس لیے اُس نے یہ اعلان کیا کہ وہ ترکوں کو زیر کرنے کی مہم اپنے سر لینے کو تیار ہے۔ اب کیا تھا؛ لائڈ جارج نے بڑے جوش کے ساتھ اس تجویز کا خیر مقدم کیا۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں اگر برطانیہ کو مغربی ایشیا میں اپنی اولوالعزمیوں اور بلند نظریوں کو پورا کرنا ہی تھا، تو وہ اس کو ہرگز گوارا نہیں کر سکتا تھا کہ پرانی عثمانیہ سلطنت کی قبر میں سے ایک نئی، متحدہ اور طاقتور ٹرکی پیدا ہو جائے؛ اس لیے اس پر تعجب نہیں کرنا چاہیے کہ وینی زیلوس کی اس تجویز پر لائڈ جارج کی گورنمنٹ نے اتنا جوش دکھلایا۔ بہ قول "ایک گواہ" کے جب تک یونان میں جان باقی تھی، برطانیہ ترکی قوم پرستوں سے لڑنے کو تیار رہی۔

یہ بات اب تک ظاہر نہیں ہوئی کہ لائڈ جارج نے یونانیوں کی کس حد تک مدد کرنے کا وعدہ کیا تھا؛ مگر اس میں کسی شبہہ کی گنجایش نہیں ہے کہ اُس نے وینی زیلوس سے یہ وعدہ کر لیا تھا کہ برطانیہ عظمیٰ اُس کو اخلاقی مدد دے گی؛ یہ یقین کر لینے کے بھی دلائل موجود ہیں کہ اُس نے اس پر اتفاق کر لیا تھا کہ وہ یونان کو روپے پیسے اور سامان حرب سے مدد دے گا۔

ناظرین نے شاید اس کو خیال کیا ہو گا کہ سنہ ۱۹۲۰ء کے شروع کے بعد کے جتنے واقعات میں نے بیان کیے ہیں، اُن میں، میں نے، ہر جگہ بہ جائے "اتحادیوں" کے "برطانیہ" لکھا ہے۔ میں نے یہ اس واسطے کیا ہے کہ اتحادیوں اور ترکوں کے درمیان جو جھگڑا تھا وہ اُس وقت کے بعد ترکوں اور برطانیہ کا ہو گیا تھا؛ کیوں کہ فرانس اور اٹلی، دونوں، لائڈ جارج کی قیادت سے اس لیے نکل گئے کہ اُن کو اُس کی پالیسی پسند نہیں تھی۔

فروری سنہ ۱۹۲۰ء میں قوم پرستوں کی فوجوں نے فرانس سے سلیشیا میں لڑنا شروع کر دیا تھا۔ یاد ہو گا کہ سائکس۔ پکاٹ کے عہد نامے کے مطابق یہ حصۂ ملک فرانس کو بخش دیا گیا تھا۔ اُنھوں نے فرانس کی فوج محافظہ کو شکست دے کر نکال باہر کیا۔ اور شہر مرعش پر قبضہ کر کے ارمنیوں کا قتل عام کر دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ارمنیوں نے ایک لیگ آف آرمینیہ قائم کر کے اپنے آپ کو فرانس کا معاون قرار دے لیا تھا اور ترکوں سے باغی ہو گئے تھے۔ ایک سال کی لڑائی کے بعد فرانس نے اس کو محسوس کیا کہ باوجود ترکوں کی مصمم مخالفت اور جنگ کے سلیشیا پر قبضہ رکھنے میں سوا نقصان کے کوئی نفع نہیں ہے، تو وہ اس قطعہ ملک کو خالی کر دینے پر آمادہ اور اپنی "علم برداری" کی حد کو بغداد ریلوے کے عدود تک محدود رکھنے کو خود بہ خود راضی ہو گیا۔ اس اثنا میں اٹلی نے جو یہ دیکھا کہ ایک طوفان خود اُس پر ٹوٹنے والا ہے، تو وہ جلدی کر کے عدلیہ سے پیچھے ہٹ گیا۔

فرانس اور اٹلی نے قوم پرستوں سے من سمجھوتا کر لیا، تو اب ایک نئی بات نے دنیا کو محو حیرت کر دیا؛ یعنی یہی دونوں سلطنتیں (فرانس اور اٹلی) ترکی کو یونان اور برطانیہ کے خلاف استعمال کرنے کے لیے اسلحہ و آلات حرب پہنچانے لگ گئیں! فرانس نے صرف یہی نہیں کیا کہ اُس نے اپنے لیے جو ذخیرہ (اسلحہ و آلات حرب کا) سابشیا میں جمع کیا تھا وہی قوم پرستوں کو دیا، بلکہ ہوا میں پرواز سکھانے کے لیے اپنے آدمی دیے۔ اس کے دو برس بعد تک فوجی ذخائر کی ایک تہ تھی کہ ترکی کی طرف جا رہی تھی؛ جو عدلیہ، مرسینا اور الگزنیڈر ٹیا کے راستے سے ہوتی ہوئی شام کی سرحد تک پہنچتی تھی۔ گمان تو یہ ہے کہ سوویٹ روس سے بھی یہ چیزیں آتی تھیں۔ جب مصطفےٰ کمال نے سنہ ۱۹۲۲ء کے موسم خزاں میں حملہ کیا ہے تو اکثر باتوں میں اُن کی فوج سامان حرب سے قریباً پوری طرح مسلح تھی۔

ایک سال کے بعد یونانیوں نے سمرنا پر قبضہ کرنے کے لیے ادھے سنہ ۱۹۲۱ء میں خشکی پر شاہ کانسٹن ٹین ٹن کی ذاتی نگرانی میں پیش قدمی کی۔ برطانیہ کی فوجی کمیشن ساتھ تھی۔ قوم پرست آہستہ آہستہ پس پا ہوگئے۔ موسم گرما میں یونانی فوج اناطولیہ ریلوے کے دونوں طرف، اسکی شہرے لے کرا فیوم قرا حصار تک پہنچ گئی۔ اس کے بعد دو برس برابر "بازی تائم" کی سی کیفیت رہی۔ اس نے ہوشیار و چالاک قوم پرست لیڈر کو اتنا موقعہ دے دیا کہ اُس نے اپنے بے پناہ ہتھیار پر، ایشیاء کوچک کے ایک کونے میں بیٹھ کر صیقل کر لی۔

ابتداء جنگ ہی میں ماہرین جنگ نے اس کو سمجھ لیا تھا کہ یونانیوں کے سپہ سالار نے لڑائی کا جو نقشہ بنایا ہے وہ بیہودہ ہے اور اُس کا انجام شکست فاش کی صورت میں ظاہر ہونے والا ہے۔ یونانی اندرون ملک میں بڑھتے تو اُن کی فوجی قطاروں کی گنجائش میں کمی آنی شروع ہوگئی اور ان پر زد پڑنے لگی۔ اُن کو کامیابی ہو سکتی تھی تو صرف اس طرح کہ وہ ترکوں کی فوج کو گھیرے میں لے کر اس کو ختم کر دیں۔ لیکن مصطفےٰ کمال بھلا یہ کب ہونے دیتے تھے؛ وہ پہلے ہی سے ہوشیار تھے۔ از رو ئے فن حرب اُن کی حالت نہایت مضبوط تھی۔ اُن کے پس پشت ایک وسیع اور اُن کا خیرخواہ ملک تھا جس میں وہ بے تامل دُور تک پس پا ہو سکتے تھے۔ اُدھر یونانیوں کی یہ حالت تھی کہ وہ جتنا بڑھتے تھے اُن کو اپنے سامان حرب و ضرب کو آگے لے جانے میں دقت بڑھتی جاتی تھی اس وقت بھی اُن کی یہ حالت تھی کہ بوجھ سے اُن کی کمر ٹوٹی جاتی تھی۔

یونانیوں کے مقابلے میں ترکوں کی جو سپاہ تھی وہ ہوائی سامان، بھاری توپ خانے، ٹینک، موٹری سامان حمل و نقل اور زمانہ حال کی ہر چیز کے لحاظ سے چوتھے درجے کی تھی؛ لیکن فوجی تجربوں،

افسروں کے حکم ماننے اور بہادری میں دنیا میں اپنا ثانی نہیں رکھتی تھی۔ تمام فوج جنگ آزمودہ سپاہیوں سے مشتمل تھی۔ مصطفےٰ کمال کے اکثر آدمی بارہ برس سے قریباً مسلسل لڑ رہے تھے؛ اُن کی پھٹی پرانی وردی کے سینے پر جو تمغے لگے ہوئے تھے وہ یہ ظاہر کرتے تھے کہ وہ پہلی یونان کی لڑائی، اٹلی کی لڑائی، بلقان کی پہلی اور دوسری لڑائی اور حجاز اور یمن کی بہت سی لڑائیوں میں لڑ چکے ہیں؛ وہ اُس فوج کے کُل سر سبد تھے جس نے برطانیہ اور فرانس کو گیلی پولی سے نکالا تھا؛ جس نے عراق عرب میں برطانیہ کی فوج بھر سے ہتھیار رکھوائے تھے؛ جس نے روسیوں کو قفقاز میں پس پا ہونے پر مجبور کیا تھا؛ جس نے فلسطین میں ایلین بی کے مقابلے میں معرکے جیتے تھے۔

ہم امریکی جو تعصب اور دعائیہ سے اندھے ہو رہے تھے اور میدان جنگ سے پانچ ہزار میل پر بیٹھے ہوئے تھے، مصطفےٰ کمال اور اُن کے پھٹے حال، چیتھڑے لگائے ہوئے، رفیقوں کو غدار، چھپ چھپ کر لڑنے والے جانور، اور باغی سمجھتے تھے، جو ایک منصفانہ اور خردمندانہ صلح کے راستے میں روڑے اٹکانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہم اُن کو خوں خوار اور قزاق کہتے تھے؛ اُن کو اتنا ذلیل سمجھتے تھے کہ ان کا مقابلہ کرنا بھی ہماری شان عزت کے منافی تھا؛ ہم کو اس امر سے سخت نفرت ہوتی تھی کہ وہ قوم جو شکست خوردہ، پٹی کٹی ہوئی ہے اور جس کو یہ سزا دی گئی ہے کہ وہ اپنی شکست کا اس طرح تاوان ادا کرے کہ اُس کے ملک کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جائیں۔ اتنی گستاخ ہوں ہو کہ وہ اپنا سر اُٹھا سکے۔ لیکن اُن کو جو کچھ کہئے، یا سمجھئے، امر واقعی تو یہ تھا کہ اناطولیہ والوں اور اُن "باغیوں" میں کوئی فرق نہ تھا، جو ڈیڑھ صدی ہوئی لیکسنگٹن[1] اور بنکر ہل[1] میں لڑے تھے۔ یہ حقیر و ذلیل قوم پرست بھی اُسی غرض سے لڑ رہے تھے جس غرض سے ہمارے جد اعلیٰ لڑے۔ جتنی فوج واشنگٹن کے مقابلے میں تھی اُس سے ان قوم پرستوں کے مقابلے میں سو گنی زیادہ طاقتور فوج تھی۔ یہ "باغی" اور یہ قوم پرست دونوں ایک ہی مقصد کے لیے لڑے؛ یعنی حق حکومت خود اختیاری اور حصول آزادی کے لیے۔

سنہ ۱۹۲۲ء کے موسم بہار تک ہر شخص کو صاف صاف معلوم ہونے لگا کہ اناطولیہ کی یہ "بازی قائم" زیادہ عرصے کے لیے جاری نہیں رہ سکتی؛ یا تو یونانیوں کو آگے بڑھنا چاہیے، یا واپس آ جانا چاہیے۔ پس پا ہونے کے معنی اگر یہ نہ ہوں کہ یونانی اُن تمام فوائد سے محروم کر دیئے جائیں جو انھوں نے اس وقت

---

[1] سنہ ۱۷۷۵ء میں ان دونوں مقامات میں انقلاب امریکہ کے موقعے پر امریکیوں اور انگریزوں کی لڑائی ہوئی تھی۔ انگریز ان محبان وطن امریکیوں کو "باغی" کہتے تھے، اور آج تک اسی نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اس جنگ میں "باغیوں" ہی کو فتح ہوئی تھی۔ (مترجم)

ایشیائے کوچک میں کچھ علاقے لے کر حاصل کیے ہیں، تو یہ معنی ضرور رکھتے کہ یونانیوں کی شہرت و عزت ختم ہو گئی؛ وجہ یہ تھی کہ یونان کے بادشاہ اور اُس کے مشیروں نے اپنی رعایا کو اصل کیفیت سے بالکل نابلد رکھا تھا۔ ان لوگوں کو خوف ہوا کہ پسپا ہونے میں یہ سارا راز کھل جاوے گا اور پھر اپنے وطن اور غیر ممالک میں جو رسوائی ہوگی وہ ظاہر تھی۔ لاچار، برطانیہ کی فوجی مشن کے اتفاق رائے سے یہ فیصلہ ہوا کہ اس نقصان اور بے عزتی کو ایک آخری کوشش کے داؤں پر لگا دیا جاوے اور جان توڑ کر ترکوں کا اس تیزی کے ساتھ مقابلہ کیا جاوے کہ قوم پرستوں کے مستقر پر قبضہ کر لیا جاوے۔ اس وقت کی کیفیت یہ تھی کہ ترک لڑائی سے پہلو بچانا چاہتے تھے: اس کا ثبوت یہ ہے کہ سنہ ۱۹۲۲ء کی بہار میں، اُنھوں نے اپنے ایک سفیر فتحی بے، کو کچھ تجاویز لے کر لنڈن بھیجا تھا کہ اُن کو گورنمنٹ برطانیہ کے سامنے پیش کیا جاوے۔ میں سمجھتا ہوں کہ من جملہ اور تجویزوں کے ایک تجویز یہ تھی کہ آبناؤ سے فوج ہٹا لی جاوے اور یونانی اناطولیہ سے ہٹا دیے جاویں۔ لیکن لائڈ جارج اور اس کا وزیر خارجہ، لارڈ کرزن (جو بڑا اور لایق ترین آدمی سمجھا جاتا تھا) بہ ظاہر یونانیوں کی ڈھونٹ بندی کے اثر میں آئے ہوئے تھے، اُنھوں نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ فتح کامل یونانیوں کے ہاتھ میں آئی ہوئی ہے؛ دونوں نے ترکوں کے سفیر سے ملنے ہی سے انکار کر دیا؛ وہ غریب کئی ہفتے برطانیہ کے دارالسلطنت میں پڑا رہا اور آخر مایوس ہو کر انگورہ آ گیا۔ فتحی بے نے آکر جو رپورٹ قوم پرستوں کے سامنے پیش کی اُس سے ان لوگوں کو صاف ظاہر ہو گیا کہ انھیں انگلستان سے رحم و کرم کی امید نہیں رکھنی چاہیے۔ لاچار و مجبور ہو کر مصطفےٰ کمال نے اپنے آخری اور سب سے بڑے حملے کی تیاری شروع کر دی۔

جب یونانیوں نے پیش قدمی شروع ہی کی ہے تو اُن کا اس وجہ سے دل بڑھا کہ اُنھوں نے قوم پرستوں کی فوج پسپا کر کے اپنے گھیرے میں لے لیا تھا اور اُن کا سخت نقصان کر کے اُن کو پسپا کر دیا تھا۔ لیکن انگورہ سے قریباً پچھتر میل پیچھے اور قریباً چالیس میل آگے، دریائے سقاریہ کے شمال و جنوب میں، مصطفےٰ کمال نے فوج کی کمان اپنے ہاتھ میں لے لی۔ یہاں یونانیوں نے پھر اپنی چالیں چلنی چاہیں: لیکن مصطفےٰ کمال نے اپنی فوج کو اُن پر ریل دیا۔ سقاریہ سے عبور کر کے کمال کی فوج کے جنوب میں یونانی ٹھیک مشرق کی طرف ترکوں کی فوج پسپا کی تلاش میں بڑھے؛ مگر بیکار۔ اب ترکوں کی فوج مشرقی و مغربی لائن میں، انگورہ سے قریباً پچاس میل کے فاصلے پر پہنچ چکی تھی؛ یونانی گھر گئے اور ایسے گھرے کہ اکیس[۲۱] دن تک اس گھیرے سے نکلنے کی جان توڑ کوشش کرتے رہے اور نہ نکل سکے۔ ایک وقت آنے والا ہے کہ یہ جنگ اور یہ کشش و کوشش دنیا کی فیصلہ کن لڑائیوں میں

شمار ہو گی۔ بہت جلد یہ ظاہر ہو گیا کہ ترکوں کی قوت کا بہت ہی کم اندازہ کیا گیا تھا؛ نیز یہ کہ یونانیوں کے سامان اعمال و انتقال کو آگے بڑھنے میں اتنی مصیبت پڑ رہی ہے، جو قابل برداشت نہیں؛ اور سب سے بڑی صورت یہ تھی کہ یونانی جہاں ہیں وہاں اب نہیں ٹھیر سکتے۔ اب کیا تھا! یونانیوں کی پس پائی شروع ہو گئی اور وہ اپنے پُرانے مقام اسکی شہر - افیوم لائن پر آگئے۔ اس پس پائی کے وقت یونانیوں کے سپہ سالار اعظم نے حکم دے دیا کہ اس موقعے پر جہاں جہاں سے سپاہی گزریں، اپنے دونوں طرف، ملک کو تباہ و برباد کرتے چلے جائیں۔ یہ وہی ترکیب تھی جو جرمنوں نے اُس وقت اختیار کی تھی جب اُنھوں نے شمالی مشرقی فرانس کو خالی کیا تھا؛ بلکہ جرمنوں نے اتنا نہیں کیا تھا جتنا یونانیوں نے کیا۔ وہ اُن سے بہت آگے بڑھ گئے؛ یعنی اُنھوں نے ترکوں کے ایک سو گانوؤں سے زیادہ کو پورا پورا نہیں تو ادھورا تو برباد کیا ہی تھا، اُنھوں نے سخت بے رحمی کے ساتھ سیکڑوں غیر محارب ترکوں کا قتل عام کر دیا، اور اپنے پیچھے جو اپنی نشانی چھوڑی وہ زمین پر مظلوموں کے خون کے دھبے تھے اور فضا میں آتش زدہ گانوؤں کا دھواں تھا۔ یونانی اپنے آپ کو "زمانۂ حال کے جنگ صلیبی کے سپاہی" کہا کرتے تھے؛ یہ حالت تھی اُس مقدس فوج کی جس کو عیسائی انگلستان نے اس لیے مقرر کیا تھا کہ وہ اس کے حکم کو ترکوں سے منوا دے؛ یہ حالت تھی اُس مقدس فوج کی جس کے سامنے وہ جھنڈا جاتا تھا جس پر مسیح (علیٰ نبینا و علیہ السلام) کی صلیب چمک رہی تھی؛ یہ تھی وہ مقدس فوج جس میں ہزاروں مقدس مقتدایان مذہب عیسوی ثواب حاصل کرنے کے لیے شامل تھے[1]۔

۲۶ اگست کو یونانیوں کی فوج کا خاتمہ ہو گیا۔ ایک ہی دن میں یونانیوں کا نام و نشان بھی مٹ گیا۔ حقیر و ذلیل قوم پرست بلا شرکت غیرے، غیر متنازع طور پر میدان کے مرد اور مالک رہ گئے! اس کے بعد ساحل کی طرف خوف زدہ "بقیۃ السیف" کی بھگدڑ اور سمرنا کی تباہی شروع ہو دی شکست خوردہ، مارے کوٹے یونانی سپاہی اور غیر مسلمانی لوگ سخت ذلت کے ساتھ ایشیا کے باہر نکال دیے گئے؛ قسطنطنیہ میں جو عثمانی گورنمنٹ کا نام و نشان رہ گیا تھا، وہ بھی جلد ختم ہو گیا، سلطان خلیفہ کو مجلس اعظم ملیہ نے اپنے حکم سے معزول کر دیا اور وہ برطانیہ کے ایک جنگی جہاز میں بیٹھ کر اپنے چھوڑے دارالسلطنت سے رخصت ہوئے۔ اُن کی جگہ ایک دوسرے خلیفہ منتخب ہوئے، جن کو صرف دینی

---

[1] اگر زیادہ تفصیل دیکھنی ہو تو مسٹر گلیبر ٹائنس اور مسٹر آرنلڈ ٹائن بی کے مضامین "ویسٹرن کوئسچن ان گریس اینڈ ٹرکی" "کرنٹ ہسٹری" کے مرتب: مشمولہ رسالہ میں ملاحظہ فرمائیے۔

اختیارات حاصل تھے۔ سوا ایک تھوڑی سی برطانوی فوج کے، جو دردانیال پر پڑی ہوئی تھی، تمام ایشیائے کوچک، بحیرۂ اسود سے شام تک اور روس سے جزائر ایجی آن تک، پھر ترکوں کے ہاتھ میں آگیا۔

برطانی گورنمنٹ کو ہرگز یہ امید نہ تھی کہ یونانی فوج کو شکست ہوگی اور وہ اس کو چاہتی بھی نہ تھی؛ کیوں کہ اس کے معنی یہ تھے کہ اُس نے مغربی ایشیا پر قبضہ پانے کے بعد جو بڑے بڑے قلعے ہوا میں بنائے تھے وہ سب ٹوٹ پھوٹ کر برابر ہوگئے۔ برطانیہ کی بحری اور بری ملکی فوج فوراً دردانیال کی طرف روانہ ہوگئی اور چناق میں اُس نے اپنی محفوظ چھاؤنی ڈال لی۔ لائیڈ جارج کا دماغ بالکل خراب ہوگیا، اُس نے برطانیہ کے مقبوضات، یہاں تک کہ بلقان کی ریاستوں کی، خوشامد کی کہ ترکوں کو پسپا کردینے کے لیے کمکیں بھیجیں۔ امریکہ کے اخبار اور گرجاؤں کے منبروں پر سے دیوانہ پن ظاہر ہو رہا تھا اور وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر یہ کہہ رہے تھے کہ ترکوں کو یوروپ میں کبھی نہیں رہنے دینا چاہیے۔

لیکن یہ بات بہت جلد ظاہر ہوگئی کہ دنیا، جس میں حکومت برطانیہ بھی شامل ہے، جنگ سے بالکل تھک چکی ہے؛ جنگ کافی ہوچکی ہے۔ فرانس نے بجائے اس کے کہ انگلستان کی مدد کرتا بہت ہی جلد اپنی فوج دردانیال سے ہٹالی؛ اور اُس نے قوم پرست ترکوں سے اپنے دوستانہ تعلقات مضبوط کرلیے۔ اٹلی بڑا خوش ہوا کہ یونان مفلس اور بے عزت ہوگیا اور وہ اُس کی آیندہ کی خرابی کا منتظر ہو بیٹھا۔ جوگوسلاویا اور رومانیہ اپنے مصائب میں ایسے پھنسے ہوئے تھے کہ اُن کو اپنے ہم سایہ کی طرف دیکھنے کی فرصت نہ تھی؛ وہ ماسکو کی دھمکی سے ڈرے ہوئے اپنی فکر میں مبتلا رہے۔ چند ہفتوں کے بعد یونان اور برطانیہ عظمیٰ کے لوگوں نے صاف صاف الفاظ میں اپنی یہ رائے ظاہر کی کہ یہ جو کچھ ہوا ایک مجنونانہ فعل تھا؛ اور دونوں نے کانس ٹین ٹن اور لائڈ جارج کی گورنمنٹوں کا خاتمہ کردیا۔ کانس ٹین ٹن تخت سے اُتار دیا گیا اور وہ جلا وطنی ہی میں مرگیا۔ لائڈ جارج، جو فی الحقیقت اس مجنونانہ مہم کا اشتعال دینے والا تھا، خوش قسمت تھا کہ وہ ایک مہذب ملک کا باشندہ تھا۔ اس لیے جبراً سیاسی گم نامی میں پھینک دیا گیا۔ لیکن یونانی وزرا جو لائڈ جارج کے فریب میں آئے ہوئے تھے اور جنھوں نے برطانیہ کے وزیر اعظم کے وعدوں پر اعتبار کیا تھا کہ اُن کو برطانیہ کی مدد ملے گی، ایک سنگی دیوار اور جلادوں کی بندوقوں کی گولیوں کے درمیان مار ڈالے گئے۔ وہ گیا کریٹ کا رہنے والا وینی زیلوس، جس کی زبان زوری اور فصاحت و بلاغت اور ذاتی جادو کی سی کشش نے پیرس کی صلح کرانے والی جماعت کو ایسا مسحور کیا تھا کہ وہ اُس کی پالیسی کے حامی بن گئے تھے اور دوسروں کو نقصان پہنچا کر یونان کی حدود کو پھیلا ہوا دیکھنا چاہتے تھے، اس نے اپنی آنکھوں سے یہ دیکھ لیا کہ جو "خواب" یونان عظیم" کا اُس نے دیکھا تھا اُس کی تعبیر غلط نکلی اور اتنی

بڑی یونانی سلطنت دُھواں بن کر ہوا میں غائب ہوگئی اور اُس کے ساتھ ہی اُس ملک کی تمام عظمت خاک میں مل گئی۔ اگر وہ کچھ کم لالچی ہوتا، اگر وہ اپنی جوع الارض کو روکے رکھتا، تو شاید یہ کہنا بے جا نہ ہوتا کہ قوم پرست گروہ کو وہ عظمت و طاقت نہ حاصل ہوتی جو ہوگئی؛ اور آج بجائے ٹرکی کے یونان کے ہاتھ میں مشرق قریبہ کا توازن قوت ہوتا۔ صرف فصاحت و بلاغت اور ذاتی کشش ہی وہ چیزیں نہیں ہیں، جن سے آدمی سیاست داں بنتا ہے۔

نومبر ۱۹۲۲ء میں لوزان کے مقام پر ترکوں اور اتحادیوں کے درمیان گفت و شنید شروع ہوئی۔ یہ ۱۹۲۳ء کے جولائی تک برابر جاری رہی (درمیان میں ایک دفعہ وقفہ ہوا تھا) اور جب ختم ہوئی تو معاہدے پر دستخط ہی ہوکر ختم ہوئی۔ اس معاہدے کے مطابق ٹرکی کو پوری آزاد قوم تسلیم کرلیا گیا، کسی قسم کا اثر برائے نام بھی اُن پر نہیں رہا؛ نیز اُس کی حکومت کے حدود عراق عرب اور شام سے لیکر دریائے میرٹزا تک اور روسی ایرانی حدود سے لے کر بحر روم تک، بلا مداخلت غیرے تسلیم کرلیے گئے۔ لوزان کے عہد نامے پر دستخط ہونے کے یہ معنی ہیں کہ مشرق قریبہ میں ایک منصفانہ فیصلہ ہوا جس سے وہاں دوامی امن و امان ہوگیا۔

ان الارض للہ یورثہا من یشاء تعز من تشاء وتذل من تشاء بیدک الخیر
انک علیٰ کل شیئٍ قدیر

(مترجم)

قطعہ تاریخ وفات حضرت ریاض

(حضرت آمانی دیلوری)

چلے ہیں حضرت خیام عصر دنیا سے
تھے دُور آپ کی طینت سے نفس کے اغراض

ہوئی ہے خدمتِ فنِ ادب میں عمر تمام
رموزِ شعر و سخن سے بھری ہے اُنکی بیاض

ہر ایک آپ سے کہتا تھا یہ دَمِ تقریر
زبان آپ کی یہ چل رہی ہے یا مقراض

زبان سے ان کی نہ پہونچا کسی کو رنج کبھی
خدا نے ان کی طبیعت میں بھر دیا اِغماض

ادب سے لیتے ہیں نام ان کا آج اعدا بھی
کسی نے آج تک اُن سے نہیں کیا اِعراض

بنے تھے قال سے اپنے تو رند بادہ پرست
مگر جو حال کو دیکھا تو تھے فضیل عیاض

نشان میں نے جو پوچھا کہا آمانی سے
کہ اِن پہ فاتحہ پڑھیے۔ یہی ہے قبر ریاض

۱۳۵۳ھ

ایک المناک رومان

(جناب مولوی صادق الخیری صاحب بی اے دہلوی)

شام ہو چکی تھی۔۔۔۔

پادری فلبرٹ مسکراتا ہوا گھر میں داخل ہوا۔ اسکے چہرے پر اپنی بھتیجی ہیلی زی کی پیشانی کو بوسہ دیتے ہوئے کسی اندرونی مسرت کے آثار نمایاں تھے۔ قدرت نے ہیلی کو پرورش کے لیے اسکے سپرد کر دیا تھا اور کلیسائے نطرڈیم کے پادری ہونے کی حیثیت سے اس کو ایسے ذرائع میسر آگئے تھے جن کی وجہ سے اس نے ہیلی کو عمدہ تعلیم دلائی تھی۔ اور یہ تعجب انگیز تھا، کیونکہ گیارہویں صدی میں علم صرف مردوں تک محدود تھا، اور ان میں بھی صرف خواص کے لیے۔ ابتدائی تعلیم اس نے اپنی ان تھک کوششوں سے ارگنٹائل میں حاصل کی تھی اور یہاں اپنے چچا کے زیر نگرانی اس کے بڑھتے ہوئے شوق نے معلومات کے دائرے کو نہایت ہی وسیع کر دیا۔

بھتیجی کے اصرار پر فلبرٹ سے بھی ضبط نہ ہو سکا اور اس نے بڑے فخر سے ہیلی کو یہ خوشخبری سنائی کہ اسکی مزید تعلیم کے لیے وہ ایبے لارڈ جیسی شخصیت کی خدمات حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ ایبے لارڈ! فرانس کا سب سے بڑا معلم! فلسفے میں یکتا! دینیات میں فرد! جسکے شاگردوں کی تعداد ہزاروں تک پہونچ چکی تھی!!

فلبرٹ کی مسرت کی کوئی انتہا نہ تھی کہ اس کے دوست ایبے لارڈ نے اس کی تجویز منظور کر لی ہے اور وہ عنقریب آکر اس کا مہمان رہے گا اور اپنا کچھ وقت ہیلی کی تربیت پر صرف کرے گا۔

ہیلی نے اس کے استقبال کی تیاریاں شروع کر دیں اور جب وہ دونوں تنہائی میں ملے تو ایک ایسے زبردست رومان کا آغاز ہوا جس کی موسیقی میلوں دور بجنے والے گھنگھروں کی طرح اب بھی شیریں ہو کر ہمارے کانوں میں گونجتی ہے۔ ہیلی اٹھارہ سالہ دوشیزہ تحیر کن حسن کا مجسمہ تھی ایک ایسا غنچہ ناشگفتہ جس کی دلفریبی نے ایبے کو دل گرفتہ کر لیا تھا۔ ایبے کی عمر اس وقت اڑتیس ۳۸ سال کی ہوگی۔ وہ دونوں ایسی عمروں سے گزر رہے تھے جبکہ ایک تنہا ملاقات جذباتِ آتش فشاں تخلیق کر دیتی ہے۔ دماغی قابلیت کے علاوہ جسمانی خوبصورتی نے ایبے کو مسحور کر لیا اور اسی طرح سنہری آواز میں بولے ہوئے ایبے کے جادو بھرے الفاظ سے وہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہی۔

تعلیم؟ سوائے محبت کی طویل باتوں کے

اسباق ہی کیا ہو سکتے تھے۔ گھنٹوں وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ایسی ہی باتوں میں اپنا وقت گزارنے لگے۔ پھر بھی ہیلی کی تعلیم انگلستان کی خانقاہ میں ہوئی تھی جہاں عورت کا ایمان یہ تھا کہ وہ خواہشات سے احتراز کرے اور نفس پر قابو حاصل کرے مگر ..... دنیا کے تمام قوانین، مذہب کے سارے احکام، گرجا کے کُل اصول، بعد الموت آتشیں لپٹوں کی ہولناک سختیاں —— ان سب کی کیا حقیقت ہے جبکہ ایک عورت کا ہاتھ ایک مرد کے ہاتھ میں تھرتھرا جائے؟ اور اس طرح آبے نے حسین و جمیل ہیلی کو، جس میں مزاحمت و مخالفت کی کوئی طاقت یا خواہش نہ تھی، اپنے قوی بازوؤں کی آغوش میں لیکر الفت کے راگ الاپنے شروع کر دیے۔ وہ دونوں دنیا کو بھول گئے اور صرف محبت کرنا انکی زندگی کا مقصد رہنے لگا۔

(۲)

آبے نے اپنے جسم اور روح کو محبت میں ایسا منہمک کیا کہ اُسے شاگردوں اور لکچروں کا بھی خیال نہ رہا۔ فلسفہ، منطق، فقہ، الٰہیات، لسانیات، جنھوں نے اُسے وحید العصر بنا دیا تھا اب اس کے لیے کچھ وقعت ہی نہیں رکھتے تھے۔ اس کا بیشتر وقت محبت کی نغمہ سرائی میں گزرتا تھا —— افسوس یہ نغمے اب ہم سے ہمیشہ کے لیے چھین لئے ہیں۔

تھوڑے ہی عرصے میں دنیا ان کے عشق سے واقف ہوگئی —— لیکن بوڑھے پادری کو علم نہیں ہوا، اُس نے کبھی نہیں دیکھا، خیال تک نہ کیا، حالانکہ وہی سب سے قریب تر تھا، مگر اُس کو سب سے آخر میں خبر ہوئی۔ وہ غضبناک ہوگیا، اُسکے ماتھے کی نیلی رگیں اُبھر آئیں اور وہ طیش میں چلّا کر بولا "میرے ساتھ یہ فریب؟ مکّار نے مجھے ذلیل کر دیا۔ میں اس محبت کا (آہ! یہ تو انسانی قیاس اور خیالی گھمنڈ ہے) خاتمہ کرکے رہوں گا!" اس کا سخت دل جو مقدس اور مذہبی فضا میں پتھر ہو چکا تھا، اپنے ارادے کی تکمیل کے لیے ہر فعل پر مستعد تھا اور اس لیے آبے لارڈ لسانیات کا ماہر، مباحثے میں لاثانی، الفاظ کا جادوگر، اُس خشمناک پادری کے آگے بے بس ہوگیا اور اسی طرح ہیلی کے غمناک آنسو بھی فلبرٹ پر کوئی اثر نہ کر سکے۔

—— محب و محبوب جدا کر دیے گئے!

فلبرٹ، بوڑھی دنیا کی طرح جو اپنے عالم شباب کو محو کر چکی ہے، ان کی اس جدائی سے مطمئن ہوگیا۔ بھلا وہ کیسے جان سکتا تھا کہ عام نظر میں وہ دونوں صرف اس لیے ایک دوسرے سے لاپروا رہتے ہیں کہ تنہائی میں چھپ چھپ کر انکی ملاقاتیں ہو جاتی ہیں۔ جذبہ کلی ہے اور محبت پھول لیکن پھل؟ —— یہ "زندگی" ہے اور ایک دن خوفزدہ پرندے کی طرح ہیلی نے آبے سے یہ بات کہدی۔ اِدھر چچا کی خشمناک آنکھیں اسکے لیے

ناقابلِ برداشت تھیں۔ وہ سوچنے لگتی کہ چچا میرے شکم کو گھور رہا ہے، لیکن فلبرٹ کو اس کا گمان بھی نہ تھا، پھر بھی اس کا مخفی خوف کسی طرح کم نہ ہوتا۔

فرار ہی ان کا آسرا رہ گیا تھا، چنانچہ ایک رات کو جبکہ پادری کہیں گیا ہوا تھا، وہ دونوں پرٹینی روانہ ہوگئے اور جب تک پیرس کی سڑکیں نظر آتی رہیں وہ چوروں کی طرح پردے ڈالے گاڑی میں دبکے رہے۔ پرٹینی ایبے لارڈ کا آبائی وطن تھا اور اس کی بہن نے ہیلی زی کا نہایت محبت سے استقبال کیا۔ یہیں ہیلی کے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام استرولب رکھا گیا۔ فلبرٹ عزت پر جان دیتا تھا اور اُس کی رائے میں اسے حاصل کرنے کے لیے انسانی قربانی بھی جائز تھی، اُن دونوں نے رازدارانہ شادی کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن فلبرٹ کو اس سے کوئی اطمینان نہ ہوا۔

* * *

اس وقت ہیلی نے دنیا پر ظاہر کر دیا کہ اسکی فطرت نہایت بلند اور تقدس مآب ہے۔ بجائے اس کوشش کے کہ وہ شادی شدہ عورت کا مرتبہ حاصل کرے، اُس نے شادی کی خواہش ہی نہیں کی۔ اس قدر وقیع آدمی کی بیوی ہونا بڑا فخر تھا لیکن اُس کا دل اس سے بھی کسی بلند خیال کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ اس کے پیشِ نظر اس کی زبردست شخصیت، اسکا ہنگامہ پرور جوش، اس کی محبوب ہستی، اس کی تمام عمر آزادی شہرت، اور عزت تھی —— وہ ان کو داغ لگانا نہیں چاہتی تھی۔ ایک دن جبکہ خیالات کا بے پناہ سیلاب اُس کے دماغ میں گردش کر رہا تھا وہ سوچنے لگی "اگر خدانخواستہ شادی ہوگئی تو مذہب کو کس قدر نقصان پہنچے گا! فلسفہ نامکمل ہی رہ جائے گا! اور یہ کس قدر شرمناک امر ہے کہ وہ شخص جو تمام دنیا کے لیے پیدا ہوا ہے صرف ایک عورت کا غلام بن جائے؟ ..... کیا کوئی ایسا شخص ہے جو تفکر و فلسفے کی تعمیر یا کتب مقدسہ کے مطالعے کے لیے مخصوص ہوتے ہوئے بچے کے رونے، انا کی لوری، نوکروں کے آنے جانے اور اولاد کی بڑھتی ہوئی پریشانیوں کو برداشت کرے؟"

اس کا بے غرض انہماک ان چند فقروں سے ظاہر ہوتا ہے، جو اس نے ایبے کے نام اولیں خط میں لکھے:—

"میں نے اپنی خواہشات کا ..... کبھی خیال بھی نہیں کیا،

یہ صرف تمہاری ہی خواہشات تھیں، تم اچھی طرح جانتے ہو، جن کی تکمیل کو میں نے اپنا فرض سمجھا۔

اگرچہ "شریکِ حیات" کہلانا زیادہ مقدس اور اچھا معلوم ہوتا ہے لیکن میں ایک خادمہ بلکہ لونڈی ہی کہلانے کو ترجیح دیتی ہوں ......

کیونکہ میرا خیال ہے کہ جتنا میں اپنے آپ کو تمہاری خاطر دوسروں کی نظروں میں گرادوں گی اتنا ہی کم دھبہ میری وجہ سے تمہاری شہرت اور بڑھتی ہوئی عزت پر لگے گا۔"

باوجود اس قدر بلند خیالات اور پاک ثبوت کے جو اس نے اپنی محبت کا دیا، فلبرٹ نے ہیلی سے اصرار کیا کہ وہ رازدارانہ شادی ہی پر رضامند ہو جائے کیونکہ اس طرح کم از کم وہ اپنے بچے اسطرو کو بدنامی سے بچا سکیں گے۔

وہ پیرس واپس آگئے اور تھوڑے دنوں بعد فلبرٹ اور اُس کے چند دوستوں کی موجودگی میں ایبے لارڈ اور ہیلی زی کی شادی ہوگئی۔

(۳)

جوں جوں وقت گزرتا گیا بوڑھے پادری کی دشمنی حق بجانب ثابت ہوتی گئی، کیونکہ توقع کے خلاف ایبے پر غرور پوری طرح مسلط ہوگیا اور گھمنڈ میں آکر وہ اتنا اندھا ہوا کہ اپنے آپ کو بالکل آزاد اور قادر سمجھنے لگا۔ ایک موقع پر خیال خام میں سرشار ہوکر وہ کہنے لگا "میری شہرت کی کوئی ہمسری نہیں کرسکتا اور میں اس قدر جوان اور خوبصورت ہوں کہ جس عورت سے چاہے محبت کروں اور چاہے جس سے شادی۔ مجھے کسی کا خوف نہیں۔ فلبرٹ نے اپنی بھتیجی کو میرے حوالے کردیا اور مجھ سے توقع کی کہ میں اپنا خالی وقت اس کی تعلیم پر صرف کروں

آمدا وہ محبت کے افسانے پڑھنے لگی اور پھر..... خوب ہوا"۔ غرض اس قسم کی فضول باتیں ایک اخلاقیات کے اُستاد کے قلم سے نکلنے پر تعجب ہوتا ہے۔

فلبرٹ سخت تکلیف اور پریشانی کے عالم میں تھا۔ اُسے ہیلی سے بڑی محبت تھی، بچپن سے پالا پوسا، پڑھایا لکھایا۔ اور جب وہ تعلیم یافتہ ہوکر جوان ہوگئی تھی، اسے پوری مسرت نصیب ہوئی کہ جو کام ۲
قدرت نے اس کے سپرد کیا تھا وہ پورا ہوگیا۔ اس نے اس کی پرورش و تعلیم پر اپنی زندگی صرف کردی اور جب پھل پک کر تیار ہوگیا تو ایک اجنبی آگے بڑھا کہ اُسے توڑ لے۔ یہ بھی برداشت ہوسکتا تھا لیکن اجنبی سنگدل تھا۔ ہیلی ایبے پر قربان ہونے کے لیے تیار رہتی، لیکن وہ اپنے غرور پر پھولا ہوا تھا اور اس چیز نے فلبرٹ کی نگاہ میں اُسے رہزن بنادیا مگر ایبے کے لیے ہیلی پھر بھی ڈھال تھی اور اس لیے اُسے نقصان پہنچانا مشکل تھا۔ جب فلبرٹ کو یہ علم ہوگیا کہ اُس کی بھتیجی ایبے کی ہر کفرانی اور خودغرضی خواہش کی تکمیل اپنا ایمان سمجھتی ہے تو اس کا قلب سراسر نفرت و حقارت کا مرکز بن گیا اور اس کی روح کی بالیدگی نفرت و تحقیر کے خونیں پھول کھلانے لگی۔

ایبے نے فلبرٹ سے وعدہ لے لیا تھا کہ شادی کی تشہیر نہ ہوگی۔ کچھ عرصے تک اُس نے اپنا وعدہ نبھانے کی کوشش کی مگر ایبے کی بدعنوانیاں اب ناقابل برداشت ہوگئی تھیں۔ چنانچہ لوگوں کو ایبے اور ہیلی کے رشتۂ ازدواج کا علم ہوگیا۔

آیبے اس پر غضبناک ہوگیا لیکن ہیلی نے اُسے اطمینان دلایا۔ اور جب اُسے یقین ہوگیا کہ معصوم ہیلی اُسے خوش کرنے کے لیے ہر مصیبت کا سامنا کرلیگی تو اُس نے شادی ہی سے انکار کردیا۔ اس سے فلبرٹ کو نہایت رنج ہوا اور یہ سُن کر اُس کے غم کی کوئی انتہا نہ رہی کہ اس کی عزیز بھتیجی نے زندگی کی مقدس ترین قسم کھالی ہے کہ وہ ایبے لارڈ کی بیوی نہیں بلکہ خادمہ ہے۔

فلبرٹ نے ہیلی کی (وہ ہیلی جو جھوٹ بولنے کی ہمت اور قابلیت سے تامر تھی) آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ایک دفعہ اور پوچھا "کیا تیری شادی نہیں ہوئی؟" اُس نے صاف کہدیا "نہیں!" فلبرٹ غضبناک ہوگیا —— قہر آلود خشمناک!!

(۴)

بُت پرس، محب اعظم، وحید العصر ایبے نے ستم ہی کردیا۔ جن دنوں فلبرٹ غصہ و غم کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ ایبے نے ہیلی کو ترغیب دی کہ وہ ارگنٹائل چلی جائے جہاں اُس نے ابتدائی تعلیم حاصل کی ہے، تاکہ پریشانیٔ دماغ کو سکون حاصل ہو، لیکن وہاں پہونچ کر خلاف توقع ہیلی کو تلخ اور مایوس کُن تجربہ ہوا —— ایبے لارڈ اُسے خانقاہ میں رہنے اور راہبہ بننے پر مجبور کر رہا تھا! ہیلی نے اپنے بچے کو ایبے کی بہن کے سپرد کرتے وقت ہی دل میں ایک ڈگر اسا محسوس کیا تھا اور اب وہی ہوکر رہا جس کا اُسے ڈر تھا۔ جب فلبرٹ کو علم ہوا کہ وہ خانقاہ بھیجدی گئی ہے تو اُس کے غصے اور صدمے کی انتہا نہ رہی اور اُسے یقین ہوگیا کہ ایبے اس سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا ہے۔

"تو وہ اس کو راہبہ بنادے گا..... خانقاہ میں رہنے والی..... ایک راہبہ!" یہ خیال تھا جس نے اُسے ایک شیطانی اور کریہ ارادے پر آمادہ کرلیا اور وہ یہ کہ "میں اُسے راہب بنا کر چھوڑونگا"۔ اور اپنے ارادے کی تکمیل کے لیے اُس نے بدمعاشوں کو ایبے کے پیچھے لگادیا، جنھوں نے ایبے کے ملازم کو روپیہ دے کر اپنی سازش میں شریک کرلیا اور اسکی مدد سے کمرے میں گھُس کر رات کے وقت اسکے جسم کو بُری طرح زخمی اور صورت کو مسخ کردیا اور اس طرح ایبے جسمانی طور پر بالکل ناکارہ ہوگیا۔ جوان و خوبصورت مرد کی جوانی مرجھا گئی اور وحید العصر کا غرور خاک میں مل گیا.... تھوڑے ہی عرصے بعد وہ بھی سینٹ ڈینس کی خانقاہ میں شریک ہوگیا۔ ہیلی زی راہبہ بن گئی —— ایبے لارڈ راہب بن گیا!!

ان دونوں کی خط و کتابت سے معلوم ہوتا ہے کہ ہیلی زی ہمیشہ ایبے کی محب اور وفادار رہی اور خانقاہ ارگنٹائل کی راہبہ ہونے کے باوجود اسکے محبت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ غمناک الفت نے اسکے دل و دماغ پر اپنا جال بچھا دیا تھا اور اسکے بربط روح کے مجروح تار ہمیشہ محبت کی موسیقی زیا

کانپتے رہے۔ اسکے ایک خط میں چند فقرے نقل کیے جاتے ہیں جو اُسکے جذبات کے صحیح ترجمان ہیں

"تم معبد میں شریک ہوے اور میں بھی —
بلکہ میں نے ہی پہل کی۔ لیکن تم نے پہلے مجھے
راہبہ بننے پر مجبور کیا — اس قدر بدگمانی؟
تمھاری قسم، مجھے اس سے دلی صدمہ ہوا۔
خدا بہتر جانتا ہے کہ اُس سے زیادہ مجھے
تمھاری پرواہ رہی اور اُس سے زیادہ تمھیں خوش
رکھنے کا مجھے ارمان رہا۔ تم نے صرف کہا ہی تھا
کوئی خدائی احکام تو تھے ہی نہیں
اور میں نے راہبہ بننا فوراً قبول کرلیا۔
مجھے صرف یہ بتادو کہ تم مجھے اتنی جلد کیوں
بھول گئے۔

۱۹۲۷ء میں حکومت نے خانقاہ ارگنطائل پر قبضہ کرلیا۔ چنانچہ تمام گوشہ نشیں زاہد خواتین وہاں سے چلی گئیں اور دو سال تک ادھر اُدھر ماری ماری پھرتی رہیں۔ اس مصیبت کو دیکھکر ابیے لارڈ نے اپنی نئی عمارت اُن کی سکونت کے لیے پیش کی اور روحانی تلقین و تبلیغ کی غرض سے وہ خود وہاں آنے جانے لگا۔

ایک دفعہ ابیے نے خواہش ظاہر کی کہ اُسے اسی عمارت میں دفن کیا جائے۔ ہیلی جواب میں بولی "..... لیکن تمھیں دفن کرنے سے پیشتر میں تمھاری قبر میں اپنی لاش تہ خاک کرنے کی زیادہ آرزومند ہوں۔"

سولہ سال بعد ابیے کی خواہش پوری ہوگئی۔ یہ اپریل کا مہینا تھا۔ ہیلی نے اُس کی قبر پر پھولوں کی تمام دولت نچھاور کردی۔ وہ خود بھی زیادہ زندہ نہ رہ سکی اور تھوڑے ہی عرصے بعد ہیلی کی لاش دفن کرنے کے لیے مقبرہ پھر کھولا گیا۔

مئی کے مہینے میں جبکہ گلاب کے پھول اپنی فراوانی اور تعطر کی وجہ سے مرکز نگاہ بنے ہوتے ہیں اس عمارت میں جہاں ابیے اور ہیلی کی لاشیں دفن تھیں، پاک محبت کی شادی رچائی گئی اور تمام مقبرہ قرمزی پھولوں کا تختہ بن گیا۔ جسمانی طور پر بھی انکی شادی ناقابل تنسیخ ہوگئی اور اب گرجے کا کوئی قانون بھی انکو جدا نہیں کرسکتا۔ انکا مقبرہ غیرفانی حجلۂ عروسی ہے۔ (ترجمہ)

مرقوماتِ رقم

چاندنی رات ہے اے رشکِ قمر ہوش میں آ / چاند ہالے میں ہے تو بھی مرے آغوش میں آ
چھلکی پڑتی ہے گری پڑتی ہے میخواروں پر / سنبھل او بنتِ عنب ہوش میں آ ہوش میں آ
کشتِ اُمید مری خشک ہوئی جاتی ہے / ہاں یہی وقت ہے اے ابرِ کرم جوش میں آ
کوکبِ بختِ رقم تو ہے عبث گردش میں / کاش آویزہ بن اور اُنکی بُنا گوش میں آ

امیر علی رقم لکھنوی

دربار رامپور کے چار شاعر

(جناب مولوی محمد اظہار الحسن صاحب بی اے ایل ایل بی - وکیل)

ڈاکٹر ٹی گرہیم بیلی ایم اے - بی ڈی - ڈی لٹ لنڈن یونیورسٹی میں شعبۂ اُردو ہندی کے ریڈر ہیں - آپ نے انگریزی زبان میں اُردو ادب کی تاریخ پر ایک مختصر کتاب " اے ہسٹری آف اُردو لٹریچر " تصنیف کی ہے جس میں ۲۴۰ ارباب قلم کے حالات اور اُنکی تصانیف پر تبصرہ کیا گیا ہے - اس کتاب میں ان تمام تصنیفات سے استفادہ کیا گیا ہے جو ۱۹۳۲ء سے قبل ادبیات اُردو کے موضوع پر شائع ہو چکی تھیں اور ایک مختصر پیمانہ پر ضروری معلومات کو جمع کر دیا گیا ہے - سطور ذیل میں اسکے ایک حصہ کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے - شاید قارئین کرام اپنی مادری زبان کے چار سر برآوردہ کے متعلق ایک یوروپین محقق کے اظہار خیال کو دلچسپی کی نگاہ سے دیکھیں گے - اظہار

امیر و داغ

امیر احمد مینائی (۱۸۲۸-۱۹۰۰ء) اور نواب مرزا خاں داغ (۱۸۳۱-۱۹۰۵ء) میں ہم کو دو ہمعصر مقابل شعرا کی ایک اور مثال ملتی ہے سودا اور میر کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے وہ بڑی حد تک امیر و داغ پر بھی صادق آتا ہے - غدر کے بعد جب دربار لکھنؤ اُجڑ گیا تو تسلیم اور جلال کے ساتھ دربار رامپور کی زینت بنے - امیر اپنی استعداد علمی کی وجہ سے شوکتِ الفاظ پر قادر تھے - داغ فطری شاعر تھے - ان کی زبان نسبتہً زیادہ رواں، سلیس، اور بامحاورہ ہے - سودا کی طرح امیر کا درجہ قصیدہ میں بلند ہے - جسکے لیے پُر شکوہ اندازِ بیان لازمی ہے - داغ میر کے مانند عاشقانہ غزلوں میں فوق رکھتے ہیں جن کے لیے سوز و گداز اور سادگی زیادہ مناسب ہے - بدقسمتی سے دونوں بالخصوص داغ نے مبتذل اور رکیک مضامین سے اپنے دامان شاعری کو آلودہ کیا - امیر کے علم و فضل کا ثبوت انکی امیر اللغات ہے جسکا آغاز عظیم الشان پیمانہ پر کیا گیا تھا، لیکن ابھی دو ہی حصے چھپنے پائے تھے اور حرفِ اول (الف) بھی نامکمل تھا کہ لغت ختم ہو گئی - مذہبی موضوعات خصوصاً (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے میلاد، حیات، وفات اور سیرت پر آپ نے اکثر نظمیں لکھیں لیکن ان میں زیادہ کامیابی نہیں ہوئی - ان میں صحیح شاعرانہ جوش مفقود ہے اور راسخ العقیدہ مسلمانوں کے نزدیک وہ محض رسمی ہیں اُن میں گرمی نہیں - انکی غزلوں کا پہلا مجموعہ ۱۸۵۷ء کی شورش میں برباد

ہو گیا اس لیے ان کے دوسرے دیوان مرآۃ الغیب ہی کو عام طور پر پہلا دیوان سمجھا جاتا ہے۔ اسکی تکمیل کے بعد اُن کو خیال ہوا کہ اس رنگ کی شاعری کا دَور ختم ہو چکا ہے۔ اُنھوں نے محسوس کیا کہ انکے دوست اور حریف داغ کو انکی بہ نسبت زیادہ قبول عام حاصل ہے۔ اُنھوں نے اپنا طرز بدل لینے کا عزم کر لیا۔ اس عمر میں یہ چیز بہت دشوار تھی لیکن انکے متعلق مشہور تھا کہ بڑھاپے کے ساتھ انکی طبیعت جوان ہوتی جاتی تھی۔ داغ کی تقلید میں اُنھوں نے سادگی اختیار کی اور روزمرہ لکھنا شروع کیا۔ بعض نقاد انکے دوسرے دیوان صنم خانۂ عشق کو پہلے دیوان پر ترجیح دیتے ہیں لیکن اس پر عام اتفاق ہے کہ وہ داغ کا جواب نہ بن سکے۔ اور یہ امر تعجب خیز بھی نہیں۔ داغ مختصر غزلوں کے اُستاد تھے۔ آپ کا تیسرا دیوان "محامد خاتم النبیین" کے لیے وقف ہے (شاعری کی یہ صنف نعت کہلاتی ہے) ان کے گراں بہا مکاتیب کے مجموعہ کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے جن کے شایع کرنے کا خیال غالباً رقعات غالب کی اشاعت سے پیدا ہوا۔ انکے تذکرہ "انتخاب یادگار" (۱۸۷۳ء) میں رامپور کے شعرا کے حالات و سوانح درج ہیں۔ یہاں برسوں رہنے کے بعد وہ عازم حیدرآباد ہوے اور وہاں پہونچنے کے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد انتقال کر گئے۔

داغ کا مرتبہ اُنکے ہموطن ارباب ادب کی نگاہ میں بہت بلند ہے۔ بہتوں کے نزدیک تو وہ اُردو کے بہترین بارہ شاعروں میں شمار کیے جانے کے قابل ہیں۔ وہ سلیس اور خوبصورت زبان نہایت روانی سے لکھتے ہیں اور صحیح محاورات کے تو گویا دریا ہیں لیکن جذبات کی گہرائیوں تک نہیں پہونچتے۔ بیسویں صدی تک بھی بقید حیات رہنے کے باوجود وہ عہد قدیم کے شاعر تھے۔ وہ ذوق کے شاگرد تھے۔ جن کا رجحان طبع دہلوی ہوتے ہوے بھی لکھنؤ کے رنگ کی جانب تھا۔ داغ کی شاعری کے دو دور ہیں۔ عہد رامپور اور عہد حیدرآباد۔ جب تک وہ رامپور میں رہے گرد و پیش کے شعرا کی تنقیدیں اُنھیں محنت سے شعر کہنے کی طرف مائل کرتی رہتی تھیں۔ اُنکی شاعری کا بہترین سرمایہ گلزار داغ، آفتاب داغ، اور فریاد داغ یہیں عالم وجود میں آیا۔ حیدرآباد پہونچنے کے بعد انھوں نے مہتاب داغ، یادگار داغ، اور اُس کا ضمیمہ مرتب کیا۔ یہاں وہ عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ ہر طرف قدردان ہی قدردان تھے۔ نکتہ چیں کوئی نہ تھا۔ اس لیے وہ کسی قدر بے پروا ہو گئے۔ اس سے انکی شاعری کو نقصان پہونچا۔ اُن کا شمار بہترین غزل گو شعرا میں ہے لیکن انکے متعلق رطب اللساں ہونا آسان نہیں۔

تسلیم ۱۸۱۹ء–۱۹۱۱ء | آپ کا اصلی نام احمد حسین تھا۔ لیکن امیر اللہ کے نام سے مشہور تھے۔ نواح فیض آباد

میں پیدا ہوئے۔ آپ کی ولادت کے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد آپ کا خاندان لکھنؤ منتقل ہو گیا۔ جہاں تلاش معاش میں آپ نے اپنی عمر کا کثیر حصہ گزارا۔ تنگدستی نے کبھی آپ کا ساتھ نہ چھوڑا۔ آپ لازمًا قدیم خیال کے طبقہ سے متعلق تھے۔ آجکل آپ کی شاعری کو زیادہ پسند نہیں کیا جاتا۔ آپ کی تصنیفات میں آٹھ مثنویاں (جن میں نالۂ تسنیم، صبح خنداں، اور دل و جان زیادہ مقبول ہیں) سفرنامۂ نواب رامپور (اس میں نواب رامپور کے سفر کی طویل روداد تقریبًا پچاس ہزار اشعار میں منظوم کی ہے غیر مطبوعہ ہے) اور پانچ دیوان تھے جن میں سے ایک ہنوز طبع نہیں ہوا۔ ایک نام غدر میں جاتا رہا۔ تین نظم، حمد، نظم دلفروز اور دفتر خیال کے نام سے چھپ گئے ہیں۔

نظم دلفروز میں تقریبًا دو ہزار اشعار قصائد کے، گیارہ ہزار غزل کے اور تیرہ سو دیگر اصناف سخن کے ہیں۔ دفتر خیال کا حجم اس سے نصف ہوگا اس میں صرف مختصر غزلیں ہیں۔ نظم ارجمند آپ کی غزلوں کا بہترین مجموعہ ہے۔ آپ کے قصیدے کا انداز بھی [illegible] ہے۔ شعرائے رامپور میں بہترین مثنوی گو شاعر تھے۔ آپ کی زبان [illegible] اور تخئیل میں قوت تھی۔ آپ کے شاگردوں کی تعداد کثیر ہے جن میں سے سر برآوردہ مشہور مقرر حسرت موہانی ہیں۔

ضامن علی جلال ۱۸۳۴ - ۱۹۰۹ء

دربار رامپور میں عروض و قواعد دانی کے لیے مشہور تھے۔ چار دیوانوں کے علاوہ جن میں قصائد اور غزلوں کے اشعار کی مجموعی تعداد تقریبًا بیس ہزار ہے۔ زبان پر آپ کی متعدد تصانیف ہیں۔ ان میں سے بعض کم و بیش سو صفحے کے مختصر رسالے ہیں۔ مفید الشعرا تذکیر و تانیث پر ایک رسالہ ہے سرمایۂ زبان اردو محاورات کا قابل قدر مجموعہ ہے۔ قواعد المنتخب میں تغیر الفاظ پر بحث کی گئی ہے۔ انکے علاوہ آپ نے دو اردو لغات بھی تالیف کیں۔

یہ سمجھنا دشوار ہے کہ تسلیم اور جلال جیسے اشخاص کی شہرت کا انحصار کس چیز پر ہے۔ ان کے قصائد اور غزلیں سبھی ہیں۔ ان کے کلام کی خوبی جذبات کی گہرائی سے خرد ادا کی شوخی میں ہے۔ غزلوں میں وہی سنگدل ہلاکت پسند معشوق کی شکایتیں اور دل جلے عاشق کے مصائب کی داستانیں ہیں۔ اور انکے قصائد میں نازیبا تعریفیں۔ انکے لیے اردو شاعری کا عصر جدید ابھی شروع نہ ہوا تھا۔

جگت موہن لال رواں

(جناب مولانا سید علی نقی صاحب صفی لکھنوی ملقب بہ لسان القوم)

عاشقِ اردو جگت موہن رواں — نکتہ فہم و نکتہ سنج و نکتہ داں
بے تعصب پاک باطن خوش تمیز — وسعتِ اخلاق سے ہر دلعزیز
شاعرِ خوشگو وکیلِ کامیاب — لایق و فایق کمالات انتخاب
بے ریا مخلص شریف النفس نیک — درحقیقت آدمی لاکھوں میں ایک
کیا قیامت ہے وہی سرو رواں — اس طرح ہو جائے بے نام و نشاں
پاؤں ٹوٹیں مرگ بے ہنگام کے — دکھ دیا جس نے عوض آرام کے
گل کیا روشن چراغ اناؤ کا — ہو گیا تاراج باغ اناؤ کا
سروِ دلجو کی جوانی کا تھا وقت — یا یہ مرگِ ناگہانی کا تھا وقت
کیسے کیسے اُٹھ گئے یارانِ فن — اب ہے اک ماتم کدہ یہ انجمن
اعتبارِ زندگانی کچھ نہیں — ہے طلسم اک دارِ فانی کچھ نہیں
ہو چکی تھی گل ابھی اک شمع بزم — ہونے پائی تھی نہ خاطر جمع بزم
دوسری شمع اور سب گل ہو گئی — تیرہ دنیائے تخیل ہو گئی
اک سرا ہے یہ جہان بے ثبات — چند روزہ رہنے والوں کی حیات
قافلے کے قافلے پہنچے عدم — آہ اُنکا رنج و غم ہے اور ہم

تا کجا آخر صفی غم کیجیے
آئے دن کس کس کا ماتم کیجیے،

مجذوب کی بڑ

(جناب خواجہ سید عزیز الحسن غوری صاحب مجذوب بی اے اسسٹنٹ انسپکٹر مدارس)

ان کو تو نے کیا سے کیا شوقِ فراواں کر دیا
پہلے جاں، پھر جانِ جاں، پھر جانِ جاناں کر دیا

فکرِ این و آں نے جب مجھ کو پریشاں کر دیا
میں نے سر نذرِ جنونِ فتنہ ساماں کر دیا

دل قفس میں لگ چلا تھا پھر پریشاں کر دیا
ہمصفیرو تم نے کیوں ذکرِ گلستاں کر دیا

دردِ دل نے اور سب دردوں کا درماں کر دیا
عشق کی مشکل نے ہر مشکل کو آساں کر دیا

طبعِ رنگیں نے مری گُل کو گلستاں کر دیا
کچھ سے کچھ حسنِ نظر نے حسنِ خوباں کر دیا

زاہدوں کو بھی شریکِ بزمِ رنداں کر دیا
سیکڑوں کو دخترِ رز نے مسلماں کر دیا

جب فلک نے مجھ کو محرومِ گلستاں کر دیا
اشکہائے خوں نے مجھ کو گُل بداماں کر دیا

جاں سپردِ تیر اور خوں صرفِ پیکاں کر دیا
پاس جو کچھ تھا مرے سب نذرِ مہماں کر دیا

"ہر چہ بادا باد ما کشتی در آب انداختیم"
کر کے جرأت ان سے آج اظہارِ ارماں کر دیا

پھونک دی اک روح تو نے مجھ میں مری ہر آہ نے
دردِ دل نے میری رگ رگ کو رگِ جاں کر دیا

میرے بیچارہ گر کا دیکھے تو کوئی حسنِ علاج
محوِ دل سے انتہائے درد درماں کر دیا

جوشِ وحشت کی مرے دیکھو عجائب کاریاں
دشت کو ذرہ تو ذرے کو بیاباں کر دیا

زلف و رخ کو ڈھانکیے یہ بھی کوئی انداز ہے
اس کو حیراں کر دیا اُس کو پریشاں کر دیا

تو نظر آنے لگا، کی اس قدر گہری نظر
میں نے جس ذرے کو دیکھا ماہِ کنعاں کر دیا

تلخ کر دی زندگی شورش تری کچھ حد بھی ہے
اف مرے ہر زخم کو تو نے نمکداں کر دیا

جنکی اُستادی پہ خود حکمت کیا کرتی تھی ناز
ایک اُمی نے انھیں طفلِ دبستاں کر دیا

میں ہوں رندِ پاک باطن دامنِ تر کو نہ دیکھ
دخترِ رز کو بھی میں نے پاک داماں کر دیا

یہ تری زلفیں، یہ آنکھیں، یہ ترا مکھڑا، یہ رنگ
حور کو اللہ کی قدرت نے انساں کر دیا

چٹکلے چلبلے، اندر اندر، تو نے اے شوقِ نہاں
دل کو میرے رازدارِ حسنِ پنہاں کر دیا

ٹوٹ جاتے کیوں نہ ٹانکے زخم کے دیکھا غضب
شاملِ بخیہ مرا تارِ گریباں کر دیا

مجھ کو سوجھا بھی تو کیا **مجذوب** وحشت کا علاج
میں نے دل وابستۂ زلفِ پریشاں کر دیا

نظرے خوش گزرے

ماہ گزشتہ میں بھی باوجود تاکیدی ہدایات کے پرچہ وقت پر تیار نہ ہو سکا خانگی علالت کے سبب جو انتظام اکتوبر میں نہیں بن پڑا ممکن ہے کہ اس دفعہ کامیاب ہو جائے اسی امید میں حجم گھٹانے کا خیال ترک کر دیا گیا۔ لیکن اگر خدانخواستہ یہ پرچہ بھی تاخیر سے شائع ہوا تو دسمبر میں اسی نسخے پر عمل کرنا ہوگا۔

حیدرآباد کی عثمانیہ یونیورسٹی کا شہرہ تو سارے ملک میں ہے مگر ہمیں اس کی زیارت اب نصیب ہوئی۔ یونیورسٹی پہلے بیرون بلدہ کے سرکاری محکمہ جات سے قریب تھی مگر اب شہر سے بہت فاصلہ پر ہے اس سبب سے ابھی تک اس کا موقع نہیں ملا کہ یونیورسٹی کی آبادی میں رہ کر وہاں کی زندگی اور کام دونوں کا مطالعہ کیا جاتا مگر یونیورسٹی کے بدولت جو ذہنی انقلاب اور علمی تغیر حیدرآباد میں ہو گیا ہے اس کے اثرات ایسے نمایاں ہیں کہ یونیورسٹی کے حدود سے باہر بھی بخوبی محسوس ہوتے ہیں۔ اور یہ وہ چیز ہے جس کا اندازہ حیدرآباد سے باہر رہنے والوں کو صحیح طور پر نہیں ہو سکتا۔

یہاں کا تعلیمی نظام عرصہ تک مدراس یونیورسٹی کے ساتھ وابستہ رہا اور شاید یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ یہاں کے لوگ اس زمانہ میں اعلیٰ تعلیم میں کوئی نمایاں کامیابی نہ حاصل کر سکے۔ بلکہ اُس وقت جن لوگوں کے حالات اجازت دیتے وہ علیگڈھ کالج میں جا کر تعلیم حاصل کرتے تھے، مگر جیسے ہی عثمانیہ یونیورسٹی قائم ہوئی تشنگان علم دوڑ پڑے اور پندرہ سولہ برس کی قلیل مدت میں یونیورسٹی کے فارغین (یہاں کی اصطلاح میں ٹیلسانین) کی اتنی کافی تعداد ہو گئی ہے کہ حکومت کو اُن کے لیے ملازمتیں فراہم کرنا مشکل ہے اور تعلیم یافتہ بے روزگاروں کا مسئلہ پیدا ہو گیا ہے۔

حکومت نے یونیورسٹی ہی کے قائم کرنے پر قناعت نہیں کی بلکہ سابقہ غفلتوں کی تلافی کے لیے ابتدائی اور ثانوی تعلیم کی اشاعتِ عام پر بھی خاص توجہ کی اور محکمہ تعلیمات کی جدید تنظیم کا نتیجہ اس صورت میں نمودار ہوا ہے کہ ملک کے چپہ چپہ پر مدارس قائم ہو گئے ہیں اور ابتدائی تعلیم جبری اگرچہ نہیں مگر مفت ضرور کر دی گئی ہے جس کی وجہ سے آبادی کے تمام طبقات علی الخصوص غربا کے لیے تعلیم حاصل کرنے میں بڑی آسانی ہو گئی ہے۔

ریاست کے ذرائع آمدنی اگرچہ برطانوی ہند کے مقابلہ میں کئی وجوہ سے محدود ہیں مگر تعلیم کی مد

میں جس قدر سالانہ مصارف یہاں برداشت کیے جاتے ہیں لحاظ اوسط شاید ہی ہندوستان کے کسی صوبہ میں اس کی نظیر ملے۔ یہاں کی مجموعی آمدنی آٹھ کروڑ کے قریب ہے اور اس میں سے اسی لاکھ سے اوپر یعنی دس فی صدی سے زائد تعلیم پر صرف ہوتا ہے۔

تعلیم سے بیداری اور بیداری سے ترقی کے لیے بے چینی پیدا ہوتی ہے، اور اس بیداری و بے چینی کے آثار آج یہاں ہر طرف نظر آتے ہیں۔ سابقہ جمود و سکون ابھی کلیۃً مفقود نہیں ہے نہ رہنا ہے۔ جب تک پرانی نسل کی جگہ نئی نسل کامل جانشین نہ ہو جائے اس کی توقع بھی نہ کرنا چاہیے، تاہم حرکت اور شورش زندگی کی جو رفتار اس وقت دکھائی دیتی ہے وہ ہر حیثیت سے امید افزا ہے۔

عثمانیہ یونیورسٹی میں تعلیم کا ذریعہ اردو ہے اور حیدرآباد کی سرکاری اور دفتری زبان بھی۔ اور اس میں ذرا شبہہ نہیں کہ بمقابلہ سابق کے یہاں سب زیادہ صاف اردو بولی جاتی ہے اور عثمانیہ یونیورسٹی کے طیلسانین میں بعض اچھے اہل قلم بھی پیدا ہو گئے ہیں لیکن ابھی اس راہ میں بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ بول چال کی اصلاح میں تو یہ اہتمام مشکل ہے اس لیے کہ آبادی کا کثیر حصہ جاہل ہے اور ابھی عرصہ تک رہے گا۔ اسکے علاوہ جہاں مختلف بولیاں رائج ہوں ہیں وہاں زبان کی شستگی و نفاست کا برقرار رہنا آسان نہیں۔ پرانے محاورات اور قدیم لہجے عرصہ تک باقی رہتے ہیں۔ البتہ تحریری زبان کی درستی میں کامیابی ہو سکتی ہے اور اس بات کی کوشش ہونا چاہیے کہ ملک میں صحت و فصاحت کا جو مشترک معیار قائم ہو گیا ہے اہل حیدرآباد کی تحریریں بھی اسی معیار کے مطابق ہوں۔

ہمارا خیال تھا کہ عثمانیہ یونیورسٹی میں اردو زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے کے یہ معنی ہیں کہ یہاں کے جملہ طیلسانین صحیح اردو لکھ سکیں گے۔ لیکن جب بعض مطبوعہ تحریریں یہاں اس کے خلاف دیکھنے میں آئیں تو تعجب ہوا اور دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اردو میں جملہ علوم و فنون ضرور پڑھائے جاتے ہیں مگر سوائے اُن طلبہ کے جن کا مضمون اردو ہوتا ہے بقیہ کے لیے اردو زبان و ادب کی تعلیم لازمی نہیں ہے بلکہ اُسکے بجائے انگریزی بطور لازمی مضمون کے پڑھائی جاتی ہے۔

برطانوی ہندوستان میں بھی اب رجحان اسی طرف ہے کہ علوم و فنون کی تعلیم دیسی زبانوں میں دی جائے۔ اور انگریزی کو بحیثیت زبان کے لازم کیا جائے۔ نیچے کے درجوں میں اب بھی یہی ہو رہا ہے۔ اور غالباً چند سال کے اندر کُل ثانوی تعلیم اسی نہج سے دی جانے لگے گی۔ اور بنگال میں جو کوشش کی جا رہی ہے اُس کو دیکھتے ہوئے تو یہ توقع بیجا نہ ہوگی کہ تھوڑے ہی عرصہ میں کلکتہ

یونیورسٹی میں اسی قسم کا انتظام ہو جائے گا جو اس وقت عثمانیہ یونیورسٹی کے لیے وجہ امتیاز ہے۔

حیدرآباد کے لئے یقیناً یہ امتیاز کچھ کم نہیں ہے کہ اُس نے ملکی زبان کو ذریعہ تعلیم قرار دینے میں کل ملک کی رہنمائی کی لیکن اگر عثمانیہ یونیورسٹی اس کا بھی اہتمام کرسکے کہ یونیورسٹی سے جو طیلسانین سند پاکر نکلیں وہ اُس زبان میں جو ذریعہ تعلیم بنائی گئی ہے صحت و روانی کے ساتھ اپنے خیالات قلمبند کرسکیں تو یہ علمی حیثیت سے اُن طیلسانین کے لیے نیز اہل ملک کے واسطے زیادہ مفید ہوگا۔

عثمانیہ یونیورسٹی کے طیلسانین اس وقت بھی حکومت کے مختلف شعبہ جات میں ممتاز عہدوں پر کام کر رہے ہیں اور وہ زمانہ آنے والا ہے جب ریاست کا سارا نظم و نسق انھیں لوگوں کے ہاتھ میں ہوگا۔ اور یہ امر مضحکہ انگیز ہوگا اگر سائنس، معاشیات، ریاضی اور فلسفہ کی اعلیٰ اسناد رکھنے کے باوجود وہ سرکاری تحریروں اور عدالتی فیصلوں کی عبارت بھی صحیح نہ لکھ سکیں۔

انگریزی، ہمارے نوجوانوں کے لیے بالکل غیر زبان ہے اور ظاہر ہے کہ بمقابلہ اردو کے اُس کی تحصیل میں کس قدر دشواری ہوتی ہے لیکن برطانوی ہند کی یونیورسٹیوں سے سند فراغ لیکر جو اصحاب مختلف محکموں میں جاتے ہیں وہ اگر سیدھی سادی مگر صحیح انگریزی لکھنا نہ جانیں تو کیسے نکو بنائے جاتے ہیں۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے طیلسانین بھی جب یونیورسٹی سے باہر نکلیں گے تو اسی معیار پر جانچے جائیں گے۔ ابھی تو وہ حدودِ ریاست کے اندر بند ہیں اور شاید کچھ روز اور رہیں۔ مگر حالات کی رفتار بتا رہی ہے کہ اُن کو ریاست سے باہر نکلنا ہوگا اور ملک کے مختلف حصوں میں کام کرنا پڑیگا۔ اُس وقت اگر اُن کی تحریریں معمولی سیدھی سادی مگر صحیح اُردو میں نہ ہوں گی تو لوگ کس درجہ اُن کی اور خود اُن کی مادرِ تعلیم کی ہنسی اُڑائیں گے۔

شستگی و فصاحت کا اثر ذہنی و دماغی نشو و نما پر بھی پڑتا ہے اور ادبی تعلیم کی یہی غایت اصلی ہے۔ اس لحاظ سے بھی ضروری ہے کہ عثمانیہ یونیورسٹی میں اُردو زبان و ادب کی تعلیم مثل لازمی مضمون کے دی جائے یا سند فراغ کے لیے اُردو میں صحت کے ساتھ تحریر کی قابلیت شرط قرار دی جائے۔

حیدرآباد سے ایک مذہبی رسالہ ترجمان القرآن نکلتا ہے جسکے ایڈیٹر مولوی ابوالاعلیٰ صاحب مودودی ہیں۔ صاحب موصوف کے بعض قابل قدر مضامین الناظر کے دور اول و ثانی میں نکل چکے ہیں اور عرصے تک جمعیۃ علمائے ہند کے اخبار الجمعیۃ کی ادارت بھی وہ کرتے رہے ہیں۔

ترجمان القرآن کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کو قرآنی تعلیم کی طرف دعوت دی جائے اور اسلام

کے احکام پر جو شبہات و شکوک بلکہ اعتراضات خود مسلمانوں کا ایک طبقہ کرنے لگا ہے اُن کی تردید متانت و سنجیدگی کے ساتھ عقلی و نقلی دلائل سے کی جائے۔

مولوی ابوالاعلیٰ صاحب جو کام کر رہے ہیں اُن کی تحریروں کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ اُس کے لیے جس قابلیت اور اہلیت کی ضرورت ہے وہ بدرجۂ اتم اُن میں پائی جاتی ہے۔ اور اگر ایسے لوگوں جن کے دلوں میں واقعی کچھ شکوک ہوں اُن کی تحریریں ملاحظہ کرنے کا موقع ملے تو سو میں ننانوے فی صدی اس کی امید کرنا چاہیے کہ ان کی تشفی ہو جائے گی اور وہ گمراہی سے بچ جائیں گے۔

ترجمان القرآن کے مطالعہ سے دیندار محظوظ ہوں گے، عام طور سے دینی معلومات میں اضافہ ہوگا اور جہاں لامذہبیت اور بے دینی کے جراثیم پرورش پا رہے ہوں انشاءاللہ اس کی مدلل اور دلآویز تحریروں سے اس بیماری کا علاج ہو جائے گا۔ اسی لیے ہماری تمنا ہے کہ ترجمان القرآن کی آواز زیادہ سے زیادہ مسلمانوں تک پہونچے اور ہم ہر ذی استطاعت مسلمان سے اس کی سفارش کرنا اپنے لیے باعث سعادت و مسرت جانتے ہیں۔

ترجمان القرآن کا چندہ پانچ روپیہ سالانہ۔ حجم ۸۰ صفحے اور کاغذ و طباعت عمدہ۔ ملنے کا پتہ: منیجر صاحب رسالہ ترجمان القرآن - حیدرآباد دکن۔

مولانا حالی کی صدسالہ برسی کا جشن بڑے تزک و احتشام کے ساتھ منایا گیا۔ اور جو اصحاب اُس میں شرکت کے لیے یہاں سے گئے تھے اُن سے وہاں کے حالات سُن کر مسرت ہوئی۔ نواب صاحب بھوپال نے توقع کے مطابق حالی میموریل فنڈ میں فیاضانہ شرکت فرمائی اور تینتیس ہزار کے قریب سرمایہ فراہم ہوگیا۔ یہ رقم اتنی نہیں کہ بنک میں جمع کرکے محض اُسکے منافع سے یادگاری اداروں کو مدد دی جائے اس لیے غالباً آٹھ دس سال سے زائد کے لیے کافی نہ ہوگی۔ لیکن اگر ہماری تجویز کے مطابق نصف رقم بھی تصانیف حالی کی اشاعت میں لگا دی گئی تو امید ہے کہ اس سے کہیں مدت تک اس کے لیے کافی ہو جائیگی اور بنک کے منافع سے تو کہیں زائد نفع کی توقع کی جا سکتی ہے۔

عید آ رہی ہے!

لکھنؤ عطر کی بہت بڑی منڈی ہے اور ہم تمام مشہور اور اچھے کارخانوں کا مال روانہ کر سکتے ہیں۔ جس قسم کا عطر درکار ہو ہم سے طلب فرمائیں

قیمت فی تولہ کے حساب سے

عطر بیلا عہ سے ،،، تک
عطر چنبیلی عہ ،، ،، عہ ،،
عطر موتیا عہ ،، ،،
عطر چمپا عہ ،، ،،
عطر جوہی عہ ،، ،،
عطر نرگس عہ ،، ،،
عطر مولسری عہ ،، ،،
عطر کیوڑا عہ ،، ،،
عطر سونگی عہ ،، ،،
عطر حنا عہ ،، ،،
عطر جنت عہ
عطر رات کی رانی ،،
عطر صندل عہ ،،
عطر ہار سنگھار عہ ،،
عطر کیوڑہ عہ ،،
عطر گلاب ،، ،،
عطر مشک ،، ،،
عطر زعفران ،، ،،
عطر عنبر عہ ،،
عطر عود ،، ،،
عطر بازاری عہ ،،
عطر خس عہ ،،
عطر حنا عہ ،،
عطر گلبسنت ،،
روح گلاب ،، ،،
عطر اگر عرقی ،،
عطر مخلوط عنبری ،،

عطر مجموعہ عہ سے ،،، تک
عطر خشخس عہ ،،
عطر عروس عہ ،،
عطر سہاگ عہ ،،
عطر دربار عہ ،،
عطر مدن مست ،،
عطر ارگجا محمد شاہی عہ ،،
عطر شہناز عہ ،،
عطر تبسم عہ ،،
عطر شگفتہ عہ ،،
عطر نارنگی عہ ،،
عطر شمامۃ العنبر ،،
عطر شاہ پسند ،،
عطر محبوب پسند ،،
عطر اگر گل ،،
عطر اگر گل کہنہ ،،
عطر دونا عہ ،،
عطر کامنی ،،
عطر الفتی ،،
عطر گل سوری عہ ،،
عطر کیتکی ،،
عطر ...ٹہ ،،
عطر کیوڑا ،،
عطر ... ،،
عطر باتابہ ،،
عطر مسالہ عہ ،،
عطر رات کی رانی ،،

راحت روح

یہ لاجواب عطر شاہی زمانہ کی ایجاد ہے جو اب صرف یہاں کے ایک قدیم کارخانہ عطر میں تیار ہوتا ہے اور خوش مذاق رئیسوں اور بڑی بڑی سرکاروں میں بہت پسند کیا جاتا ہے۔ قیمت فی تولہ عہ

مخلوط آصفی

نواب آصف الدولہ کے عہد میں یہ بے نظیر عطر تیار ہوا تھا اور انہیں کے نام سے موسوم ہے۔ جرمنی اور جاپان کے آئے ہوئے عطر خوشبو کی تیزی و پائداری میں اسکا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ قیمت فی تولہ عہ

عطر عزیز ناز

یہ عطر یہاں کے ایک مشہور کارخانہ کی سالہا سال کی محنت و کوشش کا ثمرہ ہے اور بہت سی خوشبودار کئی قسم کے پھولوں کی خوشبو سے تیار ہوا ہے۔ قیمت فی تولہ عہ

خوشبودار تمباکو

زردہ

(پتی) فی سیر عہ
(خشخاشی) ،، ،،
مشکی دانہ دار ،،
مشکی نقرئی ،،

گولیاں

طلائی فی تولہ عہ
نقرئی ،،

قوام

قوام مشکی فی تولہ ۲ر، ۴ر، ۵ر، ۶ر، ۸ر
قوام زعفرانی فی تولہ ۲ر و ۴ر
برقی قوام ،،
افشانی قوام ،،

کشمیری تمباکو

فی سیر ۲ر ۴ر ۶ر
نقرئی ،، ۸ر

پان کا مصالحہ

مشک و زعفران کی آمیزش سے ترکیب پاتا ہے اور پان کو لذیذ و خوش ذائقہ بناتا ہے۔ فی ڈبیہ ۴ر
فی شیشی ۵ر

المشتہر:- مظفر الملک اینڈ سنس۔ لکھنؤ

کو صدمہ پہونچاتی ہے اور وہ نہایت آسانی سے حاسد اور غیبت کرنے والے بن جاتے ہیں۔ یہ سوچ کر کہ اگر عوام کی نگاہ میں وہ اپنے محسود کی عظمت، پبلک کی نظر میں اپنے معتوب کی رفعت گھٹا سکے تو وہ اپنے اور اُسکے ابین خلیج کو تنگ تر کر دیں گے۔ یہ لوگ مشاق گو، بے اعتبار افترا پرداز ہوتے ہیں، اور اسی افترا پردازی کو اپنی کامیابی کا واحد آلہ بناتے ہیں۔ وہ اپنی شخصی علمیت، اپنی ذاتی اہمیت، اپنی طبعی جامعیت کے غلط اور من گڑھت افسانوں کی اشاعت کرتے ہیں اور اس طرح بظاہر خود کو تسلی دے لیتے ہیں، اپنے کو ایک خیالی ارتفاع پر کھڑا کر لیتے ہیں۔ وہ اپنے محسود کے متعلق نہایت دریدہ دہنی سے، نہایت صفائی سے، دروغگوئی کرتے ہیں، اُسکے کمالات کی تذلیل کرتے ہیں، اُسکے خانگی اور ذاتی حالات کی ٹوہ میں رہتے ہیں اور اُنھیں دریافت کرکے اُن کی آڑ میں اپنے دل کی بھڑاس نکالتے ہیں، اور اس طرح بادی النظر میں وہ خود کو تسکین دے لیتے ہیں، اپنی شہرت کو بلند تر تصور کر لیتے ہیں۔

مذکورۂ بالا نشانیوں سے اس قسم کے اشخاص کو ہر انسان پہچان سکتا ہے کیونکہ ہر ناکارہ انسان دو نشانیوں سے پہچانا جاتا ہے، اُس کی نہ چھپنے والی شیخی، اور اُس کی لا انتہا ہی غلط بیانی، جو دراصل اُسکے اظہار شیخی کے سوا کچھ نہیں۔ لیکن اس کی غلط بیانی چونکہ اُس کی کمزور ذہنیت کا آئینہ ہوتی ہے اس لیے اس سے وہی لوگ دھوکا کھاتے ہیں جو اسکے ہم مذاق اور ہم مشرب ہوتے ہیں۔

کبوتر با کبوتر باز با باز

بعینہٖ یہی حال میرزا یگانہ کا ہے اور ان کی خوشامد میں میرزا مراد بیگ شیرازی کا، ان لوگوں نے دیکھا کہ غالب اپنے انتخاب شاعرانہ خیالات، اپنے نادر تخیلات، اپنے نایاب انداز بیان کی وجہ سے اردو کے تمام شعرا پر غالب ہے، اس کا فلسفہ، اسکی حقائق آفرینی، اسکی نکتہ سنجی، اسکی وسیع النظری، اس کا طرز ادا، اُردو کے کسی اور شاعر کا چراغ اسکے سامنے جلنے نہیں دیتے۔ اسی کے ساتھ اُنھوں نے یہ بھی محسوس کیا کہ ان کے پاس وہ شاعرانہ دماغ نہیں جو شاعر کو اصلی معنوں میں شاعر بناتا ہے، وہ وجدانِ سلیم نہیں جو انسان کو حقیقی طور پر رموزِ فطرت سے واقف کرتا ہے، وہ قوتِ ابداع نہیں جو انھیں غالب تو درکنار، اور دوسرے اُردو اساتذہ کا مد مقابل بنا سکے، لہذا اُنھوں نے سوچا کہ لاؤ اسکے پیچھے پڑ جاؤ اسکو بُرا بھلا کہنا شروع کر دو، اسکی شاعری کی تنقیص کرو، اسکے اشعار پر نکتہ چینی کرو، تاکہ نہ صرف یہ ہو کہ

بد نام اگر ہونگے تو کیا نام نہ ہوگا

بلکہ ممکن ہے کہ پبلک کے چند اَن پڑھ افراد پر جادو چل جائے اور اُن کی نظروں میں یہ غالب سے برتر قرار پا جائیں، خواجہ آتش کو تو محض آڑ بنا رکھا ہے تاکہ لوگوں کو انگشت نمائی کا موقعہ نہ ملے اور دُنیا یہ نہ کہے کہ یہ اشخاص کس قدر متکبر ہیں کہ اپنے منہ میاں مٹھو بنتے ہیں۔

بہر حال میرزا یگانہ اور میرزا مراد دونوں نے جس خیال کے تحت بھی غالب پر نکتہ چینی کی ابتدا کی ہو یہ ہر شخص کا فرض ہے کہ انکے اس گھروندے کو بگاڑ دے ان کی حیلہ سازیوں اور غلط گوئیوں کا پردہ تار تار کر دے۔ میرزا مراد بیگ کی اس آرزو کا کتاب کے حرف حرف سے پتہ چلتا ہے کہ انھیں غالب کے اچھے اشعار دیکھنے کی حسرت ہے، اُس کی فلسفیانہ شاعری سُننے کا ارمان ہے، اس کی زباندانی کے نمونے دیکھنے کا اشتیاق ہے۔ وہ جگہ جگہ اس کی تمنا کرتے ہیں کہ کاش کوئی میرزا یگانہ کی سی شاعری کے نمونے غالب کے ہاں سے نکال دے۔ وہ قدم قدم پر اس اشتیاق کا اظہار کرتے ہیں کہ انھیں غالب کے کلام سے بھی ویسے نمونے دیکھنے کا انتظار ہے جو انھیں یگانہ کے کلام میں ملتے ہیں۔ اگر وہ ذرا انصاف پسندی سے کام لیتے تو ان کو غالب کے مختصر سے دیوان سے ان تمام سوالات کا خاطر خواہ جواب مل جاتا مگر انھوں نے اتنی زحمت گوارا نہ فرمائی اور یہ کام دوسروں کے ذمہ ڈال دیا کہ وہ انھیں غالب کے دیوان سے نمونے اور مثالیں چُن چُن کر دکھائیں جس طرح بچوں کا ہاتھ پکڑ کر کارنیوال میں تماشے دکھائے جاتے ہیں۔ وہ کامل اطمینان رکھیں۔ "آیاتِ وجدانی" میں جس جگہ بھی اُنھوں نے کسی قسم کی ناواقفیت یا تمنا کا اظہار کیا ہے میں اُس عبارت سے مفصل بحث کروں گا۔ گو ان کی یہ آرزو کہ غالب کے اشعار کا میرزا یگانہ کی غزلوں سے مقابلہ کیا جائے اہل دانش و علم کے نزدیک ایک ایسا خبط ہے جسکا جواب خموشی ہی ہونا چاہیے لیکن میں چاہتا ہوں کہ ان کی یہ حسرت بھی نکل جائے ؎

ایں ہم اندر شاعری غمہائے بالائے دگر

مگر قبل اسکے کہ میں اس طرف قدم اُٹھاؤں یہ ضروری ہے کہ ان غلط فہمیوں کا جو انھیں غالب کی طرف سے ہیں یا جن میں وہ لوگوں کو قصداً مبتلا کرنا چاہتے ہیں ازالہ کر دوں۔

صفحہ ۱۷ سطر ۱۱

"کیا غالب کو نادان اور بے خبر پبلک کے سامنے اس ناگوار فرض خودستائی کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ کیا غالب نے اپنے معاصرین پر حملے کرنے اور اُن کی قلعی کھول دینے میں کوئی کسر اُٹھا رکھی"

تھوڑی دیر کے لیے اس بیان کی صحت کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یگانہ غالب کے معاصر کیونکر ہو گئے۔ عصر کے معنی ہیں زمانے کے، اور یگانہ اور غالب کے زمانوں میں جو بُعد ہے وہ ہر شخص پر

ظاہر ہے۔ ممکن ہے میرزا یگانہ خواب میں شعرائے ماضی کی محفلوں میں شریک ہوئے ہوں جہاں غالب سے نوک جھونک کی نوبت آگئی ہو۔ مگر میرے خیال میں ایسا ہونا بہت بعید از قیاس ہے۔ شعرائے گزشتہ یگانہ جیسے مہمل شخص کو کبھی اپنی بزم میں قدم نہ رکھنے دیں گے اور بالفرض کسی طرح پہونچ بھی جائیں تو وہاں سے نکالے جائیں گے

محفل علم سے اس طرح نکلوائے گئے ۔۔۔ پا بدستِ دگرے دست بدستِ دگرے

جناب میرزا مراد صاحب۔ آپ کو یہ کس کتاب میں ملا تھا کہ غالب نے "فرض خودستائی" انجام دیا تھا، کیا غالب نے آیاتِ وجدانی کی سی کوئی کتاب لکھی تھی یا میرزا یگانہ کی طرح اپنی فضیلت اور بڑائی کا کبھی صور پھونکتے پھرتے تھے، یا تمام شعرائے عالم سے خود کو برتر ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔ جو ضروری کتابیں ہیں وہ تو آپ نظر انداز کر جاتے ہیں، اُن میں رقم شدہ واقعات سے قطع نظر کر لیتے ہیں اور معلوم نہیں یہ "ایجادِ بندہ اگرچہ گندہ" والی خبریں کس ہنگڑخانہ سے سُن کر بیان فرماتے ہیں جنکا نہ سر نہ پیر — غالب کے معاصر اصلی معنوں میں صرف دو اشخاص سمجھے جاسکتے ہیں۔ ذوق، مومن، — کیا غالب نے کبھی ذوق کے خلاف اس دریدہ دہنی، اس سفید جھوٹ کے ساتھ بغض نکالا، زیادہ سے زیادہ کہا تو یہ ؎

دیکھیں اس سہرے سے کہدے کوئی بڑھ کر سہرا

کیا کبھی اس نے مومن کی مخالفت میں اس طعن و تشنیع کے ہمراہ، اس تعلّی و شیخی کے ساتھ پروپگنڈا کیا — کیا اسی کو آپ "قلعی کھول دینے" کی کوشش سے موسوم کرتے ہیں، کیا اس نے کبھی معمولی نوک جھونک کے علاوہ جو ہمعصر شعرا میں ہمیشہ عام رہی ہے کچھ اور کیا — جناب میرزا مراد صاحب۔ پہلے غالب کا سا ظرف لائیے تب اس پر اعتراض کرنے کی سعی کیجیے، پہلے اُس کا سا عالی ہمت اور عالی حوصلہ شخص پیدا کیجیے پھر میرزا یگانہ کو اُس سے نسبت دیجیے ؎ حلوا خوردن را روئے باید۔ کیا یگانہ نے بھی کبھی اس پر اکتفا کی ؎ گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی۔ یا ؎

دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا۔

غالب نے کس روز وہ وطیرہ اختیار کیا تھا جو میرزا یگانہ نے اپنا شعار بنا رکھا ہے کہ قدیم اور جدید، مشرق اور مغرب کے تمام شعرا کو ذلیل کیا جائے، سب کی ادبی خوبیوں پر حرف لایا جائے، اور پھر

پوچھو تو یہ کہتا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

صفحہ ۸۲ سطر ۱۲ "غالب کا اُردو دیوان میرزا صاحب کے مختصر دیوان کے برابر بھی نہیں سکتا"

سطر ۱۶ "غالب کے لیے مایۂ ناز فی الحقیقت ان کا فارسی کلام ہے اور خود غالب کا بھی یہی دعویٰ ہے"

جناب میرزا صاحب، غالب کا دیوان کون طلسم ہوش رہا یا بوستان خیال کی طرح ضخیم ہے جو آپ نہایت تمکنت سے فرماتے ہیں کہ "میرزا یگانہ کا مختصر دیوان"۔ غالب بیچارے کی تو تمام پونجی سَو صفحوں سے زیادہ نہیں ہے اور آپ کے میرزا یگانہ کے تو دفاتر اب بھی اشاعت کے لیے باقی ہیں اور جو چھپ چکے ہیں وہی کون کم ہیں۔ کیا نشترِ یاس، اور آیاتِ وجدانی مجموعۂ دیوان غالب سے مختصر ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ غالب نے اپنا بہت سا حصۂ کلام اپنی زندگی میں دیوان سے نکال دیا تھا۔ تاہم اگر اسے ملا بھی لیا جائے تو بھی اس کا سب کلام یگانہ کے کلام سے کم ہوگا۔

دوسرا دعویٰ شاید میرزا صاحب غالب کے ان اشعار کے زور پر کرتے ہیں

بود غالب عندلیبے از گلستان عجم ... من بہ غفلت طوطیِ ہندوستاں نامیدمش

فارسی بیں تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ ... بگزر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگِ من است

لیکن جناب میرزا صاحب۔ یہ بھی تو غالب ہی کا فرمودہ ہے

جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکہ ہو رشکِ فارسی ... گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اُسے سنا کہ یوں

صفحہ ۱۷۰ سطر ۸ "

" غالب کی سرقہ یا مستعار originality جدت طرازی کیا اس حقیقی جدت طرازی کے مقابلے میں ٹھہر سکتی ہے"

پہلے تو میرزا مراد صاحب وہی پرانی ٹھوکر کھاتے ہیں کہ دعویٰ بے دلیل، اس لیے انصافاً تو اسے مہمل سمجھ کر خارج کر دینا چاہیے مگر میرزا صاحب کے مزید اطمینان اور تسکین قلب کے لیے میں اس عبارت سے بھی بحث کرتا ہوں۔ جناب میرزا صاحب، شاعری میں آپ سرقہ یا مستعار کسے کہتے ہیں، اس مسئلے میں صرف دو ہی صورتیں ممکن ہیں۔ پہلی یہ کہ غالب مرحوم نے دوسروں کے اشعار سامنے رکھ کر اُن کے مطالب کو اپنے الفاظ کا جامہ پہنایا۔ گستاخی معاف میں تو غالب کی طرف سے اس کا گمان نہیں کر سکتا کیونکہ ایسا کرنے کے معنی یہ ہوں گے کہ نہ صرف غالب کی ایمانداری پر حرف گیری کر رہا ہوں بلکہ تمام گزرے ہوئے اساتذہ کو سارق مضامین فرض کیے لیتا ہوں کیونکہ اردو کے کسی شاعر کا کلام فارسی شعراء کے مضامین سے خالی نہیں اور خود فارسی شعرا کے یہاں بھی یہی صورت ہے کہ اُلٹ پھیر کر مضامین اور تخیلات وہی آتے ہیں انداز بیان جدا ہوتا ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اگر ایسا نہیں ہے تو غالب کے دماغ میں بھی خود بخود، بعینہ وہی تخیل پیدا ہوئی جو شعرائے گزشتہ کے اشعار میں موجود تھی۔ اس صورت میں کسی طرح

بھی غالب کو سارق اور مستعار لینے والا نہیں سمجھا جا سکتا'۔ اور ایسا ہونا کچھ بعید از قیاس یا ناممکن نہیں۔ دو اشخاص جب اسی درجۂ ذہانت کے ہوتے ہیں تو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ دونوں کے دماغوں میں بالکل وہی خیالات، مطلق غیر ارادی طور پر، قطعاً جدا جدا، آتے ہیں، فرق صرف وقت کا ہوتا ہے اور میں چونکہ یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ غالب کا درجۂ ذہانت دنیا کے کسی شاعر کے درجۂ ذہانت سے کمتر تھا اس لیے اسے سارق مضامین کہنا کیا معنی رکھتا ہے ؎ من نہ آنم آں کہ ایں افسانہ ہا باور کنم۔

پھر اس کے سوا اُردو، فارسی، انگریزی، لاطینی، عربی، سنسکرت، کس زبان کا کونسا شاعر ایسا ہے جسکے یہاں تمام مضامین محض اُسی کی تصنیف اور تخئیل ہوں۔ اردو اور فارسی شعرا کی بابت اگر اس کا ثبوت درکار ہو تو اولڈ بوائے، بابت نومبر ۱۹۳۷ء میں قاضی تلمذ حسین صاحب کا مضمون ملاحظہ فرمائیے۔

کسی فلسفی کا قول ہے "سورج کے زیر سایہ کوئی شے نرالی اور جدید نہیں"

(There is nothing original under the sun)

پھر آخر میرزا صاحب جدت طرازی کسے کہتے ہیں، مسروقہ اور مستعار خیالات سے ان کا کیا مطلب ہے اگر ان کا مطلب یہ ہے کہ غالب کے اُردو کلام میں کہیں بھی ایسے نمونے نہیں ملتے جنھیں اُسکی اور صرف اُسی کی طرف منسوب کیا جا سکے، تو آئیں، محض تفریح طبع کے طور پر، صرف تفنن مزاج کی خاطر، ان چند اشعار کا مطالعہ فرمائیں اور ساتھ ساتھ یہ خیال رکھیں کہ غالب کے یہاں ایسے سیکڑوں اشعار موجود ہیں:—

(۱)	پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے	رُکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور	غالب
(۲)	گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے	رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے	
(۳)	صفائے حیرتِ آئینہ ہے سامانِ زنگ آخر	تغیر آبِ برجا ماندہ کا پاتا ہے رنگ آخر	
(۴)	دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا	یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں	
(۵)	بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی	وہ اک نگہ کہ بظاہر نگاہ سے کم ہے	
(۶)	گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے	اُٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے	
(۷)	توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے	آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا	

اب آئیے اور میرزا یگانہ کے کلام سے چند اشعار کا مطالعہ کیجیے جن کو میرزا مراد صاحب کے معیار کے مطابق مسروقہ کہا جا سکتا ہے:—

	یگانہ آرٹ		اشعار غیر
(۱)	آ رہی ہے یہ صدا کان میں ویرانوں سے کل کی ہے بات کہ آباد تھے دیوانوں سے	ص ۲۳۹	خزاں کے دن جب آئے کچھ نہ تھا جز خار گلشن میں بتاتا باغباں رو رو یہاں غنچہ یہاں گل تھا
(۲)	کسی کے ہو رہو اچھی نہیں یہ آزادی کسی کی زلف سے لازم ہے سلسلہ دل کا	ص ۹۸	بشر کو چاہیے پاس دل بشر رکھے کسی کا ہو کے رہے یا کسی کو کر رکھے " اچھا نہیں جو کھونا ایام نوجوانی اپنا کسی کو کر لو یا ہو رہو کسی کے
(۳)	ہم ایسے بدنصیب کہ اب تک نہ مر گئے آنکھوں کے آگے آگ لگی آشیانے میں	ص ۲۱۴	وائے ناکامی قسمت کا تماشا دیکھئے میں نے ان آنکھوں سے لٹتے ہوئے گھر دیکھ لیا

صفحہ ۲۲ سطر ۹

" غالب نے اتنی عمر پائی مگر ضمیر ملامت شعار کی حقیقت پر کوئی روشنی نہیں ڈالی "

میرزا صاحب، جب آپ نے غالب کے دیوان کا مطالعہ نہیں کیا ہے تو اس قدر لغو اور فضول دعوے کیوں کرتے ہیں۔ ایک جگہ تو آپ کہتے ہیں کہ " غالب کے یہاں اگر اسکا جواب نکل آئے تو کیا کہنا " دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ " غالب نے ضمیر ملامت شعار پر کوئی روشنی نہیں ڈالی " اس سے آخر کوئی کیا مطلب نکالے، خود ہی آپ اس کا اظہار کرتے ہیں کہ آپ نے غالب کے دیوان کا مطالعہ نہیں کیا ہے خود ہی پھر اس طرح رائے زنی کرتے ہیں گویا غالب کا پورا دیوان چاٹ چکے ہیں، اگر خدا توفیق دے تو ذرا غور سے اس بیچارے کے دیوان کا مطالعہ کیجیے اور دیکھیے کہ کتنے رنگا رنگ مضامین سے اسکا دیوان بھرا ہوا ہے۔ فی الحال یہ دو اشعار ملاحظہ کیجیے تاکہ آپ کو اپنے دعوے کے بطلان کا علم ہو جائے ان اشعار میں گو اس نے ضمیر ملامت شعار سے بحث نہیں کی ہے کیونکہ اتنا مہمل اور دور از قیاس خیال اسکے ذہن میں آتا ہی نہ تھا لیکن میرزا یگانہ نے جس تخئیل کو پیش نظر رکھ کر یہ شعر کہا ہے

سہو و خطا ودیعت فطرت سہی مگر سمجھا ؤں کیا ضمیر ملامت شعار کو (یگانہ)

اس سے ملتی جلتی تخئیل کی طرف غالب نے کتنے دلکش پیرایہ میں حسب ذیل اشعار میں اشارہ کیا ہے

آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار یاد مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے (غالب)

کتاب بھر میں اسی نوع کی غلط فہمی یا غلط بیانی کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔ لیکن اب اس کی حاجت نہیں کہ ان سب کا الگ الگ جواب دیا جائے۔ جو جوابات دیے جا چکے ہیں ان کی پذیرائی پر امید ہے کہ آیات وجدانی کے ناظرین بقیہ مہملات کو " صدا بصحرا " سے زیادہ وقعت نہ دیں گے۔ اب ضرورت

اس کی ہے کہ جو اعتراضات غالب کی شاعری کے متعلق کیے گئے ہیں اُن کو فرداً فرداً رد کیا جائے اور ناظرین پر ظاہر کر دیا جائے کہ گو بے عیب ذات خدا کی ہے لیکن غالب کے اشعار اور اُنکی قوتِ شاعری کے خلاف جو حملے آیاتِ وجدانی میں کیے گئے ہیں وہ صرف حاسدانہ و معیوب بیں نگاہوں کی کورانہ کوتاہ بینی نکتہ چیں اور جانبدار نگاہوں کی لایعنی تحقیق ہیں بعبارت کے ساتھ بصیرت کا ہونا بھی ضروری ہے۔ صرف اُردو کے چند الفاظ کے معانی یاد کر لینے سے آدمی نقاد نہیں ہو جاتا چند مخصوص محاوروں اور ترکیبوں کی بات بندی سے زبان داں شاعر نہیں ہو جاتا۔

ہزار نکتۂ باریک تر ز مو اینجاست نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

صفحہ ۱۴۷ "یہاں جن مضحکہ انگیز جدتوں کا ذکر ہے ان کی مثالیں جس کثرت سے غالب کے یہاں ملیں گی وہ انھیں کا حصہ ہیں۔ غالب کا مشہور مصرعہ ہے "دلِ بے دست و پا افتادہ برخوردارِ بستر ہے" دلِ بے دست و پا کے ساتھ افتادہ کا اضافہ اردو میں کتنا مضحک ہے اور دل بے دست و پا کو برخوردار بستر کہنا شہری دماغوں کے لیے کتنی ثقیل اور بھدی چیز ہے"

میرزا مراد بیگ شیرازی اپنے نام کے ساتھ شیرازی کا دم چھلا لگائے ہوئے ہیں اور پھر بھی اس مصرعہ کی ندرت سمجھنے سے قاصر ہیں نہ صرف یہ بلکہ انھیں اس میں کوئی جدت ہی نہیں معلوم ہوتی اور جو جدت ہے وہ انھیں مضحک اور شہری دماغوں کے لیے بوالعجبی کا باعث نظر آتی ہے ان کا دماغ برخوردار بستر کے معانی سمجھنے کی کوشش میں ٹھوکریں کھاتا ہے، انھیں غالب کی اس جدت طرازی پر ہنسی آتی ہے مگر یہ خیال نہیں آتا کہ ان کے شہری دماغوں پر لوگوں کو زیادہ ہنسی آئیگی، وہ اس کی زحمت گوارا نہیں فرماتے کہ غالب کے اس شعر کا پہلا مصرعہ [illegible] دوسرا مصرعہ وہ پیش کر رہے ہیں اور جس پر وہ اعتراض کر رہے ہیں۔ پہلا مصرعہ یہ ہے "سرشکِ سر بصحرا دادہ نور العین دامن ہے" دادہ کی مناسبت سے دوسرے مصرعہ میں افتادہ، نور العین کی نسبت سے برخوردار کتنی بلاغت کا نمونہ ہیں، پھر سر بصحرا کے ساتھ دادہ کا لفظ لگا کر اور دل بے دست و پا کے ساتھ افتادہ کا اضافہ کرکے غالب نے معانی میں جو وسعت اور مطلب میں جو تبدیلی پیدا کی ہے وہ میرزا صاحب کی عقل میں نہیں آتی۔ اس موقعہ پر مجھے ہندوستان کے ایک مشہور شاعر (جو شاعر تو اچھے ہیں لیکن جنکی علمی قابلیت واجبی واجبی ہے) کا ایک واقعہ یاد آتا ہے۔ جگر مراد آبادی کی ایک غزل ہے جس کی ردیف ہے "پی گیا"۔ ایک صاحب نے اعتراضاً کہا کہ شروع سے آخر تک غزل بھر میں کہیں بھی اس طرف اشارہ نہیں کہ کیا چیز پی گیا' اعتراض اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل مہمل تھا کیونکہ غزل کا ہر مصرعہ

پکار پکار کے یہ کہتا ہے لو پی گیا“ سے مقصد شراب کا پی جانا ہے لیکن اعتراض کا جواب جو دیا گیا وہ اعتراض سے زیادہ پُر تعجب ہے۔ جواب دینے والے صاحب نے فرمایا کہ ”یہ تو کوئی بات نہیں، اُردو کے اور شعراء نے بھی ایسا کیا ہے مثلاً ——— اک بار یا غفور کہا اور چڑھا گیا“ ——— یہ مصرعہ امیر مینائی[۲۲] کا ہے اور پورا شعر یوں ہے

وہ مست ہوں کہ ساغر مے جیب میں پا گیا　　اک بار یا غفور کہا اور چڑھا گیا

پہلا مصرعہ دیکھ کر ہر شخص بآسانی یہ سمجھ سکتا ہے کہ اعتراض کے جواب کی حد تک جواب کس قدر مضحکہ خیز تھا۔ لیکن یہاں جواب دینے والے سے سہو ہوا تھا۔ میرزا مراد قصداً غالب کا پہلا مصرعہ نظر انداز کر جاتے ہیں تاکہ لوگوں کو مغالطے میں ڈالیں۔ کیوں جناب میرزا صاحب کیا میرزا یگانہ [جن کے آپ ”بقول خود“ عقیدت مند ہیں] کے یہاں اس نوع کی فارسی ترکیبیں نہیں ہیں، اگر شک ہو تو ذیل کی ترکیبیں ملاحظہ فرمائیے۔

گوش بر آواز در چشم نامحرم کجا (کیا یہاں کجا کے بجائے کہاں نہیں استعمال ہو سکتا تھا)
خانہ بدوش رہگزر، رنگ و بوے رائیگاں، محوِ طلسم بندیِ نقش و نگار، دست و پا گم کرنا
[دست و پا گم کردن کا ترجمہ]

صفحہ ۶۲ ”میرزا صاحب (میرزا یگانہ) کا کلام میرزا غالب کی طرح محض حسنِ معنوی کا مظہر نہیں“ اس کو پڑھ کر پہلے تو مجھے تعجب ہوا کہ آخر میرزا مراد کو یہ کس طرح معلوم ہوا کہ غالب کا کلام محض حُسنِ معنوی کا مظہر ہے کیونکہ اُنھوں نے آیات وجدانی میں جا بجا اس کا اظہار کیا ہے کہ وہ غالب کے دیوان کا مطالعہ کرنا تضییع اوقات سمجھتے ہیں۔ جگہ جگہ ایسے فقرے لکھے ہیں جن سے صاف ظاہر ہے کہ انھوں نے غالب کا کلام نہیں پڑھا ہے ——— پھر میں نے سوچا کہ تعجب کرنا خود حماقت ہے۔ یہ دونوں میرزا صاحبان [میرزا مراد و میرزا یگانہ] بغیر سوچے سمجھے، بلا دلائل و براہین، جو چاہتے ہیں لکھ مارتے ہیں ؎

ہر لحظہ بشکلِ دگر آں یار بر آمد

اول تو مجھے میرزا مراد سے یہ دریافت کرنا ہے کہ غالب کے یہاں جو کچھ حسن معنوی ہے اسی کا مقابلہ یگانہ نے کہاں تک کیا ہے۔ جس رفعت تک اس کا مرغِ تخیل جاتا تھا اُن بلندیوں تک میرزا یگانہ کی تخیل کی لنڈوری بٹیر کبھی بھی پہونچی [اقبال نے غالب کی تخیل ہی کے متعلق کہا ہے

فکرِ انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا　　ہے پرِ مرغِ تخیل کی رسائی تا کجا]

جس نکتے کو اُس کی باریک بیں نظریں دیکھ لیتی تھیں اس کا عشر عشیر بھی میرزا یگانہ کی موتیا بند نما آنکھوں نے

باسمِ خداوند جان آفریں

الناظر

نمبر ۶ جلد ۲۶ — دسمبر ۱۹۳۵ء

مقامی حکومت

(جناب قاضی تلمذ حسین صاحب ایم اے رُکن دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی)

مضمون ذیل آر۔ این گلرسٹ کی کتاب اصولِ علم السیاست کے ایک باب کا ترجمہ ہے۔ مصنف کرشن نگر کالج میں پروفیسر تھے اور بعد کو پرنسپل ہوگئے۔ ان کی یہ کتاب ہندوستانی جامعات میں بہت مقبول ہوئی۔ سنہ ۱۹۲۱ء میں پہلا اڈیشن شایع ہوا تھا اور اب سنہ ۱۹۳۵ میں پانچواں اڈیشن نکلا ہے۔ (مترجم)

عام ملحوظات

زمانۂ جدید کی اکثر سلطنتیں اتنی بڑی ہیں کہ مرکزی حکومت کے لیے ان تمام فرائض کا انجام دینا جو معمولی حکومت سے متوقع ہوتے ہیں ناممکن ہے۔ مثلاً کوئی ایسی چھوٹی سلطنت جس کا رقبہ صرف آٹھ مربع میل ہے، وہ بھی تین رقبات میں منقسم ہے؛ جن میں سے ہر رقبے میں اس کے مقامی معاملات کے انتظام کی تنظیم ہے۔ ہر سلطنت میں مرکزی حکومت اور اس کے ساتھ اس کی مجلسِ وضعِ قوانین، جماعتِ عاملہ اور جماعتِ عدالتی کا مرکز اس شہر میں ہوتا ہے جو دارالصدر کے نام سے موسوم ہوتا ہے۔ اس دارالصدر میں قوانین وضع کیے جاتے ہیں اور کسی قدر عمل میں آتے ہیں مگر ان قوانین کے مناسب نظم ونسق کے لیے عام طور پر عہدہ دار ملک کے اطراف وجوانب میں پھیلے ہوتے ہیں۔ ہندوستان میں شہنشاہی تشریعی جماعتوں کا اجتماع دہلی میں ہوتا ہے اور جماعت

عاملہ اپنا کام زیادہ تر دہلی اور نیز شملہ میں انجام دیتی ہے مگر کلکتہ، بمبئی، مدراس اور دوسرے دار الحکومتوں میں صوبجاتی حکومتیں ہیں۔ بنگال میں کلکتہ مرکز ہے جہاں مجلس تشریعی جمع ہوتی ہے اور جہاں معتمدی اور عدالتِ عالیہ اپنا کام کرتی ہے۔ مگر ملک کے اطراف و جوانب میں کمشنر، جج، کلکٹر، حاکمِ پرگنہ، پولیس، عہدہ داران آبکاری، مہتمان مدارس اور دوسرے عہدہ دار پھیلے ہوئے ہیں جو اپنے مقامات پر اپنے انتظامی فرائض انجام دیتے ہیں۔

مقامی حکومت کے معنی — لیکن مقامی حکومت کی اصطلاح ان پر عائد نہیں ہوتی۔ بقول سجوک وحدانی سلطنت کے اندر مقامی حکومت کے معنی اُن اعضاء کار کے ہیں جو اگرچہ مرکزی مجلس تشریعی کے کاملاً تابع ہوتے ہیں مگر تقرر اور کسی حد تک اپنے فیصلوں میں مرکزی جماعت عاملہ سے آزاد ہوتے ہیں اور مالیات عامہ کے کچھ حصص پر جزواً آزادانہ اقتدار عمل میں لاتے ہیں۔ مرکزی حکومت کے مقامی عہدہ دار "مقامی حکومت" نہیں۔ یہ اصطلاح اُن اعضا پر عائد ہوتی ہے جن کا وجود مرکزی حکومت کی مرضی پر ہوتا ہے اور جو ایک رقبہ پر اپنے قیام تک ضوابط کے بنانے، مالیات عامہ کے بعض جزو پر اقتدار رکھنے، اور خود اپنے قوانین یا مجلس مرکزی کے قوانین کو عمل میں لانے کا کسی قدر قطعی اختیار رکھتے ہیں۔ یہ اعضا حقیقتاً ماتحت جماعتیں ہیں مگر بعض معینہ حدود کے اندر ان کو آزادیٔ عمل حاصل ہوتی ہے۔ عمدگیٔ انتظام کی غرض سے وہ حکومت کے فرائض کی ایک زیرِ تقسیم کی نمایندگی کرتے ہیں۔ حکومت کے کام کا مجموعۂ کلّی ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جاتا ہے جن میں سے ہر ایک کا اپنا خاص رقبۂ انتظامی ہوتا ہے۔

مقامی حکومت کی قطعی تعریف کرنا ناممکن ہے۔ اس کا بیان ہو سکتا ہے مگر تعریف نہیں ہو سکتی، کیونکہ تعریف کے لیے تحدیدات کی ضرورت ہے اور اکثر مقامی حکومت اور مرکزی حکومت میں فرق نہیں ہو سکتا۔ یہ بتانا زیادہ آسان ہے کہ مقامی حکومت کیا نہیں ہے بہ نسبت اس کے کہ کیا ہے۔ یہ حکومت مرکزی حکومت کے مقامی عہدہ داروں کا نام نہیں اور نہ بنگال کے مانند حکومت کو اس اصطلاح کے قطعی مفہوم میں "مقامی حکومت" کہا جاتا ہے۔ کسی وفاقی حکومت کے فردیات مثلاً پرشیا یا ریاست نیویارک مقامی حکومت کے فردیات نہیں ہیں۔ وہ ایک وفاقی اتحاد کے اندر صوبے ہیں جن کی خود اپنی مقامی حکومتیں ہیں۔ ایک مفہوم میں وہ مقامی حکومتیں ہیں کیونکہ وہ ماتحت واضع قوانین جماعتیں ہیں جنھیں ایک معینہ رقبہ پر اختیارات حاصل ہیں۔ مقامی حکومت کے اعضا کا وجود مرکزی حکومت کی مرضی پر ہوتا ہے مگر اس کے برخلاف ان وفاقی صوبوں کی ایک حیثیت ہے

جس کی قطعی ذمہ داری سلطنت کے دستور کے ذریعہ سے کی گئی اور جسے مرکزی حکومت اپنی مرضی سے بدل نہیں سکتی۔ درحقیقت یہ فرق ایک مفید فرق ہے مگر اس کا اطلاق ہمہ گیر طور پر نہیں ہو سکتا کیونکہ بعض امریکی ریاستوں میں ایسے اعضا ہیں جو عام طور پر مقامی حکومت کے اعضاء قرار دیے جاتے ہیں مگر دستورِ سلطنت میں ان کے لیے قطعی انتظام کیا گیا ہے اور اس کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ کوئی سلطنت نیا دستور مرتب کرتے وقت ایسی جماعتوں کی ترتیب کو تفصیل سے نہ بیان کرے جو مسلمہ طور پر مقامی حکومت کے اعضا ہوں۔ لہذا دستوری حیثیت کا یہ فرق کوئی ہمہ گیر معیار نہیں ہے۔

نہ قطعۂ ملک کی وسعت نہ آبادی کی تعداد اس امر کے تعین میں کچھ وقعت رکھتی ہے کہ مقامی حکومت کیا ہے؟ مناکو کی خود مختار سلطنت، جس کی ملاکت آٹھ مربع میل ہے، انگلستان کے یارک شائر کے مقامی رقبہ سے بہت کم ہے اور اس کی تقریباً تیس ہزار کی آبادی لندن کی مجلس ضلع یا کلکتہ کی بلدیہ کی لاکھوں کی آبادی کے مقابلہ میں کچھ نہیں ہے۔ مقامی اور مرکزی حکومت کی تفریق کا اصلی نکتہ کام کی نوعیت ہے

حکومت مقامی کے ممیز خصوصیات، اقسام فرائض

حکومت کی مختلف سرگرمیوں کے تبصرہ سے کام کے دو وسیع اصناف ظاہر ہوتے ہیں۔ صنف اول میں عام مفاد کے کام ہیں۔ یہ مفاد عام کا کام ہے کہ مرکزی حکومت غیر ملکی تعلقات اور جنگ و صلح کا انصرام کرے۔ یہ معاملات قومی اہمیت رکھتے ہیں اور تمام باشندے ان سے یکساں نفع اٹھاتے ہیں۔ اسی طرح یہ بھی مفادِ عامہ کا کام ہے کہ مرکزی حکومت تعزیری قانون، معاہدات، محاصل درآمد و برآمد، مناکحت اور طلاق کے معاملات کو اپنے اقتدار میں رکھے۔ اگر ان معاملات کا انتظام مقامی جماعتیں کرتیں تو قوم کا قانون ایک خلط مبحث ہو جاتا۔ فرائض کی ایک دوسری صنف ہے جس کا نفع ملت کے ایک جزو کو پہنچتا ہے اور ملت کا یہ حصہ صحیح طور پر ان فرائض کا ذمہ دار خیال کیا جاتا ہے۔ شہر کی روشنی یا بہم رسانی آب، بعض سڑکوں اور پلوں کی مرمت و حفاظت قطعی طور پر مقامی معاملات ہیں۔ مثلاً بمبئی کے باشندوں کو اس سے سروکار نہیں ہے کہ کلکتہ کے شہر میں روشنی اور پانی کا کیا سامان ہے، اور کلکتہ کے باشندوں کو کرشن نگر میں ایک بدرو کے بننے سے کوئی بحث نہیں۔ ایسی صورتوں میں ان کاموں سے جو نفع پہنچتا ہے وہ قطعی طور پر انھیں لوگوں سے منسوب کیا جا سکتا ہے جن کو اس رقبہ سے سروکار ہے۔

لیکن ان دونوں اقسام فرائض کے مابین ایک اور صنف فرائض ہے اور بہت وسیع

صنعت ہے جو کسی قدر قسم اول سے تعلق رکھتی ہے اور کسی قدر قسم دوم سے۔ ایک مثال لیجیے۔ یہ ذہن میں آ سکتا ہے کہ کرشن نگر کے مدارس کرشن نگر کے بلدیہ کے تحت کر دیے جائیں اور اسی طرح کلکتہ، ڈھاکہ اور راج شاہی وغیرہ کے مدارس بھی اپنے اپنے بلدیہ کے تابع کر دیے جائیں۔ اس کے یہ معنی ہوں گے کہ کرشن نگر، کلکتہ، ڈھاکہ، اور راج شاہی جس طرح کے تعلیمی نظم چاہیں جاری کریں مگر اس کا نتیجہ ہر طرح کی تعلیمی اور معاشرتی خرابیوں کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ ایک بلدیہ یہ کہے گی کہ اس کے پاس تعلیم کے لیے روپیہ نہیں، دوسری یہ کہے گی کہ اس کے پاس روپیہ ہے مگر بہت ہی ناکافی، تیسری یہ کہے گی ایک بہت ہی اعلیٰ نظم کی ضرورت ہے۔ یہ ایک مفاد عام کا معاملہ ہے کہ قوم کو تعلیم دی جائے اور ان کو ایک ہی عام تجویز کے مطابق تعلیم دی جائے۔ لہذا مرکزی حکومت کو اس کا اقتدار اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہیے مگر وہ بلدیات اور دوسری مقامی جماعتوں کو یہ آزادی دے سکتی ہے کہ مرکزی حکومت کے منظور کردہ قواعد وضوابط کے بموجب روپیہ جمع کریں یا مرکزی حکومت کے عطیات کو خرچ کریں۔

ایک اور زیادہ قاطع مثال حفظان صحت کی ہے۔ اگر مرکزی نگرانی نہ ہوتی تو ایک کارآمد مقامی جماعت جو کچھ عمدہ کام کرتی ایک ناکارہ ہمسایہ ان سب کو تباہ کر دیتا۔ مثلاً ندیا میں اگر مقامی مجلس ضلع کی کوششوں سے طاعون ناپدید ہو جاتا اور بردوان کی ناکارہ مجلس ضلع طاعون کو خارج کرنے کی کوئی سعی نہ کرتی تو جو عمدہ نتائج ندیا کی مجلس سے حاصل ہوئے تھے وہ بردوان کی مجلس کی لاپروائی سے باطل ہو جاتے۔ اس لیے یکسانی پیدا کرنے کے لیے مرکزی نگرانی لازمی ہے اگرچہ واقعی عملی کام مقامی حکومتی جماعتوں کے ہاتھ میں چھوڑا جا سکتا ہے۔ ایسے معاملات میں جو عضو چھوٹے رقبہ کی نمائندگی کرتا ہو اس کو عملی جزئیات کا انتظام کرنا چاہیے اور اصول اور عام نگرانی کا تعین بڑے رقبہ کی حکومت یعنی مرکزی حکومت کے ہاتھ میں چھوڑ دینا چاہیے۔

اس سے یہ ظاہر ہوگا کہ مقامی حکومت کو تعریف کے تحدیدات کے اندر لانا ناممکن ہے۔ ان میں سے بعض کے اندر نہ صرف وہ مقامی جماعتیں شامل ہیں جن کا ذکر اوپر ہوا ہے بلکہ وفاقی

مقامی حکومت خود اختیاری

سلطنت میں مرکزی حکومت اور صوبوں کی حکومتوں یا ایسی حکومتوں کے جیسے بنگال کی حکومت ہے، مقامی عہدہ دار بھی شامل ہیں۔

ہندوستان میں مقامی حکومت خود اختیاری کی اصطلاح نے بہت وسیع شیوع حاصل کر لیا ہے اور یہ اصطلاح مستند کتابوں میں اس شے کے ظاہر کرنے کے لیے جو مقامی حکومت سے

مراد ہے بہت اچھی طرح استعمال کی جا سکتی ہے اور خود لفظ مقامی حکومت کو تمام ان اقسام حکومت پر عائد کیا جا سکتا ہے جو مرکزی حکومت نہیں ہیں۔

مقامی حکومت کے وجوہ

مقامی حکومت کے وجود اور اس کے فوائد کے وجوہ متعدد ہیں۔

(۱) خوبی کار

اولاً یہ کہ خوبی کار کے لیے مقامی حکومت کی ضرورت ہے۔ ایک ایسے رقبہ میں جہاں لوگوں کو حکومت کے بعض کاموں سے نہایت دلچسپی ہو وہاں قوم کا فائدہ اس میں ہے کہ وہ کام عمدگی سے انجام دیے جائیں۔ اس لیے اس قسم کی خوبی کار کے لیے قوم کو یہ موقع ملنا چاہیے کہ جو لوگ اس کام کے ذمہ دار ہوں اُن پر ملامت کر سکے یا ان کو برطرف کر سکنے کی قابلیت سے ان پر اقتدار رکھے۔

(۲) کفایت

ثانیاً مقامی حکومت سے کفایت پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر حکومت کے بعض کاموں سے صرف ایک معین رقبے کو نفع پہونچتا ہے تو یہ ظاہر ہے کہ ان کاموں کا خرچ اسی رقبے پر عائد ہونا چاہیے۔ بعض وقت مرکزی حکومت کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ بعض شرائط پر مقامی حکومت کو عطیہ دے یا مرکزی حکومت مقامی جماعت کو بعض خاص اغراض کے لیے قرض لینے کا اختیار عطا کر دے یا اس رقبہ کے بعض صوبوں پر مقامی حکومت کی جانب سے محصول لگانے کی حد معین کر دے۔ مقامی رقبوں میں روپیہ وصول کرنے کا خاص طریقہ محصول لگانا یا شرح ابواب ہے۔ جو لوگ ابواب عطا کرتے ہیں ان کو مقامی مجالس کے انتخاب کا موقع حاصل ہوتا ہے اور اس طرح ایک بڑی حد تک وہ انتظام کے ساتھ ساتھ اخراجات پر بھی اقتدار رکھتے ہیں۔

(۳) تعلیمی ذریعۂ عمل

ثالثاً یہ کہ جدید نیابتی حکومت میں مقامی حکومت ایک اہم ذریعہ تعلیمی ہے۔ زمانۂ جدید کی حسب معمول سلطنتوں میں شہریوں کو قومی معاملات کی رہبری میں صرف کبھی کبھی شرکت کرنا پڑتی ہے اور عام طور پر یہ شرکت تین برس سے پانچ برس تک کے وقفہ میں رائے ثبت کرتا ہے۔ اس کا اثر یا سستی ہوگا یا بددلی، مگر مقامی حکومت ایک ایسا واقعی نیابتی نظم مہیا کر دیتی ہے جو بالکل قریب ہوتا ہے اور جس کے صحیح طریق سے چلانے پر روزانہ زندگی کے ہر شئے کا انحصار رہتا ہے۔ اس طرح شہری معاملات عامہ سے واقف ہو جاتے ہیں۔ مقامی جماعتیں مرکزی حکومت کے زیادہ وسیع معاملات کے لیے ایک عمدہ مدرسۂ تربیت مہیا کر دیتی ہے۔ ممالک مغرب کی کسی وزارت پر اگر نظر ڈالی جائے تو یہ ظاہر ہو جائے گا کہ قومی

سرگروہوں کی ایک معقول تعداد اُن لوگوں کی ہے جنھوں نے اول اول مقامی حکومت کے سرگروہ کی حیثیت سے نام پیدا کر لیا۔

(۴) حکومت کی عام تقسیم | رابعًا یہ کہ مقامی حکومت مرکزی حکومت پر سے کام کا بار کم کر دیتی ہے۔ اگر مقامی حکومتی جماعتیں نہ ہوتیں تو مرکزی حکومت کو خود اپنے عہدہ داروں کے ذریعہ سے ہر ایک کام انجام دینا پڑتا۔ مقامی حکومت کے نظم سے وہ کام تقسیم ہو گیا۔ اور ان ایام میں جبکہ حکومتی مداخلت وسیع ہوتی جاتی ہے مقامی جماعتوں کا فائدہ اور بھی واضح ہے۔

(۵) غور و فکر کے اعضا | خامسًا یہ کہ مقامی حکمراں جماعتیں حکومت کے غور و فکر کرنے والے عضو کی حیثیت سے بہت ہی کارآمد ہیں۔ وہ مجوزہ وضع قانون پر مشورہ دینے اور مقامی حالات اور دشواریوں کے معدوم کرنے کے لیے وہ بے بہا ہیں۔

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ مقامی جماعتیں ان معینہ حدود کے اندر ہوتی ہیں جو مرکزی حکومت قرار دے دیتی ہے۔ بعض معاملات میں انھیں کامل اختیارات حاصل ہو سکتے ہیں مگر دیگر معاملات میں انھیں صرف مرکزی حکومت کے احکام کی تعمیل کرنا ہوتی ہے۔ مقامی حکومت خود اختیاری کو محدود الاختیار ہونا چاہیے۔ اس کی دو وجہیں ہیں۔ اولًا یہ کہ حکومت کا رقبہ جس قدر تنگ ہوگا اُسی قدر اس امر کا زیادہ امکان ہے کہ ایک پُرزور مقصد دیگر مقاصد پر کلیتًہ حاوی ہو جائے۔ ایسی صورتوں میں مرکزی حکومت کو دخل دینا چاہیے خواہ اختیار امتناع کے ذریعہ سے یا مقامی نظم رائے دہی کو اس طرح منفرد کرنے کے ذریعہ سے کہ تمام مقاصد کی معقول نمائندگی ہو سکے ثانیًا یہ کہ متعدد فرائض کی نگرانی مرکزی طور پر ہونا چاہیے اگرچہ مقامی جماعتیں وسیع عاملانہ اختیارات رکھ سکتی ہے، تعلیم اور حفظانِ صحت اسی قسم کے معاملات ہیں۔

یہ امر علم السیاست کے ماہرین اور عملی منتظمین دونوں کے لیے شدید دشواری کا باعث ہے
حد بندی کی دشواری | کہ کس جگہ مرکزی اقتدار ختم اور مقامی اقتدار شروع ہو۔ اسی قسم کی دشواری مقامی حکومت کے چھوٹے اور بڑے قریات کے درمیان فرائض کی تقسیم کے متعلق موجود ہے۔ بعض صورتوں میں مناسب یہ ہے کہ مرکزی اقتدار یکساں طور پر قائم ہو اور بعض صورتوں میں مقامی اقتدار مناسب بھی ہے اور اس میں کفایت بھی ہے۔ اگر تمام مقامی جماعتیں ایک ہی سے معیار اخلاق کی ہوتیں تو فرائض کی تقسیم زیادہ آسان ہو جاتی مگر مرکزی حکومت کو علی التسلسل یہ دشواری پیش آتی رہتی ہے کہ مقامی جماعتوں میں یکساں خوبی کار نہیں ہے۔ مثلًا

دس مقامی جماعتوں میں سے اگر آٹھ مکمل کارکن ہیں تو باقی دو اس قدر ناقص ہو سکتی ہیں کہ وہ اُن آٹھ کے عمدہ کام کو برباد کر دیں۔

مثالیں | اس قسم کی دشواریوں کی دو ایک مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ ایک بلدیہ میں سڑک پر روشنی کرنے اور ان کے پختہ کرنے کا انتظام اس شہر کے باشندوں کا معاملہ ہے۔ باہر سے آنے والوں کو عمدہ سڑکوں اور روشنی کے عمدہ نظم سے نفع پہنچتا ہے مگر شہر کے رہنے والے ہی اصل میں نفع اُٹھاتے والے ہیں۔ یہ امر اگرچہ عام طور پر صحیح ہے مگر ایسی صورتیں بھی ہیں جہاں شہر کے رقبات سے باہر کے لوگ خود اہل شہر کے بہ نسبت زیادہ نفع اُٹھاتے ہیں۔ لورپول اور مینچسٹر کے عظیم الشان تجارتی مراکز کے درمیان چھوٹے قصبے ہیں جن کی سڑکیں زیادہ تر بڑے شہروں کے تجارتی آمد و رفت کے کام آتی ہیں۔ ان کا مال تجارت ان قصبوں کو کسی طرح کا خاص نفع پہونچائے بغیر ان کے اندر سے گزرتا ہے مگر سڑک کے درست و قائم رکھنے کا بار اہل قصبہ پر پڑتا ہے۔ یا فرض کیجیے کہ ایک شہر کو پانچ خاص سڑکیں آتی ہیں اور یہ پانچوں سڑکیں دیہاتی رقبہ سے ہو کر گزرتی ہیں جن میں سے ہر ایک میں مقامی حکومت کے لیے ایک مختلف جماعت ہے۔ خود ان رقبوں کے باشندے ان سڑکوں سے شہر یا زیادہ دُور کے باشندوں کے بہ نسبت بہت کم نفع اُٹھاتے ہیں۔ لہٰذا اس قسم کی سڑکوں کو قائم رکھنے کے لیے خرچ کی حصہ رسی تقسیم ایک ایسے اقتدار کے ذریعہ سے ہونا چاہیے جو شہر کے گرد کے ضلع کے اقتدار سے وسیع تر ہو۔ سب سے زیادہ مشکل معاملہ امداد غربا کا ہے پہلی نظر میں معلوم ہوگا کہ ہر مقامی رقبہ کو اپنی اپنی امداد غربا کے لیے ذمہ دار ہونا چاہیے۔ مگر امداد غربا کے معنی مقامی محصول کے ہیں اور ہر ایک رقبہ کو اپنا فائدہ اسی میں نظر آئے گا کہ وہ غربا کو دوسرے رقبوں کی طرف منتقل کر کے جہاں تک ممکن ہو اپنے محصول کو کم کر دیں۔ جن رقبوں میں احساس عامہ کا جذبہ زیادہ ہوگا وہ نقصان اُٹھائیں گے اور اس لیے یکسانیت پیدا کرنے اور اس قسم کی ناموزوں کارروائی کو روکنے کے لیے کوئی عام اقتدار ہونا چاہیے۔ مرکزی اقتدار تا حد امکان ہلکا ہونا چاہیے اس بار کے ایک بڑے حصے کو مقامی رقبات پر عائد کر دینے سے نہ صرف گداگری کے ذرائع کو روکنے کی تحریک ہوتی ہے بلکہ مزید فائدہ یہ ہوتا ہے کہ خانگی خیرات کے اتحاد عمل کو بھی شامل کر لیا جاتا ہے۔

تجربہ سے یہ ظاہر ہو گیا ہے کہ کسی مقامی جماعت پر جس قدر زیادہ ذمہ داری ہوگی اُسی قدر زیادہ

ذمہ داری اور خدمت عامہ | اغلب ہے کہ ملت کی خدمت کے لیے زیادہ بہتر طریقہ کے لوگ آگے بڑھیں۔ جہاں مقامی جماعت محض مرکزی حکومت کی مرضی کی تاویل و تعمیل کرتی ہے وہاں یہ دشوار

ہوتا ہے کہ صحیح طرز کے جذبۂ عامہ رکھنے والے اشخاص حاصل ہوسکیں۔ کم قابلیت کے آدمیوں کو زائد از ضرورت اختیار دینے سے تجربہ کی تعلیمی اہمیت بُرے نتائج سے ضایع ہو جائیگی۔

تجربہ بحیثیت رہبر

مقامی حکومت کے تقسیم فرائض اور تحدید رقبات دونوں معاملات میں تجربہ ہی یقینی رہبر ہے۔ عام طور پر ابتدا میں مرکزی نگرانی ضروری ہے کیونکہ مقامی جماعت کی بہ نسبت مرکزی حکومت کو قابلیت اور تجربہ پر زیادہ قدرت حاصل ہوگی جیسا کہ سجوک نے ظاہر کیا ہے "مرکزی حکومت کو وسیع تر عام معلومات سے حاصل شدہ فائق روشن خیالی اور اعلیٰ تعلیم یافتہ اذہان کا وسیع تر تجربہ حاصل ہوتا ہے"۔ بتدریج تفریق مرکزیت اس حد پر ممکن ہے جہاں مرکزی اور مقامی ضرورتیں ایک دوسرے سے مل جاتی ہیں۔ ایسی حد کا تصفیہ تجربہ اور حکومتی مداخلت کے رائج الوقت تصورات کرسکتے ہیں۔ کوئی قطعی قاعدہ نہیں موجود ہے۔

مذکورۂ بالا عام ملحوظات ہمیں اس سوال کے جواب میں مدد دیتے ہیں کہ "وضع قوانین میں کس حد تک مرکزیت ہوسکتی ہے

تشریعی تفریق مرکزیت

یا اسے مقامی بنایا جاسکتا ہے۔ ہم جب مقامی حکومت کا ذکر کرتے ہیں تو علی العموم ہمارے ذہن میں انتظامی کام کا خیال ہوتا ہے گر مقامی جماعتوں کو مختلف درجے کے اختیارات وضع قوانین بھی ہوتے ہیں۔ یہ سب تحتانی وضع قوانین ہیں۔ کیونکہ تمام مقامی جماعتیں مرکزی حکومت کے تابع ہیں۔ ان کے قوانین فی الحقیقت محض ذیلی قوانین ہیں۔ اس اعتبار میں ان کا مقابلہ متفق نظم کی صوبجاتی حکومتوں سے کیا جا سکتا ہے۔ ان کے نظام ترکیبی میں جو انکے اختیارات کی تحدید کرتے ہیں وہ اپنے حدود کے اندر قوانین بنا سکتے ہیں اور ان حدود سے خارج جو کچھ کیا جائے وہ متجاوز الاختیار اور اس لیے کالعدم ہے۔ فرق یہ ہے کہ وفاقی سلطنت کی صوبجاتی حکومتوں کی ضمانت اساسی دستور سے ہوتی ہے جو معمولی طریق وضع قانون سے بدلے نہیں جاسکتے۔ برخلاف ازیں مقامی جماعتوں کا وجود مرکزی مجلس وضع قوانین پر منحصر ہوتا ہے۔

جس حد تک اختیارات عطا کیے جاتے ہیں اُن کا انحصار متعدد عناصر پر ہوتا ہے، یعنے

مقامی اقتدار کے طرز

مواضع کی نوعیت، خود ملک کے رائج سیاسی خیالات اور تاریخی حالات عام الفاظ میں اقتدار کے تین طریقے حسب ذیل ہیں:-

۱۔ تشریعی مرکزیت اور اس کے ساتھ انتظامی تفریق مرکزیت جس میں یکسانیت کے خیال سے مرکزی حکومت قوانین منظور کرتی ہے اور ان کا انتظام مقامی جماعتوں کے ہاتھ میں چھوڑ دیتی

ہے ایسی صورت میں مقامی جماعتوں کو ذیلی قوانین بنانے کے اختیارات ہوتے ہیں جو فی الواقع انتظامی قواعد ہوتے ہیں - یہ نظم عام طور پر انگلستان اور ممالک متحدہ امریکہ میں رائج ہے گو عمل کے بعض طرزوں میں یہ تشریعی اور انتظامی دونوں اختیارات سے کامل مرکزیت کے ساتھ متوازی الوجود ہو سکتا ہے -

۲ - تشریعی تفریق مرکزیت اور انتظامی مرکزیت جس میں وضع قوانین کے وسیع اختیارات مقامی جماعتوں کو دیے جاتے ہیں مگر مرکزی حکومت اپنے خاص عہدہ داروں کے ذریعہ سے ان قوانین کو عمل میں لاتی ہے - یہ نظم فرانس اور جرمانیہ میں رائج ہے -

۳ - حکومت کی تشریعی اور انتظامی دونوں شاخوں میں کسی قدر مرکزیت اور کسی قدر تفریق مرکزیت - یہ اوپر کے دونوں طرزوں کے درمیان ایک طرح کا تسویہ ہے - اس کی مثال پرشیا کا نظم ہے اور انگلستان اور ممالک متحدہ امریکہ میں بھی اس جانب تقلید کا نمایاں میلان ہے

لیکن یہ ملحوظ رہنا چاہیے کہ مرکزی حکومت جن اختیارات کو عمل میں لاتی ہو وہ اگرچہ برائے نام ہی ہوں جیسا کہ برطانی مجلس وضع قوانین کے عارضی احکام ہوتے ہیں مگر لشت پر ہمیشہ مرکزی حکومت ہی ہوتی ہے - لندن کی ضلع کی مجلس کی ایسی جماعت کے لیے برائے نام نگرانی کی ضرورت ہوتی ہے مگر جہاں مقامی اغراض میں تصادم ہو جاتا ہے وہاں عدالت مرافعہ صرف مرکزی حکومت ہی ہے - مرکزی حکومت اپنے لیے یہ قانونی اختیار ملحوظ رکھتا ہے کہ لندن کی مجلس صوبہ کے کسی تجویز قانون کو روک دے بجز اس کے جہاں آخری اختیارات ازروے قانون اسی جماعت کو عطا کر دیے گئے ہیں - مقامی جماعتوں کی اس قسم کی آخری نگرانی دو وجوہ سے ضروری ہے اولاً مقامی جماعتوں میں تدبر ملکی کی کمی - یہ ایک فطری امر ہے کہ ایک قصبہ کی مجلس کی نسبت پارلیمنٹ کے اندر زیادہ دماغ ہے - ایک مقامی مثال لیجیے - ایک مجلس تشریعی میں ایک مجلس مقامی کے بہ نسبت زیادہ قابلیت ہوتی ہے - ثانیاً یہ کہ چھوٹے مسبقے فرقہ بندی اور اغراض و مقاصد کے مرکز بن جانے کی طرف مائل ہوتے ہیں اور مرکزی حکومت کے لیے ضروری ہے کہ وہ مستقل طاقت کے طور پر عمل کرے وہ یا تو مقامی مجلسوں میں اقلیتوں کی نمایندگی کے تیقن کے ذرائع مہیا کرے یا اکثریتوں کے فیصلہ کے خلاف اقلیتوں کے تعرضات کی شنوائی کرے -

مقامی رقبات | مختلف ملکوں میں مقامی حکومت کے رقبات مختلف ہیں - انگلستان میں علاقہ ہاے مذہبی ضلعے اور صوبے، فرانس میں کیمون، کینٹن ضلعے اور صوبے، ممالک متحدہ

امریکہ میں قصبے اور صوبے، ہندوستان میں ضلعے، پرگنے اور اتحادات۔ مقامی حکومتوں کے فردیات کی سرحدوں کی حد بندی کے لیے کوئی قاعدہ نہیں ہے چند عناصر شمار میں آسکتے ہیں۔

(۱) تاریخی حالات۔ ہر مقامی رقبہ تا حد امکان ہمنوا ہونا چاہیے۔ لہذا جہاں ممکن ہو مقامی روایات کی وقعت کرنا چاہیے، جہاں تاریخی وحدت موجود ہو وہاں عضوی وحدت زیادہ آسان ہے۔ برطانیہ میں صوبوں اور مذہبی حلقوں کے حدود فی الواقع مقامی حکومت کے جدید نظم کے رائج ہونے سے مدتوں قبل متعین ہو چکے تھے۔ مقامی حکومت کے اغراض کے لیے فطری رقبات قبول کر لیے گئے، یا ان میں خفیف ترمیم کی گئی۔

(۲) جغرافی حالات۔ اکثر دریاؤں، یا پہاڑوں کے ذریعہ سے رقبات کا قطعی تعین ہو جاتا ہے۔

(۳) آبادی کی گنجائش۔ اس کا اطلاق خصوصیت کے ساتھ شہروں میں ہوتا ہے اس معاملہ میں دو متغائر خیالات میں مصالحت پیدا کرنا ضروری ہے۔ رقبہ جس قدر چھوٹا ہوگا اُسی قدر ہر شہری کو اس میں دلچسپی زیادہ ہوگی اور اس لیے وہ جماعت کا زیادہ سرگرم رکن ہو جائے گا۔ اس طرح چھوٹے رقبات شہریت کے بہترین مدارس ہیں، مگر قابل آدمیوں کو یہ اس طرح قابو میں نہیں لا سکتے جس طرح بڑے رقبات، اور اُن رقبات کا مقامی اغراض اور فرقہ بندیوں کے زیر اثر آ جانا زیادہ ممکن ہے۔

(۴) فرائض۔ فرائض کی ترتیب کن معیار اہمیت کے اعتبار سے ہو سکتی ہے۔ سب سے کم اہمیت کے فرائض سب سے چھوٹے رقبات کی مقامی جماعتوں کو دیے جا سکتے ہیں۔ یعنی وہ جماعتیں جن کے اختیارات زیادہ محدود ہوں۔ زیادہ اہم فرائض وسیع تر رقبات کی جماعتوں کو دیے جاتے ہیں۔ مرکزی حکومت اختیارات پر جس حد تک اقتدار رکھتی ہے اس کی حد وسعت کا تعین زیادہ تر اس جماعت کے طرز سے ہوتا ہے جسے مقامی نگرانی تفویض ہوتی ہے۔ جہاں یہ جماعتیں وسیع اختیارات اور ذمہ داریوں کے اُٹھانے کے قابل ہوتی ہیں وہاں مرکزی حکومت انھیں زیادہ اختیارات دینے پر اکثر آمادہ رہتی ہے۔ یہ بھی اشارہ کیا جا سکتا ہے کہ اکثر وسیع تر رقبہ کی جماعتوں کو اپنے حدود اختیارات کے اندر چھوٹے رقبوں یا زیریں رقبوں کی مقامی جماعتوں پر معتدبہ اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔

(۵) مرکزی حکومت کی جانب سے ارادی قیام۔ نئے ملکوں میں یہ طریق آسانی سے اختیار کیا جاتا ہے مگر فرانس کے ایسے ملک میں تاریخی دشواریوں کے حل کرنے کے لیے اسے اختیار کیا

جا سکتا ہے۔

یہ بنیادیں کسی اعتبار سے ایک دوسرے سے متحد نہیں ہوتیں۔ انگلستان کی مقامی حکومت میں اگرچہ تاریخی بنا پر حلقہ مذہبی فرد یہ ہے مگر اس کی آبادی دس سے کم باشندوں سے لے کر تقریباً ساڑھے تین لاکھ تک ہے۔ فرانس میں کمیون جو تاریخی فرد یہ ہے کینٹن کے ساتھ جو ارادی قیام کا نتیجہ ہے، متوازی الوجود ہے۔

چمن گلرنگ شد ہر شاخ گلپوش

(جناب حکیم افتخار علی صاحب جگر صدیقی)

بیا دست اے بتِ بدمست و مدہوش　　غمِ دنیا و دیں کردم فراموش
جمالت را حجاب آمد سرِ طور　　مگر موسیٰ نہ آمد باز در ہوش
سلامت گر خدا از کعبہ آرد　　رسم در بتکدہ سجادہ بردوش
تبسم کرد باز احمد ہمی خواند　　سرِ تربت چو آمد قاتلم دوش
گزشت آں دوست من از کوئے دشمن　　پریشاں زلف و تابوتم سردوش
دلِ من پُر ز شوخے بے وفائے　　ستمگارے ستم آرا ستم کوش
خدایم گر دہد تابِ نظارہ　　ترا بینم بتِ غارت گرِ ہوش
حجابِ شیشہ کے مستور سازد　　شباب دخترِ رز آمد چو در جوش
بیاید از حرم در کعبۂ دل　　بتِ کفر آشنا غارت گرِ ہوش
ببیں از جوشش فصلِ بہاراں　　چمن گلرنگ شد ہر شاخ گلپوش
خطا کن بیخودی اے نشۂ عشق　　کہ دریا وش کنم خود را فراموش
مپرس از بیخودیٔ مستیِ عشق　　چو شد بیہوش باز آمد نہ در ہوش

نہاں شد یارِ من در گوشۂ دل
جگر گاہے نمی آید بآغوش

اقبال اور غزل

(جناب منشی سراج احمد علوی صاحب فانی بی۔ اے)

غزل کی تعریف کرنا اور اسکے تدریجی ارتقا کی داستان دوہرانا ایک فعل عبث ہے، اس لیے کہ فی زمانتا بچہ بچہ کی زبان پر غزلیں چڑھی ہوئی ہیں اور ہر کہ ومہ غزل کی ماہیت سے واقف ہے۔ لیکن زیر بحث مضمون کو کلی طور پر سمجھنے کے لیے ضمناً اگر غزل کی تعریف کر دی جائے تو بے جا نہیں ہے۔

اگرچہ اردو اور فارسی غزل میں بلحاظ مضامین چنداں فرق نہیں مگر مجھے صرف فارسی غزل سے روشناس کرانا منظور ہے۔ غزل کی جو تعریف کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ غزل اُس نظم کا نام ہے جو اشعار مختلف المضامین کا مجموعہ ہو اور جملہ اشعار ہم ردیف وہم قافیہ ہوں مختلف مضامین کے نفرے میں اگرچہ معنوی وسعت بہت ہے مگر شعرائے قدیم کے کلام کے مطالعہ کے بعد یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مختلف مضامین کے تحت کن مضامین کی سمائی غزل میں ہو سکتی ہے۔

غزل ہمیشہ ایسے اشعار کا مجموعہ رہی جن میں ہجر و وصال کے جھگڑے، فلک کے مفروضہ ستموں کے شکوے، محبوب کے خدوخال، زلف و کمر اور لب و رخسار کی ثنا وصفت، رشک و حسد کے مناظر، محبوب کی بے اعتنائی کا رونا، گل وبلبل اور شمع و پروانہ کے سوز وساز خیالی کے مضامین بہ آئین دلفریب و طرز نو بیان ہوے۔

اس صنف شاعری نے امتداد زمانہ کے ساتھ جس قدر زور پکڑا وہ دواوین اور کلیات کی کثرت سے بخوبی ظاہر اور واضح ہے، ہر دور میں شعرا کی نازک خیالی، نفاست پسندی اور ایجاد و اختراع کی خواہش نے غزل کو اتنی ترقی دی کہ شاید علوم مشرقی میں کسی دوسرے علم و فن کو اصولاً یا فروعاً نصیب نہیں ہوئی، اور اس لحاظ سے اگر مشرق اپنی شاعری اور خصوصاً صنف غزل پر ناز کرے تو بجا ہے اس لیے کہ کوئی زبان اس شاعری میں اس سے بازی نہ لیجا سکی۔

لیکن چند لمحوں کے لیے اگر غزل کی اس صوری اور معنوی ترقی کو علحدہ رکھ کر اسے صرف اس حیثیت سے دیکھا جائے کہ جس سرزمین میں اس کی داغ بیل پڑی، جس مالک نے خس و خاشاک سے اسکے چمن کو صاف کیا یا اس خطۂ زمین کے باشندوں نے جہاں جا کر وہ پروان چڑھی اور جہاں گل و برگ سے آراستہ کی گئی اس محنت کا کیا صلہ پایا۔ یا یہ کہ مفعول سے نے

کسی قسم کی اقتصادی، اخلاقی، سیاسی یا روحانی منفعت اس سے جلب کی یا نہیں، تو غزل کی تمام دیدہ فریب ترقیوں کی حیثیت ایک منظر سرابی سے زیادہ باقی نہیں رہتی ہے۔

مجھے یقین ہے کہ میرے یہ جملے اور یہ رائے سُن کر وہ طبقہ جس کا سرمایۂ زندگی شاعری اور خصوصاً تغزل ہے چونک پڑیگا اور فوراً اس نتیجہ پر پہونچ جائیگا کہ ان جملوں کا لکھنے والا حسن اور شاعری کے کوچے سے قطعاً نابلد ہے، جذبات لطیفہ سے عاری ہے یا کم سے کم شاعری اور غزل کے متعلق غلط راستہ پر ہے، اس لیے کہ غزل تو جذباتِ لطیفہ کے اظہار کا ذریعہ دلچسپی کا سامان اور احساسات باطنی کا آئینہ ہے اس سے توقع منفعت اور خوف ضرر خیال خام ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ "خود غلط بود آنچہ ما پنداشتیم" درحقیقت شاعری کے متعلق یہ خیال ہی غلط ہے اور اسی خیال نے ایشیائی شاعری اور بالخصوص اُردو اور فارسی شاعری کو بدنام کرڈالا کسی قوم و ملک کی شاعری حقیقت میں اس کی زندگی کی تفسیر ہے جس سے اسکے تمام خدو خال نمایاں ہوتے ہیں کسی قوم و ملک کی شاعری اسکی معاشرت، اسکے تمدن، اسکے کاروبار حیات، روحانیات اور اسکے عروج وزوال کی پوری داستان ہوتی ہے لہذا یہ کہنا کہ شاعری صرف حصول مسرت کے لیے قطعاً غلط ہے، مختلف ممالک اور اقوام کی شاعری اس بیان کی صداقت کے لیے پیش کی جا سکتی ہے۔

مجھے صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ شاعری خواہ وہ کسی صنف کی ہو مفید اور کارآمد بنائی جا سکتی ہے اور تنگنائے غزل بھی اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ اس بارگراں کی متحمل ہو سکتی ہے کہ ایک طرف وہ جذبات غیر مرئی کی آئینہ دار ہے اور دوسری جانب تمدنی، اخلاقی اور روحانی ارتقا کا پیغام بھی پہونچاتی رہی، نیز یہ کہ جس نے غزل سے یہ کام لینا چاہا وہ کس حد تک اس میں کامیاب ہوا! اور غزل اس صورت میں کس حد تک اپنی اصلی ہیئت میں باقی رہی۔

شعرائے قدیم کے یہاں اگر اس قسم کے اشعار کی تلاش کی جائے تو یہ فعل عبث ہے اس لیے کہ وہاں مقصد شعر صرف رنگینی بیان، مضمون آفرینی، نزاکت تراکیب، حسن تخیل اور جدت ادا تک محدود تھا اور استخراج داد انتہائی کامیابی سمجھی جاتی تھی۔

جیسا کہ مضمون کے ابتدائی حصہ میں غزل کے محدود تنگنائے کا ذکر کرتے ہوئے میں نے لکھا ہے کہ غزل میں کن کن مضامین اور خیالات کی سمائی تھی انکو نظر میں رکھتے ہوئے یہ بہت آسان ہو جاتا ہے کہ غزل کے اندر جن خیالات کا فقدان بیشتر ہوتا ہے وہ معلوم ہو جائیں میں اپنی جگہ پر

یہ سمجھتا ہوں کہ موجودہ دور کے لیے جبکہ ایک جانب ترقی کا دور دورہ ہے۔ مادی ترقی کے راستہ پر ہر کہ دمہ بیتابی کے ساتھ دوڑا چلا جا رہا ہے، دوسری جانب کفر و الحاد کی گھٹائیں چھا رہی ہیں مشرقی دنیا پر نکبت و ادبار کے بادل منڈلا رہے ہیں۔ ہر طرف فقدان عمل کا رونا رویا جا رہا ہے، اتفاق و یگانگت کا خاتمہ ہو رہا ہے، تنگ نظری، پست ہمتی، اور ایمان کی کمزوری، بازوے عمل کو سست کر رہی ہے۔ ضرورت ہے کہ ہر ممکن طریقہ سے مردہ عروق میں حس و حیات کا خون دوڑایا جاتا پیغام عمل پہونچایا جائے، علوے ہمت اور رفعت مقاصد کے احساسات پیدا کرنے والی باتیں سنائی جائیں، سخت کوشی اور خود اعتمادی، عزت نفس و آزادی و حریت کی طلب کا درس دیا جائے، لیکن لکچر سے نہیں، تقریر سے نہیں، بلکہ اس لطیف طریقہ سے کہ بار نہ معلوم ہو۔ اسکے بے غزل کا ساز سب سے بہتر ہے۔ جو لحن و ترنم، سرود و ساز کے پردوں میں ایک طرف فردوس گوش اور کیف آفرینی کے سامان پوشیدہ رکھتی ہے اور دوسری طرف دل میں آہستہ آہستہ گہرے نقوش ثبت کرنے کی بھی اہلیت رکھتی ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ غزل کی اصلاح دراصل کس نے کی اور کہاں تک وہ قابل قدر ہے۔ کامیابی کا سہرا ہمارے ہر دلعزیز اور قومی شاعر اقبال کے سر ہے۔ جو حقیقی معنوں میں قومی شاعر ہیں جنھوں نے عجم و عرب بلکہ یورپ و امریکہ تک اپنی شاعری کا سکہ بٹھا دیا۔ جن کی صدائے درا" خفتگان خواب کو بیدار کرنے میں سب سے زیادہ کامیاب ہوئی۔ جنھوں نے عجمی ساز اور لے کے ذریعہ مشرق مردہ کے عروق میں زندگی کی روح دوڑا دی۔

یہ اقبال کا وہ کارنامہ ہے جس پر اُنکے ہموطن جسقدر فخر کریں بجا ہے۔ اقبال کی شاعری کی خصوصیت اور رجحان شاعری اُنکا وہ "فلسفۂ متحرک" ہے جسکے وہ خود موجد ہیں۔ جو اُن کی شاعری کے تار تار سے ظاہر ہے اور اُنکی شاعری اسلامی تعلیم کا نچوڑ ہے۔

اصل یہ ہے کہ حضرت اقبال نرے شاعر نہیں جن کی شاعری کا دار و مدار شعرائے قدیم کے دواوین کی سیر یا کتب درسی کے مضامین اور خیالی افسانوں پر ہو، بلکہ وہ ایک وسیع الخیال، وسیع النظر اور وسیع التجربہ شاعر ہیں۔ ایک طرف اگر وہ خمخانۂ حجاز کے سرمست ہیں تو دوسری طرف وہ یورپ کے کارخانوں کی تیار کردہ شراب کی لذت سے بھی نا آشنا نہیں ہیں۔ ایک جانب اگر وہ جلال کے فلسفہ سے فیضیاب ہیں تو دوسری جانب گوئٹے، نیٹشا، ہیگل، آئن سٹائن، اور شوپن ہار کے رموز تفلسف سے بھی باخبر ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

اگرچہ زادۂ ہندم فروغِ چشمِ من ست — ز خاکِ پاک بخارا و کابل و تبریز
بیا کہ من ز خمِ پیرِ روم آوردم — مے سخن کہ جواں تر ز بادۂ عنبی ست

ایک جگہ اسکا بھی اعتراف کرتے ہیں۔

خرد افزود مرا درسِ حکیمانِ فرنگ — سینہ افروخت مرا صحبتِ صاحب نظراں

صبا بگلشنِ ویمر سلامِ ما برساں — کہ چشمِ نکتہ وراں خاکِ آں دیار افروخت

وہ صرف حکیم ہی نہیں بلکہ ایک باخبر انسان ہیں جو سیاست، تمدن، معاشرت کے مسائل سے بھی بخوبی آگاہ اور انھیں گہری نظر سے دیکھنے والے ہیں۔ وہ کائناتِ فطرت کے اُن مطالعہ کرنیوالوں میں ہیں جو صرف ظاہری اور سطحی مناظر سے سیر نہیں ہوتے بلکہ ذرہ ذرہ کی ماہیت، حقیقت اور اصلیت کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔

اسکے ساتھ ہی وہ بحیثیت اسلامی مورخ کے بہت بلند پایہ رکھتے ہیں۔ انکے سامنے اسلام کے مدوجزر کے مناظر بے نقاب ہیں۔ نہ صرف یہ کہ وہ ان علل و اسباب سے واقف ہیں بلکہ اُنکے علاج سے بھی آگاہ ہیں۔ مشرق کے دردِ لا دوا، اسلام کے اضمحلال، نکبت و ادبار کا درماں انکے پاس موجود ہے۔ جو صرف ملک و قوم، مذہب و ملت کی بہبودی کی خاطر بلا امیدِ نفع و تمتع پیش کر رہے ہیں۔ اور وہ بھی مختلف رنگوں میں مختلف انداز سے صورت بدل بدل کر نئے شیشوں میں نئے طرز سے، تاکہ تغیر پذیر انسانی فطرتیں دوا کی یکرنگی سے اُکتا نہ جائیں۔ یہ درماں اقبال نظموں کے ذریعہ پیش کر رہے ہیں۔ جن کی تفصیل کی یہاں ضرورت نہیں۔ ان میں سے ایک صنف غزل بھی ہے جسے اقبال نے اپنے پیام کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ اگرچہ حضرت اقبال نے غزل کی طرف ہر صنف شاعری سے کم توجہ کی ہے اور ان کی تعداد ۱۵۰ - ۲۰۰ سے زائد نہیں ہے مگر پھر بھی انکے اندر تعلیمات کے وہ ذخیرے موجود ہیں جو ہر طرح سے کافی ہیں۔

غزلوں کی اس قدر کمی کے باوجود اُن کا تعلیمی خیالات سے پُر ہونا اس بات پر دال ہے کہ حضرت اقبال اپنی دھن کے کیسے پکے ہیں اور جو واحد مقصد اُن کے سامنے ہے اُسے کسی حالت میں بھی فراموش نہیں کرتے بلکہ ہر جگہ اس کی تبلیغ میں کوشاں رہتے ہیں۔ اب میں چند عنوانات کے تحت اُن کی غزلوں سے وہ اشعار پیش کرتا ہوں جو میرے دعوے کو مستحکم کرینگے نیز غزل کا اصلاحی منظر بھی پیش کرینگے۔

(۱) خودی فطرت انسانی کا جوہر ہے، اور اسکا کسی انسان کے دل سے مٹ جانا درصل

اس کی موت کا مترادف ہے ۔لیکن خودی کے معنی تکبر کے ہرگز نہیں کہ وہ مذموم ہے ۔اس نکتہ کے سمجھنے میں اکثر غلطی ہوتی ہے اور خودی کبر نفس کی مترادف قرار پاتی ہے ۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے خودی کے معنی یوں سمجھنا چاہیے کہ ماسوا اللہ کے مقابلہ میں خودی ضروری ہے ۔انسان کو یہ ماننا چاہیے کہ خدا کے جبار کے آگے تو وہ بالکل بے حقیقت ہے لیکن اپنے دائرۂ انسانی میں اُس کی ہستی سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے اور خلیفہ فی الارض سے وہی مراد ہے اور اسی یقین کے ساتھ وہ دنیا میں کچھ کر سکتا ہے ۔ اسی کا نام عزت نفس ہے ۔اقبال اسکی دعوت یوں دیتے ہیں :—

گر بخود محکم شوی سیلِ بلا انگیز چیست　　مثل گوہر در دلِ دریا نشستن می‌تواں
من فقیرِ بے نیازم مشربم این است و بس　　مومیائی خواستن نتواں شکستن می‌تواں
راہ کو راست بجو غوطہ زن اے سالکِ راہ　　جادہ را گم نکند در تہِ دریا ماہی
ز خاکِ خویش بہ تعمیرِ آدمے برخیز　　کہ فرصتِ تو بقدرِ تبسمِ شرر است
نہ شیخِ شہر نہ شاعر نہ خرقہ پوش اقبال　　فقیرِ راہ نشین است و دل غنی دارد
اسرارِ ازل جوئی ؟ برخود نظرے واکن　　یکتائی و بسیاری ، پنہانی و پیدائی
بیا اقبال جامے از خمستانِ خودی درکش　　تو از میخانۂ مغرب زخود بیگانہ می‌آئی
مردم آزادم و آں گونہ غیورم کہ مرا　　می‌تواں کشت بیک جامِ زلالِ دگراں
بتانِ تازہ تراشیدۂ دریغ از تو　　درونِ خویش نکاویدۂ دریغ از تو
طواف کعبہ زدی گردِ دیر گردیدی　　نظر بخویش نہ پیچیدۂ دریغ از تو

ساتھ ہی دریوزہ گری سے یوں ممانعت فرماتے ہیں

بکش آں نغمہ کہ سرمایۂ آب و گل تست　　اے زخود رفتہ تہی شو ز نوائے دگراں
ز خاکِ خویش طلب آتشے کہ پیدا نیست　　تجلیِ دگرے درخورِ تقاضا نیست
آشیانے کہ بنا ئے بہ نہالِ دگراں　　آتش از نالۂ مرغانِ حرم گیر و بسوز
درِ تجا نہ زدم ، مغ بچگا نم گفتند　　آتشے در حرم افروز و تپیدن آموز
تا کجا در تہِ بالِ دگراں می‌باشی　　در ہوائے چمن آزادہ پریدن آموز
مثلِ آئینہ مشو محوِ جمالِ دگراں　　از دل و دیدہ فروشوے خیالِ دگراں
در جہاں بال و پرِ خویش کشودن آموز　　کہ پریدن نتواں با پر و بالِ دگراں

چناں گداختۂ از حرارتِ افرنگ　　ز چشمِ خویش ترا دیدہ ام دریغ از تو

(۲) زندگی چند روزہ کو اگرچہ کوئی بھی منتہائے حیات نہیں جانتا لیکن دنیاوی عزّ و مرتبہ، جاہ و دولت و ثروت و مسرت کو منتہائے مقصد ضرور سمجھتا ہے۔ لیکن اقبال کے نزدیک یہ علوِ ہمت کے خلاف ہے اور انکا منتہائے مقصد ان قیودِ زمان و مکاں سے بھی پرے ہے۔ وہ وقت و مقام کے منازل میں رُک جانا بے ہمتی کا مترادف سمجھتے ہیں۔ اس لیے رفعتِ مقام و علویتِ مقصد کی طرف یوں راہنمائی فرماتے ہیں

بلند تر ز سپہر است منزلِ من و تو　　براہ قافلہ خورشید میل فرسنگ است
نواز حوصلۂ دوستاں بلند تر است　　غزل سرا شدم آنجا کہ ہیچ کس نشنید
بہ شاخ زندگیِ ما نمی ز تشنہ لبی است　　تلاشِ چشمۂ حیواں دلیلِ بے طلبی است
در دشت جنونِ من جبریل زبوں صیدے　　یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ
ایں گنبدِ مینائی، ایں پستی و بالائی　　در شد بدلِ عاشق با ایں ہمہ پہنائی
خاکیم و تند سیر مثال ستارہ ایم　　در نیلگوں یمے بتلاشِ کنارہ ایم
ز وقتِ خویش چہ غافل نشستۂ دریاب　　زمانۂ کہ حسابش بسال و ماہے نیست
ز قید و صیدِ نہنگاں حکایتے آور　　مگو کہ زورقِ ما روشناسِ دریا نیست
ز خود گزشتۂ اے قطرۂ محال اندیش　　شدن بہ بحر و گہر بر نخاستن ننگ است
چو موج سازِ وجودم ز سیل بے پرواست　　گماں مبر کہ دریں بحر ساحلے جویم

(۳) یہ امر مسلمہ ہے کہ بغیر تکلیف اٹھائے آرام حاصل ہونا مشکل ہے اور بغیر جد و جہد کے جو مقصد حاصل ہو جاتا ہے اسکی تحصیل میں وہ مسرت باقی نہیں رہتی جو قلب اُس وقت محسوس کرتا ہے جبکہ ایڑی چوٹی کا زور لگانے، مصائب و تکالیف سے دوچار ہوتے اور صدہا ناکامیاں اٹھانے کے بعد مقصد کی ہمکناری حاصل ہوتی ہے۔ اقبال جد و جہد اور سخت کوشی ہی کو عین مقصدِ زندگی اور ماحصلِ زندگی قرار دیتے ہیں۔ انکے نزدیک اگر خواہی سلامت برکنار است، ننگ و عار ہے اور پست ہمتی کی دلیل۔ ہمتِ مردانہ اور حیات کا رمز دراصل جہدِ مسلسل ہی میں پنہاں ہے۔ اس لیے سخت کوشی اور ایذا پسندی تمام بیماریوں کا علاج ہے خواہ وہ روحانی ہوں خواہ جسمانی، معاشرتی ہوں یا تمدنی، اقتصادی ہوں یا معاشیاتی، چنانچہ اس مسئلہ کی طرف اقبال اس طرح توجہ دلاتے ہیں۔

بکیش زندہ دلاں زندگی جفاطلبی است — سفر بکعبہ نکردم کہ راہ بے خطر است
بآشیاں نہ نشینم زلذتِ پرواز — گہے بشاخِ گُلم گاہ بر لبِ جویم
رمزِ حیات جوئی؟ جز درتپش نیابی — درقلزم آرمیدن ننگ ست آبِ جو را
تیر و سنان و خنجر و شمشیرم آرزوست — با من میا کہ مسلکِ شبیرم آرزوست
از بہر آشیانہ خس اندوزیم نگر — باز ایں نگر کہ شعلۂ درگیرم آرزوست
مریز ہمتِ آں رہروم کہ پا نگذاشت — بجادۂ کہ درو کوہ و دشت و دریا نیست
شریکِ حلقۂ رندانِ بادہ پیما باش — حذر ز بیعتِ پیرے کہ مردِ غوغا نیست
شادم کہ مزارِ من درکوے حرم بستند — راہے زمژہ کاوم از کعبہ بہ بتخانہ
واے آں قافلہ کز دوتیِ ہمت میخواست — رہگذارے کہ درو ہیچ خطر پیدا نیست
درعشق غنچہ ایم کہ لرزد ز بادِ صبح — درکارِ زندگی صفتِ سنگِ خارہ ایم
بایں بہانہ بدشتِ طلب ز پا منشیں — کہ در زمانۂ ما آشنائے دلبرے نیست
دریں رباطِ کہن چشمِ عافیت داری — ترا بہ کشمکشِ زندگی نگاہے نیست

(۵) آزادی نفس ایک بڑی نعمت ہے جس کا چھن جانا موت کا مترادف ہے، زندگی کی وہ گھڑیاں بیش قیمت ہیں جو آزادی کی فضا میں بسر ہوں۔ اقبال آزادی کی قدر و قیمت سے بخوبی واقف ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ایشیا کی غلامی نہ صرف ملکی ہے بلکہ وہ بہت گہری اور مہلک ہے اس نے ایشیائی لوگوں کی ذہنیت کو سرے سے بدل دیا ہے۔ ان میں حریت اور آزادی کی خواہش باقی نہیں رہی ہے اور یہی وجہ ہے کہ انکے اندر اضمحلال روز بروز قوی تر ہوتا جاتا ہے۔

اس غلامانہ ذہنیت کو دُور کرنے کے لیے اور آزادی کی خواہش اسکے حصول کی تمنا اور اسکی اہمیت ذہن نشیں کرانے کے لیے اقبال قوم کو یوں مخاطب کرتے ہیں۔

صورت نہ پرستم من، بتخانہ شکستم من — آں سیل سبکسیرم، ہر بند گسستم من
پا ز خلوت کدۂ غنچہ بروں زن چو شمیم — با نسیمِ سحر آمیز و وزیدن آموز
نا زِ شہاں نمی کشم، زخمِ کرم نمی خورم — در نگر اے ہوس فریب ہمتِ ایں گدائے را
دل بحق بند و کشادے ز سلاطیں مطلب — کہ جبیں بر درِ ایں بتکدہ سودن نتواں
نہ بجادۂ قرارش، نہ بمنزلے مقامش — دلِ من مسافرِ من کہ خداش یار بادا
[illegible] — چہ تواں کرد کہ از کوہ نماید کاہے

(۵) مادی دنیا کی نظر فریب ترقیوں نیز سائنس کے انکشافات نے ایک دنیا کو اسباب و نتائج کے گورکھ دھندے میں پھنسا دیا ہے۔ خصوصاً یورپ کی مادہ پرست نگاہیں ہر شئے کو کیسے، کیونکر اور کیوں کی میزان پر تول کر اسکی ہست و نیست پر حکم لگاتی ہیں۔ مادہ کے تغیر، اسکے ارتقا اسکی ترکیب اور تحلیل کے محدود دائرہ کے اندر وہ ہر شئے کے بود و نبود کو پابند کرنا چاہتے ہیں۔ اس روانیِ طبع اور تفحص نے اگر ایک طرف انھیں کائنات کی کثیر اشیا کی ماہیت سے آشنا کر دیا ہے تو دوسری طرف انھیں خالق فطرت سے روز بروز دور کرتی جا رہی ہیں۔ وہ اپنے محدود علم اور فلسفہ کے ذریعہ سے "لا انتہا" کو پابند مکان و زمان بنانا چاہتے ہیں۔ ذات جبروتی کی تلاش آلات سائنس کے ذریعہ ناممکن ہی نہیں بلکہ محال ہے۔ اسکا نتیجہ یہ ہے کہ یورپ اپنی مادہ پرستی کی دھن میں جس شئے کی تلاش میں سرگرداں ہے اس سے دور ہوتا جاتا ہے اور کنہ حقیقت کی دریافت انکی سمجھ اور کوشش سے بالاتر ہو رہی ہے۔ اقبال اسکی سطحی تلاش کو عقل کی ابلہ فریبی، غلط روی اور کوتاہ بینی سے تعبیر کرتے ہیں انکی راہِ طلب جدا ہے۔ وہ ذات صمدیت کو مرکز قرار دے کر اسکی محبت، پرستش اور طلب کو کائنات عالم کی ماہیت و اصلیت دریافت کرنے کے آلات قرار دیتے اور ذات باری کو مشعل راہ بنا کر تحقیق عالم میں مصروف کار ہوتے ہیں۔ اپنے اس خیال اور آلۂ کار کو عشق سے تعبیر کرتے اور طرح طرح سے یہ امر ذہن نشین کرنا چاہتے ہیں کہ عقل کوتاہ بیں راہ ترقی میں حائل ہے لہذا اس سے ترک مشورہ اولیٰ ہے اور مشکلات سے نکلنے کے لیے عشق کو راہبر بنانا چاہیے۔ چنانچہ فرماتے ہیں

اے کہ در مدرسہ جوئی ادب و دانش و ذوق   نخرد بادہ کس از کارگہ شیشہ گراں
گرچہ متاع عشق را، عقل بہائے کم کند   من نہ ہم بہ تخت جم، آہِ جگر گداز را
بہ رہ عاقلی رہا کن کہ با او تواں رسیدن   بدل نیاز مندے بہ نگاہ پاکبازے
بچشم عشق نگر تا سراغ او گیری   جہاں بچشم خرد سیمیا و نیرنگ است
زعشق درس عمل گیر و ہر چہ خواہی کن   کہ عشق جوہر ہوش است و جان فرہنگ است
اگرچہ عقل فسوں پیشہ لشکرے انگیخت   تو دل گرفتہ نباشی کہ عشق تنہا نیست
نشان راہ ز عقل ہزار حیلہ مپرس   بیا کہ عشق کمالے ز یک فنی دارد
فریب کشمکش عقل دیدنی دارد   کہ میر قافلہ و ذوق رہزنی دارد
خوش آنکہ رخت خرد را بشعلۂ می سوخت   مثال لالہ متاعے ز آتشے اندوخت
عشق در صحبت میخانہ بہ گفتار آید   زانکہ در دیر و حرم محرم اسرارش نیست

بگذر از عقل و در آویز بموج یم عشق — کہ دراں جوے تنک مایہ گہرے پیدا نیست

نہ رسد فسونگری خرد بہ تپیدن دل زندۂ — ز کنشت فلسفیاں درا بحریم سوز و گداز من

خدا از خرد کہ بدستم نقش نامرادی — دل ما برد و بسازے کہ گسستہ تار بادا

شعلہ در آغوش دارد عشق بے پرواے من — بر نخیزد یک شرر از حکمت نازاے من

گفتم این کہ کتاب خرد فرو خواندی — حدیث شوق نہ فہمیدۂ دریغ از تو

در بود و نبود من اندیشہ گمانہا داشت — از عشق ہویدا شد این نکتہ کہ ہستم من

عشق پامال خرد گشت و جہاں دیگر شد — بود آیا کہ مرا رخصت آہے بخشند

فرنگ شیشہ گری کرد جام و مینا ریخت — بحیرتم کہ ہمیں شیشہ را پری دانند

(۶) اقبال اُن شاعروں میں نہیں جو تصوراتِ لایعنی کے پیچھے تضیع اوقات کریں۔ وہ خیالی ہجر یار، اسکے ستم و جور، اسکی ایذا رسانی اور چرخ کی کجروی کا رونا نہیں روتے۔ انھیں دل کی بیوفائی اور رقیب کی روسیاہی اور خوش قسمتی کا ذکر کرنا نہیں آتا۔ وہ اگر ماتم کناں ہیں تو قوم کے جمود پر، اُنھیں رونا آتا ہے تو اسلام کی تباہی پر، وہ گریاں ہیں تو مسلمانوں کی بے پروائیوں اور احساس مُردہ پر، اُنھیں شکوہ ہے تو اپنی پیغام اور اپنی دعوت کی ناپذیرائی پر۔ چنانچہ فرماتے ہیں

کس نہ دانست کہ من نیز بہائے دارم — آں متاعم کہ شود دست زد بے بصراں

بخاک ہند نواے حیات بے اثر است — کہ مردہ زندہ نگردد ز نغمۂ داؤد

نواے من بہ عجم آتش کہن افروخت — عرب ز نغمۂ شوقم ہنوز بے خبر است

نوا ز حوصلۂ دوستاں بلند تر است — غزل سرا شدم آنجا کہ ہیچکس نشنید

صبح دمید و کارواں کرد نماز و رخت بست — تو نشنیدۂ مگر زمزمۂ دراے را

بے نیازانہ ز شورہ نوایم مگذر — مرغ لاہوتم و از دوست پیامے دارم

حدیث دل بکہ گویم چہ راہ برگیرم — کہ آہ بے اثر است و نگاہ بے ادب است

تو جوان خام سوزے سخنم تمام سوزے — غزلے کہ می سرایم بتو سازگار بادا

بخواب رفتہ جواناں و مردہ دل پیراں — نصیب سینۂ کس آہ صبحگاہی نیست

دل یاراں ز نواہاے پریشانم سوخت — من ازاں نغمہ تپیدم کہ سرودن نتواں

ز خود رمیدہ چہ داند نواے من ز کجاست — جہان او دگر است و جہان من دگر است

باین بہانہ دریں بزم محرمے جویم — غزل سرایم و پیغام آشنا گویم

گمراز نغمہ شوقم کہ بیابی در وے　　　رمز درویشی و سرمایۂ شاہنشاہی

(۷) خانقاہی دنیا نے اسلام کو جس قدر نقصان پہونچایا اور اب تک پہونچا رہی ہے وہ ظاہر ہے۔ ان خدایان ریا و نمود نے تصوف کا طلسم باندھ کر شریعت اسلامی پر جو ضرب کاری لگائی اس کی تلافی نہیں ہو سکتی اور یہی وجہ ہے کہ اکثر شعرا نے ان فقرا اور علما سے ظاہری پردہ دری کی ہے۔ اقبال نے بھی ان سے پرہیز کرنے کی دعوت دی ہے

بیا کہ دامن اقبال را بدست آریم　　　کہ او ز خرقہ فروشان خانقاہے نیست
دل بادیہ بند و ازیں خرقہ فروشاں بگریز　　　نشوی صید غزالے کہ ز تاتارش نیست
پیر ما مصلحتاً رو بمجاز آوردہ است　　　ورنہ با زہرہ وشاں ہیچ سروکارش نیست
گرچہ از طور و کلیم است بیان واعظ　　　تاب آں جلوہ در آئینۂ گفتارش نیست
خورم بیاد تنک نوشی امام حرم　　　کہ جز بہ صحبت یاران راز داں بخشید
دلم تپید ز محرومی فقیہ حرم　　　کہ پیر میکدہ جامے بہ نقد جانے نفروخت
زمرہ در کعبہ اے پیر حرم اقبال را　　　ہر زماں در آستیں دارد خداوندے دگر
بہ علم غرہ مشو کار میکشی دگر است　　　فقیہ شہر گریبان و آستیں آلود

(۸) اگرچہ اقبال کی غزلوں کی متذکرۂ بالا خصوصیات دکھانے کے بعد چنداں ضرورت باقی نہیں رہتی کہ غزل کے اندر مضامین کے تنوع کی مثالیں پیش کی جائیں اور ان سے انکے پختگی سخن کے دعوے کو مضبوط کیا جائے لیکن اس خیال سے کہ "منکران اقبال" یہ نہ سمجھیں کہ اقبال کی غزلگوئی صرف متذکرۂ بالا مضامین کی تنگنا سے تک محدود ہے۔ اقبال کے ان اشعار کا انتخاب بھی بیجا نہ ہوگا جن سے اس خیال کی تردید ہوتی ہے۔ اقبال نہ صوفی ہیں اور نہ اس تصوف کے مدعی جو مسلم کش ثابت ہوا۔ لیکن حقیقت ہیں ضرور ہیں۔ نگاہ میں عمیق بینی موجود ہے، وہ مسائل جو ہمیشہ سے مرکز قیل و قال رہے ان کی باریکیوں سے واقف ہیں۔ حال و قال کے نازک فرقوں سے بخوبی آشنا ہیں۔ چنانچہ کبھی کبھی پردۂ شعر میں وہ ان رازہا سے نہفتہ کی طرف لطیف اشارے سے متوجہ کرتے ہیں۔ اقبال کے یہاں ابھرتی ہے اشعار کا فقدان ہے۔ اس لیے اس قسم کے اشعار بھی زائد نہیں ہیں۔ لیکن جس قدر بھی ہیں وہ حقائق و معارف کے نگینے ہیں جن کا مطالعہ لطف سے خالی نہیں۔

گماں مبر کہ سرشتند در ازل گل ما　　　کہ ما ہنوز خیالیم در ضمیر وجود

نظر بخویش فرو بستہ ام نشان این است
دگر سخن نہ سراید ز غائب و موجود

مرا ز دیدۂ بینا شکایت دگر است
کہ چوں بجلوہ درآئی حجاب من نظر است

میانہ من و او ربط دیدہ و نظر است
کہ در نہایت دوری ہمیشہ با اویم

"حرف نگفتۂ شما" بر لب کودکاں رسید
از من بے زباں بگو خلوتیان راز را

پرتو حسن تو می افتد بروں مانند رنگ
صورت مے پردہ از دیوار مینا ساختی

برہنہ حرف نگفتن کمال گویائی است
حدیث خلوتیاں جز بہ رمز و ایما نیست

اقبال بہ بند در رازے کہ نیاید گفت
ناپختہ بروں آید از خلوت میخانہ

بے تو از خواب عدم دیدہ کشودن نتواں
بے تو بودن نتواں با تو نہ بودن نتواں

در جہان است دل ما کہ جہاں در دل ماست
لب فرو بند کہ ایں عقدہ کشودن نتواں

در طلبش دل تپید دیر و حرم آفرید
ما بہ تمنائے او، او بہ تماشائے ماست

کسے کہ زخمہ رساند بتار ساز حیات
ز من بگیر کہ آں بندہ محرم راز است

تا حدیث تو کنم بزم سخن می سازم
ورنہ در خلوت من انجمنے نیست کہ نیست

در قبائے عربی خوشتر ک آئی بہ نگاہ
راست بر قامت تو پیرہنے نیست کہ نیست

تیغ لا در پنجۂ کافرے دیرینہ دہ
باز بنگر در جہاں ہنگامۂ الاّے من

با خدا در پردہ گویم با تو گویم آشکار
یا رسول اللہ! او پنہاں و تو پیدائے من

چوں بجان من درآئی دگر آرزو نہ بینی
گر ایں کہ شبنم تو یم بے کنار بودی

نظر تو ہمہ تقصیر و خرد کوتاہی
نرسی جز بہ تقاضائے کلیم اللّٰہی

آخر میں حضرت اقبال کے اُن اشعار کا انتخاب دلچسپی کا باعث ہوگا جو احساسات لطیف کا مظہر ہیں جنھیں دنیا ہر شاعر کے کلام میں ڈھونڈھتی ہے اور تیر و نشتر اور دشنہ و خنجر سے موسوم کرتی ہے۔ اقبال کے ان نشتروں کو بھی ملاحظہ کیجیے۔

بہار تا بگلستاں کشید بزم سرود
نوائے بلبل شوریدہ چشم غنچہ کشود

چہ نقشہا کہ نہ بستم بکارگاہ حیات
چہ رفتنی کہ نہ رفت و چہ بودنی کہ نہ بود

حلقہ بستند سر تربت من نوحہ گراں
دلبراں، زہرہ وشاں، گلبدناں، سیمبراں

یک نگہ، یک خندۂ دزدیدہ، یک تابندہ اشک
بہر پیمان محبت نیست سوگندے دگر

عشق را نازم کہ از بیتابی روز فراق
جان ما را بست با درد تو پیوندے دگر

مثال لالہ فتادم بگوشۂ چمنے
بپئے نظارۂ روئے تو می کنم پاکش
بخلوتے کہ سخن می شود حجاب آنجا
جادہ ز خونِ رہرواں تختۂ لالہ در بہار
دیدۂ خوابناکِ او دگر بچمن کشودۂ
بمتاعِ خود چہ نازی کہ بشہر دردمنداں
برہِ تو ناتمامم ز تغافلِ تو خامم
سرمایۂ دردِ تو غارت نتواں کردن
محبت چوں تمام افتد رقابت از میاں خیزد
بہ سازِ زندگی سوزے، بہ سوزِ زندگی سازے
ایں نکتہ را شناسد آں دل کہ دردمند است
اے بلبل از وفایش صد بار با تو گفتم
گفتی مجو وصالم بالاتر از خیالم
آشنا ہر خار را از قصۂ ما ساختی
صد جہاں می روید از کشتِ خیالِ ما چو گل
از روزگارِ خویش ندانم جز ایں قدر
کو آں نگاہِ ناز کہ اول دلم ربود
در عشق و ہوسناکی دانم کہ تفاوت چیست
ہوشم برد اے مطرب مستم کند اے ساقی
قصۂ دل نگفتنی ست درد جگر نہفتنی ست
ز مرگ و زیست چہ پرسی دریں رباطِ کہن
ایں کیست کہ بر دلہا آوردہ شبیخونے
ہر کس نگہے دارد ہر کس سخنے دارد
اے جان گرفتارم دیدی کہ محبت چیست
مشتِ گلیم و ذوقِ فغانے نداشتیم

مرا ز تیر نگاہے نشانہ بر جگر است
نگاہِ شوق بجوئے سرشک می شوئیم
حدیثِ دل بہ زبانِ نگاہ می گوئیم
ناز کہ راہ می زند قافلۂ نیاز را
رخصتِ یک نظر بدہ، نرگسِ نیم باز را
دلِ غزنوی نیرزد بہ تبسمِ ایازے
منِ جاں نیم سوزے، تو و چشمِ نیم بازے
اشکے کہ ز دل خیزد در دیدہ شکستم من
بطوفِ شعلۂ پروانہ با پروانہ می سازد
چہ بیدردانہ می سوزد چہ بیتابانہ می سازد
من گرچہ توبہ گفتم نشکستہ ام سبو را
تو در کنار گیری باز ایں رمیدہ بو را
عذرِ نو آفریدی اشکِ بہانہ جو را
در بیابانِ جنوں بردی و رسوا ساختی
یک جہان و آں ہم از خونِ تمنا ساختی
خوابم ز یاد رفتہ و تعبیرم آرزوست
عمرت دراز باد دہاں تیرم آرزوست
آں تیشۂ فرہادے ویں حیلۂ پرویزے
گلبانگ دل آویزے از مرغِ سحر خیزے
خلوتیاں! کجا برم لذتِ آہِ بے صدا
کہ زیست کاہشِ جاں مرگ جانکنی دارد
صد شہر تمنا را یغما زدہ ترکانہ
در بزم تو می خیزد افسانہ ز افسانہ
در سینہ نیا سائی از دیدہ بروں آئی
شوخانۂ ما ز گردشِ پیمانۂ دل است

قدم بیباک تر نہ در حریم جان مشتاقاں — تو صاحب خانہ آخر چرا دزدانہ می آئی
تب و تاب بتکدۂ عجم نرسد بہ سوز و گداز من — کہ بیک نگاہ محمد عربی گرفت حجاز من
جہاں عشق نہ میری و سروری داند — ہمیں بس است کہ آئین چاکری داند
دل من قشقہ زد و برہمنی کرد و لے — آں چناں کرد کہ شایستۂ زنارش نیست
کجاست منزل آں خاکدان تیرہ نہاد — کہ ہر چہ ہست چو ریگ رواں بہ پرواز است
چشم آفریدہ ایم چو نرگس دریں چمن — مژدہ بند برکشا کہ سراپا نظارہ ایم
گرچہ لعل تو خموش است و لے چشم ترا — با دل خوں شدۂ ما سخنے نیست کہ نیست
گناہ ما چہ نویسند کاتبان عمل — نصیب ما ز جہان تو جز نگاہے نیست
از سپہر بارگاہت یک جہاں دور نصیب — جلوہ داری دریغ از وادی سینائے من
چوں تمام افتد سراپا ناز می گردد نیاز — قیس را لیلیٰ ہمی نامند در صحرائے من

کلامِ فرحت

(جناب مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب دہلوی سشن جج ریاست نظام)

بنی تھی برق بھی کیا میرے ہی جلانے کو — لگا دی آگ جو چھٹتے ہی آشیانے کو
خدا ہی جانے کہ پڑتی ہے آگے کیا افتاد — لگا تو بیٹھے ہیں ہم اپنا دل لگانے کو
ترے تغافلِ بیجا سے ہم نے لاکھوں ستم — اٹھائے اور ہیں تیار پھر اٹھانے کو
قفس میں روتے تھے کیا کیا ہم آشیاں کے لیے — اب آشیاں میں ترستے ہیں اپنے دانے کو
سدا زمانہ رہا ہم سے برسرِ پیکار — کہیں زمانہ کو پھر کیا اور اس زمانے کو
جوانی جا کے مرے دوستو۔ نہیں آتی — لٹا دیا یوں نہ خدارا تم اس خزانے کو
گیا نہیں ابھی قاصد، مگر ہے میرا یہ حال — کہ دوڑ دوڑ کے جاتا ہوں اسکے لانے کو
جو تھیں جوانی کی راتیں گئیں جوانی کے ساتھ — مگر لیے ہوئے بیٹھے ہیں اس فسانے کو
سنی تو ہوگی مثل "جرب المجرب" کی — بس اور کیا کہوں اس تیرے آزمانے کو
کہاں میں طائرِ آزاد اور کہاں یہ قفس — مگر میں کیا کروں قسمت کے آب و دانے کو
کچھ ایسی دلکشی بزم جہاں میں ہے فرحت — کہ آ کے جی نہیں ہوتا یہاں سے جانے کو

خود نوشت میرزا محمد خاں قزوینی

(جناب مرزا محمد عسکری صاحب بی اے)

(سلسلۂ الناظر نمبر ۵)

انجمن علمی و ادبی در برلن آقائی تقی زادہ نے ان اصحاب کی موجودگی برلن میں غنیمت سمجھ کر ایک ادبی و علمی انجمن قائم کی تھی کہ جس کی نشست ہر شب چہار شنبہ کو ہوتی اور دس پندرہ ممبر "کاوہ" کے دفتر میں جمع ہوتے اور انواع مسائل علمی و ادبی و فنی پر گفتگو کرتے ۔ اور یہ بھی مقرر تھا کہ ہر ایک ممبر اس انجمن کا باری باری کسی خاص موضوع پر جو قبل سے وہ خود اپنے واسطے مقرر کر سکتا تھا، کوئی مضمون تیار کر کے ممبران انجمن کے سامنے سنائے ۔

ممبران انجمن بانیان انجمن میں یہ حضرات تھے :- (۱) میرزا فضل علی آقا مجتہد تبریزی وکیل سابق آذربائیجان جو فی الحقیقت ادبیات عرب میں یدطولیٰ رکھتے تھے ۔ برلن میں آخری تاریخ جمادی الآخر ۱۳۳۹ھ وفات پائی ۔

(۲) آقائی سید محمد علی خاں جمال زادہ جو اُن لوگوں سے ہیں جن سے ایران کی بہترین آیندہ امیدیں وابستہ ہیں ۔ اُن کی کتاب "روابط روس و ایران" اُن کی وسعت معلومات، قوتِ انتقاد، اور نکتہ رسی بطرز یورپ کا بہترین نمونہ ہے ۔ اور دوسری کتاب "یکے بود و یکے نبود" سے بخوبی معلوم ہو جاتا ہے کہ ایک انشا پرداز سہل و سادہ اور بے تکلف طریقے سے غیر زبانوں کے الفاظ خارج کر کے، ہر چند کہ یہ کام آسان نہیں ہے، ایک عمدہ اور مفید کتاب کیونکر تیار کر سکتا ہے ۔ یہ ایک خاص طرز و شیوہ ہے اگر کوئی ایرانی جدید یہ چاہے کہ اپنی زبان مادری میں کچھ لکھے اور یہ بھی چاہے کہ بسبب عجز و مجبوری کے کسی غیر زبان کے الفاظ و جملے اور اسالیب بیاں اہل یورپ سے نقل کرے جیسا کہ اس زمانے کے بعض لکھنے والوں کا بُرا طریقہ ہے تو یہ بالکل ممکن ہے ۔

(۳) آقائی میرزا محمود خاں غنی زادہ آذربائیجان کے نہایت فصیح اور شیریں زبان شاعر جن کا پُر لطف کلام "کاوہ" اور "ایرانشہر" کے صفحات پر اکثر شایع ہوتا رہتا ہے ۔

(۴) آقائی میرزا حسین خاں کاظم زادہ مدیر مجلہ (رسالہ) "ایرانشہر" مطبوعہ برلن کہ خود وہ رسالہ اُنکی علمی و ادبی لیاقت کا بہترین ثبوت ہے ۔

(۵) آقائی میرزا محمد علی خاں تربیت آذربائیجان کے مشہور فاضل ۔
(۶) آقائی سید محمد رضائی مساوات ۔ مشہور فاضل فلسفی ۔
(۷) میرے قدیم دوست جو اس وقت برلن میں مقیم تھے آقائی میرزا ابراہیم پورداود عصر حاضر کے مشہور شاعر صاحب طرز جدید اُس تعصب خاص کے جو اُن کو قوم عرب اور زبان عرب کے ساتھ ہے الفاظ فارسی خالص استعمال کرنے پرتلے ہوے ہیں، مثلاً خواجہ حافظ کے اس شعر پرسے

اگرچہ عرض ہنر پیش یار بے ادبی ست — زباں خموش ولیکن دہاں پُر از عربی ست

خواجہ سے سخت ناراض ہیں کہ عربی کو جزو ہنر کیوں شمار کیا ۔ یہ حقیر باوجودیکہ اُن کے اس خیال سے یعنی یہ کہ زبان عربی کے ساتھ اس قدر ہٹ دھرمی برتی جائے، ہرگز متفق نہیں ہے مگر پھر بھی اُنکی عصبیت و جذبۂ قومی و وطن پرستی کا جان و دل سے معترف ہے

برلن کے مستشرقین سے ملاقات اس قیام برلن کے زمانے میں جن جرمن مستشرقین سے میں ملا اور ان کی معلومات سے بہرہ اندوز ہوا' یہ حضرات ہیں :۔

(۱) پروفسور مارکوارت (G. Marquart) مشہور جرمن مستشرق صاحب تصانیف کثیرہ مثلاً کتاب "ایرانشہر" جس میں ایران قدیم کا جغرافیہ نہایت شرح و بسط سے بیان کیا ہے وغیرہ ۔ فی الواقع ان کا تبحر اور وسیع معلومات عجائب روزگار سے ہیں ۔ ان کا حافظہ علوم کا ایک سمندر معلوم ہوتا ہے ۔ زبان پہلوی و فارسی و عربی و ارمنی و سریانی کو بخوبی جانتے ہیں ۔ ترکوں کے اس مضحک دعوے کا کہ اکثر دنیا کے مشہور لوگ زمانۂ قدیم سے لیکر آج تک قوم تُرک سے تھے یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور زردشت اُن کے عقیدے کے بموجب ترکی الاصل تھے اور اس قسم کے اُن کے عقیدے کے بموجب ترکی الاصل تھے اور اسی قسم کے اُن کے عجیب و غریب خیالات کا اُنھوں نے خوب خاکہ اُڑایا ہے ۔ ارمنی لوگ اُن سے بہت اتحاد رکھتے ہیں اور اُن کی معلومات سے سیاسی فوائد کے خیال سے ان کا بہت زیادہ احترام کرتے ہیں مگر ایرانی چونکہ اُن کو نہیں پہچانتے اُن سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھاتے

(۲) پروفسور زاخاؤ (Eduard Sachau) کہ جن کی شہرت دُنیا بھر میں ہے ۔ عربی و سریانی و سنسکرت کے عالم متبحر ۔ فارسی بھی ایک حد تک جانتے ہیں ۔ ابوریحان بیرونی کی "الآثار الباقیہ" اور "تاریخ الہند" کی کمال خوبی سے صحت اور اُس کا ترجمہ بھی زبان انگریزی میں کیا ہے ۔ قریب بیس سال سے کتاب مشہور "طبقات ابن سعد" کی طباعت میں مشغول ہیں ۔ جس کی اب تک چودہ جلدیں شایع

ہو چکی ہیں۔

(۳) ڈکتور موریتز (B. Moritz) مدیر کتاب خانۂ مدرسۃ السنۂ مشرقیہ برلن۔ جس قدر خطوط کہ اسلام میں جاری ہیں اُن کے پڑھنے میں یہ متخصص ہیں اور ایک بہت بڑی کتاب جس میں مختلف خطوط اسلامی کے عکس درج ہیں شروع زمانہ ہجرت سے آج تک تمام کتب اور اسناد سے جمع کرکے جو بالفعل دنیا بھر کے کتاب خانوں میں موجود ہیں انھوں نے تیار کی ہے جو نہایت مفید مضمون خطوط عربی کے متعلق دائرۃ المعارف اسلامی میں مندرج ہے انھیں کے قلم سے ہے۔

(۴) ماسوف علیہ پروفسور ہارتمن[1] (Martin Hartmann) مشہور مستشرق اور زبان عربی و فارسی کے متخصص۔ ان کی تصانیف کثرت سے ہیں۔ باوجود کبرسن، سفید داڑھی، اور خمیدہ قد کے ستر برس کی عمر میں برلن میں مجھ سے ادبیات فارسی پڑھتے تھے اور مرنے سے ۹ دن پیشتر تک یہ عمل ایک جوانانہ ہمت کے ساتھ جاری تھا۔

(۵) ماسوف علیہ پروفسور مان[2] (Oskar Mann) زبان فارسی و کُردی کے عالم۔ ایران میں متعدد سفر کر چکے ہیں اور زبانِ کُردی میں مختلف تصانیف رکھتے ہیں۔

(۶) پروفسور میتوخ (Eugen Mittwoch) مشہور عربی داں۔ "طبقات ابن سعد" کا ایک جزو ان کی تصحیح سے شایع ہوا ہے۔

(۷) پروفسور فرانک (Frank) متخصص زبان سریانی۔

(۸) سباستیان بک (Sebastian Beck) مؤلف صرف و نحو زبان فارسی در زبانِ جرمن۔ باوجود کثرتِ اغلاط جامع ترین صرف و نحو کی کتاب ہے جو اب تک زبان فارسی کے متعلق خود فارسی یا کسی یوروپین زبان میں لکھی گئی ہے۔

مگر افسوس ہے کہ اس طویل مدت میں بھی میں سب سے بڑے اور سب سے بوڑھے جرمن مستشرق (آجکل ۸۸ سال کے ہیں) اُستاد نولدکیہ (Theodor Noldeke) کی شرف ملاقات سے مستفید نہیں ہوا۔ ہر چند کہ اس کا کمال شوق رکھتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ میرے قیام برلن کے زمانے میں وہ استرازبورگ (Strassbourg) میں تھے اور ظاہر ہے کہ ایام جنگ میں ایک شہر سے دوسرے شہر جانا کس قدر مشکل تھا علی الخصوص السیس و لورن (Alsace-Lorraine) میں۔ اُستاد موصوف مشہور تاریخ ساسانیان اور مختلف قیمتی تالیفات کے ایک مبسوط کتاب اور تمام

---

[1] ۵ دسمبر ۱۹۱۸ء کو برلن میں وفات پائی

[2] ۵ دسمبر ۱۹۱۷ء کو برلن میں وفات پائی۔

علوم و فنون میں جو زبان عربی و عبری و سریانی و پہلوی و فارسی سے تعلق رکھتے ہیں کمال و تفقیت رکھتے ہیں۔ سنہ ۱۹۰۶ء میں جب اُستاد موصوف کی عمر ستر سال کی ہوئی تو یورپ کے تمام مستشرقین نے ان کی سالگرہ کے موقع پر دو ضخیم جلدوں میں اُن کے حالات میں تیار اور شایع کی۔ اس کتاب میں اُستاد بزرگ کی ۵۶۴ تصانیف از قسم کتب و رسالہ جات و مضامین کا ذکر کیا ہے۔ اور اس تاریخ سے آج تک ۱۸ برس گزر چکے غالباً اس عدد پر کچھ اور اضافہ ضرور ہوا ہوگا۔

یادگار نکتہ | چونکہ مستشرقین کی صحبت کا یہاں ذکر ہوا لہذا یہ نکتہ بھی جو میرے ذاتی تجربے سے ہے اس گفتگو کے آخر میں بیان کر دینا نامناسب نہیں ہے اور وہ یہ ہے کہ میرے تمام ہموطنوں پر واضح ہو جائے کہ یورپ میں مستشرقین کے دائرہ میں اکثر جھوٹے عالم نما شارلاتان[1] اصلی اور حقیقی مستشرقین سے بمراتب زیادہ پائے جاتے ہیں۔ اور اگرچہ یہ مسئلہ تمام نوع انسان پر حاوی ہے اور تمام ممالک دنیا میں اور ہر علم و فن کی نسبت یہ پایا جاتا ہے اور یوروپی مستشرقین سے اس کی کوئی خصوصیت نہیں مگر پھر بھی یوروپی مستشرقین کے متعلق یہ عجیب و غریب خصوصیت رکھتا ہے جس کی وجہ شاید یہ ہے کہ بموجب مشہور فرانساوی مثل کے "در مملکت کوراں آدم یک چشم بادشاہ است" (اندھوں میں کانا راجہ) چونکہ اہل یوروپ عموماً مشرقی اوضاع اور مشرقی علوم و فنون اور نیز مشرقی زبانوں سے ناواقف ہوتے ہیں لہذا جھوٹے مدعیوں اور شارلاتانوں کے لیے جو محض دو ایک مشرقی زبانیں ایک حد تک جانتے ہیں اور انھیں میں امتحان دے چکتے ہیں ایسا امتحان لینے والوں کی قابلیت امتحان دینے والوں سے کسی طرح زیادہ

[1] مصنف علام نے جو نکتہ یہاں ایرانیوں کے گوش گزار کیا ہے وہ ہم ہندوستانیوں کو بھی اچھی طرح یاد رکھنا چاہیے۔ مصنوعی اور نقلی مستشرقین کے متعلق فاضل مصنف نے جو ایک سخت لفظ "شارلاتان" (charlatan) استعمال کیا ہے اس کا ترجمہ بعض ہندوستانی انگلستان واپس شدہ عربی و فارسی محققین کی خاطر سے یہاں عمداً ترک کر دیا گیا تاکہ ان کو اپنے بعض اساتذۂ باکمال کی نسبت یہ لفظ ناگوار خاطر نہ ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم بہ نصیب تحصیل علم کی غرض سے جب یورپ جاتے ہیں تو بیشتر ایسے ہی جو فروش گندم نما اصحاب سے دوچار ہوتے ہیں جن کی تعریفیں اس پیراگراف میں کی گئی ہیں اور اپنے زعم میں ہم ان کو آسمان علم و فضل کا ایک درخشاں ترین ستارہ خیال کرنے لگتے ہیں اور جب یہاں واپس آتے ہیں تو انھیں کی جھوٹی علمیت، مصنوعی کمال، نیز اُن کی بددماغی و نازک مزاجی اور قدیم طریقۂ تعلیم و تعلم سے کسر نفرت و حقارت کا اظہار انھیں کی تقلید میں کرنے لگتے ہیں اور "ہچو من دیگرے نیست" کی ہوا ہمارے سر میں سرایت کر جاتی ہے۔ اللھم احفظنا من شرور ترہاتھم۔ (مترجم)

نہیں ہوتی ایک عجیب وسیع میدان اپنے اظہار کمال کا پیدا ہو جاتا ہے لہذا یہ لوگ کوئی نہ کوئی وسیلہ ڈھونڈھ کر کسی زبان مشرقی کی معلمی پر فائز ہو جاتے ہیں جسکے بعد اُس زبان کی تعلیم مع دیگر زبانوں کے اُسی ایک زبان میں شامل کر دی جاتی ہے مثلاً فارسی و عربی و ترکی اور نیز تمام علوم و فنون کہ جو ان زبانوں میں ہیں اور تمام متعدد لہجے کہ جو مختلف مقامات پر رائج ہیں۔ ان سب کی تعلیم کسی ایک شخص کے سپرد کر دی جاتی ہے اور یہ لوگ بغیر کسی شرم اور خوف بدنامی کے (اس وجہ سے کہ عام لوگوں کو اصل و نقل کی تمیز ہی نہیں ہوتی) اُن تمام زبانوں اور علوم سے واقفیت کا دعوٰی کرنے لگتے ہیں اور درس دینا شروع کر دیتے ہیں اور تصنیفات بھی کرنے لگتے ہیں اور خاص خاص نظریئے بھی دنیا میں پیش کرتے ہیں اور کبھی یہ غضب کرتے ہیں کہ عربی، فارسی، ترکی کی کوئی کتاب لیکر اُسکو مسخ کر کے اغلاطِ فاحشہ کے ساتھ چھپوا دیتے ہیں۔ برخلاف معلمین زبان یونانی و لاطینی کے کہ ان زبانو سے اہل یورپ عموماً کچھ نہ کچھ ضرور واقف ہوتے ہیں مگر ان بیچاروں کے دعوے عربی و فارسی مستشرقین سے بہت کم بلکہ دسواں حصہ بھی نہیں ہوتے۔ اور کسی ایک چھوٹے شعبے تک ان دو زبانوں سے محدود رہتے ہیں اور فضیحت و بدنامی کے ڈر سے یہ لاطینی و یونانی داں اپنی کملی سے پاؤں بڑھانے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ غرضکہ مقصد یہ ہے کہ میرے عزیز ہموطن ایسے دھوم دھڑاکے کے الفاظ سے مثلاً "معلم السنۂ شرقیہ" و "عضو انجمن علمی فلاں و فلاں" وغیرہ سے ہرگز دھوکا نہ کھائیں اور عام طور پر اہل یورپ جو اس معاملے میں لن ترانیاں اُڑاتے ہیں اُس سے چشم پوشی کریں تا وقتیکہ وہ اعتبار کی کسوٹی پر پوری نہ اُتریں اور اُسکو وحی منزل ہرگز نہ جانیں بلکہ ہر چیز میں حق و باطل کی تمیز کی معیار عقل خداداد کو تصور کریں اور اُسی معقول ترازو سے تمام ایسے دعووں کو تولا کریں "تا کہ راہ کو چاہ سے اور خضر کو غول گمراہ سے پہچان سکیں۔

الغرض شروع جنگ سے لیکر اختتام جنگ سے دو ایک سال بعد تک میں برلن ہی میں رہا اور ہر چند کہ دلی تمنا تھی کہ "تاریخ جہاں کشائے جوینی" کی طباعت کا انتظام کرنے کے لیے میں پیرس جلد سے جلد پہونچوں مگر روابط دوستی بین الملّی اب تک درست نہیں ہوئے تھے اور اسی وجہ سے ایک ملک سے دوسرے ملک میں سفر کرنے میں سخت دقتیں بھی واقع تھیں لہذا میری یہ تمنا کسی طرح پوری نہیں ہوتی تھی کہ حسنِ اتفاق سے اسی زمانے میرزا محمد علی خاں فروغی ذکاء الملک ایران کی طرف سے ممبر مقرر ہو کے صلح نامے میں شریک ہونے کے لیے پیرس تشریف لائے۔ میں نے اپنی غرض یعنی وہی پیرس میں واپسی کی آرزو اُن کی خدمت میں عرض کی۔ اُنھوں نے فوراً بدون تاخیر شاہزادہ

نصرۃ الدولہ فیروز میرزا وزیر خارجہ وقت کی ساعدت سے کہ جو حُسن اتفاق سے اُس وقت پیرس میں تشریف رکھتے تھے اور قدیم سے مجھ پر لطف خاص رکھتے ہیں۔ سفر کی مشکلات اور پاسپورٹ کی تحصیل وغیرہ کا معاملہ رفع کر دیا۔ چنانچہ ۲۱ر جمادی الآخر ۱۳۳۸ھ (۴ر جنوری ۱۹۲۰ء) کو برلن سے روانہ ہو کر سوئیس کی راہ سے چار دن بعد پیرس میں داخل ہوا اور پندرہ سولہ سال کی مفارقت کے بعد اپنے قدیم عنایت فرما آقائی ذکاء الملک سے ملا۔ مگر افسوس ہے کہ اُن کی صحبت کی سعادت بہت تھوڑے دنوں تک حاصل رہی۔ اس وجہ سے کہ آقائی موصوف سات آٹھ مہینے کے بعد ایران واپس تشریف لے گئے اور یہ زمانہ بھی زیادہ تر سفر ہی میں گزرا۔

مصنف علام کے لیے وظیفہ

پیرس سے واپسی کے بعد آقائی ذکاء الملک اُسی قدیمی محبت، بشاشت چہرہ، اور خرمی دل کے ساتھ مجھ سے ملے مگر اُس ظاہرداری پر اکتفا نہ کر کے چونکہ میری تنگیِ معیشت کو ملاحظہ فرمایا تو گویا دوستی کے معنی دنیا کے لوگوں کو اس طرح سکھلائے کہ فوراً میری تلاش معاش کے لیے کمر ہمت باندھ کر ساعی ہو گئے۔ یہاں تک کہ بالآخر شاہزادہ نصرۃ الدولہ فیروز مرزا کی شرکت اور آقائی میرزا حسن خاں وثوق الدولہ رئیس الوزراء کی فوری اجازت سے ایک سالیانہ وظیفہ دولت ایران سے میرے واسطے مقرر فرما دیا اور ایران پہونچ کر مجھ پر مزید عنایت والطاف کر کے اس وظیفہ کی وصولی اور اس کا پہونچانا بھی اپنے ہی ذمے کر لیا۔ چنانچہ اُس تاریخ سے آج تک اُنھیں خیر سگالی کی کوششوں سے وہ مجھ کو برابر پہونچتا رہتا ہے۔ خدا اس کی جزا کے لیے خیر عمر طولانی وسعادت جاودانی کے ساتھ ان کو عنایت کرے جس کی وجہ سے بالفعل میں آسودگی و آرام سے زندگی بسر کر رہا ہوں۔ آئندہ کا حال خدا کو معلوم ہے۔ مگر جو چیز سب سے زیادہ مجھکو شرمندہ اور منفعل کر رہی ہے وہ یہ ہے کہ اُن کے احسان ومہربانی کی تلافی سوائے خالی خولی زبانی شکریہ کے میں کسی طرح نہیں کر سکتا۔

پیرس میں اپنے قیام ثانی کے زمانے میں جن مستشرقین فرانسادی سے میں ملا اُن میں ایک مسیو کازانووا[ے] (Paul Casanova) ہیں جو علاوہ زبان عربی میں متخصص ہونے کے تاریخ وجغرافیائے بلاد اسلام علی الخصوص مصر اور مختلف مذاہب وفرق اسلامیہ اور دول اسلامی کے سکوں کی شناخت میں کامل مہارت اور ان مباحث پر عمدہ تصانیف رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ بعض غیر مشہور مشکل مسائل کی تحقیق نہایت دقت وموشگافی کے ساتھ اُنھوں نے کی ہے بلکہ اس کو اُن کا ایک خصیصہ سمجھنا چاہیے۔ مثلاً ایک رسالہ لکھا جس میں کتاب مشہور "الف لیلہ" اور اس کی

ے مارچ [illegible]

روایات اور مقامات جغرافیائی کہ جو سندباد بحری کے سفر میں مذکور ہیں - ان سب کی انھوں نے کافی تحقیق کی ہے اور اگرچہ اصل حکایت ظاہر ہے کہ افسانے سے زیادہ نہیں ہے مگر اپنی تحقیق سے ان روابط تجارتی کو جو بصرے اور خلیج فارس کے ایرانی و عرب تجار اور ہندوستان و جزائر بحر ہند کے مابین دوسری اور تیسری صدی ہجری میں قائم تھے صاف طور پر دکھایا ہے اور اُن مقامات کو بھی جو اُس سفرنامے میں مذکور ہیں جعلی و افسانہ نہیں بلکہ سب درست اور جزائر بحر ہند کے صحیح نام بتلائے ہیں - صرف اُن کے زیادہ تر نام اب بدل گئے ہیں - دوسرا رسالہ مشہور کتاب " اخوان الصفا " کے متعلق ہے - اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ اس کتاب کی تالیف کس زمانے میں ہوئی اور اس کا مؤلف یا مؤلفین کون تھے - ثابت کیا ہے کہ یہ کتاب چوتھی صدی ہجری کے قبل تصنیف ہوئی ہے اور اس کے مؤلف فرقۂ اسماعیلیہ باطلیہ سے تھے - ایک اور رسالہ درخصوص ایک بڑی قلمی کتاب کے تحریر کیا ہے ، جو کتابخانہ پیرس میں علم نجوم و تاریخ کے متعلق موجود ہے - ظاہرا یہ نسخہ قلعۂ الموت (Alamout) کے کتابخانے کا حسن صباح کے عہد کا معلوم ہوتا ہے - ایک اور رسالہ " اصفہبدان یرکم " کے متعلق ہے - یہ ملوک طبرستان کا ایک مشہور خاندان تھا جس سے صاحب " مرزبان نامہ " کا بھی تعلق ہے - اس میں اُن مسکوکات کا بھی ذکر ہے کہ جو اس خاندان سے باقی ہیں - ایک اور رسالہ نہایت نادر اُن سکوں کے متعلق کہ جو صاحب الزنج مشہور سے منسوب ہیں - جس نے ۲۵۵ھ میں بصرے میں خروج کیا اور وہاں کے حبشی غلاموں کو اور اُن کے مالکوں میں جنگ کرادی - ایک اور رسالہ درخصوص خطوط طلسمات از نیرنج کے ہے کہ یہ کس زبان میں اور کس خط میں لکھے جاتے تھے - اسکے علاوہ اور بھی مشہور تالیفات ان کی ہیں جو سب نہایت مفید ہیں -

ان کے علاوہ مسیو گابریل فران (Gabriel Ferrand) مدیر " ایشیاٹک جرنل " سے ملاقات ہوئی کہ جو ایک نہایت محترم بڑے آدمی ہیں اور جغرافیا سے جزیرۃ العرب و بحر ہند اور روابط تجارتی درمیان ایران و عرب اور بنادر خلیج فارس و جزائر بحر ہند و سماترا و جاوا وغیرہ کے ماہر خصوصی ہیں اور ان کی تالیفات بھی ان مسائل پر کثرت سے ہیں -

اس زمانے میں پیرس میں آقائی میرزا عباس خاں اقبال آشتیانی مقیم طہران سے غائبانہ ملاقات اور سلسلۂ خط و کتابت قائم ہوا - یہ ایران کے ایک نوجوان فاضل ادیب ہیں اور تبحر شرقی کے ساتھ طریقۂ انتقاد و تحقیق غربی کے جامع ہیں اور کمال محنت و مشقت اور جوانی کے زور و شور کے ساتھ آثار ادبی ایران کے از سر نو زندہ کرنے میں سرگرم ہیں -

ایک اور فاضل بزرگ جن سے پیرس میں سرسری ملاقات ہوئی گر کافی استفادہ اُنکی صحبت سے حاصل نہ کرسکا، چونکہ ان کی مدتِ قیام پیرس میں کم تھی، آقائی میرمحمد حسین خاں عمید الملک حسابی ہیں۔ یہ طرز جدید کے مشہور لکھنے والوں میں ہیں اور ان سے سلسلۂ خط وکتابت بحمد اللہ قائم ہے۔

تصحیح وتالیف کتب | جن دو چار کتابوں کی تصحیح یا تالیف یا ترجمہ اس حقیر نے قیام یورپ کے زمانے میں کیا اُنکے اسماء حسب ذیل ہیں:۔ (۱) تذکرۃ الشعراء عوفی موسوم بہ لباب الالباب[1] کی جلد اول کا ایک حصہ (۲) مرزبان نامہ (۳) المعجم فی معاییر الاشعار العجم تالیف شمس قیس رازی (۴) چہار مقالہ نظامی عروضی سمرقندی (۵) جلد اول و دوم تاریخ جہاں کشا ے جوینی (بالفعل اس کی تیسری جلد کی تصحیح وطباعت میں مشغول ہوں)۔ (۶) ترجمہ لوائح جامی زبان فرنچ میں (اس کا انگریزی ترجمہ مسٹر وینفیلڈ نے لندن سے چھاپا ہے)۔ (۷) ایک رسالہ مشہور شاعر مسعود سعد سلمان کے حالات میں کہ اس کا انگریزی ترجمہ اُسوقت علیہ اُستاد براؤن کے قلم سے شایع ہوا ہے۔ (۸) تذکرۃ الاولیاء۔ شیخ فریدالدین عطار کا دیباچہ جس میں اُن بزرگوار کے حالات درج ہیں۔ (۹) مضامین متفرق بعض مجلات فارسی میں۔

(باقی آیندہ)

محمد بن عبد الوہاب قزوینی
۱۶ ربیع الثانی ۱۳۴۳ھ مطابق ۱۴ نومبر ۱۹۲۴ء

(غزل جناب مولوی سید سراج الحسن صاحب ترمذی وکیل ہائیکورٹ)

لگائی آگ کچھ صیاد نے ایسی نشیمن میں
خدا ہی ہے رہے باقی جو میرا نام گلشن میں

جلی کشتِ تمنا خوں ہوا ارمان وحسرت کا
بجز اب برقِ خرمن کیا دھرا ہے میرے خرمن میں

کچھ اس انداز سے کرتے ہیں وہ بخیہ گری اسکی
کہ رہ رہ کر مزا ملتا ہے مجھکو زخمِ سوزن میں

رہا بے بہرہ صیاد سے مشقِ جفا برسوں
کوئی گردش کا مارا آکے ٹھہرا تھا نشیمن میں

گرے جاتے ہیں غش کھا کھا کے سارے دیکھنے والے
یہ کسکے حُسن کے جلوے نظر آتے ہیں چلمن میں

ہے سبزہ سوختہ، مرجھائے گل، بے بال وپر بلبل
یہ کیسا حشر برپا ہے، یہ کیا منظر ہے گلشن میں

سیہ اعمال، رسوائے جہاں، غرقِ ندامت ہوں
چھپا لے کوئی دامن میں مرے عصیاں اپنے دامن میں

جنوں ہو جوش پر سر میں خمارِ سرفروشی ہو
بہار ایکی برس اے ترمذی یوں آئے گلشن میں

---

[1] یہ کتاب پروفیسر ایڈورڈ براؤن نے تصحیح کرکے چھاپی ہے (مترجم)

لکھنوی اور دہلوی مدارس شاعری پر ایک تحقیقی اور تنقیدی نظر

(جناب مولوی اسمٰعیل احمد تسنیم صاحب مینائی بی اے ایل ایل بی وکیل)

[سلسلے کے لیے دیکھیے رسالۂ الناظر بابت جنوری ۱۹۳۵ء]

(۲)

میرے نزدیک شاعر ہونا محض شعر کہہ سکنے کی اہلیت رکھنے کا مرادف ہے، اسی لیے میرا اعتقاد ہے کہ وہبی اور فطری شاعر ہونے کے لیے قادر الکلامی اور جامعیت کی شرطیں محض بیکار ہیں۔ میرا ایمان ہے کہ الہامی شاعری کے واسطے یہ قیدیں سراسر غیر ضروری ہیں کہ شاعر غزل اور قصیدہ، ہر دو اصنافِ سخن پر یکساں قدرت رکھتا ہو، کہ اُس کا موے قلم مرثیہ اور سہرا دونوں میں مساوی باریکیوں اور لطافتوں سے کام کرتا ہو، کہ اُس کا طائرِ فکر مثنوی میں اُسی باغ قدس کے مدارج قطع کرتا ہو جو اُس کا مرغ تخیل واسوخت میں طے کرتا ہے! چنانچہ میرا یہی نقطۂ نظر باعث ہے میرے اس یقین کا کہ داغ کے کمالات شاعری پر محض اس وجہ سے خاک نہیں ڈالی جا سکتی کہ وہ صرف غزل کے مرد تھے یا ذوق کا مرتبہ صرف اس بنا پر بلند تر نہیں کیا جا سکتا کہ وہ غزل اور قصیدہ، دونوں پر مساوی قدرت رکھتے تھے۔ بنا بر آں اس مضمون کی پہلی قسط میں شعرائے دہلی اور اساتذۂ لکھنؤ کے تدریجی تاریخی حالات بیان کرنے کے دوران میں میں نے کہیں بھی اس کا امتیاز نہیں کیا کہ شاعری غزل سے عبارت ہے یا قصیدے سے، مرثیے کی مرادف ہے یا مثنوی کی، واسوخت کا نام ہے یا مخمس کا، کیونکہ ایسا کرنے کا مقصد یہ ہوتا کہ میں شعر اور شاعری دونوں کو محدود اور تنگ کر دوں۔

مگر اس توضیح سے میرا منشا یہ نہیں کہ فن کے قیود شاعری کے لیے بیکار ہیں، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ فن کی پابندیوں سے شاعری کو نقصان پہونچتا ہے، وہ صنائع اور بدائع کا ایک طلسم ہو کر رہ جاتی ہے، اُس میں قافیہ اور ردیف کی جکڑبندیاں تصنع اتم کا نقص شدید پیدا کر دیتی ہیں۔ لیکن یہ تخیل عقل سلیم اور فہم عام کے بالکل منافی ہے۔ میں مانتا ہوں کہ اگر کوئی شاعر اتنا پست خیال اور غیر ذکی الحس ہو کہ بجز چند مخصوص تصنعات کے اپنے اشعار میں اور کسی قسم کی جدت ہی نہ پیدا کر سکے تو اُس کا تخیل یقیناً فن کے قیودات کی نذر ہو جائے گا، لیکن یہ خامی فن کی نہیں، فن کی کمی کی ہوگی، فن کے فقدان کی ہوگی۔ وہ شاعر جو اپنے الہامی اور غیبی تخیل کے احساس اور استغراق پر ہم کو مجبور کر سکتا ہے صرف

وہی ہو سکتا ہے جسے فن پر حسب ضرورت دسترس ہو تاکہ وہ اپنے احساسات، اپنے الہامات، کو ہم تک اس طرح پہونچا سکے جس طرح اور جس حالت میں خود اُس نے ان کو محسوس کیا تھا۔ اس توجیہ سے واضح ہو جاتا ہے کہ جتنا ارفع اور اعلیٰ الہام ہوگا اُتنا ہی فن کے بلند ہونے کی ضرورت ہوگی کیونکہ وہ چیز جس کو ہم شاعر کے ذہنی الہام سے تعبیر کرتے ہیں محض اُسی صورت میں خراجِ تحسین حاصل کر سکتی ہے جب شاعر کو فن پر اتنی قدرت حاصل ہو کہ وہ اُس کو اپنے الہام کا آلہ اور ناشر دونوں بنا سکے۔ یعنی جب ذکاوت، تیز حسی، اور مشق کے باعث نکاتِ فن اُس کی طبیعت ثانی بن کر اُسکے خمیر میں کچھ اس طرح جذب ہو جائیں کہ وہ اپنے تاثرات اور تخیلات کو ہم تک بعینہٖ اُن کی اصلی حالت میں پہونچا سکے گویا وہ ہمارا ہی تخیل اور ہماری ہی فکر تھے۔ یہ کمزوری البتہ کبھی کبھی ممکن ہے کہ شاعر کا الہام بذاتہٖ محض فن پر مشتمل ہو یعنی الہام اور القا کا چراغ روشن صرف فنی صنائع اور بدائع کو مؤثر کر سکے اور اُن میں کسی قسم کی جذباتی روح پیدا کیے بغیر اُن کو بلند سے بلند تر اور ارفع سے ارفع ترین بنا دے۔ لیکن ایسی صورتوں میں بھی فن میں ایسے چار چاند لگ جاتے ہیں جن کی تنویر کلیۃً صنائع نہیں جاتی کیونکہ کبھی تو ان سے کلام میں سادگی اور غیر معمولی روانی پیدا ہو جاتی ہے جیسے میر انیسؔ کے مراثی کی بعض ابیات میں۔

انیس
(۱) کیا زور ان کے چھوٹے سے ہاتھوں نے پائے ہیں — لڑکے نشانِ فوجِ ستم چھین لائے ہیں
(۲) روکے ہوئے تھی نہر کو ذاتِ رسول کی — سبزہ ہرا تھا خشک تھی کھیتی بتول کی
(۳) سہ اجل پہناتے ہی بدھی، گلے کا ہار ہوئی

اور کبھی غیر ضروری لیکن تاہم غیر معمولی تصور زائی اور پیچیدگی آ جاتی ہے جیسے مومنؔ کی بعض تواریخ میں یا میر انیس و میرزا دبیر کے بعض مراثی میں

مومن
(۱) دستِ بیدادِ اجل سے بے سر و پا ہو گئے — فقر و دیں، فضل و ہنر، لطف و کرم، علم و عمل
(۲) بنے کیونکر کہ ہے سب کار الٹا — ہم الٹے، بات الٹی، یار الٹا

انیس
(۳) گر آنکھ سے نکل کے ٹھہر جائے راہ میں — پڑ جائیں لاکھ آبلے پائے نگاہ میں

دبیر
(۴) فکرِ رفو تھی چرخِ ہنرمند کے لیے — دل چار ٹکڑے ہو گیا پیوند کے لیے
(۵) چھالا تھا آفتاب کا گردوں کے پاؤں میں — خود دھوپ چھپ رہی تھی درختوں کی چھاؤں میں

بنا بریں اس سے بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ حقیقی اہلیت شعری بجائے اس کے کہ شاعر کو فن کی زنجیروں سے آزاد کرے اُس کو فن کی مدد سے ایسا کچھ کہنے کا اہل بنا دیتی ہے جو بغیر فن کے وہ کبھی کچھ بھی

نہیں کرسکتا تھا۔

مگر فن اور چیز ہے اور جملہ اصنافِ سخن پر قدرت رکھنا اور چیز۔ میں اگر یہ کہتا ہوں کہ غالب کے مجموعۂ کلام میں قصائد کی کمی سے اُسکے مرتبے میں کوئی فرق نہیں آتا، یا میرؔ کے دیوان میں غزل، قصیدہ، رباعی، قطعہ، تاریخ، سب کے موجود ہونے سے اُن کی منزلت نہیں بڑھتی تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوا کہ میں ایک کے یہاں فن کے فقدان اور دوسرے کے یہاں فن کی بہتات سے چشم پوشی کر رہا ہوں۔ داغؔ اگر فن میں کچے تھے تو اُن کی غزلوں ہی میں اس کا ثبوت مل جائے گا۔ امیرؔ اگر فن میں کامل تھے تو اُن کے قصائد کے سوا بھی اس کی دلیل تلاش کی جاسکتی ہے۔ اس لیے میری رائے میں نظم کے کسی کارنامے کو اس نوع کی رسمی تنقید کے معیار پر جانچنا درست نہیں کیونکہ ورڈس ورتھ کے بقول اس قسم کی تنقید مصنف کی جودتِ طبع کے پہلو کو قطعًا نظرانداز کر جاتی ہے۔ ہماری اردو شاعری ازمنۂ قدیم سے اسی رسمی تنقید کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے، متقدمین سے لیکر متاخرین کے دَور تک یہ بہت سخت رہیں اب ذرا ڈھیلی پڑی ہیں۔ تاہم بالکل ٹوٹی اب بھی نہیں ہیں۔ سوداؔ کو میرؔ پر یوں کبھی کبھی ترجیح دے لی جاتی ہے کہ سوداؔ نے ہر صنفِ سخن کو اُستادانہ نبا ہا ہے اور میرؔ نے صرف غزل اور مثنوی کو، غالبؔ پر ذوقؔ کو اس لیے بعض لوگ فوقیت دیتے ہیں کہ ذوقؔ نے غالبؔ سے زیادہ شعر کہے ہیں۔ درانحالیکہ یہ چیز کسی آئینہ بھی کسی شاعر کی اہلیت شاعری پر اثر انداز نہیں ہوسکتی۔

دہلی اور لکھنؤ کے سرمایۂ شاعری میں حقیقتًا کوئی ادبی امتیاز ہے بھی یا نہیں؟ اگر ہے تو کیا، اور ان ہر دو مدارس میں سے کس کو فضیلت اور تفوق حاصل ہے اور کیوں؟ — اس قبیل کے تمام سوالوں کے صحیح جوابات تک پہونچنے کی خاطر یہ ضروری ہے کہ سب سے پہلے اس امر کا فیصلہ کیا جائے کہ حقیقت کے اعتبار سے شاعری کس چیز کا نام ہے؟ جب تک اس لفظ کی صحیح تعبیر نہیں کی جائے گی اس پیچیدہ گتھی کا سلجھانا محال ہی نہیں ناممکن ہے کہ ہندوستانی زبان کے ان ہر دو مدارس شاعری میں کیا فرق ہے اور کیوں؟

شعر کسے کہتے ہیں؟ شاعری کس چیز کا نام ہے؟ ان دونوں جامع اور مانع الفاظ کا اطلاق کس صنفِ ادب پر ہوسکتا ہے؟ ان سب سوالوں کے بظاہر مکمل اور تشفی بخش جواب بادی النظر میں دنیا کے ہر ادب کی کتابوں میں ملتے ہیں، مغرب و مشرق کی جملہ مقتدر زبانیں خواہ اُن کا تعلق ازمنۂ قدیم سے ہو یا ازمنۂ قدیم تر سے، قرونِ وسطیٰ سے ہو یا ادوارِ حاضرہ سے، مثل لاطینی، یونانی، انگریزی، فرانسیسی، عربی، فارسی، سنسکرت، ہندی، اُردو وغیرہ کے، ان میں سے کوئی بھی ایسی نہیں جس کا

اس نوع کے مسائل پر کلیتہً خاموش ہو، یا اس قسم کے مباحث سے قطعاً معرا ہو۔ اُردو ان تمام میں سب سے کم عمر ہے لیکن اس میں بھی ایک دو نہیں متعدد کتابیں اس موضوع پر لکھی جا چکی ہیں۔ مضمون زیر بحث کے نقطۂ نگاہ سے محض اُردو کی ان چند کتابوں سے مدد لے لینا بظاہر کافی معلوم ہوتا ہے لیکن شاعری کی صحیح تعریف کرنے کے لیے اور خصوصاً اس طرح جیسے میں چاہتا ہوں قریب قریب دیگر تمام متعدد زبانوں کے ادبیات کی اعانت لیے بغیر منزل مقصود تک رسائی محال ہے۔

جیسا کہ میں ابھی عرض کر چکا ہوں شاعری اور شعر کے متعلق بے شمار نظریے اور لاتعداد تعریفات موجود ہیں، ہر ملک کے ادیبوں، شاعروں، فلسفیوں، مفکروں اور مبصروں نے اس مسئلے پر اظہارِ رائے کیا ہے اور بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان جمیع آراء سے استفادہ کرنے کے بعد حقیقتِ شاعری کی تہ تک پہونچ جانا چنداں مشکل کام نہیں، مگر اصلیت اس کے بالکل خلاف ہے کیونکہ اسی بہتات اور افراط میں ہماری کمزوری اور بے بسی کا راز بڑی حد تک مضمر ہے۔ ان بے شمار نظریوں کا تعدد اور اختلافات، ان لاتعداد آراء کی گوناگونیت، یہی سب اسباب ہیں جو کسی صحیح، اصولی، اور مختتم نتیجے تک پہونچنے میں حارج ہیں، بعض نقادوں نے شاعری کی حدوں کو مذہب کی سرحد سے ملا دیا ہے اور بعض نے اُسے مذہب کے بھی پرے جگہ دی ہے، بعض نے شاعری کو جذبات کی ترجمانی سے تعبیر کیا ہے اور بعض نے تخئیل کی پرواز سے، بعض نے اُسے مناظرِ قدرت کی محاکات قرار دیا ہے اور بعض نے دلبستگی اور تفننِ طبع کا ذریعہ ٹھہرایا ہے اور بعض نے فلسفۂ حیات پر تبصرہ سمجھا ہے، چند مبصرین نے شاعری کو سہواً سائنس کے رموز و نکات سے مخلوط کر دیا ہے اور چند نے اُسے غلطی سے ایک قسم کی مصوری یا صناعی تصور کیا ہے۔ کچھ مفکرین [جن میں سب سے زیادہ قابلِ رحم ڈاکٹر عبداللطیفؒ حیدرآبادی ہیں[1]] ماہیتِ شاعری کی تشریح کرتے کرتے اصولِ شاعری اور حیاتِ شاعر کے جھمیلوں میں پھنس گئے ہیں، اور کچھ فن کے جھگڑوں میں۔ غرض

جلوہ را ایک آرزو باشد و ایں را جلوہ ہا

[1] ڈاکٹر صاحب نے اپنی صد درجہ انقلابی کتاب "غالب" میں نقادوں کی اس عام غلطی کی جانب اشارہ کیا ہے کہ وہ فن کو علم سے مخلوط کر دیتے ہیں مگر آگے چل کر "غالب زدگی" کی رو میں اسی قسم کی ٹھوکر خود کھائی ہے بنا بر آں میں اُن کی حالت کو زیادہ قابلِ رحم سمجھتا ہوں کیونکہ وہی زیادہ مضحکہ خیز بھی ہے۔ اُنکی کم فہمی اور سخن ناشناسی کو آلۂ فکر اور نشانۂ ملامت بنانے کا یہ بڑا اچھا موقع تھا مگر ـــــ کسی پہ جیسی چلی تھی کسی پہ آن لگی ـ کا خوف مانع ہے۔ اس کی طرف انشاء اللہ علیحدہ توجہ کی جا رہی ہے۔

لیکن اگر ان "غلطیہائے مضامین" سے چشم پوشی بھی کی جائے اور محض حقیقتِ شاعری سے واسطہ رکھا جائے تو بھی اس کا تعین بہت دشوار اور تفصیل طلب ہے کہ ان تمام نظریوں میں سے کس کو بنیاد قرار دے کر اُس پر ماہیتِ شعر کی ایسی مکمل عمارت تعمیر کی جائے جو مستحکم و مضبوط بھی ہو اور نظر فریب و دیدہ زیب بھی، "جنت نگاہ" بھی ہو اور "فردوس قلب" بھی۔ علمی اعتبارات سے بھی مکمل ہو اور آرٹ کے لحاظ سے بھی جامع' کیونکہ ان تمام نظریوں میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جو سراسر غلط یا کلیۃً صحیح ہو۔ ان چند در چند پیچیدگیوں پر طرّہ مغربی اور مشرقی تخیلات کا عام اور عظیم تفاوت جس نے ایک مستقل حیثیت اختیار کر کے اس نوع کی مساعی کی راہ کو دشوار تر بنا دیا ہے۔

قریب قریب ہر ادب میں جہاں کہیں بھی شعر و شاعری کی حقیقت کے مسئلے سے بحث کی گئی ہے اس صداقت کو قطعاً نظر انداز کر دیا گیا ہے کہ شاعری اصل میں ہے کیا' عموماً ہر مبصر نے خواہ وہ نقاد ہو یا ناظم، مصنف ہو یا مؤلف، مقدمہ نگار ہو یا تقریظ نویس' جب بھی اس موضوع پر قلم اُٹھایا ہے بحث محض اس امر سے کی ہے کہ شاعری کس چیز کا نام ہونا چاہیے۔ اگر مقصد صرف اتنا ہی ہو تو ہر شخص اپنی ایک جداگانہ رائے رکھنے کا مستحق سمجھا جا سکتا ہے کیونکہ ایسی صورت میں دلائل و براہین کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ ہر آدمی ذاتی پسندیدگی کی بنا پر اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنانے کا مجاز ہے میں کہتا ہوں کہ شاعری قومی جذبات کے موزوں کرنے کا نام ہونا چاہیے' دوسرا شخص کہتا ہے کہ نہیں شاعری کو مذہبی جذبات پر مبنی ہونے کی ضرورت ہے۔ ایک تیسرا شخص جذبات کو شاعری کے واسطے ضروری ہی نہیں سمجھتا اسکا خیال ہے کہ شاعری محض پرواز تخیل کا ذریعہ ہے ؎
ہر کس بخیال خویش خبطے دارد۔ حقیقت یہ ہے کہ اسی کوتاہیِ نظر کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاعری کے متعلق تخیل محض نظری انفرادی رہ گیا جس کی حیثیت ایک نصب العین سے زیادہ نہیں۔ اسی سہو نقد و نظر کا ضمنی اثر یہ بھی ہوا کہ مبصروں اور نقادوں نے مفہوم شاعری کی توضیح کے مواقع پر فطرتِ انسانی کے مطالعہ کی ضرورت کو یکسر نظر انداز کر دیا اور اس غلط فہمی میں ہو کر ایسی ایسی دُور از کار اور قیاسی رائیں قائم کیں جن کے بعد حقیقت شاعری کے متعلق کسی جامع نظریہ تک پہونچنا تو درکنار نتائج میں کہیں اصلیت و صداقت باقی ہی نہیں رہی اور یہی قیاسی آراء اور دُور از کار نظریے ذہن عوام میں چند اس قسم کے تخیلات بٹھا دینے کا ذریعہ بنے جن کی اگر بغور تصریح کی جائے تو انجام حد درجہ مضحکہ خیز نظر آتا ہے۔ چنانچہ اگر سو نہیں تو پبلک کے نوّے فی صدی افراد ضرور اس عام نظریہ کے مقر ہونگے کہ کسی شعر کی اچھائی بُرائی کا انحصار اس امر پر ہے کہ وہ قلب کو کس قدر متاثر کرتا ہے یعنی اُس کی سماعت سے

جسم میں جھرجھری پیدا ہوتی ہے یا نہیں۔ اسکے مطالعے سے سینے میں گدگدی کا احساس ہوتا ہے یا نہیں! بالفاظ دیگر شاعری کو بجائے قلب و دماغ کی بے چینیوں کے انسان کی جسمانی کیفیات کو اپنا مطمح نظر بنانا چاہیے۔ میں یہ تسلیم کر لینے کے لیے تیار ہوں کہ بعض شعروں کے سننے سے ضرور بدن میں جھرجھری کی ایک کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور اس صورت میں اس کو بھی شعر کے اثر کا معیار قرار دیا جا سکتا ہے مگر ہمیشہ تو ایسا ہو نہیں سکتا، نیز اس شکل میں سب سے زیادہ دلچسپ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شعر اس کیفیتِ لرزیدگی کے ذریعہ دماغ تک منتقل ہوتا ہے یا دماغ کے ذریعہ اس کیفیت میں کیونکہ اصول علم النفس کی رو سے تو ہر واقعہ کا اثر سب سے پہلے انسانی دماغ پر ہوتا ہے اور دماغ اُس کے تاثرات کو مختلف اعضائے انسانی پر تقسیم کرتا ہے۔ لیکن اگر یہ صورت قبول کیجائے تو کیفیت لرزش خوبیِ شعر کا معیار نہیں رہتی اور اگر اس کے خلاف تصور کیا جائے تو دماغ کیفیاتِ جسمانی کا تابع ہوا جاتا ہے۔ بہر نوع ہر طرح دشواری ہے ؎ گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل۔ علاوہ بریں جھرجھری کا انحصار تو بڑی حد تک سامع یا ناظر کی طبعی حالت پر ہوتا ہے، اس کا کھلا ہوا ثبوت یہ ہے کہ میں ایک شعر پر آج جسم میں لرزش کی کیفیت محسوس کرتا ہوں کل نہیں کرتا۔ شعر تو آج بھی اُتنا ہی بلند اور اعلیٰ ہے جتنا کل تھا، پھر کیا سبب ہے کہ یہ تغیر رونما ہوا۔ اور یہ بھی ہمارا روزمرہ کا تجربہ ہے کہ کسی عمدہ "لرزش زا" شعر کو دو چار دفعہ سننے کے بعد پھر ہمارا جسم اُس کیفیتِ لرزش سے دوچار نہیں ہوتا جو اول اول اُس شعر کو سننے سے جسم پر طاری ہوتی تھی۔ شعر میں اب بھی وہی اور اُتنی ہی خوبیاں ہیں جو اُس میں ابتداءً تھیں۔ پھر ہماری طبعی حالت میں یہ تبدیلی کیوں ہوئی کہ جھرجھری اب مفقود ہوگئی۔ درحقیقت بات یہ ہے کہ لرزیدگی کی یہ کیفیتِ جسمانی اصل میں صرف دماغ انسانی کے ساعتی تاثرات کا نتیجہ ہوتی ہے جس کو شعر کی حقیقی خوبیوں سے کچھ تعلق نہیں صرف اُس کے اثر سے تعلق ہے اور اثر بیشتر کیفیتِ مزاج پر منحصر ہوتا ہے۔

کچھ زمانہ ہوا ایک مغربی محقق نے اپنا یہ نظریہ دنیا کے سامنے پیش کیا تھا کہ بہترین شاعری وہ ہے جو الفاظ کے اُتار چڑھاؤ سے پڑھنے والے کے دہن میں لعاب زیادہ پیدا کر دے کیونکہ لعاب کی افزائش صحت کی اچھائی کی علامت ہے۔ تو گویا اس نظریے کی رو سے "شعر ناشناس" اصحاب کی کم ذوقی کا سبب اُن کا دماغ نہیں اُن کے گلے کے غدود ٹھہرے۔ اول تو مجھے اسی میں شبہہ ہے کہ لعابِ دہن کی زیادتی صحت کی دلیل ہے، دوسرے شعر کی خوبیوں کا معیار لعابِ دہن کو قرار

دنیا لنفسہٖ کتنی مضحکہ خیز چیز ہے - میں مانتا ہوں کہ ہر زبان کے سرمایہ شاعری میں بعض بعض جگہ ایسے اشعار بھی ملیں گے جن کے مطالعہ سے منہ میں پانی بھر آنا بعید از قیاس نہیں، چنانچہ اُردو کے ذخیرۂ ادب میں قصائد اور مثنویوں کے اندر جہاں کہیں لذیذ اقسام و انواع طعام کا تذکرہ آیا ہے وہاں خوش خوراک اصحاب کے "تصورانہ لطف" میں کوئی شک نہیں کیا جا سکتا، مگر اُن شعروں کے علاوہ اور بہت سے بہتر اشعار کو پڑھ کر دیکھ لیجیے ذرا جو کہیں لعابِ دہن کی زیادتی کا احساس ہو۔ کم سے کم میرے منہ میں تو اُنکے ورود سے کسی قسم کا لعاب پیدا نہیں ہوتا۔

(۱) شبِ تاریک و بیمِ موج و گردابے چنیں حائل — کجا دانند حالِ ما سبکسارانِ ساحلہا

فارسی (۲) ہر دو عالم قیمتِ خود گفتۂ — نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

(۳) ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم — کرشمہ دامنِ دل میکشد کہ جا اینجاست

(۴) جو پوچھا کہ گل کا ہے کتنا ثبات — کلی نے یہ سن کر تبسم کیا — میرؔ

(۵) تم مرے پاس ہوتے ہو گویا — جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا — مومنؔ

اُردو (۶) بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی — وہ اک نگہ کہ بظاہر نگاہ سے کم ہے — غالبؔ

(۷) آئے بھی لوگ بیٹھے بھی اُٹھ بھی کھڑے ہوئے — میں جا ہی ڈھونڈتا تری محفل میں رہ گیا — آتشؔ

(۸) قریب ہے یارو روزِ محشر چھپے گا کشتوں کا خون کیونکر — جو چپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستیں کا — امیرؔ

عربی (۹) فما لعینیک ان قلت اکففا ھمتا — وما لقلبک ان قلت استفق ھیم

ہندی (۱۰) لکڑی جل کوئلہ بھئی، کوئلہ جل بھئی راکھ — میں پاپن ایسی جلی نہ کوئلہ بھئی نہ راکھ

انگریزی (۱۱)
Oft in the stilly night,
ere slumber's chain has bound me,
Fond memory brings the Light
of other days around me.

اکثر شبِ تنہائی میں کچھ دیر پہلے نیند سے
گزری ہوئی ناکامیاں بیتے ہوئے دن عیش کے
بنتے ہیں شمعِ زندگی اور ڈالتے ہیں روشنی
میرے دلِ صد چاک پر (ترجمہ) (از نادر کاکوروی)

مختلف زبانوں کے ادب سے یہ چوٹی کے اشعار منتخب کرکے سامنے لائے گئے ہیں، کیا ان میں سے کسی کے "بآوازِ مطالعہ" سے آپ کو دہن میں لعاب کی افراط کا ادراک ہوتا ہے۔ پھر کس طرح سمجھدار انسان اس نظریے کی صحت پر ایمان لا سکتا ہے کہ شاعری کو اُنھیں اصولوں پر پرکھنا چاہیے جو

مرغ پلاؤ یا فروٹ پڈنگ کے جانچنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔

شاعری کی بابت ایک عام تخیل بھی ایسا ہے جو باوجود یکسر بے بنیاد ہونے کے ذہن عوام میں اچھی طرح جڑ پکڑتا جاتا ہے، اس کی ترویج کے ذمہ دار وہ معدودے چند اشخاص ہیں جنھوں نے اپنی شہرت کا ذبہ کی خاطر ایسے شعرا کے آفتاب کمال پر خاک ڈالنے کا بیڑا اٹھایا ہے جن کی ذکاوت تخیل اور حسن بیان ہر چہار اقصاءِ اکناف عالم سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں، ایسے مسلم الثبوت اور نحز روزگار باکمالوں کے کلام پر انصافاً اصولی نکتہ چینی اور حرف گیری کی گنجایش تو کہیں ملتی نہیں اس لیے یہ "بخود غلط" نقاد ہمہ اقسام کی ہٹ دھرمی اور کذب بیانی کر کے چند ایسے پہلوؤں پر ان باعظمت اصحاب کی گرفت کرتے ہیں جن کو صداقت اور اصلیت سے دور کا بھی لگاؤ نہیں۔

چنانچہ اس نوع کے فرضی پہلوؤں میں سے ایک پہلو "صداقتِ تخیل" کا بھی ہے، جس کے معنی اس طبقۂ نقاداں کی کذب بافیوں کے سبب غلط طور پر یہ لیے جاتے ہیں کہ شاعر نے جس خیال کا اظہار کیا ہے وہی اس کا مطمح نظر اور اصول زندگی ہے اور وہ اس پر اسی طرح کاربند رہتا ہے جس طرح سائنس کا ماہر تدقیق و تحقیق مسائل میں کشش ارضی یا ردِ عمل کے مسئلوں پر، شاہی مطبخ کا داروغہ نمک مرچ، مسالے کی کمی بیشی کے اصولوں پر۔ اگر اس تخیل کا مطلب یہ ہوتا کہ شاعر نے اپنے پیش کردہ کلام میں جن جذبات کی مصوری کی ہے اُن کا ادراک اُس نے خود اپنے حواس ظاہری اور حواس باطنی سے کیا ہے، یعنی اپنے "گوش حقیقت نیوش" سے سنا ہے، اپنی "چشم عبرت بیں" سے دیکھا ہے اور اپنے "قلب حقیقت شناس" سے محسوس کیا ہے تو چنداں مضائقہ نہ تھا کیونکہ اس صورت میں سوال "صداقت تخیل" کا نہیں رہتا "صداقت احساس" کا ہو جاتا جو ایک بالکل جداگانہ چیز ہے مؤخر الذکر شعر کے باثر اور باحسن ہونے کے لیے اتنا ہی ضروری ہے جتنا اول الذکر غیر ضروری، مگر باوجود اس حقیقت کے "شاعر اعظم" "یگانہ" اور "نقاد مسلّم" ڈاکٹر عبد اللطیف یہ دونوں کلیۃً علیحدہ مسائل کو مخلوط کرنے میں رستم و اسفندیار بنے ہوئے ہیں، ایک غالب کی شاعری کی تنقیص میں یہ دلیل لاتا ہے کہ غالب کو دغاباز بھی کہہ سکتے ہیں۔ دوسرا یہ بیان پیش کرتا ہے کہ "یہ تھی ہمارے شاعر اعظم کی رودادِ حیات" وہ عقل و خرد ان کو دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں کہ ؎

طوق زریں ہمہ در گردن خری بینم

آپ میں سے کون ایسا ہے جو امیر مینائیؒ کے ذاتی عادات و خصائل سے کم و بیش آگاہ نہیں، عالم فاضل، متقی، پرہیزگار، عابد زاہد، تہجد گزار، حق پسند، حق پژوہ، پاک طینت، صاف باطن،

بزرگ ایسے کہ اُن کی صحبت میں اُٹھنے بیٹھنے والوں کی عاقبت درست ہوگئی۔ نیک ایسے کہ کسی ایک ذی روح کو کبھی اُن سے اذیت نہیں پہونچی۔ ابھی اُن کے دیکھنے اور جاننے والے دنیا میں موجود ہیں۔ ہر ایک سے میرے اس بیان کی تصدیق و تائید ہو سکتی ہے لیکن صنمخانہ میں منجملہ اور قبیل کے اشعار کے یہ چند شعر بھی انہیں کے قلم سے نکلے ہوئے ہیں۔

(۱) کیا عارف مجھے پیر مغاں نے اک پیالے میں کرامت یہ نہیں دکھی کسی اللہ والے میں

(۲) آنکھیں دکھلاتے ہو جوبن تو دکھاؤ صاحب وہ الگ باندھ کے رکھا ہے جو مال اچھا ہے

(۳) جو گھر میں پھر کے ہم اُنکے حضور میں آئے کلیم پھر لا تا ت طور سے آئے

(۴) زاہد امید رحمت حق اور ہجو مے پہلے شراب پی کے گنہگار بھی تو ہو

پہلا شعر جمیع اولیاء اللہ کے مرتبے میں خلل اندازی کرتا ہے، دوسرا شاعر کو کانڈت جیسے عیاش طبع اور ہوس راں انسان کی زبان سے بھی بُرا معلوم ہوگا، تیسرے میں خدا کے مخصوص نبی کلیم اللہ موسیٰ کلیم عمران کی شان میں گستاخی کا پہلو ہے، چوتھا عابد شب زندہ دار اور زاہد خدا پرست کو رندی و میخواری کی تلقین کرتا ہے اور ایسے پیرائے میں جس سے شراب نوشی بجائے عذاب کے ذریعۂ ثواب بنجاتی ہے۔

داغ دہلوی مرحوم کی رندی و سرمستی کی داستانیں کس نے نہیں سنیں، اُن کی عیاش طبعی کے افسانے آج تک زبانوں پر ہیں۔ خود اُن کی شاعری کا معتدبہ حصہ اسی افتاد طبع پر دلالت کرتا ہے

حوروں کا انتظار کرے کون حشر تک مٹی کی بھی ملے تو روا ہے شباب میں (داغ)

بجز عمر کے آخری چند سالوں نماز، روزہ، قرآن، زکوٰۃ کسی سے اُنھوں نے کبھی کوئی غرض نہیں رکھی، کاٹ پیچ، حسد و کینہ، اُن کی طبیعت میں ہمیشہ رہے، لیکن اسی داغ کے کلیات میں یہ اشعار بھی ملتے ہیں

(۱) جو راہِ عاشقی میں مٹا کیسا ہوا کہتا تھا آج خاک میں کوئی ملا ہوا

(۲) سبق ایسا پڑھا دیا تو نے دل سے سب کچھ بھلا دیا تو نے

(۳) یہ آرزو ہے آنکھ میں سرمہ لگائیں ہم اے داغ خاک پاک رسول خدا سے ہم

پھر زیادہ بحث کیوں کیجیے جملہ اُردو اور فارسی شعرا کے دواوین اُٹھا کر دیکھ لیجیے "اجتماع ضدین" سے بھرے پڑے ہیں۔ ایک ہی شاعر ایک مقام پر ایک مسئلہ بیان کرتا ہے اور تھوڑی ہی دور چل کر خود اُسی مسئلے کے خلاف لکھ جاتا ہے۔ غالب ایک جگہ فرماتے ہیں

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

لیکن اس شعر سے چند غزلیں پہلے غالب ہی یہ بھی کہتے ہیں

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ — دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو (غالب)

پہلے شعر سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر کی رائے میں جنت محض ایک فرضی تخیل ہے، دوسرا شعر ضمناً بہشت کو موجود قرار دیتا ہے۔ مومن کا شعر ہے

عمر ساری تو کٹی عشق بتاں میں مومن — آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہونگے

اور یہی شاعر ایک شعر یوں بھی کہتا ہے

اُس نام کے صدقے جسکی بدولت — مومن رہوں اور بتوں کو چاہوں (مومن)

ذوق کہتے ہیں :—

پیر مغاں کے پاس وہ دارو ہے جس سے ذوق — نامرد مرد، مرد جواں مرد ہو گیا

اور آگے چل کر خود ہی یہ بھی کہتے ہیں

اے ذوق دیکھ دختر رز کو نہ منہ لگا — چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

آخر اس قسم کے متخالف خیالات کے وجود کا سبب کیا ہے۔ کیا اسکے معنی یہ ہوے کہ ان تمام اساتذہ کے طبائع کو اصول سے کوئی لگاؤ نہ تھا، یا ان سب کی افتادِ مزاج سیلانی تھی۔ میری رائے میں یہ کسی طرح اس کا صحیح سبب نہیں ہے۔ اس تفاوت کی اصلی وجہ یہ ہے کہ شاعر کا تخیل صادق نہیں ہوتا، لیکن یہ شاعر کی کمزوری نہیں کیونکہ شعرگوئی میں اُس کا تخیل صادق ہو ہی نہیں سکتا، شعر تو محض اظہار خیالات کا ایک ذریعہ ہے جسکے لیے صداقتِ احساس تو یقیناً لابدی ہے گر صداقت تخیل نہیں۔ شعرالہند کے مصنف مولانا عبدالسلام ندوی نے بھی اسی مقام پر ٹھوکر کھائی ہے، وہ قصائد کی خوشامدانہ اور تملقانہ روش پر زوروں سے اظہار نفرت کرتے ہیں، اس قدر چراغ پا ہوتے ہیں کہ بڑے بڑے عالم و فاضل، لائق و فائق اساتذہ کے تمام کمال کارناموں پر محض قصائد کی بے عنوانی کے سبب پانی پھیر دیتے ہیں، اس درجہ متنفر ہوتے ہیں کہ کھلم کھلا اُن کی تضحیک و تذلیل پر اُتر آتے ہیں اور اپنا نصب العین بنا کر پیش کرتے ہیں، مومن خاں کو۔ وہ مومن خاں جن کے کلیات میں ایک سے زیادہ خوشامدانہ قصیدے نہ ہونے کی وجہ سے ان کی خودداری اور وقار تو مسلم ہو جاتے ہیں لیکن ایک دو نہیں متعدد عریاں اور بے محل مثنویوں کی بنا پر اُن کے عجیبی کیرکٹر کی صحیح تعبیر نہیں کی جا سکتی۔ مولانا عبدالسلام ہوے یا ڈاکٹر عبداللطیف، مرزا یگانہ ہوے یا اور کوئی نقاد، ان سب حضرات نے غلطی یہ کی ہے کہ شاعری کو بجاے فن لطیفہ کے سائنس یا حکمت کی طرح ایک سنجیدہ اور پابند علم تصور کرلیا جائے یعنی ان لوگوں کے نزدیک ہر شاعر کا سرمایۂ سخن اُس کی زندگی کا آئینہ

ہوتا ہے، درانحالیکہ یہ اصول قطعاً لغو ہے اور کوئی شخص اس سے کسی طرح اتفاق نہیں کر سکتا، اگر یہ اصحاب یہ کہتے کہ شاعر کے کلام کو اُس کے اشتغال زندگی کا آئینہ ہونا چاہیے تو شاید مجھکو اتنا اعتراض نہ ہوتا مگر کسی شخص کا یہ دعوی کہ کلام شاعر قال نہیں حال ہوتا ہے یکسر مہمل ہے۔ اگر امیر مینائی رح نے نواب کلب علی خاں خلد آشیاں کی شان میں ایک قصیدے کے دعائیہ حصے کے ضمن میں یہ شعر بھی لکھ دیا

ذلیت کے یہ نفس چند جو باقی ہیں امیر — انھیں قدموں کے تلے جائیں بڑے لطف سے کٹ (امیر)

تو اس کے معنی یہ نہیں ہوسکے کہ اُنھوں نے عامۂ خلائق کو بے غیرتی یا پست خیالی کی تعلیم دی، یا وہ خود بے غیرتی اور بیحیائی کی زندگی بسر کرنے کے عادی تھے۔ اگر غالب کی کسی غزل میں یہ شعر پایا جاتا ہے

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم — ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں۔ (غالب)

تو اس کا یہ مقصد نہیں ہوا کہ اُس نے جمع انسانوں کو نماز، روزہ، پوجا پاٹ، پرستش، غرض ہمہ قسم کی عبادت سے اجتناب کرنے کا سبق پڑھایا۔ یا وہ خود ذہنیاً عبادت گزاری کو بیکار سمجھتا یا اُس سے گریز کرتا تھا۔ اگر داغ نے اپنی ایک مناجات میں ایک بیت یوں لکھی کہ

لاکھ دینوں کا ایک دینا ہے — دل بے مدعا دیا تو نے (داغ)

تو اس کا مطلب یہ کسی طرح نہیں ہوسکتا کہ وہ خود دنیا کی ہر طلب سے بے نیاز تھے، برخلاف اسکے اُن کو تو اپنے اذکار اور اشغال کے لحاظ سے طلب جاہ اور ہوس مال عوام سے زیادہ رہی اور اسی نے اُن سے دہلی چھڑا کر رامپور، عظیم آباد، اور حیدرآباد جیسے شہروں کی خاک چھنوائی۔

معترضین اعتراض کرتے ہیں کہ شعرا نے قصیدوں میں اپنے ممدوحین کی ایسی ایسی تعریفیں کی ہیں، ایسے ایسے زمین و آسمان کے قلابے ملائے ہیں جن کا سر پیر کچھ بھی نہیں، اور اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ مدح گو حضرات خود بہت پست خیال، کمظرف، اور خوشامدی ہوتے تھے۔ درانحالیکہ یہی معترضین خود آج اڈریسوں کے ذریعہ، تہنیت ناموں کی آڑ میں، سپاس ناموں کے پردے میں، اپنی معمولی سے معمولی غرض کی خاطر ان شعرا سے کہیں زیادہ چکنی چپڑی باتیں بناتے ہیں۔ اور اپنے اس فعل کے جواز میں ڈھب (*Tact*) کو آڑ لاتے ہیں۔ لیکن جس طرح آج تہنیت نامے، سپاس نامے، وغیرہ خوشامد درآمد کا ذریعہ ہیں ساٹھ ستر سال پہلے قصائد مطلب برآری کا وسیلہ تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ جن کی تعریف و توصیف میں کل قصیدے

لکھے جاتے تھے اور آج مختلف الاسم "نامے" پڑھے جاتے ہیں اُن کے کردار خود اس خوشامد اور چاپلوسی کے ذمہ دار ہیں۔ اُنھوں نے اپنے طبائع کا رنگ ایسا رکھا کہ اُن کے متوسلین اس قسم کی غیر فطری حرکتوں پر مجبور ہو گئے۔

اس تمام توضیح سے میرا مطلب یہ نہیں کہ تملق جائز ہے یا چاپلوسی کا عمل قابلِ تحسین ہے میں تو بس اتنا جتانا چاہتا ہوں کہ بحالت موجودہ کسی شاعر کے کسی حصۂ کلام کو اُس کے سوانحِ حیات کا آئینہ سمجھنا ایسا ہی ہے جیسے مخملی میانِ شمشیر کی نرمی کو جوہرِ شمشیر کا معیار قرار دینا۔ شعرا کا کلام، اور خصوصاً مشرقی شعرا کا کلام نہ اُن کے ذاتی عقائد و خیالات کا مرقع ہوتا تھا نہ ہو سکتا ہے۔ مثلاً میں شعر کہنے بیٹھتا ہوں۔ طرح کا مصرعہ ہے (بیٹھا ہوں مست و بیخود خاموش ہیں فضائیں) میرے قلم سے یہ شعر نکلتا ہے

اُفتادگی کی لذت تو نے نہیں اُٹھائی ورنہ کبھی نہ کرتا منزل کی التجائیں

دو ہی چار روز کے بعد ایک دوسری طرح پر طبع آزمائی کے دَوران میں یہ شعر کہہ جاتا ہوں۔

پہونچیں گے جانے منزلِ جاناں سے کب قریب جب ابتدا جہاں کی ہوئی تھی چلے تھے ہم

دونوں اشعار کا مرکزی تخیل ایک دوسرے کے قطعاً متضاد ہے لیکن باایں ہمہ دونوں شعر ایک ہی شاعر کی کاوشوں کا ثمرہ ہیں اور لطف یہ کہ دونوں میں سے ایک بھی اُس کے شخصی عقائد کی صحیح تصویر نہیں نہ وہ منزل سے گریزاں ہے نہ منزل کے شوق میں منزل کی سمت بے تحاشا رواں دواں۔

اس موقعہ پر ممکن ہے یہ اعتراض کیا جائے کہ قدیم شاعری کے دلدادہ شعرا کے یہاں یہ تخالفِ جذبات پایا جا سکتا ہے لیکن طرزِ جدید کے شعرا کا کلام اس نقص سے بدیں وجہ پاک ہے کہ اُنکی شاعری حقیقت سے زیادہ قریب اور فطرت کے زیادہ مطابق ہوتی ہے۔ جگر مرادآبادی دَورِ جدید کے ممتاز ترین غزل گو شعرا میں شمار کیے جاتے ہیں رئیس المتغزلین اُن کا لقب ہے۔ اُنکے دو شعر ہیں

(۱) دل تھا ترے خیال سے پہلے چمن چمن اب بھی روش روش ہے مگر پائمال ہے

(۲) لاکھوں میں انتخاب کے قابل بنا دیا جس دل کو تم نے دیکھ لیا دل بنا دیا

دونوں کے مرکزی تخیل میں جو اختلاف عظیم ہے وہ اربابِ فکر کی نگاہوں سے پنہاں نہیں۔

اصغر گونڈوی کو دَورِ جدید میں "غالبِ ثانی" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اُن کے دونوں دیوان "نشاطِ روح" اور "سرودِ زندگی" ملک کے علم داں اور علم دوست طبقے میں ہاتھوں ہاتھ لیے گئے۔ اُن کے دیوانِ اول کے دو اشعار یہاں نقل کرتا ہوں۔

(۱) اب طور پر وہ برقِ تجلی نہیں رہی ٹھہرا رہا ہے شعلۂ عریانِ آرزو

(۲) شاید کہ پیام آیا پھر وادیِ سینا سے شعلے سے لپکتے ہیں کچھ کسوتِ مینا سے

پہلے شعر میں طور کی ویرانی بیان کی ہے اور دوسرے میں اسی طور پر تجدیدِ تجلی کا ذکر کیا ہے۔ ان تمثیلات سے واضح ہے کہ خیالات کے تخالف کا یہ نقص [اگر اسے نقص کہا جا سکتا ہے) صرف دورِ قدیم ہی تک محدود نہیں۔ پھر آخر کس طرح شاعروں کے افکار کو اُنکے عقائد و اعتقادات، اُنکے اذکار و اشغال کا آئینہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ البتہ ممکن ہے اور ممکن ہی نہیں مشاہدہ ہے کہ شعرا کے سرمایۂ سخن کا کچھ حصہ کبھی کبھی اُنکے تخیلات اور تصورات کا عکس ہو سکے جیسے داغؔ کے کلام کے اکثر جزو اُنکے مذاقِ طبیعت کی سچی تصاویر ہیں یا خواجہ میر دردؔ کا بیشتر حصۂ شاعری اُن کے اشغالِ تصوف کا آئینہ دار ہے۔

میرے خیال میں اس قسم کی فروگذاشتیں محض نظری خیالات بنا لینے اور اصلیت کو نظر انداز کر دینے کا نتیجہ ہیں۔ شاعر کوئی فرشتے تو ہوتے نہیں انسان ہی ہوتے ہیں، اُن میں بھی وہی حسن و قبح، وہی خوب و زشت پائے جانا لازمی ہیں جو عام انسانوں میں ملتے ہیں، مجھ میں آپ میں دکھائی دیتے ہیں عمرو بکر میں نظر آتے ہیں۔ پھر آخر شعرا کو "آئیڈیل" انسان کیوں تصور کر لیا جاتا ہے کہ وہ صرف وہی کہیں گے جسے خود بھی صحیح سمجھیں گے، صرف وہی لکھیں گے جسے آپ بھی درست جانیں گے۔

میں اور آپ تو صبح سے شام تک اخلاقاً، طوعاً و کرہاً یا مجبوراً ایک جابر حاکم کو راضی رکھنے کی غرض سے اُس کی ثنا و صفت میں جھوٹ کے دریا بہا دیں اور کوئی مضائقہ نہ ہو لیکن بیچارہ شاعر اگر کہیں اصلیت سے سرمو تجاوز کر جائے تو کشتنی اور گردن زدنی۔ میرے اور آپ کے حلقۂ احباب میں تو اکثر مذاق میں دلچسپی کے لیے ایکٹرسوں اور طوائفوں کے حسن و جمال، دلکشی و دلآویزی کے تذکرے رہیں اور غریب شاعر اگر دو چار شعر کنگھی چوٹی، مسی کاجل، انگیا دوپٹہ، چشم و ابرو، عارض و گیسو کے بارے میں لکھ دے تو پست مذاق، بے شرم، میرے آپ کے دلوں میں خلیل اور آتشِ نمرود، کلیم اور برقِ تجلی، عیسیٰ اور قم باذنی کے متعلق عقلی قیاسات یا شبہات گشت کرتے رہیں تو چنداں حرج نہیں لیکن غریب شاعر اگر یہ کہہ دے

کیسی ارنی کہاں کے موسیٰ خود دید کی اپنے آرزو کی

تھا پردۂ ظاہری جو منظور آواز بدل کے گفتگو کی (امیر مینائیؒ)

تو ملحد، زندیق، بے دین۔ دراں حالیکہ وہ یہ تمام باتیں محض شاعر کی حیثیت سے کہتا ہے انسان کی

حیثیت سے نہیں۔ یہ سب کلام جمع کرنے کے لیے کرتا ہے عقائد کی تخریب کے واسطے نہیں۔ اور پھر بھی اُس پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ چونکہ وہ اپنے سوانح حیات اور سرمایۂ افکار میں تطابق اور توافق نہیں پیدا کر سکا اس لیے اُس کا کلام قابل قدر اور لایق وقعت نہیں۔

آئیے اتمام حجت کے لیے دو ایک کھلی ہوئی تمثیلوں سے بھی بحث کرلیں۔ فرض کیجیے ایک سنی العقائد شاعر زمانے کے ہاتھوں ایک شیعہ رئیس کے یہاں درباری شاعر کی حیثیت سے کام کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے، درباری شاعر کی اس کے فرائض میں منجملہ اور امور کے یہ چیز بھی داخل ہے کہ تاریخ پیدایش حضرت علی کرم اللہ وجہہ آنے پر منقبت میں ایک قصیدہ لکھ کر پیش کیا کرے۔ ہر مسلمان خواہ وہ سُنی ہو یا شیعہ، اس پر مجبور ہے کہ مولائے مشکل کشا کی عظمت کو تسلیم کرتے ہوئے ان کی ذاتِ بابرکات سے اُنس رکھے۔ بنا برآں اس شاعر کے لیے منقبت علیؓ میں قصیدہ لکھنا، منفعت دنیا کا سبب تو ہے ہی سعادت اُخروی کا ذریعہ بھی ہو جاتا ہے۔ چنانچہ وہ اس حکم کی تعمیل میں پس و پیش نہیں کرتا اور یکے بعد دیگرے شدہ پرشکوہ قصائد لکھتا ہے۔ صدیاں گزر جاتی ہیں نہ رئیس کا نام و نشان رہتا ہے نہ شاعر کا، صرف شاعر مذکور کا کلام دیوان کی صورت میں باقی رہتا ہے میں یا آپ اُس کا مطالعہ کرتے ہیں اور چونکہ اُس میں صرف منقبت حضرت علی میں قصائد موجود ہیں اس لیے فوراً یہ نتیجہ نکال لیتے ہیں کہ یہ شاعر اگر شیعہ نہیں تو تفضیلیہ ضرور تھا۔ ذرا غور کیجیے یہ نتیجہ نکالنا کہاں تک واقعات کے مطابق ہوگا، پھر کس طرح ہم شاعر کے کلام کی بنا پر اُس کے اعتقادات اور عقائد سے واقفیت حاصل کرسکنے کے مدعی ہو سکتے ہیں۔

امیر مینائی مرحوم فرقہ سنت و الجماعت کے پیرو تھے اور نواب کلب علی خاں خلد آشیاں بھی اسی فرقے سے تعلق رکھتے تھے۔ لکھنؤ کے مشہور شاعر ہوس کا ایک شہرۂ آفاق قصیدہ جو منقبت حضرت علی میں ہے کسی طرح نواب صاحب مرحوم کے کانوں تک پہونچا اور پہونچانے والے نے یہ کہکر پہونچایا کہ اب اس پایہ کا قصیدہ، اسی زمین اور اسی بحر میں ناممکن ہے۔ نواب خلد آشیاں مرحوم کو امیر مرحوم سے محبت بھی بہت تھی اور اُن کی قابلیت اور ذہانت پر اعتماد بھی زیادہ تھا، جانتے تھے کہ اگر صرف فرمایش کروں گا تو شاید اس جانب توجہ نہ کریں یا توجہ کریں بھی تو اوپری دل سے اس لیے یہ ترکیب نکالی کہ سر دربار ہوس کے قصیدے کی تعریف و توصیف کی اور کہا کہ "اب کوئی شاعر اس رتبہ کا قصیدہ منقبت میں نہیں لکھ سکتا"۔ حضرت امیر نے اُس وقت سکوت کیا لیکن پندرہ دن کے بعد سر دربار ہی قصیدہ سنانے کی اجازت چاہی اور منقبت میں ہوس ہی کی زمین میں ایسا قصیدہ

پڑھا کہ نواب کلب علی خاں مرحوم بھی بے اختیار یہ کہہ اُٹھے کہ "حضرت محسن کا قصیدہ تو آپ کے قصیدے کے سامنے گرد ہے" یہ قصیدہ

کیوں کر نہ کروں ملک معانی کو میں تسخیر　　خامہ ہے مرا دست یداللہ کی شمشیر

اُنکے دیوان محامد خاتم النبیین میں موجود ہے۔ لیکن اب مسئلہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ اُن کے کسی دیوان میں بھی سیدنا ابوبکر صدیق، سیدنا حضرت عمر فاروق اور سیدنا حضرت عثمان غنی میں سے کسی کے مناقب میں کوئی قصیدہ نہیں ہے تو کیا آپ اس سے یہ نتیجہ نکالیں گے کہ امیر مینائی مرحوم شیعہ مذہب کے پیرو تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ نتیجہ کس قدر غلط ہو گا لیکن اگر ایسا کیا جائے تو وہ ثمرہ کسی غلط مفروضے کا ہو گا کہ شاعر کا کلام اُسکے عقائد زندگی اور سوانح حیات کا آئینہ ہوتا ہے۔

انھیں سب وجوہ کی بنا پر میری رائے ہے کہ لکھنوی اور دہلوی مدارس شاعری کے امتیازکو تحقیقی اور تنقیدی نظر سے دیکھنے کے لیے ضرورت صرف اُسی کی نہیں کہ شاعری کی تعریفات اور توضیحات سے بحث کی جائے [جس کے بعد ایک ایسے نظری اصول تک ہماری رسائی کا امکان ہے جسکی مدد سے ہم شاعری کا صحیح تخیل اپنے ذہن میں لا سکیں گے] بلکہ اس امر کی بھی کہ آغاز شعرگوئی سے انسان کے ذہن میں شاعری کے متعلق کیا نظریہ قائم ہوا اُس نے کس طرح ارتقائی منازل طے کیے اور اب اُس کی نوعیت کیا ہے۔ اسی لیے میں نے ابتدا میں کہا تھا کہ حقیقت شاعری کے تجزیہ کے واسطے دنیا کی تقریباً تمام ترقی یافتہ زبانوں کے سرمایہ سخن سے مدد لیے بغیر اس سوال کا جواب حاصل کرنا ناممکن ہے کہ ابتداے آفرینش سے انسان نے اپنی فطری استعداد کے تحت شاعری کو کس راہ پر چلایا۔ یہ صورت طولانی ضرور ہو گی مگر اس کے علاوہ کسی اور طریقے سے صحیح نتیجہ تک پہونچنا محال ہے کیونکہ اگر اختصار کی خاطر صرف چند مشرقی زبانوں کے ادب سے سروکار رکھا گیا تو نتائج میں وہ عمومیت نہ ہوگی جس کی یہ بحث محتاج ہے۔　　(باقی)

فردوسِ خیال

(جناب میاں عبدالعزیز صاحب فطرت)

دنیاے جمال ہے تصور اُن کا　　فردوس خیال ہے تصور اُن کا
جی چاہتا ہے اُنھی کے ہو کر رہیے　　ہستی کا مآل ہے تصور اُن کا

آہ عزیز!

(جناب حکیم سید علی صاحب آشفتہ لکھنوی)

دنیا نے اپنی تاریخ ستم کو کتنی بار دوہرایا۔ فلک نے کیا کیا انقلاب پیدا کیے۔ مگر نہ اس کا کبھی کلیجا ٹھنڈا ہوا اور نہ دل پورا ہوا۔ یہ سچ ہے اہل کمال کی ساری خدائی دشمن ہوتی ہے۔ اگر آسمان پیس پیس کے فنا کرنے کے لیے تیار تو زمین نگل جانے کے واسطے آمادہ۔

اے بے رحم زمانے، بتا، آج وہ علوم و فنون کے دریا بہا دینے والے ارباب کمال کہاں ہیں، جنکے نقش قدم نے ذرّوں کو آفتاب، زمین کو آسمان بنا دیا۔ کیا تاریخ عالم ہی اتنا دم ہے کہ ان کی مکمل فہرست بھی ارباب نظر کے سامنے پیش کر سکے۔ نہیں۔ ہرگز نہیں۔ انصاف کی بات تو یہ ہے کہ آج کن کن علوم کے عالموں کو روئیں۔ کن کن فنون کے ماہروں کا ماتم کریں۔ ہر پھر کے بیتاب دل کو یہی سمجھانا پڑتا ہے کہ ازل سے نظام عالم یوں ہی قائم ہے۔ یہی ہوتا آیا ہے اور قیامت تک یہی ہوتا رہے گا۔ جب اس عالم فانی میں پیغمبر، اوصیا، اولیا نہ رہے تو پھر کسی اور بشر کا کیا ذکر۔

مرنے والا عالی ظرف دنیا سے پاک ہو کے اپنا دور عمل ختم کرکے چل بسا۔ اب اُس کے لبوں پر ہمیشہ کے لیے موت نے مہر سکوت لگا دی۔ اُس کی پُر نور آنکھیں تاریک و بے نور، اُس کا تبصرہ کرنے والا دماغ خاموش، اُسکا جذبات بھرا دل قیامت تک کے لیے ساکن ہے۔

ہاں اب دنیا میں سانس لینے والوں کا فرض ضرور ہے کہ مرنے والا اگر اس قابل ہے تو اُس کی یادگاریں قائم کریں، مجالس غم منعقد کریں، اُس کی زندگی کے کارناموں کو منظر عام پر لائیں۔ کچھ اسکے تذکروں سے دلوں کو عارضی تسلی دے لیں۔

افسوس ہے کل کی بات ہے۔ لکھنؤ کی بزم ادب اور اہل لکھنؤ کو لسان الہند جناب مرزا محمد ہادی صاحب عزیز پر کتنا ناز تھا اور سچ بھی یہ ہے کہ وہ ذات ناز کے قابل تھی۔ یہ تو تسلیم ہی کرنا پڑے گا کہ اس شخص نے لکھنؤ کی شاعری میں چار چاند لگا دیے اور ایک ایسی عام پسند طرز شاعری کی طرح ڈالی جو ہر دلعزیز اور مقبول ہوکے رہی۔ افسوس آج موت نے وہ سارا غرور خاک میں ملا دیا۔

جی میں آتا ہے کہ اُنکے مختصر حالات اور کچھ کلام حسب فرمائش حوالۂ قلم کروں۔ حالانکہ اُنکے سوانح حیات مجھ سے بہتر افراد لکھ رہے ہیں اور بہت ممکن ہے کہ اور اور حضرات بھی لکھیں اس لیے

کہ انکا حلقۂ احباب بھی وسیع تھا اور حلقۂ اثر بھی۔

جناب عزیز مرحوم کے مفصل حالات تعلیم و تعلم اور سلسلۂ حسب و نسب، اُنکے مجموعۂ غزلیات (گلکدہ) میں موجود ہیں۔ مگر چونکہ یہ ضروری نہیں کہ سب کی نظر سے گلکدہ بھی گزر چکا ہو، اس لحاظ سے اجمالاً انکا بھی ذکر ضروری ہے۔

نام و نسب مرزا محمد ہادی عزیز۔ ابن مولانا مرزا محمد علی (صاحبِ نجوم السماء) ابن مرزا صادق علی ابن مرزا محمد مہدی ابن مرزا محمد کاظم ابن مرزا محمد جعفر شیرازی۔ آخر الذکر، عزیز مرحوم کے بزرگوں میں پہلے شخص ہیں جو شیراز سے کشمیر اور کشمیر سے بتحریک خال محترم مرزا رضا علی خاں جواہر رقم، لکھنؤ تشریف لائے اور پھر لکھنؤ میں اُن کی نسل پھیلی۔ سنتے ہیں کہ عزیز مرحوم کے ننہیال کا سلسلۂ نسب سادات کرام سے ملتا ہے۔

مختصر حالات خاندانی ایک حد تک مرحوم کا خاندان علمی خاندان تھا۔ چنانچہ عزیز صاحب کے والد ماجد ایک ممتاز ادیب اور صاحب علم و فضل بزرگ تھے۔ ہونا بھی چاہیے تھا۔ اس لیے کہ آپ کے اساتذہ کے سلسلہ میں سلطان العلما بحر العلوم مولانا سید محمد صاحب قبلہ کے ایسے فرد فرید کا بھی نام نظر آتا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ علامہ مفتی محمد عباس صاحب شوستری مرحوم کا بھی اسم گرامی اور جامع علوم و فنون مولانا سید حامد حسین صاحب قبلہ کا نام نامی بھی۔ بھلا جسکے ایسے ایسے منتخب روزگار اساتذہ ہوں اُس کی قابلیت کا کیا پوچھنا۔ مسبوق الذکر نے اپنے بعد ایک فرزند روحانی (کتاب نجوم السماء) اور دو صاحبزادے چھوڑے جو دونوں اپنے اپنے فن میں صاحب کمال گزرے۔ بڑے صاحبزادے جناب حکیم محمد مہدی صاحب مرحوم جو اپنے عہد میں فن طب کے بہترین صاحب علم و عمل فرد سمجھے جاتے تھے اور حکیم بنا صاحب مرحوم کا خاندان اپنے گھر کے اس ہونہار شاگرد پر فخر کرتا تھا۔ دوسرے صاحبزادے یہی مرحوم مرزا محمد ہادی صاحب عزیز تھے، جو آسمانِ شاعری پر سورج بن کر چمکے اور شاید یہ روشنی انکی قیامت تک قائم رہے۔

مرحوم کا سنہ ولادت ۱۳۰۰ھ مطابق ۱۸۸۲ء اور تاریخ پیدائش ۵ ربیع الاول ہے۔ افسوس جس طرح ۱۸۸۲ء لکھنؤ اور اہل لکھنؤ کے لیے نیک و مسعود تھا، اسی طرح ۲ راگست ۱۹۳۵ء کا دن منحوس و دلشکن ثابت ہوا۔ جس نے یہ جوہر فرد اہل لکھنؤ سے زبردستی چھین لیا۔

مرحوم نہایت کم سنی میں اپنے والد مرحوم کے سایۂ عاطفت سے محروم ہو گئے۔ اگرچہ بڑے بھائی حکیم محمد مہدی صاحب مرحوم موجود تھے، مگر غالباً مختلف الذہن ہونے کی وجہ سے عزیز صاحب کی والدۂ ماجدہ

اُن سے علیحدہ رہیں اور عزیز مرحوم کی تربیت و پرداخت اُن کے سپرد نہ ہوئی - ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ کوئی مربی و سرپرست نہ تھا - لیکن قدرت کی نظر کرم ساتھ ساتھ تھی - گویا ایک غائبانہ قوت نے تمام رسمی علوم و فنون (یعنی علوم مشرقیہ) سے جو اُس وقت شرفا میں لزوم کے طور پر رائج تھے سج سجا کر ایک جاذب نظر صاحب کمال فرد عزیز بنا کے چھوڑا - اور رفتہ رفتہ اُس جوہر کمال کے اُبھرنے کا وقت آگیا جو بدو فطرت سے داخل خمیر کر دیا گیا تھا (یعنی ذوق شعری) - کچھ ہی دنوں میں یہ جوہر کمال پر لے اُڑا - آخر ہندوستان کے اس سرے سے لیکر اُس سرے تک کمالات شاعری کے جھنڈے گاڑ ہی کر چھوڑے

اگر دعوے کے ساتھ یہ عرض کیا جائے تو غلط نہیں ہو سکتا کہ جیسی عزیز مرحوم نے اپنی زندگی میں اپنے باغ نظم کی کامیاب بہار دیکھی اس کی مثال اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے -

جناب ڈپٹی جعفر علی خاں اثر - جناب شبیر حسن خاں جوش - جناب جودھری رحم علی صاحب ہاشمی جگت موہن لال رواں (جنھوں نے حال ہی میں انتقال کیا) آخر یہ کس کے گلستان کمال کے لہلہاتے ہوئے اشجار ہیں - کیا ان لوگوں کا انتہائی فروغ انکی غیر معمولی شہرت و مقبولیت ان کی کامیابیاں درحقیقت عزیز مرحوم کی قابل ناز کامیابیاں نہ تھیں - تھیں اور ضرور تھیں - اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے - جب تک یہ فردیں اور انکے کلام کے اثرات دنیا میں موجود ہیں - عزیز مر نہیں سکتے، اور انکے علاوہ بھی انکے بہت سے شاگرد قابل تذکرہ ہیں جنکو بہ خیال طوالت نظر انداز کرتا ہوں -

افتادِ مزاج اس میں شک نہیں کہ مرحوم لکھنؤ کی پرانی تہذیب و اخلاق کا نمونہ اور صحیح نمونہ تھے اگر اُن میں خودداری درجۂ کمال پر تھی تو عجز و انکسار بھی حد پر تھا - سنجیدگی کے ساتھ ساتھ سادگی بھی انتہا پر تھی - تکلفات شاعرانہ کے ساتھ دوستوں کے ساتھ بے تکلفی بھی حد پر تھی - اگر وہ تہذیب و شائستگی کا نمونہ تھے تو ظرافت اور بذلہ سنجی کی جان تھے - مجھے خوب معلوم ہے کہ وہ ایک حقیقت شناس دل کے مالک تھے - انکو تصنع اور بناوٹ سے بڑی حد تک نفرت تھی - قناعت، صبر، استقلال یہ تمام شریفانہ خصائل مرحوم میں بدرجۂ اتم موجود تھے - چونکہ شاعر قدرتاً ذکی الحس اور نازک مزاج ہوتے ہیں اس لیے ایک حد تک اُن میں نازک مزاجی ضرور تھی - جو خودداری سے مل کر کبھی غرور و تکبر کا دھوکا دیتی تھی - اور لوگ غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے تھے لیکن انکی اُفتادِ مزاج سے واقفیت رکھنے والے اس راز کو اور اُنکی سادہ طبیعت کو خوب اچھی طرح

سمجھتے تھے۔ بیشک جب تک لوگ اُن سے ملتے نہ تھے اُس وقت تک اس قسم کی غلطیوں میں مبتلا رہتے تھے لیکن حقیقت حال پر مطلع ہونے کے بعد ہر شخص کو سابقہ رائے بدلنا پڑتی تھی۔ کسی کو افسوس اور ندامت کے ساتھ، کسی کو تعجب و حیرت کے ساتھ۔

اسباب معیشت

زمانہ اہل کمال کا ہمیشہ سے دشمن ہے۔ علی العموم اہل زمانہ کی اور خاص طور پر ہندوستان والوں کی طبیعت ثانیہ ہوگئی ہے کہ اہل کمال کو زندگی میں پنپنے نہیں دیتے۔ ہم نے ہمیشہ ہی دیکھا ہے کہ ممتاز خدمت انجام دینے والے ہدف ملامت ہی رہتے ہیں۔ اہل دنیا بجائے ہمت افزائی کے نکتہ چینی اور تنقیص زائد کرتے ہیں۔ لسان الہند عزیز مرحوم اپنے کلیجے پر ایسے ایسے ہزاروں داغ لے گئے۔

ابتدا میں عزیز مرحوم کی ہمدردی، قدر، عزت افزائی جو چاہے کہیے۔ شہر کے ممتاز و مخیر رئیس مرزا مہاراجہ محمد عباس علی خاں صاحب بہادر مرحوم نے کی۔ اپنا اُستاد بھی بنایا اور معتمد اور حاشیہ نشیں بھی۔ رسمی طور پر کچھ خدمات بھی سپرد کر دیے۔ غرضکہ مرزا مہاراجہ کی زندگی تک عزیز مرحوم دنیا کی فکروں سے بے نیاز ہو کر اپنے ذوق کی تکمیل میں مصروف رہے۔ وہ دن اچھے تھے۔ بن پڑے کی بات ہے۔ قدر شناس بھی موجود تھے۔ زمانہ بھی خاموشی کے ساتھ اُبھرنے کا وقت دے رہا تھا۔ طبیعت کی اُمنگ کا بھی وقت تھا۔ صحیح معنوں میں عزیز کی شاعری کے شباب کا وقت تھا۔ لیکن یہ دَور وسعت کے لحاظ سے بہت طولانی نہ تھا۔ اس کے ختم ہوتے ہی زور ابتلا شروع ہو گیا۔ مرزا صاحب کے یہاں سے سلسلہ منقطع ہونے کے بعد اگرچہ مرحوم کو امین آباد ہائی اسکول میں پرشین ٹیچری کی مناسب جگہ مل گئی تھی۔ مگر وہ فارغ البالی اور اطمینان جو مرزا مہاراجہ کے یہاں تھا، عرصے تک نصیب ہوا۔ تیرہ چودہ برس کم و بیش اس ملازمت میں مرحوم نے گزارے۔ اس مصروفیت اور کشاکش حیات میں بھی جس قدر وقت فرائض ملازمت کے بعد بچتا تھا وہ اسی ذوق نظری (شاعری) کی تکمیل میں صرف ہو جاتا تھا۔ اگرچہ وقت کم ملنے کی وجہ سے ذوق تشنہ رہتا تھا۔ فلک کی زہریلی آنکھیں اس وقفۂ سکون کو بھی نہ دیکھ سکیں۔

رفتہ رفتہ اس زمانہ سے صحت خراب ہونا شروع ہوئی۔ پہلے امراض شانہ پیدا ہوئے۔ پھر فالج کا حملہ ہوا۔ ان امراض سے تو نجات ہوئی مگر دائمی طور سے افسردگی اور اضمحلال شریک زندگی ہو گئے۔ اب فرائض ملازمت تکلف سے ادا ہونے لگے۔ ہمہ وقت ایک خاص قسم کا تعب اور غیر معمولی طور پر تکان محسوس کرنے لگے۔ صحت و تندرستی کا تو قاعدہ ہی یہ ہے کہ ایک دفعہ بگڑی تو بگڑی۔ پھر

خدا ہی سنبھالے تو سنبھلے۔ مثانہ تو اول ہی سے بعض امراض کی وجہ سے خراب ہو چکا تھا۔ اعصاب اور دماغ کو فالج کے حملہ نے کمزور بنا دیا تھا۔ ان سب پر طرہ ذیابیطس کا حملہ ہوا۔ جس نے رہی سہی صحت اور دماغی قوتوں کو اور بھی خاک میں ملا دیا۔ اب یہ حالت ہوئی کہ کبھی تشویش دماغی میں زیادتی ہے تو کبھی تبخیر معدی کا زور ہے۔ کبھی شانے کی اینٹھن سے اضطراب ہے تو کبھی اختلاج قلب سے بدحواسی ہے۔ نسیان کا غلبہ ہے۔ تردد ہے۔ توہم ہے۔ بظاہر دیکھنے میں توانا لیکن درحقیقت ممدکا ضعف۔ گھر سے امین آباد ہائی اسکول جو تین چار فرلانگ سے زائد کی مسافت نہ تھی۔ جانے آنے میں چور چور ہو جاتے تھے۔ یہ شاعرانہ منزلت کے اعتبار سے وہ وقت تھا کہ عزیز مرحوم کا آوازۂ کمال ہندوستان کے اس سرے سے اُس سرے تک پہونچ چکا تھا۔ قدرشناس اور کلام کے دلدادہ کافی طور سے پیدا ہو چکے تھے۔ حلقۂ تلامذہ وسیع ہو چکا تھا۔ آغوش تربیت میں سنورنے اور سدھرنے کے لیے ہونہار تلامیذ آ چکے تھے۔

خدا غریق رحمت کرے مہاراجہ محمود آباد (سر راجہ علی محمد خاں صاحب مرحوم) کو۔ عجب جوہر شناس ہستی تھی۔ رہے نام اللہ کا۔ کیسے کیسے لوگ دنیا سے اُٹھ گئے۔ بھلا اب ایسے مردم شناس کہاں پیدا ہوتے ہیں۔ مرحوم کی نظر انتخاب نے اس جوہر فرد کو جانچا۔ اور انکی اس تعجب انگیز طرز زندگی کو محسوس کرکے بنظر قدرشناسی موجودہ راجہ صاحب بہادر محمود آباد یعنی عالیجناب خانبہادر راجہ امیر احمد خاں صاحب دام اقبالہ کا نگراں مقرر کر دیا۔

عزیز مرحوم نے یہ عافیت کی جگہ پا کے اطمینان کی سانس تو ضرور لی۔ لیکن اس اطمینان کا لطف قسمت میں نہ تھا اس لیے کہ امراض نے اندر ہی اندر صحت کو گھن لگا دیا تھا۔ فالج، ذیابیطس، مثانہ کی خرابیوں کے ساتھ امراض صدر کا بھی سلسلہ شروع ہوگیا اور رفتہ رفتہ دن کی حرارت نے جڑ پکڑنا شروع کر دی۔ مختلف تدابیر کم و بیش تو ہوتے رہتے تھے۔ لیکن محمود آباد کے مستقل قیام کی وجہ سے علاج میں پوری سرگرمی ناممکن تھی۔ لہذا یہ بات یقینی ہے کہ مقتضائے حال کے لحاظ سے معالجہ میں ایک حد تک لاپرواہی ہوتی رہی۔ جسکا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ حالت روز بروز خراب ہوتی جائے اور یہی ہوا۔

غالباً ان کی اس حالت کا اندازہ کرکے مرحوم مہاراجہ صاحب نے ان کی خدمات کتبخانے کی طرف منتقل کر دیے۔ پہلے کی بہ نسبت آرام لینے کا موقع تو ضرور پیدا ہوگیا مگر موت کی نظروں پر چڑھے ہوئے بیمار بھی کہیں شفایاب ہوتے ہیں۔ بگڑی ہوئی تندرستی نہ سنبھلنا تھی نہ سنبھلی۔

اس کشمکش مرگ وزیست کے عالم میں تقدیر نے دوسری قیامت یہ توڑی کہ مرحوم مہاراجہ نے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ میں تو یہی کہوں گا کہ مہاراجہ کی موت درحقیقت عزیز صاحب کی موت تھی۔ اس جاں فرسا واقعہ سے مایوس اور بیمار دل کی رہی سہی آس بھی ٹوٹ گئی اور ایک ایسا شدید دھکا لگا کہ پھر عزیز نہ سنبھل سکے۔

دل کی کمزوریوں کے ساتھ دیگر جسمانی امراض نے زور پکڑا۔ حرارت تو مزمن ہو ہی چکی تھی پھیپھڑوں میں پانی بھی آگیا۔ ڈاکٹری طریق علاج پر انجکشن ہونا شروع ہوئے۔ نلکیوں کے ذریعہ پھیپھڑوں سے پانی نکالا جانے لگا جس میں پانی کے ساتھ ساتھ خون بھی برابر نکلتا رہا۔ مختصر یہ کہ پھیپھڑے ٹھیک ہوئے نہ حرارت نے ساتھ چھوڑا۔ رفتہ رفتہ کھانسی بڑھی اداز بیٹھی۔ غرضکہ جب تک تو سنے دفاکی محمود آباد سے ہفتہ ہفتہ پندرہ پندرہ دن کے بعد بغرض علاج لکھنؤ آتے رہے۔ آخر لکھنؤ کے قیام پر ضعف نے مجبور کردیا۔ اور ڈیڑھ ماہ بستر پر پڑ کر ۲۱؍ اگست ۳۵ء کو بعد مغرب جان جاں آفریں کے سپرد کردی۔ اللہ اللہ کیا تھا اور کیا ہوگیا۔ زمانہ بھی کیسے کیسے رنگ بدلتا ہے۔ ایک وہ وقت تھا کہ شاہزادہ نواب بچن صاحب بلیغ مرحوم، حکیم علی محسن خاں آبر مرحوم مدیر رسالہ معیار و سکرٹری دائرہ ادب لکھنؤ۔ جناب محمد صاحب بہار مرحوم جنرل سکرٹری انجمن معین الادب لکھنؤ۔ نواب مجن صاحب جویا مرحوم۔ ننھو صاحب شفیق۔ نواب حامد علی خاں صاحب مرحوم بیرسٹر۔ مرزا کاظم حسین صاحب محشر زیدی۔ بڈھن صاحب شعلہ۔ ناچیز آشفتہ۔ جناب عزیز مرحوم جناب حکیم منے آغا صاحب فاضل مدظلہ۔ حکیم محمد طاہر صاحب طاہر مرحوم۔ اکثر معیار کے مشاعروں کی غزلیں ایک ساتھ بیٹھ کے کہا کرتے تھے۔ اور اس صحبت کا نام (بیٹھک) تھا۔ یہ بیٹھک کبھی حکیم منے آغا صاحب فاضل کے دولتکدہ پر، کبھی محشر صاحب کے مکان پر، کبھی جناب بلیغ مرحوم کے کاشانہ پر، کبھی آشفتہ کے غریب خانہ پر اور کبھی خود عزیز صاحب کے مکان پر ہوا کرتی تھی۔ ہاں کبھی کبھی یہ صحبت نواب حامد علی خاں بیرسٹر مرحوم اور حکیم علی محسن خاں آبر مرحوم کے مکانوں پر بھی ہوتی تھی۔ علی العموم سرشام سے ایک بجے تک یا ۲ بجے تک نشست رہتی تھی۔ کبھی اتفاقیہ طور پر تین چار بجے شب تک بھی یہ سلسلہ پہونچ جاتا تھا۔

اللہ اللہ! ان دلچسپ صحبتوں کا مزا اور لطف ضبط تحریر میں لانا ناممکن ہے۔ ایک طرف نوجوان شعرا کی طبیعتوں کا زور، جو یہ چاہتے تھے کہ اپنے ساتھ کے کہنے والے تو در کنار، ان کہنہ مشق شعرا سے بھی بالا جیت لے جائیں۔ دوسری طرف اساتذہ اور کہنہ مشق حضرات کی باہمی نوک جھونک بذلہ سنجی

ظرافت - حسن سلوک - خلوص - یہ سب چیزیں قابل دید تھیں -

اگر ایک نے شعر کہا تو سب نے اُس پر دشمنوں کی طرح نقد کیا - ایک ذرا سا بھی اگر کسی مصرعہ میں جھول یا سقم ہوا تو محبت کے ساتھ یہ کہکے متنبہ کر دیا کہ بھائی مصرعہ سست ہے دوسرا مصرعہ لگاؤ، ہمارے خیال میں یہ معنی اچھے نہیں ہیں - یہ خیال فرسودہ ہے - یہ سامنے کا رُخ ہے - یہ شعر تمہاری شان سے گرا ہوا ہے - وغیرہ وغیرہ -

نوجوان شعرا کی کبھی اتنی حوصلہ افزائی کی کہ اُنکے دل پہاڑ ہوگئے - کبھی یہ کہکے طبیعتوں میں دور بھر دیا کہ جوان طبیعت اور ایسا پھیکا شعر کیا تم میں کوئی جذبہ ہی نہیں ہے - یہ شعر کاٹو اور دوسرے کہو -

(باقی)

رسید کتب

(۱) **مختصر تاریخ ادب اُردو** - از سید اعجاز حسین صاحب اعجاز ایم اے لکچرار شعبہ اُردو الہ آباد یونیورسٹی مطبوعہ انڈین پریس الہ آباد - قیمت ۱۲؍

(۲) **مثنوی مادر ہند** - مصنفہ شاد عظیم آبادی - ملنے کا پتہ :- شاد بکڈپو چوگھڑا پٹنہ سٹی قیمت ۱۲؍

(۳) **انقلاب فرانس** - مرتبہ مولوی عبدالقادر صاحب بی اے - ملنے کا پتہ :- مکتبہ جامعہ اسلامیہ دھلی - قیمت ۸؍

(۴) **نیم شب** (ڈراما) اشتیاق حسین صاحب قریشی - ملنے کا پتہ - جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی قیمت ۹؍

(۵) **انجام** (ڈراما) مسٹر محمد مجیب بی اے - ملنے کا پتہ :- جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی - قیمت ۱۲؍

(۶) **کمال داغ** - مرتبہ مولانا حامد حسن صاحب قادری - ملنے کا پتہ - منیجر آگرہ اخبار - آگرہ - قیمت ۱۲؍

(۷) **دو خدائی خدمتگار** (اُردو ترجمہ) از مہادیو ڈیسائی - ملنے کا پتہ، مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی - قیمت ۱۲؍

(۸) **فردوس خیال** - مولانا محمود حسن صاحب محمود اسرائیلی - مطبوعہ جامعہ پریس دہلی - قیمت ۸؍

(۹) **مسلمان بیبیاں** : مرتبہ اعجاز الحق صاحب قدوسی - ملنے کا پتہ مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی قیمت ۱۲؍

معذرت

دسمبر کا پرچہ غیر معمولی تعویق کے ساتھ شایع ہو رہا ہے - جسکے لیے میں بہت نادم ہوں - تعویق کے اسباب لکھ کر عذر گناہ بدتر از گناہ کے مصداق نہیں بننا چاہتا - کوشش کرونگا کہ ماہ فروری میں پرچے کی اشاعت وقت پر آجائے -

(حافظ) محمد داؤد علوی

غالب

آئینہ خانہ اور شبنمستان میں

(جناب پروفیسر آغا اشہر صاحب لکھنوی ایم اے)

درست ہے کہ غالب مرحوم کے شارحین متعدد ہوئے اور ہوتے رہیں گے۔ اُنھیں اس معاملے میں ہندوستان کا خاقانی سمجھا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ لیکن بعض اوقات اشعار کے اختلاف معانی سے بہت سی مفید باتیں منظر عام پر آجاتی ہیں۔ اور بعض مرتبہ وہ نقائص جو بادی النظر میں شعر کو کم وزن بنا دیتے ہیں، شارح کی دقت نظر سے محاسن معلوم ہونے لگتے ہیں۔ غالب مرحوم کے اشعار کے معاملے میں نظم طباطبائی مغفور نے جن موشگافیوں سے کام لیا ہے اُس کا کیا ذکر۔ غالباً اردو کی یہ پہلی شرح ہے جو مغربی نقد و تشریح کے اصول کے مطابق ہے۔ لیکن بعض قلم اُن مرحوم کے دیوان کی شرح میں ایسے بھی چل پڑے جن کو کہنہ قلمدانوں میں پڑا رہنا چاہیے تھا۔ مثلاً شرح بیخود دہلوی۔ شرح شوکت میرٹھی۔ میری رائے میں ایسی شرحیں کلام غالب سے مزاح شاعرانہ کرنے کے لیے لکھی جاتی ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ غالب مرحوم کی ان تمام شرحوں میں دلچسپ اختلاف مراتب ہے۔ مثلاً نظم طباطبائی نے غالب کو غالب سمجھ کر شرح کلام کی۔ بیخود دہلوی نے اُس کو اپنے اُستاد کا معاصر سمجھ کے شرح کلام فرمائی۔ حضرت میرٹھی نے اپنے کو غالب کا نقاد سمجھ کے شرح کی۔ سٹر تنہا نے ایک نئی روشنی ڈالی۔ خیر ماہ اگست کے "الناظر" میں مولوی محمد اظہار الحسن صاحب وکیل کی وہ تحریر میں نے نہایت دلچسپی سے پڑھی، جس میں موصوف نے غالب مرحوم کے اس شعر کے متعلق اظہار رائے فرمایا ہے۔

کیا آئینہ خانے کا وہ نقشہ ترے جلوے نے
کرے جو پرتو خورشید عالم شبنمستاں کا

اس شعر کے دو ہی معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک حضرت طباطبائی مرحوم کا معمول ہو یعنی "جس طرح آفتاب کے سامنے شبنم نہیں ٹھہر سکتی اُسی طرح تیرے مقابلے کی تاب آئینہ نہیں لا سکتا" تمام شارحین نے کم و بیش انھیں لفظوں کا اعادہ کیا ہے۔ دوسرا مطلب بظاہر وہ ہے جس کا اظہار وکیل صاحب نے فرمایا ہے۔ موصوف کا خیال ہے کہ شارحین نے شرح شعر میں دقت نظر سے کام نہیں لیا۔ غالباً

دقتِ نظری سے کام لے کے یہ معنی لکھے گئے ہیں، ورنہ صاف صاف مطلب اُسی طرح کہہ دیا جانا ممکن تھا جس طرح آپ نے تحریر کیا ہے۔

اس شعر میں قابلِ نظر یہ امر ہے کہ طباطبائی مرحوم نے شرحِ شعر میں دو لفظوں پر خاص توجہ مبذول فرمائی ہے۔ پہلے مصرعہ میں "نقشہ" اور دوسرے میں "عالم" کے صحیح محلِ صرف پر۔
کسی چیز کا کچھ نقشہ یا عالم کر دینا ایسے محل پر صرف کیا جاتا ہے جب شے معلوم میں نقص صفت کا عارض ہونا مقصود ہو، یا اُس کی کسی کیفیت کا یوں بدل جانا کہ تباہی یا فقدان کا مترادف ہو۔ ان دونوں مرکبات سے مراد اظہارِ عبرت ہوا کرتی ہے۔ یا تنقیص شے معلومہ مثلاً

دم بخود ہوں منظرِ گورِ غریباں دیکھ کر
اس بھری بستی کا اب کس نے یہ عالم کر دیا (عزیز مرحوم)

بلکہ اگر یہ دونوں لفظ منفرداً بھی نظم یا نثر میں مستعمل ہوتے ہیں اُس وقت بھی ان کا عبرت نما رُخ یا کسی شے کی بُری حالت دکھانا مقصود ہوا کرتا ہے

کیا نئی دشمنوں سے بگڑی آج دوستوں کا کچھ اور عالم ہے
ہاتھ دل پر، آہ لب پر، آنکھ سے آنسو رواں اب تو یہ نقشہ ہے تیرے عاشقِ دلگیر کا (داغ مرحوم)

پہلی بات دیکھنے کی یہ ہے کہ جلوۂ آئینہ خانہ اور جلوۂ محبوب کا تقابل کیا گیا ہے۔ دوسری بات یہ کہ آئینہ خانہ میں آڑے ترچھے آئینوں کے ٹکڑے جو سالوں سے اس سلیقے سے چسپاں کیے جاتے ہیں کہ اُن میں خود بخود بغیر وجودِ روشنی ایک برقی تڑپ پیدا رہتی ہے۔ جس سے داخل ہونے والوں کی نظر میں چکا چوند ہو جاتی ہے۔ اس کیفیت سے جلوۂ محبوب کو بالاتر دکھانا مقصود ہے۔ اگر یہ بھی نہ ہو تو بذاتِ خود آئینے کی صفت روشن مانی جاتی ہے۔ اور اُسی کو اس شعر میں محبوب کے جلوۂ روشن سے ماند کیا گیا ہے۔

دوسرا مصرعہ تمثالیہ ہے۔ جناب وکیل صاحب نے "پرتو" کے معنی صرف "روشنی" کے سمجھے ہیں حالانکہ "تپش" کے معنوں میں بھی فارسی میں مستعمل ہے۔ جیسا کہ اُنکے اس فقرے سے ظاہر ہوتا ہے "سورج کی روشنی سے شبنم کو نقصان نہیں پہنچتا۔ بلکہ تپشِ آفتاب اُسے حباب بنا کر اڑا دیتی ہے"۔
ایک آئینہ کا دَم پڑ جانا یوں صحیح ہوتا ہے کہ دوسرا زیادہ صاف آئینہ اُسکے سامنے آ جائے۔ اور پہلے پر نظر نہ پڑے۔ آفتاب و شبنم جمال محبوب، آئینہ خانہ میں تقابل اس وجہ سے ہوتا ہے کہ ان تمام چیزوں میں صفت روشنی مشترک ہے

آپ تحریر فرماتے ہیں "شاعر کے نزدیک رخ محبوب میں زیادہ تابانی ہوتی ہے" خود آپ کے مطلب سے یہ اخذ ہوتا ہے کہ آئینہ خانہ کو سجانے خود کوئی اہمیت نہیں، بلکہ اگر محبوب جلوہ فگن ہو تو رونق کا عجیب عالم ہو جائے۔ جس سے آئینہ خانہ کی اہمیت سابقہ نظر انداز ہو جائے۔

"تیرے مقابلہ کی تاب آئینہ نہیں لا سکتا"

کے یہی معنی ہیں۔

رہا تعلیم فنا کا مسئلہ تو اسکے متعلق صرف یہ گزارش کافی ہے کہ ہر وہ شے جو وجود سے عدم کی طرف حرکت کرے اُس سے تعلیم فنا کا اشتباہ ہو سکتا ہے۔

قطعہ تاریخ وفات منشی جگت موہن لال رواں

(جناب مولانا سید علی نقی صاحب صفی لکھنوی ملقب بہ لسان القوم)

زباں دان محبت نکتہ سنجے　　　وکالت پیشہ آزادے حق آگاہ
بہ والا ہمتی تابندہ چوں مہر　　　براوجِ شاعری رخشندہ چوں ماہ
جواں سروے بہ گلزار معانی　　　برفت از منزلِ ہستی بناگاہ
زمرگِ او خبر ہر گہ شنیدم　　　دلم پُرگشت از اندوہ جاں کاہ

صفیؔ سال وفاتش ثبت کردم +
روانہ شد جگت موہن رواں آہ
۱۳۵۳ھ

تنقیدات عبدالحق مولوی عبدالحق صاحب سکرٹری انجمن ترقی اردو و اڈیٹر رسالہ اُردو کی چوبیس تنقیدوں کو رسالہ اُردو کے بارہ سال کے پرچوں سے انتخاب کرکے مولوی محمد تراب علی خاں صاحب باز حیدرآبادی نے مرتب کیا ہے۔ حجم ۱۲ جز تقطیع خرد قیمت ؏

قوم کی آواز - مہاتما گاندھی گول میز کانفرنس کے موقع پر انگلستان گئے تھے وہاں انھوں نے تقریریں کیں اُنکا ترجمہ جامعہ ملیہ نے شایع کیا تھا جسکی قیمت ؏ ہے۔ یہ دوسرا اڈیشن ترجمہ لاہور سے نکلا ہے اسمیں ۵ عکسی تصویریں بھی ہیں، ۱۸۰ صفحے - قیمت ؏

الناظر بک ایجنسی لکھنؤ سے طلب فرمائیے

آئینۂ ریاض

(جناب مولانا امانی صاحب دیلوری)

ریاض — لے اُڑے گیسو پریشانی مری — آئینے لے بیٹھے حیرانی مری

اصلاح امیر — لے اُڑے گیسو پریشانی مری — آئینے لے بھاگے حیرانی مری

مولانا ناطق گلاؤٹھی کا اعتراض — لے اُڑے۔ لے بیٹھے۔ لے بھاگے۔ تینوں محاوروں کا ایک ہی معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ ریاض نے "لے اُڑے" کے ساتھ "لے بیٹھے" لکھا تھا۔ لیکن اُستاد نے "لے بھاگے" بنا دیا۔ دیکھنا یہ ہے کہ شاگرد نے درست محاورہ استعمال کیا یا اُستاد نے درست اصلاح دی۔ گیسو کے لیے اُڑنا درست تھا کیونکہ گیسو کی صفت اُڑنا بھی ہے۔ لیکن دوسرے مصرعہ میں جو منشی صاحب نے "لے بھاگے" بنا دیا تو اس میں تقابل ہوگیا کہ ایک اُڑ رہا ہے اور ایک بھاگ رہا ہے۔ لیکن بھاگنا آئینہ کی صفت سے بعید ہے۔ اس لیے جب "لے بیٹھنا" اسی ضلع کا لفظ تھا تو اُستاد کے لیے مناسب نہیں تھا کہ شاگرد نے جو آئینہ کی صفت کا درست استعمال کیا تھا اُس کو بگاڑ دیتے۔"

محاکمہ حضرت عبدالباری آسی مولف تذکرہ معرکہ سخن — حضرت آسی نے اپنی خاموشی سے ظاہر کیا کہ اعتراض مسلم ہے۔

امانی — "لے اُڑے" "لے بھاگے"۔ دونوں محاوروں کا ایک ہی معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ یعنی ان میں "ربودن" کے معنی پائے جاتے ہیں جسے عربی "خطفت" کہتے ہیں اور یہ سرعت کی ایک قسم ہے۔ ذیل کے اشعار دیکھیے:—

جرأت۔ لے اُڑ گئی عاقبت جوں بوئے گل یاں کی ہوا — غنچہ ساں گر کوئی کید دم ہمیں گھیرے رہا

خلیل۔ لے اُڑیں ہم شاہد گلشن کو تا کھائیں خار کھائے — عندلیبوں نے یہ پاہم کی ہے کونسل باغ میں

ذوق۔ قفس کو لے اُڑیں صیاد اسیر مضطرب تیرے — خبر گل کی اگر اُڑتی سنیں باد بہاری سے

میر۔ تیل کی کُپی ایک لے بھاگا — ایک پکنے گھڑے سے ہالا گا

انیس۔ کب دزد سے دولت ہنر بچتی ہے — لے بھاگتے ہیں جبکہ نظر بچتی ہے

"لے بیٹھے" میں یہ معنی کہاں ہیں۔ دیکھیے "نام لے بیٹھے۔ کسی کو لے بیٹھے:—

رند۔ نام لے بیٹھوں محبت کا جو اُس کے آگے　　ظلم ہو جائے مری جان پہ آفت ہو جائے
جرات۔ یار کو اغیار جب لے بیٹھتے ہیں گھیر کے　　ہم کھڑے رہتے ہیں چُپکے منہ اُدھر سے پھیر کے
میر۔ مخالف سے نہ مل بیٹھا کر اتنا　　کہیں لے میر صاحب کو جدا بیٹھ

"لے بیٹھے" اور "لیے بیٹھے" میں بڑا فرق ہے۔ غالب مرحوم ؎

مے عشرت کی خواہش ساقیِ گردوں سے کیا کیجیے　　لیے بیٹھا ہے اک دو چار جام واژگوں وہ بھی

چونکہ "لے بیٹھے" میں (ابتذال سے قطع نظر) "ربودن" کے معنی نہیں ہیں جو یہاں مقصود ہیں اس لیے اُستاد نے "لے بھاگے" بنا دیا۔

اگر یہ کہا جائے کہ بیٹھنا آئینہ کی صفت ہے لیکن بھاگنا تو آئینہ سے بعید ہے تو سنیے جس طرح بیٹھنا آئینہ کی صفت ہے (گو یہ نادر ہے) اسی طرح بھاگنا بھی آئینہ کی صفت ہے۔ بلکہ آئینہ میں بنسبت سکون کے نقل و حرکت زیادہ ہے۔ اشعار ذیل دیکھیے جن سے ثابت ہو جائے گا کہ آئینہ کو "تگاپو" کے سوا دوسرا کام ہی نہیں۔

ظفر۔ ملائی خاک میں سب آبرو آئینہ کی تم نے　　اور اس پر بھی تمہارے سامنے یہ بے حیا آیا
میر۔ پھرے ہے خاک ملے مُنہ یہ یا نمد پہنے　　یہ آئینہ ہے نظر کردہ کس قلندر کا
وزیر۔ دیکھتا ہوں اُسکو پھرتے دستِ خوباں میں سدا　　گھر سے گو نکلا نہیں پر ہے سفر میں آئینہ
گویا۔ ہو مرے ہمراہ جاؤں میں جدھر خانہ بدوش　　چاہیے اب صورتِ آئینہ گھر پیدا کروں
سالک۔ دیکھتا ہے وہ تو اُٹھے دیکھنے کے شوق میں　　کیا عجب خود نکلے اپنے گھر سے باہر آئینہ
ناسخ۔ گر نہ ہوا امیدوار اس محبوب کے دیدار کی　　باہر اپنے گھر سے پھر نکلے نہ زنہار آئینہ
"۔ ہے حسینوں کو ہمارا ہی دلِ صاف پسند　　ہند سے اب ہو حلب کا سفری آئینہ
"۔ ہند میں پہونچا حلب سے طالبِ دیدارِ دوست　　آدمی سے کم نہیں کرتا تگاپو آئینہ

چونکہ آئینہ لوازمِ معشوق سے ہے اس لیے شاعر کہتا ہے کہ جس طرح گیسوئے معشوق میری پریشانی کو لے اُڑے اُسی طرح آئینۂ معشوق میری حیرانی کو لے بھاگے یعنی پریشانی کی طرح حیرانی کو بھی مجھ سے چھین لیا

غالب مرحوم

شکوۂ سنجِ رشکِ ہمدگر نہ رہنا چاہیے
میرا زانو مونس اور آئینہ تیرا آشنا

———— ⁂ ————

نظرے خوش گزرے

حیدرآباد کا قیام شبِ ہجر کی طرح طویل ہو گیا اور اب بھی نہیں معلوم کہ واپسی کب ہوگی۔ لکھنؤ سے غیر حاضری کی بنا پر الناظر کے انتظامات میں طرح طرح کی ابتری واقع ہوئی۔ ہر پرچہ میں بکثرت غلطیاں رہ جاتی ہیں، حتیٰ کہ اڈیٹر کی تحریر بھی صحیح نہیں چھپتی۔ پرچہ کی تیاری میں دیر ہو جایا کرتی ہے اور مضامین کا جو ذخیرہ سال کے شروع میں جمع کر لیا گیا تھا اب وہ بھی اختتام کے قریب ہے۔ اس مرتبہ کاتب صاحب کی وجہ سے کچھ تاخیر ہوئی کسی قدر ماہ صیام کی مصروفیتوں نے وقت گزارا، اور اب عید کی تعطیل سر پر ہے۔ ان اسباب سے امید نہیں کہ یہ پرچہ بھی وقت پر شایع ہو سکے۔

جن احباب نے سالِ رواں میں مضامین نہیں بھیجے یا جنکے پاس مضامین تیار ہوں وہ جلد کرم فرمائیں۔ حیدرآباد بھیجنا چاہیں تو یہ پتہ تحریر فرمائیں :- مکان نواب معشوق یار جنگ شریک معتمد مالگزاری۔ خیریت آباد۔ حیدرآباد دکن۔

کانگریس کا سالانہ اجلاس ۱۹۱۶ء کے بعد اب پھر لکھنؤ میں ہونے والا ہے۔ گزشتہ چند ماہ سے لکھنؤ کے کانگریسی کارکنوں میں مجلس استقبالی کے انتخابات کے سلسلہ میں شدید کشمکش رہی اور جب اس باہمی نزاع کا کسی صورت سے تصفیہ نہ ہو سکا تو بالآخر صوبہ کانگریس نے اجلاس کے انتظامات کے لیے اپنی جانب سے ایک مختصر مجلس بنا دی ہے۔

کانگریس کے کارکنوں میں محض اصولی اختلافات کی بنا پر یہ فرقہ بندی ہوتی تو چنداں مضائقہ نہ تھا۔ مگر افسوس ہے کہ جھگڑے کی بنیاد تمامتر شخصی و ذاتی ہے۔ اور اس سے بھی قابل افسوس یہ امر ہے کہ رفیقِ دیرینہ چودھری خلیق الزماں صاحب وکیل لکھنؤ کی ریشہ دوانی سے اس جھگڑے نے اتنا طول کھینچا ہے کہ لکھنؤ کا نام نیک سارے ملک میں بدنام ہو رہا ہے۔

تحریکِ خلافت کے زمانہ سے چودھری صاحب اور اُنکے ہمدمِ عزیز پنڈت ہرکرن ناتھ مصرا صاحب بیرسٹر لکھنؤ میں کانگریس کے سردار تھے۔ سالہا سال تک ضلع کمیٹی اور شہر کمیٹی کی صدارتیں اسی جوڑ کے لیے مخصوص رہیں۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں جب چودھری صاحب ڈسٹرکٹ کانگریس کمیٹی کے چھ ماہ صدر رہ چکے

وہیں لکھنؤ میونسپل بورڈ کے بھی چیرمین (صدر) تھے اور پنڈت جی ضلع کانگریس کمیٹی کی صدارت کے ساتھ ساتھ لکھنؤ ڈسٹرکٹ بورڈ کی کرسیِ صدارت پر بھی سرافراز تھے۔

ایک طرف دسمبر ۲۹ء میں بمقام لاہور کانگریس نے طے کیا کہ حکومت سے جنگ کی جائے، اور ۲۶ جنوری ۱۹۳۰ء کا دن یوم آزادی منانے کے لیے مقرر کیا گیا، دوسری طرف اسی ماہ جنوری میں ہزاکسیلنسی وائسرائے و گورنر جنرل کشورِ ہند کے قدوم میمنت لزوم سے لکھنؤ سرافراز ہونے والا تھا۔ کانگریسی اصحاب نے قدرتًا توقع کی کہ یہ دونوں مقامی سردار وائسرائے کے استقبال میں حصہ نہ لینگے۔ اور جب اُن کو یہ اطلاع ملی کہ اُنکے سرداروں کی نیتیں زیر فتور رہے تو اُنھوں نے اپنے امکان بھر دونوں کو سمجھانے کی کوشش کی۔ مگر شیطان مسلط ہو جائے تو پھر کون کسی کی سنتا ہے۔

پنڈت جی، دوڑے ہوئے اسٹیشن پر استقبال کے لیے پہونچے اور چودھری صاحب نے وائسرائے کی خدمت میں میونسپل ایڈریس پیش کرنے کی عزت حاصل کی۔ کانگریس والے بہت بپھرے اور جلسہ کرکے ملامت کی تو دونوں صاحب "شا بخیر و مابسلامت"، کہکر کانگریس سے مستعفی ہو گئے۔

پنڈت جی کے خیالات و حالات میں غالبًا تبدیلی ہو چکی تھی یا اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ اُنھوں نے پھر اپنی طرف سے کانگریس میں دخیل ہونے کا قصد نہیں کیا، یا کیا تو ایسے چُپ چاپ کہ کانگریس والوں کو اُن کی مخالفت کی ضرورت نہیں پیش آئی۔ لیکن چودھری صاحب زیادہ دلیر نکلے کہ انھوں نے گزشتہ سال جب کانگریس کمیٹیوں کے انتخابات ہوئے تو کانگریس میں پھر داخل ہونا چاہا۔ اور ان کی دلی تمنا شاید یہ بھی ہوگی کہ پھر صدر منتخب کیے جائیں۔

چودھری صاحب نے ۱۹۳۰ء ہی میں کانگریس اور سوراج پارٹی کے ایک اور زبردست ٹھوکر لگائی تھی اور وہ یہ کہ جب اُنکے مربی اور سوراج پارٹی کے سردار پنڈت موتی لال نہرو اور دوسرے کانگریسی اصحاب اسمبلی سے باہر آئے تو اودھ کے مسلم نمائندے مسٹر رفیع احمد قدوائی (سوراجی) کی جگہ چودھری صاحب اسمبلی میں کرسی نشیں ہو گئے۔

ڈاکٹر انصاری صاحب کو ان حضرات کی غداریوں کا علم نہ تھا یا وہ اُن کی غلطیوں کی تلافی کی یہی صورت سمجھتے تھے کہ اپنے قید ہونے کے بعد اُنھوں نے چودھری صاحب کو کانگریس کی مجلس عاملہ کا صدر، اور پنڈت ہرکرن ناتھ صاحب کو رکن نامزد کیا۔ بعض لوگ اسے اتفاقات سے تعبیر کرتے ہیں، اور بعضے اس بارے میں بھی چودھری صاحب کو قصور وار جانتے ہیں کہ پنڈت

جواہرلال نہرو کی رہائی کے بہانہ سے چودھری صاحب نے مجلس عاملہ کا جلسہ ملتوی رکھا اور چودھری صاحب اور پنڈت جی دونوں جیل میں جاکر اپنی سابقہ معصیت کا کفارہ دینے یا کانگریس کے ساتھ اپنی وفاداری ثابت کرنے سے محروم رہے۔

لکھنؤ کے کانگریسی کارکنوں میں پرانے بعض کارکنوں کے علاوہ بہت سے نئے نوجوان سنہ ۱۹۳۰ء کی جنگ میں داخل ہوئے جن کی اکثریت کی قیادت مسٹر چندر بھان گپتا، شہر کانگریس کمیٹی کے موجودہ صدر کر رہے ہیں۔ وہ چودھری صاحب کو بہت دنوں تک اپنا سردار جانتے رہے مگر اس غداری کے بعد سے اُن کا دل کھٹا ہوگیا اور جدید انتخابات کے موقع پر اُنھوں نے چودھری صاحب کو کانگریس کمیٹی میں گھسنے نہیں دیا۔ اور کون دیانتدار و انصاف پسند شخص ہے جو اُن کے اس طرزِ عمل کو غلط کہہ سکتا ہے۔

معمولی سے معمولی خطا بھی اُس وقت تک معاف نہیں کی جاتی جب تک مجرم غلطی کا معترف نہ ہو، عذر خواہی نہ کرے اور آیندہ کے لیے اطمینان نہ دلائے۔ پھر جنگ کے زمانہ میں بڑے سے بڑا سپہ سالار فوج سے بھاگے یا دشمن سے مل جائے تو کورٹ مارشل اور عبرتناک سزا سے بچ نہیں سکتا۔ غلام ہندوستان کی کیا مجال ہے کہ قومی غداروں کو ہاتھ بھی لگا سکے مگر کیا غلاموں کو اتنا بھی حقِ سزا دہی حاصل نہیں کہ غداران ملک و قوم کو ہر قسم کے اعزازات سے محروم رکھیں۔

لکھنؤ شہر کانگریس کے موجودہ رہنماؤں کا یہی قصور ہے کہ اُنھوں نے چودھری صاحب کے قوت و عظمت کے آگے سر نہیں جھکایا کانگریس کمیٹی کے انتخابات میں جو لوگ اقلیت میں تھے یا جن کی رائے گرامی میں چودھری صاحب کا وجود کانگریس کے لیے اتنا ہی ضروری ہے جس قدر انسان کی زندگی کے لیے ہوا، وہی سب چودھری صاحب کے اشاروں پر ناچ رہے اور مجلس استقبالیہ کو میدانِ کارزار بنائے ہوئے ہیں۔ سب سے زیادہ افسوسناک حالت بابو موہن لال سکسینہ کی ہے جو اپنی خدمات کی بنا پر درحقیقت اس وقت لکھنؤ کے کانگریسیوں کے سردار ہوتے مگر جنھوں نے اپنی نادانی یا ضد کی بنا پر اُس فریق کی پشت پناہی شروع کر دی ہے جو کانگریس کمیٹی کے کارکنوں سے برسرِ جنگ ہے۔ حالانکہ اسی سال کے شروع میں وہ فرقہ بندی سے اتنے بلند و ارفع ظاہر ہونا چاہتے تھے کہ اُنھوں نے نہ صرف لکھنؤ کی کانگریس سے کوئی تعلق نہیں رکھا، بلکہ صوبہ کانگریس کمیٹی تک سے علٰحدگی اختیار کر لی تھی۔ لیکن چودھری صاحب کے دامِ محبت میں گرفتار ہو کر اب تو وہ خود اس میدان میں آگئے ہیں۔

۱۹۳۰ء میں چودھری صاحب اسمبلی کی ممبری کے امیدوار تھے، اس منصب بلند کی آرزو نے اُن کو یہ جرأت دلائی کہ کانگریس کو ٹھکرا دیں اور آزادی کی جنگ میں حصہ لینے یا (معذور و مجبور تھے تو) گوشہ نشیں رہنے کے بجائے حکومت سے پینگ بڑھائیں۔

۱۹۳۵ء میں جنگ کا دغدغہ باقی نہیں، لکھنؤ میونسپلٹی میں مسلمان صدر کے منتخب ہونے کی باری ہے اور آیندہ انتخابات کے موقع پر اگر کونسل کی رکنیت پر فائز ہوگئے تو وزیر تک بننے کی گنجایش۔ ان حالات میں چودھری صاحب سے زیادہ بڑا کانگریسی کون ہو سکتا ہے اور عجب نہیں جو ۲۸ دسمبر کو جشن جوبلی کے موقع پر چودھری صاحب ہی لکھنؤ کے جلسہ کی صدارت فرمائیں۔

لکھنؤ میں اب سے تیس پینتیس سال پیشتر بھی ایک چودھری صاحب بہت با اقتدار رہ چکے ہیں۔ بظاہر چودھری خلیق الزماں صاحب بھی اُنھیں کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔ خدا کرے دونوں کا حشر یکساں نہ ہو۔

۲۲۔ دسمبر ۱۹۳۵ء

سیرۃ النبیؐ

کے سلسلہ کی **پانچویں جلد** بھی چھپ کر شایع ہوگئی ہے۔ اس میں عبادت کا مفہوم، اسلام کے فرائض خمسہ میں سے ہر ایک پر قرآن مجید کی روشنی میں علٰحدہ علٰحدہ بحثیں، توکل، صبر، اخلاص، تقوٰی، اور شکر وغیرہ جانی، مالی اور قلبی عبادات کی تشریح اور ان کے احکام و مصالح کی توضیح کی گئی ہے۔ تقطیع کلاں قیمت قسم اعلیٰ مجلد ۶؍ قسم دوم مجلد ۵؍

مجموعۂ نغز۔ حکیم قدرت اللہ قاسم کا نایاب تذکرۂ شعرائے اُردو پہلی بار پروفیسر محمود شیرانی صاحب نے مرتب کرکے شایع کرایا ہے۔ یہ قدیم تذکروں میں سب سے زیادہ ضخیم ہے۔ اسکی قدر و قیمت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ کہا جاتا ہے کہ شمس العلما آزاد کے آبحیات کی تعمیر اسی کی بنیاد پر ہوئی۔ ۹۰۰ صفحے تقطیع کلاں، دیدہ زیب جلد ۱۲،

بہادر شاہ ظفر۔ ادیب بے مثال منشی امیر احمد صاحب علوی کی لکھی ہوئی بہادر شاہ ظفر کی سوانح عمری اور اُن کے کلام پر تبصرہ۔ قیمت ۱؍

خالدہ ادیب خانم نے مشرق و مغرب کی کشمکش پر جو آٹھ خطبے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں دیے تھے یہ اُن کا اُردو ترجمہ شایع ہوا ہے۔ کتابت و طباعت اعلیٰ۔ قیمت ۲؍

الناظر بک ایجنسی لکھنؤ سے طلب کیجیے

لکھنؤ کے تحفے

لکھنؤ عطر کی بہت بڑی منڈی ہے - اور ہم تمام مشہور اور اچھے کارخانوں کا مال روانہ کر سکتے ہیں - جس قسم کا عطر درکار ہو ہم سے طلب فرمائیں :-

قیمت فی تولہ کے حساب سے

عطر بیلا عہ ر سے سے ر تک
عطر چنبیلی عہ ر سے عـہ ر تک
عطر موتیا عہ سے عـہ تک
عطر چمپا عہ ر " صمہ "
عطر جوہی عہ ر " عـہ "
عطر نرگس عہ ر " سے "
عطر مولسری عہ ر صمہ "
عطر موگرا عمہ " سے ر "
عطر سونگی عہ ر " سے ر "
عطر گل حنا عہ " صمہ ر "
عطر جسمین عـہ ر
عطریات کی ارنی عا ر سے سے ر تک
عطر صد برگ عہ ر سے سے "
عطر ہارسنگھار عہ ر " سے "
عطر کیوڑہ عہ ر " سے "
عطر گلاب سعہ " عـہ "
عطر مشک پہر " صمہ "
عطر زعفران پہر " سے "
عطر عنبر عہ ر " عـہ "
عطر عود عہ ر " سے "
عطر پانزلی عہ " صمہ "
عطر خس عہ " سے "
عطر حنا عہ ر عیـہ "
عطر ناگیسر سے ر " عیـہ "
عطر اگر غزالی عـہ " للعہ "
عطر مخلوط عنبری سے " سے "

عطر مجموعہ عہ ر سے سے ر تک
عطر فتنہ عہ ر " سے "
عطر عروس عہ ر " صمہ "
عطر سہاگ عہ ر " سے "
عطر مدن مان عہ ر عـہ "
عطر مدن مست پہر " للعہ ر "
عطر ارگجا محمد شاہی عہ " صمہ "
عطر شہناز عہ ر " صمر ر "
عطر کسم عہ " سے "
عطر شگترہ عہ " سے ر
عطر نارنگی عہ " عا "
عطر شمامۃ العنبر صمہ " سے "
عطر شاہ پسند صـعہ ر
عطر محبوب پسند مـعہ ر
عطر اگر گل سے سے عـہ ر تک
عطر اگر گل کہنہ عـہ سے عـہ "
عطر دونا عہ " سے "
عطر کامنی عا ر " للعہ "
عطر مالتی عا ر " صمہ "
عطر گل منو بر عہ " سے "
عطر کتیکی عہ ر " عا "
عطر انبہ پہر " عا ر "
عطر کبیرا پہر " عا ر "
عطر پان عہ ر " سے "
عطر نازبو عا ر " صمہ "
عطر برگ حنا پہر " سے "

راحت روح

یہ لاجواب عطر شاہی زمانہ کی ایجاد ہے جو اب صرف یہاں کے ایک قدیم کارخانۂ عطر میں تیار ہوتا ہے اور خوش مذاق رئیسوں اور بڑی بڑی سرکاروں میں بیحد پسند کیا جاتا ہے - قیمت فی تولہ صمہ ر

مخلوط آصفی

نواب آصف الدولہ کے عہد میں یہ بینظیر عطر تیار ہوا تھا اور انھیں کے نام سے موسوم ہے - جرمنی اور جاپان کے آئے ہوئے عطر خوشبو کی تیزی و پائداری میں اسکا مقابلہ نہیں کر سکتے - فی تولہ صمہ ر

عزیز نامہ

یہ عطر یہاں کے ایک مشہور کارخانہ کی سالہا سال کی محنت و کوشش کا ثمرہ ہے اور بھینی بھینی خوشبو والے کئی قسم کے پھولوں کی خوشبو سے تیار ہوا ہے - قیمت فی تولہ سے ر

خوشبودار تمباکو

زردہ

(پتی) فی سیر ۲ پہر عا ر للعہ سے ر
مشکی " سے ر للعہ سے ر عـہ
مشکی دانہ " للعہ سے ر عـہ ر عـہ
مشکی نقرئی " عـہ ر عـہ و عـہ

گولیاں

طلائی فی تولہ عہ ر
نقرئی " ۶ ر ۸ ر ۱۰ ر

قوام

قوام مشکی فی تولہ ۱ ر ۴ ر ۵ ر ۶ ر ۸ ر عہ ر عا
قوام زعفرانی " ۲ ر و ۴ ر
برقی قوام " عہ ر پہر ۸ ر
اختلائی قوام " عہ ر

کشیدنی تمباکو

فی سیر ۳ ر ۴ ر ۶ ر ۸ ر عہ ر عا ر

پان کا مصالحہ

مشک و زعفران کی آمیزش سے ترکیب پاتا ہے اور پان کو لذیذ و خوش ذائقہ بناتا ہے - فی ڈبیہ ۳ ر فی شیشی ۵ ر

دیکھا جس فلسفے کو وہ سمجھ لیتا تھا اُس کی ابجد سے بھی میرزا یگانہ کو کبھی واقفیت ہوئی۔ غالب کا پورا دیوان تو دُور رہے، اُس کی ایک غزل کے چند اشعار میں درج کرتا ہوں۔ ان اشعار کے حسن معنوی [حسن ظاہر کو جانے دیجیے] کا لحاظ رکھتے ہوئے میرزا مراد یہ بتائیں کہ یگانہ نے کبھی بھی چھوٹی بحروں کی غزلوں میں اس پایہ کے جذبات کا اظہار کیا

۱- ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی　　کچھ ہماری خبر نہیں آتی
۲- آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی　　اب کسی بات پر نہیں آتی
۳- موت کا ایک دن معین ہے　　نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
۴- ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں　　ورنہ کیا بات کر نہیں آتی
۵- مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی　　موت آتی ہے پر نہیں آتی
۶- کیوں نہ چیخوں کہ یاد کرتے ہیں　　میری آواز گر نہیں آتی

اب آئیے غالب کے کلام کی ظاہری خوبیوں پر۔ جناب میرزا مراد صاحب، آپ نے آیات وجدانی میں متعدد بار دوہرایا ہے کہ "غالب کے لیے اُردوئے معلیٰ میں ایسا شعر کہنا ناممکن ہے" ممکن ہے کہ اُردوئے معلیٰ کے معانی آپ کے ذہن میں بالکل جدا ہوں، کیونکہ آپ ہر چیز کا مطلب بالکل اُلٹا سمجھتے ہیں، جو عام طور سے اشخاص کے ذہن میں ہوتا ہے۔ مگر جو تصور اردوئے معلیٰ کا عوام کے دماغ میں ہے اُس میں اگر آپ کو غالب کی قابلیت کے متعلق شک ہو تو اُسکے خطوط کا مطالعہ فرمائیے۔ دماغی تکلیف تو ضرور ہوگی مگر آپ کو علم ہو جائے گا کہ اُردوئے معلیٰ میں کسے زیادہ دستگاہ حاصل تھی، غالب مرحوم کو یا یگانہ کو ——— رہا اشعار کا معاملہ، تو اگر آپ انصاف کی عینک لگا کر دیکھتے تو اُس کے مختصر سے دیوان میں آپکو ہزاروں نمونے مل جاتے۔ بیشک غالب کے بعض اشعار ایسے ضرور ہیں جن میں فارسیت کا غلبہ ہے، لیکن مہربان من اُس کے کلام کا بیشتر حصہ اس معیار سے جس کی بنا پر آپ نے یگانہ کے کلام کو خالص اُردو کا کلام کہا ہے صرف اُردو ہی ہے اور اس پر حسن ظاہری کے ایسے ایسے نمونے نظر آتے ہیں جن تک یگانہ جیسوں کے دماغ کی رسائی ناممکن ہے۔ مثال کے طور پر میں یہاں دس اشعار لکھتا ہوں زیادہ خلش ہو تو دیوان غالب دیکھیے۔

(۱) ڈھانپا کفن نے داغِ عیوب برہنگی　　میں ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا
(۲) محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا　　یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

(۳)	اُسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا	جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دو چار ہوتا
(۴)	مرتا ہوں اس آواز پہ ہرچند کہ سر جائے	جلاد کو لیکن وہ کہے جائے کہ ہاں اور
(۵)	تم ماہِ شبِ چار دہم تھے مرے گھر کے	پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشا کوئی دن اور
(۶)	رُخِ نگار سے ہے سوزِ جاودانیِ شمع	ہوئی ہے آتشِ گل آبِ زندگانیِ شمع
(۷)	زبانِ اہلِ زباں ہے مرگِ خاموشی	یہ بات بزم میں روشن ہوئی زبانیِ شمع
(۸)	آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک	کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک
(۹)	حسن اور اُس پہ حسنِ ظن رہ گئی بوالہوس کی شرم	اپنے پہ اعتماد ہے غیر کو آزمائے کیوں
(۱۰)	کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی	بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو

صفحہ ۱۱۰:—

"دلِ بے حوصلہ ہے اک ذرا سی ٹھیس کا مہماں وہ آنسو کیا پیے گا جسکو غم کھانا نہیں آتا"

سچ پوچھو تو یہ غالب کے بس کی بات ہی نہیں کہ ایسی الہامی زبان میں مافی الضمیر کو واضح کر سکے۔"

دلِ بے حوصلہ کو ذرا سی ٹھیس کا مہمان، کہنا ضرور فصاحت کی جان ہے لیکن یہ کہنا کہ جو غم نہیں کھا سکتا وہ آنسو کیا پیے گا، سراسر غلط اور حقیقت کے بالکل برعکس ہے۔ شاید یگانہ کے نزدیک غم کھانا آنسوؤں کے پینے سے سہل تر ہو، اور کسی میں تو اتنی کم ذوقی ہو نہیں سکتی۔

اس شعر میں جو ظاہری حسن ہے صرف اُسی کے زور پر اگر اس شعر کو الہامی تصور کر بھی لیا جائے اور اس کے معنوی سقم سے قطع نظر کی جائے تو بھی یہ نتیجہ نکالنا کہ اُردو کے کسی اور شاعر اور خصوصاً غالب کو زبان پر اتنی قدرت نہیں تھی کہ اس قسم کے صنائع و بدائع کے ساتھ شعر کہہ سکے واقعات کے بالکل خلاف ہے۔

امیر مینائیؒ	بیمارِ محبت نے کبھی منہ نہ لگایا	تاثیر گھلی جاتی ہے اس غم سے دوا میں
انیسؒ	پانی تھا آگ گرمیِ روزِ حساب تھی	ماہی جو سیخِ موج تک آئی کباب تھی
نسیم لکھنوی	صندلی رنگوں سے مانا دل ملا	دردِ سر کی کس کے ہاتھے جائیگی
ذوقؔ	کیا تاب دل جلوں سے جو برق لاگ رکھے	دوزخ بھی ہو تو ان کی چلموں پہ آگ رکھے
غالبؔ (۱)	لے پرتوِ خورشیدِ جہاں تاب ادھر بھی	سائے کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے
(۲)	میرے غم خانہ کی قسمت جب رقم ہونے لگی	لکھ دیا منجملۂ اسبابِ ویرانی مجھے

صفحہ ۹۲ امید و بیم نے وہ راستہ ہی چھوڑ دیا چراغ گل ہوا جب آستانۂ دل کا"

میرزا مراد یگانہ کے مندرجۂ بالا شعر کا تقابل غالب کے مندرجہ ذیل شعر سے کرتے ہیں

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

اور انھیں یہی نظر آتا ہے کہ یگانہ کا شعر افضل ہے، ان کی نگاہ میں "آستانۂ دل کا چراغ گل ہونا" بجائے خود ایک شعر کا حکم رکھتا ہے مگر انھیں "ذوق وصل و یاد یار کا باقی نہ رہنا" ایک دفتر تغزل کا مرادف نہیں دکھائی دیتا، ان کا دماغ "اُمید و بیم کا راستہ چھوڑ دینے" کو زیادہ سراہتا ہے لیکن "آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا" کی خوبی کی طرف منتقل ہی نہیں ہوتا۔ کیا کسی صاحب ذوق کے خیال میں میرزا یگانہ کے شعر کے مصرعۂ اولیٰ میں وہ معنویت ہے جو غالب کے مصرعۂ ثانی میں ہے۔ کیا کسی اہل نظر کی نگاہ میں "آستانۂ دل کا چراغ گل ہونے" میں وہ جامعیت ہے جو غالب نے "ذوق وصل و یاد یار باقی نہ رہنا" کہکر پیدا کی ہے۔ علاوہ بریں یگانہ کے شعر کے مقصد میں کوئی ندرت نہیں صرف الفاظ کا گھروندا ہے۔ محض ایک ڈھکوسلا ہے جس کی مراد بیگ نے اس قدر تعریف کی ہے

اے وائے بہار سے اگر این ست بہارے

صفحہ ۹۸ لحد سے بڑھ کے نہیں گوشۂ راحت قیامت آئی جو اس گھر سے میہماں نکلا

بھلا اس قیامت آئی کا کیا جواب ہو سکتا ہے یہی وہ انداز بیان ہے جس پر غالب کا کبھی دسترس نہ ہوا۔"

واللہ کیا زبان ہے اور کتنا صحیح طرز تحریر ہے۔ اجی جناب میرزا مراد صاحب خود ہی تو آپ کتاب بھر میں چیخے ہیں کہ اہل لکھنؤ کے یہاں سوائے زبان کی چاشنی کے اور کیا رکھا ہے۔ بجز صنائع و بدائع ظاہری کے کچھ نہیں ہے اور خود ہی صرف اس اتنے سے ٹکڑے "قیامت آئی" پر اتنا غوغا مچاتے ہیں گویا صور اسرافیل پھونک رہے ہیں۔ ذرا انصاف سے سوچیے کہ بجز اس ٹکڑے کے شعر میں اور کوئی خوبی بھی ہے۔ مہمل سا، فرسودہ، پامال مضمون جو خدا جھوٹ نہ بلوائے سیکڑوں شعرا اس سے پیشتر باندھ چکے ہیں، اور آپ ہیں کہ اس کی ستائش میں رطب اللساں ہیں، زمین آسمان ایک کیے دیتے ہیں۔ آپ کی شعر فہمی کی حقیقت تو اسی سے معلوم ہوتی ہے۔ حضرت غالب تو دور رہے، اسکے ایک معتقد نے ایک شعر کہا ہے جس میں "قیامت ہوگی" کی خوبی پر آپ نظر ڈالیے تو آپ کو پتہ چلے کہ یگانہ کا دعوےٰ زباندانی، اور اس کی تائید میں آپ کی قصیدہ خوانی کہاں تک قرین قیاس ہے۔ شعر یہ ہے

مر نہ جاؤ اور کے مزاروں کو نہ ٹھکرائیں حضور : اگر اٹھ کھڑے ہو نگے تو قیامت ہوگی۔ (راحت لہری)

غالب کی ایک غزل ہے جس میں بحر اور قافیہ مختلف ہیں مگر ردیف یہی ہے پریشاں نکلا عریاں نکلا ذرا اس غزل کے دو ایک اشعار سے یگانہ کی اس غزل کا مقابلہ فرمائیے تو فرق مراتب ظاہر ہوگا، ویسے بھونکنے کو تو کتا بھی بھونک لیتا ہے۔

صفحہ ۱۰۹ پر یگانہ کی غزل ہے' منظر کھلا، دفتر کھلا' ان کی بدقسمتی سے غالب نے بھی اسی زمین میں غزل کہی ہے، میں چند اشعار کا مقابلہ کیے دیتا ہوں، میرزا مراد کو اس کی حسرت بھی بہت ہے اُن کی آرزو بھی پوری ہو جائیگی

مطلع شب ہوئی پھر انجم رخشندہ کا منظر کھلا
اس تکلف سے کہ گویا بتکدے کا در کھلا
غالب
واں نقاب اُٹھی کہ صبح حشر کا منظر کھلا
یا کسی کے حسن عالمتاب کا دفتر کھلا
یگانہ

غالب کے شعر میں جو نادر تشبیہ ہے اس کے مقابلہ میں یگانہ کے ہاں دونوں مصرعوں میں وہی فرسودہ تشبیہیں " یار کا چہرہ حشر کا منظر ہے" "یار کا چہرہ حسن میں عالمتاب ہے" وہی پامال انداز بیان یا کسی کے حسن کا دفتر کھلا

جلیل کا شعر ہے نقاب کہتی ہے میں پردۂ قیامت ہوں
اگر یقین نہ ہو دیکھ لو اٹھا کے مجھے

امانت کا شعر ہے تا قیامت نہ دکھاؤ گے فلک پر چہرہ
میرا محبوب جو لے شمس و قمر دیکھ لیا

منہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں
زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا
غالب
اشک خوں سے زرد چہرہ پر ہے اک طرفہ بہار
دیکھیے رنگ جنوں کیسا مرے منہ پر کھلا
یگانہ

کہاں ہیں میرزا مراد۔ دیکھیں غالب کے شعر میں کتنا نایاب انداز بیان ہے منہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ کھلتا ہی نہیں کیا اب بھی غالب کی قابلیت پر، اس کی زباندانی پر انھیں اعتراض ہے۔ اور کچھ ان اشعار کے متعلق کہنا بے سود ہے۔ غالب کے شعر کی گرد کو بھی یگانہ کا شعر نہیں پہنچا

غالب
ان کی اُمت میں ہوں میں میرے رہیں کیوں کام بند
واسطے جس شہ کے غالب گنبد بے در کھلا
رنگ بدلا پھر ہوا کا میکشوں کے دن پھرے
پھر چلی بادِ صبا پھر میکدے کا در کھلا
یگانہ

یہاں بھی فرق مراتب ظاہر ہے، یگانہ کا مضمون کس قدر فرسودہ اور طرز ادا کس درجہ پامال ہے۔

ان کے علاوہ اور ہم قافیہ اشعار نہیں۔ لیکن یگانہ کو اپنے ذیل کے اشعار پر بھی ناز ہے اور ان کی تعریف میں جس فخر و مباہات سے وہ کام لیتے ہیں اُس سے پتہ چلتا ہے کہ انکو یہ مغالطہ ہے کہ اس بحر میں اور اس ردیف میں کوئی دوسرا شخص اس پایہ کے اشعار نہیں لکھ سکتا۔

صحبتِ واعظ میں بھی انگڑائیاں آنے لگیں
رازِ اپنی میکشی کا کیا کہیں کیونکر کھلا

آنکھ جھپکی تھی تصور بندھ چلا تھا یار کا	چونکتے ہی حسرت دیدار کا دفتر کھلا	یگانہ
چُپ لگی مجکو، گناہِ عشق ثابت ہو گیا	رنگ چہرے کا اُڑا رازِ دلِ مضطر کھلا

ان تین اشعار کے مقابلہ میں غالب کے تین شعر بھی سُن لیجیے۔

گرچہ ہوں دیوانہ پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب	آستیں میں دشنہ پنہاں ہاتھ میں خنجر کھلا
گو نہ سمجھوں اُسکی باتیں گو نہ پاؤں اُسکا بھید	پر یہ کیا کم ہے کہ مجھسے وہ پری پیکر کھلا	غالب
کیوں اندھیری ہے شبِ غم ہے بلاؤں کا نزول	آج اِدھر ہی کو رہیگا دیدۂ اختر کھلا

اربابِ نظر اور اصحابِ ذوق خود فیصلہ کرلیں کہ غالب کے اشعار کے سامنے یگانہ کے شعروں کی کیا حقیقت رہ جاتی ہے۔

صفحہ ۱۱۵

(۱) قصہ کتابِ عمر کا کیوں مختصر ہوا	رُخ داستانِ غم کا اِدھر سے اُدھر ہوا	(یگانہ)

اس شعر کی تعریف کرنے میں بھی میرزا مراد غالب کے مُنہ آئے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یگانہ کا اس شعر سے غم کے فلسفہ جاودانی کو ثابت کرنا اصلیت سے کوسوں دُور ہے آج تک کہیں بھی یہ درس نہیں دیا گیا کہ غم جاودانی ہے اور فنا کے بعد بھی باقی رہتا ہے۔ فلسفیوں، مصلحوں، پیغمبروں، کسی کے اقوال سے اس کا ثبوت نہیں ملتا۔ پھر اگر غالب نے وہی بات کہی تو کیا بُرا کیا۔ اُردو کے اور شعرا نے بھی یہی کہا ہے۔

(۱) [مومن]	چھُٹ کر کہاں اسیرِ محبت کی زندگی	ناصح یہ بندِ غم نہیں قیدِ حیات ہے
(۲) [آنا سلوم]	غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا	دَم کے جانے کا نہایت غم رہا

اسی صفحہ پر ایک اور مہمل شعر ہے

ماتم سرائے دہر میں کس کس کو روئیے	اے وائے دردِ دل نہ ہوا دردِ سر ہوا	(یگانہ)

اس کے متعلق میرزا مراد رقمطرازی فرماتے ہیں

"یہ انداز بیان اور قوتِ استدلال غالب کے یہاں خال خال نظر آتی ہے"

میں تو اتنا جانتا ہوں کہ اس قسم کی لغو تخیل پر مبنی اشعار رکھنا غالب گوارا ہی نہیں کرتا تھا۔

صفحہ ۱۱۷ "جامہ زیبوں پہ کفن نے بھی دیا وہ جوبن	دوڑ کر سب نے کلیجے سے لگانا چاہا" (یگانہ)

اس شعر میں مصنف کی رنگین بیانی قسم کھانے کے قابل ہے۔ ایک منشی فاضل کی شامت آئی، غالب کا ایک شعر میرزا صاحب کے سامنے بڑے فخریہ انداز سے پڑھ کر ندرتِ تخیل کی داد چاہنے لگے

ایک خونچکاں کفن میں کروروں بناؤ ہیں	پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی	(غالب)

میرزا صاحب نے ہنس کر فرمایا کہ جناب والا منشی فاضل کی سند حاصل کر لینا اور بات ہے اور شعر و سخن پر محاکمہ کرنا اہل الرائے کا منصب ہے، سنیے اور سمجھیے کہ عرفی کے اس شعر کے مقابلے میں غالب کے شعر کی کیا حقیقت ہے۔

ملہ ہا سوختہ اند اہل بہشت از غیرت تا شہیدان تو گلگوں کفنے ساختہ اند (عرفی)

آپ نے دیکھا، میرزا یگانہ نے اپنا اہل الرائے ہونا کس طرح ثابت کیا، آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ میرزا مراد نے کس فخریہ انداز میں یگانہ کے اس بے معنی اعتراض کی تائید کی۔

خوشیسی ست ایں رنگیں بیا وائید پالانش

ایک شاعر کوئی عمدہ شعر کہدے تو اس کے معنی یہ تو نہیں ہو سکتے کہ دنیا کے تمام اشخاص کسی دوسرے شاعر کا ہم مضمون شعر پڑھنا ترک کر دیں۔ ایک فارسی شعر کے اچھے ہونے کا یہ مطلب تو نہیں ہو سکتا کہ اُردو کا ہم معنی شعر خوب ہو ہی نہیں سکتا۔ میرزا مراد فرماتے ہیں

حق یہ ہے کہ عرفی کے شعر کے مقابلے میں غالب کا شعر پانچ فیصدی نمبر پانے کا بھی مستحق نہیں ہے"

کیا اس سے کسی طرح یہ ثبوت ملتا ہے کہ اس بیچارے منشی فاضل نے یگانہ کو غالب کا شعر سنا کر گناہ عظیم کا ارتکاب کیا تھا۔ کیا اس سے کہیں یہ استدلال ہوتا ہے کہ یگانہ کا شعر غالب کے شعر سے اچھا ہے۔ بظاہر تو ان سب امور سے یہ پتہ چلتا ہے کہ بجائے اس منشی فاضل کے یگانہ اور میرزا مراد میں شعر فہمی اور سخندانی کا فقدان ہے اُنہیں لطیف کی کمی ہے۔

ایں دولت سرمد ہمہ کس را ندہند

علاوہ بریں غالب اور عرفی کے اشعار کے معنی میں زمین و آسمان کا فرق ہے، عرفی شہیدوں کے لباس کی گلگونی پر اہل بہشت (جس میں حوریں، غلمان اور دوسرے ساکنان خلد سب شامل ہیں) کے رشک کا عالم دکھاتا ہے۔ غالب کفن کے کردروں بناؤ سے شہیدوں کے حسن و خوبصورتی کی اس قدر افزائش کرتا ہے کہ حوریں (صرف حوریں) تک متاثر ہو جاتی ہیں، فارسی پھر فارسی ہے اور اُردو پھر اُردو،

زبان پہلوی کی ہمزبانی ہو نہیں سکتی

دونوں کا کیا مقابلہ، عرفی کے شعر کی رنگینی برحق مگر میری رائے میں عرفی کے شعر کے مصرعۂ اول [ملہ ہا سوختہ اند اہل بہشت از غیرت] میں وہ معنویت، وہ جامعیت، وہ ندرت تخئیل نہیں جو غالب کے شعر کے دوسرے مصرعہ میں جو ایک پہلو اصلیت و سادگی کا ہے وہ عرفی کے مصرعہ سے معدوم ہے۔ پھر

اگر عرفی کے یہاں "سوختہ انداز غیرت" ہے تو غالب کے یہاں بھی "پڑتی ہے آنکھ" ہے جو اُردو میں اتنا ہی جامع ہے جتنا فارسی میں عرفی کے شعر کا ٹکڑا، بہرحال گو مجموعی طور پر میں غالب کے شعر کو عرفی کے شعر پر ترجیح دینے کے لیے تیار نہیں لیکن یگانہ اور مراد کی طرح یہ کہنے پر بھی رضامند نہیں کہ "غالب کا شعر عرفی کے شعر کے مقابلہ میں پانچ فیصدی نمبروں کا بھی مستحق نہیں"۔ اگر عرفی کا شعر بیس ہے تو غالب کا انیس، عرفی کا شعر آفتاب ہے تو غالب کا شعر ماہتاب، عرفی کے شعر پر اگر رنگینی صد بہارستان معنی صدقے ہیں تو غالب کے شعر پر شادابی صد ہزار گلستان نکتہ آفرینی قربان

ہیں دونوں ایک ہی سے کچھ ذرا چڑھتے اُترتے ہیں

میرزا مراد پھر گل افشاں ہیں

"عرفی و غالب نے تو شہیدان عشق کے کفن کی رنگینی کا نقشہ کھینچا ہے مگر میرزا یگانہ کی جرأت فکر نے جامہ زیبی کی ایسی بہار دکھائی ہے جو اَب تک کہیں دیکھنے میں نہیں آئی"

میرزا مراد شاید افریقہ کے کسی جنگل کے رہنے والے ہیں جو اُنھوں نے اب تک اس "آزار نگار" جامہ زیبی سے بہتر جامہ زیبی کی بہار نہیں دیکھی ہے۔ ارباب نظر اسکا خوب اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یگانہ کا شعر باوجود میرزا مراد کی اتنی جھوٹی تعریف کے عرفی اور غالب کے اشعار کے مقابلے میں کیا وقعت رکھتا ہے۔ میرزا مراد غالب کو پانچ فیصدی نمبر دینے پر تیار نہیں تھے، میں یگانہ کو ایک نمبر دینے کے لیے بھی تیار نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ شعر یگانہ میں تغزل کی وہ روح نہیں ہے جو اور شعرا کے کلام میں پائی جاتی ہے۔ میرے خیال میں یگانہ کے کلام کی اتنی بے وقعتی کا بڑا سبب یہ ہے کہ ان کے اکثر اشعار بہت روکھے پھیکے، سوز و گداز سے معرا، لذت درد سے خالی، اصلیت سے دور ہوتے ہیں۔

صفحہ ۱۱۹ پر یگانہ کی ایک غزل شروع ہوئی ہے جسکے متعلق میرزا مراد نے خود اشارہ کیا ہے کہ غالب کی غزل سے ملا کر دیکھ لی جائے۔ اُن کے حسب ارشاد یہ بھی لیے دیتا ہوں۔ ناظرین غور فرمالیں کہ یگانہ کی غزل کی غالب کے اشعار کے سامنے کیا حیثیت ہے۔

غالب
عرض نیاز عشق کے قابل نہیں رہا
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

یگانہ
تکتے ہیں آس دُور سے منہ آپ کا ہنوز
آنکھیں تو رہ گئی ہیں مگر دل نہیں رہا

کیا دونوں اشعار میں کوئی بھی نسبت ہے۔

غالب
جاتا ہوں داغ حسرت ہستی لیے ہوئے
ہوں شمع کشتہ درخور محفل نہیں رہا

یگانہ
پروانے اپنی آگ میں جل کر ہوئے تمام
اب کوئی بار خاطر محفل نہیں رہا

یگانہ کے شعر کا مصرعہ اُولیٰ اور دوسرے مصرعہ میں 'بارِ خاطرِ محفل' کی ترکیب ضرور قابلِ تحسین ہیں مگر غالب کے بلند تخئیل اور شمعِ کشتہ کے درخورِ محفل نہ رہنے کے ثبوت نے یگانہ کے شعر کو گرد کر دیا۔

یگانہ		غالب
پہونچی نہ اُڑ کے دامنِ عصمت پہ گرد تک		دل سے ہوائے کشتِ وفا مٹ گئی کہ واں
اس خاک اُڑانے کا کوئی حاصل نہیں رہا		حاصل سوائے حسرتِ حاصل نہیں رہا

غالب کے شعر کے مقابلہ میں یگانہ کا شعر پھینک دینے کے قابل ہے۔ کیا انداز ہے "حاصل سوائے حسرتِ حاصل نہیں رہا" علاوہ بریں یگانہ کے شعر میں دو بہت واضح سقم ہیں۔ اول تو مصرعہ ثانی میں مصرعۂ اولیٰ کی مناسبت سے 'رہا' نہیں ہونا چاہیے، 'ہوا' سے زیادہ صحیح مطلب نکلے گا۔ یا مصرعہ اولیٰ پھر یوں ہو۔ پڑتی نہیں ہے دامنِ عصمت پہ گرد تک دوسرے اس شعر کے جو معنی ہوتے ہیں وہ حقیقی جذبات سے کوسوں دُور ہیں۔ کسی عاشق کا یہ مقصد نہیں ہو سکتا کہ اس کے محبوب کے "دامنِ عصمت پر گرد پڑے" ممکن ہے یگانہ کی نظروں میں۔ دامنِ عصمت پر گرد پڑنے ـــــ کے معنی دوسرے ہوں۔

مندرجہ بالا اشعار کے سوا اور بھی شعر دونوں کی غزلوں میں ہیں گو ہم قافیہ نہیں۔

یگانہ	غالب
(۱) اب کہتے نہیں کسی سے تسلی کی چشمداشت	(۱) مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر کہ میں
دل تک اب اعتبار کے قابل نہیں رہا	شایانِ دست و بازوِ قاتل نہیں رہا
(۲) آہستہ پاؤں رکھیے قیامت نہ کیجیے	(۲) بر روئے شش جہت درِ آئینہ باز ہے
اب کوئی سر اٹھانے کے قابل نہیں رہا	یاں امتیازِ ناقص و کامل نہیں رہا
(۳) یاد آئی بوئے پیرہنِ یار ناصحا	(۳) وا کر دیے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حسن
اپنا دماغ اب کسی قابل نہیں رہا	غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا
(۴) دل کی ہوس وہی ہے مگر دل نہیں رہا	(۴) گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
محمل نشیں تو رہ گیا محمل نہیں رہا	لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

میرزا یگانہ کی قابلیت کا راز تو اسی سے کھلا جا رہا ہے کہ چار میں سے تین شعر قابل کے قافیہ میں ہیں۔ اور کوئی قافیہ ان سے سنبھلا ہی نہیں، برخلاف اس کے غالب نے کتنے مشکل قافیے کس خوبی سے نبھائے ہیں خصوصًا پہلا شعر بہت بلند ہے اور صحیح رنگِ تغزل میں ڈوبا ہوا ہے۔ یگانہ کے چاروں شعر نہ معلوم کس بد حواسی کا نتیجہ ہیں۔ بے اعتباریِ دل کا رونا بے شمار شعرا رو چکے ہیں اور اس اسا